پھر یاد آئی
طاہر جاوید مغل

دس ستارے

طاہر جاوید مغل

ستاروں کا مقام آسمان کی بے کراں وسعتیں ہیں جہاں سے وہ دنیا میں جاری ہنگامہ خیزیوں کا نظارہ کرتے رہتے ہیں۔ یہی ستارے اگر کبھی زمین پر اتر آئیں تو یہاں کی دلفریبیاں شاید انہیں اس قدر نہ بھائیں جتنا انہیں اپنی جگہ سے پسند آتی ہیں۔

یوم دفاع پاکستان کے پس منظر میں کسک جگاتی ایک منفرد کہانی

وہ اپریل کی ایک بڑی سہانی اور چمکیلی شام تھی۔ ایسی شاموں میں خوامخواہ دل میں ترنگ سی پیدا ہوتی ہے۔ میں کھڑکیاں کھول کر بیٹھتا ہوں، ٹی وی دیکھتا ہوں، بیوی سے کسی اچھے سے کھانے کی فرمائش کرتا ہوں اور اس فرمائش کے بدلے میں اس سے وعدہ کرتا ہوں کہ اسے اور بچوں کو کہیں گھمانے اور آئس کریم کھلانے لے جاؤں گا۔

میں جس شام کا ذکر کر رہا ہوں اس میں دونوں بچے تو گھر میں نہیں تھے۔ امتحانات کے بعد وہ تین چار دن کے لیے ماموں کے گھر گئے ہوئے تھے۔ بس میں اور شکیلہ تھے۔ سنہری شام شکیلہ کو گنگنانے پر مجبور کر رہی تھی۔ گلدان میں نرگس کے پھول سجاتے وہ گا رہی تھی۔ اپنے بالوں کو کان کے پیچھے اڑس لیتی تھی۔ اس کا موڈ بحال تھا۔ آج ہمیں ایک شاندار ڈنر پارٹی میں بھی جانا تھا۔ یہ پارٹی ایک معروف سیاسی فیملی کے سربراہ ملک حشمت دے رہے تھے۔ شکیلہ اس پارٹی کے لیے صبح سے تیاری کر رہی تھی۔

اچانک بیرونی دروازے پر کال بیل کی آواز سنائی دی لیکن ٹھہریے...... اس کال بیل سے پہلے میں آپ کو اپنے بارے میں تھوڑا سا بتا دوں۔ میرا نام انور خیال ہے۔ میں پیشے کے لحاظ سے اخبار نویس ہوں۔ فارغ وقت میں شاعری اور دیگر تخلیقی کام بھی کر گزرتا ہوں۔ مطالعہ میرا شوق ہے۔ اچھی کتاب مل جائے تو میرے وارے نیارے ہو جاتے ہیں۔ اور میری بیگم شکیلہ کے چہرے پر مردنی چھا جاتی ہے کیونکہ میرے فارغ وقت کے لیے شکیلہ اور ''اچھی کتاب'' میں کھینچا تانی ہمیشہ جاری رہتی ہے۔

میرے ذاتی مکان کے گیراج میں میری چھوٹی سی ذاتی سوزوکی کار موجود رہتی ہے تاہم دفتر کی طرف سے مجھے دفتری امور کے لیے ایک اسٹیشن ویگن بھی ملی ہوئی ہے۔ ان دونوں گاڑیوں کے ساتھ ساتھ میری زندگی کی گاڑی بھی ٹھیک چل رہی ہے۔

ہاں تو میں اپریل کی اس سہانی شام میں دروازے پر ہونے والی دستک یعنی کال بیل کا ذکر کر رہا تھا۔ میں نے اپنے ململ کے کرتے کا گریبان درست کیا اور چپل پہنتا ہوا گیٹ تک پہنچا۔ مغربی افق پر شفق کی سرخی ابھی موجود تھی۔

''کون ہے؟'' میں نے دروازہ کھولنے سے پہلے پوچھا۔

''میرا نام طفیل ہے۔ آپ ذرا دروازہ کھولنا پسند کریں گے۔'' نہایت شائستہ لہجے میں کہا گیا۔

میں نے جھجکتے دروازہ کھولا۔ باہر دیکھا اور...... دیکھتا رہ گیا۔ سامنے ایک فرد نہیں تھا...... زیادہ تھے۔ پہلی نظر میں وہ مجھے دس بارہ کے قریب لگے۔ ان کے عقب میں مغربی افق پر پھیلی ہوئی سرخی تھی۔ اس سرخی کے پیش منظر میں وہ ایک لمحے کے لیے مجھے کسی تصویر کی طرح نظر آئے۔ وہ سب کے سب جواں سال تھے۔ ان کے چہروں پر اجالا اور آنکھوں میں روشنی تھی۔ ان میں سے زیادہ تر نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی...... چند لمحوں کے لیے میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔ مجھے لگا کہ میں زمین و آسماں کے درمیان معلق ہو گیا ہوں۔ میں نے سوچا کہیں میں جاگتی آنکھوں سے خواب تو نہیں دیکھ رہا......

اپنے گرد و پیش کا ادراک حاصل کرنے کے لیے میں نے پلٹ کر اپنے گھر کی طرف دیکھا۔ چھوٹے سے صحن سے آگے برآمدہ تھا۔ برآمدے کے ایک ستون کے پیچھے شکیلہ موجود تھی اور بڑے انہماک سے ایک گملے میں پانی لگا رہی تھی۔ میں نے پھر سامنے دیکھا۔ وہ اٹل حقیقت کی طرح اپنی جگہ موجود تھے اور مسکراتی نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ وہ میرے لیے اجنبی نہیں تھے۔ میں نے انہیں پہچان لیا تھا۔ اگر وہ ایک

یا دو ہوتے تو شاید مجھے پہچاننے میں تاخیر ہوتی یا شاید میں سرے سے پہچان ہی نہ سکتا لیکن وہ سارے اکٹھے آ گئے تھے۔ شانے سے شانہ ملائے کھڑے تھے۔ میں انہیں کیسے نہ پہچانتا۔ وہ میری زمین کا سنگھار تھے۔ وہ میرے وطن کے ماتھے کا جھومر تھے۔ اس فضا میں رہنے والے ہر شخص کی ہر سانس پر ان کا احسان تھا۔ ہاں میں نے پہچان لیا۔ وہ نشانِ حیدر تھے اور جب میں نے پہچان لیا کہ وہ نشانِ حیدر ہیں تو پھر گنے بغیر ہی مجھے ان کی تعداد کا علم بھی ہو گیا۔ وہ دس تھے...... اور وہ اپریل کی اس خوش رنگ شام میں مجھ ناچیز کے دروازے پر کھڑے تھے۔ میرے ہونٹ خشک ہو گئے۔ آواز سینے میں اٹک گئی۔ میں بمشکل بس اتنا ہی کہہ سکا۔ ''آپ...... یہاں!''

یہ جان کر کہ میں نے انہیں پہچان لیا ہے ان کے چہروں کا تبسم دل آویز ہو گیا۔ میرے اندازے کے مطابق ان میں سب سے آگے میجر طفیل کھڑے تھے اور وہی عمر میں سب سے بڑے بھی نظر آتے تھے۔ تینتالیس چوالیس سال عمر ہو گی۔

انہوں نے عجیب مہربان لہجے میں کہا۔ ''ہمیں اندر آنے کا نہ کہیے گا؟''

میں جیسے ایک دم ہوش میں آیا۔ میں نے دروازہ پورا کھول دیا۔ دو قدم پیچھے ہٹا اور لڑکھڑاتی آواز میں بولا۔ ''آیئے ناں...... آیئے ناں سر۔''

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر بڑے باوقار قدموں سے میرے گھر میں داخل ہو گئے۔ چوڑے شانے، چٹان جیسے سینے، دیودار کے درختوں کی طرح اونچے لمبے لیکن حرکات و سکنات میں ایک موہ لینے والی نرمی۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں ان کے سامنے بچھ جاتا۔ ان کے قدموں کے نیچے اپنی ہتھیلیاں رکھ دیتا۔ ان کے سامنے اپنا گھر اور اپنا آپ مجھے بالکل ناچیز محسوس ہوا۔ میں انہیں نشست گاہ میں لے آیا۔ وہ صوفوں پر بیٹھ گئے۔ وہ در و دیوار کو بڑی محبت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

خوبصورت گھونگھریالے بالوں اور نشیلی آنکھوں والے راجا عزیز بھٹی نے کہا۔ ''ہم نے آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کیا؟''

میں نے سرتاپا کانپتے ہوئے کہا۔ ''آپ کیسی بات کر رہے ہیں سر، میں...... خود کو اس شہر لاہور کا خوش قسمت ترین انسان سمجھ رہا ہوں سر۔ آپ نے مجھے یہ عزت بخشی ہے۔ مجھے اپنے حواس پر، اپنی آنکھوں پر بھروسا نہیں ہو رہا۔ کیا واقعی ایسا ہے سر کہ آپ...... میرے سامنے موجود ہیں؟''

''ہاں، ہم موجود ہیں۔'' میجر اکرم نے کہا۔ ''آپ بیٹھ جایئے۔ ہم آپ سے باتیں کرنا چاہتے ہیں۔''

''مم...... میں آپ کے لیے۔ مم...... میرا مطلب ہے، آپ کیا لینا پسند کریں گے؟'' میں نے کہا۔

''نہیں کچھ نہیں۔ بس ہم آپ سے ملنا چاہتے ہیں، باتیں کرنا چاہتے ہیں اور اگر آپ پسند کریں گے تو آپ کے ساتھ تھوڑا سا گھوم پھر لیں گے۔''

''آ...... آپ جو کہیں گے، سرد ہی ہو گا لیکن پہلے......'' فقرہ راستے میں ہی رہ گیا۔

اندر سے بیگم کی تیز تیکھی آواز آئی۔ ''انور! ذرا سنیے۔''

مہمانوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ میں نے ان سے معذرت کی اور تیزی سے اندر کچن کی طرف آیا۔ بیگم حیران پریشان کھڑی تھی۔ ''یہ کون لوگ ہیں انور؟''

میں شپٹا گیا۔ فیصلہ نہیں کر سکا کہ بیگم کو بتاؤں یا نہیں۔ وہ بالکل اور مزاج کی تھی اور اس کا ثبوت یہ تھا کہ اپنے بے مثال مہمانوں کو دیکھنے کے باوجود وہ انہیں پہچان نہیں سکی تھی۔ ممکن تھا کہ وہ میری بات پر یقین ہی نہ کرتی یا پھر مجھے مخبوط الحواس سمجھنے لگتی یا سمجھتی کہ میں اس کے ساتھ کوئی ناٹک کر رہا ہوں۔

''تم بولتے کیوں نہیں انور! کون لوگ ہیں یہ؟ تم گھبرائے ہوئے ہو۔''

''یہ...... یہ میرے شناسا ہیں۔'' میں نے اٹک اٹک کر کہا۔

وہ خالی نظروں سے مجھے گھورتی رہی...... کچھ دیر بعد ایک دم شپٹا کر بولی۔ ''اچھا کہیں ان کا پروگرام چائے شائے کا تو نہیں۔ دیکھو صاف کہہ دیتی ہوں، اس وقت میں کچھ کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ زیادہ بات ہے تو فریج سے کولڈ ڈرنکس لے لو...... لیکن یہ تو پورا گینگ کا گینگ ہے۔ اتنے کولڈ ڈرنکس بھی نہیں ہوں گے۔ کتنے بندے ہیں؟'' اس نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔

''دس!'' میں نے کہا۔ ''اور میرا خیال ہے کہ تمہیں ان کو پہچان جانا چاہیے۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ انڈین ڈراموں اور فلموں کے سارے چھوٹے بڑے ''اداکار'' تو تم پہچانتی ہو۔ ان لوگوں کو نہیں پہچانتیں۔'' میرے لہجے میں تپش داخل ہو گئی۔

وہ چونک سی گئی۔ اس نے ایک بار پھر دھیان سے نشست گاہ میں جھانکا۔ چہرے پر اُلجھن بڑھ گئی۔ میرا شانہ نوچ کر بولی۔ ''تم بتاتے کیوں نہیں، کون ہیں یہ؟ کیا کرنے آئے ہیں؟''

"بہت افسوس کی بات ہے۔" میں نے تاسف سے سر ہلایا۔ "اگر ہم ان کو نہیں پہچانتے تو اس کا مطلب ہے خود کو نہیں پہچانتے۔"

وہ کچھ گڑبڑا سی گئی تھی۔ کبھی میری طرف دیکھتی تھی کبھی نشست گاہ میں جھانکتی تھی۔ آخر روہانسی ہو کر بولی۔ "مجھے بتاتے کیوں نہیں ہو؟ کیا ہارٹ اٹیک کرانا ہے مجھے؟"

میں نے کہا۔ "میں سمجھتا ہوں آج کی رات ہم دونوں اس شہر اور اس ملک کے معزز ترین لوگ ہیں۔ ہمارے گھر...... ایسے لوگ آئے ہیں جو صرف خیالوں اور سپنوں میں آسکتے ہیں......" میں نے چند لمحے توقف کیا اور شکیلہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہمارے گھر "نشانِ حیدر" آئے ہیں۔"

"نن...... نشانِ حیدر۔ تمہارا مطلب ہے جنہوں نے نشانِ حیدر پایا؟"

میری آنکھوں میں نمی تھی۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اوہ مائی گاڈ!" شکیلہ کی آنکھیں کھلی رہ گئیں اور ہونٹ دائرے کی شکل میں سکڑ گئے۔ وہ ناقابلِ یقین نظروں سے نشست گاہ کی طرف دیکھتی چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولی تو اس کی آواز جیسے کسی گہرے کنویں سے آرہی تھی۔ "مم...... مجھے ذرا سا شبہ تو ہو رہا تھا لیکن...... جو کچھ تم بتا رہے ہو یہ تو...... عقل سمجھ میں نہیں آسکتا۔ کہیں ہم دونوں کے دماغ تو نہیں اُلٹ گئے؟"

"نہیں، ایسا کچھ نہیں ہوا۔" میں نے ہولے سے کہا۔

اس نے پھر آنکھیں پھاڑ کر نشست گاہ میں جھانکا۔ لرزاں آواز میں بولی۔ "میں تو بس دو تین کو تھوڑا تھوڑا...... پہچان سکی ہوں۔ ایک تو راجا عزیز بھٹی...... دوسرے داڑھی والے صاحب، وہ شاید کارگل والے کیپٹن شیر خان ہیں...... اور تیسرے وہ بالکل نوجوان سے راشد منہاس۔"

"مجھے اب بھی افسوس ہے کہ تم صرف تین کو پہچان رہی ہو۔ ان میں سے ہر ایک چہرے ہمارے دل و دماغ پر نقش ہونا چاہیے شکیلہ!"

وہ سکتہ زدہ کھڑی تھی اور میں بھی سکتہ زدہ تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ مجھے نشست گاہ سے نکلے چار پانچ منٹ ہو چکے ہیں۔ میں نے شکیلہ سے کہا۔ "جلدی چائے وغیرہ کا انتظام کرو۔ میں ان کے پاس بیٹھتا ہوں۔ جلدی کرو شاباش۔"

اس نے تیزی سے اثبات میں سر ہلایا اور کچن کی الماری کی طرف بڑھ گئی۔ میں واپس نشست گاہ میں آگیا۔

اصل وجہ

ایک اداکارہ نے اپنے نئے پروڈیوسر کو بتایا "میری ایکٹنگ کا آپ کیا پوچھتے ہیں جی.... میں نے ایک فلم میں مرنے کا سین کیا تھا۔ اسے دیکھ کر میرا شوہر بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔"

پروڈیوسر نے سر سہلاتے ہوئے کہا "ضرور رویا ہوگا.... اس بے چارے کو تو معلوم تھا کہ تم سچ مچ نہیں مری ہو۔"

کیپٹن محمد سرور اخبار کی ورق گردانی کر رہے تھے۔ میجر طفیل کے بعد وہی زیادہ عمر کے نظر آتے تھے۔ انہوں نے اخبار پر خواتین کی رنگین و سنگین تصویروں کو دیکھ کر بیزاری کا اظہار کیا اور بولے۔ "آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے اس طرح کے اخبار کا تصور بھی محال تھا۔" انہوں نے اخبار ایک طرف رکھ دیا۔

میں دل ہی دل میں دعا کرنے لگا کہ اب وہ انگریزی اخبار کا مڈ ویک ایڈیشن نہ اٹھالیں۔ اس کی حالت اس سے بھی بری تھی۔

خیریت گزری کہ انہوں نے ایڈیشن نہیں اٹھایا۔ پوری طرح میری طرف متوجہ ہو کر بولے۔ "انور صاحب! ہم آج شب آپ کے مہمان ہیں لیکن ہم یہ وقت گھر پر بیٹھ کر گزارنا نہیں چاہتے۔ ہم گھومنا پھرنا چاہتے ہیں۔"

"ہم آپ کا لاہور دیکھیں گے۔" راجا عزیز بھٹی نے کہا۔

میں نے بے ساختہ کہا۔ "یہ میرا کہاں آپ کا لاہور ہے جی۔ آپ کی قربانیوں کے صلے میں یہ آج آباد اور روشن ہے۔"

میجر محمد اکرم نے کہا۔ "بس زیادہ نہیں، ایک دو اچھی جگہیں دکھا دیجیے جہاں پانچ چھ گھنٹے سکون سے گزارے جاسکیں۔"

"آپ کہاں جانا پسند کریں گے؟" میں نے پوچھا۔

''یہ ہم آپ پر چھوڑتے ہیں۔'' لالک جان نے پشتو کے لہجے میں اُردو بولتے ہوئے کہا۔
''وہ ٹھیک ہے جناب لیکن پہلے آپ کو چائے پینا ہوگی پھر کھانا کھانا ہوگا۔ اس کے بعد ہی ہم نکلیں گے۔''
''نہیں کھانے کی ضرورت نہیں۔ اگر آپ نے چائے کا کہہ دیا ہے تو صرف وہ پی لیں گے اور اس میں بھی تکلف نہیں ہونا چاہیے۔'' میجر شبیر شریف نے کہا۔
''آپ ٹی وی دیکھنا پسند فرمائیں گے؟'' میں نے کہا۔
''ہاں، آن کر دیجیے۔'' میجر شبیر بولے۔
میں ایک دم سٹپٹا گیا۔ ٹی وی آن کرنے کی بات میں نے خوامخواہ ہی کر ڈالی تھی۔ سوچنے لگا، اب کون سا چینل ٹیون کروں۔ یہاں تو ہر طرف ناچ گانا اور انڈین فلموں کی مار دھاڑ تھی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے ایک نیوز چینل لگایا۔ بھارت سے آنے والے ایک ثقافتی طائفے کا استقبال ڈھول ڈھمکے سے ہو رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ مہمان پوری طرح ہاسکرین پر نگاہیں مرکوز کر پاتے میں نے چینل بدل دیا۔ یہاں چار عدد سیاستدان ''ہاٹ ٹاک'' میں مصروف تھے۔ ان کی آنکھیں حلقوں سے اُبلی پڑ رہی تھیں۔ منہ سے جھاگ نکل رہے تھے۔ کشمیر کے تھرڈ اور فورتھ آپشن پر دُھواں دھار دلائل دیئے جا رہے تھے۔ میں نے پھرتی سے چینل بدل دیا۔ یہ پھرتی مہنگی پڑی...... اگلے چینل پر ایک پاکستانی اداکارہ برائے نام لباس پہنے ایک انڈین ہیرو سے بوس و کنار کر رہی تھی۔ دو تین اکٹھی جستیں لگا کر میں ایک بوسیدہ سے سوگوار چینل پر آ گیا۔ اس چینل پر ایک سال خوردہ بینکار اسٹاک ایکسچینج کے اتار چڑھاؤ اور منڈیوں کے بھاؤ پر بور ترین گفتگو فرما رہا تھا۔
کیپٹن شیر خان نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''بس یہیں رہنے دیجیے۔''
بالفاظ دیگر وہ کہہ رہے تھے۔ ''یہیں رہنے دیجیے۔ یہیں پر عافیت ہے۔''
میجر اکرم نے کہا۔ ''ساٹھ ستر کی دہائی میں ایسے ٹی وی کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔''
لالک جان بولے۔ ''سر! آپ تو پرانی بات کہہ رہے ہیں۔ سات آٹھ سال پہلے تک بھی ایسا تصور کرنا محال تھا۔''
کچھ دیر باتیں ہوئیں پھر اندر سے بیگم کی مدھم آواز سنائی دی۔ ''سنیئے انور!''
میں اجازت لے کر کچن میں پہنچا۔ ٹی ٹرالی تیار تھی۔ بیگم نے ٹھیک اہتمام کیا تھا۔

''آؤ تم بھی ملو۔'' میں نے بیگم سے کہا۔
وہ ذرا سا ہچکچائی پھر سر پر آنچل دُرست کر کے میرے ساتھ نشست گاہ میں آ گئی۔
شائستگی کی انتہا تھی۔ وہ سب کھڑے ہو گئے اور السلام علیکم کہا۔ ہم دونوں شرم سے زمین میں گڑے جا رہے تھے۔ خود کو بالکل ناچیز محسوس کر رہے تھے۔ چائے پینے کے دوران میں ان کی نورانی نگاہیں جھکی رہیں۔ اگر انہوں نے شکیلہ سے بات بھی کی تو اس کی طرف دیکھے بغیر کی۔
چائے ختم ہوئی تو میں شکیلہ کے ساتھ باہر آ گیا۔ کچن میں پہنچ کر میں نے کانپتی آواز میں کہا۔ ''شکیلہ! وہ کہہ رہے ہیں ہم سیر کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں کہاں لے جاؤں؟''
''میں کیا بتاؤں۔ مجھے کچھ زیادہ پتا نہیں۔''
''سوچو بھئی...... سوچو۔ انہوں نے یہ ذمے داری مجھ پر ڈالی ہے۔''
''مینار پاکستان؟'' شکیلہ نے کہا۔
''نہیں نہیں، وہاں تو آج اپوزیشن کا جلسہ ہے۔ زبردست ہلڑ بازی ہے۔''
''شالا مار باغ؟''
''وہاں گورنر صاحب غیر ملکیوں کو عشائیہ دے رہے ہیں۔''
''تو پھر کہاں جاؤ گے؟ جناح گارڈن چلے جاؤ۔''
''نا بابا نا۔'' میں نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ''پرسوں گیا تھا رضوی اور کرمانی صاحب کے ساتھ۔ رات کو لگتا ہے سارا باغ لواسپاٹ بن جاتا ہے۔ کونے کھدروں میں لڑکے لڑکیاں گھس کر ریسرچ کرتے ہیں۔''
''ہاں یہ تو ہے۔ ریس کورس پارک میں بھی یہی حال ہوتا ہے...... یا پھر ایک اور کام کرو۔'' شکیلہ کے ذہن میں نیا آئیڈیا آیا۔
''کیا؟''
''انہیں نہر کے ساتھ ساتھ لمبی ڈرائیو پر لے جاؤ۔ راستے میں اُتر کر مختلف جگہیں بھی دیکھ لینا۔''
''لگتا ہے تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔'' میں نے سٹپٹا کر کہا۔ ''آج خیر سے ہفتہ ہے اور ہفتے کو اب نہر کا وہی حال ہونے لگا ہے جو بھاٹی گیٹ یا موچی گیٹ کا ہوتا ہے۔ گاڑیوں کی تین تین میل لمبی لائن لگ جاتی ہے۔''
''ارے ہاں، یہ موچی گیٹ کہاں ہے۔ سنا ہے وہ بھی تاریخی جگہ ہے۔ بڑے تاریخی جلسے ہوتے تھے وہاں۔'' بیگم نے کہا۔

''کبھی اخبار پڑھو تو تمہیں پتا چلے شکیلہ بیگم، اس تاریخی جلسہ گاہ میں اب ایک بڑا پارکنگ لاٹ بن چکا ہے اور ویسے بھی موچی گیٹ کی گراؤنڈ کوئی تفریح گاہ نہیں ہے۔''

''تو پھر میں کیا بتاؤں؟'' بیگم ٹپٹا کر بولی۔

ہم کچھ دیر سر جوڑے بیٹھے رہے۔ نشست گاہ میں سے باتیں کرنے کی مدھم آواز آتی رہی۔ بیگم نے سر جھکا کر کہا۔

''اب آجا کے دریائے راوی رہ جاتا ہے۔ چاندنی رات ہوگی۔ دریائے راوی پر لے چلو۔ ذرا کشتی رانی کرلو۔ کامران کی بارہ دری بھی دیکھ لینا۔''

میں نے ایک بار پھر بیگم کو غصیلی نظروں سے دیکھا۔ ''تم صرف انڈیا اور پاکستان کے ٹی وی ڈراموں اور نئے ڈیزائن کے کپڑوں پر ہی رائے دے سکتی ہو۔''

''کیا مطلب؟''

''کشتی رانی کے لیے پانی کی ضرورت ہوتی ہے اور ہمارے پاس صرف دریا ہے، پانی نہیں۔''

''پانی کہاں ہے؟''

''پانی انڈیا کے پاس ہے اور جس کو تم بارہ دری کہتی ہو اس کو یار لوگ کباڑہ دری کہتے ہیں۔ اب کچھ نہیں وہاں دیکھنے کو۔ یہی حال باقی آثارِ قدیمہ کا ہے۔''

بیگم اپنا سا منہ لے کر رہ گئی۔

''ہاں ایک کام ہوسکتا ہے۔'' اس مرتبہ آئیڈیا میرے ذہن میں آیا۔

''کیا؟''

''مقصد تو یہی ہے کہ اپنے معزز مہمانوں کو کہیں گھمایا پھرایا جائے۔ ان کو تفریح کرائی جائے تو کیوں نہ ہم انہیں اپنے ساتھ لے چلیں، گلزار حویلی میں ملک صاحب کے ہاں۔ وہاں اچھا خاصا فنکشن ہے۔ کافی بڑی تعداد میں مہمان آئے ہوں گے اور ہر طبقے کے لوگ شامل ہوں گے۔ رنگا رنگ پروگرام ہے۔''

''تمہاری بات تو دل کو لگتی ہے لیکن گلزار حویلی کا دعوت نامہ تو بس ہم دونوں کے نام ہے۔''

''یہ کوئی مسئلہ نہیں بھئی۔ ایک اور دعوت نامہ بھی ہے میرے پاس۔ یہ دفتر کے دوست احباب کے لیے ہے۔ یہ دوست احباب گروپ بنا کر سیر سپاٹے کے لیے ایوبیہ جاچکے ہیں۔ ہم وہ دعوت نامہ اپنے معزز مہمانوں کے لیے استعمال کرلیتے ہیں اور میرے خیال میں ان معزز مہمانوں کو کسی دعوت نامے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ ملک صاحب تو رہے ایک طرف، یہ پاکستان کے کسی بڑے سے بڑے وی آئی پی کے گھر بھی چلے جائیں تو انہیں دل و جان سے خوش آمدید کہا جائے گا۔ میرے خیال میں تو یہ ملک صاحب پر ہمارا بہت بڑا احسان ہوگا۔ ان کی شادی کی سالگرہ کی تقریب ایک یادگار تقریب بن جائے گی بلکہ کہنا چاہیے کہ ایک تاریخی حیثیت اختیار کرجائے گی۔'' اندرونی جوش سے میری رگوں میں خون سنسنا اٹھا۔ میں نے تصور کی نگاہ سے اپنے ان قومی ہیروز کو گلزار حویلی میں سیکڑوں مہمانوں کے درمیان دیکھا۔

دراصل گلزار حویلی میں ہونے والی تقریب ملک حشمت کی دوسری شادی کی سلور جوبلی تقریب تھی۔ انہوں نے اپنی یہ سالگرہ منفرد انداز میں منانے کا پروگرام بنایا تھا۔ حویلی میں تقریباً ایک ہزار مہمان آرہے تھے۔ یہ سب کے سب ''کپلز'' تھے یا پھر بڑی عمر کے لوگ۔ ان میں ملک صاحب کے درجنوں لنگوٹیے بھی شامل رہے ہوں گے۔ ملک صاحب مرنجا مرنج شخصیت تھے۔ موسم اور تہواروں کی نسبت سے گلزار حویلی میں آئے دن تقریبات ہوتی رہتی تھیں اور مختلف ثقافتی پروگرام بنتے تھے۔ آج اس تقریب میں بھی ایک ورائٹی شو شامل تھا۔ چند بڑے فنکار لائیو میوزک بھی پیش کررہے تھے۔

میں نے اور شکیلہ نے اس حوالے سے تیزی سے سوچا اور آخر اس نتیجے پر پہنچے کہ معزز مہمانوں کو اپنے ساتھ گلزار حویلی لے جانا چاہیے۔ نہ صرف ان کا وقت اچھا گزرے گا بلکہ وہ اندرون شہر کی ایک قدیم حویلی اور اس کا جدید رہن سہن بھی دیکھ سکیں گے۔ بہرحال فیصلے سے پہلے معزز مہمانوں سے مشورہ ضروری تھا۔ میں اس مشورے کے لیے واپس نشست گاہ میں آگیا۔

دس اُجلے چہرے اپنی دل آویز نگاہوں سے میری جانب دیکھنے لگے۔ میں نے انہیں اپنی رائے سے آگاہ کیا۔

معزز مہمانوں کا جواب میری توقع کے عین مطابق تھا۔ میجر طفیل عمر میں سب سے بڑے تھے۔ انہوں نے باقیوں کی نمائندگی کرتے ہوئے فرمایا۔ ''انور صاحب! ہم نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ آپ جہاں لے جائیں گے ہم چل پڑیں گے لیکن......'' وہ کچھ کہتے کہتے رُک گئے۔

میں سراپا سوال بن کر ان کی طرف دیکھنے لگا۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ میجر اکرم بولے۔ ''دراصل...... ہم چاہتے ہیں کہ آپ کسی سے بھی ہمارا تعارف نہ کرائیں۔ ہاں اگر کوئی خود سے پہچان لے تو اور بات ہے۔''

''ہاں انور خیال صاحب! آپ کو وعدہ کرنا ہوگا کہ آپ کسی کو ہمارے بارے میں بتائیں گے نہیں۔ اشارتاً بھی

نہیں۔'' راجا عزیز بھٹی نے حتمی لہجے میں کہا۔

''جج...... جیسے آپ کا حکم جناب! میں آپ کی حکم عدولی کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ لل...... لیکن۔''

''ہاں...... ہاں کہیے۔'' راجا عزیز نے کہا۔

''اگر آپ کی اجازت ہو تو میں اپنے میزبان ملک حشمت کو بتادوں؟''

''آپ کا کیا خیال ہے ملک حشمت ہمیں خود سے نہ پہچان پائیں گے؟''

میں لاجواب ہوگیا۔ ''جی ہاں...... جی نہیں...... میرا مطلب تھا کہ شاید۔ نہیں نہیں آپ دُرست کہہ رہے ہیں۔ وہ تو آپ کو خود ہی پہچان لیں گے۔''

''تو یہ طے ہے کہ آپ ہمارے بارے میں کسی کو نہیں بتائیں گے۔'' میجر طفیل نے کہا۔

''اوکے سر! جیسے آپ کا حکم۔'' میں نے ادب سے سر جھکایا۔

☆☆☆

ہماری اسٹیشن ویگن آٹھ بجے کے قریب گلبرگ سے نکلی اور اندرون شہر کی طرف روانہ ہوئی۔ بیگم کو میں نے اپنی چھوٹی سوزوکی میں روانہ کردیا تھا۔ وہ خود ڈرائیو کرسکتی تھی۔

گھر سے نکلتے ہی میرے لیے مشکل پیدا ہوگئی۔ اگر میں جیل روڈ کی طرف سے جاتا تو وہاں بے حد واہیات قسم کے ہورڈنگ آویزاں تھے (وہی ہورڈنگز جن کو دیکھتے دیکھتے کالجوں کے نوجوان بجلی کے کھمبوں میں موٹر سائیکلیں ٹھونک دیتے ہیں اور اسپتال پہنچتے ہیں) اگر میں متبادل راستہ اختیار کرکے کینال پارک کی طرف سے نکلتا تو بے حد خستہ اور ٹوٹی پھوٹی سڑک کا سامنا تھا۔ دونوں طرف شرمندگی تھی۔ میں نے دوسری شرمندگی کا سامنا کرنے کا فیصلہ کیا اور گاڑی کو خستہ حال سڑک پر ڈال دیا...... میری گاڑی میں میرے ملک کے دس معزز ترین افراد سوار تھے اور میں صوبائی دارالحکومت لاہور کی ایک ایسی سڑک پر رواں تھا جس پر چاند کی سطح کا شبہ ہوتا تھا۔ اگر لاہور کا یہ حال تھا تو چھوٹے شہروں کی کیا حالت ہوگی۔

چند فرلانگ چلنے کے بعد میری ہمت جواب دے گئی اور ساتھ ہی گاڑی کی بھی۔ راستہ بہت خراب ہوگیا تھا۔ گٹر ٹوٹی پھوٹی سڑک کے اوپر بہہ رہے تھے۔ مجبوراً میں نے جیل روڈ کی طرف آنے کا فیصلہ کیا۔ جیل روڈ پر پہنچتے ہی جو پہلا دیوہیکل ہورڈنگ نظر آیا اس میں تمام تر متوقع واہیاتی موجود تھی۔ ایک لڑکا لڑکی موبائل سیٹ کے حصول کے لیے سرِعام ایک دوسرے سے ریسلنگ کررہے تھے۔

قومی ہیروز کی آنکھوں میں تاسف آمیز حیرت عود کر آئی۔ میں نے اپنی پیشانی پر عرقِ ندامت محسوس کیا۔ مجھے اس پشیمانی سے بچانے کے لیے وہ آپس میں گفتگو کرنے لگے۔ ان کی مدھم نورانی آوازیں مجھے کسی بھنبھناہٹ کی طرح دور سے آتی محسوس ہوئیں۔ مجھے خود پر غصہ بھی آرہا تھا۔ میرے ساتھ دُہرا معاملہ ہوا تھا۔ خستہ سڑک کی شرمندگی بھی حصے میں آئی تھیں اور عریاں ہورڈنگز کی پشیمانی بھی۔ یہ تو صرف ایک چھوٹی سی مثال ہے۔ گلبرگ سے لوئر مال اور لوئر مال سے داتا دربار اور بھاٹی گیٹ تک پہنچتے پہنچتے میں کئی بار عرقِ ندامت میں ڈوبا۔ بظاہر چھوٹی چھوٹی باتیں تھیں لیکن میرے لیے بے حد تکلیف دہ بن گئی تھیں۔ بے ہنگم ترین ٹریفک، تجاوزات، عریاں فلمی بورڈ، بورڈوں پر پھینکی گئی سیاہی، گاڑیوں میں گونجتے ہوئے بھارتی گانے اور جگہ جگہ بھارتی کرکٹرز اور فلمی ہیروز کی تصویریں......

بالآخر ہم گلزار حویلی پہنچے۔ اندرون شہر واقع یہ شاندار سہ منزلہ حویلی بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔ گاڑیوں کے لیے پارکنگ کا مناسب انتظام کیا گیا تھا۔ ملک صاحب کی فیملی میں اس وقت ایک وفاقی وزیر اور دو ایم این اے پائے جاتے تھے۔ اُمید تھی کہ ملک صاحب خود بھی عنقریب سینٹ کے ممبر بن جائیں گے۔ حویلی کا رُعب اور دبدبہ دیدنی تھا۔ باوردی سارجنٹ اور پولیس اہلکار ٹریفک کی روانی کے لیے بھاگے بھاگے پھر رہے تھے۔ پولیس کی دو تین چوکس گاڑیاں بھی اطراف میں ڈیوٹی دے رہی تھیں۔

میں اپنے معزز مہمانوں کو لے کر گاڑی سے اتر آیا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنا شروع ہوگیا تھا۔ ہم احاطے کے وسیع و عریض پنڈال میں پہنچے۔ یہاں احاطے اور ٹیرس پر گول میزوں کے گرد تقریباً ایک ہزار نشستیں موجود تھیں۔ ہر طرف رنگ و نور کا سیلاب سا تھا۔ قہقہے گونج رہے تھے۔ آنچل لہرا رہے تھے۔ ایک سرمستی تھی جس نے ہر شے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ وسیع اسٹیج پر ایک معروف گلوکار سارنگی اور بانسری کی سنگت میں ایک لوک گیت گانے میں مصروف تھا۔

میں اپنے مہمانوں کے ساتھ چلتا ہوا اپنی مخصوص نشستوں کی طرف بڑھتا گیا۔ ایک باوردی ملازم ہماری رہنمائی کررہا تھا۔ ہم دورویہ میزوں کے درمیان سے گزر رہے تھے۔ ہم جن لوگوں کے نزدیک سے گزرتے تھے وہ میرے باوقار مہمانوں کو ذرا تعجب سے دیکھتے تھے تاہم بہت سے ایسے بھی تھے جو بس ایک طائرانہ نگاہ ڈال کر اپنی

مصروفیات میں مگن ہو جاتے تھے لیکن کسی نے بھی میرے مہمانوں کو ان کی اصل حیثیت میں شناخت نہیں کیا۔ میرے لیے یہ صورتِ حال ایک دھچکے سے کم نہیں تھی۔ ہم کم و بیش پانچ سو افراد کے قریب سے گزرے لیکن ان میں سے کسی نے بھی اپنے ان عظیم مہربانوں کو نہیں پہچانا۔ میں ششدر رہ گیا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ یہ معزز مہمان صرف مجھے اور میری بیگم کو ہی نظر آئے ہوں لیکن اگلے ہی لمحے میں نے اپنے اس خیال کو رد کر دیا۔ یہ غلط تھا۔ وہ دیکھے جا رہے تھے...... لیکن پہچانے نہیں جا رہے تھے۔ میرے اندازے غلط ثابت ہونے لگے۔ میرا خیال تھا کہ جونہی ہم پنڈال میں داخل ہوں گے، زیادہ نہیں تو سو پچاس لوگ ضرور بڑے دھیان سے اس عظیم گروپ کو دیکھیں گے۔ ان کی آنکھیں کھلی رہ جائیں گی۔ وہ بے ساختہ اپنی جگہوں سے کھڑے ہو جائیں گے۔ ایک دوسرے کو بتائیں گے۔ پورے پنڈال میں سرگوشیاں لپکیں گی پھر سناٹا چھا جائے گا۔ ہر جاندار و بے جان شے جامد ہو جائے گی۔ تب ایک نئی طرح کی لہر جاگے گی۔ حاضرین اپنی ساری مصروفیات بھول کر میرے معزز مہمانوں کے گرد جمع ہونے لگیں گے۔ ان کی آنکھوں میں حیرت آمیز خوشی ہوگی اور نمی ہوگی۔ اس سارے پنڈال کو ایک جادوئی ہالہ اپنے حصار میں لے لے گا۔

لیکن ایسا کچھ نہیں تھا۔ سب اپنے حال میں مست تھے۔ مشروب چل رہے تھے۔ اٹکھیلیاں ہو رہی تھیں۔ سریلے قہقہے گونج رہے تھے۔ میں اپنے معزز مہمانوں کے ساتھ اپنے لیے مخصوص نشستوں پر جا بیٹھا۔ دیگر مہمانوں کی طرح ہماری خاطر تواضع بھی شروع ہوگئی۔

میں نے دیکھا میرے معزز مہمان کچھ بجھ سے گئے ہیں۔ شاید انہیں بھی یہاں آ کر توقع پیدا ہوگئی تھی کہ انہیں پہچانا جائے گا، ان سے ملا جائے گا، باتیں کی جائیں گی......

اسی دوران میں ملک حشمت صاحب ہماری طرف آتے دکھائی دیے۔ مہنگی کرنڈی کی شلوار قمیص، کریم کلر واسکٹ، ڈائی کی ہوئی اور اُوپر کو اٹھی ہوئی مونچھیں۔ وہ ساٹھ سال کی عمر میں بھی تازہ دم نظر آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ حشمت صاحب کو آتے دیکھا تو میں چوکس ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ میزبان تھے۔ کم از کم انہیں تو اپنے مہمانوں کو ضرور پہچان لینا چاہیے تھا اور مجھے اُمید تھی کہ وہ پہچان بھی لیں گے۔ میں انہیں اپنی طرف آتے دیکھتا رہا۔ میری نگاہیں ان کے چہرے پر رہیں لیکن وہ میری طرف دیکھے بغیر آگے بڑھ گئے۔

میں نے ایک دم کھڑے ہو کر کہا۔ ''ملک صاحب!''

وہ جاتے جاتے ایک لمحے کے لیے رُکے...... مڑے اور مجھ سے مصافحہ کیا۔ میں نے اپنے مہمانوں کی طرف اشارہ کیا۔ ملک صاحب نے اپنی پسوڑی میں جلدی جلدی میرے مہمانوں سے ہاتھ ملایا اور اس فلم ایکٹریس کے استقبال کے لیے لپک گئے جو ابھی ابھی داخلی راستے سے اندر آئی تھی۔ ملک صاحب نے لش پش کرتی ایکٹریس کو بڑی دل جمعی سے خوش آمدید کہا اور کندھے پر ہاتھ رکھ کر ایک دو سرگوشیاں بھی کیں...... پھر وہ آگے نکل گئے۔ کچھ دیگر مرد و زن نے میک اپ زدہ فلم ایکٹریس کو گھیر لیا۔ کچھ چنچل لڑکیاں لڑکے ایکٹریس سے آٹوگراف لینے لگے۔

میں پہلے ہی دل گرفتہ تھا۔ ایک ویٹر کی سرگوشی نے مجھے مزید دل گرفتہ کر دیا۔ اس نے میرے کندھے پر جھک کر ہولے سے کہا۔ ''سر! آپ سوفٹ ڈرنکس ہی لیں گے یا...... میرا مطلب ہے کہ علیحدہ انتظام بھی موجود ہے۔''

مجھے یہ بات گالی محسوس ہوئی۔ میں نے ڈر کر اپنے ہیروز کی طرف دیکھا۔ یقینی بات تھی کہ ان میں سے جو نزدیک تھے انہوں نے ویٹر کی بکواس سنی تھی...... لیکن مجال ہے کہ انہوں نے اپنے تاثرات سے کچھ ظاہر ہونے دیا ہو۔ وہ میری شرمندگی کی وجوہات کو اچھی طرح سمجھ رہے تھے اور خود بھی شرمندہ ہو رہے تھے لیکن اپنے احساس اور اظہار کے درمیان انہوں نے ایک پردہ سا رکھا ہوا تھا۔

میں سوچنے لگا کہ میں بھی تو عام لوگوں جیسا ہی ہوں اور شاید یہاں موجود کئی افراد مرتبے میں مجھ سے کہیں بلند ہیں۔ کون سے سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں مجھ میں۔ تحریک پاکستان کے قائدین کی چند تصویریں گھر میں لگا لینے اور کچھ کتابیں پڑھ لینے سے تو میں دوسروں سے مختلف نہیں ہو سکتا تھا پھر یہ دس سرفروش مجھے کیوں نظر آئے تھے۔ اس سوال کا جواب میری سمجھ میں یہی آیا کہ وہ اس لیے مجھے نظر آئے ہیں کہ میرے مہمان ہیں۔

اسی دوران میں اسٹیج پر کیک کاٹنے کا پروگرام شروع ہو گیا...... نو بیاہتا دُلہوں اور دُلہنوں کی ایک جماعت اسٹیج پر پہنچی اور انہوں نے ہم آہنگ ہو کر شادی کا ایک گیت گایا۔ اس لوک گیت میں شادی کی خوبصورت رسموں کا ذکر تھا۔ جگمگاتی روشنیوں اور لہراتے آنچلوں کا ذکر تھا...... اور اس میں ذکر تھا دُلہا کی پُر شوق نگاہوں کا اور دُلہن کی جھکی ہوئی سنہری پلکوں کا۔

میں نے دیکھا میرے ہیروز دلچسپی سے یہ لوک گیت سن رہے تھے۔ ان میں راشد منہاس اور سوار محمد حسین عمر میں سب

سے چھوٹے تھے۔ خاص طور سے راشد منہاس تو بالکل نوخیز دکھائی دیتے تھے۔ بمشکل اکیس بائیس برس کے۔

گیت سنتے ہوئے ان کی معصوم آنکھوں میں عجیب سی محویت اور دلگداز چمک دکھائی دی۔ میرے دل میں ایک ٹیس اُٹھ کر رہ گئی۔

اسی دوران میں کیک کاٹ دیا گیا۔ تالیوں سے پورا پنڈال گونج اٹھا۔ ''ہیپی اینی ورسری'' کے شور سے ہر طرف ارتعاش پیدا ہوگیا۔ منچلے نوجوان رنگ برنگے غباروں کو پھوڑنے لگے جو شامیانوں سے جھول رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ایک طرف بنے ڈانسنگ فلور پر بہت سی ڈسکو لائٹس جلنے بجھنے لگیں۔ بہت سے جوڑے بانہوں میں بانہیں ڈالے فلور پر آ گئے اور رقص فرما ہوگئے۔ میوزک کی دھادھم سے کانوں کے پردے لرزنے لگے۔ انڈیا سے آئے ہوئے کچھ مہمانانِ خصوصی ایک بڑی میز کے گرد موجود تھے۔ گلوں میں گلاب کے ہار ڈالے وہ بھنگڑا ڈالنے میں مصروف تھے۔ میں نے دیکھا، کچھ لڑکیاں میزوں کے درمیان چکرا رہی تھیں اور تنہا بیٹھے حضرات کو اپنے ساتھ رقص کی دعوت دے رہی تھیں۔ ایک ایسی جواں سال ماڈرن لڑکی ہماری میز کی طرف چلی آئی۔ اس نے چست پتلون پہن رکھی تھی۔ پتلون اور شرٹ کے درمیان کچھ ''علاقہ'' ہیجان خیزی کے لیے خالی چھوڑ دیا گیا تھا۔

شاید وہ کسی مشروب کی ترنگ میں تھی۔ ہیروز کے قریب آ کر بولی۔ ''آپ جنٹلمین میں سے کوئی میرے ساتھ رقص کرنا پسند کرے گا؟''

''نو تھینک یو۔'' سب سے بڑی عمر کے ہیرو نے نگاہیں جھکائے جھکائے کہا۔

''کچھ کہا آپ نے؟'' لڑکی نے ان کے قریب جھکتے ہوئے پوچھا۔

''نو تھینک یو۔'' اس مرتبہ ذرا بلند آواز میں جواب دیا گیا۔

لڑکی لہرا کر گھومی۔ ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ''نو تھینک یو'' اس نے نقل اُتاری۔

اس کے ساتھی کچھ ''ممی ڈیڈی لڑکوں'' نے بھی نقل اُتاری۔ ''نو تھینک یو۔''

یہ شریر نوجوانوں کی ایک بڑی ٹولی تھی۔ وہ سب کے سب مزاحیہ انداز میں بولنے لگے۔ ''نو تھینک یو...... یو تھینک یو۔''

''ہیجان خیز علاقے'' والی لڑکی نے اس صورتِ حال سے لُطف اٹھایا۔ وہ ایکٹنگ کرتے ہوئے اپنے ایک ساتھی سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''آپ میرے ساتھ رقص کرنا پسند فرمائیں گے؟''

نوجوان نے اپنا سر مضحکہ خیز انداز میں جھکایا۔ یہاں تک کہ اس کی کمر قوس کی شکل اختیار کر گئی۔ ''نو تھینک یو'' اس نے نقل اُتاری۔

زوردار قہقہہ پڑا۔ بظاہر یہ ٹولا اپنے حال میں مست تھا۔ لیکن میں جانتا تھا یہ ہیروز کا مذاق اُڑا رہے ہیں۔ میرا خون کھول اٹھا۔ میرا دل چاہا کہ میں اٹھوں اور ان لوگوں پر ٹوٹ پڑوں۔ ان کے گریبان پھاڑ دوں۔ ان کے لمبے بال نوچ لوں۔ انہیں چلا چلا کر بتاؤں کہ وہ کن کا مذاق اُڑا رہے ہیں۔

میں نے اٹھنے کا ارادہ کیا لیکن اس سے پہلے ہی نجانے کس طرح میرے پہلو میں بیٹھے لانس نائیک محمد محفوظ نے بھانپ لیا۔ انہوں نے بڑی متانت سے میرا بازو دبایا۔ ان کے لمس نے مجھے بے جان کر دیا۔ وہ ہولے سے بولے۔ ''نہیں، آپ کچھ نہیں کریں گے۔''

میرا سارا جسم پسینے سے تر تھا۔ میں اپنے ہیروز کو اپنے شہر کی اچھی تصویر دکھانا چاہتا تھا لیکن حقیقت اتنی تلخ اور شرربار تھی کہ ہر پردے کو جلا کر سامنے آ رہی تھی۔ میں زمین میں گڑا جا رہا تھا۔

ورائٹی پروگرام کا ایک حصہ کھانے سے پہلے اور ایک حصہ کھانے کے بعد تھا۔ پہلا حصہ شروع ہوا۔ انڈین گانوں پر واہیات ڈانس شروع ہوگئے۔ ون مین شو کرنے والا ایک کامیڈین پاکستانی اور انڈین فلمسٹاروں کی نقلیں اُتارنے لگا پھر دیگر خرافات شروع ہوگئیں۔ اس سارے پروگرام میں میرے معزز مہمانوں کو بس ایک چھوٹا سا آئٹم اچھا لگا اور یہی آئٹم مجھے بھی اچھا لگا۔ یہ آئٹم آٹھ نو سال کی ایک بچی نے پیش کیا۔ میں اس نابینا بچی کو جانتا تھا۔ یہ میزبان ملک حشمت کی پوتی تھی۔ اپنے خوبصورت سفید گلابی فراک اور لمبی سفید جرابوں میں وہ ایک ننھی پری دکھائی دیتی تھی۔ اس کی آواز سننے سے پہلے ہی اس کی معصومیت نے حاضرین کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اس نے اپنی دلنشین آواز میں بچوں کا ایک گیت گایا۔

سورج کا دروازہ کھلا
ٹھنڈی ٹھنڈی چلی ہوا
جاگو جاگو صبح ہوئی
جاگو جاگو صبح ہوئی

اس کا گیت ختم ہوا تو میرے معزز مہمانوں کے چہروں کو پہلی بار مسکراہٹ دکھائی دی اور پہلی بار انہوں نے تالیاں

بجائیں۔

جوں جوں وقت گزر رہا تھا، میرے سینے میں دھواں بھرتا جا رہا تھا کیونکہ لوگوں کی آنکھوں پر پردے پڑ گئے تھے۔ کیوں وہ اپنے درمیان چمکتے ہوئے ان دس ستاروں کو دیکھ نہیں پا رہے تھے۔ دس "نشانِ حیدر" ان کے درمیان تھے اور وہ اسٹیج کے بھانڈوں کے صدقے واری جا رہے تھے۔ میں دیکھ رہا تھا، میرے ہیروز چہروں سے ظاہر نہیں ہونے دے رہے لیکن اس صورتِ حال نے انہیں بھی مایوس کیا ہے۔ وہ کچھ گم صم سے ہو گئے تھے۔

پتا نہیں کیوں میرا دل چاہا یہ لوگ جلدی سے واپس چلے جائیں اسی دنیا میں جہاں سے آئے ہیں۔ ابھی انہوں نے یہاں کچھ نہیں دیکھا تھا۔ اس شہر کی تصویر کے بہت سے بھیانک رنگ ابھی ان کی نگاہوں سے اوجھل تھے اور یہ اس شہر لاہور کی صورتِ حال ہی نہیں تھی، یہ پورا ملک اپنی "صورتِ حال" کی وجہ سے اہلِ دل کی نگاہوں پر ستم ڈھا رہا تھا۔ ہر طرف نفرت، فرقہ پرستی، ہوس اور دہشت گردی کے دیو ناچ رہے تھے۔

میں سوچنے لگا کہ ہم ڈنر کے فوراً بعد یہاں سے نکل چلیں گے۔ مجھ میں مزید شرمسار ہونے کی سکت نہیں تھی۔ میں میجر طفیل سے اپنا مدعا بیان کرنے کے لیے کوئی مناسب سے الفاظ ڈھونڈ رہا تھا جب اچانک...... یوں لگا کہ پورے کا پورا آسمان ٹوٹ کر ہمارے اوپر گر پڑا ہے۔ یہ ایک نہایت خوفناک دھماکا تھا۔ کچھ دیر کے لیے یوں محسوس ہوا کہ میں کچھ بھی دیکھنے، سمجھنے اور سننے کے قابل نہیں پھر میرے دماغ نے چلّا کر کہا۔ "...... دھماکا ہو گیا ہے۔ گلزار حویلی دھماکے سے اُڑ گئی ہے۔"

ہاں، گلزار حویلی میں قیامت صغریٰ کا منظر تھا۔ لوگ بھاگ رہے تھے، چلّا رہے تھے، ایک دوسرے کو روندتے ہوئے بیرونی راستے کی طرف بڑھ رہے تھے، میزیں اُلٹ رہی تھیں، برتن ٹوٹ رہے تھے۔ میں نے دیکھا اسٹیج کے عقب سے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان شعلوں نے دوسری منزل کی چوبی بالکونیوں کو جا لیا۔ میں نے اس آگ میں سے زخمیوں کو کودتے اور بھاگتے ہوئے دیکھا۔ مجھ سے صرف پندرہ فٹ کے فاصلے پر پتلون شرٹ والی لڑکی شدید زخمی حالت میں پڑی تھی۔ اس کا عریاں پیٹ ایک طرف سے چاک تھا اور اندرونی عضلات جھانک رہے تھے۔ وہ تڑپ رہی تھی اور اس کے ساتھی اسے روند کر گزر رہے تھے۔ اسٹیج کے سامنے ایک فربہ اندام سیاستدان کی

کھوپڑی اُڑ گئی تھی اور وہ گول میز پر یوں اوندھا پڑا تھا جیسے میز سے کان لگا کر کچھ سن رہا ہو۔

میں نے اپنے معزز مہمانوں کو دیکھا۔ وہ بھی بھاگے لیکن وہ لوگوں کی مخالف سمت میں بھاگ رہے تھے۔ وہ آگ اور دھوئیں کی طرف بھاگ رہے تھے۔ وہ موت کے کھلاڑی تھے، وہ مردانِ میدان تھے۔ ان کی زندگی ایسے ہی آتشیں طوفان سے ٹکراتے گزری تھی۔ انہیں دیکھ کر میں بھی زخمیوں کی مدد کے لیے ان کے پیچھے لپکا لیکن پھر مجھے پتلون شرٹ والی زخمی لڑکی کا خیال آیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا، وہ اپنی جگہ موجود نہیں تھی۔ وہ اس شخص کی بانہوں میں تھی جس کا کچھ دیر پہلے اس نے (اور اس کے ساتھیوں نے) مذاق اُڑایا تھا۔ محترم نشانِ حیدر نے اسے اٹھایا اور اسے باہر پہنچانے کے لیے دھوئیں کی دیوار کے پیچھے اوجھل ہو گئے۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ تیز رفتار شعلوں نے دیکھتے ہی دیکھتے حویلی کے بڑے حصے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ جو چند...... صرف چند لوگ جان کو خطرے میں ڈال کر زخمیوں اور لاشوں کو آگ کی لپیٹ سے نکال رہے تھے ان میں میرے معزز مہمان پیش پیش تھے۔ ان کی حرکات و سکنات میں پیشہ ورانہ مہارت اور پھرتی تھی۔ ان کی آنکھوں میں شجاعت کی بے مثال چمک تھی۔ ہاں وہ شجاع تھے، سب کے سب شجاع تھے اسی لیے نشانِ حیدر تھے۔ میں سکتہ زدہ کھڑا رہ گیا۔ میں نے ان شہبازوں کو آگ میں جھپٹتے، پلٹتے اور پھر جھپٹتے دیکھا۔ وہ بڑے بڑے میز پوشوں کو اپنے چہروں اور ہاتھوں پر لپیٹ کر خطرناک ترین جگہوں پر چلے گئے اور زخمیوں کو کھینچ لائے۔

مجھے اپنی بیگم نظر آ گئی تھی۔ وہ بھی میرے لیے بے حد پریشان تھی۔ میں نے اسے چار دیواری سے باہر بھیج دیا۔

اچانک بالائی منزل کے ایک محرابی دریچے سے کسی بچے کے دردناک انداز میں چیخنے کی آوازیں آئیں۔ وہ مدد کے لیے پکار رہا تھا۔ میں نے ملک حشمت کو دیکھا۔ وہ رانیں پیٹ پیٹ کر دُہائی دے رہا تھا اور بالکونی کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ "میری پوتی کو بچاؤ...... میری کرن کو بچاؤ۔"

ہاں، یہ وہی چاند چہرہ بچی تھی جس نے کچھ دیر پہلے اسٹیج پر ایک خوبصورت گیت گایا تھا۔ اب وہ گیت، اس گیت کی آواز اور آواز کی مالک...... سب خطرے میں تھے۔ شعلے بچی کو گھیر رہے تھے۔ وہ دم بدم موت کے منہ میں جا رہی تھی۔ اس کی دادی بے ہوش ہو چکی تھی۔ ایک دوسری عورت آگ میں کودنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لوگ اسے روک رہے تھے۔ یہ بچی کی ماں تھی۔

پھر میں نے دیکھا، میرے معزز مہمانوں میں سے ایک تیزی سے آگے بڑھا۔ وہ دھوئیں کی دیوار کو چیرتا ہوا سیڑھیوں کی طرف لپکا۔ وہ کون تھا...... میں اسے ٹھیک سے دیکھ نہیں سکا۔ شاید یہ وہ تھا جس نے 58ء میں مشرقی پاکستان میں دادِ شجاعت دے کر ایک تاریخ رقم کی تھی یا وہ جس نے 65ء میں بی آر بی کے کنارے مسلسل چار دن تک سینہ تان کر شہر لاہور کا دفاع کیا تھا یا وہ تھا جس نے اپنا طیارہ دشمن کے ہوائی اڈے پر اُتارنے سے انکار کیا اور ایک غدار کو جہنم واصل کرتے ہوئے جام شہادت نوش کیا یا پھر شاید وہ شہسوار جس نے پاک فوج کی اگلی صفوں پر کمک بحال رکھنے کے لیے آگ اور دھوئیں کو چیرا اور سردھڑ کی بازی لگائی اور ہوسکتا ہے یہ وہ ہو جس نے کارگل کی جنگ میں شجاعت کا جھنڈا گاڑا۔ شیر کی طرح دھاڑتا ہوا دشمن کی پوزیشنوں میں گھس گیا اور دیوانہ وار لڑتا ہوا شہید ہوا۔ ہاں، یہ ان جواں مردوں میں سے کوئی بھی ہوسکتا تھا اور اس بات سے بہت فرق بھی نہیں پڑتا تھا کہ وہ ان میں سے کون ہے۔ وہ سب ایک ہی تھے۔ جانبازی اور سرفروشی کی ایک ہی بے مثل کہانی کا حصہ تھے۔ ان کو مشترکہ طور پر ایک ہی نام سے پکارا جاسکتا تھا...... نشانِ حیدر!

وہ چند منٹ گلزار حویلی میں موجود ہر شخص کے لیے بے حد جاں گسل تھے اور سب سے بڑھ کر اس ماں کے لیے جو اپنی بچی کے لیے دیوانہ وار آگ میں کودنا چاہتی تھی اور پھر وہ چند منٹ گزر گئے۔ میرا معزز مہمان دھوئیں کی سیاہ دیوار میں سے برآمد ہوا۔ اس نے کرن کو اپنی مضبوط بانہوں میں چھپا رکھا تھا اور دوڑتا ہوا آرہا تھا لیکن ابھی وہ آگ سے محفوظ دوری پر نہیں پہنچا تھا۔ میرے باقی معزز مہمان بھی ان کی طرف لپکے اور اسے چاروں طرف سے ڈھانپ لیا۔ وہ اس کی خیریت جاننے کے لیے بے چین تھے۔ وہ ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے ہاتھ میں گئی پھر وہ اپنی ماں کے پاس آگئی۔ وہ دم گھٹنے سے نڈھال تھی لیکن حالت خطرے سے باہر نظر آتی تھی۔ کچھ لوگ اسے لے کر ایمبولینس کی طرف دوڑ گئے۔ اس کی ماں خوشی کے آنسو ٹپکاتی ان لوگوں کے پیچھے لپکی۔

☆☆☆

ہم اپنے گھر واپس پہنچ چکے تھے۔ میری بیگم مجھ سے پہلے اپنی گاڑی خود ڈرائیو کر کے آگئی تھی۔ میں اپنے محترم مہمانوں کے ساتھ اسٹیشن ویگن میں پہنچا تھا۔ وہ بالکل گم صم اور افسردہ تھے۔ انہوں نے ٹی وی آن کرلیا تھا۔ نیوز چینل اس دھماکے کی خبر ''بریک'' کرتے ہوئے پھیپھڑوں کی پوری قوت سے چلّا رہے تھے۔ نیوز کاسٹرز نے اپنے اندرونی جوش و خروش کو پیشہ ورانہ افسردگی سے ڈھانپ لیا تھا لیکن ان کا ولولہ آوازوں کی لرزش سے ظاہر ہوتا تھا۔ ایک پھرتیلے چینل نے اس دھماکے کو ''سلسلہ وار دھماکوں'' کے طور پر پیش کرنے کے لیے پچھلے دو سال کے مختلف دھماکے بھی آن ایئر کر دیے تھے۔ اسکرین پر آگ، خون اور انسانی اعضا کے ٹکڑے تھے۔

گلزار حویلی میں مرنے والوں کی تعداد چھ ہوگئی تھی اور نیوز کاسٹر ''بے حد دُکھ'' کے ساتھ توقع کر رہے تھے کہ ابھی یہ نمبرز بڑھیں گے۔

گلزار حویلی سے ہماری یہاں تک واپسی بخیریت ہی ہوئی تھی۔ اس کے سوا کوئی خاص واقعہ نہیں ہوا تھا کہ نہر کے پل کے پار کینال پارک کے تاریک موڑ پر ایک پولیس ناکے پر ہمیں روک لیا گیا تھا۔ حسبِ رواج ایک سب انسپکٹر اور اس کے نصف درجن مسلح ماتحتوں نے ہمیں گھورا تھا۔ ہمارے چہروں پر ٹارچوں کی روشنی پھینکی تھی۔ ہم سے سوال جواب کیے تھے۔ میرے معزز مہمانوں کے حلیے ذرا ابتر تھے۔ دھوئیں کے سبب ان کے چہرے نیم سیاہ ہو رہے تھے اور کچھ کے لباس پر خون کے چھینٹے بھی تھے۔ سب انسپکٹر کی رگِ تفتیش پھڑک اٹھی اور مال بنانے والی بے شمار دفعات اس کے ذہن میں چکرانے لگیں۔ چند لمحے کے لیے لگا کہ وہ ہم سب کو وین سے نیچے اُترنے اور تلاشی دینے کا حکم جاری کرے گا۔

لیکن پھر ایک دم نجانے کیا ہوا...... وہ پیچھے ہٹ گیا اور بے حد مرعوب نظر آنے لگا۔ یہ بات نہیں تھی کہ اس نے میرے معزز مہمانوں کو پہچان لیا تھا (ایسا ہوتا تو مجھے خوشی ہوتی) وہ بس یونہی اچانک ہیبت زدہ ہوگیا تھا۔ بہت متذبذب ہونے کے بعد اس نے اپنے تنومند اہلکاروں کو اشارہ کیا اور وہ میری مبارک گاڑی کے سامنے سے ہٹ گئے۔ ہاں میں اپنی گاڑی کو مبارک ہی کہوں گا۔ اپریل کی اس طلسماتی شب میں میری گاڑی کے اندر اس دھرتی کے مبارک ترین لوگ موجود تھے۔

...... میں اور میری بیگم ساری رات جاگتے رہے۔ اپنی بساط اور بے حد معمولی حیثیت کے مطابق ہم اپنے معزز مہمانوں کی دلجوئی میں مصروف رہے۔ ہم نے ان کی تواضع اور ان کی مہمان نوازی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی لیکن...... وہ خوش نہیں تھے۔ وہ بجھ گئے تھے۔ وہ مجھے ان سیاحوں کی طرح لگے جو ایک لمبے سفر کے لیے گھر سے نکلے ہوں مگر پہلی ہی منزل پر ان کے حوصلے جواب دے گئے ہوں، اب وہ ٹوٹے دلوں کے ساتھ گھر واپس جانے کا سوچ رہے ہوں۔

میں خود کو کوسنے لگا۔ میں ان کو کیوں لے کر گیا گلزار

حویلی۔ کیا لاہور میں اور پاکستان میں کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں وہ جاتے، خوش ہوتے اور اپنی توقعات کو پورا ہوتا دیکھتے۔

ان کے بجھنے سے میں بھی بجھ گیا۔ میرا دل اندر سے رونے لگا۔ میرا دل چاہا میں ان کے قدموں میں گر پڑوں، ہاتھ جوڑ کر ان سے معافی مانگوں۔ ان سے کہوں اس ملک میں جو کچھ اچھا ہے وہ آپ کی وجہ سے ہے، جو کچھ برا ہے اس کے لیے میں قصوروار ہوں اور ہم سب سولہ کروڑ قصوروار ہیں۔ میں ان سے یہ بھی کہوں ...... اس شہر میں جن لوگوں نے آپ کو نہیں پہچانا، انہوں نے اپنی توہین کی ہے، اپنی کم مائیگی سے پردہ اٹھایا ہے۔ جو سورج کو نہیں دیکھ سکتا وہ اندھا ہوتا ہے۔ ہم سب اندھے ہیں۔ ہمارے اندھے پن سے آپ کی لازوال روشنی کا رُتبہ کم نہیں ہوسکتا۔

رات گزر گئی۔ اگلا دن طلوع ہوا۔ میرے محترم مہمانوں کی آنکھوں میں رات کے اندوہناک واقعات کا خیال ایک مہیب غم بن کر ٹھہرا ہوا تھا۔

دوپہر سے کچھ دیر بعد ہی اولین نشانِ حیدر نے اپنی بے حد ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔ ''مسٹر انور! اب ہم جانا چاہتے ہیں۔''

''سر! آپ کے جانے کی بات میرے دل کے ٹکڑے کرتی ہے۔''

''ہم مہمان ہیں اور مہمانوں کو جانا ہوتا ہے۔ آپ نے ہمارے لیے جو کچھ کیا اس کے لیے شکریہ۔'' اولین نشانِ حیدر کیپٹن سرور نے کہا۔

''سر! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں اپنی نظروں میں گر رہا ہوں۔''

راجا عزیز نے کہا۔ ''لیکن جانے سے پہلے ہم اس بچی کی خیریت جاننا چاہتے ہیں جو رات کو آگ میں گھر گئی تھی۔''

''سر! میں ابھی فون پر رابطہ کرتا ہوں۔ پتا کراتا ہوں وہ کہاں اور کیسی ہے؟''

''نہیں، ہم خود اس سے ملیں گے۔'' شیر خان نے گونج دار آواز میں کہا۔

''جیسے آپ کا حکم سر! میں آپ کو اپنے ساتھ لیے چلتا ہوں لیکن پہلے میں معلوم کرلوں کہ وہ کہاں ہے۔''

میں نے کامن روم میں جا کر گلزار حویلی فون کیا۔ وہاں سے مجھے معلوم ہوا کہ بچی میو اسپتال کے البرٹ وکٹر وارڈ میں ہے...... اب وہ ہوش میں تھی اور بات چیت کرسکتی تھی۔

میرے معزز مہمان میرے گھر سے رُخصت ہوئے اور اسٹیشن ویگن کے ذریعے میو اسپتال کی طرف روانہ ہوگئے۔ ایک بار پھر میرے لیے یہ شرمندگی کا سفر تھا۔ میو اسپتال پہنچ کر ہم سیدھے اسپیشل وارڈ کی طرف چل دیے۔ بہت سے لوگ ہمارے آس پاس سے گزر رہے تھے۔ مریض، تیماردار، ڈاکٹر اور نرسیں۔ کوئی یہ نہیں جان سکا کہ ان کے درمیان کون لوگ موجود ہیں۔ البرٹ وکٹر پورشن کے پورچ میں ایک دبنگ قسم کی پجارو جیپ موجود تھی۔ ایک نوجوان سیاستدان اپنے کسی عزیز کی تیمارداری کے بعد گاڑی میں سوار ہو رہا تھا۔ اس کے گرد مسلح گارڈز کا ہجوم تھا۔ لوگ معروف سیاستدان کی جھلک دیکھنے کے لیے جیپ کے گرد اُمڈ آئے تھے۔ ہم ان کے پاس سے ہوتے ہوئے سیڑھیاں چڑھے اور فرسٹ فلور پر گئے۔ کچھ ہی دیر بعد ہم ایک صاف ستھرے کمرے میں ننھی بچی کرن کے بیڈ کے سامنے تھے۔ بچی کے قریب اس کی والدہ اور ایک ملازمہ موجود تھیں۔ باقی رشتے دار باہر بیٹھے تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر نابینا بچی کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا۔ ''دیکھو کرن! تم سے کون ملنے آیا ہے؟''

''کون؟'' اس نے معصومیت سے پوچھا۔

ایک لمحے کے لیے میرے دل میں آیا کہ اسے بتادوں لیکن میری زبان بندی کا حکم ایک دن پہلے جاری ہوگیا تھا۔ میں نے لمبی سانس لے کر کہا۔ ''کرن! یہ وہ ہیں جنہوں نے کل آپ کو اور بہت سے دوسرے لوگوں کو آگ میں سے نکالا۔''

''اوہ!'' کرن نے کہا اور سیدھی ہوکر بیٹھ گئی۔

اس کے دائیں ہاتھ کی اُنگلیاں متحرک ہوئیں جیسے وہ اپنے محسنوں کو چھونا چاہتی ہو۔

وہ سب اس کے قریب آگئے۔ محبت سے اسے دیکھنے لگے۔ اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ میجر عزیز بھٹی کا ہاتھ زیادہ قریب تھا۔ کرن کا ہاتھ ان کے ہاتھ سے چھوا۔ اس نے ہاتھ تھاما۔ عزیز بھٹی نے جھک کر کرن کا ماتھا چوما۔ وہ اپنا نازک ہاتھ جانباز مجاہد کے چہرے پر دوڑانے لگی جیسے اپنے ہاتھ کی مدد سے چہرے کو دیکھ رہی ہو۔ ایک دم اس کے تاثرات بدلے۔ اس کے چہرے پر ہیجانی کیفیت طاری ہوئی۔ وہ عجیب لہجے میں بولی۔ ''آپ کون ہیں؟''

''آپ کو کیا لگتا ہے؟''

''آ...... آپ......'' وہ یکایک بستر پر ہی کھڑی ہوگئی۔

اسے ''اسپرنگ دار گدے'' سے گرنے سے بچانے کے لیے کیپٹن شیر خان اور میجر شبیر شریف نے تھام لیا۔ کرن نے بے حد بے قراری سے ان کے چہروں پر بھی ہاتھ پھیرا۔ اس کے ہونٹ لرزنے لگے۔ ہیجانی کیفیت بڑھ گئی۔ وہ تیزی سے

ایک ایک کے چہرے پر ہاتھ دوڑاتی چلی گئی۔ اس کی سانس تیزی سے چلنے لگی۔ چہرہ رنگ پر رنگ بدلنے لگا۔ آخر وہ بے حد ہیجانی لہجے میں بولی۔ ''یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں۔ آ...... آپ یہاں؟ مم...... میں نے آپ کو پہچان لیا ہے، میں نے آپ کو پہچان لیا ہے۔'' اس کی آواز بے پناہ حیرت اور مسرت کے بوجھ سے لرز رہی تھی۔

میں نے اپنے معزز مہمانوں کی طرف دیکھا۔ ان کے پژمردہ چہروں پر خوشی کی چمک نمودار ہوئی جیسے گہرے تاریک بادلوں سے سورج کی کرنیں پھوٹتی ہیں۔ کرن اب اپنے دونوں ہاتھوں کو بڑی محبت سے میرے معزز مہمانوں کے چہروں پر پھیر رہی تھی۔ وہ ساکت و جامد کھڑے تھے۔ ایک عجیب دلنواز چمک ان کی آنکھوں میں اُتر آئی تھی۔

کرن کا دایاں ہاتھ لالک جان کے چہرے پر تھا۔ ''میں کون ہوں بیٹی؟'' انہوں نے پوچھا۔

''آپ لالک جان ہیں۔ کارگل کے ہیرو!''

''اور میں؟'' راشد منہاس نے پوچھا۔

''آپ پائلٹ آفیسر ہیں۔ راشد منہاس!''

''اور...... آپ میجر طفیل ہیں...... اور آپ راجا عزیز بھٹی ہیں اور آپ سوار محمد حسین ہیں......'' وہ ہاتھوں سے دیکھتی گئی اور بولتی چلی گئی۔ اس نے سب کو پہچان لیا۔ ان کے مکمل نام، ان کے محاذ، ان کی شہادت کا سن۔ میں ششدر کھڑا تھا۔ ایک نابینا بچی ہزاروں بیناؤں پر بازی لے گئی تھی۔ اس کی والدہ بھی ششدر تھی۔ اب وہ بھی اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی تھی اور بے حد تعجب اور بے پایاں عقیدت سے ان ''نشاناتِ حیدر'' کو دیکھ رہی تھی۔ ان دیو قامت انسانوں کے رُعب سے اس کا وجود خشک پتے کی طرح لرزنے لگا تھا۔

معزز مہمانوں کی آنکھوں میں مسرت کے آنسو چمک گئے۔

میرے دل کے اندر سے سوال اٹھا۔ ''کیا صرف یہ بچی ہی قومی ہیروز کو پہچان سکی ہے...... یا سب بچے انہیں پہچان سکتے ہیں؟''

یہ سوال اُبھرنے کے ساتھ ہی مجھے خیال آیا کہ ابھی تک کسی بچے سے میرے معزز مہمانوں کا ٹھیک سے سامنا ہی نہ ہوسکا تھا۔ میرے گھر میں، نہ گلزار حویلی کی تقریب میں، نہ کہیں اور۔

فوراً دل کے اندر سے صدا آئی...... یہ بچی ہی نہیں شاید ہر بچہ اپنے ان قومی ہیروز کو پہچان لے گا اس لیے کہ بچے دل کے سچے ہوتے ہیں۔ ان کی نظر بھی سچی اور شفاف ہوتی ہے۔

البرٹ وکٹر بلڈنگ کے اس کمرے میں بڑا ہی جذباتی منظر تھا۔ کرن کھڑی تھی۔ اس کے اردگرد دس چمکتے ستارے تھے۔ وہ ایک ایک کو چھو رہی تھی، ہاتھ چوم رہی تھی، لپٹ رہی تھی اور ان سب کے چہرے خوشی سے گلنار تھے۔ کرن کی باتوں میں خوبصورت معصومیت اور تازہ ہوا کی خوشبو تھی۔ اس کے لہجے میں ایک ''تابناک مستقبل'' جھلک دکھاتا تھا۔ وہ سنتے رہے۔

میں مؤدب انداز میں کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔ ان میں سے کسی ایک کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ شاید وہ عزیز بھٹی تھے، شاید میجر طفیل تھے یا پھر راشد منہاس...... یا پھر سوار محمد حسین...... اور ہوسکتا ہے کہ شیر خان ہوں۔ بہرحال اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ کون تھے۔ وہ سب ایک ہی تھے۔ جانبازی اور سرفروشی کی ایک ہی بے مثل کہانی کا حصہ تھے۔ ان کو مشترکہ طور پر ایک ہی نام سے پکارا جاسکتا تھا...... نشانِ حیدر۔ کہنے والے نے بڑے جذب کے ساتھ کرن کو مخاطب کیا اور کہا۔ ''آپ صرف کرن نہیں، آپ اُمید کی کرن ہیں۔ جب تک آپ جیسے بچے یہاں موجود ہیں، پُرامید رہنے کا پورا جواز موجود ہے۔ YES, THERE IS NO REASON "TO BE DISAPPOINTED

آواز پھر سے میرے کانوں میں گونجی YES, THERE IS NO REASON TO BE DISAPPOINTED

میں نے اپنے معزز مہمانوں سے مخاطب ہوکر بڑی عاجزی سے کہا۔ ''کیا اب آپ اجازت دے سکتے ہیں کہ میں لوگوں کو آپ کے بارے میں بتاؤں؟''

میرے اس سوال کا جواب مسکرا کر نفی میں دیا گیا۔

......قریباً تیس منٹ بعد دس نشانِ حیدر...... میرے دس معزز مہمان مجھ سے رُخصت ہورہے تھے۔ اسپتال سے واپسی پر انہوں نے میری اسٹیشن ویگن نہر کے کنارے درختوں کے درمیان رُکوائی۔ مجھے مسکراتے چہروں کے ساتھ الوداع کہا اور دُور تک جاتی ہوئی خالی سڑک پر چلنے لگے۔ انہیں یوں دیکھنا ایک روح پرور تجربہ تھا۔ کندھے سے کندھا ملائے وہ چلتے چلے گئے۔ ان کے پسِ منظر میں مغربی اُفق پر شام کی سرخی تھی۔ وہ چلے گئے اور اس سرخی میں مدغم ہوتے گئے۔ میری سماعت میں بار بار ہنستا ہوا ایک رسیلا نغمہ گونج رہا تھا۔

اے راہِ حق کے شہیدو! وفا کی تصویرو!
وطن کی ہوائیں تمہیں سلام کہتی ہیں

نغمہ گونجتا رہا اور وہ سرخی میں اوجھل ہوگئے۔

❄

میرا نام امیر علی ہے۔ عمر 75 سال کے اندر باہر ہے۔ میں نے دنیا کا بہت گرم سرد دیکھا ہے۔ پچھلے قریباً چالیس سال سے میں ایک ہی گھر میں گھریلو ملازم کی حیثیت سے کام کرتا رہا ہوں۔ میرے مالک کا نام تراب فاروقی تھا۔ وہ بہت اچھے ستار نواز تھے اور اس سے بھی اچھے انسان تھے۔ کروڑ پتی تھے لیکن مزاج میں تکلف اور بناوٹ نام کو نہیں تھی۔ گاؤں میں ان کی کافی زمین تھی۔ مسلم ٹاؤن لاہور میں دو کینال کی کوٹھی ''ترابی ہاؤس'' میں رہتے تھے۔ بیوی بیس پچیس سال پہلے فوت ہو گئی تھی۔ دو بیٹے تھے جو انگلینڈ میں رہتے تھے۔ کوئی نو سال پہلے تراب صاحب کا انتقال ہوا تو میرا دل چاہا کہ اس گھر کو چھوڑ چھاڑ کر کہیں دور چلا جاؤں مگر پھر تراب صاحب کی وصیت آڑے آئی۔ انہوں نے وقتِ رخصت کہا تھا کہ میں زندگی کے باقی سال ان دیواروں کے سائے میں ہی گزاروں۔

تراب صاحب کی وفات کے چند سال بعد ان کے بڑے بیٹے ندیم نے پاکستان میں رہائش رکھنے کا فیصلہ کیا تو اس پرانی کوٹھی کو RENOVATE کرنے کی پلاننگ کی ...... کہنے کو تو یہ پرانی کوٹھی کی مرمت و آرائش تھی لیکن حقیقت میں ایک تہائی کوٹھی کو گرا کر نئے سرے سے تعمیر کیا گیا اور باقی عمارت میں بھی بنیادی تبدیلیاں کر دی گئیں۔ اب یہ دو کینال کی کوٹھی ایک بالکل نئی اور جدید عمارت تھی۔

کوٹھی کی اس کایا پلٹ کا کام انجینئر اشفاق چودھری

عرصے کے بعد آپ کے محبوب مصنف کی مختصر جھلک

طاہر جاوید مغل

بسا اوقات انسان جس کامیابی کو اپنی فراست وذھانت کا سبب قرار دیتاھے وہ اس کی نھیں بلکه کسی اور کی رھین منت ھوتی ھے ۔ وہ بھی ایك ماھر فن تعمیرات تھا اور اسے انسانی نفسیات کو سمجھنے کے علاوہ بهت ساری کامیابیوں کا سھرا اپنے سر باندھنے کا دعویٰ بھی تھا

نے انجام دیا تھا۔ اشفاق چودھری ایسے کاموں کا ماہر تھا۔ اس سے پہلے وہ مسلم ٹاؤن کی ایک کوٹھی کو RENOVATE کر چکا تھا۔ یہ کوٹھی تراب صاحب کے مرحوم دوست میاں عادل کی تھی۔ عادل صاحب اور تراب صاحب کی وفات میں صرف ایک برس کا فرق تھا۔ عادل صاحب ایک بڑے ٹیکسٹائل مل کے اونر تھے۔ ان کے اکلوتے بیٹے نے بھی حال ہی میں کوٹھی کی مرمت و آرائش کی تھی اور اسے کافی حد تک خوبصورت اور جدید بنالیا تھا۔ میں یہاں جو واقعہ بیان کرنے جا رہا ہوں اس کا تعلق درحقیقت اسی دوسری عمارت سے ہی ہے۔ اس عمارت کو عادل منزل کہا جاتا تھا۔

یہ دسمبر کی ایک خنک شام تھی۔ دھند شام سے پہلے ہی لاہور کے گلی کوچوں میں اتر آئی تھی۔ انجینئر اشفاق چودھری آج کوٹھی کے آخری معائنے کے لیے آیا ہوا تھا۔ کوٹھی کا کام مکمل ہو چکا تھا۔ آج اشفاق چودھری نے اپنی موجودگی میں آرائشی لائٹس بھی نصب کرادی تھیں۔ امید تھی کہ آج یا پھر کل تک اس کا کام بالکل فائنل ہو جاتا۔ ماربل کے فرش پر لکڑی کا برادہ بکھرا ہوا تھا۔ در و بام میں تازہ رنگوں کی خوشبو اور وارنش کی باس تھی۔ ہم بالائی منزل پر گیس ہیٹر کے سامنے بیٹھے تھے۔ اتنے میں اشفاق چودھری کے موبائل فون کی گھنٹی بجی...... وہ کچھ دیر تک فون سنتا رہا اور اثبات میں سر ہلاتا رہا۔ اس کے چہرے پر خوشی کے تاثرات تھے۔ فون بند کرنے کے بعد اس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا ''چاچا! پتا ہے یہ کس کا فون تھا؟''

''کس کا تھا؟''

''میاں عادل صاحب کے صاحبزادے حمزہ صاحب کا۔''

''کیا کہہ رہے تھے؟''

''کہہ رہے تھے کہ عادل منزل کی مرمت اور آرائش بڑی کامیاب رہی ہے جو ہم چاہتے تھے وہ بالآخر ہو گیا ہے۔''

میں نے پھر سوالیہ نظروں سے اشفاق چودھری کو دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی میری نگاہ کھڑکیوں سے گزر کر دور عادل منزل کی روشنیوں پر پڑی جس کا نیا نام اب عادل لاج رکھ دیا گیا تھا۔ دھند میں لپٹی ہوئی یہ عمارت اپنے اردگرد کی عمارتوں سے جدا نظر آرہی تھی۔ اس کے ڈھانچے میں ایک خاص طرح کی شان و شوکت تھی۔

میں نے کہا ''میں سمجھا نہیں ''مرمت اور آرائش'' کے کامیاب ہونے سے آپ کا کیا مطلب ہے؟''

اشفاق چودھری نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لیا...... اور بولا ''ہم نے عادل منزل کے ساتھ جو کچھ کیا اس کا ایک ہی مقصد تھا۔ کسی طرح اماں جی۔ یہاں سے جانے پر راضی ہو جائیں اور کل وہ یہاں سے چلی گئی ہیں۔ اپنے بیٹے حمزہ کی خواہش کے مطابق ڈیفنس کی بڑی کوٹھی میں شفٹ ہو گئی ہیں۔''

یہ خبر میرے لیے بھی حیران کن تھی لیکن بہت زیادہ نہیں۔ جس عمر رسیدہ خاتون کو اشفاق چودھری ''اماں جی'' کہہ رہا تھا، وہ مرحوم میاں عادل کی بیوی تھیں۔ ان کی عمر ستر سال سے کچھ زیادہ ہی ہوگی۔ نہایت نیک اور خدا ترس عورت تھیں۔ وہ تقریباً پچاس برس پہلے بیاہ کر عادل منزل میں آئی تھیں پھر وہ اور عادل منزل بہت کم ایک دوسرے سے جدا ہوئے تھے۔

میں نے اس خبر پر حیرت کا اظہار کیا تو اشفاق اور بھی خوش نظر آنے لگا۔ اس کی بھوری آنکھوں میں فخر یہ چمک ابھر آئی۔ سگریٹ کے دو تین گہرے کش لے کر بولا۔ ''چاچا امیر علی! تم اماں جی کے بارے میں کیا جانتے ہو؟''

''ہم نوکر لوگ ہیں جی۔ کتنے بھی پرانے ہو جائیں لیکن رہتے تو نوکر ہی ہیں۔ بے شک ہم لوگوں کے پاس معلومات ہوتی ہیں لیکن یہ معلومات زیادہ گہری نہیں ہوتیں۔ جن کو آپ اماں جی کہہ رہے ہیں، ان کا نام زینت بیگم ہے۔ مجھے تو یہی پتا ہے جی کہ زینت بیگم اپنے شوہر میاں عادل کی وفات کے بعد عادل منزل کی وارث تھیں۔ عادل صاحب یہ گھر ان کے نام کر گئے تھے۔ اب زینت بیگم کا بیٹا اور بیٹیاں چاہتی تھیں کہ زینت بیگم ڈیفنس والے نئے گھر میں شفٹ ہو جائیں اور عادل منزل بیچ دی جائے مگر زینت بیگم راضی نہیں تھیں۔ وہ اپنی زندگی کی آخری سانسیں یہاں عادل منزل میں ہی لینا چاہتی تھیں۔''

''تمہاری معلومات درست ہیں چاچا! لیکن اس سے آگے کی بات کا شاید تمہیں پتا نہیں۔ اماں جی یعنی زینت بیگم کو عادل منزل چھوڑنے پر آمادہ کرنا ایک بہت مشکل کام تھا...... اور یہ کام اس خاکسار کی وجہ سے ہو سکا ہے۔'' اشفاق چودھری نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔

وہ بہت خوشگوار موڈ میں تھا اور یوں لگتا تھا کہ اپنے موڈ کی ترنگ میں مجھے بہت کچھ بتانا چاہتا ہے۔ جلد ہی میرا اندازہ درست ثابت ہو گیا۔ صوفے پر تقریباً نیم دراز ہو کر اشفاق چودھری نے کہنا شروع کیا۔ ''یہ تقریباً دو سال پہلے کی بات ہے جب میاں عادل کے صاحب زادے حمزہ سے میری ملاقات جیم خانہ کلب میں ہوئی تھی پھر ہمارے درمیان

تھوڑی سی دوستی بھی ہوگئی۔ حمزہ نے مجھے بتایا کہ وہ اپنی مسلم ٹاؤن والی کوٹھی بیچ کر ڈیفنس میں شفٹ ہونا چاہتا ہے لیکن اس کی بوڑھی والدہ پرانی کوٹھی چھوڑنے پر ہرگز راضی نہیں ہے۔ وہ اس مسئلے کی وجہ سے بہت پریشان تھا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ یہ ایک عام مسئلہ ہے اور کئی گھرانوں میں پایا جاتا ہے...... بزرگوں نے جس چار دیواری میں زندگی کا ایک بڑا حصہ گزارا ہوتا ہے وہ اسے چھوڑنا نہیں چاہتے۔ وہاں ان کی یادیں ہوتی ہیں۔ غمی خوشی کے دھوپ... سائے ہوتے ہیں۔ زندگی کے آخری حصے میں وہ ان درو دیوار کو کھونا نہیں چاہتے۔ یہ ایک خالص نفسیاتی قسم کا مسئلہ ہوتا ہے اور اسے سلجھانے کے لیے بھی نفسیاتی طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ دوسری صورت میں پیچیدگی پیدا ہوتی ہے۔ حمزہ میری باتوں سے متاثر ہوا اور مجھے اپنے گھر عادل منزل لے آیا۔ یہاں میں حمزہ کے مہمان کی حیثیت سے دس پندرہ روز رہا۔ میں نے وقتاً فوقتاً اماں جی سے بات بھی کی اور ان کے خیالات جاننے کی کوشش کی۔ لوگوں کو سمجھنے میں مجھے ہمیشہ سے دلچسپی رہی ہے۔ یہ کام مجھے ''کنسٹریکشن'' اور ''انٹریر ڈیکوریشن'' ہی کی طرح مزیدار لگتا ہے۔ عادل منزل میں اپنے قیام کے دوران میں نے اماں جی یعنی زینت بیگم کو قریب سے جاننے کی کوشش کی۔ ان کے بارے میں میرے پچانوے فیصد اندازے درست نکلے۔ انہیں عادل منزل سے اس لیے محبت تھی کہ یہاں ان کی اور عادل صاحب کی بے شمار یادیں بکھری ہوئی تھیں۔ ہر بالکونی، ہر کمرا، ہر کھڑکی بلکہ پوری کی پوری عمارت یادوں کے گھیرے میں تھی اور صرف عمارت ہی نہیں۔ اس کے اردگرد کا ماحول، گلیاں، مکان، مکین، سب ان کے دل ودماغ پر نقش تھے۔ اپنے شوہر کی موت کے بعد یہ نقش کچھ اور گہرے ہوئے تھے...... اور پچھلے آٹھ دس برسوں میں بالکل

انمٹ ہوگئے تھے...... میں نے حمزہ کو سمجھایا کہ اگر وہ اپنی عمر رسیدہ والدہ کو لیکلخت اس عمارت سے جدا کرنا چاہے گا تو یہ بہت مشکل اور نقصان دہ ہوگا۔ ہاں وہ انہیں بڑی احتیاط کے ساتھ تھوڑا تھوڑا کر کے جدا کر سکتا ہے۔ حمزہ نے پوچھا "وہ کیسے اشفاق صاحب؟"

میں نے کہا۔ "عادل منزل کو بدلتے چلے جائیں اور ڈیڑھ دو برس میں بالکل تبدیل کر دیں۔"

"بات حمزہ کی سمجھ میں آگئی اور ہم نے کام شروع کر دیا۔"

چند لمحے توقف کر کے انجینئر اشفاق چودھری نے نیا سگریٹ سلگایا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا "تمہیں یاد ہی ہوگا چاچا امیر علی! ہم نے عادل منزل کی RENOVATION بڑی سست رفتار سے کی تھی۔ کبھی کوئی بالکونی گرادی، کبھی چند کھڑکیاں تبدیل کر دیں...... برسات کے موسم میں چھت کی لیکیج کا بہانہ کر کے ہم نے دوسری منزل کے پورے چار کمرے گرا دیے تھے اور وہاں سنگ مرمر کے فرش والا کشادہ ٹیرس بنا دیا تھا۔ ہم بڑی احتیاط سے لیکن مسلسل لگے رہے اور قریباً دو سال میں ہم نے عادل منزل کا نقشہ ہی بدل دیا۔ یہ ایک نفسیاتی مسئلے کا نفسیاتی اور بڑا محتاط حل تھا۔ ایک دو مواقع پر اماں جی نے کچھ احتجاج بھی کیا مگر ہم نے اس احتجاج کو سنبھال لیا۔ میری بات سمجھ رہے ہونا تم؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اشفاق چودھری نے آنکھوں میں ذہانت کی چمک لے کر بات جاری رکھی۔ "زینت بیگم کا اکلوتا بیٹا تو زیادہ تر ملک سے باہر ہی رہا تھا۔ بیٹیاں بہت جلدی...... بیاہ کر اپنے گھر کی ہوگئیں...... زینت بیگم کی زندگی کا محور میاں عادل ہی تھے۔ ان کی موت نے دھیرے دھیرے زینت بیگم کو ماضی پرست بنا دیا تھا۔ عادل منزل کے تمام خدوخال میں انہیں اپنا شوہر اور اپنا ماضی نظر آتا تھا لیکن جب دھیرے دھیرے عادل منزل کے سارے خدوخال ہی بدل گئے تو وہ جال بھی ٹوٹ گیا جس نے انہیں اپنی پکڑ میں لے رکھا تھا...... چار چھ ماہ کی تاخیر ضرور ہوئی ہے لیکن نتیجہ وہی نکلا ہے جو ہمیں درکار تھا...... ابھی حمزہ نے فون پر بتایا ہے کہ اماں جی اپنی رضا مندی سے عادل منزل یعنی عادل لاج کو چھوڑ کر گئی ہیں۔"

اشفاق چودھری اپنی بات ختم کر چکا تھا۔ میں نے کہا "آپ کو انجینئر کے بجائے نفسیاتی ڈاکٹر ہونا چاہیے تھا۔" وہ خاموشی سے دھوئیں کے مرغولے چھوڑتا رہا اور کچھ فاصلے پر موجود عادل لاج کی دھند میں لپٹی روشنیوں کو دیکھتا رہا۔ اس کے چونتیس پینتیس سالہ چہرے پر مطمئن مسکراہٹ تھی۔ کچھ ہی دیر بعد اس کی فرم کی گاڑی اسے لینے آگئی۔ وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ساتھ ہی وہ اس خاص موڈ میں سے نکل آیا جس میں ہوتے ہوئے اس نے مجھے یہ ساری تفصیل بتائی تھی۔ اس نے ذرا تیکھی نظروں سے مجھے دیکھا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔ "نوکر کتنا بھی پرانا اور قابلِ عزت ہو جائے لیکن نوکر ہی ہوتا ہے۔ اسے زیادہ کچھ بتانا نہیں چاہیے۔ میں نے تمہیں بتا دیا ہے۔ اب اسے ہضم ہی رکھنا۔"

ہاں نوکروں کو زیادہ کچھ بتانا نہیں چاہیے لیکن بے خبر ہوتے ہوئے بھی ہم جیسے پرانے وفادار نوکروں کو بہت کچھ معلوم ہو جاتا ہے بلکہ اشفاق چودھری جیسے خود ساختہ عالموں فاضلوں سے کچھ زیادہ ہی معلوم ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ظرف مند نوکر یہ سب کچھ اپنے تک محدود رکھتے ہیں۔

میں اشفاق کو رخصت کرنے کے بعد اپنی عمر رسیدہ ٹانگوں کو گھسیٹتا ہوا دوبارہ ہیٹر کے سامنے آن بیٹھا۔ میں نے ایک طویل سانس لیا اور بڑی اداسی کے ساتھ دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ اشفاق چودھری کافی کچھ جانتا تھا لیکن بہت کچھ اسے معلوم نہیں تھا۔ جیسے اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ زینت بیگم ہمیشہ میاں عادل سے ناخوش رہی تھیں۔ وہ کاروباری شخص ہفتوں اور مہینوں گھر سے باہر رہتا تھا اور جب گھر میں ہوتا تھا تب بھی اس کے دل و دماغ پر کاروبار کا قبضہ ہی ہوتا تھا۔ اشفاق چودھری کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ زینت بیگم جوانی میں بہت خوبصورت تھیں اور تنہائی کا شکار بھی...... وہ گھنٹوں عادل منزل کے فرسٹ فلور پر ایک محرابی کھڑکی میں بیٹھی رہتی تھیں اور ہمارے گھر یعنی ترابی ہاؤس کی طرف دیکھتی رہتی تھیں۔

اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ میرے صاحب تراب علی یہاں اس کمرے میں بیٹھ کر ستار بجایا کرتے تھے، جہاں اب میں بیٹھا آگ تاپ رہا تھا۔ ستار بجاتے ہوئے، ان کی نگاہیں اکثر عادل منزل کی محرابی کھڑکی پر لگی رہتی تھیں اور...... اشفاق کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ زینت بیگم کے یہاں سے چلے جانے کی وجہ عادل منزل کا مسمار اور تبدیل ہونا نہیں تھا...... ترابی ہاؤس کا مسمار اور تبدیل ہونا تھا۔ زینت بیگم کی آنکھوں کا تارا عادل منزل نہیں ترابی ہاؤس تھا۔

قریباً پینتیس برس تک پھیلی ہوئی اس خاموشی اور پاکیزہ محبت کی کہانی کے بارے میں اشفاق چودھری کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔

❀

فون کی گھنٹی بجی اور ناخنوں پر پالش لگاتے لگاتے وہ بری طرح چونک گئی۔ اس نے ریسیور اٹھایا اور ایک دم اس کے ذہن میں پلنے والے تمام خدشات جوان ہوگئے۔ دوسری طرف ایاز ہی تھا۔

"ہیلو عینی!" وہ گمبھیر آواز میں بولا "فون بند مت کرنا کیونکہ اس کا فائدہ کوئی نہیں۔ جب تک میں اپنی بات مکمل نہیں کرلوں گا' فون کرتا رہوں گا اور تم بار بار ڈسٹرب ہوتی رہو گی۔"

"تم اپنی بات مکمل کرچکے ہو اور میں تمہیں فیصلہ کن جواب بھی دے چکی ہوں۔" عینی جھنجلا کر بولی۔

"تم پرسوں والی بات کا ذکر کررہی ہو۔ میں آج کی بات کررہا ہوں۔ آج کی بات مختلف ہے۔"

"کیا آج تمہارے اندر انسانیت بیدار ہوگئی ہے۔ تم نے ماضی کی پاداش میں مجھے بلیک میل کرنے کا ارادہ ملتوی کردیا ہے؟"

"نہیں' ایسا تو نہیں ہے لیکن میں نے ایڈجسٹمنٹ کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ میں جانتا ہوں اس ایڈجسٹمنٹ کی ضرورت نہیں تھی۔ تم ایک کروڑ پتی صنعت کار کی بیوی ہو۔ ۵۰ لاکھ روپیہ تمہارے لیے معمولی بات تھی۔ بہرحال تمہاری باتوں پر یقین نہ کرتے ہوئے بھی میں تمہیں رعایت دینے کے لیے آمادہ ہوں۔ اگر تم واقعی چاہتی ہو کہ تمہارا ماضی تمہارے شوہر کی نظروں سے اوجھل رہے تو کل صبح گیارہ بجے تک ۳۵ لاکھ روپے کا انتظام کرلو۔ میں دہرا دیتا ہوں۔ کل صبح گیارہ بجے تک ۳۵ لاکھ روپیہ۔ اس کے ساتھ میں اپنا وعدہ بھی دہرا رہا ہوں۔ جیسے ہی میرے مالی حالات سنبھل گئے' میں تم سے لی ہوئی یہ رقم یکمشت یا قسطوں میں واپس کردوں گا۔"

عینی تلخ لہجے میں بولی "آخر تم یہ کیوں سمجھے بیٹھے ہو کہ میں تمہارے سامنے گھٹنے ٹیک دوں گی۔ میں نے... میں نے کوئی ایسا کام نہیں کیا ہے جس کے لیے مجھے شرمندگی اٹھانا پڑے۔ میرا کردار... میرا کردار صاف ہے۔"

"تمہاری آواز کا کھوکھلا پن خود تمہیں بھی محسوس ہورہا ہوگا عینی ڈیئر! اپنے کردار کے اچھے یا برے ہونے کے بارے میں کوئی شخص بھی خود فیصلہ نہیں کرسکتا۔ اس کا فیصلہ دنیا کرتی ہے۔ یا وہ لوگ کرتے ہیں جن کی اس حوالے سے اہمیت ہوتی ہے مثلاً تمہارا شوہر اختر زمانی... ہاں اختر زمانی فیصلہ کرسکتا ہے کہ تمہارا کردار صاف تھا یا نہیں! اور مجھے یقین ہے کہ اس کا فیصلہ تمہارے لیے خوشگوار نہیں ہوگا۔

ازدواجی رشتہ بہت مضبوط ہوتا ہے... اور بہت نازک بھی۔ بعض اوقات یہ معمولی ٹھیس سے چکنا چور ہوجاتا ہے لیکن اگر اس کی اساس ایثار و وفا اور باہمی اعتماد پر ہو تو بڑے سے بڑا طوفان بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ پاتا۔ ایسے ہی رشتے میں بندھے ایک جوڑے کا احوال۔ ایک فریق تحمل و درگزر کا پیکر تھا تو دوسرا سراپا نادان و ناعاقبت اندیش۔

خبر تحیر عشق سن، نہ جنوں رہا نہ پری رہی ۔ نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی

طاہر جاوید مغل

بے خبری

جب اسے معلوم ہوگا کہ تم میرے ساتھ تفریح گاہوں میں گھومتی رہی ہو، دو دو گھنٹے میرے ساتھ ہوٹل کے فیملی کیبن میں بیٹھی رہی ہو، مجھے محبت نامے لکھتی رہی ہو اور وہ سب کچھ کرتی رہی ہو جو معاملاتِ دل میں اور ایسے حالات میں کیا جاتا ہے تو اس کا ردِّعمل کچھ اچھا نہیں ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اندر سے آگ بگولا ہو جائے گا۔ پھر جونہی تم اسے نظر آؤ گی، وہ شعلہ بن کر تمہاری طرف لپکے گا اور ممکن ہے کہ تمہیں اس قدر دوڑائے کہ تم اس کی زندگی سے نکلنے میں ہی عافیت سمجھو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ بڑی عمر کے شوہر جتنے مہربان ہوتے ہیں اتنے ہی سخت دل بھی ہوتے ہیں۔ انہیں شریکِ حیات کی وفاداری پر شبہ ہو جائے تو زبردست قسم کا انتقام لینے پر تل جاتے ہیں۔"

ایاز کی مسلسل بکواس کو آج ایک ہفتہ ہونے کو آیا تھا۔ عینی اس وقت بری طرح جھنجلا گئی۔ تڑخ کر بولی "مجھے دھمکانے کی کوشش مت کرو ایاز..... میں تمہیں ایک پھوٹی کوڑی نہیں دینے والی۔ تم سے جو ہوتا ہے کرلو۔ زیادہ سے زیادہ کیا کرو گے تم؟ میرے چھ سات برس پہلے کے لکھے ہوئے ایک دو خط میرے شوہر کو دکھا دو گے....؟ دکھا دو۔ مجھے کوئی پروا نہیں۔ ہاں اور وہ خط بھی دکھا دو جس کا تم مجھے اٹھتے بیٹھتے ڈراوا دیتے ہو۔"

"اچھی طرح سوچ لو عینی! تمہارا ماضی بے نقاب ہو جائے گا۔"

"میرے ماضی میں ایسا کچھ نہیں ہے۔" وہ حلق کے بل چیخی۔

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی، پھر ایاز کی ٹھہری ہوئی آواز سنائی دی "اوکے جان! اگر تم ایسا چاہتی ہو تو ایسا ہی سہی۔" اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع ہو گیا۔

عینی کچھ دیر ریسیور ہاتھ میں تھامے بیٹھی رہی اور کانپتی رہی۔ غم و غصے سے اس کی حالت پتلی ہو رہی تھی۔ پھر ریسیور کریڈل پر رکھ کر وہ کمرے میں ٹہلنے لگی.... غصے کی تند و تیز لہر کے بعد اس کے دماغ نے کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ کچھ بے نام سے اندیشے اس کے دل و دماغ پر حاوی ہو رہے تھے اور مستقبل قریب کی شکل اسے بگڑی بگڑی نظر آنے لگی تھی۔ وہ سوچنے لگی اگر واقعی ایاز فون بند کرنے کے بعد اختر زمانی کے پاس اس کے آفس پہنچ گیا تو کیا ہوگا۔ اختر زمانی اس سے بہت محبت کرتا تھا لیکن وہ ایک شوہر کی محبت تھی۔ اس محبت بھرے رشتے کی بنیاد کاغذ کے ایک ٹکڑے پر ہوتی ہے۔ اس ٹکڑے کو پھاڑ دیا جائے تو کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ وہ اختر زمانی کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔ کسی قیمت پر کھونا نہیں چاہتی تھی۔

وہ بے قراری سے اپنی انگلیاں مروڑ رہی تھی اور دبیز قالین پر ٹہل رہی تھی۔ اس کی پیشانی پر پسینہ چمکنے لگا تھا۔ پھر اس نے ایک اہم فیصلہ کیا۔ اس نے الماری سے اپنی چیک بُک نکالی اور واپس فون سیٹ کے پاس آ بیٹھی۔ اس کے پاس ایاز کا نمبر موجود تھا۔ اس نے ایاز کو رنگ کیا مگر وہی ہوا جس کا اسے اندیشہ تھا۔ ایاز کے بجائے فون اس کے کسی ملازم نے اٹھایا۔ ملازم نے بتایا کہ صاحب ابھی اپنی گاڑی پر بیٹھ کر نکلے ہیں۔

عینی کے سینے میں دل برف کا گولہ سا بن کر رہ گیا۔ اس کی چھٹی حس پکار پکار کر اعلان کرنے لگی کہ ایاز گاڑی لے کر اس کے شوہر کی طرف گیا ہے۔ یہ بڑی نازک صورتِ حال تھی۔ اگر عینی کے اندیشے درست تھے تو پھر اس کی ازدواجی زندگی تباہی کے کنارے پر تھی۔ ایک دم جیسے اس کے اندر سے لہر سی اٹھی۔ اس نے چیک بُک اپنے پرس میں ڈالی، پرس کے اندر سے گاڑی کی چابی نکالی اور گیراج کی طرف دوڑی۔

چند ہی لمحے بعد وہ اپنی شیراڈ کار پر تیزی سے اختر زمانی کے آفس کی طرف جا رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ ایاز کو اپنے شوہر تک پہنچنے سے پہلے روک لے۔ جتنی تیز رفتاری سے گاڑی سڑک پر دوڑ رہی تھی اس سے زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ عینی کا ذہن سوچ کی شاہراہ پر بھاگ رہا تھا۔ یہ معکوس سفر تھا۔ اس کے ذہن کا رخ ماضی کی طرف تھا۔ چار پانچ سال پہلے کے واقعات اس کے ذہن میں تازہ ہو رہے تھے۔ عینی اور ایاز ایک دوسرے کو کالج کے زمانے سے چاہتے تھے۔ دونوں خوش حال اور آزاد خیال گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے ملنے جلنے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ وہ گھنٹوں ایک دوسرے کی رفاقت میں رہتے تھے بلکہ ایک مرتبہ تو وہ حیلے بہانے سے ایک ہل اسٹیشن پر بھی اکٹھے وقت گزار چکے تھے۔ ان کے تعلقات دو تین سال تک بخوبی چلتے رہے تھے، پھر بتدریج عینی میں تبدیلی رونما ہونا شروع ہوئی.... اس کی زندگی میں اختر زمانی داخل ہو گیا۔ اختر زمانی، عینی کے والد مرحوم کے ایک دوست کا بہت لائق فائق اور ذہین بیٹا تھا۔ وہ عینی سے کم از کم چودہ پندرہ سال بڑا تھا اور اس کی شادی بھی ہو چکی تھی۔ عینی اس وقت اسکول گرل تھی جب اختر زمانی اپنی بیوی کے ساتھ امریکا چلا گیا تھا۔ وہاں اس نے ملازمت کے ساتھ ساتھ اعلیٰ تعلیم حاصل کی.... ٹیکسٹائل کے کئی اعلیٰ کورسز کیے اور اس شعبے میں نام کمایا۔ امریکا میں قیام کے دوران میں ہی گھریلو جھگڑوں کے سبب اختر زمانی کی اپنی بیوی

سے علیحدگی ہوگئی تھی۔ بعد ازاں یہ علیحدگی طلاق میں بدل گئی۔ اختر زمانی کی صرف ایک ہی بچی تھی جو اس کی بیوی کے پاس ہی رہی۔ اختر زمانی امریکا چھوڑ کر واپس پاکستان آگیا۔ یہاں اس نے ٹیکسٹائل کا اپنا کام شروع کیا' جو بڑی تیزی سے پھلا پھولا اور دو تین سال کے اندر ہی اختر زمانی کا شمار ملک کے اہم صنعت کاروں میں ہونے لگا۔ کچھ تقریبات میں عینی کی ملاقات اختر زمانی سے ہوئی۔ وہ اب ایک ۴۵ سالہ شخص تھا' پیشانی سے بال اڑ چکے تھے۔ وہ پڑھنے کے لیے عینک لگاتا تھا۔ پھر بھی اس کی شخصیت میں کوئی ایسی کشش تھی جو عینی کو غیر محسوس طور پر اپنی طرف کھینچنے لگی۔ وہ اس کشش کو کوئی واضح نام نہیں دے سکی۔ کبھی اسے لگتا کہ اختر زمانی سے اس کا تعلق دوستی کے زمرے میں آتا ہے' کبھی وہ محسوس کرتی کہ ایاز چونکہ اب اسے پہلے والی محبت اور توجہ نہیں دیتا لہٰذا وہ بھی اس سے دور ہوتی چلی جارہی ہے' اور یہ دوری اسے اختر زمانی کے قریب لارہی ہے۔ بہرحال یہی وہ وقت تھا جب وہ قدم بہ قدم اختر زمانی کے قریب ہوتی چلی گئی اور ایاز سے اس کی چار پانچ سالہ رفاقت دھندلا کر معدوم ہوگئی۔ اختر زمانی نرم خو اور دھیمے مزاج کا شخص تھا۔ اس کی محبت ایک پُرسکون ندی جیسی تھی۔ اس کے برعکس ایاز کا پیار اسے تندو تیز کوہی نالے جیسا لگتا تھا۔ کوہی نالا جو ڈھلوانوں سے اترتا ہے تو اچھلتا کودتا اور شور مچاتا لیکن موسم بدلتا ہے تو دیکھتے ہی دیکھتے خشک بھی ہوجاتا ہے۔ بے شک اختر زمانی عمر میں عینی سے کافی بڑا تھا' مگر اس کی یہ کمی اس کی غیر معمولی خوش حالی پوری کرتی تھی۔ وہ نہایت شاندار زندگی گزار رہا تھا۔ کاروبار کے سلسلے میں وہ امریکا اور یورپ کے ٹوریوں لگاتا تھا جیسے لاہور میں جنرل اسٹور چلانے والے اکبری منڈی یا شاہ عالمی جاتے ہیں۔

جلد ہی عینی اور اختر زمانی شادی کے بندھن میں بندھ گئے تھے۔ شروع شروع میں عینی کو اندیشہ تھا کہ ایاز کسی شدید ردِعمل کا اظہار کرے گا مگر شادی کے بعد جوں جوں دن ہفتے اور مہینے گزرتے گئے' عینی کے اندیشے کم ہوتے گئے۔ قریباً ایک برس گزر گیا اور انہی دنوں عینی سے وہ غلطی ہوئی جو... ہرگز نہیں ہونی چاہیے تھی۔ نجانے اس روز عینی کے دل کا موسم کیسا تھا کہ اس نے اپنے پرانے محبوب ایاز کو ایک طویل خط لکھ مارا۔ اس میں پرانی یادوں کو تازہ کیا گیا تھا۔ ان محبت بھرے جذبات کا ذکر تھا جو وہ اب بھی ایاز کے لیے دل میں رکھتی تھی۔ اس خط میں عینی نے بہت سے شکوے بھی کیے تھے۔ ظاہر ہے ان میں سب سے بڑا شکوہ یہی تھا کہ ایاز

نے دیگر "مصروفیات" میں گم ہو کر عینی کو نظر انداز کرنا شروع کردیا تھا جس کی وجہ سے وہ بھی اختر زمانی کی طرف مائل ہو گئی وغیرہ وغیرہ۔ آخر میں اس نے ایاز کو لکھا تھا کہ اب ان دونوں کو چاہیے کہ ایک دوسرے کو ہمیشہ کے لیے خدا حافظ کہہ دیں اور ماضی کی یادوں کو ایک قیمتی اثاثے کی طرح اپنے پاس محفوظ کرلیں۔

ایاز کے نام عینی کے اس آخری خط کو اب قریباً دو سال ہوچکے تھے۔ عینی ان معاملات کو اب قریباً قریباً فراموش کرچکی تھی..... انسان حالات کو فراموش کردیتا ہے لیکن حالات اکثر انسان کو فراموش نہیں کرتے۔ عینی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ اب شادی کے تین سال بعد اچانک ایاز نے عینی سے رابطہ کیا تھا اور اسے بلیک میل کرنے کی کوشش شروع کردی تھی۔ اس نے بزنس کے سلسلے میں گاہے گاہے عینی کے شوہر اختر زمانی سے بھی ملنا شروع کردیا تھا اور کبھی کبھی ان کے گھر بھی آنے لگا تھا۔ اس نے پہلے ڈھکے چھپے الفاظ میں عینی کو بتایا تھا کہ وہ دبئی میں اپنا ذاتی کاروبار شروع کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اور اس سلسلے میں اسے بطور قرض کچھ رقم درکار ہے۔ پھر وہ لگی لپٹی کے بغیر اپنا مطالبہ سامنے لے آیا تھا۔ اس نے عینی سے کہا تھا کہ وہ کسی بھی طرح اس کے لیے پچاس لاکھ روپے کا انتظام کرے اور اگر وہ ایسا نہ کرسکی تو اس کی ازدواجی زندگی خطرے میں پڑجائے گی۔ وہ عینی کے وہ تمام خطوط اختر زمانی کے حوالے کردے گا جو عینی نے اسے شادی سے پہلے لکھے تھے اور وہ خط بھی جو شادی کے بعد لکھا تھا۔

.....یہ تمام خیالات پانچ دس منٹ کے اندر عینی کے ذہن سے گزر گئے۔ اس دوران میں اس کی کار بھی چیئرنگ کراس سے گزر کر فاطمہ جناح روڈ پر آچکی تھی۔ اس کے شوہر اختر زمانی کا آفس اب صرف ڈیڑھ دو کلو میٹر کی مسافت پر تھا۔ عینی نے خاصی تیز ڈرائیونگ کی تھی اور اسے امید تھی کہ وہ ایاز سے پہلے اختر زمانی کے آفس تک پہنچنے میں کامیاب ہوجائے گی..... لیکن جونہی وہ جیل روڈ جانے کے لیے پلازا سنیما والے چوراہے سے بائیں جانب مڑی، ٹریفک جام کے سبب اسے رکنا پڑا۔ کوئی چھوٹا موٹا ایکسیڈنٹ ہوا تھا لیکن ٹریفک دور تک رکی ہوئی تھی۔ عینی کی جھنجلاہٹ اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ وہ ہارن پر ہارن دیتی رہی لیکن نقار خانے میں طوطی کی کون سنتا ہے۔ قریباً آدھ گھنٹے بعد وہ اس "ٹریفک جام" سے نکل سکی۔ جس وقت وہ اپنے شوہر کے آفس پہنچی، اسے گھر سے نکلے ہوئے قریباً ایک گھنٹا ہوچکا تھا۔ آفس سے باہر پارکنگ میں ایاز کی سرخ سوزوکی کار دیکھ کر اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس کے بدترین اندیشے حقیقت کا روپ دھار چکے تھے۔ غم و غصے کی ایک بلند لہر اس کے اندر سے اٹھی اور اس کا دل چاہا کہ وہ اندر جاکر ایاز پر ٹوٹ پڑے۔ اس کی جان لے لے یا اپنی جان دے دے۔ مگر یہ صرف ارادہ تھا، اسے عملی جامہ پہنانا اتنا آسان نہیں تھا۔

وہ کار سے اتری اور اپنے آپ میں کھولتی ہوئی آفس کی طرف گئی۔ ابھی وہ دروازے سے آٹھ دس قدم دور ہی تھی کہ آفس کا دروازہ کھلا اور اس نے ایاز کو دیکھا۔ وہ اختر زمانی سے رخصت ہو کر باہر نکل رہا تھا۔ اس کے چہرے پر نظر آنے والی مدھم مسکراہٹ عینی کو دنیا کی کریہہ ترین مسکراہٹ محسوس ہوئی۔ ایاز نے عینی کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ عام سے انداز میں ایک ستون کی اوٹ میں ہو گئی۔ اس کے ذہن میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ پیش آنے والے لمحات کا پورا نقشہ اس کے ذہن میں کھنچ گیا تھا اور یہ نقشہ اتنا بھیانک تھا کہ عینی کی پیشانی پر ابھی سے پسینے کی بوندیں چمکنے لگی تھیں.....

اختر زمانی ٹیکسٹائل کا کام کرتا تھا اور ایاز کا کام ایڈور ٹائزنگ کا تھا۔ عینی جانتی تھی کہ وہ اپنے کام کے سلسلے میں کبھی کبھار اختر زمانی سے ملتا رہتا ہے۔ اس کے ذہن میں یہ خوش خیالی جنم لینے لگی کہ شاید..... شاید وہ اپنے کسی کام کے سلسلے میں ہی اختر زمانی سے ملنے آیا ہو۔ لیکن اس خوش خیالی کی عمر سیکنڈ سے زیادہ نہیں تھی۔ یہ تو کبوتر کی طرح بلی کو دیکھ کر آنکھیں بند کرنے والی بات تھی۔ جو کچھ ہونا تھا وہ تو اب ہونا ہی تھا۔ عینی نے اپنے ڈولتے ہوئے دل و دماغ کو سنبھالا اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے آفس کی طرف بڑھی۔ دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوئی۔ اس کا شوہر اپنی وسیع و عریض میز کے پیچھے خاموش بیٹھا تھا۔ اس کی نگاہیں ایک کھلی ہوئی فائل پر تھیں لیکن چہرہ بتا رہا تھا کہ اس کا ذہن کہیں بہت دور ہے۔

عینی کو دیکھ کر وہ چونکا۔ کچھ دیر ساکت نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر گمبھیر آواز میں بولا "عینی! تم یہاں؟"

عینی نے جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے شوہر کے سامنے بیٹھ گئی اور پرس اپنی گود میں رکھ لیا۔ وہ جانتی تھی کہ اس خاموشی کے پیچھے ایک طوفان ہے، جو کسی بھی وقت بپھر کر سامنے آسکتا ہے۔ لمحے صدیوں پر بھاری تھے۔ اختر زمانی کی نگاہیں بیوی کے حسین چہرے پر تھیں۔ وہ نگاہیں جھکائے بیٹھی تھی۔ جسم کے ہر مسام سے پسینہ ابل پڑا تھا۔ اختر زمانی نے ایک بار پھر گمبھیر آواز میں اسے مخاطب کیا "عینی! کیا بات

ہے۔ تم کچھ۔۔۔ پریشان لگ رہی ہو۔"

اس نے شوہر کی آنکھوں میں جھانکا اور بے ساختہ اس کے ہونٹوں سے نکلا "زمانی! آپ چھپانے کی کوشش کیوں کررہے ہیں؟ ایاز نے آپ سے کیا بات کی ہے؟"

اختر زمانی نے حیرت سے کہا "کیسی بات؟"

"وہی بات، جو ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ دونوں کے درمیان ہوئی ہے۔"

اختر زمانی کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں ابھریں "بھئی! میں تمہاری بات سمجھ نہیں پارہا۔ ایاز کام کے سلسلے میں ہی میرے پاس آیا تھا۔ وہ دبئی میں ایک ایڈورٹائزنگ کمپنی کھولنے کا ارادہ رکھتا ہے' اس بارے میں بات کررہا تھا۔ مجھ سے اسائن منٹ وغیرہ کی توقع کررہا ہے۔"

عینی کی آنکھیں شوہر کی آنکھوں میں گڑی ہوئی تھیں۔ وہ آنکھوں کے راستے اس کے دل تک پہنچنے کی کوشش کررہی تھی۔ وہ اپنے چہرے کو نارمل رکھے ہوئے تھی لیکن اس کے دل و دماغ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے۔ کیا واقعی ایسا ہوچکا تھا۔ کیا واقعی ایاز نے اختر زمانی کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ کیا یہ محض ایک اتفاق تھا کہ وہ عینی کو دھمکی آمیز فون کرنے کے فوراً بعد اختر زمانی کے آفس چلا آیا تھا اور اس سے تنہائی میں ملاقات کی تھی۔ عقل یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھی لیکن صورتِ حال اسی سمت میں اشارہ کررہی تھی۔

اختر زمانی نے تھرماس میں سے ٹھنڈا پانی نکالا اور گلاس عینی کے سامنے رکھا "تم بے حد اپ سیٹ نظر آرہی ہو ڈارلنگ۔۔۔ کیا ایاز کے ساتھ کوئی بات ہوئی ہے۔ مم۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ تم دونوں تو ایک دوسرے کو ٹھیک سے جانتے بھی نہیں ہو۔ پھر کیا مسئلہ ہوگیا ہے تمہارے بیچ؟"

عینی نے بڑی کوشش سے خود کو سنبھالا۔ ایک گہری سانس لے کر بولی "نہیں۔۔۔ ایسی کوئی خاص بات نہیں ہے۔"

"مگر تم نے ابھی کہا ہے کہ ایاز نے مجھے کوئی خاص بات بتائی ہے اور میں اسے چھپانے کی کوشش کررہا ہوں۔"

وہ سٹپٹا گئی "پتا نہیں۔۔۔ میرے دماغ میں خوامخواہ کیا وہم آگیا تھا۔"

"چلو وہم ہی سہی ڈارلنگ۔۔۔ مگر بتاؤ تو۔"

عینی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہے۔ وہ کراہتے ہوئے بولی "میں آپ کو بتاؤں گی زمانی۔۔۔ لیکن پلیز۔۔۔ ابھی مجھے مجبور مت کریں۔۔۔"

"تم مجھے الجھن میں ڈال رہی ہو۔"

"اوہ کم آن زمانی۔۔۔ یہ کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے۔ پلیز ٹیک اٹ ایزی۔" اس نے شوہر کے ہاتھ اپنے ملائم ہاتھوں میں تھام لیے اور موضوع بدلنے کی بھرپور کوشش کرنے لگی۔

○☆○

گھر آکر عینی مسلسل یقین اور بے یقینی کے درمیان ڈولتی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ایاز نے اس کے شوہر سے ہنگامی ملاقات کرنے کے باوجود اپنی دھمکی کو عملی جامہ کیوں نہیں پہنایا۔۔۔ کیا ایاز خود بھی تذبذب کا شکار تھا۔ یا پھر کاری وار کرنے کے لیے وہ کسی بہتر موقع کا انتظار کرنا چاہتا تھا۔ عینی جانتی تھی کہ ایاز کے ہر کام میں زبردست پلاننگ ہوتی ہے اور وہ قدم اٹھانے سے پہلے سیکڑوں مرتبہ سوچتا ہے۔۔۔ اس کے علاوہ ایک اور امکان بھی ہوسکتا تھا اور وہ یہ کہ عینی کو دھمکی آمیز فون کرنے کے بعد ایاز غصے میں بھرا ہوا اختر زمانی کے پاس آیا ہو لیکن یہاں حسبِ معمول اختر زمانی نے کوئی ایسی کاروباری بات کہہ دی ہو جس میں ایاز کو فائدہ ہی فائدہ نظر آیا ہو۔ لہٰذا اس نے فی الوقت اپنی دھمکی پر عمل کرنے کا ارادہ ترک کردیا ہو۔ ایسے ہی مختلف امکانات موجود تھے۔

شام کو اختر زمانی گھر آیا تو بالکل ہلکے پھلکے موڈ میں تھا۔ عینی اسے کھوجنے والی نظروں سے دیکھتی رہی مگر اس کے رویّے میں کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آئی۔ اختر زمانی ہلکے پھلکے موڈ میں ہوتا تھا تو میوزک سنتا تھا۔ اپنی طرح اسے میوزک بھی "سوبر" قسم کا ہی پسند تھا۔ پختہ گائیکی کے بیچ والے گانے' اساتذہ کی غزلیں یا پھر کبھی کبھار کلاسیکل پرانے فلمی نغمے۔ اس نے ٹیپ ریکارڈر آن کیا تو ایک کلاسیکل پاکستانی نغمہ بجنے لگا۔ بھولی ہوئی ہوں داستاں گزرا ہوا خیال ہوں۔ ایسے نغموں سے عینی کو چڑ تھی۔۔۔ ٹائی کی گرہ ڈھیلی کرتے ہوئے اختر زمانی کا دھیان اپنے بریف کیس کی طرف چلا گیا۔ وہ بریف کیس کھولتے ہوئے بولا "میں بھول ہی گیا۔ ہماری شادی کی سالگرہ پر ایاز یہ کارڈ دے گیا تھا ہمارے لیے۔"

عینی نے لرزتے ہاتھوں سے کارڈ تھام لیا۔ یہ ایک خوب صورت "ویڈنگ ڈے" کارڈ تھا۔ نیچے ایاز کے دستخط تھے۔ کارڈ دیکھ کر عینی کے جسم میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ وہ اس معاملے کو ایک بالکل دوسرے رنگ میں دیکھ رہی تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ اس کارڈ کے ذریعے ایاز نے اسے دھمکی آمیز پیغام پہنچایا ہو۔ اس نے عینی کو بتایا ہو کہ دیکھو آج دوپہر تمہیں فون کرنے کے بعد میں تمہارے شوہر کے پاس گیا

تھا' اس سے باتیں بھی کی تھیں' لیکن وہ بات نہیں کی جو تمہاری ازدواجی زندگی کو تباہ و برباد کر سکتی ہے۔ لہٰذا ابھی بھی وقت ہے' سنبھل جاؤ۔

اگلے روز بھی عینی کا دل انجانے خدشے کے تحت دھڑکتا رہا۔ اسے ڈر تھا کہ ایاز کا فون پھر آئے گا' لیکن شام تک خیریت گزری' فون نہیں آیا۔ شام کو اختر زمانی...... گھر آیا... تو خاموش خاموش تھا۔ عینی نے اس کے لیے چائے بنوائی' ہلکی پھلکی باتیں کیں اور پھر دونوں ٹہلنے کے لیے لان میں چلے گئے "تم نے مجھے کل سے الجھن میں ڈال رکھا ہے۔" اختر زمانی نے بجھے بجھے لہجے میں کہا "یا تو آدمی کو بات کرنی نہیں چاہیے یا پوری کرنی چاہیے۔"

"کیسی بات ؟" وہ جانتے بوجھتے انجان بن گئی۔

"وہی بات جو کل آفس میں ہوئی تھی۔ میرا نہیں خیال کہ تم اتنی جلدی بھول گئی ہو۔" اختر زمانی کے لہجے میں خفگی تھی۔

عینی نے ایک سیکنڈ کے لیے اختر زمانی کو گہری نظروں سے دیکھا' پھر ایک دم اس کے تاثرات بدلے اور وہ قہقہہ لگا کر ہنس دی۔ اس کی شوخ چلبلی ہنسی کسی فوارے کی پھوار کی طرح لان میں بکھرتی اور پھیلتی چلی گئی۔ اختر زمانی نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔ عینی نے ایک انداز دلربائی سے شوہر کا بازو تھاما اور اپنا رخسار اس کے کندھے سے لگا دیا۔ "کبھی کبھی تو آپ بھی میری طرح خبطی ہو جاتے ہیں۔ چھوٹی سی بات کو لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔"

"چھوٹی سی بات تھی تو پھر تم بھاگی ہوئی میرے دفتر کیوں چلی آئی تھیں؟"

"ڈارلنگ' میں نے کہا ہے ناں کہ میں تو خبطی ہوں۔ لیکن پلیز آپ تو ایسے نہ بنیں۔"

"مگر ہوا کیا تھا؟" اختر زمانی نے سٹپٹائے لہجے میں پوچھا۔

وہ پھر دلنشیں انداز میں ہنس دی "جان! بات تو کچھ زیادہ اہم نہیں تھی لیکن پتا نہیں کیوں مجھے آپ سے ڈر لگنے لگا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ آپ خفا ہوں گے لہٰذا پاگلوں کی طرح بھاگی ہوئی آپ کے پاس چلی آئی۔"

"بھئی بات بھی تو بتاؤ ناں کہ کیا تھی؟"

"ناراض تو نہیں ہوں گے؟"

"ٹھیک ہے' نہیں ہوں گا۔"

"میں نائیلہ کے گھر گئی تھی۔"

"اچھا وہی تمہاری گلبرگ کالونی والی سہیلی۔"

"جی ہاں۔ ایاز نے مجھے اس کی کوٹھی سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ اپنی سوزوکی کار میں تھا اور کار کا رخ تھا جناب عالی! آپ کے آفس کی طرف۔ مجھے لگا کہ یہ مخص جاتے ہی آپ کو اس بارے میں بتائے گا اور آپ آگ بگولا ہو جائیں گے۔۔۔ پورے کے پورے۔۔۔ سر سے پاؤں تک۔۔۔ جیسے پچھلی دفعہ ہوئے تھے۔"

"پچھلی دفعہ کب؟"

"ہاں آپ کو کب یاد ہوگا۔ روتی تو میں رہی تھی رات بھر۔۔۔ سالگرہ تھی نائیلہ کی۔ آپ سے ڈرتے ہوئے آپ کو بتایا بھی نہیں تھا۔ صرف آدھے گھنٹے کے لیے چلی گئی تھی۔ اسی "ایاز صاحب" نے دیکھ لیا تھا اور آپ سے ذکر کر دیا تھا۔ آپ نے گرج گرج کر آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔"

اختر زمانی بولا "گرجنے برسنے کو تو اب بھی دل چاہ رہا ہے لیکن تم سے خفا نہ ہونے کا وعدہ کیا ہے لہٰذا چپ رہنے پر مجبور ہوں۔ باقی یہ بات اپنی جگہ حقیقت ہے کہ مجھے اس لڑکی سے چڑ ہے۔ اور اس جیسی جو اور دو تین تمہاری سہیلیاں کہلاتی ہیں' ان سے بھی چڑ ہے۔ اور یہ کوئی ذاتی عناد نہیں ہے' اصولی اختلاف ہے۔۔۔ عینی! عورت کا اصل مقام اس کا گھر ہے اور شرم و حجاب اس کا زیور ہے۔ نت نئے فیشن کر کے لور لور پھرنے والی لڑکیوں کو میں تو سر آنکھوں پر بٹھانے کے حق میں نہیں ہوں۔۔۔ میں مانتا ہوں کہ تم نائیلہ اور اس جیسی دوسری لڑکیوں سے مختلف ہو۔ لیکن یہ انفرادیت تا دیر برقرار نہیں رہتی۔ انسان جن لوگوں میں اٹھتا بیٹھتا ہے ان کا رنگ اس پر چڑھتا ضرور ہے۔"

"ڈارلنگ! وہ بھی تو میرے پاس اٹھتی بیٹھتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ میرا رنگ ان پر چڑھ جائے۔"

"یہ عمل یک طرفہ نہیں ہوتا۔ انسان اپنے ملنے جلنے والوں سے کچھ لیتا ہے تو دیتا بھی ہے۔ اور دیتا ہے تو لیتا بھی ہے۔ اور میں نہیں چاہتا کہ ان لڑکیوں کا رنگ ڈھنگ تمہارے اندر نظر آنے لگے۔ اب تمہارے دو تین لباس ایسے بھی ہیں جو مجھے بالکل پسند نہیں اور میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ لباس اپنانے میں تم نے شعوری یا لاشعوری طور پر اپنی ان سہیلیوں کو FOLLOW کیا ہے۔ پلیز ناؤ اسٹاپ اٹ۔ بہت ہو چکی ہے اب۔۔۔ مجھ پر اور میری محبت پر رحم کرو۔"

آخری الفاظ اختر زمانی نے تقریباً مسکراتے ہوئے کہے تھے' لہٰذا عینی کی چڑھی ہوئی تیوریاں اتر گئیں۔ ویسے بھی وہ اندر سے تو خوش ہی تھی کہ اس کا ایک بدترین اندیشہ باطل ثابت ہو گیا تھا۔

اس کے بعد آنے والے ہر دن میں عینی کی بے چینی کم ہوتی گئی۔ اختر زمانی نے اسے مزید کریدنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ دوسری طرف ایاز کی طرف سے بھی دوبارہ رابطہ قائم نہیں کیا گیا تھا۔ عینی دل ہی دل میں دعا گو رہنے لگی کہ حالات جوں کے توں رہیں اور ایاز اپنے پروگرام کے مطابق دبئی شفٹ ہوجائے۔ انگریزی کا یہ مقولہ ان دنوں عینی کو بہت اچھا لگ رہا تھا کہ کسی خبر کا نہ ہونا ایک اچھی خبر ہے۔

اور پھر ایک روز سچ مچ عینی کی سن لی گئی۔ اپنی سہیلی نائیلہ ہی کی زبانی عینی کو پتا چلا تھا کہ ایاز دو ہفتے پیشتر دبئی جاچکا ہے اور وہاں ایڈورٹائزنگ ایجنسی کی داغ بیل ڈال رہا ہے۔ اس اطلاع کے بعد عینی نے سکھ کا سانس لیا تھا۔ اس کی یہ امید بندھ گئی تھی کہ اب شاید ایاز کی پریشان کن آواز اس کے کانوں میں کبھی نہ پڑے۔۔۔

وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزرتا رہا۔ اختر زمانی کے ساتھ ازدواجی بندھن میں بندھے ہوئے عینی کو اب پانچ چھ سال ہونے کو آئے تھے، تاہم ان کی کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ شاید ایک وجہ عینی کا لاابالی پن اور آزاد خیالی تھی۔ وہ ایک ایسی سوسائٹی میں موو کرتی تھی جسے اختر زمانی اچھا نہیں سمجھتا تھا۔ وہ بے حد سنجیدہ، راست گو اور کسی حد تک مذہبی بھی تھا۔ وہ عورت کے چراغ خانہ ہونے پر یقین رکھتا تھا اس کا شمع محفل ہونا اسے ہرگز قبول نہیں تھا۔ عینی کے خیالات برعکس تھے، بہرحال اس سلسلے میں حدود و قیود کو وہ بھی اہمیت دیتی تھی۔ میاں بیوی دونوں نے تھوڑا تھوڑا ایڈجسٹ کیا تھا اور تھوڑے تھوڑے تناؤ کی کیفیت میں ان کی ازدواجی زندگی کی گاڑی کسی نہ کسی طور گھسٹتی ہی جارہی تھی۔ کسی وقت جب عینی تنہا ہوتی تو اس کے پردۂ تصور پر ایاز کی شبیہہ ابھر آتی اور وہ واقعات تازہ ہوجاتے جو تین برس پہلے اس حوالے سے رونما ہوئے تھے۔ وہ یہ سوچ کر کانپ جاتی کہ اگر اس روز ایاز جوشِ غضب میں سچ مچ اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنا دیتا تو کیا ہوتا۔ وہ اختر زمانی کو اب بہت اچھی طرح جاننے لگی تھی۔ وہ اس سے شدید محبت کرتا تھا لیکن یہ محبت اس کے اصولوں سے مشروط تھی۔ اگر اسے وہ سب کچھ معلوم ہوجاتا جو ایاز بتانے جارہا تھا تو اس کا ردِعمل یقیناً شدید اور نتیجہ خیز ہوتا۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں تھی کہ میاں بیوی کے راستے جدا ہوجاتے۔ حالانکہ اس حوالے سے عینی نے اپنی پوزیشن بڑی ذہانت سے صاف کرلی تھی۔ اور اپنی طرف سے شوہر کو پوری طرح مطمئن کردیا تھا۔ پھر بھی کبھی کبھی اسے محسوس ہوتا تھا کہ اختر زمانی کے دل کی گہرائی میں کہیں شک کا موہوم سا یہ موجود ہے۔ ممکن تھا کہ اس شک کی وجہ۔۔۔ وہ سوال ہو جو اس روز اچانک عینی کے منہ سے نکل گیا تھا جب وہ بھاگم بھاگ آفس پہنچی تھی تو اس نے ایاز کو اپنے شوہر کے آفس سے نکلتے ہوئے پایا تھا۔ عینی نے بے ساختہ شوہر سے پوچھ لیا تھا کہ ایاز اس سے کیا بات کرکے گیا ہے۔ عینی نے کئی بار سوچا تھا کہ اگر اس روز یہ سوال اس کے منہ سے نہ نکلتا تو اچھا تھا۔ بے شک بعد میں عینی نے اپنے اس سوال کی بھی وضاحت کردی تھی مگر کہیں کوئی کمی ضرور رہ گئی تھی۔

۔۔۔اختر زمانی پہلے ہی عینی سے عمر میں بڑا تھا۔ کاروباری مصروفیات، ذہنی پریشانیوں اور تفریح کی کمی نے اس کے بال کچھ سفید کردیے اور میاں بیوی کی عمر میں موجود فرق زیادہ نمایاں نظر آنے لگا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اختر زمانی کی اصول پسندی میں اضافہ ہوگیا تھا جبکہ عینی نے اپنے آپ کو بدلنے کی مطلق کوشش نہیں کی تھی بلکہ یوں لگتا تھا کہ وہ اپنے سیلانی پن اور آزاد خیالی میں کچھ اور آگے نکل گئی ہے۔ میاں بیوی کے باہمی روابط بہت کمزور ہوچکے تھے اور کبھی کبھی تو وہ ہفتوں ناشتے کی میز پر بھی نہیں ملتے تھے۔ گھریلو فضا مکدر ہونے کی وجہ سے اختر زمانی کے مزاج میں ہلکا سا چڑچڑا پن آگیا تھا اور اس چڑچڑے پن کی وجہ سے عینی گھر اور شوہر سے کچھ اور بھی لاتعلق ہوگئی تھی۔ ان کی ازدواجی زندگی کو متاثر کرنے میں اولاد کی کمی بھی اپنا کردار ادا کررہی تھی۔ انہوں نے کافی علاج معالجہ کرایا تھا، طبی نقطۂ نظر سے میاں بیوی ٹھیک ہی تھے پھر بھی ابھی تک اولاد کی نعمت سے سرفراز نہیں ہوسکے تھے۔ کسی ویران رات کو جب میاں بیوی ایک ہی کمرے میں ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے سیکڑوں ہزاروں میل کے فاصلے پر ہوتے تو عینی ایک دم بہت اداس ہوجاتی۔ اسے لگتا جیسے وہ اپنے شوہر کے ساتھ نہیں کسی کلاسیکل غزل کے ساتھ لیٹی ہوئی ہے۔ دھیمے سُروں میں گائی ہوئی ایک ایسی شاعری جس میں بہت کم اتار چڑھاؤ ہیں۔ ایسے میں ایاز کا چہرہ پوری آب و تاب سے اس کے تصور میں دمکنے لگتا۔ اس کی محبت اسے یاد آتی۔ کوہی نالے جیسی پُرشور، پُرجوش اور دل و دماغ میں تہلکہ مچاتی ہوئی۔۔۔ وہ راز و نیاز، وہ نرم گرم شوخیاں، وہ جسارتیں۔۔۔ اسے اندازہ ہوتا کہ ایاز کو کھو کر اس نے بہت کچھ کھویا ہے۔ امنگ ترنگ سے بھرے ہوئے ایک دریا کے کنارے سے اٹھ کر وہ ایک ٹھہرے ہوئے پانی کے پاس آبیٹھی تھی اور زندگی کے چھ سات سال گزار دیے تھے۔ یہ پانی ایک شفاف ساکن جھیل جیسا ضرور تھا مگر اب وہ یہ شفاف ساکن منظر دیکھ دیکھ کر تنگ

آچکی تھی۔ یہ منظر اب اس کی نگاہوں میں گدلا ہونے لگا تھا۔

ہر شخص میں خوبیوں کے ساتھ ساتھ خامیاں بھی ہوتی ہیں۔ اختر زمانی میں بھی کئی خامیاں تھیں۔ اب یہ خامیاں عینی کی نگاہ میں بری طرح کھٹکتی تھیں۔ ان میں سے ایک خامی یہ تھی کہ وہ ماحول سے مطابقت پیدا نہیں کرپاتا تھا۔ اس کی مزاحمت بے شک دھیمی اور شائستہ رہتی تھی لیکن یہ مزاحمت جاری رہتی تھی۔ اب عینی کی دوستوں والا معاملہ ہی دیکھا جاتا تو اس میں اختر زمانی بدستور مزاحمت پیش کررہا تھا اور اس میں کبھی بھی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ وہ اپنے اچھے یا برے اصولوں کو سینے سے لگا کر رکھنے والے شخص کے طور پر سامنے آیا تھا۔ عینی جب ایاز کے بارے میں سوچتی تو ایک بالکل مختلف صورتِ حال اس کے سامنے آتی۔ ایاز نے عینی کی خاطر ماحول سے کتنی زبردست مطابقت پیدا کی تھی اور اپنے پر جبر کرکے خود کو حالات کے مطابق ڈھال لیا تھا۔ یہ ایک اٹل حقیقت تھی کہ اس کے پاس عینی کو بلیک میل کرنے کے لیے کافی مواد موجود تھا۔ وہ تھوڑی سی کوشش کرتا تو عینی سے خطیر رقم بٹور سکتا تھا اور نہ بٹور سکتا تو اس کی زندگی کو تہ و بالا کرسکتا تھا لیکن قدرت رکھنے کے باوجود وہ اس انتہا تک نہیں گیا تھا اور خاموشی سے پسپائی اختیار کرلی تھی۔ وہ محبت کو رسوا کرنے کے فعل سے باز رہا تھا اور عینی کو اس کے حال پر چھوڑ کر دبئی چلا گیا تھا۔

کئی ہفتوں بلکہ مہینوں کے لیے عینی کو یوں محسوس ہوا کہ جیسے اس کی سوچیں اپنے شوہر اور اپنے سابقہ محبوب کے درمیان تقسیم ہو کر رہ گئی ہیں۔ وہ دھیرے دھیرے مگر مسلسل اپنے شوہر کی محبت و توجہ سے محروم ہوتی جارہی تھی یا شاید اسے لگ رہا تھا کہ وہ محروم ہوتی جارہی ہے۔ وہ اس بارے میں جتنا سوچتی تھی' اتنا ہی اسے محسوس ہوتا تھا کہ اس کے اور اختر زمانی کے درمیان فاصلہ بڑھ گیا ہے.... ٹھہری ہوئی جھیل کے ٹھہراؤ اور گہرائی سے اسے اب کراہت محسوس ہونے لگی تھی۔ اسے اچھلتا کودتا گنگناتا پانی درکار تھا۔ اور پھر ایک موقع آیا کہ ان دونوں کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ ایک دوسرے سے علیحدہ ہوجائیں.... ضروری کارروائی کے بعد ان دونوں میں طلاق ہوگئی۔ ایک مکان' اسلام آباد میں ایک پلاٹ اور تین لاکھ کی گاڑی عینی کے نام تھی۔ اس کے علاوہ زیورات وغیرہ بھی تھے۔ وہ خود کو مالی طور پر محفوظ تصور کررہی تھی۔ اختر زمانی ایک نرم مزاج.... محبت کرنے والا اور خیال رکھنے والا شوہر تھا۔ اس سے جدا ہو کر عینی کو قلق تو ہوا لیکن یہ زیادہ دیرپا نہیں تھا۔ بہت جلد اس نے خود کو ایڈجسٹ کرنا شروع کردیا... زندگی ایک تند و تیز موڑ کاٹ کر پھر ہموار سیدھے راستے پر چلنے لگی تھی۔

○☆○

یہ طلاق سے نو دس ماہ بعد کا واقعہ ہے' ایک روز عینی دبئی ائرپورٹ پر اتری۔ عینی کو ریسیو کرنے کے لیے اس کی ایک دیرینہ سہیلی نادو ائرپورٹ پر موجود تھی۔ نادو اپنے بنگلہ دیشی بینک کار شوہر کے ساتھ دبئی میں ہی رہتی تھی۔ عینی کا یہ دورہ تفریحی نوعیت کا تھا اس کے علاوہ وہ دبئی میں کچھ شاپنگ بھی کرنا چاہتی تھی لیکن پس پردہ اس دورے کا ایک اور مقصد بھی تھا۔ وہ ایاز سے ملنا چاہتی تھی۔ اسے دیکھنا چاہتی تھی اور یہ جاننا چاہتی تھی کہ اتنا عرصہ گزرنے کے بعد اب وہ اس کے بارے میں کس انداز سے سوچتا ہے۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی شادی ہوچکی ہوگی' اس کے بال بچے ہوں گے۔ وہ اس کی زندگی کو ڈسٹرب کرنا نہیں چاہتی تھی۔ بس ایک جھونکے کی طرح اس کے پاس سے گزرنا چاہتی تھی اور اس کی خوشبو لینا چاہتی تھی۔ ایاز دبئی میں ایڈورٹائزنگ کا کام کررہا تھا' اس کا کھوج لگانا زیادہ دشوار نہیں تھا... دبئی پہنچنے کے بعد عینی نے اس سلسلے میں کوشش کی اور جلد ہی کامیاب ہوگئی۔ ایاز ایک مقامی شخص کے ساتھ مل کر کام کررہا تھا۔ اس نے بہت زیادہ ترقی تو نہیں کی تھی بہرحال ایک خوش حال زندگی گزار رہا تھا۔ عینی یہ جان کر حیران ہوئی کہ اس نے ابھی تک شادی نہیں کی۔

ایاز کا دفتر ایک کم آبادی والے علاقے میں تھا۔ ایک دو روز میں عینی کو اس کا مکمل ایڈریس اور فون نمبر وغیرہ بھی معلوم ہوگیا۔ عینی اس سے یوں ملنا چاہتی تھی کہ یہ ملاقات سرپرائز کی شکل اختیار کرجائے۔ ایک عجیب سی امنگ ترنگ اس میں جاگی ہوئی تھی۔ وہ خود کو پھر سے ایک نوجوان لڑکی محسوس کررہی تھی۔ وہ لڑکی جو کالج جاتی تھی۔ شاعری پڑھتی تھی اور ایاز نام کے ایک خوب صورت نوجوان کو دیکھ کر جس کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگتی تھیں۔ اپنی اس کیفیت کو وہ خود بھی ٹھیک سے سمجھ نہیں پارہی تھی۔

اس نے بازار سے جدید تراش کا ایک سیاہ برقعہ لیا اور ایک دوپہر خراماں خراماں "ایاز ایڈورٹائزنگ" کے آفس پہنچ گئی۔ ایاز سے اس کی ملاقات ایک سجے سجائے دفتر میں ہوئی۔ وہ ایک کلائنٹ کی حیثیت سے اس کے سامنے بیٹھ گئی اور باتیں کرنے لگی۔ ایاز کی کنپٹیوں پر چند سفید بال نظر آنے

لگے تھے' بہرحال وہ پہلے ہی کی طرح صحت مند اور تر و تازہ دکھائی دیتا تھا۔ اس کی مونچھیں پہلے سے گھنی ہوگئی تھیں اور آواز بھی کچھ بھاری محسوس ہو رہی تھی۔ باتیں کرتے کرتے عینی نے چہرے پر سے نقاب ہٹا دیا۔ آنکھوں کی طرح اس کا پورا چہرہ ایاز پر عیاں ہوگیا۔ ایاز کا منہ کھلا رہ گیا اور چہرے پر دنیا جہان کی حیرتیں سمٹ آئیں۔

"تم عینی؟" وہ کانپتی آواز میں بولا۔

"کیوں تمہارا کیا خیال تھا کہ میں اب اس دنیا میں نہیں ہوں۔"

"نہیں.... نہیں۔ لیکن میں.... سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم.... یوں۔"

"سوچ تو میں بھی بہت کچھ نہیں سکتی تھی لیکن وہ سب کچھ ہوا اور میرے سامنے ہوا۔"

ان دونوں کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ بات کو کہاں سے اور کیسے شروع کریں۔ ایاز نے کافی منگوائی۔ وہ کافی کی پیالیوں پر جھک گئے اور ماضی کو کھنگالنے لگے۔ ماضی جو ان کی نظروں کے سامنے دور تک پھیلا ہوا تھا۔ یہ ماضی دو مہیب ٹکڑوں میں بٹا ہوا تھا۔ ایک ٹکڑا عینی کے پاس تھا اور دوسرا ایاز کے پاس۔ وہ ان ٹکڑوں کو جوڑنے میں مصروف ہوگئے۔

ایاز سے عینی کی دوسری ملاقات ایاز کی رہائش گاہ پر ہوئی۔ رہائش گاہ اس کے آفس سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ وہ ایک صاف ستھرا اور کشادہ ولا تھا۔ دبئی جیسے شہر میں ایسے مکان کا مل جانا خوش قسمتی کی بات تھی۔ ان دونوں نے سرسبز لان میں بیٹھ کر شام کی چائے پی اور پھر ٹی وی لاؤنج میں صوفوں پر براجمان ہو کر مصری فلم دیکھتے رہے۔ عینی جلد لوٹنا چاہتی تھی لیکن ایاز نے بڑی خوب صورتی سے اسے باتوں میں الجھائے رکھا۔ وہ چاہتا تھا کہ عینی رات کا کھانا کھا کر جائے۔ وہ اپنے لبنانی خانساماں کی تعریفوں کے پل باندھ رہا تھا اور اپنی اس قصیدہ خوانی کا ثبوت بھی فراہم کرنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ فروزن ٹراؤٹ مچھلی پکانے میں اس کے خانساماں کا ثانی دور دور نہیں ہے۔ گفتگو کے دوران میں عینی نے دو تین بار اٹھنے کی کوشش کی لیکن ایاز نے کسی نہ کسی بہانے اسے روک لیا۔ وہ بات سے بات نکالنے کا فن جانتا تھا اور عینی تو ہمیشہ سے اس کی باتوں میں یوں گم ہوتی تھی کہ وقت گزرنے کا احساس ہی کھو دیتی تھی۔ دبیز قالینوں اور خوب صورت پردوں والے اس ائرکنڈیشنڈ گھر میں بیٹھ کر مسلسل گفتگو کرنے کے لیے ان کے پاس بہت سا مواد تھا۔ سات آٹھ برس کی باتیں تھیں جو ایک جگہ جمع ہو چکی تھیں۔ عینی اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی اور خاص طور سے ان واقعات کے بارے میں جو پانچ برس پہلے ایاز کی دھمکی آمیز ٹیلی فون کالز سے شروع ہوئے تھے اور اچانک ختم ہوگئے تھے۔ وہ دھیرے دھیرے ایاز کو ان موضوعات کی طرف لا رہی تھی۔ باتیں کرتے کرتے عینی کو دفعتاً اندازہ ہوا کہ ایاز کے لہجے میں لڑکھڑاہٹ آگئی ہے۔ وہ نشے میں محسوس ہو رہا تھا۔ باتوں کے دوران میں وہ دو تین دفعہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں گیا تھا' یقیناً اس نے ڈرنکس لیے تھے۔

"تم ڈرنک کررہے ہو؟" عینی نے پوچھا۔

"ہاں.... کبھی کبھی کرلیتا ہوں۔ شاید یہ بھی تمہارا ہی دیا ہوا روگ ہے۔"

"کیوں۔ میں نے کیا کیا ہے؟"

"تم نے کیا نہیں کیا؟" وہ نشیلے انداز میں مسکرایا "تم نے سب کچھ کیا ہے۔"

اس کا ہاتھ بے تکلفی سے عینی کے ہاتھ پر آگیا۔ عینی لرز کر رہ گئی۔ ایاز کی پیش قدمی کا یہ انداز عینی کے لیے تشویش ناک تھا۔ اس نے بارہا ایاز کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ ان کے اندر جھانکا تھا۔ لیکن ان آنکھوں کی تہ میں جو کچھ آج نظر آرہا تھا وہ کبھی نہیں آیا تھا۔ ان آنکھوں میں ایک بھوکے شخص کا عکس تھا۔ ایک ایسا شخص جس کے منہ سے طلب کی شدت سے رال بہہ رہی تھی۔ اور جو بڑی ہی "ضرورت مند" نظروں سے اس کے آر پار دیکھ رہا تھا۔ یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد عینی بے ساختہ اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ ایاز نے جراتِ رندانہ کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنا بھاری ہاتھ عینی کے شانے پر رکھ دیا۔ پھر ایک تند جھٹکے سے وہ اسے اپنے قریب لے آیا۔ الکحل کا بھبکا عینی کے نتھنوں سے ٹکرایا۔

"پلیز ایاز.... یہ کیا کررہے ہو؟"

"تم جانتی ہو کہ میں کیا کررہا ہوں۔ تم سے زیادہ اور کون جان سکتا ہے۔ تم سے زیادہ تو شاید میں بھی نہیں جان سکتا۔"

وہ اس پر جھکتا چلا گیا۔ عینی نے مزاحمت پیش کی لیکن وہ ایک ایسے بپھرے ہوئے مرد کی گرفت تھی جو نشے میں بھی تھا۔ وہ ٹی وی لاؤنج کی نیم تیرگی میں بے بس ہو کر رہ گئی۔ اس نے چلانا چاہا لیکن ایک طاقت ور ہاتھ کی سخت ہتھیلی نے اس کے ہونٹ ڈھانپ لیے۔ پھر اس کا سر کسی چیز سے ٹکرایا اور اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا پھیلنے لگا۔ کوہی نالے کا شور اس کے کانوں میں گونج رہا تھا۔

.... اس کے حواس دوبارہ بحال ہوئے تو وہ ایک نیم

تاریک کمرے میں تھی۔ یہ کمرا اسی وسیع مکان کا حصہ تھا جہاں ایاز کے ہاتھوں اس پر قیامت ٹوٹی تھی۔ وہ دروازے کی طرف لپکی۔ حسبِ توقع وہ باہر سے بند تھا۔ وہ دروازہ پیٹنے لگی۔ ایک غنڈا صورت نوجوان کھڑکی میں نظر آیا۔ یقیناً وہ ایاز کا کوئی پاکستانی دوست تھا۔ اس نے اپنا چہرہ کھڑکی کی آہنی گرل سے لگایا۔ اس کی آنکھوں میں شیطانی مسکراہٹ بھری ہوئی تھی۔ اپنے ہونٹ سکوڑ کر اس نے عینی کو ایک نازیبا اشارہ کیا اور گنگنانے لگا۔ عینی نے کھڑکی ایک دھماکے سے بند کردی اور بستر پر گر کر رونے لگی۔ اس کے دل و دماغ میں تہلکہ مچا ہوا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہی ہے۔ یہ کیا ہوا تھا اس کے ساتھ؟ اس سے اندازے کی اتنی بڑی غلطی کیونکر ہوئی۔ وہ کیوں تن تنہا آگئی ایاز کے ساتھ اس چار دیواری میں۔

اسے اپنے تئیں مردم شناسی کا دعویٰ تھا‘ لیکن آج یہ دعویٰ دھرے کا دھرا رہ گیا تھا۔ وہ اس شخص کو ہی نہیں سمجھ سکی تھی جو اس کی زندگی میں سب سے اہم تھا۔ اتنی بڑی غلطی۔ اس کا دل اپنا سر پیٹنے کو چاہ رہا تھا۔ وہ صبح تک بھوکی پیاسی اس کمرے میں بند رہی۔ اپنے اندرونی ہیجان سے گھبرا کر وہ کئی بار بلند آواز میں چیخی لیکن یہ مکان اتنا بڑا تھا کہ اس کی چیخ پکار باہر تک نہیں پہنچ سکتی تھی..... پھر وہ یہاں آتے ہوئے کسی کو بتا کر بھی نہیں آئی تھی۔ اس کی سہیلی نادو سمیت کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔ اسے یقین تھا کہ وہ ایک ناقابلِ شکست جال میں پھنس چکی ہے۔ نجانے ایاز اسے چھوڑ کر کہاں غائب ہوگیا تھا اور وہ کن لوگوں کے رحم و کرم پر تھی۔ دوپہر دو بجے کے لگ بھگ کھڑکی پر دستک ہوئی‘ اس نے کھڑکی کھولی۔ دوسری طرف پھر وہی منحوس چہرہ نظر آیا جس نے رات اسے فحش اشارے کیے تھے۔ وہ پچیس چھبیس سالہ نوجوان تھا۔ بال گھونگھریالے‘ رنگ سانولا اور آنکھوں میں کمینگی کی جھلک تھی۔ اس نے عینی کو دیکھ کر لفنگے انداز میں آنکھ میچی اور اپنے بے ڈھنگے دانتوں کی نمائش کرنے لگا ”کیوں رانی! کچھ ہوش ٹھکانے آئے یا نہیں؟“ وہ بولا۔

عینی نے ایک بار پھر کھڑکی جھٹکے سے بند کرنا چاہی لیکن اس نے گرل میں ہاتھ گزار کر اسے پٹ بند کرنے سے روک دیا۔ بازاری لہجے میں بولا ”شہزادی! ہمارے قبضے میں ہو اور ہمی سے چھپ رہی ہو۔ یہ مکان ہمارا ہے اور یہ کمرا بھی ہمارا ہے۔ یہ تمہیں کب تک پناہ دے سکتا ہے۔ ہم سے دور رہو گی تو اپنا ہی نقصان کروگی۔ دو تین دن تک پیٹ میں روٹی نہ گئی تو یہ چاند سا مکھڑا مرجھا کر پیپل کے پتے جیسا ہو جائے گا۔“

”وہ کتا کہاں ہے؟“ عینی نے زہرناک لہجے میں پوچھا۔

”شاید تم ایاز کو یاد کر رہی ہو‘ لیکن یاد کرنے کا یہ انداز تو بالکل ٹھیک نہیں ہے۔ ایک طرف اتنا پیار کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس کے لیے یہاں چلی آئی ہو اور ایک طرف اتنی ناراضگی کہ اسے انسان کہنا بھی گوارا نہیں۔“

”ہاں ہاں وہ انسان نہیں اور تم سب بھی جانور ہو۔ میں تھوکتی ہوں تمہارے منہ پر۔“

وہ غور سے اسے دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں ایک تاؤ دلانے والی چمک تھی۔ اپنی داڑھی کھجاتے ہوئے بولا ”آخر تم چیز کیا ہو رانی۔ جلیبی کے مافق تمہارے آگے پیچھے کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ جب تمہیں پتا تھا کہ ایاز تمہارے حق میں ٹھیک نہیں ہے۔ وہ پہلے بھی تمہیں بلیک میل کرچکا ہے۔ تمہارے خاوند کو تمہارے پریم پتر دکھا کر اس سے لمبی رقم بٹور چکا ہے۔ تو پھر تم کیوں اس کے پیچھے یہاں بھاگی چلی آئیں۔ یہ تو وہی بات ہوئی ناں کہ آبیل مجھے مار۔“

عینی کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ وہ یک ٹک غنڈا صورت نوجوان کو دیکھ رہی تھی۔ پھر اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا "کیا کہہ رہے ہو تم۔ کس رقم کی بات کررہے ہو؟"

"وہی جو تیرے عاشق شوہر نے اپنی اور تیری عزت بچانے کے لیے ایاز کے حوالے کی تھی۔ مبلغ ۳۵ لاکھ نصف جن کے ساڑھے سترہ لاکھ ہوتے ہیں۔" ایک لمحہ توقف کر کے اس نے عینی کی آنکھوں میں جھانکا اور بولا "تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے کچھ پتا ہی نہیں۔ تم عورتیں واقعی جلیبی کی طرح چکر دار ہوتی ہو۔ تمہارے چکر کھولنے کی کوشش میں بندے کا اپنا دماغ گھن چکر بن جاتا ہے۔"

عینی کے ذہن میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ وہ جیسے کسی برق رفتار ہنڈولے میں بیٹھی تھی اور گھومتی چلی جارہی تھی۔ پانچ سالہ ماضی ایک گٹھڑی کی طرح اس کے سامنے کھلتا چلا جارہا تھا۔ اس گٹھڑی میں سے جو چیز بھی برآمد ہو رہی تھی وہ عینی کے لیے بالکل نئی تھی۔ آج یہ حقیقت اس پر پوری طرح منکشف ہوگئی تھی کہ پانچ سال پہلے اس دھواں دھواں دوپہر کو ایاز اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنانے سے باز نہیں رہا تھا... اپنے سابقہ شوہر اختر زمانی کا چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ خاموش ہونٹ' بردبار پیشانی اور بہت گہری آنکھیں' جن میں سمندر ڈوب جائیں اور نشاں تک نہ ملے۔

وہ حیرت زدگی کے عالم میں یہ سوچتی رہی کہ اس شخص نے پانچ برس تک اتنا اہم راز اس سے چھپائے رکھا۔ اپنے کسی فعل سے' اپنی کسی بات سے' کسی اشارے کنائے سے عینی کو بھنک تک نہیں پڑنے دی کہ وہ اس کے حوالے سے کتنے بڑے راز کا امین ہے۔ صرف اس وجہ سے کہ عینی کی عزتِ نفس مجروح نہ ہو' وہ اپنی نگاہوں میں گر نہ جائے۔ اس نے سب کچھ جانتے ہوئے بھی پانچ برس تک بے خبری کا لبادہ اوڑھے رکھا۔ بے شک وہ عینی کے سلسلے میں بڑی حد تک حساس تھا مگر وہ اتنا بڑا رنج اپنے سینے میں چھپا گیا۔

یک لخت عینی کو خود پر بے حد ندامت ہونے لگی۔ پچھتاوے کی آگ نے پلک جھپکتے میں اس کے تن بدن کو لپیٹ میں لے لیا۔ آہ... وہ اختر کی محبت کو سمجھ نہ سکی۔ اس دل کو ہمیشہ کے لیے ٹھکرا کر چلی آئی جس میں اس کے لیے پیار ہی پیار تھا۔ اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو گرنے لگے۔ یہ ایک ایسے "پچھتاوے" کے آنسو تھے جس کا کوئی مداوا نہیں تھا۔

خبر نہیں کہ اس قید خانے میں عینی کے ساتھ کیا کچھ ہوجاتا اور کب تک ہوتا رہتا لیکن قدرت نے اس کی تھوڑی سزا کو زیادہ جانا۔ رات کسی پہر مکان میں ہلچل محسوس ہوئی۔ پھر کہیں قریب سے عینی نے ایاز اور اس کے دو دوستوں کی گھبرائی ہوئی آوازیں سنیں۔ ان آوازوں سے عینی کو اندازہ ہوا کہ شہر کا یہ علاقہ اخلاقی گراوٹ کا شکار ہے۔ بنگلہ دیشی' انڈین اور کورین کال گرلز یہاں عام پائی جاتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ یہاں آئے دن چھاپے وغیرہ پڑتے رہتے تھے۔ اس وقت بھی کسی ایسے ہی چھاپے کی کارروائی ہو رہی تھی۔ ایاز کی منحوس آواز عینی کے کانوں میں پڑی' وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا "چھوڑ یار! خوا مخواہ کی مصیبت میں پھنس جائیں گے۔ نکالو اس حرام زادی کو یہاں سے... لیکن اچھی طرح سمجھا دینا' اگر کہیں شکایت کرے گی تو دبئی میں جہاں بھی ہوگی ڈھونڈ نکالیں گے... اور حشر خراب کردیں گے... سمجھ رہے ہو ناں میری بات۔"

"اوکے ڈیئر۔" ساتھی کی آواز آئی۔

اس کے ساتھ ہی کوئی تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔ یقیناً یہ ایاز ہی تھا۔

○☆○

قریباً چوبیس گھنٹے پہلے وہ ایاز کے ہمراہ جس چار دیواری میں بہت خوش خوش داخل ہوئی تھی وہاں سے مٹی کا ڈھیر بن کر نکلی۔ وہ لٹی پٹی ہوئی تھی۔ اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے اور جسم و جاں پر جلتی ہوئی خراشیں تھیں۔ ایک لمبی سنسان سڑک پر وہ ڈگمگاتی ہوئی چلتی رہی۔ یہ سڑک اس کی زندگی ہی کی طرح بے سمت تھی۔ کسی نامعلوم مقام سے شروع ہو کر نامعلوم مقام تک پہنچتی تھی۔ عینی کے اردگرد دبئی کی روشنیاں تھیں مگر اندر گھپ اندھیرا تھا۔ اس کے تصور میں لاہور شہر کے درو دیوار تھے۔ ایک خوب صورت علاقے کا ایک خوب صورت مکان تھا۔ اس خوب صورت مکان کا ایک سجا سجایا کمرا تھا۔ اس سجے سجائے کمرے میں بیٹھا ہوا ایک اداس صورت شخص تھا۔ اس اداس صورت شخص کے سرہانے ایک ٹیپ ریکارڈر تھا۔ اس ٹیپ ریکارڈر پر کوئی تنہا تنہا اداس غزل چل رہی تھی۔ شاید اختر کی وہی پسندیدہ غزل

خبرِ تحیرِ عشق سن' نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا' جو رہی سو بے خبری رہی

بے خبری

طاہر جاوید مغل

اکثر لوگوں کو اپنی ناآسودہ خواہشوں کی تکمیل کی صورت اولاد کی کامیابی وکامرانی میں نظر آتی ہے... وہ چاہتے ہیں جو کچھ ان سے نہ ہوسکا ان کے بچے کر دکھائیں اور اس چاہ میں وہ بسا اوقات بہت آگے تک بڑھ جاتے ہیں۔

منفرد موضوعات کی کہانی یا تراشنے والے طاہر جاوید مغل کا تازہ شاہکار

موسم ابر آلود تھا۔ دوپہر میں ہی شام کا سماں محسوس ہوتا تھا۔ وہ آرام دہ کرسی پر ٹیک لگائے بیٹھا دیوار گیر شیشے سے باہر سڑک پر آتے جاتے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا پورا نام آصف عثمان تھا۔ عمر 70 سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ جس جگہ بیٹھا ہوا تھا وہ جگہ ''پیزا پیلس'' کہلاتی تھی۔ پیزا پیلس کی پانچ چھ شاخیں لاہور شہر میں موجود تھیں۔ پیزا کھانے کے شوقین ''پیزا پیلس'' کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ آصف عثمانی پیزا پیلس کا مالک تھا۔

وہ کرسی پر بیٹھا سگریٹ پھونکتا رہا اور سڑک کو دیکھتا رہا۔ یہاں بیٹھ کر سڑک کو دیکھنا اس کا پرانا مشغلہ تھا۔ بعض اوقات اس مشغلے کے سبب اسے دلچسپ مناظر دیکھنے کو ملتے تھے...... جیسے آج ایک دلچسپ اور قابلِ توجہ منظر اس کے سامنے تھا۔ سڑک کے پار ایک انگلش میڈیم اسکول تھا۔ چھٹی ہو چکی تھی۔ بیشتر بچے گھروں کو روانہ ہو چکے تھے لیکن ایک عورت ابھی تک اپنے بچے کے انتظار میں پریشان تھی۔ وہ کچھ دیر پہلے اسکول کے اندر بھی گئی تھی اور زیادہ پریشان ہو کر واپس آئی تھی۔ اب وہ موبائل پر کسی سے بات کر رہی تھی۔

ایک خوش رنگ چھتری اس کی بغل میں دبی ہوئی تھی۔

موبائل پر بات کرنے کے بعد عورت ایک بار پھر تیز تیز قدم اٹھاتی اسکول میں گئی۔ اس مرتبہ اس کی واپسی تین چار منٹ بعد ہوئی۔ وہ بدستور پریشان دکھائی دی۔ موبائل فون ایک بار پھر اس کے کان سے لگا ہوا تھا۔ فون بند کر کے کے بعد جواں سال عورت نے اسکول کے اردگرد کی دکانوں اور اسٹالز وغیرہ میں جھانکنا شروع کر دیا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ اس کا بچہ یہاں کہیں موجود ہوگا۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا عورت کی پریشانی بڑھتی جارہی تھی۔ اسی دوران بارش شروع ہوگئی۔ عورت نے چھتری کھولی اور پیزا پیلس کی سیڑھیوں پر شیڈ کے نیچے کھڑی ہوگئی۔ کئی اور راہگیر بھی اسی طرح دکانوں کے چھجوں کے نیچے کھڑے ہوگئے تھے۔

بارش زور پکڑتی چلی گئی۔ آصف شیشے کے پار بڑی محویت سے اس پریشان حال عورت کو دیکھ رہا تھا۔ سگریٹ ختم کرنے کے بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور بڑی شفقت کے ساتھ عورت کو اندر بلا لایا ''یہاں بیٹھو بیٹی! بارش تیز ہوگئی ہے۔ لگتا ہے کہ ابھی کچھ دیر یہ سلسلہ چلے گا۔''

''بہت شکریہ انکل۔'' وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''در...... دراصل...... میرا بیٹا......''

آصف عثمانی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے چپ کرایا اور بولا ''تمہارے بتائے بغیر ہی میں سب کچھ جان گیا ہوں۔ میں یہاں بیٹھ کر اس شیشے سے باہر سب کچھ دیکھتا رہتا ہوں۔'' اس نے چند لمحے توقف کیا پھر پُرسوچ انداز میں بات جاری رکھتے ہوئے بولا ''تمہارا بیٹا نہیں مل رہا۔ اس لیے کہ وہ یہاں ہے ہی نہیں...... وہ گھر بھی نہیں گیا ہے۔ اور میرے خیال میں...... وہ کسی ایسی جگہ پر نہیں جہاں تمہارے اندازے کے مطابق اسے ہونا چاہیے۔''

''کک...... کیا مطلب انکل۔''

عثمانی نے نیا سگریٹ سلگا کر دو طویل کش لیے اور کسی ''فورکاسٹر'' کے سے پُرخیال انداز میں بولا ''کل اسکول میں PARENT'S MEETING ہے۔ سالانہ نتیجے کا اعلان بھی ہونا ہے۔ بچے کے ذہن پر نتیجے کا دباؤ تھا۔ بہت زیادہ دباؤ...... تمہاری تمام تر کوشش کے باوجود اس کی کارکردگی وہ نہیں تھی جو ہونی چاہیے تھی۔ تم نے اس سے بہت سی توقعات لگا رکھی تھیں۔ لیکن کل جو رزلٹ آنے والا تھا وہ تمہاری توقعات کے مطابق نہیں بلکہ شاید توقعات کے الٹ تھا...... اس لیے وہ کہیں چلا گیا ہے۔ خاموشی سے کسی طرف نکل گیا ہے۔''

''یہ...... آپ کیا کہہ رہے ہیں انکل۔'' پریشان ماں کچھ اور پریشان ہوگئی۔ اس نے کرسی سے اٹھنا چاہا۔

عثمانی نے بڑے دھیمے انداز میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اسے پھر سے بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ ''نہیں بیٹی! بارش بہت تیز ہوگئی ہے۔ شاید اولے بھی پڑ رہے ہیں۔ ابھی تمہارا نکلنا ٹھیک نہیں۔ کچھ دیر تو انتظار کرنا ہی پڑے گا۔ پھر کہوگی تو میں بھی تمہارے ساتھ بچے کو ڈھونڈنے چلوں گا۔''

عورت نے نڈھال سے انداز میں شولڈر بیگ پھر میز پر رکھ دیا اور روہانسی آواز میں بولی۔ ''آپ یہ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ نومی بھاگ ...... میرا مطلب ہے...... گھر سے بھاگ گیا ہے۔''

عثمانی نے سگریٹ کا ایک طویل کش لیا اور بولا ''میں یہ اس لیے کہہ سکتا ہوں کہ ...... یہ سب کچھ میرے ساتھ بھی ہو چکا ہے۔''

''کیا مطلب...... آپ کا بچہ بھی......''

''نہیں میرا بچہ نہیں...... میں خود...... میں خود ایک بار بالکل ایسی ہی سچویشن میں گھر سے بھاگا تھا...... ایسا ہی اسکول تھا، وقت بھی تقریباً یہی تھا۔ ماں بھی ایسی تھی بچہ بھی ایسا ہی تھا مگر یہ آج سے تقریباً 56 سال پہلے کی بات ہے۔''

عورت حیرت اور پریشانی کے ملے جلے جذبات سے عثانی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کھڑکیوں سے باہر دن میں ہی رات کا سماں نظر آنے لگا تھا۔ بارش تیز ہوتی جارہی تھی۔ عثمان نے شیشے کے پار خاموشی سے بھیگتے ہوئے اسکول کو دیکھا اور طویل سانس لے کر کہنا شروع کیا۔

''ہم صرف دو بہن بھائی تھے۔ بہن مجھ سے دو سال چھوٹی تھی۔ ہمارے والد بچپن میں ہی فوت ہوگئے۔ ماں کپڑے سی کر اور کشیدہ کاری کر کے نہ صرف گھر چلا رہی تھی بلکہ ہمیں پڑھا بھی رہی تھی۔ وہ مجھے بڑا افسر دیکھنا چاہتی تھی۔ میری پڑھائی کے لیے اس بے چاری نے اپنے آپ کو ہلکان کر رکھا تھا۔ وہ خود پڑھی ہوئی نہیں تھی لیکن اس کے ذہن میں پڑھائی کی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ اس نے مجھ سے بڑی توقعات لگائی تھیں لیکن میرا مسئلہ یہ تھا کہ میں توقعات پر پورا نہیں اترتا تھا۔ میں نے اپنی مرضی سے سائنس سبجیکٹ رکھے تھے لیکن میتھ اور کیمسٹری ایسے مضامین تھے جو ہزار کوشش کے باوجود میرے پلے نہیں پڑتے تھے۔ میں اپنی ناکامیوں پر اندر ہی اندر کڑھتا تھا مگر ماں کو بتاتا کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے بہت سر مارا، بہت کوشش کی مگر اپنی ماں کے توقعات پر پورا نہیں اتر سکا۔ اندر ہی اندر ایک طرح کی دیمک تھی جو مجھے کھاتی رہی۔ میری ماں جب کسی پڑوسن یا گھر آئے مہمان

سے میری تعریفیں کرتی اور بتاتی کہ میں کتنی محنت سے پڑھ رہا ہوں اور ماں کے خواب پورے کرنے کے لیے کس طرح خود کو ہلکان کررہا ہوں تو میں شرم کے پسینے میں ڈوب ڈوب جاتا۔ کوئی ایسا پڑھا لکھا عزیز یا جان پہچان والا تھا ہی نہیں جو اسکول جاتا اور میری شاندار کارکردگی کے بارے میں جانتا۔ بس میں ہی میں تھا اور میں اپنی سادہ لوح ماں کو سب اچھا کی رپورٹ دیتا رہا۔

میں جس دن گھر سے بھاگا، اس دن بھی میرے ماں نے صبح سویرے بڑے چاؤ سے مجھے انڈے پراٹھے کا ناشتا کرایا تھا۔ پانی میں بھیگے ہوئے بادام چھیل کر کھلائے تھے۔ مجھ پر سورة پڑھ کر پھونکی تھی اور جب میں باہر کے دروازے سے نکلا تھا تو پکار کر کہا تھا ”دعا پڑھ لینا آصفی۔“

یہاں تک کہہ کر آصف عثمانی نے چند لمحے کی خاموشی اختیار کی۔ اس کی آنکھیں جیسے نصف صدی پرانے ان مناظر کو اپنی آنکھوں کے سامنے جیتا جاگتا دیکھ رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں کی پتلیوں پر ہلکی ہلکی نمی محسوس ہونے لگی تھی۔

ایک گہری سانس لے کر اس نے کہا۔ ”میں ان دنوں نویں میں پڑھتا تھا۔ دبلا پتلا جسم ہونے کے باعث اپنی عمر سے کم دکھائی دیتا تھا۔ میرے کلاس ٹیچر پہلے بھی کئی دفعہ کہہ چکے تھے کہ میں اپنی والدہ یا کسی دوسرے بڑے کو اپنے ساتھ اسکول لاؤں۔ میں ہر مرتبہ مختلف بہانوں سے ٹالتا رہا تھا۔ لیکن اس دن کوئی بہانہ کام نہیں آیا۔ اگلے روز رزلٹ تھا۔ اسکول ٹیچر نے صاف کہہ دیا تھا کہ کل تمہارا کوئی بڑا تمہارے ساتھ ہوگا یا پھر میں خود تمہارے ساتھ تمہارے گھر جاؤں گا۔ ہاں وہ بھی ایک اداس سہ پہر تھی۔ اسکول سے باہر آنے کے بعد میں دیر تک سوچتا رہا۔ میں جانتا تھا گھر میں میری ماں سالن پکا چکی ہوگی اور اس انتظار میں بیٹھی ہوگی کہ میرے گھر میں پہنچتے ہی تازہ روٹی اتار کر میرے سامنے رکھے۔ کوئی کشش مجھے ماں کی اور تازہ روٹی کی طرف کھینچ رہی تھی۔ لیکن ایک خوف مجھے ماں سے دور بھی کررہا تھا اور یہ بڑا زورآور خوف تھا اتنا زورآور کہ ماں کی کشش بھی بے اثر ہورہی تھی۔ یہ خوف تھا ماں کی آرزوؤں اور خوش فہمیوں کا شیشہ ٹوٹنے کا...... میں ماں کے چہرے کی وہ حیرت اور تکلیف نہیں دیکھ سکتا تھا جو اسے میری حقیقت جاننے کے بعد جھیلنا تھی...... اور پھر اس سہ پہر میں گھر نہیں گیا۔ میں شہر کے ایک دوسرے گوشے میں ایک پارک میں جا کر بیٹھ گیا۔ شام تک سوچتا رہا کہ کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ شام کے سائے تاریکی میں بدل گئے تو ایک شخص میرے پاس آبیٹھا۔ وہ شلوار قمیص میں تھا‘ چہرے پر عینک تھی۔ کچھ پڑھا لکھا بھی لگتا تھا۔

اس نے مجھ سے پوچھنا چاہا کہ میں اسکول سے چھٹی کے بعد گھر کیوں نہیں گیا اور یہاں آوارہ گردی کیوں کررہا ہوں۔ میں نے اسے کوئی ڈھنگ کی بات نہیں بتائی۔ اس کے بہت پوچھنے کے باوجود میں نے اسے اپنے گھر یا کسی جان پہچان والے کا پتا بھی نہیں بتایا۔ وہ بہت سمجھدار تھا سمجھ گیا کہ میں کس کیفیت سے گزر رہا ہوں۔ اسے یہ ڈر بھی پیدا ہوا کہ کہیں میں اسی طرح آوارہ گردی کرتا کسی غلط سلط بندے کے ہتھے نہ چڑھ جاؤں۔ اس نے بالآخر مجھ سے پوچھا۔ ”کیا میرے ساتھ میرے گھر جانا پسند کرو گے؟“

”آپ کا گھر کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”دور ہے لیکن اتنا دور بھی نہیں۔ اگر تم چاہو تو کل صبح ہم پھر شہر آجائیں گے۔“

میں نے رضامندی ظاہر کی اور وہ مجھے بس پر اپنے ساتھ سوار کرا کے لاہور کے ایک مضافاتی قصبے میں لے آیا۔ یہ ایک نیم پختہ مکان تھا۔ چاروں طرف کھیت اور درخت تھے۔ بارڈر یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ مجھے اپنے ساتھ لے جانے والے شخص کا نام حیات محمد تھا۔ اتفاقاً وہ بھی ایک اسکول ٹیچر تھا اور قصبے کے ہائی اسکول میں پڑھاتا تھا۔ اس نیم پختہ گھر میں وہ اپنی والدہ، اپنی بیوی اور تین بچوں کے ساتھ

رہتا تھا۔ اس کا بڑا بیٹا انور میرا ہی ہم عمر تھا۔

دو تین دن میں میں ان لوگوں سے کھل مل گیا۔ حیات محمد مجھے جلد از جلد میرے گھر واپس پہنچانا چاہتا تھا مگر خوف اور شرمندگی کے سبب میں کچھ بتا کر ہی نہیں دیتا تھا۔ وہ لوگ زیادہ زور ڈالتے تھے تو میں رونا شروع کر دیتا تھا۔ گزرنے والی ہر گھڑی کے ساتھ میرے اندر کا ڈر بڑھتا جارہا تھا۔ مجھے اپنے ماموں کا خیال آتا تھا جو ایسے معاملوں میں بے حد سخت تھے اور ماں کا خیال آتا تھا جس کا سامنا کرنے کا حوصلہ مجھ میں نہیں تھا۔ اسے لڑکپن کی نادانی کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے۔ جس ماں کو میں اپنے فیل ہونے کا دکھ دینا نہیں چاہتا تھا اس کو اپنے لاپتا ہونے کا سنگین ترین غم دے رہا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔ شاید ایک دو روز میں میں حیات محمد کے سمجھانے بجھانے کے سبب ''واپسی'' کے بارے میں سوچنے لگتا لیکن ایک عجیب واقعہ ہوگیا۔

میرے ہم عمر انور کو چڑیوں کے شکار کا شوق تھا۔ دیہاتی علاقوں کی یہ چڑیاں عام چڑیوں سے کچھ بڑی ہوتی ہیں۔ انہیں شوق سے پکایا اور کھایا جاتا ہے۔ انور کے پاس ایئر گن تھی۔ وہ مجھے اپنی سائیکل کے عقب میں بٹھا کر شکار کے لیے نکل گیا۔ اس سے پہلے بھی ہم دو بار جنگل جاچکے تھے...... اور کپڑے کے تھیلے میں کافی سارا شکار لے کر آئے تھے۔ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ آج ہم خود شکار ہونے جارہے ہیں۔ اس روز ہم درختوں میں ایئر گن چلاتے چلاتے کافی آگے نکل گئے۔ پھر ایک زخمی فاختہ کا پیچھا کرتے ہمیں پتا ہی نہیں چلا ہم نے کب وہ ان دیکھی لائن عبور کرلی جسے بارڈر کہا جاتا ہے۔ تین چار باوردی افراد نے ہمیں للکارا پھر ہمیں پکڑنے کے لیے بھاگے۔ انور تو کسی نہ کسی طرح واپس بھاگنے میں کامیاب ہوگیا مگر میں پکڑا گیا۔ مجھے کئی دن بعد پتا چل سکا کہ میں انڈیا میں ہوں۔ دراصل مجھے انڈیا کی بارڈر سیکیورٹی فورس نے اپنی حدود کے اندر سے پکڑا تھا۔''

آصف عثمانی نے توقف کرکے نیا سگریٹ سلگایا۔ کھڑکیوں سے باہر بارش تواتر سے ہورہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ آسمان سے زمین تک پانی کی چادر سی تنی ہوئی ہے۔ عورت کے موبائل فون کی بیٹری ختم ہوچکی تھی۔ اس نے آصف عثمانی کی طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھنے کے بعد پی ٹی سی ایل فون کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر شاید تیز بارش کے سبب وہ بھی ڈیڈ ہوگیا تھا۔ وہ ایک بار پھر بے دم سی ہوکر بیٹھی اور آصف عثمانی کی طرف متوجہ ہوگئی۔ وہ اپنی روداد کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں یہ سن کر حیرانی ہوگی بیٹی!'' اس سنسناتی دوپہر میں چڑیاں پکڑتے پکڑتے انڈین فورس کے ہتھے چڑھ جانے کے بعد میں پورے دس سال تک...... ہاں پورے دس سال تک واپس اپنی زمین پر قدم نہیں رکھ سکا۔ یہ دس سال میں نے کہاں کہاں اور کس کس طرح گزارے یہ ایک بہت طویل کہانی ہے۔ نہ کوئی عدالت تھی، نہ مقدمہ نہ کوئی چارج شیٹ...... بس ایک قیدی تھا اور اس کے اردگرد کھڑی اونچی اونچی دیواریں تھیں۔ میں ان دیواروں کے پیچھے تڑپ تڑپ گیا' میں اپنے گھر کو یاد کرتا تھا، اپنے گلی کوچوں کو اور سب سے بڑھ کر اپنی ماں کو۔ ماں کی انتظار اور آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھیں ہر وقت میرے تصور میں رہتی تھیں۔ ان آنکھوں کو دیکھ کر میں بھی بلک بلک کر روتا تھا۔ میرے آنسو خشک ہوجاتے، میرا گلا بیٹھ جاتا تھا مگر کوئی میری فریاد نہیں سنتا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ میں اس پنجرے کا عادی ہونے لگا جس نے مجھے قید کر رکھا تھا۔ شامیں اور صبحیں گزرتی رہیں، دن اور رات ایک دوسرے کے تعاقب میں رہے۔ مجھے مشرقی پنجاب کی دو تین جیلوں میں رکھا گیا۔ کچھ عرصے کے لیے دہلی جیل میں بھی بھیجا گیا۔ کبھی کبھی مجھ سے پوچھ گچھ بھی کی جاتی تھی مگر میرے پاس ایک ایئر گن، ایک سائیکل اور ایک زخمی فاختہ کے سوا بتانے کو کچھ تھا ہی نہیں۔

دس سال بعد جس طرح میں اچانک پکڑا گیا تھا، اسی طرح اچانک رہا بھی ہوگیا۔ اب میں قریباً 25 سال کا ایک بھرپور جوان تھا۔ کچھ خوش پوش افراد آئے۔ انہوں نے مجھ سے چند کاغذات پر دستخط لیے اور مجھے ایک گاڑی میں سوار کراکے بعد بارڈر پر لے آئے۔ یہاں مجھے پاکستانی حکام کے حوالے کر دیا گیا۔

میں اپنی ماں اور اپنے گلی کوچوں کے لیے ایسے ہی تڑپ رہا تھا جیسے تپتے ریگستان میں کئی دن کا پیاسا پانی سے بھرے گلاس کے لیے تڑپتا ہے۔ مجھے یاد ہے لاہور پہنچتے ہی میں سیدھا اپنے گھر پہنچا تھا۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے دس سال بعد مجھے آج چھٹی ملی ہے۔ میں کمر پر اسکول بیگ اٹھائے اپنی ماں کی طرف بھاگا جارہا ہوں اور وہ میرے لیے تازہ روٹی اتارنے کے لیے چولہے کے سامنے تیار بیٹھی ہے۔ لیکن جب میں وہاں پہنچا...... تو سارا نقشہ ہی تبدیل نظر آیا۔ کرائے کا وہ گھر مسمار ہوچکا تھا جہاں ہم ...... رہا کرتے تھے...... وہاں اب دکانیں بنی ہوئی تھیں۔ مالک مکان فوت ہوچکا تھا۔ میں اس کے بھائی سے ملا۔ اسے اس کے سوا کچھ معلوم نہیں تھا کہ میری ماں میرے غم میں بیمار ہوگئی تھی۔ وہ دیوانوں کی طرح مجھے سڑکوں پر تلاش کرتی رہتی تھی۔ پھر اس کا بھائی اسے اور

میرے چھوٹی بہن کو اپنے ساتھ گاؤں لے گیا تھا۔ یہ کوئی سات آٹھ سال پہلے کی بات تھی۔

میں سیالکوٹ کے اس دور دراز گاؤں میں اپنے ماموں کے پاس پہنچا۔ وہ پہلے سے کہیں بوڑھے نظر آرہے تھے۔ مجھے دیکھ کر اور بمشکل پہچان کر انہوں نے مجھے گلے سے لگایا اور دھاڑیں مار کر رونے لگے۔ ان کی زبانی مجھ پر یہ بجلی گری کہ میری ماں تقریباً پانچ سال پہلے غموں کی اس دنیا سے چھٹکارا پا گئی تھی۔ وہ قریباً پانچ برس تک دن رات میری راہ دیکھتی رہی۔ وہ گھر کا دروازہ کبھی بند نہیں کرنے دیتی تھی۔ ہر دستک پر اٹھ کر دروازے کی طرف جاتی تھی۔ جب وہ لاہور میں بیمار ہوئی تو میرے ماموں اسے اپنے ساتھ گاؤں لے آئے۔ انہوں نے اس کا بہت خیال رکھا۔ لیکن اس کو چین نہیں تھا۔ وہ نیم دیوانی سی ہوگئی تھی۔ ہر ایک دو ماہ بعد چپکے سے لاہور چلی جاتی تھی۔ اس کے پرس میں میری دو تین تصویریں رہتی تھیں۔ لوگوں کو میری تصویریں دکھاتی، گلی کوچوں میں مجھے ڈھونڈتی پھرتی تھی۔ تپتی گرم دوپہروں میں گھنٹوں میرے اسکول کے ارد گرد گھومتی رہتی تھی۔ کئی برس گزرنے کے باوجود اسے وہم رہتا تھا کہ میں اس اسکول کے آس پاس سے کہیں ملوں گا۔ یہاں لاہور میں ایک کتب فروش حاجی عنایت نے اسے اپنی بہن بنا رکھا تھا۔ وہ حاجی عنایت کے گھر کی بیٹھک میں قیام کرتی تھی۔ میرے ماموں اسے یہیں سے واپس گاؤں لے کر جایا کرتے تھے۔ دسمبر کی ایک ٹھٹھری ہوئی رات کو وہ حاجی عنایت کے گھر واپس نہیں آئی، حاجی عنایت اور ان کے گھر والے رات بھر اسے ڈھونڈتے رہے۔ اگلے روز اس دکھیاری کی لاش میو اسپتال کے سرد خانے سے ملی۔ وہ سڑک کے کنارے چلتے چلتے بے ہوش ہو کر گری تھی۔ اس کے بائیں پہلو پر فالج کا حملہ ہوا تھا۔ راہگیروں نے اسے اسپتال پہنچایا۔ اسپتال پہنچتے پہنچتے وہ ختم ہوگئی۔ بتانے والوں نے بتایا کہ مرتے وقت اس کے ہونٹوں پر میرا ہی نام تھا۔''

آصف وارثی کی آنکھیں تر ہوگئیں۔ اس نے جیب سے سفید بے داغ رومال نکال کر آنسو پونچھے اور کچھ دیر گم صم بیٹھا رہا۔ پھر خلا میں گھور کر جیسے اس نے گزرے دنوں کو یاد کیا اور بولا ''اپنے ماموں سے اپنی ماں کے مرنے کی روداد سن کر میرا دل میرے سینے کے اندر پھٹ سا گیا۔ میرا دل چاہا کہ میں بھی اپنی بے کار زندگی ختم کر کے اپنی ماں کے پاس پہنچ جاؤں۔ جس صورت کو دیکھنے کے لیے دس برس تک دن رات آنسو بہائے تھے، وہ منوں مٹی کے نیچے چھپ چکی تھی۔

کئی دنوں یا شاید کئی ہفتوں تک میں ہوش و حواس سے بیگانہ رہا۔ گاؤں کے قبرستان میں جا کر ماں کی قبر کے سرہانے بیٹھا رہتا اور اپنی غلطی کی معافی مانگتا رہتا۔ ایک ناقابلِ بیان پچھتاوا مجھے اندر سے مسمار کر رہا تھا۔ کاش دس سال پہلے کا وہ لمحہ لوٹ آتا جب میرے قدم گھر کی طرف اٹھتے اٹھتے مخالف سمت میں اٹھ گئے تھے۔

زندگی جیسے تیسے جینے کا رستہ ڈھونڈ ہی لیتی ہے۔ کچھ عرصے بعد ماموں ممانی اور چھوٹی بہن کی کوششوں سے میں بھی زندگی کی طرف لوٹنے لگا۔ دو سال پہلے ماموں نے ہی میری چھوٹی بہن کی شادی کر دی تھی اور اب وہ اپنے گھر میں خوش تھی...... ان دنوں میرے دل میں یہ شدید ترین خواہش پیدا ہوئی کہ میں اپنی مرحوم ماں کی خواہش پوری کروں۔ میں تعلیم حاصل کروں اور کچھ بن کر دکھاؤں۔ قریباً چھبیس برس کی عمر میں میں نے ایک بار پھر میٹرک میں داخلہ لے لیا۔ ماں کے چھوڑے ہوئے چند زیورات سے سہارا مل گیا۔ میں نے سخت محنت کی...... دن رات ایک کر دیا...... لیکن تب مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ آج بھی سخت محنت اور کوشش کے باوجود میری ''پروگریس'' تسلی بخش نہیں تھی...... مگر اب ایک بات تھی۔ اب میں بچہ نہیں تھا۔ اب میں اپنی خامیوں اور خوبیوں پر غور کر سکتا تھا اور میں نے خوب غور کیا۔ مجھے پتا چلا کہ میرا مسئلہ آج بھی میرے غیر موزوں مضامین ہیں۔ خاص طور سے کیمسٹری اور میتھ وغیرہ میں میری دلچسپی بالکل نہیں تھی۔ میں نے اپنے اساتذہ سے اس بارے میں تفصیل سے مشورہ کیا۔ آخر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھے سائنس کے بجائے آرٹس رکھنی چاہیے۔ آخر آرٹس بھی تو علم کی ایک معروف شاخ تھی۔ میں نے آرٹس کے مضامین رکھے۔ خوب جم کر محنت کی اور میٹرک بڑے اچھے نمبروں سے پاس کیا۔ میٹرک کے بعد ایف اے اور پھر بی اے...... میں نے یہ امتحانات امتیازی نمبروں سے پاس کیے۔ میرے دل میں یہ بات جم گئی تھی کہ میں آرٹس کے مضامین میں ہی کچھ کر کے دکھاؤں گا اور دوسروں کے لیے مثال قائم کروں گا۔ ایم اے میں میں نے انگلش رکھی اور پنجاب یونیورسٹی سے امتیازی نمبر حاصل کیے۔ اس کے بعد ایم اے معاشیات کیا۔ یہیں سے میری دلچسپی ''ہوٹل مینجمنٹ'' کی طرف ہوگئی۔ اس شعبے میں میں نے اوپر تلے دو اہم ڈپلومے حاصل کیے اور پھر ایک ڈپلوما کے لیے انگلینڈ بھی گیا۔ اس کے بعد میں ہوٹلنگ کے کاروبار کی طرف آگیا۔ میں نے جدید طرز کا ایک پیزا ریسٹورنٹ بنایا۔ پھر دوسرا پھر تیسرا...... اب پیزا پیلس کا نام کئی شہروں میں بڑی اچھی طرح

جانا پہچانا جاتا ہے...... کئی شہروں میں اس کی شاخیں کھل چکی ہیں۔ میں ہر طرح ایک کامیاب شخص ہوں...... ہاں بیٹی! میں سائنس پڑھے بغیر بھی ایک کامیاب شخص ہوں۔ مشہور و معروف ڈاکٹر اور انجینئر ایک ماہ میں اتنا نہیں کماتے ہوں گے جتنا میں ایک دن میں کما لیتا ہوں۔ میں نے شادی کی ہے، میرے بچے ہیں اور ان کے بچے بھی ہیں۔ لیکن ایک بچہ آج بھی میرے اندر چھپا ہوا ہے...... یہ بچہ آج بھی اس اسکول کے اردگرد رہنا چاہتا ہے۔ جیسے اسے امید ہو کر اس کی ماں آج نہیں تو کل اسے لینے کے لیے یہاں آئے گی۔ میں اس کرسی پر اس شیشے کے پاس بیٹھا رہتا ہوں۔ میں سب کچھ جانتا ہوں۔ پھر بھی یہاں بیٹھنا اور چھٹی کے وقت اسکول کے گیٹ کی طرف دیکھتے رہنا مجھے اچھا لگتا ہے۔''

آصف عثمانی کا گلا رندھ گیا۔ آنکھیں پھر نم ہو گئیں۔

کھڑکیوں کے باہر بھی بارش کا زور ٹوٹنے میں نہیں آرہا تھا۔ گاہے بگاہے بجلی چمکتی تھی اور بادلوں کی گڑگڑاہٹ سے در و دیوار لرز جاتے تھے۔ ایک بار اتنے زور سے بجلی کڑکی کہ یہی لگا، کہیں آس پاس گر گئی ہے۔ پریشان ماں پوری جان سے لرز گئی۔ وہ کراہی ''ہائے میں کیا کروں؟ وہ کہاں ہوگا؟ وہ تو بجلی سے ڈرتا ہے...... ہائے اللہ میں کدھر جاؤں۔ دو دن سے بخار ہے اسے...... صبح ناشتہ بھی نہیں کر کے گیا تھا'' وہ سسکنے لگی۔

آصف کھوئی کھوئی آبدیدہ آواز میں بولا ''جن کے جانے سے اتنا تڑپنا پڑے انہیں جانے ہی نہیں دینا چاہیے۔ کیونکہ جب قدم اٹھ جاتے ہیں...... تو پھر بہت دور بھی نکل جایا کرتے ہیں۔

آج کل...... کے حالات آج سے پچاس سال پہلے کے حالات سے کہیں زیادہ خراب ہیں۔ آج تو یہ شہر انسانوں سے بھرے ہوئے خطرناک جنگل بن گئے ہیں۔''

عورت کا رنگ زرد تر ہوتا جا رہا تھا۔ وہ بار بار کچھ بڑبڑانے لگتی تھی۔ غالباً دعائیں پڑھ رہی تھی۔ سامنے ہی پیزا پیلس کے ڈائننگ ہال میں ٹی وی چل رہا تھا۔ نیوز چینل سے مسلسل خبریں آرہی تھیں۔ طوفان باد و باراں کی خبر بھی بار بار نشر ہو رہی تھی۔ اچانک ایک خبر نے عورت کے ساتھ ساتھ آصف کو بھی پوری طرح متوجہ کر لیا۔ یہ تازہ ترین خبر دل دہلا دینے والی تھی۔ ایک قریبی شاہراہ پر ہوا کے زور سے ایک بہت بڑا ہورڈنگ (اشتہاری بورڈ) زمین بوس ہو گیا تھا۔ اس کے نیچے آکر دو افراد ہلاک اور کئی زخمی ہو گئے تھے۔ ہلاک ہونے والوں میں اسکول کا ایک بچہ بھی تھا۔ نیوز چینل کا کیمرا تازہ ترین مناظر دکھا رہا تھا۔ چند افراد ہلاک ہونے والے لہولہان بچے کو افراتفری کے عالم میں ایمبولینس کے اندر ڈال رہے تھے۔ بچے کی ایک جھلک نظر آئی تو عورت کربناک انداز میں چلا اٹھی۔ اس کی لرزہ خیز آواز پورے پیزا پیلس میں گونجتی اور لپکتی چلی گئی۔ ''میرا بچہ...... ہائے میرا بچہ......''

اس نے دہائی دی اور اٹھ کر دیوانہ وار باہر بھاگی۔ باہر بارش کی طوفانی بوچھاڑیں اور چنگھاڑتی ہوئی ہوائیں تھیں لیکن اب وہ ہر خطرے سے بے نیاز ہو چکی تھی۔ ''ہائے میرا نومی'' وہ روتی کرلاتی سڑک پر پہنچی۔ آصف عثمانی اس کے پیچھے بھاگا اس سے پہلے کہ وہ عالم دیوانگی میں کسی گاڑی سے ٹکرا جاتی، آصف عثمانی نے اسے تھام لیا...... اور کھینچتا ہوا واپس اپنے ریسٹورنٹ میں لے آیا۔

اس نے اسے شانوں سے پکڑ کر جھنجوڑا ''ہوش کرو بیٹی، یہ تمہارا بچہ نہیں ہے...... یہ نہیں ہے تمہارا بچہ......''

وہ حیرت زدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولا ''تمہارا بچہ میرے پاس ہے...... آؤ میں تمہیں ملاؤں اس سے۔''

چند سیکنڈ بعد ایک اندرونی کمرے...... سے عورت کا تیرہ چودہ سالہ بیٹا اپنے اسکول بیگ سمیت برآمد ہوا اور ماں سے لپٹ گیا۔ ماں اور بچے کا ملاپ دیدنی تھا۔ ماں بچے کو دیوانہ وار چومتی اور لپٹاتی چلی جا رہی تھی۔ آصف عثمانی ایک کونے میں کھڑا دل گداز نظروں سے اس ملاپ کو دیکھتا رہا۔

دو چار منٹ بعد جب جذبات کا چڑھا ہوا دریا اترا تو آصف عثمانی نے عورت کو بتایا کہ کس طرح اس نے ''پیزا پیلس'' کے اندر سے بچے کی حرکات و سکنات دیکھیں اور اسے اندازہ ہوا کہ بچہ گھر سے بھاگنے والا ہے۔ وہ اسے سمجھا بجھا کر اندر لے آیا، اسے کمرے میں بٹھایا اور کھانا وغیرہ کھلایا۔

عورت بس سر جھکا کر ہچکیوں کے ساتھ روتی چلی جا رہی تھی۔ لیکن یہ خوشی اور تشکر کے آنسو تھے۔ آصف عثمانی نے اس کے کندھے پر اپنا بوڑھا ہاتھ رکھا اور نرمی سے بولا۔ ''بیٹی! میری ماں تو بے چاری ان پڑھ تھی، اپنے بچے کی الجھنوں کو نہ جان سکی لیکن تم تو ان پڑھ نہیں ہو۔ دیکھو! میں تمہارے سامنے...... اور تمہاری جیسی ساری ماؤں کے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں اپنے معصوم بچوں سے بے خبر نہ رہو...... ان سے اچھی امیدیں ضرور لگاؤ لیکن ان امیدوں کا سارا بوجھ، تنہا ان پر ہی نہ ڈال دو...... نہیں تو...... نہیں تو......'' شاید وہ کچھ اور بھی کہتا مگر اس کی آواز بھرا گئی اور وہ رخ پھیر کر تیزی سے اندر چلا گیا۔ آج پھر اس کو اکیلے کمرے میں بیٹھ کر دیر تک رونا تھا۔

شرارت

طاہر جاوید مغل

کبھی کبھی نادانیاں بھی آگہی کے در وا کر جاتی ہیں... اور بالخصوص بچوں کی معصوم شرارتوں کو دیکھ کر تو ایسا لگتا ہے جیسے قدرت ان ننھے منے فرشتوں سے جان بوجھ کر ایسی حرکتیں سرزد کراتی ہے جو بعد میں کسی نہ کسی پیغام کی نشاندہی کررہی ہوتی ہیں۔ بچے کی ایسی ہی ایک ادا نے ماں کو جو اشارہ دیا وہ قدرت کی طرف سے اس کے صبر اور حوصلے کا بہت بڑا انعام ثابت ہوا۔ بات صرف سمجھنے کی تھی۔

دل برداشتہ لمحات میں ایک دوسرے کا حوصلہ بن جانے والے شریک سفر کا قصہ

میرا نام انجم امین ہے۔ میں لاہور کی ایک مشہور بوتیک کی مالک ہوں۔ لاہور میں میری بوتیک کی دو شاخیں ہیں۔ اب حال میں ہی میں نے سیالکوٹ میں تیسری شاخ کا افتتاح کیا ہے۔

وہ جولائی کی ایک گرم شام تھی۔ میں لاہور میں اپنی بوتیک کی مین برانچ میں تھی اور اپنی مخصوص نشست پر بیٹھی چائے سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ یہ سچ ہے کہ چائے کے شوقین موسموں سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ آج موسم کافی گرم
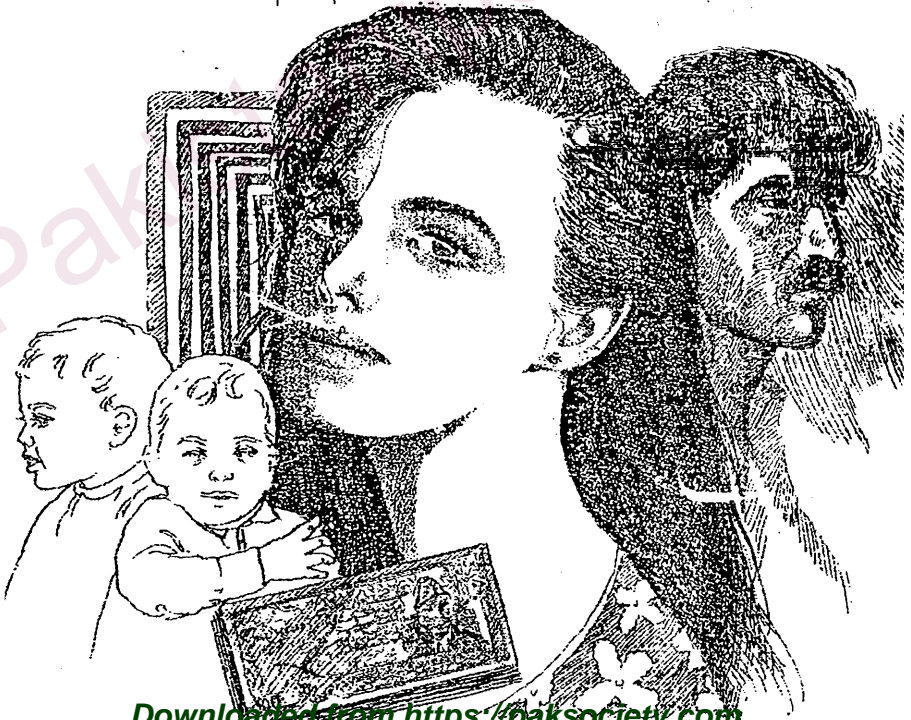
رہا تھا۔ دن کے وقت بھی مشکل سے تین چار کسٹمرز آئے تھے۔ اس وقت شاپ میں دو میاں بیوی لیڈیز کرُتے دیکھ رہے تھے۔ ان کے ساتھ دو چھوٹے بچے تھے۔ بڑے بچے کی عمر تین ساڑھے تین سال سے زیادہ نہیں تھی۔ میں دیکھ رہی تھی۔ شوہر چھوٹے بچے کو اٹھانے کے لیے نیچے جھکا تو اس کی جیب میں سے بال پین نیچے گر گیا۔ یہ پین بڑے بچے نے بڑی تیزی سے اٹھالیا۔ والد اور والدہ کو خبر نہیں ہوئی۔ اسی دوران میں میں نے ایک کال اٹینڈ کی۔ جب دوبارہ دیکھا تو وہ بچہ فرش کی ٹائلز پر بنے ہوئے ڈیزائن پر اپنے والد کا بال پین بڑی تیزی سے چلا رہا تھا۔ تب ہی اس کے والد کی نظر بھی اس پر پڑی۔ وہ شخص موسم کے پیشِ نظر پہلے ہی ذرا تپا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ اس نے بچے کو ڈانٹا اور ایک چپت بھی لگائی۔ میں نے سچویشن کو نارمل کرنے کے لیے فوراً کہا۔ ''ارے نہیں جناب! کوئی بات نہیں۔ بچے کو ماریں مت۔ بچے کے ہر کام میں معصومیت ہوتی ہے اور اکثر کوئی نہ کوئی بہتری اور فائدہ پوشیدہ ہوتا ہے۔''

میرے اس اچانک بولے گئے جملے نے مجھے چھ سات سال پیچھے پہنچا دیا۔ مجھے یاد آنے لگا کہ آج میں اور میری فیملی جس معیار کی زندگی گزار رہے ہیں...... اور یہ شاندار بوتیک کس طرح وجود میں آئی...... ہاں، یہ سب کچھ بھی ایک بچے کی معصوم سی شرارت کا ہی مرہونِ منت تھا۔

میرے شوہر امین یونس اردو کے ایک مقامی روزنامے میں سب ایڈیٹر ہیں۔ ہمارے تین بچے ہیں۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی۔ فیضان، عادل اور انعم۔ آج سے پانچ سال پہلے دوسرے بیٹے عادل کی پیدائش کے بعد اخراجات ایک دم بڑھ گئے۔ عادل کی دیکھ بھال کے لیے چھوٹی چھوٹی ضروریات کی بھرمار تھی اور انہی دنوں فیضان کا بھی اسکول میں ایڈمیشن کرایا گیا تھا۔ اب ہمیں اندازہ ہوا کہ آمدن کے مقابلے میں اخراجات بہت زیادہ ہو گئے ہیں۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ دھیرے دھیرے امین کے مزاج میں تلخی آتی جا رہی ہے۔ آئے دن چھوٹی چھوٹی باتوں پر مجھ پر بگڑنے لگتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ اخراجات کے بوجھ کی وجہ سے ہی تھا۔ ہم نے بڑی کفایت شعاری سے رمضان کے روزے رکھے تھے اور اب عید قریب تھی۔ اپنی تو خیر تھی، پر بچوں کے لیے تو نئے کپڑے درکار تھے۔

ایک دن میں نے امین سے کہا۔ ''عید سر پر آ گئی ہے۔ اپنی تو خیر ہے، بچوں کے لیے نئے کپڑے چاہئیں۔ آپ مجھے ان کے کپڑوں کے لیے کچھ پیسے دے دیں۔''

بس میرا یہی کہنا تھا کہ وہ ایک دم آگ بگولا ہو گئے۔ ''تمہیں کچھ اندازہ بھی ہے کہ میں کس طرح سے ضرورتیں پوری کر رہا ہوں؟ ایک سیلاب ہے خرچوں کا۔ کہاں سے لاؤں اتنے پیسے؟ کوئی ڈاکا ڈالوں یا اپنا گردہ بیچ آؤں......؟''

''امین! میں تو صرف......'' میری بات ادھوری رہ گئی۔

''چپ کر جاؤ خدا کے لیے۔'' انہوں نے چلّا کر کہا اور پاؤں پٹختے ہوئے آفس کے لیے روانہ ہو گئے۔

میری تو حالت ہی عجیب ہو رہی تھی۔ موجودہ صورتِ حال پہ میں سکتے کے عالم میں کافی دیر یونہی کھڑی رہی۔ شکر ہے بچے اس وقت دوسرے کمرے میں سو رہے تھے۔ امین آج سے پہلے کبھی اس انداز میں نہیں بولے تھے۔ بحث تکرار تو چلتی رہتی تھی لیکن ایسی تلخ کلامی کی نوبت کبھی نہیں آئی تھی۔

شام کو بھی وہ وقت پر گھر نہیں آئے۔ میں بڑی پریشان تھی۔ بہرحال جب وہ آئے تو ان کے چہرے پر ٹھہراؤ تھا۔ میں نے شکر کیا۔ اس رات ہم نے تسلی سے بیٹھ کر تفصیل سے بات کی اور اپنے مسائل پر غور کیا۔ ہم نے یہ نتیجہ نکالا کہ ایسے گزارہ مشکل ہے۔ روزگار کا کوئی مزید ذریعہ بھی پیدا کرنا پڑے گا۔

امین نے کہا۔ ''میری نظر میں ایک دکان ہے۔ کرائے پر مل رہی ہے۔ دل چاہتا ہے، وہاں ایک بک شاپ کھول لوں۔ آفس سے آ کر وہاں وقت دوں۔''

''کس جگہ ہے دکان؟'' میں نے پوچھا۔

''مین روڈ پر مدینہ کالونی والے موڑ کے ساتھ ہی۔''

''چلیں آئیں چل کر دیکھتے ہیں۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

ہم نے اسی وقت موٹر سائیکل پر وہاں کا وزٹ کیا۔ جگہ دیکھ کر میرے ذہن میں ایک آئیڈیا لپک کر آیا۔ دکان کی لوکیشن ایک بوتیک کھولنے کے لیے بہت آئیڈیل تھی۔ اسی سڑک پر آگے جا کر دو بڑے شاپنگ مالز اور دو تین بوتیکس بھی تھیں۔ میں نے گریجویشن فیشن ڈیزائننگ میں کی تھی۔ اچھے کپڑے خریدنے اور سینے کا شوق مجھے ہمیشہ سے تھا۔ شادی سے پہلے میں ایک مشہور بوتیک کے لیڈیز پورشن میں ایک ڈیڑھ سال جاب بھی کرتی رہی تھی۔

گھر پہنچ کر میں نے امین کو اپنی رائے سے آگاہ کیا۔ امین کو بھی میرا آئیڈیا اچھا لگا۔ ہم نے بڑی سنجیدگی سے

سوچنا شروع کردیا کہ کیوں نا کسی طرح ہم یہ دکان خرید لیں اور یہاں بوتیک کا کام شروع کریں۔ ایک دفعہ یہ بات ہم دونوں کے ذہن میں بیٹھ گئی تو پھر بیٹھتی چلی گئی۔ ہم نے تہیہ کرلیا کہ جس طرح بھی ہوگا، ہم یہ دکان خریدیں گے اور اپنی ذاتی جگہ پر کام شروع کریں گے۔

ہمارا کل اثاثہ وہ چار مرلے کا رہائشی پورشن تھا جو وراثت میں ہمارے حصے میں آیا تھا۔ اس کے علاوہ میرے کچھ زیورات تھے۔ ہم نے کچھ مزید سوچ بچار کی اور مکان بیچ کر دکان خریدنے کی نیت کرلی۔

اگلے ہی مہینے ہم ایک کرائے کے مختصر گھر میں منتقل ہوگئے اور مکان کو رنگ و روغن کرکے بیچنے کے لیے رکھ دیا۔ کبھی امین پریشان ہوتے تو میں ان سے کہتی۔ ''اللہ سے اچھے کی امید رکھیں امین... بے شک ہم رسک لے رہے ہیں، لیکن رسک کے بغیر تو کوئی کامیابی نہیں ملتی۔''

کبھی میں کرائے کے گھر میں غمزدہ ہوتی تو امین مجھے تسلی دیتے۔ ''پریشانی کے دن تھوڑے ہیں انجم! کاروبار ہو تو سب کچھ ہوجاتا ہے۔ مکان بھی دوبارہ بن جاتے ہیں۔''

وہ ہمارے لیے بڑی خوشی کا دن تھا جب مکان کا بیعانہ ہوا۔ ہمارا مکان اچھی قیمت پر بک رہا تھا۔ امید تھی کہ ہم نہ صرف دکان خرید سکیں گے بلکہ اگر تھوڑی سی کوشش مزید کریں گے تو کاروبار میں ڈالنے کے لیے کچھ سرمایہ بھی مہیا ہوجائے گا۔ وہ ہماری شادی کی ساتویں سالگرہ بھی تھی۔ صبح گیارہ بجے امین مکان کی بقایا رقم کی وصولی کے لیے روانہ ہوگئے تھے۔ بچے اسکول جاچکے تھے۔ میں معمول کے مطابق گھر کے پاس والی مارکیٹ سے سبزی خریدنے گئی۔ وہاں قریب ہی ایک بک شاپ بھی تھی۔ میں نے وہاں سے امین کے لیے ایک خوب صورت سا بال پین خریدا۔ ویسے تو شادی کی ہر سالگرہ پر ہمارے درمیان قیمتی تحائف کا تبادلہ ہوتا تھا لیکن اس دفعہ بجٹ کے پیش نظر اور اپنی موجودہ استطاعت کے مطابق میں نے امین کو تحفے میں دینے کے لیے یہ بال پین خریدا۔ آج کھانے میں بھی میں نے کچھ اسپیشل بنانے کا سوچا تھا۔ امین کی پسند کا کھانا یعنی ایگ فرائڈ رائس اور منچورین۔

میں کچن سے فارغ ہوئی تو امین گھر آگئے۔ میں نے کہا۔ ''آپ تو کہہ رہے تھے کہ بارہ بجے تک آجاؤں گا اور اب ڈھائی بج رہے ہیں۔''

''ہاں، بس فہیم صاحب نے اسٹامپ پیپر کا بندوبست کرتے ہوئے دیر کردی۔'' بیڈ پر بیٹھ کر انہوں نے تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ ساتھ ہی انہوں نے خاکی کاغذ میں لپٹی ہوئی بھاری بھرکم شے مجھے تھمائی اور بولے۔ ''یہ لیں انجم میڈم! مکان کی رقم اور ہمارے خواب کی تکمیل کی طرف ہمارا پہلا قدم۔''

میں نے بسم اللہ پڑھ کر ان کے ہاتھ سے وہ لفافہ لیا۔ وہ بولے۔ ''اسے جاکر سیف کے اسی خانے میں رکھ دو، جہاں زیور پڑا ہے۔ مجھے ڈیلر کے پاس ہی دیر ہوگئی ورنہ بینک میں جمع کروا کر آتا۔''

دراصل جمعہ تھا اور بینک جلدی بند ہوگئے تھے۔ فیضان اور عادل بھی دوپہر کو ہی گھر آگئے تھے۔ فیضان کی اسکول شرٹ کہنی کے پاس سے پھٹی ہوئی تھی۔ ڈیسک کی کوئی میخ وغیرہ لگ گئی تھی۔ امین نے اسے ڈانٹا۔ حالانکہ امین کو فیضان اور عادل سے ایک جیسا پیار تھا لیکن کبھی کبھی وہ فیضان پر تھوڑی سی سختی بھی کردیتے تھے۔ شاید یہ اس کی شرارتوں کی وجہ سے تھا۔ فیضان کو پڑنے والی ڈانٹ کے سوا وہ دن اچھا ہی گزرا۔ شام کو ہم نے چائے کے ساتھ سالگرہ کا کیک کاٹا۔ دونوں بچے بھی خوش تھے۔ امین نے مجھے ایک خوب صورت سا ہیئر کلپ دیا اور میں نے انہیں برانڈڈ بال پین دیا، جو انہیں بہت پسند آیا۔ بولے۔ ''واہ! یہ تو عین حسبِ حال گفٹ ہے۔ میرا پہلا قلم اب جواب دینے لگا تھا۔''

میں نے بھی ان کے گفٹ کے لیے پسندیدگی کا اظہار کیا۔ اسی دوران میں ہمارے پڑوسی بیگ صاحب اور ان کی بیگم ہم سے ملنے آگئے۔ ہم انہیں لے کر ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ بچے باہر ہی کھیل رہے تھے۔ اپنے مہمانوں کے ساتھ ہمیں ایک مرتبہ پھر سے چائے پینا پڑی۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آپ کسی دن بہت خوش ہوتے ہیں اور ہر اس عمل سے بچتے ہیں جو بدمزگی کا باعث بنے اور جب آپ بہت زیادہ پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں تو اکثر آپ کا ڈر حقیقت کا روپ دھار ہی لیتا ہے۔ ہمارے ساتھ بھی یہی ہوا۔ مہمانوں سے فارغ ہوکر جب ہم واپس آئے تو دیکھا کہ فیضان کے ہاتھ میں وہی پین تھا جو میں نے امین کو گفٹ کیا تھا۔ فرش کی ٹائلز پر بنے ڈیزائن کے اوپر بڑی تیزی سے وہ پین چلا رہا تھا اور پھر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ امین نے فیضان کو ایک زوردار تھپڑ دے مارا اور ساتھ میں خوب ڈانٹ پلائی۔ صرف فیضان کو ہی نہیں مجھے بھی۔ ان کا کہنا یہی تھا کہ میرے بے جا..... لاڈ پیار سے فیضان دن بہ دن بگڑتا جارہا ہے۔

میرا دل تو جیسے بجھ کر ہی رہ گیا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کچھ چیزیں غلط ہونے لگیں تو سب ہوتی چلی جاتی ہیں۔ بس اس دن بھی یہی ہوا۔ بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ اب تک جو ہوا، وہ کچھ بھی نہیں تھا۔ آگے ایک ایسا سخت امتحان آ رہا تھا جس نے ان بنیادوں کو ہی ہلا دیا جن پر ہم اپنے خواب کا محل بنا رہے تھے۔

فیضان کو تھپڑ اور ڈانٹ والے واقعے کے بعد ہم نے بس چپ چاپ رات کا کھانا کھایا۔ میں نے بچوں کو سلایا اور خود بھی سونے کے لیے کمرے میں چلی گئی۔ امین ٹی وی پر ایک ٹاک شو دیکھ رہے تھے۔ رات تقریباً پونے گیارہ کا وقت تھا۔ اچانک ہماری ڈور بیل بجی۔ ''اس وقت کون آ گیا؟'' امین نے اپنی چپل پہنتے ہوئے کہا اور دروازہ کھولنے کے لیے باہر نکلے۔ میں بھی پریشان ہوگئی اور امین کے پیچھے چلتی ہوئی صحن تک آ گئی۔ ''کون ہے؟'' امین نے پوچھا۔

''ہاں جی، امین صاحب! میں مبشر ہوں۔ دروازہ کھولیے۔''

مبشر صاحب ہمارے مالکِ مکان تھے۔ یہاں پر شفٹ ہونے کے بعد بس ایک دو دفعہ ہی ملاقات ہوئی تھی ان سے۔ گھر کا کرایہ ان کا چھوٹا بیٹا وصول کرنے آتا تھا۔

امین نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور پھر وہ ہوا جس کی ہمیں ہرگز توقع نہیں تھی۔ تین افراد تیزی سے اندر گھس آئے۔ ان میں سے دو نے اپنے چہرے بڑے بڑے رومالوں (ڈھاٹوں) میں چھپا رکھے تھے۔ دو افراد نے تیزی سے امین کو دبوچ لیا۔ ایک میری طرف لپکا۔ میں صرف ایک بار چلّا سکی۔ اس سے پہلے کہ دوسری مرتبہ چلّاتی لحیم شحیم شخص نے اپنا چوڑا ہاتھ میرے منہ پر رکھ دیا اور مجھے ہلنے جلنے سے قاصر کر دیا۔ یہ دیکھ کر میری دہشت انتہا کو پہنچ گئی کہ امین کو دبوچنے والے دو بندوں میں سے ایک نے سیاہ رنگ کا پستول امین کی کنپٹی سے لگا دیا تھا۔

یہ وہی شخص تھا جس نے اپنا چہرہ چھپا نہیں رکھا تھا۔ یہ کوئی پٹھان یا افغانی لگتا تھا۔ سر تقریباً گنجا تھا۔ نقوش کرخت تھے۔ عمر چالیس سال کے قریب رہی ہوگی۔ وہ پھنکار کر بولا۔ ''اگر گڑبڑی کروگے تو پھر بہت زیادہ گڑبڑی ہوگا۔ ام گولی چلانے میں بالکل دیر نہیں کرے گا۔''

اس کی آواز میں اتنی سفاکی تھی کہ میں لرز کر رہ گئی۔ امین نے بھی ایک دم مزاحمت ختم کر دی۔ ایک شخص نے آگے بڑھ کر بیرونی دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھا دی۔

یہ لوگ مجھے اور امین کو برآمدے میں لے آئے۔ نیم گنجے شخص نے ایک کھڑکی سے کمرے میں جھانکا۔ وہاں ہمارے دونوں بچے حالات کی شدید سنگینی سے بے خبر سو رہے تھے۔ اس نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ''اگر تم دونوں امارے کہنے پر چلے گا تو تمہیں اور تمہارے بچہ لوگ کو ذرا سا بھی نقصان نہیں پہنچے گا۔ دوسری صورت میں خون خرابا ہوگا۔'' اس نے بچہ لوگ کے لفظ پر زور دیا تھا۔

میں نے چوڑے چکلے شخص کا ہاتھ اپنے منہ سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''تم لوگوں کو جو چاہیے یہاں سے لے جاؤ۔ لیکن ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔''

''گھر کا چابیاں کدھر ہے؟'' نیم گنجے شخص نے پٹھانی لہجے میں اردو بولتے ہوئے کہا۔

امین کے چہرے پر شدید کرب کے آثار نظر آئے۔ شاید اسے اپنی ساری جمع پونجی کا خیال آ گیا تھا لیکن اس سے پہلے کہ امین ان بے رحم لٹیروں سے کوئی اور بات کہتے، میں نے بھرائی ہوئی آواز میں انہیں چابیوں کی جگہ بتا دی۔ وہ ہمارے بیڈ کے تکیے کے نیچے رکھی تھیں۔ ایک ڈھاٹا پوش اپنے ہاتھ میں چاقو لہراتا ہوا ہمارے بیڈروم کی طرف گیا اور چابیاں لے آیا۔ میں نے دیکھا امین کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ میری اپنی حالت بھی کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی۔ بہرحال ہم دونوں ہی سمجھتے تھے کہ اپنے بچوں کی سلامتی سے بڑھ کر ہم دونوں کے لیے اور کچھ نہیں۔

ان لوگوں نے بڑے سخت الفاظ میں ہم دونوں کو خاموش رہنے کی وارننگ دی۔ پھر ہمیں گھر کے چھوٹے سے اسٹور میں بند کر دیا۔ ہم وہاں سکتہ زدہ کھڑے رہے اور ایک چھوٹی سی کھڑکی کے راستے، ڈاکوؤں کو اپنے گھر میں دندناتے ہوئے دیکھتے رہے۔

بے بسی جیسی بے بسی تھی۔ میں نے کہیں سن رکھا تھا کہ اس طرح کی وارداتیں مخبری پر بھی ہوتی ہیں۔ کوئی شخص جب اپنا کوئی قیمتی اثاثہ بیچتا ہے اور کیش رقم گھر لاتا ہے تو کبھی کبھی جرائم پیشہ لوگ اس کے پیچھے لگ جاتے ہیں اور رات کو واردات کر ڈالتے ہیں۔ شاید ہمارے ساتھ بھی یہی کچھ ہو رہا تھا۔ پندرہ بیس منٹ کے اندر ان خبیثوں نے کیش اور زیورات سمیت وہ سب کچھ حاصل کر لیا جو کرنا چاہتے تھے۔

اسٹور کے اندر امین نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ہم لٹ گئے انجم۔''

میں نے تسلی دینے والے انداز میں ان کے ہاتھ

اپنے لرزاں ہاتھوں میں تھام لیے۔

ان لوگوں نے کچن میں جا کر ہمارا فریج کھولا اور اس میں کھانے پینے کی جو بھی چیز ملی کھا گئے، ان میں ہماری سالگرہ کا بچا ہوا کیک بھی شامل تھا۔ وہ آپس میں باتیں بھی کررہے تھے۔ نیم گنجا شخص اپنے ایک ساتھی کو لبو کہہ کر بلا رہا تھا۔ اسٹور کے اندر ہم دونوں کی بس ایک ہی خواہش تھی، یہ لوگ اب جلد سے جلد ہمارے گھر سے نکل جائیں۔

آخر وہ گھڑی آگئی۔ وہ لوگ جانے کے لیے تیار نظر آنے لگے۔ کیش اور زیورات انہوں نے فیضان کے ہی خالی بستے میں رکھ لیے تھے۔ یہ بستہ نیم گنجے شخص کے ہاتھ میں تھا۔ وہ ہم سے آٹھ دس قدم کے فاصلے پر تھے اور ان کی مدھم آوازیں ہمارے کانوں تک بھی پہنچ رہی تھیں۔

لبو کی آواز آئی۔ ”کل کہاں ملاقات ہوگی خاناں؟“

”کالونی والے گھر آجانا۔“ نیم گنجے سرغنہ کی آواز سنائی دی۔

”وہ تو مشکل ایڈریس ہے خاناں۔ پچھلی بار کی طرح خجل خوار ہوتا رہوں گا۔“

”اچھا روتا کیوں ہے۔ ام چھوٹے لالے کا پون نمبر (فون نمبر) دیتا ہے تمہیں۔“ نیم گنجے نے کہا۔

امین اور میں نے کھڑکی میں سے دیکھا۔ ٹیوب لائٹ کی روشنی میں وہ تینوں صاف دکھائی دے رہے تھے۔ نیم گنجے سرغنہ نے فیضان کا بستہ خالی کرنے کے لیے ساری کتابیں کاپیاں میز پر الٹ دی تھیں۔ اس نے ان میں سے ایک کاپی اٹھائی اور اس پر فون نمبر لکھنے لگا۔ میں نے غور سے دیکھا، اس کے ہاتھ میں وہی قیمتی بال پین تھا جو چند گھنٹے پہلے میں نے امین کو تحفے میں دیا تھا اور فیضان نے فرش پر رگڑ رگڑ کر خراب کر دیا تھا۔ سرغنہ جھلایا ہوا نظر آیا۔ شاید پین لکھ نہیں رہا تھا۔ اس نے فونٹین پین کی طرح بال پین کو جھٹکا اور پھر لکھنا چاہا۔ دوسری تیسری کوشش میں وہ بہ مشکل کامیاب ہوا۔ اس نے کاپی کا ورق پھاڑ کر لبو کے حوالے کیا۔ اس کے بعد وہ اسٹور روم کی طرف آگیا۔ اس نے اسٹور کا دروازہ باہر سے کھول دیا لیکن اس کے ساتھ یہ دھمکی بھی دی کہ اگر اگلے پانچ منٹ تک ہم نے اسٹور سے قدم باہر نکالا یا شور مچانے کی کوشش کی تو ہمارے حق میں بے حد برا ہوگا۔ وہ چلے گئے اور ہم حسرت سے انہیں جاتے دیکھتے رہے۔ ہمارے دل سینوں میں ٹھہر سے گئے تھے۔

☆☆☆

ڈاکے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلی۔ ”آپ

ذہانت

ایک قصبے میں ایک سرمایہ دار رہتا تھا۔ وہ ہر سال نئے مزدور تلاش کرتا تھا اور انہیں سالانہ تنخواہ دیا کرتا تھا...... لیکن وہ ان کی تنخواہ کاٹنے کے بہانے ڈھونڈتا رہتا تھا مگر ملّا کو اس بات پر یقین نہیں آتا تھا۔ بادشاہِ وقت نے ملّا سے کہا کہ وہ تحقیقات کرے اور دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی علیحدہ کرے۔

ملّا نے اس سرمایہ دار کے ہاں ملازمت کرلی۔ جب ایک سال مکمل ہوا تو سرمایہ دار نے ملّا کو طلب کر کے سرد مہری سے کہا۔ ”تمہیں میرے ہاں ملازمت کرتے ہوئے پورا ایک سال ہوگیا ہے۔ میں تمہیں پورے ایک سال کی تنخواہ دوں گا لیکن تمہیں پہلے میرے ایک سوال کا جواب دینا ہوگا۔“

ملّا نے کہا۔ ”سوال کیا ہے؟“

سرمایہ دار بولا۔ ”سوال یہ ہے کہ میرے سر کا وزن کتنا ہے؟ لیکن ایک بات کان کھول کر سن لو کہ اگر تم نے غلط جواب دیا تو میں تمہیں ایک پائی بھی نہیں دوں گا۔“

ملّا نے کچھ دیر اس کے منڈے ہوئے سر کی طرف دیکھا۔ پھر بولا۔ ”ڈھائی سیر۔“

سرمایہ دار بولا۔ ”بالکل غلط ہے۔“

ملّا نے سنجیدگی سے کہا۔ ”جناب اگر آپ کو شک ہے، تو میں آپ کا سر کاٹ کر ترازو میں تول دیتا ہوں۔“ اور ساتھ ہی خنجر نکال لیا۔ ”اس طرح فیصلہ ہوجائے گا کہ میرا جواب صحیح ہے یا غلط۔“

سرمایہ دار گھبرا گیا اور جلدی سے بولا۔ ”نہیں...... نہیں تمہارا جواب بالکل صحیح ہے۔“ اس کے بعد اس دھوکے باز سرمایہ دار نے کسی مزدور کے پیسے نہیں کاٹے۔

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

نے سنا ہے، نئے کرائے داروں کے گھر میں ڈاکا پڑ گیا۔"
محلے میں ہر شخص کی زبان پر یہی بات تھی۔ ہم میاں بیوی تو دو دن تک سکتے کے عالم میں ہی رہے۔ یقین نہیں آتا تھا کہ ہمارے ساتھ ایسا ہو چکا ہے۔ بچے بھی افسردہ اور سہمے ہوئے لگتے تھے۔ ہمارے پرانے محلے سے بھی ہمارے ساتھ والی آنٹی جن سے ہماری اچھی خاصی شناسائی تھی، ہمارے گھر افسوس کے لیے آئیں اور بھی کئی لوگ پہنچے۔ غرض یہ کہ چند دن گھر میں سوگ کا سماں ہی رہا۔ اسی دوران میں لاہور کے باہر سے بھی ہم دونوں کے عزیز ہم سے ملنے آئے۔ ان میں امین کے بڑے بھائی فہیم بھائی بھی تھے۔ ان کا بڑا بیٹا جو فیصل آباد میں تھا، پولیس میں اے ایس پی تھا۔ ان کے ریفرنس سے ہم نے ایف آئی آر بھی کٹوائی۔ ہم فہیم بھائی کی کار میں ان کے ساتھ ہی پولیس اسٹیشن سے واپس آرہے تھے۔ امین حد درجہ افسردہ تھے۔ بولے۔
"فہیم بھائی! سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارے ساتھ یہ سب کچھ کیوں ہوا۔ کبھی کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کی۔ کسی کا حق نہیں مارا۔ اپنی توفیق کے مطابق صدقہ خیرات بھی کیا ہے۔"
فہیم بھائی نے تسلی دی۔ "کتنا بڑا شکر ہے کہ اللہ پاک نے تم لوگوں کی جانیں محفوظ رکھی ہیں۔ بہرحال جو مالی نقصان ہوا ہے، اس کا بھی اللہ پاک مداوا ضرور کرے گا۔ تم لوگوں کو بے یارومددگار نہیں چھوڑے گا۔"
فہیم بھائی اسی دن واپس چلے گئے۔ ان کے جانے کے تین چار دن بعد پولیس اہل کار ہمارے گھر آئے۔ انہوں نے بتایا کہ ہمیں اے ایس پی صاحب نے بھیجا ہے۔ انہوں نے واردات کے حوالے سے کچھ مزید معلومات لیں اور چلے گئے۔ میں نے امین سے کہا۔ "لگتا ہے کہ انہوں نے ہمارے کیس کو سنجیدگی سے لیا ہے، ورنہ یہ لوگ تو مڑ کر بھی نہیں دیکھتے۔"
"ہاں دیکھو، کیا بنتا ہے۔" امین نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "ویسے آج ایک دوست سے بات ہوئی تھی۔ وہ تو کہہ رہا تھا کہ جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب بھول جاؤ سب کچھ۔ تھانے کچہری وغیرہ کے چکر میں رہے تو تمہاری جاب بھی متاثر ہو سکتی ہے۔ ایسی وارداتوں کے کھوج کم ہی ملتے ہیں۔"
"امین! ایسی بات نہ کریں۔ آپ کو یاد ہے نا فہیم بھائی نے کہا تھا خدا کی ذات پر بھروسا رکھیں۔" دن گزرتے رہے۔ اب واردات کو ہوئے قریباً تین ہفتے ہو چلے تھے۔ مایوسی مجھ پر بھی غالب آنا شروع ہو گئی تھی۔

ایک دن بچے اسکول سے آئے۔ میں نے انہیں کھانا وغیرہ دیا اور پھر بڑے دکھی دل کے ساتھ بستر پر نیم دراز ہو گئی۔ فیضان اپنا کلاس ورک دکھانے کے لیے میرے پاس آیا۔ اتنی معصوم شکل بنا رکھی تھی اس نے کہ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی کاپی دیکھنے لگی۔ اچانک میں بری طرح چونک گئی۔ پورے جسم میں جیسے ایک برق سی دوڑ گئی۔ فیضان نے کاپی پر لکھتے ہوئے ذرا دبا کر لکھا تھا۔ کھڑکی سے آنے والی روشنی کاپی کے صفحات پر ترچھی پڑ رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ فیضان کی لکھائی کے مدھم نقوش نیچے والے خالی صفحے پر بھی آرہے تھے۔ کچھ پڑھا تو نہیں جارہا تھا مگر نشانات موجود تھے۔ میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ مجھے اس منحوس رات کا وہ منظر یاد آ گیا، جب نیم گنجا سرغنہ فیضان کی کاپی پر کوئی فون نمبر لکھ رہا تھا۔ وہ امین کے خراب بال پوائنٹ سے لکھ رہا تھا اور بہت دبا دبا کر لکھ رہا تھا۔ میں اٹھ کر دیوانہ وار اس الماری کی طرف گئی جہاں بچوں کی کاپیاں، کتابیں رکھی رہتی تھیں۔ میں نے پندرہ بیس سیکنڈ کے اندر مطلوبہ کاپی ڈھونڈ لی۔ میں نے اندھا دھند صفحے پلٹے اور پھر ایک خالی صفحے پر میری نگاہیں جم کر رہ گئیں۔ وہاں ایک فون نمبر نشانات کی صورت میں موجود تھا اور پڑھا جارہا تھا۔ میں نے کاپی کو ذرا ترچھا کیا، نمبر بالکل واضح ہو گیا۔ میں امین کو یہ اطلاع دینے کے لیے ٹیلی فون کی طرف بھاگی۔

☆☆☆

اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ انتہائی تیز رفتاری سے ہوا۔ وہ فون نمبر ایک ایسا کھوج تھا جس نے صرف دس بارہ گھنٹوں کے اندر پولیس کو مجرموں کی شہ رگ تک پہنچا دیا۔ سرغنہ سمیت چھ سات افراد گرفتار ہوئے۔ اگلے چوبیس گھنٹوں میں انہوں نے نہ صرف اپنے جرم کا اعتراف کیا بلکہ مالِ مسروقہ بھی برآمد کروا دیا۔ جو رقم ہمارے گھر سے گئی تھی اور جو برآمد ہوئی، اس میں صرف بیس پچیس ہزار کا فرق تھا۔ میرا زیور بھی جوں کا توں مل گیا تھا۔
اوپر والے کے کام اوپر والا ہی جانتا ہے۔ قیمتی بال پوائنٹ کے ساتھ فیضان کی معصوم شرارت نے ایک موقع پر ہمیں بہت تکلیف دی تھی لیکن اس کی یہی شرارت ہمارے لیے بعد ازاں ایک بہت بڑی راحت اور خوشی کا باعث بن گئی تھی۔ میں کبھی کبھی اپنے شاندار بوتیک اور گھر کو دیکھتی ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے کہ قدرت نے ہمیں یہ سب کچھ ایک معصوم شرارت اور ایک خراب بال پوائنٹ کے وسیلے سے دیا ہے۔

وہ ایک بہت تلخ رات تھی۔ ''دیکھو ثانیہ! میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔ میں تمہارے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتا۔'' ندیم کے چہرے پر ایک فیصلہ کن کیفیت تھی۔

''ندیم! خدا کے واسطے ایسا مت کہیں۔ بچوں کا کیا بنے گا؟'' ثانیہ کو اپنی آواز آنسوؤں اور کرب میں ڈوبی ہوئی اور کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

ندیم مزید بپھر کر بولا۔ ''یہی تو تمہارے پاس ایک حربہ ہے۔ بچوں کی بیڑیاں میرے پاؤں میں ڈال کر میری پوری

پھر یاد آئی

طاہر جاوید مغل

وقت کا احساس بغیر کسی وجود کے بھی ہمیشہ انسانی دماغ کو اپنے شکنجے میں کسے رکھتا ہے۔ یہی اس کی طاقت ہے اور اگر ماضی اچھا ہو تو اکثر آنکھوں میں آنسو بھی لاتا ہے جیسا کہ اس کے ساتھ ہوا۔ یہی وقت جب کسی پر مہربان تو تمام انسان مہربان اور جب وقت اپنی سنگدلی پر اترے تو ساری مہربانیاں اٹھا کر ایک طرف رکھ دیتا ہے۔ جس کو ٹھوکر مار کر اس نے بھی گھر کے دروازے سے دور کیا تھا اسی کے قدموں میں وقت اسے پھر لے آیا مگر... اس کی نفرت کی انتہا کہ اس نے ٹھوکر میں رہنے کا بھی موقع نہ دیا... یہ وقت کی ظالم صورت نہیں تو اور کیا ہے۔

رشتوں کو قدموں تلے روندنے والے ایک فاتح کی بے بسی کا احوال

زندگی جہنم بنانا چاہ رہی ہو۔ میری آنے والی نسل کو برباد کر رہی ہو۔'' ندیم کا پارا چڑھا ہوا تھا۔ وہ ایسی باتیں بھی کہہ رہا تھا جو شاید وہ فی الحال کہنا نہیں چاہ رہا تھا۔

''ثانیہ! میری اور تمہاری شادی درحقیقت شادی نہیں تھی۔ یہ صرف تمہارے ماں باپ کی سوچی سمجھی سازش تھی۔ ایک دھوکا تھا اور میری زندگی کے ساتھ ایک کھلواڑ تھا۔ انہوں نے اپنی بیٹی کی زندگی اور خوشی کی خاطر میری زندگی میں زہر گھول دیا۔ ایک پیدائشی بیمار کو میرے پلّے باندھ دیا۔'' اس نے غصے میں اپنی وارڈروب پر مکّا مارتے ہوئے کہا۔ ''لیکن یاد رکھو، میں تمہیں اور تمہارے ماں باپ کو اپنی زندگی کے ساتھ مزید کھیلنے نہیں دوں گا۔ یہ سب کچھ اب میری برداشت سے باہر ہے۔''

وہ ہچکیوں سے رونے لگی۔ وہ بولنا چاہ رہی تھی اور بول نہیں پا رہی تھی۔ وہ گھٹنوں کے بل قالین پر بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ جھکا ہوا تھا اور اس کے آنسو لگاتار اس کے چہرے پر بہہ کر اس کی جھولی میں گر رہے تھے۔ ندیم ایک بار پھر گرجا۔ ''ہاں، یہ سب میری برداشت سے باہر ہے اور شاید اب وہ وقت آگیا ہے جب ہمارے راستے جدا ہو جانے چاہئیں اور...... تمہیں تمہارے کیے کی سزا ملنی چاہیے۔''

ندیم کی آواز پورے گھر میں گونج رہی تھی۔ ان کی بیٹی ثمرین جو تقریباً تین سال کی تھی، وارڈروب کے نچلے خانے سے کھلونے نکالنے میں مصروف تھی۔ بہ ظاہر اس نے خود کو کھلونوں میں مصروف کیا ہوا تھا لیکن پریشانی اور کرب کے آثار نمایاں طور پر اس کے معصوم چہرے پر نظر آرہے تھے، جو اس بات کی دلیل تھے کہ وہ اپنے اردگرد کے ماحول سے پوری طرح متاثر ہے۔ بیٹا آیان صرف دو ماہ کا تھا۔ وہ بستر پر پڑا بے چینی سے رو رہا تھا۔ شاید اسے بھوک لگی تھی۔ اس کے نحیف بازو اور ٹانگیں مسلسل حرکت کر رہے تھے۔

ندیم ثانیہ کے پاس بیٹھا اس کو شانوں سے پکڑا اور آتشیں لہجے میں بولا۔ ''اب جب تم ان بچوں کو لے کر اپنے ماں باپ کے گھر بیٹھو گی نا... تو انہیں پتا چلے گا کہ بیٹیوں کے گھر جھوٹ بولنے اور دھوکا دینے سے آباد نہیں ہوتے۔ جھوٹ برباد کرتا ہے، صرف برباد کرتا ہے۔ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں...... طلاق دیتا ہوں......''

ثانیہ نے ہاتھ جوڑ دیے۔ ''خدا کے لیے ندیم ایسا مت کہیں......''

ثانیہ کا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی ندیم نے اسے زور سے پیچھے کی طرف جھٹکتے ہوئے کہا۔ ''طلاق دیتا ہوں میں تمہیں۔''

ثانیہ جڑ سے اکھڑے ہوئے درخت کی طرح وہیں قالین پر ڈھیر ہو گئی۔ اس کی ہچکیوں کی آواز اب باقاعدہ رونے میں بدل گئی۔ اس کے رونے میں کرب تھا، بے بسی تھی، دہائی تھی اور خوف تھا۔ آیان کے رونے میں بھی اب شدت آگئی تھی۔

ندیم نے اپنا لیپ ٹاپ بیگ پکڑا اور روتے ہوئے بچے کو نظرانداز کرتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ مسلسل رونے سے بچے کے گلے میں پھندا سا لگ گیا تھا۔ ثانیہ اپنے اوپر ٹوٹنے والی قیامت کو وقتی طور پر بھول گئی۔ فوراً اٹھی اور اس کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی۔ ندیم پاؤں پٹختا ہوا دروازے تک جا چکا تھا۔ جاتے جاتے رک گیا۔ واپس آیا اور ثانیہ کی طرف انگلی اٹھا کر غضب ناک آواز میں گرجا۔ ''اور کان کھول کر سن لو، تمہارے پاس صرف اور صرف کل کا دن ہے جو کچھ اس گھر سے لینا ہے لے لو اور دفع ہو جاؤ۔ پرسوں میں جب یہاں آؤں تو مجھے تمہاری منحوس صورت یہاں دکھائی نہیں دینی چاہیے اور دوسری بات...... ان بچوں کو ابھی لے جاؤ مگر یہ بات اپنے کھوپڑے میں بڑی اچھی طرح بٹھا لو۔ یہ میرے بچے ہیں، صرف میرے بچے۔ وقت آنے پر میں نے ان کو لے جانا ہے......''

اس کی آواز جیسے ایک زہریلی چنگھاڑ تھی جو پورے گھر میں گونج رہی تھی پھر وہ تندبگولے کی طرح باہر نکل گیا۔

اور یہ وداع کی رات تھی۔ باہر بادل گرج رہے تھے اور تیز ہوا سے کھڑکیاں دروازے تھرا رہے تھے۔ وہ ثمرین اور آیان کو اپنے ساتھ لگائے بیٹھی تھی، جیسے کسی پرندے نے اپنے بچوں کو پروں میں چھپا رکھا ہو، اس نے اپنا سامان سمیٹ لیا تھا اور سامان تھا ہی کتنا؟ اپنے اور بچوں کے کپڑوں کے چند جوڑے۔ ثمرین کی دو چار کتابیں اور کاپیاں، وہ چھوٹے چھوٹے تحفے جو گزری ''برتھ ڈیز'' پر ندیم نے اسے اور ثمرین کو دیے تھے۔ ایک بڑا فوٹو البم جس میں پچھلے تین چار سال کی سنہری یادیں تھیں اور بس۔ اس نے باقی کسی شے کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ دل ہی دل میں کہا تھا...... ندیم! یہ تمہارا گھر ہے، یہ تمہاری چیزیں ہیں۔ میں تو ایک ''چند روزہ مہمان'' کی طرح یہاں آئی تھی اور جا رہی ہوں۔

بادل زور سے گرجا۔ ننھی ثمرین نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ماما... بڑی دیر ہو گئی ہے، پاپا کب آئیں گے؟ کیا وہ آج بھی نہیں آئیں گے؟''

''ہاں شاید وہ آج بھی نہیں آئیں گے۔ وہ دور گئے

ہیں۔'' وہ اشک بار آواز میں بولی۔

''وہ کیوں دور گئے ہیں؟'' اس نے توتلی زبان میں دریافت کیا۔

''یہ تو اپنے اللہ میاں سے پوچھو نا کہ کبھی پاپا...... اور کبھی ماما... اپنے بچوں سے اتنی دور کیوں چلے جاتے ہیں؟'' ثانیہ نے سسک کر کہا اور ثمرین کو اپنے ساتھ لگا کر بھینچ لیا۔ وہ وہیں بیٹھے بیٹھے سو گئی۔ ثانیہ کی آنکھوں کے سامنے ماضی کی کھڑکی کھل گئی۔ یادوں کے سلسلے دراز ہونے لگے...... ثانیہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس کی پیدائش پر اس کے والدین بہت خوش تھے لیکن بہت کچھ بدلنے والا تھا اور بہت جلد بدلنے والا تھا۔ ثانیہ اپنی پیدائش کے ڈیڑھ دو ماہ بعد سے ہی بیمار رہنے لگی تھی۔ مختلف ڈاکٹرز سے اسے چیک کرایا گیا۔ بالآخر اس کے والد سرمد صاحب جب ایک معروف لیبارٹری سے اس کی ٹیسٹ رپورٹس لے کر ڈاکٹر کے پاس گئے تو اس نے پیشہ وارانہ لہجے میں انہیں بتایا کہ ان کی بچی خون کی بیماری کا شکار ہے اور یہ تھیلیسیمیا کی ہی ایک قسم ہے۔ ساتھ ہی ڈاکٹر نے ان سے تسلی تشفی کی باتیں کیں اور کہا کہ اگر باقاعدہ علاج ہو اور کچھ پرہیز کا خیال رکھا جائے تو کافی حد تک اور کافی دیر تک اس بیماری کو قابو میں رکھا جا سکتا ہے۔ آگے جا کر یہ بیماری مکمل طور پر ٹھیک بھی ہو سکتی ہے۔

وقت اپنی مخصوص رفتار سے آگے کی طرف سرکتا رہا۔ ڈاکٹروں کے مشورے کے مطابق ثانیہ کی ٹریٹمنٹ ہوتی رہی۔ گاہے بگاہے اسے خون بھی لگتا رہا۔ ثانیہ کی والدہ شروع شروع میں تو بہت رنجیدہ رہیں لیکن پھر انہوں نے خود کو پوری طرح ثانیہ کی دیکھ بھال اور تعلیم و تربیت کے لیے وقف کر دیا۔ ثانیہ اپنے والدین کے گھر ان کی شادی کے پانچ سال بعد پیدا ہوئی تھی اور اس کے بعد ان کی مزید کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ یہی وجہ تھی کہ ثانیہ اپنے والدین کی زندگی کا مرکز و محور تھی۔ وہ اس کی آنکھوں کی چمک اور چہرے کی مسکراہٹ کے لیے اپنا سب کچھ لٹانے کے لیے تیار رہتے تھے۔

ثانیہ نے اپنے والدین کی توجہ و محبت، ڈاکٹرز کی محنت اور سب سے بڑھ کر اللہ کی مرضی اور منشا کے طفیل جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا۔ اس کی بیماری کافی حد تک کنٹرول میں تھی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ اسے دو تین ماہ تک خون کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی اور وہ جیسے بھول ہی جاتی تھی کہ وہ بیمار بھی ہے۔ ثانیہ اب سیکنڈ ایئر میں تھی۔

ایک خیال تھا، ایک سوچ تھی جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سرمد صاحب اور ان کی بیوی آسیہ کے ذہن میں جڑ پکڑ رہی تھی اور وہ سوچ تھی ثانیہ کی شادی۔ اس کی معاشی و معاشرتی ضرورت کی۔ ثانیہ کے لیے ایک ایسے ناتے کی جو ان کے جانے کے بعد ثانیہ کو سہارا دے۔ اس کے لیے سائبان بنے۔ پھر کچھ ایسا ہوا کہ حالات نے پلٹا کھایا اور انہیں اپنی پریشانی خوشی اور امید میں بدلتی دکھائی دی۔

ایک دن شام کو سرمد صاحب بستر پر لیٹے تو ثانیہ کی والدہ آسیہ بیگم ان کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔ ان کے چہرے پر دبا دبا جوش تھا۔ ''سرمد! آج آپ سے ایک بڑی اہم بات کرنی ہے۔''

''ہاں بولو۔'' سرمد صاحب تھوڑا سا اٹھ کر ٹیک لگانے والے انداز میں نیم دراز ہو گئے۔

''آج میں اور ثانیہ سپر اسٹور گئے تھے کچھ چیزیں لینے۔ وہاں ہمیں ایک عورت ملی۔ وہ دیکھنے میں ہی بہت بھلی اور ملنسار لگتی تھیں۔''

''ہاں ہاں۔ آگے بھی بولو۔''

''انہیں ثانیہ بہت پسند آئی ہے۔ وہ رشتے کے سلسلے میں ہمارے گھر آنا چاہتی ہیں۔'' آسیہ بیگم بڑے غور سے اپنے شوہر کے تاثرات دیکھ رہی تھیں، ان کے چہرے پر پہلے امید کی کرن سی چمکی لیکن پھر چہرہ سپاٹ ہو گیا۔

انہوں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''کوئی فائدہ نہیں آسیہ بیگم۔ اگر وہ ہمیں اور ہم انہیں پسند آ بھی جائیں تو جب انہیں ثانیہ کی تکلیف کا پتا چلے گا تو وہ پیچھے ہٹنے میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کریں گے۔''

''پتا نہیں، مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ وہ خاتون کوئی فرشتہ ہی تھیں اور جس طرح انہوں نے اپنی چاہت کا اظہار کیا ہے، میرا دل ان کی طرف کھنچتا ہے۔''

سرمد صاحب خاموش رہے۔ آسیہ بیگم نے ذرا توقف کر کے کہا۔ ''چلیں، انہیں آنے تو دیتے ہیں۔ ملنے میں تو کوئی حرج نہیں۔ پھر ہم نے کون سا خود انہیں مدعو کیا ہے۔ وہ اپنی چاہت سے ملنا چاہتے ہیں۔''

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان کا ذہن کسی شدید خواہش یا اندیشے کی زد میں یوں آتا ہے کہ اس خواہش کی تکمیل یا اس اندیشے سے چھٹکارا حاصل کرنے کی دھن میں وہ اخلاقیات اور اصول و ضوابط کو پس پشت ڈال دیتا ہے۔

ثانیہ کے والدین کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ انہیں وہ لوگ بہت بھلے محسوس ہوئے اور وہ رشتہ اپنی بیٹی کے لیے ہر لحاظ سے موزوں نظر آیا اور وہ چاہنے کے باوجود ان لوگوں کو اپنی بیٹی کی بیماری کے متعلق نہ بتا پائے۔ شاید ذہن

میں یہی تھا کہ ثانیہ بتدریج ٹھیک ہورہی ہے اور کیا پتا کہ شادی کے بعد یہ روگ ویسے ہی اس کی زندگی سے جدا ہوجائے۔

رشتہ طے ہونے کے موقع پر لڑکے والوں کو کچھ بتایا نہیں گیا تھا مگر ثانیہ کے ذہن میں جیسے ایک پھانس سی چبھی ہوئی تھی...... ایک دن والدہ کے منع کرنے کے باوجود اس نے ایک ریسٹورنٹ میں اپنے ہونے والے شوہر ندیم سے ملاقات کی۔ وہ اسے اپنی بیماری کے بارے میں آگاہ کرنا چاہتی تھی۔

وہ آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ ''ہاں ثانیہ جی، اب بتائیں، وہ کیا خاص بات ہے جس کی بدولت مجھے آج آپ سے اس طرح ملنے کا شرف حاصل ہوا؟'' کھانے سے فارغ ہوکر، ندیم نے ٹشو پیپر سے ہاتھ پونچھتے ہوئے کہا تھا۔

ثانیہ کے ہاتھوں میں لرزش تھی اور اس کے ہونٹ بار بار سوکھ رہے تھے۔ وہ بولی۔ ''ندیم...... دراصل...... میاں بیوی کا رشتہ ایسا ہوتا ہے کہ ان کے درمیان کوئی بات چھپی ہوئی نہیں ہونی چاہیے۔ میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ شادی سے پہلے آپ میرے بارے میں سب جانتے ہوں۔''

ندیم کے چہرے پر یکدم سنجیدگی اُمڈ آئی۔ ''دیکھو ثانیہ، میں ذرا مختلف قسم کی سوچ رکھتا ہوں، ماضی بس ماضی ہوتا ہے۔ اسے پیچھے چھوڑ دو۔ انسان کے چہرے پر اس کی آنکھیں آگے کی جانب اس لیے ہیں تاکہ وہ آگے دیکھے۔ پچھلی باتوں اور واقعات کو ڈسکس کرنے کا میرے نزدیک کوئی فائدہ نہیں۔ ماضی کے متعلق نہ میں تم سے کبھی کچھ پوچھوں گا اور نہ تم پوچھوگی۔ یہ میری خواہش بھی ہے اور میرا حکم بھی......'' ندیم نے آخری الفاظ مسکراتے ہوئے کہے تھے تاکہ ماحول کی سنجیدگی کم ہو۔

ثانیہ نے پھر بولنا چاہا لیکن ندیم نے باقاعدہ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

بات کا رخ ہی کچھ اور ہوگیا تھا۔ ثانیہ پختہ ارادہ لے کر آئی تھی کہ ندیم کو اپنی تکلیف کے نشیب و فراز کے بارے میں بتادے گی لیکن آج اس سے مل کر، اس کی باتیں سن کر اس کو جان کر نہ جانے کیوں وہ ایک دم کمزور ہوگئی۔ حالات اپنی بے پناہ کشش اور خوش آئند تصورات کے ساتھ اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔ اس نے بھی سب کچھ ''وقت'' پر چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا۔

☆☆☆

دسمبر کی ایک سرد شام میں ثانیہ اور ندیم کی شادی ہوگئی اور وہ دلہن بن کر ندیم کے گھر آگئی۔ شادی کے ایک ہفتے بعد ہی اس نے گھر کا کچن سنبھال لیا اور اس کے ساتھ ساتھ ندیم سے جڑی ہر ذمے داری کو اپنے اوپر لے لیا۔ چند اور دن نارمل انداز میں گزر گئے...... لیکن یہ سب کچھ ایسے ہی نہیں رہنے والا تھا۔ وہ وقت تیزی سے قریب آرہا تھا جب ثانیہ کی بیماری والی بات راز نہیں رہنا تھی۔ اس کی طبیعت بتدریج بوجھل ہورہی تھی۔ اگلے مہینے کی پانچ چھ تاریخ تک اسے خون لگنا ضروری تھا۔

ایک روز جب وہ خود کو بہت زیادہ مضمحل محسوس کر رہی تھی، اس نے فون پر والدہ سے بات کی اور دیر تک آنسو بہائے۔ مشورہ یہی ہوا کہ اب ندیم کو اس بارے میں بتادیا جائے۔

ندیم کو اس بارے میں بتانا ثانیہ کے لیے کوئی آسان کام نہیں تھا لیکن وہ کسی نہ کسی طرح یہ سب کر گزری۔ ندیم کا ردعمل خاصا گمبھیر تھا۔ وہ دکھی بھی تھا اور ناراض بھی۔ ثانیہ نے اسے بتایا کہ وہ جب شادی سے پہلے اسے ریسٹورنٹ میں ملی تھی تو مقصد یہی تھا کہ اسے اس بارے میں آگاہ کرے لیکن وہ کسی صورت اسے کھونا نہیں چاہتی تھی اس لیے کمزور پڑگئی اور جب اس نے اسے ماضی کے متعلق بات کرنے سے بالکل روک دیا تو وہ رک گئی۔

ندیم کے علاوہ اس کے والدین کو بھی اس خبر سے بہت رنج ہوا۔ گھر میں عجیب کشیدگی کی سی کیفیت ہوگئی۔ سب سے پہلا تاثر یہی تھا کہ ثانیہ کے گھر والوں نے اور ثانیہ نے ندیم سمیت سب کو دھوکے میں رکھا ہے۔ ثانیہ کی ساس نے کافی سخت باتیں کہیں۔ جس کے بعد ثانیہ روتی دھوتی اپنے میکے آگئی۔ اس تناؤ کے سبب اس کی طبیعت مزید بگڑ گئی۔ وقت پر خون لگنا بھی ضروری تھا۔ اسے اسپتال داخل کرادیا گیا۔ وہ قریباً دو ہفتے اسپتال میں رہی۔ اس دوران میں سسرال کی طرف سے کسی نے رابطہ نہیں کیا۔ فقط ایک مرتبہ ندیم کا مختصر سا فون آیا۔

ثانیہ کی حالت نارمل ہوگئی اور ٹریٹمنٹ مکمل ہوگئی تو والدین اسے گھر لے آئے۔ گھر آنے کے قریباً دو ہفتے بعد ثانیہ کے سسر نے سرمد صاحب سے رابطہ کیا۔ انہوں نے کافی سخت باتیں کہیں۔ سرمد صاحب نے اپنی طرف سے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی جس کو انہوں نے بالکل اہمیت نہیں دی۔ انہوں نے یہ کہہ کر فون بند کردیا۔ ''دیکھیں وقت کیا فیصلہ کرتا ہے۔''

کچھ دنوں بعد ثانیہ کو پتا چلا کہ وہ امید سے ہے۔ اپنے اردگرد کے اتھاہ اندھیرے میں جیسے اسے امید کی ایک کرن سی چمکتی محسوس ہوئی۔ اس نے اپنا دھیان اپنے ناگفتہ بہ حالات

سے ہٹانے کی کوشش کی اور ایک ننھی سی جان کی خاطر خود کو زندگی کی طرف لے جانے کی کوشش کرنے لگی۔

ثانیہ کے سسرال کی طرف سے مزید کوئی رابطہ نہیں کیا گیا تھا۔ وقت گزرتا گیا لیکن اب ایک حوصلہ سا تھا، امید کی ایک کرن سی تھی جو ثانیہ اور اس کے والدین کو نظر آرہی تھی......

اور پھر وہ وقت آگیا جس کا انہیں انتظار تھا۔ ثانیہ نے ایک بہت ہی پیاری بچی کو جنم دیا۔ بچی ہر لحاظ سے تندرست اور صحت مند تھی۔ بچی کا رنگ روپ ثانیہ پر تھا تاہم اس کے نین نقش میں ندیم کی نمایاں جھلک تھی۔ یہ خوب صورت پھول سرمد صاحب کے گھر میں امید کا یہ پیغام لے کر آیا تھا کہ شاید اب ان کی بیٹی کا گھر پھر سے آباد ہوجائے اور اس کی زندگی پھر سے رواں دواں ہوجائے۔

ایک دن ثانیہ کی والدہ آسیہ بیگم نے بچی کو گود میں لیتے ہوئے ثانیہ سے پوچھا۔ ''بچی مہینے کی ہونے والی ہے۔ تم نے ابھی تک کوئی نام نہیں رکھا۔ اتنی دیر تو ٹھیک نہیں۔''

''امی! میرا دل چاہتا ہے کہ ندیم خود اس کا نام رکھیں۔'' ثانیہ کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

ماں نے ثانیہ کا ماتھا چوما۔ ''تم پریشان نہ ہو، تم دیکھنا اب اولاد کی محبت اسے خود کھینچ کر ادھر لائے گی۔'' ان کی آواز میں امید کے دیے روشن تھے۔

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ برف پگھلنے لگی۔ ایک دن ثانیہ کے سسر نے سرمد صاحب کو فون کیا اور پھر چند دن بعد ندیم اور دیگر گھر والے ثانیہ اور بچی کو اپنے گھر لے گئے۔ گلے شکوے دور ہوئے اور ندیم اپنی پھول سی بچی کو دیر تک سینے سے لگائے اس کا سر چومتا رہا۔

زندگی ایک بار پھر اپنی ڈگر پر چل نکلی۔ اب وہ دو نہیں تین تھے اور یہ جو تیسرا تھا وہ ان کو باندھ کر رکھے ہوئے تھا۔ چھوٹی چھوٹی خوشیاں اور راحتیں پھر سے ان کی زندگی میں داخل ہونے لگیں...... لیکن جو کچھ بھی تھا ثانیہ صاف محسوس کرتی تھی کہ اس گھر میں اس کے رتبے میں کمی واقع ہو چکی ہے اور تو اور ندیم بھی کسی وقت بیگانے سے لگنے لگتے تھے۔ وہ اکثر اس وقت کو کوستی تھی جب شادی سے پہلے وہ ندیم کو سچ بتاتے بتاتے رہ گئی تھی۔

وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزرتا جا رہا تھا۔ ندیم کمپیوٹر پروگرامر تھا۔ اب اسے ایک بہت اچھی جاب مل گئی تھی۔ وہ اپنے کام میں زیادہ مگن ہوگیا۔ گھر آکر بھی رات گئے تک لیپ ٹاپ پر آفس کا کام کرتا رہتا۔ ایک دن ثانیہ نے کہا۔ ''ندیم! آپ گھر آکر بھی اکثر کام کرتے رہتے ہیں۔ آفس والے اتنا کام کیوں لیتے ہیں؟''

وہ بولا۔ ''لیتے نہیں ہیں کرنا پڑتا ہے۔ جب گھر کے خرچے ہوں، مستقل علاج معالجے ہوں تو بہت کچھ سہنا پڑتا ہے۔''

ندیم کا اشارہ اس ماہانہ خرچے کی طرف تھا جو ثانیہ کی ٹریٹمنٹ پر اٹھتا تھا۔ وہ چپ سی ہوگئی۔ بہرحال ایک بات ثانیہ کے لیے امید افزا تھی۔ وہ اب خود کو بتدریج بہتر محسوس کرتی تھی۔ عام حالات میں بالکل صحت مند لگتی تھی۔ تین چار ہفتوں کے بعد ''بوجھل طبیعت'' والے مختصر دورانیے آتے تھے جو ''ٹریٹمنٹ'' کے بعد اوجھل ہوجاتے تھے۔

ندیم جب بھی گھر آتا، فریش ہونے کے بعد ثمرین کو گود میں اٹھاتا اور اس سے باتیں کرتا لیکن ثانیہ نے ایک بات نوٹ کی تھی کہ ندیم کے تاثرات اور انداز میں ثمرین کے لیے کبھی بھی بہت زیادہ پیار اور بے تابی نہیں جھلکی۔ اسے ایک اور بچے کی خواہش تھی، ایک بیٹے کی، تندرست و توانا بیٹے کی۔

ایک روز شام کی چائے پیتے ہوئے وہ قدرے اداس لہجے میں بولا۔ ''ثانیہ! مجھے ایک بیٹا چاہیے۔ ایک وارث...... جو ہماری نسل کو آگے بڑھائے۔''

''کیوں نہیں۔ اللہ نے چاہا تو آپ کی خواہش ضرور پوری ہوگی۔'' ثانیہ نے شرما کر مختصر سا جواب دیا۔

ندیم بولا۔ ''ویسے میں نے ایک دو ڈاکٹروں سے بھی مشورہ کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ تھیلیسیمیا کے مریضوں کی اولاد کا زندگی پانا ایک کرشمہ ہے مگر یہ شرح بہت زیادہ نہیں۔ اگر آپ کا پہلا بچہ صحت مند ہے تو زیادہ چانسز ہیں کہ آپ کا اگلا بچہ بھی صحت مند ہو۔''

اس حوالے سے ثانیہ اور ندیم دونوں کے ذہنوں میں اندیشے موجود تھے اور وہ اس بارے میں ڈسکس کرتے رہتے تھے لیکن ہوتا وہی ہے جو اللہ کو منظور ہوتا ہے۔ ثمرین کی پیدائش کے قریباً تین سال بعد ثانیہ نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ ندیم اور ثانیہ کو بہت امید تھی کہ ان کا بیٹا بھی ان کی بیٹی کی طرح صحت مند اور تندرست ہوگا مگر افسوس...... یہ ساری امیدیں اور دعائیں پوری نہیں ہوئیں۔ بچے کی پیدائش کے فوراً بعد ہی یہ انکشاف ہوگیا کہ نومولود اپنی ماں سے وہی بیماری اپنے وجود میں لے آیا ہے جس نے پہلے ہی اس گھرانے کی زندگی کو تلخ کر رکھا تھا۔ بچہ یہ بیماری تو اپنے ساتھ لایا ہی تھا وہ ویسے بھی بے حد لاغر تھا۔ دبلی پتلی ٹانگیں، سیاہی مائل زرد رنگت، کچی کچی آنکھیں۔ زندگی کے آغاز میں ہی اسے سانس کی تکلیف نے بھی گھیرا ہوا تھا۔

ندیم پر تو جیسے ایک قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ اس نے کئی دن ثانیہ سے بات تک نہیں کی۔ نہ اس نے بچے کو گود میں اٹھایا، نہ اس کا ماتھا چوما، نہ اس کے معصوم لمس کو محسوس کیا۔ اس کے گھر والوں کا رویہ بھی ایسا ہی تھا۔ وہ سب کے سب جیسے اس سلسلے میں ثانیہ کو ہی قصوروار سمجھتے تھے۔

تین چار ہفتوں میں ہی حالات بہت بگڑ گئے۔ ندیم کا رویہ تلخ تر ہوتا چلا گیا...... اور پھر ایک دن وہ حشر برپا ہو گیا جس نے ثانیہ اور اس کے دونوں بچوں کی زندگی کو تہ و بالا کر ڈالا۔ طلاق...... طلاق...... طلاق...... اور سب کچھ ختم ہو گیا۔ زندگی کا درخت جیسے جڑوں سے اکھڑ گیا اور خاک پر ڈھیر ہو گیا۔

......اور آج...... آج اس گھر میں اس کی آخری رات تھی۔ باہر بادل ابھی تک گرج رہے تھے۔ گاہے بگاہے بارش کے ترڑے بھی کھڑکیوں پر دستک دینے لگتے تھے۔ اب صبح ہونے میں زیادہ دیر نہیں تھی۔ ننھی ثمرین اس کی گود میں سوئی ہوئی تھی اور دو ماہ کا آیان ''بے بی کارٹ'' میں سو رہا تھا۔ ہاں، صبح ہونے میں اب زیادہ دیر نہیں تھی لیکن اس صبح میں سیاہ رات کی سی تاثیر تھی۔ یہ وداع کی صبح تھی اور جو گزری تھی وہ وداع کی رات تھی۔

☆☆☆

دن اور رات کے سیاہ اور سفید پنچھی ایک دوسرے کے پیچھے کھیلتے رہے۔ گھڑی کی سوئیاں آگے کی جانب سرکتی رہیں، وقت گزرتا رہا۔ ثانیہ کو طلاق دینے کے بعد ندیم لاہور سے کوئٹہ شفٹ ہو گیا۔ اس کے والدین بھی ساتھ تھے۔ یہاں اسے بہت اچھی ملازمت مل گئی تھی۔ اس نے وہاں اپنا گھر بھی بنا لیا۔ پھر اس کی زندگی میں نائلہ آ گئی۔ یہ نائلہ یونیورسٹی میں اس کے ساتھ ہی پڑھتی رہی تھی۔ ان دنوں نائلہ کے ساتھ اس کی کافی ہم آہنگی پیدا ہو گئی تھی۔ دونوں شادی کا سوچنے لگے تھے مگر پھر نائلہ کے والدین کی وجہ سے یہ معاملہ آگے نہ بڑھ سکا۔ اب نائلہ کے والد وفات پا چکے تھے اور صورتِ حال کافی تبدیل ہو گئی تھی۔ نائلہ بھی کوئٹہ میں ہی تھی اور ایک پرائیویٹ کالج میں انتظامی امور سرانجام دے رہی تھی۔ دونوں میں ایک بار پھر میل ملاقات شروع ہو گیا۔ دراصل ندیم کا یہی وہ ماضی تھا جسے ندیم نے شادی سے پہلے والی ملاقات میں ثانیہ سے چھپایا تھا...... اور ثانیہ سے بھی کہا تھا کہ وہ اپنے ماضی کا ذکر نہ کرے۔

ایک سال بعد کوئٹہ میں ہی ندیم اور نائلہ کی شادی ہو گئی۔ شادی کے بعد تین چار ماہ تو اچھے گزرے، پھر آہستہ آہستہ نائلہ کا اصل روپ سامنے آنا شروع ہو گیا۔ ایک ورکنگ وومن کی حیثیت سے وہ بہت حد تک حاکمانہ مزاج رکھتی تھی۔ اس نے ندیم کو بھی اپنے مطابق چلانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ وہ جس فیملی سے آئی تھی وہ معاشی اعتبار سے ندیم کی فیملی کی ہم پلہ نہیں تھی۔ نائلہ کے اندر روپے پیسے کی اضافی طلب بھی تھی۔ اسے ندیم کے گھر میں ہر طرح کی سہولت اور آسائش مہیا تھی مگر اس کی نگاہ آگے...... مزید آگے کی طرف رہتی تھی۔ ندیم کے والدین کو اس نے بالکل کھڈے لائن لگا دیا اور ندیم کو بھی ہر طرح جکڑنا شروع کر دیا۔ آئے دن گھر میں جھگڑے رہنے لگے...... دو ڈھائی سال میں ہی ندیم ہائی بلڈ پریشر کا مریض بن گیا۔ اس کی جاب بھی متاثر ہونے لگی۔

کسی وقت وہ نائلہ سے لڑ جھگڑ کر لیٹا ہوتا تو اسے چار برس پہلے کے شب و روز یاد آتے...... لاہور کا گھر اور اس گھر میں مسکراتی ہوئی سی ایک صورت...... اسے ثانیہ یاد آتی، اس کی خدمت اور محبت یاد آتی اور وہ بے ساختہ اس ''جدا ہو جانے والی'' کا موازنہ اس عورت سے کرنے لگتا جو اب بیوی کی حیثیت سے اس گھر میں موجود تھی۔ اس کے دل کی گہرائیوں سے ایک آہ نکل کر رہ جاتی۔ وہ سوچتا کاش یہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا جو ہوا۔

اب اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ ثانیہ کہاں اور کس حال میں ہے۔ جب اس نے ثانیہ کو طلاق دی تھی تو واضح طور پر کہا تھا کہ یہ اس کے بچے ہیں اور وہ ایک دن انہیں اپنے پاس لے آئے گا لیکن گزرتے وقت کے ساتھ جہاں اور بہت کچھ بدلا تھا، یہ سوچ بھی بدل گئی تھی۔ شاید ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔ اسے اب بچوں کی کوئی خاص طلب نہیں رہی تھی۔ خاص طور سے بیٹے کی یاد تو اسے بھول کر بھی نہ آئی تھی۔ وہ جب بھی اس کے بارے میں سوچتا اس کے ذہن میں گوشت کا ایک بیمار لوتھڑا آتا تھا۔ اندر دھنسی ہوئی آنکھیں، زرد رنگ...... دواؤں کی بو...... لیبارٹریوں کی ٹیسٹ رپورٹیں...... خون کی بوتلیں اور وہ سب کچھ جو دائمی مریضوں سے وابستہ ہوتا ہے۔ بیٹی کی یاد بھی آہستہ آہستہ اس کے ذہن سے محو ہو گئی تھی۔ ندیم کے والد تو دو سال پہلے فوت ہو گئے تھے۔ والدہ روز روز کے گھریلو جھگڑوں کے سبب بیمار رہتی تھیں۔ شروع میں تو وہ پوتی کو یاد کرتی رہی تھیں مگر اب انہیں اپنی بیماری سے لڑائی کے سوا باقی باتیں کم ہی یاد رہتی تھیں۔

یہ زبردست ذہنی تناؤ اور انتشار کی وجہ ہی تھی کہ ایک روز آفس سے گھر آتے ہوئے ندیم اپنی مہران کار کا ایکسیڈنٹ کر بیٹھا۔ ایکسیڈنٹ شدید تھا۔ اس کی دونوں پنڈلیاں ٹوٹ گئیں اور وہ اسپتال میں جا پڑا۔ گھریلو جھگڑے اور معاشی

حالات پہلے ہی ناک میں دم کیے ہوئے تھے، اب یہ حادثہ ''مرے کو مارے شاہ مدار'' کی مثل تھا۔ خرانٹ نائلہ نے جب یہ دیکھا کہ شوہر بستر پر ہے تو اس نے مزید پر پرزے نکالے۔ ایک۔ پلاٹ تو وہ لڑ جھگڑ کر پہلے ہی اپنے نام کرا چکی تھی۔ ایک کا اس نے مختار نامہ لے لیا تا کہ اسے بیچ کر ندیم کا علاج معالجہ کرایا جا سکے۔ بعد میں پتا چلا کہ جو علاج معالجہ ہو رہا ہے، وہ گروی کے پیسوں سے ہو رہا ہے اور پلاٹ کی رقم ہڑپ ہو چکی ہے۔ نائلہ نے اپنے بھائی کے ساتھ مل کر کسی طرح ندیم کے مکان کو گروی رکھ دیا تھا اور اس کے عوض کافی ساری رقم اکٹھی کر لی تھی۔ خود وہ ندیم کی بیمار والدہ کے ساتھ اپنے ہی گھر کے نچلے پورشن کے ایک کمرے میں بطور کرایہ دار رہائش رکھے ہوئے تھے۔

اسپتال میں جب ندیم پر یہ راز فاش ہوا تو خوب جھگڑا ہوا۔ دو تین ہفتوں میں ہی نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ علیٰحدگی کی بات ہونے لگی۔ اسی دوران میں ندیم کی والدہ بھی راہی عدم ہوئیں۔ نائلہ نے بہ مشکل ڈیڑھ مہینا انتظار کیا اور پھر ندیم سے خلع لے کر اپنے بھائی کے ساتھ دبئی سدھار گئی...... ندیم کی زندگی کا ایک اور باب ختم ہو گیا۔

☆☆☆

ندیم کی ٹانگوں کے زخم بگڑ چکے تھے۔ آرتھوپیڈک مسائل بڑھتے جا رہے تھے۔ وہ دو ہفتے گھر میں رہتا تو چار ہفتے اسپتال میں گزارنا پڑتے۔ پہلے وہ مکان کی گروی چھڑانا چاہتا تھا مگر اب یہ سوچ پنپ رہی تھی کہ مکان بیچ ہی ڈالے اور جو مزید رقم ملے اس سے اپنی زندگی کی گاڑی چلانے اور اپنا علاج کرانے کی کوشش کرے۔

بالآخر مکان بھی بک گیا۔ اسے قریباً تیس لاکھ روپیا ملا۔ شروع میں تو یہ معقول رقم لگتی تھی لیکن اسپتالوں میں جو لوگ بیٹھے ہیں، ان میں سے بھی اکثر نے بہت کند چھریاں پکڑ رکھی ہیں۔ بے رحمی سے ذبح کر ڈالتے ہیں۔ ایک سال کے اندر اندر ندیم کی آدھی سے زائد رقم ٹھکانے لگ گئی۔ اس نے مکمل تباہی سے بچنے کے لیے ایک اندرونی مارکیٹ میں ایک چھوٹی دکان کرائے پر لے لی اور وہاں ''کمپیوٹر اسیسریز'' رکھ لیں۔ اس کی ٹانگوں کی حالت اب بہتر ہو رہی تھی اور وہ بیساکھی کے ساتھ چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا تھا مگر بلڈ پریشر کی جو تکلیف اسے نائلہ سے گھریلو جھگڑوں کے دوران میں شروع ہوئی تھی وہ بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ تکلیف اس کی آنکھوں اور گردوں پر بھی اثر کر رہی تھی۔ اسے گرمیوں میں اکثر و بیشتر گردوں کا ''پرابلم'' ہو جاتا تھا اور کسی وقت اسے ''ہاسپٹلائز'' بھی ہونا پڑتا تھا۔

زندگی کے ماہ و سال اڑتے چلے جا رہے تھے۔ دور و نزدیک ندیم کا کوئی رشتے دار نہیں تھا۔ حلقۂ احباب بھی بہت محدود تھا۔ وہ بس اپنی چھوٹی سی دکان یا پھر اسپتال تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ سب کچھ بھول گیا تھا۔ نائلہ اور اس کا لالچی بھائی، اپنے والدین، اپنی پہلی بیوی ثانیہ، ننھی ثمرین اور پیار گوشت کا وہ لوتھڑا جسے اس کے دادا نے آیان کا نام دیا تھا۔ ہاں وہ سب کچھ بھول چکا تھا لیکن کبھی کبھی وہ سوچتا تھا کیا وہ ثانیہ کی جھیل سی آنکھوں میں چھپی ہوئی محبت کو بھی بھول چکا ہے۔

☆☆☆

وہ اگست ستمبر کے دن تھے۔ ندیم شدید بیمار ہو گیا۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق گردوں کا باقاعدگی سے ڈائیلاسس ہو رہا تھا، پھر بھی اس کی طبیعت بگڑتی جا رہی تھی۔ اس نے ابھی عمر کی 55 بہاریں ہی دیکھی تھیں لیکن وہ ستر برس کا لاغر بوڑھا نظر آنے لگا تھا۔ اس کے ایک قریبی دکاندار دوست نثار نے اسے بڑی افراتفری میں اسپتال پہنچایا۔ وہ اس وقت تقریباً بے ہوشی کی حالت میں تھا۔

جب اسے ہوش آیا تو سرکاری اسپتال کا ڈاکٹر اس کے سامنے کھڑا تھا اور ذرا سخت لہجے میں پوچھ رہا تھا۔ ''بابا جی! آپ بول سکتے ہو۔ بولنے کی کوشش کیوں نہیں کر رہے ہو۔ آپ کے ساتھ کون ہے یہاں؟''

ندیم نے دھندلائی ہوئی نگاہوں سے اردگرد دیکھا۔ کوئی نہیں تھا...... دور دور تک کوئی نہیں تھا، اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''بابا جی! آپ کی تکلیف بہت بڑھ چکی ہے۔ اب اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں کہ آپ کو گردہ لگایا جائے۔ کیا آپ کے قریبی رشتے داروں میں کوئی ایسا ہے جو آپ کو گردہ دے سکے؟''

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اسی دوران میں کہیں سے اس کا دکاندار دوست نثار بھی آ گیا۔ اس نے ندیم کا کمزور شانہ ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ندیم! ڈاکٹر صاحب تم سے کچھ پوچھ رہے ہیں۔''

ندیم نے دوبارہ آنکھیں کھولیں۔ دراز قد ڈاکٹر سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک اور ڈاکٹر ہاتھ میں فائل لیے اس کے عقب میں کھڑا تھا۔ اس نے دراز قد ڈاکٹر سے کہا۔ ''ڈاکٹر احمد! پچھلی مرتبہ بھی جب یہ ایڈمٹ ہوئے تھے تو ان کے ساتھ ان کے اس دوست کے سوا اور کوئی بھی

نہیں تھا۔ اس وقت بھی ہم نے ان کو بتایا تھا کہ ان کا معاملہ اب کڈنی ٹرانسپلانٹیشن کی طرف جارہا ہے۔"

ڈاکٹر احمد نے فائل کو غور سے دیکھنا شروع کیا۔ پستہ قد ڈاکٹر...... سینئر ڈاکٹر احمد کو مؤدب انداز میں بریفنگ دیتا چلا جارہا تھا۔ دونوں کے چہروں پر ایک لاتعلق سی مایوسی دکھائی دے رہی تھی۔

کچھ دیر بعد ڈاکٹر احمد دیگر ڈاکٹرز کے ساتھ دوسرے مریضوں کی طرف بڑھ گیا۔ وہ ندیم کی موٹی تگڑی میڈیکل فائل بھی اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ نثار دکھی چہرہ لیے اپنے شدید بیمار دوست کے پاس بیٹھا رہا۔ اس سے دلجوئی کی باتیں کرتا رہا۔ اس نے بتایا کہ ڈاکٹر احمد اس وقت گردے کے علاج میں چوٹی کا ڈاکٹر ہے۔ پچھلی مرتبہ بھی اس نے کہا تھا کہ اگر تمہارا کوئی عزیز تمہیں گردہ دے سکے تو وہ تمہیں دوبارہ سے کھڑا کردے گا۔

ندیم کراہ کر بولا۔ "تم تو میری ہی طرح بوڑھے ہو۔ مجھے اور کون گردہ دے گا اور مجھے اب گردے کی ضرورت بھی نہیں۔ میں تو اب سوجانا چاہتا ہوں...... بہت لمبی نیند...... بہت دیر تک کے لیے۔"

نثار نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "ایسی باتیں مت کرو یار! ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے......"

ندیم کی کمر کی دونوں جانب شدید درد شروع ہوگیا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے زہر اس کے دماغ کو چڑھ رہا ہے۔ پھر وہ اپنے واحد سہارے (نثار) کا ہاتھ پکڑے پکڑے بے ہوش ہوگیا۔

یہ ایک طویل بے ہوشی تھی جس میں کبھی کبھی نیم بے ہوشی اور بیداری کے وقفے بھی آتے تھے۔ کسی وقت وہ اپنے نتھنوں میں تیز دواؤں کی بو محسوس کرتا، کسی وقت اسے اپنے جسم میں انجکشن لگنے کا احساس ہوتا۔ کسی وقت وہ دھندلی نظروں سے دیکھتا کہ نثار یا پھر سرخ وسپید چہرے والا ڈاکٹر احمد اس پر جھکا ہوا ہے۔ کسی وقت اسے ان کی آوازیں سنائی دیتیں۔ وہ کسی دلدل میں دھنستا چلا جارہا تھا۔ ڈوبتا چلا جارہا تھا۔ اسے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔ اس کا کوئی نہیں تھا...... اس کا اپنا کوئی نہیں تھا......

☆☆☆

وہ ایک خوشگوار سی شام تھی۔ پتا نہیں کتنے گھنٹوں یا دنوں بعد ندیم مکمل ہوش میں آیا تھا۔ وہ اسپتال کے ہی ایک کمرے میں تھا۔ اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ آسمان پر قوسِ قزح نظر آرہی تھی۔ شاید اگست کی تیز بارش کے بعد ابھی

ابھی چمکیلی دھوپ نکلی تھی۔ اسے ڈرپس لگی ہوئی تھیں اور کمر کے گرد بھی کوئی بھاری پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس نے سوچا وہ زندہ ہے یا پھر جاگتی آنکھوں سے زندگی کا خواب دیکھ رہا ہے؟

اس نے سامنے لگا کیلنڈر دیکھنے کے لیے اپنی آنکھیں سکوڑیں۔ اسے اندازہ ہوا کہ وہ کم وبیش آٹھ روز کے بعد مکمل ہوش میں آیا ہے۔ آٹھ روز...... ان آٹھ روز میں اس کے ساتھ کیا ہوتا رہا تھا؟

اسی دوران میں اسے کمرے کے دروازے پر نثار اور دراز قد ڈاکٹر احمد کی شکل نظر آئی۔ ڈاکٹر احمد تو اسے دور ہی سے دیکھ کر واپس چلا گیا اور نثار اندر آ گیا۔ نثار کے ساتھ بازار کی چھوٹی سی یونین کے صدر افتخار بھائی بھی تھے۔ وہ دونوں ندیم کے سرہانے آن بیٹھے اور اس کا حال احوال پوچھنے لگے۔ افتخار بھائی کی زبانی یہ جان کر ندیم حیرت کے سمندر میں غرق ہو گیا کہ اس کے جسم میں سرجری کے بعد گردہ لگایا جا چکا ہے اور اب اس کی حالت تیزی سے بہتر ہو رہی ہے۔

''یہ کیسے ہوا؟ کہاں سے آیا گردہ؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے خاموش بیٹھے نثار کی طرف دیکھا۔

نثار نے کہا۔ ''اللہ کے بعد یہ سب کچھ ڈاکٹر احمد کی مہربانی سے ہوا ہے۔ انہوں نے تم پر بہت زیادہ توجہ دی۔ ہر مرحلے میں تمہارے ساتھ رہے۔ تمہارے آپریشن میں شامل ہوئے اور آپریشن کے بعد بھی دن رات تمہارا خیال رکھا......''

ندیم نے کراہ کر کہا۔ ''یہ ان کی بہت بڑی مہربانی ہے...... لیکن میرے لیے گردہ دیا کس نے؟''

افتخار بھائی بولے۔ ''اس سوال کا جواب بہت حیران کرنے والا ہے۔ یہ تو ہم نے سنا ہے کہ کسی سرجن نے بہت محنت اور توجہ سے کسی مریض کا علاج کیا۔ اپنی ساری صلاحیتیں اس کی سرجری پر صرف کر دیں، لیکن یہ کم ہی سنا ہوگا کہ اپنے مریض کا گردہ بدلنے والے سرجن نے اسے اپنا گردہ بھی خود ہی دے دیا......''

ندیم مجسم حیرت افتخار بھائی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''گردہ...... بھی...... خود ہی...... دے دیا؟'' اس نے افتخار بھائی کے الفاظ دہرائے۔

''ہاں ندیم! ڈاکٹر احمد نے نہ صرف تمہارا علاج کیا بلکہ اپنا گردہ بھی دیا۔ تمہارے آپریشن کے وقت ان کی حالت ایسی نہیں تھی کہ خود آپریٹ کر سکتے، پھر بھی وہ سرجنوں کی اس چار رکنی ٹیم میں شامل رہے جو تمہیں آپریٹ کر رہی تھی......''

''یہ...... میں کیا سن رہا ہوں...... میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔''

اس سے پہلے کہ نثار یا افتخار بھائی جواب میں کچھ کہتے، خوبرو دراز قد ڈاکٹر احمد کمرے میں داخل ہوا۔ وہ قدرے مضمحل نظر آ رہا تھا مگر چہرے پر ایک نورانی سی مسکراہٹ موجود تھی۔ ڈاکٹر کو آتے دیکھ کر نثار اور افتخار باہر نکل گئے...... ڈاکٹر احمد، ندیم کے بالکل پاس آن بیٹھا۔ اس نے ندیم کا ہاتھ اپنے دونوں ملائم ہاتھوں میں لیا اور نم آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتا چلا گیا۔ کتنے ہی لمحے اسی جذب کی کیفیت میں گزر گئے۔ آخر ڈاکٹر احمد نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔ ''میں نے آپ کا سوال سن لیا ہے۔ آپ جاننا چاہتے ہیں نا کہ میں نے یہ سب کیوں کیا...... میں نے یہ اس لیے کیا کہ میں آپ کا بیٹا ہوں۔ میری رگوں میں آپ کا لہو دوڑتا ہے۔ مجھے ڈاکٹر احمد کے نام سے یاد کیا جاتا ہے...... لیکن میرا پورا نام آیان احمد ہے...... اور یہ نام میری ماماں نے اور دادا نے مل کر رکھا تھا......''

الفاظ دھاکوں کی طرح ندیم کے کاسۂ سر میں گونجے۔

اس کی نگاہ تو ڈاکٹر احمد کے خوبرو چہرے پر مرکوز رہی مگر ذہن برسوں اور زمانوں کا فاصلہ طے کرتا ہوا بیمار گوشت کے اس لوتھڑے تک پہنچ گیا جو کبھی کبھی اپنی دھنسی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اس کی طرف دیکھا کرتا تھا۔ اس کی طرف دیکھ کر اپنے کمزور بازو چلاتا تھا...... اور کبھی بڑی بے چارگی سے اس کا دامن پکڑنے کی کوشش کرتا تھا۔ وہی کمزور ناتواں سا بیمار جسم اب ایک جوان، قدآور شخص بن چکا تھا۔ ایک وجیہہ ڈاکٹر...... ایک ایسا مسیحا جو مایوس مریضوں کے لیے نئی زندگی کا پیغام تھا۔ وہ نہ صرف خود اپنی ناتوانی اور بیماری سے ابھرا تھا بلکہ اب پڑھ لکھ کر ایک نہایت قابل کڈنی سرجن بن چکا تھا اور یہ ایک ایسا کڈنی سرجن تھا جس نے اپنا ہنر ہی اسے نہیں دیا بلکہ اپنا گردہ بھی اس کے جسم کا حصہ بنا دیا تھا۔

یہ سب کچھ ناقابل یقین تھا لیکن یہ ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر احمد اس کے ہاتھ تھام کر عجب اشک بار لہجے میں بولا۔ ''آپ میرے باپ ہیں۔ میں آپ کا بیٹا ہوں۔ میں تو آپ کا تھا ابو! بے شک کمزور اور بیمار تھا لیکن تھا تو آپ کا...... ہم سب آپ کے تھے۔ باجی ثمرین، ماما...... ہم سب آپ کے تھے...... آپ ہمیں کیوں چھوڑ گئے تھے۔ آپ کو کیا پتا ہم نے آپ کو کتنا یاد کیا۔ آپ کے لیے کتنا روئے......''

وہ بولتا چلا جا رہا تھا اور ندیم حیرت سے گنگ یہ سب کچھ سن رہا تھا۔ یہی وقت تھا جب کمرے کا دروازہ کھلا اور قریباً تیس سال کی ایک جواں سال عورت اندر داخل ہوئی۔ سرخ وسپید گول چہرہ، دمکتی پیشانی۔ اس کے ساتھ دو پیارے

پیارے بچے تھے۔ ایک قریباً پانچ سال کا دوسرا تین سال کے لگ بھگ۔ ندیم کا دل یکبارگی بے طرح دھڑک اٹھا...... یہ اس کی ننھی ثمرین تھی۔ آخری مرتبہ اسی منحوس اندھیری رات میں ندیم نے اسے دیکھا تھا، جب اس نے اپنے منہ سے ''طلاق'' کے زہریلے بے رحم الفاظ نکالے تھے، وہ وارڈروب کے قریب اپنے کھلونوں میں مگن رہنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی مگر اس کا معصوم چہرہ بے پناہ غم کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ آج وہ کم وبیش چھبیس ستائیس سال بعد پھر اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ روتی ہوئی آگے بڑھی، ندیم نے اسے لیٹے لیٹے اپنے ساتھ لپٹا لیا...... ''میری ثمر۔'' وہ سسک اٹھا۔ ''میری ثمر۔''

......اگلے تین چار گھنٹوں میں ندیم پر کئی انکشافات ہوئے۔ ڈاکٹر آیان احمد کو ندیم کے بارے میں شک اس وقت ہوا تھا جب اس نے ندیم کی فائل تفصیل سے دیکھی تھی اور اس کی میڈیکل ہسٹری پڑھی تھی۔ اپنے دادا یعنی والد کے والد کا نام اور والد کے پیشے کے بارے میں پڑھ کر آیان احمد کی چھٹی حس نے اسے کچھ اہم سگنل دیے تھے۔ اس نے اگلے دو تین دن میں تیزی سے معلومات حاصل کی تھیں اور اسے معلوم ہوگیا تھا کہ اس سرکاری اسپتال کے کڈنی وارڈ میں جو لاغر لاوارث بوڑھا سا پڑا ہے، وہ اس کا باپ ہے۔ وہی شخص جس کی یادیں اس نے، اس کی بڑی بہن نے اور ماں نے سچے موتیوں کی طرح سنبھال رکھی ہیں۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ ہر دیکھنے سننے والے کو حیران وششدر کر گیا۔ ایک جواں سال معروف کڈنی سرجن خود اپنا ایک کڈنی ایک مریض کو دے رہا تھا اور وہ مریض اس کا باپ تھا۔

☆☆☆

یہ چند دن بعد کی بات ہے، ندیم اپنے بیٹے اور بیٹی کے ساتھ اپنی بچھڑی ہوئی شریک حیات ثانیہ سے ملنے روانہ ہوا۔ ڈاکٹر احمد نے اپنی ہنڈا اکارڈ گاڑی قبرستان کے مین گیٹ کے سامنے روکی۔ وہ تینوں زخمی دلوں اور برستی آنکھوں کے ساتھ شہرخموشاں میں داخل ہوئے۔ یہاں وہ ہستی سو رہی تھی جس نے حالات کی ستم ظریفی سے طلاق جیسا خوفناک گھاؤ اپنے سینے پر سہا۔ اپنے بچوں کو لے کر دردر کی ٹھوکریں کھائیں۔ اپنی بیماری سے جنگ کرتی رہی، اپنے بچے کی بیماری سے مقابلہ کیا...... اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت کے لیے مصیبتیں سہیں، اپنی جان کو رولا...... بے رحم وقت کا ہر وار اپنے سینے پر سہا اور والدین کی وفات کے بعد حالات کے کوہ گراں سے تنہا ٹکراتی رہی۔

اس نے بہت اہم کام کیے اور اس کا ایک اہم ترین کام یہ تھا کہ اس نے ایک بیمار کمزور اور مدقوق بچے کو اپنے خون پسینے سے سینچ کر پالا۔ اسے تھیلیسیمیا جیسی بیماری سے ابھارا اور اسے ایک نہایت کامیاب ونیک نام انسان بنایا...... اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسے ایک ایسا بیٹا بنایا جو وقت پڑنے پر باپ کے لیے اپنی جان بھی دے سکتا تھا۔

ثانیہ کی قبر پر پہنچ کر ندیم کا سارا جسم لرزنے لگا۔ وہ اس کا کتبہ دیکھنے لگا۔ وہ آج سے تقریباً تین سال پہلے منوں مٹی کے نیچے جا سوئی تھی۔ وہ واپس نہیں آسکتی تھی۔ وہ لاکھ پکارتا رہتا لیکن اب اس نے جواب نہیں دینا تھا۔ کچھ بھولی بسری آوازیں ندیم کے کانوں میں گونجنے لگیں۔

''اللہ کا واسطہ ہے ندیم، ایسی باتیں مت کریں۔ بچوں کا کیا بنے گا؟''

''میں تمہیں طلاق دیتا ہوں...... طلاق دیتا ہوں......''

''خدا کے لیے ندیم! آگے مت بولیں۔''

''دفع ہوجاؤ...... میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔''

وہ قبر پر سر ٹکا کر بیٹھ گیا...... اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ پتا نہیں کہ وہ کتنی دیر اسی حالت میں رہا۔ شاید ایک گھنٹا...... شاید دو گھنٹے...... یا پھر اس سے بھی زیادہ۔ اسے لگا کہ اس کے جسم کا سارا پانی آنسو بن کر آنکھوں کے راستے بہہ گیا ہے۔ اسے اٹھانے کی کوشش کی گئی لیکن وہ اسی طرح رہا...... پھر وہ نیم بے ہوش سا ہوگیا۔

اگلے روز جب اس نے اپنے بیٹے کے گھر کے ایک کمرے میں آنکھ کھولی تو وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے اردگرد کافی لوگ جمع تھے۔ اس کی بیٹی ثمرین، اس کے تین بچے، اس کا بیٹا ڈاکٹر احمد اور اس کے دو بچے، اس کی نیک صورت بہو...... اگر کوئی نہیں تھا تو وہی نہیں تھی جس کی سب سے زیادہ ضرورت تھی...... ایک دم اس کا دل ڈوبنے لگا۔ کیا وہ اب اسے کبھی نہ دیکھ پائے گا؟ تاہم اپنے ان سب بچوں کے درمیان چند گھنٹے گزارنے کے بعد اسے یہ لگا کہ وہ بھی یہیں موجود ہے۔ کسی بچے کے چہرے پر اس کے ہونٹ تھے، کسی کی آنکھوں میں اس کی گہری سیاہ پتلیاں تھیں، کسی کے سر پر اس کے لہریے دار بال تھے، کسی کی پیشانی میں اس کی جھلک تھی اور کسی کے گلے میں اس کی ہنسی جلترنگ بجاتی تھی۔ یاں وہ اپنے ان سارے بچوں میں تھی اور اس کے آس پاس تھی، وہ اسے محسوس کر سکتا تھا۔ اس نے ایک عجیب آسودہ کیفیت کے زیر اثر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اسے لگا کہ ابھی کچھ دن اور جیا جا سکتا ہے۔

بموں سے سری نگر کی طرف واپس آتے ہوئے مسافر بس اننت ناگ کے پرہجوم اڈے پر تھوڑی دیر کے لیے رکی تھی۔ وقاص نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ پھیری والے بس کے اردگرد آن کھڑے ہوئے تھے اور مختلف آوازیں لگا کر اپنا سودا فروخت کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک چھابڑی فروش عورت کے پاس ذرا جدا قسم کا سودا تھا۔ وہ چوڑیاں فروخت کر رہی تھی۔ وقاص کی نگاہیں رنگ برنگی خوب صورت چوڑیوں پر جم کر رہ گئیں۔ اسے تابندہ کی خوب صورت، ملائم ریشم جیسی کلائیاں یاد آ گئی تھیں۔ وہ اس کی نئی نویلی بیوی کی کلائیاں تھیں مگر وہ انہیں چند بار سے زائد نہیں چھو سکا تھا۔

تابندہ کے پاس شادی کے بعد صرف ایک ہفتہ ہو ... میں رہ سکا تھا۔ ایک ہفتے میں تو اچھی طرح ایک دوسرے کے مزاج کا پتا بھی نہیں چلتا لیکن پھر بھی یہ ایک ہفتہ وقاص کی زندگی کا بہترین حصہ تھا۔ پچھلے تین ماہ کے ہر ہر پل میں اس ایک ہفتے کی یادیں رچی بسی تھیں اور اس کی خوشبو وقاص کے رگ وپے میں پھیلی ہوئی تھی۔ تابندہ ٹوٹ کر پیار کرنے والی بیوی ثابت ہوئی تھی اور اس ایک ہفتے میں ہی وہ اپنی تمام ظاہری و باطنی خوبیوں سمیت وقاص کے دل کی گہرائیوں میں اتر گئی تھی اور کیوں نہ اترتی۔ وہ اس کی امی جی کی پسند تھی اور امی نے زندگی میں جب کبھی بھی وقاص کے لیے کچھ

آزادیٔ کشمیر کی جنگ کرنے والے ایک مجاہد کی داستان محبت

کشمیر، سرسبز مرغزاروں، بہتے چشموں اور گنگناتے آبشاروں کی حسین وادی مگر جسے شاید دشمنوں کی بدنگاہی کے سبب خوں رنگ کردیا گیا ہے۔ اسی کشمیر کی آزادی کے پس منظر میں لکھی گئی داستان، محبت اور فرض کے درمیان کش مکش کا احوال

جدائی

طاہر جاوید مغل

یا تھا وہ [illegible]
بس دو تین منٹ کے لیے رکی تھی۔ اس کی چھت پر سیب اور انار وغیرہ کے کریٹ چڑھائے جا رہے تھے۔ سکھ کنڈیکٹر کریٹ چڑھانے والوں کو جلدی کرنے کی ہدایت کر رہا تھا، وہ گاہے گاہے بلند آواز سے بولنے لگتا تھا۔ وقاص نے بس سے اتر کر تابندہ کی خوب صورت کلائیوں کو ذہن میں بسایا اور اس کے لیے چوڑیاں منتخب کیں۔ سبز سرخ اور زرد چوڑیاں.... چوڑیاں بیچنے والی نے انہیں آپس میں "مکس" کیا تو وہ مزید خوشنما لگنے لگیں۔ چوڑیوں والا ڈبا لے کر وقاص دوبارہ بس میں آبیٹھا۔ اس کی بڑھی ہوئی شیو سفر کے غبار سے آلودہ تھی۔ وہ کچھ تھکاوٹ بھی محسوس کر رہا تھا مگر گھر واپس جانے اور اپنے پیاروں سے ملنے کی خوشی اتنی زیادہ تھی کہ تھکاوٹ کا احساس کہیں دور پس منظر میں چلا گیا تھا۔

اس نے کھڑکی کی طرف رخ کر کے ایک طویل سانس لی۔ اسے اپنے گلی کوچوں اور در و دیوار کی بھینی بھینی خوشبو محسوس ہوئی۔ جنم بھومی کی یہ خوشبو ہر شخص کے ساتھ رہتی ہے اور اس کے من کو بھاتی ہے.... وقاص کو بھی یہ خوشبو بھاتی تھی.... تاہم آج یہ خوشبو کچھ زیادہ ہی بھاری تھی۔ اس میں تابندہ کی حسین مہک بھی شامل تھی۔ وہ سات روز کی چنچل دلہن جسے تنہا چھوڑ کر وہ اپنے فرض کی ادائیگی کے لیے چلا گیا تھا۔

وقاص حریت پسند تھا۔ عرصہ پانچ سال سے وہ ان مجاہدوں کے شانہ بشانہ مصروفِ عمل تھا جو کشمیر کی آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے.... وہ یہ سب کچھ انتہائی راز داری سے کر رہا تھا۔ اس کے انتہائی قریبی عزیزوں کے سوا اس حوالے سے کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ دوست احباب اور جان پہچان والے بس یہی جانتے تھے کہ وقاص پرائیویٹ سروس کرتا ہے اور اپنے کام کے سلسلے میں اسے گاہے گاہے سری نگر سے باہر جانا پڑتا ہے۔ ممکن ہے کہ کچھ لوگوں کو اس کے بارے میں شک ہو لیکن یہ ایک "موہوم شک" ہی تھا۔

وقاص کے مسلح حریت پسندوں کے ساتھ ملنے کا واقعہ بھی عجیب تھا۔ یہ کوئی پانچ سال پہلے کی بات تھی۔ ان دنوں وہ بی ایس سی میں تھا۔ اسے تھوڑا بہت ادب سے بھی لگاؤ تھا۔ انگلش پوئٹری وہ شوق سے پڑھتا تھا۔ اس کا ایک ہندو دوست شنکر پاٹل اس کا ہم ذوق تھا۔ وہ اکثر اسے پبلک لائبریری سے کتابیں لادیتا تھا۔ وہ کتابیں جن میں پھولوں، پرندوں اور موسموں کی باتیں ہوتی ہیں۔ جن میں محبت کے آبشار بہتے ہیں اور جھرنوں کی موسیقی گنگناتی ہے۔ یہ وہ کتابیں ہوتی ہیں جو پڑھنے والے کے لہو میں میٹھی بانسری بجاتی ہیں اور اسے زندگی سے محبت ہونے لگتی ہے.... وقاص کے لہو میں بھی

[illegible] محبت سی۔ وہ پ
تمام تر توانائیوں کے ساتھ جینا چاہتا تھا اور زندگی سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا۔ اسے وہ لوگ کچھ زیادہ اچھے نہیں لگتے تھے جو جھرنوں میں انسانی لہو ملاتے تھے۔ پرندوں کی چہچہاہٹ کو بارودی دھماکوں سے مجروح کرتے تھے اور پھولوں کو آگ سے جھلساتے تھے۔ قطع نظر اس کے کہ وہ فوجی تھے یا حریت پسند.... اسے ان سے بیزاری محسوس ہوتی تھی.... وہ سردیوں کی ایک تاریک رات تھی۔ وقاص اپنے دوست شنکر سے مل کر موٹر سائیکل پر گھر واپس آ رہا تھا۔ راستے میں موٹر سائیکل کا پیٹرول ختم ہو گیا۔ وہ موٹر سائیکل سمیت پیدل چلنے لگا۔ جی پی او سے کچھ آگے اس نے ایک فوجی جیپ دیکھی۔ جیپ درختوں کے قریب کھڑی تھی۔ تین چار فوجی تاریکی سے برآمد ہوئے اور افراتفری میں جیپ پر سوار ہو گئے۔ وقاص نے دیکھا کہ ایک فوجی کے جسم سے کوئی شے علیحدہ ہو کر گھاس پر گری ہے۔ جلدی میں وہ فوجی اس گرنے والی شے پر توجہ نہیں دے سکا۔ جیپ ٹرن لے کر تیزی سے سڑک پر آئی اور اوجھل ہو گئی۔ وقاص نے قریب جا کر دیکھا۔ جو شے گری تھی وہ ایک بیلٹ تھی۔ اس میں رائفل کی چالیس پچاس گولیاں اڑسی ہوئی تھیں۔ اس بیلٹ کو "بلٹ اسٹریپ" بھی کہا جاتا ہے۔ وقاص اسے الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا جب درختوں کی گہری تاریکی سے اسے کسی کے کراہنے کی مدھم آواز آئی۔ وہ احتیاط سے قدم اٹھاتا آواز کی سمت چل پڑا۔ یہ دیکھ کر وہ لرز گیا کہ یہاں جھاڑ جھنکاڑ کے درمیان ایک شخص کروٹ کے بل پڑا تھا۔ وقاص کی جیب میں لائٹر موجود تھا۔ اس نے لائٹر کی روشنی میں دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ یہ ایک چوبیس پچیس سالہ کشمیری نوجوان تھا۔ اس کی صورت دیکھتے ہی وقاص کو اندازہ ہو گیا کہ وہ کوئی مجاہد ہے۔ اس کی حالت قابلِ رحم تھی۔ ہونٹ پھٹے ہوئے تھے۔ سامنے والے دو تین دانت ٹوٹ چکے تھے۔ ایک آنکھ مکمل طور پر ضائع ہو گئی تھی۔ اس کے جسم پر پتلون کے علاوہ بس ایک خون آلود بنیان تھی۔ اس کے گورے چٹے جسم پر تشدد کے بدترین نشانات نظر آ رہے تھے۔ غالباً کچھ ہی دیر پہلے اس کے پیٹ میں تیز دھار آلے سے زخم لگایا گیا تھا۔ شاید سنگین وغیرہ گھونپی گئی تھی۔ خون بہہ بہہ کر ارد گرد کی زمین کو رنگین کر رہا تھا۔ یہ نوجوان بس آخری سانسیں لے رہا تھا۔ وقاص نے بے قرار ہو کر ادھر ادھر دیکھا۔ رات کے اس پہر یہاں کوئی متنفس موجود نہیں تھا جو وقاص کے ساتھ مل کر زخمی کی مدد کر سکتا۔ وقاص نے بے اختیار زخمی کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ وہ بس موت سے چند ہچکیوں کی دوری پر تھا۔ لائٹر کی لرزاں روشنی اس کے زرد چہرے اور سیاہ آنکھوں پر پڑ رہی

ہے۔ اس نے [illegible]

شخص بہت دیر تک ناقابل برداشت اذیتیں سہنے کے بعد اپنے کسی ہمدرد کی جانب دیکھتا ہے اور خاموشی کی زبان میں اس سے اپنا دکھ بیان کرتا ہے۔ اس کے زخمی ہونٹ لرز رہے تھے۔ وہ کچھ کہہ رہا تھا۔ دم توڑتی آواز ایک سرگوشی کی طرح تھی۔ وقاص نے بے اختیار اپنا دایاں کان اس کے ہونٹوں کے قریب کردیا۔ وہ کہہ رہا تھا "لے کے رہیں گے آزادی۔"

بہت مدھم آواز تھی لیکن اس میں مہیب طوفانوں کا شور تھا۔ ہر لفظ اپنی جگہ ایک بلند و بالا پہاڑ کی طرح تھا.... یہ پانچ لفظ نہیں تھے پانچ بلند و بالا پہاڑ تھے.... اور شاید اس کے علاوہ بھی بہت کچھ تھے۔ یہ لفظ اپنے معروف معنوں کے علاوہ بھی بہت کچھ بیان کررہے تھے.... چند سیکنڈ بعد اس نامعلوم نوجوان نے دم توڑ دیا تھا۔ اس کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں اور ہاتھ بھی ڈھلک گئے تھے۔ اب وقاص کا یہاں رکنا بے کار تھا اور خطرناک بھی۔ وہ نوجوان کا سر آہستہ سے زمین پر ٹکا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ "بلٹ اسٹریپ" اس نے ایک طرف پھینکا اور تیز قدموں سے اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ اگلے روز اسے ایک اخباری خبر کے ذریعے پتا چل گیا تھا کہ رات کو جس نوجوان نے اس کے ہاتھوں میں دم توڑا، وہ ایک مجاہد تھا۔

بعد کے تین چار مہینوں میں نامعلوم مجاہد کے آخری الفاظ مسلسل وقاص کے کانوں میں گونجتے رہے تھے۔ وہ پانچ الفاظ نہیں تھے.... واقعی پانچ پہاڑ تھے۔ وہ کسی طور وقاص کی سماعت میں سے سرک ہی نہیں رہے تھے.... "لے کے رہیں گے آزادی۔"

ان لفظوں نے اپنے اصل معنوں کے علاوہ بھی وقاص سے بہت کچھ کہا تھا.... ان لفظوں نے کہا تھا.... میری اس حالت اور اذیت کو بھول نہ جانا دوست اور نہ اس سبب کو بھولنا جس کی وجہ سے میری یہ حالت ہوئی ہے.... میں اپنی بے بسی اور بے چارگی کا سارا دکھ تمہیں سونپ کر جارہا ہوں.... تم میرے دشمنوں سے میرا انتقام لینا.... اور میرے دشمنوں سے سب سے بڑا انتقام یہی ہے کہ میرا وہ مقصد پورا ہوجائے جس کے لیے میں جان دے رہا ہوں۔ میں کچھ نہیں کرسکتا.... بے بس ہوں.... کیونکہ مررہا ہوں لیکن تمہارے پاس زندگی کی نعمت موجود ہے۔ میں اپنا بدلہ تم پر اور ساری انسانیت پر قرض چھوڑ کر جارہا ہوں۔

وقاص نے تنہائی میں بیٹھ کر لاتعداد مرتبہ ان پانچ الفاظ پر غور کیا تھا اور ہر بار ان میں سے نئے معنی پھوٹتے محسوس ہوئے تھے.... وقاص کو یاد تھا۔ اس رات وہ شلوار قمیص اور جیکٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس کے کندھے پر وہ بیلٹ بھی تھی

[illegible]

اس جاں بہ لب مجاہد نے وقاص کو بھی اپنا کوئی ساتھی ہی سمجھا تھا۔ اپنے ہی جیسا ایک مسلح حریت پسند۔ اس نے وقاص کو الوداعی نظروں سے دیکھ کر اپنی ساری بے بسی اور اذیت وقاص کو سونپی تھی اور ایک شہید کی حیثیت سے اس دنیا سے چلا گیا تھا۔ اب وقاص دن رات خود کو ایک قرض کے بہت بڑے بوجھ تلے محسوس کررہا تھا۔ اپنے شاعری بھول گئی تھی۔ پھولوں، پرندوں اور گنگناتے جھرنوں کی باتیں اسے بے معنی لگتی تھیں۔ اس کی نگاہوں میں ہر وقت اس جوان رعنا کی تصویر گھومتی رہتی تھی جس کے لب پارہ، دانت ندارد اور آنکھ ضائع ہوچکی تھی۔ وہ سوچتا رہتا تھا کہ وہ شخص کن اذیتوں سے گزر کر درختوں کے اس ویران جھنڈ میں پہنچا ہوگا۔ اس نوجوان کی لاش دیکھنے کے قریباً چار ماہ بعد وقاص نے خود بھی حریت پسندی اور مسلح جدوجہد کے خاردار راستے پر قدم رکھ دیا تھا.... اور اب پچھلے چار پانچ سال سے وہ اسی راستے پر گامزن تھا۔

قریباً تین مہینے پہلے اگست میں وقاص کی شادی ہوئی تھی۔ یہ شادی اسے والدہ کے بے پناہ اصرار پر کرنا پڑی تھی۔ شادی سے پہلے اس نے والدہ اور اپنی ہونے والی دلہن تک

اٹوٹ انگ ہے اور رہے گی۔ تابندہ اس کی والدہ کی پسند تھی۔ وہ اس کے لیے اجنبی تھی لیکن شادی کے بعد صرف چند دن میں ہی وہ ان لوگوں کے ساتھ یوں گھل مل گئی تھی جیسے برسوں کی شناسا ہو۔ وہ بڑی ملنسار اور خوش مزاج لڑکی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہر کسی کو گرویدہ بنا لیتی تھی۔ جب دوسروں کی یہ کیفیت تھی تو وقاص کی کیا کیفیت ہوئی ہوگی۔ وہ تو اس کا جیون ساتھی تھا۔ اس نے اسے بہت قریب سے دیکھا تھا اور اس کی شخصیت کی ساری خوبیوں کو دل و جان سے محسوس کیا تھا.... مگر شادی کے صرف سات روز بعد ہی وقاص کو اچانک سری نگر سے جانا پڑ گیا تھا۔ اپنی تنظیم کے سربراہ اعلیٰ کی طرف سے اسے فوری طور پر جموں پہنچنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ ایک نئے نویلے دولھا کے لیے اس طرح اچانک اپنی دلہن کو چھوڑ کر کئی ماہ کے لیے گھر سے چلے جانا' بڑا دشوار کام تھا لیکن وقاص صرف دولھا ہی نہیں تھا' مجاہد بھی تھا بلکہ مجاہد پہلے تھا دولھا بعد میں۔ اس نے بڑی خندہ پیشانی سے اپنی اشک بار دلہن کو الوداع کہا تھا اور جموں پہنچ گیا تھا۔ پچھلے تین ماہ میں اس نے وہی کچھ کیا تھا جو ایک کشمیری مجاہد کرتا ہے.... اس نے ویرانوں میں بسیرا کیا تھا۔ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ دشمن کے خلاف گھاتیں لگائی تھیں۔ کبھی ان کا تعاقب کیا تھا' کبھی خود کو ان کے تعاقب سے بچایا تھا.... پورے تین ماہ اسی خطرناک مصروفیت میں گزار کر اب وہ اپنے سیکٹر کمانڈر کے حکم سے گھر واپس لوٹ رہا تھا۔ اسے پندرہ روز کی رخصت ملی تھی۔ اسے عیدالضحیٰ بھی اپنے گھر گزارنا تھی۔ عید کے بعد تیسرے دن اسے پھر اپنے زونل آفس میں رپورٹ کرنا تھی۔ پندرہ روز کی رخصت پر وہ بہت خوش تھا۔ خاص طور سے اس لیے کہ اس رخصت میں عید کا پُرمسرت تہوار بھی آ رہا تھا۔

بس ناہموار سڑک پر ہچکولے کھاتی اپنی منزل کی طرف رواں رہی اور وقاص آنکھوں میں خوب صورت خواب سجائے اپنی سوچوں میں غرق رہا۔ بے دھیانی میں اس کی انگلیاں دھیرے دھیرے اس ڈبے کو سہلا رہی تھیں جن میں تابندہ کی رنگ برنگی چوڑیاں تھیں۔

○☆○

سری نگر میں وقاص اپنے دو بھائیوں اور والدہ کے ساتھ رہتا تھا۔ اب اس گھرانے میں ایک تیسرا فرد بھی شامل ہو چکا تھا.... یعنی تابندہ.... تابندہ نے بی اے کر رکھا تھا۔ وقاص کا ایک بھائی میڈیکل اسٹور چلا رہا تھا۔ اس کا نام جمشید تھا۔ سب سے چھوٹا میڈیکل کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اس کا نام حمزہ تھا۔ یہ متوسط درجے کا گھرانا تھا۔ گزر بسر آسانی

والی تھی.... اس نے ایک اچھی حالت کی چھوٹی سی گاڑی بھی خرید رکھی تھی۔

وقاص کی اچانک واپسی نے اس چھوٹے سے گھرانے پر خوشیوں کی بارش کر دی۔ والدہ بہت دیر تک اس سے لپٹ کر روتی رہیں۔ اس کا ماتھا چومتی رہیں۔ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی رہیں پھر انہوں نے اپنے لمبے کرتے کے دامن سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "بیٹا! کیوں اس طرح چھوڑ کر چلا جاتا ہے مجھے.... اپنی خیر خبر تک نہیں دیتا۔ تجھے کیا پتا میری نظر ہر وقت کواڑ پر لگی رہتی ہے۔ ہر آہٹ پر یہی سمجھتی ہوں کہ تو آ گیا ہے۔"

وقاص نے لاڈ سے ماں کی گود میں سر رکھتے ہوئے کہا "کیوں اتنا پریشان ہوتی ہیں امی۔ آپ کے پاس دو جوان بیٹے ہر وقت موجود رہتے ہیں۔"

"لیکن بیٹے کوئی رابطہ تو ہونا چاہیے.... تجھے کیا پتا دل میں کیسے کیسے خیال آتے ہیں.... اور پھر تو اکیلا نہیں ہے۔ اب تیری بیوی ہے۔ بے چاری میرے ساتھ تیرے انتظار کی گھڑیاں گنتی رہتی ہے اور پھر تو انتظار کی حد بھی تو بتا کر نہیں جاتا۔ کچھ خبر نہیں ہوتی کہ ایک ہفتے میں آئے گا یا ایک سال میں۔"

تابندہ بولی "امی جی بس آپ کا دل رکھنے کے لیے کہہ رہی ہیں ورنہ سچی بات یہ ہے کہ ہم کچھ زیادہ پریشان نہیں ہوتے بلکہ میں تو بالکل نہیں ہوتی۔ بہت مزہ کرتے ہیں ہم لوگ۔ بارہ مولا سے چھوٹی باجی بھی آئی ہوئی تھیں اور آپ کو پتا ہی ہے وہ کتنی جولی ہیں ہنس ہنس کر جمشید اور حمزہ کے پیٹ میں تو درد ہونے لگتا تھا کیوں جمشید۔"

جمشید نے اخلاقاً اثبات میں سر ہلایا۔

تابندہ' وقاص سے مخاطب ہو کر بولی "ویسے مہمان سے پوچھنا تو نہیں چاہیے لیکن واپس کب جا رہے ہیں آپ؟"

وقاص زیرِ لب مسکرایا "بھئی' کہتی ہو تو شام ساڑھے سات بجے والی بس سے چلا جاتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ چائے پی کر جائیے گا۔" تابندہ نے کہا اور اطمینان سے کچن کی طرف چلی گئی۔

حمزہ نے مسکراتے ہوئے کہا "مجھے یقین ہے' باجی چائے نہیں زعفرانی کوفتے بنانے گئی ہیں۔ بہت دنوں سے کہہ رہی تھیں کہ جس روز آپ واپس آئیں گے اس روز آپ کو زعفرانی کوفتے کھلائیں گی۔"

والدہ نے وقاص کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "بیٹا! وہ تجھ سے ناراض ہے۔ تو کہہ کر گیا تھا کہ اگر دیر سے آنا ہوا تو بھی دو ہفتے تک اپنی خیر خبر ضرور بھیجے گا لیکن تو تین مہینے بعد

ہی سفر دکھا رہا ہے۔"

وقاص کا سر بدستور ماں کی گود میں تھا۔ اس نے ان کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا "امی! آپ کو پتا ہی ہے' رابطہ کرنا کتنا مشکل ہے اور پھر یہ خطرناک بھی ہوتا ہے۔ بی ایس ایف والے آج کل شکاری کتوں کی طرح چوکس ہیں۔ میں ہر دکھ سہہ سکتا ہوں لیکن آپ لوگوں کے لیے ہلکا سا خطرہ بھی مول نہیں لے سکتا۔"

جمشید نے کہا "اچھا بھائی جان! چھوڑیں ان باتوں کو۔ یہ بتائیں۔ اب جلدی تو نہیں جانا۔"

"نہیں یار! اب عید گزار کر ہی جاؤں گا۔"

"اوہ! ونڈر فل۔" جمشید نے کہا۔

"خیر اتنا ونڈر فل بھی نہیں۔" حمزہ بولا "تین ساڑھے تین مہینے بعد آئے ہیں' کم از کم ایک مہینہ تو قیام ہونا چاہیے تھا۔ عید کے بعد تیسرے ہفتے خالو احسان کے بیٹے شکیل کی شادی بھی ہے۔"

وقاص بولا "اچھا بھئی! جب تیسرا ہفتہ آئے گا اس کو بھی دیکھ لیں گے۔ فی الحال آج کی بات کرو.... کاروبار کیسا ہے.... اور عید کی کیا تیاری سیاری ہے.... بکرے وغیرہ خریدے یا نہیں؟"

جمشید نے کہا "ابھی جانور مہنگے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ دو چار دن تک شہر میں مزید مال آجائے گا پھر ریٹ گر جائے گا۔ ویسے بھی اب آپ آگئے ہیں۔ مل کر ہی بکرا پیڑی چلیں گے۔"

پھر وقاص اور جمشید کاروبار کی باتیں کرنے لگے۔ جمشید کا میڈیکل اسٹور کافی بڑا تھا۔ اس کا شمار شہر کے بہترین اسٹورز میں ہوتا تھا۔ اسٹور میں وقاص اور جمشید کا برابر سرمایہ لگا ہوا تھا۔ منافع بھی برابر تقسیم ہوتا تھا۔ دو سیلز مینوں کی تنخواہ وقاص ادا کرتا تھا۔ اسے اسٹور پر بیٹھنا کم ہی نصیب ہوتا تھا۔ جن دنوں وہ سری نگر میں ہوتا تھا' عموماً اسٹور کے لیے سامان کی خریداری پر توجہ دیتا تھا۔

رات کو تابندہ کو منانے میں وقاص کو زیادہ مشکل پیش نہیں آئی۔ اس کی چند رس بھری باتوں نے ہی تابندہ کا غصہ کافور کردیا۔ ویسے بھی تابندہ جانتی تھی کہ اس کا شوہر ایک عظیم مقصد کے حصول کی جدوجہد سے وابستہ ہے۔ وہ ایک ایسا کام کررہا تھا جس کے کرنے کی تڑپ ہر کشمیری کے دل میں موجود تھی۔ وہ اپنی خونچکاں مادر وطن کو جکڑی ہوئی زنجیروں سے آزاد کرانے کے لیے اپنا سر ہتھیلی پر رکھے ہوئے تھا۔ اس کی رگوں میں ان گنت شہیدوں کے لہو کی طاقت تھی۔ اس کے سر پر بے شمار ماؤں کی دعاؤں کا سایہ تھا۔

تابندہ اس پر جتنا بھی فخر کرتی کم تھا۔ اپنی فخر و انبساط کے [illegible] کوئی حقیقت نہیں [illegible] وقاص کی آمد پر دکھائی تھی اور یہ صرف تابندہ ہی کی بات جو نہیں تھی۔ اس گھر کا ہر فرد اس ارفع مقصد کی اہمیت سے آگاہ تھا جس کے لیے وقاص اور وقاص جیسے ان گنت جوانوں نے اپنی جوانیوں کو داؤ پر لگا رکھا تھا۔

وقاص کی آمد سے اس چھوٹے سے گھرانے میں خوشیوں کی پُرجوش لہر دوڑ گئی۔ اتفاقاً حمزہ کی بھی کالج سے چھٹیاں تھیں۔ اگلے روز سارا دن گھر میں محفل جمی رہی۔ ڈھیروں باتیں کی گئیں' من پسند کھانا پکایا گیا۔ حمزہ نے گھر کے پچھواڑے گراسی لان میں بیڈ منٹن کا نیٹ لگا دیا۔ اس خطہ جنت نظیر میں زندگی بڑی زہریلی اور تلخ تھی۔ ایک نہایت کڑوی کسیلی گولی کی طرح لیکن جس طرح کڑوی کسیلی گولی کو نگلنے کے لیے اس کے گرد شکر لپیٹنا پڑتی ہے' زندگی کی مسلسل تلخی جھیلنے کے لیے بھی خوشیوں کے چھوٹے چھوٹے ادوار ضروری ہوتے ہیں اور پھر یہ وقت کا تقاضا بھی تھا۔

تابندہ نئی نئی دلہن تھی۔ اس کی دل جوئی کے لیے ویران شب و روز میں تھوڑی سی ہنگامہ آرائی ضروری تھی۔

سارا دن ہنسنے کھیلنے کے بعد شام کو تابندہ اور وقاص باہر گھومنے چلے گئے۔ جمشید آج اپنی گاڑی ان کے لیے گھر ہی چھوڑ گیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ جتنے دن بھائی جان گھر میں ہیں وہ گاڑی نہیں لے جائے گا.... تابندہ کو گھومنے پھرنے کا بڑا شوق تھا۔ شادی سے پہلے وہ اپنے والدین کے ساتھ تقریباً سارے شمالی ہندوستان میں گھومی تھی.... جو چند ایک شہر اس کی نگاہِ شوق میں آنے سے رہ گئے تھے' ان میں ایک سری نگر بھی تھا۔ وہ اودھم پور سے بیاہ کر آئی تھی اور سری نگر دیکھنے کا بہت شوق رکھتی تھی مگر سری نگر آنے کے بعد وہ بے چاری چار دیواری میں بند ہو کر رہ گئی تھی۔ کچھ تو شہر کے حالات بھی زیادہ اچھے نہیں تھے' دوسرے اس کا دولہا گھر میں موجود نہیں تھا۔ وہ اس کے بغیر کیسے گھوم پھر سکتی تھی۔

پہلے روز ان کا پروگرام جھیل "ڈل" جانے کا بنا۔ نومبر کی وہ پہلی شام بھی کچھ زیادہ ہی خوب صورت تھی۔ ہوا میں خنکی زیادہ نہیں تھی۔ مطلع صاف تھا۔ دونوں جھیل سے کچھ فاصلے پر ایک ریسٹورنٹ کی بالکونی میں بیٹھ گئے۔ جھیل کے پرسکون شفاف پانی پر خوب صورت ڈونگے اور بجرے تیر رہے تھے۔ اردگرد کے درختوں کا سبز عکس جھیل کے آئینے میں بالکل واضح دکھائی دیتا تھا۔ تابندہ کے چہرے پر بچوں کی سی مسرت تھی۔ وہ بڑی محویت سے جھیل ڈل کا حسن دیکھ رہی تھی۔ وہ "ڈل" کا حسن دیکھ رہی تھی جبکہ وقاص اسے دیکھ رہا تھا۔

"کتنی پیاری شام ہے نا؟" اس نے وقاص کا

ے ہوئے تھا۔

"واقعی بڑی پیاری ہے۔" وقاص نے تائید کی۔ اس کی نہیں تابندہ کی خوب صورت چوڑیوں پر تھیں۔ یہ وہی چوڑیاں تھیں جو کل اس نے اننت ناگ سے خریدی تھیں۔

"پتا ہے کہ یہ شام اتنی خوب صورت کیوں ہے؟" وہ بچوں کی طرح مٹھیاں بھینچ کر بولی۔

"کیوں ہے؟"

"اس کی دو وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ منظر میری توقع سے بڑھ کر حسین ہے۔ میں نے اس جھیل کو کئی بار اپنے تصورات میں دیکھا تھا لیکن آج وہ سارے تصورات ہیچ محسوس ہوتے ہیں۔"

"اور دوسری وجہ؟" وقاص نے پوچھا۔

"دوسری وجہ یہ ہے کہ آپ میرے ساتھ ہیں۔ آپ کہیں بھی ہوں گے، وہ جگہ خوب صورت ہوجائے گی۔"

"اور اگر میں نہ ہوں گا تو؟"

"پھر کچھ بھی خوب صورت نہیں ہے۔" اس نے روانی میں کہا لیکن پھر چونک کر وقاص کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کی جھیل ڈل جیسی آنکھوں میں نامعلوم اندیشوں کے بھنور ابھرے اور اوجھل ہوگئے۔ اس نے سرجھکا کر اپنی حنائی انگلی سے اپنی ہفت رنگ چوڑیوں کو چھیڑا اور کھوئے کھوئے انداز میں بولی "وقاص آپ کو نہیں معلوم میں آپ سے کتنی محبت کرنے لگی ہوں.... شاید آپ سوچیں گے کہ یہ بات تو ہر نئی نویلی دلہن اپنے شوہر سے کہتی ہے لیکن وقاص! میں واقعی سچ کہتی ہوں۔ آپ کے بغیر تو ایک سانس لینا بھی دشوار محسوس ہوتا ہے۔"

آخری الفاظ کہتے کہتے اس کا سر کچھ اور جھک گیا اور رخساروں پر شام کا سرخی مائل رنگ پھیل گیا۔

"تم کیا سمجھتی ہو، تمہاری جدائی مجھ پر آسان گزری ہے؟" وقاص نے ہولے سے کہا۔

"اچھا چھوڑیں ان باتوں کو۔" تابندہ جلدی سے بولی "آئیں خاموشی کے ساتھ اس سہانی شام کو اپنے اندر جذب کریں۔ یہ حسین شام ہے نا؟"

"ہاں تابندہ! اس میں حسن ہے لیکن یہ سوگوار حسن ہے۔ کاش یہ سوگواری اس حسن سے جدا ہوجائے۔"

دونوں خاموشی سے جھیل کو دیکھتے رہے۔ درمیانی عمر کا ایک انگریز جوڑا ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے جھیل کے کنارے چلتا ہوا، ان کے پاس سے گزرا۔ تابندہ بولی "وقاص! پتا ہے میرا کیا دل چاہتا ہے؟"

"کیا چاہتا ہے؟"

"میں اسی طرح آپ کے ساتھ ایک شفاف پانی کے کنارے چلی جاؤں.... چلی چلی جاؤں.... چلتے چلتے بوڑھی ہوجاؤں.... اور پھر ایک دن سب کچھ ختم ہوجائے۔"

وقاص بولا "دل تو میرا بھی یہی چاہتا ہے کہ ہم برسوں تک اسی طرح ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر چلتے رہیں.... لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ہم نے نیچے مسلم ہوٹل میں جس شخص کو کڑاہی گوشت کا آرڈر دیا ہے، وہ تو ہماری راہ دیکھتے دیکھتے فوت ہوجائے گا۔"

دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے اور بالکونی سے لکڑی کی سیڑھیاں اتر کر نیچے جھیل کے کنارے آگئے۔ رات نو دس بجے تک خوب انجوائے کرنے کے بعد وہ گھر واپس پہنچے۔

اگلے روز اتوار تھا۔ جمشید کی بھی چھٹی تھی۔ ان سب نے "فلوٹنگ گارڈنز" جانے کا پروگرام بنایا۔ وہ لوگ دن دس گیارہ بجے کے الگ بھگ کھانے پینے کا سامان لے کر نکلے اور تفریح گاہ پر پہنچ گئے۔ والدہ بھی ان کے ساتھ تھیں۔ خوش گوار اتفاق یہ تھا کہ موسم بھی بہت خوش گوار تھا۔ چمکیلی دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ اس دھوپ کے سبب سرد ہوا کی خنکی بھلی لگنے لگی تھی۔ وہ سب شفاف پانی کے کنارے بچوں کی طرح کھیلتے کودتے رہے۔ وہیں پر کھانا کھایا گیا۔ کھانے کے بعد جمشید اور حمزہ کو اپنے دو دوست مل گئے۔ وہ ان کے ساتھ باتوں میں مصروف ہوگئے۔ گھاس پر دری بچھی ہوئی تھی۔ والدہ اس پر لیٹ گئیں اور خوش گوار ہوا کی تھپکیوں نے انہیں سلادیا۔ وقاص اور تابندہ درختوں کے نیچے خوب صورت روش پر ٹہلنے لگے۔ پانی پر تیرتے ہوئے دلکش باغیچوں کا نظارہ مسحور کن تھا۔ تابندہ نے اپنے داہنے ہاتھ کی انگلیاں وقاص کے بائیں ہاتھ کی انگلیوں میں پھنسا رکھی تھیں۔ وہ کھوئی کھوئی سی آواز میں بولی "وقاص! کیا یہ وقت، یہ گھڑیاں ٹھہر نہیں سکتیں۔ جب آپ آس پاس ہوتے ہیں تو دل چاہتا ہے کہ اب کچھ بھی نہ بدلے۔ زمین آسمان کی گردش تھم جائے۔"

"دل تو میرا بھی یہی چاہتا ہے تابندہ! لیکن تم میری مجبوریاں سمجھتی ہو اور شاید میرے وطن کی مجبوریاں بھی۔"

"جب سوچتی ہوں کہ عید کے فوراً بعد آپ چلے جائیں گے تو دل کٹ کر رہ جاتا ہے.... کیا آپ کچھ دن اور نہیں ٹھہر سکتے؟"

"کیا مطلب؟"

"عید کے تیسرے ہفتے خالو احسان کے بیٹے شکیل کی شادی ہے۔ کتنا خوشی کا موقع ہوگا۔ سب ہنسیں کھیلیں گے۔ میں آپ کو یاد کرتی رہوں گی۔ پتا نہیں کیا بات ہے، جب سب لوگ مل بیٹھتے ہیں تو آپ کی کمی اور بھی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔"

"پاگل ہو تم۔ دور دراز کی سوچوں میں کھو کر ان خوشیوں میں کھوٹ ملا رہی ہو۔ جو آج ہمیں حاصل ہیں.... جانِ من! دیکھو آج میں تمہارے پاس ہوں۔ کل بھی ہوں گا' پرسوں بھی۔ پورے تیرہ دن ابھی ہمارے پاس ہیں۔ تیرہ دنوں کے کتنے گھنٹے ہوتے ہیں' کتنے منٹ۔ ہم اس سارے وقت سے لطف اٹھا سکتے ہیں۔ بشرطیکہ تم کل کلاں کے اندیشوں میں خود کو دبلا نہ کرو۔"

تابندہ نے نمناک نظروں سے وقاص کو دیکھا "آپ ۱۴ نومبر تک رک نہیں سکتے۔ شادی میں شامل ہونے کے بعد چلے جائیں۔ چودہ پندرہ دن مزید رک جانے سے کتنا فرق پڑ جائے گا۔"

"بہت فرق پڑ جائے گا تابندہ۔ تم نہیں جانتیں۔ اس وقت ہمارا ایک ایک دن قیمتی ہے۔ کشمیر کی آزادی کی طویل جنگ کا فیصلہ کن مرحلہ قریب آ رہا ہے۔ اب سستی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔"

وقاص کے جواب نے تابندہ کو خاموش کر دیا۔ وہ گم صم سی ہو گئی تھی۔ وہ لوگ مزید ایک ڈیڑھ گھنٹا فلوٹنگ گارڈنز پر رہے۔ اس دوران میں وقاص نے دو تین بار تابندہ کا موڈ نارمل کرنے کی کوشش کی۔ موڈ قدرے بہتر تو ہو گیا لیکن تابندہ کی شوخی واپس نہیں آئی۔

رات کو بیڈ روم میں دونوں دیر تک گفتگو میں مصروف رہے.... وقاص کی خوش گفتاری دھیرے دھیرے تابندہ پر اثر کرنے لگی۔ وہ اپنی باتوں سے تابندہ کو گدگدا رہا تھا۔ وہ اپنا پروگرام تابندہ کو سمجھانے لگا۔ "دیکھو' کل صبح نماز فجر کے بعد ہم پھر سو جائیں گے۔ دیر تک سوئیں گے۔ ناشتا اور دوپہر کا کھانا اکٹھا کریں گے۔ دو بجے کے قریب شازیہ باجی (تابندہ کی بہن) بھی پہنچ جائیں گی۔ خوب ہلا گلا رہے گا۔ شام کو بیڈمنٹن کھیلیں گے۔ رات کو باہر کھانا کھائیں گے۔ پرسوں میرے کالج کے ساتھی لیاقت کامران کی طرف سے ہماری دعوت ہے لیکن اس سے پہلے سہ پہر کو ہم تھوڑی سی شاپنگ کریں گے.... دیکھا نا.... شاپنگ کے نام پر ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی ہے.... خیر بدھ کے روز بدام باغ چلیں گے۔ تم نے مجھے بتایا تھا کہ یہ جگہ تمہیں بہت پسند ہے۔ جمعرات کو خیار باغ کی سیر کریں گے اور اس سے پہلے تھوڑی سی کشتی رانی بھی ہو گی۔ جمعہ کو لگتا ہے کہ شہر میں اسٹرائیک ہو جائے گی۔ ظاہر ہے کہ اسٹور بند ہو گا تو جمشید بھی گھر میں ہی ہو گا۔ صبح کے وقت جلوس میں شرکت کرنا ہو گی لیکن شام میں تو سب فارغ ہی ہوں گے۔ اس روز حمزہ نے پھوپی جان کو فیملی سمیت بلا رکھا ہے۔ اچھی خاصی رونق رہے گی.... ہاں یاد آیا بدھ کے روز تو قربانی کے جانور خریدنے بھی جانا تھا۔ چلو خیر یہ منگل کے دن ہی کر لیں گے۔ قربانی کے جانور جب آ جائیں گے تو عید سے پہلے عید کا ماحول بن جاتا ہے.... ہے نا؟"

تابندہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ اب قدرے پرسکون نظر آنے لگی تھی۔ غالباً اس نے سمجھ لیا تھا کہ وقاص کا پروگرام اٹل ہے لہٰذا خواہ مخواہ بدمزگی پیدا کرنے سے کیا فائدہ۔ ویسے بھی وقاص اپنی جو مجبوریاں بیان کر رہا تھا' وہ حقیقت کے قریب ترین تھیں۔ تابندہ ہر بنت کشمیر کی طرح ان مجبوریوں کو دل و جان سے تسلیم کرتی تھی۔ وقاص نے بڑی محبت سے اس کے بالوں کو سہلاتے ہوئے کہا "تابندہ! انسان کی آرزوئیں تو کسی جگہ ختم نہیں ہوتیں۔ وہ ایک کے بعد دوسری اور پھر تیسری خوشی کا متلاشی رہتا ہے۔ اگر بالفرض محال میں شکیل کی شادی تک رک بھی جاؤں تو کیا پھر میرے جانے سے تمہیں اداسی نہیں ہو گی؟ اس وقت بھی اداسی ہو گی۔ اس وقت کسی اور خوشی سے محرومی کا خیال میرے اور تمہارے دل میں ہو گا.... بتاؤ ہو گا یا نہیں؟"

"شاید آپ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔" تابندہ نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

وقاص بولا "لہٰذا.... اب طے کہ جو خوشی ہمیں مل رہی ہے' اسے انجوائے کریں گے اور آنے والے کل کے اندیشوں سے خود کو دور رکھیں گے۔ زندگی کے بپھرے ہوئے سمندر میں خوشی کے ایسے چھوٹے چھوٹے جزیروں پر رک کر سانس لے لینا ہی غنیمت ہے۔"

تابندہ نے وقاص کے شانے سے سر ٹکاتے ہوئے کہا "پھر مجھ سے وعدہ کریں۔ جتنے دن یہاں ہیں' میرے ساتھ ہی رہیں گے کہیں اور نہیں جائیں گے۔"

"کیا مطلب؟"

"پچھلی مرتبہ آپ لیاقت کے ساتھ تنظیم کے دوستوں سے ملنے بارہ مولا چلے گئے تھے وہاں سے باندی پورہ جانے کا پروگرام بن گیا تھا۔"

"ٹھیک ہے بھئی' وعدہ رہا۔ اس بار جتنے دن بھی ہوں' تمہارے ساتھ سری نگر میں ہی رہوں گا۔"

"ایک وعدہ اور۔" تابندہ نے کہا۔

"جی فرمائیے۔"

"عید کے دوسرے دن ہم امی کے پاس اودھم پور چلیں گے۔ رات وہیں رہیں گے۔ عید کے تیسرے دن ہم صبح سویرے واپس آ جائیں گے۔ یہ آپ کی چھٹی کا آخری دن ہو گا۔ یہ سارا دن ہم اکیلے گھومتے پھرتے گزاریں گے.... ٹھیک ہے؟"

وقاص نے ذرا توقف کیا پھر بولا "ٹھیک ہے۔"

دنوں سے یوم جوی سے ہاتھ ملایا۔ تابندہ کی آنکھ سے بچوں جیسی خوشی ناچنے لگی۔

اگلے روز حسب پروگرام دو ڈھائی بجے تابندہ کی چھوٹی باجی اپنے بچے ٹیپو سمیت پہنچ گئیں۔ ان کے آنے سے گھر کی رونق دوبالا ہوگئی۔ ہنسی مذاق کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ عصر کی نماز کے بعد گھر کے پچھواڑے لان میں بیڈ منٹن کا زبردست میچ ہوا۔ تابندہ زبردست کھیلتی تھی' اس نے وقاص کو دو مرتبہ ہرایا۔ وقاص کا بدلہ ڈاکٹر حمزہ نے اپنی بھابی کو ہرا کر لیا پھر تابندہ اور چھوٹی باجی نے مل کر حمزہ اور ٹیپو کو ہرا دیا۔ فیصلہ ہوا کہ عید تک شام کو ہر روز گیم ہوا کرے گا۔

اگلا دن بھی بہت خوش گوار گزرا۔ لیاقت کامران نے پہلے صرف تابندہ اور وقاص کی دعوت کی تھی پھر اس نے حمزہ اور آٹھ سالہ ٹیپو کو بھی اس دعوت میں شامل کرلیا۔ دعوت پر جانے سے پہلے وقاص اور تابندہ نے عید کی شاپنگ بھی کی۔ رات کو وہ دعوت کھا کر دیر سے واپس آئے۔ چھت پر خنک چاندنی میں گھومتے ہوئے تابندہ نے اپنا سر وقاص کے شانے سے لگا دیا اور بولی "کبھی کبھی تو دل چاہتا ہے کہ میں بھی آپ کے ساتھ چلی جاؤں۔ دن رات آپ کی خدمت کروں۔ ہر خطرے کا مقابلہ آپ کے ساتھ مل کر کروں۔"

"ایک مجاہد کی بیوی کے جذبات ایسے ہی ہونے چاہئیں۔" وقاص نے کہا "تاہم میرا خیال ہے کہ مجاہد کی بیوی گھر میں رہ کر اور گھر کی ذمے داریاں سنبھال کر بھی محاذ جنگ پر جانے کا ثواب پاسکتی ہے۔"

"لیکن آپ سے دوری بڑی تکلیف دہ ہے۔" اس نے اپنی چھوٹی سی ناک وقاص کے کشادہ شانے سے رگڑتے ہوئے کہا۔

"کیا ہوگیا ہے تمہیں۔" وقاص نے اس کی ٹھوڑی اٹھاتے ہوئے کہا۔

"آپ ہی نے کچھ کیا ہے۔" وہ بند آنکھوں کے ساتھ ادا سے بولی۔ اس کے چہرے سے محبت اور خوشی ایسے ہی پھوٹ رہی تھی جیسے چاند سے چاندنی۔

بدھ کے روز حمزہ' وقاص اور ننھے ٹیپو نے جا کر قربانی کے جانور خریدے تھے۔ شام کو تابندہ اور وقاص نے بدام باغ کی طرف جانا تھا۔ تابندہ بدام باغ جانے کے لیے بڑی بے چین تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ ان چند دنوں میں سری نگر کا گوشہ گوشہ دیکھ لینا چاہتی ہے لیکن اس روز پروگرام تھوڑا سا چینج ہوگیا۔ گیارہ بجے کے قریب جب وقاص نہا دھو کر دھوپ میں بیٹھا اور تابندہ اس کے سامنے اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی حلوا پوری پروس رہی تھی' دروازے پر کسی فقیر نے صدا لگائی "خدا کے نام پر سخیا.... اللہ تیری مشکلیں آسان کرے گا۔"

وقاص چونک اٹھا۔ اس نے اپنے اندرونی جذبات کو چہرے تک آنے سے بہ مشکل روکا۔ فقیر نے دوبارہ صدا دہرائی۔ وقاص اٹھ کر دروازے تک گیا اور تھوڑی سی ریزگاری فقیر کے ہاتھ پر رکھ کر واپس آگیا۔ "خدا کے نام پر سخیا.... اللہ تیری مشکلیں آسان کرے گا۔" اس کی آواز گلی میں دور جاتی ہوئی محسوس ہوئی۔ یہ دراصل ایک کوڈ ورڈ تھا۔ اس کوڈ ورڈ کو وقاص کے دروازے پر "صدا" کی صورت پکارنے والا فقیر دراصل تنظیم کا کوئی رکن تھا۔

"اس کوڈ کو "ڈی کوڈ" کرتے ہوئے وقاص قریباً ایک گھنٹے بعد شاہ ہمدان مسجد کے نواح میں پہنچ گیا۔ یہاں کشمیری چائے خانے کے پیچھے ایک باغیچے میں چھوٹا سا گودام موجود تھا۔ اس گودام میں فروٹ کی خالی پیٹیوں اور ٹوکریوں وغیرہ کے انبار لگے رہتے تھے۔ اسی کاٹھ کباڑ میں وہ سیڑھیاں موجود تھیں جو ایک قریباً ۱۴ ضرب ۳۵ فٹ کے تہ خانے میں پہنچتی تھیں۔ مختلف مراحل سے گزر کر وقاص اس تہ خانے میں پہنچا تو حسب توقع اس کی ملاقات اپنے سیکٹر کمانڈر فرحت اللہ صاحب سے ہوئی۔ وہ چوڑی چھاتی چوڑی پیشانی اور چوڑی داڑھی والے ایک سادہ سے شخص تھے۔ ایک ہاتھ کی پشت پر کئی ٹانکے لگے ہوئے تھے۔ گردن پر بھی زخم کا نشان تھا۔

رسمی گفتگو کے بعد فرحت اللہ صاحب نے وقاص کو ہائی کمان کا ایک حکم نامہ پڑھ کر سنایا۔ اس حکم نامے کے مطابق وقاص کو پرسوں صبح نو بجے تک یہاں اس تہ خانے میں رپورٹ کرنی تھی۔ یہاں سے اسے فرحت اللہ اور اپنے چند دیگر ساتھیوں کے ہمراہ فوراً باندی پورہ کے لیے روانہ ہونا تھا۔ یہاں چند روز کے اندر بھارتی فوج کے ایک کیمپ پر زبردست شب خون مارا جانے والا تھا۔ اس حملے کے لیے پچھلے ایک سال سے منصوبہ بندی ہو رہی تھی لیکن مختلف وجوہ سے یہ کارروائی ملتوی ہوتی رہی تھی۔ ہائی کمان کا خیال تھا کہ اب کارروائی کے لیے بہترین موقع دستیاب ہے۔

فرحت اللہ صاحب نے کہا "وقاص' تمہاری خواہش کے مطابق' تمہارا نام ان پانچ ساتھیوں میں شامل ہے جو اس حملے میں حصہ لیں گے۔ اس کارروائی کے بارے میں تم بڑی اچھی طرح جانتے ہو۔ اس کارروائی میں بچ نکلنے کے امکانات بہت کم اور شہادت کے امکانات بہت زیادہ ہیں۔" انہوں نے ایک لمحہ توقف کیا اور آہستگی سے بولے "تمہاری شمولیت کلی طور پر رضاکارانہ ہے۔ اگر تم چاہو تو اپنا نام واپس لے سکتے ہو یا اگر تم چاہو تو اس مہم میں نسبتاً کم خطرناک ذمے داری تمہیں سونپی جاسکتی ہے۔"

"مثلاً کیا؟" وقاص نے پوچھا۔

"مثلاً بھارتی گارڈز کو ڈاج کرنے کے لیے ایک "ڈمی اٹیک" کیمپ کے شمال میں کیا جائے گا، تم اس میں حصہ لے سکتے ہو.... یا پھر...."

"قطع کلامی کے لیے معذرت جناب۔" وقاص نے کہا "میں اس مہم میں پہلے والی حیثیت سے ہی شامل ہونا چاہوں گا۔" اس کی آنکھوں میں عقابی چمک تھی۔

فرحت اللہ صاحب نے کہا "ایک بار پھر سوچ لو.... یہ تمہارا جذباتی فیصلہ تو نہیں، میں دہرا دیتا ہوں اس کارروائی سے زندہ واپس آنے کے امکانات معدوم ہیں۔"

ایک لمحے کے لیے صرف ایک لمحے کے لیے پیاروں کے چہرے وقاص کی نگاہوں میں چمکے، ست رنگی چوڑیوں کی کھنک اس کے کانوں میں گونجی.... لیکن اگلے ہی لمحے سب کچھ پس منظر میں چلا گیا۔ پیش منظر میں کشمیر کے خون آلود چہرے آگئے اور دم توڑتے شہید کی آخری نگاہیں آگئیں۔ ان نگاہوں نے خاموشی کی زبان میں کہا "اے دوست! میں اپنی بے بسی اور بے چارگی کا سارا دکھ تمہیں سونپ کر جا رہا ہوں.... تم میرے دشمنوں سے میرا انتقام لینا اور میرے دشمنوں سے سب سے بڑا انتقام یہی ہے کہ میرا وہ مقصد پورا ہو جائے جس کے لیے میں جان دے رہا ہوں۔"

"میں جانتا ہوں جناب۔" وقاص نے ٹھوس لہجے میں کہا "میں بقائمی ہوش و حواس اس مہم پر جانے کا طلب گار ہوں۔ میری خواہش ہے کہ مجھے شہادت نصیب ہو۔"

○☆○

سہ پہر کے وقت جونہی وقاص گھر میں داخل ہوا تابندہ نے تنک کر پوچھا "کہاں چلے گئے تھے جناب۔ آپ کی یہ پگلی دیوانوں کی طرح ڈھونڈتی پھر رہی تھی.... شاید آپ بھول گئے کہ آج آپ کو بکرا پیڑی جانا تھا۔ حمزہ دو گھنٹے سے آپ کا انتظار کر رہا ہے۔ ٹیپو تو باقاعدہ رونے والا ہو رہا ہے۔"

"اوہو بھئی، اتنی بھی کیا پریشانی ہے۔" وقاص نے نارمل انداز میں کہا۔

عقب سے حمزہ نے آواز لگائی "محترم بھائی جان! عید میں اب سات آٹھ دن ہی رہ گئے ہیں۔ پچھلے برس آخری دنوں میں جانوروں کا بھاؤ ایک دم آسمان کو چھو گیا تھا لہٰذا بہتر یہی ہے کہ اگر آپ کی طبع پر ناگوار نہ گزرے تو یہ کام آج ہی نمٹا لیا جائے۔"

"تو ٹھیک ہے بھئی، چلتے ہیں پھر بکرا یا دنبہ خریدنے.... بلکہ بکرے یا دنبے خریدنے۔"

تابندہ نے کہا "اور جناب نے جو بدام باغ جانے کا وعدہ فرمایا تھا؟"

"چلو وہ کل پر رکھ لیتے ہیں۔"

"لیکن کل تو آپ نے تیاریاں...."

"بھئی کل دونوں باغات ایک ساتھ ہی دیکھ لینا بلکہ جو جو دل چاہے وہ دیکھ لینا۔"

"جو جو دل چاہے، کیا مطلب؟" تابندہ نے پوچھا۔

"ہم.... میرا مطلب ہے جی بھر کر گھوم لینا۔ سارا سبز نگر آنکھوں میں بھر لینا۔"

تابندہ نے نگاہ غلط انداز سے وقاص کو دیکھا۔ ان حسین نگاہوں میں پیار کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

وقاص ننھے ٹیپو اور حمزہ کے ساتھ جانوروں کی خریداری کے لیے نکل گیا۔ سری نگر دھماکوں، ہڑتالوں اور گھیراؤ جلاؤ کے واقعات سے گہنایا ہوا شہر تھا۔ بہرحال عید کی آمد کے سبب شہر کے چہرے پر تھوڑی سی رونق نظر آرہی تھی۔ بازاروں میں خرید و فروخت ہو رہی تھی۔ کھیل کے میدانوں میں لڑکے بالے نظر آتے تھے۔ گھاس کے قطعات پر بکھرے بچھڑے، دنبے وغیرہ اچھلتے کودتے نظر آتے تھے لیکن یہ سب کچھ وقاص سے بہت دور تھا۔ وہ اپنے ہی خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ قریباً ایک سال سے وہ جس وقت کا بڑی شدت سے انتظار کر رہا تھا، وہ آگیا تھا۔ اس وقت کے آنے کی چاپ وقاص کے لیے بہت دل پسند تھی لیکن پتا نہیں کیوں اس چاپ کے پس منظر میں ست رنگی چوڑیوں کی جھنکار بھی ڈوب ابھر رہی تھی۔ وقت کی چاپ اور چوڑیوں کی جھنکار دو متضاد آوازیں تھیں۔ وقاص کبھی ایک آواز کی طرف کھنچ جاتا تھا، کبھی دوسری کی طرف۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ گھر والوں سے اور خاص طور پر تابندہ سے اپنی اچانک روانگی کا ذکر کیسے کرے گا۔ وہ جانتا تھا۔ تابندہ پر یہ سب کچھ بہت بھاری گزرے گا۔ وہ تو عید سے تیسرے دن تک کے پروگرام ترتیب دیے بیٹھی تھی.... اور پھر وقاص یہ بھی جانتا تھا کہ اس کی روانگی کوئی معمولی روانگی نہیں ہے۔ وہ ایک نہایت خطرناک مشن پر جا رہا تھا۔

وہ شام تک گھومتے پھرتے رہے لیکن انہیں اپنی ڈیمانڈ کے مطابق جانور نہیں مل سکے۔ طے ہوا کہ پرسوں صبح سویرے یا کل شام پھر آیا جائے گا۔

بدام باغ جانے کا پروگرام تو پہلے ہی ملتوی ہو چکا تھا۔ تابندہ اور وقاص نے وہ شام گھر میں ہی گزاری۔ وقاص دیر تک والدہ کی ٹانگیں دباتا رہا۔ ان سے باتیں کرتا رہا۔ بعد ازاں ٹیپو کیرم بورڈ لے آیا۔ رات دس گیارہ بجے تک کیرم کھیلا جاتا رہا۔ رات کو خواب گاہ میں جب تابندہ سو گئی تو وقاص نے اٹھ کر ٹہلنا شروع کر دیا۔ اس نے خواب گاہ کی مدھم روشنی میں تابندہ کا ملیح چہرہ دیکھا۔ کتنا سکون و اطمینان تھا اس کے چہرے پر لگتا تھا کہ وقاص کی رفاقت کے یہ خوب

...ہوئے بھی مسکرانے پر مجبور کر رہے ہیں۔ وہ اس کا چہرہ دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ کل تابندہ کو اپنے جانے کی اطلاع کیسے دے گا۔ اسے معلوم تھا کہ سب کچھ جانتے بوجھتے بھی وہ پھوٹ پھوٹ رو کر بے حال ہو جائے گی.... یوں اس کا کل کا خوب صورت دن بھی غارت ہو جائے گا۔ وقاص نے سوچا' وہ اپنے جانے کی اطلاع دن کے اختتام پر دے گا۔ جب وہ خوب اچھی طرح گھوم پھر کر لوٹیں گے تو وہ مناسب طریقے سے اسے سمجھا دے گا کہ اس کا فوری طور پر جانا ضروری ہے۔ اس سے پہلے سارا دن سیر و تفریح کے دوران میں وہ اسے ذہنی طور پر تیار کرنے کی کوشش بھی کرتا رہے گا۔

تابندہ کا چہرہ دیکھتے ہوئے وقاص کے دل میں رقت پیدا ہو رہی تھی۔ وہ دل ہی دل میں بولا "تم ایک مجاہد کی بیوی ہو۔ تمہارے راستے اوروں سے جدا ہیں تابندہ۔" پھر وہ بڑی آہستگی سے آگے بڑھا۔ اس نے جھک کر نرمی سے تابندہ کی پیشانی کو چوم لیا۔ اپنے جانے کا حتمی فیصلہ کرنے کے بعد وہ خود کو قدرے ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا تھا۔

○☆○

صبح وقاص نے جلدی اٹھ کر تابندہ کو بھی جگا دیا۔ آج وقاص نے والدہ کے ہاتھ کے پراٹھے کھانے کی فرمائش کی تھی جو والدہ نے بہ احسن طریق پوری کر دی۔ ساتھ میں انڈے کا آملیٹ تھا اور دہی کی لسی۔ دہی کی لسی بنانا تابندہ کو نہیں آتا تھا۔ اس خاص قسم کی لسی میں تھوڑا سا کھویا اور میٹھا ڈالا جاتا تھا۔ اب وقاص کی خاطر پچھلے تین چار روز سے تابندہ یہ لسی بنانا سیکھ رہی تھی۔

ناشتے کے بعد وہ دونوں گاڑی لے کر نکل گئے۔ "ہاں بھئی' اب بتاؤ' پہلے بدام باغ یا شیار باغ یا پھر جھیل پر چلیں۔"

"شیار باغ کل چلیں گے۔ چھوٹی باجی بھی ساتھ چلیں گی۔"

"لیکن کل تو....." ایک دم وہ خاموش ہو گیا۔ بات ہونٹوں سے نکلتے نکلتے رہ گئی تھی۔

"کل کیا ہے؟" تابندہ نے چونک کر پوچھا۔

"کل ہڑتال بھی تو ہو سکتی ہے۔" وقاص نے بات بدلی۔

"ہڑتال ہو گئی تو پھر گھر ہی میں رہیں گے۔ آپ کی پھوپی جان بھی آ رہی ہیں۔ چھوٹی باجی کی طرح وہ بھی بڑی دلچسپ باتیں کرتی ہیں۔ اچھی محفل جمے گی۔"

"اچھا کل کی باتیں چھوڑو' آج کی باتیں کرو۔" وقاص نے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھالتے ہوئے دوسرا ہاتھ تابندہ کے ملائم ہاتھ پر رکھ دیا۔

"تو ٹھیک ہے۔ پہلے جھیل پر چلتے ہیں۔ تھوڑی سی کشتی رانی۔"

وہ تقریباً دو گھنٹے جھیل پر رہے۔ تابندہ بچوں کی طرح خوش نظر آ رہی تھی۔ کشتی میں سواری کے دوران میں وقاص پر چھینٹے اڑاتے ہوئے وہ اتنا ہنسی کہ اپنے سرخ لباس ہی کی طرح سرخ نظر آنے لگی۔ پتا نہیں کیوں اس کو یوں خوش دیکھ کر وقاص کا دل بیٹھ رہا تھا۔ اس کا دل چاہا وہ تابندہ کو لے کر ایک دم جھیل سے باہر آ جائے۔ جھیل کے کنارے کسی گھنے پیڑ کے نیچے بیٹھ کر وہ تابندہ کو کل کے بارے میں سب کچھ بتا دے لیکن پھر وہی خیال اس کے ذہن پر حاوی ہو گیا جو خوشیاں آج شام تک تابندہ کو مل رہی تھیں' وہ اسے ان سے محروم کیوں کرے۔

جھیل کی سیر کے بعد وہ اپنے چند عزیزوں کو ملنے چلے گئے۔ پہلے نواب بازار گئے پھر گولف کلب کے علاقے میں.... پھر رام نفشی.... اب سہ پہر ہونے والی تھی۔ تابندہ کی پسندیدہ جگہ یعنی بدام باغ ان کا انتظار کر رہا تھا۔ کار بدام باغ کی طرف جا رہی تھی۔ وقاص کے دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ پر تھے۔ نگاہیں سامنے سڑک پر جمی تھیں۔ تابندہ نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا اور بولی "کیا بات ہے وقاص! آج آپ کچھ چپ چپ سے ہیں۔"

وہ پہلے تو چونکا پھر زبردستی مسکرا کر بولا "نہیں' ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

وہ اس کی ٹھوڑی کے نیچے انگلی دے کر بولی "کچھ چھپا تو نہیں رہے ہیں مجھ سے؟"

"نہیں بھئی! تم سے کیوں چھپاؤں گا۔"

اس نے وقاص کے شانے سے سر ٹکا دیا۔ "وقاص' آپ چپ ہوتے ہیں تو لگتا ہے کہ میرے اندر بھی فوراً ایک صحرا پھیل گیا ہے۔ پلیز آپ چپ نہ ہوا کریں۔"

"اور جب میں چلا جاؤں گا پھر.....؟"

"دیکھیں وقاص! آپ نے خود کہا ہوا ہے کہ ہم بس موجودہ دنوں کی باتیں کریں گے آنے والے دنوں کی نہیں۔"

وقاص نے اپنی نگاہیں بدستور سامنے سڑک پر جمائے رکھیں۔ کھوئے کھوئے لہجے میں بولا "کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے کہ ہم زبردستی خوش ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ خوشی کے موقعوں پر بھی ہم سب کے دل اندر سے روتے رہتے ہیں اور کیوں نہ روئیں۔ اسّی ہزار شہیدوں کا خون بھی ابھی آزادی کی دلہن کو لال جوڑا نہیں پہنا سکا ہے۔ ہزاروں معذور جسم' ان گنت برباد عصمتیں' لاتعداد ہنستے بستے گھروں کے کھنڈرات' یہ سب اپنی اپنی زبان میں ہم سے انصاف مانگ رہے ہیں۔ ہم ان کی فریادوں کی طرف سے کان کیسے بند رکھ

سکتے ہیں۔"

وقاص باتیں کرتا رہا۔ تابندہ سنتی رہی۔ بیچ بیچ میں خود بھی بولتی رہی۔ اسی دوران میں وہ بدام باغ پہنچ گئے۔

درختوں کے نیچے خوب صورت روشوں پر ٹہلتے ہوئے وقاص نے محسوس کیا کہ اس کے دل کا بوجھ تابندہ کے دل پر منتقل ہو رہا ہے۔ وہ جو اب تک پھول کی طرح کھلی ہوئی تھی اب کملائی ہوئی محسوس ہونے لگی تھی اور یہ وقاص ہرگز نہیں چاہتا تھا۔ وہ اس دن کو تابندہ کے لیے نہایت خوش گوار اور یادگار بنا دینا چاہتا تھا۔ اس نے ہلکے پھلکے انداز میں باتیں شروع کر دیں۔ جلد ہی تابندہ پھر سے نارمل نظر آنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں موجود خوشی پھر سے تالیاں بجانے لگی۔

وہ سارا دن ہی تابندہ اور وقاص نے گھومتے پھرتے گزارا۔ سہ پہر کی چائے انہوں نے شام سے تھوڑی دیر پہلے ایک باغ میں پی اور لمبی ڈرائیو کے لیے نکل گئے۔ دن کا "اختتام" اب قریب پہنچ رہا تھا اور وہ کٹھن گھڑی بھی آنے والی تھی جس کا خیال صبح سے وقاص کے دل کو چپکے چپکے کھرچ رہا تھا۔ اسے پہلے تابندہ کو اور پھر سب گھر والوں کو اپنی روانگی کے بارے میں بتانا تھا۔

ڈرائیو کے دوران میں دو تین بار وقاص نے گفتگو کا رخ اپنے مطلوبہ موضوع کی طرف موڑنے کی کوشش کی۔ ایک مرتبہ اسے کامیابی بھی ہوئی لیکن وہ کوشش کے باوجود اصل بات زبان پر نہیں لا سکا۔ جوں جوں تیرگی پھیل رہی تھی، اس کا دل بوجھل تر ہوتا جا رہا تھا..... رات قریباً نو بجے وہ دونوں گھر واپس پہنچ گئے۔

اپنے کمرے میں جا کر بھی وقاص نے ایک دو بار اصل موضوع کی طرف آنے کی کوشش کی لیکن تابندہ کا موڈ اتنا شگفتہ تھا کہ وہ اپنا مدعا زبان پر نہیں لا سکا۔ پڑوس کے ایک گھر میں کسی لڑکی کی مہندی کی رسم ادا ہو رہی تھی۔ ڈھولک وغیرہ بج رہی تھی۔ تابندہ چھوٹی باجی اور ٹیپو کو لے کر مہندی والے گھر چلی گئی۔ اب اسے ایک ڈیڑھ گھنٹے تک آنا تھا۔ گھر والوں کو اپنی اچانک روانگی کے بارے میں بتانے کے لیے یہ اچھا موقع تھا۔ وقاص والدہ کے کمرے میں گیا، جمشید رات کو دیر سے آتا تھا لیکن حمزہ وہیں موجود تھا۔ وقاص کچھ دیر والدہ کی ٹانگیں دباتا رہا، پھر اس نے مناسب الفاظ میں والدہ اور بھائی کو اپنی روانگی کے بارے میں بتا دیا۔ ان کا ردعمل وہی تھا جس کی وہ توقع کر رہا تھا۔ اہل خانہ نے کبھی اسے اس طرح جانے سے روکا نہیں تھا بلکہ والدہ تو آنکھوں میں خوشی کے آنسو بھر لایا کرتی تھیں۔ اس کا منہ سر چوم کر اور دعائیں دے دے کر رخصت کیا کرتی تھیں لیکن اس مرتبہ "ایسے موقع پر" اور اس طرح اچانک اسے جانا پڑ رہا تھا

ضروری کام

بڑے اسٹور میں ایک نوجوان سیلزمین کے طور پر ملازمت حاصل کرنے کا خواہش مند تھا۔ مالک نے اس کی صلاحیتوں کا عملی مظاہرہ دیکھنے کے لیے ایک شیلف سے ایک ڈبا اتارا اور نوجوان کے ہاتھ میں دیتے ہوئے بولا "اسے شیلف سے اتارنے کے بعد تم کیا کرو گے؟"

نوجوان نے ڈبے کو غور سے دیکھا اور بولا "میں سب سے پہلے اس پر سے گرد صاف کروں گا۔"

اسے سیلزمین رکھ لیا گیا۔

کہ سب ہی کو شاک لگنا تھا۔ والدہ کی آنکھیں آنسو بہانے لگیں۔ حمزہ کا چہرہ بھی اتر گیا۔ وہ اپنے اندرونی تاثرات چھپانے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ اس نے دبے لفظوں میں صرف اتنا پوچھا "کیا آپ عید تک بھی نہیں رک سکتے۔"

"نہیں حمزہ..... اگر اب رک گیا تو پھر ایسے مواقع کے لیے پتا نہیں کب تک انتظار کرنا پڑے۔"

"کیا..... کوئی خاص موقع ہے بھائی جان۔" حمزہ نے وقاص کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں میری جان! بہت خاص موقع ہے۔"

حمزہ کی آنکھوں میں نمی سی لرزنے لگی۔ وقاص نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور ماں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "آپ دونوں وعدہ کریں کہ ابھی یہ بات تابندہ کو نہیں بتائیں گے۔ اگر میں نے مناسب سمجھا تو صبح سے پہلے کسی وقت خود بتا دوں گا۔"

"جانا کب ہے؟" والدہ نے پوچھا۔

"صبح آٹھ بجے۔" وقاص بولا۔

والدہ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو وقاص بے اختیار جھک کر ان کے گلے سے لگ گیا۔ کتنی ہی دیر وہ اس طرح بڑی خاموشی سے اپنی ماں کے ساتھ پیوست رہا پھر سرخ آنکھوں کے ساتھ علیحدہ ہو گیا۔ تینوں ماں بیٹے اس وقت تک باتیں کرتے رہے، جب تک تابندہ اور ٹیپو وغیرہ واپس نہیں آ گئے۔

○☆○

رات کو اپنے کمرے میں تابندہ خوش گوار موڈ میں

[illegible]
نے تھے وہ وقاص کو سنا رہی تھی پھر وہ الماری کی طرف چلی گئی۔ وہاں سے وہ کپڑے نکال لائی جو اس نے عید کے روز پہننے تھے۔ یہ خوب صورت جوڑا اس کے میکے سے آیا تھا پھر وہ وقاص کو اپنا خریدا ہوا ایک جوڑا دکھانے لگی۔ "یہ میں ٹرو کے روز پہنوں گی۔" وہ چہک کر بولی "اور یہ دیکھیں' یہ اس جوڑے کی ہم رنگ چوڑیاں ہیں۔ اچھی لگیں گی نا؟"

"مجھے کیا پتا اچھی لگیں گی یا نہیں۔" وقاص نے کہا۔

"کیا مطلب؟" وہ بولی۔

"بھئی غائب کا علم تو اوپر والے کو ہے۔"

"تو میں آپ کو ابھی پہن کر دکھا دیتی ہوں۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

وہ اپنے اندرونی احساسات کو حتی الامکان چھپانے کی سعی کررہا تھا اور اس میں کافی حد تک کامیاب بھی تھا۔ پانچ منٹ بعد تابندہ عید والا لباس پہن کر اس کے سامنے آگئی۔ کامدار گلابی جوڑے میں وہ نو دمیدہ پھول کی طرح لگ رہی تھی۔ وقاص اسے محویت کے عالم میں دیکھتا رہا۔ اس نے بڑی ادا سے گھوم کر وقاص کو اپنا آپ دکھایا۔ چوڑیاں چھنکا کر اس کی محویت کو توڑا اور پھر کھلکھلا کر ہنستی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ چند منٹ بعد وہ ٹرو والا لباس اور اس کی ہم رنگ چوڑیاں پہن کر آگئی۔ وقاص کی تعریفی نظروں کا خراج وصول کرکے وہ ایک بار پھر باہر چلی گئی۔ اس کی غیر موجودگی میں وقاص اپنے اندر "بات" کرنے کا حوصلہ پیدا کرتا رہا.... اپنا مدعا بیان کرنے کے لیے جملے ترتیب دیتا رہا.... لیکن جب وہ آئی اور وقاص نے اس کا مسرور چہرہ دیکھا تو ایک بار پھر اس کی ہمت جواب دے گئی۔ وہ کیسے بتاتا کہ عید ابھی بہت دور ہے۔ وہ چند گھنٹے بعد اس سے رخصت ہو رہا ہے۔

تابندہ رات گئے تک اپنے شوہر کی بانہوں میں رہی۔ وہ بستر پر دراز تھے۔ وہ اس کے بال سہلاتا رہا۔ اس سے چھوٹی چھوٹی باتیں کرتا رہا.... وہ آج بس اس سے باتیں ہی کرنا چاہتا تھا' اس کا چہرہ ہی دیکھنا چاہتا تھا۔ باتوں باتوں میں ایک بار پھر تابندہ نے کہا "کیا بات ہے وقاص! آج آپ کچھ بدلے بدلے سے ہیں۔ کیا مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہے۔"

اس نے بڑی نرمی کے ساتھ اسے سینے سے لگالیا۔ "نہیں تابندہ' ایسی کوئی بات نہیں۔ بس یونہی سر ذرا بھاری تھا۔"

"ٹھہریے' میں آپ کا سر دباتی ہوں۔" اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔

"نہیں تابندہ .... پلیز ایسے ہی لیٹی رہو۔ ابھی نیند آجائے گی تو ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

وہ لیٹے رہے .... کمرے سے باہر' شہر کی حدود سے پرے' کشمیر کے جھرنوں' چناروں اور چناروں پر رات آہستہ آہستہ سرکتی رہی۔

○☆○

وقاص علی الصباح ہی گھر سے نکل گیا تھا۔ تابندہ اس وقت فجر کی نماز پڑھنے کے بعد پھر سو چکی تھی۔ وقاص کی ہدایت کے مطابق حمزہ نے وقاص کا مختصر سامان رات کو ہی پیک کردیا تھا۔ رخصت ہونے سے پہلے وقاص نے ایک خط لکھ کر تابندہ کے سرہانے رکھ دیا تھا۔ اس خط میں اس نے لکھا تھا۔

"تابی! میں جارہا ہوں۔ دراصل مجھے پرسوں ہی بلالیا گیا تھا۔ میں پورے دو دن کوشش کرتا رہا ہوں کہ تم سے "جانے" کی بات کہہ سکوں لیکن کہہ نہ سکا۔ اس کے لیے میں تم سے معافی چاہتا ہوں۔ تابی! تم اچھی طرح جانتی ہو کہ ایک مجاہد کی زندگی اس کے وطن کی امانت ہوتی ہے۔ میری زندگی بھی امانت ہے۔ میرا وطن یہ امانت مجھ سے کسی بھی وقت مانگ سکتا ہے۔ خود کو ذہنی طور پر اس صورتِ حال کے لیے تیار رکھو۔ میں جانتا ہوں کہ تم مجھ سے بہت محبت کرتی ہو۔ میں تمہارے اس جذبے کی بے پناہ قدر کرتا ہوں لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں تمہارے ان جذبات کی بھی قدر کرتا ہوں جو مادرِ وطن کے حوالے سے تمہارے ذہن میں موجود ہیں۔ تابی! اپنے اعلیٰ مقاصد کے حصول اور وطن کی آزادی کے لیے جان قربان کردینا ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ کسی وقت مجھے یہ اعزاز نصیب ہوا تو تمہاری آنکھوں میں روتے ہوئے آنسو نہیں مسکراتے ہوئے آنسو ہوں گے۔ اس طرح اچانک چلے جانے پر ایک مرتبہ پھر تہِ دل سے معافی چاہتا ہوں.... میں تم سے محبت کرتا ہوں.... خدا حافظ۔

میرا خدا تم پر ہمیشہ اپنی رحمتوں کا سایہ رکھے۔"

یہ خط وقاص نے تابندہ کے قریب ہی سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا تھا.... وہ ایک باہمت شخص تھا۔ اس خطۂ حسین کے ان گنت نشیب و فراز میں اس نے بھارتی فوجیوں کے ساتھ زندگی اور موت کا کھیل کھیلا تھا اور بدترین حوادث کا مسکراتے ہوئے سامنا کیا تھا لیکن وہ چند غم زدہ فقروں کے ساتھ تابندہ کا سامنا نہیں کرسکا تھا۔ اسے نہیں بتا سکا تھا کہ .... عین ایک تہوار کی گہما گہمی میں وہ اسے چھوڑ کر جارہا ہے....باقی اہل خانہ سے ملنے کے بعد اور والدہ کے آنسو

اپنے شانے میں جذب کرنے کے بعد وہ شاہ ہمدان مسجد کی طرف روانہ ہوگیا۔ وہ ہنستی مسکراتی گلیاں چھوڑ کر جا رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ان گلیوں میں واپسی کا امکان بہت کم ہے۔

یاندی پورہ میں دو روز رہنے کے بعد وقاص اپنے ساتھیوں کے ہمراہ پہاڑوں میں چلا گیا۔ ان کا اسلحہ اور ایمونیشن پتھر ڈھونے والے خچروں کے ذریعے ان کے ٹھکانے پر پہنچا دیا گیا تھا.... اب انہیں حملے کے لیے مناسب ترین وقت کا انتظار تھا۔ ان کا مشن فوجی کیمپ میں داخل ہونا اور وہاں موجود نفری کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانا تھا۔ یہ حملہ "مارو اور بھاگ جاؤ" کی تکنیک کے تحت کیا جا رہا تھا۔ تاہم حملہ کرنے والے اچھی طرح جانتے تھے کہ مارنے کے بعد بھاگ جانے کے چانس بہت کم ہوں گے۔ وہ جب تک اپنے "اٹیک" کو کیمپ کے اندر تک نہ لے جاتے دشمن کو بھاری نقصان پہنچانا ممکن نہیں تھا.... اور کیمپ میں جانے کے بعد واپسی خاصی مشکل تھی۔ اس اٹیک کا ایک دوسرا مقصد کیمپ کے عقب میں واقع ایمونیشن ڈپو تک بھی پہنچنا تھا۔ مشن کے انچارج کی طرف سے پانچوں مجاہدوں کو ہدایت تھی کہ اگر وہ ایمونیشن ڈپو کو بھی نقصان پہنچا سکیں تو یہ ایک پنتھ دو کاج والا معاملہ ہوگا۔

جن دنوں حملے کا انتظار ہو رہا تھا' وقاص اکثر اپنے گھر والوں کے بارے میں سوچتا رہتا تھا۔ خاص طور سے تابندہ کی صورت بار بار اس کی نگاہوں کے سامنے آتی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اس کے آنے کے بعد روئی ہوگی.... بہت آنسو بہائے ہوں گے اس نے.... شاید تین چار دن کھانا تک نہ کھایا ہو۔ پچھلے چند روز میں وہ جتنا خوش ہوئی تھی' اس سے کہیں زیادہ دکھ اس نے جھیلا ہوگا اور اب بھی جھیل رہی ہوگی۔ وقاص' تابندہ کے دکھ کے بارے میں سوچتا تو اس کی رگوں میں لہو کی جلد دوڑنے لگتا۔ اس کا دل چاہتا کہ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ابھی واپس چلا جائے.... لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اگر وہ ایک بار واپس ہوا تو پھر "واپس" ہوتا چلا جائے گا۔ واپسی کے اس سفر کا اختتام ایک ایسی جگہ ہوگا جہاں وہ اپنے مقصد سے سیکڑوں ہزاروں میل کے فاصلے پر پایا جائے گا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ تابندہ نے جتنا دکھ جھیلنا ہے' اس میں سے بہت سا وہ اب تک جھیل چکی ہے۔ اب تو شاید اسے کچھ کچھ سکون آنا شروع ہوگیا ہوگا۔ دو روز بعد عید تھی۔ ممکن تھا کہ سب اہل خانہ کے ساتھ وہ بری بھلی عید بھی منا ہی لے۔ جوں جوں دن گزریں گے' اس کی کیفیت پہلے سے بہتر ہوتی چلی جائے گی۔ وقت بہت بڑا مرہم ہے۔ اس کے کانوں میں کسی بزرگ کی کہی ہوئی بات گونجتی اور وہ خود کو قدرے پرسکون محسوس کرنے لگتا۔

عید سے ایک دن پہلے یعنی اگلے روز انہیں اچانک حرکت میں آنے کا حکم ملا۔ آخر حملے کا وقت آگیا تھا۔ پانچ سر بکف مجاہد شب کی تاریکی میں اپنی کمین گاہ سے نکلے اور سینے تان کر فوجی کیمپ کی طرف بڑھے۔ اس کے بعد کے واقعات زیادہ طویل نہیں ہیں۔ کیمپ کے بیرونی گارڈز کو ڈاج دینے کے لیے شمال کی جانب گرینیڈز کے چند دھماکے کیے گئے تھے۔ کاشن ملتے ہی پانچوں مجاہد عقابوں کی طرح فوجی کیمپ کے داخلی راستے پر جھپٹے۔ خود کار رائفلوں اور مشین گنوں کی تڑتڑاہٹ سے فضا گونج اٹھی پھر دستی بموں کے خوف ناک دھماکوں نے وادی کو لرزا دیا۔ شعلے چاروں طرف لپکے' ان گنت انسانی چیخیں گونجیں اور کیمپ میں ہر طرف قیامت صغریٰ کا منظر نظر آیا۔ وقاص کی پیش قدمی میں شیر کی سی جھپٹ تھی۔ نعرۂ تکبیر بلند کرتا ہوا وہ دشمن کے اندر تک گھستا چلا گیا۔ وقاص اور اس کے ساتھیوں کی ناقابل گمان جرأت نے ان کے مدمقابل سپاہیوں کو حواس باختہ کر دیا۔ چند سیکنڈ کے اندر درجنوں لاشیں تڑپتی نظر آئیں۔ وقاص کے تین ساتھی کیمپ کے وسط تک پہنچتے پہنچتے شہید ہوگئے۔ وقاص کے دائیں کندھے پر بھی گولی لگی تھی۔ اس نے اپنے آخری ساتھی کو دیکھا' وہ فائرنگ کرتا ہوا خاردار تار کی طرف بھاگ رہا تھا۔ وہ اپنے کمانڈر کی ہدایت پر عمل کر رہا تھا اور ہدایت یہی تھی کہ دشمن کو بھاری نقصان پہنچانے کے بعد اپنی جان بچانے کی کوشش بھی کرنی ہے۔ ایک لمحے کے لیے.... صرف ایک لمحے کے لیے وقاص کے جی میں آئی کہ وہ بھی خاردار تار کی طرف جا کر خود کو بچانے کی کوشش کرے.... لیکن پھر اس کی نگاہ اس سائن بورڈ پر پڑ گئی جو ایمونیشن ڈپو کی لوکیشن بتا رہا تھا۔ صرف ایک سیکنڈ کے اندر کئی خیالات وقاص کے ذہن میں لپک گئے۔ ان میں سب سے اہم خیال یہی تھا....

وقاص! تمہاری منزل تو شہادت ہے نا۔ آج نہیں تو کل.... کل نہیں تو پرسوں۔ جتنی بار تابندہ کی طرف لوٹو گے' اتنی ہی بار بچھڑنا بھی پڑے گا اور ہر بار بچھڑنے کی تکلیف پہلے سے کئی گنا زیادہ ہوگی۔ تم بار بار اپنے پیاروں سے بچھڑ کر بار بار انہیں رلاؤ گے۔ کیوں نہ آج ہی بچھڑ جاؤ۔ کیوں نہ آج ہی منزل کو پا جاؤ۔ اس نے دائیں جانب دو برسٹ مارے۔ چند قدم آگے بڑھا۔ پھر دانتوں سے ہینڈ گرینیڈ کی پن کھینچی اور دیوانہ وار ڈپو کی طرف دوڑا۔ اس کی آنکھوں میں "آزادی کشمیر" کی ہزارہا مشعلیں روشن تھیں۔ سینہ تنا ہوا تھا' سر اٹھا ہوا تھا.... ہاں' ایسے لوگوں کا سینہ تنا ہوتا ہے' سر اٹھا ہوتا ہے.... چند سیکنڈ بعد شہید کے جسم کے ساتھ ہی ایمونیشن ڈپو بھی ہزارہا ٹکڑوں میں تقسیم ہوگیا۔

جلد باز

طاہر جاوید مغل

مثل مشہور ہے کہ جلدی کا کام شیطان کا۔ وہ بھی بڑا جلد باز تھا۔ عجلت شاید اس کی گھٹی میں پڑی تھی۔ اس تعجیل پسندی کے باعث خود اس کی زندگی اجیرن ہوکر رہ گئی تھی۔ بات اگر اس کی ذات تک محدود رہی ہوتی تو قابل برداشت تھی اس کی جلدی نے تو خود اس کے سوا دوسروں کو بھی بہت پریشان کیا۔

ہنستی مسکراتی چھیل چھبیلی ایک کھلکھلاتی تحریر

فیصل کے اکثر کام جلدی میں ہی خراب ہوتے تھے۔ اس نے جلدی میں عشق کیا۔ جلدی میں شادی کی.... جلدی میں گھر سے نکالا گیا۔ گوجر خان سے لاہور آنے کے لیے اس نے ٹرین بھی جلدی میں ایک ایسی پکڑلی جس سے گدھا گاڑی بھی باآسانی ریس جیت سکتی تھی اس ٹرین نے نوبیاہتا میاں بیوی کو چار گھنٹے میں گوجر خان سے فقط جہلم تک پہنچایا۔ اگر فیصل تھوڑا سا صبر کرلیتا تو ایک گھنٹے بعد پنڈی سے تیز رفتار ٹرین آنے والی تھی جو اب تک اسے لاہور کے گردونواح میں پہنچا چکی ہوتی۔

اکتوبر کے دن تھے۔ ہوا میں کافی خنکی پیدا ہو چکی تھی یہ درجہ دوم کا ڈبا تھا۔ کھڑکی کا شیشہ بند کرنے کے باوجود ہوا اندر داخل ہو رہی تھی۔ فیصل کے پہلو میں بیٹھی ہوئی کنول نے

دھیرے سے کہا "شٹر نیچے گرادیجئے۔"

فیصل نے کھڑکی کا شیشہ گرا دیا۔ چاند کی روشنی جو شیشے سے چھن چھن کر اندر داخل ہو رہی تھی اور کمپارٹمنٹ کے اس حصے کو نیم روشن کر رہی تھی، معدوم ہو گئی۔ نیم تاریکی سی محسوس ہونے لگی۔ چھت پر لگے ہوئے دونوں بلب خراب تھے۔ صرف باتھ روم کی جانب والا بلب روشن تھا لیکن وہ کافی فاصلے پر تھا۔ سامنے والی نشست پر بیٹھا ہوا معمر جوڑا اونگھ رہا تھا۔ بڑے میاں کا سر گاڑی کے ہچکولوں کے سبب مسلسل نفی میں ہل رہا تھا، جیسے وہ بہ زبانِ خاموشی فیصل کو تنبیہہ کرنے کی کوشش کر رہے ہوں کہ وہ نیم تاریکی کا فائدہ اٹھا کر اپنی نئی نویلی دلہن سے محبت جتانے کی کوشش ہرگز نہ کرے۔ بڑے میاں کے پہلو میں بیٹھا ہوا درمیانی عمر کا شخص جاگ رہا تھا لیکن وہ کسی بہت گہری سوچ میں تھا۔ اس کی نگاہ بے دھیانی میں مسلسل ٹرین کے فرش کو گھور رہی تھی۔

موقع غنیمت تھا فیصل کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں۔ اس نے اپنا تپا ہوا ہاتھ بڑی آہستگی کے ساتھ اپنی دلہن کی گود میں سرکا دیا اور اس کے نرم ہاتھ کی انگلیوں میں اپنی انگلیاں پھنسا دیں۔ یہی وقت تھا جب کمپارٹمنٹ کی چھت پر لگے ہوئے دو بے کار بلبوں میں سے ایک نے کارکردگی دکھانا شروع کر دی۔ ایک خبیث بد خواہ کی طرح وہ خود بخود روشن ہو گیا۔ روشنی ہوتے ہی دلہن نے اپنا ہاتھ فیصل کے ہاتھ سے چھڑا کر پیچھے دھکیل دیا۔ فیصل ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ اس معروف قول پر اس کا یقین پختہ ہو گیا کہ پاکستان ریلوے اپنے مسافر کو زچ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی۔۔۔ یہ بدبخت جو نجانے کتنے دنوں سے تاریک تھا، چند منٹ اور تاریک رہ جاتا تو محکمے کی حسنِ کارکردگی پر کون سا بٹا لگ جاتا تھا۔

کنول سے فیصل کا نکاح ہوئے تقریباً چھتیس گھنٹے ہونے کو آئے تھے لیکن وہ دلہن سے اتنا ہی دور تھا جتنا قطب شمالی سے قطب جنوبی۔۔۔ شاید یہ مثال غلط ہو گئی ہے۔ کیونکہ یہ دونوں ہی مقامات کافی ٹھنڈے ہیں۔۔۔۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ دونوں ایک دوجے سے اتنا ہی دور تھے جتنا جیکب آباد سے میانوالی۔ اپنے نکاح کے بعد ایک رات فیصل نے اپنے دوست لطیف کے ہاں گزاری تھی۔ لطیف پہلے سے شادی شدہ تھا۔ تاہم دونوں کی دوستی گہری تھی۔ کنول سے فیصل کی شادی کو انجام تک پہنچانے میں لطیف کا بھی کافی کردار تھا۔ لطیف کے گھر فیصل اور کنول نے جو رات گزاری تھی وہ ایک طرح سے ان کی سہاگ رات تھی۔ یہ سہاگ رات بس باتوں میں ہی گزر گئی تھی۔ افسوس کا مقام یہ تھا کہ یہ باتیں دونوں نے ایک دوجے سے نہیں کی تھیں۔ فیصل، لطیف کے پاس بیٹھا مونگ پھلی ٹونگتا رہا تھا اور کنول لطیف کی بیوی کے پاس بیٹھی کھسر پسر کرتی رہی تھی۔۔۔

درحقیقت فیصل کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا تھا بڑے طوفانی انداز میں ہوا تھا۔ یہ آج سے کوئی چار ماہ پہلے کی بات تھی جب فیصل نے پہلی بار کنول کو دیکھا۔ گوجر خان میں فیصل کے والد نواز صاحب کا لوہے کا کاروبار تھا۔ وہ اپنے کارخانے میں گھریلو استعمال کی مختلف اشیا بھی بناتے تھے۔ گوجر خان زیادہ بڑا شہر نہیں ہے۔ نواز صاحب کی رہائشی کوٹھی شہر کی چند اچھی عمارتوں میں شمار ہوتی تھی۔ دو منزلوں میں چودہ پندرہ کمرے اور اتنے ہی باتھ روم بھی تھے۔ ٹی وی لاؤنج اور ڈرائنگ رومز وغیرہ اس کے علاوہ تھے۔ فیصل نے بی کام کر رکھا تھا اب والد کے ساتھ فیکٹری میں ہاتھ بٹاتا تھا۔۔۔ والد نے ایک جگہ فیصل کے رشتے کی بات شروع کر دی تھی لیکن اسی دوران میں سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا۔

فیصل کے گھر کے پچھواڑے پندرہ مرلے کی ایک کوٹھی میں نئے کرایہ دار آئے۔ ان کی خوبرو لڑکی کنول پہلی نگاہ میں ہی فیصل کو بھا گئی۔ دو تین ہفتے تک آنکھ مچولی ہوتی رہی۔ پھر ایک دو ملاقاتیں ہوئیں۔ عہد و پیماں ہوئے۔ فیصل نے خم ٹھونک کر کنول سے کہہ دیا کہ وہ شادی کرے گا تو صرف اسی سے کرے گا۔ دونوں گھروں کی چھتیں ملی ہوئی تھیں۔ ایک روز فیصل اور کنول نے چند ضروری باتوں کے لیے چھت پر ملنے کا پروگرام بنایا۔ کنول اور اس کے گھر والے چھت پر سوتے تھے (وہ گرمی کے دن تھے) کنول نے فیصل سے کہا تھا کہ وہ گیارہ بجے سے پہلے ان کی چھت پر نہ آئے کیونکہ اس کے والد صاحب جو کھانسی کے مریض تھے، دس بجے سے پہلے نہیں سوتے تھے۔ فیصل نے اس موقع پر بھی تیز رفتاری دکھائی اور دس بجے ہی محبوبہ کی چھت پر لینڈ کر گیا۔ نہ جانے یہ فیصل کی خوش قسمتی تھی یا بدقسمتی کہ کنول کے والد راؤ صاحب ہنوز جاگ رہے تھے۔ غالباً فیصل کی شامتِ اعمال کے نتیجے میں انہوں نے کھانسی کا کوئی اچھا سیرپ پی رکھا تھا جس کے سبب انہیں کھانسی نہیں ہو رہی تھی۔ وہ بے حس و حرکت بستر پر لیٹے نظر آتے تھے۔ فیصل نے سمجھا کہ وہ سو رہے ہیں۔ اپنی خام خیالی کا علم اسے تب ہوا جب کنول سے پہلے کنول کے والد صاحب سے اس کی ملاقات ہو گئی۔ اس کے بعد نہایت زبردست گرج چمک ہوئی اور یہ مقولہ بھی غلط ثابت ہو گیا کہ جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں۔ فیصل کی کمر پر تین چار بھاری دوہتڑ بھی پڑے تھے۔ کسی نے چھت کی لائٹ روشن کر دی اور گھر والوں کو علم ہو گیا کہ ان کی چھت پر

کودنے والا دراصل ان کا ہم سایہ 'ماں پیو جایہ' ہے۔

آئندہ کے تین چار دنوں میں فیصل کو سخت ترین حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ کارگل کی جنگ کے بعد یہ اہم ترین واقعات تھے۔ گو یہ واقعات ایک گھر کی سطح پر ہوئے تھے لیکن چھوٹے اسکیل پر بھی ان کی شدت کچھ کم نہیں تھی۔ نواز صاحب نے فیصل کو دھکے دے کر گھر سے نکال دیا۔ فیصل نے بھی علی الاعلان کہہ دیا کہ وہ شادی کرے گا تو راؤ صاحب کی بیٹی سے کرے گا۔

وہ چار پانچ روز تک گھر سے باہر مارا مارا پھرتا رہا۔ اس دوران میں اپنے دوست لطیف کی مہربانی سے ایک مرتبہ فون پر کنول سے بھی اس کی بات ہوئی۔ کنول نے دکھی لہجے میں کہا۔ "جب آپ سے کہا بھی تھا کہ گیارہ بجے سے پہلے نہ آئیں تو....."

فیصل بولا "لیکن میں تو انہیں پورا ایک گھنٹا تاکتا رہا تھا' وہ بالکل بے حرکت لیٹے ہوئے تھے۔"

وہ چیخ کر بولی "بے حرکت تو ہمارا...." وہ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔ بہرحال بات فیصل کی سمجھ میں آگئی تھی۔ وہ کہنے لگی تھی "بے حرکت تو ہمارا ڈبّو بھی سارا دن لیٹا رہتا ہے' کیا تم کہو گے کہ وہ سو رہا ہے۔"

ڈبّو ان کے پالتو بلے کا نام تھا۔ کنول نے راؤ صاحب کو پالتو بلے سے جوڑنے کی ناکمل کوشش کی تھی۔ اس سے راؤ صاحب کے بارے میں کنول کے اندرونی خیالات کا اندازہ ہوتا تھا۔ راؤ صاحب کنول کے سوتیلے باپ تھے۔ وہ بے حد خوش خوراک اور سخت اندام قسم کے جھگڑالو شخص تھے۔

تین چار روز بعد جب فیصل نے ان سے کنول کا ہاتھ مانگا تو وہ سخت برہم ہوئے۔ انہوں نے فیصل سے کہا "تم گھر سے نکال دیے گئے ہو۔ تم میں تو اتنی قابلیت نہیں کہ اپنا پیٹ پال سکو۔ اپنی بیوی کو روٹی کہاں سے کھلاؤ گے۔ جاؤ چلتے پھرتے نظر آؤ۔"

راؤ صاحب کے برعکس کنول کی والدہ کا رویّہ نرم تھا۔ انہوں نے گفتگو میں ایسے اشارے دیے جن سے فیصل کو اندازہ ہوا کہ وہ اس رشتے کو ناپسند نہیں کریں گی۔ ان کی باتوں سے ان اختلافات کی بُو بھی آتی تھی جو میاں بیوی میں موجود تھے.... ڈیڑھ دو مہینوں تک کھچڑی پکی.... اس کھچڑی کا آخری نتیجہ یہ نکلا کہ کورٹ میں فیصل اور کنول کی شادی ہو گئی۔ اس شادی میں کنول کی والدہ کی پوشیدہ رضامندی بھی شامل تھی۔ فیصل کو تو اس کا والد پہلے ہی گھر سے نکال چکا تھا' اب کنول بھی گھر سے بے گھر ہو گئی تھی۔ یہ گیارہ بجے کے بجائے دس بجے چھت پر کودنے کا نتیجہ تھا۔ بہرحال اب ان دونوں کے سامنے نئی زندگی کے ڈھیروں مسائل تھے اور

قارئین متوجہ ہوں

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر آیات و احادیث درج ہیں' ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

جیبیں تقریباً تقریباً خالی تھیں۔

فیصل اب فوراً سے پہلے لاہور جانا چاہتا تھا۔ وہاں اس کا پرانا کلاس فیلو رفاقت رہتا تھا۔ رفاقت ایک بڑی فرم میں بطور کمپیوٹر پروگرامر جاب کرتا تھا۔ اس نے "حفیظ سینٹر" میں سافٹ ویئر کی ٹھیک ٹھاک دکان بھی کھول رکھی تھی۔ ماضی میں جب ڈیڈی کے ساتھ فیصل کی ان بن ہوا کرتی تھی تو رفاقت اسے بہت دلاسا دیا کرتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ جب بھی لاہور آئے گا وہ اس کے لیے آسانی سے ملازمت کا بندوبست کردے گا۔ پچھلے سال اپنے ایک دو خطوط میں اس نے فیصل سے اصرار بھی کیا تھا کہ وہ لاہور آئے۔ یہاں بی کام والوں کے لیے چند بہت اچھی ملازمتیں موجود ہیں۔

شادی کے بعد ایک رات لطیف کے گھر گزار کر جب نوبیاہتا جوڑا شہرِ پُرہنگام لاہور کی طرف روانہ ہوا تو لطیف نے زبردستی ڈیڑھ دو ہزار روپے فیصل کی جیب میں ڈال دیے۔ فیصل نے بہت کہا کہ بھئی وہاں خرچے کا کوئی ایسا مسئلہ نہیں۔ رفاقت کے ہاں رہنا ہے کھانا پینا بھی وہیں ہو گا۔ زیادہ سے زیادہ آٹھ دس روز میں نوکری لگ جائے گی.... بہرحال لطیف نے روپے واپس نہیں لیے تھے۔ آج سہ پہر وہ فیصل اور کنول کو خود ٹرین پر چڑھانے آیا تھا۔

"کہاں کھو گئے؟" کنول نے فیصل کے کندھا چھو کر دھیرے سے کہا۔

"کک.... کچھ نہیں.... یہی سوچ رہا تھا کہ کتنے بجے لاہور پہنچیں گے؟"

"کیا وقت ہو رہا ہے۔" کنول نے کھنک دار آواز میں پوچھا۔ "گیارہ بج گئے ہیں۔" فیصل نے رسٹ واچ کو روشنی کی طرف کرتے ہوئے بتایا۔

کنول مسکرائی "پھر وہی کُھپلا.... گیارہ نہیں دس بجے ہیں۔ شاید اس دن بھی آپ نے ٹھیک سے ٹائم نہیں دیکھا تھا۔"

"کس دن؟"

"جس دن، دھم سے ہماری چھت پر کود گئے تھے" کنول نے شوخی سے کہا "لوگوں کے بارہ بجتے ہیں، پتا نہیں آپ کے دس اور گیارہ کیوں بجتے ہیں۔"

فیصل کی انگلیوں میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ وہ اپنی خوبصورت دلہن کو چھونا چاہتا تھا اس سے پیار کرنا چاہتا تھا لیکن اس کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ زمانے کی کھڑی کی ہوئی ساری رکاوٹیں انہوں نے پار کرلیں تھیں لیکن اب انہیں تنہائی دستیاب نہیں تھی۔ اس عدم دستیابی نے نارسائی کا روپ دھار کر فیصل کو پل پل تڑپانا شروع کردیا تھا۔

وہ صبح آٹھ بجے کے لگ بھگ لاہور پہنچے۔ جس وقت وہ رکشا پر بیٹھ کر رفاقت کے گھر کی طرف جارہے تھے فیصل کے ذہن میں ایک نرم اور آرام دہ بستر بچھا ہوا تھا۔ ایک ایسی جگہ جہاں وہ میاں بیوی سکون سے ایک دوسرے کی بانہوں میں کھوسکیں....

رفاقت کا گھر ڈھونڈنے میں انہیں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ رفاقت اس وقت آفس جانے کی تیاری کررہا تھا۔ فیصل اور اس کی نوبیاہتا دلہن کو دیکھ کر وہ ایک بار تو زور سے ٹھٹکا پھر گرمجوشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فیصل کے گلے لگ گیا۔ وہ فیصل کے ساتھ دلہن کو دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ یہ بات تو اسے اچھی طرح معلوم تھی کہ گوجر خان میں فیصل کا کسی لڑکی سے چکر چل رہا ہے لیکن یہ بات ہرگز معلوم نہیں تھی کہ یہ بات نکاح کے بولوں تک پہنچ چکی ہے۔

فیصل اور رفاقت علیحدہ کمرے میں چلے گئے۔ رفاقت عمر میں فیصل سے کچھ بڑا تھا۔ گنجا ہونے کی وجہ سے اور بھی بڑا نظر آتا تھا۔ بہرحال دونوں میں احترام کے ساتھ دوستی کا رشتہ قائم تھا۔ فیصل نے ساری حقیقت رفاقت کے سامنے بیان کردی۔ رفاقت خوش تو ہوا لیکن اس کے ساتھ ساتھ کچھ پریشان بھی نظر آیا۔ اس نے فیصل سے کہا "رہائش کا تو کوئی مسئلہ نہیں ہے جگر! یہ تمہارا اپنا ہی گھر ہے لیکن نوکری کے سلسلے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ پچھلے سال ان دنوں میں ہماری کمپنی میں ہی پانچ چھ آسامیاں خالی تھیں مگر ان دنوں تو جیسے گریجویٹس نے لاہور پر حملہ کررکھا ہے.... کسی وقت تو.... وہ کہتے کہتے چپ ہوگیا۔

"یار بات تو مکمل کرو۔" فیصل نے اندرونی مایوسی کو چھپاتے ہوئے کہا۔

"کسی وقت تو مجھے اپنی نوکری خطرے میں نظر آنے لگتی ہے۔" رفاقت نے بات مکمل کرتے ہوئے اس امر پر مہر تصدیق ثبت کردی کہ فیصل کو ملازمت ملنے کی امید کم نہیں ہے۔

"خیر اب آ ہی گئے ہیں تو کچھ نہ کچھ کریں گے بھی۔" فیصل نے بے ڈھنگی خاموشی کو توڑنے کے لیے کہا۔

رفاقت خود تو دفتر چلا گیا، اس نے بیوی سے کہہ دیا تھا کہ وہ "دلہا دلہن" کے لیے ایک کمرا کھلوا دے۔ "کمرا کھلوانے" والا فقرہ فیصل کے کانوں کو بہت بھلا لگا تھا۔ بالکل جیسے کسی فاقہ زدہ شخص کے سامنے حلوہ پوری یا مرغ پلاؤ کی بات کی جائے۔ اپنی تمام تر پریشانیوں سے قطع نظر بس ایک ہی تصور فیصل کے ذہن میں بسا ہوا تھا۔ ایک پرسکون کمرا، ایک آرام دہ مسہری اور ہاتھوں میں اپنی دلہن کا ہاتھ۔

رفاقت کے کہنے پر رفاقت کی تنک مزاج بیوی نے فیصل اور کنول کے لیے ایک کمرا کھلوا تو دیا لیکن وہ اگلے چھ گھنٹے تک مسلسل ان دونوں کے سر پر اس طرح سوار رہی، جیسے اسے اندیشہ ہو کہ جونہی وہ اِدھر اُدھر ہٹی مہمانان گرامی کوئی قیمتی چیز اٹھا کر یہاں سے بھاگ لیں گے، عجیب کورذوق خاتون تھی۔ اسے کچھ احساس ہی نہیں تھا کہ وہ دونوں بالکل نئے نکور شادی شدہ ہیں اور ایسے لوگوں کو خلوت کی اتنی ہی ضرورت ہوتی ہے جتنی بیس سال قید تنہائی کاٹنے والے کو جلوت کی۔ وہ بہانے بہانے سے ان دونوں کے اردگرد ہی گھومتی رہی۔ ان دونوں کو اپنی نگاہ میں رکھنے کے حوالے سے وہ اتنی سنجیدہ تھی کہ اس ستم ظریف نے کچن کا رخ بھی نہیں کیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فیصل اور کنول کو دوپہر کا کھانا بھی نہیں ملا۔

سرِشام ایک اور آفت نوبیاہتا جوڑے کے سر پر ٹوٹی۔ فیصل کو رفاقت کا ایک فون موصول ہوا۔ رفاقت نے اسے بتایا کہ اسے ایمرجنسی میں آفس کے ایک کام سے اسلام آباد جانا پڑ گیا ہے۔ واپسی چار پانچ دن سے پہلے نہیں ہوسکتی۔ بہرحال اس نے فیصل سے کہا کہ وہ اطمینان سے گھر میں رہے اسے کسی طرح کی تکلیف نہیں ہوگی۔

تکلیف سے مراد شاید رفاقت کی مراد یہ تھی کہ ان دونوں سے کوئی مارپیٹ نہیں ہوگی، ورنہ تو باقی ہر طرح کی تکلیف وہ پچھلے چھ سات گھنٹے میں اٹھا چکے تھے۔ جس ستم ظریف کو رفاقت کی بیوی کہا جاتا تھا اس نے ان دونوں پر وہی نگاہ رکھی تھی جو پکا تھانیدار پکے چور پر رکھتا ہے۔ وہ دوپہر کے کھانے سے محروم تھے اور ان کے کمرے کی بجلی بھی بند تھی۔ یا شاید جان بوجھ کر بند رکھی گئی تھی۔

فیصل کی دلہن اس صورتِ حال پر جزبز تھی۔ اس نے کہا "مجھے تو لگتا ہے کہ آپ کے دوست صاحب نے بھی ہم سے پلہ ہی چھڑایا ہے۔ انہوں نے کہیں جانے کا بہانہ کرکے ہمیں اپنی فرعون صفت زوجہ کے حوالے کردیا ہے تاکہ وہ اچھے طریقے کے ساتھ ہمیں یہاں سے نو دو گیارہ کرسکے۔"

"لیکن بھئی بات یہ ہے کہ...."

"بات کچھ نہیں۔ ہمیں یہاں سے جانا ہوگا۔ میں ایسے ماحول میں نہیں رہ سکتی ڈارلنگ' کنول نے فیصل کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"مگر سوئیٹ ہارٹ' جیسے تیسے آج کی رات تو یہاں گزار لیں۔ وہ کیا کہتے ہیں کہ بوقتِ ضرورت گدھے کو بھی باپ بنا لیا جاتا ہے۔"

"یہ محاورہ گدھے کے لیے ہے لیکن ہمارا سابقہ ایک گدھی سے پڑا ہے۔" کنول نے کہا' پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی "نہیں ڈارلنگ' ہم یہاں نہیں رہیں گے۔ آپ دیکھ لینا یہ عورت رات بھر بھوت کی طرح ہمارے سر پر سوار رہے گی۔"

"تو پھر کہاں جائیں گے؟"

"وہ جو اسلامیہ پارک میں آپ کے دوست ہیں۔ کیا نام ہے ان کا.... بکرم صاحب"

"بکرم نہیں مکرم صاحب۔ حکیم مکرم صاحب" فیصل نے تصحیح کی۔

"ہاں وہی۔ ان کے ہاں چلے جاتے ہیں۔ آپ نے بتایا تھا کہ ان کی بیوی بھی بہت اچھی ہے۔ اور میرے خیال میں ان کا گھر بھی یہاں سے زیادہ دور نہیں ہوگا۔"

دس پندرہ منٹ کے اندر فیصل اور کنول نے کوچ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ یہ بات فیصل کی سمجھ میں بھی اچھی طرح آگئی تھی کہ رفاقت اور اس کی زوجہ کے حوالے سے جو نیک خیالات اس نے ذہن میں پال رکھے تھے' وہ سب کے سب بے کار تھے۔ انہوں نے اپنا مختصر سامان اٹیچی میں سمیٹا اور جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ رفاقت کی بیوی نے بس رسمی انداز میں انہیں ایک دوبار رکنے کے لیے کہا پھر بری الذمہ ہو گئی۔ غالباً وہ ان لوگوں میں سے تھی جنہیں مہمان بہت اچھا لگتا ہے مگر اس وقت جب وہ جانے والا ہوتا ہے۔

کمرا چھوڑنے سے پہلے فیصل کو ذرا تنہائی محسوس ہوئی۔ اس نے اپنی دلہن کو چومنے کے لیے اسے قریب کرنا چاہا۔ لیکن وہ پتھر کی طرح اکڑ گئی۔ اس نے آنکھوں سے بائیں جانب اشارہ کیا۔ گھر کی ملازمہ برآمدے میں بیٹھی ان کی طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ جیسے اسے اندیشہ ہو کہ جانے سے پہلے مہمانانِ گرامی' کمرے کا قالین' ٹی وی اور ریفریجریٹر وغیرہ اپنی جیبوں میں ڈال کر لے جائیں گے۔

"مجھے تو یہ لوگ نفسیاتی مریض لگتے ہیں۔ یا پھر کہیں سے انہوں نے ٹھیک ٹھاک ڈز کھائی ہوئی ہے۔" کنول نے اپنی خوبصورت ناک چڑھا کر کہا۔

رفاقت کے گھر سے باہر نکلنے کے بعد ان دونوں نے ٹیکسی لی اور مکرم علی کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں متعدد بار فیصل نے اپنی دلہن کو چومنے کا ارادہ کیا مگر ہر بار عقب نما آئینے میں اسے پٹھان ڈرائیور کی گھورتی ہوئی آنکھیں نظر آئیں اور اس نے ارادہ ملتوی کردیا۔

مکرم علی کا گھر ڈھونڈنے میں فیصل کو زیادہ دشواری پیش نہ آئی۔ مکرم علی گرمجوشی سے ملا۔ اس کا گھر کافی کشادہ تھا۔ گھر والوں کے دل بھی کشادہ ہی محسوس ہوتے تھے۔ بہرحال اس گھر میں وہ سہولتیں میسر نہیں تھیں جو رفاقت کی کوٹھی میں تھیں۔ مکرم علی کے والد بھی حکمت کرتے تھے' ان کی وفات کے بعد مکرم نے ان کی گدی سنبھال لی تھی۔ وہ دیکھنے میں بھی حکیم ہی نظر آتا تھا کیونکہ اس کی صحت اتنی اچھی نہیں تھی وہ بہت تیز باتیں کرتا تھا اور بہت تیز ہی چلتا بھی تھا۔ وہ نوجوان تھا۔ ایسی عمر میں لوگ حکیم نہیں ہوتے بلکہ "مایوسی" کی وجہ سے حکیموں کے مستقل گاہک ہوتے ہیں۔

مکرم علی نے اپنے ساتھ والا کمرا نوبیاہتا جوڑے کو رہائش کے لیے دے دیا.... اور یہیں سے نوبیاہتا جوڑے کی نئی بدقسمتی شروع ہو گئی۔ پہلے تو یہ ہوا کہ آدھی رات کو میزبان اور مہمان میں باتیں ہی ہوتی رہیں۔ دونوں بے تاب پریمی ہر بات کو آخری بات سمجھ کر سہتے رہے اور صبر کے گھونٹ بھرتے رہے۔ آخر رات بارہ بجے کے لگ بھگ خدا خدا کرکے مکرم علی کی یکطرفہ گفتگو کو بریک لگے اور میاں بیوی کو تنہائی نصیب ہوئی.... ڈبل بیڈ پر دونوں پاس پاس لیٹ گئے۔ ایک دوجے کا ہاتھ تھام لیا۔ آنکھوں آنکھوں میں باتیں ہوئیں۔ سانسوں کی لے چڑھنے لگی۔ سانسوں کی لے چڑھی تو خرابیِ تقدیر کے سبب فیصل کو تھوڑی سی کھانسی آگئی۔

کھانسی کا آنا تھا کہ دروازے پر دستک ہو گئی۔ فیصل نے لحاف ایک طرف پھینکا اور اٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے مکرم علی صاحب کھانسی کے لیے ایک سفوف "سینہ کشا" کے ساتھ موجود تھے۔ کئی برسوں کی محنتِ شاقہ کے بعد یہ سفوف پچھلے ہی ہفتے ایجاد ہوا تھا اور اب فیصل کی خوش بختی تھی کہ وہ اس سفوف سے مستفید ہو رہا تھا۔ سرِشام مکرم صاحب نے جو گفتگو شروع کی تھی' اس میں سے دو تین گھنٹے انہوں نے اسی سفوف کی ظاہری و باطنی خوبیوں کو گنوانے میں صرف کیے تھے۔ مکرم علی نے نہ صرف فیصل کو سفوف کھلایا بلکہ آدھ پون گھنٹا تک مزید اس سفوف کے فوائد گنوائے۔

ان کے جانے کے بعد پھر نوبیاہتا جوڑے کو تھوڑا سا تخلیہ ملا۔ سفوف کھانے کے باوجود فیصل کو کھانسی ہو رہی تھی' لیکن اس نے اپنی تمام تر صلاحیتیں کھانسی کو روکنے میں صرف کرر کھی تھیں۔ اس کوشش میں اس کا منہ بار بار سرخ ہو رہا تھا اور گلے کی رگیں پھول رہی تھیں۔ ایک دوبار اس نے کھانسی کی بھی لیکن اس کی شدت کو حتی الامکان حد تک

کم کردیا۔ جیسے فلک شگاف قہقہے کے بجائے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا جائے۔ لیکن جب قہقہے کو زبردستی مسکراہٹ میں بدلا جاتا ہے تو کبھی کبھی ایک بے ڈھنگا سا تاثر چہرے پر پیدا ہو جاتا ہے۔ کھانسی کو روکنے کی کوشش میں فیصل کے حلق سے بھی ایک عجیب و غریب آواز نکل گئی۔ بس پھر کیا تھا۔ وہی ہوا جس کا خطرہ تھا۔ آواز کا سننا تھا کہ مکرم علی صاحب دروازے پر آن وارد ہوئے۔ یعنی بقول شخصے' وہی ہوتا جو منظور خدا ہوتا ہے۔

اس مرتبہ وہ خاصے متفکر دکھائی دیے۔ انہوں نے انکشاف فرمایا کہ فیصل کو صرف کھانسی نہیں بلکہ کالی کھانسی ہے اور ساتھ میں تبخیرمعدہ اور ''سوزش جوف سینہ'' قسم کی کچھ تکالیف بھی ہیں۔ اس مرتبہ ایک خمیرہ اور لعاب دار دوا بھی فیصل کو حلق میں اتارنا پڑی.... لعاب دار دوا کافی کڑوی تھی۔ تاہم اس سے زیادہ کڑوی آدھ پون گھنٹے وہ کی حکیمانہ گفتگو تھی جو مکرم صاحب نے آفت زدہ جوڑے کے کانوں میں انڈیلی۔ لعاب دار دوا فیصل نے باتھ روم میں جا کر پی لی۔

خدا خدا کر کے وہ تشریف لے گئے۔ فیصل نے جھلاّئے ہوئے انداز میں اندر سے کنڈی چڑھائی اور بغیر کسی تمہید کے نفسِ مضمون کی طرف آگیا۔ اس نے کنول کو بانہوں میں لیا اور اس میں گم ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ بمشکل دو تین منٹ ہی ہوئے تھے کہ دروازہ پھر بج اٹھا۔ فیصل نے قہرناک انداز میں دانت پیسے۔ لباس اور بال درست کیے اور کنڈی کھول دی۔ سامنے حسب توقع مکرم صاحب ہی کھڑے تھے۔

اس مرتبہ وہ فیصل کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے باقاعدہ کمرے سے باہر لے گئے۔

صحن کی کڑکتی سردی میں پہنچ کر فیصل کے جذبات کافی حد تک سرد پڑ گئے۔ رہی سہی کسر مکرم علی کی گفتگو نے پوری کر دی۔ وہ ناصحانہ انداز میں سرگوشی کرتے ہوئے بولے ''میں تمہیں بتانا بھول گیا۔ یہ لعاب دار دوا جو تم نے ابھی کھائی ہے اس میں تخم لسن شامل ہے' اور تلسی کا عرق بھی ہے۔ تلسی نظام تنفس اور سوزش حلق اور افعال معدہ و جگر کے لیے بے حد مفید ہے لیکن اس کے کچھ ذیلی اثرات بھی ہیں۔ ان سے آگاہ ہونا ضروری ہے تاکہ جسم کے مختلف نظام اور افعال میں ٹکراؤ پیدا نہ ہو.... جو کہ ذہنی فتور کو جنم دے سکتا ہے۔''

''تو پھر میں کیا کروں؟''

وہ بولے ''تمہاری نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ اس موسم میں ہر روز' روز عید اور ہر شب' شب برات ہوتی ہے۔ میاں بیوی اکٹھے ہوں تو ایک دوسرے سے دور نہیں رہ سکتے۔ لیکن اس دوا کی وجہ سے تمہیں آج شب دور ہی رہنا ہو گا۔ زیادہ نہیں کم از کم آخری پہر تک تو احتیاط کرنا' میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''بالکل بھائی! سو فیصد سمجھ رہا ہوں۔''

''باقی ازدواجی زندگی کو خوشگوار بنانے کے لیے میں تمہیں کئی قیمتی نسخے بتاؤں گا لیکن ابھی نہیں پھر کبھی سہی۔''

فیصل نے سوچا' اپنی ازدواجی زندگی کو خوشگوار بنانے کا ایک زبردست نسخہ تو میرے پاس بھی موجود ہے لیکن افسوس میں اس پر عمل نہیں کر سکتا کیونکہ مہمان اگر میزبان کی گردن مروڑ کر اسے بے ہوش یا اناللہ کر دے تو یہ سنگین کیس ہوتا ہے۔

مکرم کے جانے بعد فیصل نے ایک بار پھر دروازہ بند کیا۔ اپنے ہاتھ رگڑ کر سردی کم کرنے کی کوشش کی اور بڑبڑایا.... ہر روز' روز عید.... ہر شب' شب برات.... اونہہ۔''

کنول گھٹنوں تک لحاف کھینچے بیٹھی تھی اور مسکراتی نظروں سے فیصل کو دیکھ رہی تھی ''کیا کہہ رہے تھے۔'' اس نے پوچھا۔

فیصل نے سب کچھ بتا دیا۔ وہ مسکراتے لہجے میں بولی۔ ''میرا خیال ہے کہ پھر آپ کو سو جانا چاہیے۔''

''میں پاگل نہیں ہوں کہ سو جاؤں۔''

''لیکن اس کا اندیشہ تو ہے۔ مکرم صاحب نے یہی تو کہا ہے۔''

''اندیشہ کس بات کا؟ میں نے دوا کھائی ہی نہیں تھی' باتھ روم کے واش بیسن میں بہا دی تھی۔'' وہ کنول کو بانہوں میں سمیٹتے ہوئے بولا۔

''بڑے چالاک ہیں آپ'' کنول نے تعریف کی۔

بمشکل پانچ دس منٹ ہی گذرے ہوں گے کہ فیصل سے پھر ایک غلطی ہو گئی۔ کمرے میں مچھر تھے۔ وہ نازو نعم کا پلا ہوا تھا۔ صاف ستھرے ماحول میں رہتا تھا' مچھروں سے اس کی شناسائی کم ہی تھی۔ وہ سخت بیزار ہو رہا تھا۔ ایک مچھر کو مارنے کے لیے اس نے تالی بجائی۔ یہ تالی بادشاہوں والی تالی ثابت ہوئی جس کے ذریعے خدام کو حاضر ہونے کا حکم دیا جاتا ہے۔ تالی بجنے کے ایک منٹ بعد ہی دروازے پر دستک ہو گئی۔ اس مرتبہ حکیم صاحب کی بیوی دروازے پر موجود تھیں۔ ان کے ہاتھ میں مچھر کو دور بھگانے والا تیل تھا۔ یہ تیل بھی مکرم صاحب کا ہی ایجاد کردہ تھا۔ بھونڈی سی بوتل پر بھونڈا سا ریپر لگا ہوا تھا' جس پر ایک مچھر چاروں شانے چت پڑا تھا۔

''یہ انہوں نے بھیجا ہے۔'' مسز مکرم نے کہا ''یہاں مچھر کافی ہیں آپ یہ جسم کے کھلے حصوں پر لگا لیں۔''

''شکریہ.... غالباً یہ بھی مکرم بھائی نے ہی تیار کیا ہو گا۔'' فیصل ازراہِ مروت پوچھ بیٹھا۔

جواباً اسے اس نایاب تیل کی کریڈیبلٹی کے بارے میں ایک تحقیقی مقالہ سننا پڑا مسز مکرم نے نوبیاہتا جوڑے کو بتایا کہ یہ تیل درحقیقت اس کے والد مرحوم یعنی مکرم کے سسر نے تیار کیا تھا۔ (بہ الفاظ دیگر انسانیت پر یہ احسان عظیم انہی کے دور میں ہو چکا تھا۔) مکرم نے تو اس تیل میں صرف چند تبدیلیاں کی تھیں اور اس کی پیکنگ وغیرہ کو بہتر بنایا تھا۔

مسز مکرم کے جانے کے بعد فیصل نے دروازہ پھر بند کیا۔ مچھر تو واقعی یہاں بہت تھے۔ اب دونوں یہ فیصلہ کر رہے تھے کہ مچھر کو برداشت کیا جائے یا تیل کی نہایت ناگوار بو کو..... نئی نئی شادی تھی۔ اگر شادی کو تین چار سال گذر گئے ہوتے تو بیوی کو خود سے دور رکھنے کے لیے شاید فیصل یہ تیل استعمال کرلیتا لیکن اب تو معاملہ برعکس تھا۔

اس نے سوچ بچار کے بعد تیل ایک طرف رکھ دیا اور سٹپٹائے ہوئے انداز میں پھر لحاف میں گھس گیا..... لیکن پتہ نہیں کیا بات تھی اب عجیب سی کسلمندی محسوس ہو رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ سینہ جل رہا ہے۔ وہ اٹھ کر کمرے کے اندر ہی ٹہلنے لگا۔ اسے یہ اندیشہ محسوس ہونے لگا کہ کہیں اپنے عین دور شباب میں وہ مکرم علی کے کسی غلط سلط نسخے کا شکار ہونے تو نہیں جا رہا۔ سخت سردی کے باوجود اس نے دو تین مرتبہ پانی بھی پیا۔ اب رات کے تین بجنے والے تھے..... فیصل کو اپنی طبیعت مسلسل بھاری محسوس ہو رہی تھی۔ کچھ دیر کمرے میں ٹہلنے کے بعد وہ باہر برآمدے میں آکر چکرانے لگا۔ اس کا خدائی معالج فوراً آن حاضر ہوا۔

"کیا بات ہے فیصل بھائی؟" اس نے پوچھا۔

فیصل نے اپنی طبیعت کی گرانی کے بارے میں بتایا۔

تھوڑی سی گفتگو کے بعد یہ راز کھلا کہ فیصل کی چالاکی ہی اس کے لیے مصیبت بن گئی ہے۔ جو لعاب دار دوا اس نے واش بیسن میں پھینک دی تھی، وہ کھانا بہت ضروری تھی۔ کیونکہ یہ دوا اس آتش اثر خمیرے کا توڑ تھی جو اس کو کھانسی روکنے کے لیے کھلایا گیا تھا۔ یعنی یہ اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مارنے والی بات ہوئی تھی۔

بہرحال باقی کی رات بھی مکرم علی کی تیز زبان قینچی کی طرح چلتی رہی اور بنی نوع انسان کی بیماریوں اور ان کے علاج کے حوالے سے فیصل کی معلومات میں بیش بہا اضافہ ہوتا رہا۔ صبح تک فیصل کو ایک بار پھر کھانسی شروع ہو گئی۔ تاہم خیریت گذری کہ اس وقت تک مکرم علی کے مطب جانے کا ٹائم ہو گیا تھا۔

ناشتے کے فوراً بعد گھر میں رونا دھونا مچ گیا۔ معلوم ہوا کہ مکرم علی کے سسرال میں کوئی عورت فوت ہو گئی ہے۔ اب یہ سارے لوگ فوتگی پر گجرات جا رہے تھے۔ مکرم علی بھی مطب سے واپس آگیا تھا۔ فوت ہونے والی اس کی بیوی کی بہن تھی۔ وہ لوگ دو دن سے پہلے واپس نہیں آ سکتے تھے..... فیصل رات کو ہی یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ مکرم کے گھر میں نہیں رہے گا بلکہ دو چار دن اپنی بیوی کے ساتھ سکون سے گزارنے کے لیے درمیانے درجے کے ہوٹل میں کمرا کرایے پر لے لے گا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مکرم سے جانے کی اجازت کیسے مانگے۔ اب چونکہ مکرم خود ہی گجرات جا رہا تھا۔ فیصل کی مشکل آسان ہو گئی۔ اس نے مکرم کے سامنے بہانہ بنایا کہ وہ اپنے ایک پرانے دوست کے ہاں گلبرگ جانا چاہتا ہے..... تھوڑی سی بحث و تمحیص کے بعد مکرم نے اجازت دے دی۔ بہرحال اس کے چہرے سے ظاہر تھا کہ وہ ابھی فیصل پر اپنے کئی گراں قدر نسخے آزمانا چاہتا تھا..... ایک حسرت اس کے تاثرات سے عیاں تھی۔

گیارہ بجے کے قریب فیصل اور کنول مکرم علی کے گھر سے روانہ ہوئے اور رکشا پر سوار ہو کر میکلوڈ روڈ کی طرف چل دیے۔ فیصل جانتا تھا کہ اس علاقے میں کئی صاف ستھرے ہوٹل موجود ہیں۔ ایک پرسکون کمرے کا تصور اس کے ذہن میں بسا ہوا تھا۔ ایک ایسا کمرا جس کا بند دروازہ کھٹکھٹانے کے

لیے کوئی مکرم علی موجود نہ ہو گا۔ اس نے اپنے پہلو میں بیٹھی نئی نویلی دلہن کی طرف دیکھا اور اس کا دل جیسے انگڑائیاں لینے لگا۔ کنول بھی اس کی کیفیت محسوس کر کے زیر لب مسکرانے لگی۔ شب بیداری نے اس کے حسن کو کچھ اور بھی خمار آلود کر دیا تھا۔ فیصل نے اس کا ہاتھ آہستگی سے اپنے ہاتھ میں تھام لیا اور دھیرے دھیرے سہلانے لگا۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں اس سے وعدہ کر رہا تھا۔ بس تھوڑا سا صبر میری جان کہ ابتلا کی گھڑیاں مختصر ہیں۔ بہت جلد ہم ایک ساتھ ہوں گے۔

لاہور ہوٹل سے تھوڑا آگے جا کر وہ رکشا سے اترے۔ رکشا والے کا کرایہ ادا کرنے کے لیے فیصل نے جیسے ہی جیب میں ہاتھ ڈالا تو معلوم ہوا کہ بٹوا تو جیب میں نہیں ہے۔ اس نے تیزی سے کوٹ اور پتلون کی ساری جیبیں ٹٹولیں مگر گوہرِ مقصود ہاتھ نہ آیا۔ وہ اس کی جیب سے نکل چکا تھا۔ چند لمحوں کے لیے وہ چکرا کر رہ گیا۔ رکشا کے اندر گھس کر اس نے نشست اور پائیدان کو اچھی طرح دیکھا لیکن بٹوا کہیں نہیں تھا۔ یہ تو فیصل کو اچھی طرح یاد تھا کہ مکرم کے گھر سے رخصت ہوتے وقت بٹوا اس کی جیب میں تھا۔ وہ راستے میں ہی نکلا تھا۔ شاید اس وقت جب وہ کنول کے ساتھ رکشا کے انتظار میں بس اسٹاپ پر کھڑا تھا۔

"یا خدا، اب کیا ہو گا؟" اس نے بڑے کرب کے عالم میں سوچا۔

کنول کے پرس میں کچھ روپے موجود تھے۔ ان روپوں میں سے فیصل نے رکشا کا کرایہ دیا اور اٹیچی کیس اٹھا کر کنول کے ساتھ ایک طرف چل دیا۔ ہوٹل کے پرسکون کمرے اور آرام دہ بستر کا خواب لمحوں میں ٹوٹ گیا تھا۔ کنول کے پرس میں کل دو سو اٹھارہ روپے تھے۔ ان سے تو ہوٹل کا ایک دن کا کرایہ بھی ادا نہیں کیا جا سکتا تھا۔۔۔۔

مکرم علی کے گھر واپس جانے کا بھی کوئی چانس نہیں تھا۔ وہ لوگ گھر کو تالا لگا کر گجرات روانہ ہو گئے تھے۔ ان کا دوسرا ممکنہ ٹھکانا رفاقت علی کا گھر ہو سکتا تھا۔ لیکن اس گھر کے ساتھ ہی رفاقت کی کرخت چہرہ بیوی کا تصور بھی فیصل کے ذہن میں آگیا۔ اس کے گھر واپس جانا تو گویا تھوکے کو چاٹنے والی بات تھی۔ فیصل جانتا تھا کہ کنول تو کسی صورت رفاقت کی طرف جانے کو تیار نہیں ہو گی۔

اٹیچی کیس ہاتھوں میں لٹکا کر وہ لوگ ایک بس میں سوار ہوئے اور باغ جناح پہنچ گئے۔ درحقیقت فیصل کہیں آرام سے بیٹھ کر صورتِ حال پر غور کرنا چاہتا تھا۔ باغ جناح میں سرما کی سنہری دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ وہ دونوں گھاس کے ایک قطعے پر جا بیٹھے۔ دوپہر ہو چکی تھی۔ بھوک محسوس ہونے لگی تھی۔ انہوں نے بھٹے لے کر کھائے۔ نمک مرچ اور کھٹائی لگا کر مکئی کو مزیدار بنا دیا گیا تھا۔

"اب کیا ہو گا فیصل؟" کنول منمنائی۔

"یہی میں سوچ رہا ہوں۔"

"تم ہر کام میں بہت جلدی کرتے ہو۔ تم نے ہماری چھت پر کودنے میں جلدی کی۔ تم نے شادی میں جلدی کی۔ تم نے مکرم علی کا گھر چھوڑنے میں جلدی کی اور ہوٹل جاتے ہوئے تم نے جیب سے اپنا رومال نکالنے میں جلدی کی۔۔۔ مجھے یقین ہے تم نے جلدی میں رومال نکالتے ہوئے بٹوا گرا دیا ہو گا۔"

"تم ایک نامعلوم جیب کترے کی طرفداری کر رہی ہو اور اپنے شوہر کو موردِ الزام ٹھہرا رہی ہو۔۔۔"

دونوں خوبصورت روشوں پر گھومتے رہے۔ ہر طرف خوب صورت چہروں اور رنگین آنچلوں کی بہار تھی۔ ایک خوبصورت چہرہ فیصل کے پہلو میں بھی تھا۔ لیکن اس کے قریب ہوتے ہوئے بھی وہ بہت دور تھا۔ وہ باغ جناح کی مصنوعی پہاڑی پر چلے گئے۔ درختوں کے ایک جھنڈ میں جا کر فیصل نے اپنی دلہن سے تھوڑا سا پیار جتانا چاہا۔ ابھی اس نے دلہن کو گلے ہی لگایا تھا کہ نوجوان لڑکوں کی قہقہے سنائی دیے۔ وہ دونوں بدک کر پیچھے ہٹ گئے۔ اضطراری طور پر ایک گھنی جھاڑی کی اوٹ میں ہو گئے۔ ان کا خیال تھا کہ شاید لڑکوں نے انہیں دیکھ کر قہقہہ لگایا ہے، لیکن وہ تو یونہی اپنی مستی میں ہنستے کھیلتے چلے آ رہے تھے۔ بہرحال لڑکوں کے گذر جانے کے بعد انہیں یونہی جھاڑی میں دبکے رہنا تھا۔ لڑکوں کے گذر جانے کے بعد کنول نے اٹھنے کی کوشش کی تو سسکاری لے کر رہ گئی۔ اس کا بڑا سا جھمکا ایک کانٹے دار جھاڑی میں بری طرح الجھ گیا تھا۔ اس نے جھمکا چھڑانے کی کوشش کی، ناکام ہوئی تو فیصل کوشش کرنے لگا۔ جھمکا بری طرح الجھا ہوا تھا۔ فیصل پہلے ہاتھوں سے کوشش کرتا رہا پھر اس نے دانتوں سے ٹرائی کی۔ کنول نیم دراز تھی۔ فیصل کمان کی طرح دہرا ہو کر اس پر جھکا ہوا تھا۔ اس کے دانت کنول کے چہرے کے قریب تر تھے۔ عجیب سا پوز بن گیا تھا۔ جیسے وہ خدانخواستہ آدم خور ہو اور کنول کو کچا کھانا چاہتا ہو۔

یہی وقت تھا جب جھاڑیوں میں سرسراہٹ ہوئی اور باغ کا ایک باوردی چوکیدار ہاتھ میں ڈنڈا لیے نمودار ہوا۔ وہ چند لمحے خشمگیں نظروں سے فیصل اور کنول کو گھورتا رہا۔ پھر رعب سے چلتا آگے آگیا۔ "کیا ہو رہا ہے یہاں؟" اس نے تحکم سے پوچھا۔

"کچھ نہیں بھائی' یہ جھمکا ذرا یہاں اٹک گیا تھا۔" فیصل نے کہا۔

"جھمکا اٹکانے کے لیے تمہیں کوئی اور جگہ نہیں ملی تھی۔ چوکیدار نے تیکھے لہجے میں پوچھا "کون ہو تم اور یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"یہ میری بیوی ہے بھائی' ہم سیر کرنے آئے ہیں بھائی۔"

بیویوں والے یوں چوروں کی طرح جھاڑیوں میں نہیں گھستے۔" چوکیدار نے کہا اور مخالف سمت میں چند قدم آگے جاکر اپنے کسی ساتھی فلک شیر کو آوازیں دینے لگا۔

سردی کے باوجود فیصل کے مساموں سے پسینہ پھوٹ نکلا۔ ان لمحات میں پہلی بار اس کے ذہن میں آیا کہ اس نے اپنی محبوبہ کی چھت پر کود کر اچھا نہیں کیا تھا۔ اگر وہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا تو اس وقت بڑے آرام سے اپنے گھر میں موجود ہوتا' جہاں پہلی اور دوسری منزل کے ملا کر کُل چودہ بیڈ روم تھے' چودہ عدد بستر' چودہ غسل خانے' چودہ عدد بند دروازے جو مکرم علی جیسے ہر شخص کی دستک سے محفوظ تھے..... یہ سب کچھ موجود ہوتا تو آج اسے کنول کے ساتھ یوں جھاڑیوں میں نہ گھسنا پڑتا۔

جھمکا جو پہلے کوشش کے باوجود جھاڑی سے نہیں چھوٹ رہا تھا' اب خوف کے سبب ایک دم چھوٹ گیا۔ یہ بھی ایک طرح بُرا ہی ہوا کیونکہ اب فیصل اور کنول کے پاس جھمکے کے اٹک جانے کا کوئی ثبوت نہیں تھا۔ اسی دوران میں فلک شیر بھی وہاں پہنچ گیا۔ وہ بھی ایک لمبا تڑنگا باوردی چوکیدار تھا۔

تاہم اس کی صورت دیکھ کر فیصل کے ذہن میں پھلجھڑی سی چھوٹ گئی۔ فلک شیر نامی یہ شخص فیصل کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ اس شخص کا بھائی گوجر خان میں فیصل کے والد کی فیکٹری میں کام کرتا رہا تھا۔ یہ شخص کبھی کبھی اپنے بھائی سے ملنے گوجر خان آتا تھا۔ فیصل نے ایک دو مرتبہ اس بندے سے لاہور کی معروف باداموں والی برفی بھی منگوائی تھی۔

فلک شیر نے بھی فیصل کو پہچان لیا۔ اس کی اوپر کو اٹھتی ہوئی مونچھیں ذرا ڈھیلی پڑ گئیں۔ وہ جلدی سے آگے آیا اور فیصل کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا "چھوٹے بابو! آپ یہاں.....؟"

فیصل نے کہا "شکر ہے تم نے پہچان لیا۔ ورنہ مجھے تو ڈر تھا کہ تمہارا یہ ساتھی ہماری ٹھکائی شروع کردے گا۔"

فلک شیر نے جلدی جلدی درختوں کے پتے اور مٹی وغیرہ فیصل کے کوٹ سے جھاڑی... کنول کے لیے یہ کام فیصل نے کیا۔

....قریباً ایک گھنٹے بعد وہ دونوں میاں بیوی فلک شیر کے گھر واقع کچی بستی "ککڑی کوٹ" میں موجود تھے۔ فلک شیر کا گھر بہت مختصر تھا۔ شاید تین مرلے کا ہوگا۔ یہ تین مرلے بھی دو بھائیوں میں بٹوارے کے بعد ڈیڑھ ڈیڑھ مرلہ رہ گئے تھے۔ اس ڈیڑھ مرلے میں ایک صحن تھا جو بڑے سائز کے کیرم بورڈ سے تھوڑا ہی بڑا ہوگا۔ اس کے علاوہ دڑبا نما چار کمرے تھے۔ یہ کمرے اینٹ گارے کے نہیں تھے۔ ان کی تعمیر میں انواع اقسام کا میٹریل استعمال ہوا تھا۔ چپ بورڈ' پلائی بورڈ' ون بورڈ' ٹین کی چادریں غرض ہر قسم کا نمونہ یہاں موجود تھا۔ فیصل اور کنول کو اپنے گھر میں لاکر فلک شیر ان کے سامنے بچھا جا رہا تھا۔ وہ تو تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ایک دن چھوٹے بابو اس کے گھر آئیں گے بلکہ اس کے گھر میں قیام کا ارادہ بھی ظاہر کریں گے۔ اس بے چارے کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مسٹر اور مسز فیصل کو کہاں بٹھائے۔ ان کے سامنے کیا پیش کرے۔ فلک شیر کی بیوی اور ان کے نصف درجن بچے بھی پروانوں کی طرح فیصل اور کنول کے گرد گھوم رہے تھے۔ چھوٹے بچے کی عمر چار پانچ سال تھی۔ کنول نے اسے گود میں اٹھا لیا۔ اس نے بچے سے دو چار میٹھی میٹھی باتیں کیا کردیں وہ تو اس سے چپک کر رہ گیا۔ اگلے تین چار گھنٹے میں اس نے کنول کی گود سے اترنے کا نام نہ لیا۔ وہ بار بار کنول کا منہ چوم رہا تھا اور فیصل کے احساسِ محرومی کو ہوا دے رہا تھا۔

فلک شیر نے کہا "جانی میرا سب سے چھوٹا بیٹا ہے جی۔ سب سے پیارا بھی یہی ہے' اور لاڈلا بھی یہی ہے۔"

رات سر پر آگئی تھی۔ فلک شیر نے اپنے گھر کا سب سے کشادہ اور صاف ستھرا کمرا فیصل اور کنول کے لیے خالی کر دیا۔ یہ سب سے کشادہ کمرا بھی بمشکل آٹھ ضرب آٹھ فٹ کا تھا۔ زمین پر ایک موٹی دری بچھی ہوئی تھی جس پر میزبانوں نے گدا وغیرہ ڈال دیا تھا۔ کمرے کے ایک طرف کی دیوار کنستروں کے ٹین کو جوڑ کر بنائی گئی تھی۔ کھانا فلک شیر نے ہوٹل سے منگوایا۔ وہ اس بات پر سخت افسردہ نظر آ رہا تھا کہ چھوٹے بابو کو ایسی نامعقول جگہ پر رہنا پڑ رہا ہے۔ بہرحال فیصل کے لیے یہ جگہ بھی بری نہیں تھی۔ کچھ بھی تھا یہ "جگہ" تو تھی۔ جیسے تیسے دس بجے اہل خانہ اپنے اپنے بستروں پر سونے کے لیے لیٹ گئے۔ فیصل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں۔ نوبیاہتا کنول اس کے پہلو میں تھی۔ مگر پھر اچانک یوں محسوس ہوا کہ دلی ہنوز دور است۔ دروازے پر آہٹ ہوئی اور ننھا جانی شرماتا ہوا اندر آگیا۔ "میں باجی کے پاس لیٹوں گا۔" اس نے بڑی ادا سے کہا۔

اس کی بڑی بہن تیزی سے آئی اور جانی کو جھپٹ کر اٹھا لیا "چلو امی کے پاس۔"

جانی نے اچانک چیخ ماری اور رونا شروع کر دیا۔ وہ واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔ کنول نے ازراہِ مروت جانی کو اس کی بڑی بہن سے لے لیا۔ "اچھا یہیں میرے پاس رہنے دو سو جائے گا تو لے جانا۔" کنول نے کہا۔

فیصل دل ہی دل میں سٹپٹا کر رہ گیا۔ اگلے ڈیڑھ گھنٹے میں جانی نے ایک بھی ایسا اشارہ نہیں دیا جس سے فیصل کی امید بندھتی کہ وہ آفت زادہ سو جائے گا۔ وہ توتلی زبان میں مسلسل باتیں کر رہا تھا۔ توتلی زبان فیصل کو اچھی لگتی تھی مگر اس وقت زہر لگ رہی تھی۔ خدا خدا کر کے جانی کو اونگھ آئی۔ فیصل نے کنول کو اشارے سے کہا کہ وہ لائٹ آف کر دے۔ کنول نے ہاتھ بڑھا کر لائٹ آف کر دی۔ لائٹ آف ہوئے دو تین منٹ ہی ہوئے تھے کہ بچو نگوڑے نے اٹھ کر رونا شروع کر دیا۔ اس نے انکشاف کرتے ہوئے کہا "میں بتی جلا کر سوتا ہوں۔"

فیصل کی رہی سہی امیدیں بھی ختم ہو گئیں۔ اگلے آدھ گھنٹے میں کنول نے تین بار بتی بجھانے کی کوشش کی لیکن ناکام ہوئی۔ ننھے رقیب روسیاہ نے کنول کا رخ بھی اپنی طرف موڑ لیا تھا۔ فیصل دانت پیس کر بولا "تمہیں بڑا شوق چڑھا ہوا تھا اسے گود میں اٹھانے کا۔"

"جی آپ نے مجھ سے کچھ کہا۔" فیصل کو اپنے بالکل قریب سے آواز آئی۔

اس نے گھوم کر دیکھا تو اندازہ ہوا کہ یہ آواز ساتھ والے کمرے سے آئی تھی۔ (اگر اسے کمرا کہا جا سکے تو) چونکہ دونوں کمروں کے درمیان صرف ٹین کی چادر حائل تھی اس لیے فیصل کو بالکل یہی لگا کہ کوئی اس کے پہلو میں لیٹا ہوا ہے۔ اب اس نے غور کیا تو ساتھ والے "کمرے" سے سانس لینے کی آواز بھی باقاعدہ اس "کمرے" میں پہنچ رہی تھی۔ فیصل کو شرمندگی محسوس ہونے لگی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے کنول کا منہ چوما تھا۔ یقیناً یہ آواز بھی بڑی وضاحت سے ساتھ والے کمرے کے مکین یا مکینوں نے سنی ہوگی۔ "دھت تیری کی.... اتنی پتلی دیواروں والے کمرے میں کیا خاک پیار ہو سکتا ہے۔" فیصل نے سوچا اور بیزاری سے کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔ جلد ہی اسے نیند آ گئی۔

رات کسی وقت اس کی آنکھ کھلی۔ اس نے محسوس کیا کہ کمرے میں اندھیرا ہے۔ کوئی چیز اس کے بالوں میں رینگ رہی تھی۔ ہونے کو تو یہ کن کھجورا بھی ہو سکتا تھا کیونکہ وہ جس جگہ استراحت فرما رہے تھے وہاں ایسی مخلوق کی موجودگی بعید از امکان نہیں تھی۔ بہرحال جلد ہی فیصل کو اندازہ ہو گیا کہ کنول اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی ہے۔

"جانی کہاں ہے؟" فیصل نے نہایت مدھم سرگوشی میں پوچھا۔

"اسے آنٹی لے گئی ہیں۔" کنول نے بھی بہت دھیمی سرگوشی کی۔

"باقی لوگ سو گئے ہیں؟"

"جی ہاں"

فیصل نے بڑی آہستگی سے کروٹ بدلی۔ اس کی آہستگی کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا تھا کہ مکمل کروٹ بدلنے میں اس نے ایک منٹ صرف کر دیا۔ پھر بالکل سلوموشن کے انداز میں اس نے اپنا تپا ہوا ہاتھ کنول کے رخسار کی طرف بڑھایا۔ اچانک ایک زوردار کڑاکا سنائی دیا۔ بالکل یوں لگا کہ آسمان ٹوٹ کر ان کے سر پر آن گرا ہے اور زمین دھماکے سے شق ہو گئی ہے۔ اس آواز کے سبب کنول کی چیخ نکل گئی اور وہ اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ اسے سنبھالنے کے لیے فیصل بھی کھڑا ہوا۔ اس کی ایڑی کو کسی چیز سے ٹھوکر لگی اور وہ پشت کے بل پلائی وڈ کی دبلی پتلی دیوار پر گرا۔ سارے کا سارا کمرا اپنی بنیادوں سے ہلتا محسوس ہوا۔

اہل خانہ جاگ گئے۔ روشنی ہو گئی۔ تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ سوتے میں فلک شیر کی بھاری بھرکم والدہ کا گھٹنا ٹین کے اس پارٹیشن سے ٹکرایا تھا جو فیصل والے کمرے کو دوسرے کمرے سے علیحدہ کرتا تھا۔ اس قسم کے دھماکے اس کبوتر خانے میں اکثر ہوتے رہتے تھے۔ لہٰذا سونے والوں کے کانوں پر جوں تک نہ رینگتی تھی یہ تو فیصل اور کنول ہی تھے جو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے تھے اور شب تاریک کو روز حشر جان کر "اے خدا البیک" پکارنے لگے تھے۔

باقی کی ساری رات فیصل اور کنول نے جاگتے گزار دی۔ کنول تو اتنی ڈر گئی تھی کہ اس نے فیصل کو لائٹ آف نہیں کرنی دی۔ اسے ہر وقت یہی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ ساتھ والے کمرے میں خوابیدہ کسی اہل خانہ کا گھٹنا بڑے زور کے ساتھ ٹین کی چادر سے ٹکرائے گا اور کانوں کے پردے پھاڑ دے گا۔

یوں لگتا تھا کہ قدرت فیصل اور کنول کے صبر کا پورا پورا امتحان لینے پر تلی ہوئی ہے۔ اگلے روز دوپہر کے وقت ہی بوندا باندی شروع ہو گئی تھی۔ یہ سلسلہ رات تک جاری رہا۔ فلک شیر کے گھر کے دو کمروں کی چھتیں ٹپکنے لگیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ تمام اہل خانہ کو باقی کے دو کمروں میں سونا پڑا۔ یہ کمرے پہلے ہی اوور لوڈ تھے۔ اب بالکل پیک ہو گئے۔ ایک ایک کمرے میں سات سات افراد کو ٹھونسنا پڑا۔ وہ سب ایک دوجے سے جڑے ہوئے لیٹے تھے۔ یوں فیصل اور کنول کے درمیان

قربت کی ایک شکل تو پیدا ہو گئی لیکن یہ قربت دوری سے زیادہ تکلیف دہ تھی۔ بالفاظ دیگر یہ قربت جذبات کی فراوانی کا نہیں حالات کے جبر کا نتیجہ تھی۔ سردیوں کی یہ بارش ساون کی جھڑی ثابت ہوئی۔ اگلی رات بھی اسی بارش کی نذر ہوئی۔

تیسرے دن فیصل اور کنول بالکل بیزار ہو گئے۔ وہ ذرا گھومنے کے لیے چوکیدار فلک شیر کے گھر سے نکلے۔ ابھی وہ بڑے سڑک تک ہی پہنچے تھے کہ ایک جگہ فیصل کو ٹھٹک کر رک جانا پڑا۔ اس نے سامنے سے رفاقت کو آتے دیکھا۔ وہ اپنی سفید کار میں تیزی سے چھینٹے اڑاتا چلا آ رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے واضح طور پر رفاقت اور فیصل کی نگاہ ملی لیکن رفاقت نے دیکھ کر بھی فیصل کو نہیں دیکھا۔ جو تھوڑا بہت شک ذہن میں تھا وہ رفع کرنے کے لیے فیصل فٹ پاتھ سے اتر کر گاڑی کے قریب سامنے ہی چلا گیا۔ لیکن رفاقت نے پھر بھی نظر نہیں ملائی۔

فیصل کا دماغ جھنجھنا کر رہ گیا۔ اس کا جی چاہا کہ اینٹ اٹھا کر گاڑی کی پچھلی اسکرین پر دے مارے۔ طوطا چشمی سی طوطا چشمی تھی۔ خدا کی پناہ ایسی بے اعتنائی۔ آج سے صرف چند ہفتے پہلے رفاقت اسے چھ چھ صفحوں کے خط لکھتا تھا اور ایک ایک گھنٹے کی فون کالز کرتا تھا۔ اسے بتاتا تھا کہ وہ لاہور آئے تو ہر دروازہ اپنے لیے کھلا پائے گا۔ ملازمت، مکان، گاڑی سب کچھ اسے چٹکی بجاتے ملے گا۔ بلکہ چٹکی کی زحمت بھی نہیں ہوگی بس ابرو کا اشارہ کافی ہوگا۔ مگر اب، جب اس نے دیکھا تھا کہ وہ واقعی لاہور آگیا ہے اور آیا بھی باپ سے لڑ کر ہے تو اس نے آنکھیں ماتھے پر رکھ لیں تھیں۔

کنول نے بھی دیکھ لیا تھا کہ رفاقت کس طرح آنکھ چرا کر ان کے سامنے سے گزرا ہے.... یہ فیصل کے لیے اور بھی شرمندگی کی بات تھی۔ اس کا موڈ بالکل آف ہو گیا۔ پہلے تو اس کا جی چاہا کہ ابھی رکشا پکڑ کر رفاقت کے گھر پہنچے اور اسے بے نقط سنا کر آئے لیکن پھر اس نے خود پر قابو پایا۔ سارے ہی کہتے تھے کہ وہ جلد بازی کرتا ہے.... اس نے رفاقت کے حوالے سے اپنے آپ کو تھوڑا سا وقت دینے کا فیصلہ کیا لیکن اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا۔ اس نے فلک شیر کے گھر واپس پہنچ کر فٹافٹ تین صفحوں کا ایک طویل خط رفاقت اور اس کی بیوی کے نام گھسیٹ دیا۔ اس خط میں فیصل نے دل کی ساری بھڑاس بڑی اچھی طرح نکالی۔ رفاقت کو بدترین قسم کا طوطا چشم، مطلب پرست اور ریاکار قرار دیا۔ اس کی بد دماغ بیوی کے لیے اس نے چن چن کر شایانِ شان القاب استعمال کیے۔ اس کو ایک کھڑکھڑاتے ہوئے روڈ رولر سے تشبیہ دی جو اپنے سامنے آنے والی ہر ایک شے کو روندتا اور توڑتا ہوا چلا جاتا ہے۔ فیصل نے رفاقت کو لکھا "تمہیں دیکھ کر ایک کائی زدہ مینڈک کا خیال ذہن میں آتا ہے جو اس روڈ رولر کے آگے پھدکتا ہوا بھاگتا چلا جا رہا ہے۔ ڈرتا ہے کہ رکے گا یا سستی دکھائے گا تو نیچے آ کر پچک جائے گا۔ لیکن یاد رکھنا رفاقت! یہ روڈ رولر تجھے چھوڑے گا نہیں۔ ایک دن تجھے زمین کے ساتھ یوں برابر کردے گا کہ تیری گندی کھال بھی دکھائی نہیں دے گی کمینے!"

مندرجہ بالا فقرات اس خط میں شائستہ ترین کہے جا سکتے تھے۔ خط لکھنے کے فوراً بعد فیصل نے اسے رفاقت کے پتے پر ارجنٹ پوسٹ کر دیا۔ کنول اسے روکتی ہی رہ گئی تھی۔

یہ اس روز شام کی بات ہے۔ فیصل ایک جاب کا پتہ کرنے کے لیے گھر سے نکلا ہوا تھا۔ وہ واپس آیا تو خاصا نڈھال اور پریشان تھا۔ اپنے دڑبا نما کمرے میں پہنچ کر اس نے بوسیدہ ٹائی اتار کر ایک طرف پھینک دی اور گدے پر نیم دراز ہو گیا۔ کنول نے اس کی جرابیں اتارتے ہوئے کہا۔ "کوئی بات نہیں اگر نوکری نہیں ملی۔ آپ دل چھوٹا نہ کریں۔"

"نوکری کی بات نہیں۔"

"تو پھر کیا بات ہے.... آپ بارش کی وجہ سے پریشان تھے۔ آج تو وہ بھی تھم گئی ہے۔" وہ ذرا شوخی سے بولی۔

"بات یہ نہیں ہے۔" وہ زچ ہو کر بولا "دراصل مجھ سے ایک غلطی ہو گئی ہے۔ بلکہ یہی سمجھ لو کہ سخت جلد بازی ہو گئی ہے۔"

"لیکن یہ بات تو اب کافی پرانی ہو چکی ہے۔"

"میں تمہاری چھت پر کودنے کی بات نہیں کر رہا۔ میں اب کی بات کر رہا ہوں.... دراصل وہ خط.... وہ خط مجھے نہیں لکھنا چاہیے تھا۔ بہت برا ہوا۔ یہ بہت ہی برا ہوا۔" فیصل اپنے ہاتھ تاسف سے ملتے ہوئے بولا۔

"آپ اس کل والے خط کی بات کر رہے ہیں۔" کنول نے انگلی اٹھا کر پوچھا۔ فیصل نے بڑے دکھ سے اثبات میں سر ہلایا اور بے چینی کے عالم میں اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے کی ناکام کوشش کی۔ اس کا رنگ متغیر تھا۔

"لیکن ہوا کیا ہے؟" کچھ مجھے بھی بتائیں۔

فیصل نے کانپتے ہاتھوں سے سگریٹ سلگا کر کہا "رفاقت کو سمجھنے میں، میں نے سخت غلطی کی۔ وہ تو ہمیں سرپرائز دینے کے چکر میں تھا۔"

"کیسا سرپرائز؟"

"زبردست قسم کا سرپرائز.... اوہ خدایا، یہ مجھ سے کیا ہو گیا۔"

اوہو! کچھ مجھے بھی تو بتائیں۔" کنول نے زچ ہو کر کہا۔

"یہاں میرا ایک جاننے والا اور بھی ہے۔ حاجی بشارت نام ہے اس کا۔ اس کی زبانی مجھے معلوم ہوا ہے کہ رفاقت نے میرے لیے نہ صرف نوکری کا انتظام کرلیا ہے بلکہ اپنے گھر کی انیکسی بھی میرے لیے ڈیکوریٹ کروا رہا ہے۔ اسے حاجی بشارت کے ذریعے یہ بھی معلوم ہے کہ میں یہاں چوکیدار فلک شیر کے گھر میں رہ رہا ہوں۔ بس دو تین روز میں وہ مجھے اور تمہیں بڑے چاؤ کے ساتھ اپنے گھر لے جانے والا تھا۔"

کنول کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ پھر بتدریج اس کے چہرے پر بھی تاسف نظر آنے لگا "یہ تو واقعی بہت برا ہوا۔۔۔ میں آپ سے کہہ بھی رہی تھی کہ خط لکھنے میں جلدی نہ کریں۔ آپ نے خط بھی تو اتنا کرخت لکھ دیا ہے۔ اس کی بیوی کو روڈ رولر ڈیزل انجن اور نہ جانے کیا کیا خطاب دیے ہیں۔۔۔"

فیصل نے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھتے ہوئے کہا "مجھے یہ باتیں یاد مت دلاؤ۔ کچھ سوچنے دو مجھے۔۔۔ کچھ سوچنے دو۔"

کنول نے کہا "خط آپ نے کس لیٹر بکس میں ڈالا تھا؟"

"لیٹر بکس میں کہاں" فیصل نے جھنجلا کر کہا "وہ تو میں نے ارجنٹ میل کیا تھا۔ اب تک تو نہ جانے وہ کہاں پہنچ چکا ہوگا۔"

"ایک تو آپ کی یہ پھرتیاں بہت کام خراب کرتی ہیں۔" دونوں کچھ دیر گم صم رہے پھر کنول پرُ خیال لہجے میں بولی "ڈاک والے اپنی سستی کی وجہ سے بدنام ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ خط ابھی ڈاک خانے میں ہی پڑا خوار ہو رہا ہو۔"

فیصل نے سرد آہ بھری "ہمارے سلسلے میں سارے محکموں کی سستیاں۔۔۔ پھرتیوں میں بدل جاتی ہیں۔ تم نے دیکھا ہی تھا ٹرین میں وہ کم بخت بلب بھی جل اٹھا تھا جو نہ جانے کب سے تاریک پڑا تھا۔"

"پھر بھی ڈاک خانے میں ایک کوشش کرکے دیکھ لیں۔ آپ نے ہی تو بتایا تھا کہ ایک دفعہ جب آئی کام میں آپ کی کمپارٹ آگئی تھی تو ڈاکیے کو دو سو روپے دے کر آپ نے اپنا رزلٹ دستی وصول کرلیا تھا' ہو سکتا ہے اسی طرح خط بھی واپس مل جائے۔"

"وہ سستے زمانے تھے کنول بی بی۔" فیصل نے سرد آہ بھر کر کہا "بہرحال سویرے کوشش کرکے دیکھوں گا۔ شاید بات بن جائے۔"

"سنا ہے' خط وغیرہ گم بھی ہو جاتے ہیں۔" کنول نے امید بھرے لہجے میں کہا۔

"اس محکمے میں صرف ضروری خط گم ہوتے ہیں۔" فیصل نے کہا۔

"لیکن چانس تو ہے نا؟"

"یہ چانس ایک لاکھ میں سے شاید ایک ہو۔۔۔ مجھے تو۔۔۔ لگتا ہے کہ ہمارے ستارے ہی گردش میں ہیں۔ اچھا بھلا پرسکون گھر مل رہا تھا۔ نوکری مل رہی تھی۔ اف خدایا' یہ کیا ہوگیا۔"

اس رات بارش تو تھمی ہوئی تھی مگر متاثرہ دڑبوں یعنی کمروں میں کیچڑ اتنا تھا کہ انہیں پہلے کی طرح بالکل پیک ہو کر سونا پڑا۔ اگلے روز صبح سویرے چائے رس کا ناشتا کر کے فیصل ڈاک خانے کی طرف دوڑ گیا۔

ڈاک خانے سے اس کی واپسی ایک بجے کے لگ بھگ ہوئی۔ وہ بے حد مایوس اور دل گرفتہ نظر آتا تھا۔ اس نے کنول کو بتایا کہ خط کل سہ پہر کو ہی ڈاک خانے سے نکل گیا ہے۔ راستے میں کچی آبادی کے قریب ایک چاند گاڑی سے فیصل کی ٹکر بھی ہوگئی تھی۔ وہ لنگڑاتا ہوا آرہا تھا۔ ٹوٹی ہوئی قینچی چپل اس کے ہاتھ میں تھی اور پیشانی پر چوٹ کا نیلگوں نشان بھی تھا۔ اس نے آتے ساتھ ہی کنول کو سامان پیک کرنے کا حکم دیا۔ مختصر سامان تھا۔ فٹافٹ اٹیچی میں پیک ہو گیا۔ دراصل گوجر خان واپس جانے کا فیصلہ فیصل نے راستے میں ہی کرلیا تھا۔ وہ جتنا ذلیل ہو چکا تھا اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ مونچھ نیچی کرکے شفقت پدری کے سائے میں واپس چلا جائے۔ یعنی ابا جان کے پاس واپس۔

فلک شیر کا شکریہ ادا کرکے میاں بیوی اس کے گھر سے روانہ ہوئے۔ کنول نے جتنی راتیں اس مکان میں گزاری تھیں اسے یہی خدشہ لاحق رہا تھا کہ شب کے سناٹے میں فلک شیر کی والدہ کے گھٹنے کا تصادم ٹین کی چادر سے نہ ہو جائے۔ وہ تصادم ایک نفسیاتی خوف بن کر اس کے ذہن پر سوار ہو گیا تھا۔

خستہ و بدحال جوڑا ریلوے اسٹیشن پر پہنچا۔ اس دوران میں فیصل کو مسلسل یہ خطرہ لاحق تھا کہ کہیں رفاقت سے آمنا سامنا نہ ہو جائے۔ پنجابی کی ایک مثال ہے کہ "موئی ڈریا موت توں تے موت اگے کھڑی۔" یہ مثال میاں بیوی پر صادق پڑ گئی۔ غالباً رفاقت نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔ فیصل نے گھبراہٹ کے عالم میں رکشا والے کو ایک گلی میں مڑنے کی ہدایت کی۔ رکشا والا چند لمحے تذبذب میں رہ کر گلی میں مڑ گیا۔ رفاقت کی کار بھی ان کے پیچھے گلی میں داخل ہوگئی۔ اب اس امر میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ رفاقت نے انہیں دیکھ لیا ہے۔ نہایت گھبراہٹ کے عالم میں فیصل نے رکشا والے کو ایک اور گلی میں موڑ دیا۔ یہ گلی آگے جاکر بند تھی۔ فیصل کا رنگ زرد ہو گیا تھا۔ رفاقت کی گاڑی رکشا کے

قریب رک گئی۔ اگلے چار پانچ منٹ فیصل اور کنول کے لیے خاصے حوصلہ افزا تھے۔ ان پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ محبت نامہ ابھی تک رفاقت کو موصول نہیں ہوا۔

پھر ان پر یہ انکشاف بھی ہوا کہ رفاقت انہیں لینے کے لیے کچی آبادی کی طرف جا رہا تھا کہ راستے میں ٹریفک سگنل پر اس کی نظر فیصل پر پڑ گئی۔ رفاقت کا سارا پروگرام وہی تھا جس کا فیصل نے اندازہ لگایا تھا۔ وہ میاں بیوی کو ایک زبردست سرپرائز دینے کے موڈ میں تھا۔ وہی نوکری اور رہائش والا سرپرائز۔ اس کا ارادہ بھانپنے کے باوجود فیصل خوفزدہ تھا۔ اسے یقین تھا کہ آج نہیں تو کل اس کا بھیجا ہوا محبت نامہ رفاقت کو موصول ہو جانا ہے اور پھر سب کچھ اوپر نیچے ہو جانا ہے۔ وہ گوجر خان واپس جانے پر بضد رہا۔

رفاقت نے کہا ”فیصل صاحب! لطیف شہزاد تمہیں پرلے درجے کا جلد باز کہتا ہے۔ میں نے کبھی اس سے اتفاق نہیں کیا۔ لیکن اب اندازہ ہوتا ہے کہ میں غلط تھا۔ پہلے تم نے اپنے والد کے گھر سے نکلنے میں جلدی کی‘ اب واپس جانے میں جلدی کر رہے ہو۔ میاں! یہ موقع بالکل ٹھیک نہیں ہے۔ اس کام کے لیے بہترین موقع کے متعلق میں تمہیں بتاؤں گا۔ آؤ میرے ساتھ۔۔۔“

”لل لیکن۔۔۔ تمہاری وائف ذرا سخت مزاج ہے۔ اگر بعد میں کوئی خط۔۔۔ مم۔۔۔ میرا مطلب ہے کوئی مسئلہ ہو گیا تو۔۔۔“ فیصل ہکلایا۔

”کچھ نہیں ہوگا۔ تم آؤ میرے ساتھ۔“

○☆○

رفاقت اصرار کے ساتھ فیصل اور کنول کو اپنے گھر لے گیا۔ انیکسی واقعی رہنے کے قابل بنا دی گئی تھی۔۔ رفاقت کی بیوی کا رویہ بھی پہلے سے بہت بہتر تھا۔ اس کے باوجود اگلے چار پانچ روز فیصل اور کنول نے سخت اذیت میں گزارے۔ جونہی ڈاک آنے کا وقت ہوتا وہ شکاری جانوروں کی طرح چوکنے ہو جاتے۔ مین گیٹ پر جا کر سب سے پہلے وہی ڈاک بکس دیکھتے تھے۔ ڈاک کے لفافوں پر جو ایڈریس لکھے ہوتے تھے ان پر گلی نمبر 54 بھی لکھا ہوتا تھا۔ فیصل کے اندازے کے مطابق یہ رفاقت کے ایڈریس میں نیا اضافہ تھا۔ فیصل نے جو ایڈریس لکھا تھا اس میں گلی نمبر موجود نہیں تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ نامعقول خط رفاقت تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ جوں جوں دن گزرتے گئے فیصل کا تفکر کم ہوتا گیا۔ اس کا دل محکمہ ڈاک کی سستی پر فدا ہونے کو چاہنے لگا تھا۔۔۔ انہی دنوں بچھڑے ہوئے میاں بیوی نے اپنی سہاگ رات بھی منالی۔

۔۔۔ فیصل اور کنول نے اس انیکسی میں پورا ایک سال گزار دیا۔ نوکری بھی ٹھیک جا رہی تھی اپنے مہربانوں سے فیصل اور کنول کے تعلقات بھی بہت اچھے تھے۔ رفاقت کو بھائی جان کہتے کہتے کنول کی زبان سوکھتی تھی‘ رفاقت کی وائف کو فیصل بڑی مٹھاس سے بھابھی جی کہتا تھا۔ ایک سال بعد خدا نے ان کے آنگن میں ایک خوبصورت پھول بھی کھلا دیا۔ سب نے مل جل کر اس خوبرو بچے کا نام سرمد رکھا۔ جس روز بچہ سوا مہینے کا ہوا۔ رفاقت نے فیصل کو اپنے پاس بلایا اور بولا ”اے میرے جلد باز دوست! میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ جب گوجر خان واپس جانے کا بہترین موقع آئے گا‘ تو تمہیں بتاؤں گا۔ میرا خیال ہے کہ یہ موقع آگیا ہے۔ انکل جی کا پیارا پوتا لے کر ان کے پاس جاؤ اور سلام عرض کرو۔“

بات بڑی معقول تھی فوراً فیصل کی سمجھ میں آگئی۔ فیصل‘ کنول اور ننھا سرمد رفاقت کی گاڑی میں ہی لاہور سے گوجر خان پہنچے اور ننھے سرمد کو اس کے دادا سے ملایا۔۔

۔۔۔ اس کے بعد کے حالات بڑی تیزی سے درست ہوئے۔ گلے‘ شکوے اور معافی وغیرہ کے مراحل کافی سرعت سے طے پائے۔ پندرہ بیس روز کے اندر باپ بیٹے میں صلح ہو گئی اور فیصل لاہور سے مستقل طور پر گوجر خان واپس آگیا۔ دھیرے دھیرے سب کچھ ٹھیک ہونے لگا۔ فیصل نے کارخانے اور آفس میں اپنی ذمہ داری سنبھال لی۔ شام کو وہ گھر پہنچتا تو کنول شوخ مسکراہٹ کے ساتھ اس کا استقبال کرتی۔ وہی گھر جس میں چودہ بیڈ روم تھے‘ چودہ کے چودہ دروازے مکرم علی کی دستک نیم شب سے محفوظ تھے اور چھپن کی چھپن دیواریں فلک شیر کی والدہ کے گھٹنے سے مامون تھیں۔

رفاقت علی سے فیصل کی اب گہری دوستی ہے۔ وہ اکثر ایک دوجے سے ملتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ بات آج بھی ایک راز ہے کہ وہ خط رفاقت کو ملا تھا یا نہیں۔ کبھی کبھی فیصل کو شک ہوتا ہے کہ وہ خط رفاقت کو مل گیا تھا۔ بعض لوگ اتنے گہرے ہوتے ہیں کہ بہت کچھ بحری جہازوں اور جزیروں کی طرح ان کے اندر ڈوب جاتا ہے اور وہ سمندر کی طرح اس کا پتہ نہیں دیتے۔ فیصل کو شک تھا کہ رفاقت بھی انہی لوگوں میں سے ایک ہے۔۔۔ کچھ عرصہ بعد جب رفاقت۔۔۔ فیصل کے گھر آیا تو اس نے ایک چبھتا ہوا سا فقرہ کہا تھا۔ یہ فقرہ اکثر فیصل کی سماعت میں گونجتا رہتا ہے۔ فیصل کی بیوی کو دیکھ کر اس نے کہا تھا ”یار! لڑکیاں شادی کے بعد تین چار سال تک تو بھابھی کی طرح لڑکیاں ہی رہتی ہیں۔ پھر ان میں سے اکثر روڈ رولر لگنے لگتی ہیں۔۔۔“

روڈ رولر کا لفظ رفاقت کی زبان سے فیصل نے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔

شہ زوری کو بے بسی میں بدلنے والے معاملات کی کہانی

طاہر جاوید مُغل

شہ زوری

بہنیں بھائیوں کی آنکھوں کی روشنی ہوتی ہیں۔ اُن کے آپس کے چھوٹے موٹے قضیے خوشیوں کی زندگی کی علامت ہوتے ہیں.... جیسے کسی بے رنگ تصویر میں دھنک کے رنگ بھر دیے جائیں۔ ان تینوں بہن بھائیوں کی زندگی بھی ایسے ہی رنگوں اور روشنی سے عبارت تھی کہ یکایک بہن نے لڑنا جھگڑنا چھوڑ دیا۔

وہ سرما کی ایک ابر آلود شام تھی۔ یخ بستہ اور نیم تاریک۔ کبھی کبھی بوندا باندی بھی ہونے لگتی تھی۔ ایسی ہی شامیں ہوتی ہیں جب سر پر چھت کی ضرورت کا احساس ہمیشہ سے زیادہ ہوتا ہے۔ نیم گرم کمروں میں لوگ لحاف اور کمبل اوڑھ کر بیٹھتے ہیں' ٹی وی دیکھتے ہیں' گپ شپ کرتے ہیں' پڑھتے ہیں' غرض تمام مصروفیات چار دیواری میں سمٹ آتی ہیں۔ ایسی شام میں اگر کسی کو رختِ سفر باندھنا ہو تو کتنا عجیب سا لگتا ہے۔ گھر سے باہر نکلنا ایک کڑی آزمائش کی طرح محسوس ہونے لگتا ہے۔ واصف بھی اس آزمائش میں مبتلا تھا۔ اسے اپنے کام کے سلسلے میں پشاور جانا تھا اور اسٹیشن سے نو بجے والی فلائنگ کوچ پکڑنی تھی۔

وہ دیگر اہلِ خانہ کو حسرت سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنی اپنی جگہ سکون سے تھے جبکہ وہ بے سکون تھا۔ ایسی شاموں میں وہ اکثر اداس ہو جاتا تھا اور چونکہ آج اس نے لمبے سفر پر روانہ ہونا تھا لہٰذا اس کی اداسی ہمیشہ سے سوا تھی۔

واصف کے والد عرصۂ دراز سے پائپ کا فرنیچر بنانے کا کام کرتے تھے۔ ان کا کام تین چار شہروں میں پھیلا ہوا تھا۔ اپنی گریجویشن مکمل ہونے کے بعد اب واصف بھی کاروبار میں والد کا ہاتھ بٹانے لگا تھا۔ "پے منٹس" وغیرہ لینے کے لیے اسے کبھی کبھی دوسرے شہروں میں بھی جانا پڑتا تھا۔ حالانکہ سفر اسے ہمیشہ سے ناپسند تھا۔

واصف کا ایک بھائی اور ایک بہن تھی۔ بہن کا نام شازیہ تھا...... وہ اور واصف جڑواں تھے۔ بھائی اس سے ایک سال چھوٹا تھا۔ اس کا نام فہد تھا۔ شازیہ کی شادی ہو چکی تھی

اور وہ اپنے میاں کے ساتھ کویت میں مقیم تھی۔ فہد ایم ایس سی فائنل ایئر میں تھا۔ بالکونی میں اداس بیٹھے بیٹھے واصف باربار گھڑی کی طرف دیکھتا تھا۔ والدہ نے دو تین بار آکر چائے کا پوچھا تھا لیکن اس نے انکار کردیا تھا۔ نہ اس کا دل ٹی وی دیکھنے کو چاہ رہا تھا، نہ کسی سے بات کرنے کو۔ "سفر کی شام" کو وہ عموماً ایسے ہی الگ تھلگ ہوجایا کرتا تھا۔ اپنے ہی گھر میں اجنبی، بجھا بجھا سا۔

بیٹھے بیٹھے خیالات کا دھارا واصف کو چار پانچ سال پیچھے لے گیا۔ ماضی کے مناظر تمام تر جزئیات کے ساتھ اس کے ذہن میں نمودار ہوگئے۔ بیتے ہوئے روز و شب کی ایک ایک بات یاد آنے لگی۔ کتنے اچھے تھے وہ دن۔ کتنی دھماچوکڑی ہوتی تھی ان کے گھر میں۔ فہد اس سے کتنا بے تکلف تھا ان دنوں۔ واصف اس سے ایک سال بڑا تھا لیکن دونوں ہم عمر دوستوں کی طرح ایک دوسرے سے زور آزمائی کرتے تھے اور زبانی چھیڑخانی تو ہر گھڑی کا معمول تھی۔ شازیہ بھی ان شرارتوں اور دھماچوکڑیوں میں برابر کی شریک تھی۔ وہ بڑی خودسر اور تیز طرار تھی، اوپر سے والد صاحب کی لاڈلی بھی تھی۔ اس کا حوصلہ ہمیشہ پہاڑ کی طرح بلند رہتا تھا۔ دونوں بھائیوں کو تو وہ خاطر میں ہی نہیں لاتی تھی۔ اس کے علاوہ والدہ اور چچی کے ساتھ بھی اکثر ٹکر لے لیتی تھی۔ اس کا انداز ہمیشہ جارحانہ ہوتا تھا اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ والد صاحب نے اسے ڈھیل دے رکھی تھی۔ شازیہ کو واصف اور فہد شہ زوری کے نام سے یاد کرتے تھے۔ گھر میں شازیہ کا اثر و رسوخ دیکھتے ہوئے یہ نام اس پر بالکل فٹ بیٹھتا تھا اور بات صرف اثر و رسوخ ہی کی نہیں تھی، وہ جسمانی طور پر بھی شہ زوری تھی۔ فہد کے ساتھ اکثر اس کی "مکالات" ہوجاتی تھی اور اس مکالات میں فہد کو زیر ہونا پڑتا تھا۔ عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ ایسی خرمستیاں کم ہوگئی تھیں مگر ختم نہیں ہوئی تھیں۔ جب بھی زبانی تو تکار ایک حد سے بڑھ جاتی تھی "ڈائریکٹ ایکشن" شروع ہوجاتا تھا۔ اس میں وقت ماحول وغیرہ کی کوئی قید نہیں تھی۔ یہ جنگ عین والد صاحب کی ناک کے نیچے بھی ہوسکتی تھی۔ اس وقت بھی چھڑ سکتی تھی جب ڈھیروں مہمان گھر میں آئے ہوئے ہوں اور کالج جاتے ہوئے گاڑی کے اندر بھی اس قسم کی صورتِ حال پیدا ہوسکتی تھی۔

تنازع شروع ہونے کی موٹی موٹی وجوہات چار پانچ ہی تھیں۔ مثلاً صبح وہ تینوں ابو کے ساتھ گاڑی میں کالج جاتے تھے۔ شازیہ کہتی تھی، وہ آگے بیٹھے گی۔ دونوں بھائیوں میں سے کسی ایک کا خیال ہوتا تھا کہ آج اسے ابو کے ساتھ گاڑی میں آگے بیٹھنا چاہیے۔ بس اس بات پر ہنگامہ شروع ہوجاتا تھا۔ ایک اہم وجہ ایک دوسرے کے "موزوں" کا استعمال تھا۔ صبح سویرے اس گمبھیر مسئلے پر اکثر جنگ کی سی صورتِ حال پیدا ہوجاتی تھی۔

ایک دوسرے کے تولیے کا استعمال، ایک دوسرے کی الماری میں اپنی چیزیں ٹھونسنا، باتھ روم میں پہلے داخل ہونے کا مسئلہ، ٹی وی پر اپنی پسند کا چینل لگانا، یہ چیدہ چیدہ مسائل تھے جن کے سبب گھر کے آسمان پر جنگ کے بادل منڈلایا کرتے تھے۔

ہنگامی حالات میں امی اکثر بھائیوں کی حمایت کرتی تھیں جبکہ ابو کا وزن اکثر و بیشتر شازیہ کے پلڑے میں ہوتا تھا۔

یہ بات نہیں تھی کہ واصف اور فہد ابو سے دور تھے یا شازیہ اور امی میں پیار نہیں تھا۔ بس ایک طرح کی غیر اعلانیہ گروپنگ تھی جس کے سبب گھر کے ہنگامے جاندار رہتے تھے۔ فہد اس گروپنگ کو مزاحیہ انداز میں "ٹیم ورک" کہا کرتا تھا۔ ہاں کبھی کبھی ایسا موقع بھی آتا تھا جب بے تکلفی کی ان لڑائیوں میں ہلکی سی تلخی بھی پیدا ہوجاتی تھی اور متحارب فریق سچ مچ منہ پھلا کر بیٹھ جاتے تھے۔ ایسے موقعوں پر واصف کی امی اور چچی بڑی خوبی سے مصالحانہ کردار ادا کیا کرتی تھیں۔ تلخی کی صورتِ حال عموماً اس وقت پیدا ہوتی تھی جب واصف اور فہد کو اپنے دوستوں کی موجودگی میں شازیہ کی شرارت کا نشانہ بننا پڑتا تھا۔ ایک دفعہ فہد نے اپنے ایک دوست کی سالگرہ اپنے گھر منانے کا اہتمام کیا (اس دوست کے اہلِ خانہ بیرونِ ملک مقیم تھے) شازیہ کو یہ بات پسند نہیں آئی اور اس نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار یوں کیا کہ عین سالگرہ کے موقع پر اپنی ایک سہیلی کی قریب المرگ دادی کے لیے سورۃ یٰسین پڑھوانے کا اہتمام کرلیا۔ اب ایک طرف ڈرائنگ روم میں سالگرہ ہورہی تھی اور دوسری طرف کامن روم میں سفید چادروں پر کھجور کی گٹھلیوں کا ڈھیر لگا تھا۔ اس واقعے کے بعد فہد اور شازیہ کے درمیان جاری سرد جنگ ایک دم گرم جنگ میں بدل گئی تھی اور کئی ہفتے دونوں کے تعلقات سخت کشیدہ رہے تھے بلکہ ایک دو موقعوں پر تو یوں لگا تھا کہ یہ گرم جنگ روایتی ہتھیاروں سے آگے بڑھ کر ایٹمی ہتھیاروں تک پہنچ جائے گی۔

کبھی کبھار تلخی کی صورتِ حال اس وقت بھی پیدا ہوتی تھی جب ابو کسی بات پر شازیہ کی کھلی حمایت کرتے تھے اور دونوں بھائیوں کا خیال ہوتا تھا کہ یہ ناجائز طرف داری ہے۔ ایک ایسے ہی موقع پر فہد نے جوشیلے انداز میں کہا تھا "ابو کا کردار اقوامِ متحدہ جیسا ہونا چاہیے۔"

امی نے ہنستے ہوئے جواب دیا تھا "ان کا کردار اقوام متحدہ جیسا ہی ہے۔ جیسے اقوام متحدہ صرف امریکا کی سنتی ہے، تمہارے ابو صرف اپنی لاڈلی کی سنتے ہیں۔"

واصف کو اب تک یاد تھا، وہ نومبر کی ایک چمکیلی صبح تھی۔ اتوار کا دن تھا۔ کالج سے چھٹی تھی، کوئی خاص کام بھی نہیں تھا۔ واصف بستر پر پڑا اینڈ رہا تھا۔ فہد بھاگا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ وہ بھی ابھی تک سلیپنگ سوٹ میں تھا۔ اس نے کمرے کی مشرقی جانب والی کھڑکی کھولی اور حیرت سے آسمان کو تکنے لگا۔

"کیا ہوا فہدی۔۔۔ کیا دیکھ رہے ہو؟"

"برادر، دیکھ رہا ہوں کہ سورج آج بھی مشرق سے نکلا ہے یا مغرب سے نکل آیا ہے۔"

"کیوں، کیا ہوا؟"

فہد نے جست لگائی اور واصف کے عین سامنے بستر پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر ڈرامائی انداز میں بولا "مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا برادر۔۔۔ ذرا میری ٹانگ پر چٹکی کاٹو تاکہ مجھے پتا چل سکے کہ میں خواب نہیں دیکھ رہا۔"

واصف نے ٹانگ پر زور سے چٹکی کاٹی۔ فہد نے اتنی بھیانک چیخ ماری کہ امی، جو باورچی خانے میں ناشتا بنا رہی تھیں، دوڑی ہوئی آئیں اور کھڑکی کے شیشے سے کمرے میں جھانکنے پر مجبور ہوگئیں۔۔۔ مگر جب واصف کو ہنستے ہوئے پایا تو بڑبڑاتی ہوئی واپس چلی گئیں۔

"یار، بات کیا ہے، کیوں اتنا ڈراما کر رہے ہو؟" واصف بولا۔

فہد سرگوشی کے انداز میں بولا "برادر! آج تو کمال ہوگیا۔ رات ابو نے اپنے کچھ کپڑے میری الماری میں رکھ دیے۔۔۔ تمہیں پتا ہے میری الماری میں پہلے ہی گنجائش کم ہے۔ میں ابو سے تو کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔۔۔ میں نے سوچا چلو رسک لیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔ میں نے اپنے تین چار جوڑے اور دو کوٹ نکال کر شہ زوری کی الماری میں لٹکا دیے۔ مجھے نوے فیصد یقین تھا کہ علی الصباح میرے یہ تمام لباس ہائے فاخرہ میرے کمرے کی دہلیز پر پڑے ہوں گے یا صحن میں بھٹک رہے ہوں گے۔ مگر چمتکار یہ ہوا ہے کہ وہ سارے کپڑے نہ صرف الماری میں موجود ہیں بلکہ ہماری پیاری بہنا بھی بالکل ٹھنڈے ٹھار موڈ میں ہے۔"

واصف نے غیر یقینی انداز میں سہلاتے ہوئے کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ اس نے ابھی کپڑے دیکھے ہی نہ ہوں؟"

"نہیں برادر، اس نے سب کچھ دیکھا ہے۔ میرے سامنے دیکھا ہے۔ اسے پتا ہے کہ سرحدی خلاف ورزی ہوئی ہے مگر اس کی توپیں ابھی تک خاموش ہیں۔"

"ہو سکتا ہے کہ یہ گھمسان سے۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ طوفان سے پہلے کی خاموشی ہو؟"

"مگر وہ خاموش تھوڑی ہے۔۔۔ ابھی مجھ سے باتیں شاتیں بھی کر رہی تھی۔"

"پھر یہ کوئی حکمتِ عملی بھی ہو سکتی ہے۔ کیا کہتے ہیں اسے۔۔۔ خاموش ڈپلومیسی۔"

"نہیں برادر۔ تمہیں معلوم ہے، میں کتے کی طرح سونگھ لیتا ہوں۔ مجھے تو خطرے کی بالکل بو نہیں آرہی۔"

"ہاں، تمہاری اس صلاحیت کا تو مجھے بھی اعتراف ہے۔"

دونوں بھائی بے تکلف دوستوں کی طرح ہنسنے لگے۔

شازیہ کے ساتھ بھی وہ ایسے ہی بے تکلفی سے بات کیا کرتے تھے۔ تینوں ایک دوسرے کو نام لے کر پکارتے تھے اور یوں لگتا تھا کہ تینوں ہی جڑواں یا "تڑواں" ہیں۔۔۔ ہاں پچھلے ڈیڑھ دو ہفتوں سے وہ کچھ کم کم بات کر رہے تھے۔ ان میں تھوڑی سی کشیدگی بھی تھی اس کے علاوہ شاید ایک وجہ یہ

بھی تھی کہ واصف اور شازیہ کے ایف ایس سی کے امتحان بالکل سر پر تھے اور وہ اس کی تیاری میں مصروف تھے۔

دوپہر کو واصف نے خود بھی فہد کے کپڑے شازیہ کی الماری میں ٹنگے ہوئے دیکھے اور شازیہ کا نارمل موڈ بھی دیکھا۔ اس کا دل بھی چاہا کہ چھت پر چڑھ کر دیکھے کہ سورج مشرق سے مغرب کی طرف جا رہا ہے یا مغرب سے مشرق کی طرف۔۔۔ اگلی صبح شازیہ کو آزمانے کے لیے اس نے بھی ایک حرکت کی۔ وہ تینوں ابو کے ساتھ ہی گھر سے نکلا کرتے تھے۔ پہلے شازیہ کا کالج آتا تھا۔ وہ وہاں اتر جاتی تھی۔ اس کے بعد ابو واصف اور فہد کو ان کے کالج میں ڈراپ کرتے تھے۔ وہ دونوں ایک ہی کالج میں پڑھتے تھے۔ اصولی طور پر تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ شازیہ ابو کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر نہ بیٹھتی کیونکہ اسے پہلے اترنا ہوتا تھا۔ اس کے اترنے کے بعد ابو کے ساتھ والی سیٹ خالی ہو جاتی تھی جسے پُر کرنے کے لیے فہد یا واصف میں سے ایک کو اٹھ کر آگے آنا پڑتا تھا لیکن شازیہ کو کون سمجھاتا۔ وہ اکثر و بیشتر پھرتی کا مظاہرہ کر کے اگلی سیٹ پر بیٹھ جاتی تھی اور اگر بھائیوں میں سے کوئی اس سے زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کر کے ابو کے ساتھ بیٹھتا تو وہ دھونس اور دھاندلی پر اتر آتی اور اگلی سیٹ خالی کرا کے رہتی۔ بچپن سے اس کی یہی عادت چلی آ رہی تھی۔۔۔ اس روز واصف نے شازیہ کو آزمانے کے لیے "خصوصی پھرتی" کا مظاہرہ کیا۔ ناشتے کا آخری نوالہ منہ میں رکھتے رکھتے وہ اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ اسٹڈی سے اپنی فائل لی اور بھاگ کر گاڑی میں جا بیٹھا۔ تھوڑی دیر بعد ابو، فہد اور شازیہ بھی پورچ میں پہنچ گئے۔ ملازم گاڑی کی ونڈ اسکرین صاف کر رہا تھا۔ اس کے تاثرات گواہی دے رہے تھے کہ وہ کسی ہنگامے کی توقع کر رہا ہے۔ بات تھی بھی ہنگامے کی۔ خلافِ معمول آج واصف نے فرنٹ سیٹ سنبھال رکھی تھی۔ اب چیخم دھاڑ اور کھینچا تانی کے مناظر سامنے آنے والے تھے لیکن حیرت کی بات تھی کہ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ شازیہ نے صرف ایک بار ٹھٹک کر واصف کی طرف دیکھا پھر سر جھکا کر خاموشی سے فہد کے ساتھ پچھلی نشست پر بیٹھ گئی۔ واصف اور فہد کی آنکھیں چار ہوئیں اور ان کے چہروں پر تعجب ابھر آیا۔

دونوں بھائیوں کے لیے بہن کے رویّے میں یہ تبدیلی حیرت انگیز تھی۔ وہ تو کسی طور پیچھے ہٹنے والی نہیں تھی اور نہ ہی کوئی بات دل میں رکھنے والی تھی۔ جو کچھ اس کے اندر ہوتا، فٹ سے زبان پر آ جاتا۔ شام کو بھی چھت پر دونوں بھائیوں میں یہی موضوع زیرِ بحث رہا۔ واصف نے اپنے طور پر امی کو بھی کریدنے کی کوشش کی تھی اور پوچھا تھا کہ شازیہ چپ چپ کیوں ہے۔ انہوں نے کہا تھا "چپ کہاں ہے۔ اچھی بھلی تو باتیں کر رہی ہے۔ اب تم چاہتے ہو کہ گھر میں ہر وقت ہاہاکار ہی مچی رہے۔"

دونوں بھائی اس نتیجے پر پہنچے کہ شازیہ عرف شہ زوری عرف جانِ پدر کے رویّے میں بنیادی تبدیلی واقع ہو رہی ہے اور وہ جو سکندرِ اعظم کی سی جنگجو طبیعت لے کر پیدا ہوئی تھی، امن و آشتی کی قائل ہو رہی ہے۔ فہد نے بڑے بھائی سے کہا۔ "برادر، یہ موقع بڑا اچھا ہے، کیوں نا پلان نمبر تین پر عمل کر گزرا جائے۔ شہ زوری کی آزمائش بھی ہو جائے گی کہ واقعی اس نے خود کو تبدیل کیا ہے یا نہیں؟ اور اگر کیا ہے تو کس حد تک کیا ہے؟"

واصف نے پُرسوچ انداز میں سر ہلایا۔ پلان نمبر ۳ کا نام پلان نمبر ۳ پتا نہیں کیوں پڑ گیا تھا۔ بس وہ یونہی باتوں میں اس چھوٹی سی سازش کو پلان نمبر تین کہنے لگے تھے۔ پلان نمبر ۳ ڈرائنگ روم، کامن روم اور انیکسی میں رنگ و روغن اور ڈیکوریشن کا پلان تھا۔ قریباً چھ مہینے سے ان تین کمروں میں آرائش و زیبائش کا پروگرام بن رہا تھا۔ ابو اس سلسلے میں بجٹ میں سے معقول رقم بھی مختص کر چکے تھے لیکن معاملہ "اتفاقِ رائے" کے حصول پر آ کر اٹک گیا تھا۔ جب بھی اس سلسلے میں تفصیلی بات کی جاتی تھی، واصف اور فہد کی رائے شازیہ کی رائے سے ٹکرا جاتی تھی اور یہ تصادم اتنا شدید ہوتا تھا کہ ارد گرد بیٹھے لوگوں کے کانوں کے پردے پھٹنے لگتے تھے۔ سب سے پہلے تو اس بات پر اختلاف ہو جاتا تھا کہ کام کب شروع کرایا جائے پھر کس کمرے میں کون سا رنگ ہو، کس کمرے کی ڈیکوریشن کس طرح کی ہو۔ کون سے صوفے کس کمرے میں شفٹ کیے جائیں۔ غرض ہر بات پر شدید ترین تکرار ہوتی تھی اور میٹنگ روم قومی اسمبلی کا منظر پیش کرنے لگتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اگر ان سنگین اختلافات کو طے کیے بغیر کام شروع کرا دیا گیا تو تھرڈ ورلڈ وار کو کوئی نہ روک سکے گا اور انسانیت کا مستقبل تاریک ہو جائے گا۔ لہٰذا ابو نے دانش مندی کا ثبوت دیتے ہوئے ہر بار اس معاملے کو رول بیک کر دیا تھا۔ اب بدلے ہوئے حالات میں اگر واصف اور فہد کے ذہن میں پلان نمبر تین پر عمل کرنے کی بات آئی تھی تو یہ سمجھ میں آنے والی بات تھی۔۔۔ پلان نمبر ۳ یہ تھا کہ گلبرگ میں رہائش پذیر بڑی پھوپو سے شہ زوری کو ٹیلی فون کرایا جائے اور وہ اصرار کر کے دو تین روز کے لیے شہ زوری کو اپنے ہاں بلا لیں۔ اسی دوران میں رات دن ایک کر کے تینوں کمروں کی تزئین نو کا کام مکمل کرا لیا جائے۔ (بالکل جس طرح ایمان کی حرارت والوں نے مسجد شب بھر بنا ڈالی تھی)

غور و خوض کے بعد واصف اور فہد کو یقین ہو گیا کہ منصوبہ قابل عمل ہے۔ حسب پروگرام انہوں نے بڑی پھوپو سے فون کرایا۔ اتفاقاً جمعے کی چھٹی بھی آ رہی تھی۔ شازیہ نے ہفتے کی چھٹی ساتھ ملائی اور تین دن کے لیے پھوپو کے ہاں چلی گئی۔۔۔ اتوار کی شام کو جب وہ واپس آئی تو نصف گھر کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔۔۔ تینوں کمروں کا رنگ و روغن' آرائش و زیبائش' سب کچھ مکمل ہو چکا تھا اور ہر کام شازیہ کی مرضی کے عین "خلاف" ہوا تھا۔ فہد تو کہیں کھسک گیا تھا' واصف اپنے کمرے کی کنڈی بند کیے بیٹھا تھا۔ اسے یقین تھا کہ یہ سب کچھ "شہ زوری" کی برداشت سے باہر ہو گا' اس کے صبر و تحمل کی دھجیاں بکھر جائیں گی اور وہ اتنی ہی غضب ناک نظر آئے گی جتنا ہلاکو خان بغداد پر حملے کے وقت تھا۔ ہنگامی حالات میں سلامتی کونسل کا کردار ادا کرنے والے "ابو" بھی سہ روزہ کاروباری دورے پر راولپنڈی گئے ہوئے تھے لہٰذا خدشہ تھا کہ کریک ڈاؤن کی صورت میں حالات قابو سے باہر ہو جائیں گے۔۔۔ مگر جو کچھ ہوا' وہ قطعی غیر متوقع تھا۔ شازیہ نے خاموشی سے کمروں کا جائزہ لیا۔ در و دیوار پر نظر ڈالی' امی سے ایک دو باتیں کیں اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

اس کا رویّہ عجیب سے عجیب تر ہو گیا تھا۔ کھانے کی میز پر وہ واصف اور فہد سے بھی ملی۔ ان کے درمیان رسمی گفتگو ہوئی لیکن اس تبدیلی کے بارے میں کوئی بات نہیں ہوئی جو شازیہ کی غیر موجودگی میں گھر کے اندر رونما ہوئی تھی۔۔۔ رات کو ایک بار پھر واصف اور فہد سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ ماجرا کیا ہے؟ کیا واقعی شازیہ بدل گئی تھی یا وہ مصنوعی رویّہ اپنائے ہوئے تھی۔ واصف کے ذہن میں بار بار ایک بات آ رہی تھی' عین ممکن تھا کہ ابو نے شازیہ کو ہر معاملے میں خاموش رہنے کی ہدایت کر رکھی ہو اور اس سے کہا ہو کہ جو بھی شکایت ہو وہ ان سے بیان کیا کرے۔۔۔ وہ خود واصف اور فہد وغیرہ سے نمٹ لیں گے۔ واصف نے جوں جوں اس معاملے پر غور کیا' اس کا یہ یقین پختہ ہوتا چلا گیا کہ یہ خاموشی بے معنی نہیں ہے۔ اس کے پیچھے یقیناً ابو جان کے غصے کی شکل میں ایک طوفان ہے۔۔۔ اور یہ طوفان عنقریب ان دونوں کو زد میں لے گا۔

"فہدی پیارے' ابو سے طبیعت صاف کروانے کے لیے تیار ہو جاؤ" واصف نے ٹھوڑی کھجاتے ہوئے کہا تھا۔

"یعنی دال میں کچھ کالا ہے؟" فہد نے کہا۔

"پوری دال کالی ہے' بلکہ کالی سیاہ ہے" واصف نے کہا۔ "میرے خیال میں امریکا نے اقوام متحدہ کے ہاتھوں جو کچھ عراقیوں کے ساتھ کروایا تھا' وہی ہمارے ساتھ ہونے والا ہے۔"

○☆○

ابو اگلے روز اپنے دورے سے واپس آ گئے تھے۔ اس وقت شام کے آٹھ بجے تھے جب واصف اور فہد کو محسوس ہوا کہ ان کے تمام اندیشے حقیقت ثابت ہونے والے ہیں۔ ابو نے ملازم سے کہہ کر ان دونوں کو اسٹڈی میں بلایا تھا۔ اسٹڈی میں بلایا جانا ہی کم نہیں تھا' اوپر سے دونوں کو اکٹھا بلایا جا رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ نہایت اہم نوعیت کی بات ہو گی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا' خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور امی کی تلاش میں اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں۔ ایسے موقعوں پر امی کا آس پاس رہنا ضروری ہوتا تھا۔ وہ ممتاز محل کا کردار ادا کرتے ہوئے گاہے گاہے سربراہِ خانہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیتی تھیں اور ان کے ٹمپریچر کو خطرے کے نشان سے نیچے لے آتی تھیں مگر امی کہیں نظر نہیں آئیں۔ ملازم نے مژدہ سنایا کہ امی پہلے سے اسٹڈی میں موجود ہیں۔

مطلب یہ تھا کہ معاملہ توقع سے زیادہ گمبھیر ہے۔ دونوں ڈگمگاتے اور لڑکھڑاتے ہوئے اسٹڈی میں پہنچے۔ حسب توقع ابو کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی۔ امی بھی خاموش نظر آ رہی تھیں۔ ابو نے کرسیوں کی طرف اشارہ کیا' وہ دونوں بیٹھ گئے۔ چند لمحے ایک اعصاب شکن خاموشی طاری رہی پھر ابو نے بوجھل آواز میں کہا "تم دونوں اب ماشاء اللہ بالغ ہو' تعلیم یافتہ اور سمجھ دار ہو۔ تمہیں گھر کے مسائل اور معاملات سے دور نہیں رکھا جا سکتا۔ یہ تمہارا حق ہے کہ تم سے مشورہ لیا جائے اور کسی حتمی فیصلے سے پہلے تمہاری رائے دریافت کی جائے۔"

ابو کے چہرے پر چھائی ہوئی سنجیدگی کے برخلاف ان کا لہجہ کافی حد تک نرم تھا۔ انہوں نے میز سے نظر کی عینک اٹھا کر لگائی اور بولے "لڑکیوں کی شادی وقت پر ہو جائے تو اچھا ہوتا ہے۔ شازیہ ماشاء اللہ ایف ایس سی کا امتحان دے رہی ہے۔ کچھ روز تک وہ فارغ ہو جائے گی۔ اس کے لیے ایک بہت اچھا رشتہ آیا ہے۔ لڑکا نہایت شریف اور ملنسار ہے۔ ایم ایس سی کر رکھا ہے' کویت کی ایک فرم میں معقول جاب کر رہا ہے۔ اس کے والد سے میری جان پہچان بھی ہے۔ وہ اس رشتے پر بے حد اصرار کر رہے ہیں۔ پچھلے اتوار میں اور تمہاری امی ان کے گھر بھی گئے تھے۔ بھئی ہمیں تو وہ لوگ بے حد پسند آئے ہیں۔ لڑکا ان دنوں چھٹی پر پاکستان آیا ہوا ہے۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ اگر رشتہ طے ہو جائے تو پھر ایک ماہ کے اندر اندر ہی شادی بھی کر دی جائے۔ ہماری طرح

وہ لوگ بھی رسم و رواج والے نہیں۔۔۔ نہ ہی جہیز کا کوئی مطالبہ ہے۔ سادگی سے شادی ہو جائے تو کسی کے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔۔"

ابو تادیر اس موضوع پر بات کرتے رہے۔ واصف اور فہد بت بنے بیٹھے رہے۔ وہ کیا سمجھ رہے تھے اور یہ کیا بات نکلی تھی۔ ایک دم ہی انہیں یوں لگا تھا کہ کوئی ان کا کلیجا مسل رہا ہے۔ ان کی بہن، ان کی شہ زوری، ان سے لڑنے جھگڑنے والی، ان سے روٹھنے والی اور انہیں منانے والی ان سے دور جا رہی تھی۔ انہیں اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ کیا ایسا بھی ہوتا ہے؟ کیا یوں بھی ایک دم کوئی جُدا ہو جاتا ہے۔ ساری پیار بھری لڑائیاں، سارے تنازعے بیچ میں چھوڑ کر چپ چاپ کسی طرف نکل جاتا ہے۔۔۔ اس گفتگو کے دوران میں ہی چچی بھی اسٹڈی میں پہنچ گئی تھیں۔ انہوں نے بھی اس رشتے کی پُرزور تائید کردی تھی اور لڑکے والوں کی یہ شرط ماننے کا مشورہ بھی دیا تھا کہ شادی جلد کردی جائے۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر واصف اور فہد تادیر خاموش بیٹھے رہے تھے۔ ان کی آنکھیں آنسوؤں کے بوجھ سے سرخ تھیں۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ بھی نہیں رہے تھے کہ مبادا ایک دوجے کے تاثرات دیکھ کر ضبط کا بند ٹوٹ جائے اور آنسو بہہ نکلیں۔ پھر واصف خاموشی سے اٹھا اور شازیہ کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ بستر پر نیم دراز کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ واصف کو دیکھا تو سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ اپنے بال سمیٹتے ہوئے بولی "کیسے ہو واصف بھائی!" اس کی آواز میں غیر مانوس نرمی تھی۔

"میں تو ٹھیک ہوں لیکن۔۔۔ لیکن تو یہ کیا کر رہی ہے؟"

"میں کیا کر رہی ہوں۔۔۔؟" وہ آنکھیں جھکا کر بولی۔

یکدم واصف نے اس کا سر پکڑ کر اپنے سینے سے لگالیا۔ اس کے آنسو بہہ نکلے تھے۔ وہ دلدوز آواز میں بولا "ہمیں چھوڑ کر جا رہی ہے، کیوں جا رہی ہے؟"

وہ بھی رو دی "مجھے ایک دن تو جانا ہی تھا بھائی۔۔۔ چلو اچھا ہوا جلدی چلی جاؤں گی۔۔۔ میری الماری خالی ہو جائے گی بھائی۔۔۔ اب وہاں تم اور فہد کپڑے رکھ لیا کرنا۔ گاڑی میں ابو کے ساتھ میری سیٹ بھی خالی ہو جائے گی۔ وہاں اب فہد بیٹھ جایا کرے گا۔۔۔ باقی رہا گھر۔۔۔ تو یہ تمہارا گھر ہے بھائی! میں تو نا سمجھ تھی، یونہی سینہ زوری کرتی تھی۔ تم اس گھر کو جس طرح چاہو سجاؤ اور بناؤ۔ یہاں تم نے رہنا ہے۔۔۔ میں نے نہیں رہنا۔"

واصف نے اس کا سر سینے سے بھینچ لیا "نہ شازی! ایسی باتیں نہ کر، میرا سینہ پھٹ جائے گا۔ مجھے معاف کر دے، ہم دونوں کو معاف کر دے۔ تو جانتی ہے یہ سب کچھ مذاق مذاق میں ہوتا تھا۔"

"مجھے معلوم ہے بھائی! یہ سب مذاق تھا۔۔۔ لیکن اس مذاق میں بھی تو آخر ہار میری ہی ہونی تھی۔ میں تو ہمیشہ سے ہاری ہوئی تھی بھائی! بس مجھے پتا نہیں تھا۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

واصف بے قراری سے اس کا سر سہلانے لگا "نہ میری بہن، نہ رو۔ چپ کر۔"

وہ روتی چلی گئی "بھائی، مجھے تمہاری جدائی رُلا رہی ہے۔ میں نے کیا قصور کیا تھا؟ کیوں اتنی جلدی دیس نکالا دے رہے ہو مجھے؟"

اتنے میں فہد بھی کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس نے شازیہ کا ہاتھ تھام لیا اور ہاتھ کی پشت پر آنکھیں رکھ کر آنسو بہانے لگا۔

اگلے پندرہ بیس روز میں ایک لمبا سفر طے ہو گیا۔ شازیہ کی بات پکی ہوئی پھر اس کا نکاح ہو گیا۔ نکاح کے ایک ہفتے بعد رخصتی تھی لیکن رخصتی سے پہلے شازیہ کے دولھا کو فرم والوں نے فوری طور پر کویت بلا لیا۔ ایک بار کویت جا کر فوراً واپس آنا دولھا میاں کے لیے خاصا مشکل تھا۔ لہٰذا طے ہوا کہ رخصتی براہِ راست کویت میں ہوگی۔۔۔ شازیہ کو اپنے سسر کے ساتھ کویت جانا تھا۔

اور پھر۔۔۔ پھر وہ اداس شام آپہنچی جو اب تک واصف کے دل و دماغ پر نقش تھی۔ کتنے عمر رسیدہ نظر آرہے تھے ابو اس دن۔۔۔ وہ ایسی ہی سرد اور ابر آلود شام تھی۔۔۔ ہاں ایسی شاموں میں گھر سے نکلنا بڑا مشکل لگتا ہے اور سفر ایک سزا محسوس ہوتا ہے۔ ایسی ہی ابر آلود شام میں شازیہ کو یہ گھر چھوڑنا پڑا تھا۔ ائرپورٹ روانہ ہونے سے پہلے وہ اجنبیوں کی طرح کمروں میں گھومتی رہی تھی۔ ایک ایک چیز کو دیکھتی رہی تھی۔ در و دیوار پر ہاتھ پھیرتی رہی تھی۔ پھر وہ خاموشی سے چلی گئی تھی۔ جیسے کوئی بھرے پرے میلے میں سے کپڑے جھاڑ کر نکل جاتا ہے۔ اس وقت شازیہ کا پسندیدہ مصرع واصف کے کانوں میں گونج رہا تھا۔ کس تمنا سے تم کو چاہا تھا۔۔۔ کس محبت سے ہار مانی ہے

اس شام بابل کے گھر میں شہ زوری کا زور ٹوٹ گیا۔ وہ لاچار اور مجبور ہو گئی، کچھ بھی اس کے بس میں نہ رہا۔

واصف بیٹھا ماضی کو کھنگالتا رہا۔ ہاں وہ سرما کی ایسی ہی ابر آلود اداس شام تھی۔ ایسی شامیں لمبے سفر کے لیے بڑی نامناسب ہوتی ہیں۔

اپنے معمولی فائدے کی خاطر دوسروں کو بڑا نقصان پہنچانے والوں کے لیے بطور خاص

طاہر جاوید مُغل

ہیرو

فلم نگری کے آسمانِ عروج پر چمکنے والے ایک روشن ستارے کے ٹوٹنے کا احوال۔ خیرہ کن چمک کے حصول کی خاطر چند موقع پرستوں نے اُسے ابدی اندھیروں میں دھکیل دیا... مگر وہ چمک ہرچند کہ تھی مگر نہیں تھی۔

لاہور میں ایک صاف ستھری فیشن ایبل آبادی کے پچھواڑے گندا نالا تھا۔ گندے نالے کے دوسرے کنارے پر وہ ایک وسیع و عریض جھونپڑ بستی تھی۔ یہاں کے مکین چھوٹے موٹے کام کرتے تھے' کچھ ردی کاغذ اکٹھے کرتے تھے' کچھ کباڑیے تھے' کئی ایک نے سڑکوں پر پتھر ڈالنے کی مزدوری شروع کر رکھی تھی۔ بستی کی گندی گلیوں میں ہر وقت ننگ دھڑنگ بچے گھومتے رہتے تھے' آوارہ کتے بھونکتے رہتے تھے اور جھونپڑوں سے باہر بیٹھی عورتیں آپس میں چخ چخ کرتی رہتی تھیں۔ عبدل اس بستی کا مکھیا تھا۔ وہ اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ بستی کے کچے پکے مکان میں رہتا تھا' اس نے چار پانچ گدھا ریڑھیاں بنا رکھی تھیں اور انہیں دیہاڑی پر چلواتا تھا۔ عبدل کا کچا پکا مکان بستی کے جھونپڑوں میں خاصا نمایاں نظر آتا تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ جھونپڑ بستی کا وائٹ ہاؤس تھا تو غلط نہ ہوگا۔

ایک روز عبدل بستی کے حجام دینوں سائیں کے پاس بیٹھا داڑھی بنوا رہا تھا کہ آئینے میں ایک منظر دیکھ کر بری طرح چونک گیا۔ آئینے کا زاویہ ایسا تھا کہ وہ بہ آسانی گلی میں دیکھ سکتا تھا۔ گلی میں پانچ چھ نوجوان لڑکے تاش کھیل رہے تھے۔ انہوں نے زمین پر ہی دو بوریے بچھا رکھے تھے اور ان پر آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ یہ بستی ہی کے نوجوان تھے۔ ان میں سے ایک نوجوان کی صورت دیکھ کر عبدل ٹھٹکا تھا.... جونہی شیو مکمل ہوئی' عبدل نے جلدی جلدی ٹھوڑی سے صابن صاف کیا اور باہر گلی میں آگیا۔

نوجوانوں نے جب مکھیا کو دیکھا تو فوراً کھڑے ہوگئے اور اسے بیٹھنے کے لیے جگہ دی۔ عبدل ان کے پاس ہی بوریے پر بیٹھ گیا۔ اس نے لڑکوں کو کھیل جاری رکھنے کی ہدایت کی۔ لڑکے پھر سے کھیلنے لگے۔ عبدل کی نگاہ مسلسل اس نوجوان کا طواف کر رہی تھی جسے دیکھ کر وہ ایک دم بے قرار ہو کر اٹھا تھا۔ نوجوان کی عمر بیس پچیس سال کے درمیان تھی۔ اس نے ہلکے گلابی رنگ کی میلی کچیلی شلوار قمیص پہن رکھی تھی' گلے میں تعویذ تھا' سر پر ایک رومال بچے

کی طرح بندھا ہوا تھا۔ نوجوان قبول صورت تھا لیکن بہت خستہ حلیے میں تھا۔ وہ کھیل میں اس قدر مگن تھا کہ اسے احساس ہی نہیں ہوا کہ بستی کا مکھیا اتنی محویت سے اسے دیکھ رہا ہے۔

عبدل کی حیرانی کی وجہ یہ تھی کہ نوجوان کی شکل و شباہت بہت حد تک ایک معروف فلمی اداکار سے ملتی تھی۔ اس کے چہرے کے ایک دو رخ تو ایسے تھے جن سے وہ ہو بہو فلمی اداکار قیصر کی طرح لگتا تھا۔ اگر اس کے بال ذرا سیدھے ہوتے، مونچھیں صاف ہوتیں اور دائیں کان کے قریب زخم کا نشان نہ ہوتا تو وہ تقریباً قیصر ہی کی طرح دکھائی دینے لگتا۔

عبدل زیادہ فلمیں نہیں دیکھتا تھا، نہ ہی اسے ایکٹروں ایکٹرسوں میں بہت دلچسپی تھی، سنیما تو وہ شاید ایک سال سے نہیں گیا تھا، بس کبھی کبھار بستی میں ہی وڈیو پر کوئی اچھی فلم لگتی تھی تو دیکھ لیتا تھا۔ یہ وڈیو عام طور پر دینو حجام کی دکان کے پچھواڑے ملنگی کے چائے خانے پر لگایا جاتا تھا اور ملنگی عام فلم بینوں سے باقاعدہ ٹکٹ وصول کرتا تھا۔

تاش کھیلنے والوں میں عبدل کا سب سے چھوٹا بھائی راجو بھی شامل تھا۔ عبدل نے راجو سے مخاطب ہو کر نوجوان کی طرف اشارہ کیا اور پوچھا "یہ کون ہے؟"

راجو نے کھیل سے ہاتھ روک لیا اور بولا "اس کا نام سلطان ہے بھائیا جی! گوجرانوالہ سے آیا ہے محنت مزدوری کے لیے۔ لکشمی کے ایک سنیما میں گیٹ کیپری کا کام ملنے کی امید ہے۔ کوئی ٹھکانا نہیں تھا اس کے پاس.... فٹ پاتھ پر سوتا تھا۔ میں نے کہا جب تک انتظام نہیں ہوتا میرے جھونپڑے میں رہ لو۔"

"کیا نام بتایا ہے تم نے اس کا؟"

"سلطان جی.... ویسے ہم سب اسے ہیرو کہنے لگے ہیں۔ اس کی شکل ہیرو قیصر سے بہت ملتی ہے۔ آپ نے غور نہیں کیا؟"

عبدل نے ایک بار پھر غور سے نوجوان کا معائنہ کیا "شاید تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔ میں بھی کہہ رہا تھا کہ شکل کچھ جانی پہچانی سی لگ رہی ہے۔"

ایک نوجوان بولا "بس ناک تھوڑی سی موٹی ہے بھائیا جی.... ریگ مال سے ناک رگڑ کر پتلی کردی جائے اور کان کھینچ کر تھوڑے سے بڑے کردیے جائیں تو بالکل ہی قیصر شاہ نظر آنے لگے۔"

راجو نوجوان سے مخاطب ہو کر بولا "اوئے ہیرو! ذرا بھائیا جی کو ہنس کر تو دکھا۔"

نوجوان بے ساختہ مسکرا دیا۔ راجو بولا "دیکھو بھائیا جی! ہنستا بھی بالکل قیصر شاہ کی طرح ہے۔"

کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں پھر عبدل اٹھ کر گھر آگیا۔ اس کا ذہن بار بار قیصر شاہ کے ہم شکل نوجوان کی طرف جا رہا تھا۔ عبدل جانتا تھا کہ ہو بہو ایک جیسی شکلیں تو فلموں ڈراموں میں ہی ہوتی ہیں، لیکن ملتی جلتی شکلیں عام زندگی میں بھی نظر آتی رہتی ہیں، کبھی کبھی ایسی شکل بھی نظر آجاتی ہے جو کسی دوسری شکل کے بہت قریب ہوتی ہے۔ سلطان نامی اس نوجوان کا معاملہ بھی کچھ اس طرح کا تھا۔ شکل کے علاوہ قد کاٹھ کے لحاظ سے بھی وہ اس فلمی اداکار کے بہت قریب نظر آتا تھا۔ عبدل کا موقع شناس ذہن تیزی سے اس بارے میں سوچ رہا تھا۔ عبدل کو معلوم تھا کہ اگر کسی شخص کی شکل و صورت کسی مشہور و معروف آدمی سے مل جائے تو وہ اپنے لیے کئی طرح کے فائدے حاصل کرسکتا ہے، کم از کم اتنا تو ضرور ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے لیے اپنی قابلیت کے مطابق کوئی اچھی ملازمت حاصل کرلے۔ عبدل یہ بھی جانتا تھا کہ فلموں میں مشہور اداکاروں کی شکل و صورت اور قد کاٹھ سے ملتے جلتے لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ بعض اوقات خطرناک مناظر کی شوٹنگ کے لیے اصل اداکاروں کے بجائے ان لوگوں سے کام لیا جاتا ہے۔ اس طرح ان لوگوں کی بہت اہمیت ہوجاتی ہے۔

عبدل اکثر اپنے کام کاج کے سلسلے میں اسٹوڈیوز کی طرف جاتا رہتا تھا۔ اسٹوڈیوز میں کام کرنے والے چند ملازمین کے ساتھ اس کی علیک سلیک بھی ہوگئی تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ کیوں نہ اسٹوڈیو کے کسی ملازم سے سلطان نامی اس نوجوان کے بارے میں بات کرے۔ عین ممکن تھا کہ سلطان کو کوئی بہت اچھا کام مل جاتا۔ ایسا کام جس میں پیسہ بھی ہوتا اور سیر سپاٹا بھی۔ اپنی بول چال سے سلطان.... عبدل کو بالکل سیدھا سادہ اور پینڈو نظر آیا تھا۔ ویسے بھی وہ لاہور جیسے بڑے شہر میں پردیسی تھا۔ عبدل کو امید تھی کہ وہ اس کا سرپرست بن کر اس سے بہت فائدہ حاصل کرسکتا ہے۔

عبدل کو یاد آیا کہ جب مشہور فلم اسٹار وحید مراد کا انتقال ہوا تھا تو اس کا ہم شکل ڈھونڈنے کے لیے فلم سازوں نے کیا کیا کوششیں نہیں کی تھیں۔ اخباروں میں اشتہار دیے گئے تھے، دور و نزدیک بندے دوڑائے گئے تھے۔ نامکمل فلموں کی وجہ سے فلم سازوں کو لاکھوں کروڑوں کا نقصان برداشت کرنا پڑے تو وہ اس نقصان سے بچنے کے لیے دس بیس ہزار بخوشی خرچ کرنے پر راضی ہوجاتے ہیں۔ اس موقع پر عبدل کے دل سے بے ساختہ دعا نکلی کہ قیصر شاہ نامی وہ ہیرو اللہ کو پیارا ہوچکا ہو، اور اگر نہ ہوا ہو تو آج کل میں ہوجائے۔

رات کو وہ اپنے چھوٹے بھائی راجو کے جھونپڑے میں گیا، وہاں اس نے دیر تک سلطان سے باتیں کیں۔ اس کا یہ اندازہ سو فی صد درست ثابت ہوا کہ سلطان کو ابھی ٹھیک سے شہر کی ہوا نہیں لگی۔ اس کی باتوں میں بھولپن تھا، وہ بستی کے عام لوگوں کی طرح اسے "بھائیا جی" کہہ کر مخاطب کررہا تھا اور بار بار کہہ رہا تھا۔ "بھائیا جی! میرے لیے کوئی پکی نوکری ڈھونڈ دو۔ اگلے سے اگلے چاند کو میری دو بہنوں کی شادی ہے، مجھے پیسوں کی بڑی سخت ضرورت ہے۔ میں محنت مزدوری کا کوئی کام بھی کرنے کو تیار

ہوں۔"

عبدل نے اس کے ساتھ تسلی تشفی کی باتیں کیں اور اسے اطمینان دلایا کہ وہ جلد ہی اس کے لیے کوئی اچھا کام ڈھونڈ نکالے گا۔

اسٹوڈیو میں آنے جانے والے جن لوگوں کے ساتھ عبدل کی علیک سلیک تھی ان میں سے ایک فائٹر اگزینڈر بھی تھا۔ اگزینڈر ایک کالے بھجنگ لیکن چست چالاک شخص کا نام تھا، عمر پچیس چھبیس سال رہی ہوگی، وہ جوڈو کراٹے جانتا تھا۔ اسے امید تھی کہ جلد یا بدیر اسے فلموں میں فائٹ انسٹرکٹر کی حیثیت سے کام ملنے لگے گا۔ فی الوقت وہ چھوٹے موٹے کرداروں پر قناعت کررہا تھا۔

اگلے روز عبدل نے اگزینڈر سے ملاقات کی۔ دونوں دیر تک باتیں کرتے رہے۔ عبدل نے اگزینڈر کو سلطان کے حوالے سے سب کچھ بتا دیا۔ اگزینڈر کے دل میں بھی خواہش پیدا ہوئی کہ وہ سلطان کو دیکھے، دونوں جھونپڑ بستی پہنچے، یہاں اگزینڈر نے سلطان کو بستی کے دیگر آوارہ گرد نوجوانوں کے ساتھ اخروٹ کھیلتے دیکھا۔ دور سے سلطان کی ایک جھلک دیکھنے کے بعد ہی اگزینڈر معترف ہوگیا کہ یہ لڑکا شکل و صورت اور قد کاٹھ کے اعتبار سے قیصر شاہ کے ساتھ کافی مشابہت رکھتا ہے۔

اگزینڈر عبدل کے ساتھ اس کے "وائٹ ہاؤس" میں آ بیٹھا۔ دونوں دیر تک سر جوڑے بیٹھے رہے۔ آخر اگزینڈر کے زرخیز ذہن میں ایک اچھوتا آئیڈیا آگیا۔

وہ چٹکی بجاتے ہوئے بولا "یار! ایک کام ہوسکتا ہے۔"

"کیا؟" عبدل نے پوچھا۔

اگزینڈر نے سگریٹ کا ایک طویل ترین کش لیا اور پُرسوچ لہجے میں بولا "آج کل فلم "میدان" کی شوٹنگ ہورہی ہے۔ ایک ہوٹل کا سیٹ لگا ہوا ہے، اس میں پندرہ بیس منٹ کی زبردست فائٹ ہے۔ تین چار دن سے پہلے اس سیٹ کی شوٹنگ مکمل نہیں ہوگی۔ قیصر صاحب کی یہ ساری فائٹ میرے ساتھ ہونی ہے، بڑی دھواں دھار قسم کی لڑائی ہے، تمہیں پتا ہی ہے قیصر صاحب کا جسم ذرا موٹا ہوگیا ہے، ویسے بھی وہ فائٹ سین کرانے میں کوئی اتنے زیادہ ماہر نہیں ہیں۔ آج کل ہر شاٹ مجھ سے پوچھ پوچھ کر کررہے ہیں۔ میرے دماغ میں ایک بات آئی ہے۔" اگزینڈر نے آخری فقرہ آنکھ میچ کر کہا۔

"کیا بات؟" عبدل کے چہرے پر لالچ آمیز تجسس نظر آنے لگا۔

اگزینڈر نے عبدل کے کان سے منہ لگایا اور پُرجوش انداز میں کھسر پھسر کرنے لگا۔

کوئی آدھ گھنٹے بعد وہ دونوں جب گھر سے نکلے تو ان کے چہرے جوش سے تمتمارہے تھے۔ پروگرام یہ بنا تھا کہ سلطان کے لیے کم از کم دس پندرہ روز کے لیے ایک منافع بخش کام کا انتظام کردیا جائے۔ "میدان" کی شوٹنگ بالکل آخری مراحل میں تھی۔ شیڈول کے مطابق فروری کے پہلے ہفتے میں اس کا کیمرا کلوز ہوجانا تھا اور عیدالاضحیٰ کو بہرصورت فلم کو نمائش کے لیے پیش ہونا تھا۔ اگر اس موقع پر فلم کے ہیرو کو "فٹ نس" کا مسئلہ لاحق ہوجاتا اور وہ شوٹنگ کے قابل نہ رہتا تو فلم ساز اور ہدایت کار کو روزِ روشن میں تارے نظر آجاتے۔ فلم کے رہے سہے شاٹ عکس بند کرنے کے لیے ان کی راتوں کی نیندیں حرام ہوجاتیں۔ اگر ایسے موقع پر اگزینڈر اور عبدل "میدان" کے فلم ساز اور ہدایت کار کو بتاتے کہ وہ قیصر شاہ سے بالکل مشابہت رکھنے والا ایک نوجوان مہیا کرسکتے ہیں تو یقیناً ان کی بات بے پناہ توجہ سے سنی جاتی۔ ایسے میں اگزینڈر فلم ساز سے معاملہ طے کرسکتا تھا۔ قیصر شاہ کا ہم شکل مہیا کرنے کے عوض وہ اگر بیس پچیس ہزار روپیہ بھی مانگ لیتا تو فلم ساز فوراً تیار ہوجاتا۔ سودے بازی کرکے ممکن تھا کہ وہ تیس چالیس ہزار روپے تک اینٹھ لیتے۔ "میدان" کی جو شوٹنگ باقی تھی وہ کچھ اسی نوعیت کی تھی کہ اس میں "ڈپلی کیٹ" کی گنجائش نکل سکتی تھی۔ زیادہ تر لڑائی کے مناظر تھے۔ لانگ شاٹس لے کر لڑائی میں قیصر شاہ کی عدم موجودگی کو چھپایا جاسکتا تھا۔

دونوں نے کافی دیر اس معاملے پر سوچ بچار کی تھی اور اپنی منصوبہ بندی سے کافی حد تک مطمئن ہوگئے تھے۔ پروگرام یہ بنا تھا کہ کل شوٹنگ کے دوران میں جب اگزینڈر اور قیصر شاہ کے درمیان فائٹنگ کے مناظر فلمائے جارہے ہوں گے، اگزینڈر موقع دیکھ کر قیصر شاہ کو ایسی ضرب لگائے گا کہ وہ تین ہفتوں کے لیے بستر سے اٹھ نہ سکے گا۔ اگزینڈر کو یقین تھا کہ اس سوچی سمجھی ضرب کو "اتفاقیہ" ثابت کرنے میں وہ کامیاب رہے گا اور پلاننگ کا پہلا مرحلہ طے ہوجائے گا۔

واپس جانے سے پہلے اگزینڈر ایک بار پھر سلطان نامی اس لڑکے کو دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے کہنے پر عبدل نے ایک شخص کو اپنے بھائی راجو کی طرف بھیجا اور اسے کہا کہ وہ "ہیرو" کو لے کر آئے۔ دس پندرہ منٹ بعد راجو اکیلا ہی چلا آیا۔

"وہ ہیرو کدھر ہے؟" عبدل نے پوچھا۔

"بھائیا جی! وہ تو ابھی تھوڑی دیر پہلے چلا گیا ہے۔" راجو نے جواب دیا۔

"کہاں؟"

"گوجرانوالہ گیا ہے۔ کہتا تھا پرسوں آجاؤں گا، گھر والوں سے مل کر۔"

عبدل اور اگزینڈر کے چہرے پر ایک ساتھ تشویش پھیل گئی۔ چند لمحے توقف کرکے عبدل نے پوچھا "تمہیں یقین ہے کہ وہ پرسوں تک آجائے گا۔"

"ضرور آجائے گا بھائیا جی۔"

"فرض کرو نہ آیا تو؟ کوئی اتا پتا ہے تمہارے پاس۔"

”آہو بھائیا جی! پتا بھی ہے.... گوجرانوالہ کے پاس ہی گاؤں ہے‘ پورا ایڈریس لکھا ہوا ہے میرے پاس۔ لیکن.... کیا کوئی خاص بات ہے؟“

”ہاں خاص ہی سمجھو۔“ عبدل نے کہا ”جو کچھ ہم نے سوچا ہے پورا ہو گیا تو اس منڈے کی قسمت کھل جائے گی۔ ساتھ میں ہمارا بھی فائدہ ہو جائے گا۔“

راجو تفصیل جاننا چاہتا تھا لیکن عبدل نے اسے ٹال دیا۔

○☆○

عبدل بڑی بے چینی سے الگزینڈر کا انتظار کر رہا تھا۔ پروگرام کے مطابق الگزینڈر کو شام کے فوراً بعد جھونپڑ بستی میں آنا تھا اور عبدل کو تازہ ترین صورتِ حال بتانا تھی۔ اب رات کے نو بجنے والے تھے اور اس کالے بھجنگ فائٹر کا کچھ پتا نہیں تھا۔ اس کے انتظار میں عبدل نے مسلسل حقہ گڑگڑاتے ہوئے پورا کمرا دھوئیں سے بھر دیا تھا‘ نتیجے میں اس کی بیوی اپنے بچوں سمیت کھانستی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی۔

ساڑھے نو بجے کے لگ بھگ عبدل کی برداشت جواب دے گئی۔ وہ گھر سے نکلا اور شاہ نور اسٹوڈیوز کی طرف روانہ ہو گیا۔ آدھے گھنٹے میں وہ فلم نگری پہنچ گیا۔ یہاں رات اور دن برابر تھے۔ اسٹوڈیوز سے باہر وسیع و عریض بازار میں رات کے دس بجے بھی دوپہر کی طرح چہل پہل تھی۔ ریسٹورنٹ کھلے تھے‘ چائے خانوں میں ٹی وی اور وڈیو چل رہے تھے۔ وہ ایک ایسے چائے خانے میں جا بیٹھا جہاں اکثر الگزینڈر سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ اس روز الگزینڈر تو نہیں ملا ہاں اس کے قریبی دوست منا سے ملاقات ہو گئی۔

عبدل نے چھوٹتے ہی منا سے پوچھا ”الگزینڈر کہاں ہے؟“
منا نے حیرت سے کہا ”تجھے نہیں پتا؟“
”کیوں کیا ہوا؟“ عبدل بری طرح ٹھٹکا۔ دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے تھے۔

منے نے چرس بھرے سگریٹ کا طویل کش لیتے ہوئے کہا۔ ”اس کے ساتھ تو آج دوپہر بڑا پھڈا ہو گیا ہے۔ لڑائی میں اس کے ہاتھوں قیصر صاحب کو سخت چوٹ لگ گئی ہے۔ وہ تو اسپتال میں ہیں۔ سنا ہے آپریشن ہوا ہے ان کا.... الگزینڈر کی جان آفت میں آئی ہوئی ہے۔ قیصر صاحب کے بھائیوں اور منیجر نے اسے مارا پیٹا بھی ہے۔ سنا ہے وہ تو اسے پولیس کے حوالے کرنا چاہتے تھے لیکن پھر لوگوں نے سمجھایا کہ اس نے جان بوجھ کر تھوڑا کیا ہے‘ بس قسمت میں چوٹ تھی لگ گئی۔“

”اب الگزینڈر کہاں ہے؟“

”اسپتال میں ہی ہے اور بھی بہت سے لوگ وہاں گئے ہوئے ہیں۔ قیصر صاحب ابھی تک ہوش میں نہیں ہیں۔ ناف پر الگزینڈر کا گھٹنا لگا تھا۔ پیٹ کے اندر کوئی نالی شالی پھٹ گئی ہے۔ ڈاکٹر کہتے

ہیں کہ اگر فوراً آپریشن نہ ہوتا تو جان کو خطرہ تھا۔ بہرحال اب بھی یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔"

چائے خانے میں اکثر میزوں پر اسی واقعے کے بارے میں بات ہو رہی تھی۔ عبدل اور منا بھی کچھ دیر یہی گفتگو کرتے رہے پھر عبدل بستی واپس آگیا۔

اگلے روز بھی عبدل کی ملاقات الگزینڈر سے نہیں ہوئی۔ وہ سارا دن خیریت سے گزرا تاہم شام کے بعد عبدل کو یہ اڑتی اڑتی سی خبر ملی کہ اسپتال میں ہیرو قیصر شاہ کی حالت ابھی خطرے سے باہر نہیں اور اسے کسی دوسرے اسپتال لے جانے کے بارے میں سوچا جا رہا ہے۔

صبح کے اخبارات میں بھی ہیرو قیصر شاہ کے حوالے سے خبریں موجود تھیں۔ اسے ایک اعلیٰ درجے کے پرائیویٹ اسپتال میں داخل کرا دیا گیا تھا اور ڈاکٹر اس کا ایک اور آپریشن کرنے کی تیاری کر رہے تھے۔ عبدل کو ہرگز امید نہیں تھی کہ یہ واقعہ اس طرح کا رنگ اختیار کرے گا۔ اس کا خیال تھا کہ الگزینڈر لڑائی کے دوران میں قیصر شاہ کی ٹانگ وغیرہ پر ضرب لگائے گا اور وہ کچھ روز کے لیے چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہے گا۔ اس دوران میں وہ فلم ساز سے بات طے کرکے گوجرانوالہ کے سلطان کو آگے لے آئیں گے اور مال پانی بنالیں گے۔ لیکن یہ تو لمبا ہی چکر چل گیا تھا۔

....اگلے دو چار روز میں حالات بڑی تیزی سے تبدیل ہوئے۔ ہیرو قیصر شاہ کی حالت سنبھلنے کے بجائے بگڑتی چلی گئی۔ معلوم ہوا کہ وہ اپینڈکس کا پرانا مریض تھا اور چوٹ لگنے کے وقت بھی اسے تکلیف موجود تھی' چوٹ لگنے سے اپینڈکس پھٹ گیا تھا اور ایک دو دیگر مسئلے بھی پیدا ہوگئے تھے۔

....واقعے کے پانچویں روز قیصر شاہ کے دو مزید آپریشن ہوئے' ان آپریشنز کے بعد اس پر مسلسل بے ہوشی طاری ہوگئی اور لوگ اس کی زندگی کے بارے میں مایوسی ظاہر کرنے لگے اور پھر وہ ہوا جس کی کسی کو توقع نہیں تھی۔ شوٹنگ کے دوران میں چوٹ لگنے کے ٹھیک دو ہفتے بعد جواں سال ہیرو قیصر شاہ اسلام آباد کے ایک اسپتال میں دم توڑ گیا۔

○☆○

وقت اپنی مخصوص رفتار سے چلتا رہتا ہے' کسی کے چلے جانے سے دنیا کے کام رکتے نہیں۔ ہاں کچھ عرصے کے لیے ان کاموں کی رفتار سست ضرور ہو جاتی ہے۔ سست رفتاری کا یہ دورانیہ کبھی ایک دو سال کا ہوتا ہے' کبھی ایک دو ماہ کا اور کبھی ایک دو دن کا۔ شوبز کی دنیا میں بہت تیزی ہے' یہاں چلا نہیں جاتا بلکہ بھاگا جاتا ہے۔ گرنے والوں کو رک کر دیکھنے کی مہلت بھی نہیں ہوتی۔ قیصر شاہ کی موت کے دو تین ہفتے بعد ہی فلم "میدان" کی رہی سہی شوٹنگ کے بارے میں سوچ بچار ہونے لگی۔ ایک روز جھونپڑ بستی میں عبدل ایک جہازی سائز کی چارپائی پر بیٹھا کتوں کی لڑائی دیکھ رہا تھا کہ اسے الگزینڈر کی صورت نظر آئی۔ اسے دیکھ کر عبدل فوراً محفل سے اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں عبدل کے گھر پہنچے اور کمرا بند کرکے بیٹھ گئے۔ شوٹنگ والے حادثے کے بعد یہ عبدل اور الگزینڈر کی پہلی "باضابطہ" ملاقات تھی۔ الگزینڈر نے عبدل کو سب کچھ تفصیل سے بتایا۔ اس نے بتایا کہ وہ قیصر شاہ کو جان سے مارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ لڑائی کے دوران میں اس نے قیصر شاہ کی دائیں ران پر گھٹنے کی ضرب لگانے کی کوشش کی تھی۔ یہاں قیصر شاہ کو پہلے بھی ایک چوٹ لگی ہوئی تھی' الگزینڈر کو یقین تھا کہ یہاں لگنے والی اس کی "ماہرانہ" چوٹ قیصر شاہ کو ایک دو ہفتوں کے لیے لازماً بستر پر ڈال دے گی' اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ٹانگ کے بجائے قیصر شاہ کی ناف نشانہ بن جائے گی اور زوردار ضرب اسے آناً فاناً اسپتال پہنچا دے گی۔

آخر میں الگزینڈر نے کہا "بہرحال جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اب یہ سب کچھ لپیٹا جا چکا ہے' اللہ کرے ہمیشہ ہی لپٹا رہے۔" فقرہ مکمل کرکے اس نے چند لمحے توقف کیا... پھر بولا "اب میں ایک خاص مقصد سے تمہارے پاس آیا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ تم کچھ نہ کچھ تو سمجھ ہی گئے ہوگے۔"

عبدل نے حقہ گڑگڑا کر کہا "شاید تم اس سلطان نامی لڑکے کے بارے میں کچھ کہنا چاہتے ہو۔"

"بالکل یہی بات ہے۔ وہ لڑکا کہاں ہے؟"

"وہ خبیث اب تک واپس نہیں آیا' لیکن راجو کے پاس اس کا مکمل پتا موجود ہے۔ اگر تم چاہو تو میں کل ہی اسے گوجرانوالہ بھیج دیتا ہوں' وہ اسے پکڑ لائے گا۔ ویسے راجو نے پچھلے ہفتے اسے ایک خط بھی لکھ دیا تھا۔"

الگزینڈر نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے عبدل! تم اس لڑکے کو بلالو۔ لیکن اب یہ معاملہ بالکل اور ہو گیا ہے۔ سمجھو وہ لڑکا سونے کا انڈا دینے والی مرغی بن گیا ہے۔ قیصر شاہ کی کم از کم گیارہ فلمیں ہیں جو نامکمل پڑی ہیں۔ ان سب کی سب فلموں میں اس لڑکے کی سخت ضرورت پڑے گی۔ فلم سازوں سے جتنے پیسے مانگے جائیں گے وہ دیں گے۔ ان کی تو راتوں کی نیندیں اڑی ہوئی ہیں اور اب بات صرف نامکمل فلموں تک ہی نہیں رہے گی' اب تو اس بات کا بڑا پکا چانس ہے کہ اس لڑکے کا کیریئر بن جائے۔ مجھے نہیں یقین کہ فلم والوں کو قیصر شاہ کا اتنا زبردست ہم شکل کوئی اور مل سکے گا۔ بس اس لڑکے کو تھوڑا سا سکھانے اور چمکانے کی ضرورت ہوگی۔ اگر تم اس لڑکے کو ہاتھ میں رکھنے میں کامیاب ہوگئے تو سمجھو دھن کی بارش ہو جائے گی۔"

الگزینڈر کی باتیں سن کر عبدل کے چہرے پر بھی دبا دبا جوش نظر آنے لگا۔ الگزینڈر کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں تھیں' بولا۔ "لیکن اب ہمیں بہت احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ اب اس معاملے میں میرا نام بالکل نہیں آئے گا۔ میں تمہاری بات منا سے کرا دوں

گا' وہ کیمرا مین امانت رضوی کے ساتھ کام کر رہا ہے' ہر جگہ اس کی پہنچ ہے۔ اب جو کچھ کرنا ہے' تم دونوں نے مل کر کرنا ہے۔ میں بیک میں رہوں گا اور تمہیں ہر بات سمجھا تا رہوں گا۔"

عبدل پُرجوش لہجے میں بولا "میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں یار.... قیصر شاہ کی موت کے بعد اب تمہارا پیچھے رہنا ہی بہتر ہے۔ بلکہ کسی کو شک بھی نہیں گزرنا چاہیے۔"

اگزینڈر نے کہا "بس تو پھر ٹھیک ہے۔ تم کل سویرے ہی اس لڑکے کی طرف اپنے بھائی کو بھیج دو۔ باقی باتیں کل ہوں گی۔"

عبدل نے اگلے روز اپنے بھائی راجو کو صبح سویرے گوجرانوالہ بھیج دیا اور اسے کہا کہ وہ لڑکے کو ہر صورت اپنے ساتھ لے کر آئے۔ اس نے راجو کو سلطان کے لیے پانچ سو روپے بھی دیے۔

سارا دن عبدل نے بڑی بے چینی سے راجو اور سلطان کا انتظار کیا لیکن شام کو اسے کوئی اچھی خبر نہیں مل سکی۔ راجو خالی ہاتھ واپس آگیا تھا۔ اس نے عبدل کی مایوسی میں "گراں قدر" اضافہ کرنے کے لیے اسے یہ اطلاع دی کہ سلطان نے جس گاؤں کا پتا دیا تھا وہ گوجرانوالہ سے چار پانچ میل کے بجائے پندرہ بیس میل دور ہے اور وہاں سلطان ولد خدا بخش نام کا کوئی بندہ نہیں رہتا۔

شام کو اگزینڈر اور منا آئے تو انہیں بھی عبدل نے یہ مایوس کن خبر سنائی۔ تینوں دیر تک سر جوڑے بیٹھے رہے۔ انہیں بالکل یہی محسوس ہو رہا تھا جیسے سونے کا انڈا دینے والی مرغی ان کے دڑبے سے نکل کر کہیں روپوش ہوگئی ہے۔ اگلے روز وہ تینوں از خود سلطان نامی اس لڑکے کی تلاش میں نکلے۔ پورے اڑتالیس گھنٹے تک انہوں نے گوجرانوالہ اور گردو نواح میں خاک چھانی لیکن گوہرِ مقصود ہاتھ نہیں آیا۔ وہ تھک ہار کر واپس آگئے۔

اسی طرح چار پانچ روز مزید گزر گئے۔ عبدل اور اگزینڈر کے علاوہ راجو کو بھی ہر گھڑی امید رہی کہ سلطان اچانک کسی طرف سے بستی میں وارد ہو جائے گا۔ اپنے مخصوص لب و لہجے اور اپنی خالص دیہاتی آواز میں انہیں بتائے گا کہ وہ اتنے دن تک لاہور واپس کیوں نہیں آسکا۔ لیکن یہ امید بر نہیں آئی۔ عبدل اور اگزینڈر مایوس ہونے کے باوجود ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھے تھے۔ وہ لاہور میں بھی سلطان کی تلاش جاری رکھے ہوئے تھے۔ انہوں نے اسے زیرِ تعمیر علاقوں میں کام کرتے ہوئے مزدوروں میں ڈھونڈا تھا' بستر ا چارپائی والے ہوٹلوں میں ڈھونڈا تھا' سینما گھروں کے گیٹ کیپروں میں ڈھونڈا تھا اور ہر اس جگہ تلاش کیا تھا جہاں اس کے ملنے کی معمولی سے معمولی امید بھی ہو سکتی تھی۔ پتا نہیں وہ کس طرف سے آیا تھا اور کدھر چلا گیا تھا۔ سوچ سوچ کر عبدل کا دماغ پھٹنے لگتا تھا۔

آخر ایک روز اسے اپنے تمام سوالوں کا جواب مل گیا۔ وہ بستی کے حجام دینوں کی دکان پر بیٹھا شیو بنوا رہا تھا۔ آئینے کا رخ اس طرح تھا کہ وہ لکڑی کے بینچ پر پڑا ہوا اخبار دیکھ سکتا تھا۔ اخبار میں اسے ہیرو قیصر شاہ کی بڑی سی رنگین تصویر نظر آئی۔ شیو سے فارغ ہو کر اس نے اخبار اٹھالیا اور تصویر کو غور سے دیکھنے لگا۔ وہ پڑھ نہیں سکتا تھا۔ اس نے دینوں سے کہا "یہ کیا لکھا ہے؟"

دینوں اس کے پاس بیٹھ گیا اور غور سے پڑھنے لگا۔ اس کی نظریں اخبار پر تھیں' وہ کچھ دیر منہ میں بڑبڑاتا رہا پھر بولا "بھائیا جی! قیصر شاہ کے بارے میں ہی لکھا ہے۔ وہ بہت محنتی اداکار تھا' بڑی لگن سے کام کرتا تھا۔ تھوڑے ہی دنوں میں اس نے اپنا نام بنالیا تھا وغیرہ وغیرہ۔"

"اوئے تو پڑھ کر سنا ناں۔ تجھے اپنی طرف سے تقریر کرنے کو کس نے کہا ہے۔" عبدل نے ڈانٹا۔

دینوں شرمندہ ہو کر نچلی سطور پڑھنے لگا "قیصر شاہ مرحوم بڑا مختلف اداکار تھا۔ دوسرے اداکاروں کی طرح وہ چالو کام نہیں کرتا تھا۔ اس کی خواہش رہتی تھی کہ اسے کم سے کم مگر اچھی فلموں میں کاسٹ کیا جائے۔ وہ کردار میں ڈوب جاتا تھا' اسے اپنے اوپر طاری کرلیتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج اس کے کام کو ہر ذوق کے لوگ زبردست خراجِ تحسین پیش کر رہے ہیں۔ پچھلے دنوں قیصر کو انڈسٹری کے تجربہ کار ترین ہدایت کار خواجہ شیراز نے اپنی فلم "غریب" میں کاسٹ کیا تھا۔ اس فلم میں قیصر کو اپنا رول بہت پسند تھا۔ قیصر کو توقع تھی کہ یہ رول سپرہٹ ہوگا۔ ہدایت کار خواجہ شیراز نے از خود یہ بات بتائی ہے کہ اپنے رول کو بہتر طور پر ادا کرنے کے لیے قیصر سخت محنت کر رہا تھا۔ اس نے گلزار کالونی کے علاقے میں ایک جھونپڑ بستی ڈھونڈ نکالی تھی اور ایک آوارہ نوجوان کے گیٹ اپ میں کئی دنوں سے وہاں جا رہا تھا۔ وہ ان لوگوں کا رہن سہن' بول چال' طور اطوار سب کچھ ذہن میں اتارنے کا خواہش مند تھا۔ اگر زندگی قیصر کو مہلت دیتی تو "غریب" کا ٹائٹل رول یقیناً اس کے کیریئر کا یادگار رول ہوتا۔"

دینوں پڑھ رہا تھا' عبدل سن رہا تھا اور گردو پیش اس کی نگاہوں میں گھومتے چلے جا رہے تھے۔ پتا نہیں وہ کب وہاں سے اٹھا اور کب ڈولتے قدموں کے ساتھ بستی کی گلیوں سے گزرتا ہوا اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ راستے میں اسے اگزینڈر ملا۔ دونوں میں علیک سلیک ہوئی۔ آج بھی اگزینڈر نے وہی سوال کیا جو وہ تقریباً روزانہ عبدل سے کرتا تھا "کچھ پتا چلا سلطان کا؟" اگزینڈر نے پوچھا۔

عبدل نے مایوسی سے سر ہلایا "نہیں اگزینڈر! سلطان اب نہیں ملے گا۔ یوں سمجھو کہ وہ بھی قیصر شاہ کے ساتھ ہی ہمارے ہاتھوں مر گیا ہے۔"

اگزینڈر حیرت سے عبدل کی طرف دیکھنے لگا۔

اسد باغ جناح کے گنگا رام والے گیٹ کی طرف سے باغ میں داخل ہوا۔ اپنی نئی ٹویوٹا کار اس نے پارکنگ میں کھڑی کی اور چابی گھماتا ہوا سرسبز روش پر ٹہلنے لگا۔ اچانک اس کی نگاہ گھونگھریالے بالوں والے پر پڑی۔ وہ ایک پتھریلے بینچ پر دراز تھا۔ اس کا چہرہ بازوؤں میں چھپا ہوا تھا۔ لگتا تھا کہ سو رہا ہے۔

گھونگھریالے بالوں والا اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ پچھلے ایک ہفتے میں اسد نے تین چار بار اس نوجوان کو یہاں باغ میں دیکھا تھا۔ کبھی گھاس پر خاموش بیٹھے ہوئے۔ کبھی درختوں کے نیچے یوں ٹہلتے ہوئے کہ اس کی نگاہ کہیں دور بہت دور دیکھ رہی ہوتی تھی اور کبھی کسی گوشے میں نیم دراز.... اس کے چہرے پر ایک پرانا گھاؤ تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ کسی تیز دھار آلے کا زخم ہے۔ یہ گھاؤ نما زخم اس کی پیشانی سے شروع ہو کر اس کے رخسار کو بدنما بناتا ہوا اس کی ٹھوڑی تک چلا گیا تھا۔ پیشانی پر یہ زخم زیادہ گہرا تھا جس کی وجہ سے پیشانی پچکی ہوئی سی نظر آتی تھی۔ اسد نے اس نوجوان کے لباس سے اندازہ لگایا تھا کہ وہ پڑھا لکھا ہے اور پنجاب ہی کے کسی علاقے سے تعلق رکھتا ہے۔ شاید وہ یہاں نوکری ڈھونڈنے کے لیے آیا تھا' یا پھر اپنے کسی بچھڑے ہوئے کی تلاش تھی' یا پھر یونہی راستہ بھٹکا ہوا تھا۔ اس کی غم زدہ آنکھوں میں دیکھ کر پہلا خیال ذہن میں یہی آتا تھا کہ وہ کچھ ڈھونڈ رہا ہے۔ اپنی متجسس طبع سے مجبور ہو کر ایک دوبار اسد کا دل چاہا تھا کہ وہ اس سے بات کرے لیکن پھر وہ اپنے اس ارادے کو عملی جامہ نہیں پہنا سکا تھا۔

آج اس نے گھونگھریالے بالوں والے کو یوں لیٹے ہوئے پایا تو متجسس انداز میں اس کے قریب چلا گیا "ہیلو مسٹر

صرف ایک مشتِ آگہیں اور پُرمحبت لمحے کی تلاش میں سرگرداں نوجوان کی داستان

بچپن کی انسیت بہت جلد محبت میں بدل جاتی ہے مگر اُس وقت اس کے اظہار کا مرحلہ بہت دشوار ہوتا ہے جسے اگر سر نہ کیا جائے تو آرزوئیں اور تمنائیں تشنہ کام رہ جاتی ہیں۔ اُس تشنہ کامی میں اگر احساسِ کم مائیگی بھی شامل ہو تو زندگی سراپا زہر بن جاتی ہے۔

طاہر جاوید مغل

کرید

وقت کیا ہوا ہے؟" اسد نے یونہی اسے مخاطب کرنے کے لیے دریافت کیا۔

کوئی جواب نہیں ملا۔ اسد نے ذرا اور قریب جاکر قدرے بلند آواز میں اپنا سوال دہرایا اس مرتبہ بھی جواب ندارد... حالانکہ اسد محسوس کرچکا تھا کہ وہ شخص سو نہیں رہا۔ اسد نے تیسری مرتبہ اسے مخاطب کیا تو اس نے جیسے مجبوراً آنکھوں پر سے بازو ہٹایا۔ اس کی سرخ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ ان آنسوؤں کو اپنے بازو کی رگڑ سے پونچھنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے اس نے خفا نظر سے اسد کو دیکھا، پھر ایک نگاہ اپنی رسٹ واچ پر ڈالی اور بولا "سوا پانچ۔"

"کیا بات ہے بھئی، کوئی پریشانی ہے؟" اسد اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔

"نن... نہیں... پپ... پریشانی تو کوئی نہیں۔" اس نے کہا۔

اسد کو اندازہ ہوا کہ وہ ہکلاتا ہے۔

"میں کئی دن سے تمہیں یہاں دیکھ رہا ہوں۔ دل چاہتا تھا کہ تم سے بات کروں۔"

"مم... مجھ سے؟" اس کی ڈری ہوئی آنکھوں میں حیرت بھی نظر آنے لگی۔

"کیوں؟ کیا تم سے بات نہیں کی جاسکتی؟" اسد نے مسکرا کر پوچھا۔

"مم... میرا مطلب ہے۔ مم... مجھ سے آ... آ... آپ کو بھلا کیا۔ کک... کام ہوسکتا ہے؟"

"بس میرا دل چاہ رہا تھا تم سے بات کرنے کو۔ تم مجھے بڑے دکھی لگے ہو، اس کے علاوہ یہاں لاہور میں اجنبی بھی ہو اور شاید مصیبت زدہ بھی۔"

"نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے جی۔" وہ ہر لفظ پر ہکلاتے ہوئے بولا۔

لیکن جب وہ یہ فقرہ بول رہا تھا اس کی آنکھوں میں تازہ آنسوؤں نے امڈنے کی کوشش کی تھی، جنہیں اس نے پسینہ پونچھنے کے بہانے اپنی میلی آستین میں جذب کرلیا۔

اسد نے اسے سگریٹ پیش کیا جسے اس نے شکریے کے ساتھ قبول کرلیا۔ اسد بڑی اپنائیت کے ساتھ اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ ان باتوں کے دوران میں اسد کو اتنا پتا تو چل ہی گیا کہ اس نوجوان کا نام شاہ زیب ہے اور وہ راولپنڈی سے یہاں آیا ہے۔ وہ بی اے تک تعلیم حاصل کرچکا تھا اور کام میں اپنے باپ کا ہاتھ بٹاتا تھا، اس کا باپ راولپنڈی میں فیض آباد کے علاقے میں پودوں کی نرسری چلاتا تھا۔ شاہ زیب نے ہکلاتے ہوئے بتایا کہ وہ یہاں لاہور کی سیر کرنے کے لیے آیا ہے، تاہم اسد جانتا تھا کہ وہ اصل بات چھپا رہا ہے... وہ اسے کہہ کرسن اپنے گھر لے آیا۔

اسد کا گھر باغ جناح کے قریب ہی واقع تھا۔ یہ پندرہ مرلے کی خوب صورت کوٹھی تھی۔ اسد یہاں اپنی بہت ضعیف والدہ اور دو ملازموں کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں بطور پی آر او کام کرتا تھا۔ معقول تنخواہ تھی، آسانی سے گزر بسر ہورہی تھی۔

اسد نے شاہ زیب کو پہلے تو نہانے پر مجبور کیا، پھر وارڈ روب میں سے اسے ایک مناسب سائز کی پتلون قمیص پہننے کو دی۔ رات کے کھانے کا وقت ہو چلا تھا۔ دونوں نے اکٹھے ہی کھانا کھایا۔ والدہ تو سوئی ہوئی تھیں۔ گھر کے نوکر مہمان کا بگڑا ہوا چہرہ دیکھ کر شروع میں تو خوف زدہ ہوئے لیکن بتدریج ان کا خوف کم ہوگیا۔ شاہ زیب قطعی طور پر بے ضرر اور سیدھا سادہ بندہ نظر آتا تھا۔ کھانا کھانے اور اچھی سی چائے پینے کے بعد دونوں اسٹڈی میں آگئے اور باتیں کرنے لگے۔

گفتگو کے آغاز میں تو شاہ زیب کھچا کھچا رہا مگر پھر اسد کے مہرباں رویے نے اسے متاثر کیا اور اس نے اسد کو بتایا کہ وہ یہاں ایک لڑکی کی تلاش میں آیا ہے۔ اسے کسی کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ وہ لڑکی لاہور میں ہے اور اسی علاقے میں کہیں رہتی ہے۔

اسد نے شاہ زیب سے کہا "کیا میں اس لڑکی کے بارے میں کچھ پوچھ سکتا ہوں؟"

شاہ زیب نے بے خیالی میں اپنی پیشانی کے زخم کو چھوا اور ایک گہری سانس لے کر رہ گیا "پپ... پتا نہیں... کک... کیوں... آ آ آپ بڑے اپنے اپنے سے لگ رہے ہیں۔ جج... جج... جی چاہتا ہے کہ آ آ آپ سے... کک... کک... کچھ نہ چھپاؤں۔"

اسد نے کہا "مجھے بڑی خوشی ہوگی شاہ زیب! اگر میں تمہارے کسی کام آسکا تو۔"

ہمدردی پاکر شاہ زیب کی آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو چمک گئے۔ اس نے اپنے انداز میں ہکلا ہکلا کر غم زدہ لہجے میں اسد کو جو کچھ بتایا اس کا لب لباب یہ تھا۔

"ہم شروع سے فیض آباد میں رہتے ہیں۔ میرے والد پہلے کوٹھیاں بنانے کا کام کرتے تھے پھر انہوں نے ایک نسبتاً آسان کام اپنالیا اور پودوں کی ایک نرسری بنالی جس سے معقول آمدنی ہونے لگی۔ ہم تین بہن بھائی تھے، میں سب سے چھوٹا تھا اور سب کا لاڈلا تھا۔ ہمارے پڑوس میں ایک لڑکی شاہین رہتی تھی۔ ہم بچپن میں اکٹھے کھیلتے تھے۔ لڑکپن

کی حدود میں قدم رکھا تو ہمارے درمیان ایک اور طرح کا لگاؤ پیدا ہونے لگا۔ جب تک ہم دونوں دن میں ایک مرتبہ ایک دوسرے کو دیکھ نہ لیتے ہمیں بے قراری رہتی۔ ہماری آنکھیں ایک دوسرے کی تلاش میں بھٹکتی رہتیں اور کان آواز سننے کو ترستے رہتے۔ وقت گزرنے کے ساتھ یہ کیفیت شدید ہونے لگی۔ میرا دل کہتا تھا کہ میں تنہائی میں شاہین سے کچھ کہنا چاہتا ہوں لیکن کیا کہنا چاہتا ہوں یہ مجھے خود بھی معلوم نہیں تھا۔ شاید وہ بھی کچھ کہنا چاہتی تھی اور اسے بھی معلوم نہیں کہ کیا کہنا چاہتی ہے.... پھر ایک روز ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے اچانک مجھے شاہین سے بہت دور کردیا۔ ان دنوں میں دسویں میں پڑھتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے' اس روز اسکول میں موسم سرما کی چھٹیاں ہوئی تھیں' میں بہت خوشی خوشی گھر آرہا تھا۔ سڑک پار کرتے ہوئے ایک تیز رفتار ویگن نے مجھے ٹکر ماری۔ میرے بازو کی ہڈی ٹوٹی اور چہرہ شدید زخمی ہوگیا۔ مجھے اسپتال پہنچایا گیا جہاں میں کئی روز بے ہوش پڑا رہا.... میرا چہرہ پٹیوں میں لپٹا ہوا تھا اور بازو پر پلاستر تھا.... کئی روز بعد گھر آکر میں نے آئینہ دیکھا تو میرے سینے کے اندر جیسے کوئی شے چھناکے سے ٹوٹ گئی۔ میں اب خوب صورت شاہ زیب نہیں رہا تھا۔ اپنا چہرہ دیکھ کر خود مجھے ہی کراہت آرہی تھی.... اس کے بعد میرے لیے حالات بتدریج بدلتے چلے گئے۔ میں یاروں دوستوں سے دور دور رہنے لگا۔ کھیل کود سے دل اچاٹ ہوتا چلا گیا' گھر میں بھی بس کسی گوشے میں پڑا رہتا تھا یا پڑھتا رہتا تھا۔ سب کچھ ہی تو بدل گیا تھا میرے لیے' یہاں تک کہ شاہین بھی بدل گئی تھی۔ وہ مجھ سے کم کم ملنے لگی تھی۔ اب مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں پسندیدگی کی چمک نظر نہیں آتی تھی' بس ایک ہمدردی سی جھلکتی تھی۔ آہستہ آہستہ یہ ہمدردی بھی کم ہونے لگی۔ اگر وہ مجھے کہیں اکیلے میں دیکھتی تو ڈری سی جاتی۔ حادثے کے بعد میری زبان میں بھی لکنت آگئی تھی لہٰذا میں جو فیملی میں بہت باتونی مشہور تھا بالکل ہی گم صم رہنے لگا تھا۔ میرے لیے زندگی اس قدر اور اتنی تیزی سے بدلی تھی کہ مجھے یقین ہی نہیں آرہا تھا.... پھر آہستہ آہستہ میں نے زندگی کی اس نئی شکل کو قبول کرلیا۔ میرے دل و دماغ نے تسلیم کیا کہ اب میں وہ نہیں ہوں جو پہلے تھا۔ میرے لیے سب کچھ بدل چکا ہے اور اس "سب کچھ" میں شاہین بھی شامل ہے۔ میرا دل وہی تھا' دل میں پیار وہی تھا' ارمان اور خواہشیں وہی تھیں لیکن چہرہ وہ نہیں تھا اور جب چہرہ وہ نہیں تھا تو پھر کچھ بھی وہ نہیں تھا' کتنی عجیب بات تھی۔

دھیرے دھیرے ماضی کا سب کچھ آنسوؤں میں بہہ گیا مگر ایک چیز بہہ کر بھی نہ بہہ سکی اور وہ شاہین کی من موہنی صورت تھی۔ وہ میری یادوں میں زندہ رہی۔ کچھ عرصے بعد وہ لوگ راولپنڈی سے شفٹ ہو کر لاہور آگئے۔ میرے دل کی اجڑی ہوئی دنیا کچھ اور بھی اجڑ گئی۔ میں شاہین اور اس کی دنیا سے دور اپنی زندگی کا سفر اپنے ڈھنگ سے طے کرتا رہا' میں نے بی اے تک تعلیم حاصل کی' اس کے بعد کچھ عرصہ بیکار رہا آخر والد صاحب مجھے اپنے ساتھ نرسری پر لے جانے لگے۔ شاید وہ خود بھی سمجھ گئے تھے کہ میں زندگی کی دوڑ میں دوسروں کی طرح شریک ہونے کے قابل نہیں ہوں۔ اب میں پچھلے چار پانچ سال سے والد کے ساتھ ہی ہوں۔ والد اور والدہ کئی مرتبہ کہہ چکے ہیں کہ وہ میری شادی کرنا چاہتے ہیں لیکن میں نے ہر مرتبہ سختی سے انکار کردیا ہے۔ میں شادی کرنا نہیں چاہتا اور اس کی دو بڑی وجوہ ہیں۔ پہلی وجہ تو آپ کے سامنے ہی ہے' یعنی میری شکل.... میں نہیں سمجھتا کہ کوئی معقول لڑکی اپنی رضامندی اور دلی خوشی کے ساتھ میرے ساتھ نباہ کرسکے گی۔ وہ جو کچھ کرے گی اس کے پیچھے ہمیشہ ایک مجبوری رہے گی۔ میرے انکار کی دوسری وجہ شاہین ہی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ہم ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے جدا ہوچکے ہیں لیکن ایک ادھوری خواہش ہمیشہ میرے دل سے چمٹی رہتی ہے۔ ایک دو ان کہی باتیں ہیں جو پھانس بن کر میرے سینے میں چبھی ہوئی ہیں اور کبھی چین سے نہیں رہنے دیتیں۔"

یہاں تک بتا کر شاہ زیب نے ذرا توقف کیا۔ اپنی آنکھوں میں چمکنے والے آنسوؤں کو آستین سے صاف کیا اور کتنی ہی دیر کھوئی کھوئی نظروں سے فرش کو گھورتا رہا پھر اس نے ہکلاتے ہوئے بتایا "بس ایک بار.... ایک آخری بار شاہین سے ملنا چاہتا ہوں۔ اسے پاس سے اچھی طرح دیکھنا چاہتا ہوں۔ اسے بتانا چاہتا ہوں کہ میں خوفناک ضرور ہوں لیکن مجھ سے خوف کھانے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ میرے سینے میں آج بھی وہی دل موجود ہے جو ایک ننھی سی لڑکی سے پیار کرتا تھا اور اسے اپنا سب سے اچھا دوست سمجھتا تھا۔ میں اسے بڑی نرمی سے چھونا چاہتا ہوں.... اور اگر.... وہ اجازت دے تو اس کی پیشانی کو چومنا چاہتا ہوں اور دل کی گہرائیوں سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے دل میں اس کی نسبت سے کوئی شکوا کوئی گلہ نہیں ہے۔ میرا دل اسے ایک کامیاب اور پرمسرت زندگی کی دعا دیتا ہے اور ہمیشہ دیتا رہے گا۔ اس کے بعد میں اسے بڑی خوشی اور بڑے سکون کے ساتھ ہمیشہ کے لیے خدا حافظ کہہ دوں گا۔"

شاہ زیب کی پوری روداد اسد نے دلچسپی اور توجہ سے

سنی۔ شاہ زیب خاموش ہوا تو اسد سگریٹ کا گہرا کش لیتے ہوئے بولا "تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ شاہین لاہور میں ہے اور اسی علاقے میں رہائش رکھتی ہے؟"

شاہ زیب نے کہا "۔۔۔۔ میرا ایک دوست اطہر ہے' اس کی والدہ یہاں کچھ دن گنگا رام اسپتال میں داخل رہی ہے۔ وہ بھی والدہ کے ساتھ ہی چکوال سے یہاں آیا ہوا تھا اس نے شاہین کو دو تین مرتبہ اسی علاقے میں دیکھا ہے۔ اپنی سرخ واکس ویگن میں ایک مرتبہ وہ شادمان کے چوک کی طرف سے آ رہی تھی۔ دو مرتبہ وہ اپنی سرخ گاڑی میں ہی جناح باغ کے اوپن تھیٹر والے گیٹ کی طرف سے نکل رہی تھی۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ میرا دوست تینوں مرتبہ گاڑی کا نمبر نوٹ نہ کر سکا۔"

"اوہ مائی گاڈ!" اسد کے ہونٹ دائرے کی شکل میں سکڑ گئے "تت۔۔۔۔ تم اس سرخ گاڑی والی کی بات کر رہے ہو جو وہاں ایڈ منسٹریشن کے آفس میں کام کرتی ہے۔"

"کس آفس میں؟" شاہ زیب نے حیرت سے پوچھا۔

اسد اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا "یہ وہی لڑکی ہے ناں جس کے بال ڈیانا کٹ ہیں اور ہونٹوں کے بالکل پاس نمایاں تل بھی ہے؟"

"ہاں۔۔۔۔ ہاں یہ وہی ہوگی۔" شاہ زیب کی آنکھوں میں اور آس امید کے سیکڑوں دیے جل اٹھے "یہ وہی ہوگی۔ وہ ہمیشہ چھوٹے بال رکھتی ہے اور اس کے اوپر کے ہونٹ کے پاس تل بھی ہے۔"

"میں نے اسے دیکھا ہے۔ میں اس کی رہائش سے بھی واقف ہوں۔" اسد نے پورے وثوق سے کہا۔

شاہ زیب کے ہونٹ لرزتے چلے جا رہے تھے اور چہرے پر زلزلے کی سی کیفیت تھی۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا لیکن اس کی "لکنت کا شکار زبان" اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ اسد نے تسلی بخش انداز میں اور بڑے جوش سے اس کا کندھا دبایا۔ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا "میرا خیال ہے دوست! شاہین سے ملنے کی تمہاری یہ خواہش پوری ہو سکتی ہے۔"

شاہ زیب رونے لگا۔ اس نے سسکیاں لیتے ہوئے' اسد کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ ہکلاتے ہوئے بولا "میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر فراموش نہیں کروں گا۔"

☆☆☆

اسد اور شاہ زیب ایک صاف ستھرے اسنیک بار میں بیٹھے تھے۔ سڑک کی دوسری جانب تھوڑا سا دائیں رخ پر وہ کوٹھی واقع تھی جہاں شاہین کی رہائش تھی۔ یہ جگہ باغ جناح سے زیادہ دور نہیں تھی۔ اسد نے سرخ واکس ویگن کو کئی مرتبہ باغ جناح کی طرف سے آتے اور اس کوٹھی میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ اسد کو یقین تھا کہ سرخ گاڑی والی یہ لڑکی شاہین ہی ہے اور یہ بھی یقین ہے کہ وہ دونوں اس اسنیک بار میں بیٹھ کر جلد یا بدیر اس کی جھلک دیکھ سکیں گے۔ ممکن تھا کہ وہ گاڑی لے کر باہر نکلتی یا پھر ویسے ہی اپنی کوٹھی کے ٹیرس یا لان وغیرہ میں نظر آجاتی۔ شاہ زیب بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتا تھا اور لگتا تھا کہ اپنے دل کی بے ترتیب دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں مدت کی پیاس تھی۔

اچانک اسد کو چونکنا پڑا اور اس کے ساتھ ساتھ شاہ زیب بھی بری طرح چونک گیا۔ وہ دونوں اسنیک بار کے مین دروازے سے سڑک کے اس پار شاہین کی رہائش گاہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ شاہین کو دیکھنا چاہتے تھے۔۔۔۔ اور انہوں نے اسے دیکھ لیا مگر اپنی کوٹھی میں نہیں' اسنیک بار کے اندر۔ وہ گیلری میں سے سیڑھیاں اتر کر نیچے آ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان لڑکی بھی تھی۔ دونوں کسی بات پر ہنس رہی تھیں۔۔۔۔ اچانک شاہین کا منہ کھلا رہ گیا۔ وہ اپنی جگہ پتھر کی طرح ساکت ہو گئی تھی۔ اس کی نگاہیں شاہ زیب پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ جیسے اپنی نگاہوں پر یقین کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ چند لمحے بعد اس کے حسین چہرے پر خوف نمودار ہوا اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے وہ دہشت زدہ نظر آنے لگی۔ اس کی نوجوان ساتھی شدید الجھن کے عالم میں کبھی شاہین اور کبھی شاہ زیب کو دیکھ رہی تھی۔ شاہین نے اپنی ساتھی کا بازو پکڑا اور اسے تقریباً کھینچتے ہوئے اسنیک بار سے باہر لے گئی۔ دونوں باہر کھڑی ایک سفید سوزوکی میں بیٹھ گئیں۔ اسد نے شاہ زیب کو تو وہیں چھوڑا اور خود باہر آگیا۔ سفید سوزوکی پارکنگ لاٹ میں سے نکلی تو اسد کی ٹویوٹا کار بھی رینگتی ہوئی اس کے پیچھے نکل گئی۔ شاہ زیب اپنی جگہ ساکت و جامد بیٹھا رہ گیا۔ اس کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ اسے برسوں سے یہی اندیشہ تھا۔ اسے خطرہ تھا کہ وہ جب کبھی بھی شاہین کے سامنے جائے گا' وہ خوف زدہ ہو جائے گی۔

اسد کی واپسی قریباً ایک گھنٹے بعد ہوئی۔ اس نے مسکرا کر قدرے تسلی بخش انداز میں شاہ زیب کا کندھا تھپتھپایا' پھر دونوں باہر گاڑی میں آ بیٹھے اور گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ اسد نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے کہا "میں نے اس سے بات کی ہے۔"

"کس سے؟"

"ظاہر ہے کہ وہ شاہین ہی ہے' ورنہ ایک دوسرے کو دیکھ کر تم دونوں کا اتنا برا حال کیوں ہوتا۔"

"کک۔۔۔۔ کیا بات کی ہے آپ نے؟"

"میں نے اس کا بے معنی خوف دور کرنے کی کوشش کی

ہے۔ میں نے یہاں سے تھوڑی ہی دور چورا ہے میں اس کی گاڑی روک لی تھی اور اس سے درخواست کی تھی کہ وہ صرف دو منٹ کے لیے میری بات سن لے۔ وہ پہلے تو راضی نہیں ہوئی لیکن پھر شاید میری منت سماجت پر اسے ترس آگیا۔ اس نے گاڑی سڑک سے اتار کر روک دی..... میں نے کھڑے کھڑے دس پندرہ منٹ اس سے تبادلہ خیال کرلیا۔ میں کھڑکی پر جھکا رہا اور وہ گاڑی کے اندر بیٹھی رہی۔"

"کک..... کیا کہا آپ نے؟"

"وہی جو میں نے محسوس کیا ہے اور جو مجھے کہنا چاہیے تھا۔ وہ اتنے برسوں بعد اچانک تمہیں اپنے سامنے دیکھ کر پریشان ہوگئی تھی۔ میرا خیال ہے کہ اس کی جگہ کوئی بھی ہوتا اس کا یہی رد عمل ہوتا۔"

"آپ میرا دل رکھنے کی کوشش کررہے ہیں۔" شاہ زیب نے اٹک اٹک کر کہا "میں جانتا ہوں وہ سخت ڈر گئی ہے۔ اس نے یہی سمجھا ہوگا کہ میں اسے ڈھونڈتا ہوا اس کا پیچھا کرتا ہوا یہاں تک آگیا ہوں اور اب اس کے لیے سخت مشکلات پیدا کرنے والا ہوں۔"

"تم کسی حد تک ٹھیک کہہ رہے ہو' لیکن میں نے جو دس پندرہ منٹ اس کے ساتھ بات کی ہے وہ کافی مفید ثابت ہوئی ہے۔ اس کی جھجک کافی حد تک کم ہوئی ہے۔ مجھے یقین ہے شاہ زیب کہ اگر مجھے ایک آدھ مرتبہ مزید اس سے بات کرنے کا موقع مل گیا تو اس کے سارے اندیشے دور ہوجائیں گے اور وہ خود تم سے ملنے کی خواہش ظاہر کرے گی۔"

"نہیں' یہ کبھی نہیں ہوگا اسد صاحب۔" شاہ زیب سخت مایوسی کے عالم میں سر ہلاتے ہوئے بولا "میری صورت کی طرح شاید میری تقدیر بھی بگڑ چکی ہے۔ میں نے جب جب جو جو کچھ سوچا ہے' ہمیشہ اس کے الٹ ہی ہوا ہے۔" اس کی آنکھوں میں بے اختیار نمی تیرنے لگی تھی۔

اسد نے گاڑی چلاتے چلاتے بڑی محبت سے اس کا شانہ تھپکا "شاہ زیب' میں نے تمہارے اندر تمہارے خوب صورت دل کو پہچان لیا ہے' شاہین بھی ضرور پہچانے گی۔ وہ تو پہلے سے تمہیں اور تمہارے دل کو جانتی ہے۔ اس کے لیے پہچاننا تو اور بھی آسان ہے۔"

گھر آکر اسد نے شاہ زیب کو وڈیو پر ایک فلم دکھائی اور دل بہلانے کے لیے اسے دیر تک پائیں باغ میں گھماتا رہا۔ شاہ زیب اس گھر میں خود کو کافی مطمئن محسوس کررہا تھا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ یہاں اسے دیکھنے والے اور اس کے جسمانی عیب پر آنکھوں میں کراہت آمیز حیرت بھرلینے والے بہت کم تھے۔ اسد کی والدہ تھی اور دو ملازم تھے۔ اسد کی والدہ کو ویسے ہی بہت کم نظر آتا تھا۔ ملازمین نے پہلے پہل اسے تعجب خیز نظروں سے دیکھا تھا' بہرحال اب وہ اس کے عادی ہوگئے تھے۔ ان تین افراد کے علاوہ گھر میں کوئی اور نہیں تھا۔ اسد نے بتایا تھا کہ اس کی شادی ہوچکی ہے لیکن کسی معمولی نوعیت کی گھریلو ناراضگی کے سبب اس کی بیوی آج کل اپنے میکے میں تھی۔ اس کی غیر موجودگی میں اسد کی باگیں ڈھیلی تھیں۔ وہ اپنی مرضی سے گھر میں آتا تھا' مرضی سے جاتا تھا اور کبھی گھر میں بے تکلف دوستوں کی محفل بھی سجالیتا تھا۔ بہرحال شاہ زیب کی موجودگی میں ابھی تک کوئی محفل نہیں سجائی گئی تھی۔ شاید اسد کو خود بھی احساس تھا کہ شاہ زیب تنہائی پسند ہے اور اپنے گرد اجنبی افراد کی موجودگی اسے الجھن میں مبتلا کردیتی ہے۔

تین چار دن اسی طرح گزر گئے۔ اس دوران میں اسد نے شاہین سے ایک اور ملاقات کی تھی۔ اس ملاقات کا مکمل احوال تو اسد نے نہیں بتایا' تاہم یہ ضرور کہا کہ صورت حال بہتر ہوئی ہے۔ شاہین نے توجہ سے اس کی بات سنی ہے اور اس کے خدشات بھی کم ہوئے ہیں۔

ایک رات دوسرے پہر اچانک شاہ زیب کی آنکھ کھل گئی۔ اسے سخت پیاس محسوس ہورہی تھی۔ اس نے فریج سے پانی پیا۔ اچانک اسے باتوں کی مدھم آواز سنائی دی۔ اس نے ذرا آگے جاکر ایک ادھ کھلی کھڑکی سے کان لگائے یہ اسد کی آواز تھی۔ وہ دھیمے لہجے میں کسی سے فون پر بات کررہا تھا۔ شب کے سناٹے میں اس کی آواز وضاحت سے شاہ زیب کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا "پلیز..... ذرا سمجھنے کی کوشش کرو۔ انسان کا چہرہ بدلنے سے اس کا دل تو نہیں بدلتا۔ اس کا مزاج اس کا کردار اور اس کی خواہشات سب کچھ وہی رہتا ہے۔ اگر ہم اچانک اسے ایک اجنبی سمجھنے لگیں گے تو یہ بہت بڑی اخلاقی گراوٹ ہوگی....."

دوسری طرف سے کچھ کہا گیا۔ اسد دھیان سے سنتا رہا' پھر بولا "تم ٹھیک کہتی ہو شاہین۔ وہ سب کچھ ماضی کا حصہ ہے لیکن وہ بھی تو کوئی مختلف بات نہیں کہہ رہا تھا۔ وہ تم سے کچھ مانگ نہیں رہا۔ اپنے دل پر جبر کرکے وہ تمہارا سب کچھ تمہیں واپس لوٹا چکا ہے۔ وہ تو بس تمہاری زندگی سے چند لمحے مانگنے کے لیے آیا ہے۔ ایک دوست کی حیثیت سے' دو چار ان کہی باتوں کا بوجھ اپنے سر سے اتارنا چاہتا ہے شاید..... تم سے ایک بار مل کر اور چند باتیں کرکے وہ بڑے اطمینان سے واپس چلا جائے گا اور پھر شاید کبھی واپس نہیں آئے گا۔"

دوسری طرف سے پھر کچھ کہا گیا' جسے اسد سنتا رہا اور ہوں ہاں میں جواب دیتا رہا' آخر میں بولا "وہ بڑا سادہ مزاج ہے شاہین..... وہ ٹوٹے دل کے ساتھ یہاں آیا ہے' اگر ٹوٹے دل کے ساتھ ہی لوٹ گیا تو مجھے زندگی بھر افسوس رہے گا۔

پلیز... میں تم سے درخواست کرتا ہوں...“

اچانک کہیں پاس سے کھٹ پٹ کی آواز سنائی دی۔ شاید بلی تھی۔ شاہ زیب گھبرا کر اپنے بستر پر واپس چلا گیا۔ کچھ دیر بعد اسد کی آواز آنا بھی بند ہو گئی۔ اس نے فون رکھ دیا تھا۔

شاہ زیب کے دل پر بوجھ سا پڑ گیا تھا۔ اس نے جان لیا تھا کہ اس کا میزبان کتنی مشکل سے دو چار ہے۔ وہ اس کی خاطر اپنی جان جوکھم میں ڈال رہا تھا۔ اپنا قیمتی وقت ضائع کر کے شاہین سے ملاقاتیں کر رہا تھا۔ اس کو دلائل سے قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی منت سماجت میں مصروف تھا... لیکن وہ شاید اپنے موقف پر ڈٹی ہوئی تھی۔ شاہ زیب کا دل بجھ سا گیا۔ اس نے سوچا کہ کل جس وقت اسد آفس میں ہو گا وہ بڑی خاموشی کے ساتھ یہاں سے چلا جائے گا۔ شاہین کی پیشانی پر بوسہ دینا‘ اسے گلے سے لگانا تو دور کی بات تھی‘ وہ تو اس قابل بھی نہیں تھا کہ وہ اسے توجہ سے دیکھ ہی لیتی۔ اس سے ایک آدھ بات ہی کر لیتی۔ اس نے حتمی ارادہ کر لیا کہ وہ شاہین کے دیدار کی بھیک مانگنے کے لیے یہاں بن بلایا مہمان بن کر نہیں پڑا رہے گا۔ اپنی آخری نا تمام خواہش کا دکھ بھی اپنے ”درد خزانے“ میں جمع کرے گا اور یہاں سے چلا جائے گا۔

مگر اس روز عجیب بات ہو گئی۔ وہ اپنے ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ اسد کو نجانے کیسے شک پڑ گیا کہ شاہ زیب یہاں سے چپ چاپ نکل جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ آفس روانہ ہونے سے پہلے اس نے حسب معمول اپنی والدہ اور شاہ زیب کے ساتھ ایک ہی ٹیبل پر ناشتا کیا پھر اس کی والدہ تو چلی گئیں اور ٹیبل پر اسد اور شاہ زیب بیٹھے رہ گئے۔ اسد نے صاف گوئی کے انداز میں کہا ”شاہ زیب! آج میں تمہیں اپنے ساتھ ہی آفس لے جاؤں گا۔ میں تمہیں اپنا آفس دکھانا چاہتا ہوں۔ اس کے علاوہ مجھے یہ شک بھی ہے کہ تم کہیں خاموشی سے رفوچکر نہ ہو جاؤ۔ نہ میرے بھائی! اب کوئی ایسی حرکت نہیں چلے گی۔ میری ساری محنت برباد ہو جائے گی۔“

”لیکن...“

”لیکن ویکن کچھ نہیں۔“ اسد نے تیزی سے اس کی بات کاٹی پھر پیار سے ڈانٹتے ہوئے بولا ”تمہارے دل کی مراد پوری ہونے والی ہے۔ شاہین مان گئی ہے اور سچ پوچھو تو اس کے اپنے دل میں بھی تم سے ملنے اور باتیں کرنے کی خواہش موجود ہے لیکن وہ عورت ہے اور تمہیں پتا ہی ہے کہ عورت کتنی مجبور ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ جو کچھ تمہارے دل میں ہے بالکل وہی کچھ اس کے دل میں بھی ہو‘ مگر اپنے جذبے کے اظہار سے پہلے اس بے چاری کو سو بار سوچنا پڑے گا۔“

”اس کی... شش... شش... شادی ہو چکی ہے؟“

”ہاں۔ اس کا شوہر امریکا میں ملازمت کرتا ہے‘ اور پچھلے ایک سال سے وہیں پر ہے۔ وہ اپنے دفتر کی ایک کولیگ کے ساتھ اس کوٹھی میں رہتی ہے۔“

”کوئی بچہ ہے؟“

”نہیں۔“

”اور... شش... شاہین کے والدین؟“

”ان کے بارے میں تو معلوم نہیں۔ کل ملو گے تو خود ہی پوچھ لینا۔“

”کک... کل؟“ شاہ زیب کی آنکھوں میں ڈر اور شوق یوں اکٹھے ہوئے کہ ایک ہی چیز بن گئے۔ بدنما چہرے کے باوجود وہ بے حد معصوم نظر آنے لگا۔

○☆○

اگلا دن شاہ زیب کی زندگی کا حسین ترین اور یادگار ترین دن تھا۔ وہ شاہین کے گھر ان کے ڈرائنگ روم میں موجود تھا اور شاہین صرف چند فٹ کی دوری پر اس کے سامنے صوفے پر بیٹھی تھی۔ یہ وہی سہانا خواب تھا جو وہ دس پندرہ برس سے دن رات دیکھتا چلا آ رہا تھا ”آپ کیسے ہیں؟“ شاہین کی دل نشیں آواز شاہ زیب کے کانوں سے ٹکرائی۔

”بب بالکل... ٹھ... ٹھیک... اور... آ آپ؟“

”میں بھی بالکل ٹھیک ہوں۔ آنٹی اور انکل کیسے ہیں... اور آپ... آپ کیا کرتے ہیں آج کل؟“ وہ شرما رہی تھی اور چہرے پر قوس و قزح کے رنگ لہرا رہے تھے وہ خوف اب اس کے چہرے پر کہیں نظر نہیں آ رہا تھا جو اسنیک بار میں نظر آیا تھا۔ اس دیرینہ خوف کی جگہ ایک طرح کی شناسائی اور انسیت نے لے لی تھی۔ آج شاہ زیب کو شاہین کے چہرے پر دوستی اور قربت کا وہی جذبہ نظر آیا تھا جو کبھی فیض آباد میں نظر آیا کرتا تھا۔ وہ چھتیں وہ منڈیر وہ گلی کوچے اور بازار سب اسی کومل جذبے کے کومل رنگوں میں رنگے رہتے تھے۔ اسی لیے تو وہ ساری رنگین یادیں ابھی تک شاہ زیب کے دل و دماغ پر نقش تھیں۔

”آپ کہیں کھو گئے۔“ وہ ہولے سے مسکرائی اور اپنے چھوٹے چھوٹے بالوں کو ایک ادا کے ساتھ پیشانی سے ہٹایا۔

”نن... نہیں تو... مم... میں آپ کی... بب... بات سن رہا ہوں۔ مم... مم... میں نے پچھلے برسوں میں آ... آپ کو... بب... بہت... یا... یا... یا... یاد کیا ہے شاہین... مم... مجھے لگتا تھا... جج... جیسے آپ مجھ سے روٹھ... گگ گئی

ہیں۔۔۔ اور جب مجھے ایسے لگتا تھا تو پھر۔۔۔ مم۔۔۔ میں سوچتا تھا کہ مم۔۔۔ میرا چہرہ بگڑا ہے۔۔۔ تت۔۔۔ تت تو یہ میری غلطی ہے۔ حالانکہ ایسا تو نہیں تھا ناں؟" اس کا گلا رندھ گیا۔

"نہیں شاہ زیب! میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔ بس حالات ہی کچھ ایسے ہوگئے کہ ہم آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے گئے۔" شاہین کے لہجے میں ندامت پوشیدہ تھی۔

"مم۔۔۔ میں سچے دل سے کہتا ہوں۔ خدا کی قسم مم۔۔۔ مجھے۔۔۔ آ آپ سے کوئی شش۔۔۔ شش شکوا نہیں ہے۔ یہ مم۔۔۔ مم۔۔۔ میری قسمت تھی۔ بب۔۔۔ بس۔۔۔ ایک بار۔۔۔ آ آ آپ سے ملنے کو دل چاہتا تھا۔۔۔ آ آپ سے چند۔۔۔ بب۔۔۔ باتیں کرنے کو دل چاہتا تھا۔"

"سچ پوچھیں شاہ زیب تو میں بھی اکثر پرانے دنوں کو یاد کرتی رہی ہوں۔ انکل کو، آنٹی کو۔ آپ سب کو مس کرتی رہی ہوں۔"

اتنے میں ساتھ والے کمرے میں فون کی گھنٹی بجی۔ شاہین فون سننے کے لیے دوسرے کمرے میں گئی۔ اسد نے سرگوشی کے لہجے میں کہا "شاہ زیب! میں نے کہا تھا ناں کہ اگر تم اس کے بارے میں سوچتے رہے ہو تو وہ بھی ضرور سوچتی رہی ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بھی ایک بار تمہیں دیکھنا چاہتی ہو۔ اب قدرت نے تمہیں موقع دیا ہے اسے ضائع مت کرو۔ میں سگریٹ ڈھونڈنے کے بہانے تھوڑی دیر کے لیے باہر جا رہا ہوں۔ تم اپنے دل کی باتیں کھل کر شاہین سے کہہ سکتے ہو۔ دلیر بنو۔۔۔ اگر تمہارے دل میں کوئی چور نہیں تو پھر تمہیں گھبرانے کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔"

شاہ زیب روکتا ہی رہ گیا لیکن اسد اٹھ کر باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد شاہین فون سن کر واپس آگئی۔ اس نے اسد کے بارے میں پوچھا تو ملازمہ نے بتایا کہ وہ سگریٹ لینے کے لیے نکلے ہیں ابھی تھوڑی دیر میں آجاتے ہیں۔ ملازمہ چائے وغیرہ بنانے چلی گئی تو شاہ زیب اور شاہین کمرے میں اکیلے رہ گئے۔ دونوں ماضی کی یادوں کو تازہ کرنے لگے۔ یہ سلسلہ چلا تو دونوں جیسے گزرے دنوں کے دھندلکے میں کھو سے گئے۔ ایک ایک بات ایک ایک واقعہ یاد کیا گیا۔ جو سوال برسوں سے ذہن میں تھے ان کے جواب ملے، جو ان کہی باتیں دل و دماغ کو الجھن میں مبتلا کرتی تھیں وہ کہہ دی گئیں۔ بس چھوٹی چھوٹی باتیں تھیں، عام نوعیت کے سوال و جواب تھے۔

شاہ زیب ایک صاف گو شخص کا نام تھا۔ اس نے اپنے اور شاہین کے حوالے سے کوئی بات بھی دل میں نہیں رکھی۔ صاف بتایا کہ وہ اسے کیسے کیسے یاد کرتا رہا ہے۔ کس کس موقع پر اسے کس کس طرح مس کرتا رہا ہے۔ وہ بے تکلفی سے بتاتا رہا اور وہ بے تکلفی سے سنتی رہی۔ وہ خوابیدہ لہجے میں بولا "شاہین! جن دنوں ہم بچھڑے، میں تمہیں پسند کرتا تھا۔ اس پپ۔۔۔ پسند کو میں کوئی نن۔۔۔ نام پہلے دے سکتا تھا اور نن۔۔۔ نہ اب دے سکتا ہوں۔ بب۔۔۔ بس تم مجھے پسند ہو، اور ہم۔۔۔ ہم۔۔۔ ہمیشہ رہو گی۔ جن دنوں ہم اکٹھے ہو۔۔۔ ہو۔۔۔ ہوتے تھے۔۔۔ مم۔۔۔ میں اکثر سوچا کرتا تھا، اگر ہمیں ایک دو۔۔۔ دوسرے سے دور ہونا پڑا۔۔۔ مم۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ بب۔۔۔ بچھڑ کر زندہ رہنا پڑا۔۔۔ تت۔۔۔ تو میں تمہیں۔۔۔ بب۔۔۔ بڑے اچھے طریقے سے رخصت کروں گا، اور۔۔۔ اور۔۔۔ اور ہنستے چہرے کے ساتھ رخصت کروں گا۔ بب۔۔۔ بغیر کسی شش شکوے شکایت کے۔۔۔ ان دنوں ایک۔۔۔ گگ۔۔۔ گیت اکثر مم۔۔۔ میرے کانوں میں گونجا کرتا تھا۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ تمہیں بھی بہت پسند تھا۔۔۔ یاد ہے ناں وہ نن۔۔۔ نن۔۔۔ نظم؟"

"ہاں۔" شاہین نے اثبات میں سر ہلایا "ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو۔ ہمیں تتلیوں کے جگنوؤں کے دیس جانا ہے۔"

"ہاں۔۔۔ یہی نن۔۔۔ نظم۔" شاہ زیب نے تصدیق کی۔ کھوئے کھوئے لہجے میں بولا "مم۔۔۔ میرا دل چاہتا تھا، جب کبھی تت۔۔۔ تم مجھ سے جدا ہونے لگو، میں اپنے آنسوؤں کے

پیچھے سے مم... مسکرا کر تمہاری طرف دیکھوں... تت تمہاری پیشانی کو چوموں اور بب... بڑے خلوص کے ساتھ ہمیشہ کے لیے خوب... خوب... خدا حافظ کہہ دوں۔"

شاہین کی خوب صورت آنکھوں میں آنسو جھلملا گئے۔ ان آنسوؤں میں ندامت بھی تھی اور اس کے علاوہ ایک شکوا تھا۔ یہ شکوا اکثر اس کے ذہن میں ابھرا کرتا تھا۔ معلوم نہیں یہ شکوا کس سے تھا؟ حالات سے؟ اپنے آپ سے؟ یا اس حادثے سے جس نے ان دونوں کو جدا ہونے پر مجبور کردیا تھا۔ جسم کی ثانویت اور روح کی اولیت کو سمجھتے بوجھتے بھی وہ شاہ زیب سے گریز پر مجبور ہوگئی تھی۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا' لیکن ایسا ہوا تھا۔

"مم... میں... تمہیں چھونا چاہتا ہوں شاہین۔" شاہ زیب کے ہونٹوں سے جذبات سے بوجھل آواز نکلی۔

شاہین کی پلکیں لرز کر جھک گئیں۔ ایک کرشماتی لمحے نے اس کے چہرے پر آمادگی اور خود سپردگی کا تاثر سجا دیا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ درمیان میں صرف دو فٹ کا فاصلہ رہا ہوگا۔ نہایت جذباتی انداز میں شاہ زیب آگے بڑھا اور اس کے ہونٹ شاہین کی پیشانی پر ثبت ہوگئے۔ اس کی پیشانی چوم کر وہ پیچھے ہٹا تو دونوں کی آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔ شاہین بے اختیار اس کے گلے سے لگ گئی۔ شاہ زیب نے اسے بازوؤں میں لے لیا۔ وہ ہچکیوں سے رونے لگی۔ روتے روتے اس نے پیچھے ہٹ کر الوداعی نظروں سے شاہ زیب کو دیکھا اور ایک بار پھر اس کے گلے سے لگ گئی۔ اس عمل کو کسی بھی رشتے... یا تعلق کے ساتھ منسلک نہیں کیا جاسکتا تھا' بس یہ خالص پیار کا عمل تھا۔

دونوں پیچھے ہٹ گئے۔ ایک کہنہ سال' دیرینہ بوجھ تھا جو آنسوؤں کے ساتھ ہی ان کے دل و دماغ سے ڈھل گیا تھا۔ شاید وہ دونوں ہی اپنے آپ کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگے تھے۔

"مم... میں بدنما ضرور ہوں شاہین... لل... لیکن خوفناک نہیں ہوں۔" وہ آہستگی سے بولا۔

شاہین کی نگاہیں بتا رہی تھیں کہ وہ شاہ زیب کی بات سے مکمل اتفاق کررہی ہے۔

○☆○

شاہ زیب واپس جارہا تھا۔ اسد اسے الوداع کہنے کے لیے ریلوے اسٹیشن پر موجود تھا۔ وقتِ رخصت شاہ زیب نے اسد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھاما اور جذباتی لہجے میں بولا "مم... میں آپ کا یہ احسان... زند... زندگی بھر بھلا نہ سکوں گا۔ مم... میری دعا ہے کہ... جج جس طرح آپ نے مم... مجھے خوشی دی ہے' خو... خدا آپ کو بھی خوشی دے آپ کا دل اور گھر آباد ہوجائے۔"

اسد نے کہا "میں تمہارا مطلب سمجھ رہا ہوں۔ تمہاری خواہش ہے کہ میری روٹھی ہوئی بیگم گھر واپس آجائے اور میرے سائیں سائیں کرتے گھر میں پھر سے رونق ہوجائے۔"

شاہ زیب نے اثبات میں سرہلا دیا۔

"میرا خیال ہے کہ تمہاری دعا ضرور قبول ہوگی۔" اسد نے کہا "پچھلے دنوں اپنی بیگم سے میری دو چار ملاقاتیں ہوئی ہیں۔ ان ملاقاتوں کی وجہ سے ہماری کشیدگی کافی حد تک کم ہوگئی ہے۔ مجھے امید ہے کہ اب وہ دو چار دن میں گھر آجائے گی۔"

"یہ... یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ لل... لیکن یہ ہوا کیسے؟"

"دراصل ایک اتفاق کے تحت ہم دونوں کو اکٹھے ایک پروجیکٹ پر کام کرنا پڑ گیا تھا۔"

"پپ... پروجیکٹ؟"

اسد ہولے سے مسکرایا "ہاں پروجیکٹ۔ یہ ایک بہت سادہ اور بہت پیارے شخص کی دل جوئی کا پروجیکٹ تھا' اسے ایک دیرینہ بوجھ سے آزاد کرانے کا پروجیکٹ۔"

شاہ زیب حیرت سے اس کی طرف دیکھتا چلا جارہا تھا۔ بات کچھ کچھ اس کی سمجھ میں آنا شروع ہوگئی تھی۔

اسد نے اثبات میں سرہلاتے ہوئے کہا "ہاں شاہ زیب! شاہین ہی میری روٹھی ہوئی بیوی ہے۔"

"آ... آپ نے تو... آ... آپ نے تو...؟" وہ ہکلا کر رہ گیا۔

"شاہ زیب! میں نے تم سے جھوٹ بولا تھا کہ شاہین کا شوہر امریکا میں رہتا ہے۔ اس حوالے سے دیگر باتیں بھی جھوٹ ہی تھیں۔ میں نے یہ جھوٹ اپنی اور تمہاری آسانی کے لیے بولے تھے۔ مجھے امید ہے کہ اس کے لیے تم مجھے معاف کردو گے۔"

"اوہ خدایا! آپ نے... مم میری خاطر اپنی بیوی کو... اپنی بیوی کو..." وہ ایک بار پھر ہکلا کر رہ گیا۔

"میں نے کچھ نہیں کیا ہے میرے دوست۔ میں نے صرف تمہارے اندر کے خوب صورت انسان کو پہچانا ہے۔ اگر تم مجھے اس کا کریڈٹ دینا چاہو تو بخوشی دے سکتے ہو۔"

شاہ زیب حیرت سے اس کی طرف دیکھتا چلا جارہا تھا' پھر وہ بے ساختہ اس سے لپٹ گیا۔

طاہر جاوید مغل

فن کی بلندیوں کو چھونا کسی بھی فن کار کی وہ تمنا ہوتی ہے جس کی خاطر وہ اپنا آپ بھی داؤ پر لگانے کو تیار رہتا ہے۔ وہ بھی ایک اداکارہ تھی اور ایک لافانی کردار ادا کرنا چاہتی تھی مگر اسے اس کا موقع کچھ عجیب انداز میں ملا۔

جدوجہد آزادی فلسطین کے پس منظر ایک دکھیاری ماں کا قصہ

دوستی اور محبت وغیرہ کے لیے ضروری نہیں ہوتا کہ فریقین میں ایک جیسی خصوصیات پائی جاتی ہوں۔ بعض اوقات جیون بھر ایک رشتے میں منسلک رہنے والے لوگ اپنے مزاج اور عادات کے لحاظ سے بہت مختلف ہوتے ہیں۔ کچھ یہی حال باقر مشعال اور اُم ریاض کا تھا۔ دونوں پچھلے قریباً پینتیس سال سے میاں بیوی کی حیثیت سے زندگی گزار رہے تھے۔ تاہم ان کے نظریات اور معمولات وغیرہ میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہ ایک دوسرے سے بہت محبت بھی کرتے تھے۔ ہر دکھ سکھ میں شریک بھی رہتے تھے لیکن اس کے باوجود کئی لحاظ سے ایک دوسرے سے دور بھی تھے۔

باقر مشعال الازہر یونیورسٹی سے فارغ التحصیل تھے۔ وہ ایک فلسطینی اخبار سے منسلک تھے اور آزادی کی تحریکوں میں بھرپور دلچسپی لیتے تھے۔ وہ غزہ میں اپنے خوش نما گھر میں اُمِ ریاض اور اپنے اٹھارہ سالہ بیٹے وقاص کے ساتھ رہتے تھے۔ بڑے تین بیٹوں میں سے دو کی شادی ہو چکی تھی جبکہ ایک بیٹا عرصۂ دراز سے لاپتا تھا۔

اپنے خاوند کے برعکس ام ریاض زیادہ مذہبی نہیں تھی۔ وہ فیشن کے مطابق لباس پہنتی تھی۔ عربی کے بجائے اکثر انگریزی میں بات کرتی تھی۔ فنونِ لطیفہ سے اسے خصوصی لگاؤ تھا۔ شادی کے دو سال بعد ہی اپنے شوہر کی اجازت سے اس نے ٹی وی پر ایک ڈاکومینٹری فلم میں کام کیا تھا۔ اس کے بعد یہ سلسلہ چل نکلا تھا۔ ام ریاض کو ٹی وی پر کام ملنے لگا تھا۔ اگلے چند برسوں میں اس نے درجنوں ٹیلی فلموں اور اسٹیج ڈراموں میں کام کیا تھا اور ایک جانی پہچانی شخصیت بن گئی تھی۔ بہر حال شوبز سے وابستہ ہونے کے باوجود ام ریاض ایک باوقار اور سنجیدہ خاتون ہی نظر آتی تھی۔

یہ بات نہیں تھی کہ ام ریاض کو اپنے شوہر کے ''کاز'' سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ بیشتر فلسطینیوں کی طرح وہ بھی فلسطین کی آزادی چاہتی تھی۔ اپنے انٹرویوز میں وہ اکثر اس حوالے سے بات کرتی نظر آتی تھی۔ اس نے پروڈیوسروں سے خصوصی فرمائش کر کے چند ایسے PLAYS میں بھی کام کیا تھا جن کا موضوع فلسطین کی آزادی تھا۔ بہر حال یہ بھی حقیقت تھی کہ وہ اپنے شوہر کی طرح آزادیٔ فلسطین کی سرگرم کارکن نہیں تھی۔

بچوں میں سے تیسرے نمبر کا بیٹا سو فیصد اپنے والد کے نقشِ قدم پر چلا تھا بلکہ اس سے بھی آگے نکل گیا تھا۔ اس کا نام احسن طلال تھا۔ وہ ماں باپ کو پیارا بھی بہت تھا۔ احسن لڑکپن میں ہی ایک جہادی تنظیم سے وابستہ ہو گیا تھا۔ پھر مشعال اور امِ ریاض کو پتا ہی نہیں چلا کہ کب وہ اسرائیلی ٹینکوں کو پتھر

مارتے مارتے ان پر گولیاں چلانے لگ گیا ہے...... وہ اپنے راستے پر بڑی تیزی سے آگے بڑھتا چلا گیا تھا۔ جلد ہی اسے روپوش ہونا پڑا تھا۔ یوں وہ اپنے گھر اور اپنے والدین سے بہت دور چلا گیا تھا۔

مشعال اور ام ریاض سے احسن کی ملاقات بس کبھی کبھار ہی ہوتی تھی۔ یہ خفیہ ملاقات ہوتی تھی۔ ان ملاقاتوں میں تسلسل بھی نہیں تھا۔ کبھی چند دن کے وقفے سے اوپر تلے کئی ملاقاتیں ہو جاتی تھیں۔ کبھی پورا پورا سال گزر جاتا تھا اور انہیں احسن کی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ احسن اب مکمل طور پر ایک ''مجاہد'' کی شخصیت میں ڈھل چکا تھا۔ اس نے مکمل عسکری تربیت حاصل کی تھی۔ گوریلا وار کے سارے داؤ پیچ اسے آتے تھے۔ اس نے اپنی تنظیم کی ہی ایک ساتھی لڑکی سے شادی بھی کر لی تھی۔ شروع شروع میں اسرائیلیوں نے مشعال اور اس کے اہل خانہ کو خاصا تنگ کیا تھا۔ وہ اکثر مشعال یا اس کے کسی بیٹے کو پکڑ کر لے جاتے تھے اور ہراساں کرتے تھے۔ مشعال کے بیٹوں سے پوچھ گچھ کے دوران میں مار پیٹ بھی کی جاتی تھی۔ ان کے گھر کو بارود سے اڑانے کی دھمکیاں دی جاتی تھیں اور وہ سارے ہتھکنڈے استعمال کیے جاتے تھے جو رائج تھے لیکن پھر دھیرے دھیرے یہ سلسلہ کم ہو گیا تھا۔ فوجیوں نے بتدریج یہ باور کر لیا تھا کہ مشعال اور اس کے اہلِ خانہ کا احسن سے کوئی براہِ راست تعلق نہیں ہے۔

☆☆☆

وقت اپنی مخصوص رفتار سے چلتا رہا۔ مشعال نے آزادیٔ فلسطین کے لیے اپنا قلمی جہاد جاری رکھا۔ وہ اب پی ایچ ڈی کر چکے تھے اور انہیں ڈاکٹر مشعال بھی کہا جاتا تھا۔ دوسری طرف ام ریاض بھی اپنے کام میں مگن رہی۔ وہ ایک جانی پہچانی شخصیت تھی۔ لبنانی ٹی وی پر ایک طویل سیریل میں کام کرنے کے بعد اس کی شہرت میں اضافہ ہوا تھا۔ وہ سنجیدہ اور اصلاحی رول کرتی تھی۔ غم واندوہ کے کرداروں میں تو وہ یوں ڈوب جاتی تھی کہ افسانے پر حقیقت کا گمان ہونے لگتا تھا۔ شاید اس زبردست کردار نگاری میں ام ریاض کے ذاتی دکھ کا بھی عمل دخل تھا۔ احسن کی جدائی کا دکھ ام ریاض کی شخصیت کا حصہ بن چکا تھا۔ کبھی وقت جب وہ موڈ میں ہوتی تو اپنے شوہر سے کہتی ''مشعال' کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ کسی ایسی کہانی میں کام کروں جو ہمارے اور احسن کے حالات کا عکس ہو...... اگر مجھے کوئی ایسا کردار مل گیا تو دیکھنا' میں اسے اپنی اداکاری سے یادگار بنا دوں گی۔''

''لیکن کردار ملے گا تو تب ہے نا...... موجودہ حالات میں اس قسم کا رسک کون لیتا ہے۔ ہر شخص آسانیاں چاہتا ہے۔ میں تو کہتا ہوں بس وہی عشق و محبت کی بنی بنائی کہانی ہے جو ہم برسوں سے ٹی وی اور سینما وغیرہ کی اسکرین پر دیکھ رہے ہیں۔''

''یہ بات نہیں ہے مشعال!'' ام ریاض فوراً شوہر کی بات کی تردید کرتی ''شوبز میں ایسے لوگ موجود ہیں جن کے دل میں تڑپ ہے۔ وہ اپنے وسائل اور اپنی حدود میں رہتے ہوئے کوشش کرتے رہتے ہیں...... لیکن...... مسئلہ یہ ہے کہ تم ٹی وی دیکھتے ہی بہت کم ہو۔''

''چلو' ہم بھی دیکھیں گے' جب کوئی ایسا کردار کرو گی۔''

''اگر کردار نہ ملا تو میں خود ڈراما پروڈیوس کروں گی' تم دیکھ لینا'' ام ریاض غصے سے کہتی۔

لیکن بندے کی ساری خواہشیں تو پوری نہیں ہوتیں۔ وقت گزرتا رہا۔ ام ریاض کی عمر اب ڈھل رہی تھی۔ وہ کچھ بیمار بھی رہنے لگی تھی۔ اسے دمے کی شکایت ہو جاتی تھی۔ اسٹیج پلے تو کام ہی ''آواز کے دم خم'' کا ہے۔ ام ریاض زور سے بولتی تھی تو اس کا دم اکھڑنے لگتا تھا۔ بتدریج اسٹیج پلے اس سے چھوٹ گئے۔ ٹی وی پر بھی اب وہ پہلے سی پذیرائی نہیں تھی۔ سچ کہتے ہیں کہ ہر صبح کی شام ہوتی ہے اور ہر عروج کو زوال آتا ہے۔ ام ریاض بھی اب روبہ زوال تھی۔ پھر ایک وقت آیا جب اس کی تکلیف زیادہ بڑھ گئی...... سردیوں کے دن تھے۔ ام ریاض کے لیے بولنا تک محال ہو گیا۔ اس کی تکلیف کو بڑھاوا دینے میں کچھ عمل دخل اردگرد کے حالات کا بھی تھا۔ تقریباً ایک برس بیت گیا تھا کہ احسن سے ان کی کوئی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ ایک دو خبریں ایسی بھی ملی تھیں جن سے یہ روح فرسا شبہ ہوتا تھا کہ شاید وہ موساد یا اسرائیلی فوجیوں کے ہاتھوں شہید ہو گیا ہے لیکن پچھلے ماہ ایک بار پھر اس کی شہادت کی تردید ہو گئی تھی۔ احسن کو ''صابرہ'' کے علاقے میں دیکھا گیا تھا۔ وہاں وہ ایک اسرائیلی فوجی کو ہلاک اور دو کو زخمی کر کے بھاگ گیا تھا۔ درحقیقت پچھلے دو ڈھائی سال سے احسن اسرائیلیوں کے لیے چھلاوا بنا ہوا تھا۔ وہ اسرائیلی انتظامیہ کو مطلوب افراد کی فہرست میں بہت اوپر آ گیا تھا۔ اس کے بارے میں کوئی اطلاع ملتی تھی' اسرائیلی پوری تیاری کے ساتھ چھاپا مارتے تھے' انہیں توقع ہوتی تھی کہ اس مرتبہ وہ ٹی وی پر اس کی لاش کی نمائش کر سکیں گے لیکن ہاتھ کچھ نہیں آتا تھا۔ یہ بھی سنا گیا تھا کہ وہ مختلف روپ بدلتا ہے۔ کبھی داڑھی کے ساتھ' کبھی لمبے بالوں کے ساتھ اور کبھی کسی ادھیڑ عمر شخص کی صورت میں نظر آتا ہے۔ وہ بڑی دلیری کے ساتھ ایسے

علاقوں میں گھس جاتا تھا جہاں اس کی موجودگی کے بارے میں سوچا بھی نہیں جاسکتا' اطمینان سے کارروائی کرتا اور ''پکڑنے والوں'' کی آنکھوں میں دھول جھونک کر نکل جاتا۔

پچھلے نومبر میں احسن اور اس کے ساتھیوں نے گھات لگا کر ایک فوجی ٹرک پر فائرنگ کی تھی۔ اس واقعے میں ایک کیپٹن سمیت تین اسرائیلی ہلاک ہوئے تھے۔ نتیجے میں اسرائیلیوں نے شدومد کے ساتھ احسن کو ڈھونڈا تھا۔ غیظ و غضب کی لہر میں وہ احسن کے بڑے بھائی سفیان کو بھی اٹھا کر لے گئے اور کئی دن تک ذہنی اور جسمانی اذیت کا شکار رکھا۔ پھر ایک دن خبر آئی کہ احسن کو ''رملہ'' کے قریب اِن کاؤنٹر میں شہید کردیا گیا ہے۔ اخباروں میں اس واقعے کی نمایاں خبریں آئیں لیکن دو روز بعد ہی اس خبر کی بھی تردید ہوگئی۔ معلوم ہوا کہ جاں بحق ہونے والا الفتح کا ایک رکن تھا۔ اس کی صورت اور جسامت وغیرہ احسن سے ملتی جلتی تھی۔

ایک روز جب ام ریاض اپنے بیڈروم میں لیٹی مسلسل کھانس رہی تھی۔ ڈاکٹر مشعال اندر داخل ہوئے۔ ام ریاض کے قریب بیٹھ کر انہوں نے اپنا ہاتھ اس کی جلتی پیشانی پر رکھ دیا اور بولے ''تمہارے لیے ایک اچھی خبر ہے۔ احسن نے اپنے دوست ابونصیر سے فون پر بات کی ہے۔ وہ اومان سے بول رہا تھا۔''

''سچ'' ام ریاض کی آنکھوں میں خوشی کے چراغ جل اٹھے۔

''تو کیا میں تم سے جھوٹ بولوں گا'' ڈاکٹر مشعال نے کہا۔ ''آج ابونصیر خود مجھے بتانے کے لیے آیا تھا۔''

''کیا کہا اس نے؟'' نا تواں ام ریاض اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''وہ بتا رہا ہے کہ احسن اور اس کے ساتھیوں نے ایک اچھا فیصلہ کرلیا ہے۔ وہ اب کچھ عرصے کے لیے اردن کے مضافاتی علاقے میں روپوش ہو رہے ہیں۔''

''او مائی گاڈ!'' ام ریاض نے سینے پر ہاتھ رکھا'' کاش ایسا ہی ہو۔''

ڈاکٹر مشعال نے ایک گہری سانس لی اور بولے۔ ''ابونصیر کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ احسن اب ڈیڑھ دو سال کے لیے مکمل خاموشی اختیار کرے گا۔ یہ بات وہ بھی اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کی تلاش کی سرگرمیاں بہت زور پکڑ گئی ہیں۔ ایسی صورتِ حال میں اس کا کچھ دیر کے لیے منظر سے ہٹنا ہی بہتر ہے۔''

ام ریاض خاموش بیٹھی رہی۔ اس کی آنکھوں کے گوشے

بھیگ گئے۔ پھر ان بھیگے گوشوں سے دو موتی نمودار ہوئے اور اس کے زرد رخساروں پر لڑھک گئے۔ کھڑکیوں سے باہر ایک سرد شام دھیرے دھیرے پر پھیلا رہی تھی، ہوا میں زرد پتوں کی کھڑکھڑاہٹ تھی۔ ام ریاض نے تکیے سے ٹیک لگائی اور بولی ''مشعال! میں نے بہت کام کیا ہے۔ سیکڑوں کردار ادا کیے ہیں لیکن ایک کردار اب بھی مجھ پر قرض ہے۔ ایک یادگار کردار...... میں اس کردار میں ڈوب کر امر ہو جانا چاہتی ہوں۔ ایک دکھیاری فلسطینی ماں کا کردار...... میں چاہتی ہوں کہ میرے مرنے کے بعد جب بھی تم اسکرین پر یہ کردار دیکھو، تمہاری آنکھوں میں آنسو آ جائیں اور تم مجھے بار بار معاف کرنے پر مجبور ہو جاؤ۔ میں جانتی ہوں، میں نے ساری زندگی تمہارے ''کاز'' کے لیے کچھ نہیں کیا۔ اپنے حال میں مست رہی ہوں لیکن ایک یادگار کردار میں جان ڈال کر اور اسے امر بنا کر میں اپنی ساری کوتاہیوں کا مداوا کر دینا چاہتی ہوں۔''

''تمہاری حالت اب ایسی نہیں ہے ڈیئر! کہ تم کوئی ایسا بوجھ اٹھا سکو۔''

''نہیں مشعال! میں اٹھا سکتی ہوں...... اگر میں نہ اٹھا سکی تو شاید چین سے مر بھی نہ سکوں۔ پلیز، تم کسی طرح میری مدد کرو۔''

مشعال کے ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ ابھری ''میں کیا کروں؟''

ام ریاض کی آنکھیں گہری سوچ میں ڈوب گئیں۔ کچھ دیر بعد وہ بولی ''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں بھی کسی طرح اردن پہنچ جاؤں۔''

''تمہارا دماغ خراب ہے۔ تم اپنی حالت دیکھو۔ ارد گرد کے حالات دیکھو۔''

''نہیں مشعال! ابھی نہیں...... کچھ دیر بعد...... ہم دو چار مہینے انتظار کرتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس دوران میں احسن کی تلاش کا کام ٹھنڈا پڑ جائے گا۔ پھر تم مجھے کسی طرح چپکے سے وہاں لے جانا۔''

''وہاں کیا ہوگا؟''

''وہاں میرا پرانا پروڈیوسر حسنات غزالی کام کر رہا ہے۔ میں اس سے کہوں گی کہ وہ میرے لیے جلدی سے کوئی کہانی ڈھونڈے...... بلکہ میرا خیال ہے...... میرا خیال ہے کہ اس کے پاس ایک دو کہانیاں موجود بھی ہوں گی۔ تمہیں پتا ہی ہے کہ اس نے پچھلے دنوں فلسطینی پولیس کے حوالے سے ایک زبردست ٹیلی فلم پیش کی تھی...... اگر میں نے......''

ایک دم ام ریاض کو کھانسی کا دورہ پڑا اور اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ وہ جب جذباتی لہجے میں بات کرتی تھی، ایسا ہی ہوتا تھا۔ مشعال نے اس کے گلے پر مساج کیا۔ اسے نیم گرم پانی پلایا اور اسے سہارا دے کر سیدھا لٹا دیا۔

کچھ دیر خاموشی رہی پھر مشعال اسے سمجھانے والے انداز میں بولا ''دیکھو ڈیئر! تمہاری حالت ایسی نہیں ہے کہ تم لمبی چوڑی منصوبہ بندیاں کرو اور میری بات کا برا نہ ماننا، تمہیں یہ بات مان لینی چاہئے کہ اب اسٹیج، ٹی وی وغیرہ پر تمہاری ''طلب'' ختم ہو چکی ہے۔ بے شک ایک وقت تھا کہ تم حسنات جیسے لوگوں سے اپنی من پسند کہانی میں من پسند کردار لے سکتی تھیں لیکن اب شاید ایسا نہ ہو سکے اور بالفرض محال ہو بھی جائے تو کیا تم اس قابل ہو کہ ایسے کسی کردار سے انصاف کر سکو...... پلیز ڈیئر! پلیز...... اب اپنے حالات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔''

''میں تو سمجھ رہی ہوں...... لیکن تم نہیں سمجھ رہے، میں کفارہ چاہتی ہوں اور یہ اسی طرح ادا ہو سکے گا۔ چاہے چھوٹا سا کردار ہی ہو لیکن یادگار ہو...... ایک بے مثال کردار نگاری...... ایک ماسٹر پیس، ہاں ایک ماسٹر پیس......'' وہ وجد میں بولتی چلی گئی۔ اس کی آنکھیں کہیں دور دیکھ رہی تھیں اور ہونٹ ہل رہے تھے ''مشعال...... پلیز، پلیز...... مجھے ایسا کرنے دو۔ ممکن ہے کہ اومان میں، میں احسن کو بھی دیکھ سکوں۔ میں احسن کو دیکھ لوں گی تو میرے اندر بڑی توانائی آ جائے گی۔ میں گھنٹوں کیمرے کے سامنے کھڑی ہو سکوں گی۔ تم دیکھ لینا، میں ایسا کر گزروں گی۔ احسن میرے آس پاس ہوگا تو میرا کردار خود بخود بول اٹھے گا۔ اس میں زندگی دوڑ جائے گی۔ وہ بے مثال بن جائے گا...... یادگار...... ماسٹر پیس، ہاں مشعال! ماسٹر پیس۔''

''خواب و خیال کی باتیں مت کرو ڈیئر!'' مشعال نے ہولے سے اس کے بالوں کو سہلایا۔ ''انسان جب انہونیوں کے پیچھے بھاگتا ہے تو خود کو اذیتوں کے سپرد کر دیتا ہے...... میں یہ نہیں چاہتا کہ تم سوچنا چھوڑ دو لیکن وہ سوچو جو تمہارے دائرۂ اختیار میں آ سکے۔''

☆☆☆

ڈاکٹر مشعال نے ٹھیک کہا تھا۔ اگلے دو تین ماہ میں ارم ریاض کی حالت سنبھلنے کے بجائے مزید خراب ہوئی۔ اسے کثرت سے ''ان ہیلر'' استعمال کرنا پڑتا تھا اور وہ مسلسل دوائیں بھی لے رہی تھی۔ ڈاکٹروں نے اسے مکمل آرام کا مشورہ دے رکھا تھا۔ لیکن اس کے اندر جیسے کوئی لہر بار بار اٹھتی تھی اور اس کے سکون کو اتھل پتھل کر دیتی تھی۔ اپنے اندر

امنگ ترنگ زندہ رکھنے کے لیے وہ اکثر ویڈیو پر اپنے پرانے PLAYS دیکھتی رہتی تھی' کسی وقت مشعال دیکھتا کہ وہ فون پر کسی پروڈیوسر یا فنانسر وغیرہ سے بات کر رہی ہے۔ کبھی وہ اسکرپٹس کا کوئی پلندا لے کر بیٹھ جاتی...... مشعال جانتا تھا یہ سب سعیِ لا حاصل ہے لیکن وہ اکثر خاموشی اختیار کرتا تھا۔

ان دو تین مہینوں میں بھی احسن کی تلاش زور و شور سے جاری رہی تھی۔ درحقیقت وہ اسرائیلی انتظامیہ کے لیے مستقل دردِ سر بن چکا تھا۔ ہر ایک دو ہفتے بعد کوئی نہ کوئی کارروائی اس کے کھاتے میں ڈال دی جاتی تھی...... پھر مار دھاڑ ہوتی تھی' گرفتاریاں ہوتی تھیں۔ شہ سرخیاں لگتی تھیں۔ لیکن فوج کے ہاتھ کچھ نہیں آتا تھا۔ اس دوران میں اسرائیلی فوجیوں نے غزہ کے ایک دور دراز علاقے سے ایک نامعلوم حملہ آور کو گرفتار کیا تھا۔ یہ افواہ اڑ گئی تھی کہ احسن گرفتار ہو گیا ہے...... اس نوجوان کو شناخت کے لیے شہر لایا جا رہا تھا کہ راستے میں ہی اس شخص نے ایک اسرائیلی کی رائفل سے خود کو گولی مار لی تھی۔ بعد ازاں پتا چلا کہ یہ کوئی جرائم پیشہ شخص تھا۔ تحریکِ آزادی سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

مسئلہ یہ تھا کہ اسرائیلی انتظامیہ کے پاس احسن طلال کی کوئی واضح تصویر بھی نہیں تھی۔ جو ایک دو تصویریں موجود تھیں وہ کافی پہلے کی تھیں۔ اس کے علاوہ وہ بھیس بدل کر بھی اسرائیلیوں کو زچ کرتا تھا۔ اسرائیلی ہمیشہ احسن کی شناخت کے حوالے سے پریشان رہے تھے اور یہی پریشانی اب بھی تھی۔

وہ بہار کے دن تھے...... لیکن یہ بہار بھی غزہ اور اس کے گرد و نواح پر خزاں کی طرح آئی تھی۔ روزانہ دھواں اٹھتا تھا۔ روزانہ بارود کی بو پھیلتی تھی۔ ننھے بچے ننھے ہاتھوں سے دیو ہیکل ٹینکوں پر ننھے پتھر پھینکتے تھے۔ ام ریاض کی طبیعت جوں کی توں تھی۔ اردن جانے کا خیال ابھی تک اس کے ذہن سے مکمل طور پر نکلا نہیں تھا۔ اب بھی وہ فون پر ایک واقف کار سے اسی بارے میں معلومات حاصل کر رہی تھی۔ گفتگو میں بار بار پروڈیوسر حسنات کا نام بھی آ رہا تھا۔ اچانک ایک چیخ سنائی دی۔ گھریلو ملازمہ دوڑتی ہوئی آئی اور اس نے بتایا کہ ٹی وی پر بری خبر آئی ہے۔

''کیسی خبر؟'' ام ریاض نے اپنا کلیجا تھامتے ہوئے اور خود کو سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

''میں کس منہ سے بتاؤں' آپ خود سن لیں' ملازمہ نے اشکبار لہجے میں کہا اور ٹی وی آن کر دیا۔

ام ریاض کے اندیشوں کے عین مطابق' یہ احسن کی

مہارت

مودی صاحب شاہ جی کو اپنی موٹر سائیکل پر پیچھے بٹھا کر روانہ ہوئے تو شاہ جی کافی گھبرا رہے تھے۔ وہ موٹر سائیکل پر سفر کرنے کے عادی نہیں تھے۔ مودی صاحب نے تیز رفتاری سے شارع فیصل پر موٹر سائیکل دوڑاتے ہوئے گردن موڑ کر اونچی آواز میں شاہ جی کو تسلی دی ''آپ کو گھبرانے کی ضرورت نہیں...... میں دن میں دس مرتبہ اس سڑک سے گزرتا ہوں۔ اس کا چپہ چپہ میرا جانا پہچانا ہے۔ مجھے تو یہ بھی معلوم ہے کہ اس سڑک میں کہاں کہاں گڑھا ہے......''

عین اسی وقت موٹر سائیکل ایک گڑھے سے گزری اور بری طرح اچھلی۔ شاہ جی گرتے گرتے بچے۔ مودی صاحب بات جاری رکھتے ہوئے بولے ''...... اور یہ انہی گڑھوں میں سے ایک گڑھا تھا۔''

شہادت کی خبر تھی۔ ابھی وہ یہ خبر پوری طرح سن بھی نہیں پائی تھی کہ دروازے پر کسی جیپ کے انجن کی کرخت آواز سنائی دی چند سیکنڈ بعد گھر کا فرش وزنی بوٹوں کی دھمک سے گونج اٹھا۔ یہ اسرائیلی فوجی تھے۔ ساتھ میں لیڈیز اہلکار بھی تھیں۔ یہ لوگ سیدھے ام ریاض کے کمرے میں پہنچ گئے۔

''مسٹر باقر مشعال کہاں ہیں؟'' ایک عینک والے افسر نے پوچھا۔

''وہ شہر سے باہر ہیں۔''

''تم مسز مشعال ہو؟''

''ہاں...... کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''تمہیں ہمارے ساتھ پولیس اسٹیشن چلنا ہوگا۔''

''کیوں' کس لیے؟''

''یہ ضروری ہے۔ تھوڑی دیر میں تمہیں واپس چھوڑ جائیں گے۔''

ام ریاض کے گلے میں آنسو جمع ہو رہے تھے۔ وہ چیختی ہوئی آواز میں بولی ''کیوں لے جانا چاہتے ہو مجھے؟ مجھ سے میرے بیٹے کی...... لاش شناخت کرواؤ گے؟ اور تم کر بھی کیا سکتے ہو؟ اور تم کر بھی کیا سکتے ہو؟''

تھوڑی ہی دیر بعد ام ریاض پولیس اسٹیشن میں تھیں۔ ایک مستطیل کمرے میں اسٹریچر پر ایک جسم سفید چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ چادر پر خون کے دھبے تھے۔ چند افراد ارد گرد خاموش کھڑے تھے۔ یہ قیامت کے لمحے تھے۔ اس چادر کے پیچھے

اس کے لختِ جگر کا چہرہ ہوسکتا تھا...... اور نہیں بھی۔ ہونے اور نہ ہونے میں چند ساعتوں کا فرق تھا۔ ہاں، یہ قیامت کی ساعتیں تھیں۔ ام ریاض کا کانپتا ہاتھ دھیرے دھیرے چادر کی طرف بڑھا۔ اسے بتا دیا گیا تھا کہ لاش مسخ ہے، اس لیے وہ ہمت سے کام لے۔

ہر زمانے میں دکھیاری ماؤں سے ظالم ہمیشہ یہی کہتے رہے ہیں کہ وہ ہمت سے کام لیں۔

وہ ہمت سے کام لے رہی تھی۔ اگر نہ لیتی تو شاید اپنے گھر سے اسپتال تک پہنچ بھی نہ سکتی۔ ہاتھ چادر کی طرف بڑھا۔ دل دھڑک رہا تھا...... امید و بیم کے درمیان ڈوب رہا تھا، ابھر رہا تھا۔ پھر اس نے چادر سرکائی۔ آہ...... اس کام کے لیے پتھر کا جگر اور فولاد کا دل درکار تھا۔ اس کے سامنے ایک خون آلود کٹا پھٹا چہرہ تھا۔ بال لہو میں لتھڑے ہوئے۔ ایک رخسار ندارد...... گردن کے پرخچے اڑے ہوئے۔ ہاں یہ ایک شہید کا چہرہ تھا اور یہ شہید کون تھا؟

ام ریاض کے ہاتھوں نے بے تابی سے قمیص کے چیتھڑے سینے پر سے ہٹائے۔ بغل کے نیچے کچھ دیکھا پھر لپک کر پنڈلی کی طرف آئی۔ اشک بار نگاہوں کو پنڈلی پر مرکوز کیا۔ پھر ایکا یکی اس کے حلق سے ایک دلدوز چیخ نکلی۔ یہ اس کا احسن تھا...... ہاں، یہ اس کا احسن تھا...... یہی تھا اس کا لختِ جگر۔ وہ جسم و جاں کی پوری قوت کے ساتھ اپنے شہید کے پارہ پارہ جسم سے لپٹ گئی۔ وہ کربناک انداز میں چیخ رہی تھی اور اپنے شہید کے جسم پر بوسے دے رہی تھی۔ وہ اس کے ہاتھ پاؤں، سینہ اور پور پور چوم رہی تھی۔ تب اچانک وہ دیوانی سی ہوگئی۔ وہ مڑی اور زخمی شیرنی کی طرح فوجیوں پر جھپٹی۔ اس نے وحشیانہ انداز میں لمبے تڑنگے عینک پوش کرنل کی گردن دبوچی ''میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی...... تم نے میرا احسن مارا ہے۔ تم نے میرا بیٹا چھینا ہے'' وہ ہذیانی انداز میں چیختی چلی گئی۔ اہلکاروں نے ام ریاض کو تین اطراف سے جکڑا اور گھسیٹتے ہوئے کرنل سے دور لے گئے۔ ایک کیپٹن نے ام ریاض کو طمانچہ مارا اور اسے دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ وہ مسلسل نوحہ کناں تھی۔

☆☆☆

احسن کی آخری رسومات ادا ہوئے تین ہفتے ہو چکے تھے۔ ایک شدید طوفان کے بعد حالات معمول پر آنا شروع ہوگئے تھے لیکن ام ریاض کے لیے حالات معمول پر نہیں آئے تھے۔ اسپتال میں شہید کی لاش شناخت کرنے کے بعد وہ اتنے کرب سے روئی چلائی تھی کہ اس کے گلے سے خون جاری ہوگیا تھا۔ اسے فوری طور پر اسپتال ایڈمٹ کرنا پڑا تھا۔ اب تین ہفتے گزرنے کے بعد وہ گھر تو واپس آگئی تھی لیکن اس کی حالت جوں کی توں تھی۔ کسی وقت تو یوں لگتا تھا کہ وہ اب کچھ ہی دن کی مہمان ہے۔

ایک شام ڈاکٹر مشعال گھر لوٹے تو ان کے چہرے پر دبی دبی خوشی تھی۔ دروازہ بند کر کے وہ ام ریاض کے پاس آ بیٹھے۔ ام ریاض ان ہیلر کے ذریعے بمشکل سانس لے رہی تھی۔ مشعال نے حسبِ معمول اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا اور بولے ''تیرے لیے خوش خبری ہے۔ اومان سے ابونصیر کے ہاں آج پھر احسن کا فون آیا ہے۔ وہ بالکل خیریت سے ہے۔ وہ اس بات پر بہت ''خوش'' ہے کہ اسرائیلی انتظامیہ اسے مردہ تصور کر رہی ہے...... میں نے خود اس سے بات کی ہے۔ وہ تیری صحت کے بارے میں فکرمند تھا اور بار بار تیرا حال پوچھ رہا تھا۔''

ام ریاض کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چمک گئے ''خدا اس کو اپنی امان میں رکھے، جب بھی اس سے ملو، میری طرف سے اس کی پیشانی پر تین بوسے ضرور دینا۔''

''یہ بوسے تم خود دینا'' مشعال نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''نہیں مشعال! میرا وقت اب پورا ہو چکا ہے، اب زیادہ دن نہیں جیوں گی۔''

ام ریاض نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔ چند سیکنڈ خاموش رہی پھر وہ خوابناک آواز میں بولی ''تم نے زندگی بھر میری کردار نگاری کو نہیں سراہا، کیا اب بھی نہیں سراہو گے؟ کیا اب بھی نہیں کہو گے کہ میں ایک اچھی اداکارہ ہوں؟''

مشعال کی آنکھوں سے آنسو گرے اور اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کا اثبات میں ہلتا سر دیکھ کر ام ریاض نے پھر آنکھیں موند لیں۔ اس کے چہرے پر عجیب سا سکون تھا۔ اس کے ہونٹوں سے پھر خوابناک آواز نکلی ''میں برسوں سے جس یادگار کردار کی تلاش میں تھی...... وہ میں نے ادا کر دیا ہے...... میں نے کر دیا ہے نا مشعال!'' اس نے پھر سوالیہ نظروں سے مشعال کی طرف دیکھا۔

مشعال نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا ''ہاں ڈیئر! تم نے کر دیا ہے۔ دیٹ واز اے ماسٹر پیس...... آف کورس، دیٹ واز اے ماسٹر پیس!''

اس واقعے کے قریباً چار دن بعد ام ریاض مرگئی۔ مرنے کے بعد بھی اس کے چہرے پر عجیب سی آسودگی تھی۔

اسد اور اس کے تینوں ساتھیوں نے نقاب پہن رکھے تھے۔ ان کی کیڈلک کار کوٹھی کی عقبی دیوار کے سامنے رکی۔ انجن بند کرنے اور ہیڈ لائٹس بجھانے کے بعد وہ چاروں گاڑی سے اترے۔ اسد نے اپنے ساتھی ملک احمد عرف ملک الموت کو اشارہ کیا۔ اس نے پھرتی سے دیوار پھلانگی اور کوٹھی میں کود گیا۔ ذرا دیر بعد رکھوالی کے دو کتوں کے بولنے کی آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی سائلنسر لگے پسٹل سے تین گولیاں چلائی گئیں، کتوں کی آواز خاموش ہو گئی۔ دو سیکنڈ بعد عقبی دروازہ کھول دیا گیا اور اسد سمیت تینوں افراد دندناتے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔ ان میں سے ایک کے پاس رائفل تھی جب کہ باقی تینوں سائلنسر لگے پستولوں سے مسلح تھے۔

سب سے پہلے دونوں چوکیداروں کو گولی ماری گئی پھر وہ

ارادے باندھ کر توڑ دینے والے ایک تاخیر پسند کا قصہ اس کے ارادے مضبوط ہونے تک دنیا اجڑ چکی تھی

طاہر جاوید مغل

تاخیر

ملوث کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر زندگیوں سے کھیلنے والے ایک سفاک و بے مہر نوجوان کا فسانۂ عبرت۔ ایک کمزور لمحہ اسے بھی کمزور کر گیا، اتنا ناتواں کہ کسی کا دل توڑنا بھی اسے گوارا نہ رہا پھر یہ ناتوانی اس کے لیے وہ سزا بن گئی کہ ازالے کی کوئی صورت نہ تھی۔

لوگ اندرونی دروازہ توڑ کر اندر داخل ہو گئے۔ ایک لحیم شحیم شخص چیختا ہوا ان کے سامنے آیا اس کے ہاتھ میں خود کار رائفل تھی۔ اسد کے اشارے پر ملک الموت نے اس کی کھوپڑی میں یکے بعد دیگرے تین گولیاں ٹھونک دیں۔ یہ گھر کا سربراہ سیٹھ انوار احمد تھا۔ اس کے بعد سیٹھ کے دو بیٹے اور ان کی بیویاں سامنے آئیں۔ مردوں کے چہرے تاریک تھے اور عورتیں ہذیانی انداز میں چلاتی چلی جا رہی تھیں۔ پہلے دونوں نوجوانوں کو گولی ماری گئی۔ پھر ایک خاتون کی پیشانی میں سرخ بندیا نمودار ہو گئی۔ دوسری لڑکی غالباً ٹیلی فون استعمال کرنے کے لیے سیڑھیوں کی طرف دوڑی تھی۔ اسد نے اسے بھی ڈھیر کر دیا۔

باقی اہلِ خانہ کو کمروں سے گھسیٹ کر باہر نکالا گیا۔ وہ گڑگڑا رہے تھے، قدموں میں گر کر زندگی کی بھیک مانگ رہے تھے۔ جان بخشی کے عوض اپنا سب کچھ دینے پر آمادہ تھے، مگر اسد اور اس کے ساتھیوں پر یہ سب کچھ بالکل بے اثر تھا۔ وہ ایسے مناظر سیکڑوں مرتبہ دیکھ چکے تھے۔ ان کے دل پتھر اور ضمیر مردہ ہو چکے تھے۔ وہ خطرناک دہشت گرد تھے اور قتل و غارت ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ اگلے چند سیکنڈ میں انہوں نے انوار احمد کے تمام اہل خانہ کو قتل کر ڈالا۔ کامن روم، ڈرائنگ روم اور بالائی منزل کو جانے والی سیڑھیاں مقتولین کے لہو سے سرخ ہو گئیں۔ مرنے والوں میں دو بچے بھی شامل تھے۔

ان کا کام مکمل ہو چکا تھا۔ آج رات انہیں یہی کام سونپا گیا تھا۔ ان کے گروہ کے سرغنہ نے انوار احمد اور اس کے اہلِ خانہ کی زندگی کی قیمت وصول کی تھی اور یہ قیمت دینے والا انوار احمد کا ایک کاروباری رقیب تھا۔

"FINISH" اسد نے پسٹل کی نال میں پھونک مارتے ہوئے ملک الموت سے پوچھا۔

"یس ماسٹر فنش" ملک عرف ملک الموت نے جواب دیا۔

مگر چند ہی سیکنڈ بعد اس کا جواب غلط ثابت ہو گیا۔ اسد کے ایک ساتھی نے سیڑھیوں کے نیچے جھانکا اور ایک لڑکی کو بالوں سے گھسیٹ کر اسد کے سامنے پھینک دیا۔ لڑکی کی عمر بائیس سال کے لگ بھگ رہی ہوگی۔ وہ شب خوابی کے لباس میں تھی۔ اس کے لمبے ریشمی بال اس کے کولھوں تک پہنچ رہے تھے۔ وہ امیرانہ خد و خال والی ایک نرم و نازک اور خوبصورت دوشیزہ تھی۔ لیکن اسد صرف اور صرف ایک قاتل تھا۔ جس طرح کمان سے نکلنے والے تیر اور پستول سے نکلنے والی گولی کی آنکھ نہیں ہوتی اسی طرح اسد بھی شاید اپنے مقتول کو دیکھتا نہیں تھا۔ وہ صرف اسے مارتا تھا، لیکن نشانہ لینے کے لیے ایک بار تو دیکھنا ہی پڑتا ہے۔ اسد نے بھی ایک بار لڑکی کو نظر بھر کر دیکھا تھا اس کے پسٹل کا رخ لڑکی کی پیشانی کی طرف تھا اور سفاک انگلی ٹریگر پر تھی۔ یہی لمحہ تھا جب اس کی نگاہیں لرزتی کانپتی لڑکی کی نگاہوں سے ٹکرائی تھیں۔ ڈری سہمی اور ملتجی نگاہیں جن میں موت کا خوف اور زندگی کی خواہش منجمد سی ہو گئی تھی۔ وہ ایسی سحر کار آنکھیں تھیں کہ اسد کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ اس کی انگلی جو کبھی ٹریگر پر حرکت کرنے سے چوکی نہیں تھی آج چوک رہی تھی۔ اس نے بڑے بڑے معصوم جوان اور حسین لاشے گرائے تھے لیکن آج اس کی بلا خیز سفاکی کو نجانے کیا ہوا تھا، اسے محسوس ہوا کہ وہ رحم کا مرتکب ہونے والا ہے۔ اور پھر سچ مچ ایسا ہو گیا۔ رحم..... جو اس کی لغت میں جرم تھا، اس سے سرزد ہو گیا تھا۔ اس کا پسٹل والا ہاتھ، کونے میں سمٹی ہوئی نازک لڑکی کے سامنے جھک گیا۔ اس کے ساتھی حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔

○☆○

اسی ایک کمزور نازک سی لڑکی نے اسد کی کیمسٹری بدل کر رکھ دی۔ آناً فاناً اسد کی زندگی میں ایک انقلاب رونما ہو گیا۔ اس لڑکی کا نام عنبرین تھا۔ اس کی حسین دلکشی نے اسد کے سنگلاخ سینے میں محبت کی ایک سرسبز کونپل کھلائی اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ کونپل ایک تناور درخت بن کر جھومنے لگی۔ سفاک مجرم اور بے رحم قاتل اسد کے دل میں یہ عجیب امنگ جاگی کہ وہ اس آہو چشم لڑکی کے سنگ ایک نئی زندگی شروع کرے۔ ایک ایسی زندگی جس پر جرم کا سایہ تک نہ ہو۔ جو ایک نارمل زندگی ہو۔ جس میں اسد ایک شوہر ہو اور عنبرین ایک بیوی، وہ محنت کر کے حق حلال کی روزی کمائے، شام کو تھکا ہارا گھر آئے، عنبرین ایک دلنشیں مسکراہٹ سے اس کا استقبال کرے۔ ان کے آنگن میں چہکارتے ہوئے پھول کھلیں اور ایک خوبصورت کائنات ان کی پرسکون چار دیواری میں سمٹ آئے۔

یہ خواہش ایسے تند و تیز ریلے کی طرح اسد کے دل سے ٹکرائی کہ وہ چٹان صفت ہونے کے باوجود تنکے کی طرح اس بہاؤ میں بہہ گیا۔ کچھ بھی اس کے بس میں نہ رہا اور وہ ایسا کچھ کر گزرا جس کا اس نے یا اس کے کسی ساتھی نے تصور بھی نہیں کیا تھا... اسد کے لئے ایک نئے روپ میں عنبرین کے سامنے آنا چنداں مشکل نہیں تھا۔ جس وقت اس نے

عنبرین کے والد کی کوٹھی میں واردات کی تھی وہ نقاب میں تھا۔ پھر جب وہ لوگ عنبرین کو کوٹھی سے اٹھا کر اپنے ڈیرے پر لائے تھے اس وقت بھی اسد اور اس کے ساتھیوں نے نقاب نہیں اتارے تھے۔ عنبرین اب اسد کے ڈیرے پر تھی لیکن اس کی صورت سے قطعًا ناواقف تھی۔ ایک دن اسد نے اپنے ساتھی ملک احمد کو اپنا ہم راز بنایا اور وہ سب کچھ کر گزرا جو وہ کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے دیگر دو ساتھیوں کو کسی کام سے لاہور سے باہر بھیج دیا پھر اس نے بازار سے اپنے لیے بڑے مناسب سے کپڑے خریدے۔ حجامت وغیرہ کروائی' نہایا دھویا اور اپنے ہی ڈیرے پر ایک نئے روپ میں پہنچ گیا۔ اس نے چابی لگا کر اس کمرے کا دروازہ کھولا جہاں عنبرین کو محبوس رکھا گیا تھا۔ خوف زدہ عنبرین اپنے سامنے پینٹ شرٹ والے ایک عام سے نوجوان کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔

اسد نے ہیجانی لہجے میں کہا "چلو آؤ' میں تمہاری مدد کے لیے آیا ہوں۔ وہ ڈاکو یہاں سے بھاگ گئے ہیں۔ انہیں پولیس کے چھاپے کا ڈر تھا لیکن پولیس ابھی تک نہیں آئی۔ ہو سکتا ہے کہ پولیس کے آنے کی اطلاع غلط ہو اور وہ پھر آجائیں۔"

"لل.... لیکن۔" عنبرین ہکلائی۔

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ اگر دیر کرو گی تو پھر پھنس جاؤ گی۔ مجھ پر بھروسا کرو۔"

اسد عنبرین کو اپنی ہی حراست سے نکال کر لے آیا تھا۔ باہر آکر دونوں نے ایک ٹیکسی پکڑی تھی اور سیدھے اسٹیشن پہنچے تھے۔ اسد کسی نہ کسی طرح عنبرین کو راولپنڈی لے آیا۔

یہاں ملک احمد سارا انتظام پہلے ہی کر چکا تھا۔ ایک غیر معروف علاقے میں اس نے ایک مناسب سا مکان کرائے پر لے لیا تھا اور وہاں روز مرہ ضروریات کی اشیا بھی جمع کرلی تھیں۔ اسد نے ملک احمد کا تعارف اپنے دیرینہ دوست کے طور پر کرایا۔ ایسا دوست جو اس مشکل وقت میں ان دونوں کی مدد کے لیے تیار تھا اور ہر طرح قابلِ بھروسا بھی تھا۔

چند دن وہ تینوں وہاں اکٹھے رہے۔ عنبرین اس دوران میں اسد پر خاطر خواہ بھروسا کرنے لگی۔ اسے یہ اندازہ بھی ہو گیا کہ اسد اسے پسندیدگی کی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ اسد نے عنبرین کو اچھی طرح باور کرا دیا تھا کہ اس چار دیواری سے باہر اس کے لیے خطرہ ہی خطرہ ہے۔ ان لوگوں کا خطرہ جنہوں نے اس کے والد اور پورے خاندان کو قتل کیا تھا۔ کرپٹ پولیس کی طرف سے خطرہ اور بگڑے تگڑے معاشرے کی طرف سے خطرہ۔ ویسے بھی عنبرین کا بچا کون تھا جس کی پناہ میں جانے کی اسے آرزو ہوتی' والد' بھائی' بھابیاں' چچا سب ہی تو اس منحوس رات کو جان ہار گئے تھے۔ اسے اسد کی "مہربان" ذات کی شکل میں ایک پناہ گاہ اور ایک حفاظتی حصار نظر آیا۔ وہ آہستہ آہستہ اسد کی طرف مائل ہوتی چلی گئی۔

اسد نے عنبرین سے شادی کرلی اور ایک بالکل نئی زندگی کا آغاز کیا۔ اس زندگی میں ملک احمد بھی اس کا شریک سفر تھا۔ ایک باوفا دوست کی طرح وہ قدم قدم پر اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ اسد نے محنت کر کے حق حلال کی کمائی سے ایک گمنام علاقے میں جنرل اسٹور کھول لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ جنرل اسٹور ایک چھوٹے پیمانے کا ڈپارٹمنٹل اسٹور بن گیا۔ عنبرین کی محبت اور دلنشیں قربت نے اسد کو یکسر بدل کر رکھ دیا تھا۔ اس کے چہرے پر چھوٹی سی خوب صورت داڑھی بھی تھی۔ اپنے لباس اور وضع قطع سے وہ نہایت نفیس نظر آتا تھا۔ ایک خوں خوار انسان کے اندر سے ایک ایسا خوب صورت انسان برآمد ہوا تھا کہ کبھی کبھی اسد کو بھی اپنے اوپر

تعجب ہونے لگتا تھا۔ عنبرین بھی اسد کے ساتھ خوش تھی۔ تاہم اکثروہ بیٹھے بیٹھے کہیں گم ہوجاتی تھی۔ اسد سے اور اردگرد کے ماحول سے کہیں بہت دور چلی جاتی تھی۔ ایسے میں اس کی خوب صورت آنکھوں میں کچھ خونچکاں مناظر کا عکس نظر آنے لگتا تھا۔ والد کا خون آلود جسم، بھائیوں اور بھابیوں کے چھلنی لاشے، گولیوں کے شعلے اور نقابوں کی اوٹ سے جھانکتی ہوئی خوفناک آنکھیں۔ وہ کون تھا؟ جس نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس کے ہنستے بستے گھر پر شب خون مارا تھا اور سب کچھ ملیامیٹ کردیا تھا۔ کاش وہ اس کو بھی مار ڈالتا۔ وہ اسے موت کے بالکل قریب لے جاکر واپس لے آیا تھا۔ ساری زندگی اپنے پیاروں کی یاد میں تڑپنے کے لیے اسے زندہ درگور کرگیا تھا۔

اسد نے چند بار اس حوالے سے عنبرین سے بات کرنے کی کوشش کی بھی لیکن یہ ذکر چھیڑتے ہی عنبرین کی حالت غیر ہونے لگتی تھی۔ اس کا جسم کانپتا تھا، ہونٹ نیلے سے ہوجاتے تھے اور حسین آنکھوں میں دنیا جہان کا کرب سمٹ آتا تھا۔ ایک دن اس نے ہاتھ جوڑ کر اسد سے کہہ دیا تھا "پلیز اسد! مجھ پر ترس کھائیں۔ میرے سامنے یہ بات نہ چھیڑا کریں۔ میں آپ کی محبت کے سہارے وہ سب کچھ بھولنے کی کوشش کررہی ہوں، آپ یہ ذکر چھیڑتے ہیں تو میرے زخموں سے خون نکلنے لگتا ہے۔"

کہنے کو تو وہ کہہ رہی تھی کہ وہ یہ سب کچھ بھولنے کی کوشش کررہی ہے لیکن اسد جانتا تھا کہ تنہائی ملتے ہی وہ اپنے پیاروں کی تصویروں کا خیالی البم نگاہوں کے سامنے سجا کر بیٹھ جاتی ہے۔ وہ ان لوگوں کو کبھی معاف نہیں کرسکتی تھی جنہوں نے اس کے گھرانے کو خون میں نہلایا تھا۔ وہ افراد یقیناً اس کے لیے دنیا کے سب سے قابلِ نفرت انسان تھے۔ اس واقعے کے حوالے سے کچھ ایسی ہی کیفیت اسد کی بھی تھی۔ وہ بھی کوشش کے باوجود کچھ بھی بھول نہیں پارہا تھا۔ اس نے بڑی بے دردی سے بے شمار قتل کیے تھے لیکن یہ آخری چند قتل اس کے دل کا داغ بن گئے تھے، شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ان مقتولوں کا تعلق اس ہستی سے تھا جو اسد کو دنیا میں سب سے زیادہ پیاری تھی، یعنی عنبرین! گزرنے والے ہر دن کے ساتھ اسد کے دل و دماغ پر بوجھ بڑھتا جارہا تھا۔ کئی بار اس کے دل میں یہ آئی کہ وہ سب کچھ عنبرین کے گوش گزار کردے۔ اس کے سامنے اپنا ہر جرم قبول لے اور پھر فیصلہ اس پر چھوڑ دے، لیکن ہر بار جب اس نے اپنے خیال کو عملی جامہ پہنانا چاہا ایک بلند و بالا دیوار اس کے سامنے آگئی۔ وہ ریزہ ریزہ ہونے کے بعد جڑا تھا، اس میں اب اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ عنبرین کی محبت سے محروم ہوکر پھر سے ریزہ ریزہ ہوجاتا۔ وہ بڑا سخت دل تھا، اس نے مشکلات کی بڑی بڑی چوٹیاں سر کی تھیں مگر اعترافِ جرم کی یہ چوٹی سر کرنا اس کے بس میں نہیں تھا۔

اس نے ارادہ کیا کہ پہلا بچہ پیدا ہوجائے تو پھر وہ عنبرین کو سب کچھ بتادے گا مگر پہلا بچہ پیدا ہونے کے بعد بھی وہ اپنے اندر یہ ہمت پیدا نہ کرسکا پھر اس نے یہ کام دوسرے بچے کی پیدائش تک کے لیے اٹھا رکھا، دوسرا بچہ پیدا ہوا لیکن اسد اعترافِ جرم کی گھاٹی پھر بھی سر نہ کرسکا۔ دو بچوں کے بعد بھی عنبرین سے اس کی محبت روزِ اول کی طرح قائم تھی بلکہ شاید اس میں کچھ اضافہ ہی ہوا تھا۔ وہ اس کی صورت اور سیرت کا شیدائی تھا اور اس کی محبت کی شدت اسے طوفانوں سے ٹکرانے کا حوصلہ دے رہی تھی۔ اس کا کام پھل پھول رہا تھا۔ گھر میں خوش حالی تھی۔ اس کے علاوہ اس پر خدا کا ایک اور احسان ہوا تھا۔ وہ اب تک پولیس کے علاوہ اپنے گروہ کی نظروں سے بھی محفوظ تھا۔ اس کا طوفانی ماضی اس کے پرسکون حال کو گزند پہنچانے میں ناکام رہا تھا۔ درحقیقت اسد نے اپنی زندگی کو ایک غیر معروف علاقے کی چند غیر معروف گلیوں تک محدود رکھا تھا۔ وہ کہیں آتا جاتا نہیں تھا اور نہ اس کے بیوی بچے کہیں آتے جاتے تھے۔ ان دونوں کو آنے جانے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ عنبرین کی طرح اسد کا بھی کوئی آگے پیچھے نہیں تھا۔ وہ ایک تنہا شخص تھا اور اس نے تنہا عنبرین کے ساتھ مل کر ایک ایسی دنیا آباد کی تھی کہ جو محدود ہونے کے باوجود اپنی جگہ بے حد بارونق اور مکمل تھی۔

ہاں ملک احمد کی بات مختلف تھی۔ وہ خود کو اس نئی صورت حال میں ایڈجسٹ نہیں کرپایا تھا۔ شروع میں تو اس کا خیال تھا کہ جوانی کا جوش ہے جو جلد ہی اتر جائے گا۔ اسد کا دل عنبرین سے بھر جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ سال دو سال لگ جائیں گے۔ آزاد فضاؤں میں اڑنے والا عقاب، محدود زندگی کے پنجرے سے اکتا کر پھر آزاد فضاؤں میں لوٹ جائے گا.... لیکن آہستہ آہستہ ملک احمد پر اصل صورتِ حال واضح ہونے لگی تھی۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ اسد اپنی نئی زندگی میں گم ہوتا چلا جارہا ہے۔ عنبرین جس کی حیثیت داشتہ کی ہونی چاہیے تھی "محبوب شریکِ حیات" کی حیثیت اختیار کرچکی تھی اور محبت کا بھوت اسد کے سر سے اترنے کے بجائے اس کے جسم کے ہر ہر ریشے میں سرایت کرتا چلا جارہا تھا۔ اس

نے اپنے طور پر اسد کو سمجھانا بجھانا شروع کردیا تھا۔ وہ اسے بڑی بے تکلفی سے کنویں کا مینڈک کہنے لگا تھا اور کنویں سے نکل کر حسین و جمیل پر ہنگام زندگی کی طرف لوٹنے کے مشورے دے رہا تھا۔ ان مشوروں کے جواب میں اسد اسے شادی کرنے کا مشورہ دے رہا تھا اور اس کی طرح ایک پرسکون دنیا بسانے کی تلقین کررہا تھا۔ کئی ماہ یہ کشمکش جاری رہی۔ دونوں دوست اپنے اپنے موقف پر قائم تھے۔ دھیرے دھیرے اسد کو محسوس ہونے لگا کہ ان دونوں کے راستے بدل رہے ہیں۔

پرعیش و پرہنگام ماضی ملک احمد کو اپنی طرف کشش کررہا تھا اور یہ کشش اتنی شدید تھی کہ کسی عنبرین جیسی سحرکار ساتھی کے بغیر اس کی مزاحمت ناممکن تھی اور پھر ایک روز ایک طویل بحث کے بعد اسد اور ملک احمد میں تلخ کلامی ہوئی۔ اس واقعے کے ٹھیک دو روز بعد ملک احمد نے بڑی خاموشی سے اپنا راستہ جدا کرلیا۔ اسد جب رات گئے اپنے اسٹور سے واپس آیا تو عنبرین کی زبانی اسے پتا چلا کہ ملک احمد گھر چھوڑ کر جاچکا ہے۔

اسد کی زندگی ایک بار پھر زبردست اتھل پتھل کا شکار ہوگئی۔ ملک احمد کے جانے کے بعد وہ شدید عدم تحفظ کا شکار ہوگیا تھا۔ یقینی بات تھی کہ ملک احمد جرم کی اسی پرانی دنیا میں لوٹا ہوگا جہاں سے ڈھائی تین سال پہلے آیا تھا۔ اس کا یوں لوٹنا کئی طرح سے اسد کے لیے خطرے کا باعث تھا۔ اسد نے فیصلہ کیا کہ وہ فوری طور پر یہ جگہ چھوڑ دے گا۔

اس نے جتنی تیزی سے فیصلہ کیا تھا اتنی ہی تیزی سے اس پر عمل بھی کیا۔ تین چار دن کے اندر وہ راولپنڈی کے اس محلے سے اٹھا اور ایبٹ آباد پہنچ گیا۔ وہاں اندرون شہر اس نے ایک مکان کرایے پر لیا اور ساتھ ہی دکان بھی خریدلی۔ جمی جمائی زندگی کو چھوڑ کر نئی جگہ آباد ہونا جان جوکھم کا کام تھا مگر عنبرین اور بچوں کی محبت نے اسد میں حوصلے کا پہاڑ کھڑا کر رکھا تھا۔ اس پہاڑ کے سامنے ہر مشکل اسے حقیر نظر آتی تھی۔ دو تین ماہ میں وہ اس نئی جگہ پر بھی سیٹ ہوگیا۔

بعض اوقات بظاہر حوصلہ پست کرنے والے واقعات انسان کے لیے غیر معمولی بہتری کا باعث بن جاتے ہیں۔ ایبٹ آباد میں گو بہت سی دشواریاں پیش آئیں لیکن جلد ہی حالات موافق ہونے لگے۔ اس نئی جگہ پر اسد کا کاروبار زیادہ تیزی سے پھلنا پھولنا شروع ہوا۔ وہ ایک ٹھیک ٹھاک ڈپارٹمنٹل اسٹور کا مالک بن گیا۔ اسی دوران میں اس کے ہاں تیسرے بچے کی ولادت بھی ہوچکی تھی۔ اسد نے عنبرین کو اپنے بارے میں سب کچھ بتا دینے کا مشکل ترین کام تیسرے بچے کی ولادت تک کے لیے اٹھا رکھا تھا لیکن جس طرح وہ دو مرتبہ پہلے ناکام ہوا تھا، تیسری مرتبہ بھی ناکام رہا۔ وہ جب بھی اس بارے میں سوچتا تھا اس کے دماغ کی نسیں پھٹنے لگتی تھیں۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ یہ خوفناک سچ بول کر اپنا بہت کچھ گنوا دے گا اور اس کے ساتھ ساتھ عنبرین کے مندمل زخموں سے بھی کھرنڈ اس طرح اتریں گے کہ وہ سرتاپا زخم بن جائے گی۔

اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ وہ سچ بولنا چاہتا تھا لیکن یہ سچ اس سے جو بھاری قیمت طلب کررہا تھا وہ اس کے لیے ادا کرنا ممکن نہیں تھی۔ عنبرین اور بچوں کے بغیر ایک دن بھی گزارنا اس کے لیے مشکل تھا۔ درحقیقت جب سے عنبرین اس کی زندگی میں آئی تھی، دونوں ایک رات کے لیے بھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوئے تھے۔ اب اگر اسد کسی شدید مجبوری کے تحت کہیں آنے جانے کا سوچتا بھی تو

اللہ نہ کرے

اتفاق سے آفاقی صاحب کو چھ سات ماہ بعد ہی دوبارہ انگلینڈ جانا پڑا۔ وہ سکون کی تلاش میں اس بار بھی دیہی علاقے کے ایک بورڈنگ ہاؤس میں ٹھہرے۔ انہوں نے دیکھا بورڈنگ ہاؤس کی مالکن مارگریٹ ایک بچہ گود میں اٹھائے ہوئے تھی۔

"بڑی خوشی ہوئی مارگریٹ....!" آفاقی صاحب نے مبارک باد دیتے ہوئے کہا "ہم پچھلی مرتبہ آئے تھے تو ہمیں شبہ تک نہیں ہوا تھا کہ تم امید سے ہو۔"

"یہ میرا نہیں.... میری بیٹی ہیلن کا بچہ ہے" مارگریٹ نے ان کی غلط فہمی دور کی۔

"ارے واہ.... تو تم نے ہیلن کی شادی کردی!" آفاقی صاحب نے پہلے سے زیادہ خوشی کا اظہار کیا۔

"توبہ کریں مسٹر افاکی.... اب میں اتنی بے وقوف بھی نہیں ہوں کہ ہیلن کی شادی کردوں۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے" مارگریٹ بولی۔

عنبرین اور بچوں کی جدائی کا تصور ایک دیوار بن کر اس کے سامنے کھڑا ہو جاتا تھا۔

اس کا بڑا بچہ حمزہ اب چار سال کا ہو چکا تھا۔ اسد نے اسے ایک بڑے اچھے اسکول میں داخل کروایا تھا' گھر میں اس کے لیے قاری کا انتظام کروایا تھا اور اس کی تربیت پر بھرپور توجہ دینے کی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ اس کے ذہن میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ وہ اپنے گناہوں کا کفارہ کسی حد تک اسی طرح ادا کر سکتا ہے کہ اپنے بچوں کو شریف شہری اور نہایت اعلیٰ انسان بنانے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دے۔ فرصت کے لمحات میں اپنے نئے گھر کی خوب صورت بالکونی میں بیٹھ کر اسد اور عنبرین اکثر اس موضوع پر بات کیا کرتے تھے۔ یہ دس مرلے کا گھر اسد نے حال ہی میں خریدا تھا اور میاں بیوی نے بڑے ذوق و شوق سے اس کی آرائش کی تھی۔ خاص طور سے اسد تو ہر وقت اس گھر کو زیادہ آرام دہ اور زیادہ خوب صورت بنانے کے بارے میں سوچتا رہتا تھا لیکن ان ساری مصروفیات کے دوران بھی وہ عذاب اپنی جگہ برقرار تھا۔ "جھوٹ" ایک بہت بڑا بوجھ بن گیا تھا اور یہ بوجھ ہر وقت اس کے سینے میں اس کے دل کو مسلتا رہتا تھا۔

آخر ایک روز سب کچھ اسد کے بس سے باہر ہو گیا۔ ایک طویل سوچ بچار کے بعد اس نے ایک دن اچانک فیصلہ کر لیا کہ وہ اب کچھ بھی عنبرین سے نہیں چھپائے گا۔ اس روز اپنے ڈپارٹمنٹل اسٹور میں کاؤنٹر کے عقب میں بیٹھے بیٹھے اس کی نگاہ اخبار کے بیرونی صفحے پر پڑی تھی۔ وہاں سیٹھ انوار کی پانچویں برسی کا اشتہار موجود تھا۔ یہ اشتہار ہر سال ان کی کمپنی کے چند دوستوں کی طرف سے دیا جاتا تھا۔ دنیا سے چلے جانے والے کو یاد رکھنے کا یہ ایک بہانہ تھا۔ اس اشتہار نے اسد کو یاد دلایا کہ آج سیٹھ انوار احمد کو قتل ہوئے پانچ برس ہو گئے ہیں۔ اپنے باپ اور دیگر اہل خانہ کی برسی کا دن عنبرین کو ہمیشہ اداس تر کر دیا کرتا تھا۔ رو رو کر اس کی آنکھیں سوج جاتی تھیں۔ وہ گھر میں قرآن خوانی کا انتظام کراتی تھی اور ایک ہی دن میں ہفتوں کی بیمار نظر آنے لگتی تھی۔

اسد نے مصمم ارادہ کر لیا کہ آج رات وہ عنبرین سے اپنی زندگی کی اہم ترین گفتگو کر کے رہے گا۔ وہ ایک تاریک کمرے میں اسے اپنے بازوؤں میں بھر کر اپنے سینے سے لگائے گا اور پھر آنسوؤں کے درمیان وہ سب کچھ کہہ ڈالے گا جو کہنا چاہتا ہے۔

لیکن اس شام وہ گھر گیا تو سب کچھ بدلا ہوا سا نظر آیا۔ نہ عنبرین نے سوجی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔ نہ گھر میں قرآن خوانی کے لیے جمع ہونے والی عورتوں کی جھلک نظر آئی۔ نہ حمزہ' شعیب اور ننھی آمنہ کے چہرے دکھائی دیے۔ گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ اندرونی دروازے کو تالا لگا ہوا تھا۔ ایک چابی اسد کے پاس بھی موجود تھی' وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اور شدید پریشانی کے عالم میں اِدھر اُدھر پھرنے لگا۔ اس کی چھٹی حس اسے کسی نہایت بری خبر کی اطلاع دے رہی تھی اور اس کا دل جیسے اندر سے رونا شروع ہو گیا تھا۔ ایک میز پر ایک بند لفافہ اس کا منتظر تھا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے لفافہ چاک کیا اور صوفے پر بیٹھ کر پڑھنے لگا۔

لکھا تھا "تمہارے گھر اور تمہاری زندگی سے ہمیشہ کے لیے جا رہی ہوں۔ میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ تم کبھی میری یا بچوں کی صورت نہیں دیکھ سکو گے.... اور میرے خیال میں یہ تمہاری کم سے کم سزا ہے۔ آج سے دو سال پہلے تمہارا دوست ملک احمد تمہیں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ وہ تمہیں بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا لیکن تم نہیں گئے۔ اس نے تمہاری اس بے وفائی کا بدلہ یوں لیا کہ جاتے جاتے مجھے تمہارے بارے میں سب کچھ بتا گیا۔ ہاں اسد.... پچھلے دو سال سے مجھے یہ بات معلوم ہے کہ میں ایک انسان کے ساتھ نہیں سفاک درندے کے ساتھ زندگی گزار رہی ہوں۔ وہ درندہ جس نے میرے والد' میرے بھائیوں' بھابیوں اور ان کے معصوم بچوں کو موت کے گھاٹ اتارا' اور اس سے پہلے بھی وہ نجانے کتنے بے گناہوں کا خون اسی طرح بہا چکا ہے۔ میں نے کہا ہے ناں اسد! کہ یہ تمہاری کم سے کم سزا ہے کہ تم زندگی بھر میری اور بچوں کی صورت کو ترستے رہو.... میں نے کوشش کی تھی کہ تمہیں قدرے بہتر سزا دے سکوں لیکن اپنی فطری کم ہمتی کی وجہ سے اس فیصلے پر عمل نہ کر سکی۔ میری الماری کی دراز میں وہ زہر ابھی تک موجود ہے' جو کتے مارنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ میں اس زہر کو تم پر استعمال نہ کر سکی لیکن اگر کبھی تمہیں اپنے "قابل فخر" ماضی پر بے تحاشا پیار آئے تو تم اس زہر کو استعمال کر سکتے ہو۔ خط ختم کرنے سے پہلے ایک بات اور.... شاید تمہارے ذہن میں یہ سوال ابھرے کہ تمہارے بارے میں سب کچھ معلوم ہو جانے کے باوجود میں نے ڈیڑھ دو سال تک کس بات کا انتظار کیا۔ میں نے دو سال تک ایک وہم کا تعاقب کیا۔ میں نے اس سچ کا انتظار کیا جسے تمہارے ہونٹوں سے نکلنا تھا اور میرے کانوں تک پہنچنا تھا۔ میں دو سال تک تمہارے ہونٹوں کی طرف دیکھتی رہی ہوں۔ تمہارے اندر سے بلند

ہونے والی کسی نیک آواز کا انتظار کرتی رہی ہوں۔ تم نے جو کچھ کیا اسد وہ کسی طور قابل معافی نہیں تھا۔ نہ قانون کے لیے اور نہ معاشرے کے لیے لیکن میں سچ کہتی ہوں اگر تم ایک بار.... صرف ایک بار میرے سامنے اپنے گناہ کا اعتراف کرلیتے اور آئندہ زندگی میں اپنے ماضی کی طرف مڑ کر نہ دیکھنے کا وعدہ کرلیتے تو میں اپنے دل پر بھاری پتھر رکھ کر اور اپنے سارے آنسو پی کر' اپنی حد تک تمہیں معاف کردیتی۔ اس آس پر جی لیتی کہ شاید میری اس معافی سے ایک نئی زندگی کی شروعات ہوسکے' لیکن میرا انتظار رائگاں گیا۔ دو سال کے طویل انتظار کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچ گئی ہوں کہ میں ایک ایسے منافق بہروپیے کے ساتھ زندگی گزار رہی ہوں جو کسی بھی وقت اپنے فریب کی چادر اتار کر اپنے اصلی وحشی روپ میں واپس آسکتا ہے۔ لہٰذا آج میں اور میرے بچے تمہیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ رہے ہیں۔"

○☆○

اگلے پانچ برس اسد نے جس طرح گزارے وہ کچھ اسے ہی معلوم تھا۔ ان پانچ برسوں کا ایک ایک پل وہ ایک سولی پر لٹکا رہا تھا۔ اس نے عنبرین اور اپنے بچوں کو تلاش کرنے کے لیے وہ سب کچھ کیا جو اس کے اختیار میں تھا بلکہ شاید وہ بھی جو اس کے اختیار سے بڑھ کر تھا۔ اس بات کی پروا کیے بغیر کہ وہ ایک سابقہ مجرم ہے اور قانون کی گرفت میں آسکتا ہے۔ اس نے شہر شہر اور گاؤں گاؤں کی خاک چھانی۔ گنجان ترین علاقوں سے لے کر غیر آباد ترین جگہوں تک کا سفر کیا۔ جہاں کہیں سے اسے عنبرین اور بچوں کے بارے میں کوئی کھوج ملنے کی توقع تھی وہ وہاں تک پہنچا اور اپنے مقصد کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا' کبھی گرجا' کبھی برسا' کبھی بچوں کی طرح بلک بلک کر رویا' لیکن وہ تو یوں گئی تھی کہ کہیں نشان تک نہیں چھوڑا تھا۔ دنیا بہت بڑی ہے۔ تلاش کرنے والے کے ہاتھ کتنے بھی لمبے ہوں وہ کسی کی تلاش میں پوری دنیا کو نہیں کھنگال سکتا۔ آخر ایک روز اسد کی ساری امیدیں دم توڑ گئیں اور حوصلہ کرچی کرچی ہو کر بکھر گیا۔ اس نے خود سے مخاطب ہو کر کہا "اسد! عنبرین کی آخری خواہش کا احترام کرتے ہوئے خود کو قانون کے حوالے کردو اور پھانسی کا پھندا چوم کر ہجر کے اس ناقابلِ برداشت عذاب سے چھٹکارا پالو۔"

لیکن پھر اسے یہ حوصلہ نہیں ہوا۔ وہ جانتا تھا قانون کے چکروں میں الجھ کر اسے کئی ماہ بلکہ شاید کئی برس تک زندہ رہنا پڑے گا اور زندگی اب اس کے لیے قطعی ناقابل قبول تھی۔ ایسے میں اسے عنبرین کا وہ آخری تحفہ یاد آیا۔ وہی زہر جو

بے نیازی

نیویارک میں ایک فلیٹ کے دروازے پر دستک ہوئی۔ اندر سے ایک عورت نے آواز دے کر پوچھا "کیا بات ہے...؟ کون ہے؟"

"بی بی! ہم پولیس والے ہیں۔ آپ کے شوہر کی لاش لے کر آئے ہیں۔ ان کے اوپر سے سڑک کوٹنے کا انجن گزر گیا تھا۔"

"تو پھر مجھے دروازے پر بلانا ضروری ہے کیا؟ دروازے کے نیچے سے اندر کھسکادو" خاتون کی آواز آئی۔

عنبرین نے اسے دینا چاہا تھا اور جو اس کی الماری میں رکھا رہ گیا تھا۔ یہ زہر ابھی تک اسد کے پاس محفوظ تھا۔

وہ گرمیوں کی ایک نکھری ہوئی شام تھی۔ ایسی ہی شاموں میں وہ اور عنبرین گھر کی بالکونی میں آرام کرسیوں پر بیٹھتے تھے۔ ایک دوسرے کا ہاتھ ہاتھوں میں لے کر دور سرسبز ڈھلوانوں کو دیکھا کرتے تھے۔ وہ آج بھی بالکونی میں بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے بید کی بنی ہوئی خوب صورت میز پر ایک فریم شدہ تصویر رکھی تھی۔ یہ اس کی محبوب بیوی اور تینوں بچوں کا گروپ فوٹو تھا۔ وہ کچھ دیر تک اشک بار نظروں سے اس تصویر کو دیکھتا رہا پھر اس کے ہونٹوں سے کراہتی ہوئی آواز نکلی "عنبرین! میں جب تمہارا "وقت جدائی" یاد کرتا ہوں تو خود کو دنیا کا بدقسمت ترین انسان سمجھنے لگتا ہوں۔ یہ بدقسمتی کی انتہا نہیں تو کیا ہے کہ جس وقت میں نے تم سے سچ بولنے کا فیصلہ کیا' عین اسی وقت تم نے مجھ سے ہمیشہ کے لیے جدا ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ میں' جس شام تمہاری آرزو کے عین مطابق' اپنا سچ لے کر تمہارے پاس آیا' اسی شام تم مجھے "سزائے موت" دے کر ہمیشہ کے لیے مجھ سے جدا ہوگئیں۔ کاش میں نے سچ بولنے میں یہ تاخیر نہ کی ہوتی.... یا کاش تم نے سزا دینے میں تھوڑی سی اور تاخیر کی ہوتی۔ آج پانچ برسوں بعد بدقسمتی کے شدید احساس کے ساتھ میں اس دنیا سے جا رہا ہوں۔"

اس نے آخری بار فریم شدہ تصویر کی طرف دیکھا' ایک سسکی لی اور زہر پھانک لیا.... اگلی صبح خودکشی کی خبر کے ساتھ اس کی تصویر اخبار میں موجود تھی۔

■

تاریکی کو روشن اجالے میں تبدیل کرنے کی سعی میں مصروف ایک مجسم چراغ کی داستان

محی الدین نواب

دُوسرا اور آخری حصہ

کسی بھی معاشرے میں ہر شخص کی انفرادی اور اجتماعی ذمے داریاں اور فرائض ہوتے ہیں۔ انفرادی ذمے داریوں میں سے ایک اپنی اولاد کی ایسی تربیت بھی ہے جو انہیں معاشرے کا کارآمد شہری بنائے۔ اس کے بعد معاشرے کی اجتماعی ذمے داری ہے کہ وہ انہیں عملی زندگی میں بگڑنے کے مواقع فراہم نہ کرے ورنہ انفرادی حیثیت میں دی گئی والدین کی اچھی تربیت کا اثر بہت جلد ختم ہو جاتا ہے اور نوجوان نسل ایسی راہ پر چل پڑتی ہے جو معاشرے میں بگاڑ اور انتشار کا سبب بنتے ہیں۔ آپ کے محبوب محی الدین نواب کے نشتر قلم سے معاشرے کے اسی انفرادی اور اجتماعی فرض کی داعی ایک شاہکار داستان۔ سسپنس کے خاص صفحات پر خصوصی کہانی۔
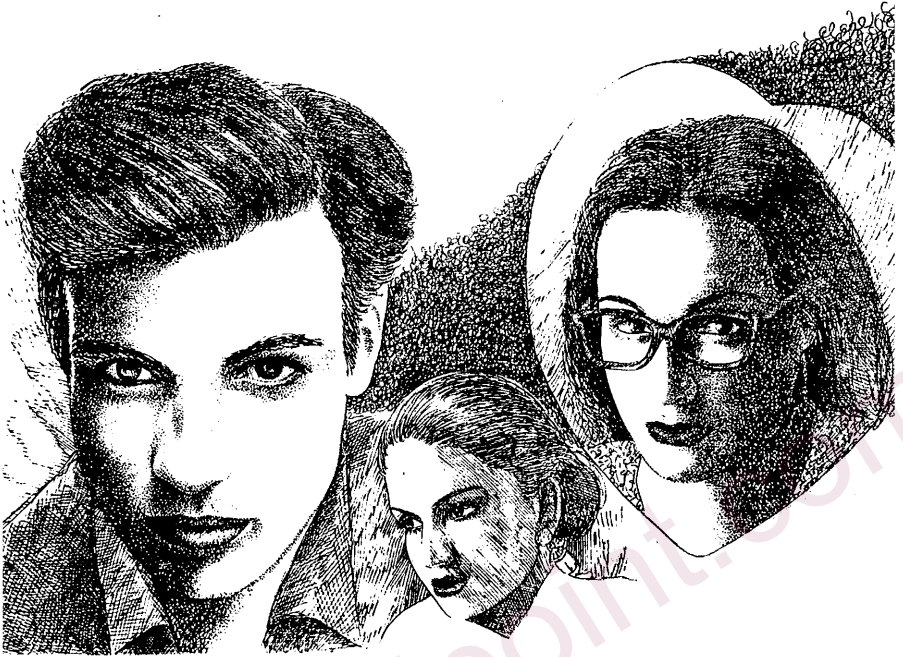
دِل ایک نازک سے آبگینے کی مانند ہوتا ہے جو ذرا سی ٹھیس لگنے پر بکھر جاتا ہے اور اگر اس دِل میں مُحبّت کی شمع بھی روشن ہو تو اس کی حساسیّت اپنی انتہائی حدوں کو چھُوتی ہے۔ ایسے ہی مُحبّت بھرے حسّاس دِلوں کی کہانی جن کے درمیان قربت کے باوجود بہت فاصلے تھے، دونوں مختلف راستوں کے مسافر تھے مگر منزل ایک تھی۔

طاہر جاوید مُغل

اس نوجوان کی کتھا جسے اپنی مُحبّت میں کسی کا حوالہ کسی کی بھیک قبُول نہیں تھی

واجد درمیانے قد کاٹھ اور درمیانی شکل و صورت کا تھا۔ عمر قریباً اکیس سال تھی۔ گورنمنٹ کالج کا اسٹوڈنٹ تھا۔ وہ انگلش میں ایم اے کر رہا تھا۔ درحقیقت وہ ان نوجوانوں میں سے تھا جو اسکول کالج اور یونیورسٹی میں ایک عام طالب علم کی حیثیت سے آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ وہ ہجوم کا ایک حصہ ہوتے ہیں۔ کوئی ایسی انفرادیت ان کی شخصیت میں نہیں ہوتی کہ انہیں علیحدہ سے یاد رکھا جاسکے۔ بس وہ ہوتے بھی ہیں اور نہیں بھی ہوتے۔ ان کی دوستیاں اور دشمنیاں بھی بالکل محدود ہوتی ہیں۔ صنفِ مخالف کے لیے ان میں کوئی خاص کشش نہیں ہوتی۔ کبھی کبھار کسی لڑکی کے ساتھ ان کا افیر بھی ہوجاتا ہے لیکن عموماً وہ لڑکی بھی ان ہی کی طرح عام سی ہوتی ہے۔

واجد مندرجہ بالا تمام خصوصیات پر پورا اترتا تھا۔ اگر کوئی بات مختلف تھی تو وہ یہ تھی کہ اس نے دل میں جس لڑکی کو بسایا تھا' وہ عام سی لڑکی نہیں تھی۔ وہ کالج کی سب سے "شائننگ" اور پرکشش لڑکی تھی۔ اس کا نام ساحرہ تھا۔ واجد کے دل میں وہ کچھ ایسی بسی تھی کہ نکالے نہیں نکلتی تھی۔ ایک ساتھ گورنمنٹ کالج میں پڑھتے ہوئے انہیں قریباً پانچ برس ہوچکے تھے۔ ان پانچ برسوں کا شاید ہی کوئی لمحہ ایسا ہو جب ساحرہ کا خیال واجد کے ذہن سے محو ہوا ہو۔ وہ ایک رخِ کامل تھی اور وہ ایک ٹمٹماتے ستارے کے مانند کچھ فاصلے سے اسے دیکھتا رہتا تھا۔ محبت چھپائے جانے والی

چیز نہیں اور پانچ سال کا عرصہ تو خاصا طویل ہوتا ہے۔ واجد کی محبت بھی ساحرہ سے چھپی نہیں رہ سکی تھی۔ وہ اس کی دلی کیفیات سے بخوبی آگاہ تھی لیکن اس نے واجد کی محبت کا جواب کبھی محبت سے نہیں دیا۔ اس کی یہ بے رخی سمجھ میں نہ آنے والی بات نہیں تھی۔ واجد بہت سے معاملوں میں اس کا ہم پلا نہیں تھا۔ وہ واجد کے مقابلے میں نسبتاً خوش حال گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ واجد گم صم اور کم آمیز تھا۔ وہ خوش گفتار اور ہردلعزیز تھی۔ تعلیمی لحاظ سے بھی وہ واجد سے کچھ آگے ہی تھی۔ پھر ایک اہم اور ناقابلِ تردید حقیقت ظاہری شکل وصورت بھی تھی۔ واجد شکل وصورت کے اعتبار سے بالکل عام نوجوان تھا۔ اس کا رنگ گندمی، بال سیدھے اور جسم چوڑائی کے مقابلے میں زیادہ لمبا تھا جبکہ ساحرہ کو بلا مبالغہ کالج کی تین چار اسمارٹ ترین لڑکیوں میں شمار کیا جاسکتا تھا۔ اپنی نوٹ بک سینے سے لگا کر ایک ادا سے لچکتی ہوئی وہ کیمپس کی سڑک پر چلتی تھی تو کئی سینے بے اختیار دھڑک اٹھتے تھے۔

شروع شروع میں واجد کا خیال تھا کہ شاید وہ کالج ہی کے کسی لڑکے میں دلچسپی لیتی ہے یا پھر فیملی میں کوئی معاملہ ہے جو وہ اسے یکسر نظرانداز کررہی ہے مگر بعد ازاں یہ دونوں مفروضے غلط ثابت ہوئے تھے۔ کم از کم واجد کسی ایسے ”افیر“ کا سراغ نہیں لگاسکا تھا۔ پھر ایک بار تو کالج کے کیفے ٹیریا میں بیٹھے ہوئے اس نے ساحرہ سے کہہ بھی دیا تھا۔ اس نے پوچھا تھا ”کسی کو پسند کرتی ہیں آپ؟“

”ہاں، ایک ہے“ اس نے شوخی سے جواب دیا تھا۔

”کون؟“

”بس ہے ناں۔ ہم دونوں کافی آگے نکل چکے ہیں۔ اب واپسی ممکن نہیں ہے۔“

واجد گم صم اس کی طرف دیکھتا رہا تھا ”کیا وہ بھی تمہیں چاہتا ہے؟“ اس نے پوچھا تھا۔

”ایسا ویسا“ وہ مسکرائی ”پاگلوں کی طرح میرا انتظار کرتا ہے۔ جب کالج سے گھر جاتی ہوں تو بھاگ کر میرے پاس آجاتا ہے۔ میری گود میں سر رکھ دیتا ہے۔“

پھر اس نے اپنے پرس میں سے ایک بلّے کی تصویر نکال کر واجد کو دکھائی تھی ”یہ ہے میرا مانو بلّا، اس کا نام ٹامی ہے۔“

وہ ہنس ہنس کر دہری ہونے لگی تھی۔ اس کی یہ ہنسی واجد کو اتنی اچھی لگی تھی کہ وہ کچھ اور پوچھ ہی نہیں سکا تھا۔

پچھلے چار پانچ برسوں میں واجد نے کیا کیا جتن نہیں کیے تھے۔ ساحرہ کے دل میں جگہ بنانے کے..... مگر ناکامی کے سوا کچھ نہیں ملا تھا۔ وہ واجد کی ہر بات کو مذاق میں ٹال دیتی تھی۔ مگر اس نے کبھی واجد کو دوٹوک جواب بھی نہیں دیا۔ شاید وہ واجد کی نہایت حساس طبع سے واقف تھی اور اسے معلوم تھا کہ جس دن اس نے کوئی فیصلہ کن بات کہی۔ واجد اپنی تمام تر چاہت کے باوجود اپنے آپ میں سمٹ جائے گا اور وہ ایک دلچسپ مشغلے سے محروم ہوجائے گی.....یا پھر وہ واجد کو ہاتھ میں رکھ کر کسی بہتر لڑکے کی تلاش میں تھی یا پھر یہ بھی ہوسکتا تھا کہ اس کے دل میں واقعی واجد کے لیے کوئی نرم گوشہ پیدا ہوچکا ہو۔ آخر واجد ایسا گیا گزرا بھی نہیں تھا اور اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اس کے سینے میں محبت سے لبالب بھرا ہوا ایک حسین دل تھا، وہ ساحرہ کو جس شدت سے چاہ سکتا تھا، اس شدت سے چاہنا کسی اور کے بس میں نہیں تھا۔ چار پانچ سال تک واجد اس یقین اور بے یقینی کے درمیان ڈولتا رہا تھا۔ یہ پاگل کردینے والی سوچیں تھیں، جنہوں نے ہر گھڑی اس کے ذہن کو گھیرے رکھا تھا.... اور اب ان کے تعلیمی سفر کی منزل قریب آرہی تھی۔ بی اے کے بعد واجد اور ساحرہ ایم اے میں چلے گئے تھے۔ بلکہ ایم اے کا پہلا سال بھی نصف سے زیادہ گزرچکا تھا۔ سال ڈیڑھ سال کی بات تھی اور پھر وہ ”آخری“ کلاس لگنے والی تھی جس کے بعد بلیک بورڈ بڑی اچھی طرح صاف کردیا جاتا ہے۔ ڈیسکوں پر الوداعی انداز میں ہاتھ پھیرے جاتے ہیں۔ درودیوار کو بڑی محبت سے دیکھا جاتا ہے اور کلاس فیلوز کو خداحافظ کہہ دیا جاتا ہے۔ یہ وہی آخری پیریڈ ہوتا ہے جس کے بعد اسٹوڈنٹس دیر تک باہر لان میں کھڑے رہتے ہیں۔ ایک دوجے کے ایڈریسز لیے جاتے ہیں، فون نمبر لکھوائے جاتے ہیں ”گیٹ ٹوگیدر“ پارٹیوں کے منصوبے بنتے ہیں اور ایک دوسرے کو ہمیشہ یاد رکھنے کی باتیں ہوتی ہیں۔ ایسے موقعوں پر کہنہ سال جہاندیدہ وقت دور کسی برآمدے میں کھڑا مسکراتا رہتا ہے۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ کل کیا ہوگا۔ گردش روز و شب میں یہ سارے لوگ بکھر جائیں گے۔ یہ بڑھتے ہوئے فاصلوں کو روک نہیں سکیں گے۔ انہیں چند دن یا ہفتے ایک دوسرے کی یاد ستائے گی۔ ایک دوسرے کی آوازیں کانوں میں پڑیں گی۔ چند روز فون کیے جائیں گے۔ شاید ایک آدھ ملن پارٹی بھی ہو۔ چند برتھ ڈیز پر پھیکی پھیکی ملاقاتیں بھی ہوں۔ پھر آہستہ آہستہ سب کچھ بھول جائے گا۔ فون نمبر گم ہوجائیں گے۔ پتے ”لاپتا“ ہوجائیں گے۔ نئی منزلوں کے سفر میں جو دھول اڑے گی اس میں پرانی یادیں دھندلا جائیں گی۔ پھر الماریوں کی تاریک درازوں میں ایک ”گروپ فوٹو“ پڑی رہ جائے گی جس میں مسکراتے چہروں پر اڑے اڑے رنگ ہوں گے۔

اس آخری کلاس کا غم اکثر واجد کو ستایا کرتا تھا۔ حالانکہ ابھی وہ کلاس کافی دور تھی۔ مگر اس کا تصور واجد کو آبدیدہ کردیتا تھا۔ کبھی جب وہ بہت اداس ہوتا تھا تو عافیہ اس کے پاس آبیٹھتی۔ عافیہ جسے سب عافی کہتے تھے، معمولی شکل وصورت کی لڑکی تھی۔ عینک لگاتی تھی۔ بال تھوڑے سے تھے جنہیں وہ بے حد مضبوطی سے پونی ٹیل کی شکل میں باندھے رکھتی تھی۔ شروع شروع میں عافی نے واجد میں دلچسپی لینے کی کوشش کی تھی مگر واجد کی طرف سے مثبت جواب نہ پاکر خاموش ہوگئی تھی۔ پھر چند ماہ بعد واجد کو معلوم ہوا تھا کہ عافی اپنے کسی کزن کے ساتھ ”انوالو“ ہوگئی ہے۔ بعدازاں عافی نے خود بھی اس کی تصدیق کردی تھی۔ واجد کے ساتھ چونکہ وہ کافی بے تکلف تھی لہٰذا اسے اکثر اپنے رومانس کے بارے میں بتایا کرتی تھی.... آج میں نے ضامن سے جھگڑا کیا، آج ضامن نے مجھ سے جھگڑا کیا، آج ہم دونوں جھگڑے، آج ہم دونوں

نے ایک دوسرے کو منایا وغیرہ وغیرہ۔ واجد بھی عافی کے سامنے اپنے دل کے پھپھولے پھوڑلیا کرتا تھا۔ عافی سے گفتگو کرنا کئی کلاس فیلوز کو بہت اچھا لگتا تھا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ بہت اچھا بولتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ بہت اچھا سنتی تھی۔ بولنے والے کی بات پر خوب دھیان دیتی تھی۔ بیچ بیچ میں سوال بھی کرتی جاتی تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ واقعی سن رہی ہے۔ واجد کی باتیں تو وہ خاص طور پر بہت انہماک سے سنتی تھی اور اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ وہ بھی اس کی باتیں خصوصی انہماک سے سنتا تھا۔

واجد اسے بے تکلفی سے "باس" کہتا تھا۔ وہ بھی جواباً اسے جنٹلمین کے لقب سے پکارتی تھی۔ وہ سرما کی ایک خوش گوار چمکیلی دوپہر تھی۔ کیمپس کی ایک روش پر ٹہلتے ٹہلتے واجد نے عافی سے کہا۔

"باس! کبھی کبھی تو سوچتا ہوں کہ میں بس منہ دیکھتا رہ جاؤں گا۔ وقت اپنی چال خاموشی سے چل جائے گا۔"

"چل کیا جائے گا.... چل رہا ہے" عافی نے زور دے کر کہا۔

"پھر تم ہی بتاؤ، کیا کروں؟"

"دیکھو جنٹلمین! جو کچھ کرنا ہے، تم نے ہی کرنا ہے۔ کسی اور سے توقع رکھو گے تو یہ بالکل غلط ہوگا۔"

"تو تمہیں خطرہ ہے کہ میں تمہیں پیامبر بنا کر ساحرہ کی طرف نہ بھیج دوں۔"

"یہ خطرہ کچھ ایسا بعید از قیاس بھی نہیں" وہ مسکرائی اور عینک کے پیچھے اس کی آنکھیں بھی مسکرانے لگیں۔

"کیا مطلب؟"

"شاید تم بھول رہے ہو۔ پچھلے سال تم ایک ایسی کوشش کر چکے ہو۔ تم نے مجھ سے کہا تھا کہ میں ساحرہ سے بے تکلف ہونے کی کوشش کروں اور اس کا عندیہ لوں۔"

"مجھے نہیں یاد۔"

"لیکن مجھے یاد ہے جنٹلمین! اور یہ بھی یاد ہے کہ میں نے کیا جواب دیا تھا۔ میں نے کہا تھا کہ میرے سر پر جو تھوڑے بہت بال ہیں وہ بھی نہیں رہیں گے۔ مس صاحبہ، غصے میں آگئیں تو جھانپڑ لگا لگا کر میرا سر پلپلا کر دیں گی۔ ہمارا ان کا کوئی مقابلہ نہیں۔ وہ بادشاہ لوگ ہیں اور بادشاہ سے رعایا کا کیا موازنہ!"

واجد نے دانت پیس کر کہا "کبھی کبھی تم اپنی باتوں سے خود کو "اصلیت" سے زیادہ حقیر ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہو جو انسان خود اپنی عزت نہیں کر سکتا، وہ دوسروں سے کیسے کرا سکتا ہے۔ بھئی ٹھیک ہے، وہ ذرا کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتی ہے مگر ہم بھی کوئی ایسے گئے گزرے تو نہیں۔ پھر دولت سے آدمی چھوٹا بڑا تو نہیں ہو جاتا۔"

"تو کیسے ہوتا ہے چھوٹا بڑا؟"

"اپنی سوچوں سے۔"

"تمہاری سوچ بڑی ہے ناں تو پھر ثبوت دو اس کا۔ ڈرتے کیوں ہو؟ جو کچھ کہنا ہے، صاف صاف لفظوں میں ساحرہ سے کہہ ڈالو۔ تختہ یا تختہ، کچھ تو ہوگا۔ یوں درمیان میں تو نہ لٹکتے رہو گے۔

اگر اس کے دل میں تمہارے لیے کچھ ہے تو وہ تمہارے دوٹوک بات کرنے سے ختم نہیں ہو جائے گا اور اگر کچھ نہیں تو پھر ہزار سال کے خاموش انتظار سے بھی کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ میری مثال تمہارے سامنے ہے۔"

"کیا مطلب؟"

وہ مسکرائی "پورے دو برس خاموش رہی اور سوچتی رہی کہ شاید تم کچھ پھوٹو گے، بے وقوف تھی، پھر عقل آئی.... اور اچھے وقت پر اچھا فیصلہ کر لیا۔ تم سے بہتر پا لیا۔ بہت زیادہ محبت کرنے والا، بہت زیادہ مخلص۔ اگر تمہارے انتظار کی دیوار سے سر پھوڑتی رہتی تو رو رو کر اندھی ہو چکی ہوتی۔"

واجد نے اس پر گھونسا تانا تو وہ جلدی سے دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ انگلی اٹھا کر بولی "دیکھو جنٹلمین! کچھ بھی ہے، میں تمہاری باس ہوں۔ حفظ مراتب ملحوظ خاطر رہے۔"

"آپ کی گاڑھی اردو کا در فٹے منہ!" واجد نے کہا اور اپنے کلاس روم کی طرف چلا گیا۔

بظاہر تو وہ کلاس روم میں آگیا تھا مگر حقیقتاً عافی کے ساتھ ہی رہا۔ اس کی باتیں واجد کے کانوں میں گونجتی رہیں اور اس کے دلائل واجد کے ذہن میں سرایت کرتے رہے۔ اس روز جب وہ کالج سے گھر کی طرف لوٹ رہا تھا۔ وہ ایک اہم فیصلے پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے ساحرہ سے آخری اور فیصلہ کن بات کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔

اگلے روز بھی نہایت خوش گوار دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ کیمپس کے وسیع گراؤنڈ میں اسٹوڈنٹ یہاں وہاں ٹولیوں کی صورت میں بیٹھے تھے۔ مونگ پھلی، مولیاں اور گاجریں کھائی جا رہی تھیں۔ واجد بھی ساحرہ کو لے کر ایک گوشے میں لکڑی کے بینچ پر آ بیٹھا۔ ساحرہ اس کے تاثرات بڑے غور سے دیکھ رہی تھی "خیریت ہے واجد! آج بڑے سیریس نظر آ رہے ہو؟"

"زندگی میں کبھی نہ کبھی تو بندے کو سیریس ہونا ہی پڑتا ہے" وہ بولا۔

"لیکن آج کا خوش گوار دن تو اس کام کے لیے زیادہ موزوں نہیں تھا۔"

"ساحرہ بی بی! اصل موسم تو انسان کے اندر کا ہوتا ہے اور میرے اندر پچھلے کئی سال سے پت جھڑ کا موسم ہی ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ تم پر پھر شاعری کا موڈ سوار ہے۔ ویسے مائنڈ نہ کرنا شاعری تمہاری افسردہ شکل پر سوٹ بھی بہت کرتی ہے۔ اگر تم کالج کے مشاعرے میں پڑھو تو خوب داد پاؤ.... لیکن تمہیں تو جیسے ہر قسم کی اچھی کارکردگی سے بیر ہے۔ وہ تمہاری دوست عائی ٹھیک کہتی تھی۔ کنوئیں کے بیل بن کر رہنا چاہتے ہو تم۔"

"نہیں، اب کنوئیں کا بیل بن کر رہنا نہیں چاہتا۔ اب میں اس دائرے سے نکلنا چاہتا ہوں۔" واجد نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

ساحرہ ایک بار پھر چونک کر اسے دیکھنے لگی، وہ بولا "ہاں ساحرہ! میں اس عذاب سے نکلنا چاہتا ہوں۔ یقین کرو، میرا دل و دماغ ماؤف ہو چکا ہے۔ یہی حال رہا تو کسی بھی کام کا نہیں رہوں گا۔"

"کیا بات ہے، ضرورت سے زیادہ سنجیدہ ہو" ساحرہ نے غور سے اسے دیکھا۔

"ہاں ساحرہ! پلیز.... مجھے اس جان لیوا عذاب سے نکال لو۔ مجھے بتا دو کہ تمہارے دل میں میرے لیے کوئی جگہ ہے یا نہیں؟ میں آج تمہاری زبان سے اپنی قسمت کا فیصلہ سننا چاہتا ہوں۔"

وہ سنجیدہ تھی لیکن ایک دم پھر کھلکھلا کر ہنس دی "تم نے کوئی زبردست قسم کی ٹریجڈی فلم تو نہیں دیکھ لی؟"

"میری بات کو مذاق میں مت لو ساحرہ! پلیز، مجھے بتا دو کہ میری حیثیت کیا ہے۔ پلیز ساحرہ! اب یہ سب کچھ مجھ سے مزید برداشت نہیں ہوتا۔ آئی ایم رئیلی ٹائرڈ!"

وہ بھی دوبارہ سنجیدہ ہو گئی۔ کچھ دیر غور سے واجد کو دیکھتی رہی۔ تب بولی "کیا ضروری ہے کہ زندگی میں ہر بات کھول کر ہی بیان کی جائے۔ میرے خیال میں تو "اظہار" جتنا زیادہ ہوتا ہے، زندگی اتنی ہی مشکل ہوتی جاتی ہے۔"

"میرے لیے زندگی جتنی مشکل ہے، اس سے زیادہ اور کیا ہو گی۔"

"بھئی میں نے کیا کہہ دیا ہے جو اتنے ناراض ہو مجھ سے؟"

"یہی تو مسئلہ ہے کہ تم نے کچھ کہا نہیں۔ تمہاری خاموشی چار برس سے مجھے خون کے آنسو رلا رہی ہے.... پلیز ساحرہ! میں تمہارے دل کی بات جاننا چاہتا ہوں۔"

ساحرہ کے چہرے پر اچانک بے پناہ سنجیدگی امڈ آئی۔ وہ گہری سانس لے کر بولی "واجد، میں تمہارے دلی جذبات کسی حد تک سمجھتی ہوں لیکن دل پر کسی کا بس نہیں ہوتا.... میرے جذبات تم سے مختلف ہیں۔ تم میرے اچھے دوستوں میں سے ایک دوست تو ہو لیکن.... اس کے سوا.... کچھ نہیں۔ میں جانتی ہوں کہ تمہاری دل شکنی کر رہی ہوں لیکن "دوٹوک بات کرنے" کا مطالبہ بھی تو تم نے ہی کیا ہے۔"

واجد یک ٹک اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھیں جیسے پتھرا گئی تھیں، رنگ بالکل زرد تھا۔ ساحرہ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "مجھے افسوس ہے.... مگر میرے خیال میں اگر حقیقت کی جستجو ہو تو پھر اسے قبول کرنے کا حوصلہ بھی ہونا چاہیے۔"

دونوں کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔ تب ساحرہ نے کہا "اچھا چلتی ہوں" وہ اٹھی اور مین گیٹ کی طرف روانہ ہو گئی۔

○☆○

اس خوشگوار دوپہر کو ہونے والی "دوٹوک" گفتگو نے واجد کی زندگی کا رخ بدل دیا۔ قریباً ایک ماہ تو وہ غم کے شدید ریلے میں بہتا رہا۔ یادوں کے پتھروں سے ٹکرا ٹکرا کر اس کا جسم پاش پاش ہوتا رہا۔ پھر اس ٹوٹے پھوٹے واجد میں سے ایک نیا واجد برآمد ہونے لگا۔ زخمی زخمی سینے والا یہ واجد ماضی کو فراموش کر دینا چاہتا تھا۔ ہمیشہ کے لیے نہ سہی چند سالوں کے لیے.... وہ زندگی میں اپنا ایک منفرد مقام بنانا چاہتا تھا۔ وہ ہجوم کا حصہ بن کر رہنا نہیں چاہتا تھا۔ اپنی ایک نمایاں شناخت کا خواہاں تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ محنت کے خاردار راستے پر چل کر روشن مستقبل کی سنہری منزل کی طرف بڑھے گا۔ اس نے خود کو سرتاپا حصول تعلیم میں غرق کر لیا۔ وہ ایم اے میں امتیازی پوزیشن کے حوالے سے اپنے والد کا دیرینہ خواب پورا کرنا چاہتا تھا۔ اس کے والد سول سرونٹ تھے اور اب ریٹائرڈ لائف گزار رہے تھے۔ وہ شاعری سے بھی شغف رکھتے تھے۔ انہوں نے ایم اے انگلش اور ایم اے اردو دونوں امتیازی نمبروں سے پاس کیے تھے۔ واجد کی والدہ ایک نہایت شفقت کرنے والی گھریلو خاتون تھیں۔ واجد کے علاوہ اس کی صرف ایک چھوٹی بہن تھی اور وہ دونوں والدہ سے بے پناہ محبت کرتے تھے لیکن والد سے اس کا لگاؤ والدہ سے بھی زیادہ تھا۔ وہ تھے بھی ان کے دوستوں کی طرح.... بچپن میں مارنا تو دور کی بات ہے، انہوں نے کبھی بچوں کو ڈانٹا تک نہیں تھا۔ ہنسنے ہنسانے والے شخص تھے اور بچوں کو اگر کچھ سمجھاتے بھی تھے تو ہنسی ہنسی میں یوں سمجھاتے تھے کہ وہ انہیں اپنے ہی دل کی بات محسوس ہوتی تھی۔ واجد ان سے بہت بے تکلف تھا۔ اکثر لاڈ سے ان کی گود میں سر رکھ دیتا تھا اور کبھی کبھی آنکھیں بند کر کے دل کی بات بھی کہہ دیتا تھا۔ ساحرہ کے حوالے سے بھی اس نے بہت کچھ والد کو بتا دیا تھا۔ خاص طور سے آخری ملاقات کا دکھڑا اس نے سنایا تھا اور اس دوران میں اس کی

آنکھوں سے مسلسل آنسو بہتے رہے تھے۔ والد صاحب نے اس کا شانہ تھپکا تھا اور کہا تھا "آنسو پونچھ لو بیٹا۔ یہ آنسو دل کی آنچ کو کم کر دیتے ہیں، یہ آنچ کم ہو جائے تو پھر بہت کچھ کھو کر بھی بہت کچھ پایا نہیں جا سکتا۔ یہ آنچ بڑی گراں مایہ چیز ہے۔ بڑے بڑے سائنس دان، عالم، فن کار اور تاریخ پر انمٹ نقش بنانے والے لوگ اسی آنچ کے مرہونِ منت رہے ہیں۔"

اور اس روز واقعی واجد نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے تھے۔ وہ ہمہ تن اپنی تعلیم کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ اس نے پہروں تنہائی میں بیٹھ کر اپنی ذات میں موجود خامیوں کا سراغ لگایا اور انہیں دور کرنے کی کوشش شروع کر دی.... مگر یہ صورتِ حال تادیر برقرار نہیں رہ سکی.... دھیرے دھیرے دل میں پیدا ہونے والی وہ تحریک مدھم پڑنے لگی جو ساحرہ کی طرف سے زوردار ٹھیس لگنے کے بعد پیدا ہوئی تھی۔ پانچ چھ ماہ بعد ایک روز اس نے خود اپنا تجزیہ کیا تو خاصا مایوس ہوا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ آہستہ آہستہ حالات سے سمجھوتا کرنے پر آمادہ ہو گیا ہے۔ اس نے کہیں پڑھا تھا کہ مقدر کا ایک دائرہ ہوتا ہے، انسان چاہے بھی تو اس دائرے سے باہر نہیں نکل سکتا۔ شاید وہ بھی مقدر کے دائرے کا قیدی تھا۔ اس نے سوچا۔ اس سے پہلے بھی تو کئی مرتبہ ایسا ہوا تھا۔ زندگی میں کچھ ایسے جھٹکے لگے تھے کہ وہ سرتاپا ہل گیا تھا۔ ایسے موقعوں پر اس نے خود کو تبدیل کرنے کا تہیہ کیا تھا۔ اپنے حوصلوں کو مہمیز کیا تھا۔ اپنے ارادوں کو صیقل کیا تھا۔ چند مہینے یا چند ہفتے وہ اپنے آپ کو بدلنے کی سرتوڑ کوشش کرتا رہا تھا لیکن تب ایک بار پھر بتدریج وہ وہیں پر آرکا تھا جہاں سے چلا تھا۔ ہجوم میں شامل وہی ایک معمولی آدمی بن گیا تھا جس کی الگ سے کوئی شناخت نہیں ہوتی۔ جو ہر لحاظ سے ایک اوسط شخص ہوتا ہے، پڑھائی میں اوسط، میل جول میں اوسط، ذہانت میں اوسط، بے شک یہ آخری چوٹ کچھ زیادہ ہی شدید تھی مگر تھی تو چوٹ ہی جس سے پیدا ہونے والے درد کو کچھ عرصے بعد بہتر ہو جانا تھا.... اور یہ بہتر ہو رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی شاید واجد کے اندر کی آنچ بھی مدھم ہو رہی تھی۔ وہی آنچ جو انسان کو معمولی سے غیر معمولی بناتی ہے۔ جب واجد اپنے اندر کی اس مدھم آنچ کو دیکھتا تھا تو بڑی مایوسی کے ساتھ سوچتا تھا۔ شاید اس کے مقدر میں ہمیشہ ایک عام شخص رہنا ہی لکھا ہے۔ بعض اوقات انسان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا کہ اس کی ذات کو کہاں سے نقصان پہنچے گا یا کہاں سے ناقابل گمان فائدہ ہو جائے گا۔ اس فائدے یا نقصان میں انسان کی کسی کوشش یا غلطی کو دخل نہیں ہوتا۔ یہ سب کچھ آپوں آپ ہی ہوتا ہے اور ایک بے خبر شخص کی زندگی کو حیرت انگیز طور پر تبدیل کر دیتا ہے۔ کسی بے کار جگہ کی قیمت اچانک آسمان سے باتیں کرنے لگتی ہے۔ کوئی لاٹری نکل آتی ہے۔ کوئی بھولا بسرا عزیز بہت سی جائداد نام کر کے مرجاتا ہے۔ واجد کی ذات کو بھی ایک ایسے ہی غیر متوقع ذریعے سے اچانک فائدہ پہنچنا شروع ہو گیا۔ یہ سب کچھ بڑے عجیب انداز میں شروع ہوا۔ بہت اوٹ پٹانگ سلسلہ تھا۔ خود واجد کو بھی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے.... ایک نئی فلم لگی۔ اس میں ایک کہنہ مشق ہدایت کار نے کچھ نئے ستارے بھی متعارف کرائے تھے۔ اس فلم میں کیریکٹر ایکٹر قسم کا رول کرنے والا ایک نوجوان ارمغان مراد نمایاں ہو کر سامنے آیا۔ یہ عام سی شکل و صورت کا نوجوان تھا۔ وزن کے مقابلے میں قد بھی کچھ طویل تھا، بہرحال اس نے بڑی منجھی ہوئی اداکاری کی تھی۔ اس نوجوان کی شکل اور قامت کچھ کچھ واجد سے ملتی تھی۔ خاص طور سے آنکھیں، پیشانی اور بال کافی مشابہت رکھتے تھے۔ کالج کے چند لڑکوں نے یہ فلم دیکھی، انہوں نے واجد سے کہا۔ "اوئے! تو، تو اس مراد نامی ایکٹر جیسا لگتا ہے۔"

واجد نے اس بات پر کوئی توجہ نہیں دی۔ لیکن جب کئی زبانوں سے اس نے یہی بات سنی تو اس نے ایک روز اخبار میں غور سے اس ایکٹر کی تصویر دیکھی۔ وہ بھی اسی کی طرح عام سے خدوخال کا مالک تھا۔ واجد کو تو اس میں کوئی بہت زیادہ مشابہت نظر نہیں آئی۔ شاید یہ پوز ذرا مختلف تھا۔

ارمغان مراد نامی یہ فلم ایکٹر بہت جلد فلم انڈسٹری کا معروف اداکار بن گیا۔ درحقیقت فلم کی تکمیل کے دوران میں ہی فلم کی رپورٹ اسٹوڈیو میں عام ہو جاتی ہے اور انڈسٹری کے دانشوروں کو معلوم ہو جاتا ہے کہ کس فلم کا مستقبل روشن ہے اور کس ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات ہیں۔ لہٰذا عام طور پر کامیاب فلم کے ریلیز ہونے سے بہت پہلے ہی اس کے ستاروں کی مارکیٹ ویلیو بڑھ جاتی ہے اور کسی ستارے کی قسمت زیادہ اچھی ہو تو وہ دھڑادھڑ کاسٹ بھی ہونے لگتا ہے۔ ارمغان مراد کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا تھا۔ چند ہفتے بعد ارمغان مراد کی ایک اور فلم ریلیز ہوئی اور اس نے تو جیسے ایکدم اسے شہرت کے آسمان پر پہنچا دیا۔ اب تک اسے کریکٹر ایکٹر یا معاون اداکار کے رول ملے تھے لیکن اس نئی فلم کی کامیابی دیکھ کر ایک ہدایت کار نے اسے بطور ہیرو بھی کاسٹ کر لیا۔ ہیرو کے لیے ارمغان مراد کی جسامت اور شکل وصورت کچھ زیادہ مناسب نہیں تھی لیکن جب کسی اداکار کی باکس آفس ویلیو بڑھتی ہے اور اسے دھڑادھڑ کاسٹ کیا جا رہا ہوتا ہے تو پھر اسے "ہیرو" لینے کا رسک بھی لے لیا جاتا ہے۔ اس وقت نہ تو عمر دیکھی جاتی ہے، نہ جسامت اور نہ شکل وصورت پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔

ارمغان مراد کی بطور ہیرو پہلی فلم اس کے پردۂ سیمیں پر ظہور کے قریباً چھ ماہ بعد ریلیز ہو گئی۔ اس فلم کے پہلے شو کے فوراً بعد ارمغان مراد فلم انڈسٹری میں بطور ہیرو "اسٹیبلش" ہو گیا۔ اس کی عام شکل وصورت سے قطع نظر نہ صرف اسے ہیرو مان لیا گیا بلکہ بے تحاشا پسند بھی کیا گیا۔ اس کی رنگین تصاویر نے اخباروں کے صفحات ڈھانپ لیے اور الیکٹرانک میڈیا پر اس کا چرچا ہو گیا۔ ویسے یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ پاک و ہند کی فلم انڈسٹریز میں اکثر ایسے ہیروز کا طوطی بولا ہے جو "خوب صورت اور اسمارٹ ہیرو" کے مروجہ معیار پر پورے نہیں اترتے۔ انڈیا میں دبلا پتلا امیتابھ اور پاکستان میں چوڑا چکلا سلطان راہی اس کی مثالیں ہیں۔

یہ تو ایک فلم اسٹار کی کہانی تھی۔ بظاہر اس کہانی کا واجد کی

روداد سے تعلق نہیں لیکن حقیقت میں تعلق موجود بھی تھا۔ اس نئے فلم اسٹار کی شکل وشباہت واجد سے بہت حد تک ملتی تھی۔ واجد جو اس سے پہلے کالج میں اور اپنے اردگرد کے ماحول میں ایک عام سانوجوان تھا۔ اب عام نہیں رہا تھا' اسے دیکھا جاتا تھا۔ اس پر غور کیا جاتا تھا۔ جب وہ قریب سے گزرجاتا تھا تو اس پر تبصرے کیے جاتے تھے۔ وہ اب کالج میں ایک جانی پہچانی شخصیت تھی۔ کئی بے تکلف کلاس فیلوز نے اسے "ہیرو صاحب" کہہ کر مخاطب کرنا شروع کردیا تھا۔ بازار میں' گلی محلے میں' ملنے جلنے والوں میں ہر جگہ۔ اسے فوری طور پر نوٹ کیا جاتا تھا۔ اس سے بات چیت کی جاتی تھی اور کبھی کبھی اس کے لیے ایسے کلمات بھی ادا کیے جاتے تھے جن میں تعریف اور ستائش کا پہلو ہوتا تھا۔ ایسے موقعوں پر وہ اکثر سوچتا تھا یہ تعریف اور ستائش کس "کارکردگی" پر ہے۔ کیا یہ اس کا کوئی کارنامہ ہے کہ اس کی شکل ایک معروف اداکار سے ملنے لگی ہے؟

پہلے پہلے اسے یہ سب کچھ بہت برا لگتا تھا لیکن پھر اس نے حالات سے سمجھوتا کرلیا۔ نہ صرف سمجھوتا کرلیا بلکہ کسی وقت اسے اپنا نمایاں اور منفرد ہونا اچھا بھی لگنے لگا۔ ہر شخص میں یہ آرزو موجود ہوتی ہے کہ کسی حوالے سے اسے پہچانا جائے۔ اسے محسوس کیا جائے اور واجد میں تو یہ خواہش ضرورت سے زیادہ تھی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ہر لحاظ سے ایک اوسط شخص تھا۔ جس طرح پانی میں قطرے کی پہچان نہیں ہوتی' اپنے ماحول میں اس کی بھی کوئی پہچان نہیں تھی۔ دھیرے دھیرے اس نے غیرارادی طور پر اپنی وضع قطع کو معروف فلم اسٹار کے مطابق بنانا شروع کردیا۔ پہلے اس نے اپنے بالوں کا اسٹائل بدلا۔ پھر اس کے لباس میں تبدیلی آئی۔ آخر اس کی چال ڈھال میں ایک تغیر رونما ہونے لگا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے یہ سب کچھ اچھا لگ رہا تھا۔ اب تو راہ چلتے لوگ دھوکا کھاجاتے تھے۔ وہ چونک کر اس کی طرف دیکھتے تھے اور تذبذب میں پڑجاتے تھے۔ ان کا حیرت آمیز تذبذب واجد کو اچھا لگتا تھا۔ غور سے دیکھنے کے بعد کچھ لوگوں کو تو معلوم ہوجاتا تھا کہ وہ فلم اسٹار ارمغان مراد نہیں لیکن کچھ کسی فیصلے پر نہیں پہنچ پاتے تھے۔ بہرحال جو جان جاتے تھے کہ وہ ارمغان مراد نہیں' وہ بھی شکل وصورت کی مشابہت سے محظوظ ضرور ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ ایک کوئز پروگرام میں شرکت کے لیے ٹی وی اسٹیشن گیا۔ وہاں ایک ٹی وی پروڈیوسر نے اسے باقاعدہ ڈرامے میں کام کرنے کی پیش کش کردی لیکن وہ فطرتاً شرمیلا اور کم آمیز تھا۔ اس نے صاف انکار کردیا.... پھر ایک روز تو کمال ہوگیا۔ وہ اپنے ایک دوست سے ملنے ایک انشورنس کمپنی کے آفس میں گیا۔ وہاں اتفاقاً کمپنی کے جنرل منیجر نے اسے دیکھا اور اپنے دفتر میں بلاکر اس کا مختصر انٹرویو کیا۔ اس انٹرویو کے بعد جنرل منیجر نے واجد کو ملازمت کی پیش کش کردی۔ یہ معقول ملازمت تھی۔ آغاز میں ہی چار ہزار تنخواہ تھی' الاؤنسز وغیرہ بھی تھے' واجد حیران رہ گیا۔ اس نے کمپنی کے افسر سے اپنے جواب کے لیے دو روز کی مہلت مانگ لی۔

گھر آکر اس نے ساری بات والد صاحب کو بتائی۔ وہ مسکرانے لگے۔ وہ جانتے تھے کہ آج کل واجد کے ساتھ عجیب وغریب واقعات پیش آرہے ہیں۔ انہوں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "پھر تم نے کیا سوچا سن؟"

وہ بولا "ڈیڈی! یہ سب کیا ہورہا ہے میرے ساتھ۔ آپ نے مجھے اپنی قوت بازو پر بھروسا کرنا سکھایا ہے۔ مجھے بتایا ہے کہ "صلہ" وہی جائز ہے جو محنت کے بدلے میں ملے۔ آپ بتائیں' کیا جو صلہ مجھے مل رہا ہے اور جو آسانیاں میرے لیے پیدا ہورہی ہیں' میں ان کا حق دار ہوں؟ میرا کارنامہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ میری شکل وصورت اور جسامت اتفاقاً ایک مشہور ومعروف شخص کے ساتھ ملنے لگی ہے۔"

اس کے والد نے مسکراتے ہوئے کہا "تمہارا فلسفہ اپنی جگہ درست ہے سن..... لیکن جو آسانیاں تمہارے لیے پیدا ہورہی ہیں یا جو تھوڑی بہت اہمیت تمہیں مل رہی ہے اس کے لیے تم نے کوئی غلط راستہ اختیار نہیں کیا ہے' نہ ہی یہ کسی منصوبہ بندی کا نتیجہ ہے۔ اتفاق کے تحت تمہاری ایک اہمیت بن گئی ہے۔ اس اہمیت کی وجہ سے اگر کچھ مواقع پیدا ہورہے ہیں تو ان سے فائدہ نہ اٹھانا میرے خیال میں ناشکری ہوگی۔ اگر تمہیں ملازمت مل رہی ہے تو اسے قبول کرو۔ اس کے بعد تم اپنی ذاتی محنت اور لگن سے خود کو اہل ثابت کرسکتے ہو اور جتنی چاہو ترقی بھی کرسکتے ہو۔"

"لیکن تعلیم ڈیڈی!"

"تعلیم بھی ساتھ ساتھ چلتی رہے گی۔ ایم اے تو تم کرنے ہی والے ہو۔ اس کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رکھ سکتے ہو۔ لیکن جو کچھ بھی کرنا ہے اپنے دل سے پوچھ کر کرو۔ اگر کسی بات پر تمہارا دل نہ مانے تو پھر اسے قبول نہ کرو' یہی دیانت داری ہے۔"

والد کے کہنے پر واجد نے سروس جوائن کرلی۔ ڈیوٹی بہت آسان تھی۔ وہ وقت نکال کر کالج بھی جارہا تھا۔ یہاں کبھی کبھار ساحرہ سے بھی ملاقات ہوتی۔ وہ دونوں بس ایک دوسرے کو دور ہی سے دیکھتے۔ سرما کی اُس چمکیلی دوپہر میں ہونے والی آخری ملاقات کے بعد ان میں کبھی کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ ساحرہ اپنے حال میں مست تھی اور وہ اپنے آپ میں مگن تھا۔ ہاں کبھی کبھی تنہائی میں وہ سوچتا تو اس کی آنکھیں بھر آتیں۔ اس نے ساحرہ کو بہت ٹوٹ کر چاہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ جتنی محبت وہ ساحرہ کو دے سکتا تھا' شاید ہی کوئی دے سکے۔ مگر یہ بھی اپنی جگہ اٹل حقیقت تھی کہ ساحرہ کا اور اس کا کوئی جوڑ نہیں تھا۔ وہ نام ہی کی نہیں شکل وصورت کی بھی ساحرہ تھی جبکہ واجد کسی گنتی میں نہیں آتا تھا اور پھر بات صرف شکل وصورت ہی کی نہیں تھی وہ ہر لحاظ سے برتر تھی۔ واجد اس پہلو سے سوچتا تو اسے لگتا کہ شاید وہی غلطی پر تھا۔ اسے چاند کی آرزو کرنی ہی نہیں چاہیے تھی۔

ایک دن وہ ایسے ہی خالی کلاس روم میں بیٹھا تھا کہ عانی اس کے پاس چلی آئی۔ "بڑے غم ناک ہو جنٹلمین!" وہ اس کے شانے سے لگ کر بیٹھ گئی۔

"شکل ہی ایسی ہے" وہ افسردگی سے بولا۔

"بھئی شکل تو میری بھی ایسی ہے لیکن تمہاری طرح دیوداس تو نہیں ہوں۔"

"تمہاری تقدیر بری نہیں ہوگی۔"

"تقدیر تمہاری بھی بری نہیں جنٹلمین.... تقدیر اچھی یا بری ہوتی ہی نہیں۔ بس انسان باحوصلہ یا بے حوصلہ ہوتا ہے۔"

"تو کیا میں بے حوصلہ ہوں؟"

"تو اور کیا ہو؟" وہ چھوٹی سی ناک چڑھا کر بولی "اللہ کا دیا سب کچھ ہے' ہاتھ پیر سلامت ہیں۔ ماشا اللہ تندرست ہو۔ اب تو ملازمت بھی مل گئی ہے... اور تمہارے اس خبط کا بھی کوئی جواز موجود نہیں رہا۔"

"کون سا خبط؟"

"یہی کہ تم ایک بالکل عام شخص ہو' کوئی ایسی نمایاں بات نہیں تم میں کہ تمہیں ہجوم سے علیحدہ یاد رکھا جاسکے.... دیکھو' بیٹھے بٹھائے تمہارا کتنا فائدہ ہوگیا ہے۔ اب تمہیں دور ہی سے پہچان لیا جاتا ہے۔ تمہاری طرف لوگوں کی تعریفی نظریں اٹھتی ہیں۔ اپنے ماحول میں اور اردگرد کے لوگوں میں تم ایک ممتاز شخص ہو' بتاؤ ہو کہ نہیں؟"

"ہوں.... لیکن مجھے ان سب باتوں سے کیا لینا۔ اپنی زندگی کی سب سے بڑی بازی تو میں ہار چکا ہوں۔ جسے زندگی میں سب سے زیادہ پیار کیا' اسی کو اپنا نہ سکا۔"

"ضروری تو نہیں کہ انسان جو چاہے وہی حاصل کرلے۔ اب... مجھے ہی... دیکھو۔ میں نے دل کی گہرائیوں سے ایک خواہش کی۔ لیکن جب یہ دیکھا کہ اس کا پورا ہونا ممکن نہیں تو قسمت کا رونا لے کر نہیں بیٹھ گئی۔ نہ ہی محرومیوں کو گلے کا ہار بنایا۔ زندہ رہنے کے لیے ایک نئے راستے پر قدم رکھا اور یقین کرو جنٹلمین! آج میں خوش اور مطمئن ہوں۔ مجھے اس بات پر پختہ یقین ہوگیا ہے کہ خدا نے ہر زخم کا مرہم رکھا ہے۔ جلد یا بدیر ہر زخم کا مداوا ہوسکتا ہے۔ کل ضامن کی پچیسویں سالگرہ تھی۔ اس نے مجھے "پی سی" میں انوائیٹ کر رکھا تھا۔ ہم دونوں قریباً ایک گھنٹا اسی موضوع پر بات کرتے رہے۔ ضامن اکثر کہا کرتا ہے' زندگی کیسی بھی ہو وہ بہرحال قدرت کا انعام ہے کیونکہ اسی میں امید کی کرن چھپی رہتی ہے اگر ہم اس کی قدر کرتے رہیں گے تو یہ کتنی بھی بری ہو ایک دن انعام بن جائے گی۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اس کو انعام بننا ہی پڑتا ہے۔"

واجد نے ایک گہری سانس لے کر اپنے الجھے الجھے بالوں میں ہاتھ پھیرا "تو پھر میں کیا کروں باس؟"

وہ بولی "بس حوصلے کے ساتھ زندہ رہو۔ باقی جو کرنا ہے قدرت خود ہی کرے گی۔ کرکٹ کی گیم میں جب باؤلر کھیل پر چھائے ہوئے ہوں تو بلے بازوں کو ایک مشورہ دیا جاتا ہے۔ ان سے کہا جاتا ہے کہ اسکور بنانے کی کوشش نہ کرو' بس وکٹ پر ٹھہرے رہو' رنز تو خود بخود بنتے رہیں گے۔"

اس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ ابھری "تم باتیں بڑی چکردار کرتی ہو۔"

"مگر خود تو چکردار نہیں ہوں ناں۔ جو دل میں ہوتا ہے وہی زبان پر۔"

"بھئی! تم تو بالکل سیدھی ہو جلیبی کی طرح۔"

"دیکھو جنٹلمین! تم پھر حفظِ مراتب کی اہمیت کو پس پشت ڈال رہے ہو۔ ایک طرح سے تم بین السطور...."

"خدا کے لیے یہ گاڑھی اردو اپنے پاس رکھو" واجد نے ہاتھ جوڑدیے "میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں اس کالج بلکہ شہر کا سب سے چغد بندہ ہوں اور مجھے پہلی فرصت میں اپنے غم سے نجات حاصل کرنی چاہیے یا پھر خودکشی کرلینی چاہیے۔"

وہ ہنس ہنس کر دہری ہونے لگی۔ اس کے نرم بال پھسل کر رخساروں پر ڈھلک آئے۔

چند روز بعد کالج میں مشاعرہ تھا۔ اس کے علاوہ لڑکے لڑکیوں میں بیت بازی کا مقابلہ بھی تھا۔ واجد نے اس قسم کی سرگرمیوں میں کبھی حصہ نہیں لیا تھا۔ تاہم مشاعرہ سننے کے لیے وہ کالج آگیا تھا۔ ساحرہ بھی موجود تھی۔ وہ بیت بازی کرنے والی ٹیم میں شامل تھی اور ہر طرف چہکتی پھر رہی تھی۔ واجد ایک گوشے میں عافی کے ساتھ گم صم بیٹھا تھا۔ ایک دو دیگر دوست بھی موجود تھے۔ بیت بازی اور مشاعرے کے درمیان تھوڑا سا وقفہ تھا۔ اس وقفے کے دوران میں اسٹوڈنٹ یونین کے سیکریٹری کی نگاہ واجد پر پڑگئی۔ وہ بولا "خواتین وحضرات ہمارے درمیان ملک کی ایک مشہور ومعروف شخصیت بھی موجود ہے۔ کمرشل اور آرٹ فلموں کے مشہور اداکار مسٹر ارمغان مراد.... اگر آپ لوگ تالیوں کے ذریعے اپنی خواہش کا اظہار کریں تو امید ہے کہ وہ ضرور اسٹیج پر تشریف لائیں گے۔"

ایک دم ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ سب اٹھ اٹھ کر واجد کی طرف دیکھنے لگے۔ چاروناچار وہ اسٹیج پر پہنچا۔ اس کی خاصی پذیرائی ہوئی۔ لڑکیوں کی طرف سے فرمائش آئی کہ واجد انہیں ارمغان مراد کے روپ میں ایک نئی فلم کے ڈائیلاگ سنائے۔ یہ نئی فلم بہت اچھی تھی اور واجد نے بھی وڈیو پر دو تین مرتبہ دیکھی تھی۔ اسے چند ڈائیلاگ یاد بھی تھے۔ جب تماشائیوں کا اصرار بہت بڑھا تو اس نے دو چار ڈائیلاگ سنا ڈالے۔ ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ کئی طرح کی فرمائشیں آنے لگیں۔ واجد پہلے تو جھجکتا رہا پھر یہ فرمائشیں پوری کرنے لگا۔ ایک غزل ٹیپ ریکارڈر پر بجائی گئی اور اس پر واجد نے ہونٹ ہلاتے ہوئے تھوڑی سی پرفارمنس بھی دی۔ لوگ مشاعرہ وشاعر بھول کر واجد کی طرف متوجہ ہوگئے تھے۔ اس ہنگامے میں واجد نے ساحرہ کی تلاش میں نظر دوڑائی۔ وہ اپنی نشست پر نظر نہیں آرہی تھی۔ وہ ہال چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ واجد کی یہ پذیرائی برداشت نہیں کرسکی ہو۔

اس رات قریباً ایک گھنٹے تک وہ سیکڑوں حاضرین کی توجہ کا مرکز بنا رہا۔ اسے شدت کے ساتھ یہ احساس ہوا کہ میڈیا میں کتنی طاقت ہے۔ اس میڈیا نے ایک عام شخص کو ہردلعزیز ہیرو بنایا تھا

اور لوگ اس سے اتنی محبت کرتے تھے کہ اس جیسی مشابہت رکھنے والے شخص کو بھی سر آنکھوں پر بٹھا رہے تھے۔ حالانکہ وہ بخوبی جانتے تھے کہ یہ وہ نہیں ہے۔

اس سے تیسرے روز کی بات ہے' واجد کو اپنے گھر کے ایڈریس پر ایک کارڈ موصول ہوا۔ کارڈ کا عنوان تھا "MISSED YOU" یہ دیکھ کر واجد بری طرح چونک گیا کہ یہ کارڈ ساحرہ کی طرف سے تھا۔ وہ ساری رات اس کارڈ کے بارے میں سوچتا رہا۔ اگلے روز کالج سے ہفتہ وار تعطیل تھی۔ وہ اپنے کمرے میں لیٹا ہوا تھا کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ پتا نہیں کیوں اس کے دل نے گواہی دی کہ یہ کوئی اہم فون ہے اور کسی اہم ہستی کی طرف سے ہے۔ اس کا قیافہ سوفیصد درست تھا۔ دوسری طرف ساحرہ کی آواز واجد نے صاف پہچان لی۔ وہ ملائمت سے بولی "کیسے ہو فرینڈ؟"

"بہت جلدی خیال آگیا" واجد نے لرزاں آواز میں کہا۔

"چلو آتو گیا ناں۔ تم نے تو ہیرو صاحب بننے کے بعد نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔"

"اس سے کیا حاصل ہونا تھا؟"

"کیا پتا کچھ ہو ہی جاتا" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ پھر ایک دم سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی "اکثر سوچتی رہتی ہوں کہ پتا نہیں اس دن میں نے تم سے کچھ زیادہ ہی سخت بات کہہ دی تھی۔"

"جیسی روح ویسے فرشتے۔ وہ بات میری اوقات کے عین مطابق تھی۔"

"افوہ' لگتا ہے۔ اب تک ناراض ہو..... بلکہ زیادہ ہی ناراض ہو۔"

کچھ دیر فون لائن پر خاموشی رہی۔ پھر ساحرہ کی آواز آئی۔

"آج شام کیا ہو رہا ہے ہیرو صاحب!"

"کچھ.... خاص تو نہیں۔"

"تو پھر آؤ..... کہیں بیٹھ کر چائے پیتے ہیں۔ ایک چائے تمہاری طرف ادھار بھی تو ہے۔"

"شاید میں نہ آسکوں۔ میرے پاس آج موٹر سائیکل بھی نہیں ہے۔"

"اچھا..... میں آجاتی ہوں..... تمہیں گھر سے پک کر لیتی ہوں" ساحرہ نے کہا۔

واجد انکار کرنا چاہتا تھا لیکن نہ کرسکا۔ قریباً ایک گھنٹے بعد وہ ساحرہ کے ساتھ اس کی سوزوکی آلٹو پر قریبی ریسٹورنٹ کی طرف جا رہا تھا۔

وہ ملاقات کافی خوشگوار ماحول میں ہوئی اور ڈیڑھ دو گھنٹے جاری رہی۔ تجدید تعلقات کے حوالے سے یہ بڑی مثبت ملاقات تھی۔ ساحرہ اپنے سابقہ رویے پر کچھ پشیمان نظر آتی تھی۔ اس کی یہ پشیمانی بار بار اس کے عارضوں پر سرخ رنگ بکھیر دیتی تھی۔ شرم' شوخی اور پشیمانی اس کی آنکھوں میں یوں گھل مل گئی تھیں کہ آنکھوں کا حسن کئی گنا بڑھ گیا تھا۔ اس ملاقات کے بعد دو ہفتوں میں دونوں کی چار پانچ ملاقاتیں اور ہوئیں۔ واجد واضح طور پر محسوس کر رہا تھا کہ ساحرہ اس کی طرف بڑھنا چاہتی ہے۔ اس کی نگاہوں میں اپنے لیے پسندیدگی کا اعلان وہ صاف پڑھ سکتا تھا۔ دونوں کے درمیان تازہ ترین میوزک کی کیسٹوں کا تبادلہ ہوا۔ انہوں نے اپنے ایک مشترکہ دوست کے گھر میں سی ڈی پر چند تازہ ترین فلمیں بھی دیکھیں۔ ان میں سے ایک فلم ارمغان مراد کی تھی۔ فلم سب کو بہت پسند آئی۔ ساحرہ نے واجد کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا "ارمغان مراد کی فلمیں تو پہلے بھی دیکھی تھیں لیکن اب یہ کچھ زیادہ ہی اچھی لگنے لگی ہیں" جب واجد نے پوچھا کہ کیوں اچھی لگنے لگی ہیں تو وہ شرما کر بولی "یہ خود سے پوچھو۔"

واجد گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھتا چلا گیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔

ایک روز نہر کے کنارے کنارے لمبی ڈرائیو کے بعد واجد اور ساحرہ واپس آرہے تھے۔ فیروز پور روڈ سے گزرتے ہوئے نجف کالونی کے پاس واجد کی نگاہ اچانک عافی پر پڑی۔ وہ بس اسٹاپ کے ہجوم میں کھڑی بس کا انتظار کر رہی تھی۔ جس وقت واجد کی نگاہ عافی پر پڑی' عافی نے بھی اسے دیکھ لیا۔ واجد نے ساحرہ کو گاڑی روکنے کا کہا۔ گاڑی روکتے روکتے ساحرہ نے بھی عافی کو دیکھ لیا تھا۔ عافی مسکراتی ہوئی ان کے پاس آگئی۔ وہ حسب معمول عام سے لباس میں تھی۔ بال کھینچ کر باندھے ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھ میں نوٹ بک تھی۔ یقیناً کالج سے واپس آرہی تھی۔

"گھر جا رہی ہو؟" ساحرہ نے پوچھا۔

"ہاں.... ارادہ تو یہی ہے۔"

"تو آؤ بیٹھ جاؤ۔ ہم ڈراپ کر دیں گے۔" ساحرہ نے کہا۔

عافی نے مسکراتی نظروں سے دونوں کو دیکھا اور پھر پچھلی نشست پر بیٹھ گئی۔ راستے میں تینوں بے تکلفی سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ سمن آباد کے قریب ایک موڑ پر عافی نے کہا۔

"بس' مجھے یہیں اتار دیں' بہت شکریہ!"

"بھئی گھر تک چھوڑ آتے ہیں۔ ایسی بھی کیا بات ہے۔" ساحرہ نے کہا۔

"نہیں' یہاں سے پاس ہی ہے' میں چلی جاؤں گی۔"

واجد بولا "بھئی' ہم وعدہ کرتے ہیں کہ واپسی پر تمہارے گھر کا راستہ بالکل بھول جائیں گے۔"

تینوں ہنسنے لگے۔ بہرحال عافی کا اصرار دیکھتے ہوئے ساحرہ نے گاڑی روک دی۔ عافی شکریہ ادا کرتے ہوئے ایک گلی میں اوجھل ہوگئی۔

واجد اور ساحرہ دوبارہ اپنے راستے پر روانہ ہوگئے۔ ساحرہ مسکراتے ہوئے بولی "بس کچھ مڈل کلاس لوگوں کا یہی تو مسئلہ ہوتا ہے۔ سفید پوشی اور رکھ رکھاؤ کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ زندگی کی سچائیوں سے دور چلے جاتے ہیں۔ اب دیکھو اسے..... یہاں اتر گئی ہے اور کہتی ہے کہ گھر پاس ہی ہے' مگر مجھے پتا ہے کہ اس کا گھر کافی دور ہے اور ایک کچی پکی سڑک سے گزر کر وہاں جانا پڑتا ہے۔"

"بہت معلومات ہیں تمہیں عانی کے بارے میں۔"

"ہاں... اس کی ایک محلے دار میری دوست بھی ہے۔ وہ بہت کچھ بتایا کرتی ہے اس بارے میں۔"

"مثلاً کیا بتاتی ہے؟"

"یہی کہ بس سفید پوشی ہی سفید پوشی ہے اور کچھ نہیں ہے۔ ایسے لوگ ہر بات گھما پھرا کر کرتے ہیں۔ ہر معاملے میں پردہ داری' ہر بات میں الجھاؤ.... ایسے لوگ جھوٹی عزت آن کے لیے لمبی چوڑی کہانیاں گھڑنے سے بھی نہیں چوکتے۔ عانی کے بارے میں وہ کزن والی بات تو سنی ہی ہوگی تم نے؟"

"ہاں سنا ہے کہ اپنے کسی کزن سے سنجیدہ قسم کا رومانس چل رہا ہے اس کا۔"

ساحرہ نے قہقہہ لگایا "سرا سر ڈینگ ہے یہ.... میں نے عانی کی محلے دار سے پوری تفتیش کی تھی۔ وہ کہتی ہے کہ عانی نے اپنا بھرم رکھنے کے لیے یہ کہانی گھڑ رکھی ہے۔"

"بھرم رکھنے کے لیے؟"

"ہاں بھئی۔ لوگ اتنے بے خبر نہیں ہیں۔ سب کو سب کچھ معلوم رہتا ہے.... شروع شروع میں عانی نے تم میں دلچسپی لی تھی لیکن تمہاری طرف سے کورا سا جواب مل گیا تھا۔ اسی ناکامی کی خفت کو مٹانے کے لیے اس نے اپنے جھوٹے رومانس کی خبر چلادی۔ بات کچھ بھی نہیں تھی۔ ضامن نام کا وہ لڑکا عانی کا کزن ہے اور کوئٹہ میں رہتا ہے۔ میری معلومات کے مطابق وہ بے چارہ آج تک لاہور بھی نہیں آیا۔ جب کہ عانی صاحبہ اس کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر دریائے راوی کے کنارے اور مینار پاکستان کے سبزہ زاروں میں ٹہلا کرتی ہیں۔" وہ ایک بار پھر قہقہہ لگا کر ہنسنے لگی۔ اگر اس کے ہاتھ اسٹیئرنگ پر نہ ہوتے تو شاید وہ واجد کے ہاتھ پر ہاتھ مارنے کی کوشش بھی کرتی۔ واجد خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"چلو چھوڑو' ان باتوں کو" واجد نے کہا "یہ بتاؤ کہ اٹھائیس تاریخ کا کیا پروگرام ہے؟"

"کیوں اٹھائیس تاریخ کو کیا ہے؟"

"ارے بھول گئیں۔ اٹھائیس تاریخ کو ہماری آخری کلاس ہے۔"

"اوہ گاڈ.... میں واقعی بھول گئی تھی.... میں نے تو پروگرام بنا رکھا ہے کہ اٹھائیس تاریخ کو ایک بالکل منفرد انداز میں بتائیں۔ آخری..... کلاس میں رونا اور منہ بسورنا تو معمول کی بات ہے۔ ہم کیوں نہ خوش باش' ہنستے گاتے اور قہقہے لگاتے جدا ہوں۔ آخر یہ کوئی زندگی کا اختتام تو نہیں کہ یوں خود پر سوگواری طاری کرلی جائے۔ یہ تو راستے کا ایک موڑ ہے اور اس موڑ کے بعد راستہ بھی باقی رہتا ہے اور سفر بھی۔"

"تم کیا کہنا چاہ رہی ہو؟"

"میرا ارادہ ہے کہ ہم اپنے تمام کلاس فیلوز کو ایک سرپرائز دیں۔ ایک زبردست ورائٹی پروگرام کا اہتمام کیا جائے اور بالکل خفیہ خفیہ.... ون مین شو کا سپر اسٹار حمید اختر میرے بڑے بھائی جان کا گہرا دوست ہے۔ وہ ہمیں ایک ڈیڑھ گھنٹا بالکل مفت دے دے گا۔ اس کے ہوتے ہوئے کسی اور کی ضرورت تو نہیں مگر ہم پاپ سنگرز جمیل اور عقیل کو بھی بلالیں گے۔ وہ دونوں ہمارے کلاس فیلو ٹیپو کے فرسٹ کزن ہیں۔ پیروڈی بھی ایسی زبردست کرتے ہیں کہ ہنسا ہنسا کر ادھ موا کردیتے ہیں۔ پھر تم خود بھی تو "ہیرو صاحب" ہو۔ ایک دو آئٹم مزاحیہ ڈائیلاگ والے تم بھی پیش کردینا۔ ایسا رنگ جمے گا کہ سب یاد کریں گے۔"

"لیکن....!"

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ یہ پروگرام ہونا ہے اور ضرور ہونا ہے.... اور خبردار' یہ سب کچھ ٹاپ سیکرٹ رہنا چاہیے۔"

"مگر ساحرہ..."

"مگر وگر کچھ نہیں۔ جو کہہ دیا' بس کہہ دیا۔ تم بے شک کوئی ڈونیشن وغیرہ نہ دینا۔ ہم دو تین ساتھی انتظام کرلیں گے۔ شو کے بعد چائے وائے پلادیں گے۔ بس تم اتنا کرنا کہ اپنے ایک دو آئٹم تیار کرلینا... اوکے؟"

ساحرہ اسے کچھ بولنے کا موقع ہی نہیں دے رہی تھی۔ ویسے بھی واجد کا اسٹاپ آگیا تھا۔ گاڑی رک گئی۔ ساحرہ نے بڑی ملائمت سے واجد کا ہاتھ دبایا اور وہ اسے خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آیا۔ ساحرہ کی گاڑی چکنی سڑک پر پھسلتی ہوئی آگے چل دی۔ واجد سڑک کے کنارے کھڑا دور جاتی گاڑی کو عجیب نظروں سے دیکھتا رہا۔

○☆○

...اور وہ آخری کلاس تھی۔ اس کلاس میں زیادہ تر ایسے طلبا تھے جو پانچ چھ سال یا اس سے بھی زیادہ اکٹھے رہے تھے۔ کئی موسموں کئی تہواروں اور ان گنت خوشگوار لمحات کی یادیں ان کے ساتھ تھیں۔ آج وہ ان یادوں کے ساتھ آخری کلاس اٹینڈ کررہے تھے۔ پھر انہیں اپنے اپنے راستوں پر آگے بڑھ جانا تھا۔ جونہی گھنٹی بجی' استاد محترم نے اپنے لیکچر کے آخری دو تین فقرے مکمل کیے اور چاک نیچے رکھ کر ہاتھ جھاڑ دیے "تھینک یو لیڈیز اینڈ جنٹلمین۔ ہم اپنے سبق کے اختتام کو پہنچتے ہیں" انہوں نے بے تکلف انداز میں کہا۔

کلاس روم میں کتنی ہی دیر سناٹا رہا۔ اداسی ہل اسٹیشن کے بادل کی طرح آہستہ آہستہ کلاس روم میں داخل ہونا شروع ہوگئی تھی۔ یہی وقت تھا جب ساحرہ اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی اور پُرجوش آواز میں بولی "نہیں مائی ڈیئر کلاس فیلوز.... ہم اولڈ فیشن میں منہ لٹکائے رخصت نہیں ہوں گے۔ ہم اس موقع کو CELEBRATE کریں گے۔ خوشی منائیں گے اور خوش خوش گھروں کو جائیں گے۔"

پھر اس نے اعلان کیا کہ ساری کلاس ہال میں پہنچ جائے۔ سب کچھ پروگرام کے مطابق تھا۔ ہال میں تماشائیوں کے

بیٹھتے ہی اسٹیج کا پردہ اٹھا اور ساحرہ کی اناؤنس منٹ کے بعد پروگرام شروع ہوگیا۔ ورائٹی شو توقع سے زیادہ جاندار تھا اور اس کی وجہ یہی تھی کہ ایک کامیڈی کنگ ان کے درمیان موجود تھا۔ حمید اختر نے ون مین شو کیا اور ایک گھنٹے تک ہنسا ہنسا کر تماشائیوں کے پیٹ میں بل ڈال دیے.... اس کے بعد میوزک اور پیروڈی کے تین چار آئٹم پیش کیے گئے جو حاضرین نے بے حد پسند کیے۔ تب ایک بار پھر حمید اختر نے کچھ مزاحیہ آئٹم پیش کیے۔ تالیاں بجا بجا کر حاضرین کے ہاتھ سرخ ہو گئے۔ ان مزاحیہ آئٹمز کے دوران میں واجد نے بھی اسٹیج پر ایک "انٹری" دی۔ حاضرین کے پرزور اصرار پر اس نے معروف فلمی ہیرو کے انداز میں چند مکالمے سنائے۔ اس کا انداز بے حد پسند کیا گیا۔ آخر ہنسی مذاق سے بھرپور یہ شو اختتام کو پہنچا اور لوگ چائے پی کر رخصت ہونے کو تیار ہو گئے۔

ہنس ہنس کر سب کی آنکھوں میں آنسو آئے ہوئے تھے' لیکن چائے پیتے پیتے سب کے چہرے ایک بار پھر اداس ہونے لگے۔ بالکل جیسے سرما کا مہربان سورج تھوڑی دیر چمکنے کے بعد پھر سے بادلوں کے نرغے میں آنے لگے.... ایک دو لڑکیاں تو باقاعدہ سسک رہی تھیں اور اپنی دوستوں سے گلے مل رہی تھیں۔

واجد چائے کی پیالی پکڑے ساحرہ کے قریب کھڑا تھا' کہنے لگا۔ "ساحرہ! ہم انسانی فطرت اور رویے کو آسانی سے بدل نہیں سکتے.... دیکھو' تم نے کتنی کوشش کی کہ اس آخری ملاقات میں غم کی فضا پیدا نہ ہو لیکن جو ہونا تھا وہ ہو کر رہا ہے۔ دیکھو' سب کے سب ایک بار پھر افسردہ نظر آرہے ہیں۔ کوئی ایک چہرہ بھی مجھے دکھادو جو اس وقت مسکرا رہا ہو۔"

"میں مسکرا رہی ہوں" وہ شوخی سے بولی۔

"لیکن تم بھی.... تادیر نہیں مسکرا سکو گی" وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

"کیا؟" اس نے چونک کر کہا۔

واجد نے ایک گہری سانس لی اور بولا "آج تم نے اپنے کلاس فیلوز کو ایک سرپرائز دیا ہے۔ ایک سرپرائز تمہارے لیے میرے پاس بھی ہے۔"

"کیسا سرپرائز!"

"ان دوسرے بہت سے لوگوں کی طرح آج میں اور تم بھی ایک دوسرے سے جدا ہو رہے ہیں۔ یہ لوگ تو شاید پھر بھی کبھی نہ کبھی مل پائیں گے لیکن ہم نہیں ملیں گے۔"

"یہ کیا الٹی سیدھی باتیں کر رہے ہو واجد!" ساحرہ کی آنکھیں حلقوں سے ابل پڑیں۔

"ہاں ساحرہ! ہم کبھی نہیں مل سکیں گے' کیونکہ ہمارے درمیان کچھ ایسا ہے ہی نہیں جو ہمیں ملا سکے۔"

"یہ.... یہ کیا کہہ رہے ہو واجد.... تمہیں کیا ہوگیا ہے.... میں.... میں تم سے محبت کرتی ہوں۔"

"نہیں ساحرہ! تم مجھ سے نہیں' اس مشہور و معروف چہرے سے محبت کرتی ہو جو آج سلور اسکرین پر جگمگاتا ہے اور دلوں کی دھڑکن ہے۔ مجھ سے تمہاری محبت صرف اور صرف اسی چہرے کے حوالے سے ہے ورنہ..... میں تو اب بھی وہی ہوں۔ کالج کا وہی معمولی طالب علم جو کسی بھی حوالے سے پہچانے جانے کے قابل نہیں..... لمبے سے قد کا کم صورت لڑکا۔"

"واجد.... واجد! یہ کیا ہوگیا ہے تمہیں؟" ساحرہ نے دونوں ہاتھوں سے واجد کے شانے تھام لیے۔ واجد نے بے رخی سے اس کے دونوں ہاتھ جھٹک دیے۔ "میں تم سے محبت کرتا تھا ساحرہ! اور تمہیں پانا میری زندگی کا سب سے سہانا خواب تھا۔ تمہارے انکار کے باوجود میری خواہش تھی کہ میں کسی طرح تمہارا دل جیت سکوں۔ اور مجھے امید تھی کہ میں خود کو اس قابل بنالوں گا کہ تم مجھے چاہو۔ لیکن میں یہ سب کچھ اپنی کوشش اور محنت سے کرنا چاہتا تھا۔ کسی کے چہرے کو کشکول بنا کر تمہاری محبت کی بھیک لینا نہیں چاہتا تھا۔"

"پلیز واجد! مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔"

"جتنا میں تمہیں سمجھا ہوں شاید تم خود بھی نہیں سمجھتی ہو۔"

"کیا سمجھا ہے تم نے؟"

"تم.... میری توقع سے زیادہ سطحی لڑکی ثابت ہوئی ہو۔ مجھے معاف کرنا ساحرہ.... مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں دل کی گہرائی سے تمہیں ناپسند کرنے لگا ہوں۔"

ساحرہ پتھر کی مورتی بنی کھڑی رہی۔ اس کا چہرہ بھی پتھر ہی کی طرح سپاٹ ہوگیا تھا.... وہ جیسے یقین نہیں کر پا رہی تھی کہ واجد نے اس کے لیے ایسے سخت الفاظ کہے ہیں۔

وہ لرزاں آواز میں بولی "تو تم مجھ سے اپنا راستہ جدا کرنا چاہتے ہو؟"

"ہمارا راستہ کبھی ایک ہوا ہی نہیں تھا" اس نے بے رخی سے کہا۔

ساحرہ کے چہرے پر بتدریج سختی نمودار ہوگئی۔ اس کے ہونٹ بھنچ گئے تھے۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہی تھی مگر کہہ نہیں پا رہی تھی۔ پھر اس نے بے حد طیش سے اپنے بال پیشانی سے جھٹکے۔ واجد پر ایک ایسی نظر ڈالی جس میں بے شمار تلخ الفاظ انگاروں کی طرح دہک رہے تھے۔ "مجھے لگتا ہے کہ فی الحال تم اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہو۔" وہ بولی۔ تب اس نے اپنا رخ پھیرا اور بڑی تیزی سے باہر نکل گئی۔

واجد کتنی ہی دیر اپنی جگہ گم صم کھڑا رہا۔ کلاس کے اکثر اسٹوڈنٹ ہال سے نکل کر باہر سبزہ زار پر چلے گئے تھے۔ آج اپنی آخری کلاس اٹینڈ کرنے کے لیے وہ خصوصی طور پر تیار ہو کر آئے تھے۔ اول جلول لڑکوں نے بھی ڈھنگ کے لباس پہن رکھے تھے۔ لڑکیوں کے رنگین آنچل لہرا رہے تھے اور شیمپو سے دھلے ہوئے بال ڈھلتے سورج کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ اداس اداس سے ماحول میں مستقبل کی باتیں ہو رہی تھیں۔ رابطے برقرار رکھنے کے عہد و پیمان کیے جا رہے تھے اور ساتھ ساتھ ان عہد و پیمان کی ناتوانی پر غور بھی کیا جا رہا تھا۔ عافی بوجھل قدموں سے چلتی اس کی طرف آئی۔ وہ ہال کے ایک نیم تاریک گوشے میں کھڑا تھا۔ وہ واجد کو صاف نہیں دیکھ سکتی تھی لیکن وہ اسے صاف دیکھ سکتا تھا۔ آج اس نے پڑھائی کی عینک نہیں لگا رکھی تھی۔ بال بھی ذرا ڈھیلے ڈھالے انداز میں باندھے ہوئے تھے۔ آسمانی رنگ کی شلوار قمیص اور سفید سوئٹر میں وہ کافی کِھلی کِھلی نظر آ رہی تھی "ہیلو جنٹلمین!" وہ قریب آ کر بولی۔

"ہیلو باس!" واجد نے جواب دیا۔

"تو ہم اپنے سفر کے اختتام کو پہنچتے ہیں" وہ ٹھنڈی سانس لے کر شستہ انگلش میں بولی۔

"ہاں، ایک سفر ختم ہوا۔"

"شاید یہ خدا حافظ کہنے کا وقت ہے۔" اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

"ہاں، یہ خدا حافظ کہنے کا وقت ہے" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا "آج میں نے کئی چیزوں کو خدا حافظ کہا ہے.... ایک ایسی نگاہ کو خدا حافظ کہا ہے جو صرف اس لیے مجھ سے محبت کرتی تھی کہ مجھ میں کسی کی مشابہت پائی جاتی ہے.... ایک ایسی نوکری کو خدا حافظ کہا ہے جو مجھے صرف اس "مشابہت" کی وجہ سے ملی تھی۔ آج میں نے ان تمام دوستوں کو بھی خدا حافظ کہنے کا فیصلہ کر لیا ہے جو صرف اس لیے میرے دوست بنے تھے کہ میں کسی مشہور و معروف اسٹار سے مشابہت رکھتا ہوں..." وہ کھوئے کھوئے انداز میں بول رہا تھا۔

"آج تو بڑے جذباتی موڈ میں ہو۔ لگتا ہے کہ واقعی کوئی فلمی اداکار بول رہا ہے۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ اس افسردہ موقع کو اور افسردہ نہ کرو۔"

"شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو" اس نے گہری سانس لی، پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا "آئندہ کیا پروگرام ہے تمہارا، کیا کر رہی ہو اب؟"

وہ چند لمحے خاموش رہی۔ پھر ذرا شرمیلے لہجے میں بولی۔ "پروگرام تو وہی ہے جو پہلے بھی تمہیں بتا چکی ہوں۔ امی ابو شادی پر زور دے رہے ہیں۔ ضامن کا بھی یہی خیال ہے۔ وہ دو چار ہفتے تک کوئٹہ سے لاہور آ رہا ہے۔"

"سچ مچ آ رہا ہے یا اسی طرح آ رہا ہے جیسے پہلے آتا رہا ہے؟"

"کیا مطلب؟"

وہ اس کے قریب چلا آیا "تم کس سے جھوٹ بول رہی ہو مس عافیہ.... خود سے، مجھ سے یا زمانے سے؟"

"ک.... کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"عافی شاید تمہیں معلوم نہیں، میں پچھلے تین چار دن تمہاری جاسوسی میں لگا رہا ہوں۔ میں نے وہ سب کچھ.... ہاں سب کچھ معلوم کر لیا ہے جو تم چھپاتی رہی ہو اور اب بھی چھپا رہی ہو۔ تم نے غلط بیانی کی ہے عافی۔ تمہارا اپنے کسی ضامن نامی کزن سے کوئی افیر نہیں۔ اور یہ غلط بیانی تم نے اس لیے کی کہ تم مجھے کسی بھی طرح کے ذہنی بوجھ اور خلش سے بچانا چاہتی تھیں۔ تم نے مجھ سے پیار کیا تھا لیکن میں اس پیار کا جواب پیار سے نہیں دے سکا تھا۔ تم نے اپنے تمام آنسو اپنے سینے میں چھپا لیے اور مجھے کبھی احساس تک نہیں ہونے دیا کہ تم اب بھی میری دوری کا غم جھیلتی ہو۔ تم نے خود کو خوش باش ثابت کرنے کے لیے ضامن کا کردار گھڑا اور اسے یوں متعارف کرایا... کہ ہر کسی کو اس پر پختہ یقین آگیا۔ بولو، کیا میں غلط کہہ رہا ہوں، بولو؟" اس نے جذباتی انداز میں عافی کو شانوں سے پکڑ کر جھنجوڑ دیا۔ عافی کی آنکھوں کے کٹوروں سے آنسو بہہ نکلے۔ واجد نے اس کے شانے چھوڑ دیے۔ دونوں کتنی ہی دیر گم صم ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ خاموشی زبان بن کر دونوں کے دلوں پر ناقابل گمان اثر کر رہی تھی۔ پھر واجد نے گلوگیر آواز میں کہا "باس! آخری کلاس ختم ہو چکی ہے.... لیکن یہ خدا حافظ کہنے کا وقت نہیں۔ یہ خوش آمدید کہنے کا وقت ہے۔ میں تمہیں خوش آمدید کہتا ہوں۔ دل کی گہرائیوں سے.... یس.... آئی لو یو باس.... آؤ اپنے اپنے چہرے اور اپنی اپنی ذات کے ساتھ ہم ایک نئے تعلق کا آغاز کریں۔"

اس نے عافی کا ہاتھ تھام لیا۔ عافی پہلے تعجب سے اسے دیکھتی رہی۔ پھر اس کے ہونٹوں پر آنسوؤں سے بھیگی ہوئی مسکراہٹ پھیل گئی۔

★★

محبت کو حساب کتاب اور نفع نقصان کے پیمانوں میں نہیں رکھا جاسکتا جو لوگ محبت میں فائدے نقصان کی باتیں کرتے ہیں وہ محبت کے مفہوم سے آشنا ہی نہیں ہوتے۔ اُس نے یہی کیا جس کا بھگتان اسے بھگتنا پڑا۔

محبت اور رقابت کے جذبوں سے معمور ایک داستانِ محبت

سود و زیاں

طاہر جاوید مغل

نوشین کے ساتھ عامر ٹوانہ کی منگنی ہو چکی تھی اور امید تھی کہ ایک سال کے اندر شادی بھی ہو جائے گی۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ نوشین اور عامر کی فیملیز تفریح کے لیے مری کے قریب بھوربن میں آئی ہوئی تھیں اور بہترین فائیو اسٹار ہوٹل میں ٹھہری ہوئی تھیں۔ دونوں گھرانے نہایت پڑھے لکھے اور ماڈرن سمجھے جاتے تھے لہٰذا نوشین اور عامر کے اکٹھے نکلنے اور گھومنے پھرنے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ وہ اکثر ہوٹل سے نکل کر لمبی ڈرائیو پر اکیلے ہی چلے جاتے تھے۔ اس شام بھی وہ دونوں ڈرائیو پر نکلے۔ نہ جانے کیسے ان کی گفتگو کا موضوع شہزاد پرواز بن گیا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ نوشین اور عامر کی معلومات کے مطابق شہزاد پرواز بھی اس علاقے کے ایک گاؤں "چشمہ پانی" میں قیام پذیر تھا۔ شہزاد پرواز ایک مصور تھا۔ وہ پچھلے قریباً دو سال سے اس گاؤں میں رہ رہا تھا اور اردگرد کے مناظر کو کینوس پر منتقل کر رہا تھا۔ یہاں اس نے لکڑی کے ایک "ہٹ" بنا رکھی تھی اور کھٹارا سی جیپ بھی رکھی ہوئی تھی۔

چند دن پہلے بھوربن کے ہوٹل میں ہی ایک ایسے شخص سے عامر کی ملاقات ہوئی تھی جس نے اسے اور نوشین کو پرواز کے تازہ ترین حالات سے آگاہ کیا تھا۔ اس شخص کا نام عبداللہ تھا۔ وہ لاہور میں عامر کی گارمنٹس کی فیکٹری میں بطور فورمین کام کرتا رہا تھا۔ اب یہاں ہوٹل میں ملازمت کر رہا تھا۔ عبداللہ نامی یہ شخص چشمہ پانی ہی کا رہنے والا تھا۔ عبداللہ نے بتایا تھا کہ گاؤں کے لوگوں سے شہزاد صاحب کا بہت کم ملنا جلنا ہے.... وہ اکثر اپنے گھر میں بند رہتے ہیں اور تصویریں بناتے ہیں یا پھر ایک چھوٹا سا خیمہ لے کر پہاڑوں کی طرف نکل جاتے ہیں اور کئی کئی دن بعد لوٹتے ہیں۔ بعض لوگ انہیں سنکی کہتے اور بعض پہنچا ہوا فنکار سمجھتے ہیں۔

عبداللہ نے شہزاد پرواز کے بارے میں ایک اور بات بھی بتائی تھی۔ اس نے کہا تھا "لوگ جو کچھ بھی کہیں بہرحال پرواز صاحب میں کچھ نہ کچھ خدا ترسی بھی ہے۔ گاؤں کی ایک لڑکی کو کشیدہ کاری کا شوق تھا۔ وہ کپڑے پر رنگین دھاگوں سے تصویریں بناتی تھی۔ جیسے پہاڑی منظر اور جانوروں پرندوں کی شکلیں وغیرہ۔ شہزاد صاحب نے نہ صرف لڑکی کا ہاتھ سیدھا کرنے میں اس کی مدد کی بلکہ اب وہ اس کی بنائے ہوئے کپڑے پنڈی لے جا کر فروخت بھی کرتے ہیں۔ اس طرح غریب لڑکی کو مناسب معاوضہ مل جاتا ہے۔ یہ آمدنی لڑکی کی بیوہ ماں اور پانچ چھوٹے بہن بھائیوں کی کفالت کا ذریعہ ہے۔" عبداللہ سے انہیں اس لڑکی کا نام "زلیخا" معلوم ہوا۔

جس وقت عامر ٹوانہ کو عبداللہ نامی شخص سے یہ معلومات حاصل ہوئیں اتفاقاً نوشین بھی پاس ہی موجود تھی۔ اس نے بھی یہ سب کچھ سنا۔ اس نے عبداللہ سے کچھ سوالات بھی کیے.... عامر کو یہ سب کچھ ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔ اس کی کچھ پرانی چوٹوں سے پھر ٹیس اٹھنے لگی تھی۔ دراصل عامر اور شہزاد پرواز میں رقابت کا ہلکا پھلکا سا رشتہ بھی تھا.... چند سال پہلے نوشین اور شہزاد پرواز اکٹھے ہی لاہور کے فائن آرٹس کالج میں پڑھتے تھے۔ دونوں میں دوستی بھی تھی۔ شاید یہ دوستی بڑھتے بڑھتے کسی اور تعلق میں ڈھل جاتی تھی لیکن اسی دوران میں نوشین کی ملاقات اپنے ہی خاندان کے خوبرو لڑکے عامر ٹوانہ سے ہوگئی۔ نوشین کے والدین کو بھی عامر برا نہیں لگا اور یوں ان دونوں کی منگنی ہوگئی۔ تاہم عامر کو اس ہلکی پھلکی وابستگی کے بارے میں بھی علم تھا جو زمانۂ طالب علمی میں نوشین اور پرواز کے درمیان رہی تھی۔ کبھی کبھار وہ چھیڑنے کے انداز میں نوشین کے سامنے پرواز کا ذکر کردیتا تھا اور کہتا تھا کہ وہ اب بھی اپنے مصور صاحب کے بارے میں سوچتی ہے.... حالانکہ وہ جانتا بھی تھا کہ ایسی کوئی بات نہیں۔

بہرحال ایک ہفتہ پہلے صورت حال قدرے مختلف ہوگئی تھی۔ ہوٹل میں عبداللہ نے تعریفی انداز میں نوشین کی موجودگی میں پرواز کا ذکر کیا تھا۔ اس سے عامر کے کسی اندرونی جذبے کو ٹھیس پہنچی تھی۔ وہ پچھلے ایک ہفتے سے مسلسل اپنے اندر الجھ رہا تھا اور تڑخ رہا تھا۔ اب جبکہ وہ دونوں لمبی ڈرائیو پر "پتریاٹہ" کی طرف جارہے تھے عامر کا موضوع سخن پرواز ہی تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"نوشین! میں ایک بات تم سے شرطیہ کہہ سکتا ہوں۔ پرواز اگر اس لڑکی کے ساتھ تعاون کررہا ہے تو یہ بے مقصد نہیں ہوگا۔ تم تو خیر پرواز کو زیادہ جانتی ہو لیکن میں بھی تھوڑا بہت جانتا ہوں۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟" نوشین نے پوچھا۔

"ہوسکتا ہے کہ تمہیں برا لگے کیونکہ تم خود بھی آرٹسٹک ذہن رکھتی ہو لیکن میرا تجربہ ہے کہ اکثر آرٹسٹ پرلے درجے کے رومان پسند ہوتے ہیں بلکہ ان کی زندگی گھومتی ہی رومانیت اور خوابوں کے اردگرد ہے۔"

نوشین بولی "تو اپنی بات صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتے۔ تمہارا مطلب یہ ہے کہ پرواز اس لڑکی کے چکر میں ہوگا۔"

"مجھے پچانوے فیصد یقین ہے کہ ایسا ہی ہوگا۔" وہ ان فنکاروں میں سے ہے جو اپنے فن اور اپنی ذات کو ایک ہی شے سمجھتے ہیں۔ کوئی خاتون ان کے کام کی تعریف کرے تو اس کا مطلب ان کے نزدیک کم از کم یہ ہوتا ہے کہ وہ ان کے عشق میں گرفتار ہوگئی ہے۔"

اس طرح کی باتیں کرتے ہوئے وہ آگے بڑھتے رہے۔ نئی ٹویوٹا کار بل کھاتی پہاڑی سڑک پر پھسلتی رہی اور شام کے سائے طویل ہوتے رہے۔ پہاڑوں کا موسم بڑا سیلانی ہوتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے دھوپ، دیکھتے ہی دیکھتے بادوباراں۔ یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔ جب وہ لوگ چلے تھے اس وقت بھی مطلع ابر آلود ہی تھا اور جب انہوں نے واپسی کا سفر شروع کیا، اچانک گہرے بادل چھا گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے تیز ہوا کے ساتھ بارش شروع ہوگئی۔ تین چار میل کا سفر انہوں نے سست روی سے قریباً نصف گھنٹے میں طے کیا پھر اچانک بادوباراں نے اتنا زور پکڑا کہ انہیں گاڑی روک دینا پڑی۔ ان سے آگے کچھ مزید گاڑیاں بھی رکی ہوئی تھیں۔ معلوم ہوا کہ آگے سلائیڈنگ ہونے کے باعث راستہ بند ہوگیا ہے۔ یہ صورت حال پریشان کن تھی۔ شہزاد نے اپنے موبائل فون پر ہوٹل میں رابطہ کرنے کی کوشش کی اور کامیاب ہوا۔ اس نے گھر والوں کو صورت حال سے آگاہ کیا اور بتایا کہ پریشانی کی بات نہیں۔ راستہ صاف ہوتے ہی وہ آجائیں گے۔

اگلے دو گھنٹے میں راستہ صاف ہی نہیں ہوسکا۔ اس دوران میں عامر کے ذہن میں ایک نیا خیال آچکا تھا۔ اس نے نوشین سے کہا "کیوں نہ ہم چشمہ پانی چلے جائیں۔ مشکل سے دو تین میل کا فاصلہ ہوگا۔ تمہارے پرانے کلاس فیلو سے ملاقات ہوجائے گی اور رات بسر کرنے کے لیے ٹھکانا بھی مل جائے گا۔ یہاں گاڑی میں بیٹھے رہے تو سردی سے جم جائیں گے۔"

نوشین نے اتفاق نہیں کیا۔ وہ بولی "کیوں مشکل کو مشکل تر بنارہے ہو۔ سڑک ٹھیک کرنے والے لگے ہوئے ہیں۔ ایک دو گھنٹے میں رستہ صاف ہو ہی جانا ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ تمہارا موڈ خوامخواہ ایڈونچر کا بن رہا ہے۔"

"بھئی! ایڈونچر کوئی بری بات تو نہیں ہے اور پھر شہزاد پرواز صاحب...."

"ہمیں اس سے کیا لینا دینا ہے بھئی!" نوشین نے بیزار ہوکر عامر کی بات کاٹی۔

"چلو دینا نہیں لیکن لے تو سکتے ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ آج کی رات اس سے اپنے سر کے لیے چھت تو لے سکتے ہیں۔"

"عامر جس بات پر اڑ جاتا تھا پھر وہاں سے اسے ہٹانا بہت مشکل ہو جاتا تھا۔ اس مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا۔ قریباً آدھ گھنٹے بعد ان کی گاڑی طوفانی بارش میں ناہموار اور تنگ سڑک پر ڈگمگاتی ہوئی "چشمہ بانی" پہنچ گئی۔

○☆○

نوشین نے پرواز کو قریباً دو سال بعد دیکھا تھا۔ وہ ویسے کا ویسا ہی تھا۔ ہاں پہاڑی علاقے میں رہ کر رنگ قدرے صاف ہو گیا تھا اور بال قدرے لمبے ہو گئے تھے۔ ہمیشہ کی طرح اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی اور لباس بھی بے قاعدہ تھا۔ اسے ایک نظر دیکھ کر ہی ایک جواں سال مصور یا شاعر کے طور پر شناخت کیا جا سکتا تھا۔ نوشین کو یہاں آکر کوفت ہی ہوئی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ یہاں آنے سے عامر کا مقصد صرف اور صرف پرواز کے بارے میں "تحقیق" کرنا ہے۔

وہ نوشین کے سامنے یہ بات ثابت کرنا چاہتا تھا کہ ایک ہفتہ پہلے عبداللہ نے پرواز کے بارے میں جو کچھ بھی تعریفی انداز میں کہا تھا' وہ حقیقت نہیں تھا۔ معلوم نہیں کہ عامر کو یہ سب کچھ ثابت کرنے میں اتنی دلچسپی کیوں تھی۔ نوشین کو یہ سب کچھ قطعی بے مقصد لگ رہا تھا۔ اگر کوئی ایسی بات تھی بھی تو اس "بات" کا پوسٹ مارٹم کرنے کی بھلا کیا ضرورت تھی بلکہ نوشین کا تو خیال تھا کہ انہیں یہاں آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ نہ جانے ایسی کیا بات تھی کہ ایک عرصے بعد پرواز سے دوبارہ مل کر اور اس سے باتیں کر کے نوشین کو الجھن سی ہونے لگی تھی۔ بھولی بسری دوستی کے حوالے سے کئی باتیں یاد آ گئی تھیں۔

پرواز کے ہٹ نما مکان میں تین کمرے اور ایک اسٹور تھا۔ رہائش کے لیے مناسب اور پر فضا جگہ تھی۔ بارش ساری رات ہوتی رہی اور وہ تینوں آگ کے گرد بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ عامر نے موبائل فون کے ذریعے اہل خانہ کو بتا دیا تھا کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہیں۔ بارش کا سلسلہ دوسرے روز بھی جاری رہا۔ راستہ بدستور بند تھا۔ شاید قدرت کو بھی یہی منظور تھا کہ وہ کچھ دیر وہاں رکیں۔ عامر کے لیے یہ صورتِ حال دل پسند تھی۔ وہ اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر پرواز کے بارے میں "مفید" چھان بین کر سکتا تھا۔

اگلے روز نو دس بجے کے قریب بارش کچھ مدھم ہو گئی۔ پرواز نے نوشین اور عامر کو بتایا کہ یہاں قریب ہی ایک پولٹری فارم ہے جہاں سے بڑی شاندار دیسی مرغیاں مل سکتی ہیں۔ اس نے کہا کہ وہ آج دوپہر کے کھانے میں انہیں دیسی گھی میں پکی ہوئی دیسی مرغی کھلائے گا۔ وہ چھتری لے کر

پولٹری فارم کی طرف چلا گیا تو نوشین اور عامر باتوں میں مصروف ہو گئے۔ نوشین نے مسکراتے ہوئے کہا "بے چارے پرواز پر تمہارا شبہ کچھ کم ہوا یا نہیں؟"

"شبہ کم ہونے کی کیا بات ہے؟" عامر نے سنجیدگی سے کہا۔

"بھئی، وہ رات کو گفتگو کے دوران تمہیں بتا تو رہا تھا کہ کشیدہ کاری والی لڑکی اسے بھائی جان کہہ کر بلاتی ہے۔"

"اونہہ.... بھائی جان۔" عامر نے منہ بنایا "وہ بھائی جان کہتی ہوگی لیکن یہ تو اسے بہن نہیں کہتا..... یہ سب کہنے کی باتیں ہیں نوشین بی بی.... میں اب بھی شرط لگانے کو تیار ہوں کہ لڑکی پر پرواز کی کرم فرمائی بے مقصد نہیں ہوگی۔"

ان کی باتوں کے دوران میں ہی رہائش گاہ کے پچھلے حصے سے کھٹ پٹ کی آوازیں آئیں۔ نوشین نے جا کر دیکھا۔ وہاں ایک لڑکی صفائی ستھرائی میں مصروف تھی۔ وہ بوسیدہ سے کپڑوں والی کوئی ملازمہ لگتی تھی۔ رنگ گہرا سانولا تھا۔ ایک آنکھ میں کچھ خرابی تھی۔ چولہا پھونکتے ہوئے دیہاتی عورتوں کی آنکھوں میں کبھی کبھی کوئی دہکا ہوا انگارا جا اٹکتا ہے اور آنکھ کا ستیاناس کر کے رکھ دیتا ہے، اس بے چاری لڑکی کے ساتھ بھی شاید یہی کچھ ہوا تھا۔ وہ برآمدے میں جھاڑو دے رہی تھی۔ اس کے ساتھ دو ڈھائی سال کا بچہ بھی تھا۔ عامر اس لڑکی کے پاس بیٹھ گیا اور ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ مقصد وہی تھا۔ یعنی پرواز اور اس زلیخا نامی لڑکی کا کھوج۔ عامر کے پوچھنے پر اس لڑکی نے بتایا کہ پرواز صاحب بڑے بھلے مانس اور خاموش طبع ہیں۔ ان میں عام لوگوں کے لیے ہمدردی بھی ہے۔ وہ ہر مہینے کے آخر میں کشیدہ کاری والے کپڑے لے کر پنڈی جاتے ہیں اور نقد بیچ آتے ہیں انہیں شہر والوں سے بات کرنے کا ڈھنگ آتا ہے۔ اسی لیے کپڑے اچھی قیمت پر بک جاتے ہیں۔ پیسے بھی نقد مل جاتے ہیں۔

عامر نے کہا "اچھا، وہ لڑکی جو کشیدہ کاری کرتی ہے کس طرح کی ہے۔ میرا مطلب ہے اچھی شکل و صورت کی ہے یا..."

لڑکی نے پہلے چونک کر عامر کی طرف دیکھا پھر سر جھکا کر عجیب لہجے میں بولی "شکل و صورت تو امیروں کی ہوتی ہے جی۔ غریبوں کی شکل و صورت ہو بھی تو کہاں نظر آتی ہے اور جو بیچارے ویسے ہی گئے گزرے ہوں ان کا تو پوچھنا ہی کیا۔"

"کیا کہنا چاہتی ہو؟" عامر نے پوچھا۔

وہ پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ بولی "میں ہی زلیخا ہوں جی۔ میرے بنائے ہوئے کپڑے ہی پرواز بھائی شہر بیچ کر آتے ہیں۔"

نوشین کے ساتھ ساتھ عامر کو بھی جھٹکا سا لگا اور وہ ٹھٹک کر لڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بالکل ہی معمولی شکل و صورت کی تھی۔ آنکھ کے عیب کی وجہ سے اور بھی معمولی نظر آرہی تھی۔ وہ جو کسی چاند چہرے والی پہاڑن کا خاکہ عامر کے ذہن میں تھا بالکل ہی چکنا چور ہو گیا تھا....

نوشین معنی خیز نظروں سے عامر کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ جیسے بہ زبان خاموشی کہہ رہی تھی "لو اب تو یقین آگیا کہ پرواز اس لڑکی کے چکر میں نہیں ہے۔"

عامر طویل سانس لے کر کمرے کی طرف مڑ گیا۔ نوشین کے پوچھنے پر زلیخا نے بتایا کہ کبھی کبھی وہ گھر کی صفائی کر دیتی ہے ورنہ پرواز بھائی جان کو تو ہفتوں تک اس قسم کا خیال نہیں آتا۔ زلیخا کے ساتھ جو بچہ تھا وہ اس کا چھوٹا بھائی تھا۔ یتیمی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ زلیخا نے بتایا کہ وہ کل چھ بہن بھائی ہیں اور والد کی وفات کے بعد بڑی مشکل سے گزر بسر کر رہے ہیں۔ وہ بتا رہی تھی کہ اللہ کے بعد یہ پرواز بھائی کی مہربانی ہے۔ اگر وہ کشیدہ کاری کے معاملے میں میری ہمت نہ بندھاتے اور میری خاطر شہر کے چکر نہ لگاتے تو شاید ہم فاقوں سے مر جاتے۔

کچھ دیر بعد زلیخا جب جھاڑ پونچھ کر کے اندر گئی تو عامر گہری سوچ میں گم بیٹھا تھا۔ اس نے سگریٹ کا طویل کش لے کر کھڑکی کے باہر جھانکا۔ بوندا باندی جاری تھی۔ پرواز کی واپسی کے ابھی کوئی آثار نہیں تھے۔ عامر بولا "گستاخی معاف، میرا اب بھی یہی خیال ہے کہ پرواز جیسے لوگ پرخلوص نہیں ہوتے۔ کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔"

"اب کیا گڑبڑ ہو گئی؟" نوشین بیزاری سے بولی۔

"تم کہو گی کہ میں تو ہاتھ دھو کر پرواز کے پیچھے پڑا ہوا ہوں۔"

"اچھا، نہیں کہتی۔ تم بتاؤ، اب کیا بات ہے تمہارے ذہن میں؟"

"میرا خیال ہے اگر لڑکی کے ساتھ پرواز کا "فلرٹ" کا چکر نہیں ہے تو پھر وہ اسے معاشی نقصان پہنچا رہا ہے۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"تمہیں تو بخوبی علم ہوگا کہ ہاتھ سے کشیدہ کاری ایک مشکل اور سخت محنت طلب کام ہے۔ اکثر ہوشیار لوگ دیہات میں جا کر یہ دست کاری ارزاں داموں خرید لیتے ہیں اور شہر میں جا کر ڈیمانڈ کے حساب سے مہنگے داموں بیچتے ہیں۔

اس دست کاری میں کچھ ایسے نمونے بھی ہوتے ہیں جو فن کے اعلیٰ معیار پر پورے اترتے ہیں۔ ان کی منہ مانگی قیمت مل جاتی ہے۔"

"وہم کا کوئی علاج نہیں عامر! اب تمہارے ذہن میں یہ خیال پختہ ہو رہا ہے کہ پرواز اس لڑکی کو اس کی محنت کا پورا معاوضہ نہیں دے رہا اور کمیشن وصول کر رہا ہے۔"

"ہو سکتا ہے کہ یہ کمیشن سے بھی آگے کی بات ہو۔ اگر کسی کی محنت کے سو روپے میں سے ساٹھ روپے رکھ لیے جائیں تو یہ کمیشن تو نہیں کہلائے گا۔"

"عامر! تم کچھ زیادہ ہی بدگمانی کا مظاہرہ نہیں کر رہے ہو؟"

"میرے خیال میں میں کم بدگمانی کا مظاہرہ کر رہا ہوں۔"

انہیں خاموش ہونا پڑا کیونکہ پرواز تین چار صحت مند مرغیاں ٹوکری میں ڈالے چلا آ رہا تھا۔ وہ دو مرغیاں پکانے کے لیے پڑوس میں دے آیا۔ تینوں بیٹھ کر پھر باتوں میں مصروف ہو گئے۔ پرواز نے عامر سے کہا "یار! میری تو رائے ہے کہ تم اپنے گھر والوں کو بھی دو چار دن کے لیے یہاں بلا لو۔ دیکھو کیسی فضا ہے۔ ہوٹل کے مصنوعی ماحول سے یہ جگہ ہزار درجے بہتر ہے۔"

"تم مصور ہو بھئی، تمہیں تو ہر طرف لینڈ اسکیپ ہی نظر آتے ہوں گے۔" عامر نے مسکراتے ہوئے کہا پھر موضوع بدلتے ہوئے کہا "کل رات تم نے کشیدہ کاری والے کپڑوں کا ذکر کیا تھا وہ کپڑے پنڈی میں کہاں بیچتے ہو تم؟"

"بس ایک دو بندے ہیں مری روڈ پر..... زیادہ تر وہی خریدتے ہیں۔"

"کون کون سے ہیں؟" مری روڈ کے اکثر دکانداروں کو میں بھی جانتا ہوں۔"

عامر نے اس حوالے سے پرواز کو کچھ مزید کریدا..... ساتھ ساتھ وہ اثبات میں بھی سر ہلاتا رہا۔

شام سے کچھ دیر پہلے وہ لوگ "چشمہ پانی" گاؤں سے ہوٹل واپس آ گئے۔ اگلے روز عامر صبح سویرے کہیں چلا گیا۔ جیسا کہ نوشین کو بعد میں معلوم ہوا وہ پنڈی گیا تھا۔ شام کو وہ

واپس آیا تو اس کے چہرے پر دبا دبا جوش تھا۔ اس نے فرصت ملتے ہی نوشین کو بتایا "میں نے کہا تھا نا کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ میں پوری "چھان بین" کرکے آیا ہوں۔ کل پرواز نے مری روڈ کے جن دو بندوں کا نام بتایا تھا۔ ان میں سے کسی ایک کو بھی وہ کپڑے فروخت نہیں کرتا۔ صرف ایک دکاندار نے بتایا کہ ڈیڑھ سال پہلے پرواز نامی مصور نے کڑھائی والے تین کرتے انہیں فروخت کیے تھے اس کے بعد اس نے کبھی صورت نہیں دکھائی۔"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" نوشین نے پوچھا۔

"پرواز کو جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ زلیخا کا کام کسی اور جگہ فروخت اور مہنگے داموں کرتا ہے۔ میری معلومات کے مطابق ایک کسٹم آفیسر سے اس کا گہرا دوستانہ بھی ہے۔ جب وہ پنڈی جاتا ہے تو اکثر اس آفیسر سے ملتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس آفیسر کے توسط سے وہ یہ کپڑے ایکسپورٹ ہی کرڈالتا ہو۔ میں نے خود دیکھا ہے یورپ کے کئی ملکوں میں ایسے گارمنٹس کی کافی مانگ ہے۔"

نوشین نے شوخ لہجے میں کہا "عامر! تم سب کو اپنے جیسا سمجھتے ہو۔ تم ایک کارخانہ چلا رہے ہو۔ تمہارا ذہن کاروباری ہے۔ ہروقت دو جمع دو کرتے رہتے ہو۔"

"میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں نوشین۔" عامر گہری سنجیدگی سے بولا "مجھے سخت کوفت ہوئی ہے پرواز کی غلط بیانی پر۔ دیکھ لینا میں ایک دو روز میں تمہیں دودھ کا دودھ پانی کا پانی کرکے دکھاؤں گا۔"

"چھوڑو بھی عامر! تم کن چکروں میں پڑ گئے ہو۔ اگر کوئی ایسی بات ہے بھی تو ہمیں چھان بین کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ بڑے بوڑھے بھی یہی کہتے ہیں کہ دوسروں کے عیبوں پر پردہ ڈالنا چاہیے۔"

"اوہو، ہم کون سا اس کے جرم کے پوسٹر لگا رہے ہیں۔ جو بات بھی سامنے آئے گی وہ ہمارے درمیان ہی رہی ہے۔"

.... یہ تیسرے روز کی بات ہے عامر اور نوشین پھر "چشمہ پانی" پہنچے۔ اتفاقاً عامر اس وقت اپنے ہٹ نما مکان پر نہیں تھا۔ اس کے پڑوس کریم خان نے بتایا کہ وہ کسی کام سے گیا ہے، سہ پہر تک آجائے گا۔ یوں لگتا تھا کہ پڑوسی ان دونوں کو ٹالنے کی کوشش کررہا ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ دونوں ہٹ میں رہیں اور عامر کا انتظار کریں۔ بہرحال عامر پختہ ارادے سے آیا تھا۔ سہ پہر تو کیا اسے رات تک بھی انتظار کرنا پڑتا تو وہ ضرور کرتا۔ وہ آج ہر صورت کسی نتیجے پر پہنچنا چاہتا تھا۔

نوشین اور عامر نے ہٹ میں قیام کیا اور پرواز کا انتظار کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد زلیخا بھی وہاں آگئی۔ وہ بھی پڑوسی کی طرح کچھ پریشان تھی۔ اس نے بتایا کہ صبح سویرے کچھ لوگ آئے تھے وہ پرواز بھائی سے اونچی آواز میں باتیں کررہے تھے۔ شاید کوئی لین دین کا جھگڑا تھا۔ اس کے کچھ دیر بعد پرواز بھائی اپنی کھٹارا جیپ میں بیٹھ کر کہیں چلے گئے تھے۔

زلیخا ان کے لیے باداموں والی چائے بنا کرلائی تھی۔ اس نے نوشین سے دیر تک باتیں کیں اور بتایا کہ وہ ان دونوں کے لیے دوپہر کا کھانا اپنے گھر بنا کرلائے گی۔ زلیخا کے جانے کے بعد نوشین اور عامر ہٹ میں ادھر اُدھر گھومنے لگے۔ یہ ہٹ ساری کی ساری لکڑی کی بنی ہوئی تھی۔ یہاں جگہ جگہ مکمل اور ادھوری تصویریں آویزاں تھیں۔ فریموں کی لکڑیاں، رنگ، برش، ایزل، پائلٹ، سب کچھ ادھر ادھر بکھرا ہوا تھا۔ ان میں سے ایک دو تصویریں کالج کے زمانے کی تھیں۔ انہیں دیکھ کر نوشین کے ذہن میں کئی پرانی یادیں تازہ ہوگئیں۔

چند دن پہلے جب نوشین اور عامر یہاں آئے تھے پرواز نے انہیں سارے کمرے دکھائے تھے لیکن برآمدے کے بائیں کونے میں واقع ایک کمرا نہیں دکھایا تھا۔ نہ ہی اس نے بتایا کہ یہاں کیا ہے۔ ان دونوں نے بھی اس کمرے کے حوالے سے کوئی سوال کرنے کی خواہش دبا لی تھی۔ کمرے کے دروازے پر تالا لگا تھا، ساری کھڑکیاں بند تھیں۔ نوشین جانتی تھی کہ پرواز کی اجازت کے بغیر عامر یہ کمرا کھول نہیں سکتا ورنہ کمرے کے اندر جھانکنے کی وہ شدید خواہش رکھتا تھا۔ اس نے دروازے کی درز سے نیچے جھانکا۔ اسٹور نما کمرے کے اندر پرالی بچھی تھی۔

وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولا "نوشین! تم یقیناً یہی سمجھو گی کہ میں پرواز کو غلط ثابت کرنے پر تلا ہوا ہوں۔ میں اس بات سے سو فیصد انکار نہیں کرتا لیکن معلوم نہیں کیا بات ہے، ہمیشہ سے میرے اندر حقیقت کو کھوجنے کی خواہش موجود رہی ہے۔ جب کوئی سوال ذہن میں اٹھتا ہے تو پھر اس کا جواب حاصل کرنا میرے لیے بہت...... بہت ضروری ہو جاتا ہے۔"

"اب تمہارے ذہن میں کیا سوال ہے۔"

"یہ تم بھی اچھی طرح جانتی ہو۔" عامر نے جواب دیا۔

دوپہر کو انہوں نے زلیخا کے ہاتھ کا پکا ہوا مزیدار کھانا کھایا۔ کھانے کے دوران میں بھی عامر زلیخا سے مختلف

سوالات کرتا رہا۔ وہ کشیدہ کاری کب سے کر رہی ہے؟ کیا بناتی ہے؟ اس پر کتنا خرچ آتا ہے؟ کیا اس نے کبھی اپنا کام کسی اور کے ہاتھ بیچا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ اس نے زلیخا سے یہ بھی کہا کہ وہ اپنے تازہ کام کا کوئی نمونہ اسے دکھائے۔ زلیخا نے کہا "مجھے افسوس ہے صاحب جی! میں نے پچھلے مہینے آٹھ کرتے بنائے تھے۔ تین چار پہلے کے پڑے ہوئے تھے۔ وہ سارے کے سارے پرواز بھائی پرسوں لے گئے ہیں۔ اب تو میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔"

"کوئی پرانا کام ہی دکھا دو۔" عامر نے کہا۔

"پرانا کام تو یہی ہے جو میں نے پہنا ہوا ہے۔" زلیخا نے اپنے بوسیدہ کپڑوں کی طرف اشارہ کیا۔

یہ کوئی دو سال پرانا سوٹ ہوگا۔ کڑھائی کے رنگ پھیکے پڑ چکے تھے۔ دھاگے نکل چکے تھے۔ ڈیزائن کی سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی۔

زلیخا اور نوشین کافی دیر تک باتیں کرتی رہیں۔ زلیخا کی باتوں میں ذہانت تھی۔ کشیدہ کاری کے حوالے سے اسے کافی معلومات بھی حاصل تھیں۔ شاید وہ شہر میں ہوتی اور اس نے کشیدہ کاری کے بارے میں کوئی کورس وغیرہ کر رکھا ہوتا تو وہ کہیں بہتر فن کارہ ہوتی۔ باتوں باتوں میں اس نے نوشین کو بتایا کہ پچھلے ڈیڑھ دو برس میں وہ کم و بیش دو سو جوڑے تیار کر کے پرواز بھائی کے ذریعے فروخت کر چکی ہے۔

زلیخا کے بہن بھائی اسکول سے آ چکے تھے۔ وہ انہیں کھانا دینے کے لیے گھر واپس چلی گئی۔ پرواز ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ نوشین نے خیال ظاہر کیا کہ کہیں اس کے کھٹارا جیپ راستے میں خراب نہ ہو گئی ہو۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے زلیخا بھی اس قسم کے خدشے کا اظہار کر چکی تھی۔

اچانک عامر چیخ کر بولا "اوہو! کمرے سے دھواں نکل رہا ہے۔"

یہ وہی کمرا تھا جس پر تالا لگا تھا اور فرش پر پرالی بچھی تھی۔

"یہ کیسے ہوا؟" نوشین نے گھبرا کر پوچھا۔

"اف.... میرا خیال ہے میں نے سگریٹ کا ٹکڑا برآمدے میں پھینکا تھا۔ شاید وہ ہوا سے گھوم کر دروازے کی نچلی درز سے اندر چلا گیا ہے۔"

"اب کیا ہوگا۔ کہیں آگ ہی نہ لگ جائے۔" نوشین نے کہا۔

عامر نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پاس ہی چھوٹی سی کلہاڑی پڑی تھی۔ اس نے کلہاڑی کے چند پے در پے وار کر کے تالا توڑ دیا۔ اس دوران میں نوشین نے جگ میں پانی بھر لیا تھا۔ دو تین مربع فٹ جگہ پر پرالی سلگ رہی تھی۔ اس سلگتی ہوئی پرالی کو بجھانے میں انہیں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ کمرا کھل گیا تھا۔ لگتا تھا کہ کمرے کو کافی دنوں بعد کھولا گیا ہے۔ دھیرے دھیرے دھواں کھلے دروازے سے باہر نکل گیا۔ دھوئیں کے سبب نوشین کھانس رہی تھی۔ اس کے خوبصورت چہرے پر پریشانی کے آثار تھے۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھولنے کے لیے عامر نے وہاں جان بوجھ کر جلتا ہوا سگریٹ پھینکا تھا۔

عامر نے کمرے کی لائٹ جلائی۔ یہاں بھی تصویریں بھری ہوئی تھیں مگر تصویریں کے علاوہ کچھ اور بھی تھا۔ اس "کچھ اور" کو دیکھ کر عامر اور نوشین کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ یہ کڑھائی والے درجنوں سوٹ تھے۔ کم و بیش دو سو تو ہوں گے۔ وہ تہ در تہ ایک دوجے کے اوپر رکھے تھے۔ ان پر گئے دنوں کی گرد پڑی ہوئی تھی۔ نوشین فائن آرٹ کی طالبہ ہونے کی حیثیت سے خود بھی کشیدہ کاری کی تھوڑی بہت سمجھ رکھتی تھی۔ اس کے خیال میں یہ کوئی بہت عمدہ کڑھائی نہیں

تھی.... یہی وقت تھا جب انہیں بیرونی دروازے پر آہٹ سنائی دی۔ انہوں نے مڑ کر دیکھا تو پرواز اندر آ رہا تھا۔ کمرے کے کھلے دروازے کو دیکھ کر وہ دنگ رہ گیا...... اس نے بیرونی دروازے کو جلدی سے کنڈی چڑھا دی پھر نوشین اور عامر کے پاس چلا آیا۔ اس کی پیشانی پر نیلگوں ابھار سا نظر آ رہا تھا۔ محسوس ہوتا تھا کہ کوئی تازہ چوٹ لگی ہے۔

عامر نے پختہ الفاظ میں پرواز کو بتایا کہ اس بند کمرے کا دروازہ انہیں اچانک کیوں کھولنا پڑ گیا۔ پرواز نے سب کچھ تحمل سے سنا۔ اس کے چہرے پر ہیجانی کیفیت تھی۔ نوشین نے کہا "پرواز' یہ سب کچھ کیا ہے...... میرے اندازے کے مطابق تو...... زلیخا کے بنائے ہوئے کپڑے ہی ہیں۔ تم تو یہ کپڑے شہر بیچ آتے تھے۔"

پرواز کے چہرے پر عجیب سی کیفیت نظر آئی۔ وہ سگریٹ کے چند گہرے کش لے کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے نوشین اور عامر کو بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ کھوئے ہوئے لہجے میں بولا "آج تم لوگوں کو اتفاقاً معلوم ہو گیا ہے ورنہ یہ راز شاید ہمیشہ راز ہی رہتا۔ تم نے زلیخا کے بنائے ہوئے کپڑے دیکھ ہی لیے ہیں۔ یہ بالکل معمولی کام ہے۔ بلکہ شاید معمولی سے بھی کچھ کم ہے۔ گاؤں میں تو شاید اسے کوئی پہن لے مگر شہر میں کوئی اسے فروخت کا نہیں سوچ سکتا۔ اتفاقاً شروع میں زلیخا نے جو چند جوڑے بنائے تھے ان میں کچھ بات تھی۔ وہ میں نے پنڈی میں فروخت کر دیے تھے اور ساتھ ہی زلیخا کی حوصلہ افزائی بھی کی تھی۔ بس اسی حوصلہ افزائی کے نتیجے میں وہ بے چاری دن رات اس کام میں جت گئی۔ وہ ہر ہفتے ایک دو جوڑے بنا کر مجھے دینے لگی۔ وہ اپنے کام کے سلسلے میں بڑی پر امید تھی۔ اس کی آنکھوں میں اس کی چمک دیکھ کر اور امید کے مشکل حالات دیکھ کر مجھے حوصلہ نہیں ہوا کہ میں اس کا "کام" واپس کروں۔ میں اس کا دل رکھنے کے لیے اس کے بنائے ہوئے کپڑے اپنے پاس رکھتا رہا اور اپنی جیب سے اس کی حوصلہ افزائی کرتا رہا۔ یہ سلسلہ ایک بار شروع ہوا تو پھر دراز ہوتا چلا گیا۔ شروع میں مجھے امید تھی کہ شاید زلیخا کا کام بہتر ہو جائے گا لیکن یہ امید پوری نہیں ہوئی۔ وہ بے چاری زیادہ معاوضے کی خواہش میں بس الٹا سیدھا کام کرتی رہی اور مجھے دیتی رہی۔"

پرواز نے چند لمحے توقف کیا اور گہری سانس لے کر بولا۔ "تمہیں معلوم ہو گا کہ میری آمدنی بھی کچھ بہت زیادہ نہیں ہے۔ میں کمرشل کام نہیں کرتا اور کمائی کے لیے کمرشل کام ضروری ہوتا ہے۔ محدود آمدنی میں سے زلیخا کے ساتھ مسلسل تعاون کرتے رہنا میرے لیے کئی مرحلوں میں بہت دشوار ثابت ہوا۔ کئی بار جی میں آیا کہ زلیخا سے صاف انکار کر دوں لیکن پھر زلیخا اور اس کے معصوم بہن بھائیوں کے چہرے اور ان کی ناگزیر ضرورتیں نگاہوں کے سامنے آ جاتیں اور میں کچھ نہ کہہ سکتا۔ اسی سلسلے میں میں نے کئی بار قرض بھی اٹھایا ہے۔ چند ماہ پہلے تک یہ قرض پچیس ہزار کے لگ بھگ ہو گیا تھا' اب ایک تہائی رہ گیا ہے' پھر بھی قرض خواہ تنگ کرتا رہتا ہے۔ آج صبح بھی اسی سلسلے میں کچھ جھگڑا ہو گیا تھا۔" پرواز کی گفتگو سے پتہ چلا کہ اس کے ماتھے کی چوٹ بھی اسی جھگڑے کے سلسلے میں لگی ہے۔

پرواز بات کر رہا تھا اور نوشین اسے عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ بہت ہی عجیب نظروں سے اس کے اندر غیر محسوس طور پر ایک تبدیلی رونما ہو رہی تھی۔ یہ بڑی معمولی سی تبدیلی تھی..... لیکن جس طرح ہزاروں میل کا سفر بھی ایک قدم سے شروع ہوتا ہے' اس طرح بہت بڑے بڑے انقلاب بھی ایک معمولی سی ناقابل محسوس تبدیلی سے ہی شروع ہوتے ہیں۔

..... کسی نے سچ کہا ہے کہ عورت اپنی ذات میں ایک پہیلی ہے.... شاید نوشین بھی ایک پہیلی تھی۔ کم از کم عامر کے لیے تو وہ ایک پہیلی ہی ثابت ہوئی۔ شاید طوفانی بارش کی رات عامر نوشین کی بات مان لیتا تو اچھا ہی کرتا..... وہ پرواز سے ملنے نہ جاتا اور نہ وہ کہانی شروع ہوتی جس نے سب کچھ الٹ پلٹ کر دیا۔ چشمہ پانی کے اس چوبی ہٹ کے ایک کمرے میں بیٹھے بیٹھے نوشین کے اندر جو ایک معمولی سی تبدیلی رونما ہوئی تھی وہ دھیرے دھیرے معمولی نہیں رہی..... وہ تبدیلی چند ماہ کے اندر انقلاب بن گئی..... وہ تبدیلی بتدریج نوشین کو عامر سے دور اور شہزاد پرواز کے قریب لے گئی تھی۔ نوشین اور پرواز کی دوستی جو چند برس پہلے حالات کی گرد میں دب گئی تھی' اتفاق کی بارش سے دھل کر پھر چمک دمک گئی' اور بالکل نئے رخ سے جگمگا اٹھی پھر قریباً ایک سال بعد سننے والوں نے سنا کہ ٹوانہ فیملی کی خوبرو لڑکی نوشین کی منگنی اپنے کزن عامر ٹوانہ سے ختم ہو گئی ہے اور اب اس کی شادی معروف مصور شہزاد پرواز سے انجام پانے والی ہے..... معمولی تبدیلیاں اسی طرح غیر معمولی تبدیلیوں سے بدلتی ہیں۔

اپنے ہی خون کے سامنے سر نہ اٹھا سکنے والے ایک مجبور باپ کی کتھا

زور آور

طاہر جاوید مغل

تدبیر اور تقدیر کا مناقشہ روز اوّل سے جاری ہے۔ کچھ تدبیر سے تقدیر کو بدلنے کی بات کرتے ہیں تو چند کا خیال ہے کہ تقدیر کے روبرو تدبیر کچھ نہیں کرسکتی۔ وہ بھی با تدبیر ہونے کے ساتھ ساتھ با تدبر بھی تھا مگر اس کی تقدیر کیا تماشا دکھانے والی تھی اُس کا اسے شائبہ بھی نہ تھا۔

مری والی کوٹھی میں پہنچتے ہی جمیل صاحب سوگئے۔ وہ بہت تھکے ہوئے تھے۔ ان کا چشمہ اور ان کے جوتے وغیرہ یقیناً ان کی بیگم نے ہی اتارے تھے۔ انہوں نے ان پر لحاف وغیرہ بھی ڈال دیا ہوگا۔ وہ ان کا بہت خیال رکھتی تھی۔ پچھلے ایک مہینے میں انہوں نے ثابت کردیا تھا کہ جمیل صاحب کو واقعی ان جیسی سمجھ دار اور محبت کرنے والی شریکِ حیات کی ضرورت تھی۔

جمیل صاحب آٹھ بجے کے لگ بھگ سو کر اٹھے تھے۔ اس وقت ان کی نوبیاہتا دلہن عارفہ بیگم سو رہی تھیں۔ عارفہ بیگم کی عمر ۳۵ سال کے لگ بھگ تھی۔ جمیل صاحب عارفہ بیگم سے چودہ پندرہ سال بڑے تھے۔ یعنی وہ پچاس کے قریب

تھے۔ تاہم صحت اچھی تھی اور وہ پہلی نظر میں پچاس کے دکھائی نہیں دیتے تھے۔ جمیل صاحب محویت سے اپنی محو خواب دلہن کو دیکھنے لگے۔ نیند کی حالت میں بھی ایک خوبصورت متانت اور ذہانت کی چمک عارفہ کے چہرے پر موجود تھی۔ بالوں کی ایک لٹ رخساریوں کو چھو رہی تھی اور ہونٹوں کے درمیان تھوڑی سی درز تھی۔ جمیل صاحب نے آگے بڑھ کر عارفہ بیگم پر لحاف درست کیا اور ہولے سے دروازہ بند کر کے باہر نکل آئے۔ ساتھ والے کمرے میں ایک نوجوان لڑکی سو رہی تھی۔ یہ عارفہ بیگم کی سب سے چھوٹی بہن نوشین تھی۔ جمیل صاحب اس کے کمرے کے سامنے سے گزر کر برآمدے میں آبیٹھے۔ نوکر قربان علی نے تپائی پر اخبار رکھ دیا تھا۔ ماماں جنت چائے بنا رہی تھی۔ جمیل صاحب نے اخبار کی ہیڈ لائن پر ایک نگاہ ڈالی پھر اسے ایک طرف رکھ دیا۔ ان کے سامنے دور تک خوبصورت وادی تھی۔ حسین کہساروں کی آغوش میں بادلوں کے نٹ کھٹ ٹکڑے تیر رہے تھے۔ یہ جگہ مری سے چار پانچ میل کے فاصلے پر بھوربن کے راستے میں واقع تھی، بڑی پرسکون جگہ تھی۔ جمیل صاحب نے یہ بنی بنائی کوٹھی اسی سیزن میں خریدی تھی۔

آرام کرسی پر بیٹھ کر بادلوں کے نٹ کھٹ ٹکڑوں کا نظارہ کرتے کرتے جمیل صاحب کا ذہن ماضی کی بھول بھلیوں میں گھومنے لگا... وہ تصور کے پردے پر بیتے ہوئے شب و روز کو دیکھنے لگے۔ ایک وقت تھا کہ وہ اپنی پہلی بیگم ثریا خانم کے ساتھ مری آیا کرتے تھے۔ اسی طرح کسی وادی کے کنارے بیٹھ کر وہ دونوں پہروں تک بادلوں اور ہواؤں کی آنکھ مچولی دیکھتے تھے۔ پھر یکے بعد دیگرے بچے ہوئے اور بچے بھی ان کے ساتھ آنے لگے۔ وہ بھی دھیرے دھیرے پہاڑوں اور وادیوں کے حسن کے اسیر ہوتے گئے۔ ہر موسم گرما میں لاہور سے مری کا سفر کرنا ایک طے شدہ اور ناقابل تنسیخ پروگرام بن گیا۔ ان کے تین بچے تھے، دو بیٹیاں بڑی تھیں اور بیٹا شجاع چھوٹا تھا اور سب سے لاڈلا بھی۔ شجاع قریباً دس سال کا تھا جب ثریا خانم کو کمر میں مستقل درد رہنے کی شکایت ہوئی اور پھر ایک روز جمیل صاحب پر یہ خبر بجلی بن کر گری کہ ثریا کو ہڈیوں کا کینسر ہے۔ جمیل صاحب گارمنٹس کی ایک بڑی فیکٹری کے مالک تھے۔ کشائش کے ساتھ زندگی گزر رہی تھی۔ مستحق لوگوں کی مدد بھی کھلے دل سے کرتے رہتے تھے۔ انہوں نے اپنی شریک حیات پر روپیہ پانی کی طرح بہایا لیکن یہ مرض روپیہ لینے نہیں آیا تھا، ان کی شریک حیات کو لینے آیا

تھا۔ ثریا بیگم قریباً پانچ سال تک بستر سے لگی رہیں۔ جمیل صاحب نے شریکِ حیات ہونے کا حق ادا کیا اور ثریا بیگم کی تیمارداری اور خدمت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ آخری دو برسوں میں تو وہ جیسے ثریا بیگم کی چارپائی سے لگے بیٹھے رہے تھے۔ آخر وہی ہوا جو قدرت کو منظور تھا۔ ہڈیوں کا ناقابل شناخت ڈھانچا بننے کے بعد ثریا بیگم دنیا سے رخصت ہوگئی تھیں۔ مری کی کسی وادی کے کنارے بیٹھ کر ہواؤں اور بادلوں کی آنکھ مچولی دیکھنے کا ایک دور ختم ہوگیا تھا۔

اگلے نو دس برس جمیل صاحب نے تنہا زندگی بسر کی تھی، انہوں نے اپنے ڈگمگاتے ہوئے کاروبار کو سنبھالا دیا تھا۔ تینوں بچوں کو بہتر تعلیم دلوائی تھی، ان کی بڑی بیٹی نے اپنی پسند کی شادی کرنا چاہی تھی۔ اس سلسلے میں جمیل صاحب کی رائے کچھ مختلف تھی۔ بہرحال انہوں نے وہی کیا تھا جو بیٹی کی خواہش تھی۔ دوسری بیٹی کی شادی بھی بڑے اچھے طریقے سے ہوئی تھی، یہ بیٹی جمیل صاحب کا زیادہ خیال رکھتی تھی۔ جمیل صاحب کی خواہش تھی کہ وہ اس کی آنکھوں کے سامنے رہے۔ انہوں نے اس کی شادی لاہور میں ہی کی تھی لیکن کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ دعا کو اثر کے ساتھ دشمنی ہوجاتی ہے، یہ دوسری بیٹی اپنے میاں کے ساتھ امریکا جانے کا ارادہ باندھنے لگی تھی اور پھر وہی ہوا تھا جو جمیل صاحب نہیں چاہتے تھے۔ ایک روز جمیل صاحب نے اسے بھیگی آنکھوں کے ساتھ الوداع کہا تھا اور وہ اپنے میاں کے ساتھ ایک نئی دنیا بسانے کے لیے امریکا سدھار گئی تھی۔ اب صرف شجاع ہی جمیل صاحب کے پاس تھا۔ شجاع مست حال لڑکا تھا۔ زیادہ لاڈ پیار کے سبب وہ کچھ خود پسند بھی ہوگیا تھا۔ کسی وقت تو وہ جمیل صاحب کو بھی دوٹوک جواب دے دیتا تھا اور اس گستاخی کو اپنا "اسٹریٹ فارورڈ" ہونا کہتا تھا۔ اس کے یار دوست بھی کچھ اچھی شہرت کے مالک نہیں تھے۔ وہ انہیں اپنی اسپورٹس کار میں لاد کر لاہور کے پوش علاقوں میں گھومتا رہتا تھا۔ جمیل صاحب کو ہر وقت اس کی طرف سے دھڑکا لگا رہتا تھا۔ جمیل صاحب کو اطلاع ملی تھی کہ اس نے کئی چھوٹی موٹی دشمنیاں بھی پال رکھی ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ جب شجاع نے اعلان کیا کہ وہ مزید پڑھائی کے لیے امریکا جانا چاہتا ہے تو دل پر چوٹ پڑنے کے باوجود جمیل صاحب نے ہامی بھرلی۔ یوں قریباً تین سال پہلے شجاع بھی کمپیوٹر کی اعلیٰ تعلیم کے لیے بیرون ملک چلا گیا تھا۔

اس کے جانے کے بعد جمیل صاحب کی اداس زندگی مزید اداس اور بے رنگ ہوگئی تھی۔ ان کی بڑی بیٹی تو شادی

کے بعد جیسے اجنبی ہی ہوگئی تھی۔ چھوٹی بیٹی نادیہ بھی کسی خاص موقع پر ہی فون کرنے کی زحمت کرتی تھی۔ سب کچھ ہونے کے باوجود جمیل صاحب کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ ماماں جنت اور خاندانی ملازم قربان علی ان کا بہت خیال رکھتے تھے لیکن جمیل صاحب کو دکھ سکھ کے ساتھی کی ضرورت تھی۔ کسی ہم زباں و ہم سخن کی ضرورت تھی۔ وہ اپنے اندر ایک وسیع و عریض خلا محسوس کرنے لگے تھے اور یہی دن تھے جب ان کی حبس زدہ زندگی میں ٹھنڈی میٹھی ہوا کا دھیما سا جھونکا عارفہ کی شکل میں داخل ہوا تھا۔

عارفہ سے جمیل صاحب کا تعارف اپنے اکلوتے دوست صدیقی صاحب کے ذریعے ہوا تھا۔ عارفہ کا تعلق آصف صدیقی کے سسرال سے تھا۔ یہ ایک سادہ مزاج اور خوش اخلاق خاتون تھیں۔ متوسط گھرانے سے تعلق تھا۔ شادی سے چند ماہ بعد ہی ان کا خاوند ایک ٹریفک حادثے میں انتقال کرگیا تھا۔ اس جان لیوا حادثے میں عارفہ بیگم کے والد بھی جاں بحق ہوئے تھے۔ عارفہ بیگم کی والدہ کا انتقال پہلے ہی ہوچکا تھا۔ عارفہ کی دو چھوٹی بہنیں تھیں جو ان سے کافی چھوٹی تھیں۔ شوہر کی وفات کے بعد عارفہ اپنے میکے آبسی تھیں اور اپنی چھوٹی بہنوں کی پرورش کی ذمے داری اپنے کندھوں پر اٹھالی تھی۔ اب وہ ایک بہن کی شادی کرچکی تھیں اور ایک بہن ان کے ساتھ ہی رہتی تھی۔ گاؤں میں والد کی چھوڑی ہوئی تھوڑی سی زمین بھی تھی جس سے دونوں بہنوں کی گزر بسر ہورہی تھی۔ جمیل صاحب کے ہمراز دوست صدیقی صاحب عارفہ کو بڑی اچھی طرح جانتے تھے۔ وہ اکثر جمیل صاحب سے کہا کرتے تھے "یار جمیل! تو عارفہ سے شادی کرلے۔ میں سچ کہتا ہوں تیری زندگی میں بہار آجائے گی... بلکہ تم دونوں کی زندگیوں میں بہار آجائے گی۔ میرا دل کہتا ہے کہ تم دونوں ایک دوسرے کے لیے بہت موزوں ہو۔"

شروع شروع میں جمیل صاحب نے اپنے دوستوں کی باتوں پر زیادہ دھیان نہیں دیا تھا لیکن پھر آہستہ آہستہ انہیں ان باتوں میں وزن محسوس ہونے لگا تھا۔ وہ ایک دوبار لاہور سے گجرات جاکر اس خوش شکل و باوقار خاتون سے ملے بھی تھے۔ خاتون کے اخلاق اور شائستہ طور اطوار نے انہیں بہت متاثر کیا تھا۔ دھیرے دھیرے وہ عارفہ کو پسند کرنے لگے تھے لیکن شادی جیسا بڑا قدم اٹھانے کا فیصلہ کرنا آسان کام نہیں تھا۔ وہ خود میں اس کے لیے ہمت نہیں پارہے تھے۔ شادی کے متعلق سوچتے ہوئے ان کے دل و دماغ پر بوجھ سا پڑجاتا تھا۔ کئی سوال ذہن میں ابھرتے، لوگ کیا کہیں گے؟ بچے کیا سوچیں گے؟ سب سے بڑھ کر یہ کہ شجاع کا ردِعمل کیا ہوگا؟ شجاع کی شعلہ مزاجی انہیں ہمیشہ اندیشے میں مبتلا رکھتی تھی۔ اس کے علاوہ بھی کئی الجھنیں تھیں۔ کیا عارفہ ایک اچھی بیوی ثابت ہوگی؟ کیا ان دونوں کا طبقاتی فرق تو مسائل پیدا نہیں کرے گا، وغیرہ وغیرہ۔

کئی ماہ تک جمیل صاحب شدید تذبذب کا شکار رہے تھے۔ اس دوران میں صدیقی صاحب بھی مسلسل اپنے کام میں لگے رہے تھے۔ بالآخر وہ اپنے جگری دوست کا ذہن بنانے میں کامیاب رہے تھے۔ قریباً ایک ماہ قبل اپریل کی ایک پُربہار شام کو ایک طویل عرصے بعد جمیل صاحب کی خزاں رسیدہ زندگی میں اچانک بہار آئی تھی۔ ایک مختصر اور بالکل سادہ سی تقریب میں عارفہ نذیر... عارفہ جمیل بن کر جمیل صاحب کے گھر میں آگئی تھیں۔ یہ سب کچھ جب ہونے پر آیا تھا تو بالکل آناً فاناً ہی ہوگیا تھا۔ جمعے کے دن بات پکی ہوئی، ہفتے کے دن نکاح ہوا اور اتوار کو رخصتی ہوگئی۔ اس شادی کے بارے میں جمیل صاحب نے صرف اپنی چھوٹی بیٹی کو بتایا تھا اور اس سے درخواست کی تھی کہ وہ ابھی یہ اطلاع صرف اپنے تک محدود رکھے، کسی عزیز رشتے دار اور یار دوست کو ابھی اس شادی سے آگاہ نہیں کیا گیا تھا۔ جمیل صاحب نے عارفہ کو فی الحال اپنے گلبرگ والے چھوٹے بنگلے میں رکھا ہوا تھا۔ دراصل جمیل صاحب چاہتے تھے کہ اس شادی کا کھل کر اعلان کرنے سے پہلے وہ اپنے بیٹے شجاع کو اعتماد میں لے لیں۔ جمیل صاحب کو سب سے زیادہ ڈر اسی کی طرف سے تھا۔

پچھلے ایک ماہ میں انہوں نے کئی بار نیویارک میں شجاع سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ پتا نہیں کہاں مارا مارا پھر رہا

> **"سوال"**
>
> مودی صاحب ایک روز ناشتا کرنے بیٹھے تو اخبار میں انہوں نے اپنے انتقال کی خبر پڑھی۔ حیران پریشان ہوکر انہوں نے رمضان کو فون کیا "یار......! تم نے اخبار میں میرے انتقال کی خبر پڑھی؟"
>
> "جی ہاں...... پڑھ لی ہے...... ویسے آپ اس وقت کہاں سے بول رہے ہیں؟" رمضان نے ذرا تشویش سے پوچھا۔

تھا۔ جمیل صاحب کو امید تھی کہ شجاع سے چند بار ٹیلی فونک گفتگو ہو جائے تو وہ اسے ذہنی طور پر خاصی حد تک تیار کر لیں گے۔ شجاع کتنا بھی تند خو سہی لیکن آخر تو بیٹا ہی تھا۔ جمیل صاحب نے اسے اتنی محبت دی تھی جو کوئی بھی محبت کرنے والا باپ اپنے اکلوتے بیٹے کو دے سکتا ہے۔

شجاع سے رابطہ نہیں ہو سکا تھا اور اسی دوران میں جمیل صاحب، عارفہ بیگم کے ہمراہ مری چلے آئے تھے۔ عارفہ بیگم کی چھوٹی بہن نوشین لاہور کے فائن آرٹ کالج میں پڑھتی تھی اور یہیں ہاسٹل میں رہتی تھی لیکن جب جمیل صاحب کی شادی ہو گئی تو نوشین کا ہاسٹل میں رہنا جمیل صاحب کو معیوب محسوس ہوا اور وہ نوشین کو گھر لے گئے۔ اب وہ بھی ان کے ساتھ رہ رہی تھی اور ان کے ساتھ ہی مری آئی تھی۔

ایک دم جمیل صاحب اپنے خیالات سے بری طرح چونک گئے۔ کسی نے بڑی نرمی سے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ انہوں نے مڑ کر دیکھا، عارفہ بیگم کھڑی تھیں۔ وہ منہ ہاتھ دھو کر نکلی تھیں۔ بہت نکھری ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ گھنے بالوں کا جوڑا ڈھیلے ڈھالے انداز میں بندھا ہوا تھا۔ ہلکی گلابی ساڑھی لمبے متوازن جسم پر خوب جچ رہی تھی۔

"کس سوچ میں کھو گئے ہیں؟" وہ ہولے سے مسکرائیں، چائے پڑی پڑی ٹھنڈی ہو گئی۔"

"اوہ!" جمیل صاحب گڑبڑا کر بولے۔

"اب ایک بار پھر "اوہ" کہیے۔"

"وہ کیوں؟"

"جناب نے سویٹر الٹا پہن رکھا ہے۔"

جمیل صاحب کے منہ سے واقعی "اوہ" نکل گیا۔ تاہم فوراً ہی سنبھل کر بولے "چلو بھئی، پہن تو رکھا ہے ناں۔"

"یہ بھی اسی بندی کی مہربانی ہے۔ رات کو سونے سے پہلے آپ کو تاکید کی تھی ورنہ آپ جتنے بے پروا ہیں، پچھلے ایک مہینے میں، میں نے بخوبی جان لیا ہے" پھر وہ کچن کی طرف رخ کر کے ملازم کو آوازیں دینے لگیں "قربان علی.... قربان علی صاحب کے لیے اور چائے بناؤ۔"

قربان علی اطاعت مندی سے سر جھکا کر اندر چلا گیا۔ ماماں اور قربان علی عارفہ بیگم کو بے حد احترام دیتے تھے، پچھلے ایک ماہ میں عارفہ بیگم نے جمیل صاحب کو تو گرویدہ کیا ہی تھا۔ ان سے متعلقہ لوگوں کو بھی گرویدہ کر لیا تھا۔

جمیل صاحب نے کہا "عارفہ بیگم، اتنا مت چاہو کہ دم نکل جائے۔ مجھے تو لگنے لگا ہے کہ میں تمہارے بغیر بے کار ہو گیا ہوں یا پھر.... بچہ بن گیا ہوں جو سہارے کے بغیر قدم اٹھاتے ہوئے بھی ہچکچاتا ہے۔"

"ہاں، سیانے کہتے ہیں کہ ہر شخص میں تمام عمر ایک بچہ چھپا رہتا ہے" عارفہ بیگم نے مسکرا کر کہا۔

"اور یہ بھی تو کہتے ہیں کہ بندہ جب زیادہ بوڑھا ہو جاتا ہے تو پھر بچہ بن جاتا ہے۔"

"خیر، ابھی آپ کی وہ اسٹیج تو نہیں آئی" عارفہ بیگم نے ہنستے ہوئے کہا اور ان کے چہرے پر شوخی کا ہلکا سا رنگ لہرا گیا۔

انہوں نے اکھٹے چائے پی۔ اسی دوران میں نوشین بھی سردی سے سی سی کرتی وہاں پہنچ گئی۔ وہ ایک خوش شکل لڑکی تھی۔ آنکھیں ہلکی بادامی تھیں، اپنی گفتگو میں انگریزی کے الفاظ کثرت سے استعمال کرتی تھی۔ بڑی بہن کے برعکس اس کے مزاج میں قدرے بناوٹ اور تکلف تھا۔ جمیل صاحب اسے بڑی اپنائیت سے نوشی کہہ کر بلاتے تھے اور کبھی کبھی نوشی بیٹا بھی کہہ دیتے تھے۔ نوشی اپنے ساتھ فائن آرٹ کا بہت سا کام لے کر آئی تھی۔ اگلے ایک ماہ میں اس نے یہاں کم از کم دو درجن لینڈ اسکیپ بنانا تھے۔ ناشتا کرنے کے فوراً بعد وہ سامانِ مصوری لے کر "فیلڈ" میں جانے کی تیاری کرنے لگی۔

اس کے جانے کے بعد جمیل صاحب اور عارفہ بیگم کوٹھی کے گراسی لان میں چہل قدمی کرنے لگے۔ جمیل صاحب کو ٹھنڈ میں کبھی کبھی سانس کی تکلیف ہو جاتی تھی۔ اس حوالے سے عارفہ بیگم تمام ضروری دوائیں لے کر اور احتیاطی تدابیر کرنے کے بعد ہی مری آئی تھیں۔ عارفہ کے آنے سے جمیل صاحب کی زندگی میں واقعی انقلابی تبدیلیاں آئی تھیں اور انہیں یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے وہ اس سے پہلے ادھورے تھے۔

❂✱❂

یہ مری میں قیام کے تیسرے چوتھے روز کی بات ہے۔ شام کے بعد جمیل صاحب بیگم کے ہمراہ مال کی سیر سے واپس آئے تھے کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ جمیل صاحب کا خیال تھا کہ ان کے لنگوٹیے صدیقی کا فون ہوگا۔ اس کی زبان میں کھجلی ہو رہی ہوگی۔ وہ حال احوال پوچھے گا اور کچھ مکالمے بازی کرے گا لیکن دوسری طرف بیٹے شجاع کی آواز سن کر جمیل صاحب کو دھچکا سا لگا "سلام ڈیڈ!" اس نے مخصوص انداز میں کہا۔

"وعلیکم السلام بیٹا، کیسے ہو؟" جمیل صاحب نے کہا۔

پتا نہیں کیوں ایکدم انہیں ایسے لگا تھا جیسے وہ کوئی

چوری کرتے ہوئے پکڑے گئے ہوں۔ حالانکہ وہ خود کئی دنوں سے چاہ رہے تھے کہ شجاع سے رابطہ ہو لیکن اب رابطہ ہوا تھا تو وہ مضطرب سے ہو گئے تھے۔ رسمی کلمات کی ادائیگی کے بعد اس وقت جمیل صاحب کا اضطراب ایکدم انتہا کو پہنچ گیا جب شجاع نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا "ڈیڈ! آپ کے لیے ایک سرپرائز ہے' میں پرسوں رات لاہور پہنچ رہا ہوں۔"

"کک.... کیا کہہ رہے ہو؟" جمیل صاحب ہکلائے۔

"کیا بات ہے ڈیڈ! آپ تو پریشان ہو گئے ہیں؟"

"نن.... نہیں بھئی! ایسی تو کوئی بات نہیں لیکن یہ ایک دم.... میرا مطلب ہے تم نے پہلے سے کوئی اطلاع ہی نہیں دی' اچانک کیسے پروگرام بن گیا؟"

"بس' سیمسٹر ختم ہوئے تھے۔ کچھ چھٹیاں آرہی تھیں۔ دو دوست پاکستان آرہے ہیں۔ ان کے ساتھ ہی پروگرام بن گیا ہے۔"

جمیل صاحب جانتے تھے کہ سیمسٹرز والی بات تو شجاع یوں ہی کہہ رہا ہے۔ سیمسٹرز وغیرہ کی اسے کبھی کوئی پروا نہیں رہی تھی۔ ہاں دوستوں والی بات صحیح ہو سکتی تھی۔

انہوں نے اپنے لہجے کی پژمردگی کو چھپاتے ہوئے کہا "پرسوں کی فلائٹ کنفرم ہے؟"

"یس ڈیڈ! اسی لیے تو آپ کو فون کیا ہے۔ پہلے لاہور کے نمبر پر کال کی وہاں سے پتا چلا کہ آپ مری گئے ہوئے ہیں... چلیں' اچھی بات ہے' مجھے بھی لاہور کی گرمی کا تصور پریشان کر رہا تھا۔ میں لاہور میں بس ایک دن ٹھہروں گا پھر سیدھا آپ کے پاس چلا آؤں گا۔ سنا ہے بڑی شاندار کوٹھی لی ہے آپ نے... میرے لیے ایک دو کمرے تیار کروا دیجئے گا۔ ممکن ہے کہ میرا دوست عدنان بھی ساتھ ہو۔"

"ا.... اچھا' ٹھیک ہے۔ میں تمہارا انتظار کروں گا" جمیل صاحب نے کہا۔

ایک دو منٹ تک مزید بات کرنے کے بعد انہوں نے ریسیور رکھ دیا۔ ان کی پیشانی پر پسینے کی نمی دکھائی دینے لگی تھی۔

عارفہ بیگم بڑے دھیان سے ان کی طرف دیکھ رہی تھیں "شجاع آرہا ہے؟" انہوں نے بڑی نرمی سے جمیل صاحب کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں' پرسوں رات کی فلائٹ سے پہنچ رہا ہے' جمعے کے دن وہ یہاں ہوگا۔"

دونوں کے درمیان ایک بوجھل سی خاموشی حائل ہو گئی۔ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ سوچ رہے تھے۔ عارفہ بیگم' جمیل صاحب کے خیالات سے بخوبی آگاہ تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ جمیل صاحب بیٹے کو اپنی شادی کی خبر دینے سے پہلے اسے ذہنی طور پر تیار کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ لیکن ابھی جو ٹیلی فون آیا تھا' اس کے بعد ان کا سارا پروگرام دھرے کا دھرا رہ گیا تھا۔

میاں بیوی اگلے روز دوپہر تک تبادلہ خیال کرتے رہے۔ پھر طے ہوا کہ عارفہ بیگم دو ایک ہفتوں کے لیے میکے چلی جائیں۔ اس دوران میں جمیل صاحب شجاع کو اپنے طریقے سے اعتماد میں لے لیں اور اصل صورت حال سے آگاہ کر دیں۔ شروع میں نوشین کے جانے کا پروگرام بھی تھا لیکن پھر اس میں تبدیلی آئی۔ نوشین کو یہاں کافی کام کرنا تھا اور وہ بڑے انتظام کے ساتھ آئی تھی۔ واپس جانے سے اس کا سارا شیڈول درہم برہم ہو جاتا۔ آخر فیصلہ ہوا کہ وہ یہیں رہے گی اور اپنی پینٹنگ جاری رکھے گی۔

❂✲❂

شجاع مری پہنچ چکا تھا۔ وہ کافی افسردہ نظر آتا تھا۔ مری آکر اس کی بہت سی پرانی یادیں تازہ ہو گئی تھیں۔ یہ سب بچپن اور لڑکپن کی یادیں تھیں۔ وہ خاص طور سے مری کا وہ ہوٹل دیکھنے گیا تھا جہاں وہ اپنی والدہ اور بہنوں کے ساتھ ٹھہرا کرتا تھا۔ اس کی ذہنی کیفیت کو بھانپتے ہوئے فی الحال جمیل صاحب کو حوصلہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ اسے اپنی شادی کے بارے میں بتائیں۔ شجاع کا دوست عدنان بھی اس کے ساتھ تھا۔ زیادہ وقت دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ہی گزارتے تھے۔ شجاع کی آمد سے قبل ہی جمیل صاحب نے عارفہ بیگم کے استعمال کی ساری چیزیں اور ان سے متعلقہ تمام اشیا ایک کمرے میں رکھ کر مقفل کروا دی تھیں۔ ماماں جنت اور قربان علی کو خصوصی ہدایت دے دی گئی تھی کہ وہ فی الحال چھوٹے صاحب سے عارفہ بیگم کا ذکر بالکل نہیں کریں گے.... نوشین کے بارے میں جمیل صاحب نے شجاع کو گول مول بات بتائی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ وہ ان کے دوست صدیقی صاحب کی قریبی عزیزہ ہیں اور اپنے کام کے سلسلے میں یہاں چند دن کے لیے ٹھہری ہوئی ہیں۔

جمیل صاحب نے وقتی طور پر شجاع سے سب کچھ کامیابی کے ساتھ چھپا لیا تھا لیکن انہیں دل و دماغ پر بڑا بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔ انہوں نے کئی بار سوچا تھا۔ انہوں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ کوئی جرم نہیں کیا' پھر وہ شجاع کو سب کچھ صاف صاف کیوں نہیں بتا سکتے۔ ٹھیک ہے کہ انہوں نے شجاع کو پیشگی اطلاع دیے بغیر شادی کی تھی لیکن یہ شادی

بوجوہ آناً فاناً انجام پائی تھی اور اس وقت شجاع رابطے میں بھی نہیں تھا۔ جمیل صاحب کے نقطۂ نظر سے یہ ایک کمزور پہلو ضرور تھا لیکن کہیں وہ ایک غلطی کو چھپانے کے لیے مزید غلطیاں تو نہیں کر رہے تھے؟ ان پر جھنجلاہٹ طاری ہونے لگی۔ کچھ بھی تھا، وہ شجاع کے باپ تھے۔ شجاع ان کا باپ نہیں تھا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ لگی لپٹی رکھے بغیر سب کچھ صاف صاف شجاع کو بتادیں گے۔

اس رات ڈنر کے بعد باپ بیٹے نے اکٹھے چائے لی۔ شجاع کچھ خاموش نظر آرہا تھا۔ جمیل صاحب ہلکی پھلکی گفتگو کرکے اسے نارمل کرنا چاہا لیکن اس کا موڈ جوں کا توں رہا۔ چائے کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے وہ گمبھیر لہجے میں بولا "ڈیڈ! مجھے پتا چلا ہے کہ آپ نے لاہور میں لارنس روڈ والی جگہ بیچ دی ہے؟"

"اوہ... ویری سوری...! ویری سوری بیٹا! مجھے تمہیں بتانا یاد نہیں رہا... دراصل..."

"پلیز ڈیڈ! پلیز... اور کچھ مت کہیں۔ جب بھی آپ "دراصل" کہتے ہیں تو اس کے بعد آپ اپنی من مانی کے لیے جواز بیان کرتے ہیں۔ بس آپ نے بیچ دی ہے سو بیچ دی ہے۔ اب اس بات پر خاک ڈالیں۔"

"لیکن شجاع! میں جو کچھ کرتا ہوں، تمہاری بھلائی کے لیے ہی کرتا ہوں۔ آج نہیں تو کل تمہیں اس کا احساس ضرور ہوگا۔ تم ہوٹلنگ کی بات کرتے ہو لیکن ہوٹلنگ ہماری لائن نہیں ہے۔ یہ ایک بالکل مختلف طرز کی فیلڈ ہے... اور پھر لارنس روڈ کا وہ پلاٹ... تو کسی طور بھی ہوٹل کے لیے مناسب نہیں تھا... میں نے تو..."

"پلیز ڈیڈ! وضاحتیں پیش مت کریں۔ میرے خیال میں آپ وضاحتوں کے محتاج بھی نہیں ہیں" وہ اپنے مخصوص غصیلے لہجے میں بولا "بات صرف اتنی ہے ڈیڈ! کہ آپ مجھے اب بھی دودھ پیتا بچہ سمجھتے ہیں اور بچہ جو کام بھی کرے وہ غلط ہی ہوتا ہے۔ آپ بھی میرے کام میں کوئی نہ کوئی غلطی ڈھونڈ ہی لیتے ہیں، میرے خیال میں، میں ہوں ہی غلط۔"

"بیٹا، میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔"

"میں آپ کی کون کون سی بات سمجھوں ڈیڈی جان! میں تو ہوں ہی سراپا حماقت۔ اب یہی سیلز منیجر عبدالرشید والا معاملہ لیجئے، آپ کی فیکٹری میں ڈیڑھ سو بندہ کام کرتا ہے۔ ان میں سے واحد عبدالرشید تھا جس کی میں نے سفارش کی تھی اور وہ اس کام کا اہل بھی تھا۔ آپ کو اپنے ڈیڑھ دو سو کارندوں میں صرف عبدالرشید ہی چھانٹی کے لیے نظر آیا۔ نظر آیا یا نہیں؟ مجھے کل ہی پتا چلا ہے کہ آپ اسے فارغ فرما چکے ہیں اور اس کی جگہ صدیقی صاحب کے ایک پرانے چمچے کو دوگنی تنخواہ پر ملازم رکھا گیا ہے۔ آپ نے رکھا ہے یا نہیں... میں ہوں ہی سراپا غلط..."

"شجاع بیٹے! رشید کی بات بھی میں تمہیں تفصیل سے بتاؤں گا۔ اس نے دو تین سنگین غلطیاں کی ہیں۔ تمہیں معلوم ہوگا تو تم خود کہو گے کہ وہ اس کام کا اہل نہیں تھا۔"

"اس دنیا میں اہل بس وہی لوگ ہیں جنہیں آپ اہل سمجھتے ہیں ڈیڈ! باقی سب احمق اور الّو کے پٹھے ہیں" وہ اٹھا اور پاؤں پٹختا ہوا باہر نکل گیا۔

جمیل صاحب کا سارا بدن پسینے میں نہا گیا تھا۔ شجاع کی شعلہ مزاجی انہیں ایسے ہی عاجز اور ناتواں کردیا کرتی تھی۔ پتا نہیں کہ یہ کیا کیفیت تھی۔ اس کا کیا نام تھا، وہ باپ ہوتے ہوئے بھی خود کو بیٹے کے سامنے بے اختیار محسوس کرنے لگے تھے۔ یہ محبت اور خوف کا عجیب سا امتزاج تھا۔

ساری پلاننگ دھری کی دھری رہ گئی تھی۔ شجاع کا موڈ سخت خراب ہوگیا تھا۔ جمیل صاحب جانتے تھے، اب اگلے آٹھ دس روز تک یہ موڈ ایسا ہی رہے گا۔ اس صورت حال میں شجاع سے عارفہ بیگم کے بارے میں بات کرنا ہرگز مناسب نہیں تھا۔ جمیل صاحب بیٹے کی ناراضی دور کرنے کے حوالے سے سوچ بچار کرنے لگے۔ ناراضی کی بڑی وجوہ دو ہی تھیں۔ ایک لارنس روڈ والے پلاٹ کی فروخت دوسری منیجر رشید کا سبکدوش کیا جانا۔ پلاٹ واپس خریدنا تو اب بہت مشکل تھا تاہم منیجر رشید کی سبکدوشی کا مداوا کیا جاسکتا تھا۔

چند روز بعد جمیل صاحب نے اس بارے میں شجاع سے بات کی لیکن اس نے سنی ان سنی کردی۔ جمیل صاحب نے اپنی بات دہرائی تو وہ اپنے مخصوص بھڑکیلے لہجے میں بولا "پلیز ڈیڈ! اس معاملے پر اب خاک ڈال دیں۔ بس، جو ہونا تھا وہ ہوگیا۔"

شجاع کی خفگی ہنوز برقرار تھی۔ کافی دن گزرنے کے باوجود اس میں کوئی خاص کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا، جمیل صاحب کی بے چینی بڑھتی جارہی تھی۔ وہ اپنے جھوٹ کو مزید طویل کرنا نہیں چاہتے تھے لیکن وہ ہورہا تھا۔ دوسری طرف عارفہ بیگم کی دوری بھی انہیں بہت بری طرح محسوس ہورہی تھی۔ درحقیقت چار پانچ ہفتوں کے اندر ہی عارفہ بیگم نے جمیل صاحب کے دل میں گھر کرلیا تھا۔ عارفہ بیگم کے پُرخلوص جذبۂ محبت نے ان کی پرکشش شخصیت کو اور بھی موثر کردیا تھا۔ ان کے جانے کے بعد جمیل

صاحب نے ہر ہر بات پر انہیں یاد کیا تھا۔ صبح وشام ان کی کمی محسوس کی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ جلد از جلد یہ معاملہ صاف ہوجائے اور وہ عارفہ کو واپس لاسکیں۔ جتنی تاخیر ہورہی تھی' یہ دھڑکا بھی بڑھتا جارہا تھا کہ شجاع کو کہیں ادھر اُدھر سے اس شادی کی ٹوہ لگ جائے اور یہ معاملہ اور بھی چوپٹ ہوجائے۔

نوشین بدستور کوٹھی میں موجود تھی۔ وہ اپنا ایزل اور پائلٹ وغیرہ لے کر صبح سویرے نکل جاتی تھی اور کبھی کبھی لنچ پر بھی واپس نہیں آتی تھی۔ شروع شروع میں اس کی موجودگی شجاع کو غالباً بری لگی تھی لیکن پھر شجاع کے دوست عدنان نے نوشین کے ساتھ ایک پرانا لنک ڈھونڈ لیا تھا۔ عدنان بھی لاہور کے فائن آرٹ کالج میں پڑھا تھا اور آرٹ کالج میں عدنان کا "دی بیسٹ ٹیچر" نوشین کا بھی "بیسٹ ٹیچر" تھا۔ یوں عدنان کے ساتھ ساتھ شجاع سے بھی نوشین کی بات چیت شروع ہوگئی تھی۔ ایک دوبار عدنان شجاع اور نوشین تصویر کشی کے لیے اکٹھے بھی گئے تھے۔

جمیل صاحب کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ اندر ہی اندر کیا کھچڑی پک رہی ہے۔ وہ تقدیر کے وار سے یکسر بے خبر تھے۔ چند روز بعد جمیل صاحب کو اچانک لاہور جانا پڑا۔ ایک کاروباری مسئلے کو سلجھانے کے لیے لاہور میں ان کی تین چار دن کی موجودگی ضروری تھی۔ انہوں نے نوشین سے بھی کہا کہ وہ ان کے ساتھ چلے لیکن اس نے بتایا کہ وہ یہاں بالکل ٹھیک ہے۔ ماماں جنت اور قربان علی وغیرہ کی موجودگی میں وہ یہاں بالکل "ایزی" محسوس کرتی ہے۔ تین چار دن ہی کی بات تھی۔ جمیل صاحب اکیلے ہی لاہور چلے گئے۔ یہاں انہیں توقع سے دو دن زیادہ لگ گئے۔ واپسی میں وہ جان بوجھ کر بائی روڈ آئے۔ وہ کچھ دیر کے لیے گجرات میں رکنا چاہتے تھے۔ گجرات' جہاں ہر وقت ان کا دل اٹکا رہتا تھا۔ جہاں عارفہ بیگم تھیں۔ جہاں ان کے پرخلوص جذبوں کی آنچ تھی اور ان کے دل میں اتر جانے والی روشن مسکراہٹ تھی۔ وہ عارفہ کو بری طرح مس کررہے تھے۔ مری سے انہوں نے ایک دوبار فون پر عارفہ بیگم سے بات کی تھی لیکن اب وہ لاشعوری طور پر انہیں دیکھنا بھی چاہ رہے تھے۔ وہ ڈیڑھ دو گھنٹے کے لیے گجرات میں رکے۔ عارفہ کے آبائی گھر میں انہوں نے دوپہر کا کھانا کھایا۔ عارفہ سے تسلی تشفی کی باتیں کیں اور اس وعدے کے ساتھ کہ آئندہ دو ہفتوں کے اندر اندر سب ٹھیک ہوجائے گا' وہ واپس مری آگئے۔

وہ عارفہ بیگم سے وعدہ کرکے آئے تھے کہ آئندہ دو ہفتوں میں سب ٹھیک ہوجائے گا لیکن مری پہنچتے ہی سب کچھ خراب ہوگیا۔ ایک بجلی چمکی اور ہر طرف آگ لگ گئی۔ ایک قیامت تھی جو جمیل صاحب کے سر پر ٹوٹ پڑی۔ وہ بادوباراں کی رات تھی۔ پہاڑ بادلوں میں اوجھل تھے۔ مخروطی چھتوں پر چھاجوں پانی برس رہا تھا۔ ماماں جنت نے گرم شال جمیل صاحب کے شانوں پر رکھتے ہوئے چپکے سے کہا "بہو رانی تاکید کرگئی تھی کہ بارش ہو تو گرم کپڑوں کا خاص خیال رکھنا۔"

جمیل نے اثبات میں سرہلاتے ہوئے شال اپنے شانوں پر پھیلالی۔ ماماں جنت ابھی باہر گئی ہی تھی کہ شجاع اندر آگیا۔ "سلام ڈیڈ!" اس نے کہا اور دروازہ بند کردیا۔

جمیل صاحب نے بیٹے کے سلام کا جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی انہیں اندازہ ہوا کہ بیٹا کوئی بہت اہم بات کہنے باپ کے پاس آیا ہے۔ شجاع کے چہرے کی اس مخصوص گمبھیرتا کو وہ بیس بائیس برسوں سے پہچانتے تھے۔ ان کے دل کی دھڑکن بڑھ گئی... تھوڑی سی تمہید باندھنے کے بعد شجاع اصل موضوع کی طرف آگیا' کہنے لگا "ڈیڈ! میں آج آپ سے ایک بہت اہم بات کہنے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔"

"ہاں... ہاں کہو بیٹا!" جمیل صاحب نے اپنے اندرونی اضطراب کو چھپاتے ہوئے کہا۔

شجاع نے ایک گہری سانس لی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا "میں شادی کرنا چاہتا ہوں ڈیڈ!"

"شش.... شادی... یہ تو.... خوشی کی بات ہے" انہوں نے ایک لمحہ توقف کیا اور بولے "کوئی لڑکی دیکھی ہے تم نے؟"

"جی ہاں ڈیڈ!" وہ بلا جھجک بولا "میں نوشین سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

جمیل صاحب کا سانس سینے میں اٹک سا گیا۔ وہ حیرت سے منہ کھولے شجاع کی طرف دیکھتے چلے جارہے تھے۔ کئی سیکنڈ ایسے ہی گزر گئے۔ جمیل صاحب کی زبان میں شاید حرکت کرنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ انہوں نے بمشکل خود کو سنبھالا اور بڑی کوشش سے بولے "یہ کیسے ہوسکتا ہے شجاع!" اپنی آواز انہیں کسی کنوئیں سے آتی محسوس ہوئی تھی۔

"کیوں نہیں ہوسکتا ڈیڈ! مجھے جیسی لڑکی کی تلاش تھی' وہ مجھے مل گئی ہے۔ وہ نوشین ہے' وہ بھی مجھے پسند کرتی ہے۔ ہم ایک دوجے کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔ ہمیں ایک دوجے کے ساتھ رہنا ہے۔"

جمیل صاحب کو اپنے قرب وجوار کی ہر شے گھومتی

ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ سانس سینے کو جیسے چھیلتی ہوئی گزر رہی تھی۔ انہوں نے سر تھام لیا۔ یہ وہ کیا سن رہے تھے؟ یہ کیا ہو رہا تھا... چلو، شجاع اصل صورت حال سے بے خبر تھا لیکن نوشین تو سب کچھ جانتی تھی۔ وہ اپنی بڑی بہن کی بہو بننے کے بارے میں کیسے سوچ سکتی تھی۔ وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی اور اگر اس نے ایسا کیا تھا تو پھر اس کے خیالات عام لوگوں سے بالکل مختلف تھے۔ جمیل صاحب نے گلاس میں تھوڑا سا پانی ڈال کر پیا اور خود کو سنبھالتے ہوئے بولے "شجاع! تمہیں نہیں معلوم، تم کیا کہہ رہے ہو۔ تم.... اس معاملے کی نزاکت کو نہیں سمجھ رہے۔"

ایک دم شجاع کی ٹون بہت بلند ہو گئی۔ وہ چیخ کر بولا "میں سب سمجھ رہا ہوں۔ میں سب جانتا ہوں۔ آپ نے ہمیشہ وہ برے سے برا کیا ہے جو آپ سے ہو سکا ہے.... آپ نے چوری چھپے شادی کر رکھی ہے۔ میرے یہاں آنے سے ایک دن پہلے تک آپ کی نئی بیوی یہاں آپ کے ساتھ موجود تھی۔ میری آمد کا سن کر آپ نے اسے گجرات بھیج دیا ہے۔ اس کا سارا سامان کامن روم کے ساتھ والے کمرے میں مقفل کر رکھا ہے آپ نے؟ بتائیں، آپ نے ایسا کیا ہے یا نہیں؟ بتائیں...." وہ اپنا چہرہ جمیل صاحب کے چہرے کے بالکل سامنے لا کر چنگھاڑا۔

جمیل صاحب سخت سردی کے باوجود پسینے میں نہا گئے تھے۔ ان کے ہاتھ لرزنے لگے تھے۔ اس لرزش کو چھپانے کے لیے انہوں نے دونوں ہاتھ شال کے اندر کر لیے۔

شجاع آتش فشاں لہجے میں بولا "آپ میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتے؟ مجھے بتائیں کہ میں سچا ہوں یا جھوٹا ہوں.... مجھے بتائیں۔"

جمیل صاحب نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور بڑی نحیف آواز میں بولے "اگر تمہیں سب کچھ معلوم ہے تو پھر.... پھر تو تمہیں وہ بات کہنی ہی نہیں چاہیے جو کہہ رہے ہو۔"

بجلی زور سے کڑکی، اس کے ساتھ ہی شجاع گرجا۔ "کیوں نہیں کہنی چاہیے۔ میں نے پیار کیا ہے.... اور پیار.... کوئی شناختی کارڈ دیکھ کر نہیں کیا جاتا۔ پیار بس ہو جاتا ہے۔ ہمیں بھی پیار ہو گیا ہے۔ ہم ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ہم شادی کرنا چاہتے ہیں۔"

جمیل صاحب کی تھکی تھکی آنکھوں میں آنسو لرزنے لگے تھے۔ انہوں نے گمبھیر آواز میں کہا "شجاع! یقین کرو بیٹا، میں تم سے کچھ بھی چھپانا نہیں چاہتا تھا۔ میں یقیناً تمہیں شادی سے پہلے ہی بتا دیتا لیکن نوشین نے تمہیں بتایا ہی ہو گا کہ یہ سب کچھ آناً فاناً ہو گیا تھا۔ اتفاقاً تم اس وقت رابطے میں بھی نہیں تھے۔ پھر تم اچانک پاکستان آ گئے۔ میں ڈر رہا تھا کہ ایک دم تمہیں بتانے سے تمہیں شاک لگے گا۔ میں تمہاری زودرنجی سے بھی خائف تھا، میں تمہیں بتدریج۔"

"بس کریں ڈیڈ! بس کریں" اس نے تیزی سے بات کاٹی "مجھے باتوں کے طوطے چڑیوں سے بہلانے کی کوشش مت کریں۔ میں جانتا ہوں، آپ نے ہمیشہ صرف اپنے بارے میں سوچا ہے اور آئندہ بھی اپنے بارے میں ہی سوچیں گے۔ میں صرف آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں، میں نوشین سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور مجھے یہ شادی ہر صورت کرنی ہے۔"

جمیل صاحب نے لرزاں آواز میں کہا "یہ کیسے ہو سکتا ہے شجاع! وہ رشتے کے لحاظ سے تمہاری خالہ لگتی ہے۔ تم اس سے کیسے شادی کر سکتے ہو؟"

وہ چیخ کر بولا "بے شک میں امریکا میں رہا ہوں لیکن مذہب کے بارے میں آپ سے کم نہیں جانتا۔ مذہبی لحاظ سے اس شادی میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ یہ شادی ہو سکتی ہے۔"

"میں تم سے اس بارے میں کوئی بحث نہیں کر رہا۔ میں تو بس یہ درخواست کر رہا ہوں کہ تم اس حوالے سے اپنے فیصلے پر نظرثانی کرو۔ میں تمہارے لیے اچھی سے اچھی دلہن ڈھونڈ نکالوں گا۔ جو تم کہو گے میں وہی کروں گا لیکن مجھے اس نئے چکر میں مت ڈالو بیٹا! یہ میرے لیے بہت تکلیف دہ ہو گا۔" وہ آخری جملے میں عارفہ کا نام بھی شامل کرنا چاہتے تھے لیکن بیٹے کے سامنے ان کی ہمت نہیں ہوئی۔

شجاع پاؤں پٹختا ہوا باہر نکل گیا تھا۔ بعد کے تین چار دنوں میں اس نے جمیل صاحب کو شکل تک نہیں دکھائی۔ جمیل صاحب کو محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ایک گہری دلدل میں پھنس گئے ہیں۔ اس دلدل میں اندیشوں کے زہریلے حشرات رینگ رہے تھے اور انہیں پیہم ڈنک مار رہے تھے۔ وہ بیٹے کے مزاج کو بڑی اچھی طرح جانتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ اس کے منہ سے جو بات نکل گئی ہے بس نکل گئی ہے۔ اب ساری دنیا بھی ایک طرف ہو جاتی تو وہ دوسری طرف اپنی بات پر مصر رہتا۔ شجاع کے اس رویے کے بارے میں سوچ کر جمیل صاحب کا دم گھٹنے لگتا تھا۔ اب ان کی واحد امید نوشین تھی۔ نوشین اپنی بڑی بہن سے یقیناً بہت مختلف تھی لیکن پھر بھی وہ انہیں اچھی ہی لگی تھی۔ وہ معاملہ فہم اور زیرک بھی تھی۔ جمیل صاحب کو توقع تھی کہ وہ ان کی بات دھیان سے

سنے گی۔ تمام پہلوؤں پر غور کرے گی اور کوئی ایسا فیصلہ نہیں کرے گی جس سے جگ ہنسائی اور بدنامی کا اندیشہ لاحق ہوتا ہو۔ جمیل صاحب کا خیال یہی تھا کہ نوشین کو شجاع کے ضدی اور طوفانی رویے کے سامنے ہتھیار ڈالنا پڑے ہیں ورنہ دل سے وہ بھی اس حقیقت کو سمجھتی ہوگی کہ یہ شادی ممکن نہیں ہے۔ دو تین روز بعد جمیل صاحب موقع دیکھ کر نوشین سے ملے۔ نوشین سے ملتے ہی ان کی ساری خوش فہمیاں دور ہوگئیں۔ ایک دو ہفتوں کے اندر ہی وہ بے حد بدل گئی تھی۔ اس نے بڑی بے رخی سے جمیل صاحب کی گزارشات سنیں پھر یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی "پلیز بھائی جان! آپ نے جو کچھ کہنا ہے 'اپنے بیٹے سے کہئے۔"

"بیٹا! میری بات تو سنو.... بیٹا نوشین!" جمیل صاحب اسے پکارتے ہی رہ گئے تھے۔

اگلے ہی روز نوشین مری سے گجرات واپس چلی گئی تھی۔ اس کے جانے کا علم جمیل صاحب کو ماماں جنت اور قربان کے ذریعے ہی ہوا تھا۔ نوشین کے جانے کے بعد دو دن تو شجاع سخت خراب موڈ میں رہا تھا پھر وہ بھی لاہور چلا گیا تھا۔

اگلے تین چار روز میں جمیل صاحب پر یہ حقیقت عیاں ہوگئی تھی کہ قسمت انہیں ایک سنگین دوراہے پر لے آئی ہے۔ ایک طرف شجاع تھا اور اس کی غصیلی ضد تھی۔ دوسری طرف عارفہ تھی اور اس کی محبت کی خوشبو تھی۔ وہ خوشبو جو صرف ایک ماہ میں ان کی مشام جاں میں گہرائی تک اتر گئی تھی۔ اس خوشبو نے ایک طویل عرصے بعد انہیں احساس دلایا تھا کہ وہ اب بھی زندہ ہیں۔ وہ ابھی اور زندہ رہ سکتے ہیں۔ وہ دوراہے پر تھے اور ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کریں۔ یہ ایک ایسا موضوع تھا جس پر وہ کسی سے بات کرنا نہیں چاہتے تھے۔ حتیٰ کہ اپنے قریبی دوست صدیقی سے بھی نہیں۔ یہ طوفان انہیں اکیلے ہی جھیلنا تھا۔ تن تنہا .... وہ اس مسئلے کے حوالے سے عارفہ کے جذبات کو بڑی اچھی طرح سمجھ سکتے تھے۔ نوشین' عارفہ کی چھوٹی بہن تھی۔ نوشین سے عارفہ کے تعلقات ویسے ہی تھے جیسے ایک بہن سے۔ اب وہ اسے بہو کے روپ میں کیسے دیکھ سکتی تھیں۔ وہ بڑی اچھی طرح جانتے تھے کہ عارفہ یہ سب قبول نہیں کرسکے گی۔

نوشین واپس گجرات جاچکی تھی لیکن اس نے ابھی تک اپنی بڑی بہن کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ دوسری طرف جمیل صاحب کو یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ نوشین لاہور پہنچی ہے اور دو تین بار شجاع سے ملی ہے۔ پندرہ بیس روز اسی طرح

"مجبوری"

ایک صاحب جو اسٹیج پر جاتے ہوئے گھبراتے تھے اور جنہیں تقریر کرنا نہیں آتی تھی، ایک بار یوں حاضرین سے مخاطب ہوئے۔

"معزز......خوا......خواتین و حضرات......!مم...... میں جب یہاں آنے کے لیے روانہ ہوا تھا تو جو کچھ میں کہنا چاہتا تھا...... وہ صرف مجھے معلوم تھا یا میرے خدا کو...... لیکن اب وہ صرف خدا کو ہی معلوم ہے......"

گزرے پھر شجاع دوبارہ مری آدھمکا۔

حسب اندیشہ وہ اپنے فیصلے پر ڈٹا ہوا تھا۔ اس کے رویے میں قطعاً کوئی لچک پیدا نہیں ہوئی تھی۔ باپ ہونے کے باوجود جمیل صاحب نے بیٹے سے معافی مانگی۔ اس کی منت سماجت کی' وہ بولا "ڈیڈ! میں آپ کے جذبات سمجھ رہا ہوں لیکن کیا کروں' اپنے دل پر میرا بس نہیں رہا۔ میں مجبور ہوں۔ میں نوشین کے پیار میں بہت دور نکل گیا ہوں۔ ہم ایک دوسرے کے بغیر نہیں جی سکتے۔"

جمیل صاحب نے آنکھوں کی نمی چھپاتے ہوئے گہری سانس لی اور بولے "ہم دونوں ہی اپنی اپنی جگہ مجبور ہیں لیکن ہم دونوں میں سے کسی ایک کو پیچھے ہٹنا پڑے گا۔ تمہیں میرے لیے یا مجھے تمہارے لیے راستہ خالی کرنا پڑے گا۔"

شجاع نے کچھ نہیں کہا۔ جمیل صاحب متوقع نظروں سے اس کی طرف دیکھتے رہے۔ شاید وہ چاہتے تھے کہ شجاع کچھ بولے لیکن وہ نہیں بولا' اسے نہیں بولنا تھا۔

جمیل صاحب اٹھے اور تھکے تھکے قدموں سے باہر نکل گئے۔ اسی روز رات کو انہوں نے فیصلہ کرلیا کہ وہ عارفہ کو طلاق دے دیں گے۔

❂✶❂

وہ بھی بارش کی رات ہی تھی۔ ماماں جنت نے چائے جمیل صاحب کے سامنے لاکر رکھی۔ وہ پڑی پڑی ٹھنڈی ہوگئی۔ آج کل چائے کے ساتھ یہی کچھ ہو رہا تھا۔ وہ گہری سوچوں میں رہتے تھے۔ بال منتشر' شیو بڑھی ہوئی' چہرہ تھکا ماندہ' اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ انہوں نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف عارفہ بیگم تھیں "السلام علیکم! کیسے ہیں؟"

"وعلیکم السلام' میں ٹھیک ہوں" انہوں نے لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے کل بھی محسوس ہوا تھا کہ آپ بہت پریشان ہیں۔ کیا بات ہے؟ شجاع سے کوئی بات ہوگئی ہے؟"

"نہیں.... فی الحال تو ایسا کچھ نہیں۔"

"دیکھیں جمیل! پلیز، آپ میری وجہ سے دل پر کوئی بوجھ نہ لیں۔ میں ایک دو ہفتے مزید یہاں رہ لوں گی۔ لیکن آپ کوئی جلد بازی نہ کریں۔ جلدی میں کام خراب ہوتا ہے۔ آپ اسے آہستہ روی سے سمجھائیں، وہ ضرور سمجھ جائے گا۔"

جمیل صاحب کیسے بتاتے، اب یہ ایک دو ہفتوں کی بات نہیں پوری عمر کی بات ہے۔ وہ ان سے کیسے کہتے کہ تم جو ایک ایک دن گن رہی ہو، اب سال بھی گنوگی تو یہ دوریاں سمٹیں گی نہیں۔ ہمارا کھیل شروع ہونے کے بعد ختم بھی ہوچکا ہے۔ ایک لامتناہی اندھیری رات سے پہلے کی دو چار "چاندنی راتیں" بیت بھی چکی ہیں۔

عارفہ بیگم کافی دیر ان سے تسلی تشفی کی باتیں کرتی رہیں۔ انہوں نے جمیل صاحب کو پڑھنے کے لیے چند سورتیں بھی بتائیں۔ پھر وقت پر دوا وغیرہ کھانے کی تاکید کی .... اس کے بعد خدا حافظ کہہ کر فون بند کردیا۔ جمیل صاحب جانتے تھے، یہ آخری فون ہے۔ اس کے بعد شاید وہ کبھی عارفہ سے بات نہیں کرسکیں گے۔ وہ دیر تک "فون سیٹ" پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہے۔ آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تھی۔ پھر انہوں نے فون کا تار کھینچ کر علیحدہ کردیا۔ آخر وہ ایک طویل سانس لے کر اٹھے۔ شال ان کے کندھوں پر جھول رہی تھی۔ کھڑکی کے سامنے چند سیکنڈ کے لیے رک کر انہوں نے بادوباراں کا منظر دیکھا۔ تب کامن روم کے ساتھ والے کمرے کا لاک کھول کر اندر چلے گئے۔ یہاں عارفہ بیگم کے استعمال کی ساری اشیا رکھی تھیں۔ لباس، جوتے، میک اپ کا مختصر سا سامان، خواتین کے چند سنجیدہ میگزین اور مذہبی کتابیں۔ چند زیورات، کانچ کی چوڑیاں، ایک نفیس سا شولڈر بیگ، مری کی سردی کے لیے ایک لیڈیز کوٹ اور اس کے علاوہ بھی کچھ اشیا۔ جمیل صاحب ایک ایک شے کو دیکھتے رہے۔ انگلیوں کی پوروں سے چھوتے رہے، ان کے چہرے پر عجیب سی کیفیت تھی۔ آخر کمرا مقفل کرکے وہ باہر نکل آئے۔

بارش کی وجہ سے سردی کافی زیادہ ہوگئی تھی۔ اپنے بیڈ روم میں پہنچ کر انہوں نے ایک مقفل دراز کھولی، چند کاغذات نکالے اور شال کو درست کرتے ہوئے آتش دان کے سامنے آن بیٹھے۔ اب ان کے سامنے ایک مشکل ترین مرحلہ تھا۔ ان کے ہاتھ میں طلاق کے کاغذات تھے۔ یہ کاغذات کل ہی ان کے وکیل نے تیار کرکے انہیں دیے تھے۔ انہیں کاغذات پر دستخط کرنا تھے اور پھر عارفہ کے پتے پر پوسٹ کردینا تھے۔ وہ دیر تک سوچتے رہے کہ یہ کاغذات وصول کرکے عارفہ کے دل پر کیا گزرے گی۔ وہ گجرات میں سراپا انتظار بیٹھی ہوئی ہے۔ ابدی جدائی کے زہر سے باؤلی تو نہیں ہوجائے گی۔ کہیں اسے کچھ ہو ہی نہ جائے، کہیں وہ.... اس سے آگے وہ کچھ نہ سوچ سکے، وہ سوچنا چاہتے ہی نہیں تھے۔

انہوں نے بڑی ہمت کے ساتھ کاغذات پر دستخط کیے اور انہیں پوسٹ کرنے کے لیے لفافے میں بند کردیا۔

یہ کوئی تین گھنٹے بعد کی بات ہے جب بستر پر لیٹے لیٹے ان کی سانسیں سینے میں الجھنا شروع ہوئیں۔ یہ رات کا آخری پہر تھا۔ باہر بارش اور ہوا کا شور تھا۔ سانس کی شکایت تو شام سے ہی تھی لیکن اب ایکدم بڑھ گئی تھی۔ انہوں نے اٹھ کر دوبارہ دوا لی مگر کچھ افاقہ نہیں ہوا۔ سینے میں شدید جکڑن محسوس ہورہی تھی۔ انہیں اندازہ ہوا کہ پیشانی پر پسینہ رینگ رہا ہے۔ طلاق کے کاغذات سامنے تپائی پر رکھے تھے۔ اچانک ان کے اندر سے ایک وجدانی آواز ابھری۔ اب ان کاغذات کی ضرورت نہیں رہی۔ اب ان کاغذات کی ضرورت نہیں رہی۔ وہ کچھ دیر سوچتے رہے پھر ڈگمگاتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھے۔ انہوں نے کاغذات آتش دان میں جھونک دیے۔

جمیل صاحب کے ہاتھ پاؤں سن ہوتے جارہے تھے۔ سینے میں بائیں طرف درد کی دیوپیکر لہریں تھیں۔ ان کا جی چاہا کہ وہ ایک آخری بار عارفہ سے بات کرلیں۔ وہ فون کی طرف بڑھے لیکن پھر انہیں یاد آیا کہ فون کا تار تو انہوں نے رات دوسرے پہر ہی کھینچ دیا تھا۔ "چلو ٹھیک ہے، جو ہونا تھا ہوگیا" انہوں نے سوچا۔ پھر وہ صوفے پر ہی ڈھے سے گئے۔ انہوں نے دیکھا، آتش دان میں طلاق کے کاغذات راکھ ہوچکے تھے۔ اس آخری منظر نے انہیں قدرے سکون دیا۔ اس کے دو تین منٹ بعد ہی جمیل صاحب کی بے جان آنکھیں پتھرا گئیں۔

کمزور باپ نے زور آور بیٹے کے لیے جگہ خالی کردی تھی۔ شاید ہمیشہ سے یہی دستور رہا ہے۔

سالگرہ نمبر کے لئے طاہر جاوید مغل کا تحفہ خاص

محبت اور ایلچی

طاہر جاوید مغل

اساتذہ کے لئے کوڑھ مغز، غبی اور بے رغبت شاگرد کوفت و الجھن کا سبب بنتے ہیں کیونکہ ایسے طالب علموں کے روبرو تو بسا اوقات ذہانت بھی ناکام ہونے لگتی ہے تاہم اگر شاگرد ذہین، معاملہ فہم اور سمجھنے کے لئے آمادہ ہو تو سمجھنے سمجھانے کا عمل دلچسپ ہوجاتا ہے۔

محبت جیسے وقیع مسئلے کو آسان کرنے والی ایک مشاق استاد کا ماجرائے دلچسپ

عظمیٰ ریاض کا تعلق درس وتدریس کے شعبے سے تھا۔ وہ کالج میں سائیکالوجی کی اسسٹنٹ پروفیسر تھیں۔ یعنی اپنے طلبہ وطالبات کو نفسیات پڑھاتی تھیں۔ دو بچے تھے۔ میاں بینک آفیسر تھے۔ عظمیٰ کالج کے طلبہ کے ایک بڑے گروپ کے ساتھ مری آئی ہوئی تھیں۔ ان کی ایک بھانجی نادیہ بھی ان کے ساتھ تھی۔ یہ گروپ کی واحد ممبر تھی جس کا تعلق کالج سے نہیں تھا۔ نادیہ نویں کی طالبہ تھی اس کی عمر چودہ سال کے لگ بھگ تھی۔

طالب علم لڑکے لڑکیوں کا یہ گروپ جو تقریباً 200 ممبران پر مشتمل تھا اگست کی 10 تاریخ کو مری پہنچا۔ یہ وہ دن ہوتے ہیں جب ملکہ کوہسار مری اپنی پوری سج دھج اور پورے جاہ وجلال میں نظر آتی ہے۔ جدھر دیکھو انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر، کہیں تل دھرنے کو جگہ نہیں ہوتی۔ ریستوران کے باہر لوگ قطاروں میں کھڑے ہوکر کھانے کے لیے اپنی باری کا انتظار کرتے ہیں۔ ہوٹلوں کے سارے کمرے بک ہوجاتے ہیں بلکہ ایسے کمرے بھی بک ہوجاتے ہیں جنہیں کمرا کہتے ہوئے ہنسی آتی ہے۔ مثلاً پان سگریٹ کے خالی کھوکھے، خستہ حال اسٹور روم، مرغیوں کے ڈربے وغیرہ

سب کچھ بک ہوجاتا ہے۔ ان دنوں میں کوئی مناسب قیام گاہ مناسب داموں میں ڈھونڈنا کار دشوار ہوتا ہے اور جب کوئی بڑا گروپ قیام گاہ ڈھونڈ رہا ہو تو پھر اس کا جُل خراب ہونا یقینی ہوتا ہے۔ کالج کے اس ''وسیع و عریض'' گروپ کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا...... کئی گھنٹے کی تلاش بسیار کے بعد پرنسپل اکرم رندھاوا صاحب نے فیصلہ کیا کہ گروپ چھوٹے چھوٹے گروپس میں تقسیم ہوجائے اور جس کے جدھر سینگ سمائیں ادھر چلا جائے' یعنی سب لوگ آزادانہ طور پر اپنی اپنی قیام گاہ ڈھونڈ لیں لیکن اس کے ساتھ شرط یہ تھی کہ ہر روز شام کو ٹھیک سات بجے سب لوگ مال روڈ کے جی پی او چوک پر جمع ہوں گے اور اپنے حال احوال سے آگاہ کریں گے یہ ٹور چھ دن کا تھا۔

رندھاوا صاحب کی ہدایت کے مطابق ہمارا گروپ پُرہجوم مری میں تتر بتر ہوگیا تھا۔ لڑکوں کا تو کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن لڑکیوں کے بہت زیادہ ذیلی گروپس نہیں بنائے جاسکتے تھے۔ 80 لڑکیاں تقریباً چھ ٹکڑیوں میں تقسیم ہوئیں ہر ٹکڑی کے ساتھ ایک عدد استاد موجود تھا۔ عظمٰی جس ٹکڑی یا گروپ میں تھی اس میں عظمٰی کے علاوہ بارہ لڑکیاں تھیں جن میں عظمٰی کی بھانجی نادیہ تھی۔ انہیں مری کے مہران ہوٹل میں تین کمرے ملے تھے۔

عظمٰی کے گروپ میں تھرڈ ایئر کی ایک لڑکی نتاشا بھی تھی' نتاشا کالج کے ہی ایک اسٹوڈنٹ منصور میں دلچسپی لیتی تھی' منصور بی ایس سی کررہا تھا اور فورتھ ایئر میں تھا۔ دونوں شائستہ حدود میں رہتے ہوئے رومانس کررہے تھے اور اس رومانس کے بارے میں کالج کے اکثر طلبہ کو معلوم تھا اور یہ کوئی اکیلا رومانس نہیں تھا ایسے چار چھ افیئرز کالج میں اور بھی موجود تھے بلکہ ایک جوڑے کی تو منگنی بھی ہوچکی تھی۔ نئی زمانہ یہ سب کچھ کالج لائف کا حصہ شمار کیا جاتا ہے۔

ٹور شروع ہونے کے ایک دن بعد ہی نتاشا نے پریشان ہونا شروع کردیا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ منصور اس سے دور ہوگیا تھا۔ وہ تو اکٹھے گھومنے پھرنے کے لیے یہاں آئے تھے مگر یہاں اژدحام کی وجہ سے سب کچھ الٹ پلٹ ہوگیا...... منصور اور اس کے گروپ کو مال روڈ سے بہت نیچے بس اسٹینڈ کے قریب ہوٹل ملا تھا۔ دو دن میں وہ بس دو دفعہ ہی مل سکے تھے۔ نتاشا لوگوں کے ہجوم میں سارا دن منصور کو ڈھونڈتی رہتی تھی یقیناً وہ بھی ایسا ہی کرتا ہوگا۔ پچھلے چوبیس گھنٹے سے نتاشا کچھ زیادہ ہی پریشان تھی۔ منصور شام کو جی پی او چوک پر بھی نہیں آیا تھا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں پرنسپل رندھاوا صاحب کی ہدایت کے مطابق سب طلبہ کو شام سات بجے اکٹھے ہونا تھا۔

درحقیقت پہلے دو روز تو اس ہدایت پر جیسے تیسے عمل ہوا تھا لیکن اب یہ حکم بھی دوسرے بہت سے احکام کی طرح ہوا میں اڑ گیا تھا۔ آزادی کی عمر تھی' آزادی کا ماحول تھا اور اگست کے حوالے سے وقت بھی آزادی کا تھا۔ رندھاوا صاحب کے احکامات اس آزاد ریلے پر کہاں تک بند باندھ سکتے تھے' کئی طلبہ شام کے اجتماع میں نہیں پہنچے تھے۔ یہ بھی پتا چلا کہ لڑکوں کی ایک ٹولی بغیر بتائے ایوبیہ چلی گئی ہے۔ لڑکوں اور لڑکیوں کا ایک مخلوط گروپ شام سات بجے سے تھوڑی ہی دیر قبل کشمیر پوائنٹ کی طرف جاتے دیکھا گیا تھا۔

جب شام سات بجے کے ''گیٹ ٹو گیدر'' میں بھی منصور سے ملاقات نہیں ہوئی تو نتاشا کچھ زیادہ ہی پریشان ہوگئی۔ وہ بالکل اداس سی پوسٹ آفس کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔ عظمٰی کے گروپ کی کچھ لڑکیاں اسے تنگ کرنے لگیں۔ عظمٰی کی بھانجی نادیہ ان میں پیش پیش تھی۔ درحقیقت پہلے دن سے ہی نادیہ نے نتاشا کو تنگ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی، یوں لگتا تھا کہ اسے نتاشا سے چڑ سی ہوگئی ہے۔ بات بے بات اس سے الجھ جاتی تھی کبھی اسے دیسی جیولیٹ کا خطاب دیتی' کبھی ہیر کی پوتی اور کبھی کسی کی رشتے دار کہہ کر پکارتی۔ نتاشا کے لباس اور بالوں کے اسٹائل وغیرہ میں نقص نکالنا بھی اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ گروپ کی ایک اور لڑکی فریال بھی نادیہ کے ساتھ شریک ہوگئی تھی اور دونوں اکثر نتاشا کے بارے میں ہی مزاحیہ کانا پھوسی کرتی رہتی تھیں۔

ان کی باتوں سے قطع نظر نتاشا ایک قبول صورت' سلجھی ہوئی لڑکی تھی۔ وہ نوعمر نادیہ کی باتوں کو بڑے تحمل سے برداشت کرتی رہی تھی اور اب بھی کررہی تھی۔ اس روز تو حد ہوگئی۔ سب لڑکیاں آئس کریم کھانے کے لیے قریبی دکان پر چلی گئیں۔ نتاشا سیڑھیوں پر اکیلی بیٹھی رہ گئی...... بس ایک سنجیدہ صورت لڑکی تھی جو اس کے پاس بیٹھی واک مین پر موسیقی سن رہی تھی۔ اتنے میں شوخ آنکھوں والی فریال تیزی سے واپس آئی اور نتاشا کو مخاطب کرکے بولی ''لو یار! تمہاری اداسی دور ہونے کا سامان ہوگیا۔''

نتاشا سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

''مذاق مت سمجھنا...... میں بالکل سنجیدہ ہوں۔'' فریال بولی ''تیرے منصور صاحب آگئے ہیں۔''

فریال نے کچھ ایسی سنجیدگی سے کہا تھا کہ نتاشا نے بے ساختہ پوچھا ''کہاں ہے؟''

''وہ نیچے 'کراچی ہوٹل' کے پاس کھڑا برگر کھا رہا

ہے۔ آؤ دکھاؤں تمہیں۔''

نتاشا چند لمحے تذبذب میں رہی پھر کھڑی ہوگئی۔ فریال اسے لے کر اس تنگ سڑک پر آگئی جو 'جی پی او' کے سامنے سے پرانی مری کی طرف اترتی ہے' صرف چالیس پچاس میٹر آگے جاکر فریال رک گئی' وہ دیکھو' وہ کھڑا ہے۔'' فریال نے اشارہ کیا۔

''کہاں ہے؟'' نتاشا نے چاروں طرف نگاہ گھما کر پوچھا۔

چند بلّیاں اِدھر اُدھر گھوم رہی تھیں۔

پھر جیسے ساری بات ایک دم ہی اس کی سمجھ میں آگئی۔ اس کے ساتھ ہی غم و غصے کی ایک شدید لہر اس کی آنکھوں میں آنسو بھر لائی۔ ہوٹل کے پاس کچرے کا ڈرم تھا' ڈرم کے پاس ایک میلا کچیلا فربہ اندام بلّا باسی برگر پر منہ مار رہا تھا۔

نتاشا نے تیزی سے گھوم کر دیکھا فریال موقعے سے غائب تھی۔ وہ اپنے آنسو ضبط کرتی ہوئی واپس جی پی او کی سیڑھیوں پر آگئی۔ عظمیٰ نے اسے جاتے اور پھر اشک بار آنکھوں کے ساتھ آتے دیکھ لیا تھا۔ وہ اس کے پاس چلی آئی۔

''کیا بات ہے نتاشا؟ تمہاری آنکھوں میں آنسو ہیں۔''

''کچھ نہیں ٹیچر! ویسے ہی پانی نکل آیا ہے۔''

''یہ ویسے ہی نکل آنے والا پانی نہیں ہے۔'' عظمیٰ اسے اپنے ساتھ سیڑھیوں پر بٹھاتے ہوئے بولی ''مجھے بتاؤ کیا بات ہے...... میں جانتی ہوں فریال تمہیں تنگ کر رہی ہے اور نادیہ بھی۔''

نتاشا پہلے تو ٹالتی رہی لیکن جب عظمیٰ کا اصرار بڑھا تو اس کے ضبط کا بند ٹوٹ گیا اور وہ ایک بار پھر رونے لگی کچھ دیر بعد بولی ''ٹیچر! نادیہ آپ کی بھانجی ہے، میں اسے چھوٹی بہن کی طرح سمجھتی ہوں...... لیکن...... وہ فریال کے ساتھ مل کر مجھے بہت ستا رہی ہے۔ میں جانتی ہوں اب بھی دونوں نے مل کر شرارت کی ہے۔''

''کیا شرارت کی ہے بھئی؟ یہی تو پوچھ رہی ہوں تم سے؟''

نتاشا نے اشک بار لہجے میں ساری بات بتادی...... عظمیٰ کو سن کر واقعی دکھ ہوا۔

رات کو کھانے کے بعد انہوں نے ایک چکر مال کا لگایا۔ سردی محسوس ہو رہی تھی عظمیٰ اپنے گروپ کے ساتھ ہوٹل واپس آگئی۔ لڑکیاں ایک ہی کمرے میں جمع ہو کر لوڈو اور کارڈ وغیرہ کھیلنے لگیں۔ عظمیٰ اپنے بستر پر نیم دراز ہوگئی اور نادیہ کے بارے میں سوچنے لگی۔ نادیہ کے ساتھ عظمیٰ کو بچپن سے بہت پیار تھا۔ وہ بالکل گڑیا سی تھی اور ذہین بھی بہت تھی۔ ذہین بچے اکثر شرارتی بھی ہوتے ہیں۔ نادیہ کی نس نس میں بھی شرارت بھری ہوئی تھی۔ وہ شروع سے ہی بے حد کھلنڈری تھی۔ بڑی ہوئی تو اس نے قد کاٹھ بھی اچھا نکالا لیکن اس میں لڑکیوں جیسی نزاکت اور نرمی نہیں تھی۔ دیکھنے میں لمڈھینگ لگتی تھی اور لڑکوں کی ہی طرح لمبے لمبے ڈگ بھرتی ہوئی چلتی تھی۔ قدرتی طور پر کچھ لڑکیوں میں نسوانیت جلدی جاگ جاتی ہے اور کچھ میں یہ تبدیلی دیر سے آتی ہے۔ نادیہ بھی دوسری قسم میں شمار ہوتی تھی۔ اپنی ہم عمر لڑکیوں کے برعکس نہ تو اس میں شرم و جھجک پیدا ہوئی تھی اور نہ ہی صنفِ مخالف کے لیے کسی طرح کی خواہش یا دلچسپی اس میں نمودار ہوئی تھی بلکہ عظمیٰ نے محسوس کیا تھا کہ اس قسم کے جذبے اور اس نوع کے واقعات کو وہ تمسخر کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ ٹی وی یا فلم وغیرہ دیکھتے ہوئے کوئی رومانی منظر اسکرین پر نمودار ہوتا تھا تو نادیہ کی آنکھوں میں شرم و حجاب کے بجائے عجیب طرح کا الجھن آمیز تمسخر دکھائی دینے لگتا تھا۔ بعض اوقات وہ کوئی بے ڈھنگا سا فقرہ بھی اچھال دیتی تھی۔ مثلاً...... دیکھو اب بک بک شروع

ہونے لگی ہے یا..... لو جی اب مینڈکوں کو پھر زکام ہونے لگا ہے۔

عظمیٰ چاہتی تھی کہ وقت کے مطابق نادیہ میں تبدیلیاں رونما ہوں۔ اسے اپنی صنف اور صنف کے جذبات کا احساس ہو۔ اس حوالے سے اس کی غیر معمولی سرد مہری میں کمی واقع ہونا اب ضروری تھا۔

لڑکیاں ساتھ والے کمروں میں مسلسل لوڈو وغیرہ کھیلنے میں مصروف تھیں۔ خبر نہیں کہ انہیں کب تک جاگنا تھا۔ عظمیٰ نے نادیہ کو اپنے پاس بلالیا۔ اس سے بات کرنے کا یہ اچھا موقع تھا۔ نادیہ آلتی پالتی مار کر اس کے سامنے بیٹھ گئی اور تکیہ دہرا کر کے گود میں رکھ لیا "جی خالہ! کیا بات ہے؟" وہ اپنے مخصوص بے پروا لہجے میں بولی۔

عظمیٰ نے گہری سنجیدگی سے کہا "نادیہ! تم ہاتھ دھو کر اس بے چاری نتاشا کے پیچھے کیوں پڑی ہوئی ہو۔ وہ آج باقاعدہ رونے لگی تھی۔"

"میں نے کیا کیا ہے خالہ؟" وہ انجان بن کر بولی۔

"دیکھو نادیہ! مجھے یہ مان ہے کہ تم مجھ سے جھوٹ نہیں بولتی ہو۔ میرا یہ مان کبھی نہ توڑنا..... آج فریال نے نتاشا سے جو شرارت کی اس میں تم بھی شامل تھیں نا؟"

نادیہ کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے گردن جھکا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تم ایسا کیوں کرتی ہو؟" عظمیٰ نے پوچھا۔

جواب میں نادیہ یکسر خاموش رہی۔

عظمیٰ نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا "دیکھو نادو! میں نفسیات پڑھاتی ہوں بہت بڑی نفسیات داں تو نہیں ہوں لیکن تھوڑا بہت علم اس بارے میں مجھے ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ کچھ تجربہ بھی ہے۔ اور میرا تجربہ کہتا ہے کہ تمہیں ذہنی تربیت کی ضرورت ہے۔ تمہارا رویہ تمہاری عمر کے مطابق نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں جس خاص سمت میں اشارہ کر رہی ہوں..... تم سمجھ رہی ہو۔ اس بارے میں ایک بار پہلے بھی ہم دونوں میں تھوڑی سی بات ہو چکی ہے۔"

وہ ذہین نظروں سے عظمیٰ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "آپ..... لڑکوں اور لڑکیوں کے ملنے جلنے کی بات کر رہی ہیں نا؟"

"ہاں..... میں یہی بات کر رہی ہوں..... اور چاہتی ہوں کہ تم بھی آج کھل کر اس بارے میں بات کرو۔"

اس نے سر جھٹک کر اپنے بالوں کو پیشانی سے پیچھے ہٹایا اور قدرے بے باکی سے بولی "خالہ! میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ مجھے یہ سب کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ ایسے لوگوں کو دیکھ کر مجھے ہنسی آنے لگتی ہے۔ بالکل اُلّو لگتے ہیں۔ ایک دم نان سینس۔"

"مجھے خوشی ہے نادو کہ آج تم کھل کر بات کر رہی ہو..... وہری نائس..... میں چاہوں گی کہ اس حوالے سے جو کچھ بھی تمہارے ذہن میں ہے بلا جھجک اور بے تکان مجھے بتاؤ۔ میں تمہاری خالہ نہیں..... تمہاری دوست بھی ہوں..... بولو ہوں نا؟"

نادو نے اثبات میں سر ہلایا۔ چند لمحے تک ایک "معصوم بے باکی" سے عظمیٰ کی آنکھوں میں دیکھتی رہی پھر گویا ہمت کر کے بولی "ایسا کیوں ہوتا ہے خالہ یہ لڑکیاں..... یہ لڑکے..... مم..... میرا مطلب ہے۔ یہ کیوں کرتے ہیں ایسے؟ ہم سب کیوں اس طرح نہیں رہ سکتے جیسے عام لوگ رہتے ہیں۔ دوستی بھی ہو، ہنسی مذاق بھی ہو، لڑائی جھگڑا بھی ہو، لیکن یہ جو....." وہ کہتے کہتے رک گئی۔

"ہاں..... ہاں کہو نادو! جو کچھ دماغ میں ہے، بے جھجک بتاؤ۔"

"مجھے ان کے انداز اچھے نہیں لگتے۔ ایک دوجے کو دیکھ کر شرم سے سرخ ہوتے ہیں، ایک دوجے کو دیکھتے ہیں اور نہیں بھی دیکھتے، بات کرتے بھی ہیں اور نہیں بھی کرتے، چھپ چھپ کر ملتے ہیں، سرگوشیاں کرتے ہیں۔ ہر وقت آہیں بھرنا، ہر وقت ایک ہی چکر میں رہنا۔ مجھے یہ سب کچھ الجھا دیتا ہے۔"

عظمیٰ مسکرائی "..... لیکن اس "سب کچھ" میں تو زندگی ہے اسی سے محبت کی شروعات ہوتی ہے۔ اسی سے دو اجنبی لوگ ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں، پھر گھر بنتے ہیں، فیملی کی شروعات ہوتی ہے۔ تم سوچو اگر ایک گھر نہ ہوتا وہاں دو محبت کرنے والے "مرد اور عورت" نہ ہوتے تو پھر تمہارا وجود کیا ہوتا؟ میرا وجود کیا ہوتا؟ یہ نیچر ہے مائی ڈیئر یہی زندگی ہے قدرت نے اس دنیا کا کارخانہ چلانے کے لیے یہ اٹل جذبے بنائے ہیں۔ ان جذبوں کے بغیر ہم ادھورے ہیں۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ اگر مجھے لڑکوں سے بات کرنا، ان سے ملنا اچھا نہیں لگتا تو میں ادھوری ہوں؟"

"نہیں..... بات نہ کرنے میں ادھورا پن نہیں بلکہ یہ تو تمہاری عمر کے لحاظ سے شاید مناسب ہی ہے، ادھورا پن تمہاری سوچ میں ہے۔"

وہ مسکرائی "خالہ! آپ تو سائیکالوجسٹ ہیں آپ کی کئی باتیں میرے سر کے اوپر سے گزر جاتی ہیں..... مجھے صرف یہ بتائیں کہ یہ ایموشن جسے آپ "محبت" کہتی ہیں..... کیوں پیدا

ہوتی ہے؟ کیوں اچھے بھلے لوگ نیم دیوانے سے لگنے لگتے ہیں۔ آپ نتاشا باجی کو دیکھ ہی رہی ہیں۔ تین دن سے کس طرح بوکھلائی بوکھلائی پھر رہی ہیں! آخر یہ لوگ ...... کیوں ...... ایک دوسرے کو اس بری طرح مس کرنے لگتے ہیں۔ کسی وقت تو یوں لگتا ہے کہ یہ صحت مند نہیں بیمار لوگ ہیں۔"

اس سے پہلے کہ عظمیٰ جواب میں کچھ کہتی، دروازے پر دستک ہوئی۔ عظمیٰ نے خود اٹھ کر دروازہ کھولا، باہر ریحان تھا۔ ریحان فرسٹ ایئر کا اسٹوڈنٹ تھا۔ وہ عظمیٰ ہی کے محلے میں رہتا تھا۔ کالج کا اسٹوڈنٹ ہونے کی وجہ سے وہ عظمیٰ کا شاگرد بھی تھا۔ بے حد شریف لڑکا تھا۔ اسے گروپ کے ساتھ ہی مری آنا تھا لیکن بوجوہ ... آنہیں سکا۔ اب پہلی فرصت میں وہ یہاں پہنچ گیا تھا۔ اس کا اٹیچی اس کے ہاتھ میں تھا۔ عظمیٰ نے اسے اندر آنے دیا۔ حال احوال پوچھا۔

ریحان کو بھی ساری صورت حال معلوم ہوئی۔ ریحان نے عظمیٰ کو بتایا کہ وہ اس گروپ میں رہنا چاہے گا جس میں اس کا دوست ٹیپو ہے۔ اب ٹیپو کہاں تھا، یہ عظمیٰ کو بھی معلوم نہیں تھا۔ اس نے ریحان کو پرنسپل رندھاوا صاحب کی طرف بھیج دیا اور اسے کہا کہ وہ ان سے ساری معلومات لے کر آئے۔ ریحان اپنا اٹیچی وہیں رکھ گیا۔

ریحان کے جاتے ہی باقی لڑکیاں بھی لوڈو وغیرہ سے فارغ ہو کر کمرے میں پہنچ گئیں یوں عظمیٰ اور نادو کے درمیان ہونے والی بات چیت وہیں رہ گئی۔

سب تھکی ہوئی تھیں جلد ہی سو گئیں۔ نادو بھی سو گئی۔ عظمیٰ جاگتی رہی۔ اس کا ذہن نادو کے سوالوں اور جوابوں میں الجھا ہوا تھا۔ نادو مرد وزن کے باہمی ربط کی حقیقت جاننا چاہتی تھی۔ وہ آفاقی جذبۂ محبت کے بارے میں الجھنوں کا شکار تھی اور یہ خاصی پیچیدہ الجھن تھی۔

عظمیٰ جاگتی رہی اور سوچتی رہی۔ دفعتاً اس کی نگاہ ریحان کے اٹیچی کیس پر پڑی۔ یہ اٹیچی دیوار کے ساتھ قالین پر رکھا تھا۔ اس سے کچھ ہی فاصلے پر نادو کا اٹیچی بھی رکھا تھا۔ یہ دونوں اٹیچی نیلے پیراشوٹ کے بنے ہوئے تھے اور بالکل ایک جیسے تھے ان کے اندر سامان کا حجم بھی کم و بیش ایک جتنا ہی تھا۔

عظمیٰ کے ذہن میں اچانک ایک بات آئی۔ اس کی آنکھوں میں چمک جاگ اٹھی۔ وہ بستر سے اتر کر ریحان کے اٹیچی کے پاس پہنچی اور غور سے اسے دیکھنے لگی۔

ابھی وہ واپس بستر پر نہیں پہنچی تھی کہ دروازے پر مدھم دستک ہوئی۔ باہر ریحان اور ٹیپو تھے۔ ریحان اپنا اٹیچی کیس

اظہار ہمدردی

ریشماں کا منگیتر کافی عرصے سے دبئی گیا ہوا تھا اور اب شادی کے لیے آنے والا تھا۔ ایک روز ریشماں نے شرماتے ہوئے زرینہ کو بتایا "وہ وہاں دبئی میں اپنے دوستوں سے کہتا پھر رہا ہے کہ میں شہر کی سب سے خوب صورت لڑکی سے شادی کرنے جا رہا ہوں۔"

"ہائے اللہ ...... ! یہ تو بہت بری بات ہے ......" زرینہ نے فوراً ہمدردانہ لہجے میں کہا "اتنا عرصہ اس نے منگنی تمہارے ساتھ رکھی اور اب ......"

لینے آیا تھا۔ عظمیٰ نے دروازہ کھولا اور اٹیچی کیس اسے دے دیا۔ ٹیپو نے بتایا کہ وہ ڈیسنٹ ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔

☆☆☆

لڑکیاں بہت تھکی ہوئی تھیں۔ اگلے روز دیر تک سوتی رہیں۔ دس بجے کے قریب ریحان کا فون آیا یہ فون عظمیٰ نے ہی ریسیو کیا۔ وہ پریشان لہجے میں بولا "ٹیچر! رات کو آپ نے مجھے غلط اٹیچی دے دیا۔ یہ تو کسی لڑکی کا ہے۔"

"واقعی؟" عظمیٰ نے حیرانی سے کہا۔

"جی ٹیچر ...... دونوں اٹیچی دیکھنے میں بالکل ایک جیسے ہیں۔ شاید اسی لیے آپ کو غلطی ہوئی۔"

عظمیٰ نے چند لمحے توقف کیا اور کمرے پر نظر دوڑانے کے بعد بولی "اوہو! میرا خیال ہے کہ میں نے تمہیں نادو والا اٹیچی دے دیا ہے۔ یہ تو ...... بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔"

"کک ...... کیوں ٹیچر؟"

"نادو تو ابھی ابھی ایک گروپ کے ساتھ چلی گئی ہے۔ وہ لوگ ایوبیہ گئے ہیں۔ وہاں سے شاید کچھ آگے بھی چلے جائیں۔ اٹیچی بھی اس کے پاس ہے۔ جلدی میں اس نے بھی نہیں دیکھا کہ یہ تمہارا اٹیچی ہے یا اس کا۔"

"ان کی واپسی کب ہے ٹیچر؟"

"واپسی تو اب کل ہوگی ...... اور وہ بھی اس صورت میں کہ کہیں آگے نہ نکل گئے تو۔"

"تو یہ واقعی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ اٹیچی میں ہی سارا سامان تھا۔"

"گڑبڑ تو دونوں طرف ہوئی ہے۔ وہ بھی ایوبیہ پہنچ کر پریشان ہوگی۔"

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی پھر ریحان بولا ''کپڑوں کے بغیر گزارا تو میں کرلوں گا لیکن...... میری نظر کی عینک بھی سامان میں تھی...... اور میری سر درد کی دوا...... اور جو گر بڑا مسئلہ ہوگیا ہے۔''

''تو پھر تھوڑی سی ہمت کرلو۔'' عظمیٰ نے سوچتے ہوئے کہا ''بس اسٹینڈ چلے جاؤ ممکن ہے کہ وہ ابھی اسٹینڈ پر ہی ہوں۔ اگر نہ ملے تو ایوبیہ والی وین پر بیٹھ جانا۔ آج رش تو ایوبیہ میں بھی ہوگا مگر تم کوشش کرو گے تو اسے ڈھونڈ لوگے۔ سر عتیق بھی ان کے ساتھ ہیں۔''

''ٹھٹھ...... ٹھیک ہے ٹیچر! میں پھر...... ٹیپو کے ساتھ نکلتا ہوں۔''

''ہاں جلدی کرو...... اگر ایوبیہ جانا پڑا تو مجھے وہاں سے فون ضرور کرنا۔''

''او کے ٹیچر۔''

''او کے۔'' عظمیٰ نے کہا اور فون بند کردیا۔

نادو کہیں نہیں گئی تھی وہ ساتھ والے بستر پر سو رہی تھی...... وہ تقریباً گیارہ بجے اٹھی۔ دوسری لڑکیاں بھی جاگ گئیں۔ اب سب کو ناشتے کی جلدی تھی۔ واش روم جانے کے لیے نادو نے اٹیچی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ ٹوتھ برش اور پیسٹ وغیرہ نکالنا چاہ رہی تھی۔ اس وقت نادو پر انکشاف ہوا کہ یہ اس کا اٹیچی کیس نہیں ہے۔ اس نے جلدی سے ڈھکنا اٹھایا۔ اٹیچی مردانہ کپڑوں اور اجنبی سامان سے بھرا ہوا تھا۔

''خالہ! یہ کیا ہے؟'' وہ حیرت سے چیخی۔

دوسری لڑکیاں بھی جمع ہوگئیں۔ عظمیٰ نے دھیان سے اٹیچی کو دیکھا ''اوہ مائی گاڈ۔'' عظمیٰ نے کہا ''یہ تو ریحان کا اٹیچی ہے۔ وہ تمہارا اٹیچی اپنا سمجھ کر لے گیا ہے۔''

لڑکیاں کھلکھلا کر ہنس دیں۔ نادو بدستور پریشان تھی ''کب آیا تھا وہ؟'' نادو نے بیزار لہجے میں پوچھا۔

''رات...... تمہارے سونے کے بعد' اٹیچی میں نے ہی اسے پکڑایا تھا۔ اس نے بھی غور نہیں کیا۔''

''اب کیا کریں؟''

''یہ تو بڑی فلمی سچویشن ہے۔'' فریال نے قہقہہ لگایا۔

''مذاق مت کرو بھئی۔ نادو پریشان ہے۔'' ایک دوسری لڑکی نے کہا۔

فریال سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی ''پریشانی کیا ہے۔ اس بے وقوف کا پتا چلاتے ہیں اور اسے کہتے ہیں کہ فٹافٹ لے کر آؤ اٹیچی...... بلکہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ ابھی خود ہی بھاگا چلا آئے۔''

''وہ نہیں آئے گا۔'' عظمیٰ نے کہا۔

''کیا مطلب ٹیچر؟''

''ابھی تھوڑی دیر پہلے اس کا فون آیا تھا۔ وہ کمرے کو لاک کر کے اپنے دوست ٹیپو کے ساتھ گھومنے جارہا تھا۔ اس کا پروگرام پنڈی پوائنٹ کا تھا مجھے نہیں یقین کہ اب وہ شام سے پہلے ہوٹل واپس لوٹیں گے۔''

''یعنی اس اُلو کو ابھی تک اٹیچی کی تبدیلی کا پتا نہیں چلا۔'' نادو نے کہا۔

''نہیں چلا ہوگا۔ اسی لیے تو اس نے ذکر نہیں کیا' عظمیٰ نے جواب دیا۔

''اب کیا کریں۔ میری تو ہری والی شرٹ بھی اٹیچی میں ہی ہے اور میری پی کیپ اور سن گلاسز ان کے بغیر تو میں نکل ہی نہیں سکتی۔''

وہ 13 اگست کا دن تھا۔ مری اپنے کلائمکس پر تھی آج اور کل کے لیے لڑکیوں نے خاص اہتمام کر رکھا تھا۔ آج کے دن کے لیے نادو نے ایک شاندار ہری ٹی شرٹ سنبھال کر رکھی ہوئی تھی۔ ساتھ میں میچنگ پاجامہ تھا۔ اب مذکورہ شرٹ تھی...... نہ میچنگ پاجامہ...... اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ نہیں تھا۔ وہ سٹپٹائی ہوئی تھی۔

تھرڈ ایئر کی لڑکی شہناز نے کہا ''آج تو رش بھی انتہا کا ہوگا۔ وہ بے وقوف گدھا آسانی سے نہیں مل سکے گا۔''

''پرنسپل سے رابطہ کر کے دیکھیں۔'' فریال نے رائے دی۔

''پرنسپل صاحب کو آج کچھ پتا نہیں کہ کون کہاں ہے۔'' شہناز نے کہا۔

عظمیٰ نے کہا ''بڑی غلطی ہوگئی ہے مجھ سے۔ مجھے اٹیچی دیتے ہوئے دیکھ لینا چاہیے تھا' دراصل کمرے میں نائٹ بلب تھا۔ برآمدے میں بھی ہلکی سی روشنی تھی۔''

''آپ کی غلطی نہیں ٹیچر! دونوں اٹیچی ہیں ہی بالکل ایک جیسے۔'' شہناز نے عظمیٰ کی طرف سے صفائی پیش کی۔

اچانک فریال نے چونکتے ہوئے کہا ''ٹیچر! ان ہوٹل والوں کے پاس ''ڈپلی کیٹ'' چابیاں بھی تو ہوتی ہیں۔''

''ہاں یہ بات تو ہے۔'' دو تین لڑکیوں نے ایک ساتھ اثبات میں سر ہلایا۔

کمرے میں فون صرف ریسیو کیا جاسکتا تھا۔ فون کرنے کے لیے ریسپشن پر جانا پڑتا تھا۔ عظمیٰ نے لڑکیوں سے کہا ''واقعی یہ ہوسکتا ہے کہ متبادل چابی ہو۔ وہ ہوٹل ڈیسنٹ میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ میں کوشش کرتی ہوں کہ وہاں فون پر

بات ہو سکے۔''

وہ فون کرنے کے لیے ریسپشنسٹ ''خان چاچا'' کی طرف چلی گئی۔ اس کی واپسی آٹھ دس منٹ بعد ہوئی۔ چہرے پر مایوسی تھی' ''نہیں بھئی۔'' عظمیٰ نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا' ''ناخوشگوار اتفاق یہ ہے کہ ہوٹل والوں کے پاس دو تین کمروں کی متبادل چابیاں نہیں ہیں اور ان میں سے ایک وہی کمرا ہے جہاں ریحان اور ٹیپو ٹھہرے ہوئے ہیں۔ میں نے گروپ انچارج مسٹر رحمان سے بھی پتا کیا ہے۔ ریحان یا ٹیپو میں سے کسی کے پاس موبائل فون بھی نہیں ہے۔''

''اچھا خالہ! دفع کریں۔'' نادو نے جھلاتے ہوئے کہا' ''میں کرلوں گی ایسے ہی گزارا۔ شام تک تو وہ لوگ ہوٹل واپس آہی جائیں گے۔''

''اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ گھومتے پھرتے کہیں ان سے ملاقات ہی ہو جائے۔'' فریال نے لقمہ دیا۔

سب لڑکیاں ناشتے کی تیاری کرنے لگیں۔ ناشتے کے بعد لباس وغیرہ تبدیل کیے گئے۔ ہلکا پھلکا میک اپ ہوا۔ پھر پروگرام بننے لگے کہ کس نے کہاں جانا ہے...... نادو ایک بار پھر بیزار نظر آنے لگی تھی۔ اسے ہر ہر قدم پر اپنا اٹیچی یاد آرہا تھا۔ اس کے استعمال کی کئی چیزیں تھیں جو اٹیچی کے ساتھ چلی گئیں تھیں۔ اب اسے اپنی ''چیپ اسٹک'' یاد آگئی تھی۔ سرد ہوا کی وجہ سے اس کے ہونٹ پھٹنے لگتے تھے۔ آج کل وہ متواتر چیپ اسٹک استعمال کررہی تھی۔ وہ بھی سامان کے ساتھ ہی چلی گئی تھی۔ پھر ایک دم اسے اپنا موبائل فون یاد آیا اور وہ تقریباً روہانسی ہوگئی۔ یہ اس کے ابو کا موبائل فون تھا۔ مری آتے ہوئے انہوں نے اسے دیا تھا۔ ابو کام کے سلسلے میں کراچی گئے ہوئے تھے وہ کراچی سے ہی روزانہ دو تین بار نادو کو فون کرتے تھے اور اس کا حال احوال پوچھتے تھے۔ اس کے علاوہ روزانہ ایک دو بار نادو کی امی کا فون بھی آجاتا تھا۔ آج تو وہ ابو سے ضرور بات کرنا چاہتی تھی کیونکہ ان کی سالگرہ بھی تھی۔

''اوہ مائی گاڈ۔ یہ کیا مصیبت پڑ گئی ہے۔'' وہ دانت پیس کر بڑبڑائی۔ پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی' ''خالہ! میرا خیال ہے کہ میں اور باجی فریال ''پنڈی پوائنٹ'' کا چکر لگا آتی ہیں' ہو سکتا ہے کہ کہیں اس گدھے کی شکل نظر آجائے۔''

''ہاں یہ ہو بھی سکتا ہے۔'' عظمیٰ نے تائید کی۔

''اور نہیں بھی ہو سکتا۔'' شہناز بولی' ''آج رش بہت زیادہ ہوگا۔'' اور جس گدھے کو آپ نے ڈھونڈنا ہے اس کا قد بھی زیادہ لمبا نہیں ہے۔''

''چلو کوشش تو کی جا سکتی ہے' ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے سے بھی چھوٹے گدھوں میں گھوم رہا ہو۔'' فریال نے کہا۔

غمزدہ نتاشا ایک طرف خاموش بیٹھی اپنی ساتھیوں کی یہ ہلکی پھلکی گفتگو سن رہی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد فریال اور نادو باقی گروپ سے علیحدہ ہو کر پنڈی پوائنٹ کی طرف جارہی تھیں۔

☆☆☆

آج مری میں واقعی ازدحام تھا۔ ہر طرف سر ہی سر نظر آتے تھے۔ کھوے سے کھوا چھل رہا تھا اور انسانوں کے اس سمندر میں نادو...... ریحان کو ڈھونڈ رہی تھی۔ کچھ دیر پہلے بادل گھر کر آئے تھے اور تیز ہوا چلنا شروع ہوگئی تھی۔ عظمیٰ کے پاس موبائل موجود تھا۔ اس کے موبائل پر سہ پہر تین بجے کے لگ بھگ نادو کی کال آئی۔ وہ آواز سے ہی تھکی ہوئی اور بیزار معلوم ہوتی تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ پنڈی پوائنٹ پر ہے اور چیئر لفٹ کے قریب ایک ''پی سی او'' سے بول رہی ہے۔ اس نے عظمیٰ سے پوچھا کہ ریحان کا کوئی سراغ ملا ہے؟

عظمیٰ نے نفی میں جواب دیا۔

نادو جھلائی ہوئی آواز میں بولی' ''پتا نہیں کدھر دفع ہوگیا ہے چغد...... خالہ! میری تو گھوم گھوم کر ٹانگیں ٹوٹ گئی ہیں۔ اس کا ایک دوست ملا تھا اس نے بھی یہی بتایا کہ وہ صبح سے اپنے کمرے سے نکلا ہوا ہے۔''

''فریال کہاں ہے؟'' عظمیٰ نے پوچھا۔

''وہ بھی ساتھ ہی ہے' بُری طرح خراب ہو رہی ہے۔'' نادو بولی۔

''سردی ہوگئی ہے تم لوگوں نے کوئی سویٹر وغیرہ پہنا ہے۔'' عظمیٰ نے ناصحانہ لہجے میں پوچھا۔

''فریال باجی نے تو پہنا ہے لیکن میرا تو ہے ہی نہیں۔ اٹیچی کے ساتھ ہی چلا گیا ہے۔'' وہ سخت بیزار تھی' صاف ظاہر تھا کہ قدم قدم پر اسے اٹیچی کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔

تھوڑی دیر بعد عظمیٰ ہوٹل پہنچی تو کمرے کے فون پر ریحان کی کال آگئی۔

وہ ایوبیہ سے بول رہا تھا' اس کے لہجے میں تھکاوٹ اور پریشانی تھی' ''ہیلو ٹیچر۔''

''ہیلو۔ کچھ پتا چلا نادو وغیرہ کا؟''

''نہیں ٹیچر! پہلے بس اسٹینڈ پر گئے۔ وہاں ڈھونڈتے رہے پھر یہاں ایوبیہ آگئے۔ یہاں بھی تقریباً ڈیڑھ گھنٹے سے گھوم رہے ہیں۔ کوئی جانی پہچانی صورت نظر نہیں آتی۔''

''اوہو۔ یہ تو بہت برا ہوا۔''

''میرے تو جوگر بھی اٹیچی میں ہیں۔ آپ کو پتا ہی ہے جوگر کے بغیر مجھ سے زیادہ چلا نہیں جاتا۔'' اس کی آواز میں کراہ کا تاثر تھا۔

''ان لوگوں کا مجھ سے بھی کوئی رابطہ نہیں ہوا۔ بہر حال تم کوشش جاری رکھو۔'' عظمیٰ نے کہا۔

شام تک نادو اور ریحان دونوں تھک کر چور ہو چکے تھے۔ ریحان اپنے اٹیچی کو ایوبیہ اور آس پاس کے علاقوں میں ڈھونڈ رہا تھا اور نادو اپنے اٹیچی کے لیے مری میں جگل خراب ہوتی رہی تھی۔ دونوں کو اپنی تلاش میں ناکامی ہوئی تھی اور اب دونوں سخت سٹپٹائے ہوئے تھے۔ خاص طور سے نادو۔ آج وہ سارا دن اٹیچی کی وجہ سے چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے پریشان رہی تھی۔ شام کو گروپ کے اکثر اسٹوڈنٹ جی پی او کی سیڑھیوں پر جمع ہوئے۔ نتاشا بھی وہاں تھی۔ نتاشا کی پریشانی ابھی تک جوں کی توں تھی۔ منصور کا اسے کوئی کھوج نہیں ملا تھا۔ وہ ابھی تک سمجھ نہیں پائی تھی کہ وہ اس سے ناراض ہے یا پھر کسی مشکل میں پھنس گیا ہے یا پھر کسی ارجنٹ کام کے سلسلے میں اسے کہیں جانا پڑ گیا ہے۔ پرنسپل رندھاوا صاحب سے بس اتنا ہی معلوم ہو سکا تھا کہ اسے کسی کام کے سلسلے میں لاہور جانا پڑا ہے لیکن وہ اسے کچھ بتا کر تو جاتا اور اگر نہیں بتا سکا تھا تو فون کال ہی کر لیتا۔ ہوٹل مہران کا نمبر اس کے پاس موجود تھا۔ منصور کے دو دوستوں سے بھی بس اتنا ہی معلوم ہوا تھا کہ لاہور سے اس کی کوئی ضروری کال آئی تھی اور وہ فوراً روانہ ہو گیا تھا۔ نتاشا اس وقت چند دوسری لڑکیوں کے ساتھ پتریاٹا گئی ہوئی تھی۔

نتاشا چاہتی تھی کہ لاہور میں منصور کے کنٹیکٹ نمبر پر فون کرے مگر ایسا کرنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ منصور نے اسے بوجوہ منع کر رکھا تھا۔ لاہور میں اپنے اور منصور کے ایک مشترکہ دوست سے رابطہ کرنے کی کوشش بھی وہ کرتی رہی تھی لیکن ناکامی ہوئی تھی۔

آج بھی نتاشا اداس سی سیڑھیوں پر بیٹھی تھی۔ اس کا سارا ٹور غارت ہو کر رہ گیا تھا۔ پرسوں انہیں واپس چلے جانا تھا۔ اپنے اردگرد کی گہما گہمی سے لاتعلق ہو کر اس نے گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکا رکھی تھی اور خالی خالی نظروں سے مال روڈ پر انسانوں کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ دیر تک روتی رہی ہے۔ اسے اس بات کا شدید اندیشہ تھا کہ زود رنج منصور اس کی کسی بات پر ناراض ہو کر واپس چلا گیا ہے۔

نادو اور فریال آج بھی سیڑھیوں پر موجود تھیں۔ مگر آج نتاشا کو چھیڑنے والا کوئی نہیں تھا وجہ یہی تھی کہ آج نادو خود پریشان تھی۔ بلکہ اس کی اور نتاشا کی حالت ایک جیسی نظر آ رہی تھی۔ وہ بھی گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکائے خاموش بیٹھی تھی اور اس کی متلاشی نظریں انسانوں کے لہریں لیتے سمندر میں ریحان کو (یعنی اپنے اٹیچی کو) تلاش کر رہی تھیں۔

باقی اسٹوڈنٹ ہنگامہ مچا رہے تھے، گپیں ہانک رہے تھے، کھا پی رہے تھے، خوشی اور ترنگ کے اس سمندر میں نادو اور نتاشا دو اداس جزیروں کی طرح تھیں۔ عظمیٰ پاپ کارن کا ایک بڑا پیکٹ تھامے آئی اور نادو کے پاس بیٹھ گئی۔

''پتا ہے آج سارے اسٹوڈنٹ کیا کہہ رہے ہیں؟'' عظمیٰ نے نادو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''کیا کہہ رہے ہیں؟''

''وہ کہہ رہے ہیں کہ نادو اور نتاشا بالکل ایک جیسی لگ رہی ہیں۔ شاید نادو کے ساتھ بھی کچھ ہو گیا ہے۔''

''آپ کیا کہہ رہی ہیں خالہ۔'' نادو منہ بنا کر بولی ''آپ جانتی ہیں کہ مجھے اٹیچی کی فکر ہے۔''

عظمیٰ گہری سانس لے کر مسکرائی اور بولی ''میں جانتی ہوں ریحان بھی بہت پریشان ہو گا۔ وہ بھی دیوانوں کی طرح تمہیں تلاش کرتا پھرتا ہو گا۔''

''خاک تلاش کرتا پھرتا ہو گا خالہ...... اس کو تو پتا ہی نہیں کہ اٹیچی بدلا گیا ہے۔ اگر وہ گدھا مجھے تلاش کر رہا ہوتا تو سیدھا ہمارے ہوٹل آتا۔''

''وہ بے چارہ تمہیں ایوبیہ میں تلاش کر رہا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ تم اٹیچی سمیت وہاں موجود ہو۔''

نادو حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں خالہ، آپ نے تو کہا تھا کہ اسے اٹیچی کے بدل جانے کا پتا ہی نہیں اور...... اور وہ اپنے دوست کے ساتھ سیر کے لیے پنڈی پوائنٹ کی طرف نکل گیا ہے۔''

''یہ دونوں باتیں غلط تھیں۔'' عظمیٰ پھر مسکرائی ''میں نے جان بوجھ کر تم سے غلط بیانی کی۔ اس کے لیے میں تم سے معذرت چاہتی ہوں اور جب ریحان ملے گا تو اس سے بھی ایکسکیوز کروں گی۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ آپ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہیں۔''

''سائیکالوجسٹ جو ٹھہری اور تم نے خود ہی بتایا تھا کہ سائیکالوجسٹ مشکل باتیں کرتے ہیں۔''

نادو روہانسی ہو گئی ''پلیز خالہ میں الجھی ہوئی ہوں، مجھے مزید نہ الجھائیں۔ آپ نے...... آپ نے مجھ سے کیوں کہا

کہ ریحان کو اٹیچی کی تبدیلی کا پتا نہیں اور وہ...... پنڈی پوائنٹ کی طرف گیا ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ مجھے تمہیں شروع سے بتانا چاہیے...... چلو آؤ سامنے کیفے میں بیٹھتے ہیں۔"

عظمیٰ حیران نادو کو لے کر سامنے اسنیک بار میں آ بیٹھی کافی کا آرڈر دے کر اس نے کہنا شروع کیا "نادو! کل شام تم نے مجھ سے ایک اہم سوال کیا تھا۔ یہ سوال مرد و عورت کے تعلق کے بارے میں تھا۔ میں تمہیں اس کا جواب یوں دینا چاہتی تھی کہ یہ جواب تمہارے ذہن میں بیٹھ جائے۔ نفسیات کہتی ہے کہ جب کوئی بات خاص طور سے سمجھانی ہو تو اس کے لیے خاص طریقہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ میں بھی کسی خاص طریقے کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ میری نظر ہوٹل کے کمرے میں تمہارے اور ریحان کے "اٹیچی کیسز" پر پڑ گئی۔ دونوں اٹیچی بالکل ایک جیسے تھے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ یہ اٹیچی کیس بدل دوں۔"

"اس سے کیا ہوا؟" نادو آنکھیں پٹ پٹا کر بولی۔

عظمیٰ نے طویل سانس لی "اس سے یہ ہوا میری شہزادی کہ تم دونوں کا سامان بدل گیا۔ جن چیزوں کی ضرورت ریحان کو تھی وہ تمہارے پاس آ گئیں...... اور جن کی ضرورت تمہیں تھی وہ ریحان کے پاس چلی گئیں۔ تم دونوں ان چیزوں کے لیے بے چین ہو گئے۔ بے چین ہو گئے یا نہیں؟"

"ہاں وہ تو ہو گئے۔" نادو نے کہا۔

"ان گمشدہ اشیا کی وجہ سے تم دونوں کا تعلق بن گیا۔ تم دونوں ہر شے سے بیگانہ ہو کر ایک دوسرے کو ڈھونڈتے پھرے۔ دن بھر تمہاری نگاہیں ایک دوسرے کی تلاش میں بھٹکتی رہیں...... اب تمہارے لیے ریحان کا ملنا بے حد اہم ہے اور ریحان کے لیے بھی تمہارا ملنا بے حد اہم ہوگا۔ تم دونوں ایک دوسرے کی ضرورت ہو۔ کیونکہ تم دونوں ایک دوسرے کی اشد ضرورتیں پوری کر سکتے ہو۔ جب ریحان آئے تو تم اس سے پوچھنا' وہ کس طرح دیوانہ وار تمہیں تلاش کرتا رہا ہے۔"

نادو کی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں لہرانے لگی تھیں

عظمیٰ نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "نادو! قدرت نے مرد اور عورت کو بھی اسی طرح مشترکہ ضرورتوں کے بندھن میں باندھ دیا ہے۔ عورت کمزور ہوتی ہے اسے ایک طاقتور سہارے کی ضرورت ہوتی ہے یہ طاقتور سہارا مرد کے پاس ہے۔ عورت کی ضرورت ہوتی ہے کہ کوئی اس کی خوب صورتی کی تعریف کرنے والا ہو' اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے قدرت نے مرد کو "سراہنے والی" آنکھیں دی ہیں۔ مرد کی خواہش ہوتی ہے کہ کوئی اس کے گھر اور بچوں کی دیکھ بھال کرے۔ قدرت نے عورت کے دل میں ممتا کی تڑپ اور سلیقہ شعاری پیدا کی ہے۔ تم میری باتیں سمجھ رہی ہو نا؟"

نادو نے زبان سے کچھ نہیں کہا' مگر اثبات میں سر ہلایا۔

عظمیٰ نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "اگر مختصر بات کی جائے تو یوں ہے کہ عورت کے پاس دلکشی ہے' نرمی ہے' نزاکت ہے اس کے علاوہ ممتا' سلیقہ' محبوبیت' حلیمی' ایثار' تسلیم' رضا بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو عورت کے پاس ہیں اور ان کی ضرورت مرد کو ہے۔ اسی طرح مرد کے پاس طاقت' مضبوطی' جفاکشی' ہنرمندی' محبت اور برداشت جیسی صلاحیتیں ہیں جن کی ضرورت عورت کو ہے۔ اسی طرح جسمانی بناوٹ اور تقاضے ہیں جن کی وجہ سے عورت کو مرد میں کشش محسوس ہوتی ہے اور مرد کو عورت میں۔ تم یوں سمجھو کہ قدرت نے مرد کی ضروریات کا "اٹیچی کیس" عورت کو دے دیا ہے اور عورت کی ضروریات کا اٹیچی کیس مرد کو تھما دیا ہے۔ اور دونوں کو دنیا کے گنجان ہل اسٹیشن پر چھوڑ دیا ہے کہ ایک دوسرے کو تلاش کریں اور اپنی اپنی زندگی کو آسان بنائیں۔ شاید اس سے ملتی جلتی صورتحال ہمارے "آدم اور حوا" کو بھی پیش آئی ہوگی۔"

نادو خاموشی سے سن رہی تھی۔ اس کی نوخیز آنکھوں میں سوچ کی گہری پرچھائیاں لہرانے لگی تھیں۔

عظمیٰ نے کہا "تم نتاشا اور منصور کو دیکھ کر حیران ہوتی ہو۔ تمہاری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ ایک دوسرے کے لیے کیوں بے قرار ہیں اور ان جیسے دوسرے لوگ بھی ایک دوسرے کے لیے کیوں بے قرار ہوتے ہیں۔ اس میں ان کا کوئی قصور نہیں نادو! یہ بے قراری تو قدرت نے ان کے اندر رکھی ہے۔ ان کے اٹیچی ان کے پاس نہیں دوسرے فریق کے پاس ہیں۔ ہر نتاشا کے لیے منصور کو ڈھونڈنا ضروری ہے اور ہر منصور' نتاشا کو تلاش کرنے پر مجبور ہے۔ تم سمجھ رہی ہو نا میری بات؟"

نادو نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلایا۔ اس کے چہرے کے تنے ہوئے عضلات اب بالکل نرم پڑ گئے تھے۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ عظمیٰ کے سمجھانے کا منفرد انداز بہت حد تک کارگر رہا تھا۔ عظمیٰ بولی "نادو! ذرا غور کرو تمہیں اندازہ ہوگا کہ میرا اور تمہارا وجود بھی اسی لیے ہے کہ "محبت" ہے۔ مرد اور عورت کے درمیان ایک اٹوٹ تعلق ہے۔ اسی تعلق کے سبب انسان کی نسل قائم ہے اس دنیا کا کارخانہ چل رہا ہے......" خالہ اور بھانجی میں کافی دیر تک

باتیں ہوتی رہیں...... اسنیک بار کے دیوار گیر شیشوں سے باہر انسانوں کا سمندر ہلکورے لیتا رہا۔ سڑک کے پار کچھ فاصلے پر اداس نتاشا ''جی پی او'' کی پتھریلی سیڑھیوں پر بیٹھی رہی اور کسی کا انتظار کرتی رہی۔

کافی ختم ہو چکی تھی...... عظمٰی کی بات بھی ختم ہو چکی تھی۔ وہ اب اٹھنا چاہ رہی تھی مگر نادو نے کافی کے دو مگ اور منگوا لیے۔ شاید وہ عظمٰی سے کچھ کہنا چاہتی تھی۔ عظمٰی تازہ گرم گرم کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ نادو نے کہا ''خالہ! آپ کی باتیں میرے دل کو لگی ہیں۔ مجھے میرے کئی سوالوں کا جواب ملا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ذہن میں ایک طرح کی پشیمانی پیدا ہو گئی ہے۔''

''پشیمانی! کیا مطلب؟''

''میں نتاشا باجی کے لیے پشیمانی محسوس کر رہی ہوں۔ میں نے...... میں نے ان کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا۔'' نادو کے لہجے میں عجیب سی ندامت آمیز نرمی تھی۔

''دیکھو تم نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ ہر بات کھول کر بیان کرو گی۔''

نادو نے چند لمحے توقف کیا پھر اعتراف کرنے والے انداز میں بولی ''میں سمجھتی ہوں کہ نتاشا باجی میری وجہ سے پریشان ہیں۔ دراصل یہ ساری میری ہی شرارت ہے۔''

''تمہاری شرارت؟''

''خالہ! دراصل منصور بھائی لاہور جانے سے پہلے ہمارے پاس ہوٹل آئے تھے۔ اس وقت نتاشا باجی دوسری باجیوں کے ساتھ پتریاٹا گئی ہوئی تھیں۔ منصور بھائی مجھے ہوٹل کے سامنے سڑک پر ملے تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ ان کے ایک ماموں جو بہت عرصے سے ناراض تھے اچانک انگلینڈ سے آئے ہیں۔ ان کی خاطر انہیں فوری طور پر لاہور واپس جانا پڑ رہا ہے۔ منصور بھائی نے مجھ سے کہا کہ میں اس بارے میں نتاشا کو بتا دوں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ لاہور جا کر وہ میرے موبائل فون پر نتاشا سے بات کریں گے۔

''میں نے نتاشا باجی کو کچھ نہیں بتایا...... بلکہ یہ کیا کہ منصور بھائی کی کال آئی تو ریسیو ہی نہیں کی...... یقینی بات ہے کہ منصور بھائی بہت پریشان ہوئے ہوں گے...... انہوں نے پچھلے دو تین روز میں بار بار کال کی لیکن میں فون فوراً بند کر دیتی تھی۔ منصور بھائی کے لیے دوسرا طریقہ یہ تھا کہ وہ ہوٹل کے فون پر نتاشا باجی سے بات کرتے۔ اس کا حل بھی فریال باجی نے نکال لیا۔ انہوں نے استقبالیہ پر بیٹھے ہوئے خان چاچا سے بات کی۔ انہیں بتایا کہ ایک لڑکا ہاتھ دھو کر ہماری کلاس فیلو نتاشا کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ وہ اسے اپنے چکر میں لانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کا نام منصور ہے۔ اگر لاہور سے اس کا فون آئے اور وہ نتاشا کو بلانے کے لیے کہے تو اسے ڈانٹ بلائیں۔ خان چاچا نے ایسے ہی کیا لیکن اس کے بعد بھی کل اور پرسوں منصور بھائی کا فون آیا تھا۔ خان چاچا نے ان کی بات نہیں کرائی۔ مجھے یقین ہے کہ منصور بھائی بھی بہت پریشان ہوں گے۔''

عظمٰی ہونٹ سکوڑے ساری بات سن رہی تھی۔ اب سب کچھ اس کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ اگر نتاشا نے پچھلے دو تین روز رو رو کر گزارے تھے تو اس کی وجہ نادو اور فریال کی شرارت ہی تھی۔

☆☆☆

رات نو بجے کے قریب ریحان ایوبیہ وغیرہ میں خجل خراب ہو کر واپس آ گیا۔ عظمٰی نے اس کو ساری بات بتائی اور اس ''تجربے'' کی وجہ سے ریحان کو خوامخواہ جو پریشانی جھیلنا پڑی اس کے لیے معذرت بھی کی۔ ریحان نے یہ سب کچھ خوشدلی سے قبول کیا۔ اس کے بعد نادو اور فریال غمزدہ نتاشا کے پاس پہنچیں۔ انہوں نے اپنی غلطی کا کھلے دل سے اعتراف کیا اور اپنی تکلیف دہ شرارت پر نتاشا سے معافی مانگی۔

نتاشا کو بھی ساری صورتحال جان کر قدرے ''ریلیف'' محسوس ہوا...... ریحان کے آنے کے بعد نادو کو اس کا اٹیچی واپس مل گیا تھا اور اپنا موبائل فون بھی۔ اس نے موبائل فون فوراً آن کر دیا اور نتاشا سے کہا کہ اگر منصور بھائی کی کال آئی تو وہ فوراً اسے اطلاع دے گی۔ عظمٰی نے خان چاچا کو بھی لڑکیوں کی شرارت سے آگاہ کر دیا۔ اور خان چاچا کو ہدایت کی کہ منصور صاحب کی کال آئے تو فوراً کمرے میں ٹرانسفر کر دیں۔

رات کے بارہ بجے تھے، سب لڑکیاں سو رہی تھیں، عظمٰی غنودگی کی کیفیت میں تھی۔ نادو کے موبائل پر منصور کی کال آئی۔ کال ریسیو کرتے ہی نادو بستر سے نکلی اور دروازہ کھول کر ننگے پاؤں نتاشا کے کمرے کی طرف بھاگ گئی۔ اس نے سخت سردی میں سویٹر وغیرہ پہننے کا تکلف بھی نہیں کیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد عظمٰی ساتھ والے کمرے کے دروازے پر نادو کی بے تاب آواز سن رہی تھی ''نتاشا باجی...... آپ کا فون...... نتاشا باجی آپ کا فون۔''

عظمٰی زیرِ لب مسکرا دی۔ نادو کی آواز کی بے تابی بتا رہی تھی کہ نفسیاتی تجربہ کامیاب رہا ہے۔

کہانی کبھی نئی یا پرانی نہیں ہوتی' کہانی بس کہانی ہوتی ہے اور پھر کہانی بھی تو ایک ہی ہے وہی صدیوں پرانی..... جو مختلف وقتوں میں' مختلف لہجوں اور پیرایوں میں دہرائی جاتی رہی ہے۔ یہ بھی ایک ایسی ہی کہانی ہے۔ اس میں محبت کا عنصر نمایاں ہے۔ اس کہانی کا تعلق اس دور سے ہے جب "تاریخ" نئی نئی وجود میں آئی تھی۔ جب انسان کو دریاؤں کے کنارے آباد ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ جب دھرتی کے سینے میں تہذیب کی جڑیں بہت گہری نہیں اتری تھیں۔ جب ایک بادشاہ ہوتا تھا اور ایک رعایا ہوتی تھی۔ جب گھوڑے کی پشت پر بیٹھ کر ملک فتح کیے جاتے تھے اور اپنے ہی جیسے انسانوں کو بیچا اور خریدا جاتا تھا۔

ایک ایسے ہی ملک میں ایک غریب نوجوان سکندر رہتا

مجھ کو اپنا بنا کے چھوڑ دیا کیا اسیری ہے کیا رہائی ہے

ایک عاشقِ زار کا فسانہ' بے چارگی۔ وہ اپنی محبت ہارنے کے خطرے سے دوچار تھا۔ اچانک اُس کی مُلاقات ایک ایسے اسیرِ محبت سے ہوگئی جس کے لیے زندگی بھر کی آزادی، غلامی کے ایک لمحے کے مقابلے میں ہیچ تھی۔ اُس نے اپنے ہم پیشہ کی خوب غم خواری کی۔

آزاد قیدی

طاہر جاوید مُغل

تھا۔ سکندرِ اعظم کے ہاتھ تو موت کے وقت خالی ہوئے تھے اس نوجوان کے ہاتھ شروع سے ہی خالی تھے۔ وہ منہ میں کسی چمچ کے بجائے بھوک لے کر پیدا ہوا تھا۔ لڑکپن سے ہی اس نے محنت کرنا سیکھ لیا تھا۔ وہ قالینوں کے ایک تاجر کے ہاں ملازم تھا۔ فارغ وقت میں وہ مصوری کرتا تھا اور سنگ تراشی سیکھتا تھا۔ اس کے یہ مشاغل بھی اس کے لیے تھوڑی بہت آمدنی کا وسیلہ بن جاتے تھے۔ بہرحال یہ ساری آمدن مل کر بھی اتنی نہیں تھی کہ اس کی بیوہ ماں اور چار بہن بھائیوں کی کفالت کرسکتی۔ ان کی گزربسر مشکل سے ہو رہی تھی۔ ایسے غریب نوجوان کو کیا حق پہنچتا تھا کسی دوشیزہ کو دیکھنے کا۔ اس کی محبت دل میں بسانے کا اور دن رات اس کی طلب میں تڑپنے کا لیکن یہ سب کچھ ہوا تھا کیونکہ ہونی کو کوئی نہیں روک سکتا اور سردی گرمی وخزاں کی طرح بہار بھی اٹل ہوتی ہے۔

چمکیلی صبحوں کی ڈولی میں بیٹھ کر گلابوں کے موسم کو آنا ہوتا ہے اور وہ آکر رہتا ہے۔ سکندر کو جس دوشیزہ سے پیار ہوا تھا اس کا نام ماہ رو تھا۔ ماہ رو یعنی چاند چہرے والی۔ وہ چاند کی طرح خوب صورت تو تھی لیکن چاند ہی کی طرح سکندر سے دور بھی تھی۔ کبھی کبھی تو سکندر کو لگتا تھا کہ وہ چکور کی طرح چاند کی طرف اڑ اڑ کر ہانپ جائے گا اور کسی رات پٹ سے زمین پر گر کر ختم ہوجائے گا۔ ماہ رو اس کی دور کی رشتے دار تھی۔ اس کا باپ ایک رئیس کے اصطبل کا پہریدار تھا۔ ماہ رو ... اور سکندر کی نسبت بھی طے ہوچکی تھی لیکن اب کچھ عرصے سے حالات کچھ ایسے ہوئے تھے کہ یہ نسبت خطرے میں پڑتی محسوس ہوتی تھی اور کسی وقت تو سکندر کو لگتا تھا کہ وہ ہمیشہ کے لیے اپنی ماہ رو کو کھودے گا۔ وہ سارے خواب مٹی میں مل جائیں گے جو اس کی آنکھوں نے گئے موسموں میں دیکھے ہیں۔ دراصل ماہ رو کا باپ اس رئیس کا قرض دار تھا جہاں وہ کام کرتا تھا۔ اب ادھیڑ عمر رئیس اس قرض کے بدلے میں ماہ رو کے باپ سے ماہ رو کا ہاتھ مانگ رہا تھا..... ہاں .... وہی صدیوں پرانی روداد .... ماہ رو کے باپ نے اس صورتِ حال سے بچنے کے لیے سرتوڑ کوشش کی تھی لیکن اب بتدریج وہ رئیس کے سامنے بے بس ہوتا جارہا تھا۔ چند روز پیشتر ایک مذہبی تہوار کے موقع پر جب سکندر کی ملاقات ماہ رو سے ہوئی تھی تو ماہ رو نے صاف کہہ دیا تھا کہ اگر وہ کچھ کرسکتا ہے تو کرلے۔ اس نے کہا "سکندر! میرے بابا کو رئیس نے آخری موقع دیا ہے۔ اگر دو ماہ کے اندر ہم نے رئیس کو پانچ ہزار اشرفیاں نہیں دیں تو وہ مجھے زبردستی اپنے گھر لے جائے گا۔ قاضی نے بھی فیصلہ دے دیا ہے۔ قرض ادا نہ کرنے کی صورت میں میرے والد کو کڑی سزا بھگتنا پڑے گی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی کہ میرا کمزور باپ قید خانے کی ذلت برداشت کرے اور میں اپنی محبت بچانے کے لیے اس کی بوڑھی کھال کو کوڑوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دوں۔"

..... دو ماہ کی مدت تھی اور اس میں سے چار پانچ روز گزر چکے تھے۔ سکندر اس مدت میں کیا کرسکتا تھا۔ شاید وہ خود کو بیچ بھی دیتا تو یہ رقم حاصل نہ کرسکتا۔ ایک روز وہ مایوسی کی انتہا کو چھو رہا تھا۔ وہ اپنے گھر سے نکلا اور یونہی گلیوں گلیوں چلتا شہر سے دور نکل آیا۔ اسے کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کدھر جارہا ہے۔ بس وہ چلتے رہنا چاہتا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ٹھہر گیا تو دم بدم بڑھتی گھٹن کے سبب اس کا دل بھی ٹھہر جائے گا۔ وہ ویرانے میں چلا گیا۔ بہت آگے ایک خشک ندی کے کنارے لمبی جنگلی گھاس تھی اور گھنے درخت تھے۔ وہ ایک سایہ دار جگہ پر بیٹھ گیا اور اپنے حالات پر غور کرنے لگا۔

اسے وہاں بیٹھے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ ایک مدھم آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس نے کچھ آگے بڑھ کر سرکنڈوں میں دیکھا اور دنگ رہ گیا۔ ایک آہنی پنجرے کے اندر ایک حبشی غلام بیٹھا تھا۔ اس کے کھانسنے کی آواز ہی سکندر کے کانوں تک پہنچی تھی۔ غلام کے جسم پر صرف ایک لنگوٹی تھی۔ اس کی غلامی کی نشانی ایک طوق نما چرمی پٹی تھی جو اس کی گردن میں نظر آرہی تھی۔ اس پٹی پر غلام کے نام کی مخصوص مہر تھی۔ غلام جوان تھا۔ اس کا رنگ بہت سیاہ نہیں تھا۔ آنکھیں روشن تھیں اور شکل وصورت میں جاذبیت تھی۔ وہ کسرتی جسم کا مالک رہا ہوگا لیکن اب اس کے رگ پٹھے کمزور نظر آرہے تھے۔ چہرہ بھی اترا ہوا تھا۔ سکندر کا خیال تھا کہ نوجوان حبشی پنجرے میں بند ہے لیکن جب اس نے غور کیا تو یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ پنجرے کا دروازہ کھلا ہے۔

نوجوان حبشی غلام اسے خالی خالی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے انداز میں عجیب سی بے تعلقی پائی جاتی تھی۔ سکندر نے اس سے پوچھا کہ وہ کون ہے اور یہاں کیا کررہا ہے۔ غلام نے تھوڑے تذبذب کے ساتھ جواب دیا کہ اس کا نام قابوس ہے اور وہ شاہی غلام ہے۔

سکندر نے پوچھا "شاہی غلام ہو تو یہاں کیا کررہے ہو؟"

نوجوان حبشی نے ایک گہری سانس لی اور بولا "یہ ایک لمبی کہانی ہے دوست۔"

سکندر نے کہا "تمہاری یہاں موجودگی حیران کن ہے۔ میں تمہارے بارے میں جاننا چاہوں گا۔"

دونوں نوجوان کچھ دیر آپس میں باتیں کرتے رہے۔ ان کے خیالات میں ہم آہنگی تھی۔ بہت جلد انہیں محسوس

ہونے لگا کہ وہ ایک دوسرے کو مدت سے جانتے ہیں۔ سکندر کو اندازہ ہوا کہ قابوس ایک بالکل سیدھا سادہ نوجوان ہے۔ وہ تھوڑا سا اٹک کر بولتا تھا۔ اس نے بہت کم بات کی تاہم جو لفظ بھی اس کی زبان سے ادا ہوا وہ غم واندوہ کی "دل گداز تصویر" محسوس ہوا۔ سکندر خود بھی ایک دل نگار شخص تھا لہٰذا اسے قابوس کی صحبت پسند آئی۔ قابوس نے سکندر سے کہا "پہلے تم اپنے بارے میں بتاؤ پھر میں بتاؤں گا۔"

سکندر نے پہلے اپنا تعارف کرایا۔ اپنا مکمل پتا ٹھکانا بتایا پھر اپنی روداد غم مختصر الفاظ میں قابوس کے گوش گزار کردی۔ وہ بڑی توجہ سے سنتا رہا۔ سکندر اور ماہ رو کا غم محسوس کرکے قابوس کی آنکھوں میں یاس کی پرچھائیاں لہرانے لگیں۔ یہ جان کر اسے یقیناً بہت دکھ ہوا تھا کہ سکندر اور ماہ رو کے درمیان چاندی کی دیوار حائل ہو رہی ہے اور وہ عنقریب ایک دوسرے سے بچھڑنے والے ہیں۔ ایک شکستہ دل ہی دوسرے شکستہ دل کا درد سمجھ سکتا ہے۔

سکندر کے بعد حبشی قابوس نے اپنی روداد سنائی۔ اس نے سیدھے سادے الفاظ میں جو کچھ بتایا وہ کچھ یوں تھا۔

قابوس شاہی غلام کی حیثیت سے محل میں رہتا تھا۔ بادشاہ ارژنگ کی ایک بہت پیاری بیٹی شہربانو تھی۔ بے حد ذہین، خدا ترس اور محبت بھرا دل رکھنے والی۔ شہزادی شہربانو کی نگاہ میں قابوس کو اہم مقام حاصل تھا۔ وہ اس کی وفاداری اور جان نثاری پر بھروسا کرتی تھی۔ لڑکپن سے ہی وہ قابوس کو پیار سے طوطو کہا کرتی تھی۔ قابوس کو دیکھتے ہی شہزادی کے چہرے پر رونق آجاتی تھی۔ قابوس کو بات کرنے کا ڈھنگ تو نہیں آتا تھا لیکن پھر بھی وہ دلچسپ آدمی تھا۔ وہ مضحکہ خیز شکلیں بنا کر اور آوازوں کی نقل کرکے ہنسانے کا فن جانتا تھا۔ وہ پرندوں اور جانوروں کی آوازاتنی خوب صورتی سے نکالتا تھا کہ سننے والا ششدر رہ جاتا تھا۔ خاص طور سے طوطے کے لہجے میں وہ بڑی دلچسپ گفتگو کرتا تھا۔ شاید اسی لیے شہزادی نے اس کا نام طوطو رکھ دیا تھا۔ وہ جب ہرا لباس پہن کر گلے میں سرخ پٹکا باندھ کر شہزادی کے سامنے آتا تو وہ خوب محظوظ ہوتی۔

قابوس کو شہزادی کے دل کا حال معلوم نہیں تھا لیکن اپنے دل کا حال وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ گزرے ماہ وسال نے اس کے دل پر خوبرو شہزادی کے نقش بہت گہرے کردیے تھے۔ وہ دل ہی دل میں اسے چاہنے لگا تھا۔ یہ خاموش محبت تھی۔ عمیق سمندروں سے زیادہ گہری اور تاریک ترین غاروں سے زیادہ پراسرار۔ اسے محبت اور عشق وغیرہ کے معانی معلوم نہیں تھے۔ وہ بس اتنا جانتا تھا کہ وہ ہردم شہزادی کے قریب رہنا چاہتا ہے۔ اس فضا میں سانس لینا چاہتا ہے جس میں شہزادی کے سانسوں کی مہک ہو اور ان راستوں کو آنکھوں سے چومنا چاہتا ہے جن پر شہزادی کے قدم پڑتے ہیں۔

اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں تو قابوس عام غلاموں کی طرح پابہ زنجیر رہتا تھا اور سخت مشقت کے کام کرتا تھا لیکن پھر پرکھنے والی آنکھوں نے اس کی صلاحیت اور وفاداری کو پرکھ لیا۔ سب سے پہلے شہزادی شہربانو نے ہی والد کو بتایا کہ طوطو نامی غلام آوازوں کی نقلیں اتار لیتا ہے اور الٹی سیدھی حرکات کرکے لوگوں کو بے ساختہ قہقہے لگانے پر مجبور کردیتا ہے۔ بعدازاں بادشاہ اور ملکہ نے بنفس نفیس قابوس عرف طوطو کی ان صلاحیتوں کا مشاہدہ کیا تھا اور اس کے لیے کچھ رعایتیں فراہم کردی گئی تھیں۔ اب اسے کم مشقت والا کام سونپا گیا تھا۔ اس کے علاوہ کام کے اوقات میں اسے زنجیرو طوق وغیرہ سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا تھا۔ کبھی کبھی قابوس کو محل کے اندر بھی بلالیا جاتا تھا اور اس کی "فن کاری" دیکھی جاتی تھی۔ قابوس حاضرین کو خوب ہنساتا تھا۔ خصوصاً جب شہزادی شہربانو سامنے ہوتی تھی تو اس کی صلاحیتوں کو چار چاند لگ جاتے تھے۔

شہزادی قابوس کی ہم عمر تھی یا شاید تھوڑی سی بڑی ہی تھی۔ ویسے بھی وہ آقا تھی اور قابوس غلام۔ قابوس کو مخاطب کرتے ہوئے شہزادی کے لہجے میں کسی وقت شفقت سی جھلکنے لگتی تھی۔ وہ بڑے پیار سے کہتی "طوطو! ہمارا گھوڑا لاؤ۔"

قابوس گھوڑا لاتا پھر گھٹنوں اور کہنیوں کے بل جھک جاتا۔ وہ اس کی پشت پر پاؤں رکھ کر گھوڑے پر سوار ہوجاتی۔ قابوس کے کسرتی جسم کے لیے شہزادی کا وزن پھول سے بھی کم ہوتا۔ وہ گھوڑے کی لگام تھام لیتا اور شہزادی کو محل کے پچھواڑے باغ میں لے جاتا۔ شہزادی اس کی پشت پر پاؤں رکھ کر اترتی۔ مصنوعی جھیل کے کنارے وہ دونوں پھولوں، تتلیوں اور جھرنوں کے درمیان گھومنے لگتے۔ وہ ادب سے ہاتھ باندھے اور سر جھکائے اس کے پیچھے چلتا۔ وہ اس کی باتوں پر ہنستی تو ہر طرف کلیاں کھل اٹھتیں۔ کبھی قابوس کی کسی بات پر ہنستے ہوئے وہ عجیب سی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتی۔ اس نگاہ کی عمر صرف ایک "لمحہ" ہوتی تھی مگر اس کی تاثیر ماہ وسال پر محیط ہوتی تھی۔ اس ایک لمحے میں قابوس کو یوں محسوس ہوتا تھا کہ شہزادی.... شہزادی نہیں ہے اور وہ غلام نہیں ہے۔ وہ دونوں صرف انسان ہیں اور ان دونوں کے دل بے پناہ قوت سے ایک دوسرے کی طرف کھنچ رہے

ہیں۔ کوئی انجانی کشش ہے جو انہیں ایک نقطے پر اکٹھا کرنا چاہ رہی ہے لیکن اگلے ہی لمحے یہ "لمحہ" گزر جاتا۔ شہزادی پھر سے شہزادی بن جاتی اور اس سے ہزاروں لاکھوں میل کے فاصلے پر چلی جاتی۔ کبھی کبھی رونما ہونے والے، اس "لمحے" کے بارے میں قابوس نے سیکڑوں مرتبہ سوچا تھا۔ کیا یہ لمحہ ہمیشہ ایک لمحہ ہی رہے گا۔ اس کے ذہن میں ہر بار یہ سوال ابھرا تھا۔

پھر یوں ہوا کہ محل میں خاص قسم کی چہل پہل نظر آنے لگی۔ مہمانوں کی آمدورفت شروع ہوگئی۔ زنان خانوں میں نت نئی پوشاکیں سرسرانے لگیں اور کشیدہ کار عورتیں ریشم، اطلس و کمخواب پر چاند ستارے اتارنے لگیں۔ محل کے ایوانوں میں نئے نئے چہرے نظر آنے لگے اور گیتوں کے پس منظر میں سارا دن خواتین کے قہقہے گونجنے لگے۔ ایک روز حبشی قابوس پر یہ انکشاف ہوا کہ شہزادی شہربانو کی شادی ہو رہی ہے اور وہ عنقریب پیا کے دیس سدھار رہی ہے۔ یہ خبر قابوس کے لیے غیر متوقع نہیں تھی پھر بھی اس پر بجلی بن کر گری تھی۔ اس رات وہ صبح تک کروٹیں بدلتا رہا اور سوچتا رہا کہ شہزادی کی شادی کی اطلاع نے اسے غم زدہ کیوں کیا ہے؟ اسے کیا حق پہنچتا ہے ایسی اطلاع پر غم زدہ ہونے کا؟ وہ غلام زادہ ہے۔ اس کا منصب یہ ہے کہ اپنے آقا کی خوشی پر خوش ہو اور اس کے غم کو اپنا غم سمجھے۔ اس رات.... اور اس رات کے بعد کئی راتوں تک وہ اپنے دل کو سمجھاتا رہا تھا۔ وہ صرف ایک غلام تھا اور اسے غلام بن کر ہی رہنا تھا۔ وہ ایک لمحہ اس نے اپنے ذہن سے کھرچ کر پھینک دیا جو کبھی کبھی شہزادی کی آنکھوں میں چمکا کرتا تھا اور ایک روشن شعاع کی طرح قابوس کے دل میں اتر جایا کرتا تھا۔

پھر ایک روز قریبی ملک کا سجیلا بانکا شہزادہ برات لے کر آیا اور شہزادی شہربانو اس کی بیوی بن گئی۔ غلام زادے نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے سینے پر جھیلا۔ اس وقت کے رواج کے مطابق دلہا شہزادہ سات روز تک سسرال میں ہی مقیم رہا۔ اس کی خوب خاطر مدارات ہوئیں۔ حسین و جمیل شہزادی اور اس کے اہلِ خانہ شہزادے کی راہوں میں آنکھیں بچھا رہے تھے۔ شہزادی نے قابوس کو بھی اپنے شوہرِ نامدار سے ملایا۔ وہ تعارف کرانے والے انداز میں بولی "یہ طوطو ہے۔ ہمارا ذاتی غلام۔ بہت ہنس مکھ، بہت دلچسپ اور وفاداری میں تو یہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس کا خاندان کئی پشتوں سے محل کا خدمت گزار ہے۔"

پھر شہزادی نے حسبِ عادت قابوس کو حکم دیا کہ وہ دلہا شہزادے کو اپنی دلچسپ حرکات اور گفتار سے محظوظ کرے۔ اس روز قابوس نے کمال کر دیا تھا۔ ہنس ہنس کر سب کے پیٹ میں بل پڑ گئے تھے۔ قابوس کا خیال تھا کہ شہزادہ بھی اس کی تعریف کرے گا لیکن یہ مراد بر نہیں آئی۔ تعریف کے موقع پر شہزادے نے کافی کنجوسی کا مظاہرہ کیا.... اگلے ایک دو روز میں قابوس کا یہ اندازہ درست ثابت ہوا کہ شہزادے نے اسے اچھی نظر سے نہیں دیکھا۔ اپنے اردگرد قابوس کی موجودگی محسوس کر کے شہزادے کی پیشانی پر بیزاری کی شکن نمودار ہو جاتی تھی۔ پتا نہیں ایسا کیوں تھا۔ شاید قابوس کو دیکھ کر شہزادی شہربانو کے چہرے پر جو مسکراہٹ کھل اٹھتی تھی وہ شہزادے کو پسند نہیں آئی تھی.... بہرطور شہزادے کی ناگواری محسوس کر کے اگلے چند روز تک قابوس، شہزادے کی نگاہ سے دور دور رہا....

شہزادی جب ساتویں روز اپنی سسرال روانہ ہوئی تو اس کے ساتھ بہت سے سازو سامان کے علاوہ قابوس بھی تھا۔ وہ ذاتی غلام کی حیثیت سے شہزادی کے جہیز میں جا رہا تھا۔ مقامی دستور کے مطابق غلاموں کو دورانِ سفر میں زنجیریں پہنا دی جاتی تھیں یا پنجرے وغیرہ میں بند کر دیا جاتا تھا۔ قابوس اور تین دیگر غلاموں کو بھی خوب صورت پنجرے میں بند کیا گیا تھا اور گھوڑا گاڑی میں لاد دیا گیا تھا۔

یہاں تک اپنی روداد سنانے کے بعد حبشی قابوس خاموش ہو گیا۔ اس کی سفید آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ دل جیسے غم سے لبریز ہو گیا۔ اس نے اپنا مدقوق چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا اور آنسو پینے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ کوشش کافی طویل ثابت ہوئی۔ رہ رہ کر ایک سرد آہ حبشی غلام کے ہونٹوں سے نکلتی تھی اور فضا کو سوگوار کر جاتی تھی۔

آخر اس نے سر اٹھایا اور گلوگیر آواز میں بولا "اب تم یہاں سے جاؤ۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔"

"لیکن تمہاری روداد نامکمل ہے۔ تم نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ تم یہاں کیسے پہنچے اور شہزادی اب کہاں ہے؟"

"شہزادی وہیں ہے جہاں اسے ہونا چاہیے تھا اور میں وہیں ہوں جہاں مجھے ہونا چاہیے تھا۔" وہ حسبِ عادت اٹک اٹک کر بولا۔

"میں کچھ سمجھا نہیں۔" سکندر نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں تمہیں کچھ سمجھا بھی نہیں سکتا۔ میں غلام زادہ ہوں اور میرے لیے شکوہ کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔" قابوس کا گلا رندھ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں اندرونی کرب کے سبب سرخ ہو رہی تھیں۔ اس نے سکندر کی طرف سے رخ پھیرا اور

ٹھہرے ہوئے انداز میں بولا "تم مصور ہونا؟"

"ہاں۔ لوگوں کا خیال ہے کہ میں اچھی تصویر بنالیتا ہوں۔"

"تو پھر میری ایک بات مانو۔"

"ہاں ہاں کہو۔"

"ممکن ہے کہ میں تم سے ملنے تمہارے گھر آؤں..... لیکن ..... اگر میں نہ آیا تو ٹھیک دو ہفتے بعد تم دوبارہ اس جگہ آنا۔ یہاں پہنچ کر تم اپنے اردگرد دیکھنا۔ جو منظر تمہیں سب سے عجیب لگے اس کی ایک تصویر بنالینا۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"بس جو میں کہہ رہا ہوں اس کو دماغ میں رکھو۔"

"اچھا..... تصویر بنانے کے بعد کیا کروں؟"

"تم یہ تصویر لے کر شہزادی شہربانو کے ملک چلے جانا۔ اس کی سسرال ڈھونڈنا تمہارے لیے مشکل نہیں ہوگا۔ ظاہر ہے شاہی محل ہی اس کی سسرال ہوگی۔ تم اپنی وہ تصویر شہزادی شہربانو کو دکھانا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تصویر شہزادی کو ضرور پسند آئے گی..... شہزادی وہ تصویر تم سے لے لے گی۔ شاہی محلوں میں رہنے والے جب کسی سے کوئی چیز لیتے ہیں تو بدلے میں انعام واکرام ضرور دیتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ شہزادی تمہیں فراخ دلی سے نوازے گی۔ اس انعام واکرام سے تم وہ قرض بہ آسانی اتار سکو گے جو تمہیں تمہاری ماہ رو سے دور کر رہا ہے۔"

سکندر کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ اس نے قابوس کو ٹٹولنے کی بہت کوشش کی لیکن ناکامی ہوئی۔ وہ جیسے ایک دم اپنے خول میں بند ہوگیا تھا اور سکندر سے کچھ بھی کہنا سننا نہیں چاہتا تھا۔ ایک عجیب سی یاسیت طاری تھی اس پر۔

اپنے ذہن میں کئی سوال لیے سکندر اس ویرانے سے واپس آگیا۔ گھر آکر وہ کئی دن تک سوچتا رہا کہ قابوس نے آخر کس منظر کا ذکر کیا تھا۔ وہ کیا چیز ہے جس کی تصویر اسے بنانا تھی اور شہزادی شہربانو کے پاس لے کر جانا تھی۔ وہ دو ہفتے والی شرط بھی بار بار اس کے ذہن میں کھٹک رہی تھی۔ قابوس نے یہ کیوں کہا کہ وہ دو ہفتے سے پہلے دوبارہ یہاں نہ آئے۔ وہ دن سکندر نے بڑی مشکل سے کاٹے۔ چودہ دن گزر گئے۔ پندرھویں روز اس نے مصوری کا مختصر سامان اٹھایا اور اپنے تجسس کی انگلی تھام کر خراماں خراماں اس ویرانے کی طرف روانہ ہوگیا۔ طویل مسافت پاپیادہ طے کر کے وہ دوپہر کے وقت اس سنسان جنگل میں پہنچ سکا۔ مقررہ جگہ پر پہنچ کر وہ دنگ رہ گیا۔ اس کی تمام حسیات سمٹ کر آنکھوں میں آگئی تھیں اور دل جیسے دھڑکنا بھول گیا تھا۔ آہنی پنجرہ اپنی جگہ موجود تھا اور اس کے اندر حبشی قابوس بھی موجود تھا..... لیکن زندہ حالت میں نہیں..... وہ مرچکا تھا۔ پرندے اور جانور اس کے جسم کا گوشت نوچ کر کھا چکے تھے اور اب صرف ہڈیوں کا ڈھانچا نظر آرہا تھا۔ یہ ڈھانچا پنجرے کی سلاخوں کے سہارے نیم دراز تھا۔ جیسے مرنے والا کچھ سوچتے سوچتے یا کسی کی راہ دیکھتے دیکھتے ابدی نیند سوگیا ہو۔ مرنے والے کی گردن میں اب بھی گھنگھروؤں والی چرمی پٹی موجود تھی لیکن اس کی روح ہر بندھن سے آزاد ہو چکی تھی۔

اس اندوہناک منظر نے سکندر کے دل ودماغ پر بہت گہرا اثر کیا تھا۔ وہ دیر تک آہنی پنجرے اور انسانی ڈھانچے کو خالی خالی نظروں سے دیکھتا رہا پھر نڈھال سا زمین پر بیٹھ گیا۔ دھیرے دھیرے اس کے حواس کام کرنے لگے۔ اسے یاد آیا کہ قابوس نے اس سے کیا کہا تھا۔ اسے یہاں نظر آنے والے سب سے انوکھے منظر کی تصویر بنانا تھی۔ اس سے انوکھا منظر بھلا اور کیا ہوسکتا تھا۔ ایک شخص آہنی پنجرے میں موجود تھا۔ پنجرے کا دروازہ کھلا تھا لیکن قیدی پنجرے سے نکلا نہیں تھا۔ وہ بھوکا پیاسا اپنے قفس میں بند رہا اور جان دے دی تھی۔

سکندر نے اپنے آنسو پونچھے۔ کینوس کو ہموار کیا..... اپنے رنگ سنبھالے اور بڑی وارفتگی سے منظر کشی میں مصروف ہوگیا۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ وہ ایک یادگار تصویر بنانے جارہا ہے۔

○☆○

شہزادی شہربانو اپنے محل میں موجود تھی۔ خوب صورت پائیں باغ میں وہ ایک فوارے کے قریب گم صم بیٹھی تھی۔ شاہی مغنیہ کا گیت فضا میں گونج رہا تھا لیکن وہ اس کی طرف سے بے خبر تھی۔ قوس قزح کے رنگوں والے پھول، شاخوں پر چہکتے ہوئے پرندے، کچھ بھی تو اس کے دل کو نہیں بھارہا تھا۔ آج کئی دن بعد وہ پھر بے وجہ اداس ہوگئی تھی۔ ایک خواجہ سرا اجازت لے کر اندر داخل ہوا۔ تعظیم پیش کرنے کے بعد اس نے شہزادی سے کہا "شہزادی حضور! ایک نوجوان شرف باریابی چاہتا ہے۔ وہ مصور ہے اور آپ کی خدمت میں کوئی تصویر پیش کرنے کا خواہش مند ہے۔"

"کون ہے وہ؟"

"کہیں بہت دور سے آیا ہے۔ چہرے پر طویل مسافت کے آثار ہیں۔ وہ اپنی تصویر کے بارے میں بہت پُرامید ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ اسے اندر لاؤ۔" شہزادی شہربانو نے کہا۔

چند لمحے بعد خستہ حال سکندر اپنی تصویر کے ساتھ پائیں باغ میں داخل ہوا۔ تین بار فرشی سلام کرنے کے بعد وہ خاموش کھڑا ہو گیا۔

شہزادی نے اسے تصویر دکھانے کا حکم دیا۔ سکندر نے تصویر کا غلاف ہٹایا اور بڑے سلیقے سے اسے شہزادی کے ملاحظے کے لیے رکھ دیا۔

شہزادی نے پہلے تو تصویر کو عام سے انداز میں دیکھا پھر ایک دم وہ چونک گئی۔ اس کی آنکھوں میں بتدریج ہیجانی کیفیت نمودار ہونے لگی۔ چہرہ رنگ پر رنگ بدل رہا تھا۔ تصویر کا فریم دونوں ہاتھوں میں تھام کر وہ یک ٹک اسے دیکھتی چلی گئی۔ کتنی ہی دیر بعد اس نے سکندر کی طرف نگاہ اٹھائی۔ اس کی حسین آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔ کانپتی ہوئی آواز میں بولی "کہاں دیکھا تھا تم نے یہ سب کچھ؟"

سکندر نے مؤدب لہجے میں شہزادی کو اس سنسان جنگل کے بارے میں بتایا جو ایک خشک ندی کے کنارے دور تک پھیلا ہوا تھا اور جہاں ایک روز سکندر اتفاقاً جا نکلا تھا۔ اس نے شہزادی کو فاقہ زدہ غلام اور آہنی پنجرے کا احوال سنایا۔

نجانے اچانک شہزادی کو کیا ہوا۔ اس نے تصویر اٹھائی اور بھاگتی ہوئی محل سرا کے اندرونی حصے میں چلی گئی۔ یقیناً وہ زار و قطار رو رہی تھی۔

مفلوک الحال سکندر کو شہزادی شہربانو کی شکل پورے دو روز بعد نظر آئی تھی۔ شہزادی نے ایک خادمہ کے ذریعے اسے محل سرا میں طلب کیا تھا۔ وہ اس پھول جیسی نظر آ رہی تھی جو موسم سرما کی ایک طویل رات میں صبح تک شبنم سے نہاتا رہا ہو۔ اس کی آنکھیں مسلسل رونے سے سوج چکی تھیں اور چہرہ اندوہ کی تصویر تھا۔ اس مرتبہ شہزادی شہربانو نے سکندر سے ساری بات تفصیلاً پوچھی۔ سکندر نے بھی کچھ چھپا کر نہیں رکھا۔ الف سے ے تک سارا ماجرا کہہ سنایا۔ شہزادی سنتی رہی اور اپنے آنسو چھپانے کی کوشش کرتی رہی۔ اس نے کرید کرید کر سکندر سے پوچھا کہ آخری ملاقات میں طوطو (قابوس) سے اس کی کیا باتیں ہوئی تھیں۔ طوطو نے کس لہجے میں کیا کیا کہا تھا۔ شاید وہ چاہ رہی تھی کہ سکندر لفظوں کی مدد سے اس پوری ملاقات کا نقشہ اس کی آنکھوں کے سامنے کھینچ ڈالے...... اور جب سکندر یہ نقشہ کھینچ رہا تھا، وہ بے اختیار ہچکیوں سے رونے لگی۔

بہت دیر بعد اس کے آنسو تھمے اور اس نے سکندر سے کہا "مصور! ہم تمہاری یہ تصویر منہ مانگی قیمت پر خریدنا

چاہتے ہیں۔"

سکندر بولا "شہزادی حضور! میں ایسی جسارت نہیں کر سکتا۔ میری طرف سے یہ تصویر ایک حقیر تحفہ سمجھ کر قبول فرمالیجئے۔"

شہزادی اپنی جگہ سے اٹھی اور اس نے ایک منہ بند تھیلی سکندر کی گود میں ڈال دی "یہ تمہاری تصویر کی قیمت نہیں ہے مصور۔" وہ گلوگیر آواز میں بولی "اس دردناک تصویر کی کوئی قیمت ہو ہی نہیں سکتی ہے۔"

رخصت ہونے سے پہلے سکندر نے کہا "شہزادی حضور! ایک بات پوچھنے کی جسارت کر سکتا ہوں؟"

"کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟"

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا "شہزادی حضور! حبشی غلام کی روداد میں ایک کڑی غائب تھی۔ وہ آہنی پنجرہ تو آپ کی برات کے ساتھ روانہ ہوا تھا۔ وہ وہاں کیوں پڑا رہ گیا تھا؟"

سکندر کو ایک پل کے لیے یوں محسوس ہوا کہ شہزادی اس مداخلت پر خفا ہو جائے گی لیکن پھر ایک دم وہ پُرسکون ہو گئی۔ شاید وہ خود بھی اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتی تھی۔ کسی ایسے شخص کے سامنے اپنا دکھ بیان کر دینا چاہتی تھی جس کا تعلق اس کے وطن سے تھا۔ اس کی مٹی سے تھا اور ان فضاؤں سے تھا جہاں وہ برسوں سانس لیتی رہی تھی۔ وہ بولی "طوطو کو ہمارے محترم شوہر نے آزاد کیا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ ایک غلام کی حیثیت سے ہمارے ساتھ ساتھ یہاں آئے۔ وہ ہماری شادی کی خوشی میں اسے آزاد کر دینا چاہتے تھے۔ سفر کے دوران میں انہوں نے اس کا آہنی پنجرہ گھوڑا گاڑی سے اتروا کر جنگل میں رکھ دیا تھا لیکن جب اسے پنجرے سے نکالنے کی کوشش کی گئی تو وہ اس کی سلاخوں سے چمٹ گیا۔ وہ دہائی دینے لگا کہ اسے موت قبول ہے لیکن رہائی نہیں۔ شاید... شاید وہ سچ مچ طوطا ہی تھا جو پنجرے کو ہی اپنا گھر سمجھتا ہے اور کھلی فضاؤں میں اڑنے سے انکار کر دیتا ہے۔ ہم جانتے تھے کہ وہ ہمارے ساتھ رہنا چاہتا ہے' ہمارے ساتھ جانا چاہتا ہے لیکن ہم مجبور تھے۔ اپنے سرتاج کی خوشنودی ہمیں ہر حالت میں عزیز تھی۔ ہم نے طوطو کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ ہم نے کہا تھا "تمہارے پنجرے کا دروازہ کھول دیا گیا ہے۔ اب تم آزاد ہو۔ ایک نئے ڈھنگ سے اپنی زندگی شروع کر سکتے ہو۔"

وہ اٹک اٹک کر بولا تھا "غلام زادہ آزاد نہیں ہے شہزادی... اس کے پاؤں میں اب بھی زنجیر ہے۔"

اس نے اور کچھ نہیں کہا تھا لیکن اس کی آنکھیں بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔ وہ آنکھیں ہمیں بتا رہی تھیں کہ وہ ہمارا انتظار کریں گی۔ آخری وقت تک... زندگی کی آخری رمق تک۔ وہ اس امید میں کھلی رہیں گی کہ ہم پلٹ کر آئیں گے..."

آخری الفاظ ادا کرتے کرتے سوگوار شہزادی پھر سسکنے لگی "ہمیں کیا پتا تھا طوطو... تو ضد کا اتنا پکا نکلے گا۔ پتا ہوتا تو... پتا ہوتا تو..."

الفاظ اس کے حلق میں اٹک کر سسکیوں میں ڈوب گئے۔ وہ ٹوٹ کر رو رہی تھی۔ شاید آج قابوس نے اس سے اپنے سارے قہقہے واپس لے لیے تھے۔ اس لمحے سکندر کو محسوس ہوا کہ یقیناً قابوس نے سچ ہی کہا تھا۔ شہزادی کی آنکھوں میں کبھی کبھی وہ لمحہ ضرور چمکتا ہوگا' جب شہزادی... شہزادی نہ رہتی ہوگی صرف ایک دوشیزہ بن جاتی ہوگی اور قابوس... قابوس نہ رہتا ہوگا صرف ایک نوجوان بن جاتا ہوگا۔ اس لمحے وہ دونوں صرف ایک مرد اور عورت کی حیثیت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوں گے۔ ان کی آنکھوں میں وہ برق چمکتی ہوگی جو آدم اور حوا کی آنکھوں میں ایک دوجے کو دیکھ کر چمکی تھی... ہاں ایسا ضرور ہوا ہوگا۔

○☆○

باقی کی کہانی زیادہ طویل نہیں ہے۔ سکندر انعام کی تھیلی لے کر اپنے ملک واپس آگیا۔ رئیس کی دی ہوئی مہلت ختم ہونے میں صرف دو تین دن باقی تھے۔ آخری دو تین دن جو سکندر اور ماہ رو کی ابدی جدائی کے درمیان حائل تھے۔ سکندر نے رئیس کی واجب الادا رقم اس کے سامنے پھینکی اور... بڑی سج دھج سے اپنی ماہ رو کو اپنا لیا۔ محبت کی ایک ادھوری کہانی نے محبت کی ایک مکمل کہانی کو جنم دے دیا تھا۔ قابوس اور شہزادی کی محبت کا ادھ کھلا پھول بکھر گیا تھا لیکن اس کی پتیوں نے زمین میں سرایت کر کے نئے لالہ و گل کو نمو دی تھی... جس سہانی رات' سکندر نے اپنی دلہن کا گھونگھٹ اٹھایا اور اس کے سرخ لبوں کو بوسہ دیا نجانے کیوں ایک دم اس کی آنکھوں میں نمی تیر گئی۔ شاید... شاید اس کے تصور میں وہ سنسان جنگل آگیا تھا جہاں جھاڑ جھنکاڑ کے درمیان ایک آہنی پنجرہ رکھا تھا اور پنجرے کے قریب ایک طوطو کی قبر تھی... ایک "ہنسانے والے" طوطو کی قبر... یہ قبر سکندر نے اپنے ہاتھوں سے بنائی تھی اور اس پر اپنے آنسوؤں سے چھڑکاؤ کیا تھا۔

★★★

طاہر جاوید مغل کی ایک تیکھی تحریر قارئین کے لئے بطور خاص

کھلونا

طاہر جاوید مغل

کوئی شے بری یا بھلی نہیں ہوتی بلکہ اس کا استعمال اسے برا یا اچھا بناتا ہے، اس کے پاس بھی ایک سہولت تھی جسے وہ کھلونا سمجھ کر اس سے کھیلتا تھا مگر یہ بھول گیا تھا کہ کبھی کوئی کھلونا اس سے بھی کھیل سکتا ہے۔
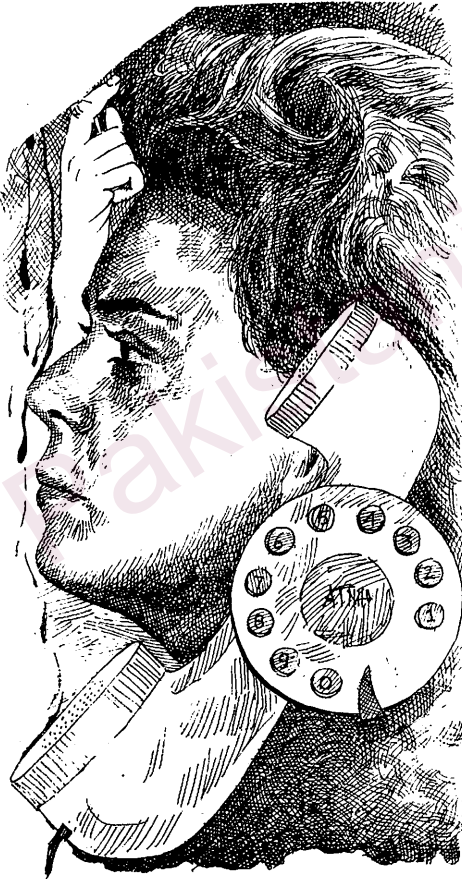
باسط کی عمر چوبیس سال کے قریب تھی۔ گھنے بال، روشن آنکھیں اور ستواں ناک ......وہ کسرتی جسم کا مالک تھا۔ ایم ایس سی کے بعد نوکری کی تلاش میں تھا بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اچھی نوکری کی تلاش میں تھا۔ ایک دو جابز اسے آفر ہوئی تھیں۔ ایک میں تنخواہ اس کی مانگ سے کم تھی، دوسری میں اسے روزانہ لاہور سے باہر قریباً چالیس کلومیٹر کا سفر طے کرنا پڑتا تھا۔

وہ کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ والد صاحب کی لبرٹی مارکیٹ میں کپڑے کی دکان تھی۔ اب بڑے بھائی نے بھی اسی دکان کی ایک شاخ شادمان کالونی میں کھول لی تھی۔ بڑے بھائی اور والد کا رجحان مذہب کی طرف تھا مگر باسط کے سلسلے میں صورتِ حال یکسر مختلف تھی۔ اس نے بال بڑھا رکھے تھے۔ جدید ترین فیشن کے کپڑے پہنتا تھا۔ پاپ میوزک سنتا تھا اور ہر ہفتے کی شام ہم خیال دوستوں کے ساتھ لاہور میں آوارہ گردی کرتا تھا۔

گھر کی بالائی منزل پر باسط کا کمرا، جو اکثر مقفل رہتا تھا، انواع واقسام کی تصویروں، رسالوں اور سی ڈیز سے بھرا ہوا تھا۔ ایک فون سیٹ بھی اس کے کمرے میں موجود تھا۔ یہ علیحدہ فون لائن اس کے اپنے نام پر تھی۔

فون سے شغل کرنا باسط کی پسندیدہ ترین تفریح تھی۔ موبائل فون تو رہتا ہی ہر وقت اس کے ہاتھ میں تھا لیکن پی ٹی سی ایل کا فون بھی وہ کچھ کم استعمال نہیں کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جو چسکا تار والے فون کے استعمال میں ہے، وہ ''بے تار والے'' فون کے استعمال میں نہیں۔ آواز کی کوالٹی، وقت کی فراوانی اور اس قسم کے دوسرے فوائد، تار والے فون سے ہی وابستہ تھے۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ''فون'' باسط کے لیے ایک دل پسند کھلونے کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ اس کھلونے کے ان گنت استعمال جانتا تھا۔

کبھی کبھی باسط کو محسوس ہوتا تھا کہ اس کے سرہانے رکھا ہوا ٹیلی فون سیٹ ایک بے جان شے نہیں ہے، یہ ایک زندہ چیز ہے۔ اس میں زندگی دوڑتی ہے۔ بہ ظاہر اس ایک چھوٹی سی شے کے ذریعے وہ نہ صرف اس شہر، نہ صرف اس ملک بلکہ پوری دنیا کے ساتھ منسلک تھا۔ افریقا کی کسی بستی، امریکا کے کسی شہر کی کسی گلی یا یورپ کے کسی دور دراز گوشے سے اس کا رابطہ اس فون سیٹ کے ذریعے ہو سکتا تھا۔ اکثر وہ ایزی چیئر پر نیم دراز ہو کر اپنے کریم کلر کے فون سیٹ کو دیکھتا اور سوچتا، دنیا بھر میں اس وقت لاکھوں کروڑوں لوگ فون استعمال کر رہے ہوں گے۔ اندرونِ ملک یا بیرونِ ملک سے کوئی

شخص بھی سہواً اس فون سیٹ کی گھنٹی بجا سکتا ہے۔ اس طرح وہ بھی اس انٹرنیشنل لائن کے ذریعے جہاں اور جس جگہ چاہے رابطہ کر سکتا ہے۔

فرصت کے اوقات میں وہ اکثر اس فون سیٹ سے کھیلتا رہتا تھا۔ خاص طور سے رات دس اور بارہ بجے کے بعد۔ ان اوقات میں اندرونِ ملک کال کے ریٹس کافی کم ہو جاتے تھے اور لوکل کال تو تقریباً مفت ہی ہو جاتی تھی۔ ''رانگ نمبر'' ایک ایسی اصطلاح ہے جو لوگوں کی ذاتی زندگیوں میں دخل اندازی کے ہزار ہا دروازے کھولتی ہے۔ سب کچھ فون کرنے والے کے اختیار میں ہوتا ہے۔ وہ کس کو کب ڈسٹرب کرے گا' کتنی بار کرے گا اور کس انداز میں کرے گا۔ حالات ناموافق ہونے کی صورت میں فوراً اسم اعظم (سوری رانگ نمبر) کہہ کر جان چھڑائی جا سکتی ہے۔ موافق حالات کی صورت میں اس رانگ نمبر کو جتنا چاہے طول دیا جا سکتا ہے۔

رات ہوتے ہی اکثر باسط کی انگلیاں بھی ڈائل پر گردش کرنے لگتی تھیں۔ وہ گھروں میں' گھروں کے بند کمروں میں اور خواب گاہوں میں داخل ہو جاتا تھا۔ مختلف آوازیں سنتا تھا۔ اونگھتی ہوئی' کسمساتی ہوئی' مسکراتی ہوئی' شعلے برساتی ہوئی' کچھ بہت بلند' کچھ دھیمی' کچھ سرگوشیوں کا انداز لیے ہوئے۔ کچھ کرخت ہوتی تھیں' کچھ نصیحت کا آہنگ لیے ہوئے' کچھ میٹھی میٹھی۔

بہرحال اس حوالے سے باسط کے کچھ اصول بھی تھے۔ وہ کسی شخص کو بار بار تنگ نہیں کرتا تھا۔ اگر کہیں سے جھاڑ پلا دی جاتی تھی تو وہ خود بھی طیش میں نہیں آ جاتا تھا۔ اسے آواز سے ہی عورتوں کی عمر کا اندازہ ہو جاتا تھا۔ بڑی عمر کی عورتوں کے ساتھ اس کی گفتگو مختصر ہوتی تھی۔ لڑکیوں میں سے جو اس کی حوصلہ افزائی کرتی تھیں' ان سے بات آگے بڑھاتا تھا ......لیکن یہ تعلق عموماً صرف دلچسپ گفتگو تک ہی رہتا تھا۔

پچھلے دو ڈھائی برس میں بہ مشکل دو یا تین لڑکیاں ہوں گی جن سے ''ٹیلی فونک تعلق'' کے بعد وہ بالمشافہ بھی ملا تھا۔ یہ دوستی دو تین ماہ چلی تھی اور پھر دوسری دوستیوں کے شور میں گم ہو گئی تھی۔

رانگ نمبر ظاہر ہے کہ غلط نمبر کو کہا جاتا ہے۔ مگر ایک روز اسی ''غلط نمبر'' نے باسط کو ایک ''صحیح فرد'' سے ملا دیا۔ یہ ایک لڑکی تھی' گریجویشن کر رہی تھی۔ اس کے والد ایک فارماسیوٹیکل کمپنی کے مالک تھے۔ لڑکی نے اپنا نام شاہینہ بتایا۔ لڑکی کی آواز سے ہی باسط کی ''تجربے کار سماعت'' نے بہت سے اندازے لگا لیے تھے۔ وہ یقیناً خوبصورت تھی' جسم چھریرا تھا' وسطی پنجاب کے لوگوں کی طرح رنگ کھلتا ہوا گندمی تھا۔

شاہینہ کی گفتگو کے انداز اور لہجے کے لوچ نے باسط کو اس قدر متاثر کیا کہ وہ جلد از جلد اس سے ملنے کے لیے بے تاب ہو گیا۔

''رانگ نمبر'' ملنے کے ٹھیک ایک ماہ بعد شاہینہ اور باسط کی ملاقات گلبرگ کے ایک چائنیز ریسٹورنٹ میں ہوئی۔ باسط نے شاہینہ کو دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔

''تم بالکل ویسی ہی ہو جیسا میں نے سوچا تھا بلکہ شاید اس سے بھی کچھ بڑھ کر۔''

''اب پتا نہیں تم نے کیا سوچا تھا۔'' وہ شرارت سے مسکرائی اور ساتھ ہی تھوڑا سا شرما بھی گئی۔

''یہ ایک گھسا پٹا جملہ ہے شاہینہ...... لیکن پتا نہیں کیوں میرا دل بار بار کہہ رہا ہے کہ تم وہی ہو جس کی مجھے تلاش تھی۔''

''پچھلے ماہ تمہاری پہلی ''ہیلو'' سن کر ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ تم بہت باتونی ہو گے۔''

''پلیز شاہینہ! میری بات کو مذاق میں مت لینا۔ میں اب...... میں اب تمہارے بغیر رہ نہیں سکوں گا۔'' باسط نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

چائنیز ریسٹورنٹ میں شاہینہ اور باسط کی وہ ملاقات بعد ازاں ملاقاتوں کے ایک طویل سلسلے کا نقطۂ آغاز ثابت ہوئی۔ وہ دونوں ''لو برڈز'' کی طرح لاہور کی فضاؤں میں اڑتے رہے۔ تنہائی کی منڈیروں پر بیٹھتے رہے۔ قربت کے پانیوں میں ڈبکیاں کھاتے رہے۔

غلط نمبر ملانے کی عادت نے باسط کو واقعی ایک نہایت درست لڑکی سے ملا دیا تھا۔ وہ ہر لحاظ سے اس کے معیار کے مطابق تھی۔ باسط کی اولین خواہش تو یہی تھی کہ کسی طرح شاہینہ کا قرب حاصل ہو۔ وہ خاصے ماڈرن گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اور خود بھی کوئی ایسی چھوئی موئی نہیں تھی تاہم لڑکی تو تھی۔ گریز عورت کی فطرت میں شامل ہے۔ شاہینہ بھی اپنی فطرت کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ دوسری طرف باسط نے بھی اپنی فطرت کا مظاہرہ شدّ و مد سے جاری رکھا۔ دھیرے دھیرے یہ سفر طے ہوتا گیا۔ وہ تنہائی میں ایک دوسرے کو چھونے لگے۔ ایک دوسرے کو درجہ بہ درجہ دریافت کرنے لگے۔ تاہم یہ سب کچھ ایک حد میں رہتے ہوئے تھا۔

تقریباً پانچ چھ ماہ اسی طرح گزر گئے۔ بہار کا موسم ختم ہوا اور موسم گرما نے اپنے گرم پر خلقِ خدا پر پھیلا دیے۔ باسط نے کہیں سنا تھا کہ محبت ایک حرکت کرنے والی شے کا نام ہے۔

یہ کبھی رکتی نہیں یا غیر محسوس طور پر بڑھتی رہتی ہے یا کم ہوتی جاتی ہے۔ باسط کو بھی اپنے اندر تبدیلیاں محسوس ہو رہی تھیں' وہ مطمئن نہیں تھا۔ شاہینہ کے ساتھ وہ قربت کے کئی درجے طے کر چکا تھا۔ مگر اب اس کے اندر کچھ اور طرح کی طلب پیدا ہو رہی تھی۔ وہ شاہینہ سے معاشی فائدہ بھی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ شاہینہ کے والد اچھے خاصے کاروبار کے مالک تھے۔ باسط بھی معقول حد تک پڑھا لکھا تھا۔ اگر باسط کو فارماسیوٹیکل کمپنی میں اچھی سی نوکری مل جاتی تو وہ اپنا مستقبل سنوار سکتا تھا۔ تاہم باسط جانتا تھا کہ ابھی یہ بات کرنے کا موقع نہیں ہے۔ اگر شاہینہ سے شادی ہو جاتی تو پھر یہ سارے مسائل خود بہ خود حل ہو جاتے تھے۔

باسط نے شاہینہ یا اس کے والد سے اس بارے میں کوئی بات نہیں کی لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے تو شاید یہ راہ' اچھی اور بری دونوں طرح کی ہوتی ہے۔ اگر دو دوستوں میں سے کسی ایک کے دل میں کوئی منفی خیال پیدا ہوتا ہے تو اس کا اثر دوسرے پر بھی پڑتا ہے۔ باسط نے اپنے دلی خیال کا اظہار کسی سے نہیں کیا مگر ایک دن ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہوئے شاہینہ نے ایک عجیب بات کہی' وہ بولی ''باسط! ڈیڈی سے ملے تمہیں کتنے دن ہوئے ہیں؟''

''پندرہ بیس دن تو ہوئے ہوں گے۔ کمپنی میں انہوں نے جو افطاری کرائی تھی' اسی میں ملاقات ہوئی تھی۔''

''اس وقت کوئی بات تو نہیں ہوئی تھی تم دونوں میں؟''

''نہیں' کوئی خاص بات تو نہیں۔''

وہ چند لمحے تک خاموشی سے سر جھکا کر میز کی شفاف سطح کو دیکھتی رہی پھر بولی ''ڈیڈی مجھ سے کبھی سخت لہجے میں نہیں بولے مگر کل بولے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے ایک بات کہی ہے۔''

''بھئی پہیلیاں کیوں بجھوا رہی ہو؟'' وہ زچ ہو کر بولا۔

شاہینہ نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا ''تمہیں پتا ہی ہے کہ ڈیڈی اپنے اصولوں کی پابندی کتنی سختی سے کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ...... تمہیں...... میرا ہاتھ مانگنے سے پہلے' اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر دکھانا پڑے گا۔''

''تو بھئی دکھا دیتے ہیں پاؤں پر کھڑے ہو کر' اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟'' باسط نے ہونٹ بھینچتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر تک دونوں اپنی اپنی جگہ خاموش بیٹھے رہے۔ پھر باسط بولا ''شاہینہ! یہ دنیا کا دستور ہے کہ یہاں ایک ہاتھ دوسرے کو دھوتا ہے' ہم ایک دوسرے کے کام آتے ہیں اور اسی طرح آگے بڑھتے ہیں۔ اگر تمہارے ڈیڈی کی طرف سے......''

''ہاں' ایک بات اور......'' شاہینہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا ''ڈیڈی ساری عمر سفارش اور رعایت وغیرہ کے سخت خلاف رہے ہیں۔ تمہارے سلسلے میں بھی ان کا کہنا یہی ہے کہ باسط نے جو کچھ کرنا ہے' اپنے بل بوتے پر کرے۔''

شاہینہ کی بات سن کر باسط کو یہی لگا کہ اس کے کرخت باپ نے ''ان دونوں کے تعلق'' کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی ہے۔

☆☆☆

اس کے بعد وہی کچھ ہوا جو ہونا تھا۔ شاہینہ اور باسط کے تعلقات بہ تدریج سرد مہری کا شکار ہوتے چلے گئے۔ شاہینہ نے کافی کوشش کی' ہر طریقے سے باسط کو سمجھانے بجھانے اور ابھارنے کا چارہ کیا لیکن سب بے سود رہا۔ شاہینہ کو جسمانی طور پر فتح کرنے کی کچھ زیادہ خواہش باسط کے دل میں نہیں رہی تھی۔ اس کا اصل ٹارگٹ تو اپنی معاشی آسودگی تھی اور جب یہ ٹارگٹ ہی دور چلا گیا تھا تو پھر ایک گھسے پٹے راستے پر چلتے رہنے سے کیا فائدہ تھا۔

وہ خوبصورت تھا' جوان تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ گفتگو کا فن جانتا تھا اور یہ ایسا ہنر تھا جو مشکل سے مشکل لڑکی کو شیشے میں اتار سکتا تھا۔ اس ہنر کو احسن طریقے سے استعمال کرنے کے لیے اس کے پاس وہ جادوئی آلہ تھا جسے لوگ عرف عام میں ٹیلی فون کہتے ہیں اور اس ٹیلی فون کے حوالے سے ایک اسم اعظم بھی اس کے پاس تھا...... سوری رانگ نمبر۔ شاہینہ کو نظر انداز کرنا ہی اب اس کے لیے بہتر تھا۔ وہ نئے راستوں پر چل کر نئی منزلوں تک پہنچنا چاہتا تھا۔ بالفاظِ دیگر وہ ان جہانوں کی طرف جانا چاہتا تھا جو ستاروں سے آگے ہوتے ہیں۔

جن دنوں شاہینہ کے ساتھ اس کا ''تعلق'' عروج پر تھا۔ اس نے اپنے آپ سے یہ عہد کیا تھا کہ اب وہ کبھی ''فون'' کو ایک کھلونے کے طور پر استعمال نہیں کرے گا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ''فون'' کے ذریعے جو بہترین چیز حاصل کرنا چاہتا تھا وہ اس نے کر لی ہے۔ یعنی شاہینہ تک پہنچ گیا ہے۔ اب فون سے کھیلنا ایک کارِ لا حاصل ہے۔ مگر اب بدلے ہوئے حالات میں ہر چیز بدلی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

پھر ایک رات ایسی آئی کہ وہ اور ''فون سیٹ'' ایک بار پھر ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے۔ رات کے بارہ بج

چکے تھے۔ نیا دن شروع ہو رہا تھا اور باسط کا نیا سفر بھی شروع ہو رہا تھا۔ شاہینہ کو الوداع کہنے کے بعد وہ اپنا بھولا بسرا مشغلہ پھر سے شروع کر رہا تھا۔ اہل خانہ نیچے والی منزل پر تھے۔ سب سے آخر میں بڑے بھائی سوتے تھے۔ وہ بھی نماز پڑھ کر سو چکے تھے۔

باسط نے ہزار ہا نمبروں میں سے یونہی ایک نمبر ملایا۔ یہ نمبر کسی کا بھی ہو سکتا تھا۔ کسی دکان کا، کسی گھر کا، کسی اونگھتی ہوئی ممی کا، کسی ٹی وی دیکھتے ہوئے ڈیڈی کا، کسی اسٹڈی کرتی ہوئی مہ جبین کا۔

یہ ایک غلط نمبر تھا اور اسی لیے ملایا گیا تھا کہ یہ غلط تھا...... اور کہا جاتا ہے کہ غلط نمبر کبھی انگیج نہیں ملتا اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ غلط نمبر بھی کبھی بہت ہی صحیح نمبر ثابت ہوتا ہے۔

یہ ایک موبائل نمبر تھا۔ چند سیکنڈ تک گھنٹی بجی، پھر دوسری طرف سے ایک بھاری مردانہ آواز ابھری ''کون ہے؟''

''تت...... توفیق صاحب سے بات کرنی ہے۔'' باسط نے یونہی ایک نام لیا۔

''کون توفیق......؟''

''یہ توفیق صاحب کا نمبر نہیں ہے؟''

''نہیں۔''

''اوہ۔ سوری رانگ نمبر۔'' باسط نے فون بند کر دیا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ اگلا نمبر ڈائل کر رہا تھا۔

☆☆☆

رات ایک بجے کا وقت تھا۔ دریائے راوی کے قریب ایک سنسان سڑک پر ایک کار تیز رفتاری سے اڑی جا رہی تھی۔ اس ہنڈا اکارڈ کا تعاقب ایک پولیس جیپ کر رہی تھی۔ یہ تند و تیز تعاقب قریباً پانچ منٹ جاری رہا۔ پھر پولیس جیپ سے کار پر یکے بعد دیگرے دو برسٹ چلائے گئے۔ کار کے پچھلے دونوں ٹائر فلیٹ ہو گئے اور وہ ڈگمگاتی ہوئی ایک درخت سے جا ٹکرائی۔ کار میں سے دو سائے نکل کر دریا کی طرف بھاگے۔ اسی اثنا میں پولیس کی مزید گاڑیاں بھی موقع پر پہنچ گئیں۔ بھاگنے والوں کو ذخیرے میں گھیر لیا گیا۔ آٹھ دس منٹ تک دونوں طرف سے اندھا دھند فائرنگ ہوئی۔ کوئی فریق بھی ہار ماننے کو تیار نہیں تھا لیکن آخر کار مفرور افراد کا ایمونیشن ختم ہو گیا۔ ان میں سے ایک موقع پر مارا گیا اور دوسرے کو شدید زخمی حالت میں گرفتار کر لیا گیا۔ گرفتار ہونے والا نامی گرامی مجرم اور دہشت گرد تھا۔ اس کا نام اکرام خاں تھا۔ وہ پولیس اور بہت سی خفیہ ایجنسیوں کے علاوہ انٹرپول کو بھی مطلوب تھا۔ اس پر قتل، اغوا اور بم بلاسٹ وغیرہ کے لاتعداد مقدمات درج تھے۔

اکرام خاں بے حد تجربے کار اور گھاگ مجرم تھا۔ اس نے ڈھائی تین برس تک پولیس اور ایجنسیوں کو تگنی کا ناچ نچایا تھا۔ وہ بے حد صفائی اور منصوبہ بندی سے وارداتیں کرتا تھا۔ اس کی طرح اس کے ساتھی بھی کبھی منظرِ عام پر نہیں آ سکے تھے۔ اس کے مختلف نام تھے۔ وہ لوگوں سے ٹیلی فونک رابطے بھی کرتا تھا مگر بے حد احتیاط سے۔ وہ موبائل فون کی کوئی بھی سم ایک یا دو دن سے زیادہ استعمال نہیں کرتا تھا۔

اکرام خاں اسپتال پہنچنے کے چند ہی منٹ بعد دم توڑ گیا۔ اس کی جیب سے جو موبائل فون برآمد ہوا وہ پولیس کے لیے بے حد اہم چیز تھا۔ آئندہ چند گھنٹے کے اندر ہونے والی تفتیش میں یہ فون اہم ترین کردار ادا کر سکتا تھا۔ موبائل فون پر کی جانے والی اور موصول ہونے والی کالوں کو نوٹ کیا گیا۔ یہ کل پانچ کالیں تھیں۔ آخری کال اکرام خاں کو رات بارہ بج کر ایک منٹ پر موصول ہوئی تھی۔ یہ پی ٹی سی ایل کے نمبر سے کی گئی تھی۔ کمپیوٹرائزڈ ڈائریکٹری کے مطابق اس فون لائن کے اونر کا نام تھا، باسط۔

ان واقعات سے بے خبر باسط اپنے بیڈ روم میں سکون کی نیند سو رہا تھا۔ سرہانے رکھے ہوئے آڈیو سسٹم پر مدھم آواز میں کسی انگلش گانے کی دھن بج رہی تھی۔ اطراف کی گلیوں میں تاریکی اور خاموشی تھی۔ اچانک اس خاموشی کو پولیس گاڑیوں کے چیختے چلاتے سائرنوں نے توڑ دیا۔ یہ ایک دو نہیں، درجن کے قریب گاڑیاں تھیں۔ ان گاڑیوں نے چاروں طرف سے ''حاجی منظور کپڑے والے'' کی کوٹھی کو گھیر لیا۔ رانگ نمبر کا کھیل بالآخر اپنی قیمت وصول کر چکا تھا۔

عبدالباسط اب جیل میں ہے۔ تفتیش کے عذاب سہتے اور مقدمے بھگتتے اب اسے دو سال ہو چکے ہیں۔ وہ کسی بڑی سزا سے بچ بھی گیا تو غالباً ابھی اسے کئی سال جیل میں گزارنا ہوں گے۔ ہمارے ہاں کا یہی دستور ہے۔ بے گناہ کو اپنی بے گناہی ثابت کرنا ہوتی ہے، چاہے اس میں عمر گزر جائے۔

لیکن باسط کلی طور پر بے گناہ بھی تو نہیں ہے۔ اس نے ایک محبت بھرا دل توڑا ہے...... اور اس کے علاوہ بھی نہ جانے کتنے دلوں کو ٹھیس پہنچائی ہے۔

وہ غلط نمبر ڈائل کرتا تھا...... پھر غلط نمبر ڈائل کرتے کرتے اس نے ایک دن غلط ترین نمبر ڈائل کر دیا۔ شاید یہی مکافاتِ عمل ہے۔

♣

دردِ عاقبت

طاہر جاوید مُغل

ماضی کے بعض ڈرائونے واقعات انسان کے لاشعور میں یوں جاگزیں ہوتے ہیں کہ مستقبل بھی ان کے زیر اثر آجاتا ہے- ایک ایسے ہی واقعے کی اثر آفرینی سے دوچار ڈاکٹر کا قصہ- اس کے مریض دردکش دوا کے انتظار میں تڑپتے ہی رہتے-

انسانی نفسیات کی دشواریاں اور پیچیدگیاں نہایت سہولت سے لکھنے والے مصنف کے قلم سے

ڈاکٹر عارفہ کافی خوب صورت تھی۔ بول چال کا انداز بھی بہت اچھا تھا۔ ہنستے ہوئے وہ بہت اچھی لگتی تھی لیکن وہ ہنستی ہی بہت کم تھی۔ اس کی ٹھوڑی پر اگر ایک چھوٹے سے زخم کا نشان نہ ہوتا تو اسے بہ آسانی حسین لڑکی کہا جاسکتا تھا۔ یہ زخم ہلال نما تھا اور صرف اس وقت نظر آتا تھا جب وہ اپنا چہرہ ذرا اوپر اٹھاتی تھی۔ ٹھوڑی سے شروع ہوکر یہ زخم گردن تک چلا گیا تھا۔

ڈاکٹر عارفہ کی ڈیوٹی اکثر آرتھوپیڈک وارڈ میں لگتی تھی اور میری ڈیوٹی اکثر گائنی میں ہوتی تھی۔ یہ دونوں وارڈز پہلو بہ پہلو تھے۔ یوں اکثر ہم دونوں کو مل بیٹھنے کا موقع مل جاتا تھا۔ جن دنوں رات کی ڈیوٹی ہوتی' ڈاکٹرز روم میں ہمارے درمیان عموماً طویل گپ شپ ہوتی ... یوں تو کسی کو جاننے کے لیے ایک عمر بھی ناکافی ہوتی ہے لیکن بہرحال ان ملاقاتوں کے نتیجے میں' میں کسی نہ کسی حد تک عارفہ کو سمجھنے لگی تھی۔ وہ غیر معمولی حد تک سنجیدہ اور روکھی پھیکی لڑکی تھی۔ حقیقت پسندی اس کے مزاج پر یوں حاوی تھی کہ رومانیت کا دور دور سراغ نہیں ملتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ زندگی کے کچھ حسین پہلو بھی ہیں لیکن وہ زندگی کی ناہمواری اور تلخی پر زیادہ نظر رکھتی تھی کیونکہ اس کے نزدیک زمانے میں انہی چیزوں کی بہتات تھی .... ساتھی ڈاکٹرز اور مریضوں وغیرہ کے ساتھ عارفہ کا رویہ بے حد سنجیدہ ہوتا تھا۔ وہ ٹو دا پوائنٹ بات کرتی تھی اور بعض اوقات تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ ہروقت موبائل فون پر بات کیا کرتی ہے جہاں عموماً مختصر ترین بات کی جاتی ہے اور ضرورت سے زیادہ ایک لفظ بھی نہیں بولا جاتا۔

پورے اسٹاف میں صرف میں تھی جس کے ساتھ عارفہ کی قدرے بے تکلفی تھی اور یہ میں ہی تھی جو کبھی کبھی عارفہ کو اس کی کسی بات پر ٹوک بھی دیتی تھی۔

ایک دن میں نے کہا "عارفہ! کبھی کبھی تم مریضوں کے ساتھ کافی بے رخی برتتی ہو۔ کل تمہارے وارڈ میں گھٹنے کے آپریشن والا وہ دیہاتی مریض کئی گھنٹے چیخ پکار کرتا رہا لیکن تم نے اسے پین کلر (SOS) نہیں دی۔ مجھے تو بڑا ترس آرہا تھا بے چارے پر۔"

"بھئی' اسے پرسوں معدے میں درد کی شکایت ہوئی تھی۔ میں پین کلر AVOID کرنا چاہ رہی تھی۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا "چلو اسے تو معدے کا درد تھا لیکن میں نے اکثر ایسے ہی دیکھا ہے۔ تم مریضوں کو پین کلر دینے سے کتراتی ہو۔ کبھی کبھی تو مجھے یوں لگتا ہے ...." میں کہتے کہتے چپ ہوگئی۔ وہ اصرار کرنے لگی کہ میں اپنا جملہ مکمل کروں۔ میں نے کہا "برا نہ ماننا' کبھی کبھی یوں لگتا ہے جیسے تم مریضوں کو تنگ کرکے خوش ہوتی ہو۔ اس کا تماشا دیکھتی ہو۔"

یہ بات کسی اور نے کہی ہوتی تو عارفہ اس سے لڑپڑتی لیکن میری بات وہ کسی نہ کسی طور برداشت کرگئی۔ کچھ دیر گہری سوچ میں کھوئی رہی پھر بولی۔

"میں نے کبھی جان بوجھ کر تو ایسا نہیں کیا۔ ویسے میرا ذاتی خیال ہے کہ بندے کو تھوڑی بہت تکلیف برداشت بھی کرنا چاہیے۔ تکلیف جھیلنا ایک فطری عمل ہے جب کہ پین کلر کھانا ایک اکتسابی فعل ہے۔"

میں نے کہا "کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ ڈاکٹر عارفہ کے اندر ایک سائیکالوجسٹ گھسی بیٹھی ہے۔"

وہ کہیں کھو سی گئی پھر آہستگی سے بولی "اچھا کبھی تمہیں بتاؤں گی' اس بارے میں بھی۔"

"یعنی کوئی بات ہے اس کے پیچھے۔"

"کس کے پیچھے۔"

"تمہاری اس اذیت پسندی کے پیچھے۔"

"نہیں تم اسے اذیت پسندی تو نہ کہو۔ ہاں ایک رویّہ ہے۔"

اس واقعے کے کوئی دو ہفتے بعد ایک روز جب ہم رات کی ڈیوٹی پر تھے اور دونوں وارڈز میں کوئی بھی "بے آرام" مریض نہیں تھا ہمارے درمیان پھر اسی موضوع پر بات چھڑ گئی۔ میں نے عارفہ کو یاد دلایا کہ وہ مجھے ایک واقعہ سنانے والی تھی۔ اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور ماضی کی دھند میں کھو گئی پھر اس نے کہانی سنانے والے انداز میں بولنا شروع کیا۔

"یہ آج سے قریباً چار سال پہلے کی بات ہے۔ میں ہاؤس جاب کر رہی تھی .... پروفیسر ڈاکٹر افتخار عثمانی ہمارے شعبے کے انچارج تھے۔ تمہیں معلوم ہی ہوگا کہ وہ ایک اچھے ڈاکٹر ہونے کے علاوہ ایک بہت اچھے انسان بھی ہیں۔ سماجی خدمت کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ وہ ان دنوں اکثر ایسے پروگرام ترتیب دیتے رہتے تھے کہ ہم میڈیکل اسٹاف کے لوگ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹ کر دیہی علاقوں میں چلے جاتے اور عام لوگوں کا طبّی معائنہ کرتے۔ خاص طور پر بچوں پر توجہ دی جاتی تھی۔ کبھی کبھی اسی طرح حفاظتی ٹیکے بھی لگانے کا پروگرام بھی ترتیب دیا جاتا تھا۔

ایک ایسے ہی موقع پر ہم چند ڈاکٹر لاہور سے ساٹھ ستر میل دور جڑانوالہ کے علاقے میں پہنچے۔ یہ جولائی اگست کے دن تھے۔ دوسرے تیسرے روز بارش بھی ہو جاتی تھی۔ ہم بارش سے بچنے کے انتظامات سے لیس ہو کر آئے تھے۔ چھتریاں' رین کوٹ' فل بوٹ وغیرہ ہمارے پاس تھے لیکن پختہ سڑک سے کم از کم پانچ کلو میٹر دور باغ پور نامی گاؤں کے نزدیک ہمیں جس آفت نے گھیرا وہ بارش نہیں تھی... مطلع ابر آلود ضرور تھا اور ہلکی ہلکی پھوار بھی پڑ رہی تھی لیکن جو کچھ ہوا' وہ قطعی غیر متوقع تھا۔ ہمیں کچھ دیہاتی دھان کے کھیتوں میں بھاگتے اور چیخ پکار کرتے نظر آئے پھر ایک سرپٹ بھاگتے تانگے سوار نے ہمیں بتایا کہ راوی دریا کا حفاظتی پشتہ ٹوٹ گیا ہے اور پانی کا سیلابی ریلا بڑی تیزی سے اس طرف آ رہا ہے ..... ہمارے اوسان خطا ہو گئے۔ اس قسم کی صورتِ حال سے کبھی ہمارا پالا نہیں پڑا تھا۔ ہمارے گروپ میں تین مرد اور دو لڑکیاں تھیں جن میں ایک میں تھی۔ میری ساتھی کا نام تابندہ تھا اور وہ خاصی نازک مزاج واقع ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں اور اس نے باقاعدہ آنسو بہانے شروع کر دیے۔ ہم پیدل تھے۔ ہماری جیپ قریباً دو کلو میٹر پیچھے ایک زمیندار کے ڈیرے پر کھڑی تھی۔ ہم نہ آگے جا سکتے تھے' نہ پیچھے دوڑ سکتے تھے پھر ہمیں جلد ہی ایک پر ہول گونج سنائی دی۔ یہ سیلابی ریلے کی گونج تھی۔ ہم قدرے نشیب میں تھے۔ سیلابی ریلا خوف ناک تیزی سے ہماری طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ بھیانک منظر ابھی تک میرے ذہن پر نقش ہے۔ سرخی مائل پانی کی لہریں تھیں جو نشیب و فراز کو ایک کرتی ہماری طرف بڑھی چلی آ رہی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے کمزور درخت پانی کی پہلی ہی ضرب سے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے اور کھیتوں کی سبز رنگت پانی کی سرخی میں گم ہوتی چلی جا رہی تھی۔ ہم ایک قدرے بلند جگہ کی طرف بھاگے۔ کھیتوں کے درمیان یہ ایک قدرتی ٹیلہ سا تھا لیکن ابھی ہم ٹیلے سے سوڈیڑھ سو گز دور ہی تھے کہ پانی نے کسی عفریت کی طرح ہمیں آ لیا۔ میں جانتی تھی کہ تابندہ کو بالکل تیرنا نہیں آتا۔ میں نے اسے اپنے ساتھ چمٹا لیا۔ اس کے بعد کچھ پتا نہیں چلا کہ کیا ہوا۔ تابندہ تو اناڑی تھی ہی' میری تیراکی بھی دھری کی دھری رہ گئی۔ سرکش پانی نے ہمیں اٹھایا اور تنکے کی طرح اپنے ساتھ بہانے لگا۔ وہ ایک ڈراؤنا خواب سا تھا۔ اس ڈراؤنے خواب میں مجھے بس ایک ہی بات یاد رہی کہ میں نے تابندہ کو مضبوطی سے تھام رکھا ہے اور اس کے ساتھ بہتی جا رہی ہوں۔

جب ذرا ہوش آیا تو میں نے خود کو کسی گیلی سطح پر لیٹے پایا۔ میرے چاروں طرف ابھی تک پانی کا شور موجود تھا۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر دیکھا' تابندہ مجھ سے تھوڑے فاصلے پر موجود تھی۔ اس کے لمبے بال ایک جھاڑی میں الجھے ہوئے تھے اور نچلا دھڑ پانی میں تھا۔ وہ بے ہوش تھی۔ میں تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔ تابندہ کے بال جھاڑی سے چھڑائے اور اسے کھینچ کر پانی سے باہر نکالا۔ یہ پختہ اینٹوں کا بنا ہوا ایک چبوترا سا تھا۔ ماہ و سال کی گردش نے اسے خستہ حال کر دیا تھا۔ یہاں دو تین قبروں کے مٹے مٹے نشانات بھی تھے۔ اس شکستہ چبوترے کو چاروں طرف سے جھاڑ جھنکاڑ نے گھیر رکھا تھا۔

میں نے تابندہ کو فوری طور پر طبّی امداد دی۔ اس کے پیٹ سے پانی نکالا اور اس کے سانس بحال کی۔ تھوڑی دیر بعد اس کی پلکوں میں جنبش پیدا ہونے لگی۔ یہی وقت تھا جب مجھے احساس ہوا کہ چبوترے پر ہمارے علاوہ کوئی اور بھی موجود ہے۔ یہ ایک لحیم شحیم شخص تھا۔ چبوترے پر اوندھے منہ پڑا تھا اور ہولے ہولے کراہ رہا تھا۔ اپنے لباس اور حلیے سے وہ مقامی نظر آتا تھا۔ اس کے بال گھونگریالے تھے۔ ایک کان میں چاندی کی چھوٹی سی بالی تھی۔ اس کے سر سے بہنے والا خون نانک چندی اینٹوں کو بھگو رہا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے بائیں کندھے سے بھی خون رس رہا تھا۔

تابندہ ہوش میں آ گئی تھی۔ میں جلدی سے اس شخص کے

پاس پہنچی۔ اسے دو تین بار پکارا تو وہ کراہتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ اب میں اس کی صورت دیکھ سکتی تھی۔ وہ ستائیس اٹھائیس سال کا تھا۔ جسم بھرا بھرا تھا۔ سینے اور بازوؤں پر کالے سیاہ بال تھے۔ تومند گردن اور جبڑوں کی ساخت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مضبوط اعصاب کا مالک ایک سخت جان شخص ہے۔ خون اس کے سر سے بہہ رہا تھا لیکن وہ کندھے کی تکلیف کو زیادہ شدت سے محسوس کررہا تھا۔ اس نے اپنے داہنے ہاتھ سے کندھے کو تھاما ہوا تھا اور اس کا رنگ فق ہورہا تھا۔

میں نے پوچھا "تم کون ہو؟"

وہ کراہتے ہوئے بولا "ملک امین کے ڈیرے پر کام کرتا ہوں۔"

"یہ چوٹ کیسے لگی؟" میں نے پوچھا۔

"پانی کا شور سن کر میں ملک کی گھوڑی کھولنے ڈھارے میں گیا تھا۔ ایک دم ساری چھت اوپر آن پڑی۔ لوہے کا گارڈر لگا ہے یہاں سر پر اور کندھے پر بھی۔" وہ کراہتے ہوئے بولا۔

"شکر کرو جان بچ گئی۔" میں نے کہا۔

"پتا نہیں کیسے پہنچا ہوں یہاں۔ اللہ ہی جانتا ہے۔"

تکلیف سے بے حال ہو کر وہ ایک بار پھر لیٹ گیا۔ بری طرح کراہتے ہوئے بولا "اور آپ کون ہیں؟"

میں نے کہا "ہم دونوں ڈاکٹر ہیں۔ شہر سے یہاں آئی تھیں۔ حفاظتی ٹیکے وغیرہ لگانے کے لیے۔ ہمارے ساتھ کچھ اور لوگ بھی تھے۔ اللہ کرے وہ بھی خیر خیریت سے ہوں۔"

"اگر تم ڈاکٹر ہو تو میرا کچھ کرو۔ یہ کندھے کی تکلیف میری جان نکال دے گی۔"

میں نے اسے اوندھا لیٹنے کو کہا اور کندھے پر سے اس کی قمیص پھاڑ دی۔ کندھے کے پچھلے حصے میں گہری چوٹ آئی تھی اور یہ پورا حصہ نیلگوں ہورہا تھا۔ کٹ لگنے سے تھوڑا سا خون بھی رس رہا تھا لیکن اصل مسئلہ اندرونی چوٹ کا تھا۔ میں نے کندھے کو ہلایا۔ تو درد نے مضروب کو بے حال کردیا۔ اس نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبالیا اور آنکھیں زور سے بھینچ لی تھیں۔ مجھے اندازہ ہوا کہ کندھے کی پچھلی ہڈی ٹوٹ چکی ہے۔ اس کے علاوہ ریڑھ کی ہڈی کے ساتھ منسلک بالائی پسلیوں پر بھی شدید ضرب آئی تھی۔ سر پر بھی پچھلے حصے میں ہی زخم آیا تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ یہ دونوں شدید چوٹیں آہنی گارڈر کی ایک ہی ضرب کا نتیجہ ہیں۔

میرے گلے میں ایک اسکارف موجود تھا۔ میں نے اس میں سے چند پٹیاں پھاڑیں۔ مضروب کے سر سے بہنے والا خون روکا اور پٹی باندھ دی۔ اس کے بعد ایک پٹی کے ذریعے میں نے اس کا زخمی بازو گلے میں لٹکا دیا اور اسے ہدایت کی کہ وہ بازو کو کم سے کم حرکت دے... تابندہ بھی اب اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ حیرت کی تصویر بنی کبھی میری طرف اور کبھی زخمی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ہم دونوں نے سفید کوٹ پہن رکھے تھے۔ خوش قسمتی سے میرے کوٹ کی ایک جیب میں چند دوائیں محفوظ رہی تھیں۔ ایک وائل کے سوا یہ سب کی سب ٹیبلٹس تھیں۔

○☆○

اگلے چوبیس گھنٹے ہم نے اس شکستہ چبوترے پر گزار دیے۔ وہ چبوترہ درحقیقت ٹھاٹیں مارتے ہوئے سیلابی پانی کے درمیان عافیت اور سلامتی کا ایک چھوٹا سا جزیرہ تھا جہاں ہم تین افراد نے پناہ لے رکھی تھی۔ یہ بالکل ویران جگہ تھی۔ چاروں طرف جہاں تک نگاہ جاتی تھی، پانی ہی پانی نظر آتا تھا۔ اس پانی میں بس کہیں کہیں درختوں کے بالائی حصے دکھائی دیتے تھے یا کھیتوں کے درمیان واقع کسی پختہ کوٹھے کی چھت نظر آتی تھی۔ ایسا ایک تنہا کوٹھا ہم سے قریباً ڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر موجود تھا۔ اس کوٹھے کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ پانی کی گہرائی دس گیارہ فٹ سے کم نہیں ہے۔ جس تیسرے شخص نے ہمارے ساتھ اس شکستہ چبوترے پر پناہ لی تھی اس نے اپنا نام ریاض عرف راجو بتایا تھا۔ وہ درحقیقت ملک امین نامی زمیندار کا کمین تھا۔ اس کے علاوہ زمیندار کے کتوں اور گھوڑوں کی رکھوالی وغیرہ بھی کرتا تھا۔ وہ باغ پور گاؤں میں ہی رہتا تھا۔ باغ پور بھی یقیناً پورے کا پورا پانی میں ڈوب چکا تھا تاہم راجو کو اپنے گھربار کی زیادہ فکر نہیں تھی۔ اس کی بیوی اپنے دو بچوں سمیت کئی ماہ سے روٹھ کر میکے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ گھر میں بس بوڑھا والد تھا۔ راجو کو اس کی فکر نہ ہونے کے برابر تھی۔ فی الوقت اگر اسے کوئی فکر تھی تو وہ اپنے کندھے کی تھی۔ پچھلے چوبیس گھنٹوں میں وہ مسلسل درد سے کراہتا رہا تھا۔ شاید پندرہ منٹ کے لیے بھی اسے نیند نہیں آئی تھی۔

ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس چھوٹے سے ویران "جزیرے" پر ہمیں کب تک رہنا ہے اور کیسے رہنا ہے۔ ہزار ہا قسم کے اندیشے گھیرتے چلے جارہے تھے۔ خاص طور پر تابندہ کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ وہ نازک مزاج اور بڑی حد تک کمزور دل لڑکی تھی۔ کل سے وہ درجنوں مرتبہ چپکے چپکے رو چکی تھی۔ پچھلے چوبیس گھنٹوں میں صرف ایک اہم واقعہ ہوا تھا۔ ہمیں کچھ فاصلے پر ہیلی کاپٹر کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دی تھی۔ اس ہیلی کاپٹر نے باغ پور گاؤں کی جانب دو تین چکر لگائے تھے پھر دھیرے دھیرے اس کی آواز معدوم ہوگئی تھی۔ میری اور تابندہ کی یہ مراد بر نہیں آئی تھی کہ ہیلی کاپٹر اس چبوترے کی طرف سے بھی گزرے گا اور ہم ہاتھ وغیرہ ہلا کر پائلٹ کو اپنی طرف متوجہ کرسکیں گے۔

آج دوپہر سے ذرا پہلے میں نے کچھ فاصلے پر پانی میں کوئی شے تیرتے ہوئے دیکھی تھی۔ دور سے یہ کوئی تھیلا سا نظر آتا تھا۔ یہ تھیلا پانی کے بہاؤ کے ساتھ دھیرے دھیرے چبوترے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے میں وہ چبوترے کے نزدیک آگیا۔ اس کی حرکت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ دس بیس فٹ کی دوری سے گزر

جائے گا۔ یہ بولی تھمین میں لپٹا ہوا ایک پیکٹ تھا۔ یقیناً آج صبح سویرے یہ پیکٹ ہیلی کاپٹر سے گرائے گئے تھے اوران میں سیلاب زدگان کے لیے کھانے پینے کی اشیا تھیں۔ ریاض عرف راجو تو درد سے بے حال پڑا تھا اور مسلسل کراہ رہا تھا۔ اس سے کسی مدد کی توقع نہیں تھی۔ میں نے تابندہ کے ساتھ مل کے ایک جھاڑی سے لمبی شاخ توڑی۔ میں تین چار فٹ تک پانی میں گئی اور شاخ کی مدد سے تھیلے کو چبوترے کے قریب کرلیا۔ اس تھیلے میں بھنے ہوئے چنے، بسکٹ اور دودھ کے پیکٹ تھے۔ یہ خوراک ہم احتیاط سے استعمال کرتے تو دو تین روز کے لیے کافی تھی۔

وہ سارا دن بھی راجو نے سخت بے چینی کے عالم میں گزارا۔ اس کے کندھے کے درد میں بالکل افاقہ نہیں ہوا تھا۔ وہ کافی سخت جان شخص تھا اور میرے خیال میں سخت مزاج بھی تھا لیکن مسلسل درد نے اسے عاجز کر کے رکھ چھوڑا تھا۔ کسی وقت درد ذرا ہلکا ہوتا تو وہ ہم سے چند باتیں کرتا ورنہ اپنی ہی تکلیف سے لڑتا رہتا۔ نہ جانے کیوں یہ شخص مجھے زیادہ اچھا نہیں لگا تھا۔ اس کے چہرے کے خدوخال بتاتے تھے کہ وہ قابلِ بھروسا شخص نہیں ہے۔ اس ویران چبوترے پر طاقت کا توازن سراسر اس کے حق میں تھا۔ اگر اس کی نیت میں کسی طرح کا فتور آجاتا تو ہم دونوں لڑکیاں اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتی تھیں.... اور میں نے ایک دوبار اس کی آنکھوں میں حریصانہ چمک لپکتے ہوئے دیکھی بھی تھی۔ ان لمحوں میں وہ مجھے اس "چبوترے کا ساتھی" نظر نہیں آیا تھا، ایک اجنبی شخص دکھائی دیا تھا۔ نہایت گھنی مونچھوں کے نیچے اس کے بھنچے ہوئے سیاہی مائل ہونٹوں نے غیر ارادی طور پر ایک خاموش دھمکی دی تھی مجھے.... اب پتا نہیں یہ میرا وہم تھا یا حقیقت میں یہ کوئی دھمکی ہی تھی۔

تابندہ کو زخمی راجو پر رہ رہ کر ترس آرہا تھا۔ میرے کوٹ کی جیب میں جو دوائیں پڑی رہ گئی تھیں، ان میں کوئی پین کلر نہیں تھی۔ تابندہ کئی باران ٹیبلٹس کو کھنگال چکی تھی کہ شاید کوئی ایک آدھ گولی درد کش دوا کی نکل آئے لیکن اسے مایوسی ہی ہوئی تھی۔ شام کو جب راجو مسلسل کراہنے لگا تو وہ جھلا کر بولی "عارفہ! کچھ کرو اس کا.... میرا دم گھٹنے لگا ہے۔"

"تم ہی بتاؤ کیا کروں؟" میں نے کہا "اینٹی بائیوٹک گولیاں ہیں وہ دے رہے ہیں اور کیا کرسکتے ہیں۔"

وہ سٹپٹا کر بولی "مجھے اچھی طرح یاد ہے، میں نے دوسری دواؤں کے ساتھ دولسڑان (پین کلر) کے دو پتے بھی لیے تھے۔ اب پتا نہیں وہ تمہارے کوٹ میں ڈالے تھے یا اپنے کوٹ میں۔"

"اپنے ہی میں ڈالے ہوں گے۔" میں نے کہا۔

وہ ایک بار پھر کوٹ کی جیبیں کھنگالنے لگی۔ ایک دم چیخ سنائی دی۔ میں اور تابندہ لپک کر راجو کی طرف گئیں۔ لیٹنے کی کوشش میں اس کے کندھے کو دھچکا لگا تھا اور اس کے درد میں اضافہ ہوگیا تھا۔ ہم اس کے قریب بیٹھ گئیں۔ کندھے کا ورم پہلے سے کم تھا۔ جوڑ میں مومنٹ بھی موجود تھی مگر درد میں افاقہ نہیں تھا۔ دوپہر کو بسکٹ کا جو ڈبا تابندہ نے راجو کو دیا تھا وہ خالی پڑا تھا۔ اب اس کے چہرے پر پھر نقاہت نظر آرہی تھی۔ تابندہ نے اسے بھنے ہوئے چنے دیے۔ وہ چند منٹ میں چبا گیا۔ بعد ازاں دودھ کے دو پیکٹ پی کر اس کے چہرے پر تھوڑی سی رونق نمودار ہوئی۔ اگر اسے درد میں افاقہ ہوتا تو وہ یقیناً گہری نیند سوجاتا لیکن اب تو اونگھ بھی اس کی قسمت میں نہیں تھی۔

"ڈاکٹر، اتنی ساری دوائیں ہیں تیرے پاس۔ ان میں سے کوئی ایک بھی ایسی نہیں جو اس درد کو کم کرسکے۔" وہ جھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔

میں نے کہا "اگر ہوتی تو ہم تجھ سے چھپا کر رکھتے۔"

وہ بولا "یہ ساری دوائیں تھوڑی تھوڑی مجھے کھلا دو۔ ہوسکتا ہے کوئی کام کرجائے۔"

میں نے کہا "کام تو کوئی نہ کوئی ضرور کرے گی.... لیکن الٹا کام کرے گی۔ تم ہمیں صلواتیں سناؤ گے کہ جو تھوڑا بہت سکون تھا، وہ بھی غارت ہوگیا ہے۔"

"سکون کس بدبخت کو ہے۔" وہ کراہتے ہوئے بولا۔

وہ ساری رات بھی ہم نے کسی مدد کے انتظار میں سوتے جاگتے گزار دی۔ اگلا دن بھی گزر گیا۔ پانی کی سطح ذرا سی نیچی ہوئی تھی مگر اس کے ساتھ ہی بارش بھی شروع ہوگئی تھی۔ ایک دوبار پھر ہیلی کاپٹر کی دور افتادہ آواز سنائی دی تھی پھر ایک مرتبہ باغ پور گاؤں کی جانب موٹر لانچ کے انجن کا مدھم شور سنائی دیا تھا مگر یہ آوازیں ہمارے لیے کوئی "مدد" نہیں لاسکی تھیں۔ بارش سے ہمارے لباس بھیگ کر بدن سے چپک گئے تھے۔ راجو کے سامنے جاتے ہوئے بھی جھجک محسوس ہوتی تھی مگر کچھ بھی تھا، رہنا تو اسی مختصر سے چبوترے پر تھا۔ یہیں اٹھنا بیٹھنا تھا، یہیں لیٹنا تھا، یہیں سونا تھا۔

یہ تیسری رات کا واقعہ ہے۔ میں اپنا سفید کوٹ نیچے بچھا کر لیٹی ہوئی تھی۔ چاروں طرف تاریکی کا راج تھا۔ ستاروں کی مدھم روشنی میں دور تک ٹھاٹیں مارتے ہوئے پانی کی چمک نظر آتی تھی۔ جھاڑیوں کے پس منظر میں جھینگروں کا شور جیسے خاموشی ہی کا حصہ بن چکا تھا۔ تابندہ میرے قریب ہی سو رہی تھی۔ دس بارہ فٹ کی دوری پر راجو نیم دراز تھا۔ وہ شاید اونگھ رہا تھا لیکن اس حالت میں بھی اس کے گلے سے کراہنے کی آواز "ہوں ہوں" کی صورت میں نکل رہی تھی۔

نیند سولی پر بھی آجاتی ہے لیٹے لیٹے میں بھی نیند کی آغوش میں چلی گئی۔ میں دیر تک سوئی۔ رات کسی پہر میری آنکھ کھلی۔ چاند کی مدھم روشنی نظر آرہی تھی۔ تابندہ میرے سرہانے بیٹھی تھی۔ اس کے لمبے بال ایک شانے پر آبشار کی طرح گر رہے تھے۔ تابندہ نے ہی میرا شانہ جھنجوڑ کر مجھے جگایا تھا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے جلدی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

وہ خاموش نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔ اس کے چہرے پر ناراضگی کی جھلک تھی۔ "کیا بات ہے تابندہ۔" میں نے اپنا سوال دہرایا۔

"تم نے جھوٹ کیوں بولا؟"

"کیسا جھوٹ؟"

"یہی کہ تمہارے پاس پین کلرز نہیں ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

تابندہ نے اپنی مٹھی کھولی۔ اس میں درد کش دوا وولٹران کے دو پتے موجود تھے۔ "یہ میں نے تمہارے کوٹ کی اندر کی جیب سے نکالے ہیں۔" تابندہ نے کہا۔

میں چند لمحے خاموش رہی پھر چبوترے کی نیم پختہ دیوار سے ٹیک لگائی "ہاں میں مانتی ہوں کہ میں نے ان گولیوں کے بارے میں غلط بیانی کی تھی۔"

"لیکن کیوں؟ کیوں تم نے اتنی سنگ دلی کا ثبوت دیا۔ یہ شخص تین دن سے سخت درد میں مبتلا ہے۔ ایک ڈاکٹر ہوتے ہوئے اور سب کچھ جانتے ہوئے بھی تم نے اس کی مدد نہیں کی۔"

میں نے کہا "تابندہ! تم بہت نرم مزاج اور سیدھی سادی لڑکی ہو لیکن یہ دنیا بہت ٹیڑھی ہے۔"

"تم کس ٹیڑھے پن کی بات کررہی ہو۔"

"میں انسان کے اندر کے ٹیڑھے پن کی بات کررہی ہوں۔ تمہیں معلوم ہوگا کہ میں نے تھوڑی بہت نفسیات بھی پڑھی ہے۔ اس روسے میں کسی بھی اجنبی کو تم سے زیادہ جان سکتی ہوں۔"

"تم کہنا کیا چاہ رہی ہو؟"

"نفسیات ہمیں بتاتی ہے کہ بعض حالات میں انسانی جبلتیں شدت سے بیدار ہوتی ہیں اور بعض حالات میں وہ نیم جان ہوکر سوجاتی ہیں۔ جیسے خوف میں غصہ نہیں آتا' نفرت میں پیار نہیں ہوتا... میں تمہیں ایک آسان اور حسب حال مثال دیتی ہوں۔ عورت کی طرف مرد کا رجحان ایک جبلت ہے لیکن شدید بھوک اور جسمانی تکلیف کی شکل میں یہ جبلت بیدار نہیں ہوتی۔ ایک بھوک سے نڈھال مرد' حسینۂ عالم کو نظرانداز کرکے روکھی سوکھی روٹی میں دلچسپی ظاہر کرے گا۔ اسی طرح جسمانی تکلیف میں مبتلا شخص کے لیے بھی جنس کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ وہ اس کے لیے ایک بے کار چیز ہے۔ بقول کسے' جان ہے تو جہان ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب تم میری بات کچھ کچھ سمجھ رہی ہو.... یہ شخص ہمارے لیے اجنبی ہے لیکن اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کچھ زیادہ اچھے کردار کا مالک نہیں۔ اس تنہا مقام پر اگر اس کی نیت میں فتور آجائے تو ہم دونوں مل کر بھی اس کی مزاحمت نہیں کرسکتیں لیکن اس کی جسمانی تکلیف نے اس کو زنجیر کر رکھا ہے۔ اس کی خواہشات درد میں دبی ہوئی ہیں یا یوں کہنا چاہیے کہ اپنی تکلیف کے علاوہ اس کا دھیان کسی اور طرف جاتا ہی نہیں۔"

ایک لمحے توقف کرکے میں نے کہا "میں یقین سے کہتی ہوں تابندہ کہ اگر یہ شخص تکلیف کے شکنجے میں نہ ہوتا تو اس ماحول میں اس کا ذہن اسے ضرور بھٹکا دیتا۔ یہاں ہماری فریاد سننے والا کون تھا۔ اس کا ایک بھرپور تھپڑ مجھے یا تمہیں بے ہوش کرنے کے لیے کافی تھا۔"

میں نے تابندہ کے تاثرات سے اندازہ لگایا کہ وہ میرے خیالات سے اتفاق کررہی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک طرح کی پریشانی بھی اس کے چہرے سے مترشح تھی۔ میں نے اسے غور سے دیکھ کر پوچھا "کیا بات ہے' تم کچھ پریشان لگ رہی ہو۔"

وہ بولی "اگر تمہاری باتیں درست ہیں تو پھر تھوڑی سی گڑبڑ ہوگئی ہے مجھ سے۔"

"کیا مطلب؟"

"میں نے تمہارے سونے کے بعد اسے وولٹران کی دو گولیاں دے دی تھیں۔ وہ ڈھائی تین گھنٹے آرام سے لیٹا رہا ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ پھر دوا مانگ رہا تھا۔ میں نے دو گولیاں مزید کھلا دی ہیں۔" میں نے وولٹران کے پتے دیکھے۔ تابندہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ ایک پتے میں چار گولیاں موجود نہیں تھیں۔

مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ راجو کی مسلسل "ہوں ہوں" سنائی

نہیں دے رہی تھی۔ مدھم چاندنی میں' میں نے غور سے دیکھا۔ وہ بڑے سکون کے ساتھ ایک پتھر سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا۔ تیز اثر دوا نے اسے وقتی طور پر درد سے بالکل بیگانہ کر دیا تھا۔ نہ جانے کیوں پہلی بار راجو کو دیکھ کر مجھے اپنے جسم میں پھریری سی محسوس ہوئی۔ بہرطور میں نے اپنا خوف تابندہ پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے تسلی تشفی کی باتیں ہی کرتی رہیں۔ میں نے تابندہ سے کہا کہ جو ہو چکا' وہ تو ہو چکا لیکن اب آئندہ ہمیں یہ غلطی نہیں دہرانی چاہیے۔ تابندہ کے چہرے پر بدستور خوف کے سائے تھے۔ وہ اپنی غلطی کو محسوس کر رہی تھی اور شاید دل ہی دل میں اپنی "نرم دلی" کو کوس بھی رہی تھی۔ موضوع سے دھیان ہٹانے کے لیے میں نے چند اِدھر اُدھر کی باتیں کیں۔ رات کا آخری پہر ابھی باقی تھا۔ میں اور تابندہ لیٹ گئیں۔ تابندہ کی بے چینی کو محسوس کرتے ہوئے میں نے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ ایک طرح کا خوف خود میرے اپنے دل میں بھی گھر کرتا چلا جا رہا تھا۔

نہ جانے میں کب تک نیم غنودگی کی کیفیت میں رہی۔ غالباً ڈیڑھ گھنٹے تو اس عالم میں گزرے ہی ہوں گے پھر ایک لرزہ خیز چیخ میرا دل دہلا دیا۔ میں تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔ یہ چیخ تابندہ کی تھی۔ میرے بدترین خدشات حقیقت کا روپ دھار چکے تھے۔ راجو کسی درندے کی طرح تابندہ سے چمٹا ہوا تھا۔ وہ اسے جھنجھوڑ رہا تھا۔ اس کے کپڑے پھاڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں تابندہ کی مدد کے لیے بڑھی تو اس نے الٹے ہاتھ کا تھپڑ میرے چہرے پر رسید کیا۔ میں دور جا گری۔ یہاں درخت کی ایک ٹوٹی ہوئی لٹھ نما شاخ میرے ہاتھ آ گئی۔ میں نے اس شاخ سے راجو پر حملہ کیا۔ میرا پہلا وار اس کے سینے پر لگا لیکن دوسرا اس نے بہ آسانی جھک کر بچا لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے صحت مند ہاتھ سے جھٹکا دیا اور شاخ میرے ہاتھ سے چھین لی۔ میں اوندھے منہ پختہ چبوترے پر گری۔ میری ٹھوڑی چبوترے کے کنارے سے ٹکرائی تھی۔ ٹھوڑی کا یہ زخم اسی بھیانک واقعے کی منحوس یادگار ہے۔ راجو نے لاٹھی نما شاخ سے مجھ پر بے دریغ حملہ کیا۔ وہ بالکل پاگل ہو رہا تھا۔ میں نے خود کو بہ مشکل اس کے مہلک وار سے بچایا اور پانی میں چھلانگ لگا دی۔ ساتھ ساتھ میں تابندہ کو پکار رہی تھی اور اس سے کہہ رہی تھی کہ وہ بھی پانی میں چھلانگ لگا دے۔ ان پُرخوف لمحوں میں مجھے یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ وہ بے چاری تیر نہیں سکتی۔ میں سرد پانی میں تیرتی ہوئی چالیس پچاس گز آگے نکل آئی۔ اس وقت مجھے تابندہ کی چیخیں سنائی دیں اور مجھے معلوم ہوا کہ وہ راجو کے شکنجے میں ہے۔ وہ شخص جو تین دن تک رحم طلب نظروں سے ہمیں دیکھتا رہا تھا' اپنی تکلیف سے نجات پانے کے پانچ چھ گھنٹے بعد ہی خود "بے رحم" بن گیا تھا اور ایک بالکل مختلف روپ میں سامنے آیا تھا۔ اب تم اسے میری بزدلی کہو' بے حسی کہو یا کمزوری کہ میں واپس تابندہ کی مدد کو نہ جا سکی۔ اس کی دلدوز چیخیں پانی میں تیر کر مجھ تک پہنچتی رہیں اور میں اس تنہا کوٹھے کی طرف تیرتی رہی جس کی چھت کا کچھ حصہ پانی میں سے دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں کس طرح اس چھت تک پہنچنے میں کامیاب ہوئی۔ میرا جسم شل ہو چکا تھا اور ذہن تاریکی میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ ٹھوڑی سے بہنے والے خون نے میرے کپڑوں کو رنگین کر دیا تھا۔ چھت پر پہنچ کر میں نے ہیجانی انداز میں مدد کے لیے چلانا شروع کر دیا لیکن آس پاس کوئی ہوتا تو پچھلے تین دنوں میں ہمیں نظر کیوں نہ آتا۔ وہاں خاموشی کے سوا اور کچھ نہیں تھا اور اگر کچھ تھا تو وہ میں سننا نہیں چاہتی تھی۔ وہ ایک بے بس لڑکی کی چیخیں تھیں پھر دھیرے دھیرے یہ چیخیں بھی معدوم ہو گئیں۔"

روئداد سناتے سناتے عارفہ کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ اس نے تھوڑی دیر آنسو بہائے پھر اشکبار لہجے میں بولی "اگلے روز دوپہر کے وقت ایک موٹر بوٹ میری مدد کو پہنچی۔ اس میں فوجی سوار تھے۔ میں دھاڑیں مار مار کر رونے لگی اور اپنے مددگاروں کو بتانے لگی کہ ہمارے ساتھ کیا ہوا ہے۔

فوجی جوان چبوترے پر پہنچے۔ چبوترہ خالی تھا۔ تاہم قریب ہی پانی میں تابندہ کی لاش تیرتی ہوئی مل گئی۔ میں وہ منظر ساری زندگی بھول نہ سکوں گی۔ ریاض عرف راجو کو دو گھنٹے بعد ایک قریبی درخت پر سے گرفتار کر لیا گیا۔ وہ تیر کر فرار ہونے کی کوشش میں تھا لیکن زخمی کندھے کی وجہ سے زیادہ دور نہیں جا سکا تھا.... بعد ازاں راجو پر آبروریزی اور قتل کا مقدمہ چلا۔ قریباً دو سال بعد اسے پھانسی کی سزا ہوئی اور وہ اپنے عبرتناک انجام کو پہنچا۔

اپنی روئداد ختم کر کے عارفہ خاموش ہو گئی۔ اس نے اپنا سر گھٹنوں میں چھپا لیا۔ کمرے میں اس کی مدھم سسکیاں گونجنے لگیں۔ میں بھی تادیر گم صم بیٹھی رہی پھر آرتھوپیڈک وارڈ میں موجود کوئی مریض درد سے کراہنے لگا۔ دھیرے دھیرے اس کی آواز بلند ہونے لگی۔ شب کے سناٹے میں یہ آواز دور تک گونج رہی تھی "ڈاکٹر صاحبہ! مجھے درد کا انجکشن لگا دیں۔ ڈاکٹر صاحبہ خدا کے لیے۔ بہت درد ہو رہا ہے ڈاکٹر صاحبہ۔"

نرس مریض کو تسلی دینے کی کوشش کر رہی تھی کیونکہ میری طرح وہ بھی جانتی تھی کہ ڈاکٹر عارفہ اتنی جلدی مریض کی فریاد نہیں سنے گی۔ میں آنسو پونچھ کر تھکے تھکے انداز میں اٹھی اور مریض کے لیے درد کا انجکشن تیار کرنے لگی۔

نفرت کی خاطر محبت کرنے والی معصوم اور پاکباز لڑکی کی کتھا

انوکھا انتقام

طاہر جاوید مغل

محبت اور نفرت دو متضاد کیفیات ہیں۔ محبت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ آفاقی جذبہ ہے جب کہ ذاتی انا اور خود پرستی کے جذبات کا نام نفرت ہے اور اگر ایسی نفرت سے محبت جنم لے تو گویا محب اپنے محبوب کی خاطر اپنی ذات کی نفی کر دیتا ہے۔ اسی حقیقت کو آشکار کرتی محبت بھری نفرت کا پُراثر ماجرا۔

شاہد ملک سے میری دوستی کو صرف دس بارہ گھنٹے ہی ہوئے تھے لیکن مجھے لگتا تھا کہ میں اسے برسوں سے جانتا ہوں۔ وہ ایک خوش لباس اور خوش گفتار شخص تھا۔ ادبی ذوق بھی رکھتا تھا۔ عمر کوئی اٹھائیس برس رہی ہوگی' تاہم اس عمر میں ہی اس نے ترقی کی کئی منازل بڑی تیزی سے طے کی تھیں اور کافی بلندی پر کھڑا تھا۔ سیالکوٹ میں اس کے چار بڑے کارخانے تھے جن میں لیدر جیکٹس قسم کی اشیا بنائی جاتی تھیں اور برطانیہ امریکا وغیرہ میں سپلائی کی جاتی تھیں۔ وہ اتنا کامیاب جا رہا تھا کہ اب پچھلے دو ڈھائی سال سے وہ صرف اور صرف ایکسپورٹ کوالٹی مال بنا رہا تھا۔

ہم دونوں امریکا سے براستہ فرینکفرٹ اور دبئی' لاہور آ رہے تھے۔ میں وہاں ایک سیمینار میں شرکت کے لیے گیا تھا۔ نیویارک سے لاہور تک یہ ایک طویل سفر تھا اور اس میں ایک اچھے اور ہم مزاج ہم سفر کا ہونا ضروری تھا جو شاہد ملک کی صورت میں مجھے مل گیا تھا۔ نیویارک سے فرینکفرٹ تک ہم مسلسل گفتگو میں مصروف رہے تھے اور اب فرینکفرٹ کے شان دار ایر پورٹ پر نرم صوفوں میں دھنسے ہوئے اپنی رابطہ پرواز کا انتظار کر رہے تھے جو دھند کی وجہ سے کچھ لیٹ تھی۔ کہانی کی مجھے ہمیشہ تلاش رہتی ہے۔ کوئی اچھی روداد سنتے ہوئے وقت بہت آسانی سے کٹتا ہے۔ دھیرے دھیرے میں شاہد کو بھی اپنے ڈھب پر لے آیا۔ میں نے کہا ”شاہد صاحب! اپنی زندگی کا کوئی واقعہ سنائیں۔“

وہ مسکرایا ”میں سمجھ رہا ہوں کہ آپ مجھے کس طرف لے جا رہے ہیں۔ میری ابھی تک شادی نہیں ہوئی' اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میرے ساتھ کوئی کہانی نتھی ہے۔“

میں نے بھی مسکراتے ہوئے کہا ”اتنے ہینڈسم اور مال دار نوجوان کے ساتھ کوئی کہانی وابستہ نہ ہو یہ کچھ عجیب سا لگتا ہے۔“

”عجیب لگتا ہے لیکن ناممکن تو نہیں لگتا۔“

”ہاں ناممکن تو کچھ نہیں ہوتا۔“

وہ بولا "چھوٹی موٹی کہانی تو ہر شخص کے ساتھ ہوتی ہے' میرے ساتھ بھی ہے۔ لیکن وہ خاصی مختصر اور غیر دلچسپ ہے۔"

میں نے کہا "ویسے میرا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ آپ ضرور اپنی ہی کہانی سنائیں۔"

"یعنی آپ بیتی کے علاوہ جگ بیتی بھی چل جائے گی۔"

"بالکل چل جائے گی۔"

"تو پھر میں آپ کو ایک ایسی کہانی سنا سکتا ہوں جس کا میں چشم دید گواہ ہوں۔"

"بسرو چشم۔" میں نے کہا۔

شاہد نے دونوں ہاتھ جیکٹ کی جیبوں میں ڈالے اور صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر ذرا نیم دراز سا ہو گیا۔ لاؤنج کے دیوار گیر شیشے سے باہر دسمبر کی دھند آہستہ آہستہ مناظر کو دھندلاتی جا رہی تھی۔ شاہد نے کہنا شروع کیا۔

"عارفہ ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ والد ایک گورنمنٹ اسکول سے ہیڈ ماسٹر ریٹائر ہوئے تھے۔ وہ بی ایڈ کر رہی تھی۔ اس کے بڑے بھائی عثمان نے کمپیوٹر میں ماسٹرز کیا تھا اور ملازمت کی تلاش میں تھے۔ عارفہ اور اس کے بھائی عثمان میں کافی بے تکلفی تھی۔ اپنے بھائی کے دل کی باتیں عارفہ ایسے ہی جانتی تھی جیسے اپنے دل کی باتیں جانتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ بھائی کسی سے ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں' اپنی چاہت کے بغیر زندہ رہنے کا تصور بھی ان کے لیے محال ہے۔ وہ ان کے پڑوس کی ایک لڑکی تھی۔ اس کا نام صنم تھا۔ خوب صورت تھی' پڑھی لکھی تھی۔ یہ لوگ کافی خوش حال تھے۔ علاقے میں ان کی کوٹھی سب سے بڑی اور شاندار تھی۔ گیراج میں دو گاڑیاں بھی کھڑی رہتی تھیں۔ صنم اور عثمان کے تعلق کا آغاز کوئی پانچ برس پیشتر ہوا تھا۔ دونوں گھروں کی چھتوں کے درمیان بس تین چار گھروں کا فاصلہ تھا۔ انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تھا اور پھر روزانہ دیکھنے لگے تھے۔ دھیرے دھیرے یہ تعلق آگے بڑھا۔ پہلے فون پر بات ہوئی پھر ایک دو ملاقاتیں بھی ہوئیں۔ وہ دونوں جانتے تھے کہ ان کا ملاپ آسان نہیں۔ ان کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ حیثیت اور مرتبے ہی کی تھی۔ صنم کے گھر والوں اور خاص طور سے اس کے والد کو اپنی حیثیت و مرتبے کا بہت احساس رہتا تھا۔ بے شک دونوں گھروں کے افراد ایک دوسرے سے ملتے جلتے تھے لیکن امیر اور غریب کے درمیان جو ایک فاصلہ سا ہوتا ہے وہ یہاں بھی برقرار تھا۔ ایک دوسرے کے ہاں کھانا بھیجا جاتا تھا۔ ایک دوسرے کی تقریبات میں شرکت کی جاتی تھی۔ صنم کے والد چوہدری بشیر اور عثمان کے والد ماسٹر اختر صاحب اکثر گھنٹوں بیٹھے باتیں کرتے رہتے تھے' مگر اس قربت میں بھی وہ ایک لکیر سی ضرور موجود رہتی تھی جو امارت کو سفید پوشی سے علیحدہ کرتی ہے۔

عارفہ' صنم کی سہیلی بن چکی تھی۔ کبھی کبھار عارفہ' صنم سے اپنے بھائی کے حوالے سے بھی بات کر لیتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ صنم بھی اس کے بھائی سے بہت محبت کرتی ہے' مگر حالات اور معاشرے سے ٹکرانے کا حوصلہ اس میں نہیں تھا۔ بس موہوم سی امید تھی اس کے دل میں کہ شاید عثمان برسر روزگار ہو کر اپنے حالات کو بہتر بنالے تو اس کے والدین اس رشتے کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو جائیں۔ وہ اکثر عثمان سے کہتی رہتی تھی اور عارفہ کے ذریعے بھی پیغام بھیجتی تھی کہ عثمان جلد از جلد برسر روزگار ہونے کی کوشش کرے۔ ڈھکے چھپے لفظوں میں وہ چاہتی تھی کہ عثمان کا معیار زندگی بلند ہو اور وہ اس کے رشتے کے لیے اس کے والدین سے سر اٹھا کر بات کر سکے۔ اپنے بھائی کی رازداں ہونے کی حیثیت سے عارفہ یہ باتیں بھائی جان کے گوش گزار کر دیتی تھی۔ ایسے موقعوں پر عثمان بس اثبات میں سر ہلا دیتا۔ اس کی آنکھوں میں کرب کروٹیں لیتا اور چہرے پر ڈرے ڈرے سائے لہرانے لگتے۔

اپنے بھائی کے چہرے پر لہراتے ہوئے یہ سائے عارفہ کو ہمیشہ بڑی اذیت پہنچاتے تھے۔ یہ اندیشوں کے سائے تھے' اور ان میں سب سے بڑا اندیشہ صنم کے کھو جانے کا تھا۔ یہ اندیشہ ہمہ وقت عثمان کو دامن گیر رہتا تھا کہ کہیں وہ صنم کو کھو نہ بیٹھے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ گردش دوراں کی تیزی کا ساتھ نہ دے سکے اور وقت کی رفتار صنم کو اڑا کر کہیں سے کہیں لے جائے۔ عارفہ جانتی تھی کہ یہ اندیشہ کسی خونی جانور کی طرح بھائی جان کا پیچھا کیا کرتا ہے۔ اس اندیشے کی خوں خواری سے بچنے کے لیے بھائی جان اپنے ہاتھ میں اپنی ڈگریاں تھامے سارا سارا دن دفاتر کے چکر لگاتے ہیں' نوکریوں کے لیے انٹرویوز دیتے ہیں اور اخباروں میں خالی اسامیوں کے اشتہار ڈھونڈتے ہیں۔ یہ اندیشہ انہیں جلتی ہوئی دوپہروں میں تپتی ہوئی سڑکوں پر برہنہ پا بھگاتا رہتا تھا اور شاید اگر رات کو نیند آتی تھی تو وہ خواب میں بھی بھاگا ہی کرتے تھے۔ ہر صبح ان کی آنکھوں میں عارفہ کو طویل مسافتوں کی تھکن نظر آتی تھی۔

عارفہ کو بھی صنم بہت اچھی لگتی تھی۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ جھٹ پٹ دلہن بنا کر اسے اپنے گھر لے آتی۔ لیکن یہ اس کے بس میں نہیں تھا بلکہ ان کے گھر میں کسی کے بس میں نہیں تھا۔ عارفہ' صنم سے چھ سات برس چھوٹی تھی پھر

بھی وہ صنم سے سہیلیوں کی طرح باتیں کرتی تھی' اور ایک بار یہ باتیں شروع ہوتیں تو گھنٹوں جاری رہتیں۔ ایک عجیب سا انس تھا اسے صنم سے۔ وہ اکثر دل کی گہرائیوں سے صنم اور بھائی جان کے لیے دعا کرتی۔

.... پھر ایک دن اسے پتا چلا کہ صنم کے رشتے کی بات چل رہی ہے۔ عارفہ کے دل پر جیسے غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ایک دن اس نے صنم سے تصدیق چاہی۔ صنم نے پژمردہ لہجے میں کہا "ہاں عارفہ! کچھ ایسی بات سن تو میں بھی رہی ہوں۔"

"پھر اب کیا ہوگا صنم باجی؟"

"میں کیا بتاؤں۔ میری تو خود کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ تمہارے بھائی جان کے اسلام آباد والے انٹرویو کا کیا بنا؟"

عارفہ نے کہا "مجھے تو کچھ نہیں بتایا۔ اگر کچھ بنا ہوتا تو بتا دیتے۔"

"وہ تو اس انٹرویو سے بڑے پر امید تھے۔"

"وہ تو ہر دفعہ ہی بڑے پر امید ہوتے ہیں۔ اب تو یوں لگتا ہے جیسے بس امید ہی رہ جائے گی' باقی سب کچھ چلا جائے گا۔"

صنم سر جھکا کر خاموش ہو گئی تھی' عارفہ بھی چپ رہی تھی۔

عارفہ کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ وہ بھائی جان کو اس بارے میں بتائے۔ چند دن بعد صنم کے رشتے کا معاملہ بھی کچھ ٹھنڈا پڑ گیا۔ لہٰذا عارفہ نے یہ بات اپنے تک ہی رہنے دی۔

ہاں یہ ضرور ہوا کہ وہ بھائی جان پر ملازمت حاصل کرنے کے سلسلے میں زیادہ زور دینے لگی۔ اس کی رائے تھی کہ اگر ملازمت نہیں ملتی تو صرف انتظار کرتے رہنے کے بجائے بھائی جان کوئی ذاتی کام شروع کر دیں۔ ہو سکتا ہے کہ قدرت اسی میں ہاتھ تھام لے۔

لیکن اس مصرعے کے مصداق کہ "الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا...." صنم اور عثمان بھی اپنی محبت کو بے رحم وقت سے نہ چھین سکے۔ کچھ عرصہ تعطل کا شکار رہنے کے بعد صنم کے رشتے کی بات پھر شروع ہو گئی اور پھر آناً فاناً یہ رشتہ طے ہو گیا۔ پہلے منگنی ہوئی اور پھر شادی کے دن مقرر ہو گئے۔ عثمان ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپ تڑپ گیا۔

عارفہ سے اس کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی لیکن وہ کمزور لڑکی کیا کر سکتی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ عثمان بھائی پر جو کچھ بیت رہا ہے وہی کچھ خود اس پر بھی بیت رہا ہے۔ صنم کی منگنی کے بعد وہ ایک روز اس سے ملنے گئی لیکن صنم کے والد اس کے ساتھ بہت رکھائی سے بولے۔ ان کے رویّے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اب اس گھر میں عارفہ کا آنا جانا پسند نہیں کرتے۔ عارفہ دل مسوس کر رہ گئی۔ اس کے بعد وہ کبھی صنم کے گھر نہیں گئی۔ دیگر گھر والوں نے بھی آنا جانا کم کر دیا تھا۔ پھر یہ تعلقات بالکل ہی ختم ہو گئے۔ جس روز صنم کے گھر شہنائیاں بجیں اور اسے کہیں دور لے جانے کے لیے کار سوار دولہا وہاں آیا' عارفہ چھت پر اکیلی بیٹھ کر بہت روئی۔ اتنا روئی کہ آنسو بھی خشک ہو گئے۔

اس روز یا شاید اس سے اگلے روز عارفہ نے ایک عجیب فیصلہ کیا تھا۔ اس جیسا فیصلہ عارفہ جیسی لڑکی ہی کر سکتی تھی۔ یہ ایک نوخیز لاابالی لڑکی کا فیصلہ تھا جو اس نے شدید کرب کا شکار ہونے کے بعد کیا تھا۔ عارفہ نے تہیہ کیا تھا کہ وہ اپنی بے بس غربت کا انتقام کسی کی پُرغرور امارت سے لے گی۔ جس طرح ایک اپر کلاس کی لڑکی نے اس کے غریب بھائی کو ٹھکرایا تھا' وہ بھی کسی اپر کلاس کے لڑکے کو اپنی محبت میں الجھائے گی اور پھر حقارت سے ٹھکرائے گی۔ بظاہر یہ ایک جذباتی فیصلہ تھا لیکن اس کے دل کی گہرائی میں یوں اترا تھا کہ دن بدن پختہ تر ہوتا گیا اور رگِ جاں بن گیا۔ وہ خوب صورت تھی' دلکش تھی۔ اس کا شباب چودھویں کا چاند تھا کہ جوں جوں افق سے ابھر رہا تھا روشن تر ہو رہا تھا۔

○☆○

تین برس گزر گئے اور وہ یونیورسٹی پہنچ گئی۔ وہ یونیورسٹی کی دو تین خوب صورت ترین لڑکیوں میں شمار ہوتی تھی۔

دراز قد، متناسب جسم، لمبے ریشمی بال اور نہایت کالی آنکھیں جن میں سچے موتیوں کی سی چمک تھی۔ عارفہ ابھی تک گلشن آباد کے اسی پانچ مرلے کے مکان میں رہتی تھی۔ اس کے والد ایک سال پہلے دمے کے مرض میں مبتلا ہو کر انتقال کر چکے تھے۔ عثمان بھائی کی شادی خاندان میں ہی ایک معمولی شکل و صورت کی عام سی لڑکی سے ہو گئی تھی۔ یہ کوئی زیادہ کامیاب شادی نہیں تھی، بہرحال گزارہ ہو رہا تھا۔ عثمان اپنی ملازمت کے سلسلے میں کوئٹہ رہتا تھا۔ چند ماہ پہلے وہ اپنی بیوی اور بچے کو بھی کوئٹہ لے گیا تھا۔ کبھی کبھی کوئٹہ سے اس کا فون آتا تھا اور وہ عارفہ سے اس کا حال احوال دریافت کر لیتا تھا۔ درحقیقت بچپن سے ہی وہ اپنا ہر دکھ سکھ عارفہ کے ساتھ شیئر کرتا تھا۔ عارفہ کی ایک بڑی بہن کی شادی ہو چکی تھی، دوسری کے رشتے کی بات چل رہی تھی۔ عارفہ کے والد دو دکانیں ترکے میں چھوڑ گئے تھے۔ ان دکانوں کا کرایہ آتا تھا، کے علاوہ تھوڑی بہت پنشن بھی تھی۔ جیسے تیسے گھر کی گاڑی چل رہی تھی۔ کبھی کبھار عثمان بھی کچھ رقم بھیج دیتا تھا۔

یونیورسٹی جانے کے چند ماہ بعد سہراب نامی ایک لڑکے سے عارفہ کا افیئر شروع ہوا سہراب بلاشبہ یونیورسٹی کے گنے چنے لڑکوں میں سے تھا۔ مالی حیثیت کے حوالے سے دیکھا جاتا تھا تو وہ یونیورسٹی کا امیر ترین لڑکا تھا۔ "ایس ایم انڈسٹریز" میں اس کی فیملی کے شیئر تیس فی صد سے زائد تھے۔ یہ ماڈرن گھرانا کافی پڑھا لکھا بھی تھا۔ سہراب، عارفہ کی زلفوں کا اسیر ہوا تو جیسے باقی ہر چیز بھول گیا۔ وہ ہمہ وقت عارفہ کے اردگرد منڈلاتا نظر آتا۔ اسے خوش کرنے کا، اس سے نزدیک ہونے کا کوئی موقع وہ ہاتھ سے جانے نہ دیتا۔

ایک روز یونیورسٹی کے کیفے ٹیریا میں وہ دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ پھولوں اور تتلیوں کی باتیں، موسموں اور رنگوں کی باتیں، خوب صورت فلموں اور کتابوں کی باتیں۔ سہراب نے اردگرد دیکھا پھر عارفہ کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے بولا "عارفہ! میں تمہیں اپنی والدہ سے ملانا چاہتا ہوں۔ وہ تم جیسی نفیس اور خوب صورت لڑکی سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔"

عارفہ شوخی سے مسکرائی "یہی بات اس سے پہلے کتنی لڑکیوں سے کہہ چکے ہیں۔"

سہراب کے چہرے پر ایک دم سنجیدگی دوڑ گئی۔ وہ گہری سانس لے کر بولا "عارفہ! پلیز میری محبت کی توہین مت کرو۔ میں یہ تسلیم کر چکا ہوں اور اب بھی کرتا ہوں کہ ماضی میں لڑکیوں سے میری دوستیاں رہی ہیں لیکن تم مجھ سے بڑی سے بڑی قسم لے سکتی ہو، تم سے ملنے کے بعد سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔

اب صرف تم ہو اور تم ہی رہو گی۔"

وہ زیر لب مسکرائی "سوچ لیں، میرے اور آپ کے درمیان اسٹیٹس کی اونچی دیوار حائل ہے۔ فی الحال آپ کا رویہ جذباتی ہے، آپ کو یہ دیوار نظر نہیں آ رہی، مگر دوسرے سب لوگ تو یہ دیوار دیکھ رہے ہیں۔ خاص طور سے آپ کے اہل خانہ، میری اور آپ کی مختلف حیثیتوں کو کیسے نظرانداز کر سکتے ہیں۔ آپ کے والدین کسی ہم مرتبہ گھرانے کی دلہن لانا چاہتے ہوں گے، دیگر اہل خانہ کے دل میں بھی معلوم نہیں کیا کیا ارمان ہوں گے۔"

سہراب نے بے تابی سے عارفہ کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا "عافی! ہمارے درمیان یہ باتیں پہلے بھی ہو چکی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ ہماری حیثیتوں میں فرق ہے لیکن اگر پیار ایسے فرق نہ مٹا سکے تو پھر وہ پیار ہی کیا ہے۔ میں یہ فرق مٹا کر دکھاؤں گا اور ثابت کروں گا کہ ہم صرف دو انسان ہیں جو ایک دوسرے کو دل کی گہرائیوں سے چاہتے ہیں۔"

اس قسم کی باتیں سہراب اکثر کیا کرتا تھا اور کبھی کبھی یہ باتیں عارفہ کو اچھی بھی لگتی تھیں لیکن وہ تہیہ کر چکی تھی کہ ان باتوں کو دل میں جگہ ہرگز نہیں دے گی۔ وہ خود سے کیے گئے عہد کو کبھی نظرانداز نہیں کرے گی..... کسی بھی حال میں ..... کسی بھی وجہ سے۔ اور خود سے کیا ہوا عہد یہ تھا کہ جیسے ایک امیر گھرانے نے اس کے سفید پوش بھائی کی جھولی میں زندگی بھر کا دکھ ڈالا تھا۔ وہ بھی کسی امیر گھرانے کی شان کو ٹھکرائے گی اور ان کے دلوں کو کبھی ختم نہ ہونے والی کسک دے گی۔ بے شک سہراب خوب صورت اور پرخلوص باتیں کرتا تھا لیکن ایسی باتیں تو صنم اور عثمان بھائی کے درمیان بھی بہت ہوئی ہوں گی۔ صنم نے بھی چاندی کی دیواروں کو توڑنے کی بات کی ہو گی، سماجی رکاوٹوں کو پھلانگنے کا عزم کیا ہو گا۔ لیکن ہوا کیا؟ جب فیصلہ کن مرحلہ آیا تو وہ بتدریج اپنے آپ میں سمٹتی چلی گئی۔ اس نے محبت کے کانٹوں بھرے راستے پر چلنے کے بجائے پھولوں بھرے راستے کا انتخاب کر لیا۔ مصلحتوں کو اپنی مجبوریوں کا نام دے دیا اور اپنے اہل خانہ کے ساتھ شانے سے شانہ ملا کر کھڑی نظر آئی۔ ثروت مندی اور مفلسی کے درمیان موجود ازلی خلا کو اس نے بھی تہ دل سے تسلیم کر لیا۔

وقت گزرتا رہا اور اس کے ساتھ ساتھ عارفہ اور سہراب کا تعلق بھی پروان چڑھتا رہا۔ پچھلے ایک برس میں سہراب نے خود کو حیرت انگیز طور پر بدلا تھا۔ تمام بری عادات ایک ایک کر کے چھوڑ دی تھیں۔ اب کسی لڑکی کے ساتھ بھی اس کی بات سننے میں نہیں آئی تھی۔ اس نے خود کو

ایک ایسے سانچے میں ڈھالنا شروع کردیا تھا جس میں عارفہ اسے دیکھنا چاہتی تھی' یا ظاہر کرتی تھی کہ دیکھنا چاہتی ہے۔ اس نے بے فکرے دوستوں سے دور رہنا شروع کردیا تھا۔ دولت کی بے جان نمود و نمائش میں بھی نمایاں کمی واقع ہوگئی تھی' اس کے علاوہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ اپنی تعلیم پر بھی توجہ دیتا ہے۔ عارفہ کے دل میں جگہ بنانے کے لیے اس نے عارفہ کے ایک دو نجی مسائل حل کرنے میں بھی مدد کی تھی۔

عارفہ جانتی تھی کہ سہراب نے یہ سب کچھ اسی کی خاطر کیا ہے' وہ بظاہر ان تبدیلیوں کی ستائش کرتی تھی لیکن حقیقتاً اس کے دل میں اب بھی سہراب کے لیے کوئی نرم گوشہ نہیں تھا۔ وہ ان تبدیلیوں کو کسی اور پہلو سے دیکھتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ سہراب کی محبت کی شدت صرف اس وجہ سے برقرار ہے کہ اسے محبت کا خاطر خواہ جواب نہیں ملتا۔ جس طرح ناقابل تسخیر قلعوں کو فتح کرنے کے لیے افواج زیادہ جوش و خروش کا مظاہرہ کرتی ہیں اور زیادہ قربانیاں دینے پر آمادہ ہوجاتی ہیں' اسی طرح سہراب بھی اسے تسخیر کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا تھا۔ وہ ایک دو مرتبہ عارفہ کو اپنے گھر والوں سے بھی ملا چکا تھا۔ اس کے والدین خوش اخلاق اور ملنسار تھے۔ بہن بھائی بھی تعلیم یافتہ اور نہایت شائستہ تھے لیکن عارفہ جانتی تھی کہ طبقۂ اشراف نے یہ شائستگی اور نرم روی اپنے چہروں پر نقاب کی طرح چڑھا رکھی ہوتی ہے۔ اگر وہ عام طبقے کے لوگوں سے جھک کر ملتے ہیں تو صرف اس لیے کہ وہ خود کو بہت قد آور سمجھتے ہیں اور یوں ان کی خوش خلقی اور انکساری بھی تکبر کا ایک روپ بن جاتی ہے۔ صنم کے والدین بھی تو ان لوگوں کے ساتھ بڑی خوش اخلاقی سے پیش آتے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ اجنبی نہیں ان کے خونی رشتے دار ہیں۔ مگر ان سے قریب ہونے کے باوجود وہ ان سے بہت دور کھڑے تھے۔ بہت دور اور بہت اوپر.... دوری مٹانا تو ناممکن نہیں ہوتا لیکن بلندی تک پہنچنا بے حد دشوار ہوتا ہے۔ ایک ایسا شخص جو دولت کے پر لگا کر ہوا میں معلق ہو اس تک ایک بے مایہ شخص کیونکر پہنچ سکتا ہے اور اگر کسی طرح پہنچ بھی جائے تو ہمیشہ اس کے زمین پر پٹخے جانے کا خطرہ موجود رہتا ہے۔

سہراب کی ایک بھتیجی پارو جو عارفہ سے کچھ ہی چھوٹی تھی' عارفہ کی دوست بن گئی۔ ایک عید کے موقع پر وہ عارفہ سے ملنے اس کے گھر آئی۔ وہ عید کیک لائی تھی۔ دو تین گھنٹے وہ عارفہ کے ساتھ موجود رہی۔ وہ عارفہ کے گھر والوں سے گھل مل گئی۔ باتوں باتوں میں وہ عارفہ کو چھیڑتی بھی رہی "آپ اتنی اچھی ہیں کہ اگر میں لڑکا ہوتی تو ضرور آپ پر عاشق ہوجاتی۔ پھر میرے اور چچا سہراب کے درمیان خوں ریز لڑائی ہوتی۔ جو بچ جاتا وہ آپ کو اڑا لے جاتا۔"

عارفہ مسکرائی "میرے خیال میں تو خوں ریز لڑائی کی نوبت نہیں آنی تھی۔ تمہارے چچا نے تمہارے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر خاموشی سے پسپا ہوجانا تھا۔ چند ہفتے بعد میرے جیسی تمام خوبیاں انہیں کسی اور لڑکی میں نظر آسکتی تھیں۔ وہ کیا کہتے ہیں یہ مرد حضرات.... تو نہیں اور سہی' اور نہیں اور سہی۔"

"حیرت ہے کہ اتنے لمبے ساتھ کے باوجود آپ انکل سہراب کو ٹھیک سے سمجھ نہیں پائیں۔ اوہ میں کیسے سمجھاؤں آپ کو.... بائی گاڈ وہ جان دیتے ہیں آپ پر۔ ہی از ریئلی سیریس اباؤٹ یو۔ وہ آپ کے لیے آہستہ آہستہ گھر والوں کو راضی کر رہے ہیں اور اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو گرینڈ ما تو مکمل طور پر راضی بھی ہو چکی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ ایک دو ہفتے تک آپ کے گھر بھی آئیں۔"

کبھی کبھی سہراب اور اس کے گھر والوں کا پیار دیکھ کر عارفہ کا دل لرز جاتا تھا لیکن اس کا ارادہ اس کے دل سے کہیں زیادہ مضبوط تھا۔ اس اداس شام کو جب پڑوس کے گھر میں شہنائیاں گونج رہی تھیں' عارفہ نے اپنے آپ سے ایک عہد کیا تھا۔ گزرے ماہ و سال کے باوجود یہ عہد آج بھی روزِ اوّل کی طرح عارفہ کے سینے پر نقش تھا۔ وہ مر تو سکتی تھی مگر اس عہد کو فراموش نہیں کرسکتی تھی۔ اب قدرت نے یہ عہد بہترین طریقے سے نبھانے کا اسے ایک بہترین موقع عطا کیا تھا۔ سہراب ویسا ہی لڑکا تھا جیسا وہ چاہتی تھی۔ یہ ویسا ہی گھرانا تھا جیسا اس کے انتقام کے لیے ضروری تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے انتقام سے کسی کا بھلا نہیں ہوگا۔ حیثیتوں اور مرتبوں کا فرق اسی طرح برقرار رہے گا۔ ایک ہی آدم کی اولاد ہونے کے باوجود باحیثیت لوگ ہمیشہ کم حیثیت لوگ کو روندتے رہیں گے۔ کھلونا سمجھ کر ان کے دلوں سے کھیلتے رہیں گے۔ اس جیسی لڑکیاں اور عثمان بھائی جیسے لڑکے اسی طرح سماجی ناہمواریوں کی بھینٹ چڑھتے رہیں گے۔ ٹھیک ہے کچھ نہ ہوگا' لیکن اتنا تو ہوگا کہ اس کا اپنا سینہ ٹھنڈا ہوجائے گا۔ اس جان لیوا ٹھیس کا مداوا ہوجائے گا جو اس اداس شام کو عارفہ کی انا کو لگی تھی اور چھت پر بیٹھے بیٹھے اس کی آنکھوں میں خون کے آنسو اتر آئے تھے۔ عارفہ کے انتقام کا نشانہ بننے والی صنم نہیں تھی اور نہ اس کا بہت مغرور باپ تھا لیکن تھا تو اسی اپر کلاس کا نمائندہ جو زمین پر ہوتے ہوئے بھی خود کو آسمان پر سمجھتے ہیں۔ اس نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ جس دن وہ سہراب کو حقارت سے ٹھکرائے گی اس روز وہ اپنے

پیارے بھائی جان کو کوئٹہ کے ایڈریس پر ایک طویل خط لکھے گی اور اس خط میں سارا ماجرا بلا جھجک بیان کر دے گی۔ انہیں بتائے گی کہ اس نے اپنے لیے ایک امیر گھرانے کا رشتہ اسی طرح ٹھکرایا ہے جس طرح ایک امیر لڑکی کے لیے ان کا رشتہ ٹھکرایا گیا تھا۔

وہ اس وقت کا انتظار کرنے لگی جب سہراب باقاعدہ طور پر اس سے شادی کا خواہش مند ہو اور اسے یقین تھا کہ بہت جلد ایسا ہونے والا ہے۔ سہراب اپنی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک لے کر اس کے سامنے اپنا دست سوال پھیلانے والا ہے۔ وہ اس لمحے کا انتظار کر رہی تھی تاہم کبھی کبھی اس لمحے کے بارے میں سوچ کر کانپ بھی جاتی تھی۔ بے شک وہ سہراب سے محبت نہیں کرتی تھی لیکن ایک قسم کا لگاؤ تو طویل رفاقت نے پیدا کر ہی دیا تھا اور اس لگاؤ سے بھی اہم عارفہ کے لیے سہراب کے اہل خانہ تھے۔ وہ عارفہ کو پسند کرتے تھے، اس سے مل کر خوش ہوتے تھے۔ جس لمحے عارفہ نے سہراب کو ٹھکرانا تھا اس لمحے یقیناً ان سب لوگوں کو بھی بے حد مایوسی ہونا تھی۔ جب عارفہ اس انداز سے سوچتی اور اس کے دل میں ہلکا سا گداز پیدا ہوتا تو وہ فوراً اس بیکراں درد و کرب کو یاد کرنے لگتی جو چند سال پہلے "اپر کلاس" کی طرف سے "لوئر کلاس" کے ایک لاچار نوجوان کی جھولی میں ڈالا گیا تھا۔ اس کا دل پھر سے پتھر کی طرح سخت ہو جاتا۔

کسی وقت عارفہ کو واضح طور پر محسوس ہوتا کہ وہ ایب نارمل انداز میں سوچ رہی ہے ایک گھرانے کے غلط رویے کے سبب وہ پورے ایک طبقے سے بدظن ہو رہی ہے، مگر وہ اپنے دل کا کیا کرتی وہ کسی طور مانتا نہیں تھا۔ وہ ایک پیار کرنے والی لڑکی تھی لیکن اپنے پیارے بھائی کی محرومی اس کے دل میں ایک ایسی نفرت بن کر اتر گئی تھی جو نکالے نہیں نکلتی تھی۔

.... اور پھر وہ لمحہ آ گیا جس کا عارفہ کو انتظار تھا۔ گرما کی ایک خوب صورت شام کو دریائے راوی کے کنارے ٹہلتے ٹہلتے سہراب نے بڑے گمبھیر لہجے میں عارفہ سے کہا تھا "عافی! میں تمہارے دل میں تو نہیں جھانک سکتا لیکن اپنے بارے میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ میں تمہارے بغیر زندگی نہیں گزار سکتا۔ یہ میرے لیے ناممکن ہے۔"

"یہ کوئی نئی بات تو آپ نہیں کہہ رہے۔" وہ ہولے سے مسکرائی تھی۔

"یہ اس لحاظ سے نئی بات ہے کہ میں اسے عملی صورت دینا چاہ رہا ہوں۔"

"کیا مطلب؟" وہ بھی سنجیدگی سے بولی۔

"اس اتوار کو میں اپنے امی ابو کو تمہارے گھر بھیجنا چاہتا ہوں۔ تمہاری کیا رائے ہے؟"

عارفہ کتنی ہی دیر خاموشی سے کنارے کی گیلی ریت کو گھورتی رہی تھی۔ اس کے چہرے سے اس کے جذبات کا اندازہ لگانا قطعی مشکل تھا۔

"تم خاموش کیوں ہو عافی؟" سہراب نے اپنا لرزاں ہاتھ عارفہ کے شانے پر رکھ دیا تھا۔

"کیا آپ مجھے تھوڑا سا سوچنے کی مہلت دیں گے؟"

"کیا ابھی بھی کچھ سوچنا باقی ہے؟"

"نہیں۔ میں آپ کے امی ابو کے آنے کے حوالے سے بات کر رہی ہوں۔"

"یعنی تمہارا خیال ہے کہ ابھی انہیں تمہارے گھر نہیں آنا چاہیے۔"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔"

"اگر کوئی بات ہے تو بتا دو پلیز۔" سہراب کے لہجے میں سیکڑوں اندیشے لرزاں تھے۔

"نہیں.... میں تو سوچنے کے لیے تھوڑی سی مہلت چاہ رہی ہوں۔" عارفہ نے نگاہیں ملائے بغیر کہا تھا "میں آپ کو کل فون پر بتا دوں گی۔"

عارفہ اور سہراب کی روداد سناتے سناتے میرے دوست شاہد ملک نے ایک گہری سانس لی اور نیا سگریٹ سلگانے میں مصروف ہو گیا۔ لاؤنج کے دیوار گیر شیشے کے باہر دھند بدستور موجود تھی۔ لاؤنج میں موجود لوگ صوفوں پر نیم دراز تھے، کچھ اونگھ رہے تھے، کچھ میگزین وغیرہ پڑھ رہے تھے، کچھ ہم دونوں کی طرح طویل گفتگو میں مگن تھے۔ رابطہ پرواز بدستور لیٹ تھی۔

شاہد نے سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا "عارفہ نے اگلے روز سہراب کو فون نہیں کیا۔ اس سے اگلے روز بھی نہیں کیا۔ تیسرا اور چوتھا روز بھی سہراب نے کانٹوں پر لوٹتے ہوئے گزار دیا۔ وہ اس کی زندگی کے کٹھن ترین چار دن تھے۔ پانچویں روز عارفہ کا فون آ گیا۔ وہ لڑکی جس نے صرف انتقام کی خاطر ایک امیرزادے سے محبت کا کھیل شروع کیا تھا، اس کھیل کو صرف کھیل نہ رکھ سکی۔ اپنی بے پناہ خواہش کے باوجود وہ سہراب کو وہ جواب نہ دے سکی جو وہ دینا چاہتی تھی۔ اس نے وہ جواب دیا جو وہ نہیں دینا چاہتی تھی۔ اس نے سہراب کو آگاہ کیا کہ وہ اپنے والدین کو ان کے ہاں بھیج سکتا ہے۔ اس واقعے کے صرف ایک ماہ بعد یعنی پچھلے سال اکتوبر میں ان دونوں کی شادی ہو گئی۔ آج کل وہ ہنسی خوشی رہ رہے ہیں۔"

کہانی کا انجام قطعی غیر متوقع تھا۔ میرے اور شاہد کے درمیان کافی دیر خاموشی رہی۔ پھر شاہد نے سگریٹ کا ایک طویل کش لیتے ہوئے کہا "آپ کے تاثرات کیا ہیں طاہر صاحب۔" میں نے کوئی جواب نہیں دیا بس اپنی سوچ میں کھویا رہا۔ شاہد بولا "یقیناً آپ کو حیرانی ہوئی ہوگی کہ عارفہ نے ایسا کیوں کیا؟"

"نہیں کچھ زیادہ حیرانی نہیں ہوئی۔ بلکہ میرا خیال تو شروع سے یہی تھا کہ اگر کوئی غیر معمولی بات نہ ہوئی تو اس کہانی کا یہی اختتام ہوگا۔"

"اس قیافے کی کوئی وجہ؟" شاہد نے پوچھا۔

"عارفہ جیسی مڈل کلاس لڑکی کے لیے سہراب جیسے باحیثیت اور پُرخلوص لڑکے کی پیشکش رد کرنا آسان نہیں تھا۔ ٹھیک ہے کہ شروع میں وہ جذباتیت کا شکار تھی لیکن دھیرے دھیرے جب زخم مندمل ہوئے تو یہ جذباتیت کم ہوتی چلی گئی ہوگی۔ پھر عارفہ نے معروضی انداز میں سوچنا شروع کردیا ہوگا۔ قسمت نے اس پر ایک نہایت خوش حال زندگی کے دروازے کھولے تھے۔ وہ ایک امیر کبیر گھرانے کی بہو بن کر نہ صرف اپنا مستقبل سنوار سکتی تھی بلکہ اپنے بہن بھائیوں کے لیے بھی زندگی میں آگے بڑھنے کے مواقع پیدا کرسکتی تھی۔ بے شک وہ سہراب سے محبت نہیں کرتی تھی مگر بہتر زندگی سے تو ہر کسی کو محبت ہوتی ہے۔ اسی بہتر زندگی کی خاطر وہ اس عہد کو توڑنے پر آمادہ ہوگئی تھی جس کا تعلق سراسر ایک وقتی صدمے اور ابال سے تھا۔"

وہ مسکرایا "آپ بڑے نرم الفاظ استعمال کررہے ہیں، لیکن میں جانتا ہوں کہ عارفہ کے حوالے سے آپ کے اصل خیالات کیا ہیں اور یہ کوئی آپ ہی کی بات نہیں۔ اگر میں ایک سو افراد کے سامنے یہ روداد بیان کروں تو ان میں سے ۹۸ کے تاثرات کچھ اسی قسم کے ہوں گے۔ وہ عارفہ کو ایک نادان، جذباتی اور خواہش پرست لڑکی قرار دیں گے۔ لوئر مڈل کلاس سے تعلق رکھنے والی ایک ایسی لڑکی جس کے لیے امیر شوہر، لمبی کار اور وسیع کوٹھی ہی زندگی کی اصل اقدار ہوتی ہیں۔ اسے یہ چیزیں جب اور جہاں مل جائیں وہیں وہ اپنی کمر ہمت کھول کر ڈیرے ڈال لیتی ہے اور باقی سب کچھ بھول جاتی ہے، پھر کوئی عہد رہتا ہے، نہ قسم اور نہ کوئی نصب العین۔"

میں خاموش رہا کیونکہ شاہد کی بات کچھ ایسی غلط بھی نہیں تھی۔ عارفہ کی روداد سننے کے بعد یہ خیالات ذہن میں ضرور ابھرتے تھے۔ ذہن یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتا تھا کہ عارفہ نے منافقت آمیز مصلحت کا سہارا لیا اور خوش حال مستقبل کی خاطر ایک ایسے شخص کو اپنے جسم و جاں کا مالک بنا دیا جسے دل ہی دل میں وہ دشمن کا درجہ دیتی تھی۔ اس اعتبار سے اس نے بھی وہی کچھ کیا جو چند برس پہلے صنم نے کیا تھا۔

شاہد نے نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "حقیقت مختلف ہے مائی ڈیئر فرینڈ! عارفہ نے یہ سب کچھ دولت اور عیش و آرام کی خاطر نہیں کیا۔ اس نے یہ سب کچھ اس لیے کیا کہ وہ اندر سے ایک حساس اور گداز دل لڑکی تھی۔ بے رحمی کے ساتھ کسی کا دل توڑنا اس کے بس میں ہی نہیں تھا۔ وہ چاہتی بھی تو ایسا نہیں کرسکتی تھی۔ وہ ایک باحیثیت گھرانے کو ٹھکرا کر اپنی انا کو فتح یاب کرسکتی تھی لیکن اس کی نیک فطرت نے اسے ہارنے پر مجبور کردیا۔ اس نے اپنا سر جھکایا اور چپ چاپ سہراب کی ہوگئی۔ مائی ڈیئر فرینڈ! اب میں آپ کو وہ ثبوت دوں گا جس کے بعد آپ کو یقین ہوجائے گا کہ عارفہ کے اس فیصلے میں کسی بھی طرح موقع پرستی یا لالچ کو عمل دخل نہیں تھا۔"

"کیسا ثبوت؟" میں نے پوچھا۔

"ایک جیتا جاگتا ثبوت۔" شاہد نے اپنی طرف اشارہ کیا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ تھی۔

"میں سمجھا نہیں۔" میں نے کہا۔

شاہد ایک طویل سانس لے کر بولا "میں نے شروع میں آپ سے کہا تھا ناں کہ میری اپنی کہانی کچھ زیادہ طویل نہیں اور نہ ہی دلچسپ ہے۔"

"ہاں کہا تو تھا۔"

وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا "طاہر صاحب! سہراب اور عارفہ کی شادی سے چند ماہ پہلے میں بھی عارفہ کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہوگیا تھا۔ میں نے ایک سے زائد مرتبہ عارفہ کو شادی کی باقاعدہ آفر بے حد خلوص کے ساتھ کی تھی۔ مگر عارفہ نے یہ آفر قبول نہیں کی تھی۔ سہراب فیملی جس کمپنی "ایس ایم انڈسٹریز" میں تیس فی صد شیئرز کی مالک تھی وہ میری ہی کمپنی تھی۔ اس میں ساٹھ فی صد شیئرز میرے تھے۔ "ایس ایم" درحقیقت میرے ہی نام شاہد ملک کا مخفف ہے۔ یہ اپنے منہ میاں مٹھو بننے والی بات ہوگی لیکن یہ حقیقت ہے کہ شکل و صورت، حیثیت، خاندانی نجابت غرض ہر لحاظ سے میں سہراب سے بہتر تھا۔" وہ چند لمحے خاموش نظروں سے مجھے دیکھتا رہا پھر بولا "میرے خیال میں اب آپ کے ذہن سے یہ بات صاف ہوجانی چاہیے کہ عارفہ نے صرف خوش حال مستقبل کے لیے سہراب کا ساتھ قبول کیا۔ وہ ایک اچھی فطرت کی لڑکی تھی اور اچھی فطرت کا مالک کسی سے برائی کرنا چاہے بھی تو نہیں کرسکتا، یہ اس کے بس میں ہی نہیں ہوتا۔"

ان دنوں ملک کے کئی بڑے شہروں میں دہشت گردی کے واقعات ہورہے تھے۔ موبائل فائرنگ اور بم دھماکوں کی خبریں اخبارات میں چھپتی رہتی تھیں۔ ایسے موقعوں پر پولیس کو بھی خصوصی قسم کے انتظامات کرنے پڑتے ہیں۔ شہر کے حساس مقامات پر اکثر سفید پوش پولیس اہلکار موجود رہتے ہیں۔ خود کو کیمو فلاج کرنے کے لیے وہ مختلف طریقے اختیار کرتے ہیں۔ کہیں کوئی اہلکار چھابڑی فروش بنتا ہے، کہیں بھیک منگا اور کہیں دکان دار۔ یہ لوگ خصوصی تربیت یافتہ ہوتے ہیں۔ وحید اسپیشل پولیس میں انسپکٹر کے عہدے پر فائز تھا۔ ان دنوں اس کی ڈیوٹی بھی فیلڈ میں تھی۔ وہ سادہ پوش کی حیثیت سے لاہور اسٹیشن پر تعینات تھا۔ ایک بستر چارپائی ہوٹل میں وہ بطور مسافر قیام پذیر تھا۔ ریلوے اسٹیشن، بس اڈے اور مزارات کے گردونواح اکثر جرائم پیشہ لوگوں کی آماجگاہ ہوتے ہیں اور وہاں سے پولیس والوں کو اکثر بڑے اہم کلیوز ملتے ہیں۔

ایک روز وحید کی نگاہ بھی ایک مشتبہ شخص پر پڑی۔ وہ اپنے حلیے سے خالص دیہاتی نظر آتا تھا۔ سیالکوٹ یا گوجرانوالہ کے علاقے کا لگتا تھا۔ عمر قریباً چوبیس سال تھی۔

ایک پولیس افسر کی زندگی میں پیش آنے والے عجیب وغریب واقعہ کا احوال

ایک دانا وبینا اور حد درجہ عقل مند شخص کا فسانہ۔ اسے خود پر ناز تھا، مگر کبھی کبھی وہ کچھ ہوجاتا ہے جس کی توقع کوئی نہیں کرسکتا۔ اُس کے ساتھ بھی ایسی ہی ایک انہونی ہوئی اور پھر وقت کی ڈور اس کے ہاتھوں سے نکلتی چلی گئی۔

ٹارگٹ

طاہر جاوید مغل

شیو بڑھی ہوئی، بال منتشر، شلوار قمیص پہنے ہوئے تھا۔ گلے میں ایک میلی سی گرم چادر تھی۔ وحید نے علی الصباح پانچ بجے اسے سرائے کے سامنے والی سڑک سے گزرتے دیکھا۔ ایک بوری اس نے کمر پر لاد رکھی تھی۔ سوچی سوچی آنکھوں کے ساتھ وہ وحید کے بالکل قریب سے اس پر توجہ دیے بغیر گزر گیا۔ وحید کو فوراً یاد آیا کہ کل بھی قریباً اسی وقت یہ شخص بوری لے کر اسی جگہ سے گزرا تھا۔ وحید کے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ شاید یہ کوئی کاریگر ہے جس نے بوری میں اوزار وغیرہ باندھ رکھے ہیں یا پھر پھیری لگانے والا، جس نے بوری میں فروخت کا سامان رکھا ہوا ہے۔ جس چیز نے وحید کو شک میں مبتلا کیا، وہ اس شخص کا صبح سویرے نظر آنا اور گھبرایا گھبرایا ہونا تھا۔ اس سے پہلے کہ وحید اس شخص کے بارے..... میں کچھ اور سوچتا یا اسے روک کر اس سے کوئی بات کرتا وہ دور نکل چکا تھا۔ نہ جانے کیوں وحید کا دل چاہا کہ اس شخص کا پیچھا کیا جائے لیکن پھر خنکی اور سستی اس پر غالب آگئی اور وہ خستہ حال چارپائی پر کمبل لے کر لیٹ گیا۔

اس روز شام کو وحید نے اس دیہاتی کو سڑک پر سے گزرتے دیکھا تو بوری اس کے پاس نہیں تھی۔ بوری وہ کہاں چھوڑ آیا تھا؟ یہ سوال بڑی شدت سے وحید کے ذہن میں ابھرا۔ وہ دیہاتی کے پاس چلا گیا۔ ”سلاماں لیکم۔“ اس نے عام سے لہجے میں کہا۔

دیہاتی نے وحید کے سلام کا جواب دیا اور خالی خالی نظروں سے وحید کو تکنے لگا۔ وحید کے پوچھنے پر ارشاد نامی اس دیہاتی نے وحید کو بتایا کہ وہ گاؤں سے مزدوری کرنے کے لیے یہاں آیا ہے۔ وحید نے عام سے لہجے میں پوچھا۔ ”تمہارے پاس شاید ایک بوری بھی تھی، وہ کہاں گئی؟“

وحید کو حیرت ہوئی جب دیہاتی بوری یا کسی تھیلے وغیرہ کے وجود سے صاف مکر گیا۔ وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا کہ اس کے پاس کوئی بوری نہیں تھی۔

ارشاد نامی اس دیہاتی نوجوان کا جواب وحید کے شک کو پختہ کرنے کے لیے کافی تھا۔ اس نے کل صبح اور پرسوں صبح خود اس شخص کو بوری سمیت سڑک پر سے گزرتے دیکھا تھا۔ وحید سے مختصر بات کر کے وہ شخص اب کافی فاصلے پر جا چکا تھا، وحید نے اسے نظر میں رکھا اور آہستہ آہستہ اس کے پیچھے چلنے لگا۔ شام اب رات کی تاریکی میں بدل رہی تھی۔ فٹ پاتھ پر، مارکیٹوں کے برآمدوں میں اور سڑک کے کنارے گرین بیلٹس پر ایک دنیا آباد ہو چکی تھی۔ دور دراز سے آئے ہوئے مزدور، مسافر اور بے آسرا لوگ یہاں وہاں چادریں بچھا کر بیٹھ گئے تھے یا لیٹ گئے تھے۔ یہی جگہیں ان کا رین بسیرا تھیں۔ مشکوک دیہاتی اپنا ڈیرا جمانے کے لیے دیر تک یہاں وہاں کوئی مناسب جگہ ڈھونڈتا رہا۔ ایک دو افراد سے اس کی تکرار بھی ہوئی۔ آخر ایک مارکیٹ کے برآمدے میں اسے جگہ مل گئی۔ اس نے وہاں چادر بچھائی اور اپنے بازو کو تکیہ بنا کر لیٹ گیا۔

انسپکٹر وحید کی نظر میں یہ شخص ”بلیک لسٹ“ ہو چکا تھا۔ رات کو وحید نے اپنے سادہ پوش ماتحت ایس آئی مشتاق باجوہ کو بھی اس شخص کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ بوری کے حوالے سے ارشاد نے جو غلط بیانی کی تھی، وہ نظرانداز کرنے والی نہیں تھی۔ اگلے روز وحید نے ازخود ارشاد کا پیچھا کرنے کا فیصلہ کیا۔ آج بھی وہ علی الصباح روانہ ہو گیا تھا۔ میلی سی گرم چادر جسے وہ رات بھر اوڑھ کر سویا رہا تھا، اب اس کے کندھے پر نظر آتی تھی۔ وہ اسٹیشن کے علاقے سے نکلا اور لکشمی چوک کی طرف آگیا۔ یہاں سے وہ بس میں بیٹھا۔ وحید بھی اس کے ساتھ ہی بس میں سوار ہو گیا۔ آخر وہ گلبرگ کے فیشن ایبل علاقے میں پہنچ گئے۔ پیدل چلتا ہوا وہ گلبرگ کے رہائشی علاقے میں پہنچا اور اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔ اس کا انداز مشکوک ہی تھا۔ وہ جیسے کوئی خاص مقام ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا۔ رک رک کر نیم پلیٹس دیکھتا اور آگے بڑھ جاتا۔ آخر وہ ایک مسجد کے اردگرد مشکوک انداز میں گھومنے لگا۔ وہ قریباً تین بار مسجد میں داخل ہوا۔ مسجد کے عین دروازے میں کھڑے ہو کر اس نے دائیں بائیں دیکھا اور پھر آگے نکل گیا۔

دوپہر کے وقت وہ گلبرگ کی ہی ایک اور جامع مسجد کے سامنے نظر آ رہا تھا۔ یہاں بھی وہ دو تین بار مسجد میں داخل ہوا اور باہر نکلا۔ ہر بار جب وہ مسجد کے بیرونی دروازے سے نکلتا کئی بار دائیں بائیں دیکھتا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار دیکھے جا سکتے تھے۔ شام تک وہ مسلسل گلبرگ کے علاقے میں گھومتا رہا۔ ایک جگہ اس نے بھنے ہوئے چنے لے کر کھائے اور ایک سرکاری نلکے سے پانی پیا۔ شام تک وہ کم از کم چار مساجد میں گیا اور وہی حرکات کیں جو پہلے کی تھیں۔ شام سے تھوڑی دیر پہلے وہ واپس روانہ ہو گیا اور ساڑھے چھ بجے کے قریب اسٹیشن واپس پہنچ گیا۔

رات کو وحید اور اس کا ماتحت ایس آئی مشتاق باجوہ سرائے کے بوسیدہ کمبلوں میں دبک کر دیر تک اس شخص کے بارے میں تبصرہ کرتے رہے۔ مشتاق نے وحید کو بتایا کہ وہ آج اس شخص کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی

کوشش کرتا رہا ہے مگر کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ جس شخص کے قریب کل رات ارشاد سویا تھا اس سے بس یہ پتا چل سکا تھا کہ اس کا نام ارشاد عرف شادا ہے' وہ شکر گڑھ کے کسی گاؤں کا رہنے والا ہے اور ترکھان کا کام کرتا ہے۔

اگر وہ ترکھان کا کام کرتا تھا تو ممکن تھا کہ اس کی بوری میں اوزار ہی ہوں مگر جس شخص نے ارشاد کے بارے میں بیان دیا' اس نے ارشاد کے پاس بوری نہیں دیکھی تھی۔ اس کے علاوہ بھی کوئی شخص ارشاد اور اس کی بوری کے بارے میں معلومات فراہم نہیں کرسکا تھا۔ انسپکٹر وحید پولیس والوں کی تعلیم یافتہ کھیپ میں سے تھا اور روایتی پولیس انسپکٹروں سے کافی حد تک مختلف بھی تھا۔ اپنے پیشے کی نسبت سے اس نے چہرہ شناسی کے بارے میں کافی کچھ پڑھ رکھا تھا' وہ کچھ عرصہ پولیس ڈپارٹمنٹ کے اس شعبے سے بھی منسلک رہا تھا جہاں کمپیوٹر پر ملزمان کے خاکے وغیرہ بنائے جاتے تھے۔ کمبل میں دبکے دبکے انسپکٹر وحید نے اپنے ماتحت باجوہ سے کہا "کل میں نے اس بندے کے چہرے کو بڑے غور سے READ کیا تھا۔ اس کے ناک نقشے میں وہ ساری اونچ نیچ پائی جاتی ہے جو ایک نہایت عیار اور غلط کار شخص کے چہرے پر ہوتی ہے۔ غیب کا علم تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے بہرحال مجھے شبہ ہے کہ یہ شخص وہ نہیں جو نظر آرہا ہے۔ اس شخص کے ہونٹ پتلے اور اندر کو دبے ہوئے ہیں جو اس کے اندر کی برداشت اور ضبط کی نشاندہی کرتے ہیں۔ گردن زیادہ لمبی نہیں ہے اور صحت مند ہے جس سے اعصاب کی مضبوطی ظاہر ہوتی ہے۔ ناک کا پھیلاؤ اور جبڑے کی چوڑائی بھی جسمانی مضبوطی اور توانائی کو ظاہر کرتی ہے۔ اس کی بھویں گھنی اور آنکھیں چھوٹی ہیں۔ ان سے مزاج کی گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔ پیشانی کی ساخت' ذہانت اور چالاکی کو ظاہر کرتی ہے۔"

"مگر یہ شخص بول چال اور حلیے کے اعتبار سے تو پکا پکا دیہاتی نظر آتا ہے۔"

"ممکن ہے کہ اس نے بہروپ بھر رکھا ہو۔ ایک کامیاب بہروپیا خود کو مکمل طور پر ایک نئی شخصیت میں ڈھال لیتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ کچھ عرصے کے لیے اپنے آپ کو بھی فراموش کردیتا ہے۔"

وہ دونوں رات گئے تک اس شخص کے بارے میں تبصرہ کرتے رہے۔ مساجد میں اس شخص کا گھومنا اور گلیوں میں پھرنا ہر زاویے سے مشکوک دکھائی دیتا تھا۔ اس کی بوری بھی دوبارہ اس کے کندھے پر نظر نہیں آئی تھی۔ وحید اور باجوہ کے ذہنوں میں بدترین خدشا یہ تھا کہ شاید اس تھیلا نما بوری میں کوئی بم وغیرہ تھا جو اس نے کہیں رکھ دیا تھا لیکن اگر وہ بم تھا تو ابھی تک کوئی تازہ منحوس خبر کیوں نہیں آئی تھی۔ باجوہ کا خیال تھا کہ اس شخص پر ہاتھ ڈال دیا جائے اور اس سے براہِ راست پوچھ گچھ کی جائے مگر وحید ابھی ایک آدھ دن مزید آبزرو کرنا چاہتا تھا۔

اگلے روز بھی وہ شخص بس پر بیٹھ کر گلبرک پہنچا اور اسی طرح سڑکوں پر گھومنے لگا۔ گاہے گاہے وہ رک کر کوٹھیوں کے اندر بھی جھانکتا تھا۔ ایک دو جگہوں پر اسے چوکیداروں نے ڈانٹا ڈپٹا بھی پھر ایک جگہ پر رکھوالی کے دو کتوں نے اس کی خبر لی اور اس کی ٹانگیں پھاڑنے کے درپے ہوگئے۔ اس نے بہ مشکل خود کو بچایا۔ آج بھی وہ دو مساجد میں گیا۔ دو تین بار دروازے میں داخل ہوا اور باہر آیا۔ دوسری مسجد میں اس نے نمازیوں میں گھس کر نماز عصر بھی ادا کی۔ وحید اور مشتاق باجوہ اسے ہر لحظہ نگاہ میں رکھے ہوئے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس شخص کی وجہ سے کوئی المیہ رونما ہو۔ شام کو وہ شخص حسب معمول واپس اسٹیشن آگیا۔

اس روز رات کو ارشاد کی شخصیت ان کے لیے مزید پراسرار ہوگئی۔ رات کو ارشاد ریلوے اسٹیشن پر ایک اوور ہیڈ برج کے نیچے سویا تھا۔ وہاں اس کا بستر ایک ملنگ کے پاس تھا۔ ناجا نامی یہ ملنگ بھی کبھی کبھار پولیس کو مشکوک

لوگوں کے بارے میں معلومات فراہم کرتا تھا۔ انسپکٹر وحید نے باجوہ کو ہدایت کی اور اس نے ملنگ کو ارشاد کے سلسلے میں الرٹ کردیا۔ آدھی رات کو ملنگ اٹھ کر وحید اور باجوہ کے پاس آیا۔ اس نے انہیں بتایا کہ ارشاد کو مزید ڈھیل دینا ٹھیک نہیں۔ وہ یقیناً ایک پراسرار شخص ہے۔ اس نے انگریزی اخبار کا ایک تراشا وحید کو دکھایا۔ اس تراشے کو بڑی احتیاط سے تہ کرکے ایک اور کاغذ میں لپٹا گیا تھا۔ تراشے میں لاہور کے چند پرہجوم تفریحی مقامات کی تصویریں تھیں اور ان کے بارے میں مکمل تفصیل درج تھی۔ مخبر ملنگ نے بتایا کہ یہ تراشا اس نے ارشاد کی جیب سے اڑایا ہے۔

○☆○

اس رات وحید اور باجوہ، ارشاد کو گرفتار کرکے پولیس اسٹیشن لے آئے۔ وہ سخت گھبرایا ہوا تھا۔ کسی وقت وہ بالکل معصوم اور سادہ نظر آتا تھا۔ کسی وقت یوں لگتا تھا کہ وہ نہایت گہرا اور چالاک شخص ہے۔ بس ایک دھوپ چھاؤں سی تھی۔ یا یوں کہہ لیں کہ ایک اندھیرا اجالا تھا جس میں کچھ بھی واضح نہیں تھا۔ محسوس ہوتا تھا کہ یہ شخص بے حد چالاک اور عیار ہے یا بے تحاشا سادہ ہے۔ اس سے پوچھا گیا وہ کہاں کا رہنے والا ہے۔ اس نے بہ مشکل اپنے گاؤں کا نام "رکھ والی" بتایا۔ اس نے کہا کہ وہ لکڑی کا کام نہیں جانتا بلکہ دیہاڑی مزدور ہے۔ وہ اپنی شادی کے لیے کچھ پیسے کمانے پہلی بار شہر آیا تھا۔ یہاں وہ روزانہ کام کی تلاش میں نکلتا ہے اور ناکام ہوکر واپس آجاتا ہے۔

وحید نے سوال کیا "تمہاری وہ بوری کہاں ہے جو دو تین روز پہلے تمہارے کندھے پر نظر آئی تھی۔"

بوری کی موجودگی سے وہ ایک بار پھر صاف مکر گیا اور اس نے کہا کہ اس کے پاس سرے سے کوئی بوری ہی نہیں تھی۔

وحید نے کہا "تم نے پہلے ایک شخص کے سامنے اعتراف کیا تھا کہ تم لکڑی کا کام کرتے ہو۔ اب تم کہہ رہے ہو کہ تم دیہاڑی مزدور ہو۔"

"میں نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔" ارشاد صاف مکر گیا۔

"اس کے سامنے گواہ پیش کیا گیا لیکن اس نے اسے بھی پہچاننے سے انکار کردیا۔ اس کی آنکھوں سے لگاتار آنسو بہہ رہے تھے۔

جب اسے بتایا گیا کہ اس کا تعاقب کیا جاتا رہا ہے اور اس کی ایک ایک مصروفیت نوٹ کی جاتی رہی ہے تو اس کا رنگ پیلا پڑگیا۔ تاہم اس نے بڑے بچگانہ انداز میں پولیس کی ان معلومات کو جھٹلادیا۔ گاہے گاہے وہ بھوں بھوں کرکے رونے لگتا تھا اور اپنی زندگی سے بیزار دکھائی دیتا تھا۔ وہ ایک نہایت پیچیدہ ملزم ثابت ہورہا تھا۔ اس کی کوئی بھی کل سیدھی نہیں تھی۔

جس دوران میں ارشاد سے پوچھ گچھ ہورہی تھی ایک شخص کو ارشاد کی تصویر دے کر شکر گڑھ کے گاؤں رکھ والی کی طرف دوڑا دیا گیا تھا تاکہ ارشاد کے بارے میں مکمل معلومات حاصل ہوسکیں۔ یہ پولیس اہل کار شام کے بعد واپس لاہور پہنچ گیا۔ اس نے بتایا کہ رکھ والی میں ارشاد ترکھان نام کا کوئی بندہ نہیں رہتا۔ اس کا مطلب تھا کہ ارشاد نے رکھ والی کا نام لے کر اپنے جھوٹوں میں ایک اور سفید جھوٹ کا اضافہ کرلیا تھا۔ اس تازہ انکشاف کے بعد ارشاد میں پولیس کی دلچسپی بڑھ گئی۔ انوسٹی گیشن سے تعلق رکھنے والے کئی افسران اگلے چند گھنٹوں میں اس پولیس اسٹیشن پہنچ گئے جہاں ارشاد عرف شادے کو رکھا گیا تھا۔ ارشاد کی گول مول باتوں نے پولیس کو زچ کرکے رکھ دیا۔ آخر پولیس اہلکاروں نے اسے اپنے روایتی سلوک کا نشانہ بنایا۔ دو منٹ کے اندر ہی وہ نیم بے ہوش ہوگیا اور اس کے منہ سے رال بہنے لگی۔ ہوش میں آیا تو وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اس نے پولیس والوں کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے اور بڑی بڑی قسمیں کھا کر وعدہ کیا کہ وہ سب کچھ سچ سچ بتادے گا۔"

وحید نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا "یہ دیہاتی لب و لہجہ چھوڑو اور انگریزی میں بات کرو۔ ہماری معلومات کے مطابق تم پڑھے لکھے ہو۔"

"میں پڑھا لکھا نہیں ہوں مائی باپ! میں اپنی ماں کی قسم کھاتا ہوں۔"

"کس ایجنسی کے لیے کام کرتے ہو؟" ایک ڈی ایس پی نے پوچھا۔

"مجھے نہیں پتا مائی باپ کیا پوچھ رہے ہیں؟"

"تمہارا ٹارگٹ کیا تھا؟" ایک اور افسر نے پوچھا۔

"مم۔۔۔ مجھے کچھ پتا نہیں صاحب۔"

"لاہور میں تمہارے لنکس کس کس سے ہیں؟"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا جناب۔"

"اور تم یہ وعدہ بھی کررہے ہو کہ تم اب سچ بولو گے اور کچھ بھی نہیں چھپاؤ گے۔"

"ہاں میں سچ بولوں گا مائی باپ مگر آپ سچ سنیں تو سہی۔"

"اچھا چلو بولو سچ۔"

وہ زمین پر اکڑوں بیٹھا تھا۔ اس نے اپنے گنجلک بال

مٹھی میں جکڑے۔ آنکھوں سے تازہ آنسوؤں کے سوتے پھوٹ نکلے۔ وہ ہچکیاں لیتے ہوئے بولا "میرا اصلی نام ارشاد ہی ہے صاحب جی۔ میں رکھ والی سے اٹھارہ کوس دور ایک پنڈ "غریب وال" کا رہنے والا ہوں۔ چھوٹا سا پنڈ ہے جی۔ اس میں نہ بجلی ہے' نہ سڑک اور نہ کوئی خط پتر وہاں پہنچتا ہے۔ اس پورے پنڈ میں بس دو تین ہی سیانے بندے ہیں۔ آپ پنڈ کی حالت کا اندا جا اس بات سے لگالیں جی کہ پنڈ کے ان دو تین سیانے بندوں میں میرا نام بھی آتا ہے۔ پورے پنڈ میں صرف میں ہی ہوں جو اب تک وڈے شہر (لاہور) آیا ہوں۔ رابعہ میری منگ کا نام ہے جی۔ ہماری منگنی کو چھ سال ہوگئے ہیں۔ مائی باپ! میں غریبی کی وجہ سے اپنی منگ کو اپنے گھر نہیں لاسکا۔ وہ اور کتنی دیر میرا انتجار کرسکتی ہے۔ چھوٹی عید کو اس نے مجھ سے کہا "شادے! کچھ کر۔ نئیں تو میرا ابا میرا ویاہ کہیں اور کردے گا۔"۔ اس نے تھوڑے تھوڑے کرکے دو تین سو روپے جوڑے ہوئے تھے وہ اس نے مجھے دیے اور کہا کہ میں اس میں کچھ اور پیسے ڈال کر کام کے لیے اوجار خریدوں اور شہر جاکر کچھ پیسے اکٹھے کروں۔ میں نے دو سو روپے اپنی بیوہ بہن سے ادھار لیے۔ اپنی ماں کی چاندی کی دو بالیاں بیچیں اور گوجرانوالہ جاکر کام کے اوجار خرید لیے۔ آپ کو تو پتا ہے ہی جی کہ غریب مجدور کی کل جائیداد اس کے اوجار ہی ہوتے ہیں۔ میرے سارے اوجار کھڑ گئے۔"

"کھڑ گئے؟ کیا مطلب؟" ایک ساتھ دو تین آوازوں نے پوچھا۔

"گواچ گئے سرکار... گم ہوگئے۔"

اس کی میلی آنکھوں سے لگاتار آنسو بہنے لگے۔ کرتے کے دامن سے آنسو پونچھ کر اس نے سر جھکالیا۔

"کیسے گم ہوگئے؟ کیا گر گئے یا کسی نے چھین لیے؟"

"نہیں جی... بس گواچ گئے۔ مجھ سے خود ہی گواچ گئے۔" وہ معصومیت کی تصویر نظر آنے لگا۔

"کیسے گواچ گئے؟"

وہ جیسے اپنے آپ سے ہی شرمندہ تھا۔ کچھ دیر تک ہچکچانے کے بعد بولا "میں صبح سویرے اوجاروں والی بوری لے کر کام ڈھونڈنے نکلا تھا۔ نہریار کوٹھیوں والے علاقے (گلبرگ) میں مجھے ایک جگہ ترکھاناں کام مل گیا جی... مالکوں نے چار پانچ دروازوں کی چوکھاٹیں بدلوانی تھیں۔ انہوں نے کہا کل تک ہم لکڑی لے آئیں گے۔ تم اپنے اوجار ادھر ہی رکھ جاؤ۔ سویرے آکے کام شروع کردینا۔ میں اوجار ادھر کوٹھی کے برآنڈے میں رکھ کر آگیا جی... پھر... پھر..."

"پھر کیا ہوا؟" وحید نے پوچھا۔

"میں بڑا پاگل ہوں۔ مجھ سے بڑی گلتی ہوگئی ہے جی۔ میں وہ کوٹھی ہی بھول گیا ہوں۔" وہ بے چارگی سے بولا "پچھلے پانچ دن سے میں وہاں جارہا ہوں جی۔ مجھے وہ کوٹھی ہی نہیں ملتی۔ میں نے دو تین نشانیاں رکھی تھیں۔ وہ بھی مجھے نہیں ملتیں جی۔ بڑی بھول ہوگئی ہے جی مجھ سے... میں پنڈ جاکر گھر والوں کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ رابعہ کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ وہ تو آس لگائے بیٹھی ہے کہ میں نے روپے کما کرلانے ہیں۔ یہاں کمائی کرتے کرتے اوجار بھی کھڑا دیے میں نے۔" وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔

"تم مسجدوں کے اندر کیوں گھومتے رہتے تھے۔ ہم نے کئی بار تمہیں مسجد کے آس پاس دیکھا ہے۔" وحید نے پوچھا۔

"وہ جی... مسجد بھی تو ایک نشانی تھی اس کوٹھی کی۔ اس کوٹھی میں اوجار رکھنے کے بعد میں نے ایک پاس کی مسجد سے پانی پیا تھا۔ پانی پی کر باہر نکلا تو وہ مٹیالے رنگ کی کوٹھی سیدھے ہاتھ دو تین کوٹھیاں چھوڑ کر نجر آئی تھی۔ میں نے اس علاقے کی کئی مسجدیں دیکھی ہیں لیکن وہ کوٹھی نہیں ملی۔ پتا نہیں کدھر کھڑ گئی ہے وہ کوٹھی۔ میں پنڈ جاکر کیا منہ دکھاؤں گا جی۔"

"تمہاری جیب سے ایک اخباری کاغذ نکلا ہے' اس کا کیا چکر ہے۔" ایک ڈی ایس پی نے پوچھا۔

"اس میں کوئی بری بات ہے مائی باپ؟" وہ کانپ کر رہ گیا

"وہ کاغذ کیسے پہنچا تمہاری جیب میں؟"

"اخبار سے پھاڑ کر رکھ لیا تھا جی۔"

"یہی تو پوچھ رہے ہیں کہ کیوں رکھ لیا تھا۔"

"بس جی' چھوٹے پپو کے لیے رکھ لیا تھا۔"

"یہ چھوٹا پپو کون ہے؟" ڈی ایس پی نے پوچھا۔

"پپو میرا بھتیجا ہے سرکار' اسکول پڑھتا ہے۔ رابعہ بھی اس سے بڑا پیار کرتی ہے۔ پپ... پپو کو وڈا شہر (لاہور) دیکھنے کا بڑا چا ہے جی۔ اس "کاگج" پر شہر کی مورتیں تھیں۔ شاہی قلعہ تھا' بادشاہی مسجد تھی' یادگار تھی۔ میں نے یہ کاگج پھاڑ کر اپنے پاس رکھ لیا۔ مجھ سے کوئی گلتی ہوگئی ہے جی؟" وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولا۔ اس کے فاقہ زدہ ہونٹ لرزتے چلے جارہے تھے۔

انسپکٹر وحید' ایس آئی باجوہ اور ان کے اعلیٰ افسران خاموش بیٹھے اور حیرت سے اس شخص کو دیکھے چلے جارہے

تھے۔ غالباً سب سے زیادہ حیرت وحید کو ہی تھی۔ اس کی پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ ساتھ اس کی چہرہ شناسی بھی دھری کی دھری رہ گئی تھی۔ جس سادگی کو وہ بہروپ سمجھ رہا تھا' وہ بہروپ انہیں اصلیت تھی۔ وحید کے تصور میں جو شخص کسی ملک دشمن ایجنسی کا ایجنٹ تھا اور اپنے حلیے میں اپنی بے پناہ عیاری چھپائے ہوئے اپنے ٹارگٹ کی تلاش میں تھا' دراصل کسی ٹارگٹ کی تلاش میں نہیں بلکہ اپنی بوری کی تلاش میں تھا۔ اس کے اوزاروں کی بوری جسے وہ سادہ لوح کسی بے پروا صاحب ثروت کی کوٹھی میں رکھ کر بھول گیا تھا اور اب ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔

وحید کے افسران کو اپنے وقت کے ضائع ہونے کا شدید احساس تھا۔ ان میں سے کئی ایک برے برے منہ بنا رہے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ سب اٹھ کر چلے گئے اور بھیگی آنکھوں والے دیہاتی کے پاس بس وحید اور اس کے دو تین ماتحت رہ گئے۔ اس سادہ لوح نے بڑی عاجزی سے وحید کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولا "سرکار' میں نے آپ کو اپنے پنڈ کا نام بتا دیا ہے' اب میری عجت آپ کے ہاتھ میں ہے۔ پنڈ میں سب مجھے بڑا سیانا سمجھتے ہیں اور وہ میری منگ تو سمجھتی ہے کہ سارے جہان کی عقل مت میرے اندر ہی بھری ہوئی ہے۔ اگر اسے پتا چلا کہ وڈے شہر میں میرے ساتھ کیا ہوا ہے تو وہ بڑی شرمندی ہوگی۔ سارے پنڈ والے بھی میرا بڑا مجاق اڑائیں گے۔ میری عجت خراب ہو جائے گی سرکار۔"

وحید کا پیشہ ایسا نہیں تھا کہ کسی پر ترس کھایا جاتا مگر نہ جانے کیوں اسے اس سادہ لوح پر بہت ترس آیا۔ وہ کچھ دیر تک یک ٹک اسے دیکھتا رہا پھر گہری سانس لے کر اس نے دیہاتی کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "دیکھو شادے!" اس نے نرم آواز میں کہا "جو کچھ ہونا تھا وہ ہو گیا' اب سیدھے واپس پنڈ چلے جاؤ ورنہ کسی بڑی مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔ شہروں کے حالات آج کل بڑے خراب ہیں۔ یہاں قدم قدم پر مصیبت کھڑی ہے۔ لوگوں کے کپڑے تک اتر جاتے ہیں۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟ جس طرح تم یہاں منہ اٹھا کر گھومتے پھر رہے ہو' کسی بھی وقت پولیس کے ہتھے چڑھ سکتے ہو یا کسی اور بکھیڑے میں پڑ سکتے ہو۔"

وہ کافی دیر تک ارشاد عرف شادے سمجھاتا رہا۔ وہ آنسو بہاتا رہا اور سعادت مندی سے سہلاتا رہا۔ اس کے پاس واپسی کا کرایہ موجود تھا' وحید نے اسے گاؤں واپس بھیج دیا۔ کہنے کو تو ارشاد واپس اپنے گاؤں چلا گیا مگر وحید کے دل میں شک سا تھا۔ گاہے گاہے اس کے ذہن میں خیال آتا تھا کہ شاید شادا واپس گاؤں نہیں گیا اور ابھی یہیں شہر میں گمشدہ متاع تلاش کر رہا ہے۔ ایک دو بار اس کے دل میں آئی کہ وہ کسی کانسٹیبل کو شادے کا ایڈریس دے کر اس کے گاؤں بھیجے اور پتا کرائے کہ وہ گاؤں پہنچا یا نہیں لیکن پھر مصروفیت میں یہ خیال اس کے ذہن کی گرفت سے نکل گیا۔

چار پانچ روز بعد اسے ایک اہم کیس کی تاریخ بھگتنے کے لیے ملتان جانا پڑ گیا۔ اس کی واپسی وہاں سے قریباً دس روز بعد ہوئی۔ جس روز وہ واپس لاہور پہنچا۔ اسی روز ایک اہم واقعہ رونما ہوا۔ وحید کو ایک شخص کا نزاعی بیان لینے کے لیے فوراً سروسز اسپتال جانا پڑا۔ اس شخص کو گلبرگ کے علاقے میں ایک کوٹھی کے سیکیورٹی گارڈ نے گولی مار کر شدید زخمی کر دیا تھا۔ اسپتال پہنچ کر وحید نے جاں بلب شخص کو دیکھا تو ٹھٹک گیا۔ وہ ارشاد عرف شادا ہی تھا۔ اس کی جان واقعی لبوں پر پہنچ چکی تھی۔ گولی اس کے کولہے سے نکال لی گئی تھی۔ ارشاد ان دو ہفتوں میں پہلے سے بڑھ کر مصیبت زدہ اور خستہ حال نظر آنے لگا تھا۔ ایک سرکاری افسر کے گھریلو چوکیدار نے وحید کو بتایا کہ یہ شخص شام کے بعد مشکوک انداز میں ایک کوٹھی کے اندر تاک جھانک کر رہا تھا۔ گارڈ نے اسے للکارا تو یہ بھاگ کھڑا ہوا۔ گارڈ نے تاریکی میں اس کا پیچھا کیا اور نہ رکنے پر گولی چلا دی' جو اس کے کولہے میں لگی۔

مضروب کی جامہ تلاشی میں بس کے کچھ پرانے ٹکٹ' دس دس کے دو نوٹ اور ڈیڑھ روپے کی ریزگاری ملی تھی۔ اس کے علاوہ ایک جیب میں بھنے ہوئے چنے اور گڑ کی چھوٹی سی ڈلی تھی۔ وحید بڑے دکھ کے ساتھ جاں بلب شادے کے اوپر جھک گیا۔ شادا بڑے دھیمے لہجے میں اٹک اٹک کر بولا "مجھے معافی دے دو صاحب... مجھ سے بڑی گلتی ہوئی۔ میں واپس پنڈ نہیں گیا تھا۔ اپ... اپنی بوری... کے بغیر میں کیسے جاتا؟ اپنی ماں کو اور اس کو (رابعہ کو) کیا منہ دکھاتا..." وہ کچھ دیر تک اپنی اکھڑی سانسوں کو درست کرنے کی بھرپور کوشش کرتا رہا مگر یہ کوشش کامیاب نہیں ہوئی۔ ڈاکٹر نے معذرت کر کے وحید کو پیچھے ہٹا دیا۔

کچھ ہی دیر بعد شادا دم توڑ گیا۔ وحید کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ وہ اس غریب شہر کو دیکھتا رہا۔ جو محنت کشی کا سادہ لوح ایجنٹ تھا۔ جس کے "خفیہ رابطے" صرف اپنی لاچاری سے تھے اور اس شہر میں جس کا پہلا اور آخری ٹارگٹ اپنے اوزاروں کی بوری ڈھونڈنا تھا۔

وہ دسمبر کے چوتھے ہفتے کی طویل ترین راتوں میں سے ایک رات تھی۔ بے حد تاریک، بے حد سرد اور بارش میں بھیگی ہوئی۔ کبھی کبھی بجلی زور سے چمکتی تھی اور کچھ ہی دیر بعد بادل دھاڑنے لگتے تھے لیکن بادلوں کی دھاڑوں کے علاوہ بھی کچھ دھاڑیں تھیں جو در و دیوار کو لرزا رہی تھیں۔ نور، جس کا پورا نام عین النور تھا۔ ان دھاڑوں کو سنتی تھی تو سرتاپا لرز جاتی تھی۔ یہ انسانوں کی دھاڑیں تھیں، وحشی انسانوں کی دھاڑیں۔ ان کی آنکھوں میں شعلے رقص کر رہے تھے اور انہوں نے اس قدیم حویلی کو چاروں طرف سے گھیرا ہوا تھا۔ ان لوگوں کی تعداد کسی طرح بھی ڈھائی تین سو سے کم نہیں تھی۔ وہ بار بار حویلی کے مضبوط چوبی پھاٹک پر حملہ آور ہوتے تھے اور اسے توڑنے کی کوشش کرتے تھے۔ کچھ کی کوشش تھی کہ وہ دیواروں پر بانس کی لمبی سیڑھیاں لگا کر اندر گھس جائیں اور کچھ ایک دوسرے کے کندھوں پر پاؤں رکھ کر بیرونی دیوار کے بالائی کنارے تک اپنے ہاتھ پہنچانے کی کوشش کرتے تھے۔ حویلی میں موجود لوگ اندر سے ان پر خشت باری کرتے تھے، یا پھر طویل لاٹھیوں کے ذریعے انہیں بیرونی دیوار پر سے دھکیل کر نیچے گرا دیتے تھے۔

حویلی میں موجود تمام عورتیں ایک بڑے ہال نما کمرے میں موجود تھیں اور تھرتھر کانپ رہی تھیں۔ اس کمرے سے باہر مسلح پہرے دار موجود تھے تاہم ان کے چہرے بھی حالات کی سنگینی کے سبب تاریک دکھائی دیتے تھے۔ عورتوں کی تعداد بیس کے قریب تھی۔ ان میں چھ سات نوجوان لڑکیاں تھیں، باقی درمیانی عمر کی یا بڑی عمر کی خواتین تھیں۔ تیئیس سالہ نور بے دم سی ہوگئی تھی اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ صاف دیکھ رہی تھی کہ ایک قیامت ان کے سر پر ہے اور کسی بھی وقت ان پر ٹوٹ سکتی ہے۔

باہر سے کسی شرابی شخص کی للکارتی ہوئی آواز آئی۔

”اوئے مولوی مہرا! ہم منڈے کو سہرا باندھ کر لائے ہیں۔ تیری دھی کو ہمارے ساتھ جانا ہی جانا ہے۔ زندہ یا پھر مردہ۔ اب بھی وقت ہے سوچ لے...... تیرے حق میں چنگا یہی ہے کہ اس کو تیار کر دے۔“

نور نے دیکھا، اس کے والد مولوی اشفاق مہرا کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے۔ گیس لیمپ کی روشنی میں ان کا سایہ، جیسے کمرے کی پرانی دیوار پر لرز رہا تھا۔ اسی اثنا میں ان کا بوڑھا ملازم خدا بخش اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں پلاسٹک کا ایک بڑا لفافہ تھا جس میں سرخ رنگ کا کوئی کپڑا جھلک دکھا رہا تھا۔ بوڑھے ملازم خدا بخش نے نور کے والد سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”مولوی جی! ان بدبختوں نے یہ لال جوڑا دیوار کے اوپر سے اندر پھینکا ہے۔“ خدا بخش کی آواز لرز رہی تھی۔

نور کے والد نے لفافہ لے کر سرخ جوڑے کو ڈبڈباتی آنکھوں سے دیکھا۔ مخمل پر چمکیلا کام تھا اور یہ واضح طور پر دلہن کا لباس نظر آتا تھا۔ اشفاق مہرا نے لفافہ گھما کر دیوار پر دے مارا اور بے دم سے ہو کر قالین پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے بھی نور ہی کی طرح دیوار سے ٹیک لگا لی۔ پاس ہی نور کی بڑی بہن بسمہ بھی بیٹھی تھی۔ اس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ اس نے باپ کے بازو کو یوں تھام رکھا تھا جیسے کوئی ڈوبنے والا کنارے کو تھامتا ہے۔

اسی دوران میں نور کی والدہ زلفت بیگم اندر داخل ہوئیں۔ وہ نور اور بسمہ کی سگی والدہ تو نہیں تھیں مگر آفت کی اس بھیانک گھڑی میں ان کا چہرہ بھی درد کی تصویر دکھائی دیتا تھا۔ ان کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ انہوں نے فرش پر گرا ہوا سرخ جوڑا اٹھا لیا اور پھر بے جان قدموں سے چلتی ہوئی اپنے شوہر کے پاس آ بیٹھیں۔ انہوں نے بڑی نرمی سے شوہر کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بوڑھے ملازم خدا بخش کی طرف دیکھا۔ وہ مالکن کا اشارہ سمجھ کر باہر نکل گیا۔ زلفت بیگم نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ ”مہرا صاحب! یہاں کوئی مدد کو نہیں آئے گا۔ ہمیں اپنی مدد آپ کرنا ہوگی۔“

”تو کس طرح کروں میں اپنی مدد آپ؟“ مولوی اشفاق مہرا نے زخمی آواز میں کہا۔ ”اپنی بیٹی کو اپنے ہاتھوں سے تیار کر کے...... ان ڈاکوؤں کے حوالے کر دوں؟ انہیں کہوں، لے جاؤ اسے...... اپنے کلیجے ٹھنڈے کر لو۔“

”نہیں مہرا صاحب! لیکن ...... جو کچھ بھی ہو رہا ہے...... اور جو کچھ ہونے والا ہے...... اسے دیکھ کر ہمیں کوئی درمیانی راہ تو نکالنا ہی پڑے گی......“

”اور وہ درمیانی راہ کیا ہے؟“ اشفاق مہرا نے بیوی کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

”مہرا صاحب! کچھ بھی ہے...... وہ لوگ...... اپنی بسمہ کو بہو بنانا چاہتے ہیں۔ اسے ابدال کے نکاح میں لانا چاہتے ہیں۔ اب بھی بات چیت کا دروازہ بند نہیں ہوا ہے۔ اگر ان سے صلح کی بات ہو جاتی ہے تو پھر وہ پورے طریقے سے اور عزت کے ساتھ اپنی بسمہ کو لے کر جائیں گے...... ہم ان سے کچھ شرطیں بھی منوا سکتے ہیں بلکہ ابھی ان سے ہر طرح کی لکھت پڑھت بھی ہو سکتی ہے لیکن......“ زلفت بیگم کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئیں۔

بادل ایک بار پھر زور سے گرجا اور اس کی آواز، باہر سے بلند ہونے والے للکاروں اور دھاڑوں میں گڈمڈ ہونے لگی۔

زلفت بیگم نے ہمت جمع کر کے اپنی بات مکمل کی۔ ''لیکن اگر خدانخواستہ...... خدانخواستہ...... یہ لوگ اندر گھس آئے اور...... دو چار اموات ہوگئیں...... تو پھر سارا معاملہ اور طرح کا ہوجائے گا۔ ہم سب کے ساتھ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔''

بسمہ نے سہمی ہرنی کی طرح نور کی طرف دیکھا اور اس کی گرفت اپنے باپ کے بازو پر کچھ اور سخت ہوگئی۔ اس کے ہاتھوں کے ناخن زرد دکھائی دینے لگے تھے اور ایسی ہی زردی اس کے ریشمی رخساروں پر بھی کھنڈی تھی۔ وہ خوش شکل تھی۔ اس کے جسم پر سلیقے کا لباس تھا۔ کنگھی کیے ہوئے لمبے بال چوٹی کی صورت میں کمر کی طرف گئے ہوئے تھے مگر ابتلا کے ان لمحوں میں وہ بالکل بے ترتیب اور ہراساں تھی۔ کسی ایسی چڑیا کی طرح محفوظ پناہ گاہ میں گھس جانا چاہتی تھی جس پر نکیلے پنجوں والا عقاب جھپٹ رہا ہو۔

مولوی اشفاق مہرا کی خاموشی دیکھ کر زلفت بیگم کا حوصلہ بڑھا۔ انہوں نے بوڑھے ملازم خدابخش کو آواز دی۔ وہ مؤدب انداز میں دروازے پر نمودار ہوا۔ زلفت بیگم نے کہا۔ ''خدابخش! تم برآنڈے والی بیٹھک خالی کرواؤ...... اور بھائی جی سے کہو کہ ان لوگوں سے گل بات کرنے کے لیے، ان میں سے تین چار بندوں کو اندر بلالیں۔ پر کسی کے پاس کوئی ہتھیار شتھیار نہیں ہونا چاہیے۔''

اس موقع پر اشفاق مہرا نے کچھ کہنا چاہا مگر بس، ان کے ہونٹ کپکپا کر رہ گئے۔ یوں لگتا تھا کہ پچھلے تین چار گھنٹے کی جان لیوا کشمکش نے انہیں اندر سے بالکل توڑ ڈالا ہے۔ وہ کوئی فیصلہ کرنے کے قابل ہی نہیں رہے تھے۔

یہی وقت تھا جب انگریزوں کے زمانے کی اس دو منزلہ حویلی کی چھت پر ایک زبردست دھما کا سنائی دیا۔ یوں لگا کہ نانک چندی اینٹوں کی بنی ہوئی کوئی بڑی دیوار مسمار ہوکر گری ہے۔ اس دھماکے نے کمرے میں موجود خواتین کو چلّانے پر مجبور کردیا۔ بسمہ بھی دہشت زدہ ہوکر باپ سے چمٹ گئی۔ مولوی مہرا خود کو اس سے چھڑاتے ہوئے باہر کی طرف لپکے۔ ملازم خدابخش ان کے ساتھ تھا۔ حویلی کی بیرونی دیواروں کے قریب شور وغل میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ لکڑی اور لوہے کے مضبوط پھاٹک کو توڑنے کی کوششیں عروج پر پہنچ گئی ہیں۔ چھت پر سے کی جانے والی خشت باری میں بھی تیزی آگئی تھی۔

سہمی ہوئی خواتین رو رہی تھیں اور ان میں سے کئی ایک کے ہونٹ بے ساختہ دعائیہ انداز میں ہلتے چلے جارہے تھے۔ زلفت بیگم نے بسمہ کو اپنے گلے سے لگالیا اور اس کا منہ سر چومنے لگیں۔ وہ بے چاری سرتاپا کانپ رہی تھی۔ نور کی خالہ عریفہ اور زلفت بیگم نے اسے بانہوں میں لے کر لکڑی کی ایک چوکی پر بٹھایا۔ خالہ عریفہ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے گلوگیر آواز میں کہا۔ ''نہ میری دھی، اٹھ رو پونچھ لے...... بیٹیاں ہمیشہ اپنے ماں پیو کے لیے قربانیاں دیتی ہیں۔ دیکھنا رب سوہنا تیری مدد کرے گا۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ اج کے ویری کل تیرے پاؤں دھو دھو کر پئیں گے...... ساری مصیبتیں دفع دور ہوجائیں گی۔''

زلفت بیگم نے ایک ملازمہ لڑکی کو خفیف اشارہ کیا۔ وہ دھیمے قدموں سے باہر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک پیلا دوپٹا تھا اور مٹی کا ایک بڑا سا روغنی پیالہ تھا۔ پیالے میں گھلی ہوئی مہندی تھی۔ خالہ عریفہ اور زلفت بیگم نے دوپٹا بسمہ کے جھکے ہوئے سر پر ڈال دیا۔ وہ سسکیوں سے رو رہی تھی۔

نور نے اپنی بڑی بہن کی حالت دیکھی اور سر کا عقبی حصہ دیوار سے ٹکا کر آنکھیں بند کرلیں۔ وہ شاذونادر ہی روتی تھی۔ رونا شاید اس کی فطرت میں ہی نہیں تھا لیکن آج جب اس نے اپنی آنکھیں بند کیں تو گرم آنسوؤں کی دھاریں سی اس کے سرد رخساروں پر بہہ نکلیں۔ وہ جیسے اندر سے چکنا چور ہورہی تھی۔ اس نے آنکھوں کی باریک درز سے دیکھا، اس سے تھوڑی دور فرش پر تانبے کی ایک گول طشتری پڑی تھی۔ اس طشتری میں مٹی کے قریباً ایک درجن دیے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی روشن نہیں تھا۔ کچھ دیے اوندھے اور کچھ سیدھے تھے۔ نور کی دادی ان کے قریب افسردہ بیٹھی تھی۔ اس تنہا حویلی سے باہر درختوں اور جھاڑیوں پر اور اونچے نیچے ٹیلوں پر اور بارشی نالے کے کناروں پر بجلی چمک رہی تھی اور بادل دھاڑ رہے تھے...... مگر حویلی کی بیرونی دیوار کے قریب سے بلند ہونے والی دھاڑیں اب ماند پڑگئی تھیں۔ خشت باری کی آوازیں بھی معدوم ہوگئی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ...... حویلی کی چھوٹی بیٹھک میں بات چیت شروع ہوگئی ہے۔ نور سوچنے لگی۔

کیا یہ بات چیت کامیاب ہوسکے گی؟

کیا وہ قیامت ٹل جائے گی جو دسمبر کی اس طویل رات میں اس حویلی کی دیواروں کے باہر منڈلا رہی تھی؟

کیا مہرا خاندان کی عزتیں بچ جائیں گی؟

کیا اپنی عزت وآبرو کا دفاع کرتے ہوئے اس کے ابا، اس کے تایا، اس کے دونوں ماموؤں اور بہنوں بھائیوں کو اپنی جانیں نہیں گنوانا پڑیں گی؟

سوال تو بہت تھے لیکن جواب کوئی نہیں تھا۔

عین النور نے اپنی آنکھیں بند رکھیں اور خود کو اردگرد کے ماحول سے کاٹنے کی کوشش کرنے لگی...... اور وہ اکثر ایسا کرنے میں کامیاب ہو جاتی تھی۔ وہ ہمیشہ سے ایسی ہی تھی۔ سب سے الگ تھلگ ...... کم گو...... اپنی ہی سوچوں میں گم رہنے والی۔ کہتے ہیں کہ نیند سولی پر بھی آجاتی ہے ......نور کو نیند تو نہیں آئی مگر ایک تھکن سی اس پر طاری ہونے لگی۔ اس تھکن نے اس کی شدید ترین تشویش اور گھبراہٹ کو کسی حد تک کم کر دیا تھا...... ویسے بھی وہ نسبتاً مضبوط اعصاب کی مالک تھی۔ اسے حالات سے لڑنا آتا تھا...... یہ اور بات ہے کہ ایسی لڑائیوں میں وہ بہت مرتبہ ہاری بھی تھی ...... وہ سوچنے لگی...... وہ اس ہولناک رات تک کیسے پہنچی ہے؟ کس طرح کے واقعات نے کس طرح کا رخ اختیار کیا کہ آج وہ اور اس کے خاندان والے اس قیامت کے دہانے پر ہیں۔ اس کا ذہن بڑی تیزی لیکن بڑی تفصیل سے واقعات کی پرتیں کھولنے لگا۔ وہ عارضی طور پر ہی سہی لیکن اپنے اردگرد کے دہشت ناک ماحول سے تھوڑے فاصلے پر چلی گئی۔ بارش، گرج، للکاریں، دھاڑیں، ڈری ہوئی سرگوشیاں، چلتے پھرتے بے تاب قدموں کی آوازیں ...... سب کچھ ساعت میں دھندلا سا گیا۔ ماضیِ دور اور ماضیِ قریب کے مناظر اس کی نگاہوں کے سامنے چلنے لگے۔

☆☆☆

عین النور نے گجرات سے آگے تحصیل پھالیہ کی طرف موراں والی نام کے گاؤں میں آنکھ کھولی تھی۔ یہ خالص دیہاتی علاقہ تھا۔ اب تو وہاں پکی سڑک پہنچ چکی تھی مگر نور کے بچپن میں وہاں صرف کچا راستہ تھا، پکی سڑک تک جانے کے لیے ان لوگوں کو تانگوں وغیرہ پر کوئی دس میل کا فاصلہ طے کرنا پڑتا تھا۔ نور نے ایک بھرے پُرے آسودہ گھرانے میں آنکھ کھولی تھی۔ اس کے والد مولوی اشفاق اور تایا خلیل مہرا علاقے کے خوشحال زمینداروں میں شمار ہوتے تھے۔ نور سے بڑی دو بہنیں بتول اور بسمہ تھیں۔ بھائی کوئی نہیں تھا۔ تینوں بہنوں کا بچپن اسی گاؤں کے کھیتوں کھلیانوں اور سرسبز ٹیلوں پر کھیلتے کودتے گزرا تھا۔ تایا خلیل بھی اسی گھر میں رہتے تھے۔ ان کے بھی تین بچے تھے۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی مہرین

جو کہ تقریباً نور ہی کی ہم عمر تھی۔ اس لیے لڑکے شرجیل اور عثمان تھوڑے سے بڑھا کو تھے لیکن کھیل کود میں وہ بھی سب کے ساتھ شریک ہوتے تھے۔

نور کے بچپن اور لڑکپن کی یادیں بڑی سہانی تھیں۔ ماموں اور تایا اس سے بہت پیار کرتے تھے۔ گھر بھر کے بچوں میں سب سے چھوٹی وہی تھی۔ اسے خصوصی پروٹوکول ملتا تھا...... برسات کے موسم میں آموں کے باغوں میں جھولے، سردیوں کی سنہری دھوپوں میں وسیع لان کے اندر کھیل کود اور گیندے کے پودوں میں تتلیوں کا تعاقب...... گرمیوں میں چاندنی راتیں اور کشادہ چھت پر بچھی ہوئی بہت سی چارپائیاں...... کہانیاں، چٹکلے اور شریر سرگوشیاں...... اور بہار...... بہار کا موسم تو جیسے نور کے دل میں کھب جایا کرتا تھا۔ ان کے گھر کے عقب میں ایک وسیع پھلواری تھی جو ان کی اپنی ہی ملکیت تھی۔ اس پھلواری میں ایک جانب پھل دار درختوں کا باغ تھا۔ نور کی والدہ، دادی جان، پھوپیاں دو ممانیاں اور ان کے بچے اکٹھے ہوتے تو اس باغ میں بہار پر بہار آجاتی۔ ایک بہت بڑی دری بچھائی جاتی۔ اس پر ایک درخت کے ساتھ گاؤ تکیہ لگا کر دادی جان کے بیٹھنے کی جگہ بنائی جاتی۔ ایک جانب ڈھولک رکھ کر گانے گائے جاتے، وہیں پر کھلے میں پکوان بنائے جاتے اور کھیل کود ہوتا۔ ایسی محفلوں میں خاندان کا کوئی مرد شریک نہیں ہوتا تھا اور اونچی دیواروں والے باغ کا دروازہ باہر سے بند کر دیا جاتا تھا۔

گاؤں کی خوشگوار زندگی میں خوشی کی ایک تازہ لہر اس وقت آتی تھی جب سردیوں کے گلابی موسم میں بڑے پیر جی کا میلا آتا تھا۔ اسے عرفِ عام میں امنالے کا عرس کہا جاتا تھا۔ قرب وجوار میں اس میلے کی دھوم تھی۔ لوگ دو ماہ پہلے سے ہی اس موقع کی تیاری شروع کر دیتے تھے۔ کپڑے سلوائے جاتے تھے۔ چوڑیاں، پراندے اور جوتے وغیرہ خریدے جاتے تھے۔ چڑھاوے کی چادریں تیار ہوتی تھیں۔ بچوں کی تیاری کو خاص اہمیت دی جاتی تھی۔ یہ میلا پورا ہفتہ جاری رہتا تھا...... اور ہر بار اہلِ علاقہ کو بہت سی سنہری یادیں دے کر رخصت ہوتا تھا۔

بچپن میں نور بھی اس میلے کو بڑی روانی سے امنالے کا میلا کہا کرتی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کی سمجھ میں آیا کہ یہ لفظ ''امنالا'' نہیں بلکہ امناں والا ہے۔ یعنی امن اور محبت والا۔ بڑے پیر صاحب کا مکمل نام پیر برکات امناں والا تھا۔ وہ زندگی بھر پیار اور محبت کا درس دیتے رہے تھے۔ کہا

جاتا تھا کہ وہ جانی دشمنوں کو جانثار دوستوں میں بدل دیتے تھے۔ ان کی بابرکت ذات کی وجہ سے بہت سے خاندانوں اور برادریوں کے چھوٹے بڑے جھگڑے جڑ سے ختم ہو گئے تھے۔ انہی کی نسبت سے میلے کا نام اماں والے کا میلا پڑ گیا تھا۔

نور نے ساتویں کا امتحان ''موراں والی'' کے ہائی اسکول سے ہی پاس کیا تھا۔ اس وقت اس کی عمر قریباً تیرہ سال تھی...... منجھلی بہن بسمہ کوئی پندرہ سال کی اور بڑی بہن بتول انیس کے لگ بھگ تھی۔ وہ دو ڈھائی سال پہلے میٹرک کر چکی تھی۔ اسکول کے بعد اب وہ کالج جانا چاہتی تھی اور کالج جانے کے لیے اس کا گجرات جانا ضروری تھا۔ وہاں وہ اپنے کچھ ننھیالی عزیزوں کے پاس رہ سکتی تھی۔ نور کے والد مولوی اشفاق بالکل اس کے حق میں نہیں تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ تعلیم کافی ہو گئی ہے، بتول اب سلائی کڑھائی سیکھ لے......اور اگر زیادہ بات ہے تو پھر آرٹس کے مضامین لے کر پرائیویٹ ایف اے کر لے۔ بتول بڑوں کی ہر بات پر سر جھکانے والی لڑکی تھی۔ اس نے وہی کچھ کیا جو اس کے والدین چاہتے تھے۔ بڑی بہن بتول سے نور کو بڑا لگاؤ تھا۔ جب آپی بتول کے بارے میں نور کو پتا چلا کہ وہ کالج نہیں جائے گی تو وہ دل ہی دل میں خوش ہوئی تھی کہ اب اسے آپی کی مزید کمپنی میسر رہے گی۔

ہاں، وہ بڑے اچھے دن تھے۔ سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا مگر پھر ایکا ایکی نور کو محسوس ہونے لگا کہ گھر میں سب اچھا نہیں ہے۔ بڑے کچھ پریشان تھے۔ بند دروازوں کے پیچھے صلاح مشورے کیے جا رہے تھے۔ سرگوشیوں میں باتیں ہوتی تھیں پھر ایک دن نور کو بسمہ سے پتا چلا کہ چودھری طغرل اپنے بڑے بیٹے ابدال احمد کے لیے آپی بتول کا رشتہ مانگ رہا ہے......اور یہ رشتہ آپی سمیت گھر میں کسی کو بھی قبول نہیں۔

یہ بات سب ہی جانتے تھے کہ کھاری برادری کے چودھری طغرل کے دونوں بیٹے انتہا کے بگڑے تگڑے تھے۔ لڑائی جھگڑا، زمینوں پر قبضے، نشے بازی...... کون سی ایسی لت تھی جو ان میں موجود نہیں تھی۔ اپنی جوانی کے زمانے میں چودھری طغرل بھی کچھ کم نہیں رہا تھا۔ ڈھلتی عمر کے ساتھ وہ کچھ دھیما پڑ گیا تھا مگر فطرت تو وہی تھی۔

بڑی بہن بسمہ نے سراسیمہ لہجے میں نور کو بتایا تھا۔ ''یہ کھاری برادری والے بڑے زہریلے لوگ ہیں۔ اپنی بات منوانے کے لیے بہت آگے تک جاتے ہیں۔ پہلے تو پیار محبت اور پالیسی سے کام لیتے رہے ہیں، پر اب دھمکیوں پر اتر آئے ہیں۔''

''کیا کہتے ہیں وہ؟'' نور نے بھولپن سے پوچھا تھا۔

''کہتے ہیں کہ ہمارے اباجی زبان دے کر مکر رہے ہیں، حالانکہ اباجی نے کوئی زبان دی ہی نہیں تھی۔ وہ سفید جھوٹ بول رہے ہیں اور طاقت کے زور پر اس کو سچ بنانا چاہتے ہیں۔''

نور نے کہا۔ ''تو اباجی...... پولیس والوں کو کیوں نہیں بتاتے۔ وہ جو موچھوں والے لمبے سے انکل آیا کرتے ہیں، وہ اباجی کے دوست ہیں۔ اباجی نے کہا تھا کہ وہ تھانیدار ہیں۔''

''وہ چھوٹے تھانیدار ہیں نور۔ یہ جو چودھری طغرل ہے اس کے تعلقات تو بڑے بڑے تھانیداروں سے ہیں۔ ویسے بھی اس طرح کی باتیں پولیس وغیرہ تک نہیں پہنچائی جاتیں۔ بڑے بوڑھے خود ہی بیٹھ کر فیصلہ کر لیتے ہیں۔''

''تو پھر کیوں نہیں کرتے فیصلہ؟ ہم اپنی پیاری آپی کی شادی اپنی مرضی سے کریں گے۔ کسی اور کی مرضی سے نہیں۔''

وہ گھر میں سب سے چھوٹی تھی۔ اسے پریشان کن باتوں سے دور رکھا جاتا تھا پھر بھی اسے یہ احساس ہو رہا تھا کہ حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ ابا اور تایا کے چہرے اُترے رہتے تھے۔ دونوں ماموں جواں سال تھے۔ وہ کسی وقت بہت طیش میں نظر آتے تھے۔ ایک دن اس نے چھوٹے ماموں کو چھت پر بیٹھ کر بڑے غصے میں مسواک چباتے اور اپنی رائفل بھی صاف کرتے دیکھا تھا۔ گھر میں پنچایت وغیرہ کا ذکر بھی چل رہا تھا۔

پھر ایک دن سب کچھ ٹھیک ہوتا محسوس ہوا۔ نور کو پتا چلا کہ گاؤں کے بڑے بوڑھوں نے اباجی کے حق میں فیصلہ دیا ہے اور ان پر سے بلا ٹل گئی ہے۔

اس واقعے کے ڈیڑھ دو ماہ بعد ہی آپی بتول کی شادی کی باتیں ہونے لگیں۔ اپنے خاندان میں ہی ایک دور کے رشتے داروں میں آپی کی بات ہو رہی تھی۔ یہ لوگ ملتان میں رہتے تھے۔ یہ بہت خوشی کی بات تھی لیکن نور ان دنوں کچھ اداس بھی رہا کرتی تھی۔ اس کی آپی بیاہ کر اس سے دور جا رہی تھی۔ یہ سب کچھ خوش اسلوبی سے انجام پا گیا اور اس کی آپی شادی کے بعد اپنے پیا کے شہر چلی گئی۔

اب سب کچھ ٹھیک ہو جانا چاہیے تھا...... اور یہ کچھ عرصے تک ٹھیک بھی رہا مگر پھر آہستہ آہستہ گھر کے ماحول میں دوبارہ بے چینی پائی جانے لگی۔ معاملہ وہی کھاری برادری والوں کا تھا۔ انہوں نے بات اپنے دل سے نکالی

نہیں تھی۔ ایک روز ماں نے اسے بتایا۔ ”تمہارے ابا باغ والی اپنی زمین بیچ رہے ہیں۔“

”پر کیوں امی؟ وہاں تو ہم جھولے ڈالتے ہیں، اتنا مزہ کرتے ہیں۔“ وہ معصومیت سے بولی تھی۔

”وہ زمین کھاپڑا والوں کی زمین کے ساتھ لگتی ہے اور وہاں آئے روز جھگڑا ہوتا ہے۔“

”جھگڑا ہو تو زمین بیچ دی جاتی ہے؟ اور جھگڑا ہوتا کیوں ہے امی؟“

”جنہوں نے جھگڑنا ہوتا ہے وہ کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ لیتے ہیں اور تمہارے ابا اور تایا خواہ مخواہ کی دشمنی سے بچنا چاہتے ہیں۔“

”تو دشمنی سے بچنے کے لیے ہم اپنی زمین کیوں بیچیں۔ وہ لوگ بیچ دیں نا۔“

”جس کا زیادہ زور چلتا ہے اس کی بات بھی چلتی ہے۔“ ماں نے آہ بھر کر کہا تھا۔

وہ زمین بک گئی جہاں نور کے بچپن کی بے شمار یادیں وابستہ تھیں۔ نہ صرف زمین بک گئی بلکہ چند ماہ کے اندر اندر حالات اتنے خراب ہوئے کہ ابا اور تایا نے اپنی باقی زمین بھی فروخت کر دی...... اور آبائی گاؤں موراں والی کو اور گجرات کو چھوڑ کر خاموشی سے لاہور آ گئے۔ نور ان دنوں آٹھویں کے امتحان کی تیاری کر رہی تھی۔

لاہور کی ایک نئی رہائشی کالونی میں ان لوگوں نے دس دس مرلے کے دو بنے بنائے گھر خرید ے تھے۔ دونوں گھروں میں مشکل سے ایک کلومیٹر کا فاصلہ ہوگا۔ ایک گھر تایا کے لیے اور دوسرا ان کے لیے تھا۔ نور کو یہاں ایک اچھے اسکول میں داخلہ مل گیا۔ تایا کے بچوں کو بھی مناسب جگہوں پر داخلے مل گئے۔ بسمہ اب میٹرک پاس کر چکی تھی اور یہاں مسئلہ پھر وہی کالج میں داخلے کا تھا۔ نور کے اباجی تذبذب میں تھے۔ بہرحال تایا جان کی کوشش سے یہ مسئلہ حل ہوا اور اباجی ایک قریبی کالج میں بسمہ کا داخلہ کرانے پر آمادہ ہو گئے۔

یوں تو نور کے والد کی طرح اس کے تایا بھی مذہبی ذہن رکھتے تھے اور انہی کی طرح باریش بھی تھے مگر مولوی جی کا سابقہ صرف نور کے اباجی کے لیے ہی استعمال ہوتا تھا۔ دونوں گھرانوں میں بہت سلوک اور یگانگت کے باوجود تھوڑا سا فرق بھی موجود تھا۔ تایا جان کے گھر میں ٹی وی، ٹیلی فون وغیرہ کی سہولتیں موجود تھیں۔ ان کے بچے پینٹ شرٹ اور دیگر جدید لباس پہنتے تھے اور گھر میں کچھ آزادی دکھائی دیتی تھی مگر نور کے گھر میں چونکہ صرف بیٹیوں نے ہی پرورش پائی تھی، اس لیے یہاں ماحول قدرے سخت تھا۔ پردے اور نماز روزے کی پابندی تایا جان کے گھر سے تھوڑی زیادہ تھی۔ موبائل فون تو ان دنوں موجود ہی نہیں تھا...... مگر عام فون بھی ان کے گھر میں کبھی نہیں لگوایا گیا۔ یوں تو تائی جان بھی پردہ کرتی تھیں لیکن نور کی امی باقاعدہ برقع پہنتی تھیں۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر ان کے گھر میں اکثر ایک طرح کا تناؤ پیدا ہو جاتا تھا۔ اباجی مخلوط تقریبات میں شرکت کرنے کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ شادی کے موقع پر اضافی رسموں سے بھی انہیں اختلاف تھا۔

☆☆☆

گاؤں سے شہر میں آ جانے کے بعد نور کے لیے چند ماہ تک تو روز و شب بڑے اجنبی سے رہے۔ یہاں کی تیز رفتار زندگی سے مطابقت پیدا کرنے میں سب کو دشواری پیش آئی لیکن پھر جلد ہی سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔ اسکول میں نور کی ایک دو سہیلیاں بھی بن گئیں۔ وہ پڑھائی کے علاوہ دیگر سرگرمیوں میں بھی حصہ لینے لگی۔ انہی دنوں اسکول میں کھیلوں کے مقابلے ہوئے۔ نور نے سو میٹر کی دوڑ میں حصہ لیا اور پہلے نمبر پر آئی۔ اسے ایک چھوٹا سا کپ بھی ملا۔ وہ اسکول سے گھر واپس آئی تو امی جان، تائی کے گھر گئی ہوئی تھیں۔ بسمہ کالج سے واپس آ چکی تھی۔ اس نے نور کا پھولا ہوا بستہ دیکھا تو پوچھا۔ ”اوئے، یہ کیا گھسایا ہوا ہے اس میں؟“

”تم بتاؤ کیا ہو سکتا ہے؟“ نور نے الٹا اس سے سوال کیا۔

بسمہ نے بستے کے اندر ہی کپ کو ٹٹول کر دیکھا اور بولی۔ ”کوئی سخت سی چیز لگ رہی ہے۔“

”سخت سی چیز ہے اور سخت محنت کر کے جیتی ہے بھئی۔“ نور نے کہا اور بستے سے کپ نکال کر بسمہ کو دکھایا۔

بسمہ خوش ہوئی۔ ”کس چکر میں ملا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”تمہاری بہن دوڑ میں پہلے نمبر پر آئی ہے...... سو میٹر کی دوڑ۔“

بسمہ تھوڑا سا چونکی پھر ادھر ادھر دیکھ کر بولی۔ ”اوئے تیرا بیڑا اترے۔ تُو نے دوڑ میں حصہ لیا ہے؟“

”بتا تو رہی ہوں۔“

بسمہ نے کہا۔ ”اباجی کو پتا چل گیا نا... تو ٹھیک ٹھاک جھاڑیں پڑیں گی۔ ان کو یہ بھی اچھا نہیں لگے گا۔

”مگر بسمہ اس میں حرج ہی کیا ہے۔ میں نے کوئی تیراکی... میں تو حصہ نہیں لیا۔ دوڑ میں ہی لیا ہے نا...... اور وہ بھی حجاب پہن کر۔“

"مگر تو دوری تو ہے نا چہیتی بیگم۔ ذرا نخرے تو مارتے ہیں نا تُو نے؟"

"میری کسی بات پر یہاں تو کوئی خوش ہی نہیں ہوتا۔" نور نے منہ بنایا۔ "آپی یا تمہاری ہر بات کی تعریف ہوتی ہے۔ مجھے تو جیسے ایک کونے میں ڈالا ہوا ہے۔ اباجی تو رحم کی نظر ہی نہیں ڈالتے۔ لگتا ہے ان کی سگی بیٹی ہی نہیں ہوں۔"

"خبیث کہیں کی۔" بسمہ نے اس کا کان مروڑا۔ "بہت محبت کرتے ہیں وہ تجھ سے۔ بس یہ جو تیری دکھری رگ ہے نا اس کی وجہ سے پریشان ہوتے ہیں کبھی کبھی۔"

"کیا دکھری رگ ہے میری؟"

"یہ جو ہر وقت رسالے پڑھتی ہے...... کسی کونے میں گھسی رہتی ہے...... اور نمازیں بھی قضا کر دیتی ہے۔"

"کب نمازیں قضا کرتی ہوں میں؟" نور نے لڑاکی مرغی کی طرح پر پھیلائے۔ "کب کونے میں گھسی رہتی ہوں ...... اور رسالے کو تو ہاتھ لگائے، آج مجھے پورا ایک مہینا ہو گیا ہے۔"

"توبہ توبہ...... پورا ایک مہینا۔ ابھی پرسوں اتوار کو چھت پر بیٹھی کیا پڑھ رہی تھیں؟"

"وہ رسالہ نہیں تھا، اسکول کا میگزین تھا۔ اسپورٹس کے صفحے دیکھ رہی تھی۔" نور تنک کر بولی۔

شاید یہ بحث مزید آگے چلتی مگر اسی دوران میں بیرونی دروازے پر کھٹکا ہوا۔ بسمہ نے نور کا چھوٹا سا کپ جلدی سے اس کے اسکول بیگ میں گھسا دیا اور بیگ کو بیڈ کے نیچے کر دیا۔ اندر آنے والے اباجی ہی تھے۔ وہ آج کل لاہور کے مضافات میں کچھ زمین خرید کر وہاں چھوٹے چھوٹے رہائشی پورشن وغیرہ بنانے کا ارادہ رکھتے تھے...... اور اس سلسلے میں بڑے ماموں مراد کے ساتھ مل کر کافی بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اردو بازار میں ایک دکان بھی خریدی تھی جہاں وہ اسلامی کتب کی ہول سیل کا ارادہ رکھتے تھے۔

اپنی کامیابی اور کپ کے حصول کی خوشی نور کو کسی طرح ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ اگلے روز اس نے والدہ کو بھی اپنا جیتا ہوا کپ دکھایا۔ والدہ خوش ہوئیں لیکن انہوں نے بھی تقریباً وہی بات کہی جو اس سے پہلے بسمہ کہہ چکی تھی۔ انہوں نے کہا۔ "نور! بس اپنی پڑھائی کی طرف توجہ رکھو۔ اب تم نے میٹرک کا امتحان دینا ہے اور یہ کوئی آسان نہیں ہوتا۔"

"آپ فکر نہ کریں۔ میں پاس کر لوں گی۔" وہ بے پروائی سے بولی اور الہڑ انداز میں چارپائی پھلانگتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی۔

اس سے اگلے روز جب وہ اسکول پہنچی تو اسکول میں اسپورٹس کی ٹیچر مسز نبیلہ وجدان نے اسے اپنے پاس بلایا اور اسے مشورہ دیا کہ وہ فزیکل ٹریننگ میں باقاعدگی سے حصہ لے اور خاص طور سے رننگ میں۔ اس کی رننگ اچھی ہے اور وہ محنت کرے تو مقابلے جیت سکتی ہے۔

نور نے کہا۔ "ٹیچر! شاید میرے گھر والے بھی مجھے اس کی اجازت نہ دیں۔"

"ہائیں۔" مسز وجدان نے حیرت سے آنکھیں نکالیں۔ "یہ کیا بات ہوئی۔ تم ایک صحت مند سرگرمی میں حصہ لے رہی ہو اور وہ بھی چار دیواری کے اندر۔ اس میں ایسی کیا بات ہے؟"

وہ بولی۔ "ٹیچر! دراصل...... میرے ابا جان...... اس معاملے میں ذرا سخت ہیں۔ شاید وہ منع کر دیں۔"

"کبھی بھی نہیں کریں گے۔ تم کسی دن مجھے ان سے ملواؤ۔ میں خود بات کروں گی۔" مسز وجدان نے پورے یقین سے کہا۔

نور نے یہ بات بڑی بہن بسمہ کو بتائی اور اس سے درخواست کی کہ وہ اس سلسلے میں اسے اباجی سے اجازت لے کر دے۔ نور کی نسبت بسمہ اور بتول کی بات اشفاق صاحب ذرا نرمی سے سن لیتے مگر یہ موضوع ایسا تھا کہ بسمہ کی بھی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ دو تین دن کوشش کرتی رہی کہ اس حوالے سے تھوڑا بہت ابا جان کو بتا دے...... تاکہ اگر انہیں بعد میں پتا چلے تو وہ بہت زیادہ ناراض نہ ہو جائیں مگر نور اور بسمہ میں سے کوئی بھی یہ بات اباجی کے سامنے زبان پر نہ لا سکیں۔ رہیں والدہ تو ان کی والد صاحب کے سامنے سٹی ہی گم ہو جاتی تھی۔ اشفاق صاحب آج کل ویسے بھی ذرا ناخوشگوار موڈ میں تھے۔ تعمیری کام کے سلسلے میں کچھ دشواری پیش آ رہی تھی۔ وہ آتے اور ان کی پیشانی کا بل دیکھ کر ہی نور سمجھ جاتی کہ بسمہ آج بھی کوئی بات نہیں کر سکے گی۔

تین چار روز بعد دونوں بہنوں نے یہ کوشش ویسے ہی ترک کر دی۔ سب کچھ معمول کے مطابق چلتا رہا۔ ایک دن اسپورٹس ٹیچر مسز وجدان نے پھر نور کو اسٹاف روم میں بلایا۔ انہوں نے کہا۔ "نور! تم نے اپنے والد صاحب سے بات نہیں کرائی؟"

وہ جواب پہلے ہی تیار کر چکی تھی۔ "ٹیچر! آج کل وہ کنسٹرکشن کرا رہے ہیں۔ بہت زیادہ مصروف ہیں۔ اب بھی

لاہور سے باہر گئے ہوئے ہیں۔"

"ٹھیک ہے، جب بھی موقع ملے مجھے ان سے ضرور ملواؤ...... اور دیکھو اگلے مہینے ایک اچھا ایونٹ ہے۔ ہمارے اسکول کی لاہور کی تمام برانچز کے مشترکہ کھیل ہو رہے ہیں۔ تم ان میں حصہ لو۔ تھوڑی محنت کرو تو پہلی، دوسری پوزیشن حاصل کرسکتی ہو۔"

"مجھے کرنا کیا ہوگا ٹیچر؟"

"کچھ بھی نہیں۔ فزیکل ٹریننگ کا پریڈ تو ہوتا ہی ہے، اس میں باقاعدگی سے حصہ لو۔ پھر ہفتے میں دو روز ایک ڈیڑھ گھنٹے کے لیے رننگ کی ٹریننگ ہوتی ہے، جوگرز تو ہوں گے تمہارے پاس؟"

"نہیں ٹیچر! لیکن میں لے لوں گی۔" وہ بولی۔

"شاباش۔ تم ضرور آگے بڑھوگی۔ ایک اچھی "اسپرنٹر" بنوگی۔" انہوں نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔

نور خاموشی سے ٹریننگ میں حصہ لیتی رہی۔ مسز وجدان اس پر خصوصی توجہ دے رہی تھیں۔ پریکٹیکل کے ساتھ ساتھ وہ اسے تھیوری بھی سمجھا رہی تھیں۔ "دیکھو نور! چھوٹے فاصلوں کی دوڑوں میں اسٹارٹنگ کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اگر کوئی ایتھلیٹ اسٹارٹ میں سیکنڈ کے دسویں حصے کی بھی دیر کرتا ہے تو یہ دسواں حصہ آگے جاکر ایک یا دو سیکنڈ میں بدل جاتا ہے......"

ایک دن انہوں نے کہا۔ "نور! دوسری لڑکیوں کی نسبت تمہارے reflexes بہت اچھے ہیں...... کسی وقت مجھے لگتا ہے کہ تم نیچرل ونر ہو۔ کیا تمہاری فیملی میں پہلے بھی کوئی ایتھلیٹ رہا ہے؟"

"نہیں ٹیچر۔" نور نے نفی میں سر ہلایا۔ "لیکن اگر آپ بھاگ دوڑ کو ایتھلیٹس کہیں تو پھر بھاگ دوڑ تو ہم نے خوب کی ہے۔ میں نے آپ کو بتایا تھا ناکہ ہم پہلے گاؤں میں رہتے تھے۔ وہاں ہمارے گھر کے ساتھ بہت بڑا باغ تھا۔ ہم بہن بھائی سارا سارا دن اس میں دوڑیں لگاتے تھے۔ میں کسی کے ہاتھ نہیں آتی تھی۔ کزنز نے میرا نام "اڑن چھو" ڈال رکھا تھا۔"

"تم واقعی اڑن چھو بن سکتی ہو نور۔ بس تھوڑی سی محنت اور مستقل مزاجی چاہیے۔"

اسکول کی "برانچز" کے مقابلے ہوئے۔ ان میں سو میٹر کی ریس بھی تھی۔ نور نے یہ فائنل مقابلہ بہ آسانی جیت لیا۔ وہ دوسرے نمبر پر آنے والی کھلاڑی سے کم از کم دو سیکنڈ آگے رہی تھی۔ ٹیچرز کے علاوہ ڈائریکٹر صاحب نے بھی اس کی بہت تعریف کی۔ اسے ٹرافی ملی اور تعریفی سرٹیفکیٹ بھی۔

اس مرتبہ اس کی یہ کامیابی چھپی نہیں رہ سکی۔ تایا کے گھر میں بھی سب کو پتا چل گیا تھا لہٰذا بسمہ نے ضروری سمجھا کہ ابا جان کو بھی یہ بات خود بتادی جائے۔ اس روز ان کا موڈ بھی قدرے بہتر تھا نمازِ مغرب کے بعد بسمہ نے اوڑھنی سختی سے اپنے سر اور چہرے کے گرد لپیٹی اور ابا جان کے پاس چلی گئی۔ اس نے ٹرافی ابا جان کو دکھائی۔ "یہ کس کی ہے؟" وہ حیران ہوکر بولے۔

"نور کی...... اسکول سے ملی ہے۔"

"مگر اس کے نمبر تو اتنے اچھے نہیں تھے؟"

"اباجی! اس نے دوڑ میں حصہ لیا تھا۔ یہ دیکھیں یہ سرٹیفکیٹ بھی ہے۔" مولوی اشفاق مہر کی پیشانی پر بے ساختہ ایک بل نمودار ہوگیا۔ سرٹیفکیٹ اور ٹرافی دیکھنے کے بعد انہوں نے دونوں چیزیں آہستہ سے ایک طرف رکھ دیں اور بولے "وہ خود کہاں ہے؟"

"ڈ...... ڈر رہی تھی کہ آپ کو برا نہ لگے۔"

"ڈر تو اللہ کا ہونا چاہیے۔ ہم نے یہاں کون سا بیٹھے رہنا ہے تم لوگوں پر پابندیاں لگانے کے لیے۔" انہوں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ پھر آواز دی۔ "عین النور! کہاں ہو عین النور!" وہ اسے ہمیشہ پورے نام سے پکارتے تھے۔

نور ڈری ڈری سی باپ کے بستر پر پائینتی کی طرف آ بیٹھی۔ وہ نسبتاً دھیمے لہجے میں بولے۔ "دیکھو بیٹی، ماں باپ کبھی بھی اپنی اولاد کا برا نہیں سوچتے۔ وہ سوچ ہی نہیں سکتے۔ ان کی رائے اور مشورے میں بھلائی کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہوتا۔ یہ کھیل کود، اچھل پھاند لڑکوں کے کام ہیں۔ لڑکیاں پڑھائی اور گھر گرہستی کے کاموں میں ہی اچھی لگتی ہیں......"

"بس اباجی! ٹیچر نے ہی زور دیا تھا کہ تھوڑا بہت......" آواز اس کے گلے میں اٹک گئی۔

"کیا تھوڑا بہت؟" وہ عینک درست کرکے بولے۔

"یہی کہ نصابی سرگرمیوں کے علاوہ بھی تھوڑا بہت...... ہونا چاہیے۔"

"تو بھئی، نصابی سرگرمیوں کے علاوہ تم اور بھی تو کچھ کرسکتی ہو۔ تمہاری آواز اچھی ہے۔ قرأت اور نعت خوانی کے مقابلوں میں حصہ لے سکتی ہو۔ پھر تقریری مقابلے ہوتے ہیں۔ سلائی کڑھائی کے کمپٹیشن ہوتے ہیں......"

"ٹھیک ہے...... ابا جان...... میں کوشش کروں گی۔" اس نے کہا۔

وہ طویل سانس لے کر بولے۔ "دیکھو بیٹا نور! ہم ایک دیندار گھرانے سے ہیں۔ ہماری کچھ روایات ہیں، کچھ اصول ضابطے ہیں۔ کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرے دوسرے بچوں کی بہ نسبت تم ان اصول وضابطوں سے کچھ دور ہو۔ یہ چیز مجھے کبھی کبھی رنج بھی دیتی ہے...... اپنے ان معاملات پر غور کرو اور میں ایک بار پھر کہتا ہوں، والدین کبھی بھی اپنے بچوں کا برا نہیں سوچتے۔"

وہ بس اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔ وہ کوشش کر رہی تھی کہ اس کی اوڑھنی سر سے سرکنے نہ پائے۔ کل اس نے اپنے بالوں کی کچھ کمزور لٹیں کاٹی تھیں۔ یہ کٹنگ اس موقع پر اباجی کے سامنے آجاتی تو ان کی خفگی ایک دم غصے میں بدل سکتی تھی۔

نور پڑھائی میں بہت اچھی نہیں تھی۔ تاہم وہ ان طالب علموں میں سے تھی جو تھوڑی کوشش کے ساتھ امتحان بہ آسانی پاس کر لیتے ہیں۔ پڑھائی جاری رہی اور اس کے ساتھ تھوڑا تھوڑا شوق بھی ہوتا رہا۔ اسے اب خود بھی رننگ میں دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی۔ اسپورٹس ٹیچر کی ہدایت کے مطابق اسے اسکول میں آدھی چھٹی کے بعد ایک پریڈ کی اضافی چھٹی مل جاتی تھی۔ وہ اور اس کی کلاس فیلو شاہینہ اس دوران میں رننگ کرتی تھیں۔ اسکول کا گراؤنڈ خاصا وسیع تھا۔ ایک چکر تقریباً نصف کلومیٹر کا بن جاتا تھا۔ وہ دونوں روزانہ قریباً چار چکر لگاتیں۔ اس کے بعد گھنے درختوں کے نیچے ایک پاتھ پر "اسپرنٹس" یعنی سو میٹر کی تیز رفتار دوڑیں لگائی جاتیں۔ اکثر اوقات مسز وجدان بھی موقع پر موجود ہوتی تھیں۔ وہ دونوں لڑکیوں کو سو میٹر کے اسرار و رموز سمجھاتیں۔ اسٹاپ واچ ان کے ہاتھ میں ہوتی تھی...... اور نگاہیں فنش لائن پر۔ وہ اس بات پر خوش تھیں کہ دونوں لڑکیوں کا ٹائم روز بروز بہتر ہو رہا تھا۔ خاص طور سے نور کا۔

ٹرافی والے واقعے کے بعد اباجان اور نور میں دوڑ وغیرہ کے بارے میں پھر کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ وہ پوری طرح تعمیراتی کام میں الجھے ہوئے تھے۔ اباجان کو نور سے جو دو چار شکایتیں تھیں، وہ اس نے دور کرنے کی کوشش کی تھی۔ اب وہ صبح جلدی اٹھتی تھی۔ نماز میں بے قاعدگی ختم کر دی تھی۔ کزنز کی موجودگی میں دوپٹا اپنے سر سے سرکنے نہیں دیتی تھی، اس کے علاوہ پڑھائی پر بھی توجہ دے رہی تھی۔

ایک دن نور اسکول سے گھر آئی تو بسمہ کو روتے ہوئے پایا۔ وہ بھی ابھی ابھی کالج سے لوٹی تھی اور اپنے سفید براق یونیفارم میں پیاری لگ رہی تھی۔

"کیا ہوا بسمہ؟" نور نے بڑی بہن کو بے تکلفی سے بانہوں میں لیتے ہوئے پُرتشویش لہجے میں پوچھا۔

وہ پہلے تو ٹالتی رہی پھر اس نے بتایا کہ آج گاؤں سے دو بندے آئے تھے۔ وہ اباجی اور تایا کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر باتیں کرتے رہے۔ ان میں سے ایک دو باتیں بسمہ کے کانوں میں بھی پڑ گئی تھیں۔

"کیا کہا انہوں نے؟" نور نے پوچھا۔

بسمہ ناک سے سُوں سُوں کی آواز نکالتے ہوئے بولی۔ "نور! ہم حیران ہوتے تھے نا کہ آپی بتول والا معاملہ تو ختم ہو گیا...... پھر تایا اور اباجان گاؤں چھوڑ کر یہاں شہر میں کیوں آ گئے۔"

"ہاں، یہ حیرانی تو تھی۔"

"اس کی وجہ امی اور دادی کو بھی معلوم تھی۔ پر انہوں نے کبھی ہم سے ذکر نہیں کیا۔"

"کیا وجہ تھی؟"

"وہ لوگ ابھی تک اپنے مطالبے سے پیچھے نہیں ہٹے نور...... خاص طور سے چودھری کا بیٹا ابدال۔ وہ ابھی تک اپنی ہٹ پر قائم ہے، چودھری اب کہتے ہیں کہ اگر بڑی کا رشتہ نہیں ہو سکا تو چھوٹی کا ...... یعنی میرا رشتہ انہیں دیا جائے۔ اب پنچایت والے بھی ان کا ساتھ دے رہے ہیں۔ وہ ایک ہی بات کہتے ہیں کہ ہمارے گھر والے زبان دے کر انکاری ہوئے ہیں۔ انہیں کم از کم ایک لڑکی کا رشتہ تو دینا ہو گا۔"

"اوہ گاڈ۔" نور نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔

"یہ ضد اور ہٹ دھرمی بھی کیا بلا ہوتی ہے ان چودھریوں وڈیروں میں...... خدا کے بندو! شادی تو زندگی بھر کا ساتھ ہے اور اس میں لڑکے لڑکی کا راضی ہونا ضروری ہے۔ یہ کیا بات ہوئی کہ کسی کو گائے بکری کی طرح کان سے پکڑا اور کسی کھونٹے سے باندھ دیا۔" نور کے لہجے میں تپش تھی۔

"یہی بات تو ان لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔" بسمہ بولی۔

"اب کیا ہو گا؟"

"اباجان اور تایا جان کل گجرات جا رہے ہیں۔ کسی ایم پی اے سے بات کرنی ہے انہوں نے تاکہ یہ جھگڑا زیادہ نہ بڑھے۔"

امی بڑے کمزور دل کی تھیں۔ وہ تو جیسے بستر سے لگ گئیں۔ ان کی بیماری کی ایک نہیں دو وجوہات تھیں۔ ایک تو یہی بسمہ والا معاملہ۔ وہ کئی بار بے حد دکھی لہجے میں کہہ چکی تھیں، یہ لوگ ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے پڑ گئے ہیں...... ان

کی پریشانی کی دوسری وجہ بڑی بی بی بتول کے گھریلو حالات بھی تھے۔ وہ ایک بچی کی ماں بن چکی تھی۔ ملتان میں وہ اپنے سسرال میں زیادہ خوش نہیں تھی۔ شوہر غیاث سخت مزاج کا تھا اور کسی وقت مار پیٹ کی نوبت بھی آجاتی تھی۔ دو تین دفعہ وہ ناراض ہو کر میکے آ گئی تھی مگر پھر صلح ہو جاتی تھی اور شوہر اسے لے جاتا تھا۔

ابا اور تایا جان بار بار گجرات جا رہے تھے۔ کسی وقت ان کے ساتھ بڑے ماموں بھی ہوتے تھے۔ ایسے ہی ایک سفر کے دوران میں نور کے ابا جان کو ہائی بلڈ پریشر کی تکلیف بھی ہوئی اور وہ گھر آنے کے بجائے اسپتال پہنچے۔ اس دن نور کی امی بڑی آزردہ تھیں۔ انہوں نے کہا۔ ''ہمارے بڑے کہا کرتے تھے کھاپریوں سے کبھی کوئی تعلق واسطہ نہ رکھنا۔ یہ کھوٹے اور خطرناک لوگ ہیں۔ پر تیری دادی......''

وہ کہتے کہتے چپ ہو گئیں۔

نور نے ماں کو ذرا کریدا تو انہوں نے ڈرے ڈرے لہجے میں کہا۔ ''یہ سب تیری دادی کا ہی کیا دھرا ہے۔ نہ ان کی کھاپریوں کی وڈی ماں سے اتنی دوستی ہوتی اور نہ یہ مصیبت ہمارے گلے پڑتی۔''

نور اب قدرے سیانی ہو چکی تھی۔ اب اسے بات کو کریدنا اور اس کی تہ تک پہنچنا آ گیا تھا۔ اس نے کہا۔ ''امی! اگر چودھری طغرل کی ماں کے ساتھ ہماری دادی کا اٹھنا بیٹھنا تھا تو اس سے یہ مطلب کیسے نکل آیا کہ ہم نے کھاپریوں کو آپی بتول کے رشتے کے لیے زبان دے دی تھی؟''

''یہ بات کافی پیچھے تک گئی ہوئی ہے نور۔'' والدہ نے کہا۔ ''یہ دونوں عورتیں سہیلیوں کی طرح تھیں۔ اس وقت تیری آپی بتول کی عمر چار پانچ سال کی ہو گی۔ کھاپریوں کی ماں نے بتول کو کھیلتے دیکھا اور کہا کہ اسے تو میں اپنے پوترے ابدال کی ووہٹی بناؤں گی۔ بس اتنی سی بات تھی جو بنتے بنتے بتنگڑ بن گئی۔ کھاپریوں کے ساتھ تمہارے ابا اور تایا کا کوئی زمین کا جھگڑا بھی تھا لیکن یہ جھگڑا دونوں عورتوں کی دوستی اور میل جول کے نیچے دبا رہا۔ کھاپریوں کو اس بات کا لالچ تھا کہ جب بتول کا رشتہ مل جائے گا تو وہ زمین بھی خودبخود ان کے پاس چلی جائے گی جس کا جھگڑا تھا۔ بتول ویسے بھی شکل صورت کی اچھی تھی۔''

نور نے کہا۔ ''اباجی اور تایا جی کو ان ساری باتوں کا پتا نہیں تھا؟''

''پتا تھا لیکن اس وقت یہ تو پتا نہیں تھا کہ طغرل کے پتر بڑے ہو کر اسے طرح کے نکلیں گے۔ بہرحال تمہارے ابا نے کبھی بھی منہ سے اس رشتے کے لیے اقرار نہیں کیا تھا۔ ہاں کھاپریوں کی وڈی ماں زورازوری کرتی رہی۔ کبھی بتول کے کپڑے لے آتی، کبھی عید شب برات شروع کر دی۔''

اب بات کافی حد تک نور کی سمجھ میں بھی آ رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ آپی بتول کی شادی کے بعد باغ والی زمین کا جو جھگڑا شروع ہوا، اس کی وجہ آپی بتول کی شادی ہی تھی اور اب بات وہیں تک نہیں رکی تھی۔ وہ لوگ ان کے اباجی کو مجبور کر رہے تھے کہ وہ اپنی چھوٹی بیٹی کا رشتہ ان کو دیں، اسے یہ بھی پتا چلا کہ آپی بتول کی شادی کے بعد ایک اہم واقعہ یہ ہوا تھا کہ ابدال کا بڑا چاچا ایم پی اے بن گیا تھا۔ انہیں سیاسی اثر رسوخ حاصل ہو گیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ اب آپی کے بعد وہ بسمہ کا رشتہ مانگنا شروع ہو گئے تھے۔

تین چار ہفتے کافی تناؤ میں گزرے پھر یہ معاملہ کچھ سدھر گیا۔ اباجی بھی اب بہتر تھے لیکن اس سارے تصفیے نے ایک نقصان کر دیا تھا اور یہ کافی بڑا نقصان تھا۔ نور نے اپنی والدہ کو کھو دیا تھا۔ تناؤ بھرے دنوں میں ایک دن ایسا آیا جب ان کا ایک پہلو بے جان ہو گیا۔ ان پر فالج کا شدید حملہ ہوا تھا۔ چند گھنٹے اسپتال میں گزارنے کے بعد وہ منوں مٹی کے نیچے جا سوئیں۔

ان کی وفات نے نور اور بسمہ کو جیسے بنیادوں سے ہلا دیا تھا۔ والد نے تو ہمیشہ ان سے تھوڑا فاصلہ رکھا تھا، یہ والدہ ہی تھیں جو ان کے ہر دکھ سکھ میں شریک رہتی تھیں اور تینوں بیٹیوں کے ہر طرح کے مسائل کا حتی المقدور سامنا کرنے کی کوشش کرتی تھیں۔ نور ہر وقت غم اور اداسی کے ایک نادیدہ حصار میں رہنے لگی۔ میٹرک کا فائنل امتحان سر پر تھا مگر وہ پڑھائی پر کوئی توجہ نہیں دے پا رہی تھی۔ اسپورٹ والی سرگرمی بھی ایک دم ماند پڑ چکی تھی۔ ویسے بھی وہ امتحان کے لیے اسکول سے فارغ ہو چکی تھی۔

ایک روز اسپورٹس کی ٹیچر مسز وجدان بالکل غیر متوقع طور پر ان کے گھر آن پہنچیں۔ شکر کا مقام تھا کہ اس وقت نور کے ابا جان گھر میں موجود نہیں تھے ورنہ جونہی مسز وجدان نے اپنا تعارف کرانا تھا ابا جان کا پارہ چڑھنا شروع ہو جانا تھا۔ مسز وجدان نے نور کے ساتھ دیر تک دلجوئی کی باتیں کیں۔ پھر اس کے بڑے ماموں مراد کو بھی بلا لیا۔ مسز وجدان نے نور کے ماموں مراد اور بہن بسمہ کو بتایا کہ نور میں ایتھلیٹکس کے حوالے سے غیر معمولی صلاحیت موجود ہے۔ انہوں نے کہا۔ ''مجھے بڑا افسوس ہو گا اگر کسی وجہ سے نور کا ٹیلنٹ ضائع ہو جائے۔ آپ لوگوں کو اس سلسلے میں

کردار ادا کرنا چاہیے [illegible] میں کچھ تحفظات ہیں تو آپ لوگ ان سے بات کریں۔ انہیں سمجھائیں۔''

ماموں مراد بولے۔ ''ٹیچر! ہم نور کے حوالے سے آپ کے خیالات کی قدر کرتے ہیں مگر ہر گھر کے اپنے معاملات اور مسائل ہوتے ہیں۔ ہم نہیں سمجھتے کہ بھائی جان سے بات کرنے کا کچھ فائدہ ہوگا۔ یہ آ بیل مجھے مار والی بات ہوگی...... اس حوالے سے خاموشی ہی بہتر ہے۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ نور خاموشی سے رننگ میں حصہ لیتی رہے؟''

''جی ہاں۔ اگر اسے شوق ہے اور آپ سمجھتی ہیں کہ یہ اس کے لیے اچھا شوق ہے تو پھر یہ شوق خاموشی سے بھی پورا ہو سکتا ہے۔''

مسز وجدان نے نور کو مجبور کیا کہ وہ امتحان سے فارغ ہوتے ہی ان سے رابطہ کرے اور فراغت کے ڈھائی تین ماہ میں اپنی ٹریننگ کو آگے بڑھائے۔

نور مناسب قد اور چھریرے جسم کی مالک تھی۔ رنگ بچپن میں گندمی تھا لیکن اب کافی کھلتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ نقوش بھی جاذب تھے۔ گو بسمہ اس سے زیادہ خوبصورت تھی مگر اس کی کمی نور کے نہایت متناسب جسم اور الھڑپن نے پوری کر دی تھی۔ یہ نوخیز شباب کے دن تھے، اس کے جسم سے جیسے توانائی پھوٹتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ وہ ڈٹ کر کھاتی تھی مگر بھاگ دوڑ کے سبب یہ خوش خوراکی اس کے ''فگر'' کو نقصان نہیں پہنچاتی تھی۔

امتحانات کے بعد نور خاموشی سے مسز وجدان کے پاس ان کی ٹریننگ اکیڈمی میں جاتی رہی۔ مسز وجدان چند سال پہلے تک خود بھی نیشنل لیول کے مقابلوں میں حصہ لیتی رہی تھیں اور انہوں نے ریس کے کئی اہم ایونٹس جیت رکھے تھے۔ انہیں نور میں ایسا اسپارک نظر آ رہا تھا جو اس کو آگے لے جا سکتا تھا۔ نور نے بسمہ سے مشورے کے بعد ابا جان اور دادی کو یہی بتایا تھا کہ وہ کوکنگ کا ایک کورس اٹینڈ کر رہی ہے اور یہ سفید جھوٹ بھی نہیں تھا۔ وہ ایک آدھ گھنٹے کے لیے ایک کوکنگ کے اسکول میں جاتی تھی مگر وہاں سے فوراً مسز وجدان کی اکیڈمی میں پہنچ جاتی تھی۔ اس کے جوتے اور ٹریک سوٹ وغیرہ بھی وہیں پڑے رہتے تھے۔ وہ بڑی لگن سے سیکھ رہی تھی۔

میٹرک کا امتحان نور نے سیکنڈ ڈویژن میں پاس کر لیا۔ تاہم اس دوران میں اسے رننگ میں کئی چھوٹی چھوٹی [illegible] بڑھنے لگا۔ کھیل کے حوالے سے اس پر ایک جنون سا سوار ہونے لگا۔ اس نے ان بڑے ملکی اور غیر ملکی رنرز کے بارے میں پڑھا جنہوں نے اپنا اور اپنے خاندان کا نام روشن کیا اور کامرانیاں سمیٹیں۔ اس کے اندر ایک زبردست تحریک پیدا ہونے لگی۔ وہ جب جب آپی کی تلخ گھریلو زندگی کو دیکھتی تھی اور اپنی مرحومہ ماں کے گھٹن زدہ روز و شب کو یاد کرتی تھی، اس کے اندر کچھ کر گزرنے کا شوق فزوں تر ہوتا تھا۔ اسے ہمیشہ سے یہی لگا تھا کہ وہ ایک چھوٹی موٹی لڑکی نہیں ہے۔ وہ اپنی دونوں بڑی بہنوں سے مختلف تھی اور بات فقط دونوں بہنوں کی ہی نہیں تھی، وہ اپنے خاندان کی اکثر لڑکیوں سے بھی مختلف تھی۔ گڑیوں سے کھیلنا اسے بچپن اور لڑکپن میں بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ کپڑوں کا بھی بہت زیادہ شوق نہیں تھا۔ خوامخواہ شرمانا، چلمنوں کے پیچھے چھپنا، لمبے لمبے گھونگھٹ نکال کر خود کو مزید نمایاں کرنے کی کوشش کرنا، بات بات پر اوئی اللہ...... ہائے اللہ مر گئی...... جیسے جملوں کا استعمال اور نازونزاکت کے سارے انداز اسے ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے۔ وہ اس نادیدہ حصار کو توڑنا چاہتی تھی جو موراں والی گاؤں کی اکثر لڑکیوں کے اردگرد موجود تھا۔ کبھی کبھی اسے لگتا تھا کہ اسے پر دیے گئے ہیں اور وہ اڑ سکتی ہے۔ اس کی زندگی اس کی ماں اور آپی کی زندگی سے بہت مختلف ہو سکتی ہے۔

پچھلے پانچ چھ ماہ میں اس نے کئی چھوٹے بڑے میڈل اور کپ جیتے تھے۔ وہ یہ سارے انعامات گھر کے بیسمنٹ میں موجود امی جان کی ایک پرانی جستی پیٹی میں لحافوں کے نیچے رکھ دیتی تھی۔ بسمہ کے علاوہ کسی کو اس کلیکشن کا پتا نہیں تھا۔

دو سال پہلے بسمہ کو تو کالج میں داخلہ مل گیا تھا مگر جب نور کی باری آئی تو ابا جان نے برملا کہہ دیا کہ وہ کالج نہیں جائے گی۔ ان کے سخت رویے کی وجہ یہی تھی کہ وہ ہر وقت نور کی طرف سے چونکے رہتے تھے۔ ایک روز جب نور...... کوکنگ اسکول سے (اور دراصل مسز وجدان کی اکیڈمی) واپس گھر آئی تو دادی اور ابا جان میں بات چیت ہو رہی تھی۔ دروازے کی اوٹ سے کچھ اڑتے اڑتے فقرے نور کے کانوں میں بھی پڑے۔ دادی نے کہا۔ ''توبہ یا اللہ یہ وقت بھی دیکھنا تھا ہم نے۔ لڑکیاں اکیلی گھومنے نکلتی ہیں اور جب دل چاہے واپس آتی ہیں۔ کوئی پوچھنے بتانے والا نہیں۔ میں تمہیں صاف بتا دیتی ہوں اشفاق! تیری اس چھوٹی کے چھن ٹھیک نہیں۔ اس کو ذرا سنبھال کر رکھ۔ لڑکوں

کی طرح کداڑے مارتی پھرتی ہے۔لڑکیوں بالیوں والی کوئی شرم کوئی نزاکت ہی نہیں اس میں۔"

"اماں جی! آپ جانتی ہیں، شروع سے ہی ایسی ہے وہ۔اب بڑی ہو رہی ہے،طور طریقے بھی آجائیں گے۔"

"آئے ہائے...... اور کتنی بڑی ہوگی۔ کوٹھے جتنی ہوگئی ہے۔کل سیڑھیوں پر یوں چڑھ رہی تھی، جیسے کوئی گھوڑی دولتیاں مارتی ہوئی جا رہی ہو۔ نہ سر پر دوپٹا نہ پاؤں میں جوتی۔میں تو کہتی ہوں بتول کی طرح اسے بھی گھر میں ہی بارھویں کروادے۔"

"سوچ تو یہی رہا ہوں اماں جی! پر اب بسمہ کالج جا رہی ہے۔ بھائی خلیل کے سارے بچے جا رہے ہیں...... وہ کہے گی، مجھ پر ہی پابندی کیوں؟"

"خلیل کی بات تو چھوڑ دو۔ وہ تو ویسے ہی اپنی آخرت کو بھلا کے بیٹھا ہوا ہے۔ حج کر کے بندہ دنیاداری سے دور ہو جاتا ہے پر اسے کوئی فرق نہیں پڑا۔ پیسے کے پیچھے جو دوڑ پہلے تھی، وہ اب بھی ہے۔ راحت کو دیکھ لے، اسی طرح پتلی سی چادر لے کر بازار چلی جاتی ہے۔ کہتی ہے اب بوڑھی ہوگئی ہوں۔ پر شادی بیاہ پر اس کی تیاریاں دیکھو تو کہیں بڑھاپا نظر نہیں آتا۔"

نور برا سا منہ بنا کر وہاں سے ہٹ آئی تھی۔

کالج میں داخلے کا معاملہ بہ دستور اٹکا ہوا تھا۔ اس مرتبہ پھر تایا خلیل کی کوششیں بارآور ہوئیں۔ کچھ کردار بسمہ اور بڑے ماموں مراد نے بھی ادا کیا۔ نور کو اس شرط پر بمشکل اجازت ملی کہ بڑے ماموں اسے خود کالج چھوڑ کر آیا کریں گے اور لایا بھی کریں گے۔ کالج ان کے شوروم کے راستے میں پڑتا تھا اس لیے وہ ایسا کر بھی سکتے تھے۔

☆☆☆

کالج میں پہنچنے سے پہلے ہی نور کی تھوڑی بہت شہرت کالج میں بھی پہنچ چکی تھی۔ کئی ایک اسٹوڈنٹس جانتے تھے کہ وہ ایک اچھی ایتھلیٹ ہے۔ اس کی اسپورٹ ٹیچر بھی اس کے نام سے شناسا تھیں۔ ایک فائدہ نور کو یہ ہوا کہ نئی ٹیچر فرحانہ بیگ ذاتی طور پر مسز وجدان کی دوست بھی تھیں۔ فرحانہ بیگ نے شروع میں ہی نور پر خصوصی توجہ دینا شروع کر دی۔ اسے ٹیم میں شامل کر لیا گیا اور وہ مراعات بھی دی گئیں جو ایک ابھرتی ہوئی ایتھلیٹ کے لیے ضروری تھیں۔ مسز وجدان اور فرحانہ بیگ کی ہدایت کے مطابق نور مختلف ٹرائلز میں بھی شرکت کر رہی تھی۔ فرحانہ بیگ بہت اچھی کوچ بھی تھیں۔ ایک روز فرحانہ بیگ اور منیجر الیاس صاحب نے اسے خوشخبری سنائی۔ انہوں نے کہا۔ "تمہارے لیے ڈیپارٹمنٹل ٹیم میں شامل ہونے کا زبردست چانس بن رہا ہے۔"

"ڈیپارٹمنٹل ٹیم؟" نور نے ذرا حیرت سے کہا۔

"بھئی اکثر سرکاری اور غیر سرکاری محکمے اچھے کھلاڑیوں کو ملازمت دیتے ہیں اور انہیں "گروم" کرتے ہیں۔ تمہیں واپڈا کی سروس کا موقع مل رہا ہے۔" فرحانہ بیگ نے ایک لیٹر نور کے سامنے رکھ دیا۔

اس لیٹر کے مطابق لاہور سے پانچ چھ ایتھلیٹ لڑکیوں کو ٹرائل اور انٹرویو وغیرہ کے لیے اسلام آباد بلایا گیا تھا۔ ان میں نور کا نام بھی تھا۔

نور نے لیٹر پڑھنے کے بعد کہا۔ "لیکن میڈم! میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ میرے گھر والے......"

"اوہو، چھوڑو اس بات کو۔ ابھی انہیں کچھ نہ بتاؤ، تم ٹرائل وغیرہ تو دو۔ یہ کوئی معمولی موقع نہیں ہے۔ کامیاب ہو گئیں تو ٹھیک ٹھاک معاوضہ ملنا شروع ہو جائے گا۔ پھر دیکھ لینا جس طرح بھی کرنا ہوگا۔"

"مگر میڈم! یہ بات چھپی تو نہیں رہے گی بلکہ...... میرا تو اسلام آباد جانا ہی ممکن نہیں ہوگا۔"

"صرف دو دن کی بات ہوگی۔ بہن اور ماموں کو بتا دو۔ والد صاحب کو ابھی نہ بتاؤ۔ انہیں کالج کے تفریحی ٹور وغیرہ کا کہہ دو۔ خدانخواستہ تم کوئی غلط کام تو نہیں کر رہی ہو۔ کہتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں کوئی صلاحیت دے رکھی ہو تو اسے استعمال نہ کرنا بھی بہت بڑی ناشکری ہوتی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ تمہارے والد بھی جلد یا بدیر اس بات کو سمجھ جائیں گے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں اور پرنسپل صاحب کسی دن اکٹھے ان سے ملاقات کریں اور انہیں تمہارے حوالے سے قائل کریں۔"

"مگر میڈم......"

"دیکھو نور!" میڈم فرحانہ نے اس کی بات کاٹی۔ "کہتے ہیں کہ بچے کا ایک باپ وہ ہوتا ہے جو اسے آسمان سے زمین پر لاتا ہے اور دوسرا باپ استاد ہوتا ہے جو اسے زمین سے اٹھاتا ہے اور بلندی پر پہنچاتا ہے۔ کیا تم اپنے اساتذہ کو یہ درجہ نہیں دیتی ہو؟"

اس روز میڈم فرحانہ نے اسے نوے فیصد قائل کر لیا۔ وہ خیالوں میں الجھی اور ایک چمکیلے مستقبل کا سوچتی ہوئی سہ پہر کے بعد پہنچی۔ تاہم گھر پہنچ کر اسے ایک نئی طرح کی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا۔ گھر کی فضا کچھ بدلی بدلی سی محسوس ہوئی۔ دادی اماں اور پھپھو حاجرہ اسے مختلف

نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اباجان بھی گھر میں ہی موجود تھے۔ کچن سے بریانی کی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ آج نور نے ذرا لمبی ٹریننگ کی تھی۔ اس کی بھوک چمکی ہوئی تھی۔ اس نے بسمہ سے پوچھا۔ ''کھانا تیار ہے؟''

بسمہ ذرا مسکراتے ہوئے بولی۔ ''کھانا تو دس پندرہ منٹ میں تیار ہو جائے گا لیکن مہمان ابھی نہیں آئے۔''

''کون سے مہمان؟'' نور نے سلاد پر منہ مارتے ہوئے کہا۔

''تیرے مہمان۔''

''میرے مہمان؟ کیا پہیلیاں بجھوا رہی ہو۔ کون آ رہا ہے بھئی؟''

بسمہ کی مسکراہٹ جو پہلے ہی پھیکی سی تھی کچھ اور بھی پھیکی ہو گئی۔ وہ شاید بولنے کے لیے مناسب الفاظ ہی ڈھونڈ رہی تھی جب پھپھو حاجرہ اندر آ گئیں۔ نور کو گلے سے لگا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پچکارتے ہوئے اپنے ساتھ صوفے پر بٹھا لیا۔ بسمہ کنی کترا کر جلدی سے باہر نکل گئی۔

نور حیرت زدہ تھی۔ ساتھ والے کمرے سے ابا جان کے کھنکھارنے کی آواز آ رہی تھی۔ پھپھو حاجرہ نے بڑے دلار سے کہا۔ ''نور! اچھے رشتے بڑی مشکل سے ملتے ہیں۔ ٹھیک وقت پر ٹھیک رشتہ مل جانا، اللہ کی خاص مہربانی ہوتی ہے۔ اب دیکھ لے تیری خالہ کی تینوں بیٹیاں ستائیس اٹھائیس سال سے اوپر کی ہیں اور اسی طرح بیٹھی ہیں۔''

''پھپھو! آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں؟'' کم سن نور کا سانس سینے میں گھٹنے لگا۔ پھپھو بولیں۔

''اچھا رشتہ آیا ہے۔ تیرے اباجی کے جاننے والے ہیں۔ مولانا حبیب اللہ عالم دین ہیں، ان کا بڑا بیٹا ذوالقرنین۔ تیرے اباجی کی شاپ کے ساتھ ہی اس کی شاپ بھی ہے۔ اسلامی کتابیں چھاپنے اور بیچنے کا کام کرتا ہے۔ اچھی آمدن ہے۔ اپنا گھر ہے۔ صرف ایک جڑواں بہن ہے اور ایک چھوٹا بھائی۔ بالکل چھوٹی سی فیملی ہے۔ یہ دیکھو۔''

پھپھو نے ایک کارڈ سائز تصویر نور کے سامنے کر دی۔ اس نے دھندلائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ تیئس چوبیس سال کا نوجوان تھا۔ چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی تھی۔ کہنے کو قبول صورت کہا جا سکتا تھا مگر چہرے پر عجیب طرح کی سنجیدگی اور سختی تھی۔ جیسے ہر چیز سے بیزار بیٹھا ہو۔

نور نے کانپتے ہاتھوں کے ساتھ تصویر میز پر رکھ دی اور اپنا ماتھا پکڑ لیا۔ اس کے جسم کا سارا خون جیسے اس کے سر کی طرف یلغار کر رہا تھا۔

''کیا ہوا بیٹی؟'' پھپھو نے پوچھا۔

نور نے اشک بار نظروں سے پھپھو کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''یہ...... یہ آپ لوگ کس طرح کا مذاق کر رہے ہیں مجھ سے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ کیا...... شادی بیاہ کی بات ...... اس طرح کی جاتی ہے۔ نہ کسی نے مجھ سے کچھ پوچھا، نہ کچھ بتایا۔ میں نے ......'' اس کا سارا جسم لرز رہا تھا۔ وہ اپنا فقرہ مکمل نہ کر سکی اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

پھپھو نے گھبرا کر اسے کندھوں سے تھاما اور دوبارہ صوفے پر بٹھایا۔ ''نور پتر! تیرے اباجی گھر میں ہیں۔ ان کے کانوں تک آواز نہ چلی جائے۔ میری بات سن، ذرا ٹھنڈے دل سے......''

''نہیں پھپھو...... نہیں ...... میں نے کچھ نہیں سننا۔ میں نے یہ شادی نہیں کرنی۔'' وہ باقاعدہ رونا شروع ہو گئی۔ حالانکہ وہ بہت کم روتی تھی مگر آنسو جیسے بھر امار کر اس کی آنکھوں تک آ گئے تھے اور آنکھوں میں ہی نہیں پورے جسم میں رواں ہو گئے تھے۔

اب بسمہ بھی اندر آ گئی تھی۔ شاید وہ دروازے سے لگی کھڑی تھی۔ اس نے نور کو اپنے ساتھ لگایا اور ہراساں لہجے میں بولی۔ ''نوری...... نوری! چپ ہو جا اباجی نے سن لیا تو مصیبت آ جائے گی۔'' شاید بسمہ کے اشارے پر ہی پھپھو نے اٹھ کر کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا تھا۔

بریانی کی خوشبو اب بھی نتھنوں تک پہنچ رہی تھی مگر اب یہ گندھک کی بو کی طرح نور کی ناک اور اس کے گلے کو چھیل رہی تھی۔ وہ بسمہ کو جھنجوڑتے ہوئے بولی۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے بسمہ! تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا...... کیا تم بھی اس سارے کھیل میں شریک ہو...... کیا تم بھی یہی چاہ رہی ہو؟''

بسمہ بولی۔ ''نہیں نور! مم ...... مجھے بھی ابا جان نے کل دوپہر ہی بتایا تھا...... اور تمہیں سمجھانے کے لیے کہا تھا لیکن سچی بات ہے میری ہمت ہی نہیں پڑ رہی تھی تم سے بات کرنے کی ...... اور پھر رات کو وہ مجھے بازار لے گئے۔ میں واپس آئی تو تم سو رہی تھیں۔''

پھپھو بولی۔ ''ان باتوں کو چھوڑو۔ تم سب کو پتا ہے کہ ہونا تو اس گھر میں وہی ہے جو تمہارے اباجی چاہتے ہیں اور ماں باپ کبھی اولاد کا برا نہیں سوچتے۔ لڑکے کی ماں اور بہن نے پچھلے مہینے تمہارے حفیظ انکل کی شادی پر تمہیں دیکھا تھا۔ اس کے بعد سے یہ بات چیت چل رہی تھی۔''

''کیوں چل رہی تھی بات چیت ...... ہاں کیوں چل رہی تھی؟'' نور تڑخ کر بولی۔ ''کس نے پوچھا تھا مجھ سے؟

کس نے بات کی تھی؟ اباجی خود کہتے ہیں، اسلام میں بیٹیوں کو حق دیے گئے ہیں۔ میرا حق کہاں تھا؟ میرا حق کہاں ہے؟ اور یہ کیا بات ہے کہ کالج سے گھر آؤ تو آگے آپ کی شادی کی تیاریاں ہو رہی ہوں اور ابھی تو مجھ سے آگے بسمہ ہے۔ اباجی کے جاننے والوں کو وہ کیوں نظر نہیں آتی؟ انہوں نے مجھ پر ہی کیوں نشانہ لے لیا ہے؟"

"ناشکری کی باتیں نہ کر۔" پھپھو پہلی بار غصے میں بولی۔ "ہر ایک کا مقدر اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ بسمہ بھی... انخواستہ کوئی لولی لنگڑی نہیں ہے۔ دیکھنا دو چار ماہ میں اس کا بھی بڑا چنگا بر مل جائے گا۔ بھائی اشفاق تم دونوں بہنوں کے فرض سے جلد از جلد فارغ ہونا چاہتے ہیں۔"

"فرض سے نہیں بوجھ سے۔ شاید ہم بوجھ ہیں ان کے لیے۔ وہ ہمیں اتار پھینکنا چاہتے ہیں۔" نہ چاہنے کے باوجود نور کی آواز بلند ہوتی جا رہی تھی۔ یہی وقت تھا جب دروازے پر دستک ہوئی اور تینوں عورتیں ٹھٹک گئیں۔ بسمہ کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ باہر سے اباجی کی بھاری آواز سنائی دی۔

"بسمہ! تیار ہو گئی ہے عین النور؟"

"ہاں اباجی ہو رہی ہے۔"

"جلدی کرو بھئی! وہ لوگ آنے والے ہیں۔" اباجی نے ملائمت سے کہا۔

ان کے قدموں کی مدھم چاپ ابھری۔ وہ واپس اپنے کمرے میں جا رہے تھے۔ جب وہ کھڑکی کے سامنے سے گزر رہے تھے تو نور ایک دم اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ نہ جانے اتنا حوصلہ، اتنی ہمت اور جرأت اچانک اس میں کہاں سے آ گئی تھی۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ اندر تھی اور ابا جان باہر۔ وہ اسے دیکھ نہیں سکتے تھے۔ وہ جالی دار کھڑکی تک پہنچی اور کراہتی ہوئی سی آواز میں بولی۔

"اباجان۔"

وہ ٹھٹک کر رک گئے اور کھڑکی کی طرف دیکھنے لگے۔

"نور! کیا بات ہے؟" انہوں نے نرم لہجے میں پوچھا۔

چند لمحوں کے نہایت بوجھل وقفے کے بعد نور نے کہا۔

"اباجان! آپ...... ابھی...... میری کوئی بات نہ کریں۔"

مولوی اشفاق مہرا کے چہرے پر جیسے حیرت اور طیش کا دریا بہہ گیا۔ وہ بولے۔ "م م...... میں سمجھا نہیں...... تم کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"اباجان! میں آپ کی بیٹی ہوں۔ مجھے آپ سے اس طرح بات نہیں کرنی چاہیے مگر میں ابھی پڑھنا چاہتی ہوں۔ آپ میری بات نہ کریں۔" اس نے بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

یہ الفاظ نہیں بارودی دھماکے تھے۔ نور کو خود یقین نہیں ہو پا رہا تھا کہ وہ کھڑکی کی اوٹ سے یہ الفاظ اپنے والد سے کہہ چکی ہے۔ پتا نہیں وہ کیسے لمحے تھے جنہوں نے اس طرح کی جرأت اسے عطا کر دی تھی۔ اسے لگا تھا کہ ان لمحوں میں اس کی والدہ مرحومہ کی ساری گھٹن زدہ زندگی سمٹ آئی ہے اور اپنی آپی بتول کی ازدواجی زندگی کی ساری تلخیاں بھی اکٹھی ہو گئی ہیں۔ ہاں، یہ الفاظ نہیں بارودی دھماکے تھے۔ مولوی اشفاق مہرا تیزی سے دروازے کی طرف پلٹے۔ اگلے ہی لمحے دروازے کے تختے اس طرح دھڑ دھڑائے جیسے پورا دروازہ دیواروں سے نکل کر کمرے میں آ گرے گا۔ "دروازہ کھولو، بسمہ دروازہ کھولو۔" وہ خوفناک آواز میں دہاڑے۔

بسمہ نے سہمی ہوئی نظروں سے پھپھو حاجرہ کی طرف دیکھا۔ انہوں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ "بھائی جان! ہم اسے سمجھا رہے ہیں۔ ابھی سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔"

"میں کہتا ہوں دروازہ کھولو، ورنہ میں توڑ دوں گا۔" مولوی اشفاق کی آواز پورے گھر میں گونجی۔ وہ جیسے پھٹ پڑے تھے، شاید ان کا "بی پی" بلندیوں کو چھو رہا تھا۔

صاف پتا چل رہا تھا کہ انہوں نے دروازہ نہ کھولا تو مولوی جی کا طیش مزید بڑھے گا اور نتائج مزید برے نکلیں گے۔ پھپھو نے کانپتے ہاتھوں سے دروازہ کھول دیا۔

مولوی اشفاق کے ہاتھ میں ایک ٹوٹی ہوئی ہاکی کا دستہ تھا۔ اندر آتے ساتھ ہی وہ جیسے نور پر پل پڑے۔ وہ چلاتی ہوئی زمین بوس ہو گئی۔ دستے کی ضربیں اس کے جسم پر تواتر سے لگ رہی تھیں۔ کمرے میں کہرام سا مچ گیا تھا۔ مولوی اشفاق دہاڑ رہے تھے۔ "بدبخت! زبان چلاتی ہے...... میرے سامنے زبان چلاتی ہے۔"

بسمہ تڑپ کر باپ کے سامنے آ گئی۔ "اباجی نہیں...... پلیز اباجی......"

اس نے کئی چوٹیں اپنے ہاتھوں پر سہیں۔ اس کی چوڑیاں ٹوٹ گئیں، ناخنوں سے خون بہہ نکلا۔ پھپھو بھی اپنے طور پر انہیں سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ دادی سمیت گھر میں موجود دیگر افراد بھی ہانپتے کانپتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔ مولوی اشفاق غم و غصے کے عالم میں گرج رہے تھے۔ "تیری یہ جرأت...... تیری یہ ہمت...... بے شرم بے حیا...... اپنے باپ کے منہ پر کالک مل رہی ہے۔ اس سے تو اچھا ہے کہ اپنے ہاتھوں سے گولی مار دے مجھے۔ اپنے

ہاتھوں سے ذبح کر ڈالیں گے۔

وہ پھر نور کی طرف جھپٹے۔ بڑے ماموں نے بمشکل انہیں سنبھالا۔

دادی نوحہ کرنے والے انداز میں پکاریں۔ ''مجھے پہلے ہی پتا تھا، اس کلموہی نے ایک نہ ایک دن کوئی چاند چڑھانا ہے۔ یہ ہماری جانیں لے کر رہے گی۔ میں پہلے ہی کہتی تھی، اس بے شرم کو کالجوں کی ہوا نہ لگواؤ۔ دس دس گھنٹے غائب رہتی ہے۔ پتا نہیں کیا کیا کرتی پھر رہی ہے۔ اس گھر میں کوئی میری بات سنتا ہو تو پھر ہے نا۔ ہائے اللہ، یہ مجھے کیا دیکھنا پڑ رہا ہے......''

نور ایک کونے میں گٹھڑی بن کر سمٹی ہوئی تھی۔ قریب ہی اس کی کتابیں بکھری ہوئی تھیں۔ کالج کی سفید یونیفارم پر خون کے داغ نمودار ہو گئے تھے۔ یہ وہی خون تھا جو اس کا سر پھٹنے سے بہا تھا۔ اس کی گھٹی گھٹی آواز ایک دردناک فریاد بن کر کمرے میں گونج رہی تھی۔

ماموں مراد نے نور کے اباجی کو اپنی بانہوں کے کلاوے میں لے لیا اور انہیں بڑی مشکل سے سنبھالتے ہوئے کمرے سے باہر لے گئے۔ ان کی ٹوپی گر گئی تھی اور عینک ناک کے آخری سرے تک سرک آئی تھی۔ وہ دہاڑے۔ ''شام تک اس خبیث کو سمجھا لو اگر سمجھتی ہے تو...... ورنہ پھر وہ ہوگا جو اس خاندان میں کبھی نہ ہوا ہوگا۔ میں مر جاؤں گا یا اس کو مار ڈالوں گا۔''

پورا گھر ایک طوفان کی زد میں تھا۔ کچھ دیر بعد معلوم ہوا کہ نور کے اباجان نے کسی ایمرجنسی کا بہانہ کر کے مہمانوں کو فی الحال آنے سے روک دیا ہے۔ اس واقعے کی اطلاع سن کر تائی جان اور مہرین وغیرہ بھی بھاگے آئے تھے۔ نور کو گھر میں ہی طبی امداد دی گئی اور اس کے سر سے مسلسل بہنے والا خون روکا گیا۔ ایک مسئلہ یہ تھا کہ تایا خلیل لاہور میں موجود نہیں تھے۔ انہیں اگلے روز آنا تھا۔ وہ ایسے موقعوں پر بات کو سنبھال لیا کرتے تھے۔

بسمہ نے گلوگیر آواز میں تائی جان راحت سے کہا۔ ''بڑی امی! آپ بڑے ابا کو فون کریں۔ انہیں کہیں وہ آج ہی واپس آجائیں۔''

''پتا نہیں کہ رابطہ ہوتا ہے یا نہیں۔ میں کوشش کر کے دیکھتی ہوں۔'' انہوں نے کہا۔

''آپ انہیں بتائیں کہ یہاں کیا ہوا ہے۔ میں آپ کے گھر جا کر خود انہیں فون کر لیتی مگر میں چاہتی ہوں کہ یہاں نور کے پاس رہوں۔''

تائی جان نے کسی انداز میں سر ہلایا۔ وہ نور اور بسمہ کو تسلی دیتی ہوئی اپنے گھر چلی گئیں تاکہ شوہر کو فون کر سکیں۔ پھپھو مسلسل نور کو سمجھانے بجھانے میں لگی ہوئی تھیں۔ گاہے بگاہے دادی بھی کوئی کڑوا کسیلا لقمہ دے دیتی تھیں۔ دادی پرانے خیال کی عورت تھیں اور ان کی سوچ یہی تھی کہ لڑکیوں کو سات آٹھ جماعتیں پڑھنے کے بعد گھر گرہستی سیکھ لینی چاہیے اور ان کی شادی جلدی کر دینی چاہیے۔ دادی کی اپنی شادی فقط پندرہ سال کی عمر میں ہو گئی تھی اور وہ پردے کی اتنی پابند تھیں کہ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے انہوں نے ساری عمر اپنے سسر اور جیٹھوں کو اپنی صورت نہیں دکھائی تھی۔

وہ بار بار کہہ رہی تھیں۔ ''نوری! تیرے پیو کا غصہ بڑا بھیڑا ہے۔ اگر تو نے اس کی بات نہ مانی تو اس نے جان سے مار دینا ہے تجھے۔ پھر اس راحت بی بی (تائی) نے تجھے بچانے کے لیے نہیں آنا۔''

پھپھو حاجرہ بھی اسی سے ملتی جلتی بات کہہ رہی تھیں مگر پتا نہیں کہ نور کو کیا ہوا تھا۔ مار کھانے کے بعد اور باپ کی ٹھوکریں سہنے کے بعد نور کے اندر کا خوف نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ اس کے اندر جیسے ایک باغی سر اٹھا رہا تھا۔ اپنے والد اور اپنی دادی کا باغی، اپنے اردگرد کے حالات کا باغی، اس باغی سے آج سے پہلے نور کی کوئی شناسائی نہیں تھی۔

دوسرے کمرے سے ابھرنے والی دادی کی آواز مسلسل نور کے کانوں میں پڑ رہی تھی۔ وہ اب اس کی مرحومہ ماں کو مجرم ٹھہرا رہی تھیں۔ ان کی تربیت کو ناقص گردان کر نور کو ان کا پرتو قرار دے رہی تھیں۔

پھپھو انہیں ایسی تلخ باتیں کرنے سے روک رہی تھیں اور ساتھ ساتھ ان کی ہمنوائی بھی کر رہی تھیں۔ اباجان نے شام تک کا الٹی میٹم دیا تھا۔ ایک اچھی بات یہ ہوئی کہ شام کے فوراً بعد ہی تایا جان گجرات سے لاہور پہنچ گئے۔ وہ سیدھے ان کے گھر ہی آئے تھے...... انہوں نے ہمیشہ نور سے بہت پیار کیا تھا۔ اس کا پھٹا ہوا سر، زخمی کلائیاں اور سوجی ہوئی آنکھ دیکھ کر وہ ششدر رہ گئے۔ اس کے ساتھ ہی ان کے سرخ و سپید چہرے پر بس سرخ رنگ ہی باقی رہ گیا۔ نور کا خیال تھا کہ شاید تایا کو دیکھ کر وہ رو پڑے گی لیکن آنسو جو بہت کم ہی اس کی آنکھوں تک آتے تھے، اب بالکل روٹھے ہوئے تھے۔ بس آنکھوں کے کنارے جل رہے تھے اور ایک انگارہ سا تھا جو سینے میں دھرا ہوا تھا۔

نور کے سر پر پیار دے کر تایا جان دوسرے کمرے

میں ابا جان سے ملنے چلے گئے۔ بسمہ نے جلدی سے کوریڈور اور اپنے کمرے کا دروازہ بند کردیا تاکہ دونوں بھائیوں کے درمیان ہونے والی گفتگو ان کے کانوں تک نہ پہنچ سکے۔

گفتگو شروع ہوئی اور دھیرے دھیرے اتنی بلند ہوگئی کہ دونوں دروازے بھی اس کی گونج کو نہ روک سکے۔ نور کے ابا جان بڑے بھائی کی بے حد عزت کرتے تھے مگر آج تو وہ بھی ان کے سامنے بول رہے تھے۔ تایا کی آواز زیادہ بلند تھی اور پھر وہ بلند تر ہوتی چلی گئی۔ اڑتے اڑتے کچھ الفاظ بسمہ اور نور کے کانوں تک بھی پہنچے۔ وہ کہہ رہے تھے۔ ”بہت افسوس ہے اشفاق! بہت افسوس ہے۔ تم اپنی ہی بچی کے بارے میں ایسی غلط سوچ رکھتے ہو۔ اگر ایسا ہی ہے تو پھر اس کے گلے میں پھندا ڈال کر ماردو اسے یا زندہ گاڑ دو زمین میں۔“

”خدا کے لیے بھائی جان! مجھے بولنے پر مجبور نہ کریں۔ یہ آپ لوگوں کا لاڈ پیار ہے جس نے اس کو اس حال تک پہنچایا ہے۔“

”کس حال تک پہنچایا ہے؟ کیا کردیا ہے اس نے؟ مجھے بتاؤ کون سی قیامت توڑ دی ہے اس نے؟ تم سے جینے کا حق ہی مانگ رہی ہے نا۔ یہی کہہ رہی ہے نا کہ اس چھوٹی سی عمر میں اس پر شادی اور بال بچے کی ذمے داری نہ ڈالو اور کیا کہہ رہی ہے وہ؟“

”بھائی جان! آپ کو کچھ معلوم نہیں۔“ نور کے ابا جان نے قدرے دبی آواز میں کہا۔ ”اس کے طور طریقے بہت بدل گئے ہیں۔ یہ دیکھیں، میں آپ کو دکھاتا ہوں۔ یہ دیکھیں ...... یہ ہے اس کا سامان جو نیچے پرانی پیٹی سے نکلا ہے...... یہ بھی دیکھیں......“

دھاتی اشیا کے گرنے اور پٹخے جانے کی آوازیں آئیں۔ ایک لمحے میں نور کو اندازہ ہوگیا کہ بیسمنٹ میں موجود اس کے کپ اور ٹرافیاں وغیرہ ابا جان کی نظر میں آچکے ہیں ...... اور آج دوپہر سے یہاں جو کچھ ہورہا ہے، اس کے پیچھے کچھ نہ کچھ ہاتھ ان چیزوں کی برآمدگی کا بھی ہے۔ پتا نہیں کہ یہ چکر کتنے دنوں سے چل رہا تھا۔

”تو کیا ہے اشفاق؟“ تایا جان کی بلند آواز دروازوں سے گزر کر نور اور بسمہ کے کانوں تک پہنچی۔

”کون سا گناہ کردیا ہے اس نے۔ کون سی ایسی حرکت کی ہے جس سے ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں؟ میں پھر کہتا ہوں اشفاق! اس طرح کا کٹرپن تمہیں لے ڈوبے گا۔ ہم اللہ کے احکام کو مانتے مانتے اللہ کے احکام سے بھی آگے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔“

”بھائی جان! میں اس بارے میں آپ سے کوئی بحث کرنا نہیں چاہتا۔“

”مگر میں کرنا چاہتا ہوں۔“ تایا خلیل گرجے۔ ”مجھے بتاؤ، اپنی روتی سسکتی بچی کو مارکوٹ کر کسی کی ڈولی میں دھکیلنے کا حق کس نے دیا ہے تمہیں؟“

آوازیں آنا بند ہوگئیں۔ شاید درمیان میں موجود کوئی اور دروازہ بھی بند کردیا گیا تھا لیکن یہ اندازہ تو ضرور ہورہا تھا کہ ابا اور تایا میں زوردار تکرار چل رہی ہے۔ چار پانچ منٹ مزید گزرے پھر تایا جان غصے سے بھرے ہوئے ......تند بگولے کی طرح اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے کونے میں دبکی نور کو بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور اپنے ساتھ لگاتے ہوئے بولے۔ ”چل میری بچی! یہ گھر تیرے رہنے کے قابل نہیں ہے۔ اندھا بہرا ہوگیا ہے اس گھر کا سربراہ۔ اس کی عقل پر پتھر پڑ گئے ہیں۔“

پھپھو نے تایا خلیل کو روکنا چاہا پر انہیں بھی زور کی ڈانٹ کھانا پڑی۔ تایا بولے۔ ”بس، میں نے فیصلہ کرلیا ہے۔ یہ میرے پاس رہے گی جب تک تم لوگوں کے دماغ ٹھیک نہیں ہوتے۔ میں رکھوں گا اسے۔“

قریبی کمرے سے نور کے ابا جان کی دبی دبی مگر تلخ آواز ابھری۔ ”لے جائیں ...... لے جائیں اس تختے کو۔ میں بھی اس کی شکل دیکھنا نہیں چاہتا۔ میں سمجھوں گا یہ مرگئی ہے میرے لیے۔“

☆☆☆

اس دن کے بعد نور کے سارے روز و شب ایک دم بدل گئے۔ تایا ابا اسے اپنے ساتھ اپنے گھر لے آئے تھے۔ تایا کی طرح تائی راحت نے بھی ہمیشہ اس سے بہت پیار کیا تھا۔ پھر تایا کے تینوں بچے، نور کے لیے بالکل بھائی بہنوں کی طرح تھے۔ وہ شرجیل، عثمان اور مہرین کے ساتھ ایک ہی گھر میں کھیل کود کر جوان ہوئی تھی۔ مہرین اس سے صرف ایک ڈیڑھ سال بڑی تھی اور فزیوتھراپسٹ بن رہی تھی۔

تایا خلیل کافی رعب دار شخصیت کے مالک تھے۔ کسی کے لیے بھی ان کی بات کو رد کرنا یا ان سے طویل بحث مباحثہ کرنا ممکن نہیں تھا...... اور نور کے ابا جان سے تو ان کا رشتہ بڑے بھائی کا بھی تھا۔ نور کے ابا جان مولوی اشفاق کے لیے ہرگز ممکن نہیں تھا کہ وہ بڑے بھائی کے ساتھ ایک حد سے زیادہ تناؤ پیدا کرسکیں۔ انہوں نے جیسے ایک دم نور

سے لاتعلقی سی اختیار کرلی۔ چار پانچ روز بعد ایک شام تایا ابا گھر آئے تو ملازم خدا بخش نے کینوس کا ایک بڑا سا بیگ کندھے پر لاد رکھا تھا۔ تایا ابا نے کہا۔ ”لو بھئی نور! یہ میں تمہارے کپ اور ایوارڈ وغیرہ اس نامعقول کے قبضے سے نکال کر لایا ہوں۔“ نامعقول سے ان کی مراد یقیناً چھوٹا بھائی ہی تھا۔

تایا ابا نے بیگ کی زپ کھولی...... اور اس میں سے ایک بڑا کپ نکال کر سامنے میز پر رکھ دیا۔ کپ ٹیوب لائٹ میں چمک رہا تھا۔ تایا ابا نے کہا۔ ”آج میری ملاقات تمہاری ٹیچر میڈم فرحانہ بیگ سے بھی ہوئی ہے۔ میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ نور اسلام آباد جائے گی اور میں اس کے ساتھ جاؤں گا۔ وہ بڑی خوش ہوئی ہے۔ اسے تم سے بہت زیادہ امیدیں ہیں اور بات صرف میڈم فرحانہ کی ہی نہیں، تمہارے اکثر ٹیچرز تمہیں ایک کامیاب ایتھلیٹ کے طور پر دیکھ رہے ہیں۔“

”پر تایا ابا! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ میں نے ابا جی کو بہت ناراض کیا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ ان سے معافی مانگ لوں۔“

”جب معافی کا وقت آئے گا تو وہ بھی مانگ لینا لیکن یہ وقت معافی کا نہیں ہے۔ اس معافی کی کم از کم قیمت یہی ہوگی کہ وہ تمہیں کمرے میں بند ہونے پر مجبور کردے گا اور پھر چند روز میں تمہارا نکاح پڑھوا کر تمہیں کسی قاری ذوالقرنین کے حوالے کردے گا۔“

”لیکن تایا ابا......“

”لیکن ویکن کچھ نہیں۔“ انہوں نے نور کی بات کاٹی۔ ”میں جیسے کہتا ہوں ویسے کرتی جاؤ۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔“ انہوں نے اسے اپنے ساتھ لگا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ تائی راحت نے بھی اس کا شانہ سہلایا۔ مہرین دلچسپی اور حیرت سے نور کے درجنوں کپ اور ٹرافیاں دیکھ رہی تھی۔

دو روز بعد نور اپنے تایا جان کے ساتھ بذریعہ کوچ اسلام آباد گئی۔ اس نے ٹرائل میں حصہ لیا۔ اس کی کارکردگی تسلی بخش رہی۔ اسے فوری طور پر ملازمت تو نہیں ملی تاہم اسے شارٹ لسٹ کرلیا گیا اور پوری امید دلائی گئی کہ وہ جلد ہی محکمے کی طرف سے کھیلتی ہوئی نظر آئے گی۔

اسلام آباد کے وزٹ سے نور کے اعتماد میں قابلِ ذکر اضافہ ہوا۔ اسے سینئر ایتھلیٹس سے ملنے اور ان سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔ اس کے اندر زبردست تحریک پیدا ہوئی۔ لاہور واپس آنے کے بعد نور نے باقاعدگی سے فرحانہ کے کوچنگ سینٹر جانا شروع کردیا۔ یہ سینٹر کئی برس پہلے فرحانہ بیگ نے کھیل سے ریٹائرمنٹ کے بعد شروع کیا تھا۔ اس کا اصل نام ”فرحانہ ایتھلیٹکس اسکول تھا“ اسے عام طور پر ایف اے ایس کہا جاتا تھا اور ایتھلیٹکس کے حلقوں میں اس کا نام تھا۔

میڈم فرحانہ بیگ اس ادارے کی روح رواں تھیں...... اور بڑی محنت سے لڑکیوں کو رننگ کی تربیت دے رہی تھیں۔ اپنے اسکول کی دوست شاہینہ سے بھی نور کا مسلسل رابطہ رہتا تھا۔ شاہینہ کا تعلق ایک ایلیٹ کلاس فیملی سے تھا۔ اس کے والد ایک کامیاب صنعت کار تھے۔ اس نے ایک ہائی فائی کالج میں داخلہ لیا تھا اور اسپورٹس میں بھرپور حصہ لے رہی تھی۔ اکثر سو میٹر کی دوڑ میں دونوں سہیلیوں کا آمنا سامنا بھی ہوجاتا تھا۔ ان دونوں کی ٹائمنگ میں بس انیس بیس کا فرق ہی تھا۔ کسی وقت نور اور کسی وقت شاہینہ کی ٹائمنگ بہتر رہتی تھی۔

دونوں فرصت کے لمحات میں بے تکلف گفتگو بھی کرتی تھیں۔ شاہینہ بھی نور ہی کی طرح دراز قد اور اسمارٹ جسم کی مالک تھی۔ شکل وصورت کے لحاظ سے بھی دونوں شاید ہم پلہ ہی تھیں تاہم شاہینہ کے نسبتاً زیادہ خوش حال لائف اسٹائل نے اس میں اضافی نکھار پیدا کردیا تھا۔ کسی بھی ابھرتی ہوئی ایتھلیٹ کی طرح شاہینہ بھی مستقبل کے خوب صورت سپنے دیکھ رہی تھی۔ اس کے والد اور بھائی اس کی پوری سپورٹ کررہے تھے......

ایک روز نور اپنے تایا ابا کے ساتھ ان کی سوزوکی کار میں ڈیفنس کی طرف شاہینہ سے ملنے جارہی تھی۔ تایا ابا ڈرائیو کررہے تھے۔ انہیں چار بجے تک شاہینہ کے گھر پہنچنا تھا اس لیے وہ گاڑی تھوڑی تیز چلارہے تھے۔ ایک چوراہے سے وہ بائیں ہاتھ مڑے۔ حالانکہ انہوں نے اشارہ دے رکھا تھا پھر بھی غلط سمت سے اوورٹیک کرنے والا ایک موٹر سائیکل سوار ان کی گاڑی سے آٹکرایا۔ تایا نے بمشکل موڑ کاٹا اور گاڑی کو کنارے پر لگایا۔ موٹر سائیکل پر دو لڑکے سوار تھے۔ دونوں گرے اور تھوڑی بہت چوٹیں بھی آئیں۔ دوسری طرف گاڑی کے دونوں دروازوں پر بھی ٹھیک ٹھاک رگڑیں آئیں۔ تایا جان باہر نکلے تو لڑکوں نے ان سے بدتمیزی شروع کردی۔

تایا نے ایک کو دھکا دیا، وہ تایا سے کھینچا تانی کرنے لگے۔ نور بھی گھبرائی ہوئی باہر نکل آئی۔ اس نے لڑکوں کو

سے پیچھے ہٹانے کی کوشش کی، اسے بھی ایک زوردار دھکا کھانا پڑا۔ یہی وقت تھا جب نور نے ایک دراز قد لڑکے کو دیکھا۔ اس نے اپنی موٹر سائیکل چھوٹے اسٹینڈ پر کھڑی کی اور حملہ آور لڑکوں کی طرف جھپٹا۔ ”اوئے کیا کرتے ہو۔ بزرگ آدمی ہیں۔“ وہ پکارا۔

”بزرگ ہے تو ساری سڑک کا ماماں بن گیا ہے یہ۔“ سرخ ٹی شرٹ والا لڑکا چلّایا۔

اگلے ہی لمحے دونوں لڑکے دراز قد نوجوان سے گتھم گتھا ہو گئے۔ دراز قد نوجوان ورزشی جسم کا مالک تھا اور لگتا تھا کہ لڑائی بھڑائی سے بھی واقف ہے۔ اس نے سرخ شرٹ والے کے پیٹ میں ٹانگ رسید کی تو وہ کراہتا ہوا اپنی موٹر سائیکل کے اوپر جا گرا۔ دوسرے لڑکے نے چند کے چلائے مگر پھر دراز قد نوجوان نے اسے اڑنگا لگا کر سڑک پر گرا دیا اور اس کے سینے پر چڑھ کر اس کی اچھی خاصی دھنائی کر ڈالی۔ موقع پر جمع ہو جانے والے لوگوں نے سرخ شرٹ والے کو پکڑ لیا تھا۔ وہ اب بھی اچھل اچھل کر نور کے تایا جان اور دراز قد نوجوان کی طرف آنے کی کوشش کر رہا تھا مگر اس کوشش میں اب زیادہ دم خم نہیں تھا۔ چند تماشائیوں نے سڑک پر گرے ہوئے دوسرے لڑکے کو دراز قد نوجوان کی گرفت سے چھڑایا اور اسے لعنت ملامت کی۔ اس کی ناک سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔

دراز قد نوجوان کی قمیص کا گریبان بھی پھٹ گیا تھا اور اس میں سے اس کا بالوں بھرا سینہ جھانک رہا تھا۔ وہ نور کے پاس آیا اور بڑی شائستگی سے بولا۔ ”آپ گاڑی میں بیٹھیں اور انکل آپ بھی بیٹھیں۔ آپ نکلیں یہاں سے، میں دیکھ لیتا ہوں ان کو۔“

”نہیں نہیں بیٹا! لڑائی بڑھانے کی ضرورت نہیں۔ بس ان کو سبق مل گیا ہے۔ تم بھی جاؤ یہاں سے۔“

اسی دوران میں دور سے ایک ٹریفک سارجنٹ کی سفید موٹر سائیکل کی جھلک دکھائی دینے لگی...... تایا جان نے دراز قد نوجوان سے کہا۔ ”ابھی ٹریفک والے آ جائیں گے۔ تم جاؤ یہاں سے بیٹا۔ وہ دیکھو، وہ خبیث بھی نکل رہے ہیں۔“

”میں بھی چلا جاؤں گا لیکن آپ گاڑی میں بیٹھیں۔“ نوجوان نے بڑے اطمینان سے کہا۔

تایا ابا نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی، نور پہلے ہی بیٹھ چکی تھی۔ انہوں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ کافی آگے جا کر نور نے مڑ کر دیکھا۔ ان کا مددگار...... ٹریفک سارجنٹ سے بات چیت کر رہا تھا۔ اس کے انداز میں زبردست اعتماد تھا۔

چند روز بعد انٹر کالجیٹ مقابلے شروع ہو گئے۔ یہ ایک بڑا ایونٹ تھا۔ ٹریننگ سینٹر میں میڈم فرحانہ نور کو بھرپور پریکٹس کروا رہی تھیں۔ کافی سخت شیڈول تھا۔ ہفتے میں پانچ دن، کم از کم تین گھنٹے تک وہ سخت مشقیں کر رہی تھی۔ پہلے وارم اپ ہوتا پھر جسم اور پٹھوں کو لچک دار بنانے والی ورزشیں ہوتیں۔ ان کو عرف عام میں اسٹریچنگ کی ایکسرسائز کہا جاتا تھا۔ اس کے بعد رننگ کا سیشن ہوتا۔ اس تربیتی دورانیے کے علاوہ بھی نور بس دوڑ اور مقابلے کے بارے میں ہی سوچتی رہتی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اپنی پریشان کن سوچوں کی طرف اس کا دھیان کم ہی جاتا تھا۔ ہاں، رات کو جب وہ تھکی ہاری بستر پر لیٹتی تو ابا جان کی صورت نگاہوں کے سامنے آ جاتی۔ ان کی آواز کی بازگشت اس کے کانوں سے ٹکراتی۔ انہوں نے تایا جان سے کہا تھا۔ ”ٹھیک ہے لے جائیں اس تحفے کو یہاں سے...... میں سمجھوں گا یہ مر گئی ہے میرے لیے۔“

پچھلے دو تین ہفتوں میں بس ایک بار بسمہ سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ وہ چوری چھپے کالج سے سیدھی تایا کے گھر آئی تھی اور نور سے ملی تھی۔ نور کو گلے لگا کر اس نے خوب آنسو بہائے تھے اور دل کا بوجھ ہلکا کیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ ابا جان نے انہیں نور کے ساتھ ملنے سے منع کر دیا ہے۔

ایک دن اس کے لیے پھپھو حاجرہ کا فون آیا۔ وہ کسی پی سی او سے بات کر رہی تھیں۔ انہوں نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ”نورا! تیرے ابا جی بہت پریشان ہیں، تم نے بہت دکھ دیا ہے انہیں۔ یاد رکھنا انہیں ناراض کر کے تو کبھی خوش نہیں رہ سکے گی، کسی بھی کام میں کامیابی نہیں ملے گی تجھے۔“

”میں کیا کروں پھپھو؟“ وہ روہانسی ہو کر بولی۔ ”وہ جس شرط پر مجھے معاف کریں گے، وہ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ میری شادی کرنا چاہتے ہیں وہ...... اور اپنی من مرضی سے۔ بالکل جس طرح انہوں نے آپی بتول کی شادی کی۔ اسے ایک ایسے سنگ دل بندے کے حوالے کر دیا جو انہیں ہم سے ملنے تک نہیں دیتا...... جس نے آپی کی زندگی کو جہنم بنا رکھا ہے...... مجھے شادی کے نام سے ہی خوف آنے لگا ہے پھپھو۔“

”اس کا کیا مطلب ہوا؟ شادی تو ایک نہ ایک دن کرنا ہی ہوگی تو کیوں نا اس میں اپنے باپ کی خوشنودی شامل کر لو۔“

”آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ ایک نہ ایک دن کرنا ہی ہوگی شادی لیکن ابھی نہیں پھپھو۔ ابھی...... میں کچھ کرنا چاہتی

ہوں...... کچھ بن کے دکھانا چاہتی ہوں......

''بن کے دکھانا چاہتی ہو۔'' پھپھو نے تلخ لہجے میں اس کی نقل اتاری۔ ''ڈاکٹر بن رہی ہوتا...... انجینئر بن رہی ہوتا؟ کچھ شرم کرو نور، کبڈی کھیلنے والوں کی طرح دوڑتی پھر رہی ہو۔ ہمارے خاندان میں کس نے کیا ہے اس طرح کا کام؟ اس سے کیا حاصل ہونا ہے تم کو......؟''

''ہوسکتا ہے پھپھو کچھ ہو ہی جائے۔'' نور نے کھوئی کھوئی آواز میں کہا۔

''کم از کم تمہیں تو کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ یہ میری پیشین گوئی ہے۔ تم نے اپنے باپ کا دل دکھایا ہے۔ اس کی بددعا لی ہے۔'' پھپھو نے بھنا کر کہا اور ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔

وہ وہیں پر کافی دیر تک گم صم بیٹھی رہی۔ یہاں تک کہ مہرین نے اسے وہاں سے اٹھایا اور اپنے کمرے میں لے گئی۔

☆☆☆

یہ پنجاب بھر کے کالجوں کے مقابلے تھے۔ نور اپنے کالج کی تمام برانچز کی طرف سے اس کیٹیگری میں سومیٹر ریس کی نمائندگی کررہی تھی۔ اس کی دوست شاہینہ نے بھی ان مقابلوں میں حصہ لینا تھا مگر مقابلوں سے صرف ایک ہفتہ پہلے شاہینہ فوڈ پوائزننگ کا شکار ہوگئی تھی اور ڈاکٹرز نے اسے تین ہفتے آرام کا مشورہ دے دیا تھا۔

یہ مقابلے نور کے لیے بڑے سودمند رہے۔ وہ ایک ابھرتی ہوئی ہونہار ایتھلیٹ کے طور پر سامنے آئی۔ ان مقابلوں کے دوران میں ایک اور اہم بات ہوئی۔ اس کی ملاقات اسی دراز قد نوجوان سے بھی ہوگئی جس نے چند ہفتے پہلے روڈ ایکسیڈنٹ میں ان کی مدد کی تھی اور بدتمیزی کرنے والے اوباش لڑکوں کو سبق سکھایا تھا۔ وہ بڑا فلمی سا سین تھا اور اپنی تمام تر سنگینی کے ساتھ ابھی تک نور کے ذہن پر نقش تھا۔

مقابلوں کے دوران میں اپنی ''ہیٹ'' میں پہلا نمبر حاصل کرنے کے بعد نور اپنے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر ہانپ رہی تھی۔ میدان میں تالیوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

''ویل ڈن۔ مبارک ہو۔'' ایک آواز سن کر وہ چونکی۔

اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اس کے سامنے وہی کھڑا تھا۔ دراز قد، مضبوط شانے، چمکتی ہوئی پیشانی۔

''اوہ آپ یہاں؟'' نور کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''جی ہاں...... میرا نام فرہاد ہے۔ میں ویکلی سپر اسٹار میں اسپورٹس کے شعبے کا انچارج ہوں۔ یہ میرا کیمرامین تنویر ہے۔''

''آپ کو یہاں دیکھ کر خوشی ہوئی۔'' نور نے رسمی انداز میں کہا۔

''کیا ہم آپ کی ایک تصویر لے سکتے ہیں؟''

''نو...... آئی ایم سوری...... مجھے تصویر بنوانا پسند نہیں ہے۔'' نور نے اپنا اسکارف درست کرتے ہوئے کہا۔

''اوکے...... کوئی بات نہیں۔'' فرہاد نے خوشدلی سے کہا اور کیمرامین کو واپس جانے کا اشارہ کیا۔ وہ پلٹ گیا۔

''آپ سے ایک سوال پوچھ سکتا ہوں مس نور؟'' فرہاد نے کہا۔

''جی پوچھیے۔''

''یہاں کافی لڑکیاں حصہ لے رہی ہیں مگر آپ اپنے لباس اور رویّے کے حوالے سے سب سے مختلف نظر آرہی ہیں۔''

وہ مسکرائی۔ ''میں ثابت کرنا چاہتی ہوں کہ ایک لڑکی مناسب اور باوقار لباس کے ساتھ بھی اکثر کھیلوں میں حصہ لے سکتی ہے۔ اپنا اور اپنے ملک کا نام روشن کرسکتی ہے۔''

فرہاد نے کہا۔ ''بہت اچھی بات کہی ہے آپ نے...... لیکن ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کرے آپ آگے جائیں اور بڑے مقابلوں میں حصہ لیں۔ جب آپ اپر لیول پر پہنچتے ہیں تو پھر یہ لباس وغیرہ کے معاملے آڑے آتے ہیں۔''

''میں انشاء اللہ ایسے کسی معاملے کو آڑے نہیں آنے دوں گی۔ ثابت کروں گی کہ اگر ایک عورت میں صلاحیت ہے تو پھر اس طرح کی مجبوریاں اس کے راستے کی رکاوٹ نہیں بن سکتیں۔'' وہ بات کرتے ہوئے بار بار اپنا اسکارف بھی درست کررہی تھی۔ اس کا یہ انداز جیسے فرہاد کے دل کو بھا رہا تھا۔

اسی دوران میں نور کی استاد اور کوچ فرحانہ بیگ موقع پر پہنچ گئیں۔ نور کے تایا اور تایازاد بھائی شرجیل بھی ساتھ تھے۔ انہوں نے نور کو ''ہیٹ'' جیتنے پر مبارک باد دی اور اگلی ہیٹ کے لیے وش کیا۔ نور اپنی کوچ فرحانہ بیگ سے باتیں کرنے لگی۔ نور کے تایا خلیل بھی اب فرہاد رازی کو دیکھ چکے تھے۔ وہ بڑے تپاک کے ساتھ اس سے ملے اور اس کی خیر خیریت دریافت کی۔ نور کی طرح تایا خلیل بھی فرہاد کے بہت شکر گزار تھے۔

فرہاد رازی بہت جلد بے تکلف ہوجانے والا نوجوان تھا۔ اس کی خوش گفتاری سے اخلاص اور انسیت جھلکتی تھی۔ فرہاد اور خلیل صاحب تماشائیوں کے درمیان آبیٹھے۔ فرہاد نے خلیل صاحب کو بتایا کہ ایک والدہ کے علاوہ اس کا دنیا میں اور کوئی نہیں۔ دو بڑے بھائی مستقل طور پر فرانس میں

شفٹ ہو چکے ہیں۔ وہ سیلف میڈ شخص تھا۔ اپنی کوشش سے ایک ہائی فائی میگزین میں ایک اچھی جاب تک پہنچا تھا۔ اس کے علاوہ اسے فلاحی کاموں سے بھی دلچسپی تھی۔ اس کے ایک چچا ماضی میں فرسٹ کلاس کرکٹ کھیل چکے تھے۔ شاید وہ مزید آگے جاتے لیکن چوٹ لگنے کے باعث اس فیلڈ کو خیرباد کہنے پر مجبور ہو گئے۔ اب وہ بوڑھے ہو چکے تھے۔ ان کی کسمپرسی دیکھ کر فرہاد کو یہ خیال آیا تھا کہ ماضی کے ایسے باصلاحیت کھلاڑی جو اب گمنامی اور تنگ دستی کی زندگی گزار رہے ہیں، ان کے لیے کوئی ادارہ قائم کیا جائے۔ آج کل وہ اپنے ایک ڈاکٹر دوست فیضان علی کے ساتھ مل کر اس پلان پر کام کر رہا تھا۔

جواب میں خلیل صاحب نے کہا۔ ''بھئی پھر تو ہم دونوں میں ایک قدر مشترک موجود ہے۔ میں نے بھی اپنے علاقے میں ایک فری کلینک قائم کیا ہے اور کوشش کر رہا ہوں کہ وہاں مستحق مریضوں کا حتی المقدور مفت علاج کیا جائے۔''

''اس سلسلے میں آپ کو کسی بھی طرح میرا تعاون درکار ہو تو میں حاضر ہوں۔'' فرہاد نے کہا۔

خلیل صاحب نے کہا۔ ''تعاون کی صورت تو بالکل موجود ہے بھئی۔ تم نے اپنے ڈاکٹر دوست کا ذکر کیا ہے۔ ہم نے دو ڈاکٹرز کا انتظام کر رکھا ہے لیکن کم از کم ایک ڈاکٹر کی ضرورت اور ہے۔ اگر تمہارے دوست اپنی سہولت کے مطابق کچھ وقت دے سکیں تو بڑی اچھی بات ہوگی۔ اگر وہ مناسب معاوضہ چاہیں گے تو وہ بھی ادا کر دیا جائے گا۔''

''آپ یہ کیسی بات کر رہے ہیں انکل۔'' فرہاد نے محبت سے کہا۔ ''کسی نیک کام میں حصہ ڈالنے کا موقع ملنا تو ایک سعادت کی طرح ہوتا ہے۔''

کوئی دو گھنٹے بعد نور کی دوسری ہیٹ ہوئی۔ یہ ہیٹ بھی اس نے ایک سخت مقابلے کے بعد جیت لی۔ یہ بڑی اہم کامیابی تھی، سارا میدان تالیوں سے گونج اٹھا۔ تماشائیوں میں صرف ٹیلیٹر کو ہی مدعو کیا گیا تھا۔ بڑا اچھا ماحول تھا، نور کی کلاس فیلوز نے نور کی اس کامیابی کو بڑی اچھی طرح ''سیلیبریٹ'' کیا۔ اب فائنل ہیٹ تھی، اس میں پنجاب کے انٹر کالجیٹ مقابلوں کی تیز رفتار ترین لڑکی کا انتخاب ہونا تھا......نور کے اچھے چانسز موجود تھے۔

دوسری ہیٹ میں کامیاب ہونے کے بعد جب نور انکلوژر میں پہنچی تو تایا خلیل اور فرہاد پرانے شناساؤں کی طرح بے تکلف بات چیت کر رہے تھے۔ تایا خلیل، فرہاد کو مدعو کر چکے تھے کہ وہ ان کے گھر آئے اور گھر کے بالکل پاس ہی واقع ان کے فری کلینک اور ڈسپنسری کا معائنہ کرے۔

اگلے روز کا فائنل مقابلہ بڑا سنسنی خیز تھا۔ نور یہ مقابلہ جیت تو نہیں سکی مگر اس نے تیسری پوزیشن حاصل کر لی اور وکٹری اسٹینڈ پر پہنچ گئی۔ اس نے کانسی کا تمغا جیتا۔ یہ کامیابی بھی معمولی نہیں تھی۔ تایا خلیل نے اسے گلے سے لگایا اور حوصلہ افزائی کی۔ اس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے بولے۔ ''مجھے اپنے اللہ سے پوری امید ہے، ایک دن تم کوئی بڑی کامیابی حاصل کر کے اس نامعقول کا منہ بند کر دو گی۔''

نامعقول کا لفظ وہ اکثر و بیشتر اپنے چھوٹے بھائی اشفاق کے لیے ہی استعمال کیا کرتے تھے۔ اشفاق جن کو عام لوگ مولوی اشفاق مہرا کہتے تھے اور جن کا کتابوں کا کاروبار آہستہ آہستہ جم رہا تھا۔

انٹر کالجیٹ مقابلوں کے بعد نور کا اکثر فرہاد سے آمنا سامنا ہونے لگا۔ فرہاد اور اس کا دوست ڈاکٹر فیضان، تایا جان کے فری کلینک میں اہم کردار ادا کر رہے تھے۔ فرہاد اکثر گھر بھی آ جاتا تھا۔ شرجیل اور عثمان سے بھی اس کی گاڑھی چھننے لگی تھی۔ پتا نہیں کیوں نور کو محسوس ہوتا تھا کہ اس کے دل کی گہرائی میں کسی گوشے کے اندر فرہاد کے لیے پسندیدگی کے جذبات پیدا ہو رہے ہیں اور یہ کیفیت شاید یک طرفہ نہیں تھی۔ اس نے بھی اکثر فرہاد کی گہری آنکھوں میں اپنے لیے ایک بے نام سا عکس لرزاں دیکھا تھا۔ وہ ایک لڑکی تھی، اس کے دور شباب کے کچھ تقاضے تھے مگر وہ ان معاملوں سے کوسوں دور رہنا چاہتی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اپنے مہربان اور محسن تایا کے لیے کسی بھی درجے کی معمولی سے معمولی پریشانی کا باعث بنے۔ وہ اپنے حوالے سے انہیں ہمیشہ سربلند اور سرخرو دیکھنے کی خواہش مند تھی...... اور اس کے لیے اپنے جسم اور جان پر ہزار ہا صدمے سہنے کے لیے تیار تھی۔

ایک روز بادل گھر کر آئے ہوئے تھے۔ تایا ابا گھر میں ہی تھے۔ فرہاد بھی آیا ہوا تھا اور ان کے ساتھ ڈرائنگ روم میں موجود تھا۔ نور کو ٹریننگ سینٹر جانا تھا۔ بڑے تایا زاد بھائی شرجیل کو کوئی کام تھا اور وہ گاڑی لے کر گیا ہوا تھا۔ ایسے موقعوں پر تایا ابا یا عثمان اسے موٹر بائیک پر لے جاتے تھے۔ آج بھی یہی پروگرام تھا مگر پھر بارش شروع ہو گئی۔

''تایا ابا! مجھے دیر ہو جائے گی۔ آج میرا جانا بہت ضروری ہے۔'' نور نے ڈرائنگ روم میں جا کر اور ذرا ٹھٹک کر کہا۔

بادل گرج رہے تھے اور بارش برسنا شروع ہو گئی تھی۔ تایا ابا کچھ دیر سوچنے کے بعد بولے۔ ''ایسا کرو تم فرہاد

بھائی کے ساتھ چلی جاؤ۔ اس کے پاس گاڑی ہے۔ یہ تمہیں چھوڑتا ہوا نکل جائے گا، واپسی پر شرجیل لے آئے گا۔''

''لیکن تایا ابا......'' وہ کہتے کہتے رک گئی۔ اسے عجیب سی جھجک محسوس ہو رہی تھی۔

''کوئی بات نہیں بیٹا جی! میں کہہ رہا ہوں نا کہ چلی جاؤ۔'' تایا ابا نے اعتماد سے کہا۔ فرہاد کے پاس چھوٹی سوزوکی مہران تھی۔ وہ دونوں جب گھر سے نکلے تو ہلکی بارش ہو رہی تھی لیکن پھر سہ پہر میں ہی اندھیرا چھا گیا اور تابڑ توڑ مینہ برسنے لگا۔ یہ جولائی کا وسط تھا اور مون سون کی دوسری بارش تھی۔ انہیں ریواز گارڈن سے قذافی اسٹیڈیم کی طرف جانا تھا۔ ابھی وہ نہر والی سڑک پر نہیں پہنچے تھے کہ انہیں شدید ٹریفک جام کا سامنا کرنا پڑا۔ معلوم ہوا کہ آگے ایک بہت بڑا ہورڈنگ سڑک پر گر گیا ہے جس کی وجہ سے ٹریفک جام ہے اور گاڑیاں آمنے سامنے سر جوڑے کھڑی ہیں۔ ایسے شدید موسم میں عام طور پر ٹریفک پولیس بھی دائیں بائیں ہو جاتی ہے اور پھنسی ہوئی سیکڑوں گاڑیاں قدرت کے رحم و کرم پر رہ جاتی ہیں۔

''میرا خیال ہے کہ گاڑی موڑ لی جائے۔'' فرہاد نے کہا۔

''ہاں، وہ دیکھیں اور لوگ بھی مڑ رہے ہیں۔'' نور نے تائید کی۔

فرہاد نے پھرتی سے گاڑی موڑ لی۔ اب انہیں ایک لمبا چکر کاٹ کر کینال روڈ پر پہنچنا تھا مگر وہ دو تین سو میٹر دور ہی گئے ہوں گے کہ یہاں بھی ٹریفک جام ملا۔ فرہاد نے بہتر سمجھا کہ گاڑی ریس کورس پارک کی پارکنگ میں لے جائے۔

انہوں نے گاڑی پارکنگ میں روک دی اور سڑک کی صورتِ حال بہتر ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ بارش اتنی تابڑ توڑ تھی کہ تھوڑی ہی دیر میں اردگرد کے راستوں پر کئی کئی فٹ پانی کھڑا ہو گیا۔ اب اگر ٹریفک کھل بھی جاتا تو وہ اتنی جلدی یہاں سے نکل نہیں سکتے تھے۔

''یہ تو اچھا نہیں ہوا۔'' نور بے قراری سے ہاتھ ملتے ہوئے بولی۔ ''میڈم فرحانہ سینٹر میں پریشان ہوں گی۔ ادھر تایا جان کو گھر میں فکر ہو گی۔''

''آپ پریشان نہ ہوں نور، وہ سامنے پی سی او نظر آ رہا ہے۔ میں انکل خلیل کو فون کر دیتا ہوں۔''

''ابھی ٹھہر جائیں، بارش تیز ہے۔'' نور نے کہا۔

آدھ پون گھنٹا مزید گزر گیا۔ بارش کچھ دیر کے لیے ہلکی ہو کر پھر تیز ہو جاتی تھی۔ سیوریج کے نظام میں کچھ خرابی تھی جس کی وجہ سے اردگرد کی سڑکوں پر پانی کی سطح بلند ہوتی جا رہی تھی۔ آخر نور کے منع کرنے کے باوجود فرہاد نے اپنی جینز گھٹنوں تک اڑسی اور فون کرنے کے لیے باہر چلا گیا۔

اس کی واپسی میں دیر ہو رہی تھی اور نور کو تشویش لاحق ہونا شروع ہو گئی تھی۔ وہ عام لڑکیوں سے بہت مختلف تھی مگر تھی تو لڑکی ہی۔ آخر فرہاد واپس آتا دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پیکٹ تھا جو اس نے شاپر میں لپیٹ رکھا تھا۔ اس نے تیزی سے گاڑی میں گھس کر دروازہ بند کر لیا۔

''ہو گیا فون؟'' نور نے پوچھا۔

''بالکل ہو گیا۔ انکل نے ہی اٹھایا تھا، پریشان تھے۔ انہوں نے سینٹر میں فون کیا تو وہاں سے میڈم فرحانہ نے انہیں بتایا کہ نور نہیں پہنچی۔''

''مجھے بھی پریشانی تھی۔''

''نہیں۔ میں نے انہیں پوری تسلی دے دی ہے اور کہا ہے کہ وہ میڈم کو بھی آگاہ کر دیں۔''

اس طرف سے پریشانی ختم ہوئی تو نور نے شاید پہلی بار اردگرد کے موسم کی نیرنگی پر دھیان دیا۔ دور تک ریس کورس پارک کے خوب صورت سبزہ زار نظر آ رہے تھے۔ ان میں درخت تھے اور پھولوں کے تختے تھے...... اور روشیں تھیں۔ یہ سب کچھ تسلسل کے ساتھ مون سون کی اس دھواں دھار بارش میں بھیگ رہا تھا۔

''یہ لیں جی! کے ایف سی کے برگر۔ مجھے پتا تھا کہ آپ کو بھوک لگ رہی ہو گی۔'' فرہاد نے پیکٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مجھے بھوک زیادہ لگتی ہے؟''

''اگر میں کہہ بھی دوں تو اس میں کون سی غلط بات ہے۔ آپ ہر وقت جسمانی مشقت کی صورتِ حال میں رہتی ہیں۔ عام لوگوں کی نسبت آپ کو انرجی کی زیادہ ضرورت ہے۔''

''تو پھر عام لوگ اپنے لیے برگر کیوں لے آئے ہیں؟'' وہ ہولے سے مسکرائی۔

''آپ کا ساتھ دینے کے لیے۔'' وہ اپنے بھیگے بالوں کو اپنی فراخ پیشانی سے ہٹاتے ہوئے بولا۔ اس کے کپڑے شرابور ہو رہے تھے۔

اس نے ایک برگر نکال کر نور کی طرف بڑھایا۔ نور نے ابھی دو بائٹ ہی لیے تھے کہ وہ پکارا۔ ''ٹھہریے ٹھہریے محترمہ! آپ کا زنگر تو یہ رہا۔ یہ میرا ویلیو برگر ہے۔'' اس نے نور والا برگر اس سے لے کر دوسرا تھما دیا۔

زنگر واقعی نور کو پسند تھا مگر فرہاد کی اس حرکت میں تھوڑی سی شوخی اور چالا کی نظر آ رہی تھی۔ اس نے جان بوجھ

کر ''برگر'' نور کو تھما دیا تھا۔ اب وہ اس کے چھوٹے برگر کو بڑے اطمینان سے کھانے میں مصروف تھا۔ یہ ایک معنی خیز اشارہ تھا۔ نور کے سارے جسم میں جیسے سنسنی اور انبساط کی ایک لہر سی دوڑی۔

اس نے بائٹ لیتے ہوئے کن انکھیوں سے فرہاد کی طرف دیکھا۔ وہ یوں کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ وہ دلکش شخصیت کا مالک تھا اور یہ دلکش شخصیت دن بدن اس کے دل میں گھر کر رہی تھی۔

کولڈ ڈرنک کا سپ لے کر وہ کھوئی کھوئی آواز میں بولا۔ ''یہ راستے بھی کیا چیز ہوتے ہیں نور! اپنوں کو غیر اور غیروں کو اپنا بنا دیتے ہیں۔ کسی وقت سوچتا ہوں کہ اگر اس روز میں خلافِ معمول اس سڑک سے گزر کر آفس نہ جا رہا ہوتا تو آپ سے اور انکل سے کبھی ملاقات نہ ہو پاتی۔''

''ہاں، راستے کیا چیز ہوتے ہیں اور یہ بارش بھی کیا چیز ہوتی ہے...... دو اچھے بھلے بندوں کو ایک گاڑی میں بند کر کے، فلسفیوں کی طرح سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔'' وہ بولی۔

''تو میں آپ کو فلسفی لگ رہا ہوں؟''

''باتیں تو ایسی ہی کر رہے ہیں۔'' وہ مسکرائی۔

''آپ مسکراتی ہوئی اچھی لگتی ہیں۔''

''ویسے برا نہ مانیے گا۔ یہ بڑا گھسا پٹا فقرہ ہے۔''

''الفاظ اہم نہیں ہوتے محترمہ، ان کا مفہوم اور ان کی تاثیر اہم ہوتی ہے۔''

اچانک سامنے آسمان پر بجلی کا نہایت زوردار کڑاکا سنائی دیا۔ نور نے بے ساختہ فرہاد کا بازو تھام لیا۔ اس کی انگلیاں جیسے اس کے سڈول بازو میں کھب سی گئی تھیں۔ پھر فوراً ہی اس نے ہاتھ ہٹا بھی لیا۔ بارش کی بوچھاڑیں تیز ہو گئیں۔

فرہاد نے کہا۔ ''آپ بہادر لڑکی ہیں۔ چھوٹی موٹی لڑکیوں سے بہت مختلف لیکن ہیں تو لڑکی۔'' اس کا اشارہ یقیناً اس گرفت کی جانب تھا جو ابھی تھوڑی دیر پہلے نور نے اس کے بازو پر بنائی تھی۔

وہ اپنے نیلے اسکارف کو درست کرتے ہوئے بولی۔

''شاید آپ ٹھیک کہتے ہیں۔''

''ویسے کتنا اچھا ہوتا اگر آپ تھوڑی سی ''مزید لڑکی'' ہوتیں۔'' وہ شوخی سے بولا۔

''کیا مطلب؟''

''فلموں ڈراموں میں تو لڑکیاں ایسے موقعوں پر ڈر کر قریبی مرد حضرات کے اوپر ہی گر جاتی ہیں۔''

''آپ کچھ ضرورت سے زیادہ نہیں بول رہے۔'' وہ سنجیدہ ہو گئی۔

''سس...... سوری۔''

وہ ذرا توقف سے گویا ہوئی۔ ''میرا خیال ہے، اب ہمیں چلنا چاہیے۔ لگتا ہے کہ سڑک پر پانی کافی کم ہو گیا ہے۔''

فرہاد نے ٹھنڈی سانس لی۔ پانی واقعی ایک دم کم ہونا شروع ہو گیا تھا حالانکہ بارش ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ فرہاد کے چہرے سے لگتا تھا کہ وہ اتنے خوب صورت موقع کو یونہی بغیر ''پیش رفت'' کے کھونا نہیں چاہتا۔ وہ کبھی سڑک کو دیکھ رہا تھا، کبھی آسمان کو۔

''کیا سوچ رہے ہیں؟'' نور نے نرم لہجے میں کہا۔

وہ مسکرایا...... اس کی خوب صورت آنکھوں میں پھر ہلکی سی شوخی عود کر آئی۔ ''او کے۔'' اس نے کہا اور گاڑی اسٹارٹ کی۔ تین چار بار سیلف لگایا لیکن وہ اسٹارٹ نہیں ہوئی۔ ''ہو جا...... ہو جا۔ میری جان کی دشمن ہو جا......'' وہ بڑبڑایا۔

پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ''مجھے لگتا ہے نور صاحبہ! گاڑی ہم سے متفق نہیں۔ وہ اس موسم سے تھوڑا سا اور لطف اندوز ہونا چاہتی ہے۔''

''کچھ لوگ خود کو ضرورت سے زیادہ سمجھ دار سمجھتے ہیں...... مثلاً، ان کا خیال ہوتا ہے کہ بس وہی جانتے ہیں کہ گاڑیوں میں چور سوئچ بھی ہوتے ہیں۔''

''آپ کا خیال ہے میں نے چور سوئچ دبایا ہے؟''

''میرا خیال یہی ہے۔ میں جانتی ہوں کہ آپ نے یہ حرکت فرمائی ہے۔''

''اوہ گاڈ...... تیرے یہ سادہ دل بندے کدھر جائیں۔''

فرہاد نے بے بسی کی اداکاری کی اور تھکے ہوئے انداز میں سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائی پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''ویسے برا نہ مانیے گا۔ کیا آپ کا بھی کوئی چور سوئچ ہے؟ میرا مطلب ہے کہ آپ کے دل میں بھی کوئی چور سوئچ ہے؟''

''یہ کیا سوال ہوا۔ آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں؟'' وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

''دراصل، مجھے لگتا ہے کہ آپ کے دل میں بھی کوئی چور سوئچ ہے جس کے سبب آپ نے اپنی خاص قسم کی دھڑکنوں کو بند کیا ہوا ہے...... پلیز، اس سوئچ کو آف کریں۔ دل کو دھڑکنے دیں، آزادی سے...... جب وہ دھڑکے گا تو زندگی کی رگوں میں خون خود ہی اپنے راستے تلاش کرنا شروع کر دے گا۔''

"مجھے شاید نئے راستوں کی ضرورت نہیں۔ میں جس راستے پر چل رہی ہوں، وہی میرے لیے کافی ہے۔"

"دیکھا نا۔ ہے چور سوچ۔ بالکل ہے۔" اس نے سر ہلایا۔

اس کے انداز نے نور کو بے ساختہ مسکرانے پر مجبور کر دیا مگر اگلے ہی لمحے وہ پھر سنجیدہ ہو گئی۔ "اچھا اب چلیں۔ ابھی اندھیرا ہو جائے گا۔"

"لیکن...... آپ نے یہ سوئچ آف کرنے والا کام ضرور کرنا ہے۔ پلیز......پلیز۔"

وہ خاموشی سے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی پھر اسے لگا کہ یہ خاموشی نیم رضامندی کی طرح ہے۔ اس نے گھبرا کر کچھ بولنا چاہا مگر بول نہ سکی۔

"تھینک یو...... تھینک یو۔" فرہاد نے کہا اور نیچے جھک کر گاڑی کا چور سوئچ دبا دیا۔ گاڑی اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھ گئی۔ پارکنگ سے باہر نکلتے ہی وہ چوراہے پر پہنچ گئے۔ ٹریفک سگنل بند تھا، انہیں رکنا پڑا۔ دفعتاً نور کی نگاہ کھڑکی سے گزر کر بائیں جانب کھڑی ایک ایف ایکس گاڑی پر پڑی۔ وہ بری طرح چونک گئی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ذرا کرخت شکل اور چھوٹی ڈاڑھی والا جو نوجوان بیٹھا تھا، وہ اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ وہ اسے پہچان سکتی تھی، یہ وہی تھا...... ہاں، یہ وہی تھا۔ پھپھو اور بسمہ نے اس کا نام... ذوالقرنین بتایا تھا۔ یہی تھا جسے اباجی نے اس کے لیے پسند کیا تھا۔ وہ بھی بڑے دھیان سے نور ہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

نور نے گھبرا کر اسکارف کو اپنی ٹھوڑی سے اوپر کھینچ لیا اور اپنا ایک تہائی چہرہ چھپا لیا۔ فرہاد نے اس وقت کوئی مزاحیہ بات کی تھی اور ہنس رہا تھا۔ نور کو اس کی بات کی سمجھ آئی تھی اور نہ اس کی ہنسی کی، اس کے اندر تو جیسے کھلبلی سی مچ گئی تھی۔ اس نے ایک بار پھر کن انکھیوں سے ایف ایکس پر نگاہ دوڑائی۔ یقیناً وہ مولانا حبیب کا بیٹا قاری ذوالقرنین تھا اور اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اس دوران میں فرہاد نے بھی نور کی بے چینی کو نوٹ کر لیا۔ وہ بولا۔ "کیا بات ہے نور...... آپ کچھ پریشان ہو گئی ہیں؟"

"نہیں، پریشان تو نہیں۔" اس نے بہ مشکل خود کو سنبھالا۔

اسی دوران میں سگنل سبز ہو گیا۔ دونوں گاڑیاں چل پڑیں۔ فرہاد آگے نکل گیا۔ ذوالقرنین غالباً آخر تک نور کو دیکھتا رہا تھا۔ قریباً ایک فرلانگ آگے جا کر نور نے سائڈ کے عقب نما آئینے میں دیکھنے کی کوشش کی۔ نیلے رنگ کی ایف ایکس اب بھی ان کے پیچھے آ رہی تھی۔ نور کی دھڑکنیں زیر و زبر ہونے لگیں۔

اب ایف اے ایس کا ٹائم تو گزر چکا تھا، اس لیے نور واپس گھر ہی جا رہی تھی۔ مزنگ چورنگی کے چوراہے پر نور نے ایک بار پھر عقب نما میں جھانکا، نیلی گاڑی عقب میں موجود تھی مگر پھر آگے جا کر وہ نظر نہیں آئی۔

☆☆☆

رات کو نور دیر تک جاگتی رہی۔ اس کے ذہن میں بہت سے اندیشے سر اٹھا رہے تھے۔ ذوالقرنین نے اسے جن نگاہوں سے دیکھا تھا، وہ شکوک و شبہات سے اٹی ہوئی تھیں۔ کیا وہ اس بارے میں کسی کو آگاہ کرے گا؟ کہیں وہ یہ بات نور کے گھر اور اس کے اباجی تک تو نہیں پہنچا دے گا؟ اور اگر ایسا ہوا تو اباجی جو پہلے ہی بھرے بیٹھے تھے، ان کا ردعمل کیا ہوگا؟

اس نے سوچا کہ کیا وہ اس حوالے سے پیش بندی کرے اور پہلے ہی تایاجی اور تائی جی کو بتا دے؟

اگلے روز وہ قریبی مارکیٹ میں گئی اور وہاں سے بسمہ کی ایک دوست کو فون کیا۔ اس سے کہا کہ بسمہ پی سی او سے تایا کے فون پر رابطہ کرے یا خود گھر آ کر اس سے ملے۔ شام سے کچھ دیر پہلے گھر کے فون پر بسمہ کی کال آ گئی۔ نور نے چھوٹتے ہی پوچھا۔ "بسمہ! گھر میں تو سب خیریت ہے نا؟"

"بس اسی طرح کی خیریت ہے جس طرح کی چل رہی تھی۔ تم کیوں پوچھ رہی ہو۔ کیا کوئی نئی بات ہوئی ہے؟"

"نن...... نہیں...... مگر مجھے پریشانی تھی۔ انٹر کالجیٹ مقابلوں کے بعد میری ایک تصویر اخبار میں بھی چھپی تھی۔ اباجی کی نظر سے تو نہیں گزری؟" نور نے بات بتائی۔

"گزری بھی ہوگی تو انہوں نے ذکر نہیں کیا۔ وہ آج کل بالکل گم صم سے ہیں نور! آپی بتول کی طرف سے بھی کچھ اچھی خبریں نہیں ہیں۔ بھائی غیاث کا رویہ دن بدن خراب ہوتا جا رہا ہے۔ اتوار کو بڑے ماموں مراد ملتان گئے ہوئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ آپی سیڑھیوں سے گری ہے۔ ماتھے اور کلائی پر سخت چوٹ آئی ہے۔ اب پتا نہیں کہ وہ گری ہیں یا کچھ اور ہوا ہے۔"

نور کے دل سے ایک ہوک سی نکلی۔ اپنے بہنوئی غیاث کا چہرہ اس کی نگاہوں میں گھوم گیا۔ وہ بہت کم بولتا تھا اور شاید اچھا ہی کرتا تھا کیونکہ اس کے منہ سے اکثر پتھر ہی جھڑتے تھے۔ پتا نہیں کیا بات تھی جب کبھی بھی اس کے

تصور میں اپنے بہنوئی غیاث کی سخت گیری یا اپنی مرحومہ ماں کی بے بسی آتی تھی، اس کے اندر ایک زبردست تحریک پیدا ہوجاتی تھی۔ اس کے پاؤں جیسے بے ساختہ حرکت کرنے لگتے تھے۔ اس کے سینے میں ترنگ سی جاگنے لگتی تھی۔ آگے بڑھنے کی لگن، کچھ کر دکھانے کی تڑپ، مرد کے تسلط سے آزادی کی آرزو۔

پانچ چھ دن ایسے ہی گزر گئے۔ اس روز والے واقعے کا کوئی ردعمل سامنے نہیں آیا۔ نور اب سوچنے لگی کہ شاید وہ ذوالقرنین تھا ہی نہیں۔ اسے پہچاننے میں غلطی ہوئی ہے یا شاید اسکارف کی وجہ سے وہ اسے ٹھیک طرح نہیں دیکھ سکا۔ یا یہ بھی ممکن تھا کہ اس نے نور کو پہچان تو لیا ہو مگر فرہاد کو اس کا تایازاد بھائی یا ماموں سمجھا ہو۔

☆☆☆

ذوالقرنین نماز روزے کا پابند ایک پرہیز گار نوجوان تھا۔ اس کی عمر چوبیس سال سے آگے بڑھ چکی تھی۔ والد مولانا حبیب اللہ ایک جانے پہچانے عالم دین تھے لیکن پتا نہیں کیوں یہ بات ان کی سمجھ میں بھی نہیں آتی تھی کہ اگر کوئی خاص مجبوری نہ ہو تو بچوں کی شادی جلد کر دینی چاہیے۔ زندگی کے ہر دور کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں اور اسی طرح شباب کے بھی۔

ذوالقرنین ان نوجوانوں میں سے تھا جو کسی غیر عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ ٹھوس حقیقت تھی کہ اسے بالغ ہوئے سات برس ہونے والے تھے اور اس کے جسمانی تقاضے شاید اس سے بھی پہلے کے تھے پھر ایک روز اس نے ماں سے کہہ ہی دیا تھا......

”امی! میرے لیے کوئی ڈھونڈیں......“

اس واقعے کے کوئی دو ماہ بعد اس نے ایک شادی میں پہلی بار مولوی اشفاق صاحب کی دختر عین النور کو دیکھا تھا۔ وہ اس وقت بھی مکمل عبایا میں تھی۔ ذوالقرنین کی جڑواں بہن خدیجہ نے اس کے بازو پر چٹکی لیتے ہوئے کہا تھا۔

”ذوالقرنین! وہ کریم کلر عبایا والی ہے جس سے تمہاری بات چل رہی ہے۔“

اس کے بعد شادی کی پوری تقریب میں ذوالقرنین کی نگاہوں میں اس کا من موہنا چہرہ گھومتا رہا تھا۔ بعدازاں اسے ایک دن عین النور کی ایک تصویر بھی دکھائی گئی تھی۔ اس کے دل کو یہ لڑکی ہر طرح سے بھائی تھی۔ اس نے کئی شب و روز اس کی سوچ میں گم گزار دیے تھے۔ اس نے آنے والے خوشگوار دنوں کی چاپیں سنی تھیں اور دھڑکنوں کو بے ترتیب محسوس کیا تھا۔ آخر وہ مرحلہ آیا تھا جب یہ معاملہ فائنل ہونے جا رہا تھا...... اور تب سب کچھ اتھل پتھل ہو کر رہ گیا تھا۔ یہ بات جہاں تک پہنچی تھی وہیں پر ختم ہوگئی تھی......

اور کچھ دنوں بعد یہ اڑتی اڑتی سی بات دل گرفتہ ذوالقرنین کے کانوں تک پہنچی تھی کہ لڑکی اپنے گھر والوں سے ناراض ہو کر تایا کے گھر میں رہنے لگی ہے اور کھیلوں وغیرہ میں حصہ لے رہی ہے...... چار دن پہلے ذوالقرنین نے مولوی اشفاق کی بیٹی عین النور کو پھر دیکھا تھا اور اس مرتبہ کسی شادی کی تقریب میں نہیں بلکہ بارش کی رم جھم میں ریس کورس پارک کے سامنے ایک گاڑی کے اندر۔ وہ ایک خوبرو نوجوان سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی اور ذوالقرنین کی طرف دیکھ کر بے طرح ٹھٹک گئی تھی۔ تب سے ذوالقرنین کا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ لڑکی کچھ غلط سلط چکروں میں پھنس چکی ہے۔ پہلے اس نے سوچا کہ وہ اپنی بہن خدیجہ کو اس صورتِ حال سے آگاہ کرے...... لیکن پھر ارادہ بدل دیا۔ وہ ایک بار خود اس سے ملنا چاہ رہا تھا۔ تھوڑی سی کوشش کر کے اس نے یہ کھوج بھی لگا لیا تھا کہ نور اس روز جس خوبرو لڑکے کے ساتھ دیکھی گئی تھی، اس کا نام فرہاد رازی ہے۔ وہ ایک جدید طرز کے ہفت روزہ میگزین میں کام کرتا ہے اور آج کل نور کے تایا خلیل مہرا صاحب کے گھر میں اس کا بہت آنا جانا ہے۔ یہ معلومات اس نے اپنے دو دوستوں کی مدد سے حاصل کی تھیں۔ یہ دونوں دوست ایک مقامی تنظیم اصلاحِ معاشرہ کے کارکن تھے۔ کچھ عرصے سے ذوالقرنین بھی اسی تنظیم کا رکن تھا۔

☆☆☆

نور ٹریننگ سینٹر ایف اے ایس میں موجود تھی اور اسٹریچنگ کی ورزشیں کر رہی تھی۔ کوچ میڈم فرحانہ کسی کام سے گئی ہوئی تھیں۔ ان کی غیر موجودگی میں دیگر لڑکیوں کو انسٹرکشن وغیرہ دینا بھی نور کی ذمے داری تھی۔ اتنے میں چوکیدار رزمان خان نمودار ہوا۔ اس نے کہا۔ ”بی بی صیب! ایک بندہ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ بہت دیر سے ضد کر رہا ہے۔ اپنا نام ذوالقرنین بتا رہا ہے۔“

نور کی رگوں میں خون سنسنا اٹھا۔ اس نے پونی ٹیل کس کر باندھی۔ اوپر پہنا پھر اسکارف لیا اور باہر پہنچی۔ وہ میڈم فرحانہ کے آفس میں بیٹھا تھا۔ نور کو دیکھ کر وہ کھڑا ہوگیا اور ”السلام علیکم“ کہا۔

”جی فرمایئے۔“ نور نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔

''اہم بات ہے۔ کیا آپ مجھے بیٹھنے کا نہیں کہیں گی؟''

پہلے تو نور کے جی میں آئی کہ نفی میں جواب دے پھر اس نے خود کو سنبھالا اور میڈم کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ آپ نے جو کچھ بھی کہنا ہے چند لفظوں میں کہہ دیں۔''

''چند لفظوں میں کہنے والی بات ہوتی تو میں یہاں نہ آتا۔'' وہ ذرا سخت لہجے میں بولا۔ ''آپ کو تسلی سے سننا ہوگا۔ ورنہ میں کسی اور وقت آجاؤں گا۔''

''آپ کوئی بہت بڑا انکشاف نہیں فرمانے والے، آپ نے مجھے گاڑی میں تایا جان کے دوست کے ساتھ دیکھا ہے اور اب اسی سلسلے میں کوئی بے کار بات ارشاد کرنے والے ہیں۔''

''میں آپ کو سمجھانا چاہتا ہوں۔ آپ گمراہی کی طرف جارہی ہیں۔ آپ ایک مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتی ہو۔ آپ کے والد مولوی اشفاق ایک عزت دار آدمی ہیں۔ آپ کیوں ان کو رسوا کرنا چاہ رہی ہو؟'' وہ نور کی طرف دیکھے بغیر بات کررہا تھا۔

''دیکھو مسٹر! تم مجھ سے اس لہجے میں بات نہیں کرسکتے۔ میں اپنا اچھا برا خوب سمجھتی ہوں۔ تم خوامخواہ ٹھیکیدار بننے کی کوشش نہ کرو۔''

''اگر تمہیں اپنے اچھے برے کی تمیز ہوتی تو اپنے محسن اور اپنے بدخواہ کو پہچانتی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مجھے کسی اور سے بات کرنا پڑے گی۔''

''بلیک میل کررہے ہو؟ ٹھیک ہے بتادو جس کو بتانا ہے، میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا ہے......''

''اور مجھے لگ رہا ہے کہ تم ایک نہیں کئی غلط کام کررہی ہو۔ ہمارے درمیان کوئی اور رشتہ نہ بھی ہو تو انسانیت کے طور پر میں تمہیں سمجھا سکتا ہوں۔ یہ پتلونیں کس کے چھلانگیں مارنا، فٹ بال اور جوڈو کراٹے کھیلنا، کیا یہ لڑکیوں اور عورتوں کے کام ہیں؟ قدرت نے عورت کو صنف نازک بنایا ہے، اس کی کچھ اور ذمے داریاں ہیں، اس کی محنت مشقت کے کچھ اور میدان ہیں۔''

''ہاں کچن میں برتن دھونا، ڈھیروں کپڑے استری کرنا، سستے بازاروں میں جاکر بچوں کے لیے شاپنگ کرنا...... یہ ہیں اس کے میدان...... تم جیسے لوگ ہیں مسٹر ذوالقرنین! جنہوں نے اسلامی دنیا کی نصف آبادی کو مُردار بنا کر رکھ دیا ہے، اپنی یہ تقریر تم اپنے پاس رکھو تو بہت بہتر ہے۔''

وہ تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور باہر نکل گئی۔

ذوالقرنین کا چہرہ لال بھبوکا ہورہا تھا۔

وہ واپس ہال کمرے میں جاکر بے قراری سے ٹہلنے لگی۔ کچھ دیر بعد اس نے چوکیدار سے پوچھا۔ اس نے بتایا کہ وہ بندہ جاچکا ہے۔

تین چار دن پھر تناؤ میں گزرے۔ نور کو اندیشہ تھا کہ شاید کوئی ردعمل ظاہر ہو۔ اس نے صاف طور پر کہا تھا کہ اب کسی اور سے بات کرنا پڑے گی۔ کسی اور سے، اس کی مراد نور کے ابا جان کے سوا اور کیا ہوسکتی تھی؟

بہرطور خیریت ہی گزری۔ نور اب فرہاد کے سلسلے میں زیادہ محتاط ہوگئی تھی۔ وہ دو تین بار گھر بھی آیا مگر نور نے اس کا سامنا کرنے سے گریز کیا۔ حسب معمول اسے کالج چھوڑنے اور واپس لانے کے لیے ماموں مراد کی ڈیوٹی تھی۔ الیف اے ایس کی آمدورفت تایا ابا کے ذمے تھی۔ تایا اب اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھ رہے تھے اور شب و روز اس کے لیے دعا گو بھی رہتے تھے۔ وہ تہجد بھی پڑھتے تھے۔ ایک رات نور کھانسی کی دوا لینے کے لیے اٹھی تو اس نے چار بجے کے لگ بھگ تایا ابا کو مصلے پر بیٹھے اور اشک بار آنکھوں سے دعا مانگتے دیکھا۔ نور کو دیکھ کر انہوں نے دعا ختم کی اور اس سے اٹھنے کی وجہ پوچھی تو نور نے بتایا کہ یونہی رات کے کھانے میں دہی پکوڑیاں کھالی تھیں جس کی وجہ سے کھانسی ہورہی ہے۔

وہ مضطرب ہوگئے۔ ''اگر زیادہ مسئلہ ہے نور تو ڈاکٹر کو دکھالیتے ہیں۔ تمہیں اس طرح کی بے احتیاطی نہیں کرنی چاہیے۔ سالانہ ایونٹ میں اب زیادہ دیر نہیں ہے۔ تمہیں ہر طرح فٹ ہونا چاہیے۔''

اس نے تایا ابا کو تسلی دی اور بتایا کہ وہ بالکل ٹھیک ہے۔

وہ بالکل ٹھیک تھی...... لیکن شاید بالکل ٹھیک نہیں بھی تھی۔ وہ فرہاد سے مکمل گریز کررہی تھی مگر اس گریز میں شاید اس کا دل اس کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ اس نے ایک دن دور سے فرہاد کا ستا ہوا چہرہ دیکھا تھا اور اس کے سینے میں ایک درد سا لہریں لینے لگا تھا۔ اس نے خاموشی کی زبان میں خود ہی سے پوچھا...... ''کیا تم فرہاد کو چاہنے لگی ہو؟''

جواب نفی میں نہیں تھا۔ اسے ایک عجیب سی گھبراہٹ محسوس ہونے لگی۔ وہ ان راستوں پر چلنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اپنی تمام تر توجہ اپنے کھیل پر مرکوز رکھنا چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس سے ایسی کوئی چھوٹی سے چھوٹی لغزش بھی نہ ہو جس کی وجہ سے اس کے تایا ابا کو ابا جان کے سامنے یا دیگر لوگوں کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔ اس کے اندر ایک

جنگ سی رہنے لگی۔ وہ ٹریننگ میں بھرپور حصہ لے رہی تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ کسی وقت اس کے تصور میں فرہاد کا ستا ہوا اداس چہرہ بھی آجاتا تھا۔

ایک دوپہر جب گھر میں سب سو رہے تھے، فون کی بیل ہوئی۔ نور نے فون اٹھایا تو دوسری طرف فرہاد تھا۔ نور کی آواز پہچان کر وہ فوراً بولا۔ ''پلیز نور! فون بند نہ کرنا۔ میں آپ سے بس ایک چھوٹی سی بات کہنا چاہتا ہوں۔''

وہ ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئی۔ ادھر ادھر دیکھ کر دھیمے لہجے میں بولی۔ ''کہیے میں سن رہی ہوں۔''

''نور! مجھے لگتا ہے کہ اس روز میں نے گاڑی میں آپ سے جو بے تکلف باتیں کیں، وہ آپ کو بری لگی ہیں۔''

''بری نہیں لگیں تو اچھی بھی نہیں لگیں۔'' اس نے مبہم جواب دیا۔

''میں اس کے لیے آپ سے معافی مانگتا ہوں...... اور آئندہ کے لیے محتاط رہنے کا وعدہ کرتا ہوں۔''

''چلیں، آپ وعدہ کرتے ہیں تو اچھی بات ہے۔''

''لیکن صرف ایک درخواست ہے میری۔''

''فرمائیں۔''

''صرف ایک بار...... آپ سے دو چار باتیں کہنا چاہتا ہوں لیکن فون پر نہیں آپ کے سامنے بیٹھ کر۔''

''یہ کیا بات ہوئی۔ مجھے تو لگتا ہے کہ آپ نے ابھی جو وعدہ کیا ہے وہ آغاز ہونے سے پہلے ہی ختم ہو گیا ہے۔''

''نہیں نور! یقین کریں میرے دل میں آپ کا بہت احترام ہے۔ اپنی وجہ سے میں آپ کے ماتھے پر ایک چھوٹی سی شکن دیکھنا بھی نہیں چاہوں گا۔ مجھے آپ کے صرف دس پندرہ منٹ درکار ہیں، جہاں بھی آپ کہیں۔''

نور صاف انکار کر دینا چاہتی تھی مگر معلوم نہیں کیوں نہ کر سکی۔ کچھ فرہاد کا انداز ایسا عاجزانہ تھا کہ وہ اسے سخت جواب نہ دے سکی۔

تایا جان فرنیچر کا کام کر رہے تھے۔ وہ ہر مہینے کے پہلے ہفتے میں چنیوٹ جاتے تھے اور پھر گجرات کا چکر لگاتے ہوئے اگلے روز واپس آتے تھے۔ دو روز بعد وہ جانے والے تھے، ان کی غیر موجودگی میں گاڑی بھی ان کے پاس ہی ہوتی تھی، ایک دن کے لیے نور کو رکشا پر ایف اے ایس جانا پڑتا تھا۔

اس دفعہ بھی وہ رکشا پر گئی اور گلبرگ مارکیٹ کی ایک کیفے شاپ میں اس نے آدھ پون گھنٹے کے لیے فرہاد سے بات چیت کی۔ اس نے چادر کا نقاب کیا ہوا تھا اور آنکھوں پر سن گلاسز تھے۔ فرہاد نے بڑے سلجھے ہوئے شائستہ انداز میں نور کی سماعت تک اپنے دل کی بات پہنچائی۔ اس نے اسے بتایا کہ وہ اسے پسند کرتا ہے اور اسے اپنی زندگی کا حصہ بنانا اس کے لیے بڑی خوش نصیبی کی بات ہوگی۔ نور کا جواب بھی حوصلہ شکنی والا نہیں تھا۔ تاہم اس نے دو باتیں فرہاد پر بالکل واضح کر دیں۔ اس نے کہا کہ اس کی زندگی اور مستقبل کے بارے میں آخری فیصلہ اس کے بڑوں نے کرنا ہے اور وہ ان کے اس حق میں ایک ذرا سی کمی بیشی کی بھی متحمل نہیں ہے...... کیونکہ وہ پہلے ہی اس حق کے حوالے سے بہت شرمندہ ہے۔ دوسری بات اس نے یہ کہی کہ فی الحال اس کی ساری کی ساری توجہ اپنے کیم کی طرف ہے، اس کے تایا ابا نے جاگتی آنکھوں سے جو خواب دیکھا ہے، وہ اسے پورا کرنا چاہتی ہے...... جب وہ اس مرحلے سے نکل جائے گی تو پھر شادی وغیرہ کا معاملہ زیر غور آئے گا۔ تب تک وہ فرہاد سے کسی بھی طرح کا کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتی۔ ہاں ان کے دلوں میں جو کچھ موجود ہے، وہ موجود رہے گا اور وہ اس حوالے سے دعاگو رہیں گے۔

یہ دوسری شرط کافی کڑی تھی۔ فرہاد نے بصد منت و سماجت نور سے اتنی سی رعایت لے لی کہ مہینے میں فقط ایک بار وہ صرف پانچ دس منٹ کے لیے بات کر لیا کریں گے اور وہ بھی فون پر۔

وہ بے حد خوش گفتار تھا۔ اس کی باتوں میں محبت اور لطافت کی ایسی چاشنی تھی کہ نور اس کے پاس سے اٹھ نہیں پا رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''نور! میں نے آپ کو پہلی بار شادی کے فنکشن میں دیکھا تھا، آپ نے بڑے کلرفل کپڑے پہن رکھے تھے۔ اس کے بعد میں نے ہمیشہ آپ کو بالکل سادہ لباس میں دیکھا ہے۔ جی چاہتا تھا کہ آپ کو ایک بار پھر رنگین لباس میں دیکھوں۔ لگتا ہے کہ اگلے ہفتے شاید میری یہ مراد پوری ہو جائے۔''

''کیا مطلب؟'' نور نے اپنی لمبی پلکیں جھپکیں۔

''آپ کے کالج میں گیٹ ٹوگیدر ہے، چھوٹے موٹے کھیل بھی ہوں گے۔ مجھے رسالے کی طرف سے کوریج کے لیے آنا ہے......''

بننا سنورنا نور کو کبھی بھی پسند نہیں رہا تھا۔ لڑکپن میں جب وہ اپنی دونوں بڑی بہنوں کو بناؤ سنگھار کرتے دیکھتی تو اسے بڑا عجیب سا لگتا۔ ایسا عموماً شادی بیاہ کے موقعوں پر ہی ہوتا تھا...... اور اس وقت تو نور کی باقاعدہ ہنسی چھوٹ جاتی تھی جب وہ دیکھتی کہ ابا جان کے ڈر سے ان کا سارا بناؤ

سنگھار بھاری اوڑھنیوں کے نیچے چھپ گیا ہے اور وہ زرق برق کپڑے پہن کر جس طرح لپٹی لپٹائی ہوئی، تقریب میں گئی تھیں اسی طرح واپس آ گئی ہیں۔

لیکن آج وہ خود کو بناؤ سنگھار کے لیے تھوڑا سا مجبور پا رہی تھی۔ پھر بھی اس نے احتیاط سے ہی کام لیا۔ ہلکی سی لپ اسٹک، تھوڑا سا پف پاؤڈر اور بائیں کلائی میں چند چوڑیاں، لباس بھی زیادہ شوخ نہیں تھا۔ کالج کے وسیع و عریض گراؤنڈ میں میلے کا سماں تھا، بے شمار اسٹالز اور تفریح کے لوازمات تھے۔ اس کی کولیگ شاہینہ بھی آئی ہوئی تھی۔ وہ بھی آج کل پوری تندہی سے صوبائی سطح کے مقابلوں کی تیاری کر رہی تھی۔

فرہاد اور چند دیگر اخباری نمائندے اس تقریب میں چکرا رہے تھے۔ فرہاد کے ساتھ ایک خاتون فوٹو گرافر تھی۔ وہ عام سے انداز میں چلتا ہوا نور تک آ گیا۔ رسمی کلمات کے بعد بولا۔ ''آپ کو رنگین لباس میں دیکھنے کی خواہش تو کسی حد تک پوری ہوئی...... مگر...... یہ جو چلمن ہے دشمن ہے ہماری۔''

''اور یہ ہمیشہ دشمن ہی رہے گی۔'' نور نے مستحکم لہجے میں کہا۔ (چلمن سے فرہاد کی مراد، نور کا اسکارف تھا)۔

''چلیں، کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے۔ اس لحاظ سے یہ بھی شکر کا مقام ہے۔'' فرہاد نے نور کے سراپا پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

نور کو اپنے رخساروں پر شرم کی تمتماہٹ محسوس ہوئی۔ وہ بولی۔ ''اب اگر آپ کسی اور طرف تشریف لے جائیں تو بہتر نہیں؟''

''اور کہاں جائیں کچھ نظر ہی نہیں آ رہا۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔''

''جی ہاں، الو کو بھی اجالے میں کچھ نظر نہیں آتا۔'' نور نے کہا اور ایک دوست کو پکارتی ہوئی اس کی طرف چلی گئی۔

کچھ ہی دیر بعد شاہینہ بھی وہاں آ گئی۔ وہاں مٹکا ریس اور بوری ریس ہو رہی تھی۔ کچھ لڑکیوں نے نور اور شاہینہ سے کہا کہ وہ بھی ان ریسوں میں حصہ لیں۔

میڈم فرحانہ نے منع کر دیا۔ انہوں نے کہا۔ ''بھئی یہ دونوں تو اب اپر لیول کی رنر ہیں۔ یہ ان دوڑوں میں حصہ لیں گی، تو دوسری لڑکیوں کا حق مارا جائے گا۔''

وہ دونوں ایک طرف کرسیوں پر بیٹھ گئیں اور یہ مقابلے دیکھنے لگیں۔ شاہینہ ذرا چبھتی ہوئی سی نگاہوں سے نور کو دیکھ رہی تھی۔ ہولے سے بولی۔ ''یہ لڑکا تمہارے ارد گرد کیوں گھوم رہا تھا؟'' اس کا اشارہ فرہاد کی طرف ہی تھا۔

''کوئی خاص بات نہیں ...... یونہی انٹرویو کا ماحول بنا رہا تھا۔ میں نے منع کر دیا۔''

شاہینہ اب بھی تیز نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ گہری سانس لے کر بولی۔ ''دیکھو نور! ہمارا آپس میں کمپی ٹیشن ہے لیکن ہم دوست بھی ہیں۔ ایک دوسرے کی بھلائی چاہتی ہیں۔ ہمیں اس طرح کے معاملوں سے دور رہنا چاہیے۔''

''کس طرح کے معاملوں سے؟'' نور نے گڑبڑا کر پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ تم میری بات اچھی طرح سمجھ رہی ہو۔ یہ سب لڑکے ایک جیسے ہوتے ہیں۔ ٹانگیں کھینچ کر سیڑھی سے گرا دینے والے، ہمیں اس وقت سارا دھیان اپنے گیم پر رکھنا چاہیے۔ گوجرانوالہ کی نشو کی ٹائمنگ بڑی اچھی جا رہی ہے۔ ویسے بھی ایک کھلاڑی خاندان سے ہے وہ۔ فزیکلی بڑی فٹ ہے۔ ہم ذرا ڈھیلی پڑیں گی تو وہ ''لیڈ'' لے جائے گی۔''

''پتا نہیں تم نے اپنے ذہن میں کیا بنا لیا ہے۔ وہ تو بس بات کر رہا تھا مجھ سے......''

''ساری بات...... بات کرنے سے ہی شروع ہوتی ہے پھر بات گلے پڑ جاتی ہے۔ ذرا سنبھل کر رہو۔ ویسے بھی تم نے ایک بہت بڑا چیلنج قبول کیا ہوا ہے۔ والد کو ناراض کر رکھا ہے اور انہیں کچھ کر کے دکھانا چاہتی ہو۔ یہ نہ ہو کہ کچھ ایسا ہو جائے جوان کو مزید خفا کر دے۔''

شاہینہ کی بات میں وزن تھا۔ وہ اندر سے کانپ سی گئی۔ بہر حال اس نے اپنے تاثرات نارمل ہی رکھے اور موضوع بدلتے ہوئے بولی۔ ''اس بارے میں تم بے فکر رہو ڈیئر! باقی جہاں تک نشو کی بات ہے۔ اس کا غرور تو ہم دونوں میں سے کسی ایک نے توڑ ہی دینا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ کافی منہ پھٹ بھی ہے، میڈم کے بارے میں کچھ الٹی سیدھی باتیں بھی کی ہیں۔ اس نے کہا ہے کہ وہ ایف اے ایس کی آڑ میں مال بنا رہی ہے......''

ابھی نور اور شاہینہ میں بات ہو ہی رہی تھی کہ ان کے عقب میں کچھ لڑکیوں نے ہوٹنگ شروع کر دی۔ وہ گوجرانوالہ سے آئی تھیں اور نشو عرف نشو بجلی کی سپورٹرز تھیں۔ ان میں سے دو تین نے نشو کی تصویر والے پوسٹر بھی اٹھا رکھے تھے اور سالانہ مقابلوں میں نشو کو فیورٹ قرار دے رہی تھیں۔ انہوں نے شاہینہ اور نور پر آوازے کسے۔ خاص طور سے نور کو نشانہ بنایا اور اسے نور پینڈو قرار دیا۔

نور کی حمایت کرنے والی لڑکیوں کے ایک گروہ نے اس ہوٹنگ کا بھرپور جواب دیا۔ جھگڑے کی صورتِ حال

پیدا ہوگئی۔ منتظمین نے صورتِ حال کو سنبھال لیا۔

نور نے اپنی تمام تر توجہ اپنی ٹریننگ پر رکھی ہوئی تھی۔ وہ سالانہ صوبائی مقابلے جیتنے کے لیے سرتوڑ کوشش کررہی تھی۔ وہ اپنی کامیابی کے پیچھے اپنے ابا جان کا مسکراتا ہوا چہرہ بھی دیکھ رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اگر وہ سو میٹر کا ٹائٹل جیت گئی تو یہ اتنی بڑی کامیابی ہوگی کہ ابا جان کا دل موم ہوجائے گا۔ ایک بار وہ خود کو ثابت کردے پھر ابا جان کی بات مانتے ہوئے وہ کھیل کا میدان چھوڑ دے گی اور یہ بھی ممکن تھا کہ پھر کوئی انہونی ہوجاتی اور ابا جان کچھ شرائط کے ساتھ اسے ایتھلیٹکس کے ساتھ جڑے رہنے کی اجازت دے دیتے۔ وہ بہت پُرجوش تھی۔ کسی وقت اس کی ٹائمنگ 12.90 سیکنڈ کو چھو جاتی تھی اور یہ نشو بجلی کی عمومی ٹائمنگ سے بہتر تھی۔

ذوالقرنین والا معاملہ بھی بظاہر سردخانے میں چلا گیا تھا۔ تین چار ہفتے گزر چکے تھے، اس کی طرف سے مزید کوئی ردعمل سامنے نہیں آیا تھا۔ یقیناً وہ سمجھ گیا تھا کہ اس ''ایڈونچر'' میں اس کے لیے کچھ بھی موجود نہیں ہے۔ نور ڈرنے اور دبنے والی لڑکی نہیں تھی۔

فرہاد والی صورتِ حال بھی جوں کی توں تھی۔ اس نے نور سے جو وعدہ کیا تھا، اس پر کاربند تھا۔ کسی وقت آمنا سامنا ہوجاتا تو اس کا رویہ اتنا نارمل ہوتا کہ کسی کے لیے کسی طرح کے شبہے کی کوئی گنجائش ہی نہ ہوتی۔ مہینے کے آخر میں طے شدہ پروگرام کے مطابق صرف ایک بار چند منٹ کے لیے دونوں میں ٹیلیفونک رابطہ ہوا۔ یہ مختصر سا بے ضرر رابطہ نور کو بڑا اچھا لگا۔ اس کے اندر جیسے ایک خلا سا پورا ہوگیا۔ ایک بے نام خوشی اس کے اندر پیدا ہوئی...... ہاں کوئی تھا جو دل کی گہرائی سے اسے چاہتا تھا...... اس کے لیے دعا کرتا تھا...... اسے سوچتا تھا اور اس کی آس رکھتا تھا۔ یہ احساس بڑا حوصلہ افزا اور توانائی بخش تھا۔

دوسری طرف شاہینہ کے پندونصائح بھی جاری تھے۔ وہ بڑی زیرک اور معاملہ فہم تھی۔

اس روز نور نے اقرار نہیں کیا تھا، اس کے باوجود وہ جان چکی تھی کہ نور اور اسپورٹس ایڈیٹر فرہاد رازی کے درمیان کوئی ''راز'' موجود ہے۔ وہ اکثر اسے فون کردیتی اور محتاط رہنے کی یاددہانی کراتی۔

ایک دن نور نے مذاق میں کہہ ہی دیا۔ ''کہیں ایسا تو نہیں شاہینہ کہ تم خود...... اس میں دلچسپی محسوس کرنے لگی ہو۔''

''بڑے افسوس کی بات ہے۔ تم رہوگی پینڈو کی پینڈو ہی۔ تمہارے بھلے کا کہہ رہی ہوں۔ ان ماڈرن شہری لڑکوں کے داؤ پیچ بتا رہی ہوں تمہیں۔ ٹھیک ہے، نہیں تو نہ سہی۔'' اس نے فون بند کردیا۔

نور اپنی جگہ بیٹھی کچھ دیر مسکراتی رہی پھر اس نے شاہینہ کو رنگ کیا۔ دوسری تیسری کوشش میں اس نے کال ریسیو کی۔ سوری کرنے کے بعد نور بولی۔ ''یار! مذاق کررہی تھی۔ تمہاری ہمدردی اور محبت ہر شبہے سے بالاتر ہے۔ مجھے اچھی طرح پتا ہے کہ میری حدیں اور میری ذمے داریاں کیا ہیں اور یہ بھی پتا ہے کہ نشو ہم دونوں کی مشترکہ حریف ہے۔ ہمیں اسے ہرانا ہے اور ہرصورت ہرانا ہے......''

''اور مجھے پتا ہے کہ اسے تم ہی نے ہرانا ہے۔ کل میڈم فرحانہ سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ کوچ سرمد صاحب بھی ساتھ تھے۔ ان دونوں کو یقین ہے کہ اگلے دو تین ہفتوں میں تمہاری ٹائمنگ میں کم از کم...... کم از کم ایک سیکنڈ کی بہتری اور آئے گی۔''

''یہ تو اللہ کو پتا ہے اور اصل فیصلہ تو اس دن اور اس وقت ہونا ہے جب فائنل اسپرنٹ لگائی جائے گی اور مجھے تو لگتا ہے کہ بہت معمولی مارجن ہوگا۔''

''بھی تو ہوتا ہے کانٹے دار مقابلہ۔'' شاہینہ نے کہا۔

سالانہ ایونٹ میں اب بس بیس روز باقی تھے۔ تناؤ میں دن بدن اضافہ ہورہا تھا۔ تایا ابا اور ماموں مراد اس کی مسلسل حوصلہ افزائی کررہے تھے۔ اس کی ڈائٹ کا مکمل خیال رکھا جارہا تھا اور تربیتی سیشن بھی باقاعدگی سے اٹینڈ کرائے جارہے تھے لیکن پتا نہیں کیوں کسی وقت پھپھو حاجرہ کے کہے ہوئے الفاظ نور کے کانوں میں گونجنے لگتے۔ انہوں نے ایک روز کہا تھا۔ ''کم از کم تمہیں تو کچھ حاصل نہیں ہوگا نور! یہ میری پیشین گوئی ہے۔ تم نے اپنے باپ کا دل دکھایا ہے۔ اس کی بددعا لی ہے۔''

ایسے وقت میں وہ کانپ جاتی۔ نماز پڑھنے کے بعد دیر تک دعا مانگتی رہتی...... ''اے رب کریم! مجھ پر رحم فرما۔ اپنے ابا جان کے حوالے سے مجھ سے جو غلطی سرزد ہوئی ہے، مجھے اس کا ازالہ کرنے کی توفیق عطا فرما۔ ان کے دل میں میرے لیے رحم ڈال دے میرے مالک۔ میں اندھی ہوگئی ہوں۔ مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ مجھے راستہ سوجھا دے۔''

ایک بار اس کے دل میں آئی کہ سارے اندیشے بالائے طاق رکھ کر گھر چلی جائے اور ابا جان کے قدموں میں سر رکھ دے۔ اسے معلوم تھا کہ آپی بتول بھی ملتان سے آئی ہوئی ہیں۔ ہوسکتا تھا کہ سب مل جل کر اسے ابا جی سے

معافی دلا دیتے لیکن کوشش کے باوجود وہ اپنے اندر اتنی ہمت پیدا نہ کر پائی ...... اور اس نے تایا ابا کی ہدایت کے مطابق سب کچھ سالانہ ایونٹ کے بعد پر چھوڑ دیا۔

گزرنے والے ہر دن کے ساتھ اس ایونٹ میں نور کی کامیابی کے امکانات روشن ہو رہے تھے۔ شاہینہ کے حوالے سے بھی توقعات بہت بلند تھیں۔ مقابلے سے چار دن پہلے کی بات ہے۔ نور نے آخری پہر کو اٹھ کر دیکھا۔ تایا ابا حسبِ معمول تہجد کی نماز پڑھ رہے تھے۔ ان کی سفید ڈاڑھی میں وضو کا یا شاید...... آنسوؤں کا پانی چمک رہا تھا۔ انہوں نے سر پر ٹوپی رکھی ہوئی تھی اور جینز کی پتلون پنڈلیوں کے وسط تک اڑسی ہوئی تھی۔

وہ انہیں دیکھتی رہی۔ ابا جان کی نسبت تایا ابا زیادہ تعلیم یافتہ تھے اور ان کا مطالعہ بھی وسیع تھا۔ وہ ہر معاملے کو معروضی انداز میں دیکھنے کے عادی تھی۔ سلام پھیرنے کے بعد انہوں نے نور کو اپنے قریب بلایا۔ وہ قالین پر ان کے پہلو میں بیٹھ گئی۔ انہوں نے اسے اپنے ساتھ لگایا اور کوئی آیت پڑھ کر اس پر پھونکی...... پھر عجیب وجدانی سے لہجے میں بولے۔ ''نور بیٹا! تم بہت محنت کر رہی ہو اور یاد رکھو، محنت کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ اس حوالے سے دیر تو ہو سکتی ہے لیکن اندھیر کبھی نہیں ہوتی۔ ہمارے قائد نے یقینِ محکم کے ساتھ عملِ پیہم کی جو بات کی تھی، وہ اسی جانب اشارہ کرتی ہے۔ جب مشکلات کے باوجود عملِ پیہم رہتا ہے تو پھر وہ مقام آجاتا ہے جب خدا بندے سے خود پوچھتا ہے...... بندے تو بتا تو کیا چاہتا ہے۔''

اس نے تایا ابا کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کو کبھی مایوس نہیں کروں گی تایا ابا۔ آپ نے میرے لیے جو کچھ سوچا ہے، اسے عملی شکل دینے کے لیے ہر حد تک جاؤں گی۔''

''مجھے یقین ہے، کامیابی تمہارے قدم چومے گی۔ ہم نے اس نامعقول کو دکھانا ہے کہ بیٹے نہ ہوں تو بیٹیاں بھی بیٹوں جیسے کام کر کے اپنے والدین کا سر فخر سے بلند کر سکتی ہیں۔''

نور کی آنکھوں میں نمی آگئی۔ تایا ابا نے اس کا سر چوما۔ ''مجھے بیٹی کی بڑی خواہش تھی۔ شرجیل اور عثمان پیدا ہو چکے تھے۔ مہرین کی پیدائش ابھی نہیں ہوئی تھی۔ میرے اندر جیسے ایک بڑا خلا سا تھا۔ وہی دن تھے جب اشفاق کے ہاں تم نے جنم لیا۔ تم سارے گھر کی اور خاص طور سے میری لاڈلی بن گئی تھیں۔ میں تمہیں سارا سارا دن گود میں اٹھائے پھرتا تھا۔ تم نے صرف سات ماہ کی عمر میں چلنا شروع کر دیا تھا۔ سب دنگ رہ گئے تھے۔ ایک سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے تم باقاعدہ بھاگنے لگی تھیں۔ میں تمہیں مشکل سے پکڑتا تھا اور تمہیں لان کی گھاس پر لٹا کر تمہاری ٹانگیں دبایا کرتا تھا...... تمہیں وہ باتیں تو یاد نہیں ہوں گی؟''

''کچھ کچھ...... دھندلے دھندلے سے منظر یاد ہیں تایا ابا۔''

''تم تین چار سال کی تھیں، جب میلے کے موقع پر تم سب بچوں نے حویلی کے سامنے والے باغ میں دوڑیں لگائی تھیں۔ تم نے چھوٹا ہونے کے باوجود سب کو ہرا دیا تھا۔ میں نے اس وقت پتا ہے تمہاری تائی سے کیا کہا تھا؟''

وہ سوالیہ نظروں سے تایا کی طرف دیکھنے لگی۔

وہ بولے۔ ''میں نے کہا تھا یہ نور ہے...... اور نور کی رفتار 299274 کلومیٹر فی سیکنڈ ہوتی ہے۔''

نور مسکرا دی۔ مصلے پر بیٹھے ہوئے تایا ابا بھی مسکرا دیے۔ نور کی طرف دیکھ کر ہولے سے بولے۔ ''آج میں پھر کہتا ہوں۔ تم نور ہو......''

تایا ابا کی باتوں نے نور میں ایک نئی امنگ، ترنگ پیدا کر دی تھی۔ پتا نہیں کیوں اس موقع پر اس کا یہ دل بھی چاہا کہ وہ تایا ابا کو فرہاد کے حوالے سے تھوڑا بہت بتا دے۔ اشارتاً ہی ذکر کر دے لیکن پھر اس نے یہ کام بھی ایونٹ کے بعد تک اٹھا رکھا۔

☆☆☆

سو میٹر کی دوڑ کا ٹریک تھا اور کالج کے گراؤنڈ میں یہ ایک طرح کی فائنل ریہرسل تھی۔ کوچ میڈیم فرحانہ نے کہا۔ ''نور! تم سمجھو کہ مقابلہ کل نہیں آج ہے اور یہ تمہاری فائنل ہیٹ ہے۔ اس میں تم نے اپنا ہنڈرڈ پرسنٹ دینا ہے۔ گھٹنوں پر جھک جاؤ، اپنے پاؤں کو فٹ بلاکس پر پوری طرح ایڈجسٹ کرو۔ نظر ٹارگٹ پر...... اور یہ بات یاد رکھو اسٹارٹ کی بے حد اہمیت ہے۔ اوکے...... تم تیار ہو؟''

''یس میڈم!'' نور نے جھکے جھکے اپنا سر اٹھایا اور ٹارگٹ پر نگاہیں جما دیں۔

''ایک بار پھر کہہ رہی ہوں۔ تم نے ہنڈرڈ پرسنٹ دینا ہے۔ کانوں کو پسٹل کی آواز پر مرکوز رکھو...... ریڈی......''

نور نے سانس اندر کی طرف کھینچی۔ اس کی تمام تر توانائی جیسے اس کے جسم کے نچلے حصے اور خاص طور سے اس کے پاؤں میں جمع ہو چکی تھی۔ اس کے اردگرد تین چار اسپرنٹرز اور بھی تھیں...... ہاں یہ فائنل ریہرسل تھی۔

فائر کی آواز کے ساتھ ہی نور گولی کی رفتار سے اپنے

ٹارگٹ کی طرف بڑھی۔ اب تک اس کا سب سے اچھا ٹائم 12.90 تھا۔ آج وہ اس کو بیٹ کرنا چاہ رہی تھی۔ وہ جیسے ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ اپنی تمام تر جسمانی اور ذہنی توانائی کے ساتھ...... اور جب اس نے فنش لائن کراس کی، میڈم فرحانہ اور مسز وجدان کا مشترکہ نعرہ نور کے کانوں سے ٹکرایا۔
وہ اپنے مومنٹم میں بیس تیس میٹر تک بھاگتی چلی گئی پھر اس نے مڑ کر اپنی کوچ اور ٹیچر کی طرف دیکھا۔ دونوں کے ہاتھوں میں اسٹاپ واچز تھیں اور ان کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے۔ نور نے 12.50 کا ٹائم حاصل کر لیا تھا اور یہ رزلٹ اس امر کی نہایت روشن امید تھا کہ وہ کل پہلی پوزیشن حاصل کر لے گی۔ بہرحال حتمی فیصلہ تو کل میدان میں ہونا تھا۔

نور کی فرینڈز نے اس سے وعدہ لے رکھا تھا کہ اگر آج اس نے 12.50 کا ٹائم حاصل کر لیا تو وہ انہیں ٹریٹ دے گی۔ اب وہ اس کے درپے ہو گئی تھیں۔ نور نے سینٹر کے فون سے تایا کو کال کی اور انہیں بتایا کہ آج وہ اپنی ایک دوست کے ساتھ اس کی گاڑی پر آ جائے گی۔

دراصل وہ ایک پنتھ دو کاج والا معاملہ کر رہی تھی۔ چار دن بعد عید کا تہوار بھی تھا۔ کوئی چھوٹا موٹا تحفہ تو اسے فرہاد کو دینا ہی تھا۔ اس نے سوچا کہ واپسی پر وہ چند منٹ کے لیے بازار میں بھی رک جائے گی اور فرہاد کے لیے کوئی گفٹ پیک خرید لے گی۔

تین فرینڈز فوکسی کار پر ایک قریبی آئس کریم پارلر میں چلی گئیں۔ نور بالکل پرہیزی ڈائٹ لے رہی تھی، ایک کپ آئس کریم کی گنجائش تو یقیناً نکل ہی سکتی تھی۔ وہ پارلر کی گیلری میں جا بیٹھیں اور آرڈر دے دیا۔ کچھ دیر بعد اچانک نور کی نگاہ نیچے ہال میں ایک گوشے کی طرف اٹھ گئی۔ وہ بری طرح چونکی، وہاں فرہاد موجود تھا۔ اس کے دو دوست بھی تھے۔ تینوں بے تکلفی سے باتیں کر رہے تھے۔

نور نے ذرا دھیان سے دیکھا اور اسے دوسری بار چونکنا پڑا۔ فرہاد سے گپیں ہانکتے ہوئے لڑکوں میں سے ایک کی صورت نور کو شناسا سا لگ رہی تھی۔ یہ وہی سرخ شرٹ والا لڑکا تھا جس نے ان کی گاڑی سے موٹر سائیکل ٹکرائی تھی اور پھر تایا ابا سے اس کا جھگڑا ہوا تھا۔

یقیناً یہ وہی تھا۔ وہ بڑی بے تکلفی سے فرہاد کے ساتھ اٹکھیلیاں کر رہا تھا...... نور نے اپنا اسکارف درست کیا اور ذرا، ایک ستون کی اوٹ میں ہو گئی۔ اس شخص سے فرہاد کی دوستی کب اور کیسے ہوئی؟ فرہاد نے تو کبھی اس بات کا ذکر نہیں کیا تھا۔ اس کے دل میں کھدبدی ہونے لگی۔ آرڈر آ چکا تھا۔ وہ بے دلی سے آئس کریم کھانے لگی۔ نیچے ہال کمرے میں صورتِ حال کچھ تبدیل ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔ تینوں دوستوں میں کسی بات پر تکرار چل رہی تھی۔ پھر یہ باقاعدہ جھگڑے کی شکل اختیار کرنے لگی...... دوستوں میں تفریح کے دوران میں اکثر تلخی کی صورتِ حال بھی پیدا ہو جاتی ہے مگر یہ تلخی کچھ زیادہ تھی۔ غالباً ان کے درمیان کسی کیمرے اور ادھار رقم کی بات ہو رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے نوبت ہاتھا پائی تک پہنچتی محسوس ہوئی۔ وہ لڑکا جس کا حوالہ سرخ شرٹ تھا، فرہاد کا گریبان دبوچنے کی کوشش کرنے لگا۔ تیسرا دوست ان دونوں کے درمیان آ گیا۔ ہیڈ ویٹر اور ایک دوسرے شخص نے بھی مداخلت کی اور بہ مشکل بیچ بچاؤ کرایا۔ سرخ شرٹ والا جو آج نیلی دھاری دار قمیص میں نظر آ رہا تھا، بکتا جھکتا باہر چلا گیا۔

پتا نہیں کہ اچانک نور کے دل میں کیا آئی۔ اس نے دونوں فرینڈز سے کہا۔ ”پلیز، تم دونوں ادھر ہی میرا انتظار کرو...... میں ابھی آتی ہوں۔“

ان دونوں کو حیران چھوڑ کر وہ بائیں جانب والی سیڑھیاں اتری اور اس جانب بڑھی جدھر نیلی قمیص والا گیا تھا۔

وہ لڑکا اسے پارلر سے کچھ فاصلے پر اپنی موٹر بائیک کو جھلاہٹ میں ککس مارتا مل گیا۔ نور نے اپنا اسکارف ٹھوڑی سے اوپر ہونٹوں تک کھسکایا اور اس کے پاس پہنچ کر بولی۔
”ایکسکیوزمی، میں آپ سے دو منٹ بات کر سکتی ہوں؟“

ایک اسمارٹ لڑکی کو اپنے روبرو دیکھ کر لڑکے کے چہرے سے جھلاہٹ رفوچکر ہو گئی۔ وہ خود کو سنبھالتے ہوئے بولا۔ ”آپ کون؟“

لڑکا چند منٹ تذبذب میں رہنے کے بعد اپنی موٹر بائیک کو پھر سے لاک کرنے میں مصروف ہو گیا۔ نور اس کے ساتھ چند سیڑھیاں اتر کر پارک میں پہنچ گئی۔ یہاں سایہ دار درخت تھے اور پھولوں کے پودے بھی تھے۔ وہ ایک بڑے پودے کی اوٹ میں ایک پتھریلی بینچ پر بیٹھ گئے۔ ان کے درمیان جو ابتدائی گفتگو ہوئی، اس میں لڑکے کا نام پرویز معلوم ہوا اور نور پر یہ انکشاف بھی ہوا کہ وہ دو ڈھائی سال سے فرہاد کا دوست ہے۔ وہ وی سی آر اور کیمروں وغیرہ کی ریپئرنگ کا کام کرتا تھا، اس کی اپنی دکان تھی۔

گفتگو کے دوران میں پرویز نے اچانک چونک کر نور کی طرف دیکھا اور اس کی طرف انگلی اٹھا کر بولا۔
”معاف کریں۔ کہیں آپ کا نام نور تو نہیں؟ وہی جو اسپرنٹ میں حصہ لیتی ہیں؟“

نور نے [illegible] آپ [illegible] کیسے اندازہ لگایا؟''

وہ عجیب انداز سے مسکرایا۔ ''آپ کا بہت تذکرہ ہوتا رہتا ہے نور صاحبہ، وہ ...... جو کچھ آپ کے ساتھ کر رہا ہے......ہم کو پتا ہے۔''

''م......میں کچھ سمجھی نہیں؟ کون وہ؟''

''آپ سمجھ سکتیں......تو اب تک ...... اس کے چکر سے نکل چکی ہوتیں......خیر چھوڑیں......اب آپ کا کھیل ختم ہو چکا ہے۔ اب آپ نے خود ہی اس ''الّو بنو'' چکر سے نکل جانا ہے۔''

''الّو بنو؟'' نور کے لہجے میں استعجاب تھا۔

''جی ہاں...... الّو بنایا جاتا رہا ہے آپ کو۔ سیڑھی کے طور پر استعمال کیا گیا۔ کسی اور تک پہنچنے کے لیے۔''

نور کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ جیسے روہانسی ہو کر بولی۔ ''کیا......تم یہ سب کچھ فرہاد کے بارے میں کہہ رہے ہو؟''

''تو اور کس ذات شریف کا ذکر ہو رہا ہے۔''

پتا نہیں کیوں نور کا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ یہ دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ پرویز نامی لڑکا جو کچھ کہہ رہا ہے، بے بنیاد نہیں ہے۔

اس نے اس سے درخواست کی کہ اگر اس نے یہ بات چھیڑ دی ہے تو پھر اسے ادھورا نہ رکھے۔

پرویز تذبذب میں نظر آیا پھر اس نے نور سے کہا کہ یہ جگہ ٹھیک نہیں ہے۔ وہ کل کسی جگہ مل کر یہ بات کر سکتے ہیں۔ نور کل تک کا انتظار کیسے کر سکتی تھی۔ اس نے پرویز کو مجبور کیا۔ وہ پارک سے اٹھ کر مارکیٹ کی عقبی سمت ایک کیفے میں آن بیٹھے۔ رازداری کی شرط پر پرویز نے جو کچھ بتایا، وہ شاید پرویز کے لیے تو بہت زیادہ اہم نہ ہو لیکن نور کے لیے تہلکہ خیز تھا۔ اس نے کہا۔ ''نور صاحبہ! یقیناً تمہیں یہ سن کر افسوس ہوگا کہ فرہاد تم سے نہیں تمہاری دوست شاہینہ سے محبت کرتا ہے اور یہ چکر تمہارے والے چکر سے بھی پہلے کا ہے۔ فرہاد اور شاہینہ کے درمیان کچھ دوری پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اپنے گیم میں بہت زیادہ مگن ہو کر اس کو Avoid کرنے لگی تھی۔ شاہینہ میں حسد پیدا کرنے کے لیے ہی فرہاد نے تم سے راہ و رسم بڑھائی اور میرے خیال میں وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا ہے۔''

''میں...... یہ نہیں مانتی۔''

''سوری مس! تمہارے ماننے یا نہ ماننے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ وہ دونوں [illegible] ایک ہو چکے ہیں۔ اب بہت جلد تمہیں اپنے مقام کا بھی پتا چل جائے گا۔''

نور کی نگاہوں کے سامنے ماضی قریب کے مناظر گھومنے لگے۔ اسے وہ ساری باتیں یاد آئیں جو شاہینہ وقتاً فوقتاً اس سے کہتی رہی تھی۔ اس نے شروع میں ڈھکے چھپے انداز میں اسے فرہاد سے دور رہنے کے مشورے دیے تھے۔ نور سے کہا تھا کہ وہ کہیں اس سے فلرٹ نہ کر رہا ہو...... اور اس طرح کی کئی اور باتیں لیکن ایک سوال ذہن میں اٹھ رہا تھا۔ نور سے فرہاد کا تعارف ایک ایکسیڈنٹ کے بعد اتفاقیہ ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ بھی اتفاقیہ نہیں تھا۔

پرویز نے بھی اس کی تصدیق کی۔ نور سے ایک بار پھر رازداری کا وعدہ لینے کے بعد اس نے بتایا۔ وہ سب فرہاد کی پلاننگ تھی۔ وہ دن رات شاہینہ کے لیے تڑپ رہا تھا اور اسے واپس اپنے پاس لانے کے منصوبے سوچتا تھا۔ وہ ایکسیڈنٹ جان بوجھ کر کیا گیا اور اس کے بعد بھی جو کچھ ہوا پلاننگ کے ساتھ ہوا۔

''تمہارے پاس ان باتوں کا کیا ثبوت ہے؟'' نور نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''شاید تم کوئی گواہ مانگ رہی ہو یا کوئی تصویر وغیرہ دیکھنا چاہتی ہو لیکن میں تمہیں اس کا ''لائیو'' ثبوت دے دیتا ہوں اور وہ بھی آج ہی بلکہ ابھی ایک ڈیڑھ گھنٹے میں۔'' اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا کہنا چاہتے ہو پرویز صاحب؟''

''دونوں پری آج کل ڈیفنس کے ''اوڈی کافی ہاؤس'' میں مل رہے ہیں۔ آج بھی ملیں گے۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا۔''

نور کی نگاہوں کے سامنے ہر چیز گردش کر رہی تھی۔ اس کا ذہن دھندلایا ہوا تھا۔ پرویز سے رخصت ہو کر وہ سیدھی آئس کریم پارلر پہنچی۔ اس کی دونوں دوست بے حد پریشان تھیں اور اب وہاں سے اٹھنے کا سوچ رہی تھیں۔ نور نے ان سے معذرت کی۔ وہ دونوں شدید الجھن میں تھیں اور اسی الجھن میں وہاں سے رخصت ہو گئیں کیونکہ نور نے انہیں کچھ بتایا نہیں تھا۔ ان کے جانے کے بعد نور نے گھر فون کیا اور تائی جان کو بتایا کہ اسے تھوڑی سی مزید دیر ہو جائے گی۔ وہ پریشان نہ ہوں۔

اس کام کے بعد اس نے ایک آٹو رکشا لیا اور اس ایریا میں جا پہنچی جہاں معروف اوڈی کافی ہاؤس واقع تھا۔ وہ بڑی نکھری ہوئی روشن شام تھی مگر نور کے لیے اس میں

تاریکی اور نوحے کے سوا اور کچھ نہیں تھا...... اور پھر وہ جان لیوا گھڑی بھی آئی جب اس نے کافی ہاؤس کے ایک نیم تاریک گوشے میں شاہینہ اور فرہاد کو ہنستے اور باتیں کرتے دیکھ لیا۔ فرہاد فیشن کے طور پر شیشا پی رہا تھا اور شاہینہ ایک کپ سے چسکیاں لے رہی تھی۔ وہ ٹریک سوٹ میں تھی۔ پونی ٹیل باندھے ہوئے تھی۔ شاید رننگ کرنے کے بعد سیدھی یہاں آ گئی تھی۔ کل اس نے بھی اہم ترین مقابلے میں حصہ لینا تھا۔

وہ شام اور وہ رات نور کے لیے بڑی عذاب ناک تھی۔ تایا ابا نے صدقے کے طور پر بکرے کی قربانی دی تھی۔ گھر میں سب نور کے لیے دعائیں کر رہے تھے، منتیں مان رہے تھے اور وہ جیسے اندوہ و ناتوانی کے اتھاہ پانی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ذراستانے کے بہانے وہ بند کمرے میں چلی گئی اور پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ اس نے فرہاد کو چاہا تھا اور دل و جان سے چاہا تھا۔ اس حوالے سے اس کی کنواری آنکھوں میں ان گنت سپنوں نے جگہ بنائی تھی۔ وہ سب کچھ ریزہ ریزہ ہو گیا تھا...... اور وہ بھی اس طرح کہ وہ ندامت اور شرمندگی کے گہرے غار میں جا گری تھی۔ اس شخص نے شاہینہ کی محبت پانے کے لیے بڑی بے رحمی سے نور کا استعمال کیا تھا اور وہ بڑی سادگی سے استعمال ہوئی تھی۔

وہ روتی نہیں تھی۔ ان لڑکیوں کو ناوان سمجھتی تھی جو تکیے بھگوتی ہیں لیکن آج اسے خود رونا پڑ رہا تھا۔ بہت دیر تک آنسو بہانے کے بعد اسے اپنے دل کا بوجھ قدرے کم محسوس ہوا...... مگر جو غم تھا وہ تو ہر رگِ جاں میں ٹھہرا ہوا تھا۔ واش روم میں جا کر بہت دیر تک منہ دھونے اور چہرے پر لوشن وغیرہ لگانے کے باوجود وہ اپنے رونے کے آثار چھپا نہیں سکی اور اس روز اسے پہلی بار اندازہ ہوا کہ جب غم آنکھوں تک رسائی حاصل کر لیتا ہے تو پھر اسے چھپانا کتنا دشوار ہوتا ہے۔ بند کمرے سے باہر سب چہک رہے تھے۔ ان کی امیدیں جوان تھیں اور وہ کل کا انتظار کر رہے تھے، انہیں معلوم نہیں تھا کہ کل جس لڑکی نے سالانہ کھیلوں میں حصہ لینا ہے وہ اندر سے مر گئی ہے۔

حوصلے کیسے ٹوٹتے ہیں، توانائی، ناتوانی میں کیسے بدلتی ہے، منزلیں نگاہوں کے سامنے کیسے دھندلاتی ہیں، یہ نور کو اس روز پتا چلا...... اور ہزاروں لوگوں کے سامنے چلا۔ وہ سو میٹر کی فائنل ''ہیٹ'' تک تو پہنچ گئی...... مگر وہ پہلا نمبر حاصل نہیں کر سکی۔ دوسرا اور تیسرا بھی نہیں کر سکی۔ وہ چوتھے نمبر پر آئی۔ یہ بہت بڑا اپ سیٹ تھا۔ نور کے سپورٹرز کے لیے بڑا اہم اور غم ناک بنی۔ وہ تو 12.50 کی ٹائمنگ حاصل کر چکی تھی، پھر اتنا پیچھے کیسے رہ گئی۔ جو اس پر گزری ہے وہ کس دل کو پتا ہے۔

ریس ہارنے کے بعد نور کی نگاہ سب سے پہلے اپنے تایا ابا پر ہی پڑی۔ ان کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اپنے آنسو بہ مشکل روکے ہوئے ہیں پھر اس نے اپنی محبوب ٹیچر اور کوچ میڈم فرحانہ کی طرف دیکھا۔ انہوں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھاما ہوا تھا۔ نور نے اپنا اسکارف درست کیا اور تھکے تھکے انداز میں چلتی، تماشائیوں کے اسٹینڈز کی طرف آ گئی۔

تایا ابا نے آگے بڑھ کر نور کو گلے لگایا اور پیٹھ تھپکی۔ ''کوئی بات نہیں...... ہار جیت کھیل کا حصہ ہے، ہمارا کام کوشش کرنا ہے...... اور ہمت برقرار رکھنا ہے۔'' ان کی آواز ٹوٹ رہی تھی لیکن وہ خود کو سنبھالے ہوئے تھے۔

بسمہ بھی چوری چھپے یہ ریس دیکھنے کے لیے آئی ہوئی تھی اور اپنے کزنوں مہرین، شرجیل اور عثمان وغیرہ کے ساتھ بیٹھی تھی۔ آدھے نقاب سے اوپر اس کی آنکھوں میں دکھ تھا لیکن بظاہر اس نے مسکراتے ہوئے نور کو تسلی دی۔ ''کوئی بات نہیں۔ پورے پنجاب میں چوتھا نمبر ہے تمہارا۔ آگے اور چانس ملیں گے۔''

یہ ریس نشو بجلی نے جیت لی تھی۔ لاہور کی شاہینہ کا دوسرا نمبر آیا تھا۔ نشو اپنی ایسوسی ایشن کے بینر کے ساتھ پورے گراؤنڈ میں چکراتی پھر رہی تھی۔ اس کی سپورٹر لڑکیاں ساتھ تھیں۔ نشو خاص طور پر اس جگہ رکی جہاں نور اپنے کوچز اور ساتھیوں کے ہمراہ کھڑی تھی۔ یہاں ان سب نے خوب نعرے لگائے اور فقرے اچھالے۔ اسپیکر پر کمنٹری کرنے والے صاحب نشو کی تعریف میں قصیدے پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے وہیں کھڑے کھڑے پیشین گوئی کر ڈالی کہ نشو اسپرنٹ کے میدان کا سب سے تابناک...... ابھرتا ہوا ستارہ ہے اور وہ نیشنل گیمز میں بھی میدان مار لے گی۔

''کوئی بات نہیں نور صاحبہ! ایسے اپ ڈاؤن آتے ہی ہیں۔'' یہ آواز نور کے عقب سے آئی تھی۔ اس نے مڑ کر دیکھا وہاں فرہاد کھڑا تھا۔ میگزین ''سپر اسٹار'' کا وجیہہ اسپورٹ ایڈیٹر۔ اس کے خوبصورت بال پیشانی پر لہرا رہے تھے۔ کتنا معصوم اور سادہ نظر آتا تھا۔ ہاں، یہی شخص تھا جس نے آج ایک نہایت اہم سنگِ میل نور سے چھینا تھا...... ہاں یہی تھا۔ وہ خاموشی سے دوسری طرف دیکھنے لگی۔

☆☆☆

ایونٹ کے بعد نور بیمار ہوئی۔ اسے بخار ہوا۔ بعد میں پتا چلا کہ ملیریا ہے۔ وہ اس کے لیے بڑے مایوس کن دن تھے۔ پتا نہیں کیوں وہ خود کو ہاری اور دھتکاری ہوئی محسوس کرتی تھی حالانکہ تایا اور تائی اس کی دلجوئی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھ رہے تھے۔ تینوں کزن شرجیل، عثمان اور مہرین بھی ہر طرح اس کا خیال رکھ رہے تھے۔ ایک روز پھپھو حاجرہ آئیں۔ تائی راحت اس وقت مہرین کو لینے کالج گئی ہوئی تھیں۔

پھپھو نے کہا۔ ''بتا کیا ملا تجھے اپنے باپ کا دل دکھا کر۔ کون سا میدان مار لیا ہے تو نے جس کی وجہ سے تیرے پالنے والوں کا سر اونچا ہو گیا ہے؟ بڑے لمبے چوڑے وعدے کر رہے تھے بڑے بھائی جان بھی......''

''آپ تایا جان کو کچھ نہ کہیں پلیز۔'' نور نے کہا۔

''انہی کے بے جا لاڈ نے تیری بیڑیوں میں وٹے ڈالے ہیں۔ بھائی جان اور باجی راحت دونوں قصوروار ہیں۔''

''پلیز پھپھو...... پلیز...... چپ ہو جائیں۔''

وہ عینک کے پیچھے سے دکھ آمیز غصے سے نور کو دیکھتی رہیں، پھر بولیں۔ ''دیکھ نور! اب بھی وقت ہے سنبھل جا۔ ایک لڑکی کے لیے اس سے بڑا میڈل اور کوئی نہیں ہوتا کہ اس کے پالنے والے اس سے راضی ہوں اور اس کا گھر بس جائے۔ اپنے ابا جی سے معافی مانگ لے۔''

''آپ، معافی کہتی ہیں۔ میں ان کے قدموں پر سر رکھ دیتی ہوں مگر وہ مجھ پر کچھ رحم تو کریں۔ مجھے اس طرح تو گھر سے دھکا دے کر نہ نکالیں۔ میں نہیں کرنا چاہتی ابھی شادی۔''

''تو اس لیے نہیں کرنا چاہتی کہ تیرے دماغ میں کیڑا ہے...... اور وہ کیڑا یہی ہے کہ تو شاید کوئی بہت بڑی کھلاڑی بننے والی ہے۔ نہیں بنے گی تو۔ کچھ نہیں ملے گا تجھے۔ جو بچے اپنے والدین کی بددعا لیتے ہیں وہ کسی جگہ بھی کامیاب نہیں ہوتے......''

پھپھو اشارتاً اس ناکامی کا ذکر کر رہی تھیں جو چند دن پہلے اس کے حصے میں آئی تھی۔ وہ انہیں کیسے بتاتی کہ اس ناکامی کے پیچھے کیا سنگین حالات تھے۔ کس طرح کسی نے اس کے دل کے ٹکڑے کیے تھے اور اسے مٹی کا ڈھیر کر ڈالا تھا۔

وہ خود سے ہرگز ناامید نہیں تھی۔ اسے پتا تھا کہ وہ کر سکتی ہے۔ اپنے تایا ابا اور اپنے دیگر چاہنے والوں کی امیدوں پر پورا اتر سکتی ہے۔ اس نے 12.50 کا ٹائم حاصل کیا ہوا تھا اور یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔

پھپھو اسے جلی کٹی سنا کر چلی گئی تھیں۔ نور ان سے گھر کے حالات پوچھنا چاہتی تھی، خاص طور سے بسمہ کے بارے میں دریافت کرنا چاہتی تھی کہ چودھری طغرل کے بیٹے سے اس کا پیچھا چھوٹا ہے یا نہیں...... لیکن پھپھو اسے کوئی موقع دیے بغیر بھناتی ہوئی باہر چلی گئی تھیں۔ (ویسے نور کو اتنا پتا چل چکا تھا کہ جو مقامی ایم پی اے یہ مسئلہ حل کرا رہا تھا، اسے کامیابی ملی ہے اور وہ کھاپری برادری کے لوگوں کو سمجھانے میں کامیاب رہا ہے۔ اب ابا جان اور پھپھو وغیرہ کہیں بسمہ کی منگنی کا سوچ رہے ہیں)۔

چند دن بعد نور کا بخار اتر گیا...... اور وہ ایک بار پھر ٹریک پر آ گئی۔ اس نے خود کو بڑی حد تک سنبھال لیا تھا۔ اس نے فرہاد کے تصور کو اپنے ذہن سے کھرچنے کی کوشش کی تھی اور بڑی حد تک کامیاب رہی تھی۔ اسے تھوڑا سا شکوہ شاہینہ سے بھی تھا کہ ایک بے تکلف دوست ہوتے ہوئے بھی اس نے اسے شروع میں ہی اصل صورت حال سے آگاہ کیوں نہ کر دیا۔ اسے فرہاد سے دور رکھنے کی کوشش تو کرتی رہی مگر حقیقت نہیں بتائی۔ شاید اس کی بھی کچھ مجبوریاں رہی ہوں گی۔ اس سے اب بہت کم ملاقات ہوتی تھی۔ فرہاد سے بھی دوبارہ کوئی رابطہ نہیں ہوا تھا۔ اس نے اور اس کے دوست ڈاکٹر فیضان نے تایا جان کے فری کلینک میں بھی شکل نہیں دکھائی تھی۔ تایا ابا اس سلسلے میں فرہاد سے رابطہ کرنے کی کوشش کرتے رہے تھے مگر رابطہ نہیں ہو سکا تھا...... انہوں نے ایک اور ڈاکٹر ہائر کر لیا تھا۔ یہ بات اب پایۂ تصدیق کو پہنچ چکی تھی کہ یہ سب فرہاد کا ڈراما تھا۔ مہرین کو بھی اس ڈرامے کا شک ہو چکا تھا۔

سب کچھ بھول بھال کر نور نے ایک بار پھر ایف اے ایس جانا شروع کر دیا۔ اب وہ نیشنل گیمز کی تیاری کر رہی تھی۔ اس کے کوچز اس کی طرف سے پُرامید تھے۔ وہ چھوٹے بڑے مقابلوں میں بھی حصہ لینے لگی۔ اس کی ہیڈ کوچ فرحانہ بیگ نے اس کی ایک خامی نوٹ کی...... وہ کسی وقت فالس اسٹارٹ (غلط شروعات) کر جاتی تھی۔ اہم مقابلوں میں فالس اسٹارٹ کی وجہ سے بڑے بڑے ایتھلیٹ ڈس کوالیفائی ہو جاتے ہیں اور ان کے کیریئر داؤ پر لگ جاتے ہیں۔ فرحانہ بیگ نے دن رات محنت کی اور نور کی اس کمی کو بچانوے فیصد تک درست کر دیا۔ وہ تکنیک کے ہر پہلو پر توجہ دے رہی تھیں۔ ٹریک پر پوزیشن کیسے لینی ہے...... فٹ بلاکس کا بہترین استعمال کیسے ممکن ہے؟ کس طرح جھک کر اپنے ہاتھوں کو اسٹارٹنگ لائن سے ٹچ کرنا ہے۔ فنش لائن پر پہنچتے ہوئے خود کو کس طرح آگے جھکانا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

دوسری طرف نور کی اہم ترین حریف شوبی کی تیاری بھی عروج پر تھی۔ اس کے والد اور چچا نہ صرف اسپورٹس مین تھے بلکہ سیاسی اثر رسوخ بھی رکھتے تھے۔ کہا جارہا تھا کہ نشو کے اہلِ خانہ نے اسے پرائیویٹ طور پر انگلینڈ کا دورہ کرایا ہے۔ وہاں اس نے غیر ملکی کوچز سے بھی ''ٹپس'' لیے ہیں اور ممکن ہے کہ انگلینڈ سے کوئی کوچ اس کی ٹریننگ کے لیے پاکستان بھی آئے۔

شاہینہ کے حوالے سے اطلاعات تھیں کہ وہ سرگرمی سے تربیت میں حصہ نہیں لے رہی پھر ایک روز نور کی تایا زاد مہرین نے اسے رازداری کے انداز میں خبر سنائی۔ ''تمہیں پتا ہے کہ شاہینہ کی شادی ہو رہی ہے؟''

''کیا؟'' نور حیرت زدہ رہ گئی۔

''ہاں جی۔ چٹ منگنی پٹ بیاہ والا معاملہ ہوا ہے اور لڑکا پتا ہے کون ہے؟''

''کون؟''

''وہی ذات شریف جس نے ہمارے روبرو رفاہِ عامہ کا ڈھونگ رچایا ہوا تھا اور ابا جان کے فری کلینک میں کردار ادا کر رہا تھا...... فرہاد رازی۔ سنا ہے کہ اس چٹ منگنی پٹ بیاہ کے پیچھے فرہاد رازی کا کوئی راز ہے۔'' مہرین نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب؟''

''دونوں نے تعلقات بنا رکھے تھے۔ ایک دن شاہینہ ٹریک پر بھاگتے بھاگتے گرگئی۔ پتا چلا کہ وہ ''پریگننٹ'' ہے۔ شاہینہ کے والدین نے فرہاد کو جا دبوچا۔ وہ کھاتے پیتے بااثر لوگ ہیں۔ انہوں نے فرہاد کے سامنے دو آپشن رکھے۔ شادی کر دیا پھر بھگتنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ وہ شادی بھگتنے کو تیار ہو گیا۔''

نور نے یہ سب کچھ سناٹے میں سنا۔ اسے ہرگز امید نہیں تھی کہ اس کی دوست اور کولیگ کے ''رننگ کیریئر'' کا اختتام اس طرح ہوگا۔ شاہینہ اور فرہاد کی اس کہانی میں ایک کردار نور کا بھی تھا اور یہ کردار اس سے زبردستی کروایا گیا تھا۔ وہ اس کردار اور اس سے وابستہ ساری تلخ یادوں کو اب ہمیشہ کے لیے ذہن سے نکال دینا چاہتی تھی۔

چند روز بعد واقعی شاہینہ کی شادی ہوگئی۔ اس شادی کی خبر نور کو ایک مشترکہ فرینڈ کے ذریعے ہی ملی تھی۔

نور پوری تندہی اور جانفشانی کے ساتھ اپنے راستے پر گامزن تھی۔ یہ بڑا کٹھن راستہ تھا۔ وہ تایا جان یا پھر ماموں مراد کے ساتھ صبح منہ اندھیرے الیف اے ایس پہنچ جاتی تھی۔ وارم اپ ہوتی، اسٹریچنگ کرتی، جب کئی کلومیٹر کی دوڑ اور پھر سو میٹر کے ڈیش لگاتی۔ وہ تھک کر چور ہو جاتی، کئی مرتبہ اسے لگتا کہ اس کے پاؤں کے ناخنوں سے خون بہہ نکلے گا۔

جب وہ جان توڑ محنت کر رہی ہوتی اس کے ذہن میں بس ایک ہی خیال ہوتا۔ وہ اپنے تایا جان کو سرخرو دیکھے، تایا جان بھی ہر دستیاب سہولت اس کے لیے فراہم کر رہے تھے۔

تایا زاد بہن مہرین فزیو تھراپسٹ بھی تھی۔ یہ سہولت نور کو گھر میں ہی مل گئی تھی۔ کوئی چھوٹا موٹا مسئلہ ہوتا تو مہرین فوراً اس کی مدد کو آجاتی۔ ایک روز نور کو گھٹنے میں ہلکا سا کھچاؤ محسوس ہوا۔ تایا کی ہدایت پر مہرین نے فوراً فون پر اپنی سینئر پروفیسر سے مشورہ کیا اور نور کے مساج میں لگ گئی۔

نور جلد ہی بہتر محسوس کرنے لگی۔ اس نے کہا۔ ''مہرین! کس منہ سے تیرا شکریہ ادا کروں۔''

''اسی منہ سے کر دیا کرو۔ کافی پیارا ہے، جب کس کر پونی ٹیل باندھتی ہو تو اور بھی اچھی لگتی ہو۔ شاید فلورنس بھی ایسے ہی باندھتی ہوگی دوڑتے وقت۔''

فلورنس ایک طرح سے نور کا آئیڈیل تھی۔ ہر کھلاڑی کا کوئی نامور کھلاڑی آئیڈیل ہوتا ہے۔ نور کے بھی اسی طرح کچھ آئیڈیل تھے۔ سو میٹر کی امریکن ریکارڈ ہولڈر فلورنس...... جس کی ٹائمنگ 10.49 سیکنڈ تھی۔ یہ ٹائمنگ ہر اسپرنٹر کے دل و دماغ میں ایک روشن سنگِ میل کی طرح جگمگاتی تھی...... اور پھر انڈین پی ٹی اوشا، جس نے جکارتہ میں 11.39 کی ٹائمنگ حاصل کی تھی اور پاکستان کی ایتھلیٹکس کا جگمگاتا ستارہ عبدالخالق جو مردوں کی کیٹگری میں 10.04 کی ٹائمنگ کے ساتھ ایشیا کا ریکارڈ ہولڈر تھا۔

وہ بھی خود کو ایسے ہی چمکتے دمکتے ستاروں کے درمیان یا ان کے آس پاس دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ کچھ کر گزرنا چاہتی تھی۔ ایک عورت کی حیثیت سے اپنے آپ کو منوانے کی آرزو رکھتی تھی...... تاکہ آپی بتول کے شوہر جیسے مرد...... اور ذوالقرنین جیسے مرد...... اور فرہاد جیسے مرد...... اس کی حیثیت کو تسلیم کریں۔

مہرین کے جادوئی لمس نے نور کے گھٹنے کا کھچاؤ یوں چن لیا جیسے وہ کبھی تھا ہی نہیں۔

مہرین بولی۔ ''تمہیں پتا ہے نور جب میں نے فزیو تھراپسٹ بننے کا سوچا تھا تو چچا جان (نور کے ابا جی) نے بڑی مخالفت کی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ یہ مالشیا بننے جا رہی ہے۔ لڑکیوں کو یہ کام زیب نہیں دیتے۔''

''ہاں، مجھے یاد ہے اور ایسی ہی باتیں ہیں جو ہمیں

سوچنے کی دعوت دیتی ہیں۔ اگر ہم ٹریک پر ہمت نہ ہاریں تو اور دیگر ہزاروں لڑکیاں بھی اس فیلڈ میں نہ آئیں تو پھر اس تھراپی کے حوالے سے ایک فیمیل دوسری فیمیل کی مدد کیسے کر سکتی ہے۔ ہمیں ایسی تنگ نظریوں سے نکلنا پڑے گا۔''

وہ بہت ہی کٹھن اور مشقت والے دن تھے۔ نور کو ایف ایس سی کا امتحان بھی دینا تھا۔ ٹیچرز کے ساتھ مشورے سے اس نے اس امتحان کو اگلے سال تک ملتوی کر دیا اور تمام تر توجہ رننگ پر مرکوز رکھی۔ پرنٹ میڈیا کے کئی لوگ اسے اپنے صفحات پر ہائی لائٹ کرنا چاہتے تھے مگر وہ جیسے...... ایک شخص کی وجہ سے...... پورے میڈیا سے ہی الرجک ہو گئی تھی۔ وہ شدید ضرورت کے وقت ہی تصویر اترواتی تھی اور وہ بھی اسکارف کے ساتھ۔ رننگ کے وقت بھی اس کا لباس سب سے علیحدہ اور باوقار ہوتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ایتھلیٹ کا ظاہری حلیہ اور لباس وغیرہ اس کی راہ میں کبھی رکاوٹ نہیں بن سکتا۔

ایک رات جب وہ سو رہی تھی، اسے لگا کہ اس کے پاؤں پر کوئی چیز رینگ رہی ہے۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اس نے دیکھا تایا ابا اس کے پاؤں کی طرف موجود تھے، ان کے ہاتھ میں ایک آئنٹمنٹ کی ٹیوب تھی۔ وہ اس کے ایک زخمی پاؤں پر دوا لگا رہے تھے۔

''تایا ابا! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟''

''اپنی بیٹی کے زخم پر مرہم رکھ رہا ہوں اور کیا کر رہا ہوں؟''

''تایا ابا'' وہ ٹھٹک کر رہ گئی۔''زخم کہاں ہے۔ زیادہ رننگ کی وجہ سے تھوڑی سی سرخی آ گئی ہے۔''

''میری بچی۔ ایتھلیٹ کے پاؤں کی تھوڑی سی سرخی بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ تمہیں پہلے بھی بتایا تھا۔ اس معاملے میں غفلت نہ کیا کرو اور کل کا دن ریسٹ کرو۔ یہ میرا حکم ہے۔''

وہ تایا ابا کے گلے لگ گئی۔ انہوں نے اس کا سر چوما۔ اس کے پاؤں کو سہلاتے ہوئے بولے۔''جب تم چھوٹی سی تھیں، میں تمہیں دبوچ کر تمہارے پاؤں پر گدگدی کیا کرتا تھا۔ تم ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوتی تھیں۔ بہت گدگدی ہوتی تھی تمہیں تلووں پر...... یاد ہے نا؟''

''ہاں تایا ابا...... اور آپ کو میرے گندے پاؤں بہت برے لگتے تھے۔ آپ مجھے جوتے یا چپل کے بغیر چلنے نہیں دیتے تھے۔''

وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولے۔''شاید یہ تمہاری محبت ہی تھی جس کے صلے میں اللہ نے پھر مجھے اپنی بیٹی بھی عطا کر دی لیکن تہمینہ کی پیدائش کے بعد بھی تمہاری محبت کبھی کم نہیں ہوئی......''

''آپ کی محبت اور آپ کی توجہ میرے لیے بے حد قیمتی ہیں تایا ابا۔ شاید اسی محبت اور توجہ کی بدولت میں خود کو ثابت کر سکوں اور کسی دن میرے اباجی بھی مجھے واپس مل جائیں۔''

''کیوں نہیں ملے گا وہ...... ضرور ملے گا۔ بس محنت شرط ہے اور مستقل مزاجی شرط ہے۔ میرا ایمان ہے نور، محنت کا صلہ ضرور ملتا ہے۔ وہ رائگاں جا ہی نہیں سکتی۔''

''آپ کا ایمان، میرا ایمان بھی بن چکا ہے تایا ابا''

''تم دیکھنا...... اس مرتبہ اللہ تعالیٰ تمہیں محنت کا پھل ضرور دے گا۔ کل میری بات تمہاری سینئر کوچ سے بھی ہوئی ہے۔ وہ بہت پُر امید ہیں۔''

اسلام آباد میں ہونے والے قومی کھیلوں کے لیے نور نے بہ آسانی کوالیفائی کر لیا تھا۔ آخر وہ دن آن پہنچا جب ابتدائی دوڑوں (یعنی Preliminary Heats) کے بعد نور کو فائنل ہیٹ میں حصہ لینا تھا۔ اس ہیٹ میں جو دو تین اہم مدمقابل موجود تھیں، ان میں ایچی سن کالج کی ایک لڑکی کے علاوہ نشو بجلی بھی تھی۔ پچھلے کچھ دنوں میں نور کی ٹائمنگ میں قریباً 0.30 سیکنڈ کی بہتری آئی تھی اور اسے یقین تھا کہ یہ بہتری اسے گولڈ میڈل دلانے میں اہم ثابت ہو گی۔

آخر وہ گھڑی آ گئی۔ ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ نور میدان میں پہنچی۔ وارم اپ کے دوران میں نشو بجلی اسے کڑی نظروں سے گھورتی رہی۔ جیسے نور کو دیکھ کر خود کو تاؤ دلا رہی ہو اور اس تاؤ کو اپنی انرجی بنا رہی ہو۔ نور نے بھی اس کی گرم نگاہوں کا جواب گرم نگاہوں سے ہی دیا۔ اس کے قریب سے گزرتے ہوئے نشو نے اپنے بوائے کٹ بالوں کو پھونک مار کر اپنی پیشانی سے ہٹایا اور سرگوشی کرتے ہوئے آگے نکل گئی۔ اس نے کہا تھا کہ آج پینڈو واپس پنڈ چلی جائے گی۔

گولڈ میڈل ہیٹ اسٹارٹ ہوئی...... پوزیشن لی گئی...... پسٹل کی آواز کے ساتھ ہی ایتھلیٹس کے رگ پٹھوں نے بجلی کی طرح رسپانس کیا اور وہ اپنے پاؤں سے فٹ بلاکس کو دھکیلتے ہوئے ٹارگٹ کی طرف جھپٹیں۔

پسٹل کی آواز کے فوراً بعد ہی نور کو محسوس ہوا کہ آج اس کا اسٹارٹ بہت اچھا نہیں تھا۔ بہرحال وہ بھاگنے میں اپنا ہنڈرڈ پرسنٹ دے رہی تھی۔ یہ سارا قریباً 50 قدم کا کھیل تھا، شاید ایک دو قدم زیادہ۔ قریباً پندرہ قدم کے بعد نور نے اسٹارٹ کی کمی کو دور کرنے کے لیے اضافی توانائی

لگائی۔ اس وقت نشو اس سے تقریباً چار پانچ فٹ پیچھے تھی۔ اپچی سن والی لڑکی کا فاصلہ زیادہ تھا مگر پھر نور کو لگا کہ نشو سے اس کا فاصلہ کم ہو رہا ہے۔ اس نے اپنی دائیں آنکھ کے گوشے سے دیکھا، نشو کی آگے بڑھتی ہوئی شبیہ نظر آ رہی تھی۔ پھر اسے یہ احساس ہوا کہ وہ اس کے برابر آنے کے بعد چند انچ آگے نکل گئی ہے۔ ریس دیکھنے والوں کا شور فلک شگاف تھا۔ آخری مرحلہ بے حد جاں گسل تھا۔ آخری چودہ پندرہ قدموں میں نور نے جسم و جاں کی پوری توانائی صرف کی اور فنش لائن پار کر لی۔

وہ ایک بار پھر ہار چکی تھی۔ نشو نے یہ ریس جیت لی تھی۔ نور کا خیال تھا کہ وہ دوسرے نمبر پر آئی ہے مگر جب فوٹو فنش کا رزلٹ سامنے آیا تو وہ تیسرے نمبر پر تھی۔ اپچی سن کالج کی ارم نے نہایت تھوڑے مارجن سے اس سے دوسری پوزیشن بھی چھین لی تھی۔ ان دونوں کا فرق صرف 0.08 سیکنڈ رہا تھا۔

نور بے دم سی ہو کر ایک طرف بیٹھ گئی۔ اس کی سانس ابھی تک نارمل نہیں ہوئی تھی۔ پچھلی ہار کے موقع پر اس نے اپنے ساتھیوں اور اپنے تایا جان کی طرف دیکھا تھا مگر اس مرتبہ اسے یہ ہمت بھی نہیں ہوئی۔ وہ کافی دیر گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی رہی۔ آخر اسے اپنی کمر پر تایا جان کے مشفق ہاتھ کا لمس محسوس ہوا۔ وہ ایک گھٹنا زمین پر ٹیک کر اس کے قریب بیٹھ گئے تھے اور اسے اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔ نور کے آنسو اکثر اس سے روٹھ جایا کرتے تھے۔

لیکن اس کی آنکھوں کے کنارے جل رہے تھے۔ سینے میں ایک ہچکی سی تھی جو آزاد ہونا چاہتی تھی، وہ ضبط کیے بیٹھی رہی۔ تایا جان اس کے کانوں میں تسلی آمیز سرگوشیاں کرتے رہے۔ ان سرگوشیوں پر ڈھول کی تھاپ حاوی ہو رہی تھی...... اور وہ نعرے حاوی ہو رہے تھے جو نشو بجلی کے سپورٹرز بلند کر رہے تھے۔ ان لمحوں میں نور کے دل میں خیال آیا۔ کہیں واقعی یہ اباجی کی بددعا تو نہیں جو جان توڑ کوشش کے باوجود اسے کامیابی سے دور رکھے ہوئے ہے۔

☆☆☆

وہ کمرے میں بند تھی۔ یوں لگتا تھا کہ کسی کو شکل ہی دکھانا نہیں چاہتی۔ اس نے رات کو کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ تایا جان تو اپنے ماہانہ دورے پر گجرات چلے گئے تھے لیکن تائی راحت اور تینوں کزنز تو گھر میں ہی تھے۔ پہلے مہرین دروازہ کھٹکھٹاتی رہی۔ اب شرجیل بار بار دستک دے رہا تھا، گاہے بگاہے تائی راحت کی آواز بھی آ رہی تھی، اس آواز میں تشویش کا عنصر نمایاں تھا۔ شاید انہیں ڈر تھا کہ نور نے مایوسی کے عالم میں کوئی ایسی ویسی چیز نہ کھا لی ہو مگر ایسی بات نہیں تھی۔

آخر وہ دروازے کے پاس پہنچی اور کراہ کر بولی۔
”میں ٹھیک ہوں لیکن پلیز ...... مجھے ابھی آرام کرنے دیں۔“
”مگر چند نوالے تو لے لو بیٹی۔“ تائی نے دلار سے کہا۔
”ابھی دل نہیں چاہ رہا۔ آپ سو جائیں، میں خود ہی لے لوں گی۔“

تائی کے بڑبڑانے کی مدھم آواز آئی۔ بہرطور اس کے بعد دستک وغیرہ نہیں ہوئی۔ نور نے کاغذ قلم سنبھالا اور اپنے ابا جان کو ایک خط لکھنے بیٹھ گئی۔ یہ کافی طویل خط تھا۔ اس کا خلاصہ کچھ اس طرح تھا۔

”اباجی! میں آپ کی فرمانبردار بیٹی ہوں اور ہمیشہ رہوں گی۔ شاید آپ کو اندازہ نہ ہو، آپ سے جدا ہو کر میں نے ہر پل آپ کو یاد کیا ہے۔ آپ کی محبت کو ترسی ہوں، امی کے بعد ہم بہنوں کے لیے آپ ہی تو سب کچھ ہیں۔ وہ واقعہ ایسا اچانک تھا کہ اس نے مجھے کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہیں دیا اور میں تایا ابا کے ساتھ یہاں چلی آئی۔ مجھے پتا ہے اباجی، میں نے آپ کو بہت دکھ دیا ہے۔ پلیز ...... آپ اپنی اس ناسمجھ اور کمزور بیٹی کو معاف کر دیں۔ پلیز اباجی پلیز۔ آپ مجھے معاف نہیں کریں گے تو میں خود کو دنیا کی بدقسمت ترین ہستی سمجھتی رہوں گی اور کبھی خوش نہیں رہ سکوں گی۔“

اگلے روز اس نے یہ خط مہرین کے ہی ذریعے اباجان تک پہنچایا تھا۔ دو روز بعد بڑی عید تھی اور اڑتی اڑتی سی یہ خبر بھی آ رہی تھی کہ شاید بسمہ کی کہیں بات پکی ہونے والی ہے۔ یہی دو وجوہات تھیں جن کی بنا پر نور کو ایک بار پھر اپنے گھر میں قدم رکھنے کا موقع مل گیا۔ اگلے دن، شام کے وقت پھپھو اس کے پاس آئیں اور اسے اپنے ساتھ لے کر گھر آ گئیں۔ اباجی اس وقت گھر کے ڈرائنگ روم میں موجود تھے۔ آپی بتول بھی اپنے سسرال سے آئی ہوئی تھیں۔ آپی اور پھپھو ”لرزتی کانپتی نور“ کو اپنے ساتھ لے کر ڈرائنگ روم میں گئیں۔

اباجی صوفے پر بیٹھے تھے۔ رخ دوسری طرف تھا، پہلے سے کمزور نظر آ رہے تھے۔ پھپھو نے لجاجت سے کہا۔ ”بھائی جان، یہ...... نور آئی ہے۔“

اباجی نے مڑ کر دیکھا۔ نور کو کچھ اور تو نہیں سوجھا، وہ جلدی سے آگے بڑھی اور بیٹھ کر اباجی کا گھٹنا تھام لیا۔ ان کے گھٹنے پر پیشانی رکھ کر اشکبار لہجے میں بولی۔ ”پلیز

ابا جی! مجھے معاف کر دیں۔ میں نے آپ کا دل دکھایا ہے، میں خوش نہیں ہوں...... میں بہت دکھی ہوں......" وہ بولتی چلی گئی۔

انہوں نے اپنا گھٹنا چھڑانے کی کوشش کی مگر نور کی گرفت مضبوط تھی۔ وہ برہمی سے بولے۔ "یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے۔ پیچھے ہٹو۔"

مغرب کی اذان سنائی دے رہی تھی۔ پھپھو نے ڈرے لہجے میں کہا۔ "چلیں معاف کر دیں بھائی جان...... بڑے معاف ہی کیا کرتے ہیں، اپنی غلطی پر شرمندہ ہے یہ......"

انہوں نے اٹھنے کی کوشش کی۔ "پیچھے ہٹو۔ مجھے نماز پڑھنے جانا ہے۔"

"پہلے آپ مجھے معاف کریں ابا جی۔" اس کی آواز میں بے پناہ کرب تھا۔

وہ کچھ دیر خاموش رہ کر بولے۔ "اچھا ٹھیک ہے...... پیچھے ہٹو۔"

وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور واش روم کی جانب بڑھ گئے۔

اگلے روز عید تھی۔ دونوں گھروں کا ہمیشہ سے یہ دستور رہا تھا کہ عید اکٹھے ہی مناتے تھے بلکہ اس میں پھپھو کا گھرانا بھی شریک ہوتا تھا۔ پھپھو کے شوہر عرصہ پہلے انتقال کر چکے تھے۔ عید کی گہما گہمی میں تھوڑا سا حزن بھی شامل تھا۔ نور کی والدہ کی وفات کے بعد یہ پہلی بڑی عید تھی۔ عید کی رات نور نے اپنے گھر میں ہی گزاری۔ اگلے روز پھپھو اور آپی بتول نے نور کو سمجھایا۔ پھپھو نے کہا۔ "دیکھو نور! تمہارے ابا جی نے تمہیں گھر آنے کی اجازت تو دے دی ہے لیکن ان کی اصل ناراضگی اسی طرح دور ہو سکتی ہے کہ تم اپنی ضد چھوڑ دو۔ شادی پر رضامند ہو جاؤ۔ وہ تم دونوں بہنوں کے فرض سے جلد از جلد فارغ ہونا چاہتے ہیں۔"

"پھپھو! میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ میرے لیے آپ سب کو اتنی جلدی کیوں ہے؟ کیوں مجھے کچھ دیر کے لیے مزید اپنی محبت کے سائے میں نہیں رکھ سکتے؟"

"یہ محبت ہی تو ہے نور۔" آپی بتول نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ "ابا جی، تمہیں اپنے گھر کی ہوتے دیکھنا چاہتے ہیں۔"

"انہوں نے آپ کو اپنے گھر کی، دیکھ ہی لیا ہے نا...... اس سے ان کو کچھ تسلی ہو جانا چاہیے۔" نور کے لہجے میں تلخی تھی۔

"ہر ایک کی اپنی قسمت ہوتی ہے نور۔" پھپھو نے کہا۔ "اور تیرے لیے تو بہت اچھا رشتہ آیا تھا...... تیری وجہ

سے وہ ہاتھ سے نکل گیا۔ ذوالقرنین [illegible] دین
دار، کماؤ اور بڑوں کے سامنے سر جھکا کر رکھنے والا۔ آج کل
ایک مسجد میں بچوں کو قرآن پاک پڑھاتا ہے اور بالکل فی
سبیل اللہ۔ اس عمر میں اتنی خدا خوفی کم کم ہی ہوتی ہے۔''

نور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی...... اور دوسرے کمرے
میں چلی گئی جہاں، بسمہ، مہرین اور دیگر کزن موجود تھے۔

رات کو ایک بار پھر پھپھو کا فقرہ اس کے کانوں میں
گونجنے لگا...... ذوالقرنین بہت اچھا لڑکا تھا......

''ہوں۔'' اس نے سر کو بیزاری سے حرکت دی اور
کروٹ بدل لی۔

بے شک ذوالقرنین کی ایک بات نور کو اچھی لگی تھی کہ
اس نے ایک موقع پر فرہاد کو نور کے ساتھ کار میں دیکھنے کے
باوجود، یہ بات اپنے تک محدود رکھی تھی۔ اس نے بعد میں بھی
اپنے گھر میں یا نور کے گھر میں کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا (حالانکہ
ایک موقع پر نور کو ڈر پیدا ہوا تھا کہ کہیں وہ اسے بلیک میل
کرنے کی کوشش نہ کرے) لیکن جہاں تک ذوالقرنین کے
لیے پسندیدگی کا تعلق تھا، یہ سوال خارج از نصاب تھا۔ ایک
شوہر کی حیثیت سے نور کے دل و دماغ میں جو آئیڈیل تھا، وہ
بالکل اور طرح کا تھا۔ نرم مزاج، خوش گفتار، خوش لباس اور
سب سے بڑھ کر یہ کہ بیوی پر بے جا پابندیاں عائد نہ کرنے
والا۔ اس کی صلاحیتوں کو پھلنے پھولنے کا موقع دینے والا۔
بے شک مذہبی لیکن روشن خیال۔

وہ سوچنے لگی، کہیں نہ کہیں تو کوئی ہوگا جو اس کے لیے
ہوگا۔ جو اس کے مطابق ہوگا۔ اسے اس کی ساری بشری
خامیوں اور خوبیوں کے ساتھ چاہے گا۔

☆☆☆

عید گزر چکی تھی۔ ذوالقرنین کی روزمرہ مصروفیات
پھر شروع ہو چکی تھیں۔ عصر تک اپنی کتابوں کی دکان پر
رہنے کے بعد وہ قریبی مسجد میں چلا جاتا تھا اور بچوں کو تجوید
کے ساتھ قرآن پاک پڑھاتا تھا۔ اس کے بعد دو گھنٹے کے
لیے پھر دکان پر جانا ہوتا تھا لیکن آج چونکہ بارش ہو رہی
تھی، اس لیے وہ جلدی گھر آ گیا۔ شیروانی اتار کر ہینگر پر
لٹکائی۔ ٹوپی اتار کر ایک طرف رکھی، اپنی چھوٹی ہموار ڈاڑھی
سے بارش کے قطرے جھاڑے اور تھکا تھکا سا بستر پر دراز
ہو گیا۔

سہانا موسم ہر کسی پر اثر کرتا ہے۔ دل میں کچھ شگوفے
سے پھوٹتے ہیں، چاہے وہ دل کسی کا بھی ہو۔ مولانا حبیب
اللہ کے بیٹے قاری ذوالقرنین کا بھی ہو۔ ہاں اپنی تمام تر
[illegible] کے باوجود اس کا دل دھڑکتا
تھا، اس کی رگوں میں خون کی یورش ہوتی تھی۔ اس نے بارہا
خود کو سمجھایا تھا...... وہ اسے بھول کیوں نہیں پاتا۔ وہ اس کے
لیے نہیں ہے۔ اس کے مزاج کی نہیں ہے، وہ کیوں اپنی
زندگی کو ایک مسلسل ناہمواری کے حوالے کرنا چاہتا ہے لیکن
وہ دل ہی کیا جو مان جائے۔ اس نے اسے پہلی بار شادی کی
تقریب میں دیکھا تھا۔ وہ عورتوں والے پورشن میں تھی اور
اپنا اسکارف کھول کر باندھ رہی تھی۔ بس ایک جھلک سی تھی،
دلکش چہرے کی، لمبے شہد رنگ بالوں کی اور شربتی آنکھوں
کی۔ وہ جھلک قاری ذوالقرنین کے اندر گہرائی تک پیوست
ہو گئی تھی۔ وہ بہت اداس رہنے لگا تھا۔

دروازے پر آہٹ ہوئی اور ذوالقرنین کی جڑواں
بہن خدیجہ اندر آ گئی۔ ''بھائی! آج تم جلدی آ گئے؟''

''بس، بارش ہو رہی تھی، ایسے موسم میں گاہک وغیرہ
کہاں آتا ہے۔''

''امی آج بھی کہہ رہی تھیں کہ ایک لڑکی دیکھنے جانا
ہے......''

''خدیجہ! کہا بھی ہے کہ ابھی تھوڑے دن ٹھہر جاؤ۔''

''ایسا کیوں ہے بھائی، تم تو خود ای سے کہا کرتے
تھے کہ...... شادی بیاہ میں زیادہ دیر نہیں ہونی چاہیے اور
اب دیر پر دیر کیے جا رہے ہو۔''

''دراصل ...... میں اپنے دل کو ذرا ٹھکانے پر لانا
چاہتا ہوں۔''

''مجھے پتا ہے، وہ ٹھکانے پر کیوں نہیں ہے۔'' خدیجہ
نے زیر لب مسکرا کر کہا۔

شروع میں ذوالقرنین نے نور کے حوالے سے اپنے
سارے احساسات صرف اور صرف اپنے تک محدود رکھے
تھے۔ یہ کوئی ناجائز احساسات نہیں تھے مگر ذوالقرنین نے
خود کو جس خول میں چھپا رکھا تھا، وہ اسے باہر نکلنے کی اجازت
نہیں دیتا تھا۔ ایک نہایت دین دار نوجوان کی حیثیت تھی
اس کی۔ وہ اصلاح معاشرہ نامی تنظیم کا ایک سرگرم رکن تھا۔
لوگ اس کی شرافت کی مثالیں دیتے تھے۔ اب عالم دین
مولانا حبیب اللہ کا یہ بیٹا کسی کے عشق میں گرفتار ہو گیا تھا۔
ذوالقرنین کے نزدیک یہ بہت معیوب صورت حال تھی۔
اس نے اپنی سوچوں کو سات پردوں میں لپیٹ کر سات تہ
خانوں کی گہرائی میں دھکیل دیا تھا۔ صرف ...... اور صرف
خدیجہ ایسی تھی جو ان تہ خانوں کی گہرائی میں سے کچھ ڈھونڈ
لائی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا بھائی کسی شدید ذہنی کوفت کا

شکار ہے۔ وہ نور کے حوالے سے باخبر رہنے کی کوشش کرتی
تھی کیونکہ وہ بھی اسی کالج میں زیر تعلیم تھی (اب کچھ عرصے
سے اس نے بھائی کے اصرار پر کالج میں اصلاح معاشرہ
تنظیم کی داغ بیل بھی ڈالی تھی) اسے کالج میں نور کے
بارے میں کوئی بات معلوم ہوتی تو بھائی سے شیئر کرتی۔

خدیجہ بولی۔ ''ذوالقرنین! مجھے نہیں لگتا کہ وہ اپنی
ڈگر سے ہٹنے والی ہے۔ عید کے موقع پر وہ واپس اپنے والد
اشفاق صاحب کے گھر چلی گئی تھی۔ معافی وغیرہ بھی مانگی
ہوگی اس نے......مگر اب پھر تایا کے گھر میں ہے......اور وہ
بھاگ دوڑ والی روٹین بھی جاری ہے۔ پتا نہیں وہ کیا نکالنا
چاہتی ہے اس میں سے......؟''

''اپنے والد سے صلح ہوئی اس کی؟'' ذوالقرنین نے پوچھا۔

''مکمل صلح تو نہیں ہوئی، ورنہ وہ واپس تایا کے پاس
کیوں جاتی۔ شاید اتنا ہوا ہے کہ اسے اپنے گھر میں قدم رکھنے
کی اجازت مل گئی ہے۔ شاید اس نے کچھ مہلت وغیرہ مانگی
ہو۔ کسی وقت مجھے اس پر بڑا ترس آتا ہے۔''

''مہلت کس لیے چاہتی ہے۔ وہی بھاگ دوڑ ہی
ہے نا اور اس میں وہ بری طرح ناکام ہوئی ہے۔''

''یہ جو کھلاڑی اور فن کار وغیرہ ہوتے ہیں
ذوالقرنین! ان کے ذہن میں ایک بار جو کیڑا گھس جائے وہ
آسانی سے نہیں نکلتا۔ خود کو خراب کررہی ہے۔ اتنی پیاری
ہے، اتنے اچھے گھر سے ہے مگر خود کو مصیبتوں میں پھنسا رہی
ہے۔ مولوی اشفاق کے لیے یہ کتنی شرمندگی کی بات ہوگی کہ
ان کی بیٹی اس طرح کے کاموں میں پڑی ہوئی ہے۔''

''ایسے بندے کو اللہ ہی ہدایت دیتا ہے۔''

''لیکن یہ تو ہوسکتا ہے کہ وہ کسی بڑی مصیبت میں
پھنسنے کے بعد ہدایت پائے۔''

''کیا مطلب؟''

''میں نے کالج میں سنا تھا کہ گوجرانوالہ کی ''چیمپئن
ایتھلیٹ'' نشو بجلی کے ساتھ نور کا زبردست ٹاکرا چل
رہا ہے۔ وہ لوگ کسی صورت نور کو آگے نہیں آنے دیں
گے۔ جہاں کہیں کوئی ایونٹ ہوتا ہے اور یہ دونوں اکٹھی
ہوتی ہیں، جھگڑا ہوتے ہوتے رہ جاتا ہے۔''

''بس یہی معاملے ہیں نا خدیجہ جن کی وجہ سے عورت
کو گھر کی چار دیواری تک محدود رہنے کو احسن سمجھا جاتا ہے۔
باہر کی مشکلوں کا مقابلہ کرنے کے لیے قدرت نے مرد کو بنایا
ہے اور وہی اس کے لیے بہتر ہے۔'' پھر وہ ذرا توقف سے
بولا۔ ''تم خود بھی تو اس سے ملتی ہو نا؟''

''ہاں۔ کبھی کبھی، عام سے انداز میں۔''

''اسے شک تو نہیں ہوا کہ تم کون ہو؟''

''نہیں۔ اس نے کبھی مجھے دیکھا ہی نہیں۔ کہیں دیکھا
بھی ہوگا تو بھول چکی ہے۔''

بہن سے گفتگو کے بعد بھی ذوالقرنین دیر تک جاگتا
رہا۔ کھڑکیوں سے بارش کی پھواریں ٹکرا رہی تھیں اور دل
میں جلترنگ کی سی کیفیت پیدا ہوتی تھی۔ نور کی آواز، اس کی
آنکھوں کے رنگ، اس کا دلنشیں لب ولہجہ اور پھر خفگی کے
عالم میں پیشانی کی ایک چھوٹی سی سلوٹ......سب کچھ اس
کے تصور میں گھوم رہا تھا۔

پتا نہیں کیوں ذوالقرنین کا دل چاہا کہ وہ کم از کم ایک
بار نور سے پھر ملاقات کرے اور اسے اس ''سعئی لاحاصل''
سے نکالنے کی کوشش کرے۔ اسے سمجھائے کہ اس کی
جدوجہد کا اصل مقام اس کا گھر ہے۔

☆☆☆

نور آہستہ آہستہ شکست کے بعد صدمے سے نکل رہی
تھی۔ وہ ابھی ابھی ''ایف اے ایس'' سے واپس آئی تھی
اور تھکی ہاری سی بستر پر دراز تھی۔ ذرا ستانے کے بعد وہ
مغرب کی نماز پڑھنا چاہ رہی تھی۔ اسی دوران میں تایا ابا
اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے کہا۔ ''گاؤں چلنا ہے؟''

''گاؤں؟''

''بھئی، بھول گئی ہو تم۔ امنالے کا میلا آگیا ہے۔
تمہاری دادی تو ایک مہینے سے تیاریوں میں لگی ہیں۔ پچھلی
دفعہ وہ لوگ اکیلے چلے گئے تھے مگر میرا خیال ہے اس دفعہ
ہمیں ضرور جانا چاہیے۔''

امنالے کا میلا یعنی پیر امناں والے کا میلا......اس
میلے کا ذکر ہی اپنے ساتھ بچپن اور لڑکپن کی بے شمار سنہری
یادیں لے آتا تھا۔ دل میں ایک ترنگ سی جاگتی تھی لیکن
آج کل نور کا تربیتی شیڈول بھی ٹائٹ چل رہا تھا۔ اس نے
کہا۔ ''کتنے دن رکنا ہوگا تایا ابا؟''

''کم از کم پانچ دن لیکن تم ضرور جاؤ۔ ایک تو تمہارا
موڈ بہتر ہوگا۔ دوسرے میں چاہتا ہوں کہ تمہیں اس
نامعقول کے آس پاس رہنے کا موقع ملے اور اس کے دل
میں مزید نرمی پیدا ہو۔'' نامعقول سے تایا ابا کی مراد ہمیشہ کی
طرح نور کے ابا جی ہی تھے۔

وہ بچنا چاہتی تھی مگر دل بھی چاہ رہا تھا۔ آخر وہ آمادہ
ہوگئی۔ ٹریننگ سینٹر یعنی ''ایف اے ایس'' سے پانچ چھ دن
کی چھٹی اس شرط پر مل گئی کہ وہ اسٹریچنگ وغیرہ کی ورزشیں

جاری رکھے گی اور [illegible] پوری کرے گی۔ بسمہ اور نور دوسرے دن بازار گئیں تاکہ روانگی کے حوالے سے کچھ شاپنگ کرسکیں۔ شاپنگ کرتے ہوئے بسمہ ذرا تھک گئی تو وہ دونوں ایک جوس کارنر میں داخل ہوگئیں۔ ابھی انہیں میز پر بیٹھے دو چار منٹ ہی ہوئے تھے کہ نور نے دیکھا کسی شخص نے بسمہ کو مخاطب کیا ہے۔ ''بسمہ بہن! کیا میں دو منٹ کے لیے یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟''

بسمہ اور نور نے ایک ساتھ اس شخص کی طرف دیکھا۔ نور بے طرح چونک گئی۔ وہ ذوالقرنین تھا۔ وہ سفید شلوار قمیص اور واسکٹ میں تھا۔ سر پر چمکیلے حاشیے والی گول ٹوپی تھی۔

بسمہ اور نور کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''یہ کیا بدتمیزی ہے؟'' نور نے غصے سے کہا۔

''پلیز...... میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ صرف...... صرف دو چار منٹ۔''

نور کا دل چاہا کہ وہ اپنی کرسی کو پیچھے جھٹک کر اٹھ کھڑی ہو مگر پھر اس نے خود کو سنبھالا۔ اپنا حجاب درست کرتے ہوئے تیکھے لہجے میں بولی۔ ''کیا میں یہ سمجھوں کہ آپ ہمارا پیچھا کر رہے تھے؟''

''میں شرمندہ ہوں لیکن خدا گواہ ہے، میں کسی بری نیت سے یہاں موجود نہیں ہوں۔ صرف آپ کی بھلائی کی بات کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ حسب عادت نظریں جھکائے جھکائے بولا۔ پچھلی ملاقات کی نسبت آج اس کا لہجہ بھی قدرے بہتر تھا۔

''معاف کیجیے۔ ہم نابالغ نہیں ہیں۔ اپنا برا بھلا سمجھتی ہیں۔''

''یہی تو دکھ ہے کہ آپ سب کچھ سمجھنے کے باوجود سمجھ نہیں پا رہیں۔ میں پھر معافی چاہتا ہوں لیکن یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ آپ ایک ایسے راستے پر چل رہی ہیں جہاں آپ اور آپ کے نہایت نیک نام والد صاحب کے لیے بہت سی پریشانیاں ہیں۔''

''آپ کس حوالے سے مجھے لیکچر دے رہے ہیں۔ کیا آپ کا خیال ہے کہ میں کوئی ناسمجھ جاہل ہوں؟''

''ایسا ہوتا تو پھر اتنے دکھ کی بات بھی نہیں تھی۔ ایسا نہیں ہے اور اس کے باوجود آپ گمراہی کی طرف جا رہی ہیں۔''

''جسے آپ گمراہی فرما رہے ہیں، وہ ہمارے نزدیک نہیں ہے اور یہ بحث اتنی طویل ہے کہ...... آپ کے بال سفید ہوجائیں گے۔'' نور نے اپنا شولڈر بیگ اٹھایا اور تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ بسمہ نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ ذوالقرنین کے چہرے پر سرخ رنگ لہرا گیا مگر وہ اپنی جگہ [illegible] بیٹھا رہا۔

نور اور بسمہ نے باقی شاپنگ ادھوری چھوڑ دی۔ موڈ ایک دم خراب ہوگیا تھا۔ نور بڑبڑا رہی تھی۔ ''پتا نہیں کہاں سے پیچھے پڑ گیا ہے۔ اب اگر یہ سامنے آیا تو منہ توڑ جواب ملے گا اسے۔''

اگلے روز دادی اور پھپھو کی فیملی کے ساتھ ساتھ دونوں بھائیوں کی فیملیاں، تین گاڑیوں پر سوار گاؤں روانہ ہو رہی تھیں۔ ماموؤں کو ایک روز بعد آنا تھا۔ بہت عرصے بعد نور کو لاہور سے باہر نکلنے اور اپنی مصروفیات کو بریک لگانے کا ایک موقع مل رہا تھا۔ وہ تایا جان والی گاڑی میں سوار ہوتی لیکن وہاں دادی بیٹھی ہوئی تھیں اور نور کو معلوم تھا کہ وہ پورے راستے میں اس کی والدہ مرحومہ کو نشانے پر لیے رکھیں گی اور نور کو مادر پدر آزاد قرار دے کر اس کے لتّے لیں گی۔ وہ اس گاڑی میں بیٹھ گئی جس میں پھپھو اور کزن موجود تھے۔

گجرات سے آگے تنگ سڑک پر ایک گھنٹے کا سفر تھا اور کچے پکے راستے پر قریباً دو گھنٹے کا نہایت دشوار سفر طے کرنے کے بعد وہ بالآخر موراں والی گاؤں پہنچ گئے۔ (بسمہ کے رشتے والا معاملہ حل ہوچکا تھا۔ ایک ایم این اے ضامن تھا۔ اب اس حوالے سے انہیں کھاپری برادری کی طرف سے کسی طرح کا اندیشہ نہیں تھا۔ چودھری طغرل کی والدہ وڈی اماں آج کل بیمار تھی اور نور کی دادی اس کی خبر گیری بھی کرنا چاہتی تھیں۔)

موراں والی میں وہ بڑے پُرلطف دن ثابت ہوئے۔ ہر گزرنے والے دن کے ساتھ رونق میں اضافہ ہو رہا تھا۔ میلے کی قدیم روایت کے مطابق تین دن پہلے علاقے کے لوگوں نے رضاکارانہ طور پر ہر طرح کا آتشیں اسلحہ تھانے میں جمع کرا دیا تھا لیکن یہ اسلحہ تھانے میں جمع نہیں ہوتا تھا۔ رسم کے مطابق بلند و بالا مزار کے سامنے سات آٹھ بڑی چارپائیاں ڈال دی جاتی تھیں۔ ان پر سفید چادریں بچھائی جاتی تھیں اور لوگ اپنے اپنے ہتھیار لاکر یہاں رکھتے جاتے تھے اور تھانے کے محرر سے ٹوکن لیتے جاتے تھے۔ ایک ٹوکن ہتھیار یا ہتھیاروں کے ساتھ باندھا جاتا تھا۔ مزے کی بات یہ تھی کہ اس میں ناجائز اسلحہ بھی شامل ہوتا تھا۔ اس اسلحے کے لیے بالکل علیٰحدہ طریقہ کار تھا...... یہ اسلحہ لوگ رات کی تاریکی میں جمع کراتے تھے۔ جو ضروری سمجھتے، وہ اپنا منہ سر بھی ڈھانپ لیتے تھے۔ درختوں کے ایک جھنڈ میں مستطیل شکل کی ایک طویل کوٹھڑی تھی۔ ناتک

چندری اینٹوں کی بنی ہوئی اس قدیم عمارت کی موٹی دیواروں میں چھوٹے چھوٹے بہت سے خانے بنائے گئے تھے۔ ان خانوں پر لوہے کے قریباً ایک مربع فٹ کے ڈھکنے اور تالے لگے ہوئے تھے۔ ہر خانے کا نمبر تھا۔ اپنے غیر لائسنسی ہتھیار لوگ ان خانوں میں رکھتے اور چابی اپنے پاس محفوظ کر لیتے۔ میلے کے اختتام پر رات کے وقت یہ لوگ اپنے ہتھیار نکال کر لے جاتے تھے۔ مدتوں گزرنے کے باوجود اس معاملے میں کبھی کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی تھی۔ ہر شخص اپنے ہی ہتھیار لے کر جاتا تھا اور اگر پولیس کو ناجائز اسلحے کے مالک کی کچھ خبر ہو بھی جاتی تھی تو مطلق بازپرس نہیں کی جاتی تھی۔ یہ سب اس میلے کی بے مثال اور انوکھی روایات تھیں یعنی غیر قانونی کام بھی بے حد ایمانداری کے ساتھ۔ اس حوالے سے لوگوں کے عقیدے اتنے پختہ تھے کہ کوئی انحراف کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میلے کے سات روز میں علاقے میں کوئی لڑائی جھگڑا نہیں ہوتا تھا۔ حتیٰ کہ چوری، رسّا گیری اور جیب تراشی کی چھوٹی موٹی وارداتیں بھی ناپید ہو جاتی تھیں۔ یہ تھا امناں والے کا میلا۔

نور اور فیملی کے دیگر بچوں بڑوں نے اپنی ساری سنہری یادیں تازہ کیں۔ آبائی مکان کا بڑا حصہ اور ملحقہ باغ تو بک چکے تھے مگر دریا کی طرف پرانی حویلی اب بھی دونوں فیملیز کی ملکیت تھی اور وہ یہاں بھرپور تفریح کر سکتے تھے۔

یہاں بھی کچھ پڑھے لکھے لوگوں کو معلوم ہو چکا تھا کہ مولوی اشفاق مہرا کی بیٹی بڑی اچھی کھلاڑی نکلی ہے اور اخباروں وغیرہ میں اس کا ذکر آتا ہے کئی عورتیں اور لڑکیاں اس سے ملنے کے لیے آئیں۔ کچھ آنکھوں میں واقعی ستائش تھی مگر کچھ کی آنکھوں میں ناپسندیدگی اور بیگانگی کی جھلک تھی، جیسے وہ خاموشی کی زبان میں کہہ رہی ہوں...... تم ہمارے گاؤں کی سیدھی سادی لڑکیوں کو کیا راستہ دکھا رہی ہو۔ مولوی اشفاق کی بیٹی ہو کر تم کس راستے پر چل رہی ہو۔ یہ تمہارا راستہ نہیں ہے۔ اپنی جوانی سنبھالو، اپنا گھر سنبھالو، بال بچے دار بنو، کڑیوں کے یہ کام نہیں ہوتے۔

میلے میں ایک دن صرف خواتین کے لیے مخصوص تھا۔ اس روز نور، بسمہ، مہرین اور فیملی کی دیگر لڑکیاں بھی گئیں اور خوب تفریح کی۔ ہاں نور کو کھانے پینے میں بہت احتیاط کرنا پڑ رہی تھی۔ صرف دو ہفتے بعد اسے ایک اہم ایونٹ میں حصہ لینا تھا اور اس میں نشو بھی آ رہی تھی۔

گاؤں میں قیام کے دوران نور نے اباجی کی دلجوئی کی کافی کوشش کی۔ ان کی خدمت کا کوئی موقع وہ ہاتھ سے جانے نہ دیتی مگر ان کا رویہ بدستور سپاٹ رہا۔ تایا جان کے سامنے وہ بول تو نہیں سکتے تھے مگر دونوں بھائیوں میں پہلی والی گرمجوشی کہیں دکھائی نہیں دیتی تھی۔ نور خود کو اس کا ذمے دار سمجھتی تھی۔

گاؤں سے واپس آ کر نور پھر اپنے روزمرہ کے معمولات میں لگ گئی۔ پانچ چھ روز کی کمی پوری کرنے کے لیے اس نے اضافی محنت کی۔ ایتھلیٹکس کا یہ ایونٹ دراصل واپڈا میں ملازمت کے حوالے سے تھا۔ صوبے کی چار پانچ ٹاپ رنرز بھی اس میں حصہ لے رہی تھیں۔ نور نے سو میٹر کے ٹرائلز میں سخت جدوجہد کی۔ فائنل ہیٹ میں اس نے اپنی اہم ترین حریف نشو بجلی کو 0.75 سیکنڈ کے ساتھ شکست دی (حالانکہ مبینہ طور پر نشو کو ایک غیر ملکی کوچ کی خدمات بھی حاصل تھیں اور وہ نیشنل گیمز میں ٹائٹل مقابلہ بھی جیت چکی تھی)۔

اس فتح کے بعد نور کو قوی امید ہو گئی کہ وہ اگلے قومی مقابلوں میں بھی نشو کو پچھاڑ سکے گی۔ اس ایونٹ کی فتح سے نور کو دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ اسے ایک مناسب جاب مل گئی۔ تنخواہ زیادہ نہیں تھی لیکن اتنا ضرور ہوا کہ تایا جان پر اس کے اخراجات کا جو اضافی بوجھ پڑ رہا تھا وہ کم ہو گیا۔ مثلاً اگر پہلے اس پر 30 ہزار ماہانہ خرچ ہو رہا تھا تو اب یہ شرح چودہ پندرہ ہزار رہ گئی۔ تنخواہ کے علاوہ نور کو کچھ مراعات بھی مل رہی تھیں۔

نور کو خدشہ تھا کہ شاید ذوالقرنین پھر اس کو ڈسٹرب کرنے کی کوشش کرے گا مگر ایسا نہیں ہوا۔ وہ پوری دل جمعی سے میگا ایونٹ یعنی نیشنل گیمز کی تیاری میں لگی رہی۔ اس نے تایا جان کے کہے کو اپنا 'موٹو' بنا لیا تھا۔ محنت اور مسلسل محنت، اس یقین کے ساتھ کہ صلہ مل کر رہے گا۔ سخت تربیت اور رننگ کے دوران میں بھی وہ کئی بار یہ جملہ زیر لب دہرانے لگی تھی...... "مسلسل محنت کا صلہ مل کر رہتا ہے۔"

اس کی ٹائمنگ اب کسی وقت 11.90 سیکنڈ کو چھو جاتی تھی۔ اس کا اور اس کے کوچز کا یہ یقین پختہ ہوتا جا رہا تھا کہ وہ گولڈ میڈل یا کم از کم سلور میڈل تک پہنچ جائے گی۔

☆☆☆

میگا ایونٹ نیشنل گیمز میں اب صرف ڈیڑھ ماہ باقی تھا۔ نور کا اوڑھنا بچھونا اس کی ٹریننگ بنی ہوئی تھی۔ وہ کہیں آنے جانے میں بھی بہت احتیاط سے کام لے رہی تھی۔ پہلے وہ کبھی تایا یا ماموں کے ساتھ کہیں موٹر بائیک پر بھی چلی جاتی تھی مگر اب تایا ابا کا حکم تھا کہ وہ صرف گاڑی استعمال کرے گی۔ ایسے موقعوں پر چوٹ لگ جانا یا کسی طرح اَن فٹ ہو جانا بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔

وزارتِ کھیل کی طرف سے [illegible] سطح پر کوئی [illegible] ہنٹ اسکیم ہو رہی تھی۔ انڈر 16 کی لڑکیوں میں سے قابل جوہر تلاش کیا جا رہا تھا۔ یہ ٹرائلز نور کے کالج کے وسیع و عریض میدان میں ہونا تھے۔ انتظامیہ نے نور کو بھی سینئر ایتھلیٹ کی حیثیت سے دعوت نامہ جاری کیا ہوا تھا۔

وہ ایونٹ کے روز کالج پہنچی تو وہاں رش لگا ہوا تھا۔ شامیانوں کے نیچے مختلف شہروں سے آنے والی بے شمار چھوٹی لڑکیاں موجود تھیں۔ نور پر انکشاف ہوا کہ نشو بجلی بھی آئی ہوئی ہے۔ نشو کی موجودگی اسے ہمیشہ ناگوار ہی گزرتی تھی اگر اسے پتا ہوتا کہ اس نے بھی آنا ہے تو شاید وہ نہ آتی۔

نور کے ساتھ بسمہ اور مہرین بھی آئی ہوئی تھیں۔ بسمہ حسبِ معمول برقعے میں تھی۔ تقریب میں ایک موقع پر وہی ہوا جس کا نور کو خدشہ تھا۔ نشو کی سپورٹرز نے ہلڑ بازی شروع کر دی۔ بسمہ کو ''ڈاکو'' کہا گیا۔ (کیونکہ اس نے برقع پہن رکھا تھا) نور کو دیکھ کر ''پینڈو...... پینڈو'' کے نعرے لگائے گئے...... اور بات صرف ہوٹنگ تک ہی نہیں رہی۔ ہجوم میں سے کسی لڑکی نے پیچھے سے ہاتھ بڑھایا اور نور کا اسکارف کھینچ کر اتار دیا۔ یہ بدتمیزی مہرین سے برداشت نہیں ہوئی۔ اس نے اس لڑکی کو دیکھ لیا اور اس کے بال کھینچے۔ ان لوگوں کو تو شاید بہانہ ہی چاہیے تھا۔ ایک دم لڑائی شروع ہو گئی۔ کئی لڑکیاں مہرین اور بسمہ پر پل پڑیں۔ بسمہ کا برقع پھٹ گیا، وہ گر گئی۔ بسمہ اپنی چھوٹی بہن کے برعکس بالکل دھیمے مزاج اور دبلے جسم کی تھی، ٹھیک سے دفاع بھی نہ کر سکی۔ اپنی بڑی بہن کو یوں بے بس دیکھ کر نور تماشائی کیسے رہ سکتی تھی۔ وہ ان لڑکیوں سے بھڑ گئی۔ نشو چلاتی ہوئی اس کی طرف بڑھی۔ نور نے اسے گھما کر کرسیوں پر دے مارا۔ اسی دوران میں ایک ہٹی کٹی لڑکی کے ہاتھ میں کسی ٹوٹی ہوئی کرسی کا پایہ آ گیا تھا۔ وہ نور پر جھپٹی اور تاک کر اس کی ٹانگ کو نشانہ بنایا۔ مضبوط لکڑی کے پائے کی دو تین شدید ضربیں نور کو لگیں۔ نشو کی حمایتیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ صاف محسوس ہوا کہ انہوں نے یہ سب پلاننگ کے ساتھ کیا ہے۔

یہی موقع تھا جب نور نے خدیجہ کو دیکھا۔ اس کا گلابی اسکارف تیزی سے قریب آ رہا تھا۔ وہ اصلاح معاشرہ کے فیمیل ونگ کی جنرل سیکریٹری تھی۔ اپنی ساتھیوں کے ہمراہ وہ حملہ آور لڑکیوں پر جھپٹی۔ ایک دو منٹ کے لیے ٹھیک ٹھاک مارا ماری ہوئی۔ کئی لڑکیوں کو چوٹیں آئیں پھر نشو کی سپورٹرز پسپا ہو گئیں۔ کالج کی انتظامیہ اور گارڈز وغیرہ بھی [illegible] آگے اور [illegible] ایک دوسرے سے دور کر دیا۔

نور کو سب سے پہلے اپنی ٹانگ کی فکر ہوئی۔ اس نے ٹانگ پر وزن ڈالا اور پھر چل پھر کر دیکھا۔ چوٹ ابھی گرم تھی...... اسے کوئی خاص دشواری نہیں ہوئی۔ بہرحال گھٹنے کے پاس ایک بڑا نیل نمودار ہو چکا تھا۔ اس میں سے تھوڑا سا خون بھی رس رہا تھا۔ اس نیل کی موجودگی ظاہر کر رہی تھی کہ ہنگامے میں جان بوجھ کر نور کو نشانہ بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس واقعے پر میڈم فرحانہ اور ڈیپارٹمنٹ کے اسپورٹس ہیڈ نے شدید ردعمل ظاہر کیا...... نور کو چوٹ لگانے والی لڑکی پوائنٹ آؤٹ ہو گئی تھی۔ نور کے اساتذہ کا خیال تھا کہ نشو اور اس لڑکی کے خلاف باقاعدہ ایف آئی آر درج کرائی جائے مگر پھر فونز کی گھنٹیاں بجنا شروع ہو گئیں۔ گوجرانوالہ سے دو تین بااثر افراد کی کالیں بھی آ گئیں۔ مختلف ذریعوں سے ڈیپارٹمنٹ کے ہیڈ کو بھی اپروچ کر لیا گیا۔ اندازہ ہوا کہ معاملہ صلح صفائی پر ختم ہو گا۔ ویسے بھی نور کسی شدید چوٹ سے بچ گئی تھی۔ میڈم فرحانہ اسے اپنے ساتھ لے کر آرتھوپیڈک اسپتال پہنچیں۔ اس کی ٹانگ کے ایکسرے وغیرہ کیے گئے اور تسلی ہونے کے بعد اسے ضروری ٹریٹ منٹ بھی دی گئی۔ ڈاکٹرز نے اسے تین چار روز مکمل آرام کا مشورہ دیا۔

بظاہر سب ٹھیک ہو گیا تھا مگر چار پانچ روز آرام کے بعد جب نور ٹریک پر پہنچی اور اس نے باقاعدہ رننگ شروع کی تو اس پر انکشاف ہوا کہ معاملہ اتنا سادہ نہیں جتنا اب تک نظر آیا ہے۔ اس کا متاثرہ گھٹنا پوری طرح کام نہیں کر رہا تھا۔ یہ وہی گھٹنا تھا جس پر شروع شروع میں کھچاؤ محسوس ہوا کرتا تھا مگر بہترین فزیکل ٹریننگ سے یہ کھچاؤ ختم ہو گیا تھا۔ اب اس سخت چوٹ نے اس کھچاؤ کو دوبارہ نمودار کر دیا تھا۔

یہ بڑی تکلیف دہ صورت حال تھی۔ چار پانچ روز تک تو نور نے کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ اس نے یہ امید پالی تھی کہ شاید دوڑنے سے اور روٹین میں آنے سے گھٹنے کی حالت بھی معمول پر آ جائے گی مگر ایسا نہیں ہوا۔ تکلیف میں کمی کے بجائے اضافے کا احساس ہوا...... وہ اس صورت حال کو مزید راز نہ رکھ سکی۔ ڈیپارٹمنٹ کی کوچ اور منیجر وغیرہ بھی آگاہ ہو گئے۔ ایک بار پھر اس کی چوٹ اور ''ٹریٹ منٹ'' کا سلسلہ شروع ہوا۔ ہڈی میں ہیئر لائن فریکچر کا اندیشہ تو ''سی ٹی اسکین'' وغیرہ سے دور ہو گیا مگر ایک دو مسل متاثر تھے...... تفصیلی معائنے کے بعد محکمے کے ڈاکٹر صاحب نے کہا۔

''مس نور! آپ کو کم از کم دو ہفتے مکمل آرام کرنا پڑے گا۔''

وہ روہانسی آواز میں بولی۔ ''لیکن ڈاکٹر! دو ہفتے آرام کے بعد تو صرف تین ہفتے بچیں گے۔ میں اتنی جلدی فارم کیسے حاصل کر پاؤں گی؟''

''تو پھر آپ ...... میرا مشورہ مانیں۔ ان مقابلوں سے دستبردار ہو جائیں۔ جلد بازی کر کے آپ اپنے کیریئر کو خطرے میں ڈال دیں گی۔''

یہ الفاظ برق کی طرح نور کے حواس پر گرے۔ ''نہیں...... میں یہ نہیں ہونے دوں گی۔'' وہ دل ہی دل میں پکار کر بولی۔

ڈاکٹر صاحب کہہ رہے تھے...... ''مس نور! ابھی آپ کی عمر بائیس سال ہے۔ آپ کو زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ آئندہ سال قومی ایونٹ میں بھرپور حصہ لے سکتی ہیں اور جہاں تک میرا تجربہ کہتا ہے، ہوسکتا ہے کہ آپ بہتر کارکردگی دکھا سکیں۔''

''اوہ نو۔'' اس نے کرب کے عالم میں دائیں بائیں سر ہلایا۔ وہ تو ایک ایک دن گن کر گزار رہی تھی اور ڈاکٹر صاحب ایک سال کی بات کر رہے تھے۔

میڈم فرحانہ بھی وہاں موجود تھیں۔ انہوں نے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب! اس کی باڈی میں ریکوری کی زبردست صلاحیت ہے۔ مجھے امید ہے کہ دس بارہ روز کے مزید آرام سے یہ فٹ ہو جائے گی۔''

''اللہ کرے ایسا ہی ہو لیکن مجھے امکان نظر نہیں آ رہا۔ ویسے میری رائے تو یہ ہے کہ آپ لوگوں کو اور ہمارے ڈیپارٹمنٹ کو اس لڑکی کے خلاف قانونی کارروائی کرنی چاہیے۔ صاف پتا چلتا ہے کہ نور کو جان بوجھ کر نشانہ بنایا گیا ہے۔''

''وہ بڑے بااثر لوگ ہیں۔'' فرحانہ بیگ نے کہا۔ ''کیس ہوا تو پھر کیسوں کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ آپ کا ڈیپارٹمنٹ بھی اس چکر میں پڑنا نہیں چاہتا۔''

ڈاکٹر صاحب بولے۔ ''میں نے اس واقعے کی ویڈیو دیکھی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اگر وہ دوسرے گروپ کی لڑکیاں مدد کو نہ آ جاتیں تو نور اور اس کی چار پانچ ساتھیوں کو مزید نقصان پہنچ سکتا تھا۔''

''جی ہاں۔ وہ ہمارے کالج کی ہی ایک آرگنائزیشن کی لڑکیاں تھیں۔ انہوں نے بڑا بروقت قدم اٹھایا۔''

نور نے ابھی تک تایا جان اور بسمہ وغیرہ کو اپنی ہولناک افتاد سے بے خبر رکھا ہوا تھا۔ تاہم مہرین کو کسی حد تک اندازہ ہو چکا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ گھٹنے کی اندرونی سائڈ پر لگنے والی چوٹ کتنی مضر ہوتی ہے۔ وہ بہت فکرمند تھی۔ اس روز ڈاکٹر سے مل کر جب نور گھر پہنچی تو کافی افسردہ تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ تایا جان کو اس خبر سے کیسے آگاہ کرے۔ دوسری طرف اسے یہ امید بھی تھی کہ وہ چند روز کے آرام کے بعد دوبارہ ٹریک پر آ جائے گی۔

گھر پہنچنے پر اسے معلوم ہوا کہ ایک مہمان آئی ہوئی ہے۔ دراصل اسے نور نے ہی بے حد ''ریکوئسٹ'' کر کے بلایا تھا۔ یہ وہی لڑکی خدیجہ تھی جس نے ہنگامے کے روز ڈٹ کر نور اور اس کی فرینڈز کی مدد کی تھی۔ وہ ''عبایا'' میں تھی اور تائی جان اور مہرین کے ساتھ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی چائے پی رہی تھی۔

نور اسے دیکھ کر گرمجوشی سے گلے ملی۔ ''سوری خدیجہ! مجھے کچھ دیر ہوگئی۔ وہاں ٹریننگ سینٹر میں ایک لیکچر سننا پڑ گیا تھا۔'' نور نے ڈاکٹر اور اسپتال والی بات گول کی۔

''کوئی بات نہیں۔ مجھے آپ کی تائی جان اور مہرین سے مل کر بہت اچھا لگا۔ میں آپ کی بہن سے بھی ملنا چاہتی تھی مگر وہ شاید دوسرے گھر میں ہیں۔'' نور نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بولی۔ ''ان کو بھی تو تھوڑی سی چوٹ آئی تھی۔ سارا برقع بھی پھٹ گیا تھا ان کا۔''

''ہاں، وہ اب بالکل ٹھیک ہے۔''

''اور آپ؟''

''آپ کی مہربانی سے میں بھی ٹھیک ہوں۔ آپ سے ملاقات تو پہلے بھی ہوتی رہتی تھی مگر یہ پتا نہیں تھا کہ ایک دن آپ اس طرح ہمارے لیے رحمت کا فرشتہ ثابت ہوں گی۔''

''نہیں بھئی نور! آپ تو ہمارے کالج کا بلکہ پورے شہر کا ایک روشن نام ہیں۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ آپ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے اور مزید ترقی دے۔ مجھے یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی ہے کہ آپ اب پھر روٹین کی ٹریننگ کر رہی ہیں۔''

نور کو سینے میں غم کی لہر سی محسوس ہوئی۔ خدیجہ اور نور کے درمیان بیس تیس منٹ تک گفتگو کا دور چلا لیکن اس تھوڑے سے وقت میں ہی وہ ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئیں۔ جیسے مدتوں سے ایک دوسرے کو جانتی ہوں۔ خدیجہ، نور سے تقریباً دو سال سینئر تھی۔ وہ اب نور کو بے تکلفی سے ''تم'' کہہ کر مخاطب کر رہی تھی اور نور کو یہ اچھا لگ رہا تھا۔

خدیجہ نے کہا۔ ''اب ہم اس گروپ کی طرف سے پوری طرح الرٹ ہو گئے ہیں۔ ان ''پرکٹی'' شتونگڑیوں نے کسی بھی موقع پر گڑبڑ کی تو منہ توڑ جواب ملے گا۔ انشاء اللہ۔''

اچانک نور کو خیال آیا۔ ”خدیجہ! آپ آئی کیسے ہیں؟“

”بھائی ساتھ ہے۔ وہ باہر گاڑی میں بیٹھا ہے۔“

”ارے یہ کیا بات ہوئی۔ انہیں باہر بٹھا دیا ہے۔“ تائی جان بولیں۔ ”کہا بھی تھا اسے اندر لے آؤ لیکن مانی نہیں۔ کہہ رہی تھی کہ وہ ذرا...... تنہائی پسند ہے۔“

خدیجہ ہنسی۔ ”تنہائی پسند بھی...... اور آج اس کا روزہ بھی ہے، کچھ کھائے پیے گا نہیں۔“

”لیکن خدیجہ! انہیں ڈرائنگ روم میں تو بٹھا دیتیں۔“ نور نے کہا۔

”چلیں، پھر سہی...... اس وقت تو کافی دیر ہو گئی ہے۔“ وہ رسٹ واچ دیکھتے ہوئے بولی۔ ”اب آپ لوگ اجازت دیں۔ انشاء اللہ پھر ملاقات ہوگی۔“ وہ اجازت لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

نور اور مہرین اسے دروازے تک چھوڑنے گئیں۔ ان کی ایف ایکس گاڑی پندرہ بیس قدم دور کھڑی تھی۔ گاڑی کا رخ دوسری طرف تھا۔ نجانے کیوں یہ نیلی گاڑی نور کو جانی پہچانی سی لگی...... جب خدیجہ گاڑی میں بیٹھنے لگی تو نور کو ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے شخص کی ذرا سی جھلک نظر آئی۔ وہ سناٹے میں رہ گئی۔ اس کی نظر دھوکا نہیں کھا رہی تھی۔ وہ ذوالقرنین تھا قاری ذوالقرنین۔ تو کیا خدیجہ، ذوالقرنین کی بہن تھی؟ کیا اسے معلوم تھا کہ اس کے بھائی کے ساتھ کچھ عرصہ پہلے نور کے رشتے کی بات چلی تھی؟ وہ کافی دیر تک اس غیر متوقع اتفاق کے حوالے سے سوچتی رہی۔ کہیں خدیجہ کی یہاں آمد کے پیچھے بھی تو کوئی منصوبہ بندی نہیں تھی؟

اپنی چوٹ کے بارے میں نور کے دل و دماغ میں تہلکہ سا مچا ہوا تھا مگر وہ کسی پر ظاہر نہیں ہونے دے رہی تھی۔ وہ اپنے اندر امید کو روشن رکھے ہوئے تھی اور سوچ رہی تھی کہ چند دن کے مکمل آرام سے وہ نارمل ہو جائے گی۔ گاہے بگاہے نشو بجلی اور اس کے گروپ کے حوالے سے بھی اس کے اندر شدید غم و غصہ نمودار ہوتا تھا مگر اسے اچھی طرح معلوم ہو چکا تھا کہ ان لوگوں سے لڑائی مول لینا آسان نہیں ہے۔

اس نے بند کمرے میں ہلکی پھلکی ورزش کر کے اپنی چوٹ کی نوعیت کو سمجھنے کی کوشش کی اور اس کا نتیجہ الٹا نکلا۔ اسے گھٹنے میں تیز درد شروع ہو گیا۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ تایا ابا تھے۔ انہیں ابھی تک نور کی فٹنس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ ان کے ہاتھ میں ایک پارسل تھا۔ یہ اسپیشل ایتھلیٹ شوز تھے جو انہوں نے یو ایس اے سے منگوائے تھے۔

”لو بھئی! تمہارا یہ کام بھی ہو گیا۔“ وہ اسے پیکٹ تھماتے ہوئے دبے دبے جوش سے بولے۔

پھر ان کی نگاہ نور کے چہرے پر پڑی اور وہ ذرا ٹھٹکے۔ ”خیریت تو ہے نوری؟“ انہوں نے پوچھا۔

”بس یونہی...... سر میں تھوڑا سا درد تھا۔“ اس نے بہانہ بنایا۔

”تو آرام کرو نا بیٹی! کل تو تمہاری پریکٹس بھی نہیں ہے۔“

”جی تایا ابا۔“ اس نے اپنے تاثرات کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

تایا ابا کو دکھانے کے لیے اس نے پیکٹ کھولا۔ شوز پہن کر بھی دیکھے، تعریف بھی کی اور شکریہ بھی ادا کیا لیکن اس کے دل پر جو گزر رہی تھی، وہی جانتی تھی۔

تایا ابا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”نور! تمہیں پتا ہے چاند پر پہلا شخص کون پہنچا تھا؟“

”جی...... نیل آرمسٹرانگ۔“ وہ ہولے سے بولی۔

”اور دوسرا؟“

”دوسرے کا نام...... نہیں...... دوسرے کا نام یاد نہیں۔“

انہوں نے مسکراتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ”اپنے لیے ہمیشہ نمبر ون کو ذہن میں رکھو۔“ اسے خدا حافظ کہتے ہوئے وہ اپنے کمرے میں چلے گئے۔

وہ دروازہ بند کر کے جیسے سسک اٹھی۔

☆☆☆

ایونٹ سے چھ سات دن پہلے تایا ابا کو بھی پتا چل گیا تھا کہ نور پوری طرح فٹ نہیں ہے لیکن پوری طرح پرعزم ہے اور ہر صورت ایونٹ میں حصہ لینا چاہتی ہے۔ محکمے کے سینئر ڈاکٹر کے علاوہ بھی ایک دو بہترین اسپیشلسٹ اسے زیر معائنہ رکھے ہوئے تھے۔ نور کوشش کے باوجود اپنی بہترین ٹائمنگ حاصل نہیں کر پا رہی تھی اور یہ اس کے لیے بے حد تکلیف دہ بات تھی لیکن ایک جنون تھا، ایک دیوانہ پن تھا، وہ ہر صورت میگا ایونٹ میں حصہ لینا چاہتی تھی۔ ایک وجدان سا تھا اس کے اندر...... اس نے مسلسل محنت کی ہے۔ اپنی کوششوں میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، اسے ضرور صلہ ملے گا...... مل کر رہے گا۔ یہی تو کہتے تھے تایا جان بھی۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے لیکن وہ اس مقابلے کے لیے پوری طرح تیار ہو گئی جس کا انتظار وہ ایک عرصے سے کر رہی تھی......

(جاری ہے)

وہ اپنی فٹنس کے حوالے سے مطمئن نہیں تھی مگر اپنی ہیڈ کوچ میڈم فرحانہ کو بتا بھی نہیں رہی تھی۔ اسے اندیشہ تھا کہ اگر اس نے اس حوالے سے میڈم فرحانہ سے تفصیلاً بات کی تو ہوسکتا ہے کہ معاملہ خراب ہوجائے۔ نتیجہ یہ نکلے کہ اسے ایونٹ میں حصہ لینے سے ہی روک دیا جائے۔ وہ فٹنس حاصل کرنے کی پوری کوشش کررہی تھی اور ساتھ ساتھ شب و روز دعا گو بھی تھی۔

بالآخر فیصلے کا دن آن پہنچا۔ توقع کے عین مطابق ٹاپ کی پانچ چھ اسپرنٹرز آسانی سے فائنل تک پہنچ گئیں۔ ان میں نشو بجلی، نور اور ایچی سن کالج کی ارم بھی شامل تھیں۔ ہر کسی کو فائنل ریس کا نہایت شدت سے انتظار تھا۔ اسٹیڈیم تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ کیمروں کی فلیش لائٹس چمک رہی تھیں۔ ٹی وی کیمرے اور عام ویڈیو کیمرے بھی چکراتے دکھائی دے رہے تھے۔ دل دھڑک رہے تھے اور سانسوں کے زیروبم میں تیزی آچکی تھی۔ اس کے کزن مہرین، شرجیل، عثمان وغیرہ بھی یہاں موجود تھے...... اور تایا جان کی موجودگی تو ہمیشہ لازمی ہوتی تھی۔ ہاں بسمہ اس دفعہ نہیں آسکی تھی لیکن یقیناً وہ بھی کہیں نہ کہیں ٹی وی کے سامنے موجود تھی۔

رنرز نے ٹریک پر پوزیشن لی۔ اپنے پاؤں فٹ بلاکس پر جمائے۔ آگے جھک کر اسٹارٹنگ لائن کو چھوا اور فائر ہوتے ہی اپنے سپنوں کی تعبیر کی طرف دوڑے۔ ان لمحوں میں نور نے اپنے فٹنس کے پرابلم کو قطعی طور پر ذہن سے نکال باہر کیا تھا۔ بس ایک ہی بات اس کے ذہن میں تھی، اس نے جیتنا ہے اور ہر صورت جیتنا ہے۔ اس نے اپنی اس حریف کو نیچا دکھانا ہے جس نے اسے ہرانے کے لیے بدترین حربے اختیار کیے۔ وہ اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کا بدلہ اس لڑکی سے قانونی طور پر نہیں لے سکتی تھی مگر کھیل کے میدان میں تو لے سکتی ہے اور وہ ضرور لے گی...... ایک دوسرا تصور جو اس کے حوصلے کو مہمیز کررہا تھا، وہ اس کے تایا ابا کا تصور تھا۔ انہوں نے بہت انتظار کیا تھا۔ آج وہ ان کی آنکھوں میں خوشی کی چمک دیکھنا چاہتی تھی...... خوشی اور فتح کی چمک۔

وہ فٹ بلاکس کو دھکیلتے ہوئے دوڑی اور اپنی تمام تر ذہنی و جسمانی توانائیاں صرف کردیں۔ وہ آغاز میں ہی دفاعی چیمپئن نشو سے تین چار فٹ آگے نکل گئی...... نشو نے چالیس میٹر طے کرنے کے بعد پورا زور لگایا اور نور کے برابر آگئی۔ وہ آج پھر آگے بڑھنا چاہتی تھی مگر آج نور نے تہیہ کیا ہوا تھا کہ اپنی لیڈ برقرار رکھے گی۔ تماشائیوں کے شور سے پورا اسٹیڈیم گونج رہا تھا...... اور پھر یکایک زمین و آسمان نور کی نگاہوں میں گھوم گئے۔ اس کے پاؤں زمین پر نہیں تھے۔ اس کے ایک گھٹنے میں ایسی شدید ٹیسیں اٹھی تھی جیسے کسی نے ٹانگ میں دہکا ہوا نیزہ اتار دیا ہو پھر شاید وہ ایک دو نہیں کئی پلٹیاں کھا گئی تھی۔ وہ فنش لائن سے پچیس تیس میٹر پہلے ہی گرچکی تھی۔ کئی سیکنڈ تک تو اسے پتا ہی نہیں چلا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ دل و دماغ یقین نہیں کرپارہے تھے مگر نگاہوں کو کیسے جھٹلایا جاسکتا ہے۔ وہ اسپرنٹرز کو عقب سے دیکھ رہی تھی۔ وہ فنش لائن پار کرچکی تھیں۔ نشو بجلی کے دونوں بازو بے ساختہ فضا میں اٹھ گئے تھے۔ وہ اپنے بازوؤں اور اپنی انگلیوں سے وکٹری کا نشان بنارہی تھی۔ بھاگتی چلی جارہی تھی جیسے ہواؤں میں اڑ رہی ہو۔

نور اپنی جگہ پڑی رہی، وہ کیسے اٹھتی؟ مُردے بھی کہیں اٹھتے ہیں۔ ان لمحوں میں وہ مُردہ ہی تو تھی۔ انتظامیہ کے چند مرد و زن اس کی طرف لپکے۔ فی میل ورکرز نے اسے بازوؤں سے تھام کر اٹھایا۔ وہ ایک ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح تھی۔ وہیں ٹریک پر بیٹھی رہی۔ اس کی کہنیاں اور گھٹنے بری طرح چھل گئے تھے۔ ان میں آگ بھری ہوئی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں اور سر اپنے گھٹنوں میں گھسیڑ لیا۔ وہ کچھ دیکھنا نہیں چاہتی تھی، کچھ سننا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے سنا تھا کہ آسمان لوگوں کو نگل لیتا ہے، یا زمین پھٹ جاتی ہے اور وہ اس میں سما جاتے ہیں۔ شاید وہ بھی کسی ایسی ہی انہونی کی منتظر تھی۔ اس وقت جس منظر کی دید کا خوف اسے سب سے زیادہ ''ہانٹ'' کررہا تھا، وہ تایا جان کے ہلدی رنگ چہرے کا منظر تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں مزید مضبوطی سے بھینچ لیں۔

☆☆☆

صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے، محنت کا صلہ ملتا ہے۔ عمل پیہم رائگاں نہیں جاتا...... کہاں تھے ان محاوروں کے خالق، کیوں بنائے گئے یہ محاورے؟ کیوں شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں نے امید کی شان میں قصیدے کہے اور اسے زندگی کی بقا کی بنیاد قرار دیا۔ وہ رات دن سوچتی تھی اور سوچتی چلی جارہی تھی۔ وہ ایک بار پھر کمرے میں بند ہوگئی تھی، نہ کسی سے مل رہی تھی، نہ کسی کی بات سن رہی تھی۔ یہاں تک کہ اس نے تین دن گزرنے کے باوجود تایا جان کا سامنا بھی نہیں کیا تھا۔ اتنے میں دروازہ کھٹکھٹایا گیا پھر مہرین

کی مدھم آواز ابھری۔ ”دروازہ کھولو نور! یہ ٹھیک بات نہیں۔ کیوں بھوکوں مرنا چاہتی ہو؟“

”نہیں مروں گی بھوکی۔“ وہ چڑچڑے انداز میں بولی۔ ”بسکٹ ہیں اندر اور دودھ بھی ہے فریج میں۔ جاؤ تم۔ میں کھالوں گی۔“

”لیکن یہ کیا بیوقوفی ہے نور! تم تو تماشا بنا رہی ہو اپنے آپ کو۔ جو ہونا تھا وہ ہوگیا۔ اب اپنے حواس ٹھکانے پر کرو۔ اگر گھٹنے کا مسئلہ زیادہ ہے تو اس کو بھی ٹریٹ منٹ کی فوری ضرورت ہے۔“

”نہیں......ٹھیک ہے گھٹنا میرا۔“ وہ لہجے کی تلخی کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”دیکھو نور! تمہیں ابا جان کے سامنے جاتے ہوئے اچھا نہیں لگ رہا نا؟ لیکن وہ تو کل شام ہی چنیوٹ چلے گئے تھے۔“ (ابا جان سے مہرین کی مراد اپنے ابا جان تھے)۔

”گھر میں اور کون ہے؟“ نور نے مری مری آواز میں پوچھا۔

”بس میں اور امی۔ وہ بھی بازار گئی ہیں۔“

کچھ دیر سوچنے کے بعد نور نے ایک لمبی سانس لی اور دروازہ کھول دیا۔ مہرین اندر آگئی۔ نور جیسے سسک کر اس کے گلے سے لگ گئی۔ وہ رونا چاہتی تھی مگر آنسوؤں کے بغیر کیسے رویا جاسکتا ہے؟

”کوئی بات نہیں نور۔ ہر کام میں اللہ کی بہتری ہوتی ہے۔ تم نے کوشش تو پوری کی۔ کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ اب جو اللہ کو منظور۔ کل ابا جی بھی یہی بات کہہ رہے تھے۔“ وہ نور کو دلاسا دینے لگی۔

نور بالکل بجھ سی گئی تھی۔ کوئی دلاسا کام نہیں کر رہا تھا۔ وہ کہیں چلے جانا چاہتی تھی۔ کچھ دنوں کے لیے ہر ایک سے دور ہو جانا چاہتی تھی......مگر کہاں جاتی؟

اچانک اس کی نگاہ خدیجہ پر پڑی۔ وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھی۔ یقیناً نور کو حوصلہ تسلی دینے کے لیے ہی آئی تھی۔ نور کے قدم جیسے بے ساختہ خدیجہ کی طرف اٹھ گئے۔ اس سے بات کر کے نور کو بہت اچھا لگا کرتا تھا مگر پھر یکایک وہ ٹھٹک سی گئی۔ اسے خدیجہ کے ساتھ اس گھر میں اپنی آخری ملاقات یاد آگئی تھی۔ خدیجہ کا بھائی اسی کے ساتھ آیا تھا اور وہ قاری ذوالقرنین تھا۔ ذوالقرنین کا خیال آتے ہی نور کے اندر کچھ بجھ سا گیا۔ خدیجہ کے حوالے سے اس کی ساری چاہت ایک دم گہنا گئی۔ وہ دھیمے قدموں سے خدیجہ کے پاس پہنچی اور عام سے انداز میں اس سے ملی۔

خدیجہ بے حد سنجیدہ نظر آرہی تھی۔ نور کو اندازہ ہوگیا کہ وہ کافی دیر سے یہاں مہرین کے پاس موجود تھی اور دونوں میں نور کی چوٹ وغیرہ کے حوالے سے تفصیلی بات ہوتی رہی ہے۔ نور کو مہرین پر تھوڑا سا غصہ بھی آیا کہ اس نے کیوں خدیجہ سے اس معاملے پر بات کی مگر پھر یہ سوچ کر اسے اپنا غصہ ماند پڑتا محسوس ہوا کہ اس کی ہار کی وجہ اور اس کی چوٹ کے بارے میں تو اب ہر کسی کو معلوم ہو ہی چکا ہوگا اور پھر جب سب کو معلوم ہو چکا ہے تو خدیجہ کو بھی سہی۔

رسمی کلمات کے بعد خدیجہ نے کہا۔ ”میں کل کے اخبار میں تمہارے بارے میں پڑھ رہی تھی۔ ڈاکٹر رضوان کا مختصر انٹرویو تھا۔ انہوں نے کہا ہے کہ وہ تمہارے گھٹنے کی چوٹ سے آگاہ تھے اور انہوں نے تمہیں اور تمہاری ہیڈ کوچ کو مشورہ بھی دیا تھا کہ تمہارا ایونٹ میں حصہ نہ لینا بہتر ہے۔“

”لیکن میں کچھ بہتر محسوس کرنے لگی تھی۔ میرا خیال تھا کہ میں یہ کرسکتی ہوں مگر جو میری قسمت میں تھا۔“

”میں سمجھتی ہوں نور کہ جو تمہاری قسمت میں تھا وہ تمہیں نہیں ملنے دیا گیا اور اس کی قصوروار صرف اور صرف نشو ہے۔ وہ مدت سے تمہارے پیچھے پڑی ہوئی تھی اور آخر اپنا کام دکھا گئی۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ سارے ثبوت ہونے کے باوجود ہم اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکے......اور اس لیے نہیں بگاڑ سکے کہ وہ بڑے باپ کی بیٹی ہے۔ وہ طاقتور لوگ ہیں۔ کوئی باہر کا ملک ہوتا تو تمہارا کیریئر داؤ پر لگانے والی اس خبیث کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے کر دیا جاتا۔“

”چھوڑیں خدیجہ! خود کو پریشان نہ کریں، جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب میں یہ سب بھول جانا چاہتی ہوں۔“ اس نے عام سے لہجے میں کہا تھا مگر لہجے کی تہ میں جو غیر معمولی کرب تھا، وہ چھپائے نہیں چھپا تھا۔

خدیجہ نے جیسے بے قرار ہو کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”ایسے مت بولو نور! سب کچھ ختم نہیں ہوا ہے۔ یہ صرف ایک ایونٹ کی بات ہے، تم بھلی چنگی ہو جاؤ گی۔ ڈاکٹر رضوان نے بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ ڈیڑھ دو ماہ کا مکمل آرام تمہیں پھر سے فٹ کرسکتا ہے، اس کے علاوہ......“

”پلیز خدیجہ! آپ یہ ذکر نہ ہی کریں، مجھے اب گھبراہٹ ہونے لگتی ہے۔ ویسے بھی میں کچھ دن کے لیے ذرا تنہائی میں رہنا چاہتی ہوں۔ اب بھی......سکون کی گولی کھائی ہوئی ہے......تھوڑی دیر سونا چاہ رہی تھی۔“ وہ کہتے کہتے کہہ ہی گئی۔

یہ اس امر کا واضح اشارہ تھا کہ وہ زیادہ دیر خدیجہ کے

پاس بیٹھنا نہیں چاہتی۔ نور کی یہ بے رخی محسوس کرنے کے باوجود خدیجہ کی خندہ پیشانی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ اس نے بڑے پیار سے اس کے ہاتھ کو تھپتھپایا...... نم آنکھوں کے ساتھ اس کے سر کو چوما اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''اچھا تم آرام کرو۔ اگر موڈ اچھا ہو اور کسی وقت بات کرنے کو دل چاہے تو فون ضرور کرنا۔''

☆☆☆

وہ کسی صورت اس کے ذہن سے نکلتی ہی نہیں تھی۔ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے ہر وقت اس کا خیال تھا۔ شادی کی تقریب کا وہ منظر جیسے ذوالقرنین کے دل و دماغ پر نقش ہو کر رہ گیا تھا...... اس نے اپنا ڈھیلا اسکارف کھول کر پھر باندھا تھا۔ ستاروں کے درمیان جیسے ایک چاند چمکا تھا اور پھر اوجھل ہو گیا تھا۔ کئی گھڑیاں ایسی ہی کایا پلٹ ہوتی ہیں۔ وہ پوری زندگی پر محیط ہو جاتی ہیں۔ کہنے کو تو بس چند سیکنڈ لیکن جھیلنے کو ساری زندگی۔

تین دن پہلے اسے پتا چلا تھا کہ نور ایک بار پھر ٹائٹل جیتنے میں ناکام رہی ہے اور بری طرح ناکام رہی ہے۔ وہ آدھے راستے کے فوراً بعد ٹریک پر گر گئی تھی اور دور تک لڑھکی تھی۔ اس کی یہ تصویر کئی اخباروں میں چھپی تھی اور پی ٹی وی پر بھی یہ منظر دکھایا گیا تھا۔

ذوالقرنین کا دل غم سے بھرا ہوا تھا، اتنے میں اس کی جڑواں بہن خدیجہ اندر آ گئی۔ وہ اس کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ ذوالقرنین کے کہنے پر ہی وہ نور سے ملنے گئی تھی۔

خدیجہ بالکل گم صم تھی۔ گہری سانس لے کر بولی۔'' وہ بہت خاموش ہے۔ بالکل ٹوٹ پھوٹ گئی ہے۔ میں سوچتی ہوں ذوالقرنین...... دانشوروں نے شاید درست ہی کہا ہے کہ ظلم کی حکومت تو قائم رہ سکتی ہے مگر ناانصافی کی نہیں۔ یہاں دو طرح کا انصاف ہے۔ ایک غریب اور بے وسیلہ لوگوں کے لیے، دوسرا امیر اور اثر رسوخ والوں کے لیے۔ ہمارا اندازہ بالکل درست تھا۔''

''کیا مطلب؟''

''نور کی ناکامی کی وجہ وہی چوٹ ہے جو اس کمینی نشو نے اسے کالج والے ایونٹ میں لگوائی تھی۔ اس کا گھٹنا پوری طرح فٹ نہیں تھا پھر بھی اس نے ریس میں حصہ لیا اور شکست کھا گئی۔ میرا تو دل چاہتا ہے کہ وہ نشو کہیں میرے سامنے آئے اور میں اسے گولی مار دوں۔ سنا ہے آج کل وہ لاہور آئی ہوئی ہے، اس کے اعزاز میں تقریبات ہو رہی ہیں۔''

''اب کیا کہتی ہے نور...... کیا اب بھی اپنی ضد پر رہے گی؟''

''نہیں، اس بارے میں تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ یقین کرو ذوالقرنین! آج اسے دیکھ کر بڑا ترس آیا ہے مجھے۔ اپنے تایا اور والد کے سامنے سرخرو ہونے کے لیے بڑی جان ماری تھی اس نے مگر......''

ذوالقرنین ذرا توقف سے بولا...... ''چلو تم اس سے ملتی رہو۔ اسے سمجھانے کی کوشش کرو کہ زندگی میں ایک ہی جیت نہیں ہے اور ایک ہی میدان نہیں ہے۔ بندہ ایک جگہ کامیابی حاصل نہ کر سکے تو کسی اور شعبے میں نام کما سکتا ہے۔''

''تمہیں کہا تھا نا ذوالقرنین! یہ جو کھلاڑی اور آرٹسٹ ہوتے ہیں نا، یہ دھن کے بڑے پکے ہوتے ہیں۔ ان کے بارے میں یقین سے کوئی پیش گوئی بھی نہیں کی جا سکتی۔''

خدیجہ نے بھائی سے یہ بات چھپائی کہ نور اس سے بڑی سرد مہری سے ملی ہے۔

اگلے روز ذوالقرنین عصر کی نماز پڑھ کر دکان پر پہنچا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف خدیجہ کی ایک دوست تبسم تھی۔ وہ ہیجانی لہجے میں بولی۔ ''ذوالقرنین بھائی! خدیجہ زخمی ہو گئی ہے۔ شیخ زید اسپتال میں ہے۔ آپ جلدی آئیں۔''

''ہوا کیا ہے؟'' ذوالقرنین چلا کر بولا۔

''فیڈریشن کے آفس میں لڑائی ہوئی ہے۔ نشو اور اس کی دوستوں نے خدیجہ کو بری طرح مارا ہے۔ اس کی...... کلائی کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے اور بھی کئی زخم ہیں۔''

ذوالقرنین اپنی ایف ایکس پر آندھی کی رفتار سے شیخ زید اسپتال پہنچا۔ خدیجہ ابھی ایمرجنسی میں ہی تھی۔ اس کی ٹوٹی ہوئی کلائی پر عارضی ڈریسنگ کر دی گئی تھی۔ اس کے سر، کندھے اور پاؤں کی انگلیوں پر شدید چوٹیں آئی تھیں۔ تنظیم کی کئی ممبران بھی وہاں موجود تھیں۔ زخمی ہونے کے باوجود خدیجہ پریشان نہیں تھی۔ اس کی آنکھوں میں جیسے آگ سی روشن تھی۔ ذوالقرنین نے اسے گلے سے لگا کر تسلی دی۔ پھر تبسم سے پوچھا کہ کیا ہوا ہے؟

اس نے بتایا کہ فیڈریشن کے آفس میں نشو کے اعزاز میں ایک فنکشن تھا۔ خدیجہ اکیلی وہاں پہنچ گئی۔ وہاں اس نے اسٹیج پر آ کر اور ڈائس کے سامنے نشو کے خوب لتے لیے۔ اسی پر لڑائی ہوئی۔

ایک دوسری لڑکی بولی۔ ''خدیجہ باجی نے غلطی کی، اگر ایسا کچھ کرنا تھا تو کم از کم ہم میں سے دو چار کو انفارم کر دیتیں۔''

واقعے کی جو تفصیل معلوم ہوئی، وہ کچھ اس طرح تھی۔ خدیجہ کے اندر نشو کے لیے مسلسل غصہ پل رہا تھا۔ آج اس سے برداشت نہیں ہو پایا۔ وہ فیڈریشن کے آفس پہنچ گئی۔ وہاں نشو اور ایچی سن کالج کی ارم کو نقد انعامات دیے جانے والے تھے۔ جب نشو ڈائس پر آئی تو خدیجہ نے وہاں پہنچ کر مائک کے سامنے بولنا شروع کر دیا۔ نشو کی چیمپئن شپ کو فراڈ قرار دیا...... اور بتایا کہ اس نے کس طرح ''پری پلاننگ'' اصل حق دار نور کو ایونٹ سے باہر کیا ہے۔ وہاں اتفاقاً وہ ہٹی کٹی لڑکی بھی موجود تھی جس نے نور کی ٹانگ پر کرسی کے ٹوٹے ہوئے پائے سے ضربیں لگائی تھیں۔ وہ حاضرین میں سے نکل کر خدیجہ پر جھپٹ پڑی۔ خدیجہ نے اس کی بھی ٹھکائی کر دی۔ اس کے ناک منہ سے خون جاری ہو گیا۔ نشو بجلی پہلے تو سکتہ زدہ کھڑی رہی مگر پھر خدیجہ پر جھپٹی۔ خدیجہ نے اسے ایک یادگار طمانچہ رسید کیا۔ بعد میں تقریباً اسے بھی طمانچے پڑے اور وہ زدوکوب بھی ہوئی مگر وہ پہلا طمانچہ درجنوں کیمروں میں ریکارڈ ہو گیا۔

☆☆☆

مہرین نے نور کو زبردستی بیڈ پر نیم دراز کر رکھا تھا اور اس کو گھٹنے کی مختلف ورزشیں کرا رہی تھی۔ اسی دوران میں پی ٹی سی ایل فون کی گھنٹی بجی۔ مہرین نے کال ریسیو کی اور اس کے تاثرات میں ہلچل مچ گئی۔ دوسری طرف سے کسی جھگڑے کی بات ہو رہی تھی۔ فون سننے کے بعد مہرین نے نور سے کہا۔

''اچھی خبر نہیں، خدیجہ اور نشو کی لڑائی ہوئی ہے۔ خدیجہ کا بازو فریکچر ہو گیا ہے، اسپتال میں اس کا آپریشن ہو گا۔''

''اوہ گاڈ۔'' نور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ''کس نے بتایا ہے؟''

''میری کولیگ ہے...... وہ بھی شیخ زید کے فزیوتھراپی ڈیپارٹمنٹ میں ہے۔''

''لیکن معاملہ کیا تھا...... کوئی اپنی بھی دشمنی ہے ان کی؟''

''نہیں بھئی۔ تمہاری والی دشمنی ہی ہے۔ ایک فنکشن میں خدیجہ ڈائس پر پہنچ گئیں اور خطاب فرماتی ہوئی نشو کا اچھا خاصا ریمانڈ لیا۔ کافی ہنگامہ ہوا ہے۔''

آدھ پون گھنٹے میں نور اور مہرین کو اس واقعے کی ساری تفصیلات معلوم ہو چکی تھیں۔ یہ بھی پتا چلا کہ چند دن پہلے نور کو چوٹ لگانے والی لڑکی سلطانہ اس لڑائی میں اسٹیج سے گر کر تھوڑی دیر کے لیے بے ہوش بھی ہو گئی تھی۔ ممکن تھا کہ نشو کے ورثا پرچہ وغیرہ بھی درج کرا دیتے مگر چونکہ خدیجہ کو بھی سخت چوٹ لگی تھی اس لیے ابھی تک پولیس کو انفارم نہیں کیا گیا تھا اور معاملہ رفع دفع کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

''خدیجہ اچھی بھلی سمجھ دار ہیں۔ انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہ کیوں میرے لیے لڑائی مول لے رہی ہیں۔''

''کبھی کبھی اس طرح کی بات اپنے بس میں نہیں رہتی نور! صبر کا پیمانہ لبریز ہو جائے تو پھر زیادہ ہی چھلک جاتا ہے۔ میں نے اس دن نوٹ کر لیا تھا کہ تمہیں دیکھ کر خدیجہ بہت پریشان ہو گئی ہیں......''

تین دن بعد کی بات ہے، نور اور مہرین نے خدیجہ کی مزاج پرسی کے لیے اسپتال جانے کا فیصلہ کیا۔ خدیجہ کا آپریشن کامیابی سے ہو چکا تھا۔ نور چاہتی تھی کہ وہ اس وقت اسپتال پہنچیں جب خدیجہ کا بھائی ذوالقرنین آس پاس موجود نہ ہو۔

خدیجہ پرائیویٹ روم میں تھی۔ جب وہ اس کے پاس پہنچیں تو وہ روم میں اکیلی ہی تھی۔ وہ دونوں اس کے دائیں بائیں بیٹھ گئیں، ایک خوبصورت ''مگے'' اس کے سرہانے رکھ دیا۔ رسمی کلمات کے بعد نور نے کہا۔ ''آپ نے ایسا کیوں کیا خدیجہ...... خوامخواہ لڑائی مول لی۔ آپ تو مجھے سمجھاتی تھیں کہ ان باتوں میں پڑنے سے کوئی فائدہ نہیں۔''

''پتا نہیں نور کہ کیسے ہو گیا۔ جب میں تم سے مل کر آئی تو میرے دل کی حالت عجیب ہو گئی تھی۔ پھر نہ چاہتے ہوئے بھی میں وہاں پہنچ گئی۔ آئی ایم سوری لیکن ایسا لگتا تھا کہ کچھ بھی میرے بس میں نہیں رہا۔''

''آپ جانتی ہیں خدیجہ! یہ لوگ اچھے نہیں ہیں۔ یہ آپ کے لیے پریشانیاں پیدا کر سکتے ہیں۔''

''نہیں، کوئی پریشانی نہیں ہو گی انشاء اللہ! انہیں پتا تھا کہ اگر وہ پولیس تک گئے تو پھر بات آگے تک جائے گی۔ کل صلح صفائی کی بات ہو گئی ہے۔ میں نے انہیں صاف بتایا ہے کہ وہاں فیڈریشن کے دفتر میں جو کچھ بھی ہوا، اس میں کسی اور کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔''

''مگر اس سے فائدہ کیا ہوا خدیجہ؟'' نور نے جزبز ہو کر کہا۔

''بہت فائدہ ہوا ہے نور! کم از کم ان لوگوں کو ایک جواب تو ملا ہے۔ اب آئندہ کوئی حرکت کرنے سے پہلے وہ کئی بار سوچیں گے۔ تمہیں پتا چلا ہی ہو گا، وہ ماڈرن غنڈی تو اسٹیج سے گر کر کچھ دیر کے لیے بے ہوش بھی ہو گئی تھی......''

مہرین بولی۔ ''مگر آپ کو بھی تو قیمت چکانا پڑی خدیجہ آپی! آپ اسپتال میں پڑی ہیں۔''

''کوئی قیمت نہیں۔'' وہ مصنوعی ناراضگی سے بولی۔

"بھلی چنگی ہوگئی ہوں، کل تک شاید چھٹی بھی مل جائے۔"

ابھی وہ باتیں کر ہی رہی تھیں کہ واش روم کا دروازہ کھلا اور ذوالقرنین تولیے سے بازو صاف کرتا ہوا باہر نکلا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی ہموار ڈاڑھی میں پانی کے قطرے چمک رہے تھے۔ ذوالقرنین کو دیکھ کر نور کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ بھی ذرا ٹھٹکا پھر اس نے شائستگی سے "السلام علیکم" کہا۔ نگاہیں حسبِ معمول جھکی ہوئی تھیں۔ نور اور مہرین نے جواب دیا۔ وہ شاید وضو کر کے نکلا تھا۔ بولا "خدیجہ! نماز کا ٹائم ہو رہا ہے۔ میں بس ابھی آتا ہوں۔"

وہ چلا گیا۔ مہرین نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔ "یہ کون تھے خدیجہ آپی؟"

"میرا بھائی ذوالقرنین۔"

"اچھا، آپ انہی کے ساتھ ہمارے گھر آئی تھیں؟"

خدیجہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ "بہت زیادہ خیال رکھتا ہے میرا۔ چار دن سے مسلسل یہاں میرے پاس ہے۔"

اسی دوران میں مہرین کی وہ دوست آ گئی جو اسی اسپتال میں فزیوتھراپسٹ تھی۔ مہرین اس کے ساتھ باتیں کرتی ہوئی باہر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد کمرے میں ایک بوجھل خاموشی طاری ہوگئی۔ نور کے علاوہ جیسے خدیجہ بھی کچھ کہنا چاہ رہی تھی مگر کہہ نہیں پا رہی تھی۔ آخر نور نے ہی اس خاموشی کو توڑا۔ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "اس کا مطلب ہے کہ آپ پہلے سے جانتی ہیں؟"

"کیا؟" خدیجہ نے پوچھا۔

اس نے ذرا توقف سے کہا۔ "یہی کہ میں وہی ہوں جس کے ساتھ کچھ عرصہ پہلے آپ کے بھائی کے رشتے کی بات چلی تھی؟"

خدیجہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور تکیے سے ٹیک لگا لی۔ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "ہاں نور...... میں جانتی تھی...... مگر میں نے تمہیں بتایا نہیں...... مجھے ڈر تھا کہ تمہیں پتا چل گیا تو ہماری دوستی شروع میں ہی ختم ہو جائے گی لیکن یہ نہ سمجھنا کہ میرے اور تمہارے ملنے میں کوئی پلاننگ تھی۔ ظاہر ہے کہ ہم ایک ہی کالج میں تھیں، جو کچھ ہوتا رہا خود بخود ہوتا رہا۔"

"...... آپ میرے لیے صرف خدیجہ ہی رہتیں تو بہت اچھا ہوتا۔" نور کھوئے ہوئے لہجے میں بولی۔

"میں اب بھی تمہارے لیے صرف خدیجہ ہوں۔ میں تمہیں یقین دلاتی ہوں ہمارے درمیان اور کوئی تعلق کبھی نہیں آئے گا۔"

اس سے پہلے کہ خدیجہ مزید کچھ کہتی، مہرین اور اس کی دوست واپس آ گئیں۔ گفتگو کا موضوع بدل گیا۔ نور اب جلد یہاں سے نکل جانا چاہتی تھی۔ خدیجہ سے رخصت ہو کر وہ دونوں کمرے سے باہر آ گئیں۔ جب وہ سیڑھیاں اتر رہی تھیں تو ان کی ملاقات پھر ذوالقرنین سے ہوگئی۔ وہ کولڈ ڈرنکس اور اسنیکس وغیرہ لے کر اوپر آ رہا تھا۔

"آپ جا رہی ہیں؟" وہ ان کی طرف دیکھے بغیر بولا۔

"جی ہاں۔ گھر میں انتظار ہو رہا ہوگا۔" مہرین نے جواب دیا۔

"آپ پانی تو پی لیتیں۔"

"شکریہ۔ دیر ہو رہی ہے۔" مہرین نے کہا۔

وہ دونوں سلام لیتے ہوئے نیچے اتر آئیں۔

راستے میں مہرین نے گہری نظروں سے نور کو دیکھا اور دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "ویسے نور! بندہ اتنا برا بھی نہیں لگتا جتنا ہم سمجھتے ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"سیانے کہتے ہیں نا کہ شکلوں پر نہیں جانا چاہیے۔ شکل صورت سے یہ ذرا سخت مزاج اور گم صم سا ہے مگر جب بات کرتا ہے تو اور طرح کا تاثر پیدا ہوتا ہے۔"

"اچھا، تم زیادہ مردم شناس نہ بنو۔" نور نے چڑ کر کہا۔

"یار! میں تو ایک عام سی بات کر رہی ہوں۔"

"لیکن میرے لیے یہ عام نہیں ہے مہرین! میں اس طرح کے کسی بندے کو اپنی زندگی میں لانے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔"

"کوئی آئیڈیل؟" مہرین دبی دبی شوخی سے بولی۔

"نہیں۔ کوئی آئیڈیل نہیں مگر یہ قاری ذوالقرنین بھی نہیں۔"

نور کا موڈ دیکھتے ہوئے مہرین نے خاموش رہنا مناسب سمجھا۔

...... پندرہ بیس روز گزر گئے۔ انہوں نے دوبارہ خدیجہ کی خیر خیریت دریافت نہیں کی حالانکہ انہیں چاہیے تھا کہ کم از کم ایک بار تو اسے فون کر لیتیں۔ (نور نے مہرین کو بتا دیا تھا کہ خدیجہ اور اس کے درمیان ذوالقرنین والی بات کھل چکی ہے) آخر ایک روز مہرین نے خدیجہ کو فون کر ہی دیا۔ حال احوال پوچھا۔ نور نے بھی تھوڑی سی بات کی۔ گفتگو کے آخر میں خدیجہ نے نور سے کہا۔ "نور! تمہارے پاس اور کون ہے؟"

"کوئی نہیں۔ مہرین تھی، باہر چلی گئی ہے۔"

خدیجہ بولی۔ "تم مجھ سے خفا تو نہیں ہو نور؟"

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ میں آپ سے کبھی خفا

نہیں ہوسکتی۔ میرے دل میں آپ کا ایک مقام بن چکا ہے۔بس تھوڑا سا افسوس ضرور ہے۔''

''کس بات کا؟''

''یہی کہ ماضی کی ایک بات ہمارے درمیان آ گئی ہے۔ہم پہلے کی طرح آزادانہ نہیں مل سکتیں لیکن کچھ بھی ہے خدیجہ! آپ دور رہ کر بھی میرے قریب ہی رہیں گی۔''

دوسری طرف کچھ دیر بوجھل سی خاموشی طاری رہی پھر خدیجہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔''نور! اس دن اسپتال میں، میں نے تم سے ایک فقرہ کہا تھا، اپنے اور تمہارے تعلق کے بارے میں...... تمہیں یاد ہے؟''

نور نے کہا۔''ہاں، آپ نے کہا تھا، میں اب بھی تمہارے لیے صرف خدیجہ ہوں۔ تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ ہمارے درمیان اور کوئی تعلق کبھی رکاوٹ نہیں بنے گا۔''

''میں اپنی اس بات پر قائم ہوں نور۔ بس تم سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔ یہ پہلی اور آخری بات ہوگی۔ اس کے بعد میں کبھی اس موضوع پر بات نہیں کروں گی۔اس موضوع کا صفحہ ہماری گفتگو کے باب میں سے ہمیشہ کے لیے علیٰحدہ ہو جائے گا۔''

''آپ...... کیا...... کہنا چاہتی ہیں؟''

''نور! ہر بہن کو اپنا بھائی پیارا ہی ہوتا ہے لیکن میں جو بات کہنے جارہی ہوں، یہ بالکل بے لاگ ہے...... وہ تمہیں دل کی گہرائیوں سے چاہتا ہے نور! اس کی محبت میں اتنی گہرائی ہے کہ کبھی کبھی میں ڈر جاتی ہوں۔ شاید تمہیں معلوم نہ ہو جب تم دونوں کے رشتے کی بات ختم ہوئی تو وہ کئی دن اپنے کمرے میں بند رہا تھا۔ اب کافی عرصہ گزر چکا ہے، وہ گھر والوں پر ظاہر تو کچھ نہیں کرتا لیکن میں جانتی ہوں کہ وہ دن رات تمہیں سوچتا ہے۔ پچھلے چند مہینوں میں کئی موقعے ایسے آئے جب اچھی جگہ اس کا رشتہ ہوسکتا تھا مگر وہ انکار کر دیتا ہے۔ میں اس کی رگ رگ سے واقف ہوں نور......''

خاموشی کا ایک وقفہ آیا۔ شاید خدیجہ منتظر تھی کہ نور ہنکارا بھرے گی مگر وہ چپ رہی۔ خدیجہ نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔''نور! ہم بچپن سے ایک دوسرے کے رازداں تھے۔ چھوٹی چھوٹی باتیں بھی ایک دوسرے سے شیئر کرتے تھے۔ مار بھی اکٹھے کھاتے اور ہمیں پیار بھی اکٹھا ہی ملتا تھا۔ میں اسے مذاق میں اخروٹ کہا کرتی تھی۔ جب وہ غصہ کرتا تو میں کہتی، ذوالقرنین! میں تمہاری تعریف کررہی ہوں۔ اخروٹ اوپر سے سخت لیکن اندر سے کتنا نرم ہوتا ہے۔ وہ کہتا کہ پھر تم خرمانی ہو، اوپر سے نرم لیکن اندر سے سخت۔ ہم ایک دوسرے کے مزاج شناس ہیں نور۔ وہ جتنا سنجیدہ اور کم گو ہے، اندر سے اتنا ہی خوش مزاج ہے۔ وہ تمہیں بہت پیار دے سکتا ہے نور...... تمہاری توقعات سے کہیں زیادہ اور یہ وقتی جذبہ نہیں ہوگا۔ اس میں اتنی پائیداری ہوگی کہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔ تم میری بات سن رہی ہونا؟''

نور ذرا توقف سے بولی۔''میں زیادہ کچھ کہنا نہیں چاہتی...... صرف یہی گزارش ہے کہ...... آپ...... اپنے وعدے پر قائم رہیے گا...... میرا مطلب ہے...... آپ جو کہنا چاہتی تھیں آپ نے کہہ دیا...... اور میں نے سن لیا۔ اب اگر ہم...... کبھی کوئی بات چیت کریں گے تو اس میں یہ موضوع نہیں آئے گا۔''

دوسری طرف چند سیکنڈ سناٹا سا رہا پھر خدیجہ کی بوجھل آواز ابھری۔''ٹھیک ہے نور! میں اپنے وعدے پر قائم ہوں لیکن تم اس بارے میں ایک بار سوچنا ضرور۔''

رسمی کلمات کے بعد گفتگو کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ ابھی وہ ریسیور رکھ ہی رہی تھی کہ تائی جان آ گئیں۔ آج کل ان کے رویے میں تھوڑی سی تبدیلی محسوس ہو رہی تھی۔ اب بھی ان کی پیشانی پر ہلکا سا بل موجود تھا۔ بولیں۔''کس سے بات کررہی تھیں؟''

''خدیجہ تھیں۔ ان کی خیر خیریت پوچھ رہی تھی۔''

تائی بولیں۔''دیکھو اب جبکہ ہمیں پتا چل گیا ہے کہ خدیجہ، اسی ذوالقرنین کی بہن ہے تو پھر ہمیں اس سے زیادہ میل جول نہیں رکھنا چاہیے۔''

''آپ اس بارے میں بے فکر رہیں تائی امی۔ اب بھی میں نے فون نہیں کیا تھا۔ مہرین نے حال چال پوچھنے کے لیے کال ملائی تھی۔''

تائی جان نے نور کی جانب پُرسوچ انداز میں دیکھا پھر اس کے قریب ہوگئیں۔ نرم لہجے میں بولیں۔''دوپہر کو جب تم سو رہی تھیں تو تمہاری کوچ میڈم فرحانہ کا فون بھی آیا تھا۔ تم سے بات کرنا چاہ رہی تھیں۔ میں نے کہا اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

نور خاموش بیٹھی رہی۔

تائی راحت نے دلار سے اس کا ہاتھ تھاما اور بولیں۔''نور! کئی کاموں میں اللہ کی مرضی شامل نہیں ہوتی۔ ہم کتنی بھی کوشش کرلیں وہ کام ہو نہیں پاتے۔ تم نے اپنے طور پر بہت کوشش کی ہے کھیل کے میدان میں۔ کوئی کسر اٹھا نہیں

رکھی۔ تمہارے تایا ابا نے بھی اپنی حیثیت اور ہمت سے بڑھ کر تمہارا ساتھ دیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب تمہیں ذرا دوسرے انداز میں سوچنا چاہیے۔ میری بات کا برا نہ ماننا۔ لڑکیوں کی شادی کی ایک عمر ہوتی ہے۔ تین چار سال کا ایک دور ہوتا ہے جس میں ان کا گھر بس جانا چاہیے، ورنہ مشکلیں بڑھ جاتی ہیں۔''

''آپ ...... کیا کہنا چاہتی ہیں تائی امی؟'' نور ان کی طرف دیکھے بغیر بولی۔

''تم ہمیں بہت پیاری ہو نور...... جس طرح یہ مہرین کا گھر ہے اسی طرح تمہارا بھی ہے لیکن ایک دن تو مہرین کو بھی جانا ہی ہے نا۔ میرا مشورہ ہے نور کہ اب تم گھر گرہستی کے بارے میں سوچو، ماشاء اللہ کوئی کمی نہیں ہے تم میں۔ اچھے سے اچھا رشتہ مل جائے گا۔''

نور نے تائی کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''کیا تایا ابا نے یہ کہا ہے؟''

''انہوں نے کہا تو نہیں لیکن میں جانتی ہوں وہ رات دن تمہاری بھلائی کے بارے میں سوچتے ہیں۔ وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ تمہارے اباجی کے ساتھ تمہاری صلح ہو۔ تمہارے کاموں میں تمہارے والد کی مرضی شامل ہو۔ اسی میں خیر ہے اور اسی میں دین و دنیا کی بھلائی بھی ہے۔''

''میں نے تو ہر طرح کوشش کر کے دیکھی ہے تائی امی۔ ان کی ناراضگی وقتی طور پر کچھ کم تو ہو جاتی ہے مگر دور نہیں ہوتی۔''

وہ عینک درست کرتے ہوئے بولیں۔ ''اور اس کی وجہ بھی تم اچھی طرح جانتی ہو جب تک تم یہ بھاگ دوڑ والا کام چھوڑو گی نہیں، ان کا دل تمہاری طرف سے صاف نہیں ہوگا۔ میرا تو مشورہ یہی ہے نور! اب تم میڈم فرحانہ سے صاف صاف بات کر لو۔ انہیں بتا دو کہ تم کلب میں نہیں آؤ گی۔ سیانے کہتے ہیں کہ باپ کی بددعا نہیں لینی چاہیے۔ وہ بڑی سخت ہوتی ہے۔ کبھی کبھی مجھے ڈر لگتا ہے کہ تم کسی ایسی ہی سختی کی لپیٹ میں نہ آ جاؤ۔ پلیز نور...... پلیز۔'' انہوں نے اس کا ہاتھ دبایا اور ملتجی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

نور نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس خالی خالی نظروں سے دیوار کو گھورتی رہی۔ تائی راحت کچھ دیر انتظار کرتی رہیں پھر جز بز سی ہو کر اٹھ کھڑی ہوئیں اور خاموشی سے باہر نکل گئیں۔

نور نے دروازہ اندر سے بند کیا اور بستر پر ڈھے سی گئی...... ''میں کیا کروں میرے خدا ...... کس طرف جاؤں؟'' وہ دل ہی دل میں پکاری۔

پتا نہیں کیوں جب وہ رننگ سے پیچھے ہٹنے کا سوچتی تھی اور ابا جان کی نصیحتوں کے سامنے سر جھکانے کا سوچتی تھی تو اس کے سامنے ایک دیوار سی کھڑی ہو جاتی تھی۔ یہ کیسی دیوار تھی؟ کیا یہ انا کی دیوار تھی؟ کیا یہ اس عزم کی دیوار تھی کہ اس نے کچھ بن کر دکھانا ہے اور تایا ابا کا سر لوگوں کے سامنے جھکنے نہیں دینا؟ کیا اس دیوار کی تعمیر اس کے اندر کے جنون سے ہوئی تھی، وہ جنون جو سو میٹر کے ٹریک سے وابستہ تھا؟

اگرچہ اس کا دل گواہی دیتا تھا کہ ابا جان اپنے نظریات پر بالکل درست ڈٹے ہوئے ہیں اور ان کی ناراضگی بھی بجا ہے اور وہ دل سے چاہتی تھی کہ ابا جان اس سے راضی ہو جائیں۔ اس کا مقصد ہرگز بھی ان کے نظریات وخیالات سے ٹکرانا نہیں تھا مگر وہ اپنے اندازِ زندگی کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔

وہ بہت دیر سوچتی رہی۔ کھڑکیوں سے باہر شام کے سائے تاریکی میں بدلنے لگے، ذہن تھک سا گیا۔ اس پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ وہ سوتے جاگتے کی درمیانی کیفیت میں تھی۔ اس نے تصور میں دیکھا۔ اسے دلہن بنایا گیا ہے۔ بھاری بھر کم چمکیلے کپڑے، زیورات، چوڑیاں، نیکلس، ناک میں نتھلی، چہرے پر میک اپ کی تہ۔ وہ سکڑی سمٹی بیٹھی ہے...... جس طرح اس کے گاؤں موراں والی کی لڑکیاں دلہن بن کر بیٹھتی تھیں۔ ایک ہیولا کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ وہ اس کا دلہا ہے، شاید ذوالقرنین ہے۔ ہاں ذوالقرنین ہی ہے۔ وہ اسے دبوچتا ہے، مسہری پر گراتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک تیز دھار چاپر (برچھا) ہے۔ وہ کہتا ہے...... چلو ہم ایک نئی زندگی کا آغاز کرتے ہیں۔ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں اور تم کو کھونا نہیں چاہتا۔ لہٰذا سب سے پہلے ہم اس جھگڑے کو ختم کرتے ہیں جو ہماری ازدواجی زندگی میں زہر گھول سکتا ہے۔ وہ بے دردی سے چاپر چلاتا ہے اور نور کے دونوں پاؤں ٹخنوں کے پاس سے کاٹ کر رکھ دیتا ہے۔ لرزتے ہوئے سفید پاؤں کمرے کے گلابی قالین پر پڑے ہیں۔

نور جیسے تڑپ کر اپنے تصور سے باہر آ گئی۔ اس کا چہرہ پسینے سے تر تھا۔ دل بے پناہ رفتار سے دھڑک رہا تھا۔ وہ واش روم میں چلی گئی۔ چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے، اپنی گردن کو بھگویا اور باہر آ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ سامنے ہی ایک دیوار پر فلورنس کی تصویر آویزاں تھی۔ امریکا کی وہی فلورنس جس نے 10.49 سیکنڈ کا عالمی ریکارڈ قائم کر رکھا تھا۔ اس تصویر میں وہ برق کی رفتار سے فنش لائن کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ہزاروں نگاہیں اس پر لگی ہوئی تھیں۔

وہ دیر تک تصویر کو دیکھتی رہی، پھر ایک گہری لمبی سانس لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے اندر پھر تحریک پیدا ہو رہی تھی۔ دور کہیں ریڈیو یا ٹیپ ریکارڈر پر کسی گیت کے

بول گونج رہے تھے۔ گر گر کے مصیبت میں سنبھلتے ہی رہیں گے...... جل جائیں مگر آگ پہ چلتے ہی رہیں گے۔

وہ ذرا جھک گئی اور اپنے گھٹنے کا جائزہ لینے کے لیے آہستہ آہستہ ٹانگ کو اوپر نیچے حرکت دینے لگی۔ وہ خود کو بہتر محسوس کر رہی تھی۔

☆☆☆

وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزر رہا تھا۔ صبح ہوتی تھی، شام ہوتی تھی۔ دن کا اجالا اور رات کا اندھیرا ایک دوسرے کا تعاقب کرتے رہے...... گھڑی کی سوئیاں متحرک رہیں...... اسی طرح چار ماہ گزر گئے۔ نور ابھی تک تایا ابا کے گھر میں تھی۔ تائی راحت کے رویے میں کچھ فرق آ گیا تھا مگر تایا ابا بدستور اس کے ساتھ جم کر کھڑے تھے۔ وہ ہر طرح اس کی حوصلہ افزائی کی کوشش کرتے۔ انہوں نے کبھی اسے رننگ سے دور جانے کا مشورہ نہیں دیا...... ہاں کسی وقت اتنا ضرور کہتے کہ وہ دیگر معاملات پر بھی توجہ دے اور اپنے والد سے اپنا فاصلہ گھٹانے کی کوشش کرے۔ وہ جیسے، نور سے خفا ہونا یا اس کی بات کو رد کرنا جانتے ہی نہیں تھے۔

دو ڈھائی ماہ کے مکمل آرام کے بعد نور ایک بار پھر رننگ میں حصہ لینا شروع کر چکی تھی۔ اب گھٹنا اس کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن رہا تھا۔ وہ اپنی پہلی فارم حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لگتا تھا کہ پہلے والی فارم حاصل ہو تو جائے گی مگر آسانی سے نہیں۔ وہ اب گاہے بگاہے ٹریننگ سینٹر (ایف اے ایس) بھی جاتی تھی۔ تایا ابا اسے چھوڑ کر آتے تھے اور واپس بھی لاتے تھے۔ وہ کسی عذر کو اس معمول کے راستے میں رکاوٹ نہیں بننے دیتے تھے......

بسمہ کو تقریری مقابلوں میں حصہ لینے کا شوق پیدا ہوا تھا اور وہ کئی جگہ جیتی بھی تھی۔ ابا جان کی غیر موجودگی میں دونوں بہنیں آپس میں مل بھی لیتی تھیں...... اور ایک دوسرے کے حالات سے آگاہ ہوتی تھیں۔

خدیجہ یا اس کے بھائی ذوالقرنین کے ساتھ پھر کوئی رابطہ نہیں ہوا تھا۔ ایک بار نور کا دل چاہا کہ وہ کم از کم فون کر لے اور خدیجہ کی خیریت دریافت کرے مگر پھر وہ فون کی طرف بڑھتے بڑھتے رک گئی۔ ایسے موقعوں پر عجیب سی کشمکش اس کے اندر نمودار ہو جاتی تھی۔

اور پھر ایک دن نور کی زندگی میں ایک اہم واقعہ رونما ہوا۔ اسے یوں لگا جیسے اس واقعے نے اسے اپنے والد سے کچھ اور دور کر دیا ہے۔ نور چھت پر بیٹھی پیپرز کی تیاری کر رہی تھی کہ تائی راحت اس کے پاس آ بیٹھیں۔ ان کا انداز دیکھ کر ہی نور کو اندازہ ہو گیا کہ کوئی اہم بات ہے۔ انہوں نے کہا۔ ”نور! تمہیں کچھ پتا چلا ہے اشفاق کے بارے میں؟“

”کیوں، کیا ہوا ہے ابا جان کو؟“ وہ چونک گئی۔

”وہ شادی کر رہے ہیں...... میرا مطلب ہے، نکاح کر رہے ہیں۔“

وہ کتنی دیر سناٹے میں رہی...... پھر بہ مشکل بولی۔ ”آپ سے کس نے کہا ہے؟“

”کہنے کی بات نہیں ہے۔ یہ کام ایک دو روز میں ہونے والا ہے۔ کوئی بیوہ عورت ہے۔ بچہ وغیرہ بھی نہیں ہے۔ امام مسجد صاحب کی کوئی عزیزہ ہے۔ انہوں نے ہی بات طے کرائی ہے۔“

”مگر...... وہ......“ نور کچھ بول نہ سکی۔ گڑبڑا کر رہ گئی۔ دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔

تائی راحت نے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ ”ذرا عجیب تو لگتا ہے مگر شرعی طور پر اس میں کوئی برائی بھی نہیں ہے۔ تمہاری امی کے انتقال کو کافی عرصہ ہو گیا ہے۔ انہوں نے ڈھائی تین سال بیماری کے بھی کاٹے۔ شاید اشفاق کو دکھ سکھ کے لیے کسی ساتھی کی ضرورت محسوس ہوتی ہو۔ تم بہنوں نے تو بیاہ کرا کے اپنے گھروں کو چلے جانا ہے۔“

اس کی آنکھوں میں نمی سی آ گئی۔ توقف سے بولی۔ ”شاید اسی لیے ابا جان کو ہمیں بیاہ دینے کی جلدی تھی۔“

”نہیں نور! ہر بات کو منفی انداز میں نہیں لیتے۔ یہ ٹھیک ہے کہ انہوں نے تمہارے رشتے کی بات چلانے میں بہت جلدی کی...... اور شاید وہ لڑکا تمہارے جوڑ کا بھی نہیں تھا مگر نیت تو ان کی ٹھیک ہی رہی ہو گی۔ وہ دراصل تمہاری مصروفیات سے بھی ڈرے ہوئے تھے اور...... دیکھا جائے تو ان مصروفیات نے تمہیں کوئی فائدہ بھی نہیں دیا۔ میں سمجھتی ہوں کہ اگر......“ پھر وہ ایک دم خاموش ہو گئیں۔ غالباً انہیں محسوس ہوا تھا کہ اس موقعے پر یہ نیا موضوع چھیڑنا مناسب نہیں۔

انہوں نے نور کو بتایا کہ وہ خود بھی اس خاتون سے ملی ہیں۔ ملنسار اور اچھے مزاج کی لگتی ہیں۔ تم تینوں بہنوں کے بارے میں تفصیل سے پوچھ رہی تھیں۔ تمہارے بارے میں تو پہلے سے ہی تھوڑا بہت جانتی ہیں۔ بتا رہی تھیں کہ کسی اخبار میں تمہاری تصویر بھی دیکھی تھی۔

تائی راحت باتیں کر رہی تھیں اور نور کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ پتا نہیں کیوں اسے عجیب سی شرمساری محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے والد دوسری شادی کر رہے تھے۔

یہ بڑا کٹھن مرحلہ تھا۔ آیا اور گزر گیا۔ ابا جان چند افراد کے ساتھ گئے اور زلفت نامی اس خاتون کے ساتھ نکاح کر کے اسے گھر لے آئے۔ پھپھو حاجرہ کے علاوہ تایا ابا بھی بوجھل دل کے ساتھ اس مختصر تقریب میں شریک ہوئے۔ ماموؤں نے شرکت نہیں کی۔ نور بھی اس وقت شریک ہوئی جب اس کی نئی امی گھر آ چکی تھیں۔ چھریرے جسم کی دراز قد کشمیری خاتون تھیں۔ عمر 35 اور 40 کے درمیان رہی ہوگی۔ اپنی اس ''نئی والدہ'' سے مل کر نور کو اتنا برا نہیں لگا جتنا وہ سمجھ رہی تھی۔ بیگم زلفت نے اسے پیار کیا، اپنے پاس بٹھایا اور محبت آمیز باتیں کرتی رہیں۔ پھر بھی کوشش کے باوجود نور زیادہ دیر اس کے پاس نہیں بیٹھ سکی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی مرحومہ والدہ جنہوں نے ساری عمر ابا جان کی جھڑکیاں سہی ہیں، کہیں آس پاس ہی موجود ہیں اور نم آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھ رہی ہیں۔

دو ڈھائی سال بعد یہ پہلا موقع تھا جب ابا جان نے اس کے سر پر پیار دیا اور نارمل انداز میں چند باتیں بھی کیں مگر نور جانتی تھی کہ یہ عارضی تبدیلی ہے۔ ابا جان کے اندر جو ناراضی جڑ پکڑ چکی ہے وہ اپنی جگہ قائم ہے۔ ایک عجیب سی دیوار حائل تھی باپ اور بیٹی کے درمیان۔

''میں مانتی ہوں ابا جان آپ اپنی جگہ بالکل درست ہیں...... شاید میں ہی غلط ہوں...... مگر...... مگر یہ کیسی جنگ میرے اندر ہوتی رہتی ہے۔ مجھے جو بھی صلاحیتیں ملی ہیں وہ بھی تو اللہ کی طرف سے تحفہ ہے میرے لیے۔ میں نے تو کبھی کوئی غلط قدم اٹھانا نہیں چاہا۔ ہمیشہ اللہ کی نیک بندی اور آپ کی فرماں بردار بیٹی بن کر رہنا چاہا...... معلوم نہیں قدرت کو مجھ سے کیا کام لینا ہے...... میرے پیارے ابا جان...... بس مجھے زندگی میں اس ایک لمحے کا انتظار ہے۔ جب میں آپ کے سامنے سرخرو ہو جاؤں گی۔''

اس دن گھر آ کر نور دیر تک روئی۔ اس کا رونا آنسوؤں کی صورت میں نہیں ہوتا تھا، بس اس کی آنکھوں کے کنارے جلتے رہتے تھے۔ دل میں ایک دھواں سا بھر جاتا تھا اور یہ دھواں آنکھوں تک آ کر شدید جلن میں بدل جاتا تھا۔

وہ تکیے میں چہرہ گھسا کر جیسے خیالوں ہی خیالوں میں بہ زبانِ خاموشی اپنے ابا جان سے مخاطب ہوتی...... ابو! میں تیسری تھی نا۔ اَن چاہی تھی نا...... آپ نے ہمیشہ مجھے خود سے کچھ فاصلے پر رکھا لیکن میں تو آپ کے بہت قریب تھی۔ ہر وقت آپ کی بانہوں میں سمائے رہنا چاہتی تھی۔ میں نے ہمیشہ آپ کی نظروں میں اہمیت حاصل کرنا چاہی۔ بچپن سے ہی اس کھوج میں رہتی تھی کہ میری کوئی بات آپ کو بھا جائے، آپ آپی بتول اور بسمہ سے نظر ہٹا کر میری طرف دیکھیں۔ جب آپ نہیں دیکھتے تھے تو میں اور سہارے ڈھونڈتی تھی، شاید تایا جان کی مہربان آغوش میں بھی آپ کی محبت ڈھونڈنے کی کوشش کرتی تھی۔ میری یہ حسرت میرے ساتھ ہی جوان ہوتی رہی ہے ابو! آپ کو کیا پتا میں نے آپ کی توجہ پانے کے لیے کیا کیا جتن کیے لیکن میرا ہر جتن مجھے آپ سے دور ہی لے گیا۔ میں چاہت کی نگاہ کو ترستی تھی لیکن آپ نے تو کبھی مجھ پر رحم کی نگاہ بھی نہ ڈالی۔

وہ دیر تک اسی انداز میں سسکتی رہی پھر سو گئی۔

اس کی نئی امی زلفت نے دو تین ہفتے میں ہی گھر میں اپنی جگہ بنالی۔ وہ نور اور بتول سمیت ہر ایک کے ساتھ خوش خلقی کے ساتھ پیش آتی تھیں۔ نور کو یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ اس کے اور ابا جان کے درمیان دوریاں ختم کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ ایک روز وہ نور کو زبردستی گھر لے گئیں۔ وہ شام تک وہاں رہی پھر ایک دن جب تایا ابا کی طبیعت کچھ ناساز تھی، وہ ان کی عیادت کے لیے آ گئیں۔ ابا جان بھی ان کے ساتھ تھے۔ وہ کوشش کرتی رہیں کہ نور کے ابا جان، نور سے بھی بات کریں اور ان دونوں کے درمیان جو ایک دیوار سی کھڑی ہو چکی ہے، وہ مسمار ہو۔ اس دن پہلی بار نور نے خود پر جبر کر کے ان کو ''چھوٹی امی'' بھی کہا۔

ایک روز جب تایا جان اپنے کام کے سلسلے میں گجرات گئے ہوئے تھے اور مہرین کالج میں تھی، چھوٹی امی ان کے گھر آئیں۔ انہوں نے اکیلے میں نور کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''نور! اس بات میں شک و شبے کی کوئی گنجائش نہیں کہ تمہارے ابو تم سے بہت محبت کرتے ہیں۔ بس تمہاری طرف سے ان کے دل کو ٹھیس پہنچی ہے اور یہ انہیں ہر وقت دکھی رکھتی ہے۔''

''کیا آپ سمجھتی ہیں کہ یہ ٹھیس پہنچنے میں میرا قصور ہے؟ کیا آپ جانتی ہیں کہ جس وقت میرے رشتے کی بات چلائی گئی اس وقت میری عمر کیا تھی؟''

''مجھے سب پتا ہے بٹیا جی! اور میں مانتی ہوں کہ اس معاملے میں ان سے ذرا جلدی ہوئی ہے مگر اب تو ان باتوں کو لمبا عرصہ گزر چکا ہے۔''

''لمبا عرصہ گزر چکا ہے پر مجھے معلوم ہے کہ ابا جان کے دل سے نکلا کچھ نہیں۔ وہ آج بھی یہی کہیں گے کہ میں موٹی سی چادر اوڑھ کر اور گھونگھٹ نکال کر گھر میں بیٹھ جاؤں اور چپ چاپ اسی جگہ شادی کر لوں جہاں وہ کہتے تھے۔''

''اس جگہ شادی والی بات تو میں بھی نہیں مانتی......

لیکن نور! جہاں تک میں والی بات ہے...... شاید اب تم بھی محسوس کرتی ہوگی کہ...... یہ سفر اب کافی لمبا ہوگیا ہے۔ تم نے ماشاء اللہ کافی کامیابیاں بھی حاصل کی ہیں مگر انسان کو وہ سب کچھ تو نہیں ملتا جس کی وہ تمنا کرتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ تم اس معاملے پر پھر غور کرو۔''

نور نے ذرا بے رخی سے کہا۔ ''چھوٹی امی! اگر آپ مجھے یہی سب کچھ سمجھانے آئی ہیں تو پلیز...... نہ سمجھائیں۔ آخر ایک دن تو مجھے کھیل چھوڑنا ہی ہے لیکن کب چھوڑوں گی، اس کا فیصلہ میں نے خود کرنا ہے۔''

''اچھا...... تم اپنے اندازے کے مطابق کوئی ٹائم بتادو کہ کب تک یہ سلسلہ ختم ہوجائے گا؟ میں تمہارے ابو کو مطمئن کرلوں گی۔''

''اگر انہوں نے اس شرط پر مطمئن ہونا ہے تو بے شک نہ ہوں۔'' وہ جھلا کر بولی۔ شاید اٹھ ہی کھڑی ہوتی مگر چھوٹی امی نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور پچکارنے لگیں پھر انہوں نے اسے اپنے ساتھ لگایا اور سر چوما، بولیں۔

''میرا بڑا دل چاہتا ہے کہ تمہیں بھی اسی طرح تمہارے ابا جان سے باتیں کرتے دیکھوں جس طرح بتول اور بسمہ کرتی ہیں۔ اللہ وہ دن جلدی لائے۔''

وہ اس سے بڑی بہن بتول اور اس کے شوہر کی باتیں کرنے لگیں اور بتانے لگیں کہ کس طرح وہ بتول کے شوہر غیاث کو راہ راست پر لانے کی کوشش کررہی ہیں۔ انہوں نے نور کی دادی کا ذکر بھی کیا اور کہا کہ وہ ذرا سخت مزاج تو ہیں لیکن دل کی بہت اچھی ہیں اور وہ بھی نور کو پھر سے اپنے گھر میں دیکھنا چاہتی ہیں۔

یہ اگلے روز کی بات ہے۔ نور اور مہرین بازار گئیں۔ کچھ شاپنگ کرنا تھی، سہ پہر کا وقت تھا۔ وہ شاہراہ قائداعظم کے ایک ریستوران میں جا کر سوپ پینے لگیں۔ دو نوعمر لڑکیوں نے نور کو پہچان لیا اور اس سے ایتھلیٹکس کے متعلق باتیں کرنے لگیں۔ اسی دوران میں نور کی نگاہ کھڑکی سے باہر گئی۔ پرجوش افراد کی ایک ریلی سڑک پر سے گزر رہی تھی۔ وہ نعرے لگا رہے تھے اور کتبے لہرا رہے تھے۔ نور دیکھ کر چونکی، ریلی میں سب سے آگے ذوالقرنین نظر آرہا تھا۔ اس کی سیاہ ڈاڑھی دھول میں اٹی ہوئی تھی اور بال پیشانی پر لہرا رہے تھے۔

وہ بلند بھاری آواز میں پکارا۔ ''پاکستان کا مطلب کیا؟'' نعرے لگاتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔

یہ غالباً اسی تنظیم اصلاح معاشرے کی ریلی تھی۔ کتبے اور بینرز کچھ اس قسم کے تھے...... فحاشی و عریانی نامنظور۔ امریکیوں، یہودیوں کے ایجنڈے نہیں چلیں گے۔

تیس چالیس سیکنڈ کے اندر ریلی کھڑکی کے سامنے سے گزر گئی اور اس کے عقب میں رینگتی ہوئی ٹریفک دکھائی دینے لگی۔ مہرین نے کہا۔ ''بھئی! یہ تو وہی ہے خدیجہ کا بھائی...... اس وقت تو پورا پورا لیڈر لگ رہا تھا۔''

''چلو پورا پورا لیڈر ہو یا آدھا آدھا، ہمیں کیا۔'' وہ سوپ کا چمچ لیتے ہوئے بولی۔

''ہمیں ہے نا بھئی۔ ریلی تو گزر گئی مگر ٹریفک پھنس گئی۔ ابھی ہم نکلیں گے تو کچھ نہ کچھ بھگتنا پڑے گا۔''

''بھگت لیں گے۔'' وہ بے پروائی سے بولی۔ پھر چند لمحے توقف کرکے کہا۔ ''خدیجہ سے تو بات نہیں ہوئی دوبارہ؟''

''تم نے ہی روک دیا تھا، میرا تو دل چاہ رہا تھا۔''

''دراصل دل تو میرا بھی چاہتا ہے۔ ایک عجیب سی انسیت محسوس ہوتی ہے ان سے لیکن وہ کیا کہتے ہیں کہ گلاب کے ساتھ کانٹا بھی ہو تو گلاب کے قریب جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔''

''لیکن کانٹا بھی تو گلاب کا بھائی ہی ہے نا۔ ویسے ہوسکتا ہے کہ وہ اتنا کانٹا بھی نہ ہو۔ جب تک بندے کو پرکھا نہ جائے اس کے بارے میں حتمی رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔ اب دیکھو نا...... وہ جو اسپورٹس صحافی فرہاد تھا شکل سے کیسا لگتا تھا، مگر نکلا کیا؟''

اس موضوع نے نور کو بدمزہ کردیا۔ اس نے برا سا منہ بنایا۔ مہرین بولی۔ ''لگتا ہے کہ فرہاد کے ذکر نے تمہارا منہ کڑوا کردیا ہے۔ کوئی میٹھی چیز منگواتے ہیں۔'' اس نے ویٹر کو بلایا۔

نور نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی جہاں ٹریفک رینگ رینگ کر گزر رہی تھی۔ جن دو کم سن لڑکیوں نے نور سے آٹو گراف لیے تھے، وہ دور ایک کرسی پر بیٹھی اشتیاق سے اسی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ وہ ان دونوں کے لیے بڑی اہم تھی۔ شاید ایک اسٹار کی حیثیت رکھتی ہو لیکن وہ جانتی تھی کہ یہ اسٹار کن کالے بادلوں کی زد میں ہے۔ پتا نہیں کیوں اب کبھی کبھی مایوسی بھی اس پر طاری ہونے لگتی تھی۔ محنت اور مسلسل محنت مگر وہ صلہ کہیں نہیں تھا جس کی وہ آرزومند تھی۔ پھر تایا ابا کی آواز کی بازگشت اس کے کانوں میں گونجی۔ نور کی ایک ہار کے موقع پر انہوں نے کہا تھا...... خدا کے گھر میں دیر ہوتی ہے اندھیر نہیں۔

اس شام جب وہ بازار سے گھر پہنچیں تو ٹی وی آن تھا۔ ان دنوں پی ٹی وی کے علاوہ بس دو چار چینلز ہی اور ہوتے تھے جن میں سی این این اور این ٹی ایم وغیرہ کے

علاوہ ایک اسپورٹ چینل بھی تھا۔ وہاں ایک نیوز چل رہی تھی۔ نیوز کاسٹر کہہ رہا تھا...... ''مسٹر فرہاد کا تعلق اسپورٹس نیوز کے شعبے سے ہے۔ وہ ایک بڑے میگزین کے اسپورٹس انچارج ہیں۔ ان کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا نوٹس لیا جانا چاہیے۔''

اس کے ساتھ ہی ایک ویڈیو کلپ چلایا گیا جس میں ایک اسٹریچر کو تیزی سے کسی اسپتال کی ایمرجنسی میں داخل کیا جارہا تھا۔ نیم بے ہوش فرہاد صاف پہچانا جارہا تھا۔ اس کے سر، دونوں بازوؤں اور ایک پاؤں پر پٹیاں تھیں۔ نیوز کاسٹر کہہ رہا تھا۔ ''میاں بیوی کے درمیان خلع کے کیس کی خبر دو دن پہلے آئی تھی۔ ایتھلیٹ شاہینہ کے والد کی طرف سے فرہاد پر کیس کیے جانے کا ذکر بھی آیا تھا لیکن آج جو واقعہ ہوا وہ زیادہ غیر متوقع ہے۔ شاہینہ کے بھائیوں کی طرف سے فرہاد کو زبردست تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ وہ گاڑی پر سوار جیل روڈ سے گزر رہا تھا۔ گاڑی روک کر اسے اور اس کے وکیل دوست کو باہر گھسیٹا گیا اور فرہاد کو سڑک پر لٹا کر بے دریغ مارا گیا۔ اس کے دونوں بازو ٹوٹ گئے ہیں۔ اس سے گاڑی بھی چھین لی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ہنڈا گاڑی بھی اسے سسرال کی طرف سے ہی ملی ہوئی تھی اور بیوی کے نام رجسٹرڈ تھی۔''

نور اور مہرین حیرت میں گم یہ سب کچھ سنتی رہیں۔ آج ہی ان کی گفتگو میں فرہاد کا ذکر آیا تھا اور آج ہی یہ خبر سننے میں آگئی تھی۔ رات تک اس بارے میں مزید تفصیل کا پتا بھی مختلف ذریعوں سے چلا۔ معلوم ہوا کہ شادی کے دو تین ماہ بعد ہی شاہینہ اور فرہاد میں اختلافات شروع ہوگئے تھے۔ فرہاد کی نگاہ سراسر شاہینہ کے والد کے روپے پیسے پر تھی۔ اس کے علاوہ وہ شادی شدہ ہونے کے باوجود ادھر ادھر منہ مارنے سے باز نہیں آرہا تھا۔ کئی بار کی تنبیہ اور وارننگ کے باوجود اس نے اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ بالآخر نتیجہ خلع کے مطالبے، دیگر کیسز اور فرہاد کی شدید درگت کی صورت میں نکلا۔

کمرے میں بند نور دیر تک سوچتی رہی۔ اسے یوں لگا جیسے کافی عرصے بعد بالآخر اس کے نہایت شدید اور توہین آمیز دکھ کا مداوا ہوگیا ہے۔ فرہاد نے جس طرح اسے اپنے کھیل کا حصہ بنایا اور مطلب نکلنے کے بعد منہ پھیرا، وہ سب نور کے لیے ایک کربناک تجربہ تھا اور یہی کربناکی تھی جس نے اسے اپنے کیریئر کے نہایت اہم دور میں ایک حوصلہ شکن شکست سے دوچار کیا تھا۔

ایک بار پھر تایا ابا کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے...... اللہ کے گھر میں دیر ہے اندھیر نہیں۔

ہاں یہاں بھی شاید دیر تو ہوئی تھی مگر مکافات کا قانون حرکت میں آیا تھا۔ اس نے نیم دراز ہوکر تکیے سے ٹیک لگائی اور سوچنے لگی...... کیا اس کی مسلسل محنت، جانفشانی اور غیر مشروط کمٹ منٹ کے حوالے سے بھی کوئی قانون قدرت حرکت میں آئے گا؟ اسے اور اس کے تایا ابا کو کوئی صلہ ملے گا؟

اگلے روز تایا ابا سے بھی اس بارے میں بات ہوئی۔ انہوں نے کہیں اخبار میں یہ خبر دیکھی تھی۔ بولے۔ ''نور! تمہیں پتا چلا ہے اس فرہاد کے بارے میں؟''

نور نے اثبات میں جواب دیا اور ٹی وی کی نیوز کا ذکر کیا۔ وہ گہری سانس لے کر بولے۔ ''بندے کی اصلیت کا پتا اس وقت چلتا ہے جب اس کے ساتھ واسطہ پڑتا ہے۔ اس لڑکے نے کلینک کے سلسلے میں مجھے بہت دھوکا دیا۔ پچیس تیس ہزار روپیہ بھی لے گیا مگر زیادہ تکلیف اس ذہنی پریشانی کی ہے جو اس کی وجہ سے ہوئی۔''

نور اب تایا ابا کو کیا بتاتی کہ وہ جس دھوکے کا ذکر کررہے ہیں وہ اس کا عشر عشیر بھی نہیں جو اس شخص نے خود اسے دیا تھا، اپنے مطلب کے لیے اسے کھلونا بنا ڈالا تھا۔ تایا ابا نے اسے سوچ میں گم دیکھ کر موضوع بدلا۔ ''تمہیں پتا ہے، امنالے کا میلا آنے والا ہے؟''

''کب؟'' وہ بے ساختہ بولی۔

انہوں نے کیلنڈر پر نگاہ دوڑائی اور حساب لگا کر بولے۔ ''بس تین ہفتے رہ گئے ہیں تقریباً۔ میں تو کہتا ہوں پروگرام بنالو۔ پچھلی دفعہ بھی اچھا وقت گزرا تھا تم لوگوں کا۔''

امنالے کا ذکر ہی ایسا تھا کہ بچپن اور لڑکپن کی بے شمار سنہری یادوں کو ہانک کر دل و دماغ کے باڑے میں لے آتا تھا۔ یادوں کے اس احاطے میں سرما کی سنہری دھوپ ہوتی تھی، ڈھول کی تھاپ، گھوڑوں کے رقص، جھولے، تماشے، پکوانوں کی مہک، کشتیاں، کبڈیاں، رنگین آنچل، دلنشیں گیت...... اور پتا نہیں کیا کچھ۔

نور تناؤ اور پژمردگی کے عجیب دور سے گزر رہی تھی (اس کی نوکری کی بنیاد ایتھلیٹکس پر تھی اور کسی وقت یہ نوکری بھی خطرے میں محسوس ہوتی تھی)۔ امنالے کے نام پر اس کا دل دھڑکا اور سینے میں امنگ سی جاگی۔ اس نے کہا۔ ''تایا ابا! دل تو چاہتا ہے لیکن......''

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔ بس تم پروگرام بناؤ، سب

ٹھیک ہو جائے گا۔‘‘

’’دادی اماں بھی کچھ بیمار ہیں۔‘‘ نور نے کہا۔

’’تو ان کے علاج کی بات ہی تو کر رہا ہوں میں...... دیکھنا میلے پر جانے کے لیے وہ کیسے بستر سے اٹھتی ہیں اور تیاری کرتی ہیں۔‘‘

پتا نہیں کیوں نومبر دسمبر کے مہینے ہمیشہ سے نور کے لیے کچھ اداسی لے کر آتے تھے۔ سردی بڑھ جاتی تھی۔ شامیں چھوٹی ہو جاتی تھیں۔ لوگ دیر تک کمروں میں بند رہتے تھے، کہرا مناظر کو ڈھانپتا تھا اور درخت بے لباس نظر آتے تھے۔ آج کل بھی وہ کچھ ایسی ہی کیفیت محسوس کر رہی تھی۔ کئی دن سے آسمان پر بن بارش کے بادل تھے۔ سورج شکل نہیں دکھا رہا تھا۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ آج اسے پریکٹس کے لیے جانا تھا مگر دل نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ کمبل اوڑھ کر کرسی پر بیٹھی رہی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر کھڑکی کا پردہ تھوڑا سا وا کیا۔ باہر باغیچے میں حسین بوٹے سر جھکائے خاموش کھڑے تھے۔ کیاریوں میں گیندے اور چائنا روز کے پھول بھی جیسے سردی سے سکڑے سمٹے تھے۔ اسے وہ منظر یاد آ گیا جو دو دن پہلے اس نے اور مہرین نے شاہراہ قائداعظم کے ریسٹوران میں بیٹھے دیکھا تھا۔ وہ چھوٹا سا جلوس جو نعرے لگاتا اور کتبے لہراتا کھڑکی کے سامنے سے گزرا تھا۔ اس میں سے سب آگے وہ تھا۔ اس کا چہرہ غصے اور جوش سے تمتما رہا تھا۔ وہ بار بار اپنا مکا فضا میں لہراتا اور نعرہ بلند کرتا تھا...... پاکستان کا مطلب کیا؟ آواز میں ٹھہراؤ تھا اور وہ سچائی تھی جو اپنے موقف کے حوالے سے اس کے اندر موجود تھی۔ اپنی تمام تر سخت گیری کے باوجود وہ کھرا مخلص دکھائی دیتا تھا...... اور اس کی بہن خدیجہ نے کہا تھا کہ وہ اندر سے اخروٹ کے مغز کی طرح نرم ہے۔ یہ ایک بہن کے تاثرات ایک بھائی کے بارے میں تھے اور ابھی تایا ابا نے کہا تھا...... حقیقت کا پتا تو اسی وقت چلتا ہے جب کسی انسان سے مستقل طور پر واسطہ پڑتا ہے۔

خدیجہ کی کہی ہوئی باتیں نور کے کانوں میں گونجنے لگیں۔ اس نے کہا تھا کہ وہ یہ باتیں پہلی اور آخری بار کہے گی اور واقعی تب سے اب تک اس نے دوبارہ اس موضوع پر بات نہیں کی تھی بلکہ اتفاق یہ ہوا تھا کہ اب تک ان کی بات ہی نہیں ہو پائی تھی۔ خدیجہ نے کہا تھا...... نور، وہ تم سے بہت محبت کرتا ہے۔ دل کی اتھاہ گہرائیوں سے اور میں دعوے سے کہتی ہوں کہ یہ کوئی عارضی یا سطحی جذبہ نہیں ہے۔ میں اس کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ وہ دن رات تمہیں سوچتا ہے...... تمہارے حوالے سے کسی اچھے وقت کا انتظار کرتا ہے۔

نور نے ایک آہ بھری اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی۔ خدیجہ کی باتوں کے حوالے سے وہ کبھی کبھی بے چین سی ہو جاتی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ کوئی واقعی اس کا انتظار کر رہا ہے۔ اس کی آس لگائے بیٹھا ہے، اس کی نسبت سے کسی انہونی کی راہ دیکھ رہا ہے۔

وہ کیوں کر رہا تھا ایسا؟ کیوں سراب کے پیچھے دوڑ رہا تھا؟ نور کو اپنے دل پر بہت بوجھ محسوس ہونے لگا۔ وہ جیسے اندر سے جھنجلا سی گئی۔ وہ کیوں یہ بات سمجھ نہیں جاتا کہ نور کے دل میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ وہ دو مختلف مزاجوں اور مختلف سوچوں کے انسان ہیں۔ وہ نہیں مل سکتے...... اور انہیں ملنا بھی نہیں چاہیے۔

پتا نہیں کیوں نور کا دل چاہا کہ وہ ایک بار اس سے بات کرے...... ٹیلی فون پر ہی سہی مگر اس سے رابطہ کرے۔ اسے سمجھائے کہ وہ کسی انہونی کی آس نہ لگائے۔ جو وہ سوچ رہا ہے کبھی نہیں ہوگا۔ اس کے والدین اور اس کی بہن جلد از جلد اس کے سر پر سہرا دیکھنا چاہتے ہیں، وہ ان کا دل نہ دکھائے۔

یہ عصر کا وقت تھا۔ وہ کافی دیر سوچتی رہی۔ اس نے اپنے آپ کو مضبوط کیا اور پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اماں لے کے میلے پر جانے کی تیاری ہو رہی تھی۔ اسے بھی اپنے لیے کچھ چیزیں خریدنے اپنی کالونی کی مارکیٹ تک جانا تھا۔ اس نے گرم شال لی۔ اونی ٹوپی پہنی اور شولڈر بیگ لے کر قریبی مارکیٹ کو چل پڑی۔ اس کے پاس ذوالقرنین کی دکان کا نمبر موجود تھا۔ اسے پتا تھا کہ اس وقت وہ دکان پر ہی ہوگا۔

وہ ایک پی سی او باکس کے اندر چلی گئی۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا مگر اس نے تہیہ کر رکھا تھا کہ وہ ٹھوس بے لچک لہجے میں وہ سب کچھ کہہ دے گی جو اس نے سوچ رکھا ہے اور بات کو مزید طول دیے بغیر فون بند کر دے گی۔

اس نے نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف گھنٹی بجنا شروع ہوئی پھر فون اٹھایا گیا۔ اردو بازار کا شور کانوں میں گونجا، تب ذوالقرنین کی بھاری مگر ٹھہری ہوئی آواز ابھری۔ ’’ہیلو...... ہیلو...... کون؟‘‘

پتا نہیں یہ کیسے لمحے تھے۔ نور کوشش کے باوجود بول نہیں سکی۔ وہ جو نہایت روکھے پھیکے لہجے میں ذوالقرنین کی مکمل حوصلہ شکنی کا ارادہ رکھتی تھی، ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکی۔ چند سیکنڈ توقف کے بعد آواز دوبارہ ابھری۔

''ہیلو، کون بول رہا ہے؟ کس سے بات کرنی ہے؟''

نور نے ایک بار پھر کوشش کی مگر گلے میں پھندا سا تھا۔ کبھی نہ گھبرانے والی اور شدید ترین تناؤ میں بھی خود کو یکسو رکھنے والی نور منتشر سی ہوگئی تھی۔ اس نے ریسیور کو مضبوطی سے تھاما۔ کچھ کہنے کے لیے [illegible] مزید کچھ کہنے سے پہلے ہی ایک دم ریسیور [illegible] دیا گیا۔

وہ قریباً ایک منٹ تک وہاں گم صم کھڑی رہی پھر [illegible] نکل آئی، اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا ہے، اس کے ذہن میں ابھی تک ہلچل تھی۔ وہ یونہی گارمنٹس کی ایک دکان کے سامنے جا کھڑی ہوئی اور شوکیس میں جھانکنے لگی۔ اس نے اپنے دل کو سخت کرنا چاہا۔ شعوری طور پر ذوالقرنین کی وہ ساری باتیں یاد کیں جو اسے بری لگتی تھیں۔ اس کا Tipical لباس، اس کا بے لچک لب ولہجہ، اس کی گھنی بھویں جنہیں وہ غصے کے وقت اچکا تا تھا اور اس کا وہ رویہ جو خواتین کو کھیل کے میدان اور اس طرح کی دیگر مصروفیات سے دور رکھنے کے حوالے سے تھا۔

وہ ایک بار پھر پی سی او کے کیبن کی طرف بڑھی۔ ایک خاتون اپنی بات ختم کر کے باہر نکل رہی تھی۔ نور اندر چلی گئی اور دروازہ بند کرلیا، اس نے ریسیور اٹھایا۔ اچھی طرح کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ دل ایک بار پھر شدت سے دھڑکنے لگا تھا۔ اس نے ہمت کر کے ڈائل پر انگلی رکھی...... لیکن...... آدھا نمبر ڈائل کرنے کے بعد ہی ایک بار پھر اس نے ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا اور تیزی سے باہر نکل آئی۔ وہ بے خوف لڑکی تھی اور دل کی بات کہہ دیا کرتی تھی لیکن آج پتا نہیں کہ اسے کیا ہوا تھا؟

☆☆☆

ذوالقرنین اپنی شاپ پر گم صم بیٹھا تھا۔ ابھی تھوڑی ہی دیر پہلے اسے ایک فون کال آئی تھی۔ اس نے ریسیور اٹھا کر کئی بار ہیلو کہا تھا مگر جواب ندارد تھا بس سانسوں کی آواز آتی رہی تھی۔ تب اس نے دوبارہ پوچھا تھا کہ کون بول رہا ہے۔ آواز اس مرتبہ بھی نہیں آئی تھی۔ ہاں کسی کلائی کے بینگل ٹکرانے کی مدھم صدا ضرور ابھری تھی اور فون بند کردیا گیا تھا۔ پتا نہیں کیوں ذوالقرنین کو محسوس ہو رہا تھا کہ یہ فون کسی اور کی طرف سے نہیں، نور یا اس کی تایا زاد بہن مہرین کی طرف سے تھا۔ زیادہ امکان یہی تھا کہ یہ نور کی طرف سے ہوگا لیکن وہ کچھ بولی نہیں تھی۔ اگر وہ نور ہی تھی تو کیا کہنا چاہتی تھی؟ ذوالقرنین کے ذہن میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔

اسے یاد آیا کہ خدیجہ کالج گئی ہوئی ہے۔ وہاں فیئر ویل کی ایک تقریب تھی۔ وہ جب بھی کسی ایسی تقریب میں جاتی تھی، ذوالقرنین کو تشویش ہونے لگتی تھی۔ چند مہینے پہلے ایک ایسی تقریب میں ہی تو خدیجہ کا بازو ٹوٹا تھا اور چوٹیں لگی تھیں۔ خدا کا شکر تھا کہ اب یہ معاملہ ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ نشو بجلی یا اس کے گروپ کی طرف سے کم از کم اب تک تو کوئی [illegible] خانی نہیں ہوئی تھی۔ پھر بھی ذوالقرنین کو ایسے موقعوں پر [illegible] جاتا تھا۔ اس نے گھر فون کیا۔ والدہ نے بتایا [illegible] وہ ذرا بے چینی سے دکان کے اندر ہی [illegible] فون کی گھنٹی بج گئی۔ دوسری طرف خدیجہ ہی [illegible] بولا۔

''واپسی میں دیر لگائی ہو تو کسی طرح [illegible] تمہیں معلوم ہے تمہارا بھائی پنجوں پر کھڑا ہو کر تمہاری راہ دیکھتا رہتا ہے۔''

''سوری۔ بس رش کی وجہ سے تھوڑا ٹائم لگ گیا۔ تم نے فون کیا تھا؟''

''ہاں، تمہاری واپسی کا پوچھنا تھا...... اور ایک دوسری بات بھی کرنا تھی۔''

''دوسری بات؟ کوئی لڑکی تو نہیں دیکھ لی؟'' اس نے حسبِ عادت چھیڑا۔

''دیکھی تو نہیں سنی ہے......اور مجھے لگتا ہے کہ وہ نور ہی تھی۔''

وہ چونک کر بولی۔ ''کیا مطلب......کوئی......فون آیا تھا؟''

''ہاں، آیا تو فون ہی تھا مگر دوسری طرف سے صرف سانسوں کی آواز ہی آتی رہی۔''

''اور سانسوں کی آواز سے جناب کو پتا چل گیا کہ وہ نور تھی؟''

''ہاں۔ میرے اندازے کے مطابق یہ فون اس مارکیٹ سے کیا گیا تھا جس کے پاس انکل اشفاق کی رہائش ہے۔ اب تم پوچھوگی کہ یہ نتیجہ میں نے کیسے نکالا؟''

''بالکل۔ بات تو پوچھنے والی ہے۔''

''مارکیٹ کی جامع مسجد میں عصر کی اذان ہو رہی تھی۔ میں وہاں کے مؤذن عبید اللہ صاحب کو اور ان کی اذان کو بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہاں کئی بار جمعہ پڑھا ہے، کیا سمجھیں؟'' ذوالقرنین معنی خیز لہجے میں بولا۔

''تمہیں تو سی آئی ڈی میں بھرتی ہونا چاہیے تھا۔'' خدیجہ نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا پھر ذرا توقف سے بولی۔ ''لیکن یہ ضروری تو نہیں ہے نا کہ وہ نور ہی ہو۔''

''میرا قیافہ تو یہی ہے کہ وہ نور یا مہرین میں سے کوئی

ایک تھی۔ باقی واللہ علم بالصواب۔'' تھوڑے سے توقف کے بعد اس نے دوبارہ کہا۔''خدیجہ، کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ تم ایک بار اور اس سے مل لو۔ ہوسکتا ہے کہ وہ کچھ کہنا چاہتی ہو لیکن کہہ نہ پارہی ہو۔''

''نہیں ذوالقرنین، میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اس حوالے سے پہلی اور آخری بار اس سے بات کررہی ہوں۔ میں اپنے وعدے پر قائم رہنا چاہتی ہوں...... اور...... ویسے بھی ذوالقرنین! سیانے کہتے ہیں کہ محبت کو آزاد چھوڑ دینا چاہیے، بغیر شرط کے...... بغیر کسی بندھن کے...... اگر وہ واقعی محبت ہوگی تو کسی نہ کسی طور آپ کی طرف پلٹ آئے گی۔ ہم نے اس سے جو بھی کہنا ہے کہہ دیا ہے۔ اب انگریزی کے محاورے کے مطابق گینداس کی کورٹ میں ہے۔''

وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر فون پر اس نوع کی مزید گفتگو مناسب نہیں تھی۔ وہ خاموش رہا۔ اس کی خاموشی کو محسوس کر کے خدیجہ نے کہا۔''آج کیا تاریخ ہے؟'' ذوالقرنین نے بتایا کہ گیارہ ہے۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔

''کچھ یاد آیا تمہیں؟ آٹھ دس دن بعد امنالے کا میلا آنے والا ہے۔ پچھلے سال نور کے اباجی نے تمہیں میلا دیکھنے کی دعوت دی تھی۔ میں تو کہتی ہوں اس بار ہو آؤ وہاں سے...... ہوسکتا ہے کہ کوئی اچھی بات ہوجائے۔''

''میرے خیال میں تو یہ بے کار کی باتیں ہیں......''

شاید وہ اور بھی کچھ کہتا مگر لائن میں شور اور کھڑکھڑاہٹ شروع ہوگئی۔

اس نے فون بند کردیا۔ دل میں ایک بے قراری سی تھی۔ اگر وہ واقعی نور یا مہرین کی کال تھی تو ہوسکتا تھا کہ دوبارہ کال آئے۔ کل یا پرسوں...... یاممکن ہے کہ ابھی کچھ دیر بعد۔ اس نے سیاہ رنگ کے فون سیٹ کا ریسیور اچھی طرح کریڈل پر جمایا اور جیسے منتظر نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ کیوں اسے بھول نہیں پاتا؟ کیوں ہر گھڑی اس کا انتظار رہتا ہے؟ وہ کوئی عاشق مزاج کالجیٹ لڑکا نہیں تھا...... وہ قاری ذوالقرنین تھا۔ اس کی ایک پہچان تھی۔ اس کے گھرانے کی پہچان تھی۔ لوگ ان کی نجابت کی مثالیں دیتے تھے اور جو کچھ ہوا اس میں ذوالقرنین کا کوئی قصور بھی نہیں تھا۔ نور اس کی سوچوں اور نظروں میں آنے والی پہلی لڑکی تھی اور وہ بھی صرف اس لیے آئی تھی کہ اس کے والدین نے اسے ذوالقرنین کے لیے پسند کیا تھا۔ نور اس کو دکھائی گئی تھی۔ اس کی باتیں اسے بتائی گئی تھیں۔

ذوالقرنین کے دل میں اس کے لیے جگہ بنائی گئی اور جب جھکی جھکی نگاہوں والے خاموش طبع ذوالقرنین کے دل میں اس کی جگہ بن گئی تھی تو سب الٹ پلٹ ہوگیا تھا اور اب وہ بے پناہ کوشش کے باوجود اس کی سوچوں سے چھٹکارا حاصل نہیں کرپارہا تھا۔ بے شک وہ اس کے مزاج کی نہیں تھی، بے شک اس کی مصروفیات ذوالقرنین کو پسند نہیں تھیں لیکن وہ اس سے محبت کرنے لگا تھا۔ محبت ایسی ہی بے دلیل اور منہ زور ہوتی ہے۔ وہ اپنے راستے اور اپنے اصول ضابطے خود مقرر کرتی ہے۔

ایک گاہک کی آواز نے اسے خیالوں سے چونکایا۔

''بیٹا ذوالقرنین! سیرت امام زین العابدین ہوگی آپ کے پاس؟'' یہ ایک قریبی مدرسے کے استاد تھے اور ذوالقرنین کے پرانے کسٹمر۔

''جی سر! ایک کاپی موجود ہے۔ اوپر پڑی ہے، میں دیکھتا ہوں۔'' ذوالقرنین نے کہا اور سیڑھی چڑھ کر دکان کے بالائی حصے کی طرف گیا۔ ابھی وہ پانچ چھ سیڑھیاں ہی چڑھا تھا کہ فون کی گھنٹی پھر بج اٹھی۔ وہ بڑا باتحمل نوجوان تھا مگر گھنٹی کا بجنا اور نور کا خیال ذہن میں آنا اتنا ہی ہیجان خیز تھا کہ وہ جلدی سے پلٹا۔ شلوار کے پائنچے میں اس کا پاؤں الجھا اور وہ چار پانچ زینوں سے لڑھکتا ہوا نیچے آیا۔ اس کے سر پر ٹھیک ٹھاک چوٹ لگی اور ناک سے خون رسنے لگا۔ کہنیوں پر بھی گہری خراشیں آئی تھیں۔ اسے قریبی کلینک میں پہنچایا گیا۔ ڈاکٹر نے چیک کیا اور تسلی دی۔ اس کی ایک آنکھ خون کی طرح سرخ ہوگئی تھی۔ پیشانی پر پٹی بندھوا کر اور انجکشن وغیرہ لگوا کر وہ دوبارہ دکان پر آگیا۔

اردگرد کے دکاندار حال احوال پوچھنے کے لیے جمع ہوگئے۔ ایک نے کہا۔''یار! تم تو ہمارے بازار کے سب سے رکھ رکھاؤ والے دکاندار ہو، دکان میں دو سیلز مین موجود تھے پھر خود کیوں سیڑھی چڑھ گئے اور اگر چڑھ ہی گئے تھے تو پھر چھلانگ کیوں لگادی؟''

دوسرے نے کہا۔''کوئی ضروری فون آگیا تھا۔ جناب پلٹے تو گر گئے۔''

ایک بے تکلف ہمسائے نے کہا۔''کوئی اور ہوتا تو اس بات کا بھی بتنگڑ بنتا کہ ایسا کون سا ضروری فون تھا مگر بھئی، تم پر شک کرنا تو ایسے ہی ہے جیسے کسی میاں مٹھو پر شک کیا جائے کہ وہ رات کو مرغ کی طرح اذان دیتا ہے۔''

دوست ادھر اُدھر کی باتیں کررہے تھے اور وہ اپنے اندر ہی اندر بے پناہ خجل ہورہا تھا۔ گھر میں کچھ نہیں بتایا گیا

تھا۔ اس کی طبیعت ذرا بہتر ہوئی تو اس نے ایک پڑوسی دکاندار کو ساتھ لیا اور اپنی ایف ایکس خود ہی ڈرائیو کر کے گھر چلا گیا۔

......اگلے روز رات کو اسے خاصا تیز بخار ہو گیا۔ تسلی کے لیے سی ٹی اسکین وغیرہ بھی کرا لیا گیا۔ اوکے رپورٹ ملی۔ ڈاکٹر نے کہا دو تین دن تک بخار چلے گا...... اگلے روز بخار نسبتاً کم تھا مگر غنودگی بدستور تھی۔ رات کو ذوالقرنین کے کمرے میں خدیجہ تیمارداری کے لیے موجود تھی۔ رات گئے بخار کی مدہوشی میں ذوالقرنین نے دو تین بار کچھ کہا۔ خدیجہ نے اٹھ کر سنا۔ اس کا بھائی بہت مدھم آواز میں دلفگار لہجے میں ''نور'' کا نام لے رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

اس نے نور سے وعدہ کر رکھا تھا کہ وہ اب کبھی اس سے اپنے بھائی کے حوالے سے بات نہیں کرے گی اور وعدہ ایفا کرنا خدیجہ کی خوبی تھی لیکن وہ کم از کم یہ تو کر سکتی تھی کہ مہرین کو فون کرتی اور اسے ذوالقرنین کی چوٹ کے بارے میں بتاتی۔ وہ جانتی تھی کہ مہرین رات کو دیر تک جاگتی ہے۔ اس کو فون کرنے کے لیے وہ فون سیٹ کے پاس آن بیٹھی۔ دل و دماغ میں کشمکش سی تھی۔ کافی دیر تک فون کے پاس بیٹھنے اور سوچنے کے بعد وہ نفی میں سر ہلا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے اندر سے یہ آواز آ رہی تھی کہ کچھ باتوں کا فیصلہ وقت پر چھوڑ دیا جائے۔

☆☆☆

نور کمرے میں گم صم سی بیٹھی تھی۔ نئی ملازمہ ابھی ابھی کمرے میں صفائی کر کے گئی تھی۔ چاندی نام تھا۔ یہ مشکل پچیس چھبیس سال کی رہی ہو گی۔ قبول صورت تھی لیکن بڑی بجھی بجھی اور ڈری ڈری سی۔ ماتھے پر چوٹ کا پرانا نشان تھا، تھوڑا سا لنگڑاتی بھی تھی۔ کل تائی امی نے بتایا تھا کہ اس کا شوہر پچپن سال سے زیادہ عمر کا ہے اور اس کو بہت مارتا پیٹتا ہے۔

تائی امی کمرے میں آئیں تو نور نے پوچھا کہ یہ کیوں اس کی مار کھاتی ہے؟

تائی بولیں۔ ''دور دراز علاقے کے رہنے والے ہیں۔ راجن پور کے آس پاس۔ اس کی شادی زبردستی کی گئی تھی۔''

''وہ کیوں؟''

''کوئی لمبا چکر تھا۔ اس کے بھتیجے نے کسی لڑکی کو بھگایا تھا۔ لڑکی والوں نے پنچایت بلائی۔ ایسی پنچایتوں میں بڑے بڑے منحوس فیصلے ہوتے ہیں۔ فیصلہ یہ ہوا کہ ملزم لڑکے کی بہن کی شادی لڑکی کے باپ سے کر دی جائے لیکن دوسری پارٹی نہیں مانی۔ وہ لڑکی بہت چھوٹی تھی مشکل سے چودہ پندرہ سال کی۔''

''تو پھر؟''

''پھر ملزم پارٹی نے آفر کی کہ ہم لڑکے کی چھوٹی پھوپی چاندی کا رشتہ دے دیتے ہیں۔ چاندی بھی اچھی شکل کی تھی مگر اس کو پہلے شوہر سے طلاق ہو چکی تھی، بچہ وغیرہ کوئی نہیں تھا۔ اس بار مدعی پارٹی نہیں مانی۔ انہوں نے کہا ہمیں کنواری کے بدلے کنواری چاہیے۔ اندازہ لگاؤ ان لوگوں کی جاہلیت کا۔ مرد عورت کا رشتہ کتنا خوبصورت اور خوشبودار ہوتا ہے لیکن ایسے لوگ اسے بدلے کی آگ سے گھناؤنا اور مکروہ بنا دیتے ہیں۔''

''پھر کیا ہوا؟'' نور نے پوچھا۔

''وہی سودے بازی۔ معتبر لوگوں کے بیچ میں پڑنے سے مدعی پارٹی چاندی کے رشتے پر مان تو گئی مگر ساتھ میں دو بھینسوں اور نقد رقم کی صورت میں بہت سا جرمانہ بھی وصول کیا۔ اب یہ بے چاری اپنے سے دوگنا عمر کے شوہر کے ساتھ بسر کر رہی ہے۔ وہ پکا جواری ہے، بہت کچھ ہار چکا ہے۔ اب گھر میں پڑا اینٹھتا ہے۔ یہ بے چاری گھروں میں کام کرتی ہے۔''

''یعنی اپنے بھتیجے کے کیے کی سزا بھگت رہی ہے؟''

''بالکل۔ ایسی کہانیاں ہمارے دیہاتوں اور گوٹھوں میں ہر جگہ بکھری ہوئی ہیں نور...... کنواری کے بدلے کنواری۔ بیاہتا کے بدلے بیاہتا۔ یا ایک کنواری کے بدلے دو بیاہتا...... سن کر اور دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ہم پتھر کے زمانے میں بستے ہیں اور ہم پر جنگل کے قانون لاگو ہوتے ہیں۔''

''ایسا قانون جس میں مردوں کے کیے ہوئے کی سزائیں بھی صرف عورتوں کو ہی ملتی ہیں۔'' نور نے تائیدی انداز میں کہا۔

''بالکل...... اب یہی چاندی والا معاملہ ہی دیکھو۔ اس کا کیا قصور تھا؟ یہ بیٹھی بٹھائی اس گھیرے میں آ گئی۔ لڑکے کی پھپو کی حیثیت سے اسے قربانی دینا پڑی۔ اچھی صورت کی تھی، جوان تھی، بھگائے جانے والی لڑکی کا کوئی جوان بھائی یا چچا وغیرہ ہوتا تو اس کے پلے باندھ دی جاتی۔ کوئی ایسا نہیں تھا اس لیے لڑکی کے کھوسٹ باپ نے یہ جرمانہ وصول کیا اور اسے اپنے گھر ڈال لیا۔''

نور آہ بھر کر رہ گئی۔

اسی دوران میں پی ٹی سی ایل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

نور نے دیکھا، یہ فون ان ہی چھوٹی لڑکیوں کی طرف سے تھا جن سے ایک دن ریستوران میں ملاقات ہوئی تھی۔ ظاہر تھا کہ انہوں نے ایتھلیٹکس کے حوالے سے ہی بات کرنا تھی۔ آج کل نور کا دل بالکل نہیں چاہ رہا تھا کہ اس موضوع پر بات کرے یا اس بارے میں سوچے۔

اس نے فون نہیں اٹھایا۔ کچھ دیر بعد پھر بیل ہونے لگی۔ تیسری بار بیل ہوئی تو نور نے کال ریسیو کر لی۔ بچیوں کی والدہ بول رہی تھی۔ اپنی اندرونی کیفیت کو دباتے ہوئے نور نے خوش خلقی سے بات کی۔

بچیوں کی والدہ صباحت بولی۔ ''نور! تم میری بچیوں کی آئیڈیل ہو۔ وہ دونوں بڑی دلچسپی لے رہی ہیں رننگ میں۔ اس حوالے سے میں تم سے دو منٹ بات کرنا چاہتی ہوں۔''

''جی کہیں۔''

''میں ایک بڑی بہن کی طرح تم سے آزادانہ بات کر سکتی ہوں۔ تمہاری طرح ہم بھی ایک دینی رجحان والے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ کیا طریقہ ہو سکتا ہے نور کہ بچیاں پُروقار طریقے سے اور اپنے حجاب کو برقرار رکھتے ہوئے بھی اس طرح کی صحت مند تفریحات میں حصہ لے سکیں؟''

''یہ تو بڑا لمبا موضوع ہے صباحت صاحبہ لیکن جو کچھ میری ادنیٰ سمجھ میں آیا تھا، وہ میں نے ایک اخباری انٹرویو میں بھی تفصیل سے بیان کیا تھا۔ آپ......''

''ہاں۔ وہ انٹرویو میں نے بھی پڑھا تھا۔'' صباحت نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''تمہاری کچھ باتیں ابھی تک میرے ذہن میں ہیں۔ اس میں تم نے ایک لباس کا آئیڈیا بھی پیش کیا تھا جو لڑکیاں اور خواتین رننگ کے وقت پہن سکتی ہیں۔ ظاہر ہے نور، خواتین کے جسم کے کچھ حصے ایسے ہیں جنہیں کسی بھی طرح نمایاں نہیں ہونا چاہیے اور مردوں کے سامنے تو بالکل نہیں۔''

''جی ہاں۔ اس لباس میں، میں نے یہی چیز مدنظر رکھی تھی۔ بہت سی نئی لڑکیوں نے اسے اپنایا ہے اور مفید پایا ہے۔''

''نیکر کے بجائے غالباً ٹراؤزر قسم کی چیز تھی۔'' صباحت نے کہا۔

''ہاں لیکن زیادہ کھلا ٹراؤزر نہیں اور کپڑا ابھی ہلکا پھلکا لچکدار اور ملائم ہو۔ جو سامنے سے ہوا کی مزاحمت نہ کرے۔ لباس کا اپر کولہوں سے نیچے تک جاتا ہے اور بھاگتے ہوئے بھی آپ کے جسم کے ساتھ رہتا ہے، سامنے کی طرف دو ایک جگہ ہلکی پھلکی پیکنگ ہے جو باڈی کی شیپ کو نمایاں نہیں ہونے دیتی۔ آپ کہیں گی تو میں آپ کو انٹرویو کی فوٹو اسٹیٹ بھجوا دوں گی۔ تفصیل سے دیکھ لیجیے گا......'' اب وہ پیچھا چھڑانے کے موڈ میں تھی۔

بہتر ہوا کہ دوسری طرف کوئی بچہ رونے چلانے لگا اور صباحت نے کہا۔ ''اچھا نور! چھوٹا بیٹا رو رہا ہے، پھر بات کریں گے۔''

نور کو یہ ساری گفتگو بوجھ محسوس ہوتی تھی۔ اس نے سکھ کا سانس لیا، عجیب کیفیت تھی اس کی۔

یہ دوسرے روز کی بات ہے، سہ پہر اور شام کے درمیان ایک کمزور سی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔

نور کمرے میں بیٹھی تھی۔ مہرین لپکتی ہوئی اندر داخل ہوئی اور بولی۔ ''مبارک ہو بھئی۔ کوئی مٹھائی وغیرہ ہونی چاہیے۔'' نور کا دل دھڑک اٹھا۔ اسے لگا جیسے شاید اس کے حوالے سے کوئی اچھی خبر ہے۔ واپڈا والی نوکری خطرے میں دیکھ کر اس نے دو تین اور جگہوں پر ٹرائل دے رکھے تھے۔ اس نے سمجھا شاید کہیں سے کوئی لیٹر آیا ہے مگر مہرین کی مبارک دوسرے حوالے سے تھی، اس نے کہا۔ ''آل پنجاب تقریری مقابلے میں گولڈ میڈل جیتا ہے بسمہ نے...... تمہیں ابھی تک خبر نہیں ہوئی؟''

بسمہ کی کامیابی کا سن کر نور کا دل بلیوں اچھل گیا، مہرین کہہ رہی تھی۔ ''مجھے تو دوپہر ایک بجے ہی پتا چل گیا تھا، میں نے سمجھا تم تک بھی خبر پہنچ چکی ہوگی۔''

خوشی کے اس موقع پر نور کو اپنے سینے میں کچوکا سا محسوس ہوا۔ شام ہونے کو آئی تھی اور وہ ابھی تک اپنی بہن کی اتنی اہم کامیابی سے بے خبر تھی۔ وجہ صاف ظاہر تھی، ابا جان نے جو پابندیاں لگا رکھی تھیں، ان کے سبب دونوں گھروں میں اطلاعات کا تبادلہ کم ہی ہوتا تھا۔ ابا جان نے ابھی تک ٹیلی فون بھی نہیں لگوایا تھا۔

ابھی نور اور مہرین باتیں ہی کر رہی تھیں کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ دوسری طرف بسمہ تھی، کسی پی سی او سے بات کر رہی تھی۔ ''نور! میں نے گولڈ میڈل جیت لیا۔'' وہ چھوٹتے ہی بولی۔ اس کی آواز جذبات کی شدت سے کپکپا رہی تھی۔

''ہاں...... مجھے ابھی پتا چلا ہے مہرین سے۔ بہت بہت مبارک ہو۔'' وہ بولی۔

نور کے لہجے میں اداسی کی جھلک کو بسمہ نے فوراً نوٹ کیا۔ بولی۔ ''ویری سوری نور! میں تمہیں دوپہر کو ہی اطلاع دینا چاہ رہی تھی مگر ابا جان اور چھوٹی امی ساتھ تھیں۔ موقع ہی نہیں ملا۔''

"چلو کوئی بات نہیں۔ دوپہر کو تمہارا فون نہیں آیا تو میں نے یہی سمجھا کہ فائنل آج نہیں ہوگا۔"

"بس اب جلدی سے گھر آجاؤ۔ اکٹھے "سلیبریٹ" کریں گے، آپی بتول بھی آئی ہوئی ہے۔"

"ابا جان کا موڈ کیسا ہے؟" نور نے پوچھا۔

"بالکل ٹھیک ہے۔ نہ بھی ہو تو چھوٹی امی ہیں نا موڈ ٹھیک کرنے کے لیے۔ وہ بھی کہہ رہی تھیں کہ نور اور مہرین کو بلالو۔"

اسی دوران میں رابطہ منقطع ہوگیا۔ بہرحال ضروری بات ہوگئی تھی۔ نور کو امید تھی کہ ابھی پھپو یا چھوٹی امی میں سے کوئی آئے گا اور نور کو اپنے ساتھ لے جائے گا مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ رات گزر گئی، اگلا روز بھی گزر گیا۔ اگلے روز شام کو تایا ابا گھر آئے تو انہوں نے نور کو بتایا۔ "بھئی آج دعوت پر چلنا ہے۔"

"کہاں؟" نور نے پوچھا۔

"تمہارے گھر اور کہاں؟ بسمہ کی کامیابی پر تمہارے ابا جان نے کافی بڑا فنکشن کرڈالا ہے۔ پاس کے سارے رشتے دار آرہے ہیں۔ میرا خیال ہے جہاں بسمہ کے رشتے کی بات ہوئی ہے، وہ لوگ بھی آئیں گے۔"

"ہمیں تو کسی نے نہیں بتایا۔" مہرین نے کہا۔

"چلو اب میں جو بتا رہا ہوں، تیار ہوجاؤ۔ نو بجے تک پہنچنا ہے۔"

نور کو سینے میں چبھن سی محسوس ہوئی۔ نجانے کیوں اسے یوں لگا کہ ابا جان کی طرف سے بسمہ کی کامیابی پر خوشی کا یہ غیر معمولی اظہار اسے دکھانے کے لیے بھی ہے۔ جیسے وہ اسے بتانا چاہتے ہوں اور تایا ابا کو بھی بتانا چاہتے ہوں کہ یہ ہوتی ہے کامیابی اور یوں ملتا ہے والدین کی فرمانبرداری کا صلہ۔ یہ بات نہیں تھی کہ نور اپنی بہن کی کامیابی پر خوش نہیں تھی۔ اس کی کامیابی کا سن کر اس کے دل کی اتھاہ گہرائی سے خوشی کے سوتے پھوٹے تھے مگر ابا جان اور دیگر اہلِ خانہ کے رویے نے اسے تھوڑا سا افسردہ کیا تھا۔

تقریب میں کافی مہمان تھے۔ بسمہ کے ہونے والے سسرالی بھی آئے تھے۔ باقاعدہ کیک کاٹا گیا اور بسمہ کی کامیابی کو سیلیبریٹ کیا گیا۔ بسمہ کے متوقع سسرالیوں سے ابھی تک نور کی باقاعدہ ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ ایک انکل نے نور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"یہ بیٹی کون ہے؟"

دادی نے کہا۔ "چھوٹی پوتی ہے میری۔ پچھلی دفعہ کہیں گئی ہوئی تھی، آپ سے نہیں ملی ہوگی۔"

"اچھا یہ وہی ہیں جو ریس وغیرہ میں بھی حصہ لیتی ہیں۔" انکل نے اپنی نیم سفید ریش میں انگلیاں چلا کر ذرا چبھتے لہجے میں کہا۔

"ایک مرتبہ...... شاید گر بھی گئی تھیں، تصویریں وغیرہ آئی تھیں۔" ایک لڑکی بے ساختہ بول اٹھی۔

تایا ابا نے مسکرا کر کہا۔ "آپ کو بس گرنا یاد رہ گیا، کچھ اور یاد نہیں آیا۔ یہ صوبائی اور قومی سطح کے مقابلوں میں کئی بار وکٹری اسٹینڈ تک پہنچ چکی ہے۔ اس کا کمرا ایوارڈز اور ٹرافیوں سے بھرا ہوا ہے......"

بسمہ کے ہونے والے دیور نے کہا۔ "دراصل انکل! کرکٹ کا کھیل باقی سب کھیلوں کو کھا گیا ہے، ان بے چارے ہاکی والوں کو ہی دیکھ لیں۔ قومی ٹیم میں آکر ریٹائرڈ بھی ہوجاتے ہیں لیکن ہم انہیں شکلوں سے نہیں پہچانتے۔ کچھ کے تو نام بھی معلوم نہیں ہوتے اور جب ہاکی جیسے قومی کھیل کا یہ حال ہے تو باقیوں کا کیا پوچھنا۔"

"ایسی بات نہیں ہے۔" تایا ابا نے دفاع کیا۔ "بے شک کرکٹ بہت حاوی ہوچکی ہے مگر دیگر کھیلوں کے پرستار بھی موجود ہیں۔"

"چلیں جی۔ آپ کہتے ہیں تو ہم مان لیتے ہیں۔ ویسے بھی لڑکی والوں سے ہمارا بحث کرنا تو بنتا ہی نہیں ہے۔" بسمہ کے ہونے والے سسر نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔ سب ہنسنے لگے۔

نور کو یہاں بہت بے چینی محسوس ہورہی تھی، وہ اپنا اسکارف درست کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ شاید اس کا اٹھنا ہی بہتر تھا کیونکہ ابا جان کو بھی اس کی موجودگی زیادہ اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اپنے نئے رشتے داروں سے اسے اور اس کے شوق کو چھپانا چاہتے ہیں۔

وہ دیر تک بسمہ کے پاس رہنا چاہتی تھی لیکن پتا نہیں کیوں کھانا کھائے بغیر ہی واپس تایا ابا کے گھر آگئی۔

تایا ابا کو ساری صورتِ حال کا اندازہ ہورہا تھا۔ بے شک بسمہ نے اہم کامیابی حاصل کی تھی مگر اس کامیابی کو جس طرح سیلیبریٹ کیا گیا تھا، اس میں ایک طرح کی مسابقت بھی شامل تھی۔ تایا ابا کو اس بات پر بھی رنج تھا کہ اشفاق نے اس گیٹ ٹوگیدر کے سلسلے میں کوئی مشورہ نہیں کیا تھا اور ان لوگوں کو بالکل آخر وقت میں اطلاع دی تھی۔ اس کا جواب دینے کا موقع بھی تایا ابا کو جلد ہی مل گیا۔

مہرین فزیوتھراپی کے دوسرے سال میں تھی، اس نے فزیوتھراپی میں نئے رجحانات اور اسپورٹس میں ان کے

اطلاق کے موضوع پر ایک مضمون لکھا تھا۔ یہ مضمون نہ صرف پاکستان میں بلکہ انگلینڈ کے ایک اچھے میڈیکل میگزین میں بھی شائع ہوا اور اسے طبی حلقوں میں پذیرائی ملی۔ انگلش جریدے کی طرف سے مہرین کو معقول معاوضہ اور تعریفی... سرٹیفکیٹ بھی موصول ہوا۔ تایا خلیل نے بھی نامعقول اشفاق کو جواب دینے کے لیے فوراً ایک تقریب کا اہتمام کر ڈالا۔ یہ تقریب بھی گھر میں ہوئی اور اس میں کافی مہمان شریک ہوئے۔ اپنی دونوں بہنوں کی کامیابی پر نور دل کی گہرائی سے خوش تھی لیکن پتا نہیں کیوں یہ دونوں تقاریب اس کے لیے بوجھل ثابت ہوئیں۔ اس نے خود کو بالکل سائڈ لائن پر محسوس کیا۔ اب کبھی کبھی اسے محسوس ہونے لگتا تھا کہ شاید اس نے واقعی اپنے لیے ایک غلط لائن منتخب کر لی تھی۔ یہ اس کا میدان ہی نہیں تھا یا پھر میدان تو تھا لیکن وہ درست طور پر اس میں داخل نہیں ہوئی تھی، جب وہ داخل ہوئی تو اس کے ساتھ ایک بددعا تھی اور یہ بددعا کسی اور نے نہیں اس کے والد نے دی تھی۔

دو تین روز بعد جب نور ایف اے ایس میں پریکٹس کے بعد گھر واپس آئی تو اسے ایک اور دھچکا لگا، ایک لیٹر اس کا منتظر تھا۔ اس محکماتی لیٹر میں بڑے محتاط الفاظ استعمال کرتے ہوئے نور کو نوکری سے جواب دے دیا گیا تھا۔

اسے ہمت نہیں ہوئی کہ تایا ابا کو بتاتی تاہم اس نے مہرین کو بتا دیا۔ ''یہ سراسر ناانصافی ہے۔'' مہرین نے تڑخ کر کہا۔ ''مجھے شک ہے کہ اس سلسلے میں بھی نشو بجلی کا گروپ کام کر رہا ہے۔''

''نہیں بھئی، ہمیں ہر معاملے میں ان کا ہاتھ نہیں ڈھونڈنا چاہیے۔''

''تو پھر اور کیا وجہ ہو سکتی ہے نور! تم اب فٹ ہو، باقاعدگی سے رننگ بھی کر رہی ہو۔ میڈم فرحانہ کہہ رہی تھیں کہ تمہاری یہی روٹین رہے تو تم دو تین ماہ میں پہلے والی فارم حاصل کر سکتی ہو۔''

وہ بے دم سی ہو کر کرسی پر بیٹھ گئی اور جوتے اتار کر دور پھینک دیے۔ بال سمیٹتے ہوئے بولی۔ ''کبھی کبھی تو لگتا ہے کہ میں کسی اور سے نہیں اپنی قسمت سے لڑ رہی ہوں۔''

اس سے پہلے کہ مہرین جواب میں کچھ کہتی تایا ابا کی آواز آئی۔ ''کہاں ہو لڑکیو! میں ڈھونڈ رہا ہوں تمہیں۔''

نور نے جلدی سے کہا۔ ''تایا ابا کو جاب کے بارے میں کچھ نہیں بتانا۔''

مہرین نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

تایا ابا کے ہاتھوں میں کچھ کپڑے تھے جو وہ درزی سے لے کر آئے تھے۔ یہ نور اور مہرین کے دو دو سوٹ تھے جو انہوں نے امنالے کے میلے پر لے کر جانے تھے۔ ایک زرق برق سوٹ تائی امی کا بھی تھا۔ وہ ہمیشہ سے خوش لباس تھیں اور دادی اماں کے طعنے ان کی خوش لباسی پر کبھی کوئی منفی اثر نہیں ڈال سکے تھے۔ دوسروں کی طرح وہ بھی (پڑھی لکھی ہونے کے باوجود) امنالے کے میلے کا شدت سے انتظار کرتی تھیں۔

تایا ابا نے کہا۔ ''پرسوں صبح سویرے روانگی ہے، جو کام نمٹانے ہیں آج نمٹا لو۔ میں ذرا گاڑی کا تیل فلٹر بدلوانے جا رہا ہوں۔''

وہ چلے گئے۔ نور اسی طرح خاموش بیٹھی رہی۔ مہرین نے بے تکلفی سے اس کی گود میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''باجی جان! موڈ ٹھیک کریں۔ اپنا زندگی میں اونچ نیچ چلتی رہتی ہے کبھی کے دن بڑے کبھی کی راتیں۔ سب اچھا ہو جائے گا، آپ بس تیاری فرمائیں۔''

''پتا نہیں کیوں دل بجھ سا گیا ہے مہرین۔''

''اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ تیاری فرمائیں۔ چند دن کے لیے آب و ہوا تبدیل ہوگی، ماحول تبدیل ہوگا تو جناب کے دماغ میں جھاڑو پھرے گا اور کافی کچرا شچرا نکل جائے گا۔''

وہ دیر تک نور کو قائل کرتی رہی اور آخر کافی حد تک کامیاب ہو گئی، یقیناً ابا جان بھی جا رہے تھے اور یہ آس ہمیشہ نور کے دل میں موجود رہتی تھی کہ شاید ابا جان کے قریب رہنے سے کسی وقت کوئی ایسا موقع بھی مل جائے جو ان کی دوریاں ختم کر دے۔ انا اور بیگانگی کی وہ بلند دیوار گر جائے جو ان دونوں کے درمیان حائل ہو چکی تھی۔

اگلے روز نور اور مہرین بھی دیگر لڑکیوں کے ساتھ روانگی کی تیاری میں لگ گئیں۔ نور اور مہرین نہیں جانتی تھیں ...... بلکہ کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ اس مرتبہ ان کا یہ سفر کتنا تہلکہ خیز ثابت ہونے والا ہے۔ کچھ حالات ''ماحول کے ہم رنگ سانپوں'' کی طرح ہوتے ہیں، مدتوں گھات لگائے خاموش پڑے رہتے ہیں۔ ان کے اندر زہر پنپتا رہتا ہے۔ وہ اپنے شکار کا انتظار کرتے رہتے ہیں...... اور آخر جھپٹ پڑتے ہیں۔ یہاں بھی کچھ سانپ موجود تھے۔ یہاں بھی کچھ ایسی ہی صورتِ حال تھی۔

☆☆☆

امنالے کا میلا تو خوشی کا باعث ہوتا ہی تھا۔ اس کی

تیاریاں بھی خوشی و شادمانی کے زمرے میں آتی تھیں......

تیاری مکمل تھی اور اب سفر درپیش تھا۔ ایک اسٹیشن ویگن اور تین گاڑیاں لاہور سے گجرات کی طرف روانہ ہو رہی تھیں۔

شرجیل، عثمان، مہرین اور نور اسٹیشن ویگن میں تھے۔ ابا جان کو یہ بات اچھی تو نہیں لگی تھی مگر مہرین، بسمہ کو کھینچ تان کر اسٹیشن ویگن میں لے آئی تھی۔ اس نے آپی بتول کو بھی آنے کا کہا تھا مگر وہ ابا جان اور چھوٹی امی زلفت کے ساتھ ٹویوٹا گاڑی میں رہی تھیں۔ خوشی کے موقع پر نور بھی سب میں گھل مل جایا کرتی تھی مگر اس دفعہ ایسا نہیں ہو سکا تھا۔ وہ کوشش کے باوجود خود کو دوسروں میں مکس نہیں کر پا رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں بار بار اس کا دھیان چار پانچ روز پہلے والے واقعے کی طرف چلا جاتا تھا۔ آخر وہ ذوالقرنین سے بات کیوں نہیں کر پائی تھی؟ کیوں اس کی غلط فہمیاں دور کرنے میں ناکام رہی تھی؟ کیا وہ واقعی غلط فہمیاں ہی تھیں؟ یہ سوال اسے اندر سے لرزا دیتا تھا۔ وہ جس شخص کو پسند ہی نہیں کرتی تھی اس سے دوٹوک بات کرنے میں کیا چیز مانع آ گئی تھی؟ اسے جیسے اپنی ہی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

اس کی پژمردگی کی دوسری وجہ یقیناً یہ بھی تھی کہ اس کی ڈیپارٹمنٹل جاب ختم ہو گئی تھی اور اپنی پریکٹس وغیرہ جاری رکھنے کے لیے اس پر اضافی بوجھ پڑنے والا تھا۔ کبھی کبھی تو اسے یوں لگتا تھا جیسے شاید وہ مستقبل میں پوری تندہی کے ساتھ رننگ پریکٹس جاری ہی نہ رکھ سکے۔ ان باتوں کے علاوہ ابا جان کا رویہ بھی اسے مسلسل ٹھیس پہنچا رہا تھا۔ ان کی آنکھوں میں معافی یا رحم کی کوئی رمق اسے نظر نہیں آتی تھی۔

دادی اماں علیحدہ گاڑی میں پھپھو حاجرہ اور خالہ عریفہ کے ساتھ موجود تھیں۔ یہ گاڑی ماموں مراد ڈرائیو کر رہے تھے۔ دادی اماں پچھلی نشست پر تکیے کے سہارے نیم دراز تھیں۔ ان کی دوائوں والا شاپر بھی ان کے سرہانے رکھا تھا اور پھپھو اس شاپر کی حفاظت پر مامور تھیں۔

سفر ہنسی خوشی کٹا۔ گجرات سے آگے پھالیہ کے نواح میں دوپہر کا کھانا ایک آب جو کے کنارے کھایا گیا۔ سردیوں کی سنہری دھوپ، ہلکی ہوا میں دور تک جھومتی ہوئی فصلیں اور درختوں کے تالیاں بجاتے ہوئے پتے۔ یہ ان لوگوں کا بچھڑا ہوا ماحول تھا اور اس ماحول میں آ کر وہ سب عجیب سی آسودگی محسوس کرتے تھے۔

موراں والی گائوں پہنچتے پہنچتے انہیں شام ہو گئی۔ میلے کے آثار گائوں کے نواح سے ہی شروع ہو جاتے تھے۔ بہت سے شامیانے لگ چکے تھے۔ کچھ لگائے جا رہے تھے۔ جھولوں کی تنصیب ہو چکی تھی۔ سرکس اور تھیٹر کی تزئین و آرائش کا کام تیزی سے جاری تھا۔ مٹھائیوں، سموسوں اور کتلموں کی جانی پہچانی خوشبو دور ہی سے ان سب کے نتھنوں میں گھسنے لگی۔ گائوں میں بھی سب کو معلوم ہو گیا کہ مہرا گھرانے کے لوگ بھی پہنچ گئے ہیں۔ اہلِ دیہہ کے جوش و خروش میں اضافہ ہوا۔

گائوں والی رہائش گاہ تو اب مکمل طور پر فروخت ہو چکی تھی۔ ان لوگوں کا قیام اس پرانی حویلی میں تھا جو گائوں سے کچھ فاصلے پر بارشی نالے کے کنارے واقع تھی۔ دریا بھی یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ حویلی تک جانے کے لیے ایک نیم پختہ رستہ بنا دیا گیا تھا۔ اشفاق مہرا اور خلیل مہرا کی آمد سے پہلے ہی اس حویلی کو بالکل تیار کر دیا گیا تھا۔ رنگ و روغن ہوا تھا۔ لان اور درختوں کی تراش خراش کی گئی تھی۔ کچن کا سامان بھرا گیا تھا اور دیگر ضروریات فراہم کی گئی تھیں۔ موراں والی سے آگے ایک زمیندار کے ڈیرے تک ٹیلیفون کی لائن آ چکی تھی۔ وہاں سے آگے قریباً ایک کلومیٹر تک خلیل مہرا نے اپنے خرچے پر فون لائن کا انتظام کر رکھا تھا۔ اس مرتبہ حویلی میں جنریٹر کی سہولت بھی مہیا تھی۔ مہرا فیملی کے پرانے ملازم اور ملازمائیں بھی یادوں کو تازہ کرنے کے لیے حویلی میں موجود تھے اور خدمت کے لیے کمربستہ نظر آتے تھے۔

نور کے تایا ابا خلیل مہرا نے پرانے ملازم فدا حسین سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے اس دفعہ چودھری طغرل سے ملاقات نہیں ہوئی۔''

فدا حسین بولا ''شاید آپ کو پتا نہیں چلا، پچھلی جمعرات چودھری صاحب کی والدہ فوت ہو گئی ہے۔''

''انا للہ وانا الیہ راجعون۔'' خلیل مہرا اور اشفاق مہرا نے ایک ساتھ کہا۔ پھر خلیل مہرا ذرا برہمی سے بولے۔ ''فدا حسین! تم لوگوں کو کسی طرح اطلاع تو کرنی چاہیے تھی۔''

''جی میں نے اپنے پتر کو پھالیہ بھیجا تھا تاکہ آپ کو فون کر سکے مگر آپ کا فون ملا ہی نہیں۔ وہ خود لاہور جا کر آپ کو بتا دیتا پر ہڑتال تھی۔ پہیا جام تھا...... صبح چار بجے وہ فوت ہوئی۔ پیشی (ظہر) کے بعد جنازہ بھی ہو گیا۔''

''اوہو۔ ہمیں افسوس کے لیے جانا چاہیے۔'' نور کے ابا اشفاق مہرا نے کہا اور تھکاوٹ کے باوجود دونوں بھائی اٹھ کھڑے ہوئے۔

...... کچھ ہی دیر بعد وہ اپنی ٹویوٹا کار پر سوار تین

کلومیٹر دور گاؤں میں داخل ہو رہے تھے۔ وہ سیدھے چودھری طغرل کی حویلی میں پہنچے۔ میلے کے دنوں میں چودھری طغرل کی حویلی میں مسلسل چراغاں کیا جاتا تھا مگر اس بار صورتِ حال مختلف تھی۔

چودھری طغرل کے ملازموں نے خلیل مہرا اور مولوی اشفاق مہرا کو حویلی کی وسیع بیٹھک میں بٹھا دیا۔ قریباً دس منٹ بعد چودھری طغرل اندر داخل ہوا۔ وہ ہمیشہ کی طرح کلف لگے...... کھڑکھڑاتے ہوئے بادامی رنگ کے شلوار قمیص میں تھا۔ سر پر اسی رنگ کی طرّے دار پگڑی تھی۔

خلیل مہرا اور اشفاق مہرا نے گلے مل کر افسوس کا اظہار کیا اور نشستوں پر بیٹھ گئے۔ خلیل مہرا بولے۔ ''اس بات کا بھی بہت افسوس ہے کہ ہمیں بروقت اطلاع نہ مل سکی، ورنہ ہر صورت جنازے میں شریک ہوتے۔''

اشفاق مہرا نے کہا۔ ''آپ ہی ہمیں اطلاع کر دیتے۔ چھ سات گھنٹے کا راستہ تھا، ہم پہنچ ہی جاتے۔ ہمیں یہاں پہنچ کر اطلاع ملی ہے۔ ابھی ہم نے ماں جی کو نہیں بتایا۔ ان کو بھی بڑا دکھ ہونا ہے۔ وہ تو یہاں آتی ہی وڈی اماں جی سے ملنے کے لیے تھیں۔''

''چلو جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اب تو دعا ہی کی جا سکتی ہے۔'' چودھری طغرل نے قدرے روکھے لہجے میں کہا۔

مولوی اشفاق مہرا نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ چودھری طغرل اور خلیل مہرا نے بھی اٹھا لیے۔ دعا کے بعد خلیل مہرا نے چودھری طغرل سے اس کے بیٹوں کے بارے میں پوچھا۔ ''ابدال اور وارث کہاں ہیں؟''

''کہیں نکلے ہوئے ہیں۔ شاید ڈیرے پر گئے ہیں۔'' چودھری نے مختصر جواب دیا۔

مولوی اشفاق مہرا نے کہا۔ ''اللہ تعالیٰ وڈی اماں کی بخشش کرے اور ان کے درجے بلند کرے۔ ہماری والدہ سے ان کی دوستی بڑی گہری تھی اور کئی طرح کی اونچ نیچ دیکھنے کے باوجود یہ برقرار ہی رہی۔''

چودھری طغرل نے لمبی سانس لی اور عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''ہاں، وڈی اماں نے کئی دکھ بھی سہے پر یہ دوستی نبھاتی رہیں۔ کافی احسان ہیں ان کے تم لوگوں پر۔''

چودھری طغرل کے آخری الفاظ نے دونوں بھائیوں کو چونکایا پھر خلیل مہرا نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''بے شک...... بے شک وہ بڑی مہربان عورت تھیں۔ سب کے لیے مہربان تھیں۔''

چودھری اسی سپاٹ لہجے میں بولا۔ ''کچھ احسانوں کا تو لوگوں کو پتا ہے اور کچھ کا پتا بھی نہیں۔ بہرحال اب ان باتوں سے کیا فائدہ۔''

اسی دوران میں کسی قریبی کمرے سے کھنکھارنے اور بولنے کی مدھم آواز سنائی دی۔ خلیل مہرا اور اشفاق مہرا نے پہچان لیا۔ یہ چودھری طغرل کے بڑے بیٹے ابدال ہی کی آواز تھی۔ وہ شاید کسی ملازم سے بات کر رہا تھا اور طغرل نے کہا تھا کہ ابدال اور وارث گھر میں نہیں ہیں۔

شاید ابدال وغیرہ ان سے ملنا نہیں چاہتے تھے۔ چودھری طغرل کا رویہ بھی واضح طور پر بدلا ہوا نظر آتا تھا۔ اس رویّے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ شاید اس میں والدہ کی موت کا دکھ بھی شامل تھا۔ یا پھر یہ بات کہ وہ لوگ آخری رسومات میں شریک نہیں ہو سکے تھے۔

حویلی واپس آ کر خلیل مہرا اور اشفاق مہرا نے اپنی بیمار والدہ کو ان کی پرانی سہیلی وڈی اماں کی رحلت کی خبر سنائی۔ وہ کافی دیر گم صم رہیں پھر اپنی اوڑھنی سے نم آنکھیں صاف کرنے لگیں۔ وہ خود ان کے گھر جانا چاہتی تھیں مگر مولوی اشفاق مہرا نے کہا۔ ''ماں جی! آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ سفر کی تھکاوٹ بھی ہے۔ کل یا پرسوں کسی وقت چلے جائیں گے۔''

دو دن بعد وڈی اماں کا دسواں تھا۔ دسویں تک تو میلے کی تیاری کچھ سست رہی مگر پھر وہی ہوا جو ہوا کرتا ہے۔ مرنے والوں کے ساتھ مرا نہیں جاتا اور اکثر اوقات سوگ کی کیفیت میں بھی لوگ خوشی کے مواقع مکمل طور پر ضائع نہیں ہونے دیتے اور پھر وڈی اماں تو ویسے بھی پچانوے سال سے اوپر کی ہو کر گزری تھی۔ اس کے جنازے پر خاصا اہتمام کیا گیا تھا۔ پنجابی میں اسے وڈا کرنا کہتے ہیں۔ بعض برادریوں میں تو ایسے موقعوں پر باجے تک بجائے جاتے ہیں اور خیر خیرات کے علاوہ شیرینی وغیرہ بھی بانٹی جاتی ہے۔ خیر یہاں باجے تو نہیں بجائے گئے تھے مگر میٹھے چاول کی دیگیں پکی تھیں اور کچھ دیگر رسومات بھی ادا ہوئی تھیں۔ دسویں کے بعد اماناں والے کا میلا پورے جوبن پر آ گیا۔ وہ ساری مصروفیات اور تفریحات شروع ہو گئیں جو اس میلے کا خاصہ تھیں۔ بارشی نالے کے ساتھ ساتھ مویشیوں کی منڈی لگ گئی۔ میلے کی دکانیں سجنے سنورنے لگیں۔ سرکس اور تھیٹر کی رونقوں میں اضافہ ہو گیا۔ جھولوں کی گردش بڑھ گئی...... اور پھر وہ دن آیا جب قدیم رسم کے مطابق علاقے کے لوگ اپنے اپنے ہتھیار رضاکارانہ طور پر مزار کے سامنے جمع کرا دیتے تھے...... اور سات دن کے لیے قرب و جوار

میں مکمل امن و امان کی فضا قائم ہوجاتی تھی۔ گاؤں کی عورتیں اور بچے گھروں کی چھتوں پر چڑھ کر یہ منظر دیکھتے تھے۔ مہرا گھرانے کی عورتیں بھی یہ رسم دیکھنے کے لیے، تین کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے اپنی پرانی حویلی سے گاؤں میں آ گئی تھیں۔ وہ اپنے فروخت شدہ گھر کی چھت پر موجود تھیں اور مزار کے سامنے اہلِ دیہہ کی طویل قطار دیکھ رہی تھیں۔ جہازی سائز کی سات بڑی بڑی چارپائیاں تھیں جن پر ہر طرح کا لائسنسی اسلحہ ڈھیر کیا جارہا تھا۔ باوردی پولیس اہلکار موجود تھے اور اسلحہ جمع کرانے والوں کو رسید نما کوپن دے رہے تھے۔ اسلحے سے بھی کوپن منسلک کیے جارہے تھے۔

قطار میں سے ایک شخص آگے بڑھتا، اپنا ہتھیار جمع کراتا، کوپن حاصل کرتا اور پھر مزار کی طرف رخ کر کے ادب سے سلام کرتا۔ اس کے بعد الٹے قدموں پیچھے پلٹ جاتا۔ اس عمل کے مکمل ہونے تک قریباً ساتوں چارپائیاں مختلف اقسام کے چھوٹے بڑے آتشیں اسلحے سے لدگئیں۔

دوسرا مرحلہ رات کو تھا۔ اس میں ناجائز اسلحہ بھی اس قدیم کوٹھری میں جمع ہوجاتا تھا جہاں تنگ چندی اینٹوں کی دیواروں میں بے شمار خانے بنے ہوئے تھے اور تالے لگے ہوئے تھے۔

یہ رسم اور اس طرح کی ساری رسمیں اہلِ علاقہ کے دلوں میں گھر کر چکی تھیں۔ مثلاً آج ہی کے روز شام کے بعد گھروں میں ڈھولک بجانے اور گیت گانے کی رسم بھی ادا ہوتا تھی۔ یہ ترنجن سے ملتی جلتی تقریب تھی۔ انگیٹھیاں دہکائی جاتی تھیں، گڑ اور باداموں والا حلوا بنایا جاتا تھا۔ علامتی طور پر ایک آدھ رنگین چرخا بھی پاس رکھ لیا جاتا تھا اور سہاگنیں اور کنواریاں ملن اور جدائی کے گیت گاتی تھیں۔

بتول نے کہا۔ ”نورا! آج رات تو یہیں رہیں گے۔ مزہ آئے گا۔“

نور بولی۔ ”آپی...... آپ کو پتا بھی ہے، مجھے یہ ڈھولک شولک اچھی نہیں لگتی۔“

چھوٹی امی زلفت نے کہا۔ ”تو مت ڈھولک بجانا تم۔ سن تو سکتی ہونا۔“

”نہیں چھوٹی امی! میری طبیعت بھی ٹھیک نہیں۔ میں ابا جان کے ساتھ حویلی چلی جاؤں گی۔ صبح پھر آ جاؤں گی۔“

ایک عورت نے بسمہ سے مخاطب ہو کر ذرا تیکھے لہجے میں کہا۔ ”بسمہ! تمہاری یہ بہن شروع سے ہی دکھرے ٹائپ کی ہے۔ اس کو تو اپنے ساتھ شامل کرنے کا ایک ہی

لوڈشیڈنگ

ایک انگریز نے پاکستان آ کر اردو سیکھی۔ جب واپس گیا تو لوگوں نے پوچھا کہ آپ نے کیا بولنا سیکھا تو اس نے کہا۔ ”لائٹ چلی گئی ہے۔ لائٹ آ گئی ہے۔ لائٹ جانے والی ہے۔ لائٹ آنے والی ہے۔ لائٹ نہیں آئی۔ لائٹ نہیں گئی۔ لائٹ جا بھی سکتی ہے۔ لائٹ آ بھی سکتی ہے۔ لائٹ ڈم آ رہی ہے۔ لائٹ تیز آ رہی ہے۔ لائٹ آ کیوں نہیں رہی۔ لائٹ جا کیوں نہیں رہی۔ لائٹ ابھی تو آئی تھی لو پھر چلی گئی۔“

مرسلہ: کاشف قیوم، کراچی

طریقہ ہے۔ جس طرح مردوں کی کبڈی ہوتی ہے، اسی طرح ہم عورتوں کی بھی کبڈی رکھ لیں۔“

سب ہنسنے لگیں...... نور کا چہرہ سرخ ہوگیا مگر اپنی ماں کی عمر کی عورت کو جواب دینا اس نے مناسب نہیں سمجھا اور اٹھ کر اور سیڑھیاں اتر کر نیچے چلی گئی...... اور بات صرف اس ایک عورت کی ہی نہیں تھی۔ یہاں بیشتر عورتیں اسے تنقیدی نظر سے ہی دیکھتی تھیں۔ خاص طور سے بڑی عمر کی عورتوں کی نگاہوں میں تو اس کے لیے واضح بیگانگی اور تلخی نظر آتی تھی۔ یہ بات ان کے لیے کسی طور پسندیدہ نہیں ہوسکتی تھی کہ ایک لڑکی مردوں کی طرح بھاگ دوڑ کرے اور مقابلوں میں حصہ لے...... اور لڑکی بھی کوئی عام نہیں، مولوی اشفاق مہرا کی بیٹی...... گھر کے وسیع صحن میں موجودہ مالک مکان حاجی اکرام صاحب کے بچے جھنڈیاں وغیرہ تیار کر رہے تھے۔ وہ برآمدے میں سے گزری۔ ایک کمرے سے ابا جان کے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ کمرے میں اکرام صاحب کے اہلِ خانہ موجود تھے اور وہ ان میں بیٹھے بسمہ کی باتیں کر رہے تھے۔ اس کامیابی کا ذکر ہو رہا تھا جو بسمہ کو چند دن پہلے تقریری مقابلوں میں حاصل ہوئی تھی۔ اس بارے میں بات کرتے ہوئے ابا جان کے لب و لہجے میں ایک سرشاری سی بھر جاتی تھی۔

نور ایک طویل سانس لیتی ہوئی صحن کی طرف بڑھی اور اسے عبور کر کے ڈیوڑھی کی طرف آ گئی۔ یہ سب وہی در و دیوار تھے جن میں اس کا بچپن گزرا تھا۔ چپے چپے پر

یادیں نقش تھیں مگر اب یہ سب کچھ کسی اور کی ملکیت تھا۔ مہرا فیملی کی حیثیت یہاں ایک دو دن کے مہمان جیسی تھی۔ اس نے اسکارف درست کیا۔ اوڑھنی اچھی طرح لپیٹی اور باہر آ گئی۔ سامنے ہی پرالی کے ڈھیر لگے تھے اور کالی سیاہ بھینسیں کھرلی میں منہ مار رہی تھیں۔ تایا زاد عثمان گاڑی کے پاس کھڑا بچپن کے کسی ہم جولی سے گپ شپ کر رہا تھا۔ نور کو دیکھ کر وہ چونکا اور پاس آ گیا۔ ''کیا بات ہے نور؟''

''عثمان بھائی! طبیعت ذرا بوجھل سی ہو رہی ہے۔ پلیز مجھے حویلی چھوڑ آئیں۔''

''لیکن آج تو یہاں ڈھولک کا پروگرام تھا۔''

''نہیں بھائی۔ یہ نہ ہو بیمار پڑ جاؤں۔ آرام کر لوں گی تو کل تک ٹھیک ہو جاؤں گی۔''

''کسی دوا وغیرہ کی ضرورت تو نہیں؟'' عثمان نے اپنائیت سے پوچھا۔ نور نے نفی میں جواب دیا۔

وہ عثمان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی اور حویلی چل دی۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی مگر ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ شام کے سائے لمبے ہونا شروع ہو گئے تھے۔ وہ میلے کی رونق کے درمیان سے ہو کر گزرے۔ شامیانوں اور عارضی دکانوں کے آس پاس لوگوں کا ہجوم تھا۔ جگہ جگہ پنجابی میوزک بھی پلے ہو رہا تھا۔ نوجوانوں کی ٹولیاں ہلا گلا کر رہی تھیں۔ یکا یک وہ چونکی۔ اسے ایک جانا پہچانا چہرہ نظر آیا۔ ہاں، یہ وہی تھا...... یہ وہی تھا۔ اس کے سر پر شاید پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس نے کالی گرم چادر کی بکل مار رکھی تھی۔ وہ گاڑی کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ شاید ایک سیکنڈ کے لیے ان دونوں کی نگاہیں بھی ملی تھیں۔ پھر گاڑی آگے بڑھ گئی اور اس کی شکل اوجھل ہو گئی۔ شبہے کی گنجائش نہیں تھی۔ یہ ذوالقرنین ہی تھا۔ اس کی ایک جھلک کل شام بھی اس نے حاجی اکرام صاحب کے گھر سے باہر دیکھی تھی! اس وقت وہ مین دروازے پر کھڑا ابا جان اور تایا جان سے علیک سلیک کر رہا تھا۔ تب نور کی طرف اس کی پشت تھی۔ نور کو بس شک سا ہوا تھا کہ یہ ذوالقرنین ہے لیکن آج تو اس نے اسے صاف دیکھا تھا۔

عثمان پوری توجہ سے گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ اسے پتا ہی نہیں چلا کہ نور کسی کو دیکھ کر بری طرح چونکی ہے۔ نور کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ یہاں کیوں تھا؟ کیا عام لوگوں کی طرح صرف میلا دیکھنے آیا تھا؟ یا پھر عام لوگوں کی طرح نہیں آیا تھا؟

حویلی کے مین گیٹ کے سامنے پہنچ کر عثمان نے نور کو ڈراپ کر دیا۔ وہ بولی۔ ''عثمان بھائی! تائی امی کو بتا دینا کہ میں یہاں آ گئی ہوں۔''

''او کے۔'' اس نے کہا اور واپس چلا گیا۔

ایک کمرے سے دادی اماں کی ہائے ہائے سنائی دے رہی تھی۔ وہ کسی وقت تکلیف میں ہوتی تھیں اور کسی وقت نہیں بھی ہوتی تھیں مگر عادتاً ہائے ہائے کرتی رہتی تھیں۔ اس وقت بھی پھپھو حاجرہ اور ایک ملازمہ ان کے پاس موجود تھیں اور ان کی مٹھی چاپی کر رہی تھیں۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر نور بستر پر گر گئی اور ذوالقرنین کے بارے میں سوچنے لگی۔ کیا وہ اکیلا تھا یا کوئی اور بھی اس کے ساتھ تھا؟ یوں تو شرجیل اور عثمان کے کچھ دوست بھی لاہور سے میلا دیکھنے کے لیے آئے تھے اور ویسے بھی لاہور سے لوگ یہاں پہنچتے تھے مگر ذوالقرنین کا یہاں نظر آنا نور کے لیے اہم اور پریشان کن تھا۔ اس کے ماتھے پر کوئی چوٹ وغیرہ بھی لگی ہوئی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ پھپھو یا شرجیل سے اس بارے میں کچھ پوچھے لیکن ہمت نہیں پڑی۔ خیالوں میں الجھی ہوئی وہ سو گئی۔

یوں تو لاہور میں اچھی سے اچھی چوڑیاں اور مہندی وغیرہ مل جاتی تھی مگر یہ بھی میلے کا ''کریز'' تھا کہ دوسرے دن شام کے وقت عورتیں میلے سے چوڑیاں، مہندی اور خوشبو وغیرہ خریدتی تھیں۔ مہرین اور دو ماموں زاد بہنیں نور کو بھی کھینچ کر اس شاپنگ کے لیے لے گئیں۔

نور نے ابھی تک مہرین کو بھی کل والے واقعے کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ نہ ہی مہرین نے کوئی ایسی بات کی تھی جس سے پتا چلتا کہ وہ یہاں ذوالقرنین کی موجودگی سے آگاہ ہے۔ لڑکیاں ایک ریڑھی والے کے پاس کھڑی گول گپے کھا رہی تھیں جب اچانک مہرین نے اس کے بازو پر چٹکی لی اور سرگوشی میں بولی۔ ''وہ دائیں طرف دیکھو ...... کراکری کی دکان کے پاس۔''

نور نے اس رخ پر دیکھا اور اس کے جسم پر چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ وہاں لوگوں کے درمیان ذوالقرنین کی جھلک نظر آئی۔ وہ حسب معمول شلوار قمیص میں تھا اور ایک موٹر سائیکل کو اسٹارٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''خدیجہ کا بھائی ہے نا یہ؟'' مہرین نے تیز سرگوشی کی۔

نور نے اثبات میں سر ہلایا۔

''یہ ذات شریف یہاں کیسے؟'' مہرین بولی۔

ذوالقرنین کا رخ دوسری طرف تھا۔ اس نے شاید اپنی چوٹ چھپانے کے لیے اور گرد و غبار سے بچنے کے لیے سر پر ڈبی دار رومال لپیٹ رکھا تھا۔ وہ جس موٹر سائیکل کو

ککس مار رہا تھا، وہ ایک عمر رسیدہ شخص کی تھی جو پاس ہی کھڑا تھا۔ چند سیکنڈ بعد موٹر سائیکل اسٹارٹ ہوگئی۔ عمر رسیدہ شخص خوش ہوگیا...... اور ذوالقرنین کے لیے غالباً شکریے کے الفاظ استعمال کیے۔

موٹر سائیکل آگے نکل گئی۔ ذوالقرنین کے دونوں ہاتھ سیاہ ہورہے تھے۔ شاید کچھ دیر پہلے وہ موٹر سائیکل کے پلگ وغیرہ سے چھیڑ چھاڑ کرتا رہا تھا۔ ہاتھ دھونے کے لیے اس نے اردگرد دیکھا اور پھر گول گپے والی ریڑھی کی طرف بڑھا، جہاں بالٹی میں پانی نظر آرہا تھا اور یہی وقت تھا جب اس کی نگاہ نور وغیرہ پر پڑی۔ درمیانی فاصلہ بیس پچیس قدم کے قریب تھا۔ پھر بھی ذوالقرنین نے انہیں پہچان لیا۔ وہ ریڑھی کی طرف آتے آتے ذرا ٹھٹکا اور پھر رخ پھیر کر ایک شامیانے کی طرف بڑھ گیا جہاں چائے خانے کے باہر نلکا نظر آرہا تھا۔ اس نے وہاں جاکر ہاتھ دھوئے۔ اس عمل کے دوران میں اس نے ایک دوبار اچٹتی نظروں سے نور اور مہرین کی طرف بھی دیکھا۔

مہرین نے کہا۔ ”یہ اصلاحِ معاشرہ یہاں بھی موجود ہے۔“

”ہاں۔ مجھے بھی کل شک ہوا تھا حویلی جاتے ہوئے۔“ نور نے پوری وضاحت نہیں کی۔

”بھئی! امنالے کی کشش لوگوں کو دور دور سے کھینچ لاتی ہے۔ پر پتا نہیں یہ امنالے کی کشش ہے بھی یا نہیں۔“ مہرین نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

وہ اب ہاتھ دھو کر سیدھا کھڑا ہوگیا تھا اور قدرے دراز قد ہونے کی وجہ سے ہجوم میں نمایاں نظر آرہا تھا۔ شانے کشادہ اور سر اور ڈاڑھی کے بال ہموار تھے۔ چائے خانے والے لڑکے نے اسے ہاتھ پونچھنے کے لیے ایک تولیا رومال دے دیا۔ وہ شکریہ ادا کرنے کے بعد ہاتھ پونچھنے لگا۔ نگاہیں بدستور جھکی ہوئی تھیں لیکن تاثرات سے صاف پتا چلتا تھا کہ وہ نور اور مہرین کی نظروں کو اپنے چہرے پر محسوس کررہا ہے۔

نور نے ہاتھ میں پکڑا ہوا گول گپا واپس تھالی میں رکھ دیا تھا۔ چہرے پر اسکارف درست کرتے ہوئے اس نے مہرین سے سرگوشی کی۔ ”چلو چلیں۔“

”بھئی! یہ دو تین گول گپے مجھے بددعائیں دیں گے۔ انہیں تو نگل لو۔“ اس نے پورا گول گپا منہ میں ڈالنے سے پہلے کہا۔

نور تھوڑا سا رخ پھیر کر کھڑی ہوگئی۔ اسی دوران میں کہیں پاس ہی موجود سرکس کا شیر اپنے پنجرے میں دھاڑنے لگا۔ بہت سے لوگ اس کی دھاڑ دیکھنے اور سننے کے لیے سرکس کے شامیانوں کی طرف بھاگے۔ نور نے دیکھا کہ ایک نوجوان آیا اور ذوالقرنین کو بھی کھینچتا ہوا سرکس کی طرف لے گیا۔ ذوالقرنین جیسے جانا نہیں چاہ رہا تھا۔ اس نے جاتے ہوئے دو تین بار مڑ کر نور اور مہرین کی جانب دیکھا، پھر اسے ہجوم نے چھپالیا۔

گول گپے کھانے کے بعد گروپ کی چند لڑکیاں بھی شیروں کو دیکھنے کے لیے سرکس کے شامیانوں کی طرف چلی گئیں مگر نور دیگر لڑکیوں کے ساتھ میلے کے دوسرے حصے کی طرف روانہ ہوگئی، وہ اپ سیٹ تھی۔

☆☆☆

رات کو مہرین اور نور اپنے اپنے پلنگ پر لحاف اوڑھے لیٹی ہوئی تھیں۔ درمیان میں انگیٹھی دہک رہی تھی۔ لائٹ گئی ہوئی تھی مگر جنریٹر کا انتظام موجود تھا۔ کھڑکیوں سے باہر دسمبر کی یخ بستہ دھند...... جامن، مالٹے اور بیری کے ٹنڈ منڈ درختوں کو ڈھانپے ہوئے تھی۔

مہرین نے کہا۔ ”میں نے پھپھو حاجرہ سے تھوڑی سی سن گن لی ہے۔ انہیں بھی پتا نہیں کہ خدیجہ کا بھائی یہاں آیا ہوا ہے۔ ہاں یہ کہہ رہی تھیں کہ لاہور سے اردو بازار کے تین چار دکاندار بھی میلا دیکھنے کے لیے آئے ہوئے ہیں۔“

”وہ کیوں کررہا ہے ایسا؟“ نور نے کھوئی کھوئی سی آواز میں کہا۔

”ہوسکتا ہے کہ وہ خاص تمہارے لیے نہ آیا ہو۔“

”نہیں مہرین۔“ نور نے اپنی سبز جرسی کی آستینیں اوپر کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ تو خود کو دھوکے میں رکھنے والی بات ہے۔“

”کیا تم نے ٹھیک سے دیکھا تھا کہ پرسوں وہ ابا جان اور چچا جان سے بات کررہا تھا؟“

”ہاں بھئی۔ یہی تھا لیکن تب مجھے صرف شک ہوا تھا۔ اگلے روز تصدیق ہوگئی۔“

دونوں خاموش ہوگئیں۔ باہر تاریکی میں کہیں کوئی رات کا پرندہ چہکارا۔ نور کے دل پر ایک بوجھ سا تھا۔ وہ اسے کچھ نہیں دے سکتی تھی، پھر اس کی آنکھوں میں سوال کیوں تھے؟ وہ کیوں ایک سراب کے پیچھے بھاگ رہا تھا؟ ہوسکتا ہے کہ وہ اتنا برا انسان نہ ہو۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اچھا انسان ہو لیکن نور کے ذہن میں جیون ساتھی کا جو تصور تھا، وہ اس سے بہت مختلف تھا۔

خاموشی کے وقفے کے بعد وہ دونوں پھر باتیں کرنے

لگیں۔ اس مرتبہ موضوع ابا جان کی ناراضگی تھی، جن کو لڑکیوں کا ڈھولک بجانا اور حاجی اکرام صاحب کے گھر رہنا بالکل پسند نہیں آیا تھا۔ اتنے میں دادی جان کی لاٹھی کی ٹک ٹک سنائی دی پھر انہوں نے لاٹھی سے ہی کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ''اولڑکیو! کیا چوں چوں لگا رکھی ہے، آدھی رات ہونے والی ہے، سو جاؤ اب۔''

''اچھا دادی۔'' مہرین نے ناگواری سے کہا اور لحاف میں منہ گھسالیا۔ ''دس بجے کو آدھی رات کہہ رہی ہیں۔'' وہ بڑبڑائی۔

دادی نے کمرے میں جھانکا۔ دروازے کے پاس ہی نور کے جوگر پڑے تھے۔ انہوں نے لاٹھی سے ہی انہیں ایک طرف ہٹایا۔ جیسے وہ جوگر نہ ہوں، کوئی پلید بدبودار شے ہو۔ نور پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈالی اور بگڑ کر بولیں۔ ''کہا بھی ہے کہ جلدی سوجایا کرو۔ بند کردو لائٹ۔''

''ابھی کر دیتی ہوں۔ واش روم میں جانا ہے۔'' نور نے کہا۔

''بات ماننی ساری زندگی نہیں آئے گی تجھے۔ بات ماننے والی ہوتی تو اس حال کو نہ پہنچتی۔ ساری کی ساری ماں پر ہے۔'' ان کی آواز میں زخمی کرنے والی کاٹ تھی۔ وہ باہر نکل گئیں۔

نور کا دل چاہا کہ وہ چلا کر دادی سے کہے کہ اب تو وہ عرصے سے منوں مٹی کے نیچے سوئی ہوئی ہیں...... وہ اب تو انہیں معاف کردیں مگر اس نے خود پر ضبط کیا اور ایک نہایت طویل، نہایت تلخ سا گھونٹ بھر کر رہ گئی۔ اس کی آنکھوں کے کنارے بے طرح جلنا شروع ہو گئے تھے۔ چند سیکنڈ بعد وہ دکھ آمیز جھلاہٹ کے ساتھ اٹھی اور لائٹ آف کرنے کے بعد مہرین کی طرح لحاف میں منہ گھسالیا۔

☆☆☆

اگلے روز موسم ابر آلود تھا۔ رات کو تھوڑے سے چھینٹے بھی پڑے تھے۔ بہت ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ خواتین نے حلوا پوری، چنوں اور دودھ پتی کا ناشتا کیا۔ نور چکنائی والی خوراک سے ذرا دور ہی رہتی تھی۔ اس نے دو تین سلائس، انڈے اور اورنج جوس سے کام چلایا۔

ابا جان، تایا جان اور ماموں مراد صبح سویرے ہی گاڑی پر کہیں نکل گئے تھے۔ نور نے محسوس کیا تھا کہ وہ کچھ پریشان بھی ہیں۔ چودھری طغرل کے گھرانے کی عورتیں بھی کہیں دکھائی نہیں دی تھیں۔ کل چوڑیوں کی خریداری کے موقع پر ابدال کی دو بہنیں نظر آئی تھیں مگر انہوں نے آنکھ نہیں ملائی تھی۔ نور اور مہرین نے اندازہ لگایا تھا کہ شاید طغرل گھرانے کے ساتھ کوئی تلخ ترش بات ہوئی ہے۔ تائی امی، چھوٹی امی زلفت اور پھوپھا جرہ وغیرہ کا بھی یہی خیال تھا۔

ناشتے کے فوراً بعد مہرین اس کے سر پر سوار ہوگئی۔ ''چلو بھئی چلیں۔ اس مرتبہ بڑا زبردست آسمانی جھولا آیا ہے۔ مزہ آجائے گا۔ دور دور تک سارا علاقہ نظر آئے گا۔''

''مہرین! آج نہیں۔ طبیعت بالکل بھی نہیں چاہ رہی۔''

''یار چھوڑو۔ دادی جان کی باتوں کو دل سے نہ لگایا کرو۔ تمہیں تو پتا ہے وہ جیسی ہیں۔''

وہ چپ رہی۔ وہ اسے کیا بتاتی، بات صرف دادی جان ہی کی نہیں تھی، یہاں کون تھا جو اسے اپنایت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ وہ ہر وقت جیسے بے مہر اجنبیوں کے حصار میں رہتی تھی۔ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے وہ ان گنت سوالیہ نگاہوں کی چبھن اپنے جسم پر محسوس کرتی تھی...... دیکھو اس لڑکی کو...... یہ مولوی اشفاق مہرا کی بیٹی ہے۔ یہ بتول اور بسمہ کی بہن ہے۔ یہ اپنے بڑوں کی نافرمان ہے۔ اسے باپ نے دھتکارا ہوا ہے۔ یہ ایک ایسا کام کرتی ہے جو عورتوں کے لیے باعثِ ننگ ہے۔

مہرین نے اپنی انگلی سے نور کے پہلو میں کچوکا دیا۔ ''کیا مایوس صورت بنائی ہوئی ہے۔ بھئی، ہم کسی جہلم میں نہیں، میلے پر آئے ہوئے ہیں۔ دو دن بعد اس میلے سے دور ہوں گے اور ہر طرح کے جھمیلے سے قریب ہوں گے۔ چلو اٹھو، میں آج تمہیں گھر میں نہیں رہنے دوں گی۔''

چھوٹی امی بھی آگئیں۔ وہ پہلی مرتبہ اس میلے میں آئی تھیں اور بہت انجوائے کر رہی تھیں۔ اس میلے کی انوکھی رسموں ریتوں نے بھی انہیں متاثر کیا تھا۔

چھوٹی امی اور مہرین کے زور دینے پر وہ بادل ناخواستہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ براؤن شلوار قمیص کے اوپر اس نے گہری براؤن جرسی پہنی اور لمبی شال کے ساتھ اسکارف پہن کر تیار ہوگئی۔ میلے کی گہما گہمی میں اضافہ ہو چکا تھا۔ بارش کے اندیشے کے پیشِ نظر خیمہ زن لوگوں نے اپنے خیموں پر بڑے بڑے پلاسٹک منڈھ دیے تھے اور دیگر احتیاطی تدابیر کی تھیں۔ کسی قریبی میدان میں آج کشتیوں کے مقابلے بھی ہو رہے تھے تاہم وہ ایونٹ شام کا تھا۔ ابھی تو لوگ دیگر تفریحات سے لطف لے رہے تھے۔ آپی بتول بسمہ اور ممانیوں سمیت مہرا فیملی کی اکثر عورتیں برقعوں میں تھیں۔ جو نہیں تھیں، انہوں نے بھی چہرے حجاب یا نقاب

میں چھپا رکھے تھے۔

اچانک نور نے محسوس کیا کہ نہ چاہنے کے باوجود اس کی نگاہیں ادھر ادھر بھٹک رہی ہیں...... ایسا کیوں ہو رہا تھا؟ وہ اسے کیوں دیکھ رہی تھی؟ کیا وہ چاہتی تھی کہ وہ اسے نظر آئے...... یا وہ یہ چاہتی تھی کہ وہ اسے نظر نہ آئے؟ نہیں نہیں، وہ اسے دیکھنے کے لیے تو نہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ اسے کیوں دیکھنا چاہے گی؟ وہ شاید لاشعوری طور پر چاہتی تھی کہ وہ یہاں سے جا چکا ہو۔ اس کا اردگرد نظر نہ آنا ہی نور کے لیے اچھا تھا۔ ہاں اسی لیے وہ اسے دیکھ رہی تھی۔

سب لڑکیاں آسمانی جھولے پر بیٹھیں اور دو تین بار بیٹھیں، جب بلند و بالا جھولا اوپر جاتا تھا تو اردگرد کا علاقہ دور تک دکھائی دیتا تھا۔ پورا موراں والی گاؤں، اس کی گلیاں، اس کے پیچ و خم اور پھر آگے مویشی منڈی، خریداروں کا ہجوم، بائیں طرف ڈھائی تین کلومیٹر کے فاصلے پر بارشی نالے کا مٹیالا پانی اور اس پانی کے کنارے پرکھوں کی پرانی حویلی جہاں وہ قیام پذیر تھے۔ حویلی کے باہر کھڑی ان کی دو گاڑیاں کھلونوں کی طرح نظر آ رہی تھیں۔ اس نالے کے پار آگے تک درختوں، جھاڑیوں اور سرکنڈوں کے سلسلے تھے اور اس کی دوسری جانب پولیس چوکی کی چھت خاکستری دھبے کی طرح دکھائی دیتی تھی۔ اس چھت پر شاید پولیس والوں کی وردیاں سوکھ رہی تھیں۔ دائیں کنارے پر ایک چٹیل میدان تھا جہاں سیم تھور کی سفیدی تھی۔ اس میدان کی ایک جانب موراں والی گاؤں کے کھیت شروع ہو جاتے تھے، جن میں سے کچھ پر ٹریکٹر چلائے گئے تھے اور کچھ پر کھاد، مکئی اور سرسوں کے کھیت لہلہا رہے تھے۔ ان کے درمیان پگڈنڈیاں اور گزرگاہیں تھیں۔ دور ایک ڈیرے پر ٹیوب ویل کے پانی کی موٹی دھار چاندی کی طرح چمکتی تھی۔ اس کے اردگرد بچے دوڑتے تھے اور چند عورتیں کپڑے دھوتی تھیں۔

جھولا ابھی رکا ہوا تھا۔ اس کی ڈولی بلندی پر تھی۔ مہرین نے کہا۔ ''اوپر سے چیزوں کو دیکھنا کتنا اچھا لگتا ہے۔''

''ہوں۔'' نور نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

مہرین بولی۔ ''آج تو وہ کہیں نظر نہیں آیا۔''

''اللہ کرے نہ ہی آئے۔''

''سچ کہہ رہی ہو؟'' وہ مسکرائی۔

''جب اس طرح بات کرتی ہو تو زہر لگتی ہو۔'' وہ چڑ کر بولی۔

وہ دونوں اس ڈولی میں اکیلی تھیں۔ اچانک نور کی نگاہ دور نیچے ایک منظر پر پڑی۔ اس نے چودھری طغرل کے چوڑے چکلے بیٹے ابدال کو دیکھا۔ وہ چمکیلے شلوار کرتے اور واسکٹ میں تھا۔ کندھوں پر چودھریوں کے انداز میں تہ شدہ گرم شال ڈال رکھی تھی۔ (یہ وہی تھا جس کے لیے پہلے آپی بتول اور پھر بسمہ کا رشتہ مانگا گیا تھا) ابدال کے پاس ہی ابا جان کا پرانا ملازم خدا بخش تھا۔ کافی فاصلہ تھا، پھر بھی پتا چل رہا تھا کہ ابدال بڑے سخت لہجے میں خدا بخش سے کچھ کہہ رہا ہے۔ کسی طرح کی تلخ کلامی تھی، پھر دو تین بندے آگے آئے اور انہوں نے صلح صفائی کا کردار ادا کیا۔

''یہ کیا چکر ہے؟'' مہرین الجھن سے بولی۔

''لگتا ہے کہ دو تین دن سے کچھ گڑبڑ ہے۔ کل ماموں مراد بھی بڑے غصے میں نظر آ رہے تھے۔''

''کہیں وہ پرانا معاملہ ہی تو پھر اٹھ کھڑا نہیں ہوا۔'' مہرین نے ذرا تشویش سے کہا۔

''یہ تو بڑے ہی بتا سکتے ہیں۔ تم جا کر ابا یا تایا جان سے پوچھنا۔''

اس منظر نے مہرین کا مزہ کرکرا کر دیا تھا۔ اس کا تفریحی موڈ ختم ہوتا نظر آ رہا تھا۔ گرم شال کو مضبوطی سے اپنے گداز شانوں پر لپیٹ کر بولی۔ ''پتا نہیں کب چلے گا جھولا؟''

''تمہیں تو بلندی اچھی لگ رہی تھی؟'' نور نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔ (ویسے وہ بھی پریشان تھی)۔

''وہ تو ٹھیک ہے، مگر سردی بھی بڑی ہے۔''

''بلندی اچھی یا بری نہیں ہوتی۔ اردگرد کے منظر اچھے یا برے ہوتے ہیں۔ بلندی صرف اتنا کرتی ہے کہ ہمیں زیادہ کچھ دکھا دیتی ہے اور تفصیل سے۔''

''اچھا زیادہ فلسفہ نہ بگھارو۔ دعا کرو کہ یہ آسمانی چرخا چل پڑے۔ ہمیں اب گھر چلنا چاہیے۔'' مہرین نے اپنے مرمریں ہاتھ اوورکوٹ کی جیبوں میں گھسیڑتے ہوئے کہا۔

اسی دوران میں جنریٹر کی آواز بلند ہوئی اور جھولا حرکت میں آ گیا۔

☆☆☆

شام ہوتے ہی گہرا اندھیرا چھا گیا اور مینہ تواتر سے برسنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی لائٹ بھی چلی گئی۔ جنریٹر کل سے کام نہیں کر رہا تھا۔ حویلی میں لالٹین اور گیس کیمپس روشن کر دیے گئے۔ حویلی سے تقریباً تین کلومیٹر دور موراں والی میں بھی یقیناً میلے کی سرگرمیاں ماند پڑ چکی تھیں۔ حویلی سے باہر چاروں طرف وہی خاموشی اور یکسانیت تھی جو

متواتر برستی بارش میں ماحول کا حصہ ہوتی ہے۔ سردیوں کی طویل رات سر پر تھی اور صبح بہت دور تھی۔

نور، مہرین، بسمہ اور بتول ایک ہی کمرے میں بیٹھی انگیٹھی پر ہاتھ تاپ رہی تھیں۔ رشتے میں ان کے ایک چچا تھے جو انگلینڈ سے آئے ہوئے تھے۔ وہ ملتان میں رہتے تھے۔ ملتان سے میلا دیکھنے یہاں پہنچے تھے اور اچھی کوالٹی کا ملتانی سوہن حلوا بھی اپنے ساتھ لائے تھے۔ سوہن حلوا سامنے پڑا تھا مگر لڑکیوں نے بس چکھنے پر اکتفا کیا تھا۔ گیس لیمپ کی روشنی نے ماحول کو غنودہ سا کر رکھا تھا۔ کچن میں ملازمائیں کھانا تیار کر رہی تھیں اور پلاؤ اور پالک گوشت کی خوشبو اونچی چھتوں والے کمروں میں چکرا رہی تھی۔

نور نے چھوٹے شیشوں والی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ احاطے سے آگے حویلی کے چوبی گیٹ کے پاس دو پہریدار حسب معمول ایک شیڈ کے نیچے لکڑی کے اسٹولوں پر بیٹھے مونگ پھلی کھا رہے تھے۔ ان کے ہتھیار تو میلے کے آغاز میں ہی جمع ہو چکے تھے، اب وہ بس لاٹھیوں سے مسلح تھے۔

نور نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ’’ابا جان اور تایا ابا ابھی تک نہیں آئے۔ اللہ خیر کرے۔‘‘

’’بارش کی وجہ سے رک گئے ہوں گے۔‘‘ بسمہ خود کو تسلی دینے والے انداز میں بولی۔

’’انہوں نے کون سا پیدل آنا تھا۔‘‘ بتول نے اپنی شیر خوار بچی کو چھاتی سے لگا کر اس پر اپنی گرم شال پھیلاتے ہوئے کہا۔

’’تائی امی نے کچھ نہیں بتایا؟‘‘ نور نے مہرین سے پوچھا۔

’’انہیں بھی کچھ زیادہ پتا نہیں۔ بس یہی کہہ رہی تھیں، شاید کوئی لین دین کا جھگڑا ہے۔‘‘

’’مگر ماموں مراد تو بڑے غصے میں لگ رہے تھے اور وہ چھوٹی موٹی بات پر غصے میں نہیں آتے۔‘‘

اسی دوران میں گاڑی کی آواز سنائی دی۔ ’’شاید ابا جان آ گئے ہیں۔‘‘ بسمہ بولی اور جلدی سے دروازے کی طرف بڑھی۔

اندازہ درست ہی تھا۔ آنے والے ابا جان اور تایا ابا ہی تھے۔ دو ملازم چھتریاں تان کر ان کو برآمدے تک لے آئے۔ ان کی شیروانیوں پر بارش کے چھینٹے تھے۔ دونوں کو دیکھ کر ہی پتا چل جاتا تھا کہ ان کے موڈ سخت خراب ہیں۔ لڑکیوں میں سے کسی کو ہمت نہیں ہوئی کہ ان سے کوئی سوال کرتی۔ رات کا کھانا بھی بے دلی سے کھایا گیا۔ خلافِ معمول نور کے ابا جان اور تایا ابا سمیت سب مردوں کا کھانا مردانے میں ہی بھیج دیا گیا۔

نور کافی تھکی ہوئی تھی۔ دادی اماں کی بات کی وجہ سے کل رات اسے بارہ ایک بجے تک نیند نہیں آئی تھی۔ صبح سویرے مہرین نے جگا کر بٹھا دیا تھا۔ اب وہ جلدی سونا چاہتی تھی۔ عشا کی نماز پڑھ کر وہ صوفے پر نیم دراز ہوئی اور وہیں آڑی ترچھی پڑی سو گئی۔

وہ کھانسی کی وجہ سے جاگی تھی، وہ خوش خوراک ضرور تھی لیکن پرہیزی کھانا کھاتی تھی۔ کل دوسری لڑکیوں کے ساتھ چند گول گپے کھا کر اس کا گلا خراب ہو گیا تھا۔ اس نے دیکھا، مہرین اور بسمہ بھی ایک ہی پلنگ پر ڈبل لحاف کے نیچے سوئی پڑی تھیں۔ گیس لیمپ کی روشنی کچھ مدھم ہو گئی تھی اور انگیٹھی تقریباً بجھ چکی تھی۔ باہر بادل گرج رہے تھے اور بارش کبھی آہستہ کبھی تیز ہو جاتی تھی۔ اس نے الماری سے کھانسی کا سیرپ نکالا اور ڈیڑھ ڈھکن پیا۔ بکھرے بالوں کو جوڑے کی شکل میں باندھتے ہوئے اور ہیئر پن اپنے ہونٹوں میں دبائے ہوئے اس نے وال کلاک پر نگاہ ڈالی۔

ابھی صرف ساڑھے نو ہی بجے تھے مگر لگتا تھا کہ آدھی رات ہو چکی ہے۔ لحاف میں گھسنے سے پہلے وہ دروازے کو بولٹ کرنے کے لیے آگے بڑھی تو اسے مدھم آوازیں سنائی دیں۔ یوں لگا جیسے ابا جان، تایا خلیل اور ماموں مراد کسی بات پر جھگڑ رہے ہیں۔ وہ مردانے حصے میں تھے اس لیے آواز نہ ہونے کے برابر تھی۔ بس گونج سی اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔

نور میں تجسس تو پہلے سے ہی جاگا ہوا تھا۔ اس نے شال اوڑھی، یخ بستہ چپل پہنی اور باہر نکل آئی۔ ساتھ والے کمرے میں، چھوٹی امی زلفت، آپی بتول کی بڑی بیٹی حنا کو اپنے ساتھ لگائے لحاف کے نیچے اونگھ رہی تھیں۔ باقی لوگ بھی سو چکے تھے۔ فقط کامن روم میں سے دادی جان کے کھانسنے اور بڑبڑانے کی صدا آ رہی تھی۔

نور دبے پاؤں چلتی نیم روشن راہداریوں سے گزری اور ایک بند دروازے کی چٹخنی بہت آہستہ سے اتار کر مردانے حصے میں آ گئی۔ آوازیں اب واضح سنائی دینے لگی تھیں مگر الفاظ اب بھی پوری طرح سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ وہ بڑی بیٹھک کے سامنے پہنچ کر رک گئی اور سننے لگی۔

ابا جان کی سخت آواز ابھری ...... ’’میں پھر کہتا ہوں۔ مجھے ان کی نیت ٹھیک نہیں لگتی۔ میرا تو مشورہ ہے کہ سویرا ہوتے ہی نکل جائیں۔‘‘

’’ایسی بھی لٹ نہیں پڑی ہوئی بھائی جان! ان کی

اینٹ کا جواب پتھر سے دے سکتے ہیں ہم۔ مگر اندر کی بات کا تو پتا چلے کہ اچانک یہ کایا پلٹ ہوئی کیوں ہے؟'' یہ چھوٹے چچا احسان کی آواز تھی جو ایک ماہ پہلے انگلینڈ سے پاکستان آئے تھے۔

''میں تمہیں بتاتا ہوں احسان۔'' تایا خلیل کی پاٹ دار آواز نور کے کانوں تک پہنچی۔ خاموشی کے ایک وقفے کے بعد وہ ٹھہرے لہجے میں بولے۔ ''سارا معاملہ چودھری طغرل کی ماں کے مرنے کے بعد خراب ہوا ہے اور اس کی ایک خاص وجہ ہے۔ دراصل چودھری طغرل اور اس کا گھرانا اپنی ضد سے کبھی بھی پیچھے نہیں ہٹا تھا۔ میں ان لوگوں کی تین نسلوں کو جانتا ہوں۔ ان کی طبیعت کتے کی اس دم جیسی ہے جو سو سال حقے کی نال میں رہ کر بھی ٹیڑھی کی ٹیڑھی رہتی ہے۔''

''تو پھر وہ صلح صفائی کیا تھی۔ ان لوگوں نے تیسری پنچایت میں خود کہا تھا کہ معاملہ ختم ہوگیا ہے۔''

''نہیں احسان! معاملہ ختم نہیں ہوا تھا۔ یہ کبھی بھی ختم نہیں ہوا۔ زہر ان کے اندر پلتا رہا ہے۔ انہوں نے سب سے پہلے بتول کا رشتہ مانگا۔ پنچایت کا فیصلہ ہمارے حق میں آیا اور ہم نے فوراً بتول کی شادی کردی۔ اسی دوران میں ابدال کا چچا سکندر ایم پی اے بن گیا۔ اس نے سب سے پہلا کام یہی کیا کہ اپنی ضد کی باسی کڑی میں ابال لا دیا۔ اسی کے کہنے پر ان لوگوں نے بتول کے بعد بسمہ کا رشتہ مانگنا شروع کردیا۔ تم سب کو یاد ہوگا اس مرتبہ پنچایت نے بھی ان کا ساتھ دیا تھا۔ ان دنوں حالات بڑے خراب ہوگئے تھے۔ کسی وقت تو لگتا تھا کہ شاید بسمہ کو زبردستی ہم سے چھین لیا جائے گا۔ بہرحال اللہ نے کرم کیا۔ ایک روز ماں جی (نور کی دادی) خاموشی کے ساتھ اپنی سہیلی وڈی اماں (طغرل کی ماں) کے پاس گئیں۔ کسی زمانے میں یہ دونوں عورتیں دوپٹا بدل بہنیں بھی بنی تھیں۔ دوپٹا بدلی کی یہ رسم اماناں والے کے مزار پر ہوئی تھی۔ ماں جی نے اس روز وہی تیس سال پرانا دوپٹا طغرل کی ماں کے قدموں میں رکھ دیا اور اس سے کہا کہ وہ اس دوپٹے کے صدقے اس کی پوتی بسمہ کو معاف کردے۔ وڈی اماں بھی اپنے زمانے کی مانی ہوئی ہٹ دھرم تھی۔ پر کچھ ویلے ایسے ہوتے ہیں جب بندہ نرم پڑ جاتا ہے۔ پتا نہیں اس دن دونوں عورتوں میں کیا کیا باتیں ہوئیں اور کس طرح ہوئیں۔ آخر وڈی اماں نے وہ دوپٹا دوبارہ ہماری ماں کے سر پر رکھ دیا...... اور اس سے کہا کہ وہ اپنے بیٹوں کو سمجھانے کی پوری کوشش کرے گی...... ساتھ ہی اس نے ماں جی سے یہ بھی کہا کہ معاملہ ذرا ٹھنڈا ہوجائے تو وہ اپنے بیٹوں اور پوتریوں کو لے کر یہاں سے چلی جائے......''

تایا ابا کے اگلے ایک دو جملے نور کی سمجھ میں نہیں آئے کیونکہ بادل زور سے گرجے تھے اور در و دیوار جیسے لرز گئے تھے۔

تب تایا ابا کی آواز دوبارہ نور کے کانوں تک پہنچی...... ''خدا جانے اس عورت نے اپنے بیٹے طغرل اور پوتروں ابدال وغیرہ کو کس طرح ان کے منحوس ارادوں سے باز رکھا اور وہ کس طرح باز آئے۔ بہرحال یہ کام ہوگیا......''

اس موقع پر چھوٹے ماموں مراد نے کچھ کہا۔ چونکہ وہ دور بیٹھے تھے اس لیے الفاظ نور کی سمجھ میں نہیں آئے۔ یہی اندازہ ہوا کہ انہوں نے کھا پریوں کی کمینگی کے بارے میں کوئی بات کی ہے۔

نور کو ہر گھڑی یہ دھڑکا بھی لگا ہوا تھا کہ کہیں کوئی اسے یہاں دروازے سے لگا دیکھ نہ لے۔ اندر ہونے والی گفتگو کے اثرات سے اس کا دل بے طرح دھڑکنا شروع ہوگیا تھا۔

اچانک احاطے کی طرف سے ایک بلند آواز نور کی سماعت تک پہنچی۔ پہلے تو وہ اسے چوکیدار کا آوازہ سمجھی لیکن پھر پتا چلا کہ یہ آواز حویلی کے باہر سے آئی ہے۔ بیٹھک کے اندر سے کسی نے کھڑکی کھولی۔ شاید آواز کا ماخذ جاننے کی کوشش کی تھی۔

نور کا پول کھل سکتا تھا۔ وہ الٹے قدموں واپس مڑی اور اسی طرح بلی کی چال چلتی ہوئی واپس کوریڈور میں اور پھر اپنے کمرے میں پہنچ گئی۔ رکھوالی کے کتے مسلسل شور مچا رہے تھے۔

جب وہ کمرے میں پہنچی تو اسے یوں لگا، جیسے حویلی کے پھاٹک سے باہر کئی افراد موجود ہیں اور بلند آواز میں بول رہے ہیں۔ اس نے کھڑکی تھوڑی سی کھولی۔ سرد ہوا سوئیوں کی طرح چہرے سے ٹکرائی۔ اس کے ساتھ ہی نور پر انکشاف ہوا کہ حویلی سے باہر کافی زیادہ لوگ جمع ہیں اور غالباً ان کی ٹارچوں اور لالٹینوں وغیرہ کی روشنی تھی جو بلند چار دیواری کے پار دکھائی دے رہی تھی۔

ہوا کی کاٹ سے بچنے کے لیے اس نے جلدی سے کھڑکی کا پٹ بند کردیا۔

یہ کون لوگ تھے؟

اس وقت اس خراب موسم میں یہاں کیوں آئے تھے؟

کہیں یہ؟...... کہیں یہ......؟

وہ اس سے آگے سوچ ہی نہیں سکی۔ اس نے بے تاب ہوکر دوبارہ کھڑکی کھولی۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ شور بڑھتا جارہا تھا۔ یہ دس بیس یا چالیس پچاس لوگ نہیں تھے۔ یہ بہت زیادہ تھے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ حویلی کی چاروں طرف موجود ہیں اور قہرناک آوازوں میں للکار رہے ہیں۔ چند لمحوں کے لیے گہرے بادلوں میں سے چاند تے ایک جھلک دکھائی اور دوبارہ اوجھل ہوگیا۔ ہوا کے یخ بستہ تھپیڑوں نے کمرے کی رہی سہی حرارت بھی ختم کردی۔

بسمہ کسمسا کر اٹھ بیٹھی۔ اس کے دراز ریشمی بال بکھرے ہوئے تھے اور جسم پر ویلوٹ کی گلابی قمیص بے ترتیب تھی۔ ''کیا ہوا نور؟'' اس نے ہراساں آواز میں کہا۔

''کچھ نہیں۔ شاید کچھ لوگ ہیں باہر۔'' نور نے دوبارہ کھڑکی بند کردی۔ اس کا منہ خشک ہونا شروع ہوگیا تھا۔

☆☆☆

یہ سب کیا ہورہا تھا؟ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ دیگر خواتین بھی جاگ گئی تھیں اور بدحواسی کے عالم میں ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ برآمدے میں گیس لیمپس کی روشنیاں دکھائی دیں۔ نور نے دیکھا، تایا ابا احاطہ پار کرکے مین گیٹ کی طرف جارہے تھے۔ ملازم خدا بخش نے ان پر چھتری کا سایہ کررکھا تھا۔ ماموں مراد، احسان اور دیگر افراد برآمدے میں ہی کھڑے تھے۔ نور نے ایک بار پھر کمرے کی کھڑکی تھوڑی سی کھول دی تاکہ باہر کی آوازیں سنی جاسکیں۔ چھوٹی امی، پھپو حاجرہ، تائی راحت اور دیگر خواتین بھی اس ادھ کھلی کھڑکی کے پاس آگئیں۔ لوہے اور کھڑکی کے اس مضبوط گیٹ میں ایک چھوٹا دروازہ بھی تھا۔ نور کے تایا ابا نے شاید یہی دروازہ کھولنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا مگر اسی دوران میں حویلی کا پرانا ملازم فدا حسین لپک کر ان کے پاس پہنچ گیا۔ ''نہیں مالک!'' وہ ہراساں آواز میں بولا۔ ''دروازہ نہ کھولیں۔ مجھے ان کے ارادے اچھے نہیں لگتے۔''

''تو پھر؟'' تایا ابا کی آواز نور وغیرہ کے کانوں تک پہنچی۔

فدا حسین آگے بڑھا اور اس نے گیٹ میں ایک جانب موجود وہ چھوٹا سا روزن کھول دیا جس میں سے باہر جھانکا جاسکتا تھا۔

تایا ابا اس روزن کے سامنے کھڑے ہوگئے۔ انہوں نے باہر کسی سے مخاطب ہوکر کہا۔ جواب میں چودھری طغرل کی بلند آواز سنائی دی۔ ''دروازہ کھولو خلیل! ہم تم سے بات کرنے آئے ہیں۔''

''بات کرنے کا یہ کون سا وقت اور طریقہ ہے۔'' تایا خلیل نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔

''یہی طریقہ ہے ...... یہی طریقہ ہے۔'' ایک اور گرجدار آواز سنائی دی۔ یہ یقیناً طغرل کے بڑے بیٹے ابدال کی تھی۔

پھر نجانے کیا ہوا، کوئی چیز گیٹ سے ٹکرائی اور ملازم فدا حسین نے لپک کر روزن کو بند کردیا۔ جونہی روزن بند ہوا گیٹ کو دھکیلا جانے لگا اور اس پر ہتھوڑے سے برسنے لگے۔ چودھری طغرل کی للکار سنائی دی۔ ''دروازہ کھولو خلیل! نہیں تو توڑ دیں گے ہم۔''

اب نور کے ابا جان، ماموں مراد اور تایا زاد بھائی شرجیل اور عثمان وغیرہ بھی بارش کی پروا کیے بغیر احاطے میں نکل آئے تھے۔ رکھوالی کے کتوں نے جیسے شدید خطرے کی بو سونگھ لی تھی اور مسلسل شور مچا رہے تھے۔ حویلی کی چودہ فٹ بلند باؤنڈری وال کی دوسری جانب بیسیوں افراد کے للکارے سنائی دے رہے تھے۔

نور کے ابا جان نے ماموں مراد کو مخاطب کرکے بلند آواز میں کہا۔ ''مراد! ٹیلی فون کرو...... پولیس چوکی میں فون کرو۔''

ان کی آواز یقیناً باہر بھی سنی گئی تھی۔ باہر سے چودھری طغرل کی دہاڑ سنائی دی۔

''مولوی مہرا! خیریت چاہتا ہے تو دروازہ کھلوا دے۔ ورنہ آج سارے اگلے پچھلے حساب برابر ہوجائیں گے۔ ابھی اسی وقت۔''

یہی وقت تھا جب نور نے دیکھا کہ ماموں مراد کامن روم کی طرف سے گھبرائے ہوئے نکلے۔ پھپو حاجرہ نے کھڑکی میں سے پوچھا۔ ''کیا ہوا مراد؟''

وہ دانت پیس کر بولے۔ ''حرامزادوں نے فون کے تار کاٹ دیے ہیں۔''

''ہائے اللہ! اب کیا ہوگا؟'' پھپو نے سینے پر ہاتھ رکھا۔

ماموں مراد جواب دیے بغیر احاطے کی طرف چلے گئے۔

اسی دوران میں حویلی کی بالائی چھت پر سے چوکیدار گل محمد پکارا۔ ''مہرا صاحب! یہ لوگ سیڑھی لگا کر دیوار پر چڑھنے کی کوشش کررہے ہیں۔''

تب نور اور دیگر عورتوں نے خوفزدہ نظروں سے دیکھا...... گیٹ کے دونوں چوکیدار لاٹھیاں سونت کر باؤنڈری وال کی طرف لپکے۔ باؤنڈری وال کے بالائی

سرے پر دو انسانی سر دکھائی دے رہے تھے۔ یقیناً یہ وہی افراد تھے جو اندر گھسنے کی کوشش میں تھے۔ چوکیدار نے بے دریغ ان پر لاٹھیاں برسائیں ...... دونوں ہیولے اوجھل ہوگئے۔ اب صاف پتا چل رہا تھا کہ یہ کھلی لڑائی کی شکل بن گئی ہے۔ عین ممکن تھا کہ اس صورتِ حال میں فائرنگ یا ہوائی فائرنگ بھی شروع ... ہوجاتی مگر حویلی میں اسلحہ کسی کے پاس نہیں تھا اور شاید باہر والوں کے پاس بھی نہیں تھا۔

ماموں مراد، شرجیل اور عثمان وغیرہ سرتاپا آتش بن گئے تھے۔ ماموں مراد نے ملازموں کو بھی ساتھ لیا اور حویلی کی ''لوردف'' پر چلے گئے۔ یہاں سے وہ کسی بھی ایسے شخص کو روک سکتے تھے جو سامنے سے بیرونی دیوار پر سے اوپر چڑھنے کی کوشش کرتا۔ باہر سے سنائی دینے والا شوروغل بڑھتا جارہا تھا اور پتا چلتا تھا کہ یہ لوگ حویلی کی چاروں طرف موجود ہیں۔ حویلی میں مہرا فیملی کے قریباً پندرہ مرد اور بیس عورتیں تھیں۔ لاہور سے آنے والے سات آٹھ مہمان حویلی کے مہمان خانے میں بھی موجود تھے۔ اس کے علاوہ حویلی کے ملازم تھے جن میں ایک مالی، اس کے دو جوان بیٹے، خانساماں اور چوکیدار وغیرہ شامل تھے۔

تین چار منٹ کے اندر اندر سب لوگوں کو صورتِ حال کی شدید سنگینی کا احساس ہوگیا۔ شرجیل کو جب پتا چلا کہ کچھ افراد دو بانسی سیڑھیاں لے کر حویلی کی عقبی دیوار کی طرف گئے ہیں تو وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اوپر والی چھت پر چلا گیا اور وہاں سے ان لوگوں پر اینٹیں وغیرہ برسائیں اور انہیں اوپر نہیں چڑھنے دیا۔

عورتوں کے رنگ فق ہو رہے تھے۔ دادی اماں بھی آ گئی تھیں اور انہیں دیکھ کر تو یہی لگ رہا تھا کہ انہیں دل کا دورہ پڑ جائے گا۔ وہ سرتاپا لرزنے لگی تھیں۔ باہر بارش ہلکی ہوگئی تھی، تاہم گاہے بگاہے بجلی چمکتی تھی اور احاطے کے مناظر روشن ہوجاتے تھے۔ مہرین، نور اور بسمہ زینے چڑھ کر دوسری منزل پر آ گئیں۔ یہاں سے منظر زیادہ وضاحت سے دکھائی دے رہا تھا۔ یہ دیکھ کر نور کا دل بیٹھ گیا کہ اس تاریک سنسان رات میں ان کی حویلی سے باہر بپھرے ہوئے دیہاتیوں کی ایک کثیر تعداد موجود تھی۔ ان کے ہاتھوں میں کلہاڑیاں اور چمکیلے کوکوں والی لاٹھیاں چمک رہی تھیں۔ کچھ کے ہاتھوں میں پرانی طرز کی برچھیاں بھی دکھائی دیتی تھیں۔ اسلحہ تھانے میں جمع ہوچکا تھا ورنہ یقیناً وہ بھی موجود ہوتا۔ ان لوگوں کی بھڑکوں اور للکاروں سے پتا چلتا تھا کہ ان میں سے کئی نشے میں ہیں۔ شاید خشت باری سے ان کے کچھ ساتھی زخمی بھی ہوگئے تھے۔ وہ گندی گالیاں بک رہے تھے اور خطرناک نتائج کی دھمکیاں دے رہے تھے۔

نور حوصلہ مند لڑکی تھی، سکہ بند نسوانیت سے اسے زیادہ تعلق نہیں تھا مگر اس موقع پر اس کا دل بھی خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرزنے لگا۔

دوسری منزل سے وہ گفتگو واضح سنائی دینے لگی جو تایا ابا اور چودھری طغرل وغیرہ کے درمیان ہو رہی تھی۔ یہ گفتگو بڑی بلند آواز میں ہو رہی تھی، وجہ یہی تھی کہ چودھری طغرل گیٹ کی دوسری طرف تھا۔ چودھری طغرل دہاڑ رہا تھا۔

''اوئے مہرا! دعائیں دو اس عورت کو جس کی وجہ سے اب تک بچے ہوئے تھے تم۔ اس کے پاؤں دھو دھو کر پیتے تو بھی کم تھا۔'' (وہ اپنی ماں کا ذکر کر رہا تھا)

نور کے تایا ابا نے کہا۔ ''تو پھر اب کیا ہوگیا ہے چودھری؟ اب کیوں کر رہے ہو یہ سب کچھ؟ کیوں طوفان کھڑا کر رہے ہو؟''

''اب وہ نہیں رہی۔ وہ چلی گئی ہے۔ مرگئی ہے، صبر کا گھونٹ پی کر اور اس کے ساتھ ہی وہ بات بھی ختم ہوگئی ہے۔ اب ہمیں اپنی منگ چاہیے۔ تمہیں پتا ہے ہم کھاپری ہیں اور کھاپری اپنی بات ویاہنے کے لیے سو سال تک بھی انتظار کرتے ہیں۔''

''غلط بات نہ کرو چودھری! تم چنگی طرح جانتے ہو، کوئی منگنی نہیں ہوئی تھی۔ بس ایک اڑتی اڑتی بات تھی جس کو تم نے بتنگڑ بنایا اور اب تو وہ بات بھی ختم ہوچکی تھی...... سب کو پتا ہے کہ......''

''نہیں ہوئی تھی بات ختم...... نہیں ہوئی تھی۔'' طغرل خلیل مہرا کی بات کاٹ کر دہاڑا۔ ''تم مولویوں کو کیا پتا کہ ہم نے کیا کیا باتیں سنی ہیں لوگوں کی۔ کہاں کہاں ہماری پگ گری ہے اس رشتے کی وجہ سے۔ بزدلی، بے غیرتی کے طعنے سنے ہیں ہم نے۔ بس اس ماں کی وجہ سے چپ تھے......''

طغرل کے بعد اس کا چھوٹا بھائی سابق ایم پی اے سکندر بولا۔ ''مولوی اشفاق! اب بھی ہم تیری بیٹی کو اٹھانے کے لیے نہیں ویاہنے کے لیے آئے ہیں۔ شرع کے مطابق اسے ڈولی میں بٹھا کر لے جائیں گے۔ اسے نوں (بہو) بنانا ہے ہم نے۔ اپنے ان غنڈوں کو باز کر جو اینٹیں چلا رہے ہیں۔ ورنہ پھر فساد ہوگا اور وہ سب کچھ ہوگا جو ہم نہیں چاہتے۔''

زور سے بجلی چمکی اور چند سیکنڈ کے لیے قرب و جوار دور تک روشن ہوگئے۔ نور کی نگاہوں نے ایک حیران کن منظر کی جھلک دیکھی۔ ایک سفید گھوڑی پر ایک شخص سہرا

باندھے بیٹھا تھا۔ اس کے اردگرد چمکیلے کپڑوں والے کچھ لوگ براتیوں کی طرح موجود تھے۔ سہرے والا شخص یقیناً ابدال ہی تھا۔ نور کے سینے میں دل جیسے ٹھہر گیا۔ سخت سردی کے باوجود اس کے جسم کے ہر مسام سے پسینا بہہ نکلا۔ اس نے کن انکھیوں سے بسمہ کی طرف دیکھا، وہ شاید یہ منظر نہیں دیکھ پائی تھی مگر مہرین کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اس نے وہ جھلک دیکھی ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ صورت حال اس سے کہیں زیادہ سنگین ہے جتنی وہ سمجھ رہے ہیں۔

''یا اللہ رحم کر۔'' نور کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

اشفاق مہرا نے آگے بڑھ کر کہا۔ ''کچھ شرم کرو چودھری۔ کیا یہ طریقہ ہوتا ہے بیٹیوں کو بیاہنے کا۔ تمہاری دھی کی برات اس طرح آئے تو کیا تمہیں قبول ہوگی؟''

''میری دھی کی برات اس طرح نہیں آئے گی مولوی اشفاق، کیونکہ میرے منہ میں زبان ہے...... کسی پلید جانور کا چمڑا نہیں۔ ہم نے کل بھی تمہیں سمجھایا تھا۔ اب یہ کام ہونا ہی ہے، تم چاہو تب بھی، نہ چاہو تب بھی۔ چنگا یہی ہے کہ دروازہ کھول دو اور کڑی کو تیار کرو۔ نکاح خواں ساتھ ہے۔ ابھی سب کچھ ہوگا، ابھی اسی وقت۔''

یہی وقت تھا جب دائیں طرف سے پھر کچھ افراد نے دیوار پر چڑھنے کی کوشش کی۔ لٹھ بردار تیار تھے، وہ لپکے اور اندھا دھند لاٹھیاں برسا کر انہیں نیچے گرا دیا۔ اس واقعے کے فوراً بعد گھیراؤ کرنے والوں کے غیظ و غضب میں اضافہ ہوگیا۔ انہوں نے جیسے گیٹ پر ہلا ہی بول دیا تھا۔ انگریزوں کے دور کا یہ قدیم گیٹ کسی قلعے کے دروازے جیسا تھا۔ باؤنڈری وال کی طرح اس کے اوپر بھی نوکدار آہنی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ یہ اوپر سے بند تھا اور اسے پھاندا نہیں جاسکتا تھا۔ درجنوں افراد ایک ساتھ مل کر اسے دھکیلنے لگے اور وزنی چیزوں سے ضربیں لگانے لگے۔ یہ دہشت ناک مناظر تھے۔

ماموں مراد بھاگتے ہوئے ان کے پاس آئے۔ ان کا چہرہ آگ کی طرح سرخ تھا۔ وہ نور سمیت تینوں لڑکیوں سے مخاطب ہوکر بولے۔ ''یہاں کیا کر رہی ہو تم؟ چلو نیچے چلو۔ جب تک ہم نہ کہیں کوئی کمرے سے باہر نہ نکلے۔''

وہ انہیں لے کر نیچے آگئے۔ نیچے بھی کہرام سا مچا ہوا تھا۔ آپی بتول بے ہوش ہوگئی تھیں۔ چھوٹی امی ان کی ہتھیلیوں کی مالش کر رہی تھیں اور ساتھ ساتھ پانی پلانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ''آنکھیں کھولو، بتول! ہوش کرو۔'' پھپھو حاجرہ نے بے تاب ہوکر اسے جھنجوڑا۔

اس کی آنکھیں بند رہیں، تاہم وہ ہولے ہولے کراہنے لگی۔

''اب کیا ہوگا مراد۔'' تائی راحت نے دہشت زدہ لہجے میں پوچھا۔ ''کیا...... یہ لوگ...... بسمہ کی بات کر رہے ہیں...... بسمہ کے رشتے کی......؟''

''میں دوں گا ان کو رشتہ، بڑی اچھی طرح دوں گا۔'' مراد پھنکارا اور پھر کچن کے اندر سے ایک بڑی چھری نکال لایا۔ ''میں آنتیں نکال دوں گا اس کنجر ابدال کی اور اس کے باپ کی۔ مار ڈالوں گا سب کو۔''

وہ جیسے غصے سے دیوانہ ہوکر احاطے کی طرف بڑھا۔ عورتیں ایک ساتھ چلائیں۔ ان کی پکار سن کر چوکیدار اور دیگر افراد مراد کی طرف متوجہ ہوئے۔ مراد کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھول کر باہر نکلنا چاہتا ہے اور باہر نکلتے ہی ابدال کا پیٹ پھاڑ دے گا۔ شرجیل بھی اس کے عقب میں تھا۔

تین چار افراد نے مراد سے لپٹ کر اسے روک لیا اور کھینچ کر واپس برآمدے میں لے گئے۔ تایا خلیل نے مراد کو بری طرح ڈانٹا۔ پھر انہوں نے نور کے ابا جان سے کہا۔ ''اشفاق! تم ان لڑکوں کو لے کر اندر چلے جاؤ۔ ہم بات کر رہے ہیں۔ اس طرح کام اور خراب ہوجائے گا۔''

چھت پر سے ہونے والی خشت باری اب رک گئی تھی اور اس کی وجہ یہی تھی کہ فی الحال باہر سے دیوار پر چڑھنے کی کوشش بھی نہیں ہو رہی تھی۔

نور نے دیکھا، تایا ابا اور مہمان خانے سے نکلنے والے دو بارعب افراد گیٹ کے پاس کھڑے تھے۔ گیٹ کا چھوٹا روزن کھلا ہوا تھا اور کچھ بات چیت ہو رہی تھی۔ یہ بات چیت یقیناً تکرار کی شکل میں تھی لیکن آوازیں بلند نہیں تھیں۔ حویلی کے زیادہ تر مرد اور لڑکے چھت پر تھے۔ اگر باہر موجود مشتعل لوگوں میں سے کوئی باؤنڈری وال کی نوکدار سلاخیں پھلانگنے کی کوشش کرتا تو وہ اسے روکنے کے لیے تیار تھے۔

چند منٹ بعد تایا جان اور ابا جان ستے ہوئے منہ سے حویلی کے اندرونی حصے میں واپس پہنچ گئے۔ ملازم خدا بخش کے ہاتھ میں ایک گول طشتری تھی۔ تانبے کی اس منقش طشتری میں قریباً ایک درجن دیے پڑے تھے۔ مٹی کے ان دیوں میں سے کچھ الٹے تھے اور کچھ سیدھے۔ خدا بخش نے دل گرفتہ انداز میں یہ طشتری میز پر رکھ دی اور بیزار سا ایک طرف کھڑا ہوگیا۔ ''یہ کیا ہے تایا ابا؟'' بتول نے سراسیمہ

لہجے میں پوچھا۔

تایا ابا گم صم رہے پھر خدا بخش سے بولے۔ ''تم ہی بتاؤ چاچا۔''

خدا بخش گمبھیر آواز میں بولا۔ ''اس کو 'نیاں' کی رسم کہتے ہیں جی۔ پرانے وقتوں سے چلی آرہی ہے۔ کچھ لوگ مانتے ہیں کچھ نہیں بھی مانتے۔''

''یہ ہے کیا؟'' چھوٹی امی زلفت نے استفسار کیا۔

خدا بخش نے پریشان نظروں سے نور کی دادی اماں اور پھوپھو حاجرہ کی طرف دیکھا۔ دادی اماں کا رنگ مٹی ہو رہا تھا اور ہاتھ پاؤں کی کپکپاہٹ بڑھ گئی تھی۔ وہ تانبے کی طشتری اور دیوں کی طرف ہی دیکھ رہی تھیں۔

خدا بخش نے اٹکتے لہجے میں کہا۔ ''رشتے ناتے یا پھر لین دین کے معاملے میں جب کوئی بڑا جھگڑا ہوتا ہے تو حضرت امناں والے کی رائے جاننے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تھالی میں بارہ دیے رکھے جاتے ہیں اور رکھنے والا یہ کہتا ہے کہ اگر وہ حق پر ہے تو پھر دیے اس پر گواہی دیں۔ یہ دیے مزار کی ایک محراب میں رکھ دیے جاتے ہیں۔ یہ وہی سرخ محراب ہے جو مزار کی دائیں جانب پتھر کی جالی کے پاس نظر آتی ہے۔''

''محراب میں رکھنے سے کیا ہوتا ہے؟'' انگلینڈ پلٹ احسان نے پوچھا۔

''یہ محراب دراصل ایک چھوٹی سی کھڑکی ہے جس میں ہر وقت ہوا آتی رہتی ہے۔ شام کے بعد چلنے والی ہوا اس میں سے کچھ دیے بجھا دیتی ہے اور کچھ جلتے رہتے ہیں۔ اگر زیادہ دیے جلتے رہتے ہیں تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ نیاں لینے والا حق پر ہے...... یہاں بھی چودھری طغرل نے نیاں لیا ہے اور کہتا ہے کہ میں حق پر ہوں۔''

''یہ دیے جو اوندھے پڑے ہیں ان کا کیا مطلب ہے؟'' بیگم زلفت نے پوچھا۔

''یہ وہ ہیں جو بجھ گئے تھے۔'' خدا بخش نے جواب دیا۔

نور نے اوندھے پڑے دیے گنے، وہ چار تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ چار دیے بجھے تھے اور آٹھ جلتے رہے تھے۔ یہ فال ہی کی کوئی قسم تھی۔ اس کے بارے میں اور اس طرح کی کئی رسموں کے بارے میں نور نے پہلے بھی سن رکھا تھا۔

شرجیل بولا۔ ''یہ تھالی بھی تو یہ خبیث ہی لے کر آئے ہیں۔ ہمیں کیا پتا کہ کتنے جلے اور کتنے بجھے اور آپ خود ہی تو یہ کہہ رہے ہیں کہ بہت سے لوگ اس نیاں شیاں کو مانتے ہی نہیں۔''

فدا حسین نے مدھم آواز میں کہا۔ ''نکاح خواں مولوی شمس بھی ساتھ ہیں۔ وہ گواہی دے رہے ہیں کہ نیاں ہوا ہے۔''

''یہ سب کیا بے ہودگی ہے۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا۔'' شرجیل تڑخ کر بولا۔ ''ایک طرف یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ امن والے کا میلا ہے اور اپنے ہتھیار جمع کراتے ہیں، لڑائی جھگڑے کو بڑا گناہ سمجھنے لگتے ہیں۔ دوسری طرف یہ سب کچھ ہو رہا ہے ہمارے ساتھ؟''

خدا بخش مری مری آواز میں بولا۔ ''اس لیے تو یہ نیاں وغیرہ کیا ہے ان لوگوں نے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس رسم کے بعد انہیں یہ سب کچھ کرنے کی اجازت مل گئی ہے۔''

مراد نے نفرت سے ایک طرف تھوک دیا۔

شرجیل نے کہا۔ ''پرسوں ایک متولی کہہ رہا تھا، میلے پر کبھی بارش نہیں ہوئی۔ یہ مزار والے کی کرامت ہے اور شام کو جب بارش شروع ہوئی تو وہی متولی اسے رحمت کہہ رہا تھا اور خیال ظاہر کر رہا تھا کہ اس مرتبہ اوپر والے نے زائروں کے گناہ دھونے کا فیصلہ کیا ہے۔''

''بس یہ وہم اور بے کار عقیدے ایسے ہی لمبی لمبی جڑوں والے ہوتے ہیں۔'' تایا ابا نے کہا۔ ''بے شک یہ ایک اللہ والے کا مزار ہے اور وہ بلند پایہ ہستی تھے مگر ایسی پاک جگہوں پر اپنے کاروبار چمکانے والے لوگ نت نئی حکایتیں گھڑتے ہیں اور لوگوں کو بے وقوف بناتے ہیں۔''

مراد نے غصے میں طشتری کو ہاتھ مار کر دور ہٹا دیا۔ ''میں نہیں مانتا ان فالوں شالوں کو۔ یہ لوگ بس بدمعاشی کر رہے ہیں۔ زور دکھا کر اپنی بات منوانا چاہتے ہیں۔ ہماری بیٹی کوئی گاجر مولی نہیں جو یہ اکھاڑ کر لے جائیں گے۔ ان کو ہماری لاشوں پر سے گزرنا ہوگا۔'' وہ ہمیشہ سے غصے والا تھا اور اس وقت اس کا غصہ آسمان کو چھو رہا تھا۔

مولوی اشفاق مہرا بھی بلڈ پریشر کے مریض تھے۔ ان کا چہرہ سرخ انگارہ ہو رہا تھا اور سانس پھولی ہوئی تھی۔ شاید اسی لیے تھوڑی دیر پہلے بڑے بھائی خلیل مہرا نے انہیں بہانے سے کمرے میں بھیج دیا تھا۔

خلیل مہرا نے مراد کو ایک بار پھر ڈانٹا۔ ''یہ جوش کا نہیں ہوش کا وقت ہے۔ انہوں نے حویلی کو چاروں طرف سے گھیرا ہوا ہے۔ رات کا وقت ہے، بارش ہو رہی ہے۔ نہ اس طرف کسی نے آنا ہے نہ جانا ہے۔ ہم کو یہ لوگ باہر نہیں نکلنے دیں گے۔ ہمیں ٹھنڈے دل سے کچھ سوچنا ہوگا۔''

مراد نے ایک بار پھر طیش بھری نظروں سے تانبے کی طشتری اور اس میں سیدھے اور اوندھے پڑے مٹی کے دیوں کو دیکھا اور بولا۔ ''لیکن میں ان بے کار رسموں کو نہیں مانتا۔ یہ لوگ بس اپنا الوسیدھا کرنے کے لیے ان رسموں کا سہارا لیتے ہیں۔ یہ رسم نہ ہوتی تو کوئی اور ہوتی...... کوئی اور فال ہوتی۔ ان لوگوں نے ہم پر چڑھائی کرنا ہی تھی۔''

عمر رسیدہ ملازم خدا بخش نے کہا۔ ''بیٹا! تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ ان رسموں کے بہت سے نقصان ہیں پر کچھ فائدے بھی تو ہوتے ہیں۔ اب یہی دیکھو کہ اگر اسلحہ جمع کرانے کا رواج نہ ہوتا اور لوگ اس پر پورا یقین نہ رکھتے تو ...... اب تک شاید یہاں بہت نقصان ہو گیا ہوتا......''

'' نقصان کیا، دونوں طرف سے کئی لاشیں گر گئی ہوتیں۔'' خلیل مہرا صاحب نے تائید کی۔

یہی وقت تھا جب احاطے کی طرف سے کچھ ٹوٹنے اور گرنے کی آواز آئی۔ رکھوالی کے کتوں نے شور مچایا اور مختلف آوازیں بھی سنائی دیں۔ چند سیکنڈ بعد بوڑھا ملازم فدا حسین ہانپتا ہوا اندر آیا۔ خلیل مہرا سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''مالک! انہوں نے رسے ڈال کر ایک طرف سے دیوار کا جنگلا گرا دیا ہے...... لگتا ہے کہ وہ اوپر چڑھنے کی کوشش کریں گے۔''

خلیل مہرا، اشفاق مہرا، مراد اور دیگر افراد احاطے کی طرف لپکے۔ نور، مہرین اور دیگر لڑکیوں نے کھڑکی سے جھانکا، صاف طور پر تو دکھائی نہیں دیا مگر اندازہ ہوا کہ بلند باؤنڈری وال کے بالائی حصے پر لگی نوکدار سلاخوں والی باڑ کا کچھ حصہ دکھائی نہیں دے رہا۔ وہاں سے باڑ اکھاڑ دی گئی تھی۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا کہ موٹے آہنی تار کی مدد سے اس باڑ پر کمند ڈالی گئی تھی اور اس کمند کو جھٹکے دے دے کر قریباً پندرہ بیس فٹ چوڑائی کا ایک ٹکڑا نیچے گرا دیا گیا تھا۔ اب اس حصے سے باؤنڈری وال پر چڑھنا آسان ہو گیا تھا۔ بہر حال ابھی یہاں سے چڑھنے کی کوئی کوشش نہیں ہو رہی تھی۔ شاید یہ کارروائی صرف دباؤ ڈالنے کے لیے کی گئی تھی کہ اگر ان کی بات نہیں مانی گئی تو وہ ہر حد تک جائیں گے۔

گیٹ کے مختصر روزن میں سے ایک بار پھر دو طرفہ گفتگو شروع ہو گئی۔ یہ مستطیل روزن چوڑائی میں دو فٹ کے قریب اور اونچائی میں صرف سات آٹھ انچ تھا۔ تانبے کی طشتری بھی اسی خلا سے اندر بھیجی گئی تھی۔

گیٹ پر ہونے والی گفتگو قریباً دس منٹ جاری رہی۔ بارش کی بوچھاڑوں ہی کی طرح کبھی لہجے مدھم اور کبھی تندو تیز ہو جاتے تھے۔ شرجیل اندر آیا تو سب عورتیں اس کے گرد اکٹھی ہو گئیں۔ ''کیا بات ہوئی شرجیل؟'' تائی راحت نے بیٹے سے پوچھا۔

''بس ہو رہی ہے۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔ لہجے میں مایوسی تھی۔

'' کچھ ہمیں بھی تو بتاؤ...... شاید...... کوئی اچھا مشورہ ہی دے دیں۔'' بیگم زلفت نے استفسار کیا۔ خالہ عریفہ نے بھی ساتھ دیا۔ سب کے رنگ زرد تھے۔

'' وہ خبیث اپنی بات پر اڑے ہوئے ہیں......'' شاید وہ کچھ اور بھی کہتا مگر بسمہ کی طرف دیکھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔ وہ بے چاری پہلے ہی ہلدی ہو رہی تھی۔

خالہ عریفہ بسمہ کو اپنے ساتھ لے کر دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد شرجیل نے جو کچھ بتایا اس سے پتا چلا کہ چودھری طغرل اور اس کے ہمنوا بسمہ کے حوالے سے ایک انچ بھی پیچھے نہیں ہٹ رہے۔ وہ اسی وقت نکاح اور رخصتی چاہ رہے ہیں۔ ابا جان، چچا جان اور دیگر اس کوشش میں ہیں کہ کم از کم آج رات کے لیے اس معاملے کو ٹال دیا جائے اور کل پنچایت میں اس کا حل نکالا جائے لیکن یہ ہوتا نظر نہیں آتا۔

باہر سے ایک دم شور بلند ہوا اور مار دھاڑ کی آوازیں آئیں۔ لڑکیاں چلا اٹھیں۔ شرجیل بھی احاطے کی طرف دوڑا۔ وہاں باقاعدہ لڑائی کا منظر تھا، باہر کے لوگوں نے جس جگہ سے باؤنڈری وال کی نوکدار گرل اکھاڑی تھی، اب وہاں سے کچھ افراد اوپر چڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ حویلی کے مرد لاٹھیوں اور کلہاڑیوں سے ان پر حملہ آور ہوئے تھے۔ بجلی چمکی اور چند ساعتوں کے لیے قرب و جوار روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گئے۔ نور نے دیوار کا منظر دیکھا۔ یہ ایک جنگی منظر جیسا تھا، کم از کم چار پانچ افراد تھے جنہوں نے چوٹ سے بچنے کے لیے سروں پر بھاری پگڑیاں کس رکھی تھیں اور دیوار پھاندنے کی کوشش میں تھے۔ ان پر چھت پر سے اینٹیں برس رہی تھیں اور احاطے میں موجود افراد لمبی لاٹھیوں سے انہیں نیچے گرانے کی کوشش کر رہے تھے۔ مطلب یہی تھا کہ بات چیت ناکام ہو گئی ہے اور اب وہ لوگ ہر صورت اندر گھسنا چاہتے ہیں۔

ان کے للکارے خوفناک تھے۔ وہ گندی گالیاں دے رہے تھے اور اندر موجود عورتوں کے لیے غلیظ الفاظ استعمال کر رہے تھے۔

بسمہ، بتول اور ماموں کی لڑکیوں نے رونا شروع کر دیا۔ تائی راحت سجدے میں گر گئیں اور جان آبرو کی سلامتی کے لیے گڑگڑانے لگیں۔ دادی اماں کا برا حال تھا اور ان کو سنبھالتے سنبھالتے پھپو حاجرہ خود بھی نیم جان ہو رہی تھیں۔

حویلی کے مردوں نے، جن میں باہمت ملازم بھی شامل تھے، جان پر کھیل کر اندر گھسنے والوں کی کوشش ناکام بنا دی۔ اس کوشش میں چار پانچ افراد کو شدید زخم آئے لیکن جس کو شدید ترین چوٹ لگی وہ نور کے ماموں مراد تھے۔ باہر سے جوابی خشت باری بھی ہوئی تھی۔ ایک اینٹ لگنے سے ان کے سر پر گہرا زخم آیا تھا...... اور بالائی ہونٹ بھی پھٹ گیا تھا۔ وہ نیم بے ہوش تھے۔

انہیں اندر لایا گیا۔ ان کی حالت دیکھ کر عورتوں نے رونا شروع کر دیا۔ بہر حال نور اور مہرین کسی حد تک حوصلے میں رہیں۔ ایک فزیوتھراپسٹ کی حیثیت سے مہرین میڈیکل کی سوجھ بوجھ رکھتی تھی۔ حویلی میں فرسٹ ایڈ کا سامان موجود تھا۔ مہرین نے سب سے پہلے مراد کے سر سے بہنے والا خون بند کیا اور پھر عارضی بینڈیج کر دی۔ اس نے لرزاں آواز میں کہا۔ ''فوری خطرے کی تو کوئی بات نہیں...... مگر ماموں کو اسپتال لے جانے کی ضرورت ہوگی۔''

حویلی کے سامنے ''لوروف'' پر حویلی کے آٹھ دس افراد موجود تھے۔ اگر باؤنڈری وال کے شکستہ حصے سے کوئی اوپر چڑھنے کی کوشش کرتا تو اسے موثر طریقے سے روکا جاسکتا تھا مگر یہ دفاع کتنی دیر تک چل سکے گا، اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔

نور نے دیکھا، بسمہ سکڑی سمٹی ہوئی ایک سہمی چڑیا کی طرح کونے میں گھسی ہوئی تھی۔ گاہے بگاہے دہشت زدہ نظروں سے اپنے بڑوں کے چہرے دیکھتی تھی۔ اسی اثنا میں چھوٹی امی زلفت اور پھپو حاجرہ نے اس کے ابا جان کو اپنے ساتھ لیا اور ساتھ والے کمرے میں جا کر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ وہ کوئی خاص قسم کی گفت گو کر رہی تھیں۔

دس پندرہ منٹ بعد تینوں باہر آگئے۔ ابا جان کا چہرہ بدستور کرب کی آماجگاہ تھا۔ یہی وقت تھا جب ملازم خدا بخش اندر داخل ہوا تھا اور اس نے پلاسٹک کا ایک بڑا لفافہ ابا جان کی طرف بڑھایا تھا۔ اس لفافے میں سرخ رنگ کا کوئی کامدار کپڑا جھلک دکھا رہا تھا۔ خدا بخش نے نور کے ابا جان سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''مولوی جی! ان بدبختوں نے یہ لال جوڑا دیوار کے اوپر سے اندر پھینکا ہے۔''

یہ بسمہ کے لیے شادی کا جوڑا بھیجا گیا تھا۔ نور کے ابا جان نے لفافہ گھما کر دیوار پر دے مارا تھا اور بے دم سے ہو کر بسمہ کے پاس قالین پر بیٹھ گئے تھے اور پھر کچھ دیر بعد وہ منظر نور کی نگاہوں کے سامنے آیا تھا جب اس نے چھوٹی امی زلفت کو سوچی سوچی آنکھوں کے ساتھ ابا جان کے پاس بیٹھے اور انہیں سمجھاتے دیکھا تھا۔ ابا جان جھلا کر بولے تھے۔ ''تو کیا کروں میں؟ اپنی بیٹی کو اپنے ہاتھوں سے تیار کر کے...... ان ڈاکوؤں کے حوالے کر دوں۔ انہیں کہوں، لے جاؤ اسے، اپنے کلیجے ٹھنڈے کر لو۔''

''نہیں جی...... لیکن...... جو کچھ بھی ہو رہا ہے...... اور جو کچھ ہونے والا ہے...... اسے دیکھ کر ہمیں کوئی درمیانی راہ تو نکالنا ہی پڑے گی۔''

''اور وہ درمیانی راہ کیا ہے؟'' اشفاق مہرا نے بیوی کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

''...... جو کچھ بھی ہے، وہ لوگ...... اپنی بسمہ کو بہو بنانا چاہتے ہیں۔ اسے ابدال کے نکاح میں لانا چاہتے ہیں۔ اب بھی بات چیت کا دروازہ بند نہیں ہوا ہے۔ ہم ان سے کچھ شرطیں بھی منوا سکتے ہیں...... لیکن...... اگر خدانخواستہ...... یہ لوگ اندر گھس آئے اور...... دو چار موتیں ہو گئیں...... تو پھر سارا معاملہ اور طرح کا ہو جائے گا۔ ہم سب کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔''

اسی دوران میں دو منزلہ حویلی کی چھت پر ایک زوردار دھما کا ہوا تھا۔ حویلی کی سہی ہوئی عورتیں بے طرح چلا اٹھی تھیں اور مرد سیڑھیوں کی طرف لپک گئے تھے۔ بعد ازاں پتا چلا تھا کہ شرجیل، عثمان اور غیاث وغیرہ نے ملازموں کے ساتھ مل کر حویلی کی خستہ برساتی کی ایک دیوار گرا دی تھی۔ مقصد یہی تھا کہ اگر دوبارہ مارا ماری کی نوبت آئے تو چھت سے خشت باری کرنے کے لیے اینٹیں اور روڑے مہیا ہو سکیں۔

اگلے ایک گھنٹے میں چھوٹی امی زلفت اور پھپو حاجرہ وغیرہ نے ابا جان اور تایا ابا کو نیم رضامند کر لیا تھا۔ کوئی دوسری راہ سجھائی ہی نہیں دے رہی تھی۔ مراد شدید زخمی تھا اور حالات اتنے سنگین تھے کہ کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ یہ حکم حاکم مرگِ مفاجات والی صورتِ حال تھی اور پھر نور نے وہ منظر بھی دیکھا جب اشک بار چھوٹی امی اور خالہ عریفہ نے، باہر سے بلند ہونے والے پُرغضب للکاروں کی گونج میں پیلا دوپٹا روتی سسکتی بسمہ کے سر پر ڈالا اور اس کے لرزاں ہاتھوں پر مہندی لگانا شروع کی۔

آہ...... یہ کیسی شادی تھی...... یہ کیسا نکاح تھا؟ پنچایتوں، بیٹھکوں اور جرگوں کے حکم پر یہ زنا بالجبر کے کیسے تماشے لگائے جاتے ہیں۔ جاہلیت اور انا پرستی کے حصار میں آبرو ریزی کے یہ کیسے کھیل، کھیلے جاتے ہیں؟

نور نے سوچا اور اس کے سر کی نسیں پھٹنے لگیں۔ وہ فرش پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے سر کا عقبی حصہ دیوار سے ٹکا کر آنکھیں بند کرلیں۔

☆☆☆

ہاں......اس نے سر کا عقبی حصہ دیوار سے ٹکا کر آنکھیں بند کرلی تھیں......اس کی آنکھوں کے سامنے ماضی کی طویل فلم چلی تھی جو بچپن اور لڑکپن سے شروع ہوئی۔ موراں والی گاؤں کے گلی کوچوں سے ہوکر نکلی اور لاہور پہنچی...... وہاں کی شاہراہوں، درس گاہوں اور کھیل کے میدانوں سے ہوتی ہوئی، سومیٹر کے ہیجان خیز ٹریک تک آئی۔ تھوڑی ہی دیر میں اس نے ماضی کی کھڑکی سے یادوں کا کتنا بڑا ہجوم دیکھا تھا...... اور اب ایک بار پھر وہ تصور کی دنیا سے حقیقت کی دنیا میں موجود تھی۔ حقیقت جو دسمبر کی اس خوفناک رات میں بے حد بے رحم اور لرزہ خیز تھی۔ حویلی چاروں طرف سے گھری ہوئی تھی۔ اردگرد دور تک کوئی مددگار نہیں تھا اور نہ کسی کو خبر تھی کہ اس برسات کی رات میں یہاں بارشی نالے کے کنارے اس تنہا حویلی پر کیا گزر رہی ہے۔ بچاؤ کی بس ایک ہی شکل رہ گئی تھی۔ بسمہ کو سرخ جوڑا پہنایا جاتا اور اسے ان زبردستوں کے حوالے کردیا جاتا جو باقاعدہ برات کے ساتھ یہاں موجود تھے۔ وہ اسے لے جاتے۔ بدمست چودھری زادہ آج رات ہی شادی کے نام پر اسے روند ڈالتا۔

ساتھ والے کمرے سے بسمہ کی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں اور ساتھ ساتھ چھوٹی امی، پھپھو حاجرہ اور تائی وغیرہ کی سرگوشیاں بھی جو اسے حوصلہ دینے میں مصروف تھیں۔ نور نے وال کلاک کی طرف دیکھا...... آہ، ابھی صرف دو بجے تھے۔ صبح بڑی دور تھی۔ قرب و جوار میں بھیگی ہوئی سنسان رات نے اپنے بے مہر پنجے گاڑ رکھے تھے۔ لق ودق، سنسان اور پھنکاتی ہوئی رات۔

یکایک دوبارہ زبردست شور سنائی دیا۔ نور کے ابا جان، تایا ابا اور ملازمین احاطے کی طرف لپکے۔ نور کی رگوں میں خون منجمد ہونے لگا۔ عورتیں سسکنے لگیں۔ شور حویلی کے دائیں پہلو میں مہمان خانے کی جانب تھا۔ یہ مہمان خانہ (جو پندرہ بیس سال پہلے تعمیر کیا گیا تھا) حویلی کی بیرونی چار دیواری سے ملا ہوا تھا۔ کھا پریوں کے للکارے، گالیاں، دھاڑیں، ہر آواز ان کی سماعتوں کا عذاب تھی۔ صورتِ حال واضح ہونے میں قریباً پانچ منٹ لگے۔

☆☆☆

برآمدے میں گیس لیمپس کی روشنی تھی۔ نور نے دیکھا کہ ملازمین نے کسی کا خونچکاں جسم اٹھا رکھا ہے اور اسے مردانے کی طرف لے جا رہے ہیں۔ وہ دیکھ کر کانپ گئی۔ یہ حویلی کے سب سے پرانے ملازم فدا حسین کا بیٹا رشید تھا۔ ہاں نور کی نگاہیں دھوکا نہیں کھا رہی تھیں، وہ رشید ہی تھا۔ غالباً اس کے سینے پر کوئی بہت بڑا گھاؤ تھا جس نے اس کے پورے بدن کو لہو رنگ کر رکھا تھا۔ یہ محسوس کرکے نور کے رد نگٹے کھڑے ہوگئے کہ رشید شاید زندہ نہیں ہے۔

خواتین کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا جارہا تھا لیکن نور نے اپنے تایازاد عثمان کو سیڑھیوں کے نیچے گھیر لیا۔ ''آخر کیا چھپا رہے ہو تم؟'' وہ اس کے بازو میں اپنے ناخن گھساتے ہوئے بولی۔

اس نے گول مول بات کرنے کی کوشش کی مگر نور نے اس کی ایک نہیں چلنے دی۔ آخر وہ ردہانسی آواز میں بولا۔ ''ان حرامزادوں نے مار ڈالا ہے اس کو...... جان لے لی ہے اس کی۔''

نور چند سیکنڈ کے لیے سکتہ زدہ رہ گئی پھر ہمت کرکے بولی۔ ''مگر ہوا کیا ہے؟''

جواب میں تایازاد عثمان نے دلدوز لہجے میں جو کچھ بتایا، اس کا خلاصہ کچھ یوں تھا...... مہمان خانے کے عقبی کمرے باؤنڈری وال سے ملے ہوئے تھے۔ فدا حسین کے بیٹے رشید نے یہاں سے نکلنے اور پولیس چوکی تک پہنچنے کا ارادہ کیا۔ وہ دلیری کے ساتھ مہمان خانے کی چھت پر چلا گیا اور وہاں سے باہر چھلانگ لگا کر اندھا دھند بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کی قسمت اچھی ہوتی تو شاید وہ نکل جاتا مگر ٹارچ کی روشنی میں اسے دیکھ لیا گیا۔ وہ تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ پکڑا گیا۔ اس کے پاس وہی مراد والی چھری تھی، اس نے چھری چلا کر خود کو چھڑانا چاہا مگر...... بپھرے ہوئے شرابیوں نے اسے کلہاڑیوں اور خنجروں سے کاٹ ڈالا۔ پھر اس کی لاش دیوار کے اوپر سے اندر پھینک دی گئی۔ اب وہ دھمکیاں دے رہے تھے کہ دوسروں کا حشر بھی یہی ہوگا۔ اندر گھس آئے تو ایک ایک کو مار ڈالیں گے۔

نور نے سنا، باہر سے بلند ہونے والی آوازوں میں وحشت نمایاں تر ہوتی جارہی تھی۔

☆☆☆

مولوی اشفاق مہرا اور خلیل مہرا نے مشورہ کیا۔ انہیں اب بالائی منزل، نچلی منزل سے زیادہ محفوظ لگ رہی تھی۔ لڑکوں نے بھی یہی مشورہ دیا۔ مولوی اشفاق عورتوں کو لے کر دوسری منزل پر آ گئے۔ ان کی ہدایت پر نور کی دادی اماں کو ایک کرسی پر بٹھایا گیا اور شرجیل، عثمان، غیاث وغیرہ کرسی اٹھا کر دوسری منزل پر لے گئے۔ سیڑھیاں چڑھتے وقت دادی اماں کو رونے کی آوازیں آئیں۔ انہوں نے اس بارے میں پوچھا تو مولوی اشفاق نے انہیں گول مول سا جواب دیا۔

یہ آوازیں دراصل فدا حسین اور اس کی بیوی کی تھیں۔ اپنے بچے کی دردناک موت نے انہیں نوحہ کناں کر رکھا تھا۔

اشفاق صاحب بالائی منزل پر پہنچ گئے۔ وہ دکھ اور تشویش کی انتہا پر تھے۔ ایک طرف بے گناہ بیٹی اور اس پر ہونے والے ظلم و ستم کا تصور تھا، دوسری طرف اپنے پورے خانوادے کی جان اور آبرو تھی۔ وہ کچھ فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے۔ بسمہ کو اس کی پھپھو حاجرہ اور چھوٹی امی نے سرخ جوڑا تک پہنا دیا تھا مگر حتمی فیصلے کی ہمت ابھی تک کوئی نہیں کر پا رہا تھا۔

اشفاق صاحب صوفے پر بیٹھ گئے۔ لرزتی کانپتی بسمہ ان کی بائیں جانب اور بتول دائیں جانب تھی۔ مہرین اور ماموں زاد سلیمہ ان کے قدموں میں قالین پر بیٹھی تھیں۔ اشفاق صاحب نے بسمہ اور بتول کو اپنے ساتھ لگا رکھا تھا۔

''ارے نور کہاں ہے؟'' پھپھو حاجرہ نے کہا اور کمرے کے دروازے کی طرف بڑھیں۔ ''نور...... نور!'' انہوں نے آوازیں دیں۔

اشفاق صاحب کی بیگم زلفت بھی اٹھ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگیں۔

''کہاں گئی وہ؟'' بتول نے بھی بے قراری سے کہا۔

اشفاق صاحب کچھ بڑبڑائے اور اٹھ کر برآمدے میں آ گئے۔ بارش کچھ دیر کے لیے رک گئی تھی۔ بادل پھٹے تھے اور پوری رات کا چاند جھانکنے لگا تھا۔ اشفاق صاحب نور کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھے، مہرین بھی ان کے ساتھ تھی۔ کچھ ہی فاصلے پر مہمان خانے کا سنگل اسٹوری پورشن دکھائی دے رہا تھا۔ چھت پر لگا ہوا ٹی وی انٹینا چاندنی میں چمک رہا تھا۔ اچانک ایک منظر نے اشفاق صاحب کو جکڑ لیا۔ ان کی ساری حسیات جیسے سمٹ کر ان کی آنکھوں میں آ گئیں۔ انہوں نے ایک ایسا منظر دیکھا جس پر ان کی اپنی ہی نگاہوں کو بھروسا نہیں ہوا۔ کیا وہ جاگتی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھ رہے تھے؟ وہ مہمان خانے کی چھت سے نیچے پرالی کے ایک ڈھیر پر چھلانگ لگا رہی تھی...... ہاں، یہ وہی تھی...... یہ وہی نافرمان تھی، وہی سرکش تھی......

مہرین نے بھی بے پناہ حیرت سے دیکھا۔ اگر یہ کوئی فلم ہوتی اور یہ منظر سلوموشن میں دیکھا جاتا تو بے حد سنسنی خیز ہوتا۔ دیکھنے والوں کے رونگٹے کھڑے کر دیتا۔ وہ جیسے ہوا میں اڑتی ہوئی پرالی کے ڈھیر پر گری۔ وہاں سے اٹھی...... سنبھلی...... اور بھاگی۔ ہاں...... وہ بھاگی، اس کے سامنے تھور زدہ طویل میدان تھا۔ وہ اس کے آس پاس موجود تھے۔ انہوں نے للکارے بلند کیے اور اس کے پیچھے لپکے...... ابھی کچھ دیر پہلے وہ فدا حسین کے لڑکے رشید کے پیچھے بھاگے تھے اور اسے پکڑ لیا تھا...... لیکن...... یہ رشید نہیں تھا۔ یہ نور تھی۔ یہ پاکستان کی مانی ہوئی اسپرنٹرز میں سے ایک تھی اور وہ بھاگ رہی تھی۔ اپنی پوری رفتار کے ساتھ۔ وہ جیسے ہوا میں اڑ رہی تھی۔ اس نے دوپٹا کس کر کمر سے باندھ رکھا تھا۔ اس کے پاؤں میں جوگرز تھے۔ آج اس کا اسکارف پھسل گیا تھا اور اس کے بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔

''پکڑو...... جانے نہ پائے۔'' ایک للکار ابلند ہوا۔

لاٹھیاں اور کلہاڑیاں چمکیں۔ تعاقب کرنے والوں کے قدم برق رفتار ہوئے، وہ اسے دبوچنے کے لیے پوری طاقت سے بڑھے مگر ان کے آگے نور تھی...... اور نور کی رفتار...... بہت ہوتی ہے......

مولوی اشفاق منڈیر کے آخر تک آئے اور سینے کی پوری قوت سے چلّائے۔ ''بھاگو عین النور...... بھاگو...... ان کے ہاتھ نہیں آنا عین النور...... بھاگو۔'' ان کی آواز گونجتی اور پھیلتی چلی گئی۔

کسی نے عین النور کا جواب نہیں سنا...... مگر مولوی اشفاق نے سنا۔ اس نے جیسے خاموشی کی زبان میں کہا تھا...... میں آپ کی بیٹی ہوں ابا جان! آپ کی ناکارہ ترین بیٹی۔ آپ کو بہت دکھ دینے والی، مایوس کرنے والی لیکن آج میں آپ کو مایوس نہیں کروں گی...... ہاں، میں نہیں کروں گی کیونکہ یہ میرا میدان ہے، یہ میرا راستہ ہے۔

''بھاگو عین النور...... بھاگو۔'' مولوی اشفاق پھر پوری طاقت سے پکارے اور یہ وہی مولوی اشفاق تھے، جنہوں نے ہمیشہ کہا تھا...... مت بھاگو عین النور۔

''رن فاسٹ...... نور! رن فاسٹ۔'' مہرین بھی چلّائی۔

اور وہ بھاگ رہی تھی۔ یہ ایک ناقابلِ فراموش منظر تھا۔ چھریرے بدن کی ایک لڑکی اور...... اس کے عقب میں موت کے ہرکارے، درمیانی فاصلہ پندرہ بیس قدم کے قریب۔ تعاقب کرنے والوں میں بڑی عمر کے لوگ بھی تھے، کڑیل جوان بھی اور بالکل نوجوان چودھری زادے بھی۔ انہیں یقین تھا، وہ حصار توڑنے والی اس لڑکی کو بارشی نالے تک نہیں پہنچنے دیں گے کیونکہ بارشی نالے کے پار جھاڑیوں اور سرکنڈوں کا گھنا سلسلہ تھا اور پھر اس سے آگے وہ راستہ تھا جو سیدھا پولیس چوکی تک پہنچتا تھا اور وہ شاید اسی رخ پر جارہی تھی۔ وہ اس لڑکی سے اپنا درمیانی فاصلہ کم کرنے میں ناکام ہوئے تو بھاگتے بھاگتے اس کی طرف چھوٹے دستے کی کلہاڑیاں اور لاٹھیاں وغیرہ پھینکنے لگے۔ ساتھ ساتھ وہ گالیاں بھی بک رہے تھے۔ ان کی جھلاہٹ دیدنی تھی۔ ایک لڑکی، ایک کمزور لڑکی...... ان کے ہاتھ نہیں آرہی تھی۔

ہاں، قدرت ایسے ہی ہار کو جیت میں بدلا کرتی ہے۔ ایسے ہی جاں گسل مشقتوں کا صلہ دیا کرتی ہے۔ ایک طرح سے نہ سہی دوسری طرح سے...... دوسری طرح سے نہ سہی، تیسری طرح سے۔ بے شک محنتیں رائگاں نہیں جاتیں۔ جاں سوزیاں ضائع نہیں ہوتیں۔ آخر صلے مل کر رہتے ہیں۔

مولوی اشفاق اپنی بیٹی کی جیت دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ منڈیر کے آخری سرے تک پہنچ چکے تھے...... "بھاگ جاؤ نور...... پولیس تک پہنچ جاؤ۔" وہ بار بار کہتے تھے۔ انہوں نے مٹھیاں بھینچ رکھی تھیں، ان کی آواز بیٹھ رہی تھی۔

اب بسمہ، بتول، سلیمہ، چھوٹی امی، پھپھو حاجرہ اور بہت سے دیگر لوگ اس جگہ جمع ہوچکے تھے اور روشن چاندنی میں، سکتہ زدہ کرنے والی یہ انوکھی دوڑ دیکھ رہے تھے۔ پھر ایک ٹویوٹا گاڑی بھی نور کے پیچھے لپکی۔ یہ پھولوں سے سجی ہوئی تھی۔ شاید یہ وہی گاڑی تھی جس پر بسمہ کو لے جایا جانا تھا...... زندہ یا مردہ ...... (چودھری طغرل نے یہی کہا تھا) گاڑی برق رفتاری سے نور کے تعاقب میں پہنچی تو وہ دائیں جانب کے ان تھور زدہ کھیتوں میں گھس گئی جن میں پکی منڈیریں بنا کر، انہیں آباد کرنے کی کوشش کی جارہی تھی۔ یہاں پہنچ کر گاڑی بری طرح پھدکنے اور ڈگمگانے لگی۔ نور اور تعاقب کرنے والوں کا فاصلہ بڑھتا جارہا تھا۔ اس کے قدم برق کی طرح حرکت کررہے تھے...... بال لہرارہے تھے۔ وہ ایک ایتھلیٹ کی تمام تر مہارت کے ساتھ فنش لائن کی طرف بڑھ رہی تھی اور آج اس کی فنش لائن یقیناً وہ بارشی نالا تھا جس کی دوسری جانب جھاڑیوں اور سرکنڈوں کا گھنا سلسلہ تھا۔

ٹویوٹا گاڑی کسی گڑھے میں پھنس کر گھوم گئی اور ڈھیروں مٹی اڑانے لگی۔ دوڑنے والوں میں بہت سے لوگ ہمت ہار کر سست پڑ چکے تھے مگر کھاپری برادری کے چند تیز طرار لڑکے اب بھی بھیڑیوں کی طرح اس کے تعاقب میں تھے...... اس تک پہنچنے کی سعی کررہے تھے...... انہیں معلوم نہیں تھا کہ وہ اس دوڑ کے لیے ایک نہایت غلط حریف چن بیٹھے ہیں۔ بے شک کمزور، بے شک لڑکی...... لیکن بے شمار ایونٹس کی فاتح، پروفیشنل رنر۔ اس نے ایک بار پھر اپنا رخ تھوڑا سا پھیرا اور بھاگتی ہوئی اس بارشی نالے میں اتر گئی جہاں پانی اس کی کمر سے اوپر آرہا تھا۔ وہ جس رفتار سے دوڑی تھی، اسی ہمت سے اس نے نالے کو پار کیا اور دوسرے کنارے سے نکل آئی۔ اس کے پیچھے نالے میں کودنے والے نوجوان کھاپریوں کو ابھی کنارے تک پہنچنے میں کم از کم ایک منٹ درکار تھا۔ یہ ایک منٹ نور کے لیے بہت زیادہ تھا۔

☆☆☆

نور نے نالے کے مٹیالے سرد پانی میں سے نکل کر کنارے پر چڑھنے میں دیر نہیں لگائی۔ اس نے مڑ کر دیکھا، چاندنی میں ان کھاپریوں کے ہیولے صاف نظر آرہے تھے جنہوں نے اس کے پیچھے برساتی نالے میں چھلانگیں لگائی تھیں۔ وہ ابھی نصف پاٹ تک بھی نہیں پہنچے تھے۔ انہیں نور تک پہنچنے کے لیے کم وبیش ایک منٹ درکار تھا...... اور ایک منٹ میں ساٹھ سیکنڈ ہوتے ہیں۔ وہ جب بے دلی کے ساتھ بھی بھاگتی تھی تو بارہ اعشاریہ پندرہ سیکنڈ میں سو میٹر طے کرلیتی تھی۔

اس نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر پھر دوڑنا شروع کردیا۔ اب وہ اندھا دھند تو نہیں بھاگ رہی تھی مگر پھر بھی رفتار خاصی تیز تھی۔ اس کے اردگرد اب خودرو جھاڑیاں تھیں اور دس بارہ فٹ بلند سرکنڈے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اسے پکڑ نہیں سکیں گے۔ شاید آج اسے کوئی بھی نہیں پکڑ سکتا تھا۔ آج اس کے کانوں میں اس کے ابا جان کی آواز پڑی تھی۔ یقیناً وہ اس کے ابا جان کی آواز ہی تھی۔ جب اس نے چاول کی چھال کے ڈھیر پر چھلانگ لگائی اور اپنے پاؤں کو پوری رفتار سے حرکت دی تھی، اس نے مہمان خانے کی چھت سے یہ آواز سنی تھی۔ انہوں نے پکار کر اسے

بھاگنے کا اور کھاپریوں کے ہاتھ نہ آنے کا کہا تھا...... وہی تو تھے جو اسے عین النور کے نام سے پکارتے تھے۔ بے شک یہ وہی تھے۔ اس آواز نے نور کے حوصلوں کو پہاڑ کر دیا تھا۔ اسے لگا تھا کہ آج اسے کوئی نہیں چھو سکے گا اور کوئی نہیں چھو سکا تھا۔

اب بھی وہ پوری ہمت کے ساتھ بھاگ رہی تھی۔ اس کے کپڑے سخت سردی میں نالے کے پانی سے بھیگ کر اس کے جسم سے چپک گئے تھے مگر شدید جسمانی مشقت کے سبب اس کے زیریں جسم کو بالکل سردی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ فقط شانوں اور چہرے کو ہوا کے تھپیڑے لگ رہے تھے۔ اسے ڈر صرف ایک ہی بات کا تھا، کہیں عقب سے بپھرے ہوئے کھاپری اس پر کوئی فائر نہ کر دیں۔ ابھی تک تو خیریت گزری تھی اور اسے لگتا تھا کہ خیریت ہی رہے گی۔ یہ امنالے کے میلے کے دن تھے۔ علاقے کے بدترین افراد بھی نسلوں سے چلے آنے والے رواج کے مطابق فائر ہونے والے ہتھیاروں کو چھونا گناہ سمجھتے تھے۔

وہ جانتی تھی کہ وہ سیدھی پولیس چوکی کی طرف جا رہی ہے۔ کل دوپہر اس نے آسمانی جھولے کی بلندی سے جو فضائی منظر دیکھا تھا، وہ اس کی مدد کر رہا تھا۔ پھر بھاگتے بھاگتے ایک دم ایک اور خیال اس کے ذہن میں آیا اور وہ ڈر گئی۔ میلے کے دنوں میں علاقے میں آتشیں ہتھیار ممنوع ہو جاتے تھے۔ کیا پولیس والوں کے پاس بھی ہتھیار نہیں ہوتے تھے؟ اس بارے میں اسے ٹھیک سے کچھ پتا نہیں تھا لیکن اگر پولیس والوں کے پاس بھی ہتھیار نہیں تھے تو پھر ...... وہ بپھرے ہوئے ہجوم کو اور جنونی کھاپریوں کو کیسے روک سکتے تھے؟

اس نے اپنی شلوار کے پائنچوں کو جرابوں میں گھسا کر ٹراؤزر کی شکل دے رکھی تھی۔ جوگرز کے تسمے بھی کس کر باندھ رکھے تھے، پھر بھی ایک جگہ اس کا پاؤں کسی چیز سے الجھا اور وہ گرتے گرتے بچی۔ چاندنی پھر ایک دم اوجھل ہو گئی تھی اور اسے تیز بھاگنے میں دشواری محسوس ہو رہی تھی۔ وہ پروفیشنل اسٹیمنا کی مالک ہونے کے باوجود ہانپ رہی تھی مگر اسے پتا تھا کہ اب چوکی زیادہ دور نہیں ہے۔ شاید ایک دو منٹ کا فاصلہ تھا...... یہی وقت تھا جب اسے عقب سے ایک فائر سنائی دیا۔

☆☆☆

ذوالقرنین کا دل شام سے ہی کچھ اکھڑا ہوا سا تھا۔ ایک بے نام سی اداسی اس پر حاوی ہو رہی تھی۔ رات گہری ہونے کے ساتھ ساتھ گرج چمک اور بارش کا سلسلہ بھی بڑھتا چلا گیا۔ ذوالقرنین کو کسی کروٹ چین نہیں آ رہا تھا۔ وہ یہاں سے چلے جانا چاہتا تھا، ابھی، اسی وقت۔ نور کی مسلسل سرد مہری نے ذوالقرنین کو جیسے اس کی اپنی نظروں سے ہی گرا دیا تھا۔ کسی وقت تو اسے یوں لگتا تھا کہ وہ گرے پڑے لڑکوں کی طرح وہ کام کر رہا ہے جسے عرفِ عام میں ''بھونڈی'' کہا جاتا ہے۔ وہ اصلاحِ معاشرہ کا ٹھیکیدار بنتا تھا اور اپنے دل کے ہاتھوں اتنا مجبور تھا کہ کسی موہوم امید کے سہارے نور کے پیچھے یہاں موراں والی تک چلا آیا تھا۔ بے شک میلا دیکھنے کی دعوت اسے پچھلے سال اشفاق مہر اصاحب نے بھی دی تھی اور یہ ایک معقول بہانہ تھا مگر جو کچھ اس کے دل میں تھا، وہ تو ذوالقرنین اچھی طرح جانتا تھا۔

اردو بازار کے تین اور دوست بھی اس کے ساتھ تھے۔ وہ خوب انجوائے کر رہے تھے۔ وہ سب ایک مقامی کے گھر کرائے پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ میلے کے دنوں میں اپنے گھر کرائے پر دینے کا رواج موراں والی میں بھی پایا جاتا تھا۔ رات گیارہ بارہ بجے تک ذوالقرنین کی طبیعت اتنی بیزار ہو گئی کہ اسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ابھی موراں والی سے نکل جائے گا...... (دوستوں کو بتائے بغیر) وہ لوگ علیحدہ گاڑی پر آئے تھے اور جب چاہے جا بھی سکتے تھے۔

بارہ بجے کے لگ بھگ وہ خاموشی سے اٹھا۔ وضو کر کے نمازِ حاجات ادا کی۔ سفر کے نفل پڑھے۔ صرف ایک دوست رمیز کو اٹھایا جس سے وہ اپنی کیفیت شیئر کر سکتا تھا۔ اسے اپنی روانگی کا بتا کر اور قائل کر کے وہ چپ چاپ اپنی قیام گاہ سے نکل آیا۔ بارش ہلکی ہو چکی تھی اور کسی وقت بند بھی ہو جاتی تھی۔ سردی سے بچنے کے لیے اس نے اپنی اونی کوہاٹی چادر اچھی طرح بالائی جسم پر لپیٹ لی۔ نیلی ایف ایکس گاڑی کھلے میں کھڑی تھی اور برف ہو رہی تھی۔ فوری طور پر تو گاڑی کا ہیٹر بھی کام نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور موراں والی سے اور موراں والی کے میلے سے نکل آیا۔ پتا نہیں کیوں وہاں سے نکلتے ہوئے اس کی آنکھوں میں نمی سی آ گئی۔ اس کی نگاہوں میں بار بار وہ منظر آ جاتا تھا جب وہ دوسری لڑکیوں کے ساتھ ٹھیلے والے کے پاس کھڑی تھی اور پھر اسے دیکھ کر بالکل منہ پھیر کر کھڑی ہو گئی تھی۔ کتنی بے اعتنائی، بیگانگی اور بیزاری جھلکتی تھی اس کے انداز سے۔

اس نے گاڑی کو دوسرے گیئر میں ڈالا اور کچے پکے راستے پر ہچکولے کھاتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ پختہ سڑک تک پہنچنے کے لیے اسے قریباً دو کلومیٹر تک اسی نیم پختہ راستے پر جانا تھا اور پھر برساتی نالے کا تنگ پل بھی پار کرنا تھا۔

اس کے دائیں بائیں جھاڑیاں اور سرکنڈے تھے۔

چاند نے تھوڑی دیر کے لیے گہرے بادلوں کی اوٹ سے جھلک دکھائی تھی اور پھر اوجھل ہو گیا تھا۔ اچانک ذوالقرنین بری طرح ٹھٹک گیا۔ اسے بائیں جانب سے کچھ فاصلے پر فائر کی آواز سنائی دی...... ابھی وہ اسی پر غور کر رہا تھا کہ بائیں جانب کے سرکنڈوں میں عجیب سی حرکت ہوئی اور کوئی تیزی سے بھاگ کر سامنے سے گزرا۔ وہ ایک لمحے کے لیے ایف ایکس کی ہیڈ لائٹس کے سامنے آیا تھا۔ ذوالقرنین سکتے میں رہ گیا۔ اسے اپنی نگاہوں پر بھروسا نہیں ہوا۔ بھیگے لباس اور بھیگے بالوں والی وہ دراز قد لڑکی جو لڑکھڑاتی ہوئی سی بھاگ رہی تھی...... نور کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی......

حیرت کے شدید دھچکے سے سنبھلنے کے بعد اس نے گاڑی کے بریک دبائے اور کھڑکی کھول کر اپنے پھیپھڑوں کی پوری طاقت سے پکارا۔ ''نور...... نور۔''

وہ رک گئی۔ درمیانی فاصلہ دس پندرہ قدم سے زیادہ نہیں تھا۔ ''یہ میں ہوں نور۔'' وہ پھر چلایا۔

تب تک شاید وہ بھی ذوالقرنین کی نیلی ایف ایکس پہچان چکی تھی۔ وہ چند لمحے ساکت رہنے کے بعد گاڑی کی طرف جھپٹی اور دروازہ کھول کر اگلی نشست پر بیٹھ گئی۔ ''جلدی کرو...... پولیس چوکی چلو۔ انہوں نے حویلی کو گھیر لیا ہے...... وہ...... میرے پیچھے بھی آ رہے ہیں۔'' اس کی آواز دہشت کے سبب ناقابلِ شناخت ہو رہی تھی۔

ذوالقرنین بھی حیرت اور سنسنی کے شدید گھیرے میں آ گیا لیکن کوئی سوال پوچھنے کے بجائے اس نے گاڑی کو تیزی سے آگے بڑھانا مناسب سمجھا۔ گاڑی غیر ہموار راستے پر اچھلتی کودتی آگے بڑھی...... اور پھر اس نے ایک جگہ سے نالے کا پل پار کر لیا۔

''آپ زخمی تو نہیں ہیں؟'' ذوالقرنین نے اس پر ایک نگاہ ڈالی اور ہیجانی لہجے میں پوچھا۔

''نہیں، میں ٹھیک ہوں۔'' وہ مضطرب آواز میں بولی۔

ایک آدھ منٹ کے اندر ہی وہ پولیس چوکی کے سامنے تھے۔ پولیس چوکی کے مختصر صحن میں تاریکی تھی۔ ایک دو کمروں کے روشن دانوں میں لالٹین وغیرہ کی روشنی دکھائی دیتی تھی۔ ہلکی بارش پھر شروع ہو گئی تھی۔ نور اور ذوالقرنین ایک ساتھ گاڑی سے نکلے اور چوکی کا بیرونی دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔ بیرونی دیوار کی اونچائی دس فٹ کے قریب تھی۔

''دروازہ کھولیں، جلدی کریں۔'' نور چلّانے والے انداز میں بولی۔

اس سے ملتا جلتا فقرہ ذوالقرنین نے بھی دہرایا۔ ساتھ ساتھ وہ دونوں دروازہ بھی پیٹ رہے تھے۔ پھر ذوالقرنین کے ذہن میں آیا اور اس نے گاڑی کی کھلی کھڑکی میں سے اپنا ہاتھ گزار کر ہارن پر رکھ دیا۔

اس کا بھی کچھ اثر نہیں ہوا۔ ''پتا نہیں بھنگ پی کر سو گئے ہیں سارے۔'' ذوالقرنین جھلا کر بولا۔

نور سخت پریشانی میں مڑ مڑ کر دیکھ رہی تھی۔ اس کی سانس چڑھی ہوئی تھی اور سینے کا زیر و بم واضح تھا۔

اچانک ذوالقرنین کے ذہن میں نیا خیال آیا۔ گاڑی ابھی تک اسٹارٹ تھی۔ وہ اسے چلا کر دیوار کے بالکل قریب لے آیا۔ پھر اس کی چھت پر پاؤں رکھ کر دیوار پر چڑھا اور اندر کود گیا۔ چند ہی سیکنڈ بعد اس نے بیرونی دروازہ اندر سے کھول دیا۔ نور اسی لمحے کی منتظر تھی۔ وہ جلدی سے اندر گھس گئی۔ ''کنڈی چڑھا دیں۔'' ذوالقرنین نے کہا اور صحن پار کر کے اندرونی کمروں کی طرف لپکا۔

اس نے ایک کمرے کا دروازہ بری طرح پیٹ دیا۔ اس مرتبہ یہ کوشش رائگاں نہیں گئی۔ دروازہ کھلا اور سادہ کپڑوں میں ایک بھاری بھرکم شخص نظر آیا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ چوکی انچارج سب انسپکٹر جان محمد تھا اور خاصا دبنگ شخص تصور کیا جاتا تھا۔

ذوالقرنین نے جھلا کر کہا۔ ''آپ لوگ کس طرح کی ڈیوٹی دے رہے ہیں۔ باہر غدر مچا ہوا ہے اور آپ نے دروازے بند کر رکھے ہیں۔''

سب انسپکٹر نے اپنی سرخ آنکھوں سے ذوالقرنین کو گھورا، ہو سکتا تھا کہ وہ جواب میں کوئی سخت بات کہتا لیکن اس کی نگاہ خستہ حال نور پر پڑ گئی۔ ''کیا ہوا ہے؟'' اس نے پاٹ دار آواز میں پوچھا۔

نور اپنا سر ڈھانپتی ہوئی آگے آئی اور بولی۔ ''آپ یہ پوچھیں کہ کیا نہیں ہوا۔ کھاریوں نے ہمارے گھر کو گھیر لیا ہے۔ ایک بندے کو سخت زخمی اور دوسرے کو قتل کر دیا ہے۔ وہ...... میرے پیچھے...... بھی لگے ہوئے ہیں۔'' اس کا گلا رندھ گیا۔

دو تین اور کمروں کے دروازے اب کھل گئے تھے۔ کچھ باوردی اور کچھ سادہ لباس والے اہلکار باہر نکل آئے

تھے۔ نور مسلسل بولی چلی گئی اور ایک منٹ کے اندر اندر اس نے تقریباً ساری صورت حال پولیس والوں کے گوش گزار کردی۔ یہ انکشاف ذوالقرنین کے لیے بھی تہلکہ خیز تھا کہ حویلی کے اردگرد بہت سے لوگ جمع ہیں اور نور کی بہن بسمہ کو ایک طرح سے اغوا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

ایک ہیڈ کانسٹیبل نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”تھوڑی پہلے مجھے بھی شک ہوا تھا کہ نالے کی طرف کوئی فائر کیا گیا ہے بلکہ شاید یہ دو فائر تھے۔ فائر اور وہ بھی میلے کے دنوں میں۔ گڑبڑ تو ضرور ہورہی ہے جی۔“

دو تین منٹ کے اندر اندر پولیس اہلکار چوکی سے باہر نکل آئے۔ ان کی تعداد پندرہ کے لگ بھگ تھی۔ کچھ وردی میں اور کچھ سادہ لباس میں تھے۔ دو چار کو چھوڑ کر سب کے پاس اسلحہ موجود تھا۔ اندازہ ہورہا تھا کہ سب انسپکٹر جان محمد خود بھی کھاپری برادری سے زیادہ خوش نہیں ہے۔ اس نے فوراً بذریعہ فون قریبی تھانے تک بھی اطلاع پہنچادی تھی۔ جھاڑیوں اور سرکنڈوں کے پار حویلی کی جانب روشنی سی دکھائی دے رہی تھی۔ شاید کہیں تھوڑی بہت آگ بھی لگی ہوئی تھی۔

سب انسپکٹر جان محمد اپنی نفری کے ساتھ پولیس موبائل میں بیٹھ گیا۔ کچھ اہلکار موٹر سائیکلوں پر تھے، تین چار ذوالقرنین کی ایف ایکس میں لدگئے۔ تھوڑا آگے جاکر سب انسپکٹر نے گاڑی رکوالی۔ یہاں بہت بڑی ایک جھونپڑا بستی تھی۔ بارش کی وجہ سے ان میں سے کئی لوگ جاگ رہے تھے۔ سب انسپکٹر نے بلند آواز میں انہیں پکارا۔ پکی رنگتوں والے پانچ چھ افراد لپک کر اس کی طرف آئے۔ اس نے ان سے کچھ کھسر پسر کی۔ ایک دو منٹ کے اندر ہی اس جھونپڑا بستی میں ہلچل نظر آئی اور درجنوں افراد کلہاڑیوں اور لاٹھیوں سے مسلح ہوکر نکل آئے۔ ان میں سے کچھ گھوڑا ریڑھیوں پر اور کچھ گدھا گاڑیوں پر سوار ہوگئے۔ اس سارے قافلے نے پل پار کیا اور تیزی سے وقوعہ کی طرف بڑھا۔

نور، ذوالقرنین کے ساتھ ایف ایکس میں اگلی نشست پر بیٹھی تھی۔ اس کا لباس نم تھا اور اب وہ سردی سے کانپ رہی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ پولیس اہلکاروں کو حویلی کی تشویشناک صورتِ حال سے بھی آگاہ کررہی تھی اور بتارہی تھی کہ وہ کس طرح بچ کر یہاں پہنچ پائی ہے۔

ذوالقرنین نے اسے کانپتے دیکھا تو اپنی گرم کوہاٹی شال اتار کر نور کے کندھوں پر ڈال دی۔ وہ پہلے تو جھجکی اور یوں لگا کہ وہ شال لینے سے انکار کردے گی مگر پھر خاموش رہی۔ ”اس کو اچھی طرح لپیٹ لیں۔“ ذوالقرنین نے اس کی حالت دیکھتے ہوئے کہا۔

کچے پکے راستے پر گاڑی اچھلتی کودتی آگے بڑھ رہی تھی۔ پولیس موبائل کی عقبی سرخ بتیاں ذوالقرنین کی راہنمائی کررہی تھیں۔ ان کے عقب میں خانہ بدوشوں کے ریڑھے اور گدھا ریڑھیاں تھیں۔ غالباً ان کے دو چار کتے بھی شور مچاتے ساتھ آرہے تھے......

تھوڑ زدہ طویل میدان میں پہنچتے ہی حویلی کے آثار نظر آنے لگے۔ شاید حویلی کے کسی کونے میں آگ بھی سلگ رہی تھی۔ سب انسپکٹر نے عقلمندی کا مظاہرہ کیا اور ایک جگہ گاڑی روک کر آٹومیٹک رائفلوں سے کئی برسٹ چلوائے۔ یہ ہوائی فائرنگ تھی اور بلوائیوں کے لیے پیغام تھا کہ پولیس آگئی ہے، وہ ٹکر نہ لیں۔

......کچھ دیر بعد جب وہ لوگ حویلی کے سامنے پہنچے تو گھیراؤ کرنے والے بکھر چکے تھے۔ ذوالقرنین اور نور نے کچھ ٹولیوں کو دریا کی جانب بھاگتے دیکھا۔ کچھ ٹارچوں اور لالٹینوں کی دور ہوتی ہوئی روشنیاں سرکنڈوں کی جانب نظر آرہی تھیں۔

نور نے دیکھا مشتعل کھاپریوں نے حویلی کے قدیم چوبی دروازے کو آگ لگانے کی کوشش کی تھی۔ یہ کوشش یقیناً نور کے فرار ہونے کے بعد ہی ہوئی تھی۔ مگر لکڑی اور لوہے سے تیار ہونے والے اس دروازے کا کچھ خاص نہیں بگڑ سکا تھا۔ اب خانہ بدوش بھی پہنچ گئے تھے اور پولیس کے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہوگئے تھے۔ زبردست ہوائی فائرنگ اور پولیس گاڑی کا مسلسل ہوٹر سن کر حویلی والوں کو یقین ہوگیا کہ پانسا پلٹ چکا ہے۔ حویلی کا جہازی سائز دروازہ کھول دیا گیا۔ نور کی نگاہ سب سے پہلے شرجیل، چچا احسان اور اپنے ابا جان پر پڑی وہ لپک کر ان کی طرف گئی۔ ابا جان کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ ٹھٹک گئی، جیسے سمجھ نہ پارہی ہو کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ ابا جان کے سامنے پہنچ کر وہ ایسے ہی منتشر سی ہوجایا کرتی تھی لیکن اس بار صورتِ حال مختلف رہی۔ ابا جان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ انہوں نے عجیب کیفیت میں اپنے دونوں بازو نور کے لیے کھول دیے۔ وہ لپک کر گئی اور ان کی بانہوں میں سما گئی۔

”میری بچی...... میری عین النور۔“ وہ پکارتے چلے گئے۔ ”آج تم نے وہ کیا جو کوئی اور نہ کرسکتا تھا۔ آج تم میرا بیٹا بنی ہو۔ آج تم نے ہم سب کو ایک بہت بڑی مصیبت اور

خواری سے بچایا ہے......'' انہوں نے اسے باہوں میں بھینچ لیا اور اس کا سر اور ماتھا چومتے چلے گئے۔

وہ سسک رہے تھے اور وہ بھی رو رہی تھی۔ وہ جب روتی تھی تو بس اس کی آنکھوں کے کنارے جلا کرتے تھے لیکن آج اس کے آنسو بھی نکل رہے تھے۔

اس کے ابا جان اشک بار آواز میں بولے۔ ''میری بہادر بیٹی......میری دلیر بیٹی......شیر بیٹی......''

سب انسپکٹر جان محمد اور اس کے ماتحت تعجب سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ ساری بات ان کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ نور کے ابا جان نے خود کو نور سے علیٰحدہ کرتے ہوئے فخریہ لہجے میں کہا۔ ''یہ میری بیٹی ہے...... یہ...... بہت بڑی رنر ہے...... بڑے میڈل جیت چکی ہے۔ اسی نے آج ان بدبخت کھا پریوں کا گھیرا توڑا ہے اور آپ تک پہنچی ہے۔ اللہ سوہنے نے اسے ہم سب کی جان آبرو کی حفاظت کا ذریعہ بنایا ہے۔''

انہوں نے ایک بار پھر نور کو اپنے ساتھ لگالیا۔ نور بولی۔ ''ماموں مراد کہاں ہیں۔ انہیں اسپتال پہنچانے کی ضرورت ہے۔''

'' تمہارے تایا اور عثمان وغیرہ اسے لے کر جارہے ہیں۔ وہ دیکھو گاڑی آرہی ہے۔'' انہوں نے ہیڈ لائٹس کی طرف اشارہ کیا۔ تاریکی کو چیرتی ہوئی ہیڈ لائٹس گیٹ تک آگئیں۔

گاڑی قریب پہنچی تو تایا ابا نے کھڑکی سے چہرہ نکال کر نور کی گردن کی پشت پر ہاتھ رکھا اور اسے اپنی طرف جھکا کر اس کی پیشانی کا بوسہ لیا۔ اشک بار آنکھوں کے ساتھ لیے جانے والے اس بوسے میں انہوں نے وہ سب کچھ کہہ دیا جو وہ کہنا چاہتے تھے۔ نور نے پچھلی نشست پر دراز ماموں مراد کو دیکھا۔ ان کے سر کی بینڈیج خون سے تر تھی۔ آنکھیں بند تھیں، عثمان نے کہا۔ ''گھبرانے کی بات نہیں نور! ٹرنکولائزر کے اثر میں ہیں۔ انشاء اللہ ٹھیک ہوجائیں گے۔''

گاڑی تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ یہی وقت تھا جب ایک چنگھاڑ سی نور کے کانوں میں پڑی۔ وہ گھبرا کر پلٹی۔ گیٹ کے بالکل پاس گل عباسی کے پودوں کے پیچھے سے ایک پرچھائیں سی جھپٹتی ہوئی نظر آئی۔ تاریکی میں نور کو بس یہی نظر آیا کہ حویلی کے چوکیدار گل محمد کی ٹوپی اچھل کر دور جاگری ہے۔ پھر ایک دوسرا شخص پرچھائیں سے لپٹ گیا...... ورنہ یہی لگ رہا تھا کہ وہ پرچھائیں سیدھی نور کی طرف آئے گی۔

ایک دم ایک ہنگامہ سا بپا ہو گیا تھا۔ کوئی جنونی انداز میں چلا رہا تھا۔ ''ماردوں گا...... کاٹ ڈالوں گا...... ٹوٹے کردوں گا۔''

نور کئی قدم پیچھے ہٹ گئی تھی اور ابا جان نے اسے اپنی اوٹ میں لے لیا تھا۔ نور کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ ٹارچوں کی روشنی تصادم والی جگہ پر پہنچی تو نور نے دیکھا کہ چوڑا چکلا ابدال کسی سے لپٹا ہوا ہے۔ وہ جس سے لپٹا ہوا تھا، وہ ذوالقرنین کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ ابدال کے ہاتھ میں چھوٹے دستے والی چمک دار کلہاڑی تھی اور اس کے چہرے پر غیظ و غضب کے شعلے تھے۔ صاف طور پر پتا چلتا تھا کہ وہ شراب کے نشے میں دھت ہے...... اور کسی بھیڑیے سے بڑھ کر خون آشام ہورہا ہے۔ اس کی کلہاڑی پر ذوالقرنین نے بھی گرفت بنا رکھی تھی اور دونوں تقریباً گتھم گتھا تھے۔ پھر وہ دونوں گر گئے لیکن ذوالقرنین نے کلہاڑی کے دستے پر اپنی گرفت ختم نہیں ہونے دی۔ اس کی مزاحمت زبردست تھی۔

پھر پولیس والے اور دیگر افراد بھی ابدال پر جھپٹے اور اس خون آشام کو دبوچ لیا گیا۔ وہ دیوانگی کے عالم میں دھاڑ رہا تھا اور پتا نہیں کیا کیا بک رہا تھا۔ بس ایک فقرہ ہی نور کی سمجھ میں آیا۔ ''اپنی ووہٹی لے کر جاؤں گا، چھوڑوں گا نہیں اسے......''

نور یہ سوچ کر لرز گئی کہ یہی وہ شخص تھا کہ آج رات بسمہ کو جس کے حوالے کیا جانا تھا۔ پولیس والوں نے وہیں گیٹ کے قریب اسے بے دریغ پیٹا اور نیم بے ہوش کر ڈالا۔ لرزتی کانپتی نور کو اس کے ابا جان نے اپنے ساتھ لگایا ہوا تھا۔ نور نے ذوالقرنین کی طرف دیکھا۔ اس کا گریبان چاک ہوگیا تھا۔ ہونٹوں سے خون رس رہا تھا لیکن ویسے وہ بالکل ٹھیک تھا۔

چوکیدار گل محمد کے چہرے پر کلہاڑی کا سخت وار لگا تھا۔ اس کے کئی دانت ٹوٹ گئے تھے اور ایک طرف کا گال قریباً کان تک چر کر رہ گیا تھا۔ ایک دوسری گاڑی میں اسے بھی فوراً اسپتال روانہ کردیا گیا۔

صورت حال سے صاف پتا چل رہا تھا کہ پولیس پارٹی کی آمد پر باقی لوگ تو یہاں سے تتر بتر ہوگئے تھے مگر یہ شرابی ابدال کہیں آس پاس چھپ گیا تھا اور کسی موقع کا منتظر تھا۔ گیٹ کھلنے کے بعد یہ موقع اسے نور پر حملے کی صورت میں ملا جو چوکیدار گل محمد اور ذوالقرنین نے ناکام بنادیا۔

سب کے سامنے ہی بری طرح مدہوش ابدال کو الٹی ہتھکڑی لگا کر پولیس کی گاڑی میں پھینک دیا گیا۔ وہ لہولہان

تھا اور ایک ٹوٹا ہوا چمکیلا ہار اب بھی اس کے گلے سے لٹک رہا تھا۔ سب انسپکٹر جان محمد کی ہدایت پر پولیس اہلکاروں نے حویلی کے اردگرد سرچ آپریشن شروع کر دیا کہ کوئی اور کھاپری بھی کہیں گھات لگائے نہ بیٹھا ہو۔ حویلی کا گیٹ بھی بند کر دیا گیا تھا۔

ماموں اور چچا وغیرہ اب ذوالقرنین سے باتیں کر رہے تھے۔ اس کی خیریت پوچھ رہے تھے۔ پھر سب انسپکٹر جان محمد نے ماموں اور چچا کو اپنے پاس بلا لیا اور ان کو ضروری ہدایات دینے لگا۔ اسی دوران میں نور نے دیکھا کہ ذوالقرنین آگے آیا۔ نور کے ابا جی سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''انکل! زخمیوں کو اس طرح اکیلے نہیں بھیجنا چاہیے، کوئی ساتھ ہو۔ یہ لوگ یہاں سے تو بھاگ گئے ہیں لیکن ادھر ادھر بکھرے ہوئے ہیں۔''

ذوالقرنین کی بات کا وزن سب نے محسوس کیا۔ افراتفری میں اس طرف دھیان ہی نہیں گیا تھا۔

ذوالقرنین نے اپنی گاڑی کے دروازے کھول دیے۔ تین مسلح پولیس اہلکار اس کے ساتھ بیٹھ گئے اور گاڑی زخمی چوکیدار والی گاڑی کے پیچھے روانہ ہو گئی...... حویلی میں اب حالات مکمل کنٹرول میں تھے۔ معلوم ہوا کہ جب نور چھت سے چھلانگ لگا کر بھاگی اور کھاپریوں کی زد سے نکل کر سرکنڈوں میں اوجھل ہو گئی تو مایوس ہو کر اور جھنجلا کر کھاپریوں نے حویلی کے گیٹ کو آگ لگانے کی کوشش کی۔ انہوں نے دیوار کے اوپر سے صحن میں کچھ پیٹرول بم بھی پھینکے۔ جواب میں ان پر چھت سے سخت خشت باری کی گئی...... پیٹرول بموں سے دو تین افراد کو معمولی زخم آئے۔ کسی بڑے نقصان سے بچت ہو گئی۔

......خطرہ ٹل چکا تھا پھر بھی سب انسپکٹر جان محمد نے چند اہلکار گیٹ پر متعین کر دیے اور باقیوں کو ساتھ لے کر لاش کے معائنے کے لیے چلا گیا۔ نور کے ابا جان، چچا جان اور دیگر مرد بھی ساتھ گئے۔ نور، پھپھو حاجرہ اور تائی راحت کے ساتھ خواتین والے حصے میں آ گئی۔ آپی بتول، بسمہ، مہرین، سلیمہ سب اس کے گرد اکٹھی ہو گئیں۔ ان میں سے بیشتر ابھی تک لرزاں تھیں۔ وہ ان سب جیسی تھی لیکن سب جیسی نہیں بھی تھی۔ وہ مختلف تھی اور آج ایک بڑے واقعے نے یہ ثابت بھی کر دیا تھا۔ سب کی آنکھوں میں ستائش تھی اور محبت آمیز نمی تھی۔ مہندی لگے ہاتھوں والی بسمہ نے اسے ایک بار پھر اپنی بانہوں میں بھینچ لیا اور سسکنے لگی۔ جب وہ دونوں جدا ہوئیں تو سب اردگرد بیٹھ گئیں اور نور پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ حویلی سے باہر اب پولیس کی مزید گاڑیوں کے ہوٹر سنائی دینے لگے تھے۔

☆☆☆

......اور یہ منظر تھا لاہور میں مولوی اشفاق مہرا کی رہائش گاہ کا۔ نور اب اپنے گھر میں تھی۔ کچھ لمحے عجیب کایا پلٹ ہوتے ہیں۔ مشکلیں آسان کر دیتے ہیں۔ بلند و بالا دیواریں جن کے گرنے کا کوئی امکان نہیں ہوتا، ریت بن کر مسمار ہو جاتی ہیں۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا جب ابا جان نے اسے حویلی کے دروازے پر سینے سے لگایا تھا اور اس کا ماتھا چوما تھا اور اسے بہادر بیٹی کہہ کر اس کی پیٹھ تھپکی تھی...... انہی لمحوں میں...... ہاں، انہی لمحوں میں نور نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس کے ابا جان جو بھی کہیں گے وہ سر تسلیم خم کر دے گی۔ اب وہ ساری زندگی ان کی کسی بات کو رد نہیں کرے گی۔ شاید اس کے ابا جان کو خود بھی معلوم نہیں تھا کہ ان کی ایک تھپکی کی قیمت کتنی زیادہ ہے۔ وہ اس ایک تھپکی پر اپنی زندگی نثار کر سکتی تھی۔

اپنے والد کی مرضی و منشا کے لیے جو یہ خداداد آمادگی اس کے اندر پیدا ہوئی تھی، وہ اسے اب ضائع کرنا نہیں چاہتی تھی۔ جلد از جلد اسے استعمال میں لے آنا چاہتی تھی۔ وہ اپنے اسی کمرے میں بیٹھی تھی جہاں سے اٹھ کر وہ ایک دن تایا ابا کے گھر میں جا بسی تھی۔ دل فگار اور پارہ پارہ۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ جنوری کی شفق رنگ شام لاہور کے آسمان کو چھو رہی تھی۔ رنگ برنگی پتنگیں فراٹے بھرتی ہوئی فضا میں تیر رہی تھیں اور ساتھ ساتھ اپنے ٹھکانوں کی طرف سمٹ رہی تھیں۔ ایسی مختصر اور سرد شامیں اسے اکثر اداس کر دیتی تھیں۔ اس نے براؤن رنگ کی وہ گرم کوہاٹی چادر دیکھی جسے اس نے استری کر کے تہہ کر دیا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ خدیجہ سے ملاقات ہو تو وہ اس کے بھائی کی چادر اسے واپس کر دے۔ اس نے بے خیالی میں چادر پر ہاتھ پھیرا۔ وہ منظر اس کی نگاہوں میں بھر گیا جب اس تہلکہ خیز رات میں حویلی کی طرف جاتے ہوئے اس نے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ تھاما تھا اور دوسرے ہاتھ سے اپنی چادر کندھوں سے اتار کر نور کے شانوں پر پھیلا دی تھی۔ ان لمحوں میں وہی تڑپ، وہی لگن اور لازوال انتظار دکھائی دیا تھا جس کا مشاہدہ اس نے ایک دو بار پہلے بھی کیا تھا اور جس نے اسے سرتاپا لرزا دیا تھا۔ وہ شروع میں اسے بہت برا شخص سمجھتی تھی پھر وہ اسے صرف برا سمجھنے لگی لیکن اب وہ اس کے لیے ایک اچھا شخص بن چکا تھا۔ سچا، کھرا اور شاید انسانیت سے محبت کرنے والا بھی لیکن

وہ کیا کرتی؟ وہ اچھا ہونے کے باوجود بلکہ بہت اچھا ہونے کے باوجود اس کے لیے پسندیدہ نہیں تھا۔ وہ اس کی محبت کا جواب محبت سے نہیں دے سکتی تھی۔ وہ مجبور سی ہو جاتی تھی۔ کیوں مجبور ہو جاتی تھی؟ شاید...... کوئی آئیڈیل اس کی راہ میں حائل ہو جاتا تھا۔ کلین شیوڈ، ماڈرن لباس، چلبلا۔ یا پھر کوئی انجانا خوف تھا جو اس کا راستہ روکتا تھا۔ یہ کیا کیفیت تھی؟ وہ خود بھی سمجھ نہ پائی تھی۔

مہرین کبھی کبھی زیادہ بے تکلف ہو جاتی تھی۔ اس نے ایک دو بار اس تہلکہ خیز رات کے حوالے سے اسے چھیڑا بھی تھا۔

ایک دن کہنے لگی تھی۔ ''سمجھ میں نہیں آتا کہ جب تم چوکی کی طرف جا رہی تھیں، خدیجہ کا بھائی اتفاقاً ہی تمہیں آ ملا تھا؟''

''کیا مطلب؟''

''کہیں کوئی رابطہ وغیرہ تو نہیں ہوا تھا پہلے سے؟''

''تمہاری عقل گھاس چرنے گئی ہوئی ہے اور میرا دل چاہ رہا ہے کہ گلاس مار کر تمہارا سر توڑ دوں۔''

''مگر اس سے مجھے جواب تو نہیں مل جائے گا نا۔ اچھا چلو چھوڑو اس بات کو...... جب تم دونوں اکٹھے گاڑی میں حویلی جا رہے تھے کیسا محسوس ہوا تمہیں؟ میرا مطلب ہے کہ کوئی بات تو کی ہوگی اس نے یا تسلی کے لیے تمہارا ہاتھ شاتھ تھاما ہوگا......''

''اس وقت تین پولیس والے بیٹھے ہوئے تھے گاڑی میں...... اور کلیجا منہ کو آ رہا تھا۔'' نور نے بیزار لہجے میں کہا تھا اور اٹھ کر کچن کی طرف چلی گئی تھی۔

حویلی والے واقعات کو اب قریباً دس روز ہو چکے تھے۔ دو تین اخبارات میں حویلی والے واقعے کی تفصیلی خبر بھی چھپ چکی تھی...... اس میں جانی پہچانی ایتھلیٹ نور کی کارکردگی کو بھی سراہا گیا اور بتایا گیا کہ اس نے کس طرح ایک نہایت سنگین صورتِ حال میں اپنی فیملی کی مدد کی اور بھاگ کر ایک قریبی پولیس اسٹیشن تک پہنچی۔ جو بھی نور سے ملتا تھا، پہلے اس حیرت انگیز واقعے کے بارے میں ہی پوچھتا تھا۔

اتوار کا دن تھا۔ ابا جان گھر میں ہی تھے۔ آپی بتول، آپی کے شوہر غیاث اور بسمہ ماموں مراد کی خبر گیری کے لیے اسپتال گئے ہوئے تھے۔ ان کے سر کا باقاعدہ آپریشن ہوا تھا اور اب وہ روبہ صحت تھے۔ چوکیدار گل محمد کے چار دانت ٹوٹ گئے تھے اور جبڑے کی ہڈی بھی فریکچر ہوئی تھی۔ وہ زیر علاج تھا۔ مہرا فیملی اس کی پوری نگہداشت کر رہی تھی۔

نور، ابا جان کے سر کے بالوں میں تیل ڈال کر مالش کرنے میں مصروف تھی۔ وہ ان کے عقب میں تھی۔ اپنی بات کہنے کے لیے یہ بڑا اچھا موقع تھا۔ ابا جان نور کو حویلی کے حالات کے بارے میں بتا رہے تھے۔ ان کے مطابق فدا حسین کے بیٹے رشید کے قتل کا مقدمہ چودھری طغرل اور اس کے بڑے بیٹے ابدال کے خلاف ہی درج ہوا تھا۔ آٹھ دس اور افراد بھی نامزد تھے مگر بڑے مجرم یہی دونوں تھے۔

ابا جان نے کہا۔ ''یہ بھی پتا چلا ہے کہ پرسوں طغرل کو پولیس اسٹیشن میں دل کا دورہ پڑا ہے اور اسے جہلم کے اسپتال میں داخل کرایا گیا ہے۔ اس کی حالت ڈانوا ڈول ہے۔ دراصل سب انسپکٹر جان محمد نے دونوں باپ بیٹے پر بڑی ٹائٹ ایف آئی آر کاٹی ہے۔ دو تین اور کیس بھی کھل گئے ہیں ان کے خلاف۔ پھانسی سے بچ بھی گئے تو آٹھ دس سال تو باہر نہیں آئیں گے انشاء اللہ۔''

''ابو! اس فائر کی سمجھ نہیں آئی جو نالے کے پار کیا گیا۔ پتا نہیں کہ مجھے نشانہ بنایا گیا تھا یا پھر وہ ہوائی فائر تھے؟''

''اس کا بھی پتا چل گیا ہے۔'' ابا جان نے اپنے ہاتھ میں موجود ننھی سی تسبیح کو حرکت دیتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے نکل جانے کے بعد یہ لوگ ناچ کر رہ گئے تھے۔ مایوسی میں ہی انہوں نے گیٹ پر پٹرول ڈال کر آگ لگانے کی کوشش کی اور اسی مایوسی اور بدحواسی میں ایک کھاپری نے یہ دو فائر بھی کیے۔ یہ فائر نالے کے پار کے ایک ڈیرے سے کیے گئے۔ وہاں ایک چرسی ٹریکٹر ڈرائیور نے بھوسے کے ڈھیر میں ایک پستول چھپا رکھا تھا۔ اس نے ہوا میں دو گولیاں چلائیں اور سمجھا کہ شاید تم اس طرح ڈر جاؤ گی مگر تب تک تم چوکی کے سامنے پہنچ چکی تھیں......''

تھوڑی دیر اس بارے میں بات ہوئی پھر چند لمحے کے توقف کے بعد وہ ہولے سے بولی۔ ''ابو! ایک بات کہوں؟''

''ہاں ہاں، بولو عین النور۔''

''میں نے آپ کا بہت دل دکھایا۔ آپ مجھے دل کی گہرائی سے معاف کر دیں...... میں وعدہ کرتی ہوں، کبھی آپ کی کسی بات پر اعتراض نہیں کروں گی۔ آئندہ زندگی کے بارے میں آپ میرے متعلق جو فیصلہ بھی کریں گے، مجھے قبول ہوگا۔''

انہوں نے گھوم کر اس کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں پھر آنسو چمک گئے تھے۔ اسے بازو سے پکڑ کر انہوں نے اپنے سامنے کرسی پر بٹھا لیا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ جو کچھ کہہ

رہی تھی وہ اس کا مطلب بڑی اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔

"میری بچی!" انہوں نے بڑے جذبے سے کہا اور اسے کھینچ کر اپنے ساتھ لگا لیا۔ "تم..... بھی مجھے معاف کر دو۔ میں نے بھی تمہیں ہمیشہ غلط سمجھا ہے۔ تمہیں دکھ دیا ہے۔"

نور کا سر ان کے سینے پر تھا۔ وہ اپنے سر کو نفی میں ہلانے لگی۔ آنکھوں کے کنارے جل ہی نہیں رہے تھے، بھیگ بھی رہے تھے۔

وہ گلوگیر لہجے میں بولے۔ "دیکھو، قدرت بھی کیا کیا منظر دکھاتی ہے۔ میں نے تمہارے شوق کو ہمیشہ بُرا کہا...... اس وجہ سے ہمیشہ تم سے خفا رہا مگر...... تمہارے اسی شوق کی وجہ سے اس رات ہم سب نے نئی زندگی پائی۔ جو کام کوئی اور نہ کر سکا، وہ تم نے کیا۔ میں ان لمحوں کو کبھی بھول نہیں سکتا نور۔ اگر تم ان کے ہاتھ آجاتیں تو...... تو......" وہ اس سے آگے کچھ بول نہ سکے اور چند لمحے کے لیے رقت آمیز کیفیت میں رہے۔

تب سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے انہوں نے کہا۔

"انسان خود کو عقلِ کُل سمجھتا ہے اور قدرت اسے بتاتی ہے کہ اس کی فہم و دانش کی کیا حقیقت ہے...... پتا نہیں کیوں آج مجھے لگتا ہے کہ تم اس رویّے کی حقدار نہیں تھیں جو میں نے اب تک تم سے اپنائے رکھا......"

"ابو جی! اب چھوڑیے ان باتوں کو۔ یہ سب ماضی کا حصہ ہے۔ میں آپ کی بیٹی ہوں۔ بس آپ کی بیٹی ہوں۔" اس نے اپنے گرم آنسو اپنے ابو کے سینے کو سونپ دیے۔ وہ حیران تھی کہ یہ آنسو کئی برسوں تک کیوں اس کی آنکھوں میں آزادانہ راہ نہیں پا سکے...... کیا پہلے...... وہ اپنی شناخت چاہتی تھی، اپنی ذات کو منوانا چاہتی تھی، اس کے بعد ان آنسوؤں کو راستہ ملنا تھا؟

☆☆☆

یہ دو ماہ بعد کی بات ہے۔ مارچ کا پہلا ہفتہ تھا۔ یہ بہار کے آغاز کی ایک سہانی رات تھی۔ سارے میں موتیے اور گلاب کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ گھر میں ڈھولک بج رہی تھی۔ پرسوں نور کی سگائی تھی۔ ابا جان کی دیرینہ آرزو کے مطابق اس کی منگنی مولانا حبیب اللہ مرحوم کے فرزند ذوالقرنین سے ہی ہونے والی تھی۔ اپنے عزم کے مطابق اس نے ابا جان اور تایا جان کی خواہش کے سامنے سر جھکا دیا تھا۔ تائی راحت نے اپنے دلنشیں انداز میں اسے سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔ "نور...... عورت کے لیے بہت بہتر ہوتا ہے کہ وہ اس سے شادی کرے جو اسے چاہتا ہے۔ نہ کہ اس سے جسے وہ چاہتی ہے۔"

اور وہ بھی جانتی تھی کہ ذوالقرنین دل کی گہرائیوں سے نور پر فدا ہے۔ اس کے کئی ثبوت تھے جن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ وہ امناں والے کے میلے میں بھی موجود تھا اور اس موقع پر بھی موجود تھا جب طوفانی شب میں نور اس ویران پولیس چوکی کے دروازے پر دستکیں دے رہی تھی...... اور اس وقت بھی جب چوکیدار گل محمد حملہ آور ابدال کو روکنے کی کوشش میں گر چکا تھا...... وہ خاموش محبت اپنے سینے میں لیے برسوں سے اس کا سایہ بنا ہوا تھا۔

اور نور بھی یہی سوچ رہی تھی۔ انسان کو وہ سب کچھ تو نہیں ملتا جس کی وہ تمنا کرتا ہے اور ایک دن شادی کہیں نہ کہیں تو کرنا ہی تھی...... تو پھر کیوں نا اس میں بڑوں کی خوشنودی شامل ہو جاتی۔

اگلے روز نور ایک اور امتحان سے دوچار ہو گئی۔ یہ بھی کڑا امتحان تھا۔ وہ تایا زاد مہرین سے مل کر واپس اپنے گھر آئی تو ملازمہ نے ایک لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔ "یہ شاید آپ کا ہے چھوٹی بی بی۔"

نور نے لفافہ دیکھا اور اس کے پورے جسم میں سنسنی پھیل گئی۔ یہ محکماتی لیٹر تھا۔ اسی مہرباں نامہرباں ادارے کی طرف سے جس نے جاب فراہم کی تھی اور جس کی نمائندگی وہ قومی کھیلوں میں کر چکی تھی۔ کچھ عرصہ پہلے ہونے والے ٹرائلز کی بنیاد پر نہ صرف اس کی ملازمت بحال کر دی گئی تھی بلکہ یہ ارادہ بھی ظاہر کیا گیا تھا کہ وہ دو دوسری ایتھلیٹس کے ساتھ نیشنل اسپورٹس میں محکمے کی نمائندگی بھی کرے گی۔

یہ ایک بڑی خوشخبری تھی لیکن ایک ایسے موقع پر آئی تھی جب اس کی شادی کی تیاری ہو رہی تھی۔ اس نے خود کو زندگی کے ایک مشکل ترین دوراہے پر محسوس کیا۔ خط اس کے ہاتھ میں لرزنے لگا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ شادی اور اسپورٹس دونوں کام ایک ساتھ کبھی نہیں چل سکتے۔ وہ اپنے ہونے والے سسرالیوں کے خیالات اچھی طرح جانتی تھی اور اپنے ابا جان کے مزاج کو بھی۔ وہ ان دونوں راستوں میں سے بس ایک ہی راستہ چن سکتی تھی۔ ایک جاں گسل کشمکش کے بعد اس نے وہی راستہ چنا جو اسے چننا چاہیے تھا۔ اس نے نہ صرف وہ خط پھاڑ دیا بلکہ گھر کے عقبی کمرے میں پہنچی۔ یہاں وہ سارے ایوارڈز اور ٹرافیاں وغیرہ موجود تھیں جو تایا ابا کے گھر سے واپس اس کے گھر میں آئی تھیں۔ چھوٹی امی زلفت نے یہ ٹرافیاں اس کمرے میں سجا دی تھیں۔ اس نے ان ساری ٹرافیوں اور ایوارڈز کو ایک ڈبل بیڈ شیٹ میں گٹھڑی کی طرح باندھا اور تہ خانے میں

جا کر اس پرانی جستی پیٹی میں پھینک دیا جو شاید اسی کام کے لیے خالی پڑی تھی۔ اس پر عجیب سی کیفیت طاری تھی، سینے میں جیسے دھواں سا پھیلا ہوا تھا۔ وہ اپنے شوق سے یوں بچھڑ رہی تھی جیسے کوئی دیرینہ محبوب ساتھی سے بچھڑتا ہے۔

ملازمہ سودا سلف لینے قریبی مارکیٹ جا چکی تھی۔ اس وقت نور گھر میں اکیلی تھی۔ وہ ایک الماری تک پہنچی۔ وہاں وہ امپورٹڈ ایتھلیٹکس شوز رکھے تھے جو کچھ عرصہ پہلے تایا ابا نے اسے یو ایس اے سے منگوا کر دیے تھے۔ یہ اس کے سب سے محبوب شوز تھے۔ وہ انہیں لے کر چھت پر چلی گئی۔ ان پر مٹی کا تیل چھڑکا اور آگ دکھا دی۔ وہ جل گئے تو ان کی راکھ ایک شاپر میں ڈال کر ڈسٹ بن میں پھینک دی۔ اس کے بعد کمرے میں بند ہو کر اس نے دیر تک آنسو بہائے اور ہلکی پھلکی ہو گئی۔ اسے نیند آ گئی۔ وہ تب جاگی جب شام گہری ہو گئی اور ڈرائنگ روم میں پھر سے ڈھولک بجنا شروع ہو گئی...... اس کی منگنی میں اب بس چوبیس گھنٹے باقی رہ گئے تھے اور شادی میں بھی زیادہ دن نہیں تھے۔

☆☆☆

کبھی کبھی وقت پر لگا کر اڑنے لگتا ہے۔ شاید ان دنوں بھی ایسا ہی تھا۔ دن مختصر تھے اور شادی کی تیاری میں صبح سے شام اور پھر رات ہونے کا پتا ہی نہیں چلتا تھا۔ شاپنگ ہو رہی تھی۔ دو تین بار خدیجہ بھی نور کے ساتھ گئی تھی۔ وہ بہت خوش تھی۔ اس کے بھائی کی دلی مراد پوری ہو رہی تھی۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ وہ جیسے ہواؤں میں اڑتی پھر رہی تھی۔

ایک دن وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”شادی سے پہلے اپنے ہونے والے میاں سے نہیں ملو گی؟“

”وہ کیوں؟“

”بھئی، تمہاری ہچکچاہٹ اور خوف میں کمی واقع ہو جائے گی۔“

”کیا آپ یہ کہنا چاہ رہی ہیں کہ آپ کے بھائی خوفناک ہیں؟“

”اگر خوفناک نہیں تو پھر تم نے سگائی کے بعد ایک بار بھی میل ملاقات کی خواہش کیوں ظاہر نہیں کی؟“

”اب ایک ہی بار مل لیں گے...... اور بھگت بھی لیں گے۔“ وہ ہولے سے مسکرائی۔

”بہت برا لفظ استعمال کیا ہے تم نے...... بھگت لیں گے۔“ خدیجہ نے اس کے سر پر ہولے سے چپت لگائی پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ ”نور! تم سے کہا تھا نا کہ وہ سخت ضرور ہے، کئی معاملوں میں دوٹوک رائے رکھتا ہے لیکن یہ سختی ویسی ہی ہے جیسے...... اخروٹ کی ہوتی ہے۔ اندر سے کتنا نرم اور مزیدار ہوتا ہے۔“

نور بولی۔ ”لیکن اخروٹ کی ”نرمی“ تک پہنچنے کے لیے کافی مشکل پیش آیا کرتی ہے جناب...... کچھ کی ”نرمی“ تو اپنے سخت خول سے نکلنے کا نام ہی نہیں لیتی۔“

”وہ ایسا نہیں ہے نور! تم بے فکر رہو۔ بس تھوڑا سا...... ٹائم دینا اسے۔“

اور یہ نور کی شادی کی رات تھی۔ اپریل کی درمیانی تاریخیں تھیں۔ بہار کا شباب تھا...... اور شباب پر بہار تھی۔ پوری راتوں کا چاند دمک رہا تھا۔ بہار اور چاندنی کا ملاپ دلوں میں جادو جگا دیا کرتا ہے۔ وہ اپنے حجلۂ عروسی میں پھولوں کی لڑیوں کے درمیان گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اسے میک اپ اور بھاری گہنے وغیرہ کبھی پسند نہیں رہے تھے مگر کچھ معاملات وقت کی مجبوری ہوتے ہیں۔ اسے اپنا یہ روپ بالکل بھلا نہیں لگ رہا تھا مگر وہ اسے دل و جان سے نبھانا چاہتی تھی اور پھر وہ گھڑیاں آئیں جب اس کا شریک حیات، اس کا شوہر کمرے میں داخل ہوا۔ نور کے دل کی دھڑکن بڑھ گئی۔ سانسوں کی آمدورفت تیز ہو گئی۔ گلاب، گیندے اور نرگس کے پھولوں کی مہک اس کے حواس کو ڈھانپ رہی تھی۔ سرخ جوڑے کے اندر اس کا سیمیں بدن تھا اور اس بدن کے اندر اس کا دل تھا اور اس دل میں امید کی کرنیں روشن تھیں۔ کچھ خوشگوار سی دھڑکنیں ان نیلی سفید کرنوں کو دھڑکانے لگی تھیں۔ کرنیں متحرک تھیں اور جھلملا رہی تھیں۔

اس نے گھونگٹ اٹھایا۔ چند رسمی فقرے ادا کیے اور پھر اس کے پاؤں کی طرف دیکھنے لگا۔ پاؤں پر مہندی تھی اور نقرئی پازیبوں کی جھلملاہٹ تھی۔ اس نے نور سے تمام تر توجہ ہٹا کر اس کے پاؤں پر نگاہ جمالی، پھر عجیب انداز سے ان پر ہاتھ پھیرا۔

یکایک نور کے ذہن میں ایک سیاہ جھکڑ چلا اور اس کے پورے بدن میں پھیل گیا۔

اسے لگا...... اسے لگا اس کے ہر مسام سے پسینا بہہ نکلا ہے۔ وہی مناظر اس کے ذہن پر جھپٹے جو ایک مرتبہ غنودگی کے عالم میں اس کے پردۂ تصور پر ابھرے تھے۔ اس نے کہا تھا، میں تم سے بہت زیادہ محبت کرتا ہوں۔ اتنی کہ تمہیں پانے کے بعد کھونے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ لہٰذا مجھے ایسا کچھ کرنا ہوگا کہ ہماری جدائی کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں...... اور پھر......

... خون کی پچکاریاں اور نور کی اپنی ہی آہ و بکا اس کے کانوں میں گونجنے لگی تھی۔ اس کے پاؤں ٹخنے کے اوپر سے کاٹ ڈالے گئے تھے۔ نہ رہیں گے پاؤں، نہ بھاگے گی تُو...... نہ بھاگے گی تُو۔

تو کیا آج وہی تصور حقیقت کا روپ دھارنے والا تھا...... یا اس تصور جیسا کوئی اور بے رحم منظر سامنے آنے والا تھا؟ پھولوں کی لڑیوں کے درمیان سے نور کو ذوالقرنین کی پشت نظر آرہی تھی۔ اس کی کریم کلر شیروانی، اس کی ہموار ڈاڑھی کی ایک سائڈ اور اس کا ایک ہاتھ جس میں ایک چابی تھی۔ اس کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا اور نہ ان کے تاثرات۔ اس نے چابی سے الماری کھولی اور اس میں سے کچھ نکال لیا۔ وہ دیکھ نہیں سکی۔ اس کی نگاہیں دھندلا رہی تھیں۔ وہ بزدل نہیں تھی لیکن ان لمحوں میں اس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ اس نے کیا نکالا تھا؟ کیا ایک تیز دھار چاپر...... یا اس جیسی کوئی اور چیز؟ نہیں، وہ چاپر نہیں تھا۔ وہ ایک ڈبا تھا جو خون میں لتھڑا ہوا تھا۔ ویسا ہی گہرا سرخ خون جو اس کے عروسی لباس کا تھا...... مگر نہیں، وہ سرخ خون نہیں تھا۔ وہ تو سرخ رنگ کا ڈبا تھا جس کے بیچ کی طرف سفید دھاریاں تھیں۔ وہ ڈبا لے کر اس کے قریب آیا۔ اسے کھولا...... اس میں ایتھلیٹک شوز تھے۔ امپورٹڈ، سفید رنگ کے یو ایس اے کے بنے ہوئے، اسپرنٹرز کے لیے مخصوص۔ وہ جاگتی آنکھوں سے خواب تو نہیں دیکھ رہی تھی۔ نہیں، یہ حقیقت تھی۔ ذوالقرنین نے شوز نکالے۔ عجیب نظروں سے نور کی طرف دیکھا۔ محبت سے مسکرایا اور بولا۔ ''پاؤں آگے کرو نور۔''

وہ ششدر تھی۔ کانوں میں ایک آواز گونج رہی تھی۔

کون کہتا ہے محبت لوگوں کو نہیں بدلتی؟

محبت لوگوں کو بدلتی ہے۔

ان کی سوچوں کو بدلتی ہے۔

ان کے خیالات کی سب سے گہری پرتوں میں بھی اتر جاتی ہے اور وہاں نئے معیار ایجاد کرتی ہے۔ یہی محبت کا معجزہ ہے۔

☆☆☆

شادی کے بعد چند روز کے اندر ہی وہ ایک دوسرے کے اتنا قریب آگئے تھے کہ نور سوچ بھی نہ سکتی تھی۔ جیسے برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ ایک دوسرے کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ شریک حیات کے لیے جو ایک موہوم سا آئیڈیا نور کے دل و دماغ میں ابھرا کرتا تھا، نجانے کہاں کھو گیا تھا۔ اس آئیڈیل کی جگہ حقیقت نے لے لی تھی اور حقیقت خوبصورت تھی۔ اس تخیل سے کہیں زیادہ خوبصورت اور دلنواز تھی جو بھی ایک میگزین کے اسپورٹس انچارج کے طور پر اس کے سامنے آیا تھا...... اب وہ اس کا نام بھی ذہن میں لانا نہیں چاہتی تھی۔

''ماشاءاللہ۔'' ذوالقرنین نے اس کے عقب میں آکر کہا اور وہ اپنے خیالوں سے بری طرح چونک گئی۔ ڈریسنگ میز کے اسٹول سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ کھانے کی ایک دعوت پر جارہے تھے۔ نور نے ہمیشہ کی طرح بہت ہلکا میک اپ کیا تھا۔ چوڑیاں اور جھمکے پہننا اس کی مجبوری تھی ورنہ وہ یہ بھی نہ پہنتی۔ اس معمولی تیاری کے ساتھ بھی وہ بڑی دلکش لگ رہی تھی۔ ذوالقرنین نے کندھوں سے تھام کر اسے اور اس کے سنگھار کو سونگھا پھر ایک فرحت بخش سانس لے کر بولا۔ ''اللہ آپ کو نظرِ بد سے بچائے۔ میں اپنی قسمت پر ناز کرسکتا ہوں۔''

''کیا اب مجھے شکریہ ادا کرنا ہوگا؟'' وہ مسکرائی۔

''نہیں۔ صرف، میری شیروانی کا اوپر والا بٹن بند کرنا ہوگا۔'' وہ بھی ہلکے پھلکے انداز میں بولا۔

نور نے اس کی خوبصورت تراش کی براؤن شیروانی پر نگاہ دوڑائی۔ وہ جچ رہا تھا۔ نور نے شیروانی کا بالائی بٹن ذرا زور لگا کر بند کیا۔ کالر تھوڑا سا ٹائٹ تھا۔ وہ مصنوعی انداز میں کراہنے لگا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ اتنے تنگ گلے والی شیروانی میرے سسرالیوں نے سازش کے تحت سلوائی ہے...... جب مجھ سے پیچھا چھڑانے کو دل چاہے گا، آپ مجھے یہ شیروانی پہننے کے لیے دے دیں گی۔''

''آپ زیادہ ڈراما نہ کریں۔ ہاں، یہ ہے کہ دو ماہ پہلے کے حساب سے تھوڑا سا وزن بڑھ گیا ہے آپ کا۔''

''آپ اتنا اچھا پکاتی ہیں تو پھر یہی کچھ ہوگا۔'' اس نے ا[illegible]سے بانہوں میں لیتے ہوئے کہا۔

''چلیں، اب دیر ہورہی ہے۔ خدیجہ اور خالہ نیچے انتظار کررہی ہوں گی۔'' وہ پیچھے ہٹتے ہوئے بولی اور آئینے کے سامنے دوبارہ لپ اسٹک درست کرنے لگی۔

وہ بولا۔ ''ارے ہاں یاد آیا۔ صبح آپ نے ایف اے ایس بھی جانا ہے، کتنے بجے اٹھنا ہوگا؟''

''چھ بجے سے پہلے۔'' وہ مسکرائی۔ ''کل رننگ سیشن بھی ہونا ہے۔''

''یا خدا...... یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں؟'' ذوالقرنین نے کہا اور ٹھنڈی سانس بھری۔ وہ کتنا Cool لگ رہا تھا۔

وہ حیرت سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اسے بار بار

تایا ابا کی بات یاد آگئی تھی۔ ایک مرتبہ انہوں نے کہا تھا۔ ''صورتیں دھوکا دیتی ہیں نور۔ جب تک کسی بندے کے ساتھ رہا نہ جائے اسے پرکھا نہ جائے، کوئی حتمی نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا۔''
بے شک وہ درست کہا کرتے تھے۔
''چھ بجے تو اندھیرا ہوتا ہے تو جہ محترمہ۔'' وہ بولا۔
''امید ہے کہ جلد ہی آپ کی شکایات دور ہو جائیں گی۔ جب میں گیم چھوڑ دوں گی، پھر ٹائمنگ کی یہ سختیاں نہیں رہیں گی۔''
''لیکن گیم سے آپ نے مکمل ناتا تو نہیں توڑنا نا۔ جب آپ کو چنگ وغیرہ کی طرف آئیں گی تب بھی وقت تو دینا ہی پڑے گا۔ صبح چھ بجے نہ سہی، سات بجے سہی۔ سات بجے نہ سہی، آٹھ بجے سہی......نو بجے سہی۔''
''نو بجے سے جناب کو کیا پریشانی ہوگی؟'' وہ بولی۔
''پریشانی تو مجھے دس اور گیارہ بجے سے بھی ہوسکتی ہے لیکن ہوسکتا ہے کہ پھر اللہ تعالیٰ، آہستہ آہستہ کچھ کرم فرمادے۔ دل کی بے قراریوں کو ذرا قرار آجائے۔'' وہ کسی چنچل لڑکے کی طرح بولا۔
ذوالقرنین کے مزاج کا یہ رخ نور کے لیے بڑا دل آویز تھا۔ وہ سوچنے لگی کئی کم ہمتیاں کتنی مفید ثابت ہوتی ہیں۔ اگر کچھ عرصہ پہلے پی سی او کے بوتھ سے ذوالقرنین کو ایک سخت فون کرتے کرتے وہ رک نہ جاتی اور ارادہ بدل نہ دیتی تو نجانے ان کے درمیان کتنی بڑی خلیج حائل ہوجاتی۔ قدرت کے کام قدرت ہی جانتی ہے۔ نور اور ذوالقرنین کے درمیان اس کال والا معاملہ بھی صاف ہو چکا تھا۔ ایک دن رومانی موڈ میں ذوالقرنین نے اس سے پوچھا تھا کہ میلے پر جانے سے پہلے ایک دن سہ پہر کو نور نے اسے کال کی تھی؟ نور مان گئی تھی مگر یہ وضاحت نہیں کی تھی کہ وہ کال اس نے اچھے نہیں برے موڈ میں کی تھی۔ بس اتنا کہا کہ آپ کو سمجھانا بجھانا چاہتی تھی۔ اس کے بعد ذوالقرنین نے بھی اسے بتادیا تھا کہ میلے کے دوران میں اس کے سر پر پٹی کیوں نظر آئی تھی۔ فون بیل سن کر سیڑھیوں سے اس کا لڑھک جانا ایک دلچسپ واقعہ تھا۔ نور اور ذوالقرنین دونوں ہنستے ہوئے سرخ ہوگئے تھے۔

☆☆☆

......اور پھر آخر وہ دن آن پہنچا جس کا انتظار مدت سے تھا۔ آج نور ایک بار پھر سو میٹر دوڑ کے میدان میں تھی۔ یہ میگا ایونٹ تھا۔ قومی کھیل تھے اور اس کے سامنے وہی ٹریک تھا جس پر وہ کئی بار ہاری تھی اور ایک بار بری طرح گری بھی تھی لیکن آج وہ ہارنا نہیں چاہتی تھی۔ کم از کم وکٹری اسٹینڈ کو تو کھونا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے اندر ایک عجیب سی ترنگ تھی اور اس ترنگ کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ پرانی حریف نشو بجلی بھی پوری تیاری کے ساتھ ایونٹ میں حصہ لے رہی تھی۔ اس کے بارے میں اڑتی اڑتی خبر یہ تھی کہ اس نے کسی فٹنس پرابلم کا شکار ہوکر اپنا قریباً ایک چوتھائی سیکنڈ کھودیا ہے۔
بظاہر سنجیدہ لیکن اندر سے متبسم ذوالقرنین حوصلہ افزا انداز میں نور کے اردگرد موجود تھا۔ اس کی حوصلہ افزائی نور کے لیے بے حد اہم تھی۔ نور کی پرفارمنس اب تک بہت بہتر تھی۔ اس نے جاں گسل کوشش کے ساتھ اپنی پرانی فارم تقریباً تقریباً حاصل کرلی تھی۔ ابتدائی ہیٹس میں ایک مرتبہ اس کی ٹائمنگ 12.05 بھی رہی تھی۔
اسٹیڈیم کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ کیمرے حرکت کررہے تھے۔ اس کی محترم کوچز نبیلہ وجدان اور میڈم فرحانہ بھی موجود تھیں۔ اپنے مختلف لباس اور اسکارف کی وجہ سے نور ہمیشہ علیحدہ سے نظر آتی تھی۔ کچھ لوگ اس حلیے کو بہت پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے اور کچھ ہوٹنگ بھی کرتے تھے۔ نشو بجلی اس کے پاس سے گزری اور حسب معمول ایک فقرہ اچھال گئی۔ ''سونے پر سہاگا ہے یار! ایک تو پینڈو، اوپر سے شادی شدہ۔''
نور نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کا نظریہ ہمیشہ سے یہی تھا کہ اصل جواب میدان میں ہوتا ہے۔
فائنل ریس شروع ہونے سے چند منٹ پہلے اس کے پیارے تایا ابا اس کے پاس آئے، اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اسے اپنے ساتھ لگایا اور بولے۔ ''بیٹا! ہار جیت کھیل کا حصہ ہوتی ہے۔ کوئی ہارتا ہے تو ہی کوئی جیتتا ہے نا۔ اصل چیز تو مستقل مزاجی ہے اور اپنی کوشش سے جڑے رہنا ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ غیر مستقل مزاج فاتح سے ایک ایسا ہارنے والا کہیں بہتر ہے جو مستقل مزاجی سے کوشش جاری رکھتا ہے اور نتیجے کو خندہ پیشانی سے قبول کرتا ہے......تم جیت سکتی ہو اور ہار بھی سکتی ہو۔ دونوں صورتوں میں تم ہماری جان ہو...... کیونکہ تم ......موراں والی میں وہ جیت اپنے نام کرچکی ہو جو کبھی ہار میں نہیں بدل سکتی......''
نور کو تایا ابا کا جملہ بہت اچھا لگا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن پھر ایک سایہ سا اس کے چہرے پر لہرایا۔ وہ بولی۔ ''ابا جان نہیں آئے نا؟''
''نہیں......لیکن انہوں نے تمہاری کامیابی کی دعا کی ہے۔ ان کی ساری گڈ وشز تمہارے ساتھ ہیں۔''

''پر [illegible]''

''اس کا جواب تو وہی دے سکتا ہے......مگر نور! وہ تم سے خوش ہے۔ تمہیں کامیاب دیکھنا چاہتا ہے۔''

اناؤنسمنٹ ہوگئی کہ فائنل ریس میں حصہ لینے والی اسپرنٹرز ٹریک پر آجائیں۔

دیگر لڑکیوں کی طرح نور بھی پہنچ گئی۔ اس کی خواہش تھی کہ ابو جان یہاں آئیں۔ انہوں نے اسے نیک دعاؤں سے رخصت کیا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ وہ اپنے کام سے جلدی واپس آ گئے تو اسٹیڈیم پہنچیں گے۔

نور نے ان کی دی ہوئی دعاؤں کو یاد کیا اور ان کی کمی کو دور کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ دعا اور بددعا میں بہت فاصلہ ہوتا ہے۔ اس سے پہلے ابو جان کی دعائیں اس کے ساتھ نہیں تھیں...... نہ صرف وہ دعاؤں سے محروم تھی بلکہ بقول پھپھو حاجرہ ایک بددعا بھی اس کے ساتھ تھی۔ آج صورتِ حال بالکل مختلف تھی۔

اسپرنٹرز ٹریک پر پہنچ چکی تھیں۔ اب کسی بھی وقت پوزیشن ہونے کا اعلان ہوسکتا تھا۔ اچانک نور نے دیکھا کہ اس کے تایا انتظامیہ کے ایک شخص سے آرگومنٹ کر رہے ہیں۔ وہ شاید نور سے کوئی بات کرنا چاہتے تھے۔ آخر وہ کامیاب ہوئے اور اپنی پی کیپ درست کرتے ہوئے سیدھا نور کی طرف آئے۔

''کیا ہوا تایا ابا؟'' وہ جیسے اندر سے کانپ گئی۔

انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اپنی انگلی سے تماشائیوں کے اسٹینڈ کی طرف اشارہ کیا۔ وی آئی پی کی تیسری یا چوتھی رو میں اسے ایک چہرہ نظر آیا۔ یہ اس کے ابا جان کا چہرہ تھا۔ وہ آ گئے تھے...... وہ پہنچ گئے تھے، وہ مسکرا رہے تھے......نور کے اندر ایک ترنگ پیدا ہوئی۔ یہ ترنگ توانائی کی ایک شعاع بن کر اس کے پاؤں کے ناخنوں سے اٹھی اور سر کے بالوں تک چلی گئی۔

لاہور کی اس چمکیلی سہ پہر میں آسمان پر سفید بادلوں کے ٹکڑے تھے۔ پوزیشن لینے کا اعلان ہوا۔ اسپرنٹرز نے اپنے پاؤں فٹ بلاکس پر جمائے، آگے کو جھکیں، اسٹارٹنگ لائن کو چھوا۔ سیکنڈ پوزیشن لی اور ان کی سماعتیں فائر کی آواز سننے کے لیے تیار ہوگئیں۔ یہ سب کچھ وہی تھا۔ وہی پوزیشن، وہی ٹریک، وہی تماشائی، وہی دور سے نظر آتی ہوئی فنش لائن کی جھلک لیکن آج ایک چیز نور کے لیے مختلف تھی۔ آج ایک شخص یہاں موجود تھا......اور آج ایک تھپکی یہاں موجود تھی۔ اور یہ اس محترم شخص کی تھپکی تھی جس نے اسے جنم دیا تھی۔ جس کو وہ کچھ بن کر دکھانا چاہتی تھی، جس کی نگاہوں میں وہ اپنی ستائش دیکھنے کے لیے ہمیشہ ترسی تھی۔ کبھی بچپن میں بے تکی شرارتیں کی تھیں، کبھی بندر کی طرح اچھلی کودی تھی۔ کبھی نیک پروین بن گئی تھی، کبھی جھگڑے کیے تھے اور بے ڈھنگے لباس پہنے تھے، کبھی کوئی انوکھا ہنر سیکھنا شروع کر دیا تھا......ابو! میں بھی آپ کی بیٹی ہوں، ابو میری طرف بھی دیکھیں......ابو، میں تیسری ہوں لیکن آپ کی ہوں......

[illegible] جس کی [illegible] وہ ہمیشہ کوشاں رہی

اس نے زندگی کے مختلف مرحلوں میں جو کچھ بھی کیا تھا، ان کی نگاہوں میں آنے کے لیے ہی تو کیا تھا۔ اپنی اس کوشش میں وہ ان سے دور سے دور ہوتی چلی گئی تھی اور پھر میلے والا واقعہ ہوا تھا جس نے اس کی برسوں پرانی آرزوئیں پوری کر دی تھیں۔ [illegible] ابو نے اس کا ماتھا چوما تھا۔ آج اسے ایک اور موقع ملا تھا اپنے ابو کی نگاہوں میں اپنا مقام مستحکم کرنے کا۔ اور اس کا دل کہہ رہا تھا کہ وہ آج کچھ کر گزرے گی......

آج سب کچھ وہی تھا جو پہلے ایونٹس میں ہوا کرتا تھا لیکن آج ایک شخص یہاں موجود تھا اور آج ایک تھپکی اسے مل رہی تھی۔

پھر وہ بھاگی...... اس کا دل کہہ رہا تھا، کوئی انہونی نہ ہو جائے ورنہ آج اسے کوئی ہرا نہیں سکے گا۔ اس نے اپنی سخت ترین حریف نشو بجلی کو دیکھا۔ وہ اس سے دو قدم پیچھے تھی۔ بڑی تیزی سے پاس آ رہی تھی۔ وہ ہمیشہ ایسا ہی کرتی تھی۔ نصف فاصلے کے بعد اپنا مومنٹم بڑھاتی تھی اور مارجن Cover کر لیتی تھی۔ آج وہ پھر وہی کر رہی تھی۔ اسپرنٹرز کے لیے بھاگنے کے دوران میں بولنا آسان نہیں ہوتا لیکن نور نے نشو کو کن انکھیوں سے دیکھا اور گرجی...... میں پینڈو ہوں......شادی شدہ بھی ہوں لیکن آج ہراؤ مجھے...... ماں کا دودھ پیا ہے تو ہراؤ مجھے۔ وہ ایک جنونی کیفیت میں جیسے ہوا میں اڑ رہی تھی......اور پھر فنش لائن کا فیتا نور کے سینے سے ٹکرایا تھا......

یہ وہی ساعتیں تھیں جن میں صدیوں پرانے سپنے پورے ہوتے ہیں، یہ وہی لمحے تھے جن میں شکستوں کا تسلسل ٹوٹتا ہے اور فتح مستقل مزاجوں کے قدم چومتی ہے اور یہ وہی وقت تھا جب سر بے ساختہ سجدۂ شکر کے لیے جھک جاتے ہیں۔

نور نے بھی اپنا سر جھکا دیا۔ وہ جیت چکی تھی۔ اس کے کانوں میں اپنے سپورٹرز کے وہ پُرجوش نعرے گونج رہے تھے جن کے لیے آج تک اس کی سماعت ترسی تھی۔ سفید بادلوں کے پیچھے سے بہار کا مہربان سورج نکلا اور لاہور کے آسمان پر مسکرانے لگا۔

ختم شد

غرقِ محبت

طاہر جاوید مغل

جب جذبات میں ہلچل ہو اور دل کی دھڑکنوں میں تلاطم بپا ہو لیکن آنکھیں محبوب کا عکس قید کیے اسے ساری دنیا سے چھپا لینا چاہتی ہوں تو ایسے میں ہزاروں سوال روح میں چھید کردیتے ہیں... جسے بے تحاشا چاہا جائے اور اس کی بے خبری میں دل و جان فدا ہوجائیں تو دل سے اٹھنے والی ایک سرگوشی جیسے پوری کائنات میں ایک بھونچال لے آتی ہے... "تم کب تک مجھ کو بھولوگے" جسے چاہا جائے اور اپنایا نہ جاسکے... ایسی لمبی مسافت پیروں میں آبلے ڈالنے کے باوجود مسافر کو آگے بڑھنے سے روک نہیں سکتی۔ وہ بھی خود کو نہ روک پایا۔ اگرچہ چلنا محال تھا مگر ارادوں کی پختگی بنا منزل کی آس لیے چلنے پر مجبور کرتی رہی لیکن... قدرت کے اپنے ہی اصول ہوتے ہیں کچھ بھی "بے وجہ" ہونے کی اس کے پاس کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ پھر کیسے اس کا سفرِ محبت رائگاں جاتا... کسی کے دل میں اٹھنے والا خاموش طوفان یہ ثابت کردیتا ہے کہ محبت اپنے رستے خود بناتی ہے۔ وہ جو سارے موسم اپنے اندر سموئے محبوب کی آمد کا منتظر تھا... وہ لمحہ آیا اور ایک ہی پل میں گویا اپنی پوری زندگی جی گیا...

روح کا روح سے مسلسل تال اور محبتوں کے

بے مثال اور لازوال جذبوں کی سحر انگیز داستان

سہ پہر ختم ہو رہی تھی اور شام ہولے ہولے اپنے سرمئی پر کھول رہی تھی۔ سہ پہر اور شام کے اس درمیانی وقفے میں ایک اداس ہوا چلتی تھی جو اس ریگستانی علاقے میں ریت کے ذرّوں کو یہاں سے وہاں لے جاتی تھی۔ اس اداس ہوا میں ایک سناٹا سا تھا جیسے...... دور بیابانوں میں بانسری کے لطیف سُروں پر کوئی اجنبی سا غم ہلکورے لے رہا ہو، سناٹے کا اَن دیکھا پھیلاؤ اسے اچھا لگتا تھا۔ سناٹے کی اَن سنی تانیں اس کے دل کے تار چھیڑتیں، اسے گدگداتی تھیں۔ تنہائی اس کی جنم بھومی تھی۔ ماں جیسی شفیق ہستی سے وہ آشنا ہی نہیں ہوا تھا۔ اس نے جانا ہی نہ تھا کہ باپ کا سایہ کیا ہوتا ہے؟ بہن بھائی، رشتے دار، یہ سب کچھ اس کے لیے بے معنی تھا۔ وہ جیسے تنہا آسمانوں سے پھینکا گیا تھا۔ شاید وہ کسی اور سیارے کی مخلوق تھا جو غلطی سے اس کرۂ ارض پر اتر آیا تھا۔

وہ ماضی کی طرف نگاہ دوڑاتا تو بچپن کی جو پہلی یاد اس کے ذہن میں آتی تھی، وہ یہی تھی کہ وہ ایک کھیت کے کنارے کھالے کے ٹھنڈے پانی میں ہاتھ پاؤں چلا رہا ہے اور تیرنے کی کوشش کررہا ہے۔ ایک احساس اسے بتاتا تھا کہ اگر اس نے ہاتھ پاؤں نہ چلائے تو وہ پانی کے اندر چلا جائے گا اور یہ اچھا نہیں ہوگا۔ اب اس بات کو برسوں بیت چکے تھے۔ وہ کھلے ہاتھ پیر کا ایک مضبوط نوجوان تھا۔ اس کی چھاتی ابھری ہوئی اور سڈول تھی۔ اس کے بازو معمول سے لمبے اور مسل مضبوط تھے۔ اس کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں میں جیسے ایک بے قراری سی کروٹیں لیتی رہتی تھی۔ وہی بے قراری جو بندے کو کسی جگہ ٹکنے نہیں دیتی۔ وہ بھی کہاں ٹکتا تھا۔ لاہور میں تھا تو اس نے دو تین ٹھکانے بدلے تھے۔ پھر وہ پنڈی چلا گیا۔ پنڈی میں ایک بندے سے اس کا جھگڑا ہوا۔ جھگڑے نے طول پکڑا تو وہ وہاں سے بھی نکل آیا۔ کراچی کے ساحل نے چار سال تک اس کے پاؤں پکڑے رکھے مگر اس کی بے چین طبع نے اسے وہاں بھی مستقل ڈیرا نہیں ڈالنے دیا۔

ہاں، تنہائی اس کی جنم بھومی تھی۔ اجنبی سناٹے سے اس کا پہلا عشق تھا۔ تنہائیوں، سناٹوں اور اجنبی ویرانوں کی بہترین جگہ ریگستان کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوسکتی تھی اور اب وہ وہاں پہنچ چکا تھا۔ پچھلے چار پانچ ماہ سے وہ چولستان میں تھا ...... ترنڈا کا ایک قریبی گاؤں منڈ بھیرو اس کا مسکن تھا۔ پنڈی کے ایک پرانے دوست نے کراچی میں اسے دیکھ لیا تھا اور اپنے ساتھ منڈ بھیرو لے آیا تھا...... اور اب پچھلے ڈیڑھ دو ماہ سے وہ اس کے ساتھ اس کے تباہ شدہ گھر کی چھت تعمیر کرنے میں اس کی مدد کررہا تھا۔

ہاں تو سہ پہر ختم ہو رہی تھی اور شام ہولے ہولے اپنے سرمئی پر کھول رہی تھی۔ وہ ایک ریتیلے ٹیلے پر نیم دراز دور افتادہ سناٹوں سے اٹھنے والی بانسری کی غم انگیز آواز سن رہا تھا۔ اس نے نشیب میں دیکھا جہاں پانی ذخیرہ کرنے والے وسیع تالاب نما جوہڑ کا پانی سورج کی روشنی میں لشکارے مار رہا تھا۔ اس نے ایک جیپ دیکھی جو دھول اڑاتی، تیزی سے تالاب کے پاس سے گزر رہی تھی پھر اچانک کچھ عجیب ہوا۔ تیز رفتار جیپ نے ایک دو ہچکولے کھائے۔ بری طرح لہرائی پھر ایک خوفناک منظر سامنے آیا۔ جیپ نے باقاعدہ قلابازی کھائی اور ایک زبردست چھپاکے کے ساتھ پانی میں جا گری۔ وہ آڑی گری تھی، اس کے دونوں عقبی پہیے نظر آرہے تھے لیکن پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ دونوں پہیے بھی اوجھل ہوگئے اور صرف پچھلا بمپر اور اسکرین وغیرہ ہی پانی سے باہر رہ گئے۔

آس پاس کوئی نہیں تھا بلکہ دور دور تک کوئی ذی نفس نظر نہیں آتا تھا۔ دلاور نے دائیں بائیں دیکھا۔ اس نے جیپ الٹتے وقت دور سے مدھم سی نسوانی چیخ بھی سنی تھی۔ وہ اٹھا اور کسی چھلاوے کی طرح بے ساختہ ڈھلوان پر دوڑتا چلا گیا۔ اس کے چوڑے مضبوط پاؤں جیسے ریت پر بھنور سے بنا رہے تھے۔ تالاب تک تقریباً 100 میٹر کا فاصلہ تھا جو اس نے آناً فاناً طے کیا اور ایک جست لیتا ہوا پانی میں کود گیا۔ وہ اس تالاب کی گہرائی سے واقف تھا۔ آڑی ترچھی جیپ اب مکمل طور پر پانی میں ڈوب چکی تھی۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید ہاتھ پاؤں مار کر رہ جاتا لیکن وہ لہروں کا شناور تھا، پانی میں اترنا اور اس سے لڑنا جانتا تھا۔ اس نے سانس باہر نکالی اور دس بارہ فٹ نیچے چلا گیا۔ ایک لڑکی کے بال اس کے ہاتھ میں آئے۔ وہ اسے کھینچتا ہوا پانی سے باہر لے آیا اور کنارے پر ڈال دیا۔ لڑکی چند سیکنڈ سے زیادہ پانی میں نہیں رہی تھی مگر مکمل طور پر بے ہوش تھی۔ اس کی بے ہوشی کی وجہ اس کے سر پر لگنے والی کوئی چوٹ تھی۔ وہ خوبصورت تھی اور فیشن ایبل لباس میں تھی۔ لگتا تھا کہ شہر کی رہنے والی ہے۔

شاید دلاور ابھی کچھ دیر مزید اسے دیکھتا رہتا مگر وہ جانتا تھا کہ ابھی کم از کم ایک فرد اور پانی کے اندر ہے۔ اس نے دوبارہ پانی میں جست کی اور غوطہ لگا کر جیپ تک پہنچ گیا۔

دروازہ کھل جانے سے لڑکی تو خود بخود پانی میں گر گئی تھی مگر اس کا ساتھی ابھی تک جیپ میں پھنسا ہوا تھا۔ اس

نے سیفٹی بیلٹ بھی لگا رکھی تھی۔ دلاور نے دیکھا کہ اس کی گردن ایک طرف ڈھلک چکی ہے اور آنکھیں بند ہیں، وہ شدید خطرے میں تھا۔ دلاور نے اس کی سیٹ بیلٹ کھولنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ بیلٹ بری طرح بکل میں پھنسی ہوئی تھی۔ بکل کو توڑ کر یا بیلٹ کو کاٹ کر ہی اس شخص کو آزاد کرایا جاسکتا تھا۔ یہ لمحے اس شخص کی زندگی کے لیے بڑی قیمتی تھے۔ دلاور کا سانس سینے میں گھٹنا شروع ہوگیا۔ اگر وہ تازہ سانس لینے کے لیے سطح آب پر چلا جاتا تو پھر شاید دیر ہوجاتی۔ وہ پانی میں ہی رہا اور دیوانہ وار سیفٹی بیلٹ سے الجھتا رہا۔ آخر معجزہ ہوگیا۔ دلاور کے زور لگانے سے بکل کا کچھ ٹوٹ گیا اور بے ہوش شخص اس جان لیوا بندش سے آزاد ہوگیا۔ دلاور نے اسے کھینچ کر جیپ سے نکالنے کی کوشش کی۔ جیپ کے الٹنے سے اسٹیئرنگ کا اینگل ایسا ہوگیا تھا کہ وہ شخص بہ آسانی ڈرائیونگ سیٹ سے جدا نہیں ہو پارہا تھا۔ دلاور نے کسی نہ کسی طرح یہ مشکل بھی آسان کی اور اس شخص کو اپنے ساتھ کھینچتا ہوا سطح آب پر لے آیا۔ قریباً چھ منٹ بعد، بگڑی ہوئی ہوا دیوانہ وار اس کے پھیپھڑوں میں گھسی اور اس کے جسم و جاں میں پھر سے زندگی دوڑ گئی۔

اس نے اردگرد نگاہ دوڑائی، دور دور تک کوئی دکھائی نہیں دیا۔ بس درخت اور ریتیلی زمین کے نشیب و فراز تھے۔ وہ بے ہوش نوجوان کو اپنے ساتھ کھینچتا ہوا کنارے پر لے آیا اور لٹا دیا۔ تب اس کی نگاہ دوبارہ خوبرو لڑکی پر پڑی۔ اس کی قمیص بھیگ کر اس کے جسم سے چپک گئی تھی۔ بال منتشر تھے اور بھیگی لٹیں بل کھا کر ایک رخسار کو ڈھانپے ہوئے تھیں۔ سورج کی ترچھی روشنی اس چہرے کو کچھ یوں منور کر رہی تھی کہ وہ دیکھتا ہی چلا گیا۔ کچھ لمحے بڑے انقلاب آفریں ہوتے ہیں۔ ان میں صدیوں کی وسعت ہوتی ہے اور کوئی ایسی توانائی ہوتی ہے جو پلک جھپکتے میں پوری زندگی کا احاطہ کرلیتی ہے۔ یہ بھی کوئی ایسی ہی ساعتیں تھیں۔ دلاور سب کچھ بھول بھال کر اس چہرے کو دیکھتا چلا گیا۔ کوئی نادیدہ کشش تھی جو اسے اس چہرے کے بالکل قریب لے گئی۔ اس قدر قریب کہ وہ سانسوں کی آہٹ تک محسوس کرنے لگا۔ وہ عجب سوئی جاگی سی کیفیت تھی۔ اسے اتنا یاد تھا کہ وہ بے ساختہ آگے کو جھکا تھا۔ پھر کیا ہوا، کیسے ہوا، سب کچھ ایک سحر انگیز دھندلکے میں چھپا ہوا تھا۔ اس نے ان ہونٹوں کو اپنے ہونٹوں سے چھوا تھا جو شاید دنیا میں سب سے حسین ترین تھے۔ یا پھر وہ سب سے حسین ترین نہیں تھے لیکن اس جادوئی ماحول نے، سورج کی ان ترچھی کرنوں نے اور روح کی مست کردینے والی ہوا نے انہیں حسین ترین بنادیا تھا۔

وہ ٹھٹک کر پیچھے ہٹا، اس کا دل اتنی شدت سے دھڑک رہا تھا کہ لگتا تھا پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ مدہوشی کی سی کیفیت تھی لیکن اس کے اندر سے ایک طرح کی ملامت کا احساس بھی نمودار ہورہا تھا۔ وہ ایسا تو نہیں تھا، پھر اس سے یہ کیونکر ہوا؟

اچانک اسے خیال آیا کہ چند فٹ کے فاصلے پر وہ نوجوان بھی اوندھا پڑا ہے جسے اس نے موت کے منہ سے نکالا ہے اور جس کو ابتدائی طبی امداد کی فوری ضرورت ہے۔ وہ پلٹا اور اس نوجوان پر جھک گیا۔ اس کے پیٹ اور پھیپھڑوں میں یقیناً پانی بھرا ہوا تھا۔ وہ اس کی کمر پر دباؤ ڈال کر اس کے اندر سے پانی نکالنے لگا۔ کافی پانی نکلا۔ تب اس نے اسے سیدھا کیا اور اس کے دل کی دھڑکن سننے کی کوشش کی دھڑکن بہت مدھم تھی، جیسے کسی اتھاہ کنویں میں پانی ہلکورے لے رہا ہو۔ وہ اس کے سینے پر دباؤ ڈال کر دل کو پمپ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ بے ہوش نوجوان کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس کو کھانسی کا شدید دورہ پڑا، پھر اس نے دو الٹیاں کیں...... وہ زندگی کی طرف لوٹ رہا تھا۔ دلاور کی مسلسل کوشش بے ثمر نہیں رہی تھی۔ اس دوران میں خوبرو لڑکی بھی ہوش میں آچکی تھی۔ وہ خالی خالی نظروں سے اردگرد دیکھ رہی تھی پھر اس کی نگاہ بے ہوش نوجوان پر پڑی۔

''شاہ زمان...... شاہ زمان!'' وہ چلاتی ہوئی اٹھی اور اس سے لپٹ گئی۔ وہ اس کے بھیگے بالوں میں انگلیاں چلا رہی تھی۔

دلاور نے حوصلہ کر کے لڑکی کو مخاطب کیا۔ ''میڈم! آپ حوصلہ رکھیں۔ یہ جلد ہوش میں آجائیں گے...... یہ دیکھیں...... ان کی پلکوں میں حرکت ہورہی ہے۔''

''اوہ گاڈ...... یہ کیا ہوگیا ہمارے ساتھ۔'' لڑکی کبھی اپنے ساتھی کی طرف اور کبھی اس تالاب کی طرف دیکھتی تھی جہاں ان کی جیپ پانی کے اندر گئی تھی۔

کچھ دیر بعد نوجوان کے حواس بھی بحال ہونے لگے۔ وہ بجھی بجھی آنکھوں سے تالاب کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے جسم پر کچھ چوٹیں آئی تھیں لیکن چہرے پر کوئی ایسا خاص نشان نہیں تھا۔ دلاور کو لڑکی کا نام سویرا معلوم ہوا۔ اس نے جدید تراش کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ اس کو جو واحد چوٹ لگی تھی وہ اس کے سر پر تھی۔ کنپٹی کی طرف ایک گومڑ بن گیا تھا جس میں سے خون بھی رس رہا تھا۔

اسی دوران میں قریبی گوٹھ سے بہت سے لوگ بھاگتے ہوئے جائے حادثہ پر پہنچ گئے۔ ان لوگوں کو بکریاں چرانے والے ایک چودہ پندرہ سالہ لڑکے نے حادثے کی اطلاع دی تھی۔ آناً فاناً شاہ زمان اور سویرا کو ایک اونٹ گاڑی پر بٹھا کر گوٹھ میں ایک ڈیرے پر پہنچا دیا گیا۔ پاؤں کی شدید چوٹ کی وجہ سے شاہ زمان کو چلنے میں سخت دشواری محسوس ہو رہی تھی۔

گوٹھ کا چودھری ''رحیم سائیں'' شاہ زمان کے بڑے بھائی کو اچھی طرح جانتا تھا۔ فوری طور پر ان کو طبی امداد دی گئی۔ سویرا کو ڈیرے سے تھوڑی دور ایک حویلی کے زنان خانے میں بھجوا دیا گیا۔ سویرا کی ایک کلائی پر گہری خراش دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے علاوہ بھی چھوٹی موٹی خراشیں تھیں لیکن شاہ زمان کی حالت پتلی تھی۔ اس کا ایک بازو نہیں مل رہا تھا، جبکہ ٹخنے کے قریب گہرا زخم آیا تھا۔ اس زخم کی وجہ یہ تھی کہ جیپ الٹتے وقت یہ پاؤں بریک پیڈل میں پھنس گیا تھا۔

رحیم سائیں نے فوری طور پر گاؤں کے ماہر کمپاؤنڈر کو بلایا اور اپنے سامنے شاہ زمان کے ٹخنے اور بازو کی ڈریسنگ کروائی۔

رات آٹھ بجے کے لگ بھگ ڈیرے پر دو جیپیں آ کر کھڑی ہوئیں۔ ا[illegible] میں سے دھڑا دھڑ لوگ اترنے لگے۔ وہ سب کے سب [illegible] تھے۔ ان کی قیادت کرنے والا پیر فضل تھا۔ بھاری تن و توش، گہری گندمی رنگت، سفید چھدری ڈاڑھی اور سر پر مخصوص چولستانی پگڑی۔ وہ سیدھا شاہ زمان کے پاس آیا۔ شاہ زمان نیم دراز تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر شاہ زمان کو اپنے ساتھ لگایا اور ساتھ پڑی کرسی پر بیٹھ کر بولا۔ ''دھی رانی تو ٹھیک ہے نا؟''

''ہاں چاچا! وہ ٹھیک ہے، بس معمولی چوٹ آئی ہے۔'' وہ نقاہت سے بولا۔

''گھبرانے کی ضرورت نہیں...... تو بہر شیر ہے۔ میں نے جیپ پانی میں سے نکلوالی ہے۔ اپنے بندے ٹارچوں کی روشنی میں گڈی کا معائنہ کر رہے ہیں۔ ایک ٹائر میں ہوا نہیں ہے۔ کہیں کوئی فائر شائر تو نہیں لگا؟''

''نہیں چاچا! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

''تو پھر ہوا کیا ہے؟''

''بس قسمت میں یہ چوٹیں لکھی تھیں۔ اسپیڈ تھوڑی سی تیز تھی۔ ایک کھڈے کی وجہ سے جیپ اچھلی اور کنٹرول سے باہر ہو گئی؟''

''تجھے کتنی دفعہ کہا ہے پتر! گڈی کو گڈی سمجھا کر، ہوا کا گھوڑا نہ سمجھا کر۔'' وہ اپنی بھاری مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر بولا۔ اسی دوران میں اس کی نگاہ قریب کھڑے دلاور پر پڑی۔ دلاور بڑے دھیان سے ساری گفتگو سن رہا تھا۔

''یہ منڈا کون ہے؟'' پیر فضل، دلاور کو بغور دیکھ کر بولا۔

''یہی تو ہے چاچا...... جس نے ہم دونوں کو موت کے منہ سے نکالا ہے۔'' شاہ زمان نے جذباتی لہجے میں کہا۔

''کیا نام ہے تمہارا...... اور کہاں کے رہنے والے ہو؟'' پیر فضل کا لہجہ اچانک نرم پڑ گیا۔

''دلاور نام ہے جی...... میں منڈ بھیرو...... میں رہتا ہوں۔''

''یہاں کے تو نہیں لگتے۔ کہاں سے آئے ہو؟'' پیر فضل نے پوچھا۔

''میرا دوست مجھے کراچی سے یہاں لایا ہے۔ چند مہینے سے یہاں اس کا مہمان ہوں۔''

اسی دوران میں ڈیرے کا مالک رحیم سائیں اپنے مسلح کارندوں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ پیر فضل نے کھڑے ہو کر اس سے معانقہ کیا اور اچھے الفاظ میں اس کا شکریہ ادا کیا۔

رحیم سائیں نے کہا۔ ''بچوں کی جان بچ گئی ہے، اس سے بڑی خوشی کی بات اور کوئی نہیں اور اس خوشی میں سے یہ خوشی بھی نکلی ہے کہ آپ لوگ ہمارے غریب خانے پر تشریف لائے ہیں۔ یہ بڑے بخت کی بات ہے۔''

رحیم سائیں اور پیر فضل ساتھ ساتھ بیٹھے۔ ان کے بیٹھنے کے ساتھ ہی میزوں پر کھانا چن دیا گیا۔ پیر فضل کے بے حد انکار کے باوجود انہیں کھانے کی دعوت قبول کرنا پڑی۔ شاہ زمان کی طبیعت ابھی پوری طرح بحال نہیں تھی۔ اس نے بس چند لقمے لینے پر اکتفا کیا۔ کھانے کے دوران میں جب دلاور کو علیحدہ سے کھانا دیا جانے لگا تو شاہ زمان نے منع کر دیا اور اسے اپنے برابر میں بٹھا کر کھانا کھلایا۔

شاہ زمان خاموش تھا مگر تھوڑی تھوڑی دیر بعد بڑی عجیب نگاہوں سے دلاور کی طرف دیکھتا تھا۔ ان نگاہوں میں احسان مندی کے رنگ لہریں لیتے تھے اور احسان مندی کیوں نہ ہوتی۔ جان بچانے والا تو اللہ ہوتا ہے لیکن جو کچھ دلاور نے کیا تھا، شاید کوئی اور نہ کر سکتا۔ جیپ تو مکمل ڈوب چکی تھی۔ وہ اپنی جان کی پروا کیے بغیر گہرے غوطے میں گیا تھا اور سخت کوشش کر کے پہلے سویرا اور پھر اسے نکال لایا تھا۔ اگر اس کا سانس ٹوٹ گیا ہوتا تو پھر...... شاید

تالاب سے تین لاشیں ہی نکلتیں۔

پرتکلف کھانے سے فارغ ہو کر پیر فضل نے سگار سلگا لیا اور موبائل فون پر شاہ زمان کے بڑے بھائی شاہ فرمان کو خیر خیریت کی اطلاع دی اور بتایا کہ وہ لوگ جیپ کو فی الحال سیمیں پر چھوڑ رہے ہیں تاکہ اسے چلنے کے قابل بنایا جاسکے۔ اس کے بعد پیر فضل اور شاہ زمان نے رحیم سائیں کا پھر شکریہ ادا کیا اور سویرا کو بلوانے کا کہا۔

سویرا کا نام سن کر یکبارگی دلاور کا دل زور سے دھڑک اٹھا۔ تھوڑی دیر بعد جب سویرا بڑی سی چادر میں لپٹی لپٹائی باہر برآمدے میں آئی تو پیر فضل نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور بولا۔ ''جیوندی رہ دھی رانی۔''

سویرا نے سر جھکا کر پیار وصول کیا۔ اسی دوران میں کریم کلر کی پھولدار چادر میں لپٹی ہوئی سرو قد سویرا نے ذرا ترچھی نظر سے دلاور کی طرف دیکھا۔ یہ نظر جیسے کسی ورمے کی طرح دلاور کے سینے سے آر پار ہوگئی۔ وہ بس ''ایک'' نگاہ ہی تھی۔ اس کے بعد وہ لوگ جتنی دیر وہاں کھڑے رہے، سویرا بالکل لاتعلق ہی رہی۔

وقت رخصت رحیم سائیں نے مٹھائی کے دو بڑے بڑے تھال پیر فضل کو پیش کیے اور صدقے کے طور پر ایک کالے بکرے کی قربانی ان کے سامنے کی۔

شاہ زمان کو کرسی پر بٹھا کر دو کارندوں نے اٹھالیا۔ جیپ میں بیٹھنے سے پہلے شاہ زمان نے ایک کارندے سے کہا۔ ''دیکھو، دلاور کہاں ہے؟''

دلاور جیپ کی دوسری جانب کھڑا تھا۔ کارندہ دلاور کو بلالایا۔

شاہ زمان، دلاور کو خاموشی سے دیکھتا رہا...... پھر جیسے وہ کسی نتیجے پر پہنچ گیا۔ میٹھے لہجے میں بولا۔ ''دلاور! اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو ہمارے ساتھ چلو۔ دو چار دن حویلی میں ہمارے مہمان رہو۔ تمہارے ساتھ کچھ وقت گزار کر ہم سب کو بہت اچھا لگے گا۔''

دلاور کے کانوں میں جیسے شادیانے سے بج اٹھے۔

ایک بار پھر وہی چہرہ اور وہی ہونٹ اس کی آنکھوں کے سامنے آگئے۔ وہ کیا لمحے تھے؟ وہ کیا جادو تھا؟ وہ سب کچھ کیوں ہو گیا تھا؟ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ کوئی مقناطیس سا تھا جو اپنی بے پناہ طاقت سے اسے اپنی طرف کھینچ رہا تھا...... اور اس کی تمنا کے عین مطابق اسے چلنے کی دعوت دی گئی تھی۔

اس نے پہلے تو تھوڑی سی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا، پھر اپنے احسان مند میزبانوں کے ساتھ چلنے پر راضی ہو گیا۔

منڈ بھیرو کے جنوب مغرب میں تقریباً بیس کلومیٹر کے فاصلے پر یہ ایک ریگستانی گاؤں تھا۔ ''چوڑیرہ'' نامی اس گاؤں کی خاص بات وہ خوبصورت نخلستان تھا جو ریگستانی پٹی کے ساتھ ساتھ چودہ پندرہ کلومیٹر تک چلا گیا تھا۔ وہاں مال مویشی چرتے تھے۔ فربہ بھینسیں آزادانہ گھومتی تھیں اور خاص قسم کی بھیڑیں تھیں جن کے منہ سفید اجلے اور جسم پر خوبصورت چکبرے دھبے سے تھے۔ قریباً ایک ہزار نفوس پر مشتمل یہ ایک خوبصورت گاؤں تھا۔ بڑے سائیں کی قریباً پانچ ایکڑ پر پھیلی ہوئی حویلی مغلیہ دور کے کسی قلعے کی یاد دلاتی تھی۔ بلند فصیلیں، تین فٹ چوڑی دیواریں، اصطبل، نایاب گھوڑوں کے جتھے، دوکوہانی سفید اونٹ، شکاری کتے، چھیل چھبیلی ملازماؤں کی چہل پہل، دست بستہ ملازموں اور ہرکاروں کی فوج...... دلاور نے یہ شاندار حویلی دیکھی اور بس دیکھتا رہ گیا۔

درحقیقت دلاور کے پاؤں سے بگولے بندھے ہوئے تھے۔ وہ آزاد طبع رکھتا تھا۔ کسی ایک جگہ ٹک کر رہنا شاید اس کے لیے ممکن ہی نہیں تھا۔ دوسرے لفظوں میں وہ کسی بندھن میں نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ شتر بے مہار تھا۔ اسی لیے اس نے پنڈی چھوڑا، اسی لیے شہر لاہور کے دلکش بھنور، جو بہت سوں کو جکڑ کر مفلوج کر دیتے ہیں، اس کا راستہ نہ روک سکے۔ اسی لیے شاید وہ کراچی کے ساحل کی گیلی ریت کو پاؤں سے دھکیلتا ہوا وہاں سے بھاگ نکلا۔

اور اب وہ یہاں اس حویلی میں تھا۔ منڈ بھیرو سے چلتے وقت دلاور نے اپنے دوست ملتانی کو بھی اپنے ساتھ لے جانے کی خواہش ظاہر کی تھی اور ملتانی بھی اس کے ساتھ ہی یہاں پہنچا تھا۔ پیر فضل تو حویلی میں داخل ہوتے ہی اپنے دو کمین لے کر حویلی کے جنوب کی طرف چلا گیا۔ شاہ زمان اس عظیم الشان عمارت میں داخل ہوتے ہی سرتاپا ''بڑا سائیں'' نظر آنے لگا تھا۔ اس کے استقبال کے لیے بہت سی خواتین کھڑی تھیں۔ اس کی کرسی جب برآمدے میں رکھی گئی تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ شاہ زمان کا رنگ گورا، بال گھنگرالے، بھویں موٹی اور آپس میں ملی ہوئی تھیں۔ چوڑے جبڑے اس کی سخت مزاجی کو ظاہر کرتے تھے۔ وہ لنگڑاتا ہوا خواتین کی طرف بڑھا۔ سب سے پہلے آگے بڑھ کر جس عورت نے اس کا ماتھا چوما، وہ ادھیڑ عمر آپا صوفیہ تھی۔ سب انہیں بڑی آپا کہتے تھے۔ وہ شاہ زمان کے بڑے بھائی شاہ فرمان کی سب سے بڑی بیوی تھیں۔ وہ

دلاور کو ایک باوقار اور نہایت زیرک عورت لگیں۔ ایک ایسی خاتون جس نے بہت دکھ سہہ کر اور زمانے کا بہت سا ''سرد گرم'' دیکھ کر اب اپنی زندگی کے لیے مناسب راستے ڈھونڈ لیے ہوں۔

انہوں نے دراز قد شاہ زمان کے دونوں کندھوں پر ہاتھ پھیرا اور بولیں۔ ''آپا صدقے، تو ٹھیک تو ہے نا؟''

شاہ زمان بولا۔ ''بڑی آپا! خدا کا شکر ہے، اس نے نئی زندگی دی ہے ہم دونوں کو۔''

بڑی آپا نے شاہ زمان کے سر پر ہاتھ پھیرنے کے بعد سویرا کو گلے سے لگالیا۔ وہ ہچکیوں کے ساتھ رونے لگی۔ دلاور فاصلے پر کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہ جتنی بار بھی سویرا پر پڑی تھی، بس وہیں جم کر رہ گئی تھی۔ اسی دوران میں حویلی کی دیگر خواتین آگے بڑھ کر سویرا اور شاہ زمان کی بلائیں لینے لگیں۔ دلاور کو ابھی تک معلوم نہیں ہوسکا تھا کہ سویرا اور شاہ زمان کا آپس میں کیا رشتہ ہے؟

اسی دوران میں شاہ زمان نے دلاور کو اشارے سے اپنے پاس بلایا اور بڑی آپا کو بتایا کہ یہی وہ بندہ ہے جس کے وسیلے سے آج ان دونوں کی جان بچ پائی ہے۔ بڑی آپا نے دلاور کو سرتاپا دیکھا پھر بڑے شائستہ انداز میں اس کے لیے شکریے اور تعریف کے الفاظ ادا کیے۔ بڑی آپا نے دلاور کی طرف دیکھ کر شاہ زمان کے کان میں ایک دو سرگوشیاں بھی کیں۔

دلاور اور ملتانی کو بڑی محبت کے ساتھ مہمان خانے کے ایک شاندار کمرے میں ٹھہرایا گیا۔ ان کی میزبانی میں کسی طرح کی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی گئی۔ ملتانی خوش خوراک تھا۔ موجودہ صورت حال اس کے لیے بہت اطمینان بخش تھی۔ ملتانی کو اخبار پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ کھانے والی اشیا کے اشتہار وہ خاص رغبت سے دیکھتا تھا۔ ویسے وہ پانچ چھ جماعتیں ہی پڑھا تھا۔ اس کے برعکس دلاور نے کھینچ تان کر ایف اے پاس کر رکھا تھا۔ وہ صرف کھانے کے اشتہاروں کے لیے اخبار نہیں دیکھتا تھا بلکہ اسے پڑھتا بھی تھا۔

اگلے روز ملتانی حویلی میں تھوڑا سا گھوما پھرا۔ اس نے ملازمین سے باتیں کیں اور تھوڑی بہت سن گن بھی لی۔ اسے پتا چلا کہ شاہ زمان کے بڑے بھائی شاہ فرمان نے چار شادیاں کر رکھی ہیں۔ اس کی سب سے بڑی بیوی آپا صوفیہ اور سب سے چھوٹی جو حال ہی میں بیاہی گئی ہے، شاہدہ کے نام سے جانی جاتی ہے۔ شاہ زمان حالانکہ چھوٹا ہے پھر بھی اسے بڑا سائیں کہا جاتا ہے اور وہ اس لیے کہ وہ بڑے بھائی سے زیادہ قابل اور سمجھدار ہے...... اور چوڑیرہ کے لوگ اس کی بے پایاں صلاحیتوں کی وجہ سے اسے ہی بڑا سمجھتے ہیں، جبکہ اصل بڑا یعنی شاہ فرمان زیادہ تر نشے میں غرق رہتا ہے۔ شاہ زمان کے بارے میں ملتانی کو معلوم ہوا کہ وہ ابھی تک غیر شادی شدہ ہے لیکن جلد ہی اس کی شادی رچنے والی ہے۔

شام کے وقت دلاور نے کمرے کی کھڑکی میں سے باغیچے کی طرف دیکھا۔ وہاں شاہ زمان کھڑا تھا۔ زخمی پاؤں کی وجہ سے اس نے ہاتھ میں واکنگ اسٹک تھام رکھی تھی۔ اس کے قریب وہی ماہ رخ، پری پیکر تھی جس نے پلک جھپکتے ہی دلاور کے دل کی دنیا زیروزبر کر ڈالی تھی...... ہاں وہ سویرا تھی۔ لمبے بال کمر تک جا رہے تھے، ریشمی اوڑھنی ان بے بہا بالوں کو سنبھالنے میں ناکام تھی۔ وہ شاہ زمان سے بات کر رہی تھی۔ شاہ زمان مونچھوں پر انگلی پھیر رہا تھا اور بڑی پُرتپش نظروں سے سویرا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ شرمانے والے انداز میں مسکرائی اور پھر رخ پھیر کر سفید گلابوں کی کیاری کی طرف متوجہ ہوگئی۔ ایک خاص دلکشی تھی اس کے نقوش میں۔

دلاور کے دل میں جیسے ایک کانٹا سا چبھ گیا۔ تو کیا سویرا ہی وہ لڑکی تھی جس سے شاہ زمان کی شادی کی تیاری ہو رہی تھی؟ وہ بے ساختہ سویرا کی طرف دیکھتا چلا گیا۔ آس پاس کا سارا منظر جیسے فیڈ آؤٹ ہوگیا۔ اس کے سامنے بس وہ دلکش مرمریں مورتی رہ گئی جو کسی بات پر مسکرا رہی تھی۔ اس کی مسکراہٹ اس کی مجموعی خوبصورتی کی طرح لاجواب تھی۔ اس نے سوچا...... بے پناہ خوبصورت لوگوں کی ہنسی بھی ایسی ہی لاجواب ہونی چاہیے۔ اچانک اس نے خود کو اس ''ٹرانس'' میں سے نکالا۔ یہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا؟ وہ ایسا تو نہیں تھا؟ وہ تو کسی کی بھی پروا نہیں کرتا تھا۔ پھر یہ کیسا منہ زور جذبہ تھا جو اسے اپنے ساتھ بہائے چلا جا رہا تھا۔ یہ کیسی کشش تھی جو اس کے وجود کی طنابیں کھینچ رہی تھی؟

شاید کچھ معاملات انسان کے بس میں ہی نہیں ہوتے۔ کچھ بے پناہ لمحے ایسے ہوتے ہیں جو انسان کو بے بس کر دیتے ہیں۔ کچھ احساسات، جن کی ڈوریاں دست غیب سے حرکت میں آتی ہیں۔

سویرا آسمان پر چمکتا ہوا چاند تھی اور دلاور زندگی کے صحرا میں اڑنے والا ریت کا ایک ذرہ۔ وہ چوڑیرہ کی امیر زادی تھی اور وہ نگر نگر گھومنے والا بنجارا جسے اپنی ابتدا، اپنے ماضی کا بھی علم نہیں تھا۔ انجانے میں ایک جذبہ تھا جو

دلاور کے دل میں نمو پا چکا تھا۔ انسان کے اندر کوئی بھی تبدیلی رونما ہوتی ہے تو اس کا ادراک سب سے پہلے خود اسی کو ہوتا ہے۔ دلاور سمجھ چکا تھا، کوئی بہت بڑی تبدیلی احساسات میں آچکی ہے۔

یہ دوسری رات کی بات ہے، وہ ایک لمحے کے لیے بھی سو نہ سکا۔ بیڈروم بہت شان دار تھا۔ ملتانی نے مرغ پلاؤ اور خالص دودھ کی کھیر بہت سیر ہو کر کھائی تھی۔ اب وہ سو سیر کا ریچھ اوندھے منہ پڑا خراٹے لے رہا تھا مگر دلاور کی آنکھوں سے نیند روٹھ چکی تھی۔ وہ جونہی آنکھیں بند کرتا، وہ گلابی ہونٹ اس کی آنکھوں میں جھلملاتے اور وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھتا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے بھی یہی ہوا تھا، وہ اچانک بستر سے اٹھ بیٹھا تھا۔ اس نے سنگِ مرمر کی تپائی سے جگ اٹھایا، پانی گلاس میں ڈالا اور ایک ہی بار میں پی گیا۔ اسے گرمی محسوس ہونے لگی، دل گھبرانے لگا۔ وہ بیڈ سے اترا، ہولے سے دروازہ کھولا اور باہر نکل آیا۔ رات کا شاید پچھلا پہر تھا۔ مشرق کی طرف سے ہلکی صحرائی ہوا چل رہی تھی۔ وہ صحن میں آیا۔ یہاں زنانے اور مردانے حصے کے درمیانی احاطے میں ایک طرف دو جھولے لگے ہوئے تھے۔ اس سے آگے کافی وسیع گراسی لان تھا جہاں انواع و اقسام کے پھول اور پھل دار پودے تھے جن میں سے زیادہ تر جنوبی پنجاب سے منگوا کر یہاں لگائے گئے تھے۔ لان کے اختتام پر اینٹوں کی سولنگ والا ایک اور احاطہ تھا جہاں جیپیں اور دیگر گاڑیاں کھڑی کرنے کے لیے جگہ بنائی گئی تھی۔ اس سے آگے ملازمین کے رہائشی کوارٹرز تھے۔ کوارٹرز کی بائیں جانب زنانے حصے کی دو منزلہ عمارت تھی جو درختوں کے پیش منظر میں آدھی چھپی، آدھی ظاہر ہو رہی تھی۔ اسی عمارت کی بالائی منزل کے کچھ کمروں میں مدھم روشنی تھی جو بیش قیمت پردوں سے چھن چھن کر باہر آرہی تھی۔ اس نے سوچا ایسے ہی کسی کمرے میں سویرا سو رہی ہوگی۔ وہ بے مثل حُسن سوتے میں کیسا لگتا ہوگا؟ کیا حسن کے سونے کا انداز بھی حسین ہوتا ہے؟ ایک بار پھر وہی دو لب...... تھوڑے سے نم...... تھوڑے سے گرم اس کے تصور میں آن دھمکے۔ اس نے سوچا اگر اس وقت تالاب کے کنارے، کوئی اسے یہ حرکت کرتے دیکھ لیتا تو کیا ہوتا؟

اس نے جھرجھری سی لی اور خیالات کے نرغے سے باہر آنے کی کوشش کرنے لگا۔

چہل قدمی کرتا ہوا وہ ملازمین کے کوارٹرز سے آگے چلا گیا۔ وہاں کھجوروں کے بہت سے درخت تھے۔ وہ ابھی واپس مڑنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اسے درختوں سے آگے کچھ کھٹ پٹ سی سنائی دی۔ وہ چونک گیا اور دبے پاؤں چل کر سرعت سے ایک دیوار کی اوٹ میں ہو گیا۔ چند لمحے بعد اس نے ایک حیران کن منظر دیکھا۔ وہ چند ملازمین تھے جو ڈھائی تین فٹ مربع کے تین چار چوبی ڈبے اٹھائے ایک کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔ تجسس کے سبب اس کی تمام خوابیدہ حسیات جاگ اٹھیں۔ وہ جس جگہ کھڑا تھا، وہاں سے ملازمین کی نظر میں نہیں آسکتا تھا۔ اس نے تھوڑی سی ہمت کی اور درمیانی فاصلہ کچھ اور کم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہاں سے منظر تھوڑا اور واضح ہو گیا۔ وہ پانچ افراد تھے جو لکڑی کے چوکور ڈبوں کو بڑی احتیاط سے اٹھائے ایک تاریک دروازے میں داخل ہو رہے تھے۔ ڈبوں میں چھوٹے چھوٹے سوراخ بھی نظر آرہے تھے۔

ان ڈبوں میں کیا تھا؟ رات کے اس پہر اتنی رازداری سے یہ کام کیوں کیا جارہا تھا؟ کئی سوال دلاور کے ذہن میں کلبلانے لگے۔ ملازمین تاریک دروازے میں داخل ہو کر اوجھل ہو چکے تھے۔ باہر سناٹے میں بس مدھم صحرائی ہوا کی سرگوشی تھی۔ وہ دبے پاؤں چلتا ہوا تاریک دروازے تک پہنچ گیا۔ دروازے سے آگے سیڑھیاں کسی تہ خانے میں اتر رہی تھیں۔ ملازمین سیڑھیوں کے نچلے سرے تک پہنچ چکے تھے۔ دلاور دروازے کی اوٹ سے یہ مناظر دیکھ رہا تھا۔ تاہم وہ اپنے عقب سے بھی بے خبر نہیں تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ وہیں کھڑا رہے یا پلٹ جائے۔ اس سے پہلے کہ وہ کسی فیصلے پر پہنچتا، نیچے کسی ملازم کے ہاتھوں سے ڈبا چھوٹ کر فرش پر جا گرا۔ پھر اچانک کوئی چیز پھڑپھڑانے لگی۔ پورے تہ خانے میں جیسے بھگدڑ مچ گئی۔ ملازمین میں افراتفری پھیل گئی۔ وہ ایک دوسرے کو کوس رہے تھے اور ان میں سے کوئی ایک ننگی گالیاں بھی دے رہا تھا۔

پھر ایک ملازم تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اوپر آیا۔ دلاور نے بڑی تیزی سے اپنی جگہ چھوڑی۔ اگر وہ ایک لمحے کی تاخیر کر دیتا تو اس شخص کی نظر میں آجاتا۔ اس شخص نے بڑی عجلت میں تہ خانے کا دروازہ ایک دھماکے سے بند کر دیا۔

دلاور دیوار سے پشت لگائے ساکت و جامد کھڑا تھا۔ یہ ابھی، اس نے کیا دیکھا تھا۔ لکڑی کے چوکور ڈبے میں کیا تھا جو نکلا تھا اور پھڑپھڑانے لگا تھا؟

دور کہیں مغرب کی جانب کسی ریگستانی گلی کی چھوٹی سی مسجد سے اذانِ فجر کی آواز بلند ہونے لگی تھی۔ اس نے

اپنی جگہ چھوڑ دی۔ مہمان خانے میں پہنچا تو ملتانی جاگ چکا تھا اور اس کی غیر حاضری پر بے حد پریشان دکھائی دے رہا تھا...... دلاور کو دیکھتے ہی بولا۔ ''کہاں غائب ہو گئے تھے؟''

''میں ذرا چہل قدمی کے لیے نکلا تھا۔ پیٹ میں اینٹھن سی ہو رہی تھی۔''

ملتانی بولا۔ ''کھانا تو میں ڈٹ کر کھاتا ہوں اور اینٹھن تمہارے پیٹ میں ہونے لگتی ہے۔''

''یہی تو پکی دوستی کا ثبوت ہے۔'' دلاور نے بستر پر گرتے ہوئے کہا۔

ملتانی تو تھوڑی دیر باتیں کرنے کے بعد سو گیا مگر دلاور جاگتا رہا۔ اس کا ذہن بار بار تہ خانے والے واقعے کی طرف جا رہا تھا۔

صبح دلاور کے لیے بے حد خوبصورت تھی۔ بیڈ روم سے نکل کر جب وہ نشست گاہ میں آیا تو سویرا ایک ملازمہ کے ساتھ ایک چھوٹی میز پر ناشتا لیے بیٹھی تھی۔ چہرہ پرسوں رات سے بھی زیادہ پیارا اور روشن دکھائی دیتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ دودھ اور میدے سے نہا کر نکلی ہے۔ ملازمہ جھک کر ناشتے کی چیزیں ترتیب سے میز پر رکھ رہی تھی۔ سویرا تمکنت سے بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ اب تک کے مشاہدے میں دلاور نے نوٹ کیا تھا کہ سویرا نہ صرف پڑھی لکھی اور روشن خیالات والی لڑکی ہے بلکہ کافی حد تک صاف گو اور بے تکلف بھی ہے۔ بے شک حویلی کا ماحول جاگیردارانہ رنگ ڈھنگ کا تھا مگر سویرا اپنے حلیے سے لے کر اپنی بول چال تک بالکل ماڈرن لگتی تھی۔

''ہیلو مسٹر دلاور۔'' وہ دلکش انداز میں مسکرائی۔ ''تمہارا وقت کیسا گزر رہا ہے؟''

دلاور کا دل یکبارگی بے طرح دھڑک اٹھا۔ وہ کتنی بے تکلفی سے اسے مخاطب کر رہی تھی۔ وہ مؤدب انداز میں اس کے سامنے بیٹھ گیا اور بولا۔ ''سویرا بی بی! آپ کی مہمان نوازی کا بہت شکریہ لیکن...... آج رات میں...... ایک پل کے لیے بھی سو نہیں سکا۔''

وہ تھوڑی پریشان ہو گئی۔ ''کیوں؟ کوئی مسئلہ تھا؟''

وہ کہنا چاہتا تھا...... سب سے بڑا مسئلہ تو آپ ہیں سویرا بی بی...... لیکن کہہ نہیں سکا۔ ''اصل میں مجھے نئی جگہ نیند نہیں آتی۔'' اس نے نگاہیں جھکاتے ہوئے کہا۔

''پھر تو تمہیں بڑی مشکل پیش آتی ہو گی...... میرا مطلب ہے، تم نے خود ہی بتایا ہے کہ تم شہر شہر اور بستی بستی گھومتے ہو۔''

وہ کچھ جھینپ سا گیا۔ اسی دوران میں سویرا نے چائے کا کپ اس کی طرف بڑھایا۔ وہ بڑی احتیاط سے کپ سویرا کے ہاتھ سے لیتے ہوئے بولا۔ ''نہیں...... پہلے دو چار دن مشکل پیش آتی ہے، پھر میں عادی ہو جاتا ہوں۔''

سویرا کی تیز نگاہیں دلاور کی حرکات و سکنات کو بغور دیکھ رہی تھیں۔ وہ کچھ نروس سا ہونے لگا۔ اپنی گھبراہٹ کو دور کرنے کے لیے اس نے بیڈ روم کی طرف رخ کر کے ملتانی کو آواز دی۔ اس دوران میں سویرا نے ایک جیم کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اس کی کلائی میں ہفت رنگ چوڑیاں کھنکنا اٹھیں۔ وہ ایک سلائس پر جیم لگاتے ہوئے بولی۔ ''دلاور! تم کچھ پریشان نظر آتے ہو؟''

''نن...... نہیں...... ایسی تو کوئی بات نہیں۔''

سویرا نے ملازمہ سے کہا کہ وہ بیڈ روم سے ملتانی کو بلا لائے۔ ملازمہ جونہی کمرے سے نکلی، سویرا تھوڑا آگے ہوئی اور اس نے نہایت بے تکلفی اور اعتماد سے اپنا ہاتھ دلاور کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ بڑے جذباتی لہجے میں بولی۔ ''تھینک یو ویری مچ دلاور! تم نے ہم دونوں کی جان بچا کر ہم پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ بچانے والا تو بے شک اوپر بیٹھا ہے مگر وہ بچانے کا کام اپنے ہی کسی بندے کو سونپتا ہے نا۔''

دلاور کا سارا وجود جیسے اس نرم و نازک ہاتھ کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا۔ اس کا دل چاہا، گھڑیاں ختم جائیں، وقت رک جائے...... اور وہ اسی مہرباں بوجھ تلے پڑا رہے۔ اس نے سویرا کی بات کا جواب دیتے ہوئے بہ مشکل کہا۔ ''میں کسی قابل نہیں ہوں سویرا بی بی! بس اوپر والے نے مجھ سے یہ کام لینا تھا، لے لیا......''

سویرا کی کنپٹی پر ابھی تک ایک چھوٹی سی بینڈ ایج موجود تھی۔ وہ بے دھیانی میں اپنی اس چوٹ کو سہلاتے ہوئے بولی۔ ''جب جیپ پانی میں گری، تم اس وقت کہاں تھے؟''

دلاور نے اسے تفصیل سے سب کچھ بتایا۔ کیسے اس نے جیپ کو لہراتے اور زوردار آواز سے پانی میں گرتے دیکھا۔ کیسے وہ پانی میں اترا، غوطہ لگایا، دونوں کو باہر لانے کے لیے اس نے کیا کیا کوشش کی۔ اس نے سب کچھ بتایا مگر ان جادوئی لمحوں کے بارے میں کچھ نہیں بتایا جب اس نے سویرا کو بالکل سیدھا، ریت پر لیٹے دیکھا تھا...... اس کی نگاہیں، اس کے دلکش چہرے پر پیوست ہو کر رہ گئی تھیں اور پھر وہ کچھ ہوا تھا جس کا اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ ارد گرد کی ہر چیز کو فراموش کر کے اس کے بے مثل چہرے پر جھک

گیا تھا...... اور وہ یہ سب کچھ بتا بھی کیسے سکتا تھا؟ یہ تو ایک ایسا سنہری راز تھا جسے وہ زندگی کی آخری سانس تک اپنے سینے میں چھپا کر رکھنا چاہتا تھا۔

گفتگو کے دوران میں سویرا نے اچانک کہا۔

"دلاور! کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ تم ہمارے ساتھ یہاں اس حویلی میں ہی رہو۔ شاہ زمان صاحب کوئی بھی مناسب کام تمہارے اور ملتانی کے ذمے لگا سکتے ہیں؟"

کل شاہ زمان نے بھی اس سے ملتی جلتی بات کی تھی مگر دلاور کوئی جواب نہ دے پایا تھا۔ پتا نہیں کیوں اس حوالے سے اس کی دلی کیفیت کچھ عجیب سی تھی۔ کبھی تو اس کا دل چاہتا تھا کہ اس حویلی کو اور اس میں "رہنے والی کو" ایک پل کے لیے بھی اپنی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دے...... اور کسی وقت دل میں آتا تھا کہ کہیں دور بھاگ جائے اور پھر بھول کر بھی ان راہوں پر قدم نہ رکھے جو اسے اس حویلی کی طرف اور اس کے مکینوں کی طرف لاسکیں۔ اب بھی وہ سویرا کو کوئی ٹھوس جواب نہ دے پایا اور صرف اتنا کہا کہ ان کی مہربانی کا بہت شکریہ۔ وہ اس بارے میں سوچے گا۔

ملازمہ شگفتہ ناشتے کے برتن اٹھا کر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد سویرا بھی اپنے سیل فون پر کال سنتی ہوئی باہر نکل گئی۔ دلاور اور ملتانی وہیں بیٹھے رہے۔ ملتانی کو یہاں جو کچھ کھانے کو مل رہا تھا، اس نے اس کی ساری سوچیں اس کے معدے میں جمع کردی تھیں۔ وہ آج کل جیسے دماغ سے نہیں معدے سے سوچ رہا تھا۔ اس نے دلاور کو گردن سے پکڑ کر ذرا جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ "اوئے ناہنجار! کیوں عزت کی روزی روٹی کو لات مار رہا ہے۔ دو ٹکے کے لوگ نہیں ہم اور یہاں ہمیں سر آنکھوں پر بٹھایا جارہا ہے۔ اگر یہ لوگ آفر کررہے ہیں تو مان جا۔ اگر کچھ زیادہ نہ بھی ہوا تو ان کا چہیتا ملازم تو ضرور بن جائے گا تو...... اور چہیتے ملازموں کو یہ وڈے لوگ اپنی جان سے لگا کر رکھتے ہیں۔"

دلاور جیسے ملتانی کی بات سن ہی نہیں رہا تھا۔ وہ کھوئے کھوئے انداز میں حویلی سے آگے، درختوں سے پرے...... مشرق کی جانب اس دشت کو دیکھنے لگا جسے مقامی لوگ روہی کہتے تھے۔ ان ریتیلے راستوں پر تند ہوائیں گشت کرتی تھیں۔ گرم جھونکوں کی تپش میں ایک بے نام سی اداسی اور تڑپ چھپی رہتی تھی۔ یہ ہوائیں اجنبی سناٹوں کی کوکھ سے جنم لیتی تھیں...... اور اجنبی سناٹے...... اس کا پہلا عشق تھے۔ اب یہ بے وجود عشق ایک ہیولے کی شکل اختیار کررہا تھا، ایک چہرے میں ڈھل رہا تھا۔

☆☆☆

منظر ہال نما کمرے کا تھا۔ بیش قیمت قالین، شاندار مسہری، دلکش فانوس، کھڑکیوں پر بھاری کامدار پردے۔ سویرا گرمیوں کے ہلکے پھلکے لباس میں تھی۔ وہ مسہری کے پاس ہی غالیچے پر آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی۔ اس کی چچازاد رمشا، مسہری پر یوں بیٹھی تھی کہ اس کے پاؤں سویرا کی گود میں تھے۔ سویرا اس کے پاؤں کے ناخنوں پر کیوٹکس لگا رہی تھی۔

رمشا نے کہا۔ "یہ بندہ کوئی شے ہی لگتا ہے۔ کل میں نے اسے زمان بھائی کے ساتھ باغیچے میں گھومتے دیکھا تھا۔ لگتا تھا کہ پی ٹی وی کی کسی سیریل سے کوئی ہینڈسم ہیرو اٹھ کر ہماری حویلی میں چلا آیا ہے۔"

"تو تیرے کیا ارادے ہیں؟" سویرا نے ذرا شوخی سے کہا۔

"اگر تیری طرح میرے گلے میں بھی منگنی والی رسی نہ ہوتی تو ہوسکتا تھا میں اسے...... تین لفظ بول دیتی۔" وہ مزاحیہ انداز میں بولی۔

"ہائیں، تین لفظ؟" سویرا نے آنکھیں نکالیں۔

"یعنی شادی سے پہلے ہی اسے طلاق طلاق کہہ دیتیں۔"

"صرف یہی تین لفظ نہیں ہوتے۔ آئی لو یو بھی تو تین لفظ ہوتے ہیں۔" رمشا نے کہا اور شرمانے کی اداکاری کرنے لگی۔

"دُر فٹے منہ تیرا...... اور تیری عقل کا بھی۔" سویرا نے اطمینان سے کہا۔

"اور تیری عقل بھی کوئی آسمان کو نہیں چھو رہی۔ یہ طلاق والا لفظ عورتیں نہیں بولتیں۔ انہیں کچھ کہنا ہی پڑے تو پھر کہتی ہیں۔ خلع...... خلع...... خلع......"

"اچھا بکواس بند کر اپنی۔" سویرا نے قدرے بیزاری سے کہا۔

رمشا نے مسہری چھوڑی اور دھپ سے سویرا کے سامنے غالیچے پر آ بیٹھی۔ سویرا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ "میں تجھے ایک بات بتانا تو بھول ہی گئی۔"

"کیا؟"

"میں کل کچن سے نکل رہی تھی کہ اچانک بڑی آپا کی آواز کان میں پڑی۔ وہ تمہاری شادی کی بات کررہی تھیں، بے بے جی سے۔"

"کیا کہہ رہی تھیں؟" سویرا نے نظریں جھکائے

جھکائے پوچھا۔

”دل میں لڈو پھوٹنے لگے ہیں نا...... دیکھو دیکھو ذرا...... میری سوہنی سہیلی کا مکھڑا کیسے لال گلابی ہوتا جا رہا ہے۔“

”اپنی چونچ بند کرو اور اگر کوئی بات ہے تو بتا۔“

”بڑی آپا، بے بے جی سے کہہ رہی تھیں۔ وڈے بھا (شاہ فرمان) نے کہا ہے، دسمبر میں بہت سے کاروباری مسئلے ہیں، زمینوں کے ٹھیکے وغیرہ دینے ہیں اور بھی کئی کام ہیں، شاہ زمان کی شادی دسمبر کے بجائے اکتوبر میں ہی رکھ لی جائے۔“

سویرا کے دودھیا چہرے پر اب واقعی سرخی دوڑ گئی۔ یہ شرم کی سرخی تھی۔ اس کا سر جیسے بے ساختہ جھک گیا۔

رمشا خاموشی سے اسے دیکھنے لگی پھر اس نے ایک گہری سانس لی اور ایک دم سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ ”سویرا! تمہیں یقین ہے کہ شاہ زمان تمہیں بہت چاہتا ہے؟“

”اس میں کوئی شک نہیں۔“ سویرا نے بھی سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

”تم شہر کی پڑھی لکھی لڑکی ہو۔ شاہ زمان بھی کوئی ان پڑھ نہیں ہے لیکن جو کچھ بھی ہے، وہ زمینداری والا ذہن رکھتا ہے۔ یہاں حویلی کا ماحول بھی تم سے کوئی ڈھکا چھپا نہیں ہے۔“

”کیا کہنا چاہتی ہو؟“

”اس کے مزاج کو اور یہاں کے رسم و رواج کو بدل پاؤ گی؟“

”ارادہ تو مضبوط ہے۔“ وہ ہولے سے مسکرائی۔

رمشا کچھ دیر خاموشی سے اسے دیکھتی رہی پھر بولی۔ ”اور اگر...... کچھ غلط ہونا شروع ہو گیا تو؟ میرا مطلب ہے...... مثلاً...... اگر...... دو چار سال بعد...... اپنے بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے شاہ زمان نے بھی......“

سویرا نے اس کا جملہ مکمل نہیں ہونے دیا اور تیز لہجے میں بولی۔ ”نہیں رمشا! میں نے کہا ہے نا کہ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ زمانہ بدل گیا ہے...... حویلی بھی بدل رہی ہے۔ ہمیں اچھے کی امید رکھنی چاہیے اور یہ امید میرے اندر موجود ہے۔“

”لیکن...... فرض کرو...... ایسا ہو گیا تو...... کچھ عرصے بعد تم سے شاہ زمان کو بانٹنے کے لیے کوئی اور آ گئی تو؟“

”تمہیں کہا ہے نا کہ ایسا نہیں ہوگا۔ اگر ہو گیا تو سب کچھ ختم ہو جائے گا......“ شاید سویرا کچھ اور بھی کہتی لیکن اسی دوران میں کہیں پاس سے وڈے بھا شاہ فرمان کی بھاری بھرکم آواز سنائی دی اور دونوں لڑکیاں جیسے ڈر کر خاموش ہو گئیں۔

☆☆☆

دلاور بہت بے چینی میں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جو کچھ اس کے سینے میں پنپ رہا ہے، وہ کسی بھی صورت میں ہو نہیں سکتا۔ وہ محلوں میں پلنے والی شہزادی تھی، وہ ایک بے نام بے ہنر بے کار انسان تھا۔ ان کا میل ہوتا بھی تو کیسے؟ اس نے اس کی جان بچائی تھی، وہ اس کی عزت کرتی تھی، اسے خاص اہمیت دیتی تھی مگر یہ کوئی فلمی سچویشن تو نہیں تھی کہ وہ اس کی محبت میں گرفتار ہو جاتی۔ اپنی منگنی تڑوا دیتی اور اس کے ساتھ کھیتوں کھلیانوں میں محبت کی پینگیں بڑھانے لگتی۔ کسی وقت وہ سوچنے لگتا تھا کہ جونہی شاہ زمان گاؤں واپس آئے گا، وہ اس سے سیدھی سیدھی بات کرے گا اور اس سے جانے کی اجازت طلب کرے گا۔

کسی وقت اس کے دماغ میں وہ تہ خانے اور لکڑی کے ڈبوں والے مناظر بھی چکرانے لگتے تھے۔ اس کا فطری تجسس بیدار ہوتا اور وہ سوچنے لگتا کہ وہ کیا قصہ تھا۔ اب بھی رات کا دوسرا پہر چل رہا تھا اور وہ انہی سوچوں میں گم مہمان خانے کے وسیع برآمدے میں چکرا رہا تھا۔ اس کے قدم جیسے بے ساختہ اس تہ خانے کی طرف اٹھ گئے۔ ابھی وہ تہ خانے سے کافی فاصلے پر ہی تھا کہ اسے دو پرچھائیاں بڑی تیزی سے چھت پر حرکت کرتی نظر آئیں۔ یہ یہاں کے پہریدار تو نہیں ہو سکتے تھے۔ انہیں اس طرح بھاگنے کی کیا ضرورت تھی۔ اچانک تہ خانے کی سیڑھیوں کی طرف کوئی بلند آواز سے للکارا۔ ”اوئے...... کون ہو تم...... کون ہو......“ اس کے ساتھ ہی ایک فائر کی آواز آئی۔ تاریکی میں شعلہ سا چمک کر رہ گیا۔ آٹومیٹک رائفل کا فائر ایک زبردست ہنگامے کی شروعات ثابت ہوا۔ ایک دم ہی جیسے حویلی کا سناٹا چکنا چور ہو گیا تھا۔ بھاگ دوڑ کی آوازیں آئیں، دروازے دھڑدھڑائے، کھڑکیاں کھلیں، بلب روشن ہوئے اور پھر جیسے کہرام سا مچ گیا۔ ایک دم ہی اندھا دھند فائرنگ ہونے لگی۔

دلاور نے خود کو ایک چوکور ستون کی اوٹ میں کر لیا۔ ہر طرف چنگاریاں سی بکھر رہی تھیں۔ اصطبل کی طرف گھوڑے ہنہنا رہے تھے اور رکھوالی کے کتے شور مچا رہے تھے۔ ملتانی بھاگتا ہوا باہر نکلا۔ وہ بدحواس بھینسے کی طرح عین گولیوں کی زد میں جا رہا تھا۔ دلاور نے عقب سے اس کی قمیص کا کالر دبوچا اور گھما کر ایک چٹائی پر پھینک دیا۔

ملتانی ہراساں آواز میں بولا۔ ’’یہ کیا ہو رہا ہے دلاور؟‘‘

’’برات روانہ ہو رہی ہے تیری...... دیکھ نہیں رہا، فائرنگ ہو رہی ہے۔ سر نیچے رکھ۔‘‘ آخری الفاظ دلاور نے چلا کر کہے اور خود بھی ستون کی اوٹ میں سٹ گیا۔

چند گولیاں سنسناتی ہوئی ان کے بالکل پاس سے گزریں۔ یکایک ایک شخص بھاگتا ہوا آیا اور اوندھے منہ ان سے دس پندرہ فٹ کے فاصلے پر گرا۔ دلاور نے پہچان لیا۔ یہ حویلی کا ہی ایک کارندہ تھا۔ گولی غالباً اس کی کمر میں لگی تھی اور وہ گرتے ہی بے حرکت ہو گیا تھا۔

وہ جس جگہ پڑا تھا، وہاں اسے کسی بھی وقت مزید گولیاں لگ سکتی تھیں لیکن اسے وہاں سے ہٹانا بھی آسان نہیں تھا۔ ہٹانے والا براہِ راست گولیوں کی زد میں آ جاتا۔ آخر دلاور کی فطری دلیری نے اسے مہمیز کیا۔ وہ ستون کی اوٹ سے نکلا اور جھک کر...... اور لپک کر مضروب تک پہنچ گیا۔ اس نے اس کا ایک بازو پکڑا اور گھسیٹتا ہوا محفوظ آڑ میں لے آیا۔

یہی وقت تھا، جب پیر فضل بھی ہانپتا کانپتا وہاں پہنچ گیا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹی نال والی رائفل تھی اور آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔

’’شاباش دلاور! تم نے بڑی ہمت دکھائی۔ ورنہ یہ مارا جاتا۔‘‘ اس کا اشارہ زخمی کارندے کی طرف تھا۔

’’یہ کیا ہو رہا ہے فضل صاحب؟‘‘ دلاور نے پوچھا۔

’’حضور چانڈیو کے بندے گھس آئے ہیں۔ حرامزادے پکھیرو لینے آئے ہیں۔ پکھیرو تو ان کو ملے گا ایسا کہ ساری زندگی یاد رکھیں گے۔‘‘

اسی دوران میں دو کارندے زخمی کارندے کو اٹھا کر مہمان خانے کے اندرونی کمروں کی طرف لے گئے۔ حویلی کا خاص کارندہ شیرو دوڑتا ہوا آیا۔ اس کی رائفل کی نال سے دھواں خارج ہو رہا تھا۔ بھاری بھرکم چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ وہ تہ خانے کی طرف سے آیا تھا۔ اس نے تمتمائے چہرے کے ساتھ پیر فضل کو اطلاع دی۔ ’’پکھیرو کو کچھ نہیں ہوا جی۔ وہ کنجر سیڑھیوں تک تو آ گئے تھے مگر اندر نہیں جا سکے۔‘‘

دو گولیاں شیرو کے بالکل قریب دیوار پر لگیں اور بہت سا پلاستر اکھڑ کر برآمدے کے فرش پر جا گرا۔

شیرو نے دانت پیس کر ایک گالی دی اور جوابی فائرنگ کرتا ہوا آگے نکل گیا۔ پیر فضل نے بھی اپنے کارندوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے برآمدے کے آخری سرے پر جا کر مختلف جگہوں پر پوزیشنیں لے لیں۔ اسی دوران میں پیر فضل کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ اس نے کال ریسیو کی...... پھر گرج کر بولا۔ ’’حضور چانڈیو کے بندے ہیں۔ آج ان بدمعاشوں کو ایسا مزہ چکھا دو پھر کبھی ایسی جرأت نہ کریں۔‘‘ وہ بات کرتا ہوا اور دیوار کی آڑ لیتا ہوا آگے نکل گیا۔

دلاور گم صم کھڑا تھا۔ حضور چانڈیو، تہ خانہ...... پکھیرو...... یہ سب کیا گورکھ دھندا تھا۔ اچانک اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ کہیں لکڑی کے ان ڈبوں میں پکھیرو یعنی پرندے تو بند نہیں تھے۔ ڈبوں میں سوراخ تھے اور اس رات دلاور کو ایک ڈبے سے پھڑپھڑاہٹ بھی سنائی دی تھی۔ اگر یہاں کسی پرندے کی بات ہو رہی تھی تو پھر وہ کیا ہو سکتا تھا؟ کہیں یہ کوئی باز یا عقاب قسم کی چیز تو نہیں تھی؟ اسے معلوم تھا کہ یہ زمیندار وڈیرے باز عقاب اور شاہین وغیرہ کے شکار کے شوقین ہوتے ہیں۔

اچانک دلاور کو بالائی منزل سے چلانے کی آواز آئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ بالائی برآمدے میں اسے بڑی آپا دکھائی دیں۔ وہ ایک حملہ آور پر جھپٹی تھیں اور اس سے رائفل چھیننے کی کوشش کر رہی تھیں۔ رائفل بردار نے جھٹکا کر بڑی آپا کو زور سے دھکا دیا۔ وہ سیڑھیوں سے لڑھکتی ہوئی کئی فٹ نیچے گریں۔ یہ منظر کسی اور نے بھی دیکھا تھا اور جس نے دیکھا تھا، وہ غیض سے دیوانہ ہو کر حملہ آور پر جھپٹ پڑا تھا اور یہ جھپٹنے والا کوئی اور نہیں تھا سویرا تھی۔ وہ شیرنی کی طرح اس ’’حملہ آور‘‘ پر آئی جس نے بڑی آپا کو دھکا دیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ہاکی تھی۔ اس نے یہ ہاکی پورے زور سے حملہ آور کی کلائی پر ماری۔ اس کے ہاتھ سے رائفل چھوٹ کر جنگلے سے ٹکرائی اور پھر نیچے احاطے میں جا گری۔ سویرا نے دوسرا وار حملہ آور کے سر پر کیا۔ یہ وار حملہ آور نے اپنے ہاتھوں پر روکا اور سویرا سے ہاکی چھیننے کے لیے اس سے گتھم گتھا ہو گیا۔ دلاور نے یہ منظر دیکھا تو اپنی جگہ کھڑا نہ رہ سکا۔ وہ یہ سب کچھ کیسے دیکھ سکتا تھا۔ دیکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ تو اس کی جان تھی۔ اس کی رگوں میں لہو بن کر دوڑ رہی تھی۔ سانس بن کر اس کے سینے میں چل رہی تھی۔ وہ برآمدے میں اندھا دھند بھاگتا ہوا سیڑھیوں تک پہنچا۔ کئی گولیاں اس کے آس پاس سے گزری ہوں گی لیکن اسے کچھ پتا نہیں چلا۔ وہ سیڑھیاں پھلانگتا ہوا بالائی برآمدے میں آ گیا۔

جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، حملہ آور کی ایک کلائی ٹوٹ گئی تھی۔ حملہ آور سویرا سے ہاکی چھین نہیں پایا تھا۔ وہ

اب بے دریغ اسے پیٹ رہی تھی مگر وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ حملہ آور کا ایک ساتھی اس کی مدد کے لیے پہنچ چکا ہے۔

اس کے ہاتھ میں قریباً نو انچ لمبے پھل کا تیز دھار چاقو تھا۔

وہ سویرا پر جھپٹ رہا تھا جب دلاور اس کے راستے میں دیوار بن گیا۔ حملہ آور نے دیوانہ وار ہاتھ چلایا۔ چاقو دلاور کی چھاتی کو افقی رخ پر چیرتا ہوا نکل گیا۔ ایک آتشیں لکیر سی دلاور کے سینے سے لے کر کندھے تک چلی گئی۔ پہلا وار سہنے کے بعد اس نے دوسرے وار کا موقع نہیں دیا اور وحشت کے عالم میں چاقو بردار کو روئی کی طرح دھنک ڈالا۔ دلاور کے سر کی ایک خوفناک ضرب اپنے چہرے پر کھانے کے بعد چاقو بردار، جنگلے سے ٹکرانے کے بعد کوئی پندرہ فٹ نیچے پختہ صحن میں گرا اور پھر بری طرح لنگڑاتا ہوا ایک طرف اوجھل ہوگیا۔ فائرنگ کی شدت اب حویلی کے عقبی گیٹ کی طرف تھی اور اس صورت حال سے پتا چل رہا تھا کہ باقی حملہ آور بھی تیزی سے پسپا ہو رہے ہیں۔

سویرا نے اسی اثنا میں حملہ آور کی ایک دو ہڈیاں مزید توڑ ڈالی تھیں۔ پھر حویلی کے مسلح محافظ وہاں پہنچ گئے اور انہوں نے زخمی کو دبوچ لیا۔ یہی وقت تھا جب سویرا کی نگاہ دلاور کے خون سے لت پت سینے پر پڑی۔ چاقو گہرائی میں تو نہیں گیا تھا مگر اس کے سینے کے گوشت کو چوڑائی کے رخ پر ایک طویل کٹ لگا گیا تھا۔ سویرا ملازموں کی طرف دیکھ کر پکاری۔ ''ان کو اسپتال لے جاؤ۔ جلدی کرو...... بہت خون نکل رہا ہے۔''

☆☆☆

دلاور کو بہاولپور کے بڑے اسپتال میں لے جایا گیا۔ وہاں اس کی چھاتی پر کافی سارے ٹانکے آئے اور خون کی ایک بوتل بھی دینا پڑی۔ اگلے روز سویرا اور شاہ زمان اس کی تیمارداری کے لیے اسپتال بھی آئے۔ یہ شاہ زمان کا اثر رسوخ تھا کہ اسپتال کا عملہ اور ڈاکٹرز وغیرہ اس کے سامنے بچھے جا رہے تھے۔ اس کے ساتھ مسلح گارڈز کی ایک فوج تھی۔ کچھ اسپتال کے اندر تھے، کچھ باہر۔

شاہ زمان نے مسکراتے ہوئے دلاور کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا۔ ''تم ہمارے لیے بڑے لکی ثابت ہو رہے ہو۔ شاید تم بروقت وہاں نہ پہنچتے تو سویرا کو کوئی نقصان پہنچ جاتا۔''

شاہ زمان کی بات پر دلاور بس اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔ اس نے یہ نہیں بتایا کہ وہ نہ صرف بروقت وہاں پہنچا تھا بلکہ اس نے سویرا کی طرف بڑھنے والا مہلک چاقو بھی اپنی چھاتی پر جھیلا تھا۔ غالباً سویرا کو بھی پتا نہیں چل سکا تھا کہ وہاں ان لمحوں میں اصل صورت حال کیا ہوئی تھی۔

دلاور نے بات بدلتے ہوئے کہا۔ ''بڑی آپا صاحبہ کا کیا حال ہے؟''

''وہ سیڑھیوں سے گر کر بے ہوش ہوگئی تھیں۔ مگر اللہ کا شکر ہے کہ تھوڑی دیر بعد ہوش میں بھی آگئیں۔'' سویرا نے جواب دیا۔

''اللہ نے بڑا کرم کیا ہے۔'' دلاور نے تہِ دل سے کہا۔

''اب ہم نے تمہیں کہیں جانے نہیں دینا۔ تم واقعی ہمارے لیے بہت لکی ہو۔'' شاہ زمان نے کہا۔

''میں کس قابل ہوں جی۔ یہ تو آپ کی نظر کی مہربانی ہے۔''

''اگر میں یہ کہوں کہ میں تمہیں حویلی میں کوئی ملازمت دینا چاہتا ہوں، تو تمہارا جواب کیا ہوگا؟''

''آپ مجھے جس کام کے قابل بھی سمجھیں گے، میرے لیے بڑی خوشی کی بات ہوگی لیکن......''

''لیکن نہیں......'' شاہ زمان نے اس کی بات کاٹی۔ ''لیکن کے بعد بہانہ شروع ہوجاتا ہے۔'' پھر وہ اپنی گھنی مونچھوں کو سہلا کر بولا۔ ''تم نے ہمارے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ میں اب نہیں چاہتا کہ تم ہماری نظروں سے دور رہو۔''

اس نے دوبارہ دلاور کو سرتاپا دیکھا۔ جیسے نظروں نظروں میں اس کی جسمانی طاقت اور ذہنی چستی کو تول رہا ہو۔ اس کی نگاہوں میں دلاور کے لیے چاہت تو تھی لیکن اس چاہت میں مفاد اور ملکیت کا احساس بھی جھلک دکھا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک طرح کا احسان بھی تھا۔ جیسے وہ خاموشی کی زبان میں کہہ رہا تھا...... تمہاری حیثیت اور حسب نسب اس قابل تو نہیں کہ تمہیں اپنے اتنا قریب رکھا جائے لیکن چونکہ حالات نے تمہیں ہماری ایک بے مثال ''خدمت'' کا موقع دیا ہے اس لیے تمہیں برداشت کیا جاسکتا ہے...... اور آگے بڑھنے کے موقعے بھی دیے جاسکتے ہیں......

وہ بولا۔ ''تم اسپتال سے ڈسچارج ہوکر سیدھے حویلی جاؤ گے۔ سمجھو یہ تمہارے لیے میرا پیار بھرا حکم ہے۔ میں بھائی صاحب (شاہ فرمان) سے بات کرلوں گا۔ وہ تمہیں اور تمہارے دوست کو مستقل طور پر حویلی میں رکھنے کا انتظام کرلیں گے......''

دلاور نے خاموش رہنے میں ہی عافیت سمجھی۔

شاہ زمان نے مختصر الفاظ میں دلاور کو بتایا کہ حویلی میں گھس کر فائرنگ کرنے والے ان کی ایک مخالف پارٹی کے لوگ تھے۔ ان کو قرار واقعی جواب ملا ہے۔ ان کا ایک

بندہ جان سے گیا ہے۔ وہ سخت زخمی ہوئے ہیں۔ ان کے خلاف دو ایف آئی آر بھی کٹوائی گئی ہیں......

وقتِ رخصت شاہ زمان نے دلاور کا شانہ تھپکا تو سویرا نے بھی کمال بے تکلفی سے، اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

وہ بہت فرینک...... بے جھجک اور شفاف لڑکی تھی۔ اندر باہر سے ایک جیسی، کوئی بناوٹ نہیں تھی اس میں۔ دلاور نے کئی بار دیکھا تھا وہ حویلی کے عام ملازموں میں گھل مل جاتی تھی۔ ان کے کوارٹرز میں بیٹھ کر ان سے باتیں کرتی تھی۔ شاہ فرمان اور شاہ زمان کی پروا کیے بغیر ملازمین کے دکھ درد میں شریک ہو جاتی تھی۔

کمرا وہی عالی شان تھا جس میں اس نے سویرا کی یاد میں بے چین راتیں گزاری تھیں۔ اس کی تیمارداری ہونے لگی۔ اس کی بہترین نگہداشت ہونے لگی۔ زخم دینے والا چارہ گر بن جائے تو قیامت ٹوٹتی ہے۔ دلاور پر بھی دن رات قیامت بیتنے لگی۔

سویرا حویلی کے گھٹے ہوئے ماحول کو ہرگز خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ وہ اپنی مرضی کرنے والی لڑکی تھی۔ وہ دوپہر اور رات کا کھانا اپنے سامنے ملازمہ سے لگواتی اور جب تک وہ کھانہ چکتا، وہ وہیں رہتی۔ اکثر اس کے ساتھ رمشا بھی ہوتی۔ وہ دن رات دلاور کے لیے کیف آور تھے اور اذیت ناک بھی۔ جب تک سویرا وہاں رہتی وہ گھڑیاں اس کی خوشبو سے معطر رہتیں۔ وہ چلی جاتی تو اذیت کا زہریلا دھواں اس کے سینے میں بھر جاتا۔ اس کا دم گھٹنے لگتا۔ اس نے دو تین بار چاہا کہ سویرا سے اس ہنگامے کے بارے میں تفصیل سے پوچھے جس نے حویلی میں تہلکہ مچایا تھا لیکن نہیں پوچھ سکا۔ نہ ہی اس نے سویرا کو یہ بات بتائی تھی کہ اسے چھاتی پر لگنے والا زخم دراصل اسے بچاتے ہوئے لگا تھا۔ پتا نہیں کیوں سویرا سے بات چھپانا اسے اچھا لگ رہا تھا۔

وہ ایسی ہی دھوپ چھاؤں والی دوپہر تھی۔ سویرا ملازمہ کے ساتھ...... دیسی بٹیر کی یخنی اور مکئی کی روٹی لے کر آئی تھی۔ رمشا آج اس کے ساتھ نہیں تھی۔ ملازمہ کھانا چن کر چلی گئی۔ سویرا روزانہ تر و تازہ ہوتی تھی مگر آج کچھ زیادہ ہی خوش تھی۔ وہ تھوڑی دیر ادھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی پھر یخنی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے بولی۔ ''دلاور! تم نے ابھی تک شہر تو بہت سے گنوائے ہیں مگر یہ بتایا ہی نہیں، تم پیدا کس شہر میں ہوئے؟''

''سویرا بی بی! مجھے معلوم ہی نہیں......'' وہ اداسی سے بولا۔

''کیا مطلب......؟'' سویرا نے حیرانی سے کہا۔

''سویرا بی بی! میرا آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ سمجھیں میں اس دنیا میں اکیلا ہوں۔'' وہ تھوڑا سا آگے ہوئی اور اس نے اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ دیا۔ بہت میٹھے اور نرم لہجے میں بولی۔

''تم خود کو اکیلا مت سمجھو...... ہم سب لوگ تمہارے ساتھ ہیں۔'' اسے لگا کہ اتنی سی بات دلاور کی تشفی کے لیے کافی نہیں ہے۔ وہ چند لمحے سر جھکائے دلاور کو خاموشی سے دیکھتی رہی پھر جیسے کچھ سوچ کر ایک دم سے چہکی۔ گردن کو ایک زاویے پر حرکت دے کر بولی۔

''آج میں تم سے بہت سے سوال پوچھنا چاہتی ہوں۔ چلو ایک کام کرتے ہیں۔ آج سے تم اور میں اچھے دوست ہیں۔ تم جتنے دن حویلی میں رہو گے، مجھے سویرا بی بی نہیں بلکہ صرف سویرا کہو گے۔ مگر تب جب صرف تم اور میں اکیلے ہوں گے۔ دوسرے لوگوں کی موجودگی میں سویرا بی بی ہی چلے گا...... سمجھے تم۔'' دلاور کو اپنا دماغ سن ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ جواب میں کچھ کہنا چاہتا تھا مگر گنگ ہو کر رہ گیا تھا۔

وہ پھر سے بولی۔ ''اور دوستی کا تقاضا یہ ہے کہ دوست سے کوئی بات بھی چھپائی نہیں جاتی۔'' پہلی بار دلاور نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ یوں نظر آتا تھا جیسے روتا بچہ من پسند کھلونا مل جانے کے بعد آنسو پونچھتے ہوئے مسکرانے لگے۔

سویرا پڑھی لکھی تھی۔ سندھ یونیورسٹی سے ماسٹرز کر چکی تھی۔ کو ایجوکیشن میں ''یاری دوستی'' نبھا چکی تھی۔ شاعری اسے پسند تھی۔ خود بھی شعر لکھتی تھی۔

شاعر رومان پرور ہوتا ہے۔ شاہ زمان سویرا کے دور کے رشتے داروں میں سے تھا۔ کسی تعمیراتی کام کے سلسلے میں چار، چھ دفعہ یونیورسٹی جانا ہوا جہاں سویرا کی کشش نے اسے دیوانہ کر دیا۔ یونیورسٹی کے چکر بڑھ گئے۔ کام لمبا ہو گیا، سویرا کے بچپن میں ہی اس کے ماں باپ میں علیحدگی ہو گئی تھی۔ ماں یورپ کے کسی ملک میں تھی جبکہ باپ امریکا میں اپنی زندگی گزار رہا تھا۔ سویرا کو اس کی پھپھو نے پالا تھا۔ کسی عید شب برات وغیرہ پر...... ماں باپ کی طرف سے علیحدہ علیحدہ کارڈ موصول ہوتے جن کو دیکھے بغیر وہ ردی کی ٹوکری میں پھینک دیتی تھی۔

اس کا کل جہاں اس کی پھپھو عالیہ ہی تھیں۔ پھپھو عالیہ سندھ یونیورسٹی کی پروفیسر اور بڑی آپا کی فرسٹ کزن تھیں۔ شاہ زمان نے بڑی آپا کے ذریعے سویرا سے شادی کا پیغام بھیجا...... جو چند ماہ کی سوچ بچار کے بعد پھپھو عالیہ نے سویرا کی رضامندی سے قبول کر لیا۔ شاہ زمان خوش شکل

تھا۔ مال و دولت اور اثر و رسوخ والا تھا۔ یونیورسٹی میں پڑھنے والی سویرا اور دنیا کو پڑھانے والی پھپھو عالیہ بخوبی جانتی تھیں کہ ایسے رشتے قسمت سے ہی دروازے پر دستک دیتے ہیں۔ زمانہ خراب تھا۔ غیروں سے نمٹنے کی تاب پھپھو بھتیجی میں نہیں تھی...... اسی لیے کچھ تحفظات کے باوجود ہامی بھر لی گئی تھی۔ اب پچھلے ڈیڑھ ماہ سے سویرا اپنی پھپھو اور ان کی بیٹی رمشا سمیت اس حویلی میں مقیم تھے۔

سویرا نے ماسٹرز کرلیا تھا۔ جس دن پھپھو کا ٹرانسفر بہاولپور یونیورسٹی میں ہوا، وہ لوگ سامان سمیٹ کر بہاولپور آگئے۔ بہاولپور میں ہوتے ہوئے بڑی آپا انہیں کرائے کے مکان میں کہاں رہنے دے سکتی تھیں۔ وہ دوسرے دن ہی بہاولپور گئیں اور ان کو اٹھا کر حویلی میں لے آئیں۔

پھپھو عالیہ نے سو ہاتھ پیر مارے مگر بڑی آپا کے آگے ایک نہ چلی۔ انہوں نے صاف کہہ دیا۔ ''حویلی اتنی بڑی ہے تین لوگوں کے آنے سے کم نہیں پڑنے والی اور اگر انکار کرو گی...... تو...... رشتہ ختم......'' ظاہر ہے آخری بات انہوں نے مذاق میں کی تھی۔ چاروناچار انہیں بڑی آپا کی بات ماننا پڑی۔ ان کو اوپری منزل پر شاندار کمرے دے دیے گئے...... ایک کمرے میں پھپھو عالیہ رہ رہی تھیں جبکہ دوسرے کمرے میں سویرا اور رمشا تھیں۔

پھپھو عالیہ نے کبھی گھاٹے کا سودا نہیں کیا تھا۔ وہ جہاندیدہ اور دور اندیش پروفیسر تھیں۔ لالچی نہیں تھیں مگر زمانے سے خوبصورتی کا خراج وصول کرنا بھی اپنا حق سمجھتی تھیں۔ حویلی کھلے دل اور کھلے پیسے والوں کی تھی...... تین عورتیں تو کیا...... چوڑی حویلی تین سو لوگوں کو بھی خود میں سمو سکتی تھی۔

تو سویرا کی بات پر پہلی دفعہ دلاور نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ اس کے دل میں شادمانی ہلکورے لیتی تھی۔ سویرا نے دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا، وہ ہاتھ کیسے جھٹک سکتا تھا۔ سویرا عجیب دل لگی کے موڈ میں تھی یا شاید وہ مغموم دلاور کا دل بہلانا چاہ رہی تھی۔

وہ بولی۔ ''دلاور! تم نے لاہور تو دیکھا ہوگا...... بتاؤ کیسا ہے؟'' آنکھوں میں تجسس بھری چمک تھی۔

''اچھا ہے...... بلکہ بہت اچھا ہے۔'' اس نے کہا اور ذہن کے دریچے میں تنگ گلیاں اور ساتھ ساتھ جڑی چھتوں کی دھوپ پھیل گئی۔

''ایک دفعہ یونیورسٹی کا ٹرپ لاہور گیا تھا...... میں بیمار پڑگئی، نہ جا سکی...... جس کا قلق ہمیشہ رہے گا۔''

''تو آپ اب چلی جائیں...... آپ کو کس نے روکا ہے۔'' وہ خاموشی کے خول سے رفتہ رفتہ باہر آنے لگا تھا۔

''تم چلو گے میرے ساتھ...... میں پرانا لاہور دیکھنا چاہتی ہوں...... تنگ گلیاں...... پُرپیچ بازار۔'' وہ خیالوں میں جیسے کہیں دور چلی گئی تھی......

''آپ جب حکم کریں گی...... مجھے تیار پائیں گی۔''...... وہ مؤدب لہجے میں بولا۔ اس کی نگاہیں نیچی تھیں...... گلابی ہونٹوں سے دور......

سویرا بازو میں پڑی چوڑی کو گھماتے ہوئے بولی۔ ''دلاور! تم ہمیں بچاتے ہوئے اپنی جان پر کھیل گئے......''

''اس میں کوئی خاص بات تو نہیں سویرا......'' سویرا کہتے ہوئے وقت پیش آرہی تھی مگر وہ کہنے پر مجبور تھا۔

''مگر لوگ ایسے نہیں ہوتے، کسی کے جھگڑے میں اپنی جان خطرے میں نہیں ڈالتے...... تم جو نظر آتے ہو، وہ ہو نہیں۔'' وہ ترچھی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی تو دلاور گڑبڑا گیا۔ فوراً سنبھلتے ہوئے بولا۔

''آپ کی جگہ کوئی بھی ہوتا میں ایسا ہی کرتا۔'' سویرا بڑے غور سے اسے دیکھنے لگی۔ وہ کچھ بولنا چاہتی تھی کہ ملازمہ آن ٹپکی...... اس کی آمد سویرا کو بری لگی۔ وہ اسے کسی بہانے سے بھیجنا چاہتی تھی کہ رمشا اسے بلانے آگئی۔ دلاور نے غور کیا رمشا اور ملازمہ کی موجودگی میں سویرا پوری کی پوری ''سویرا بی بی'' نظر آنے لگی تھی...... پُروقار...... اور وضع دار۔

اگلے دو دن سویرا نہیں آئی۔ حویلی میں ایک عجیب سی ہلچل نظر آرہی تھی۔ اس نے بلند کھڑکی کے پردے سرکا کر دیکھا تھا، حویلی کی باؤنڈری وال کے گرد خاردار تاریں لگائی جارہی تھیں۔ ملازمین بڑی مستعدی کے ساتھ یہاں سے وہاں بھاگے چلے جاتے تھے۔ یہ تیسرے دن دوپہر کی بات ہے، سویرا ملازمہ کے ساتھ کھانا لے کر آئی۔ ملازمہ کھانا رکھ کر چلی گئی تو سویرا بولی۔ ''تم میرا حال نہیں پوچھو گے، میں دو دن بیمار پڑی رہی۔''

دلاور کے دل میں ایک ٹیس اٹھی۔ وہ شاید عشق کے ابتدائی اسباق کو نہیں سمجھ پارہا تھا۔ جب کسی سے محبت ہوجاتی ہے تب اس کی ہلکی سی تکلیف بھی عاشق کو تڑپا دیتی ہے۔ یہ تیسرا موقع تھا جب وجود میں ہونے والی حیرت انگیز تبدیلی نے اسے پریشان کیا تھا۔ پہلا موقع تب آیا تھا جب وہ ڈوبتی سویرا کو بچا کر پانی سے باہر لایا تھا۔ وہ پہلی نظر پہلا احساس اور پہلا گھاؤ تھا۔ دوسرے موقع پر اس نے حویلی پر

حملے کے وقت سویرا کو ایک حملہ آور سے دست و گریباں دیکھا تھا اور ایک دم تڑپ سا گیا تھا۔ اب بھی سویرا نے اپنی بیماری کا بتایا تھا تو اس کا دل جیسے کسی غم کے اندھیرے کنویں میں ڈوب گیا تھا۔ وہ بے تابی سے بولا۔

''سویرا! آپ اپنا دھیان رکھا کیجیے۔ آپ کمزور لگ رہی ہیں۔''

دلاور کی پریشانی سویرا سے چھپی نہ رہ سکی...... وہ یک ٹک اسے دیکھتی رہی...... پھر مسکراتے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اب ٹھیک ہوں۔ ویسے تمہیں خود پر زیادہ دھیان دینے کی ضرورت ہے۔'' وہ رکی پھر بولی۔ ''ظفر بتا رہا تھا تمہارا زخم پہلے سے بہتر ہے۔''

''جی! میں کل چل کر باہر تک بھی گیا تھا......'' دلاور اندرونی کشمکش کو اعتدال پر لانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ دلاور کی اندرونی کیفیت کو سویرا نے جیسے اس کے چہرے سے پڑھ لیا تھا۔ دلاور خود میں پشیمان ہوا جا رہا تھا۔ اسی خفت کو مٹانے کی خاطر اس نے فوراً گفتگو کا رخ پھیرنے کی کوشش کی اور بولا۔ ''سویرا! ایک بات پوچھوں، آپ بُرا تو نہیں منائیں گی؟''

''ہاں بولو......''

''تھوڑے دن پہلے حویلی میں جو کچھ ہوا وہ سب کیا تھا؟''

سویرا ایک دم سے خاموش ہوگئی جیسے وہ اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ دلاور جواب کا انتظار کرتا رہا، سویرا خاموش رہی تو وہ بولا۔ ''لگتا ہے...... آپ اس موضوع کو نہیں چھیڑنا چاہتیں۔''

اس کے جواب میں سویرا نے بڑی تیزی سے نفی میں سر ہلایا جس سے دوپٹا کھسکا اور چند نسواری زلفیں چہرے پر پھیل گئیں۔ اس نے ہاتھ سے انہیں سر پر جمایا۔ دوپٹا سر پر سیدھا کیا اور تھوڑا مسکراتے ہوئے بولی۔ ''میں تمہیں کہہ چکی ہوں...... دوست سے کوئی بات چھپائی نہیں جاتی...... تو میں اس پر قائم ہوں۔''

سویرا نے محتاط اور مختصر لفظوں میں جو کہانی سنائی، وہ کچھ اس طرح سے تھی کہ حویلی پر حملہ ''شوکت سیال'' نے کروایا تھا۔ وہ رحیم یار خان کے ایک ایم پی اے حضور چانڈیو کا جگری دوست تھا۔ شوکت سیال نہایت بدمزاج، منہ پھٹ اور بات بات پر لڑنے مرنے پر اتر آنے والا بندہ تھا۔ اسے حضور چانڈیو کی پوری پشت پناہی حاصل تھی۔ حویلی پر حملہ کسی ''باز'' کو چرانے کے لیے کیا گیا تھا۔ خیال ظاہر کیا جا رہا تھا کہ وہ ''باز'' نہایت قیمتی اور تربیت یافتہ ہے۔ پولیس کے پہنچتے ہی حملہ آور اپنے دو زخمی ساتھیوں کے ساتھ فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے جبکہ ان کا ایک ساتھی دھر لیا گیا تھا۔ قیمتی باز محفوظ رہا تھا۔

حویلی پر حملے کا سن کر شاہ فرمان اپنی نئی نویلی بیوی کے ساتھ فوراً کراچی سے واپس آ گیا تھا جبکہ شاہ زمان ایک دن بعد ترنڈا سے واپس پہنچا تھا۔

سویرا بات مکمل کر چکی تو دلاور کافی سنبھل چکا تھا، بولا۔ ''سویرا! کیا یہ باز بہت زیادہ قیمتی ہے؟''

''ہاں شاید...... سدھائے ہوئے عقاب قیمتی ہی ہوتے ہیں۔''

''آپ کے خیال میں کیا قیمت ہوگی اس کی......؟''

دلاور نے کہا تو سویرا نے بڑی دلچسپی سے دلاور کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''سننے میں آ رہا ہے...... آٹھ...... دس لاکھ کے قریب ہوگی۔''

''مگر مجھے اس کے پیچھے کوئی اور کہانی ہی معلوم ہوتی ہے۔ آٹھ دس لاکھ کے باز کے پیچھے حویلی پر اتنا بڑا حملہ...... اور آپ کے خیال کے مطابق حملہ شوکت سیال اور حضور چانڈیو نے مل کر کروایا ہے...... دس لاکھ ایسے لوگوں کے لیے بہت بڑی رقم تو نہیں ہے۔''

سویرا نے غور سے دلاور کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''مجھے لگتا ہے...... تم کسی سراغ رساں...... فرم کے لیے کام کرتے رہے ہو۔'' لہجے میں شوخی تھی۔ آج کی سویرا اور تھوڑے دن پہلے والی سویرا میں بہت فرق تھا۔ وہ دلاور سے یوں روانی سے باتیں کر رہی تھی جیسے اسے برسوں سے جانتی ہو یا شاید یہ کو ایجوکیشن یونیورسٹی کے ماحول کا اثر تھا۔

دلاور ہنس دیا بولا۔ ''میں تو خود آج تک گم شدہ ہوں۔ میں کسی کا سراغ کیا لگاؤں گا۔''

دن گزرنے لگے۔ ہر روز ایک نیا ہنگامہ ہوتا۔ ایک علیحدہ کہانی ہوتی۔ ایک دن سویرا اپنی ڈائری لے کر آئی۔ اس پر نثر اور شاعری کی مشق کی گئی تھی۔ اس میں ایک آزاد نظم تھی۔

تم کب تک مجھ کو بھولو گے
اس دشت کی تنہا راتوں میں اک درد جو ٹھہرا ہوتا ہے
وہ درد بھی طعنے دیتا ہے، چپ چاپ سسکیاں لیتا ہے
اک ٹیس بھی اٹھ کے کہتی ہے
تم کب تک مجھ کو بھولو گے

نظم دلاور کے دل کو چھو گئی۔ وہ ہر لمحہ اس کی گردان

کرنے لگا۔ جس ڈر نے تھوڑے دن پہلے اس کے دل میں جگہ بنائی تھی، وہ اسے بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ وقت نے اسے ورغلا لیا تھا۔ حالات نے اسے خاموش طوفانوں سے بے خبر کردیا تھا۔ وہ عشق کی منزلیں بڑی بے خبری سے طے کرنے لگا تھا۔ سویرا نے جو رومال اسے دیا تھا، وہ اس نے سنبھال کر رکھا تھا۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے سویرا کی خوشبو رومال کے راستے اس کے پھیپھڑوں میں داخل ہوکر اور اسے مدہوش سا کردیتی ہے۔ پتا نہیں کیوں اسے ایسا محسوس ہورہا تھا کہ وہ دن بدن سویرا کے عشق میں ڈوبتا چلا جارہا ہے۔ وہ سب کچھ جانتا بوجھتا تھا پھر بھی عشق کی بے پناہ آگ کی طرف بڑھتا چلا جارہا تھا۔

وہ دھوپ بھرا بڑا چمکیلا ریگستانی دن تھا۔ دلاور کافی حد تک صحت یاب ہوچکا تھا۔ وہ بستر کی چادر درست کررہا تھا کہ سویرا آن ٹپکی۔ اس نے بے بی پنک کلر کا سوٹ پہن رکھا تھا جس پر اسی کلر کا کیش کا دوپٹا تھا۔ آدھے بازو کے کناروں پر میرون کلر کے موتی جھول رہے تھے۔ ان کپڑوں میں سویرا کا حسن قیامت ڈھا رہا تھا۔

وہ جھک کر بیڈ کی چادر درست کرواتے ہوئے بولی۔ ''دلاور! جو کام تم کررہے ہو، یہ کام گھروں میں عورتیں کرتی ہیں۔''

''میرا کوئی گھر ہوتا...... تو شاید کوئی عورت بھی ہوتی اور اگر عورت ہوتی تو وہ چادر درست کرنے والا کام ضرور کرتی......'' دلاور نے مسکرا کر کہا۔

''یہی تو میں کہہ رہی ہوں...... عورت ہے...... کہاں؟'' وہ چادر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے شوخی سے بولی تو دلاور کا دل جیسے مٹھی میں آگیا۔

وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی مگر خاموش ہوگئی۔ باریک دوپٹے کو سر پر درست کرتے ہوئے بولی۔ ''تم نے پوچھا ہی نہیں میں اس وقت تمہارے کمرے میں کیوں آئی ہوں...... حالانکہ دوپہر کے کھانے میں ابھی دو گھنٹے باقی ہیں۔''

''آپ خود ہی بتا دیجیے۔'' دلاور نے نظریں جھکا کر کہا۔

''صبح...... شاہ زمان نے تمہیں بلایا ہے...... تم نے کیا فیصلہ کیا ہے......؟''

''کس بارے میں......؟''

''حویلی میں رہنے کے بارے میں...... میرا مطلب ہے مستقل طور پر رہنے کے بارے میں؟''

دلاور اسے کہنا چاہتا تھا۔ ''سویرا! اب اس حویلی کے سوا تو میرا کوئی ٹھکانا ہی نہیں رہا ہے۔ حویلی بھی اس لیے کہ اس میں تم رہتی ہو...... تمہاری خوبصورت باتوں کی چہکار اس حویلی کی فضاؤں میں رقص کرتی ہے۔ تمہاری خوبصورتی کے رنگوں کی قوسِ قزح اس ماحول میں ٹھہری ہوئی ہے۔ جس ہوا کو میں اپنے پھیپھڑوں میں اتارتا ہوں، اس ہوا میں تمہاری سانسوں کی خوشبو گھلی ہوئی ہے۔ تمہارے چہرے کی ہنسی کے کھلتے گلاب میرے دل میں تہلکہ مچاتے ہیں۔ اب تم ہی مجھے بتاؤ میں حویلی چھوڑ کر کہاں جاؤں گا۔''

وہ یہ سب کچھ اسے نہ کہہ پایا۔ نہایت دھیمی جھکی سی آواز میں بولا۔ ''مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اب مجھے حویلی سے چلے جانا چاہیے۔''

''خبردار! ایسی بات دوبارہ کی تو...... تمہیں یہیں اسی حویلی میں رہنا ہے۔ یہی بات میں تمہیں کہنے آئی تھی......''

دلاور کا دل بھر آیا بولا۔ ''کس حیثیت سے...... کہنے آئی ہیں مس؟''

''ایک دوست کی حیثیت سے......''

''اگر نہ رہوں......؟''

''دوست کا دل ٹوٹ جائے گا...... اور ایسے دوست کا...... جو خود کو تمہارا قرض دار بھی سمجھتا ہے اور رہتی زندگی تک سمجھتا رہے گا۔'' سویرا نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا اور تیزی سے کمرے سے نکل گئی......

چند لمحے دلاور خاموشی سے اس دروازے کو تکتا رہا جہاں سے تھوڑی دیر پہلے سویرا گئی تھی۔ پھر ڈھول پر ایک زوردار چوٹ پڑی...... ایک، دو، تین، چار...... دھن دھنا دھن دھن...... دھن دھنا دھن دھن...... ڈھول کی تھاپ پر میلے میں رقص کرنے والا ملنگ جیسے دیوانہ وار خون کی آبیاری کرنے والی رگوں میں دھمالیں ڈالنے لگا...... دلاور کا انگ انگ ناچنے لگا۔ اس کا دل پھڑکنے لگا۔ سویرا خاص طور پر اسے کہنے آئی تھی کہ اسے حویلی میں ہر صورت رہنا ہے۔ وہ تو چاہتا ہی یہ تھا۔ وہ تو حویلی سے اب دور رہ ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ تو یوں ہی...... تکلفاً سویرا کو حویلی سے جانے کا کہہ رہا تھا۔ کس کافر کو یہاں سے جانا تھا۔ صبح وہ شاہ زمان کے روبرو پیش ہوا۔ شاہ فرمان بھی وہیں تھا...... اس کے چہرے پر سنگدلی اور بے رحمی کا کھچاؤ سا تھا۔ کثرتِ مے نوشی سے آنکھوں کے نیچے کا ماس ابھر آیا تھا۔ دلاور چند منٹ وہاں بیٹھا۔ بات ہوگئی۔ معاملات طے ہوگئے۔ دلاور کو ڈرائیور کم محافظ کی صورت میں رکھ لیا گیا۔ ڈرائیوری وہ بہت اچھے سے جانتا تھا۔ پنڈی میں جس دوست کے ساتھ مل کر کام کرتا تھا، اس کی کار دلاور ہی ڈرائیو کرتا تھا۔

ان دنوں دلاور میں انقلابی تبدیلیاں آئیں جن پر وہ

خود بھی حیرت زدہ رہ گیا۔ کم گو، شرمیلا دلاور باتونی اور خوش اخلاق ہو گیا۔ عشق نے اس کے دل میں جوت جگائی تھی اور وہ سودائی ہو گیا تھا۔ جیسے صوفی اور ملنگ ہو گیا تھا۔

وہ ہر کسی کی خوشی کا خیال رکھتا تھا۔ وہ ہر کسی کی مدد کے لیے کمربستہ رہنے لگا تھا۔

ایک دن وہ گاڑی چمکا رہا تھا۔ زنان خانے کی سواریوں کو لانے لے جانے کی ڈیوٹی اسی کی تھی۔ بڑی آپا نے "زھرپیر" جانا تھا۔ ان کے ساتھ ایک عورت آئی جو ایک ٹانگ سے معذور تھی۔ اس نے آدھے چہرے کا نقاب بھی کیا ہوا تھا۔ دلاور نے اچٹتی نگاہ ڈالی تو نقاب کے نیچے کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔ جیسے ناک والی جگہ پر ناک نہ ہو...... کوئی خلا سا ہو۔ سارے رستے بڑی آپا دلاور سے باتیں کرتی رہیں، وہ ان کے جواب دیتا رہا۔ اپنی پرانی کہانیاں بھی سناتا رہا مگر اس کا ذہن نقاب والی عورت میں اٹکا رہا۔ وہ عورت سارے رستے ایک دفعہ بھی نہیں بولی۔ آخر دلاور سے نہ رہا گیا بولا۔ "بڑی آپا! گستاخی معاف۔ مجھے کوئی حق تو نہیں پہنچتا مگر پھر بھی میں پوچھ رہا ہوں۔ یہ محترمہ کون ہیں؟"

خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا یہاں تک کہ دلاور کو پشیمانی ہونے لگی کہ اس نے یہ سوال کیوں کیا۔

پھر اچانک بڑی آپا کی گمبھیر آواز گونجی۔ "یہ شاہ فرمان کی تیسری بیوی اور میری سوتن نگینہ ہے۔"

دلاور .... آگے کچھ نہ بول سکا۔ واپسی کا رستہ بھی خاموشی سے کٹا۔

ظفری دلاور کا روم میٹ اور حویلی کا پرانا ملازم تھا۔ وہ دلاور سے کافی مانوس ہو چکا تھا۔ اس رات سوتے وقت دلاور نے داہنی طرف کروٹ لی اور ظفری سے بولا۔ "ظفری یار! یہ نگینہ بی بی کون ہیں؟"

"تو نے اسے کہاں دیکھا؟" ظفری حیرت سے بولا۔

"بڑی آپا کے ساتھ آج "زھرپیر" تک گئی تھیں۔"

"یہ بڑی لمبی اور دردناک کہانی ہے۔" وہ لمبی سانس کھینچ کر بولا۔

"تو پھر سنانا...... میرا آج جلدی سونے کا موڈ نہیں ہے اور تو...... تو آدھی رات تک جاگتا رہتا ہے۔"

ظفری دلاور کی بات پر ہنس دیا اور بولا۔ "یار! چوڈیرو حویلی کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ یہ سمجھ لو کہ چوڈیرو حویلی کے بڑے بوڑھوں کی ایک قدر مشترک تھی۔ وہ تین سے چار شادیاں کرتے تھے۔ یہ ریت ابھی تک چلی آ رہی ہے۔ شاہ زمان تو ابھی جوان ہوا ہے۔ شاہ فرمان بڑا ہے اور اب تک چار بیاہ رچا چکا ہے۔"

"چار بیاہ......!" دلاور نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں...... ہاں چار بیاہ...... اور پانچویں کی باری بھی جلدی آ جائے گی۔ شاہ فرمان کی پہلی شادی بڑی آپا سے ہوئی جن سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ اگر اولاد ہوتی تو بھی وہ دوسری، تیسری، چوتھی شادی ضرور کرتا۔ دوسری شادی رخشندہ سے ہوئی...... جو بے اولادی میں ہی شادی کے تیسرے سال مر گئی۔ تیسری شادی نگینہ سے ہوئی...... اور اب چوتھی شادی شاہدہ سے ہوئی ہے۔"

"حویلی کی کوئی عورت نقاب نہیں کرتی مگر یہ نگینہ بی بی ...تو پوری کی پوری پردے میں تھیں، یہ کیا ماجرا ہے؟"

ظفری کے چہرے پر خوف پھیل گیا بولا۔ "یار! یہ شاہ فرمان بڑا ظالم بندہ ہے...... چوتھی شادی پر نگینہ نے واویلا مچایا اور طلاق مانگی تو شاہ فرمان نے اپنے ہاتھ سے اس کی ناک اور ہونٹ کاٹ ڈالے۔" ظفری کانوں کو ہاتھ لگانے لگا۔

"اور نگینہ نے احتجاج نہیں کیا؟"

"او بدھو، سائیں...... احتجاج کی وجہ سے ہی تو ناک اور ہونٹ کاٹے گئے تھے۔ اور ایک اور ستم ظریفی سنو۔ حویلی کی کوئی بہو نہ طلاق لے سکتی ہے، نہ حویلی سے بھاگ کر کہیں جا سکتی ہے۔ یہ چوڈیرو حویلی کا صدیوں پرانا اصول ہے...... جو ابھی تک چلا آ رہا ہے۔"

"ظفری! شاہ زمان کو سب بڑے سائیں کیوں کہتے ہیں؟ حالانکہ وہ شاہ فرمان سے دس بارہ سال چھوٹا لگتا ہے۔"

ظفری بولا۔ "بدکرداری...... شاہ فرمان شروع سے ہی آوارہ اور بے پروا تھا۔ "بڑے سرکار" نے اپنی آخری وصیت میں شاہ زمان کو اپنا گدی نشیں چنا تھا۔ اسی وجہ سے اب شاہ زمان "بڑے سائیں" کے رتبے پر فائز ہیں۔"

"شاہ فرمان بڑا ہے، اسے کبھی شرمندگی محسوس نہیں ہوتی جب سب لوگ اس کے سامنے چھوٹے بھائی کو "بڑا سائیں" کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔" دلاور نے کہا۔

"میرا نہیں خیال اس سے شاہ فرمان کو کوئی فرق پڑتا ہو بلکہ میرے خیال سے وہ اس میں خوش ہے۔ بڑے سائیں کہلوانے میں بڑی قباحتیں ہیں۔ بہت سی پابندیاں ہیں۔ ایسی پابندیاں جو شاید شاہ فرمان جیسا عیش پرست بندہ نہیں نبھا سکتا...... اب اس دن حویلی پر ہونے والا حملہ ہی دیکھ لو ...... وہ سب کچھ شاہ فرمان کی غلطی کی وجہ سے ہی ہوا تھا۔"

"شاہ فرمان کی غلطی کی وجہ سے؟ میں تمہارا مطلب

نہیں سمجھا......'' دلاور نے الجھن سے کہا۔ ظفری بستر سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور اس نے سگریٹ سلگالیا۔ گہرا کش لے کر اسی سگریٹ سے دوسرا سگریٹ سلگا کر دلاور کو پکڑاتے ہوئے بولا۔

''یارا! اس حویلی کے ایک تہ خانے میں ...... قیمتی پکھیرو کچھ عقاب ٹائپ چیزیں رکھی جاتی ہیں۔ بعد میں سدھائے ہوئے قیمتی پکھیرو...... عرب ملکوں میں بھیجے جاتے ہیں اور عربوں سے لاکھوں کمائے جاتے ہیں۔ یہ سب کام شاہ فرمان کرتا ہے۔ ''بڑے سائیں'' یہ سب جانتے ہوئے بھی جان بوجھ کر آنکھیں موندھے ہوئے ہیں بلکہ کچھ لوگوں کا تو یہ بھی خیال ہے کہ ''بڑے سائیں'' بھی اس دھندے میں برابر کے شریک ہیں۔ صرف دنیا کو دکھانے کے لیے انجان بنے ہوئے ہیں۔''

''اچھا تو حویلی پر جو حملہ ہوا، وہ لوگ قیمتی پکھیرو چرانے آئے تھے۔'' دلاور نے کہا۔

ظفری مسکرادیا اور بائیں سر کو نفی میں حرکت دیتے ہوئے رازدارانہ لہجے میں بولا۔ ''چرانے نہیں آئے تھے بلکہ اپنا چرا کے لایا ہوا ایک قیمتی ''باز'' واپس لینے آئے تھے۔''

''چرا کے لایا ہوا باز...... میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا؟''

''او یارا...... ایک تو تمہیں بات بڑی دیر سے سمجھ میں آتی ہے۔ شاہ فرمان نے اپنے سب سے خطرناک کارندے ''شیرو'' سے رحیم یار خان کے ایک کوٹھ سے ایک باز چوری کروایا اور حویلی میں لے آیا۔''

دلاور باز کے متعلق سویرا سے سن چکا تھا پھر بھی انجان بنتے ہوئے بولا۔ ''کیا...... وہ باز...... قیمتی ہے؟''

''قیمتی نہیں بلکہ بہت قیمتی ہے۔ بلکہ یوں سمجھ لو...... وہ ایک سادہ چیک ہے۔'' ظفری نے کہا۔

''ایسی کیا بات ہے اس میں؟''

''یہ بہت اندر کی باتیں ہیں...... رہنے دو......''

دلاور نے خاموشی اختیار کرلی تو ظفری خود ہی بولا۔

''تم پوچھوگے نہیں...... اندر کی بات کیا ہے؟''

دلاور ہنس دیا، بولا۔ ''خود ہی تو تم نے کہا تھا...... رہنے دو...... میں نے رہنے دیا......''

''او بدھو سائیں! تمہیں اپنا یار کہا ہے اور یار سے کوئی چیز بھی چھپائی نہیں جاتی۔ حویلی میں بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم ہے کہ ''شان'' نامی باز اتنا اہم اور قیمتی کیوں ہوگیا ہے۔ اصل میں اس کی وجہ دو شیخوں کی لڑائی بیان کی جارہی ہے۔''

''دو شیخوں کی لڑائی۔''

''ہاں...... ہاں...... ایک شارجہ کا کوئی بڑا بزنس مین ہے...... دوسرا دبئی کا ارب پتی امیر زادہ ہے۔ دونوں کی آپس میں ٹھن گئی ہے۔ دونوں شاہ کے دعوے دار ہیں اور اسے حاصل کرنے کے لیے منہ مانگی قیمت دینے کے لیے تیار ہیں۔'' ظفری باتیں کرتے کرتے سوگیا۔ دلاور اس کا منہ دیکھتا رہ گیا۔ ظفری کو دو بجے سے پہلے نیند نہیں آتی تھی مگر دو بجتے ہی اس کی آنکھیں بند ہونے لگتیں اور وہ بیٹھے بیٹھے خراٹے لینے لگتا۔ دلاور نے مسکرا کر اسے دیکھا، بستر پر اسے سیدھا کیا اور خود دوسری طرف کروٹ لے کر لیٹ گیا۔ آج رات نیند آنی مشکل تھی، اسے صبح سویرا کو یونیورسٹی لے کر جانا تھا۔ وہاں سے پھر سویرا کو بازار جانا تھا۔ وہ وقت کا حساب لگانے لگا۔ دو ڈھائی گھنٹے کی ڈرائیو تو بن جاتی تھی۔ وہ گاڑی تھوڑی سست چلاتا تو تین گھنٹے بھی لگ سکتے تھے۔ ڈھائی تین گھنٹے بہت وقت تھا۔ وہ سوچنے لگا سویرا سے کیا باتیں کرے گا۔ سویرا کے بارے میں سوچنے کے ساتھ ساتھ وہ اس ''باز والی بات'' میں بھی الجھا ہوا تھا۔

مگر صبح اس کے تمام ارمانوں پر اوس پڑگئی۔ وہ صبح سے گاڑی چمکائے جارہا تھا، وہ اس سیٹ کو بار بار صاف کررہا تھا جہاں سویرا نے آکر بیٹھنا تھا۔ سویرا تو آئی مگر اس کے ساتھ پھپھو عالیہ بھی تھیں۔ سویرا نے بہت ہلکا میک اپ کررکھا تھا، یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ابھی تازہ تازہ کوئی گلاب کی کلی کھلی ہے۔ گاڑی میں بیٹھی تو ہر سو اس کی خوشبو بکھر گئی۔ دلاور نے بیک مرر پہلے سے سیٹ کررکھا تھا۔ سفر شروع ہوا۔ وہ بار بار کن انکھیوں سے اسے دیکھنے لگا۔ سویرا کے چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔ وہ کچھ خاموش تھی۔ سفر خاموشی میں کٹا۔ جو کچھ اس نے رات جاگ کر سوچ رکھا تھا، سب اس سے الٹ ہورہا تھا۔ ایک دو دفعہ اس نے خود بات کرنے کا سوچا مگر دونوں کی گمبھیر خاموشی دیکھ کر اس کی ہمت نہیں پڑی۔ اس سے پہلے وہ جب بھی حویلی سے کسی کو لے جاتا تھا تو بے تکان بولتا تھا۔ پھپھو عالیہ، سویرا، رمشا، بڑی آپا سب سے بے تکلفی سے بات چیت کرتا تھا بلکہ سب مستورات اس کی ڈرائیونگ سے زیادہ اس کی خوش اخلاقی اور خوش گفتاری سے خوش تھیں مگر آج کچھ گڑ بڑ تھی...... دونوں عورتوں کی گمبھیرتا کے پیچھے کچھ ناپسندیدہ حالات کی پرچھائیاں نظر آتی تھیں۔

یونیورسٹی آگئی تو پھپھو عالیہ اور سویرا اندر چلی گئیں۔ ان کی واپسی آدھے گھنٹے بعد ہوئی۔ دلاور نے اتر کر باری

باری دونوں دروازے کھولے۔ پہلے سویرا بیٹھی، بعد میں پھپھو عالیہ بیٹھیں مگر انہوں نے گاڑی کا دروازہ بند نہیں کیا۔ ایک لمحے کے لیے کچھ سوچا پھر گاڑی سے نیچے اترتے ہوئے بولیں۔ ''سویرا! یوں کرو تم اکیلی بازار ہو آؤ...... مجھے واپسی پر یہاں سے پک کر لینا۔'' سویرا نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلایا...... دروازہ بند ہوا اور گاڑی آگے بڑھ گئی۔

ڈھول کی تھاپ پر دھمال ڈالنے والا رنگیلا شخص دلاور کے وجود میں بھنگڑے ڈالنے لگا۔ اسے کانوں کے قریب ڈھول کی دھائیں دھائیں سنائی دینے لگی۔ سویرا اس کے ساتھ گاڑی میں اکیلی تھی۔

''سویرا! آج آپ کو اس طرح دیکھ کر میرا دل دکھی ہے۔'' دلاور ہمت کرتے ہوئے بولا۔

''تم کیوں دکھی ہو...... پریشان تو میں ہوں۔'' سویرا نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''دوست کو پریشان دیکھ کر دوست تو دکھی ہوگا۔''

''ہاں...... شاید......'' سویرا گاڑی کے شیشوں سے پار کہیں دور دیکھتے ہوئے بولی۔

''بڑے کہتے ہیں کہ شیئر کرنے سے پریشانی کم ہو جاتی ہے۔ بوجھل دھڑکنوں کو قرار آجاتا ہے۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو...... پریشانی کم ہو جاتی ہے...... مگر واہموں کا کوئی علاج نہیں ہے۔ یہ پل پل ڈستے ہیں۔'' سویرا نے عجیب سے دکھ بھرے لہجے میں کہا تو...... دلاور سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے آج سے پہلے سویرا کو یوں منتشر نہیں دیکھا تھا۔ اس نے ایک لمحے میں فیصلہ کیا اور شروع ہو گیا۔ ''سویرا بی بی...... دیکھیں...... (اس نے جان بوجھ کر بی بی کا اضافہ کیا تھا)

''وہم کا علاج لقمان حکیم کے پاس بھی نہیں تھا بلکہ اس کے دادا کے پڑ دادا کے پاس بھی نہیں تھا۔ یہ ایک منفی جذبہ ہے جو بدگمانی سے جنم لیتا ہے۔ زندگی بہت مختصر ہے، اتنی مختصر جیسے ایک سانس ابھی ہے...... دوسرے پل میں نہیں۔ اتنی چھوٹی زندگی کے لیے ...... اتنی فکر...... اتنی پریشانی...... کیوں......؟ ہمیشہ مثبت سوچو...... ہمیشہ...... اچھا سوچو......''

بیک ویو مرر میں دلاور نے دیکھا کہ سویرا کے خزاں رسیدہ چہرے پر دھیمی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی ہے۔

دلاور کے دل میں خوشی ناچ اٹھی۔ وہ بولا۔ ''اچھا آپ ساری باتیں چھوڑیں ...... مجھے صرف ایک بات کا جواب دیں۔''

''ہاں پوچھو ...... ؟'' سویرا نے دوپٹا سر پر سیدھا کرتے ہوئے کہا۔

''اتنی دلکش لڑکی...... واہموں...... اور اندیشوں سے اس قدر پریشان کیسے ہوسکتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں تو دنیا کے سب سے خوبصورت رنگ اترتے ہیں۔ ان پیارے رنگوں سے دکھ کا رنگ میل نہیں کھاتا...... اس بدصورت رنگ کو اپنی آنکھوں سے ہٹا دیجیے۔''

سویرا کے چہرے پر شفق کے رنگ بکھر گئے۔ چہرہ شرم سے گلنار ہو گیا۔ صنف نازک کو خود کی تعریف اچھی لگتی ہے۔ یہ ایک فطری عمل ہے اور دلاور نے یہ کام ایسے وقت میں کیا تھا جب سویرا غمگین تھی۔ تیر نشانے پر بیٹھا تھا۔ سویرا کی پریشانی جو کوئی بھی تھی، وہ ایک لمحہ اس پریشانی کو کافور کرنے میں کامیاب ہوا تھا۔ سویرا اپنی اصل حالت میں واپس لوٹ آئی۔

وہ واقعی ایک من موجی لڑکی تھی۔ وہ بازار گئی۔ اس نے بھرپور شاپنگ کی۔ دلاور کے لیے خوبصورت سی گھڑی خریدی۔ واپس آکر خود اپنے ہاتھ سے اس کی کلائی پر باندھی اور بولی۔ ''شکریہ دلاور...... تم ایک بہترین دوست ہو......''

''مگر ...... شاید ...... یہ بہت قیمتی گھڑی ہے۔ میں اسے......''

سویرا نے اسے روک دیا۔ ''خاموش رہو...... یہ تم سے زیادہ قیمتی نہیں ہے...... YOU MAKE MY DAY''

واپسی پر دلاور تحفے کے بوجھ تلے دبا رہا۔ یونیورسٹی پہنچنے سے تھوڑی دیر پہلے سویرا نے خاموشی توڑی، شوخی سے بولی۔ ''اگر تم مجھے لاہور نہیں لے کر گئے تو میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔ میں تمہارا گھر تمہاری جنم بھومی دیکھنا چاہتی ہوں۔''

''میں تفصیل بتاؤں گا تو آپ ارادہ ترک کر دیں گی۔'' دلاور بھی شوخی کے موڈ میں آگیا۔

''ایسی کیا بات ہے؟'' وہ بچوں کی طرح منہ پھلا کر ایک ادا سے بولی۔

''جس گلی سے آپ کو گزرنا پڑے گا، وہاں سے دو انسان اکٹھے نہیں گزر سکتے۔''

''تو کیا ہوا...... میں تمہارے پیچھے چل پڑوں گی۔ تم مجھ سے آگے چلنا......''

''اس گلی میں اندھیرا اور سیلن زدہ بو ہوگی۔ ایک سائڈ پر گندی نالی ہوگی جہاں اکثر بچے رفع حاجت کرتے ہوئے دکھائی دیں گے۔ یہ نظارہ سہہ پائیں گی آپ......؟'' دلاور کی ہنسی چھوٹ گئی...... سویرا نے ایک

جھرجھری سی لی......

دلاور، سویرا کو اچھی طرح جان گیا تھا۔ وہ کسی کے ہاتھ کا کٹا پھل نہیں کھاتی تھی۔ جس گلاس کو کسی نے چھوا ہوتا، وہ اس میں پانی نہیں پیتی تھی۔ پھپو عالیہ اسے برہمن کہتی تھیں مگر وہ عادت سے مجبور تھی۔ مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ کسی نے اس کی بے خبری میں اس کے ہونٹوں کو بہت دیر تک چھوا ہے۔

یونیورسٹی کا موڑ آنے والا تھا جب سویرا نے پیچھے سے ہاتھ بڑھا کر اس کا بایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بولی۔ ''تم نے پوچھا ہی نہیں کہ میں نے تمہیں بہترین دوست کیوں کہا؟''

دلاور کو خاموش پا کر بولی۔ ''اس لیے کہ تم نے میرے کہنے پر حویلی سے جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور اتنا بڑا فیصلہ ایک بہترین دوست ہی کر سکتا ہے۔''

دلاور کی زندگی نے یکا یک ایک بہت بڑا موڑ لیا تھا۔ یہ موڑ اتنا بڑا تھا کہ دلاور خود بھی چکرا کر رہ گیا تھا۔ اس نے پنڈی چھوڑا تھا، لاہور کو خیرآباد کہا تھا۔ کراچی سے بھاگ نکلا تھا مگر روہی کی فضاؤں میں کوئی سحر تھا۔ چولستانی ہواؤں کے جھونکوں میں ایک غیر مرئی گرفت تھی جن سے آزادی ناممکن تھی۔

وہ پورا کا پورا سویرا کے عشق میں بھیگ چکا تھا۔ بات دور نکل چکی تھی۔ واپسی ناممکن تھی وہ سوچنے لگا، جس شدت سے وہ سویرا کو چاہنے لگا تھا، کیا سویرا کے دل میں بھی، اس کے لیے کوئی جذبہ موجود ہے؟ جواب ''ہاں'' میں آیا۔ سویرا نے کچھ خوبصورت اشارے دیے تھے۔ اس نے کہا تھا۔ ''دلاور! تمہیں حویلی میں رہنا ہے۔ میں یہی بات تم سے کہنے کے لیے آئی تھی۔'' پھر اس نے کہا تھا۔ ''دوست کا دل ٹوٹ جائے گا۔ ایسے دوست کا جو خود کو تمہارا قرض دار سمجھتا ہے۔ اور رہتی زندگی تک سمجھتا رہے گا۔'' اس نے ایسا کیوں کہا تھا؟

اس کے دل میں کیا نہاں تھا۔ آج اس نے دلاور کو ایک خوبصورت سی گھڑی تحفے میں دی تھی اور کہا تھا۔ ''تم بہترین دوست ہو......'' اس نے دلاور کو اپنا بہترین دوست کیوں کہا تھا؟ کیا اس کے دل کا موسم تبدیل ہو چکا تھا؟ اس کے اور شاہ زمان کے درمیان کوئی دراڑ پیدا ہو چکی تھی؟ عورت کی دوستی سے غلط مطلب تو مرد لیتے ہی ہیں۔ کہیں وہ بھی تو غلط مطلب نہیں لے رہا تھا؟

ساری رات وہ جاگتا رہا۔ باتوں کی کڑیاں ملاتا رہا...... صبح تک اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ لکھنا جانتا تھا۔ جو باتیں زبان بیان نہیں کر سکتی تھی، اس نے خط میں لکھ دیں۔ کاغذ تہ کر کے جیب میں رکھ لیا۔ دل میں فیصلہ کیا کہ جس دن سویرا کا موڈ سب سے اچھا ہوگا۔ وہ سارے اندیشے بالائے طاق رکھ کر اس دن وہ کاغذ کا ٹکڑا سویرا کو تھما دے گا۔ اس کے بعد جو بھی ہو دیکھا جائے گا......

مگر اگلے آٹھ دس دن میں بھی وہ موقع پیدا نہ ہو سکا۔ پانچ دن کے لیے اسے شاہ زمان کے ساتھ رحیم یار خان جانا پڑا...... وہی قیمتی باز والا معاملہ تھا...... شاہ زمان کی معاملہ فہمی اور سمجھداری سے یہ مسئلہ ختم ہونے کے قریب تھا۔ چھٹے دن یہ لوگ حویلی واپس آ گئے...... تہ کیا ہوا کاغذ اس کی جیب میں ہی تھا۔ وہ دن میں کئی دفعہ ٹٹول کر اس کی موجودگی کا اندازہ لگاتا تھا۔ حویلی پہنچ کر اسے مایوسی ہوئی۔ اس نے رحیم یار خان میں پانچ دن کانٹوں پر بسر کیے تھے۔ اب حویلی پہنچ کر معلوم ہوا کہ سویرا رمشا کے ساتھ فورٹ عباس رمشا کی کزن کے گھر گئی ہوئی ہے۔ سویرا کے بغیر اسے حویلی سونی سونی لگی...... ایک دم خالی اور بکواس۔ سویرا کی واپسی چوتھے دن ہوئی...... مگر اگلے تین دن بھی سویرا کی شکل نظر نہیں آئی۔ دلاور کے حلق میں نمکین آنسوؤں کا ذائقہ گھل گیا۔ پہلی دفعہ اسے سویرا پر غصہ آیا...... وہ سرتاپا انتظار بنا بیٹھا تھا اور سویرا کو جیسے کوئی پروا ہی نہیں تھی۔ وہ رات اس نے آنکھوں میں کاٹ دی...... اگلا سارا دن بھی گزر گیا مگر سویرا نہیں آئی۔ انتظار کی تاریکی طویل ہوتی چلی گئی۔ دیدار کا اجالا نہیں پھیلا۔ اس کا وجود مسلسل انتظار کی تپش سے چٹخنے لگا۔ رگ رگ میں آگ سی بھرنے لگی...... ایک دو دفعہ اس کا دل چاہا خط کو نکالے اور اس کے ٹکڑے کر کے پھینک دے۔

وہ ایک دھندلی یا شاید سیاہ دوپہر تھی۔ صحرا کے جنوب کی سمت سے دور کچھ بگولے سے اٹھے تھے جنہوں نے سورج کی روشنی کا راستہ روک لیا تھا۔ یہ صحرائی بگولے حویلی سے کئی میل دور دکھائی دے رہے تھے۔ یہ بگولے اوپر ہی اوپر اٹھ رہے تھے جیسے سورج کو چھونا چاہتے ہوں۔

ظفری کمرے سے نکل کر حویلی کے جنوب کی طرف بھاگ گیا تھا۔ کمرے سے نکلتے وقت اس نے دلاور سے کہا تھا۔ ''مجھے لگتا ہے...... ابھی تھوڑی دیر بعد طوفان آنے والا ہے...... میں سیبوں والی حویلی کے دروازے بند کر آؤں۔'' سیبوں والی حویلی احاطے کے اندر ہی ایک طرف واقع تھی۔

ظفری کو گئے ابھی تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ دروازہ کھلا

اور کوئی اندر آ گیا......

دلاور کا کمرا روشنی سے جگمگا اٹھا۔ وہ سویرا تھی۔ ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ سویرا کا دوپٹا سر سے اتر کر اس کے شانوں پر پھیل گیا۔ نسواری زلفیں منتشر ہوئیں تو دلاور کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ بے ترتیب کھلے بالوں نے اس کے حسن کو کئی گنا زیادہ کر دیا تھا۔ وہ بال سمیٹ رہی تھی، سرکش ہوا شرارت کے موڈ میں تھی۔ سویرا نے شولڈر بیگ لٹکا رکھا تھا۔ یوں لگتا تھا وہ ابھی کسی کے ساتھ آئی ہے۔ پھر اس بات کی تصدیق بھی ہو گئی۔ اس نے دلاور کو بتایا کہ وہ ابھی ابھی شاہ زمان اور رمشا کے ساتھ بازار سے لوٹی ہے۔ شاہ زمان نے ایک مہنگی دکان سے سینڈوچ خریدے...... رمشا اور شاہ زمان نے تو اپنے حصے کے کھا لیے۔ اس نے اپنا سینڈوچ بچا لیا پھر وہ دلاور کی طرف سیدھی ہوئی اور بولی۔ ''بوجھو...... میں نے سینڈوچ کیوں نہیں کھایا......''

دلاور کے وجود میں تو ہر طرف آتش بازی چھوٹ رہی تھی مگر اس نے اپنے چہرے پر خفگی کا پہرا بٹھا لیا اور سویرا کے سوال پر کچھ نہ بولا۔

سویرا کو کچھ گڑبڑ کا احساس ہوا۔ وہ تھوڑا آگے ہوئی۔ دلاور کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولی۔ ''کیا بات ہے...... کوئی مسئلہ ہے؟''

دلاور نے نفی میں سر ہلا دیا۔ اس کے وجود میں ایک طوفان برپا تھا۔ اس نے پورے پندرہ دن سویرا کا انتظار کیا تھا۔ اس نے ایک ایک سیکنڈ میں اسے سو سو دفعہ یاد کیا تھا۔ اس کے بس میں ہوتا تو آگے بڑھ کر سویرا کو گلے لگا لیتا...... تب تک اسے چومتا چلا جاتا جب تک انتظار کی کڑھن آنکھوں کے رستے بہہ نہ جاتی۔

سویرا کمرے میں بہت خوش خوش داخل ہوئی تھی مگر دلاور کو یوں دیکھ کر بجھ سی گئی تھی۔ سویرا کی ایسی حالت دیکھ کر دلاور کو فتح مندی کا احساس ہونا چاہیے تھا مگر اس کا دل غم سے بھر گیا۔ حلق میں پھندا سا لگ گیا۔

''مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہے۔ اگر ایسا انجانے میں بھی ہوا ہے تو پلیز مجھے معاف کر دو۔'' سویرا نے بڑے دکھی لہجے میں کہا تو دلاور کا سینہ شق ہو گیا۔ جذبات کی شدت سے اس کی آنکھوں میں وہی نمی اُمڈ آئی جو تالاب کے پاس سویرا کو بچانے کے بعد اس کی آنکھوں میں در آئی تھی۔

وہ سویرا کو پریشان نہیں دیکھ سکتا تھا، گلوگیر لہجے میں بولا۔ ''سویرا! پلیز مجھے معاف کر دیں۔ مجھے آپ کے ساتھ ایسا برتاؤ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اصل...... میں......''

اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ ''اصل میں کیا......؟'' آنکھوں میں ہلکی سی شوخی کی چمک تھی۔

''اصل میں...... میں آپ سے ناراض تھا۔ اتنے دن آپ کی شکل نہیں دیکھ سکا اسی لیے دل تھوڑا سا باغی ہو گیا تھا اور پھر آپ کو بھی تو کوئی خیال نہیں آیا۔'' لہجہ دھیما اور شکوہ کناں تھا۔

''اب تو میں آ گئی ہوں نا...... اب خوش ہو جاؤ...... میرے پاس تمہارے لیے ایک سرپرائز ہے۔'' وہ کہنا چاہتا تھا کہ اس کے پاس بھی سویرا کے لیے ایک چیز ہے جو وہ پچھلے چودہ پندرہ دن سے جیب میں ڈالے پھر رہا ہے مگر وہ اتنی ہمت اکٹھی نہ کر پایا۔

سویرا نے شولڈر بیگ سے سینڈوچ نکال کے دلاور کی طرف بڑھایا۔ سینڈوچ اس نے لے لیا اور بولا۔ ''آپ نے نہیں کھایا۔''

''نہیں...... تم کھاؤ......'' اس نے کہا اور شولڈر بیگ کی سائڈ والی زپ کھول کے کچھ ڈھونڈنے لگی۔ بالوں کی ایک سرکش لٹ کو کان کے پیچھے اڑستے ہوئے بولی۔ ''دلاور! تمہیں پتا ہے میں آج بہت خوش ہوں۔ اتنی جتنی میں کبھی آج سے پہلے نہیں تھی۔'' دلاور کا دل بری طرح دھڑک اٹھا۔ غیر ارادی طور پر اس کا ہاتھ جیب میں پڑے کاغذ کے ٹکڑے کو ٹٹولنے لگا۔ وہ کچھ بولنا چاہتا تھا۔ وہ اپنے دل کی بات کہہ دینا چاہتا تھا۔ چاہے وہ کتنی بھی غلط تھی، چاہے وہ کتنی بھی انوکھی تھی۔ ''تم نے کہا تھا...... ہمیشہ مثبت سوچنا چاہیے۔ میں نے تمہاری بات پر عمل کیا دلاور! اور یقین جانو، مسئلہ حل ہو گیا۔ تھوڑے دن پہلے جس وہم نے میری زندگی اجیرن کر دی تھی، وہ ختم ہو گیا۔ میں بے چین کر دینے والے اندیشوں سے نکل آئی۔''

وہ پتا نہیں کن واہموں اور کیسے اندیشوں کی بات کر رہی تھی۔ دلاور کا دل تو بس کاغذ کے اس ٹکڑے پر اٹکا ہوا تھا جو اس کی جیب میں تھا۔ سویرا نے ایک دیدہ زیب کارڈ نکال کر دلاور کی طرف بڑھایا اور بولی۔ ''بوجھو...... یہ کیا ہے؟'' دلاور نے نفی میں سر ہلایا...... تو وہ بے حد شوخ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے بولی۔ ''یہ شادی کا کارڈ ہے......''

''کس کی شادی کا......'' وہ ڈبے میں پیک سینڈوچ کو سائڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولا۔

''کس کی شادی کا ہو سکتا ہے......؟'' آنکھوں کی چمک مزید بڑھ گئی تھی۔

"اب میں نجومی تو ہوں نہیں...... آپ ہی بتا دیجیے۔"

"نہیں، تم خود ہی پڑھ لو......" اس نے کارڈ دلاور کے ہاتھ میں تھما دیا۔ دلاور نے کارڈ پڑھا۔ زمین و آسمان اس کی نگاہوں میں گھوم گئے۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا۔ دروازہ اتنی زور سے بجا کہ یوں محسوس ہوا چوکھٹ سمیت نیچے گر پڑا ہو۔ ظفری نے ٹھیک ہی کہا تھا، طوفان آرہا ہے۔

سویرا سہم گئی، جلدی سے بولی۔ "مجھے لگتا ہے تیز آندھی آرہی ہے۔ میں چلتی ہوں۔" وہ مڑی پھر رک کر بولی۔

"میرا سرپرائز کیسا لگا؟" جھوٹی مسکراہٹ لبوں پر سجانا کس قدر مشکل ہوتا ہے، یہ اس روز دلاور کو معلوم ہوا۔

سویرا چلی گئی۔ اس کی خوشبو بھی اس کے ساتھ ہی کمرے سے رخصت ہوگئی۔ سویرا کی شادی کا کارڈ اس کے ہاتھوں میں تھا اور آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تھی۔

پندرہ دن بعد اس کی شادی شاہ زمان کے ساتھ ہو رہی تھی۔ کراچی میں سمندر کے کنارے بیٹھ کر وہ اکثر سوچا کرتا تھا، خدا نے اتنا زیادہ پانی ایک جگہ کیسے اکٹھا کر دیا ہے مگر آج اس کی آنکھوں میں شاید اتنا پانی خدا نے اکٹھا کر دیا تھا۔ ریت کے طوفان نے چوڈیرو حویلی، اس سے باہر روہی اور اس سے آگے منڈ بھیرد کے ریتیلے بازاروں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ہر طرف اندھیرا چھا گیا تھا۔ کھڑکیوں کے پٹ دھڑا دھڑ بجنے لگے تھے۔ دلاور کی آنکھوں میں ویرانوں کی دھول تھی۔ اس کے لیے یہ صدمہ ناقابلِ برداشت تھا۔

اس رات اسے بخار ہوگیا۔ باہر ریتیلی آندھی کے جھکڑ چلتے رہے۔ وہ اپنے بستر پر پڑا بخار میں پھنکتا رہا۔ لاہور میں لوہاری سے آگے اور شاہ عالمی سے پہلے ایک تنگ گلی والا بازار بائیں طرف اوپر کو چڑھتا تھا۔ اس بازار کے اختتام پر تنگ گلیوں کا ایک گورکھ دھندا سا تھا۔ انہی گلیوں میں سے ایک گلی میں اس کا سارا بچپن گزرا تھا۔ نیم تاریک گلی کا سیلن زدہ "تھڑا" اس کی من پسند جگہ تھی۔

جس عورت کے پاس وہ رہتا تھا، وہ اس کی ماں نہیں تھی۔ چاچی...... ماسی...... نانی...... دادی بھی نہیں تھی۔ پتا نہیں کون عورت تھی وہ جس نے اسے پالا تھا۔ جب وہ بارہ سال کا ہوا تو وہ عورت مرگئی۔ آدھے سفید آدھے مہندی لگے بالوں والی عورت کی میت پر بیٹھ کے وہ بہت دیر تک روتا رہا تھا۔ اس کے بعد وہ نہیں رویا۔ رونا اسے اچھا نہیں لگتا تھا مگر آج وہ رونا دوبارہ لوٹ آیا تھا۔ آج ایک جیتی جاگتی عورت نے اسے رونے پہ مجبور کر دیا تھا۔ وجہ صاف تھی۔ یہ دلاور کی زندگی میں داخل ہونے والی دوسری عورت تھی۔

اگلے تین دن بھی اس کا بخار نہ اترا۔ ظفری اسے دوا لاکر دے رہا تھا اور مسلسل اس کی تیمارداری بھی کر رہا تھا۔ ظفری دلاور کے کہنے پر ہی ملتانی کو منڈ بھیرو سے بلا لایا تھا...... ملتانی کے آنے سے ظفری کی ڈیوٹی کم ہوگئی۔ ملتانی، دلاور کی خدمت میں جت گیا۔

دلاور کی حالت سدھرنے لگی۔ بخار کم ہونے لگا۔ یہاں ہر گزرتے دن کے ساتھ دلاور ٹھیک ہو رہا تھا۔ دوسری طرف ہر گزرتے دن کے ساتھ حویلی کی سجاوٹ میں اضافہ ہوتا چلا جارہا تھا۔ برقی قمقمے لگ رہے تھے۔ رنگ برنگی لائٹوں اور مصنوعی پھولوں سے حویلی کو لاد دیا گیا تھا۔ ولیمے کے لیے بہت بڑے دسترخوان کا انتظام کیا جارہا تھا۔ دو ہزار کے قریب مہمانوں کی لسٹ تیار کی گئی تھی مگر سٹنگ اور کھانے کا انتظام اس سے بھی زیادہ کا رکھا جارہا تھا......

شادی میں چار دن باقی رہ گئے تھے۔ ظفری کی زبانی اسے معلوم ہوا تھا کہ سویرا...... پھپھو عالیہ...... اور رمشا...... بہاولپور میں رمشا کے خالو کے گھر شفٹ ہوگئے ہیں۔ اب برات چوڈیرو حویلی سے بڑی آن بان سے نکل کر رمشا کے خالو کے گھر جانی تھی۔

شادی سے ایک دن پہلے دلاور ملتانی سے بولا۔

"چل یار...... یہاں سے کہیں دور چلے جائیں...... اب میرا دل یہاں پر نہیں لگے گا۔"

"کہاں جائیں گے ہم؟"

"کہیں بھی مگر یہاں سے دور...... جہاں بہت ساری ہوا ہو...... میں...... میں کھل کے سانس لینا چاہتا ہوں...... یار...... یہاں کی ہوا ٹھیک نہیں ہے...... اس ہوا میں گندھک ملی ہوئی ہے۔ میرا سارا سینہ جھلس گیا ہے۔ میرا سارا حلق چھل گیا ہے......" وہ عجیب لہجے میں بولا۔

دلاور کا درد بھرا لہجہ محسوس کر کے ملتانی چونک گیا۔ غور سے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "اوئے لالے! تیرے چہرے پر تو عشق کا پینٹ ہوا، ہوا ہے۔ مجھے ٹھیک سے بتا بات کیا ہے؟" ملتانی دلاور کا رازدان تھا۔ اس کا اصرار بڑھا تو دلاور نے اپنی کہانی کے خاص خاص حصے سنا ڈالے۔ ملتانی سر پکڑ کر بیٹھ گیا، بولا۔

"یار...... یہ سب بہت برا ہوا" ایک لمحے کے لیے اس نے اپنے سر کو کھجایا اور پینترا بدل کر بولا۔ "اب میں

تجھے یہاں زیادہ دیر رکنے نہیں دوں گا...... صبح ہوتے ہی ہم واپس منڈ بھیرو چلیں گے...... پھر اس سے اگلے دن ہم دونوں پنڈی چلے جائیں گے۔ ایک کام کا ٹھیکا ملا ہے مجھے، چار پانچ دن بعد جانا تھا مگر اب پرسوں ہی چلیں گے......"

ملتانی بڑے ٹھوس لہجے میں کہہ رہا تھا مگر دلاور جانتا تھا...... اب رہائی ممکن نہیں تھی۔ سویرا تو پرسوں دلہن بن کر اس گھر میں آرہی تھی، اپنی تمام تر کوششوں اور ارادوں کے باوجود وہ یہاں سے کہیں نہیں جاسکتا تھا۔ عشق کی نادیدہ ڈور نے اس کے ہاتھ باندھ کر اس کے پورے وجود کو جکڑ دیا تھا۔

شاید یہ خود اذیتی تھی۔ وہ سویرا کی شادی اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

شادی نہایت دھوم دھام سے ہوئی...... یہ چوڈیرو گاؤں کے "بڑے سائیں" کی شادی تھی۔ جتنی بھی خوشی منائی جاتی کم تھی۔ طوفان آتے ہیں، تباہی مچاتے ہیں اور گزر جاتے ہیں۔ شادی کا طوفان بھی ہر چیز کو نیست و نابود کر کے گزر گیا...... شادی کے بعد تین چار دن دلاور شراب کے نشے میں دھت اپنے بستر پر پڑا رہا۔ شراب کا حصول اس حویلی میں کون سا مشکل کام تھا۔

اس نے کبھی کوئی نشہ نہیں کیا تھا۔ صرف سگریٹ پیتا تھا۔ اس دن کے بعد اس نے نشہ شروع کر دیا۔ اس "بیماری" کو خود سے لپیٹ لیا جو اسے سویرا کی یاد سے نجات دلاسکتی تھی۔ شادی کے پانچویں دن ملتانی سومنت ساجت کے باوجود واپس لوٹ گیا۔ دلاور اس کے ساتھ نہیں گیا۔ وہ ابھی اور اذیت سہنا چاہتا تھا۔

یہ شادی کے دو ہفتے بعد کی بات تھی۔ صبح دس گیارہ بجے کے قریب سویرا ٹہلتی ٹہلتی دلاور کے کمرے تک آگئی تھی۔ اس نے بڑی کامدار شال لے رکھی تھی۔ اب وہ چوڈیرو حویلی کی نئی بہو تھی...... اس کی چال میں ایک شاہانہ تمکنت آگئی تھی۔ وہ دلاور سے سخت خفا تھی۔ وہ شادی میں شریک نہیں ہوا تھا۔ وقتاً فوقتاً سویرا کو دلاور کی بیماری کی خبریں ملتی رہتی تھیں۔ وہ اس کا احوال جاننے کے لیے ہی ٹہلتی ہوئی اس طرف آنکلی تھی۔

کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ دلاور اندر موجود نہیں تھا۔ ظفری بھی کسی کام سے نکلا ہوا تھا۔ سویرا اندر داخل ہوگئی۔ سارا کمرا بے ترتیب اور چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔ ایک لمحہ اس کے دل میں خیال آیا کہ دلاور والی سائڈ کی چیزیں سنبھال دے مگر دوسرے لمحے ہی اس نے اس خیال کو رد کر دیا۔

الماری کھلی ہوئی تھی، کپڑے بے ترتیب پڑے ہوئے تھے۔ اس نے ایک ہینگر کو اٹھایا تو اس کے نیچے سے شراب کی بوتل برآمد ہوئی۔ اس کو جھٹکا لگا۔ اس نے فوراً الماری بند کر دی۔ الماری کے ساتھ ہی ایک ادھ کھلا اٹیچی کیس پڑا تھا۔ اس نے وہ کھولا، اس میں بہت سی چیزیں بے ترتیبی سے پڑی ہوئی تھیں۔ ان بے ترتیب چیزوں میں سے اس نے لکڑی کا ایک خوبصورت ڈبا اٹھالیا۔ اس نے آہستگی سے اسے کھولا تو حیران رہ گئی۔ سب سے اوپر ایک رومال پڑا تھا۔ یہ وہی رومال تھا جو سویرا نے ایک بار دلاور کو آنسو پونچھنے کے لیے دیا تھا۔ رومال کے نیچے وہ گھڑی تھی جو سویرا نے اسے تحفے کے طور پر دی تھی۔ اس سے نیچے ٹوٹی چوڑیوں کے کچھ ٹکڑے تھے۔ سویرا دیکھ کے دنگ رہ گئی۔ یہ چوڑیاں اسی کی تھیں۔ پر یہاں کیسے پہنچی تھیں۔ چوڑیوں کے نیچے ایک کاغذ تہ کیا ہوا پڑا تھا۔ سویرا نے وہ کاغذ کھولا۔ خوش خط الفاظ میں نظم لکھی تھی۔ تم کب تک مجھ کو بھولوگے...... اس نے ساری نظم پڑھ ڈالی۔ یہ آزاد نظم اس کی تخلیق کردہ تھی۔ سویرا نے پلنگ کا پایہ تھام لیا اور وہیں بیٹھ گئی۔ اس کا ذہن چکرا رہا تھا۔ آنکھوں کے آگے تارے ناچ رہے تھے۔ آج اس پر ایک عجیب انکشاف ہوا تھا۔

☆☆☆

دلاور نہ زمین پر تھا نہ آسمانوں میں۔ اس کا وجود جیسے ہواؤں میں معلق تھا۔ ظفری اکثر اسے اپنی حالت سدھارنے کا کہتا۔ مگر کسی کے کہنے سے اس کی حالت کہاں سنبھلنے والی تھی۔ ظفری یہی سمجھتا تھا کہ دلاور گھریلو طور پر بے حد پریشان ہے۔ دلاور نے اسے اپنے گھربار کے بارے میں دردناک من گھڑت کہانی سنا رکھی تھی اور یہ جھوٹ گھڑنے کا مشورہ دلاور کو ملتانی نے دیا تھا۔

دلاور اس وقت سیبوں والے باغ کی طرف چلا جارہا تھا۔ "سیبوں والا باغ" اصل میں وسیع و عریض چوڈیرو حویلی کا جنوب مشرقی حصہ تھا۔ یہاں کوئٹہ کا سب سے اچھا سیب لاکر پیک کیا جاتا تھا اور پھر مڈل ایسٹ میں ایکسپورٹ کیا جاتا تھا۔ دلاور کی حالت ابتر تھی۔ اس کے بال الجھے، شیو بڑھی ہوئی تھی۔ شکل سے مہینوں کا بیمار نظر آتا تھا۔ ظفری سیبوں والے باغ کا نگران مقرر تھا۔ وہ اس وقت وہاں موجود تھا۔ سیبوں کی پیٹیاں کنٹینر میں لوڈ کروا رہا تھا۔ سیبوں والے باغ میں آنے کا مشورہ ظفری نے ہی اسے دیا تھا۔ ظفری ہمدرد اور انسان دوست آدمی تھا۔ وہ

چاہتا تھا کہ دلاور اپنے کمرے میں پڑا رہنے کے بجائے چلے پھرے...... حویلی میں گھومے، خود کو مصروف رکھنے کی کوشش کرے جس سے اس کی موجودہ خراب طبیعت درست ہو۔ دلاور کو باغ میں آتا دیکھ کر ظلفری کے چہرے پر مسکراہٹ ابھری پھر گہری ہوگئی۔ وہ کنٹینر سے چھلانگ لگا کر اتر آیا بولا۔ ''یارا! بہت اچھا کیا تم ادھر آگئے۔'' وہ ہاتھ میں پکڑا ایک سیب چمکا کر دلاور کی طرف اچھالتے ہوئے بولا۔ ''یارا! خود کو سنبھالو...... نہاؤ...... شیو بناؤ...... اچھے کپڑے پہنو۔ بخار تو کب کا رخصت ہوگیا۔ تم اب اپنے ذہن سے پریشانی کو بھی رخصت کردو۔''

ظلفری کی بات پر اس نے پھیکی سی مسکراہٹ پر اکتفا کیا۔ وہ دل کھول کے ہنسنا چاہتا تھا مگر اس کا دل مر گیا تھا۔ کوئی چیز کوئی منظر، کوئی بات بھی تو اسے اچھی نہیں لگتی تھی...... آدھے سفید آدھے مہندی لگے بالوں والی عورت کے مرنے کے بعد بھی اس کی حالت کافی دن ایسی ہی رہی تھی۔ پھر تھوڑے دنوں بعد وہ بہتر ہوگیا تھا۔ کیا اب بھی ایسا ہوگا؟ تھوڑے دن...... کچھ ہفتے...... گزر جانے کے بعد وہ زندگی کی طرف لوٹ آئے گا؟ جواب نفی میں آیا...... گھاؤ پہلے زخم سے زیادہ گہرا اور کاری تھا۔

ظلفری...... سیبوں والا کنٹینر چوڈیرو کی حدود سے باہر نکلوانے کے لیے چلا گیا اور دلاور کو تھوڑی دیر بعد واپس آنے کا کہہ گیا۔

باغ وسیع رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔ زمین پر تھوڑا اونچا تھڑا سا تھا جس پر فاصلے سے لوہے کے پائپ لگے تھے اور ان پائپوں کے اوپر ٹین کی چادریں ڈالی ہوئی تھیں۔ ٹینی چھت کے نیچے جا بجا پرالی بکھری ہوئی تھی۔ دھلے دھلائے سیب صاف کر کے خوبصورت کریٹوں میں پیک کیے جارہے تھے۔ دھلے سیب دیکھ کر دلاور کے دل میں امید سی جاگی۔ وہ ٹین کی چادروں والی چھت سے پرے ہٹتا چلا گیا۔ وہ درختوں سے گھرے اس حجرے کی عقبی جانب بڑھ گیا جہاں سے دھلے ہوئے سیب لائے جارہے تھے۔ دلاور کو من کی مراد مل گئی۔ حجرے کی بیک سائڈ پر پانی کا تالاب موجود تھا۔ ہیوی موٹر کی آواز گونج رہی تھی اور تقریباً پانچ انچ قطر کے پائپ سے جھاگ اڑاتا پانی تالاب میں گر رہا تھا۔ یہ حوض نما تالاب کم و بیش تین سو مربع فٹ کا تھا۔ تالاب میں سے پانی نکال نکال کر سائڈ پر بنی ہوئی حودیوں میں سیب دھوئے جاتے تھے مگر اب نہیں دھوئے جارہے تھے۔ دلاور نے تالاب کے قریب بیٹھے ایک ملازم سے اجازت لی اور

کپڑوں سمیت تالاب میں اتر گیا...... وہ گہرے پانی کی مچھلی تھا۔ گہرے پانی کی مچھلی جو لاکھوں ٹن پانی کے دباؤ میں بھی زندہ رہتی ہے جس دباؤ پر چیزیں پھٹ کر ریزہ ریزہ ہو جاتی ہیں، وہ سکون سے تیرتی ہے۔ دباؤ کی زیادتی اس کی زندگی...... دباؤ کی کمی اس کی موت ہوتی ہے۔ وہ سینے سے سانس نکال کر تالاب کے پیندے میں جا بیٹھا۔ تالاب دس فٹ کے قریب گہرا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ یہاں دنیا کی مصیبتوں، اس کے رنج و غم سے دور ہو گیا ہو۔ ہلکی ہلکی سرگوشیوں جیسی آوازیں تھیں جو اس کی سماعت سے ٹکراتی تھیں...... آدھے سفید آدھے مہندی لگے بالوں والی عورت کے گھر اکثر وہی آدمی آیا کرتا تھا۔ آہستہ آہستہ دلاور کو اندازہ ہوا تھا کہ وہ اس کا گھر والا ہے۔ اس کا نام سرفو تھا، مگر سب اسے سرفو دم گھٹ کہتے تھے۔ وہ راوی کے پانیوں کا کینجوا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ وہ بغیر سانس لیے پندرہ منٹ تک پانی کے اندر رہ سکتا ہے۔ وہ جب بھی اس گھر میں آتا دلاور کو اپنے ساتھ دریائے راوی لے جاتا۔ خود پانی میں اترتا، اسے بھی غوطہ لگانے پر مجبور کرتا۔ اس وقت دلاور کی عمر سات آٹھ سال ہوگی (دلاور کا نام...... دلاور بھی اسی نے رکھا تھا) پانی کے اندر شروع شروع میں دلاور کی حالت بری ہو جاتی۔ وہ کھانستا، غوطے کھاتا، پانی ناک میں داخل ہو کر اس کا تالو چھیل دیتا، اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے مگر سرفو دم گھٹ کو اس پر رحم نہ آتا۔ ان لمحات میں سرفو دم گھٹ، دلاور کو دنیا کا سب سے ظالم انسان لگتا مگر اس سختی کے پیچھے ایک تربیت چھپی ہوئی تھی...... پتا نہیں کیوں سرفو دم گھٹ جاتے جاتے اپنا فن دلاور میں منتقل کر گیا۔ سخت، جان لیوا تربیت میں دلاور کو پتا بھی نہ چلا کہ وہ کب گہرے پانی کی مچھلی بن گیا ہے۔ سرفو دم گھٹ کی تربیت قریباً تین سال تک جاری رہی۔ دلاور کو پالنے والی عورت کے مرنے کے ساتھ ہی یہ سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔ وہ عورت دنیا سے کیا گئی، سرفو دم گھٹ بھی جیسے دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس کے بعد دلاور نے اسے کبھی نہیں دیکھا مگر تب تک ایک نایاب ہنر دلاور میں منتقل ہو چکا تھا۔

وہ جب حد سے زیادہ پریشان ہوا کرتا تو راوی کے پانی میں کود جاتا۔ کنارے پر کسی جڑ کو پکڑ کر تین چار منٹ تک زیرِ آب رہتا۔ جب سینے میں رکی سانس اس کے پھیپھڑوں کو جھنجوڑنے لگتی، وہ سطح آب پر آ جاتا۔ سانس لے کر دوبارہ زیرِ آب چلا جاتا۔ آج بھی وہ ہمیشہ سے زیادہ دکھی تھا۔ حویلی میں تالاب نظر آیا تو جیسے وہ جی اٹھا اور پھر...... من پسند کھیل شروع ہو گیا...... وہ روز سیبوں والی حویلی میں آتا اور بہت دیر تک اپنا پسندیدہ کھیل کھیلتا۔ دم توڑتی مچھلی پانی ملنے سے دوبارہ جی اٹھتی ہے۔ وہ بھی جیسے دوبارہ زندہ ہونے لگا تھا، ون بدن بہتری کی طرف بڑھنے لگا تھا۔ پہلے وہ ہردم نشے میں رہتا تھا مگر اب نشے والی حالت میں کمی ہونے لگی تھی۔ اسی دوران میں ایک روز ایک عجیب واقعہ بھی ہوا۔ تالاب میں غوطہ زن رہنے کے بعد دلاور پانی کی سطح پر ابھرا تو ٹھٹک کر رہ گیا۔ چند قدم کے فاصلے پر بڑی آپا، کٹی ناک والی نگینہ بیگم اور سویرا وغیرہ کھڑی تھیں۔ وہ بالکل غیر متوقع طور پر باغ کی سیر کو آئی تھیں۔ دلاور کا بالائی جسم عریاں تھا۔ بڑی آپا کی نگاہ سیدھی دلاور کی چھاتی پر پڑی۔ وہاں افقی رخ پر دس بارہ انچ لمبا زخم تھا جو سویرا کو بچاتے ہوئے دلاور کے سینے پر آیا تھا۔ دلاور صرف شلوار میں تھا، اس نے باہر نکل کر جلدی سے چادر میں اپنا جسم لپیٹا اور مؤدب کھڑا ہو گیا۔ بڑی آپا نے کہا۔ ''دلاور! کافی لمبا پھٹ لگا ہوا ہے تجھے، شکر کر تیری جان بچ گئی۔''

دلاور نے کہا۔ ''جی ہاں، پھٹ تو لگا ہے...... لیکن اب پرانا ہو گیا ہے۔''

بڑی آپا کے پیچھے کھڑی ایک ملازمہ کانوں کو ہاتھ لگا کر بولی۔ ''توبہ اللہ جی۔ بڑی خطرناک لڑائی تھی وہ۔ جب چانڈیو کے بندے نے چاقو چلایا تو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ مجھے تو لگتا ہے جی کہ اگر اس ویلے دلاور سامنے نہ آتا تو یہ چاقو...... اللہ نہ کرے سویرا باجی کو ہی لگتا تھا۔''

دلاور کو لگا جیسے اس کا کوئی قیمتی راز افشا ہو گیا ہے۔ اسے محسوس ہوا کہ جیسے سویرا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا ہے۔ عورتیں اس واقعے کی تفصیل بیان کرنے لگ پڑیں۔ دلاور موقع دیکھ کر وہاں سے ہٹ گیا۔

☆☆☆

شادی کے بعد دو تین ماہ پلک جھپکتے میں گزر گئے۔ سویرا، شاہ زمان کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی تھی۔ وہ ایسی بیوی ثابت ہوئی تھی جو اپنی اطاعت، ناز و ادا اور موقع محل کے مطابق بات چیت سے خاوند کا دل جیت لیتی ہے۔ شاہ زمان اس کے حسن کا اسیر تو پہلے سے تھا۔ اب اس کی سیرت کا گرویدہ بھی ہو چلا تھا مگر ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ اس کی رگوں میں جاگیردارانہ خون بھی دوڑتا تھا۔ وہ کسی وقت رات کو حویلی میں راگ رنگ کی محفل بھی جما لیتا تھا۔ سویرا دبی زبان میں اعتراض کرنے کے بعد خاموش ہو جاتی

تھی۔ ایک جوان چودھری کی حیثیت سے شاہ زمان ''نظر بازی'' سے بھی باز نہیں آتا تھا۔

شام کا وقت تھا۔ شاہ زمان اور سویرا لان میں بیٹھے چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ چائے کا سامان میز پر ترتیب سے رکھنے والی ملازمہ ماروی تھی۔ اس نے اپنا جسم باریک دوپٹے میں لپیٹ رکھا تھا۔ اس کے جسم کا انگ انگ چیخ چیخ کر دیکھنے والے کو اپنی طرف متوجہ کرتا تھا۔ شریف سے شریف انسان کی آنکھیں بھی اس کے قیامت خیز جسم سے ٹکرائے بنا نہیں رہ سکتی تھیں۔

اس کا رنگ گندمی' چہرے کے نقوش تیکھے تھے۔ لانبی آنکھوں میں لگے کاجل میں حسن کی ایک داستان رقم تھی۔ اس کا حسن کسی بھی پارسا کا بیڑا غرق کر سکتا تھا۔

وہ جھک کر چائے بنا رہی تھی اور شاہ زمان مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا وقتاً فوقتاً اسے دیکھ رہا تھا۔ سویرا کی لاعلمی کے دوران جتنی دفعہ اس کی نظر ماروی کی طرف اٹھتی، نگاہ کی پیش پہلے سے بڑھی ہوتی ...... عورت چار آنکھیں رکھتی ہے۔ سویرا سب جانتے ہوئے بھی انجان بنی رہی۔ شاہ زمان نے اس کے انجان بنے رہنے کو اپنا کارنامہ سمجھا اور مزید دلیر ہو گیا۔ وہ باتیں تو سویرا سے کر رہا تھا مگر اس کی نگاہوں کا مرکز ماروی تھی...... آخر سویرا زچ ہو گئی۔ اس نے تھوڑے سخت لہجے میں ماروی کو وہاں سے جانے کا اشارہ کیا تو شاہ زمان یوں انجان بن گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو......

تھوڑی دیر پہلے سویرا بہت اچھے موڈ میں تھی مگر شاہ زمان کی نظر بازی نے سویرا کے موڈ کا ستیاناس کر دیا۔ باقی وقت وہ خاموش رہی، صرف ہوں ہاں سے شاہ زمان کی باتوں کا جواب دیتی رہی۔

اگلی رات، ڈنر میں کھانا سرو کرنے والی بھی ماروی تھی۔ بڑے ٹیبل پر کھانا لگایا گیا تھا۔ سب لوگ کھانا کھا رہے تھے اور بظاہر شاہ زمان، شاہ فرمان سے باز کے سلسلے میں کوئی گرما گرم بحث کر رہا تھا مگر اس کی نگاہیں ماروی کا طواف کر رہی تھیں۔ کھانا سویرا کے حلق میں اٹکنے لگا۔ ابھی تو اس کی شادی کو ڈھائی تین ماہ کا عرصہ ہی ہوا تھا۔ شاہ زمان یہ کیا کر رہا تھا۔ آدمی عورتوں کی جانب دیکھتے ہیں مگر اس طرح دیکھنے اور شاہ زمان کے اب والے دیکھنے میں بڑا فرق تھا اور یہ فرق سویرا کو بری طرح محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے دل کو لاکھ بہانے دے کر بہلا لیا کہ وہ یوں ہی شکی مزاج ہو رہی ہے۔ آدمی عورتوں کی طرف دیکھتے ہی ہیں۔ اسے شاہ زمان کی نظر پہچاننے میں غلطی ہوئی ہے لیکن ......

بھلکڑ

جنرل وارڈ میں ایک صاحب سے جن کا ابھی ابھی آپریشن ہوا تھا برابر میں لیٹے ہوئے مریض نے پوچھا۔ ''آپ کو آپریشن کے بعد کوئی تکلیف تو محسوس نہیں ہو رہی؟''

وہ صاحب بولے۔ ''اجی کیا پوچھتے ہو۔ پیٹ میں بڑا درد ہو رہا ہے۔''

پڑوسی مریض بولا۔ ''یہ ڈاکٹر صاحب دراصل بھلکو ہیں۔ ایک آپریشن کے بعد انہیں مریض کا پیٹ دوبارہ کھولنا پڑا کیونکہ وہ اس کے پیٹ میں قینچی بھول گئے تھے، دوسرے مریض کے پیٹ میں چاقو بھول گئے تھے۔''

اتنے میں ڈاکٹر صاحب گھبرائے ہوئے وارڈ میں داخل ہوئے اور گھبرا کر بولے۔ ''بھئی کسی نے میری چھتری تو نہیں دیکھی؟'' اتنا سننا تھا کہ آپریشن والے صاحب بے ہوش ہو گئے۔

مرسلہ: وزیر محمد خان، بٹل ہزارہ

لیکن یہ سلسلہ تو کئی ہفتوں سے سویرا کو نظر آ رہا تھا۔ اس رات سویرا نہ سو سکی۔ صبح ناشتا دونوں نے باہر لان میں کیا۔ چائے کا سپ لیتے ہوئے وہ بڑی ادا سے بولی۔ ''آج کل آپ بڑے دل پھینک لگ رہے ہیں۔'' شاہ زمان ہنس دیا۔ سلائس کا ٹکڑا منہ میں چباتے ہوئے بولا۔

''تم کس کی بات کر رہی ہو؟'' وہ لانبی انگلی شاہ زمان کے پہلو میں گھساتے ہوئے بولی۔

''آپ کی ...... اور مجھے لگتا ہے آپ کو ٹھیک کرنا پڑے گا۔'' اس کی انگلی رینگتی ہوئی شاہ زمان کے سینے پر آ گئی۔

شاہ زمان نے جلدی سے اِدھر اُدھر دیکھا اور سویرا کا ہاتھ فوراً پرے ہٹا دیا۔

''کیا ہوا......؟'' سویرا قہقہہ مارتے ہوئے شوخی سے ہنسی۔

''کیا کر رہی ہو...... کوئی دیکھ لے گا......'' اس نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

''اچھا جی ...... آپ کو اپنی عزت کا بڑا خیال ہے۔'' اس نے شاہ زمان کے پہلو میں چٹکی لی پھر بولی۔ ''وہاں ڈنر

میں تو سب کے سامنے بڑی بہادری کا مظاہرہ کررہے تھے آپ ......ایک منٹ کے لیے بھی ماروی سے آپ کی نظر نہیں ہٹ رہی تھی۔"

سویرا کی بات پر وہ دل کھول کر ہنسا...... بولا۔ "تم عورتیں بھی پتا نہیں کیا مخلوق ہو۔ ہر وقت شک کی دنیا میں جیتی ہو۔"

"تو کیا...... شک نہ کروں...... آپ برابر...... اسے گھورے جارہے تھے۔" وہ مصنوعی خفگی سے لاڈ دکھاتے ہوئے بولی۔ وہ ادائیں دکھارہی تھی...... شاہ زمان کو چھیڑ رہی تھی مگر اندر اس کے دل میں اک گرہ سی لگ گئی تھی۔

شاہ زمان بولا۔ "تو شک نہ کیا کر...... چوڑیرو حویلی کے مردوں کے خون میں یہ چیز شامل ہے۔ ہم لوگ عورتوں کے قدردان ہیں اور خاص طور پر خوبصورت عورتوں کے ......تمہارے جیسی......" وہ اس کی طرف اشارہ کرکے ہلکے پھلکے انداز میں بولا۔ "اور ضروری نہیں ہے ہر خوبصورت عورت کو ہم اپنی بیوی بنالیں...... اسی لیے میں مفت مشورہ دیتا ہوں...... تو ایویں شک کے بیج نہ بویا کر......" سویرا جانتی تھی کہ شاہ زمان نے یہ باتیں مذاق میں کی ہیں۔ وہ یہ باتیں کرتے ہوئے اشارے کنائیوں سے اسے چھیڑ بھی رہا تھا...... مگر سویرا یہ بھی جانتی تھی کہ اس مذاق کی آڑ میں سچ بھی جھلک رہا تھا۔ شادی سے قبل اس نے اپنے ذہن میں جو اندیشے دبادیے تھے، وہ صرف دو تین ماہ بعد ہی سر اٹھانے لگے تھے۔

☆☆☆

دلاور کے ہاتھ میں عجیب شغل آ گیا تھا۔ اس نے ظفری سے اجازت لے لی تھی۔ وہ روزانہ سیبوں والے باغ کا رخ کرتا اور گھنٹوں اپنا من چاہا کھیل کھیلتا۔ تالاب کے پانی میں ڈبکی لگاتا تو دنیا کے رنج والم کچھ دیر کے لیے پانی سے باہر رہ جاتے...... ظفری کسی کام سے تھوڑے دنوں کے لیے صادق آباد گیا ہوا تھا۔ دلاور کمرے میں اکیلا تھا۔ جب وہ تنہا ہوتا تو سرکش سوچیں اس پر حاوی ہونے لگتی تھیں۔

باہر گھنگھور گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا تھوڑی دیر میں بارش شروع ہوگی اور کئی مہینوں سے پیاسی زمین سیراب ہوجائے گی۔

جس سوچ اور جس جذبے کو سلانے کی سعی وہ پچھلے دو تین ماہ سے کررہا تھا اور جس میں وہ کچھ کامیاب بھی ہوا تھا، جاگ گیا۔ بدلتے موسم اور مست ہواؤں نے یکا یک، اس کے اندر کا موسم بھی بدل ڈالا۔ شادی کے بعد اس نے دو تین دفعہ سویرا کو نئے ڈرائیور کے ساتھ نکلتے دیکھا تھا۔ وہ سویرا کا سامنا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ پچھلے چند ہفتے سے اس کا دل چاہنے لگا تھا کہ اب وہ یہ حرم چھوڑ جائے۔ مگر اب شاہ زمان نے اسے یہاں روک لیا تھا۔ وہ اس سے کوئی اہم کام لینا چاہتا تھا۔ وہ "اہم کام" کیا تھا، دو ماہ گزر جانے کے بعد بھی دلاور کو معلوم نہیں ہوسکا تھا۔ دلاور کے دل میں نشے کی مدہوشی کے عالم میں کئی دفعہ یہ سوال اٹھا تھا کہ سویرا کو ایک دفعہ بھی اس سے ملنے کا خیال نہیں آیا۔ وہ چاہتی تو "بیمار" دلاور کی خبر لینے ہی آجاتی۔ مگر وہ اس حقیقت سے لاعلم تھا۔ سویرا اس کی خبر لینے ہی آئی تھی اور اس کی غیر موجودگی میں اس کے کمرے میں وہ کچھ دیکھ گئی تھی کہ دوبارہ وہاں آنے کی ہمت اس میں نہ رہی تھی۔

سہانے موسم نے آج اس کے دل کے تار چھیڑ دیے تھے۔ تھوڑی دیر بوندا باندی ہوتی رہی پھر موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ اس نے اٹھ کے کھڑکی کے پٹ کھول دیے۔ سوندی گیلی مٹی والی ہوا اس کے نتھنوں سے ٹکرائی تو وہ جھوم اٹھا۔ سویرا شدت سے اسے یاد آنے لگی۔ اس کے نرم گلابی ہونٹ اب تک اسے بھولے نہیں تھے۔ اس نے ان ہونٹوں سے ایسا جام پیا تھا کہ مرتے دم تک اس نشے سے آزاد نہیں ہوسکتا تھا۔ اس نے بھولنے کی خاطر اس واقعے کو بے خبری کے پاتال میں پھینک دیا تھا مگر ایسے "حادثے" کب بھولتے ہیں۔ جب جب کلیاں کھلتی ہیں، جب جب بارش برستی ہے، اس واقعے کی یاد دل کی دیواروں کو ٹھوکریں مارتی ہے۔

باہر بارش برستی رہی اور وہ رات بہت دیر تک بستر پر کروٹیں لیتا رہا۔ اس کی آنکھ نہ جانے کب لگی...... مگر تھوڑی دیر میں ہی وہ کسمساکر اٹھ بیٹھا...... حواس کچھ بحال ہوئے تو اسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اس کے ساتھ بستر پر کوئی اور بھی ہے۔ ایک نامانوس سی خوشبو بھی کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھا اور اس نے لائٹ آن کردی...... خدا کی پناہ...... اس کے بستر پر ایک قیامت موجود تھی۔

وہ ایک لڑکی تھی۔ اس کا جوان قاتل جسم دلاور کے دماغ میں دھماکے کررہا تھا۔ اس کے کپڑے بھیگے ہوئے تھے۔ بال بکھرے ہوئے تھے اور وہ مخمور نگاہوں سے دلاور کی جانب دیکھ رہی تھی۔ کاجل لگی آنکھوں میں ایک داستان رقم تھی۔

دلاور نے اس فتنہ پرور لڑکی کو بے شمار دفعہ حویلی کے برآمدوں اور نشست گاہ کے آس پاس کام کرتے اور آتے جاتے دیکھا تھا۔ یہ وہی ماروی تھی جس کو حویلی کا ہر مرد للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا تھا۔ یہ لڑکی...... یہاں...... اس کے بستر پر رات کے ڈیڑھ، دو بجے کے قریب اس حالت اور ایسے موسم میں کیا کررہی تھی؟ دلاور کو سازش کی بو محسوس ہونے لگی۔ اس نے بڑی عجلت میں کمرے کا دروازہ کھولا، دھیمے مگر نہایت سخت لہجے میں بولا۔ ''چلو...... یہاں سے باہر نکلو...... تم کیا کررہی ہو میرے کمرے میں؟''

اس نے نگاہ اٹھا کر ایک ادائے قاتلانہ سے دلاور کی جانب دیکھا۔ آہستگی سے بستر سے اٹھی۔ دلاور کے قریب آکر دروازہ بند کردیا۔ دلاور نے غصے کے عالم میں دروازہ کھولنا چاہا تو وہ شعلہ بدن پوری کی پوری دلاور کے ساتھ آ لگی۔ دلاور ایک لمحے کے لیے سن ہوکر رہ گیا۔ رات، تنہائی، بارش اور ساتھ لگا ایک جوان نسوانی جسم...... دلاور جیسے سرتاپا پسینے میں ڈوب گیا۔ اس نے اس لڑکی کو کندھوں سے پکڑ کر خود سے علیحدہ کیا تو وہ حیران رہ گیا۔ وہ رو رہی تھی۔ اس کی کاجل لگی آنکھوں میں آنسوؤں کی لڑیاں تھیں۔ اس سے پہلے کہ دلاور کچھ سمجھ پاتا یا اس سے کوئی سوال کرتا، وہ بولی۔ ''دلاور! مجھے معاف کردینا۔ مجھے ایسا رستہ اختیار کرنا پڑا...... میں خود کے ہاتھوں مجبور ہوکر یہاں تک پہنچی ہوں......''

''تم کہنا کیا چاہتی ہو؟'' دلاور کا لہجہ درشت تھا۔

''میں تم سے پیار کرتی ہوں...... اور اس دن سے کرتی ہوں جس دن تم نے اس حویلی میں قدم رکھا ہے......'' وہ ایک لمحے کے لیے رکی پھر بولی۔ ''ٹھہرو، تمہیں یوں سمجھ نہیں آئے گی...... میں تمہیں تفصیل سے بتاتی ہوں۔ یہاں آؤ...... بیٹھ کے بات کرتے ہیں۔''

اس لڑکی نے کچھ اس انداز سے کہا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی دلاور کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ اس کے برابر میں بیٹھی اور بولی۔ ''میرا نام ماروی ہے۔ ترنڈا کی رہنے والی ہوں۔ اس حویلی میں اپنی ماں کے ساتھ رہتی ہوں۔ میں جس لڑکے سے پیار کرتی تھی اس کا نام بابو تھا۔ اس کی شکل تم سے بہت ملتی تھی۔ تمہارے جتنا قد کاٹھ، تمہارے جیسا جسم۔ تین سال ہوئے وہ ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ختم ہوگیا۔ میری دنیا اندھیر ہوگئی۔ میں جھلی اور دیوانی ہوگئی۔ میں ہر روز اس کی یاد میں آنسو بہاتی تھی۔ پھر ایک دن میں نے تمہیں حویلی میں دیکھا تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا...... میں سمجھی بابو لوٹ آیا ہے مگر دلاور جانے والے کب واپس لوٹ کے آتے ہیں۔ تم بابو نہیں ہو...... بابو جیسے تو ہونا...... روپے میں آٹھ دس آنے تو اس سے ملتے ہونا۔ میں تمہیں دیکھتی ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے بابو ابھی زندہ ہے۔ میرے پاس ہے۔'' اس نے گلوگیر لہجے میں کہا اور اٹھ کر دلاور کو اپنی بانہوں میں لے لیا......

دلاور کرسی پر بیٹھا ہوا تھا، اس کا سر کسی گداز میں دھنستا چلا گیا...... نسوانی بدن کی خوشبو نے اس کا بیڑا غرق کر کے رکھ دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ بہک جاتا...... اپنی ہی نظروں میں گر جاتا، اس نے خود کو ماروی سے علیحدہ کیا اور منت بھرے لہجے میں بولا۔ ''ماروی! مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ تم اس وقت یہاں سے جاؤ۔ کسی نے دیکھ لیا تو قیامت آجائے گی۔ میں صبح تم سے بات کروں گا۔'' دلاور نے لاکھ جتن کر کے اسے وہاں سے رخصت کیا اور واپس آکر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس کا دماغ ہزار کلومیٹر کی رفتار سے دوڑ رہا تھا۔ زمانے بھر کی خاک چھاننے والا اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے والا دلاور اتنا تو سمجھ رہا تھا کہ ماروی خود سے یہاں نہیں آئی تھی، اسے کسی نے بھیجا ہے۔ کس نے بھیجا، یہ سوال جواب طلب تھا۔

ماروی نے جو کہانی اسے سنائی تھی، وہ نہایت کمزور اور بوگس تھی۔ کہانی سناتے ہوئے اس کے جذبات اور اس کا لہجہ میل نہیں کھا رہا تھا۔ وہ جیسے کسی کا یاد کرایا ہوا سبق پڑھ رہی تھی۔

☆☆☆

آنے والے دنوں میں ماروی اس کے لیے عجیب دردِ سر بن گئی۔ جب موقع ملتا وہ آن ٹپکتی اور پھر اس کی جان نہ چھوڑتی۔ وہ بہت دیر اس سے باتیں کرتی رہتی۔ صاف پتا چلتا تھا، وہ اسے خود کی طرف مائل کرنا چاہتی ہے۔ وہ ہر حربہ آزما رہی تھی۔

ایک دن وہ گاڑی میں بیٹھا اس کا ڈیش بورڈ صاف کر رہا تھا۔ آج وہ پہلے دن اپنی ڈرائیوری کی ڈیوٹی پر واپس آیا تھا۔ پستول اس نے اپنے ہولسٹر میں لگا رکھا تھا...... آگے جھک کر صفائی کرتے ہوئے پستول پسلیوں میں چبھنے لگا تو اس نے پستول نکال کر ڈیش بورڈ پر رکھ دیا اور اپنا کام کرنے لگا۔ اسے پتا ہی نہ چلا کب ماروی اگلا دروازہ کھول کے اس کے برابر میں آ بیٹھی۔

''تم یہاں بھی پہنچ گئیں......؟'' دلاور نے اسے گھورا۔

''میں تمہارا پیچھا کبھی نہیں چھوڑوں گی......'' وہ بالوں کی

ایک آوارہ لٹ کو انگلی پر گھماتے ہوئے بولی۔ جواب میں دلاور کچھ نہیں بولا، اپنے کام میں منہمک رہا...... ماروی نے ڈیش بورڈ سے پستول اٹھالیا، دلاور کی جانب کرتے ہوئے بولی۔

''اور اگر تم نے مجھ سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی تو ...... میں تمہیں گولی ماردوں گی۔'' وہ ایک آنکھ بند کیے اس کا نشانہ لیے ہوئے تھی۔

دلاور نے جھپٹ کے اس سے پستول چھینا تو وہ ایک دم سہم گئی...... دلاور نے اسے بے نقط سناڈالیں...... پہلے وہ خاموش ہوئی پھر چہرے کے تیور بگڑے۔ نچلا ہونٹ ڈھیلا چھوڑ کر کجلی آنکھوں میں آنسو لے آئی...... اس نے تیزی سے اس سے پستول چھینا تھا اسی دوران اس کے ناخنوں سے ماروی کا ہاتھ زخمی ہوگیا تھا۔ دلاور کا دل نرم پڑ گیا۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کے زخم کو دیکھنے لگا...... اسی دوران شاہ زمان اندر سے برآمد ہوا۔ اس کا دھیان گاڑی میں اگلی سیٹ پر بیٹھی ماروی پر پڑا۔ ماروی نے چونک کر دلاور سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور گاڑی سے نکل کر سر پر دوپٹا ٹھیک کرتی ہوئی وہاں سے رفو چکر ہوگئی۔ شاہ زمان نے جاتی ہوئی ماروی کو بڑی گہری اور تفصیلی نظروں سے دیکھا اور گاڑی کی طرف آگیا۔ دلاور نے بڑی سرعت سے شاہ زمان کے لیے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا...... شاہ زمان بڑے کروفر سے گاڑی میں سوار ہوا اور گاڑی تیزی سے حویلی کے صدر دروازے سے باہر نکل گئی۔ چند منٹ خاموشی کے گزر گئے پھر شاہ زمان کی بھاری آواز گونجی۔

''اب تم کیسے ہو......؟''

''اللہ کا کرم ہے بڑے سائیں...... پہلے سے بہت بہتر ہوں......''

''اسپتال سے جو رپورٹس آنی تھیں، ان کا کیا بنا......''

''بڑے سائیں...... رپورٹس آگئی تھیں۔ اللہ کا کرم ہے، سب ٹھیک ٹھاک ہے۔'' رپورٹس کے بارے میں دلاور نے جھوٹ سے کام لیا تھا اور اس جھوٹ کا مشورہ بھی دلاور کو ملتانی نے ہی دیا تھا۔ نہ ہی کوئی ٹیسٹ ہوا تھا، نہ ہی کسی رپورٹس نے آنا تھا مگر حویلی میں یہی مشہور کیا گیا تھا کہ ملتانی، دلاور کی بیماری سے متعلق خون کے ٹیسٹ لے کر گیا ہوا ہے۔

چند لمحے پھر خاموشی سے گزر گئے پھر شاہ زمان نے بھویں اچکاتے ہوئے کہا۔ ''یہ کڑی'' تمہاری گاڑی میں کیا کررہی تھی؟

دلاور گڑبڑا گیا۔ ''کون سی کڑی...... بڑے سائیں......''

شاہ زمان کا لہجہ قدرے ترش ہوگیا۔ ''اوئے...... وہی...... جو میرے آنے پر گڈی سے نکل کر بھاگی تھی۔''

''بڑے سائیں! میں تو اسے ٹھیک سے جانتا بھی نہیں ہوں۔ تھوڑے دن سے میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ میں جہاں جاتا ہوں وہاں پہنچ جاتی ہے۔ میں تو اب تنگ آگیا ہوں۔'' شاہ زمان پُرسوچ انداز میں عقب نما شیشے میں دلاور کو دیکھنے لگا۔ مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے بولا۔

''وہ تمہاری گاڑی میں کیا کررہی تھی؟ تم نے اس کا ہاتھ بھی پکڑ رکھا تھا۔''

''بڑے سائیں! کیا بتاؤں...... یہ لڑکی جونک کی طرح چمٹ گئی ہے۔ فلمی باتیں کرتی ہے۔ کہتی ہے تمہاری شکل میرے بابو سے ملتی جلتی ہے۔ بابو کو اپنا منگیتر بتاتی ہے جو تین سال پہلے کسی ایکسیڈنٹ میں مارا گیا تھا۔ اب بھی میں گاڑی کا ڈیش بورڈ صاف کررہا تھا کہ میری بے خبری میں اندر گھس آئی۔ میں نے اپنا پستول ڈیش بورڈ پر رکھا ہوا تھا۔ اس نے اٹھا کر میری طرف اس کا رخ کردیا اور فضول ایکٹنگ کرنے لگی۔ میں گھبرا گیا جھپٹ کر اس سے پستول چھینا تو میرے ناخن اس کے ہاتھ پر نشان چھوڑ گئے۔ خون رسنے لگا تو مجھے اس پر ترس آگیا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اوپر سے آپ آگئے۔'' دلاور نے سب صاف صاف بیان کردیا۔

شاہ زمان بڑی گہری سوچ میں غرق ہوگیا۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں تیزی سے حرکت کرنے لگیں، وہ مونچھوں کو تاؤ دیتا گیا اور سوچتا چلا گیا۔ جانے کیوں دلاور کو محسوس ہورہا تھا کہ شاہ زمان کا دل ماروی پر آیا ہوا ہے۔

☆☆☆

سویرا نے اپنے ہاتھوں سے شاہ زمان کے لیے دودھ کی باداموں والی سردائی بنائی تھی۔ وہ شام سے ہی اس کا انتظار کررہی تھی مگر شاہ زمان رات گئے دلاور کے ساتھ واپس آیا۔ آرام گاہ میں پہنچا تو کافی تھکا ہوا دکھتا تھا۔ سویرا نے آگے بڑھ کر اس کی واسکٹ اتاری...... بستر پر بیٹھا تو اس کے جوتے اتار کر جرابیں اتارنے لگی۔

''لگتا ہے، آج آپ بہت تھک گئے ہیں......''

شاہ زمان جواباً کچھ نہیں بولا۔ بیڈ پر بیٹھ کر سر پیچھے ٹکادیا۔ سویرا نے ٹھنڈی سردائی گلاس میں انڈیلی اور شاہ زمان کو پیش کردی، بولی۔ ''میں نے اپنے ہاتھوں سے بنائی ہے۔''

شاہ زمان تین گھونٹوں میں ساری سردائی اندر انڈیل گیا۔

''آپ کچھ پریشان دکھتے ہیں۔'' سویرا فکرمندی سے بولی تو شاہ زمان سیدھا ہوکر بیٹھا اور بولا۔

''میں پریشان ہوں تمہیں اس سے کیا...... تم کھیل

کھیلا ہے......"

سویرا دم بخود رہ گئی۔ پریشانی سے اس کا چہرہ کھنچ گیا۔ وہ بمشکل بولی۔ "کیا...... کھیل کھیلا ہے...... میں نے......؟"

"تم اچھی طرح جانتی ہو...... حویلی میں کیا چکر چل رہے ہیں۔ کیسی چالیں چلی جا رہی ہیں۔ اندھا نہیں ہوں میں۔"

"میں اب بھی آپ کا مطلب نہیں سمجھی...... میں نے کونسا جرم کیا ہے جس کی خبر مجھے بھی نہیں ہے۔" وہ روہانسی ہوگئی۔

"وقت آنے پر سب معلوم پڑ جائے گا...... ابھی مجھ سے اس بارے میں کوئی سوال مت پوچھو۔"

"مگر...... میں......" اس نے کچھ کہنا چاہا۔

شاہ زمان سویرا کی بات کاٹ کر بہت زور سے دہاڑا اتنی زور سے کہ سویرا کو کمرے کی دیواریں لرزتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ "میں نے ایک بار کہا نا...... اس بارے میں مجھ سے ابھی کوئی سوال مت پوچھو......"

سویرا سہم گئی...... خاموش ہوگئی...... سندھ یونیورسٹی میں کلاس فیلوز کے ساتھ چہلیں کرنے والی، رومانوی شاعری کرنے والی...... بات بے بات قہقہے لگانے والی سویرا خاموش ہوگئی...... عورت کو اپنا گھر بچانے کے لیے کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا...... اس کا ناتواں دل لحہ بہ لحہ لرزتا ہے، پل پل وہ ڈر جاتی ہے، سہم جاتی ہے۔

سویرا کی وہ رات خاموشی میں آنسو بہاتے ہوئے گزر گئی...... صبح ناشتے میں بھی شاہ زمان کا رویّہ سویرا سے ٹھیک نہیں رہا...... وہ آدھا ناشتا کر کے باغیچے میں چلا گیا...... لنگڑاتے ہوئے حویلی کا چکر کاٹا۔ شاہ فرمان سے نشست گاہ میں ایک ڈیڑھ گھنٹا طویل گفتگو کی...... پھر گیارہ ساڑھے گیارہ کے قریب باغیچے میں واپس آ گیا۔ اس نے ایک ملازمہ کو ماروی کو بلانے کے لیے بھیجا...... تھوڑی دیر بعد ماروی سکڑی سمٹی اس کے روبرو تھی۔

"سر میں تیل کی مالش کر لیتی ہو......" شاہ زمان سخت لہجے میں بولا۔

"ج...... جی بڑے سائیں......" وہ ہکلاتے ہوئے بولی۔

"تو جاؤ پھر تیل لے آؤ۔"

ماروی دوڑی ہوئی گئی اور دو منٹ میں واپس آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں تیل کی بڑی بوتل تھی۔ اس نے احتیاط سے سر میں تیل ڈالا اور مالش کرنے لگی۔

شاہ زمان کی آنکھوں میں فتح کی چمک تھی۔ وہ تنی گردن کے ساتھ بڑے کروفر سے کرسی پر بیٹھا مالش کروا رہا تھا۔ عادت سے مجبور مونچھوں کو تاؤ دے کر بولا۔ "کیا نام بتایا تھا تیری ماں نے اپنے گاؤں کا؟"

"بڑے سائیں...... ترنڈا......"

"تیرا باپ کیا کام کرتا ہے؟"

"بڑے سائیں! ہم لوگ تھوری ہیں۔ میرا باپ بکریاں چراتا ہے۔ ہمارے گاؤں کے ساتھ ہی چنی گوٹھ ہے...... وہ وہاں منڈی میں ہوتا ہے۔"

"تو کل...... گاڑی میں کیا کر رہی تھی؟" اچانک شاہ زمان نے سوال کیا تو ماروی یکدم سے گڑبڑا گئی۔ لرزتے لہجے میں بولی۔

"وہ...... وہ بڑے سائیں...... م...... میں...... م...... میں......"

"کیا میں...... میں لگائی ہوئی ہے...... ٹھیک سے جواب دے۔" شاہ زمان کا لہجہ سخت ہوگیا۔ وہ ماروی کے ہاتھ کی انگلیاں بری طرح مروڑ رہا تھا۔

"وہ جی...... بی بی جی...... نے مجھے بھیجا تھا......" کانپتی آواز میں اس نے کہا۔

"کس کام کے لیے؟" لہجہ بدستور تلخ تھا۔

ماروی کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کیا جواب دے پھر ایک دم سے بولی۔ "بازار سے کچھ سامان منگوانا تھا جی۔" تکلیف کے سبب اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

شاہ زمان سوچ میں غرق ہوگیا۔ اس نے ماروی کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ ہاتھ کے اشارے سے بولا۔ "اچھا...... اب تو جا۔" شاہ زمان نے دور سے آتی بڑی آپا کو دیکھ لیا تھا۔

بڑی آپا مسکراتے ہوئے شاہ زمان کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گئیں، بولیں۔ "میرے چھوٹے دیر کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا آج کل......"

"میں بالکل ٹھیک ہوں بڑی آپا......" وہ خوش دلی سے مسکرایا۔

"تیرا پیر کیسا ہے......؟ زخم پورا بھر گیا ہے نا......"

"ہاں...... ہاں بڑی آپا...... اب تو پیر پر پورا وزن پڑتا ہے۔"

"وہ باز والا معاملہ کہاں تک پہنچا؟" بڑی آپا حویلی کے حالات سے آگاہی رکھتی تھیں اور کسی حد تک ان معاملات میں انوالو بھی رہتی تھیں۔

"بڑی آپا...... وہ باز ہماری سوچ سے بھی [illegible] ہے۔" شاہ زمان کی آنکھوں میں [illegible]

"تمہارے خیال سے [illegible]؟"

"بڑی آپا! آپ کو پتا [illegible]"

شنگوں کے درمیان لڑائی کی وجہ بنا ہوا ہے۔"

"ہاں...... مجھے تھوڑا بہت اس بارے میں پتا چلا تھا......"

"شنگوں کی وہ لڑائی عروج پکڑ گئی ہے۔ وہ اب ایک ضد اور انا بن گئی ہے۔ مڈل ایسٹ پاکستان نہیں ہے جہاں ڈنڈے کے زور پر...... دھونس...... دھاندلی سے کوئی چیز حاصل کرلی جائے..... وہاں پر یہ سب چیزیں نہیں ہوتیں...... دونوں شیخ یہ سب دنگا فساد نہیں کرسکتے مگر...... جو وہ کرسکتے ہیں ڈنکے کی چوٹ پر کررہے ہیں۔ سننے میں یہ خبریں بھی آرہی ہیں کہ شان نامی باز کی بولی ستر سے اسی لاکھ ریال تک لگ گئی ہے۔"

بڑی آپا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں...... وہ تقریباً ہکلاتے ہوئے بولیں۔ "ستر... اسی لاکھ ریال...... یہ...... کیسے ممکن ہوسکتا ہے؟"

"ہوسکتا ہے...... یہ خبر جھوٹی ہو...... یا بڑھا چڑھا کر بتائی گئی ہو...... مگر بڑی آپا...... اس میں ایسی کوئی انہونی بات بھی نہیں ہے۔ یہ شیخ اپنے عیش و آرام اور کبھی کبھی تفریحِ طبع کے لیے لاکھوں ریال خرچ کردیتے ہیں...... تو جہاں...... ضد اور انا کا مسئلہ پیدا ہوجائے...... وہ......" شاہ زمان نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

بڑی آپا کی آنکھوں میں بے پناہ چمک ابھر آئی...... شاہ زمان سے تھوڑا قریب ہوتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں بولیں۔ "وہ باز...... اب ہے...... کہاں......؟"

شاہ زمان آہستگی سے بولا۔ "بڑی آپا...... وہ ہمارے کنٹرول میں ہے۔ حضور چانڈیو اور شوکت سیال کے حویلی پر کیے جانے والے حملے کے بعد...... وہ باز ہم نے یہاں سے ترنڈا بھیج دیا ہے۔ تھوڑے دن پہلے جو میں ترنڈا گیا تھا...... اسی سلسلے میں گیا تھا۔ سفید حویلی کے تہ خانے میں "شان" اس وقت محفوظ ہاتھوں میں ہے۔ چار گارڈ اس کی حفاظت کررہے ہیں۔"

"مگر...... شوکت سیال......؟" بڑی آپا نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"حویلی پر ہلا بول کے انہوں نے جو غلطی کی ہے، ان کی جان اتنی جلدی نہیں چھوٹے گی۔ ابھی بھی میں بھائی جی سے اسی کیس کے بارے میں بات کرکے آیا ہوں...... حویلی پر حملے کے بعد جو پرچہ ہم نے کٹوایا تھا، اس میں ہم نے ایک قتل بھی شوکت سیال پارٹی پر ڈال دیا تھا۔ عدالت میں کیس چل رہا ہے۔ آپ کو پتا ہے شوکت سیال کی پشت پناہی کرنے والا حضور چانڈیو ہے۔ الیکشن سر پر ہیں۔ فی الحال حضور چانڈیو کوئی ایسا کام نہیں کرے گا جس سے اس کی پارٹی کی ساکھ کو نقصان پہنچے۔ سننے میں آرہا ہے کہ وہ تو حویلی پر کیے جانے والے حملے پر بھی پچھتا رہا ہے۔ اس کا خیال تھا۔ اس کے تربیت یافتہ کارندے گوریلا ایکشن کرکے بڑی صفائی سے باز اڑا لے جائیں گے...... اور کسی کو خبر بھی نہ ہوگی مگر ہمارے بندوں نے نا صرف بیرونی خطرے پر آنکھیں کھلی رکھیں بلکہ حملہ آوروں کو بھرپور جواب بھی دیا۔ حضور چانڈیو کی سازش بے نقاب ہوگئی۔ اس کو لینے کے دینے پڑ گئے...... اب وہ کیس ختم کرانا چاہ رہا ہے اور ہم لوگ کیس کو طول دے رہے ہیں۔"

بڑی آپا معنی خیز انداز میں مسکرائیں، بولیں۔ "اس کا مطلب ہے تم لوگ وہ باز واپس کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔"

"نہیں بڑی آپا...... ہم نے کیا باز کا اچار ڈالنا ہے۔ باز تو ہم حضور چانڈیو پارٹی کو واپس کریں گے مگر کڑی شرائط پر۔"

"مگر مجھے تو کچھ ایسی خبر پہنچی تھی کہ وہ باز تمہارے "بھائی جی" نے شیرو کے ذریعے چوری کروایا تھا۔"

شاہ زمان آنکھ میچ کے بولا۔ "بڑی آپا...... یہ چوڈیرو حویلی کی سب سے خفیہ خبر ہے...... کہتے ہیں دیواروں کے کان بھی ہوتے ہیں۔ اسی لیے خاموشی بہتر ہے......" وہ کرسی پر سیدھا ہوا۔ سرگوشی کے انداز میں بولا۔ "وہ باز بھائی جی نے شیرو کے ذریعے ہی حاصل کیا ہے مگر عدالت میں...... شیرو نے پیش ہوکر اپنا بیان ریکارڈ کروایا ہے کہ وہ باز اس نے رحیم یار خان کے قریب "ست یار" گوٹھ سے رانا قوم کے ایک بندے "سخی بابر" سے خریدا ہے۔"

"اور عدالت نے یہ سب سچ مان لیا......؟"

"اور کیا تو نہیں...... عدالت کو سچ ماننا پڑا۔" شاہ زمان زیرِ لب مسکرایا...... بڑی آپا کا سوالیہ انداز دیکھ کے بولا۔ "ہم نے سخی بابر کو عدالت میں پیش کردیا اور اس نے اقبالی بیان میں صاف کہہ دیا کہ یہ باز اس نے شیرو کو فروخت کیا تھا۔"

"یہ سب کیسے ممکن ہے......؟" بڑی آپا کی حیرت عروج پر تھی۔

شاہ زمان نے ایک قہقہہ لگایا، بولا۔ "بڑی آپا...... روپیہ...... یہ دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ اس سے آپ خوشیاں خرید سکتے ہو...... خواہشیں خرید سکتے ہو...... ایمان خرید سکتے ہو...... لوگ خرید سکتے ہو...... آپ کا کیا خیال ہے؟ سیاسی پارٹیوں کے آگے آگے چلنے والے

...... گلا پھاڑ کر نعرے لگا [illegible] ساتھ ہوتے ہیں...... نہیں...... نہیں...... وہ نامراد روپیہ ہوتا ہے جو انہیں ناچنے پر مجبور کرتا ہے۔"

"سخی بابر کے بیان سے تو حضور چانڈیو پارٹی بری طرح پھنس جائے گی......" بڑی آپا نے کہا۔

"پھنس جائے گی کیا...... پھنس گئی ہے...... اب وہ دن دور نہیں جب شوکت سیال اور حضور چانڈیو گھٹنے ٹیکتے ہوئے چوڈیرو حویلی آئیں گے...... کیس ختم کرانے اور باز کی واپسی کے لیے ہمارے ترلے کرنے......!"

بڑی آپا خاموش تھیں۔

☆☆☆

وہ نیم دراز تھی اور سوچوں کے پنچھی پر لگا کر اڑ رہے تھے۔ دور ریگستان کے بیابانوں سے ایک ہوک سی اٹھتی تھی اور پورے ماحول پر چھا جاتی تھی یا شاید یہ ہوک اس کے اپنے من میں کرلاتی تھی۔ جس دن سے وہ دلاور کے کمرے میں گئی تھی اور اس نے لکڑی کے بکس میں پڑی ہوئی وہ چیزیں دیکھی تھیں، اک احساسِ جرم نے اسے گھیر لیا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے ایک ہی سوچ اس کے ذہن پر سوار رہتی تھی، کہیں اس کی بے وقوفی نے کسی کی زندگی عذاب تو نہیں بنا دی تھی۔

دروازے پر کھٹکا ہوا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ رخساروں کے پاس کسی چیز کا احساس جاگا۔ اس نے انگلی سے چھوا تو حیران رہ گئی...... وہ آنسو تھے جو بنا دستک دیے اس کی آنکھوں سے پھسل آئے تھے۔ آنسو تو کسی جذبے، کسی دکھ کے ساتھ آنکھوں سے چھلکتے ہیں مگر یہ کیا ہوا تھا؟ اسے خود کو بھی پتا نہ چلا تھا اور اسے پتا بھی کیسے چل سکتا تھا...... یہ آنسو بالکل اس کی لاعلم محبت کی طرح غیر محسوس تھے جو اس کے وجود میں کسی ہلکی سی چنگاری کی صورت پنپ رہی تھی۔ اس نے جلدی سے اپنے آنسو صاف کر ڈالے۔ دروازے پر دستک ہوئی اور پھر ماروی اندر داخل ہوگئی۔

"بیٹھ جاؤ۔" سویرا ٹیک لگا کر بیٹھتے ہوئے بولی......

"...... تمہارا کام کہاں تک پہنچا؟"

"بی بی جی! مجھے لگتا ہے بڑے سائیں کو شک پڑ گیا ہے۔" وہ ہاتھ مروڑتے ہوئے بولی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا...... انہوں نے تجھ سے کچھ کہا؟" سویرا کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"میں اس دن دلاور کی گاڑی میں جا بیٹھی۔ بڑے سائیں نے مجھے دیکھ لیا...... بڑی غصے والی نظروں سے گھور

[illegible] لگتے ہیں [illegible]

"انہوں نے تجھ سے کوئی بات کی......؟"

"بات وات تو نہیں کی جی...... پر اگلے دن مجھ سے کہنے لگے میرے سر میں تیل کی مالش کردو۔"

"تو پھر......" سویرا کا دل بہت زور سے دھڑکنے لگا تھا۔

"میں نے کردی مالش...... مالش کرواتے ہوئے غصے سے پوچھنے لگے...... اس دن تو گڈی میں دلاور کے ساتھ کیا کر رہی تھی...... میری تو ٹانگیں کانپنے لگیں بی بی جی...... مجھے سمجھ نہ آئی کیا جواب دوں، پھر میں نے بہانہ بنایا کہ بی بی جی نے مجھے بھیجا تھا...... بازار سے کچھ چیزیں منگوانی تھیں۔"

"آگے سے کیا بولے تمہارے بڑے سائیں۔"

"بولے وولے کچھ نہیں...... غصے سے مونچھوں کو تاؤ دیتے رہے اور بڑی گہری سوچ میں ڈوبے رہے۔" سویرا کا دل ڈوبنے لگا۔ اسے شاہ زمان کا اس دن والا رویہ یاد آنے لگا۔ "تم کھیلو...... کھیل اپنے...... تم اچھی طرح جانتی ہو حویلی میں کیا چکر چل رہے ہیں۔ اندھا نہیں ہوں میں......" تو کیا شاہ زمان باخبر ہو چکا تھا؟

اس نے ماروی کو جانے کا کہا اور کمرے کی لائٹ بند کر کے نیم دراز ہوگئی...... شاہ زمان نے کہا تھا۔ "تم کھیلو کھیل اپنے......" ہاں تو وہ کھیل رہی تھی...... یہ کھیل...... کیونکہ وہ ایک کمزور عورت تھی......

وہ سب کچھ برداشت کر سکتی تھی...... شاہ زمان کو کسی کے ساتھ بانٹ نہیں سکتی تھی...... شاہ زمان جن نظروں سے ماروی کی جانب دیکھتا تھا...... وہ نظریں یہ اندازہ لگانے کے لیے کافی تھیں کہ...... بہت جلدی نہ سہی، دیر سے ہی سہی...... شاہ زمان ماروی سے "ہر طرح" کے تعلقات استوار کر لے گا...... اور "ضرورت" پیش آنے پر اس سے بیاہ بھی رچا لے گا...... ماروی عام لڑکی ہوتے ہوئے بھی عام نہیں تھی۔ اس کا خوبصورت چہرہ اور قیامت ڈھاتے جسمانی نشیب و فراز کسی کا بھی ایمان خراب کر سکتے تھے۔ اس سے پہلے کہ شاہ زمان کا "ایمان" خراب ہو جاتا...... سویرا ماروی کو دلاور کے ساتھ نتھی کر دینا چاہتی تھی۔

سویرا نے ہی ماروی کو اعتماد میں لے کر دلاور کے پیچھے لگایا تھا۔ ایک طرف وہ ماروی کو شاہ زمان سے دور رکھنا چاہتی تھی...... دوسری طرف نا سمجھی میں جو غلطی اس سے ہوئی تھی، وہ اس کا مداوا کرنا چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ دلاور...... ماروی کی طرف مائل ہو جائے اور دل میں پلنے

والے منفی جذبوں سے چھٹکارا حاصل کر لے۔ وہ جذبے جن کا تعلق خود سویرا سے تھا۔ کچھ چیزیں پس منظر میں ہوتی ہیں، نظر نہیں آتیں۔ کچھ قیامتیں سمندر کی گہرائی میں ہوتی ہیں جو نگاہوں سے پوشیدہ ہوتی ہیں۔ سویرا، ماروی کو شاہ زمان سے دور رکھنا چاہتی تھی۔ دلاور کے قریب لانا چاہتی تھی۔ بظاہر تو وہ ایسا ہی چاہتی تھی۔ مگر اس کے دل کے نہاں خانوں میں ایک چھوٹی سی ''ندی'' بھی بہتی تھی اور اس ندی کے پانی سے جیسے آواز آتی تھی۔

تم کب تک مجھ کو بھولو گے
اس دشت کی تنہا راتوں میں اک درد جو ٹھہرا ہوتا ہے
وہ درد بھی طعنے دیتا ہے
رہ رہ کے سسکیاں لیتا ہے
ایک ٹیس بھی اٹھ کے کہتی ہے
تم کب تک مجھ کو بھولو گے

☆☆☆

وہ ابھی تک نہیں سمجھ پایا تھا۔ ماروی کیوں اس کے پیچھے ہاتھ دھو کے پڑ گئی ہے۔ جس دن سے اس نے بڑے سائیں کے ساتھ ماروی والی بات کی تھی، اس دن سے ماروی کی پیش قدمی سست ہو گئی تھی۔ وہ موقع کی تاک میں رہتی تھی۔ جب بڑے سائیں حویلی میں نہیں ہوتے تھے، وہ چھم سے دلاور کے روبرو آن کھڑی ہوتی تھی۔

اس دن بھی وہ سیبوں والے باغ کی طرف سے چلا آ رہا تھا کہ وہ اچانک اس کے سامنے آ گئی۔ دلاور اس سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ اس نے لمبے بالوں کی چٹیا میں گجرے لگا رکھے تھے۔ ایک ادا سے دلاور کی طرف دیکھ کر بولی۔

''تم بڑے ظالم ہو......''

''میں نے تو تجھے کچھ نہیں کہا۔ میں ظالم کہاں سے ہو گیا؟''

''اسی وجہ سے تو تجھے ظالم کہہ رہی ہوں۔ تو مجھے کچھ کہتا ہی نہیں ہے۔'' وہ ادا سے اِتراتے ہوئے بولی۔

''کیا کہوں تجھے؟'' دلاور آج دل لگی کے موڈ میں تھا۔

''میری طرف غور سے دیکھ ...... میرے حسن کی تعریف کر ...... میرے بارے میں کچھ کہہ ...... حویلی کا کون سا ایسا مرد ہے جو میرے حسن کی تعریف نہ کرتا ہو ...... بس ایک تو ہے جو پتا نہیں کس خیالی دنیا میں رہتا ہے۔ ایسا ٹھنڈا مرد میں نے کبھی نہیں دیکھا۔''

''تو آج سچ سچ بتا میرے سے چاہتی کیا ہے؟''

''سنے گا...... تو تڑپ جائے گا......''

''میں تڑپنا چاہتا ہوں''

''تو سن......'' وہ ایک لمحے کے لیے رکی۔ اس [illegible] دلاور کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ بولی۔ ''میں تجھ [illegible] محبت کرتی ہوں...... تجھ سے شادی کرنا چاہتی ہوں''

دلاور نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔ آنکھوں میں ہلکی سی نمی تھی، یہ نمی جھوٹی تھی یا سچی۔ اس سے دلاور کو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ تو اس جہان کا باسی بن گیا تھا...... جہاں کسی بھی چیز سے کوئی بھی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ عشق کے ایسے دریاؤں کو عبور کر رہا تھا جن میں آگ بھی تھی اور ان دریاؤں کا پانی برف سے زیادہ ٹھنڈا بھی تھا۔ دلاور نے جیسے سویرا کے عشق میں ڈوب کر ''فنا'' حاصل کر لی تھی۔

دلاور نے ماروی کی طرف دیکھ کر بڑے نرم لہجے میں کہا۔ ''ماروی! تم بہت اچھی ...... ہو ...... خوبصورت اور جوان بھی ہو...... ہو سکتا تھا بلکہ یقیناً میں تمہاری طرف مائل ہو جاتا۔ اگر میرے ساتھ ایک بدقسمتی نہ ہوئی ہوتی۔''

''کیسی بدقسمتی......؟'' ماروی نے شکوہ کناں لہجے میں کہا۔

''میں برف کا آدمی ہوں...... میرے دل میں پہاڑوں کی سینکڑوں ٹن برف نے بسیرا کر رکھا ہے۔ میرے جذبات کوہ ہمالیہ کی برف کی چادر اوڑھ کر سو چکے ہیں۔''

ماروی کانپ گئی، بولی۔ ''تمہاری کوئی بات بھی میرے پلے نہیں پڑ رہی......'' وہ پاس پڑے سنگی بینچ پر بیٹھ گئی۔

دلاور بولا۔ ''تمہارے پلے پڑ بھی نہیں سکتی...... سنو...... میں تمہیں ایک بات بتاؤں...... تمہیں پتا ہے ایک جیتا جاگتا انسان...... ایک چلتی پھرتی لاش میں کیسے تبدیل ہوتا ہے۔ جب اس سے جینے کا مطلب چھین لیا جاتا ہے''

...... ماروی گھبراہٹ سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی...... اسے ڈر تھا کہ کہیں کوئی دلاور کو یوں بولتے ہوئے نہ دیکھ لے...... مگر یہ دوپہر کا وقت تھا...... جھلسا دینے والی چولستانی ہوا حویلی کے اس حصے میں دھیرے دھیرے چل رہی تھی اور جس [illegible] بینچ پر ماروی بیٹھی تھی اس کے اوپر نیم کے دو جڑواں درخت چھاؤں کیے ہوئے تھے۔

دلاور کہہ رہا تھا۔ ''ماروی...... میں [illegible] ہوں...... میں پاکستان کے ہر شہر میں رہا ہوں [illegible] دل اچاٹ ہو جائے بھاگ نکلتا ہوں...... میں یہاں [illegible] بھاگ جانا چاہتا ہوں مگر بڑے سائیں [illegible] ہے...... لیکن شاید...... نہیں [illegible] بھی اتنی طاقت نہیں [illegible] ماروی...... میں یہاں سے [illegible]

......مگر بڑی بڑی فولادی بیڑیاں ہیں جو میرے پاؤں میں پڑی ہوئی ہیں۔ میں بھاگتا ہوں اور منہ کے بل گر جاتا ہوں۔ پھر اٹھ کے دوبارہ کوشش کرتا ہوں پھر گر پڑتا ہوں۔ میری ٹانگیں زخمی ہو چکی ہیں، میرا سارا جسم چھلنی ہو چکا ہے...... ماروی...... تم نے کبھی ایسا پرندہ دیکھا ہے جو آگ میں جل رہا ہو...... وہ اڑنا چاہے تو نہ اڑ پائے...... اور نہ ہی موت سے اس کی خلاصی ہو......'' دلاور ہذیانی انداز میں بول رہا تھا اور آنسوؤں کی نمی اس کی آنکھوں میں ہلکورے لے رہی تھی۔

ماروی کے جسم میں واضح کپکپی طاری ہو چکی تھی...... اس کا وہاں بیٹھنا محال ہو رہا تھا۔ اس نے کوئی بہانہ بنایا اور وہاں سے بھاگ نکلی......

☆☆☆

اس دن کے بعد ماروی نے دلاور کے پاس جانا کم کر دیا۔ سویرا نے وجہ پوچھی تو ماروی نے صاف کہہ دیا۔ ''بی بی جی ...... میں نے ہر طریقہ استعمال کر کے دیکھ لیا ہے۔ وہ بندہ ٹو کس سے مس نہیں ہوتا...... کسی عجیب مٹی کا بنا ہوا ہے بلکہ اب تو مجھے اس سے خوف آنے لگا ہے۔ بڑی اول جلول سی باتیں کرتا ہے جی وہ......''

''کیا کہتا ہے......؟'' سویرا کے لہجے میں تجسس تھا۔

''وہ ...... جی ...... پتا نہیں کیسی کیسی باتیں کرتا ہے۔ کبھی عشق کی...... کبھی برف کی...... کبھی کہتا ہے تم نے زندہ لاش چلتی پھرتی دیکھی ہے۔ میرے پلے تو کچھ نہیں پڑتا بی بی جی......''

سویرا کی آنکھوں میں دکھ گہرا ہو گیا...... انگلی میں پڑی انگوٹھی کو مروڑتے ہوئے بولی۔ ''اور کیا کہتا تھا......؟''

''کہتا ہے میں برف کا آدمی ہوں...... اس کی باتیں سن کر تو میں کانپ گئی تھی...... بی بی جی آپ...... آپ یہ کام اور کسی کو دے دیں۔ دلاور بڑا اور ٹاپ کا بندہ ہے ــ پتا نہیں کن چکروں میں ہے......''

حویلی کا ہر مرد اسے یوں دیکھتا تھا کہ ابھی کھا جائے گا۔ ان مردوں میں سویرا کا خاوند سرفہرست تھا اور کیوں نہ ہوتا...... وہ اس حویلی کا بڑا سائیں تھا۔ اس سے زیادہ حق ماروی پر کسی کا نہیں بنتا تھا۔ وہ اسے نوچ کر بھی کھا جاتا تو کسی کی مجال نہیں تھی۔ سویرا کا دل کوئی ہتھیلی میں لے کر مسلنے لگا۔ وہ ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتی تھی لیکن لگتا تھا کہ ایک بھی نہ کر سکے گی۔

☆☆☆

دلاور اکثر شاہ زمان یا پیر فضل کی گاڑی ڈرائیو کرتا تھا۔ ''بیماری'' سے ٹھیک ہونے کے بعد یہ ڈیوٹی اس نے خود بڑے سائیں سے سفارش کر کے لگوائی تھی۔ وہ سویرا کی گاڑی ڈرائیو کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اس کا سامنا کرنا نہیں چاہتا تھا مگر عجیب بات تھی کہ یہاں سے جانا بھی نہیں چاہتا تھا۔

وقت پَر لگا کر اڑنے لگا تھا۔ ماروی اب بھی وقتاً فوقتاً اس سے ملنے آتی تھی مگر وہ بھی جان چکی تھی کہ ان تلوں میں تیل نہیں۔ مجبوراً سویرا بی بی کے کہنے پر اسے یہ ڈیوٹی بہر حال دینی تھی۔ حضور چانڈیو سے کیس زور و شور سے چل رہا تھا جس میں شاہ زمان کا پلڑا بھاری تھا۔ ''شان نامی باز'' ترنڈا میں سفید حویلی کے تہ خانے میں بالکل محفوظ تھا۔ وہ ایک بلینک چیک تھا۔ شاہ فرمان کی غیر قانونی اسمگلنگ جاری تھی۔ ایک دو بار اس نے سوچا کہ اس شان نامی باز کے سلسلے میں دونوں شیخوں سے خود سودا کیا جائے مگر ایسا کرنے سے اسے شاہ زمان اور پیر فضل نے باز رکھا تھا۔ ان کا کہنا تھا اس سے بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہونے کا خدشہ ہے۔

شاہ زمان کا ماروی سے آنکھ مٹکا مسلسل جاری تھا۔ یہ سویرا اور شاہ زمان کے درمیان ایک سرد جنگ تھی۔ سویرا ماروی کو شاہ زمان سے دور رکھنے کے لیے جو کر سکتی تھی، وہ کر رہی تھی...... جبکہ شاہ زمان ماروی سے قربت کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔

ملتانی دو چار دفعہ دلاور سے ملنے حویلی آیا تھا پھر واپس پنڈی چلا گیا تھا۔

دلاور کا کئی دفعہ سویرا سے آمنا سامنا ہوا تھا اور وہ کسی بہانے سے کنی کترا کر گزر جاتا تھا۔ اس کے دل کا حبس جب حد سے بڑھ جاتا تھا تو وہ رات کے وقت روہی کی طرف نکل جاتا تھا۔ ظفری اسے اکثر منع کرتا کہ رات کے وقت جھاڑیوں اور کیکر کی جڑوں میں سانپ بھی ہوتے ہیں۔ پر وہ کسی کی سنتا کب تھا۔ شیشے کی بلند دیواروں کے اندر کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ وہ رات کے وقت اکثر چلتا ہوا دور تک نکل جاتا۔ کیکٹس کے پودوں سے بچتا بچاتا۔ کیکر کے درختوں سے ہمکلام ہوتا وہ ایک ریتیلے ٹیلے سے پار ایک پستہ قد بیری کے نیچے جا بیٹھتا۔ یہ جگہ اس کی جائے پناہ تھی۔ اس سے آگے روہی کی بے آب و گیاہ بیکراں وسعتیں تھیں۔ جہاں اجنبی سناٹے ''بستے'' تھے۔ اجنبی سناٹے جو اس کا پہلا عشق تھے۔ ان سناٹوں اور سویرا کے عشق میں کتنی مماثلت تھی۔ سویرا کا عشق بھی پہلے عشق کی طرح خاموش، پراسرار اور جان لیوا تھا۔

آج بھی وہ پستہ قد بیری کے نیچے بیٹھا تھا۔ آنکھیں نم تھیں۔ شاہ زمان کسی کام کے سلسلے میں تھوڑے دنوں کے لیے کراچی گیا ہوا تھا...... حویلی کی عورتوں کا ڈرائیور بیوی کی زچگی کی وجہ سے چھٹی پر تھا اور شاہ زمان جاتے ہوئے دلاور کی ڈیوٹی زنان خانے کی ڈرائیونگ پر لگا گیا تھا۔ اس نے بہت ہاتھ پاؤں مارے تھے مگر کوئی بہانہ نہ چل سکا تھا۔

دلاور بہت رات تک پستہ قد بیری کے نیچے بیٹھا رہا اور سوچتا رہا...... سویرا کی ایک ایک بات اس کی سماعت میں گونجنے لگی...... اس کی ہر ہر حرکت...... ہر ہر ادا...... گلابی ہونٹ تھے جن کے گداز میں اس کا دل دھنستا چلا جا رہا تھا۔

یہ صرف نرم و نازک ہونٹ نہیں تھے، ایک دلدل تھی جس میں وہ ناک تک ڈوب چکا تھا۔ ہاتھ پیر منجمد تھے...... پورا جسم مفلوج تھا۔ صرف ناک سے سانس کی آمدورفت جاری تھی۔ اس کا دل بوجھل تھا۔ سانس اندر کھینچنے سے پورے جسم میں درد جاگ اٹھتا تھا۔

یکایک اس نے تیز تیز سانس کھینچنا شروع کر دیے۔ دلدل اسے نگل رہی تھی۔ وہ اچانک اتنی زور سے چیخا کہ اس کی آواز دور بیابانوں تک سفر کرتی چلی گئی۔ اجنبی سناٹوں تک پھیلتی چلی گئی...... اس نے گھبرا کر بیری کی ایک شاخ تھام لی...... یہ کانٹوں والی بیری تھی۔ کئی کانٹے اس کی ہتھیلی اور انگلیوں میں پیوست ہو گئے...... ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور رات کے اس سے ریت کے کئی ذرّے اس کی نمناک آنکھوں میں گھس گئے...... مرد تھا...... رونا نہیں چاہتا تھا...... مگر ریت کے ذرّوں نے ایک جواز پیدا کر دیا تھا۔

تم کب تک مجھ کو بھولو گے
اس دشت کی تنہا راتوں میں، اک درد جو ٹھہرا ہوتا ہے
وہ درد بھی طعنے دیتا ہے
اک ٹیس بھی اٹھ کے کہتی ہے
تم کب تک مجھ کو بھولو گے......

☆☆☆

پچھلی رات بہت دیر تک وہ روہی میں رہا تھا۔ اس نے دانستہ ایسا کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کسی بھی وقت وہ امتحان شروع ہو سکتا ہے جس سے وہ اتنے عرصے سے نظریں چراتا آیا ہے...... دلاور کے عشق کی کہانی بھی کتنی عجیب و غریب تھی۔ وہ یہاں سے فرار چاہتا تھا...... مگر حویلی چھوڑ کر جانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ وہ سویرا کی نظروں سے اوجھل رہنا چاہتا تھا مگر اس کی قربت کی خوشبو میں معطر بھی رہنا چاہتا تھا۔ شاید بلند شیشے کی دیواروں کے اندر کے تقاضے اور تھے...... شیشے کی دیواروں سے باہر لے آیا تھا اور

جس امتحان سے وہ ڈر رہا تھا، اگلی صبح وہ شروع ہو گیا...... وہ کیپ پہنے گاڑی میں بیٹھا ڈیش بورڈ صاف کر رہا تھا کہ اچانک پچھلا دروازہ کھلا اور خوشبو کا ایک جھونکا گاڑی میں داخل ہو گیا۔ یہ وہ خاص مہک تھی جو دلاور مرتے دم تک نہیں بھول سکتا تھا۔ یہ دلربا مہک تب پہلی مرتبہ اس کے نتھنوں سے ٹکرائی تھی جب ڈوبتی سویرا کو اس نے لا کر تالاب کے کنارے لٹایا تھا اور یہ خوشبو اس وقت تیز تر ہو گئی تھی جب...... اس نے اپنے ہونٹ اس کے لبوں پر ثبت کیے تھے۔

ہاں، وہ سویرا ہی تھی جو دوپٹا گلے میں ڈالے، بال لہراتی گاڑی میں داخل ہوئی تھی۔

وہ سر جھکا کر ہینڈ بیگ میں سے کچھ تلاش کرنے لگی۔ اس کے کھلے بالوں نے اس کے چہرے کو ڈھانپ لیا...... وہ دلاور کی موجودگی سے لاعلم بولی۔ ''اسلم! جلدی چلو...... مجھے یونیورسٹی جانا ہے۔'' اسلم اس ڈرائیور کا نام تھا جو چھٹی پر گیا ہوا تھا۔

''بی بی جی! کون سی یونیورسٹی......؟'' دلاور دھیمی آواز میں بولا تو جیسے سویرا ایک جھٹکے سے کسی خواب سے بیدار ہو گئی...... اس کی نسواری بالوں کی لٹیں گالوں پر جھول رہی تھیں اور حیرت سے دہن تھوڑا سا کھلا رہ گیا تھا۔ یہ ادا نہیں تھی، فطری تاثر تھا...... مگر یہ تاثر قیامت ڈھا رہا تھا...... دلاور نے ایک لمحے کے لیے یہ قیامت دیکھی تھی اور پھر فوراً نظریں جھکا لی تھیں۔

''دلاور...... تم......؟''

''جی بی بی جی...... !''

سویرا کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئی۔ اس کا دل بڑی تیزی سے دھڑکنے لگا تھا پھر وہ خود کو اعتدال پر لاتے ہوئے بولی۔ ''بہاولپور یونیورسٹی جانا ہے۔ رستہ معلوم ہے تمہیں......؟''

''بہت عرصہ پہلے آپ کو لے کر گیا تھا۔ کچھ کچھ یاد ہے۔''

''دوسرا ڈرائیور اسلم کدھر ہے......؟''

''میرا خیال ہے وہ چھٹی پر ہے۔ بڑے سائیں نے اس کی جگہ میری ڈیوٹی لگائی تھی۔''

''اچھا پھر چلو...... جو رستہ یاد ہے اس پر چلتے جاؤ...... بھول جاؤ گے تو میں بتا دوں گی۔'' دلاور نے ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا دی۔ سویرا اور دلاور معاشرتی تفاوت کے باوجود بھی اچھے دوست تھے مگر وقت نے دراڑ

ایک جھجک پیدا کر دی تھی دونوں کے بیچ...... دس پندرہ منٹ کی ڈرائیونگ کے بعد بالآخر وہ جھجک سویرا نے ہی دور کی۔
وہ ونڈ اسکرین سے پار کھلے بے آباد میدانوں کی جانب دیکھتے ہوئے بولی۔ ''دلاور! تمہیں معلوم ہے، میں تم سے سخت خفا ہوں۔''
دلاور کا تاثر ایسا تھا جیسے اس نے سویرا کی بات سنی ہی نہیں...... وہ صرف جواباً ''اچھا جی......'' کہہ کر خاموش ہو گیا۔
''تم یہ نہیں پوچھو گے کیوں خفا ہوں......؟'' سویرا کہیں دور دیکھتے ہوئے بولی۔
''آپ خود ہی بتا دیجیے......'' اس نے مختصر جواب دیا۔
''تم میری شادی میں کیوں نہیں آئے...... میں خاص طور پر تمہیں کارڈ بھی دے کر گئی تھی......'' اس کی ذات میں موجود شیشے کی بلند دیواروں کے اندر ایک دم سے بھونچال آ گیا۔ شیشے دھڑا دھڑ بجنے لگے...... اندر کی زہریلی فضا میں اذیت بڑھ گئی...... وہ بمشکل بولا۔
''بی بی جی! میں نے آپ کو بتایا تھا۔ ان دنوں میں سخت بیمار تھا...... اس لیے نہیں آ سکا......''
''بعد میں بھی تم نے مبارک دینے کی زحمت نہیں کی...... کیا ناراض تھے مجھ سے؟'' آخری جملہ بڑی دلربائی سے کہا گیا تھا۔ دلاور کے وجود کا سارا لہو جیسے اس کے دل میں اکٹھا ہو گیا۔ دل دھڑا دھڑ بجنے لگا۔ وہ بولا۔
''نہیں بی بی جی!...... میری آپ سے کیسی ناراضی۔''
''تم نے یہ بی بی جی...... کی کیا رٹ لگائی ہوئی ہے۔ سویرا نام ہے میرا......'' وہ مصنوعی غصے سے بولی۔
''نہیں بی بی جی...... اب نہیں......'' وہ روہانسا ہو گیا۔
''کیا اب نہیں......؟'' وہ حیرت سے بولی۔
''اب آپ ہمارے بڑے سائیں کی بیگم صاحبہ ہو...... اب میں آپ کو نام سے نہیں پکار سکتا۔''
''کیا اسٹوپڈ باتیں کرتے ہو......''
''آپ جو مرضی کہیں جی... اب اس منہ سے آپ کا نام ادا نہیں ہو گا۔'' دلاور نے بے پروائی سے کہا تو یکدم سے سویرا کے دل کو ایک دھچکا سا لگا...... یہ ایک الارم تھا...... ہلکا سا اینٹی کیٹر تھا۔ اس کے دل کے نہاں خانے میں جو ایک چھوٹی سی ندی بہتی تھی، اس کی لہروں میں تلاطم پیدا ہوا تھا۔ سویرا تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئی۔ گم صم بیٹھی ونڈ اسکرین سے باہر تیزی سے گزرتے ہوئے مناظر کو دیکھتی رہی...... پھر جیسے کسی خیال سے جاگتے ہوئے بولی۔
''دلاور! ماروی کے ساتھ تمہارا کیا چکر ہے......؟''
وہ پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''بی بی جی! مجھے نہیں معلوم وہ لڑکی کیوں ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ کئی دفعہ تو یوں لگتا ہے وہ مجھے نوکری سے نکلوا کے رہے گی......''
آخری بات دلاور نے اپنے پاس سے جان بوجھ کے لگائی تھی۔
سویرا ایک دم سے سیدھی ہو گئی، تھوڑے جوشیلے لہجے میں بولی۔ ''تم بالکل پروا نہ کرو...... تمہیں یہاں نوکری سے کوئی نہیں نکال سکتا...... اس کی گارنٹی میں تمہیں دیتی ہوں...... اور دوسری بات یہ کہ تم یہاں نوکر ہو بھی نہیں۔ تمہاری حیثیت کچھ اور ہے۔'' اس نے چند لمحے توقف کر کے بات جاری رکھی۔ ''اور اگر تم واقعی ماروی میں دلچسپی رکھتے ہو تو میں اس سلسلے میں تمہاری مدد کر سکتی ہوں۔''
''آپ میری کیا مدد کریں گی......؟''
''میں تمہاری شادی ماروی سے کروانے میں مدد کر سکتی ہوں۔ ویسے ایک دوست ہونے کے ناتے میں کہوں گی...... ماروی دل کی بہت اچھی لڑکی ہے...... تم دونوں ایک ساتھ بہت اچھے لگو گے۔'' سویرا کی آنکھوں میں چمک سی تھی۔
دلاور سر جھکا کے تھوڑا سا کھانسا جس سے گلے میں لگا بے بسی کا پھندا کھل گیا۔ وہ بولا۔ ''بی بی جی......! آپ کے خلوص اور تعاون کا بے حد شکریہ...... مگر میں شادی نہیں کرنا چاہتا......''
''ماروی سے نہیں کرنا چاہتے...... یا......''
''میں شادی ہی نہیں کرنا چاہتا...... پتا ہے بی بی جی...... یہ سب دل کا کھیل ہے۔ جب دل مر جاتا ہے تو ہر چیز، ہر جذبہ ایک ہی سطح پر آ جاتا ہے...... ہونے...... نہ ہونے میں کوئی فرق نہیں رہتا...... زندگی اور موت میں کوئی فرق نہیں رہتا۔''
سویرا کا دل گھبرانے لگا۔ وہ جلدی سے بات کا رخ موڑتے ہوئے بولی۔ ''آگے کسی بازار پر گاڑی روکنا، مجھے کچھ چیزیں خریدنی ہیں۔''
آگے پیٹرول پمپ کے ساتھ ایک اسنیک بار تھا۔ سویرا اندر گئی اور تھوڑی دیر بعد واپس لوٹ آئی۔ اس کے ہاتھ میں بڑا شاپنگ بیگ تھا جس میں جنک فوڈ ٹائپ بہت سی چیزیں تھیں۔
دلاور یہ نہ جان سکا کہ سویرا رو کر اپنا من ہلکا کر کے آئی ہے۔ اس کی آنکھوں کے نچلے پپوٹے...... گلابی دکھنے لگے تھے۔ باقی سفر خاموشی سے کٹا۔ دو گھنٹے کی مسافت کے بعد وہ بہاولپور یونیورسٹی پہنچ گئے۔ یونیورسٹی کے ساتھ ساتھ بہت سے کوارٹرز بنے ہوئے تھے۔ سویرا بڑا شاپر لے کر ایک کوارٹر میں گھس گئی...... اس کی وہاں سے واپسی قریباً

آدھے گھنٹے بعد ہوئی۔

وہ واپس آئی تو قدرے خوش تھی۔ بولی۔ ”چلو دلاور...... ہمیں اب صرف چند منٹ کے لیے مین بازار میں رکنا ہے۔ پھر حویلی واپس چلیں گے......“

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے جب وہ لوگ حویلی پہنچے...... گاڑی سے اترتے ہوئے سویرا بولی۔ ”دلاور! تم مجھے بی بی جی...... کہو...... یا جو مرضی کہو...... میری نظر میں پہلے بھی تم میرے دوست تھے، آج بھی میں تمہیں وہی دلاور سمجھتی ہوں۔ خود کو سنبھالو...... پہلے والے دلاور بن جاؤ...... جو ڈھیروں باتیں کرتا تھا۔ ہر کسی کا دل لگائے رکھتا تھا۔“

وہ خاموشی سے سر جھکا کر رہ گیا۔

☆☆☆

ایک دن دلاور بستر پر پڑا سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ ظفری معنی خیز انداز میں مسکراتا ہوا اس کے پاس آ گیا۔ دانت نکالتے ہوئے بولا۔ ”ایک خوش خبری ہے...... اور ایک بری خبر ہے۔ بول پہلے کون سی بتاؤں......“ ایک لمحے کے لیے رک کر اس نے سر پر ہاتھ مارا بولا۔ ”یار...... خبر اصل میں ایک ہی ہے مگر وہ کسی کے لیے اچھی ہے...... کسی کے لیے...... دل دُکھانے والی۔“

”پہیلیاں کیوں بجھوا رہا ہے...... بات بتا کیا ہے؟“

”بات اصل میں یہ ہے کہ حویلی کی رونق، حویلی سے رخصت ہو گئی...... یہ ہوئی بری خبر اور اچھی خبر یہ ہے کہ ماروی سے تیری جان چھوٹ گئی ہے۔“

دلاور کا منہ کھلا رہ گیا۔ ”واقعی؟“

”ہاں...... واقعی......! سویرا بی بی نے ماروی کا نکاح بہاولپور میں ایک بندے سے کر دیا ہے۔ ان کی ایک کلاس فیلو کا کزن بہاولپور یونیورسٹی کے کوارٹرز میں رہتا ہے۔ خوش شکل اور محنتی ہے۔ ہے بھی ماروی کی برادری کا۔ سویرا بی بی نے ماروی کی ماں سے بات کی۔ اندھے کو کیا چاہیے دو آنکھیں۔ اس نے فوراً ہامی بھر لی...... دو چار دنوں میں یہ سارا چکر چلا اور ماروی ساری حویلی کو سونا کر گئی۔“ ظفری ٹھنڈی سانس کھینچ کر بولا۔

دلاور کو یاد آنے لگا۔ سویرا اسی کے ساتھ تو بہاولپور گئی تھی۔ تو کیا وہ ماروی کے رشتے کے سلسلے میں گئی تھی؟ وہ ابھی سوچوں میں تھا کہ ظفری نے اسے کندھوں سے پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا بولا۔ ”یار!...... تو بھی پتا نہیں کیسا مرد ہے...... وہ تیرے آگے پیچھے پھرتی رہ گئی اور تو نے اس کو گھاس تک نہیں ڈالی۔“

”گھاس ڈال کے کیا کرتا......؟“

”اس سے شادی کرتا...... کم از کم حویلی کی رونق یہاں سے رخصت تو نہ ہوتی......“

”تو بہت بے غیرت آدمی ہے۔ تب وہ تیری بھابی ہوتی۔“ دلاور نے ہنس کے کہا تو حیرت سے اس کا منہ کھل گیا کھسیانا سا ہو کر بولا۔

”یارا! میں تھوڑا جذبات میں آ گیا تھا۔ پھر تو وہ واقعی ہماری بھابی بن جاتی...... سوری یار مجھے معاف کر دے...... یہ عورت ذات بڑی فتنے کی چیز ہے اور اگر خوبصورت ہو...... تو......“

دلاور نے کہا۔ ”ظفری! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی...... بڑے سائیں اور شاہ فرمان کراچی کسی کام سے گئے ہوئے ہیں۔ پیر فضل سیہون شریف عرس کی تقریبات میں مصروف ہیں۔ پیچھے سے ماروی کا نکاح۔“

”اس میں کون سی انہونی بات ہے۔ ماروی کی ماں تو بیچاری بڑے عرصے سے ماروی کی شادی کے لیے فکر مند تھی...... ماروی کی خوبصورتی نے اس کی راتوں کی نیندیں اڑا رکھی تھیں۔ بھلا ہو سویرا بی بی کا جنھوں نے خود آگے بڑھ کر یہ فرض ادا کیا ہے...... مالک ہوں تو ایسے ہوں......“

دلاور ظفری کی بات سن کر خاموشی سے اسے دیکھتا رہا پھر بولا۔ ”بڑے سائیں اور شاہ فرمان دونوں کچھ دنوں سے کراچی میں ہیں۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا۔ دونوں بھائی ہی حویلی سے غائب ہیں۔“

”تو حویلی میں رہتے ہوئے بھی حویلی میں نہیں ہوتا۔ مجھے لگتا ہے جو تو رات بہت دیر تک روہی کے ویرانوں میں بیٹھا رہتا ہے، اس نے تیرے دماغ پر اثر کیا ہے۔ ایسی کھلی جگہوں پر بھوت پریت ہوتے ہیں...... آدمی کو نقصان پہنچاتے ہیں۔“

دلاور ہنس دیا بولا۔ ”ان سے زیادہ نقصان مجھے انسانوں نے پہنچایا ہے...... تو حویلی کے اندر والی بات بتا جو میں حویلی میں رہتے ہوئے بھی نہیں جانتا۔“

ظفری دلاور کی بات پر مسکرا دیا۔ انکشاف آمیز لہجے میں بولا۔ ”وہ بازو والا معاملہ تو، تو جانتا ہی ہے نا......“

دلاور نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”اسی سلسلے میں دونوں بھائی کراچی میں ہیں۔ رحیم سائیں بھی کراچی میں ہیں۔ تم نہیں جانتے ہو گے، رحیم سائیں ...... یہ منڈ بھیرو کے پاس ایک کوٹھ کے مالک ہیں۔“

دلاور، رحیم سائیں کو جانتا تھا مگر خاموش رہا ...... سائیں وہی تھے جنھوں نے جیب تا اب ...... زخمی شاہ زمان اور سویرا کی مدد کی ......

اپنے ڈیرے پر لے آئے تھے۔ ان کی مرہم پٹی کروائی تھی، بعد میں انہیں کھانا بھی کھلایا گیا تھا۔

ظلفری کی بات جاری تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''رحیم سائیں بیچ میں پڑکر حضور چانڈیو اور بڑے سائیں کی صلح کروا رہا ہے۔ خبریں یہ آرہی ہیں۔ رحیم سائیں کافی حد تک کامیاب ہوگیا ہے۔ بڑے سائیں بھاری رقم کے عوض شان باز واپس کرنے پر راضی ہوگئے ہیں اور جو کیس عدالت میں چل رہا ہے، اسے بھی واپس لیا جارہا ہے۔''

ظلفری کچھ دیر خاموش رہا پھر انگڑائی لیتے ہوئے بولا۔ ''یارا! یہ ہمارے صاحب لوگ ویسے پیسے کے بڑے پجاری ہیں۔ دیکھونا...... ''شان'' باز خود چوری کروایا اور بعد میں بھاری رقم کے ساتھ اب واپس کیا جارہا ہے۔ حضور چانڈیو پارٹی سے حویلی پر حملے والی غلطی ہوگئی جس کی وجہ سے وہ پھنس گئے۔ اب دیکھو یہ کیس چھ مہینے چلتا رہا۔ کیس ختم کروانے کے لیے علیحدہ سے رقم لی ہے بڑے سائیں اور شاہ فرمان نے......''

''وہ کیسے......؟'' دلاور حیرت سے بولا۔

''خون بہا...... شاہ فرمان نے عدالت میں جو بیان دیا تھا، اس میں اپنا ایک بندہ مقتول بیان کیا گیا تھا۔ اسی لیے تو یہ کیس حضور چانڈیو کے گلے کا پھندا بنا رہا مگر اب یہ کیس ختم ہوگیا ہے یا ہونے کے قریب ہے۔ حضور چانڈیو سے اس بندے کا خون بہا لیا جارہا ہے۔ جو کبھی قتل ہوا ہی نہیں، کیسی لطیفے والی بات ہے۔ دو بندوں کا تبادلہ بھی ہوگا ایک وہ جو حویلی پر حملے میں پکڑا گیا تھا۔ اس کے بدلے شاہ فرمان وغیرہ اپنا ایک خاص بندہ چھڑوائیں گے۔''

''ہاں شاید دنیا ایسی ہی ہے۔'' دلاور نے کہا۔ بلند شیشوں سے پار سورج چمک رہا تھا، ہوائیں چل رہی تھیں۔ زندگی سانس لے رہی تھی۔

☆☆☆

آج دلاور کی جائے پناہ پر کچھ اور لوگ قابض ہوگئے تھے۔ ڈھولکی بج رہی تھی۔ دف بج رہے تھے۔ گھنگھروؤں کی چھنکار بیتہ قدبیری کے آس پاس رقص کررہی تھی۔ وہ چار طوائفیں تھیں جن کے جوان جسموں سے پسینا چھوٹ کر ان کی ایڑیاں بھگو رہا تھا۔ ان کے کمانوں کی طرح تنے، تنگ کپڑوں میں پھنسے، وحشی بدن میوزک کی دھن پر جلوے بکھیر رہے تھے۔ رات کے اس سمے جنریٹر کی آواز ڈھولکی اور دف کی آواز میں مدغم ہورہی تھی۔ شراب پانی کی طرح بہائی جارہی تھی۔ یہ حضور چانڈیو سے بھاری رقم وصول کرنے کا جشن تھا۔ حیدرآبادی طوائفوں نے ناچ ناچ کر روہی کی ریتیلی زمین میں دنگا مچادیا تھا۔ ایک جوان...... میلے رنگ کا سرائیکی جس نے سر پر شیشوں والی ٹوپی پہن رکھی تھی اور جس کا میلا چہرہ بھی جنریٹر کی تیز روشنی میں لشکتا تھا، کان پر ہاتھ رکھے کوئی تان لگا رہا تھا۔

طوائفوں پر جوں جوں نوٹ نچھاور کیے جاتے تھے، ان کے پیر اور زیادہ تیزی سے حرکت کرنے لگتے تھے۔

''شان'' باز تین کروڑ کے عوض حضور چانڈیو کو واپس کیا جانا تھا۔ جرگے میں طے ہوا تھا کہ رقم پہلے ادا کردی جائے گی، باز تین دن بعد حضور چانڈیو کے گوٹھ میں خود شاہ فرمان پہنچا کر آئے گا۔ اس پر بہت اعتراض تھا۔ حضور چانڈیو نے کہا تھا کہ باز رقم ادا کرتے وقت ہمارے حوالے کیا جائے۔ جس پر دونوں بھائی متفق نہیں ہوئے۔ بہت لمبی چوڑی بحث کے بعد رحیم سائیں کی گارنٹی کے ساتھ یہ معاملہ طے ہوگیا۔

رقم چوڈیرو حویلی والوں کے اکاؤنٹ میں پہنچ چکی تھی۔ جن دو بندوں کا تبادلہ ہونا تھا، وہ بھی ہوچکا تھا۔ جو آدمی حضور چانڈیو سے رہا ہوکر آیا اس کا نام ''ٹریگر'' تھا۔

اب رقم بینک میں کنفرم ہونے کے بعد فوری طور پر اس جشن کا اہتمام کیا گیا تھا۔

جشن ختم ہونے کے بعد اس رات نشے میں دھت شاہ زمان حویلی میں داخل ہوا۔ مہمان خانے میں اکڑ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''جاؤ شیرو! ماروی کو بلا کر لاؤ۔'' اس کا لب ولہجہ بالکل ٹن تھا۔

''مگر سائیں...... اس وقت...... اس وقت آپ سو جائیں۔'' شیرو نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ ''رات کا ایک بج رہا ہے۔''

''بکواس کرتے ہو...... زبان چلاتے ہو...... بڑے سائیں کے آگے...... کس حرامزادے کی مجال ہے...... جو میرے حکم کو نہ مانے...... بلاؤ...... اس ناگن کو...... جس نے...... یہاں۔'' وہ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کے بولا۔ ''یہاں ڈنگ مارے ہیں...... آج میں حساب برابر کرنا چاہتا ہوں۔''

''بہت اچھا بڑے سائیں!'' شیرو یہ کہتا ہوا پچھلے پاؤں پلٹ گیا۔ اس کی واپسی چند منٹ بعد ہوئی۔ وہ تھوڑا گھبرایا ہوا تھا۔ لرزتے لہجے میں بولا۔ ''وہ...... وہ بڑے سائیں...... ماروی تو یہاں نہیں ہے۔''

شاہ زمان گردن ٹیڑھی کرکے مخمور لہجے میں بولا۔ ''یہاں نہیں ہے...... یہ کیا بکواس کررہا ہے...... تو......؟''

''بڑے سائیں! وہ...... وہ...... اس کی ماں...... جو ہے نا...... اس نے پچھلے ہفتے نکاح کر دیا ہے اس کا...... وہ چلی گئی ہے یہاں سے......''

یہ انکشاف نشے میں دھت شاہ زمان کے لیے دھماکے سے کم نہیں تھا۔ وہ اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا سائیڈ ٹیبل پر پڑا بیش قیمت گلدان گھما کر زمین پر دے مارا۔ شیشے کا وہ گلدان کرچی کرچی ہو گیا۔ وہ ناقابلِ یقین غراتے لہجے میں بولا۔ ''لاؤ بلا کر اس کی ماں کو میرے پاس......''

اگلے چند منٹوں میں ماروی کی آدھی سوئی، آدھی جاگی ماں شاہ زمان کے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے بکھرے بالوں کو چادر میں لپیٹ رکھا تھا...... وہ حواس باختہ تھی۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اتنی رات گئے اسے کیوں بلایا گیا ہے۔ ٹوٹے گلدان کو دیکھ کر اس کی رہی سہی ہمت بھی جواب دے گئی تھی۔ شاہ زمان کی آنکھوں میں لہو اترا ہوا تھا۔ وہ آنکھوں کو سکیڑتے ہوئے، گہری خوفناک نگاہوں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ماروی...... کہاں ہے......؟''

''بڑے سائیں! اس کی شادی ہو گئی ہے...... اب وہ بہاولپور اپنے سسرال میں ہے۔''

ماروی کی ماں نے کانپتے لہجے میں کہا تو شاہ زمان ناقابلِ یقین تیزی سے آگے بڑھا۔ اس نے اس بوڑھی کمزور عورت کے بال اپنی مٹھی میں جکڑ لیے، ایک جھٹکا دیا جس سے اس کی چادر اتر گئی۔ وہ درد سے کراہ اٹھی تا بادلوں کی گرج سے لہجے میں بولا۔ ''تیری مجال کیسے ہوئی اس کی شادی کرنے کی...... بڑے سائیں کے حکم کے بغیر تو یہاں پتا بھی نہیں ہلتا...... اور تو نے...... اتنا بڑا کام مجھ سے پوچھے بغیر کر دیا......''

شاہ زمان نے ایک جھٹکے سے اسے پرے پھینکا۔ وہ نہایت قیمتی پانچ فٹ اونچے پلر گلدان پر گری۔ گلدان گرا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ ماروی کی ماں کی کلائی زخمی ہو گئی۔ گلدان ٹوٹنے سے وہ اور طیش میں آ گیا یا اسے بہانہ مل گیا۔ اس نے بوڑھی عورت کو ٹھوکر پر رکھ لیا۔ وہ چیخنے لگی۔ خدا اور رسول کے واسطے دینے لگی...... مگر الکوحل کے زیرِ اثر شاہ زمان کے کان پر جوں تک نہ رینگی...... اس کے ہاتھ اور پاؤں اس وقت رکے جب اس عورت کے منہ سے سویرا بی بی کا نام نکلا۔ وہ لرزاں روتے لہجے میں بولی۔

''بڑے سائیں......! میری کیا مجال میں آپ کے حکم کے بغیر لڑکی کی شادی کروں...... وہ تو...... سویرا بی بی نے جلدی جلدی سارا انتظام کیا...... میں نے تو ایک دو دفعہ انہیں کہا بھی تھا کہ بڑے سائیں کی اجازت کے بغیر شادی کرنا مجھے ٹھیک نہیں لگ رہا...... انہوں نے یہ جواب دیا کہ اگر بڑے سائیں نہیں ہیں...... تو کیا ہوا...... میں تو ہوں نا......''

شاہ زمان اپنی جگہ منجمد ہو گیا۔ اس کے دیدے پھیلے ہوئے تھے اور آنکھوں کی غیر معمولی چمک میں کسی آنے والے طوفان کی پیش گوئی تھی...... شاہ زمان نے رخ دوسری طرف پھیر لیا۔ شیرو نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس عورت کو اٹھایا، چادر اسے تھمائی اور اشارہ کیا کہ جلدی سے یہاں سے نکل جاؤ......

دو تین دن بالکل خاموشی سے گزر گئے۔ شاہ زمان نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا...... بس وہ ہر روز دلاور کے ساتھ ''فیروزہ'' نکل جاتا تھا۔ فیروزہ لیاقت پور اور چنی گوٹھ کے پاس ایک خوبصورت بستی تھی۔ شاہ زمان فیروزہ میں ایک دو منزلہ عالی شان مکان میں جاتا اور تین چار گھنٹے بعد وہاں سے نکلتا...... دلاور اتنی دیر باہر چھاؤں میں سستاتا رہتا۔ ایک دن شاہ زمان دو منزلہ مکان سے باہر آیا تو اس کے ساتھ بڑی سی پگڑی والا ایک ساٹھ پینسٹھ سالہ شخص بھی تھا۔ اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں پشاوری جوتی تھی اور ہاتھ پاؤں غیر معمولی بڑے تھے۔ چہرے مہرے سے پختون لگتا تھا۔ رخصت ہوتے وقت پگڑی والے نے شاہ زمان سے مصافحہ کیا اور رواج کے مطابق اس کے گالوں کا بوسہ لیا۔ شاہ زمان کافی ہشاش بشاش تھا۔ چوڑیرو پہنچنے تک وہ پچھلی سیٹ پر پُرسکون انداز میں نیم دراز رہا۔ انداز سے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس نے کوئی نہایت اہم سنگِ میل عبور کر لیا ہے۔

☆☆☆

وہ چوڑیرو حویلی کی ایک حبس زدہ شام تھی۔ سیبوں والی حویلی میں بھنگ گھوٹی جا رہی تھی۔ حویلی کے کارندے ٹیپو ٹریگر کی خوشی میں اپنے انداز میں جشن منانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ شاہ زمان بھی وہاں پر موجود تھا۔ وہ بھنگ کا رسیا تو نہیں تھا...... مگر کبھی کبھار شوق پورا کر لیا کرتا تھا۔ بھنگ بڑی بڑی تین، چار ''دوریوں'' میں گھوٹی جا رہی تھی۔ دلاور ظفری کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ اس حویلی میں آنے کے بعد اور سویرا سے ''زخم'' کھانے کے بعد اس نے ہر نشے کا ذائقہ چکھا تھا مگر فنا کی دیواریں کھڑی کرنے کے بعد اس نے یہ سب چھوڑ تو نہیں تھا...... محتاط ضرور ہو گیا تھا۔

ایک [illegible]

دودھ پھینٹ رہا تھا کہ اچانک سیبوں والی حویلی کے صدر دروازے سے دھول اڑاتی ہوئی جیپ اندر داخل ہوئی...... اس میں شاہ فرمان اور شیرو سوار تھے۔ دونوں بڑی عجلت میں جیپ سے اترے۔ چہرے بتا رہے تھے کہ کوئی خیر کی خبر نہیں ہے۔ شاہ فرمان، شاہ زمان کو نہیں دیکھ سکا۔ دھاڑتے ہوئے بولا۔ ''اوئے۔ یہ تم لوگوں نے کیا کنجر خانہ لگا رکھا ہے۔ اٹھاؤ یہاں سے سب کچھ......'' اس نے ایک میز کو ٹھوکر ماری، ایک کرسی کو اٹھا کے پرے پھینکا۔ اسی دوران میں شاہ فرمان کے بگڑے تیور دیکھتا ہوا شاہ زمان اٹھ کھڑا ہوا۔

وہاں موجود تمام کارندوں کے چہرے دھواں دھواں ہو رہے تھے۔ اسی اثنا میں شاہ فرمان کی نظر شاہ زمان پر پڑ گئی۔ وہ تیزی سے اس کی جانب بڑھا اور اس کے کان میں سرگوشی کی...... شاہ زمان بڑے بھائی کی بات سنتا گیا اور اس کے چہرے کا رنگ بدلتا گیا...... جواب میں اس نے بھی شاہ فرمان سے آہستگی سے کوئی بات کی جس کا جواب شاہ فرمان نے ہاتھ ہلاتے ہوئے دیا...... شاہ زمان کے چہرے پر پریشانی کے سائے منڈلا رہے تھے۔ اس نے دھاڑتے ہوئے کارندوں کو حکم دیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے تین جیپیں مسلح جوانوں سے لد گئیں اور دھول اڑاتی ہوئی وہاں سے رخصت ہو گئیں۔

دلاور منہ کھولے ظفری کی جانب دیکھنے لگا...... مگر ظفری بھی اس صورتِ حال سے اتنا ہی لاعلم تھا جتنا کہ دلاور...... رات گئے تک حویلی میں چہ میگوئیاں ہوتی رہیں...... مگر اصل صورتِ حال کا کسی کو اندازہ نہ ہو سکا۔

اس دن کے بعد حویلی کی فضا میں اک بے نام سا تناؤ پیدا ہو گیا۔ دبی دبی سرگوشیاں سر اٹھانے لگیں۔ ملازمین آپس میں مختلف قیاس آرائیاں کرنے لگے۔ اصل صورتِ حال کو چھپایا جا رہا تھا...... مگر سب جانتے تھے، اہم باتیں زیادہ دیر چھپی نہیں رہ سکتیں۔ اس بات کو بھی جلد ہی کھلنا تھا۔

ماروی کی شادی والے معاملے کے بعد شاہ زمان خاموش تھا اس نے سویرا کے سامنے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا تھا اور وہ کرنا بھی نہیں چاہتا تھا...... وہ سید ھا وار کرنا چاہتا تھا...... اسی سلسلے میں دلاور کے ساتھ فیروزہ چکر لگاتا رہتا تھا۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ عنقریب ایک خوبرو لڑکی اس حویلی میں سویرا بی بی کی سوتن بن کر آنے والی ہے۔

ایک دن دلاور نشست گاہ میں شاہ زمان کے پاس اکیلا بیٹھا تھا۔ موقع دیکھ کر بولا۔ ''بڑے سائیں! برا نہ [illegible] سائیں کو کچھ عرض کروں......''

وہ دلاور کی طرف دیکھے بغیر بولا۔ ''ہاں...... بولو......''

''بڑے سائیں! آپ نے مجھ سے کہا تھا...... تم سے بہت ضروری کام لینا ہے۔ مجھے یہاں رہتے ہوئے بہت عرصہ ہو گیا ہے۔ نہ آپ نے مجھ سے وہ کام لیا اور نہ ہی اس کے متعلق کچھ بتایا۔''

شاہ زمان کے چہرے پر سوچوں کا ایک جال بنا ہوا تھا۔ وہ ہاتھ کی انگلی ماتھے پر رگڑتے ہوئے بولا۔ ''بہت جلد میں تمہیں بتاؤں گا...... بس تم اپنی تیاری رکھو۔''

''بڑے سائیں! آپ حکم کریں۔ میں ہر دم تیار ہوں۔''

اسی دوران دھماکے سے دروازہ کھلا اور ادھیڑ عمر شاہ فرمان شیرو کے ساتھ اندر داخل ہوا...... شاہ فرمان کے تیور بگڑے ہوئے تھے۔ وہ شاہ زمان کے برابر والی نشست پر بیٹھ گیا۔ ماتھے پر تیوڑی ڈالتے ہوئے بولا۔ ''چاچا پیر فضل کی حضور چانڈیو سے بات ہوئی ہے۔ چاچے نے ان کو حوصلہ رکھنے کو کہا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ ہم چوڑیر دوالے [illegible] اپنی زبان سے نہیں پھرتے۔''

''تو کیا کہا حضور چانڈیو...... نے......'' شاہ زمان کے لہجے میں بھی پریشانی تھی۔

''[illegible] کہنا کیا ہے...... وہ جو حرام کا تخم...... شوکت سیال ہے نا...... وہ چانڈیو کو اکسا رہا ہے...... معاملے کو بگاڑنے کے لیے بڑھاوا دے رہا ہے...... بات کو...... کئی دفعہ تو دل میں آتا ہے اس شوکت سیال کا پتا ہی صاف کر دیں بیچ میں سے۔''

''نہیں...... نہیں...... ہم نے ایسی کوئی بے وقوفی نہیں کرنی۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں نے...... ٹریگر کو تیار کیا ہے وہ جائے گا کچے کے علاقے میں...... ٹریگر نے ہی کافی معلومات بھی اکٹھی کی ہیں۔ کھرا ڈھونڈ لیا ہے اس نے۔''

''اس کا وہاں اکیلے جانا ٹھیک ہوگا؟'' شاہ فرمان نے سوال اٹھایا۔

''نہیں...... دو بندے اور بھی اس کے ساتھ جائیں گے۔ وہ دونوں کچے کے چپے چپے سے واقف ہیں۔''

''ان کی روانگی کب تک ہوگی؟''

''دو چار دن لگ جائیں گے...... ایک ہفتہ بھی لگ سکتا ہے......'' شاہ زمان نے کہا۔

''مگر...... حضور چانڈیو......؟''

''اب اتنا انتظار تو اسے کرنا پڑے گا......'' شاہ زمان پُرسوچ لہجے میں بولا۔

(باقی اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں)

غرقِ محبت

طاہر جاوید مغل

جب جذبات میں ہلچل ہو اور دل کی دھڑکنوں میں تلاطم بپا ہو لیکن آنکھیں محبوب کا عکس قید کیے اسے ساری دنیا سے چھپا لینا چاہتی ہوں تو ایسے میں ہزاروں سوال روح میں چھید کردیتے ہیں... جسے بے تحاشا چاہا جائے اور اس کی بے خبری میں دل و جان فدا ہوجائیں تو دل سے اٹھنے والی ایک سرگوشی جیسے پوری کائنات میں ایک بھونچال لے آتی ہے... "تم کب تک مجھ کو بھولوگے" جسے چاہا جائے اور اپنایا نہ جاسکے... ایسی لمبی مسافت پیروں میں آبلے ڈالنے کے باوجود مسافر کو آگے بڑھنے سے روک نہیں سکتی۔ وہ بھی خود کو نہ روک پایا۔ اگرچہ چلنا محال تھا مگر ارادوں کی پختگی بنا منزل کی آس لیے چلنے پر مجبور کرتی رہی لیکن... قدرت کے اپنے ہی اصول ہوتے ہیں کچھ بھی "بے وجہ" ہونے کی اس کے پاس کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ پھر کیسے اس کا سفرِ محبت رائگاں جاتا... کسی کے دل میں اٹھنے والا خاموش طوفان یہ ثابت کردیتا ہے کہ محبت اپنے رستے خود بناتی ہے۔ وہ جو سارے موسم اپنے اندر سموئے محبوب کی آمد کا منتظر تھا... وہ لمحہ آیا اور ایک ہی پل میں گویا اپنی پوری زندگی جی گیا...

روح کا روح سے میل اور محبتوں کے

بے مثال اور لازوال جذبوں کی سحر انگیز داستان

دوسرا اور آخری حصہ

شاہ زمان جب سے کراچی سے لوٹا تھا، سویرا کو اس کا رویہ بدلا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ ہر طرح سے اس کی دل جوئی میں لگی ہوئی تھی۔ وہ اس کی کسی بھی بات کو رد نہیں کرتی تھی۔ ماروی کے نکاح کے بارے میں دونوں میں بس سرسری سی بات ہوئی تھی۔ ابھی پچھلے ماہ میں شاہ زمان نے ڈھکے چھپے الفاظ میں اسے کہا تھا...... کہ پھپھو عالیہ اور رمشا کو اب یہاں نہیں رہنا چاہیے...... اس میں ہماری ہی بے عزتی ہے۔ تو سویرا تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئی تھی۔ اس نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا...... مگر اگلے چند دنوں میں پھپھو عالیہ اور رمشا حویلی سے کوچ کر گئی تھیں۔ سادہ لوح سویرا نہیں جانتی تھی کہ اس کا "بڑا سائیں" دوسری شادی کی راہیں ہموار کر رہا ہے۔ وہ تو بس اس کے ہر فیصلے کے آگے سر جھکاتی چلی جا رہی تھی...... یہ سب کچھ کرنے کے باوجود بھی شاہ زمان کا انداز بدلا بدلا سا تھا۔

یہ بات سویرا کو پریشان کر رہی تھی۔ کیا عورت صرف مرد کی خدمت گزاری کے لیے بنی ہے؟ اس کو خوش رکھنا اس کا خیال رکھنا...... اس کی ضرورتیں پوری کرنا اور مرد کا جب دل چاہا ٹشو پیپر کی طرح اسے ردی کی ٹوکری میں پھینک دے...... وہ ایسا ٹشو پیپر نہیں بننا چاہتی تھی۔ اس نے تو شادی ایسے آدمی سے کی تھی جو اسے دل و جان سے چاہتا تھا۔ وہ اس کے دل میں رہنے کے لیے ہی تو سندھ یونیورسٹی سے اٹھ کر چوڈیرو آ گئی تھی مگر حالات کچھ اور اشارہ کر رہے تھے...... تقدیر کی کتاب کے ورق تیز آندھی کی زد میں پھڑ پھڑا رہے تھے اور ایسے صفحے نگاہوں کے سامنے آنا چاہ رہے تھے جن میں...... سویرا کے لیے درد ہی درد لکھا تھا...... اور یہ سب کچھ کتنی جلدی ہو گیا تھا۔

☆☆☆

پوری حویلی میں یہ بات پھیل چکی تھی کہ چوڈیرو حویلی اور حضور چانڈیو کے بیچ پھر کوئی نیا تنازعہ کھڑا ہو گیا ہے مگر اس تنازعے کی نوعیت کوئی نہیں جانتا تھا۔ جو خبریں گردش کر رہی تھیں اور جو قیاس لگائے جا رہے تھے، ان سے اندازہ ہوتا تھا کہ معاملہ پھر سے باز کا ہے۔ یوں لگتا تھا کہ پرندے کی رقم وصول کرنے کے باوجود چوڈیرو حویلی والے پرندہ حضور چانڈیو کے حوالے نہیں کر رہے۔ اگر واقعی ایسا تھا تو پھر یہ بدعہدی تھی مگر معاملے کی اصل حقیقت چند لوگوں کو معلوم تھی اور وہ خاموشی اختیار کیے ہوئے تھے۔ سننے میں یہ بھی آ رہا تھا کہ دونوں پارٹیوں کے درمیان کشیدگی اس قدر بڑھ گئی تھی کہ تصادم کا خطرہ تھا۔ کچھ سمجھدار بڑے لوگوں نے بیچ میں پڑ کر ایک جرگہ بلایا اور دونوں پارٹیوں کے صرف بڑے اس جرگے میں شریک ہوئے۔ باتوں باتوں میں آوازیں بلند ہو گئیں۔ لہجے تلخ تر ہو گئے...... بندوقیں نکل آئیں...... مگر پھر معاملہ ٹھنڈا ہو گیا۔ پیر فضل، رحیم سائیں نے اپنی پگڑیاں اتار کر پیروں میں رکھ دیں...... کچھ ضمانتوں، کچھ شرائط کے ساتھ یہ جرگہ ختم ہو گیا۔

چوڈیرو حویلی والوں کو دو ہفتے کی مہلت چاہیے تھی۔ وہ بالآخر مل گئی......

اس مہلت کے بعد یوں لگتا تھا...... حویلی میں چھائی تناؤ اور پریشانی کی کیفیت ختم ہو گئی ہے۔ ایک دن حویلی کے زنان خانے میں سیبوں کے چار کریٹ پہنچائے تھے...... ظفری...... دلاور کو اپنے ساتھ لے گیا۔ وہ نہیں جانا چاہتا تھا...... مگر ظفری ضد پر اڑ گیا۔ اس دن دلاور نے زنان خانے کو پہلی دفعہ اندر سے دیکھا۔ جس وقت وہ کریٹ برآمدے میں رکھ رہے تھے، اوپری منزل کی بالکونی جو صحن کی طرف کھلتی تھی، اس پر سویرا ایک ملازمہ کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ مرجھایا ہوا لگتا تھا۔ جونہی اس کی نگاہ دلاور سے ملی، سویرا کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی...... دلاور دل تھام کے رہ گیا۔ فنا کی دیواروں سے باہر کے منظر نے اسے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔

اس نے جلدی سے کریٹ وہاں رکھے اور وہاں سے بھاگ نکلا۔ ظفری اسے آوازیں دیتا رہ گیا مگر اس نے اپنے کمرے میں پہنچ کر ہی دم لیا۔ ابھی دوپہر تھی، رات ہونے میں کافی وقت تھا...... پستہ قد کانٹوں والی بیری والی جگہ آباد کرنے کا وقت ابھی نہیں ہوا تھا۔

ظفری کی واپسی وہاں سے ایک گھنٹے بعد ہوئی۔ وہ آیا تو اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ یوں لگتا تھا اس کے پاس کوئی اہم خبر ہے۔ آتے ہی چوکڑی لگا کر بستر پر بیٹھ گیا بولا۔ "اتنے دنوں سے جس بات نے میری نیند حرام کی ہوئی تھی، مجھے وہ پتا چل گئی۔" دلاور نے سوالیہ انداز میں اس کی جانب دیکھا تو وہ بولا۔ "تمہیں معلوم ہے اس دن جب سب لوگ سیبوں والی حویلی میں بھنگ گھوٹ رہے تھے تو چھوٹے سائیں شیرو کے ساتھ بڑی گھبراہٹ میں وہاں آئے تھے...... پتا ہے کیا خبر لائے تھے؟"

"مجھے کیا پتا......؟" دلاور بےزاری سے بولا۔

"جو باز انہوں نے ترنڈا کی سفید حویلی کے تہ خانے میں رکھا ہوا تھا وہ وہاں سے پھر چوری ہو گیا۔"

"او خدایا...... یہ کیا کہہ رہے ہو؟"

دلاور کا منہ کھلا رہ گیا۔

"جی ہاں۔ بالکل ایسا ہی ہے...... اس خبر نے چوڈیرو حویلی کو ہلا کے رکھ دیا ہے۔ سب سے پہلا شک شوکت سیال اور حضور چانڈیو پر کیا گیا۔ باز کی چوری پوشیدہ رکھی گئی اور بڑے سائیں نے اپنے گماشتے ہر طرف بھگائے...... بہت جلد ان کو معلوم ہوگیا کہ باز حضور چانڈیو نے چوری نہیں کرایا بلکہ اسے چوری کرنے والے لوگ کچے کے علاقے سے آئے تھے۔ وہ چوری شدہ باز اب راجن پور سے آگے پانی کے بہاؤ سے پار کچے کے علاقے میں ہے۔ پہلے پہلے تو یہ بات حضور چانڈیو سے چھپائی گئی۔ ایک ہفتے تک انہیں جھوٹی تسلیاں اور دلاسے دیے جاتے رہے مگر جب باز.... پہنچانے والی مہلت ختم ہوگئی...... تو حضور چانڈیو نے سنگین نتیجے کی دھمکی دے دی۔ دونوں طرف سے کشیدگی بے حد بڑھ گئی۔ اس سے پہلے کہ کوئی نئی جنگ شروع ہوجاتی، بیچ میں رحیم سائیں اور پیر فضل کود پڑے۔ انہوں نے ایک جرگے کا اہتمام کیا...... جرگے میں بھی بدمزگی ہوگئی۔ شوکت سیال بدزبان اور جوشیلا بندہ ہے۔ اس نے شاہ فرمان کے ساتھ کوئی بدتمیزی کی...... دونوں طرف سے بندوقیں نکل آئیں۔ فائر ہوتے ہوتے رہ گیا...... رحیم سائیں اور پیر فضل نے اپنی پگڑیاں اتار کر لڑنے والوں کے پاؤں میں پھینک دیں۔ اس خوفناک صورتِ حال سے نمٹنے کے بعد پیر فضل نے مخالفین کو صاف صاف بتادیا کہ باز چوری ہوچکا ہے۔ ہم لوگ وعدہ خلاف نہیں ہیں۔ جیسے بھی ہوگا، وہ باز واپس کریں گے اور پھر باز کی واپسی کے لیے دو ہفتے کی مہلت مانگی گئی۔ وہ مہلت اس شرط کے ساتھ منظور ہوئی کہ اگر شاہ زمان وہ باز دو ہفتوں میں واپس نہیں کرتا تو تین کروڑ کی رقم...... اور خون بہا والی رقم فوری طور پر حضور چانڈیو کو واپس کی جائے......"

ظفری خاموش ہوا تو دلاور کے چہرے پر حیرانی تھی۔ وہ بولا۔ "تمہیں ان باتوں کا کہاں سے پتا چلا؟"

ظفری ہنس دیا۔ "تم آم کھاؤ، پیڑ مت گنو...... ہماری پہنچ بھی حویلی کے اندر تک ہے۔" وہ آنکھ میچ کے بولا۔

☆☆☆

اس دن شاہ زمان، دلاور کو فیروزہ والی کوٹھی کے اندر لے گیا۔ دلاور اک سائڈ پر کرسی پر براجمان تھا۔ دوسری طرف بڑی میز پر بھاری جسامت والا پٹھان بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر چٹی سفید عورت بیٹھی تھی جو اس کی بیوی معلوم ہوتی تھی۔ اس عورت کے ساتھ ایک میلے سے چہرے والی عورت بیٹھی تھی۔ اس کا نام صغراں تھا۔ تیز طرار اور آنکھیں مٹکانے والی صغراں بولی۔

"مفید جان! بڑے سائیں کو تھوڑا وقت اور دو......"

مفید جان ہاتھ کھڑا کرتے ہوئے بولا۔ "ام اپنی طرف سے دو سال دینے کو تیار ہے مگر...... گارنٹی کوئی نہیں ہے۔ وہ حرام کا پلا کسی وقت بھی پہنچ گیا تو...... گڑبڑ ہوجائے گا......"

"مفید جان! گڑبڑ کو ہم سنبھال لیں گے...... مگر ابھی ایک چھوٹا سا مسئلہ ہے...... میں صرف بیس بائیس دن ہی تو مانگ رہا ہوں......" شاہ زمان نے کہا۔

چٹی سفید عورت بولی۔ "تم بیس بائیس دن کی بات کرتے ہو...... ہم ایک دو دن کی گارنٹی بھی نہیں دے سکتے...... ادھر ابھی...... ام سے صاف صاف بات کرو...... اور قصہ خلاص کرو...... پرسوں اگر تم برات لے کر آتا ہے تو ٹھیک...... ورنہ ہم یہ شادی کینسل کرے گا......" عورت جتنی خوبصورت اور نرم و نازک دکھتی تھی، اس کا لہجہ اتنا ہی کڑوا کسیلا تھا۔

صغراں بولی۔ "بڑے سائیں! آپ ایسا کریں آج مشورہ کرلیں...... کل...... آکران کو بتادیں گے......"

مشورہ کرنے کی بات پر شاہ زمان بھڑک اٹھا...... چوڈیرو حویلی کا ازلی جوشیلا خون اس کے دماغ کو چڑھ گیا۔ غصے کو حتی الامکان دباتے ہوئے بولا۔ "میں نے کس سے مشورہ کرنا ہے...... دنیا مجھ سے آکر مشورہ مانگتی ہے۔ میں یہیں کھڑے کھڑے ہر فیصلہ کرسکتا ہوں۔ وہ تو بس بیچ میں ایک اڑچن آگئی ہے۔ نہیں تو......"

طیش میں آنے کے بعد شاہ زمان نے جو فیصلہ کیا وہ سراسر مفید جان وغیرہ کی مرضی کے مطابق تھا۔ طے ہوا کہ صرف دو دن بعد ہفتے کی شام کو شاہ زمان دس پندرہ خاص بندوں کے ساتھ آئے گا اور گلِ لالہ کو نکاحی بنا کر لے جائے گا۔ اس نے مفید جان وغیرہ کو تاکید کی کہ مہمانوں کی خاطر مدارت میں کوئی کسر نہیں رہنی چاہیے۔ اس نے ایک موٹی رقم بھی اس سلسلے میں مفید جان کو دے دی۔

اور پھر ویسا ہی ہوا جیسا شاہ زمان نے کہا تھا۔ ایک شام بڑی راز داری کے ساتھ شاہ زمان خوبرو گل لالہ کو اپنی دولہن بنا کر چوڈیرو حویلی میں لے آیا۔ جن لوگوں نے نکاح میں شرکت کی تھی ان میں بڑی آپا اور نگینہ بیگم کے علاوہ دو تین ملازمائیں بھی شامل تھیں جو زرق برق کپڑوں میں شاہ زمان کی رشتے دار ہی دکھائی دیتی تھیں۔

یہ ظلم سویرا پر ہوا تھا لیکن وہ جیسے پتھر کا بت بنی ہوئی تھی۔ دو تین دن سے بالکل سکتہ زدہ سی تھی۔ وہ جان چکی تھی کہ اسے یہ سب کچھ سہنا ہے اور سہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

اس حویلی کی دیواریں بڑی اونچی تھیں۔ آج کل اس حویلی میں صرف ایک ناک کٹی نگینہ بیگم موجود تھی لیکن اس سے پہلے بھی یہاں نہ جانے کتنی ناک اور کان کٹیاں اور زندہ لاشیں چلتی پھرتی رہی تھیں، وہ سب کچھ خاموشی سے جھیل گئی تھی، آپا نے اسے یہ تسلی بھی دی تھی کہ ہو سکتا ہے کہ کڑی کو تین چار مہینے پاس رکھ کر شاہ زمان اسے فارغ کردے۔ یعنی تحفے تحائف دے کر طلاق دے دے مگر ایک راستہ تو کھل ہی گیا تھا نا، ایک کو طلاق ہو بھی جاتی تو تیسری سے بیاہ ہو سکتا تھا۔

دلاور بھی اس صورتِ حال پر ششدر رتھا۔

نئی دوہٹی باقاعدہ سجی سجائی اونٹ گاڑی پر بیٹھ کر چوڈیرو حویلی میں آئی تھی۔ شاہ زمان نے حویلی کے چھوٹے بڑے ملازموں میں خوب پیسے بانٹے تھے۔

اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں عجیب سی لالی تھی۔ چند ماہ پہلے سویرا نے بڑی ہوشیاری کا ثبوت دیا تھا اور اس کی غیر حاضری میں ماروی کا نکاح پڑھوا کر اسے چلتا کیا تھا...... اس نے بے خوفی کے ساتھ...... شیر کے منہ سے نوالہ چھیننے کی حرکت کی تھی۔

اس کے جواب میں شاہ زمان نے خاموشی اختیار کی تھی۔ تھوڑا عرصہ صبر کیا تھا اور پھر انتقامی طور پر وہ اپنے سے کئی سال چھوٹی لڑکی کو اپنی دلہن بنا کر اس حویلی میں لے آیا تھا۔ اس رات گلِ لالہ کے پاس جانے سے پہلے وہ سویرا کے پاس آیا تھا اور طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولا تھا۔

''سویرا! عورتیں ہمیشہ سے خود کو بہت دانا اور سمجھدار سمجھتی آئی ہیں۔ وہ یہ تصور کرلیتی ہیں کہ وہ مردوں کو اپنے اشاروں پر چلاسکتی ہیں مگر میں آج تمہیں بتاتا ہوں ان میں اکثر احمق ہوتی ہیں تمہاری طرح۔'' وہ انگلی سے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

سویرا بت بنی اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ آنسو لڑیوں کی صورت اس کی آنکھوں سے گرتے رہے۔ وہ اس زہر کا پیالہ لبوں سے لگائے بیٹھی تھی جس کو پینے کا تصور بھی اس کے وہم و گمان میں نہیں تھا۔ وہ سویرا کو دیکھ رہا تھا۔ وہ خاموش تھا لیکن اس کی خاموشی کہہ رہی تھی۔ ''سویرا! تم نے سوکن سے بچنے کے لیے مجھ سے ماروی چھینی لیکن سوکن پھر بھی آ گئی اور یہ سلسلہ ابھی آگے چلے گا۔''

اس قیامت خیز رات کے بعد سویرا مر گئی۔ سندھ یونیورسٹی میں چہلیں کرنے والی، ہر دم مسکرانے والی سویرا مر گئی۔ اس دن کے بعد وہ ایک زندہ لاش کے مانند ہو گئی۔ وہ زندگی کے تمام معمولات نبٹا رہی تھی مگر اس کے وجود میں کوئی چیز تھی جو فنا ہو گئی تھی۔

شاہ زمان نئی بیوی کے نشے میں مست تھا۔ وہ جو کبھی سویرا کے لیے آہیں بھرا کرتا تھا، آج یوں لاتعلق بنا پھرتا تھا جیسے اس نام کی کوئی لڑکی اس حویلی میں رہتی ہی نہ ہو۔

دلاور دو تین دفعہ گاڑی پر سویرا کو بہاولپور...... عالیہ پھپو سے ملوانے کے لیے لے کر گیا مگر سارے رستے سویرا نے دلاور سے کوئی بات نہیں کی۔ بس گم صم سی بیٹھی باہر خالی نگاہوں سے گزرتے مناظر کو دیکھتی رہتی۔ سویرا کی ایسی حالت دیکھنا دلاور کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ سویرا خود کو دنیا کی ٹھکرائی ہوئی عورت تصور کرنے لگی تھی...... مگر اس کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ کوئی ہزار ہا شدتوں کے ساتھ اسے چاہتا ہے۔ اس کی ایک مسکان کے بدلے اپنی جان لٹا سکتا ہے۔ وہ اس عشق کی شدتوں سے ناواقف تھی جو دلاور کے سینے کی گہرائیوں میں موجزن تھا۔

ایک دن بہاولپور پہنچنے پر جب نڈھال سویرا گاڑی سے اتری تو اس کا پاؤں مڑ گیا۔ وہ کراہتے ہوئے زمین پر بیٹھ گئی۔ دلاور اس کی تکلیف پر تڑپ اٹھا۔ وہ بے ساختہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور اس کے پاؤں دبانے لگا۔ اس کے چہرے پر بے پناہ کرب تھا، اس کے چہرے پر پھیلنے والے سائے اور آنکھوں کی بے قراری دیکھ کر سویرا حیران رہ گئی، ان بے قرار آنکھوں میں سیکڑوں افسانے رقم تھے۔

اس پریشان چہرے پر ہزاروں ایسی تحریریں نقش تھیں جو آج سے پہلے سویرا کو نظر نہیں آئی تھیں...... یا شاید...... یہ تحریریں ہمیشہ سے تھیں بس سویرا نے انہیں پڑھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ ایک ایک سطر پڑھتی گئی اور دل کے نہاں خانے میں جو ندی تھی اور جس کی لہروں میں کبھی کبھار تلاطم پیدا ہوتا تھا، آج وہ تلاطم حد سے زیادہ بڑھ گیا۔ اس میں موجود رنگ برنگی مچھلیاں اچھلنے کودنے لگیں۔

سویرا کھڑی ہوئی تو اس کے پاؤں میں لنگڑاہٹ تھی۔ اس نے سنبھلنے کے لیے سہارا لینا چاہا مگر دلاور کے علاوہ آس پاس کوئی ''سہارا'' موجود نہیں تھا۔ اس نے گرنے سے بچنے کے لیے دلاور کا ہاتھ تھام لیا۔ دلاور نے ڈگمگاتی سویرا کو تھام لیا اور اسے بازو سے پکڑ کر گھر کے اندر تک لے گیا۔ سویرا کی آنکھوں میں نمی تھی...... وہ نمی پاؤں کی تکلیف کی تھی یا دلاور کے سہارے کی...... دلاور یہ نہ جان سکا۔

واپسی پر سویرا قدرے بہتر تھی۔ اس نے خاموشی توڑ دی اور بولی۔ ''بہت بہت شکریہ۔''

''بی بی جی...... کس بات کا......'' وہ عقب نما آئینے

میں دیکھ کر بولا۔

''مجھے سہارا دینے کا......'' وہ ممنونیت سے بولی۔

''میں تو آخری سانس تک آپ کو سہارا دینے کے لیے تیار ہوں۔'' دل کی بات وہ زبان پر نہ لاسکا بولا۔.... بی بی جی......! ایک بات بولوں۔'' سویرا کا سوالیہ انداز دیکھ کر کہنے لگا۔''بی بی جی......! آپ خوش رہا کریں۔ آپ ایسے خاموش اور پریشان اچھی نہیں لگتیں......''

سویرا کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ بالوں کی لٹ کو دھیرے سے کان کے پیچھے اڑستے ہوئے بولی۔ ''دلاور! خوش رہنے کے لیے زندہ ہونا ضروری ہے......مگر ...... میں زندگی سے دور ہوتی جارہی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے پر بے پناہ کرب امڈ آیا۔ دلاور اس کا غم اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔

اس کے جواب میں دلاور کے ذہن میں کہنے کے لیے بہت کچھ تھا مگر وہ شیشے کی بلند دیواروں کو پھاندنا نہیں چاہتا تھا......وہ فنا کی چاردیواری سے نکلنا نہیں چاہتا تھا۔

اگلا دن دلاور کے لیے بڑا دھماکا خیز تھا۔ پوری حویلی میں ایک بھونچال سا آیا ہوا تھا۔ شام ہونے سے کچھ دیر پہلے جب شاہ زمان نئے خریدے گئے اونٹوں کا معائنہ کررہا تھا۔ اس کے ساتھ ملازمین کی ایک فوج کھڑی تھی۔ دلاور بھی ان میں شامل تھا کہ صدر دروازے کی طرف سے ایک جیپ دھول اڑاتی ہوئی آئی۔ شاہ زمان کے پاس پہنچ کر وہ جیپ ایک جھٹکے سے رکی۔ اس میں سے دو بندوق بردار بڑی سرعت سے نکلے۔ انہوں نے جیپ کی پچھلی جانب سے جھک کر ایک زخمی آدمی کو نکال کر باہر لٹا دیا، وہ ٹیپو ٹریگر تھا۔ وہ شدید زخمی حالت میں تھا اور کراہ رہا تھا۔ اس کی ایسی حالت دیکھ کر وہاں کھڑے سب لوگ ششدر رہ گئے۔ شاہ زمان غصیلے لہجے میں دھاڑتے ہوئے بولا۔''اوے...... یہ کیا ہے......کس نے زخمی کیا ہے اسے!''

''بس بہت گڑبڑ ہوگئی ہے جی۔'' بندوق بردار نے کہا، پھر وہ آگے کو جھک کر بڑی رازداری سے زمان کو کچھ بتانے لگا۔

ٹریگر سیریس حالت میں دکھتا تھا۔ شاہ زمان کے کہنے پر اسے فوری طور پر اسپتال بھجوادیا گیا۔ شاہ زمان پریشانی میں پیشانی مسلنے لگا۔ اس نے شاہ فرمان کو فون ملایا اور اس سے بات کرنے لگا......تھوڑی دیر بعد پیر فضل، شاہ فرمان کو لے کر حویلی پہنچ گیا......تینوں سر جوڑ کر حویلی کی نشست گاہ میں بیٹھ گئے......ایک گھنٹے بعد شاہ زمان نشست گاہ سے نکلا

اور اس نے دلاور کو جلدی سے گاڑی نکالنے کا کہا۔ پندرہ منٹ کی ڈرائیو کے بعد وہ لوگ نزدیکی اسپتال میں تھے۔ ٹیپو ٹریگر آئی سی یو میں تھا اور ہوش میں تھا۔ شاہ زمان کو اندر جانے کی اجازت مل گئی اور کیوں نہ ملتی۔ اسپتال کا ایم ڈی اس کا نمک خوار اور اطاعت گزار تھا۔ دلاور باہر کھڑا کھڑکی سے سب دیکھنے لگا۔ ٹیپو ٹریگر شاہ زمان سے کوئی بات کررہا تھا جسے شاہ زمان بڑے غور وانہماک سے سن رہا تھا۔ وقفے وقفے سے شاہ زمان اس سے کچھ پوچھنے بھی لگ جاتا...... یہ ملاقات آٹھ دس منٹ تک جاری رہی...... پھر شاہ زمان بڑی تیزی سے باہر نکل آیا۔

واپسی پر دلاور نے پوچھا۔''بڑے سائیں! ٹیپو بچ تو جائے گا؟''

شاہ زمان کسی خیال سے چونکا پھر تیوری چڑھاتے ہوئے بولا۔''اسے کچھ نہیں ہونے والا۔ ببر شیر ہے وہ...... حضور چانڈیو کے قبضے میں اتنی دیر رہ کر بچ نکلا ہے تو کوئی بات تو ہے نا اس میں۔''

شاہ زمان چند سیکنڈ تک مونچھوں کو تاؤ دیتا رہا پھر دلاور کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔''جیپ ذرا سامنے، ان درختوں میں روکو۔''

دلاور نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی جیپ روک دی۔ سائے گہرے ہورہے تھے۔ سورج مغربی افق میں چہرہ چھپا چکا تھا۔ دلاور سوالیہ نظروں سے شاہ زمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔''دلاور! میں نے ایک دن تجھ سے کہا تھا......کہ تجھ سے ایک بہت خاص کام لینا چاہتا ہوں۔ بس سمجھو وہ وقت آگیا۔ تو اپنے آپ کو تیار کرلے۔ آج جو کچھ ہوا ہے، اس کے بعد مجھے یقین ہوگیا ہے کہ یہ کام بس تو ہی کرسکتا ہے۔''

دلاور کی دھڑکن انتہا کو پہنچ گئی۔ وہ بولا۔''بڑے سائیں! آپ حکم کریں، جان بھی حاضر ہے۔''

شاہ زمان نے سگریٹ سلگایا اور اگلے آٹھ دس منٹ میں شاہ زمان کو جو کچھ بتایا، وہ تحیر خیز تھا۔ یہ بات تو خیر دلاور پہلے ہی جان چکا تھا کہ باز چوری ہوچکا ہے، مگر یہ خبر اسے شاہ زمان کی زبانی ملی کہ ٹیپو ٹریگر کے زخمی ہونے کی وجہ وہ باز ہی ہے۔ دراصل دو دن پہلے شاہ زمان نے اپنے اس دستِ راست کو باز کی بازیابی کے لیے ہی کچے کے ایک دور دراز گوٹھ کی طرف روانہ کیا تھا۔ وہاں کوئی بہت بڑی اور پرانی حویلی تھی جسے کچا قلعہ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ علاقے کے ایک بدنام شخص ساجے بٹھل نے وہ باز کچا قلعہ میں رکھا

ہوا تھا اور وہاں اس کی حفاظت کا محفوظ انتظام تھا۔ شاہ زمان نے جو کچھ کیا تھا پلاننگ کے ساتھ کیا تھا مگر پلاننگ کامیاب نہیں ہوئی اور ٹریگر شدید زخمی ہو کر واپس آ گیا تھا۔ دراصل کل رات، شب برات کی تھی۔ شاہ زمان وغیرہ کو معلوم ہوا تھا کہ اس تہوار کے موقع پر کچا قلعہ میں ساجے مغل کے بس دو چار پہریدار ہی موجود ہوں گے اور اگر اس موقع کا فائدہ اٹھا کر شب خون مارا جائے تو باز کو وہاں سے نکالا جا سکتا ہے۔ ٹیپو ٹریگر پرسوں بڑی رازداری سے اس مہم پر نکلا تھا مگر وہاں پہریدار توقع سے زیادہ تھے۔ یہ لوگ کچا قلعہ کے اندر بھی داخل نہ ہو پائے تھے اور دوطرفہ فائرنگ میں ٹیپو ٹریگر کو جان کے لالے پڑ گئے تھے۔

اور اب شاہ زمان یہ کام دلاور کے سپرد کرنے جا رہا تھا۔ کیوں؟ اس کا علم دلاور کو تھوڑی دیر بعد ہوا۔ شاہ زمان نے کچھ دیر تک سوچ میں غرق رہنے کے بعد کہا۔

”دلاور! کچا قلعہ کا سارا نقشہ میرے پاس ہے۔ یہ ساری عمارت ایک اونچے ٹیلے پر ہے۔ تین طرف تو ساجے کے خطرناک کارندے پہرے پر رہتے ہیں لیکن چوتھی طرف پہرے کا نظام اتنا سخت نہیں ہے۔ اس طرف ایک بڑی برساتی جھیل ہے۔ چوڑائی کوئی آدھ فرلانگ کے قریب ہوگی، لمبائی ایک ڈیڑھ میل ہے۔ اگر کوئی اچھا تیراک چوڑائی کی طرف سے اس جھیل کو احتیاط سے پار کر لے تو کچے قلعے کی پچھلی طرف سے اندر گھس سکتا ہے۔“

”احتیاط سے پار کرنے سے آپ کی کیا مراد ہے جناب؟“

”میری معلومات کے مطابق یہ حرامزادے رات کے وقت بھی جھیل پر نظر رکھتے ہیں۔ وہاں جنریٹرز ہیں اور سرچ لائٹس وغیرہ بھی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تم میری بات سمجھ رہے ہو۔ جھیل پار کرنے والے کو پانی کے اوپر آئے بغیر تیرنا پڑے گا اور پتا نہیں کیوں...... میرا دل گواہی دیتا ہے کہ تم یہ کام کر سکتے ہو۔ تمہارے اندر اس کام کو کرنے کی خداداد صلاحیت ہے۔ میں سچ کہتا ہوں، مجھے وہ منظر زندگی بھر نہیں بھولے گا......“

اس کے بعد شاہ زمان اس واقعے کی تفصیل میں کھو گیا جب دلاور نے زبردست پیراکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے شاہ زمان اور سویرا کو پانی کی بے رحم موت سے بچایا تھا۔ اب ساری کڑیاں مل رہی تھیں اور بات دلاور کی سمجھ میں آ رہی تھی ...... وہ وہیں جیپ کے نیم گرم ماحول میں بیٹھے تھے۔ شاہ زمان اور دلاور کے درمیان ایک طویل گفتگو ہوئی۔ شاہ زمان نے دلاور کو کچا قلعہ کا وہ نقشہ بھی دکھایا جو ہاتھ سے بنایا گیا تھا۔ اس میں اس خاص جگہ کی نشاندہی بھی تھی جہاں وہ نہایت قیمتی پرندہ موجود تھا۔ ایک ایسا پرندہ جس کے حصول کے لیے دو شیخوں نے سر دھڑ کی بازی لگا رکھی تھی۔ اتفاق کی بات یہ تھی کہ پرندے کو کچا قلعہ کے ایک محفوظ حصے میں رکھا گیا تھا لیکن اگر کوئی شخص پانی کی طرف سے کچا قلعہ میں داخل ہونے میں کامیاب ہو جاتا تو اس کے لیے پرندے تک رسائی چنداں مشکل نہ رہتی اور یہ بڑا اہم نکتہ تھا۔ شاہ زمان اور دلاور نے اس سارے معاملے پر بے حد تفصیل سے بات کی اور بہت سی جزئیات طے کر لیں۔

☆☆☆

یہ دو روز بعد کا واقعہ ہے۔ وہ ایک سرد تاریک رات تھی۔ سب کچھ پروگرام کے مطابق ہوا تھا۔ دلاور اپنے ساتھی بالے کے ساتھ شام کے فوراً بعد ہی کچا قلعہ کے نواح میں پہنچ گیا تھا۔ وہ دونوں، ایک ایسے لوڈر کے ذریعے یہاں آئے تھے جو یہاں دودھ کی نقل و حرکت کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے لوڈر میں جان بوجھ کر نقص پیدا کر دیا تھا اور اسے جھاڑیوں کے ایک جھنڈ میں کھڑا کر دیا تھا۔ اقبال عرف بالا لوڈر میں ہی تھا۔ دلاور جھیل کے کنارے سرکنڈوں میں چھپا ہوا تھا۔ اس نے چست پتلون قمیص پہن رکھی تھی۔ ایک فٹ کا دو دھاری خنجر اس کی ریگ زین کی جیکٹ میں موجود تھا۔ اس کے علاوہ واٹر پروف ٹارچ اور چھوٹا پسٹل بھی تھا جسے پانی کی زد سے بچانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ کچا قلعہ کا نقشہ بھی ایک پولیتھین میں لپیٹ کر اس نے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ اس کے علاوہ ایک چھوٹا واٹر کولر تھا جسے دلاور نے بیلٹ کے ذریعے اپنی کمر سے باندھ رکھا تھا۔

اگلے آدھ پون گھنٹے میں اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا لیکن اسے پروا نہیں تھی۔ یہاں اس دنیا میں تھا بھی کون اس کو رونے والا۔ اسے وہ مہربان عورت یاد آئی جس کے کچھ بال سفید اور کچھ مہندی رنگے تھے۔ وہ اس کی ماں کی طرح تھی۔ اس عورت سے دلاور کے دل کے بہت سے تار جڑے ہوئے تھے۔ جب وہ عورت اس دنیا سے رخصت ہوئی تو بہت سے تار ٹوٹ گئے لیکن بہت سے اب بھی سلامت تھے۔ اب ایک اور عورت سے اس کے دل کے تار جڑے تھے اور یہ سویرا تھی اور یہ تار اتنے مضبوط تھے کہ شاید...... دلاور کی موت پر بھی نہیں ٹوٹ سکتے تھے۔ وہ ان دنوں جو کام بھی کرتا تھا، جس طرف بھی جاتا تھا، اسے اپنے سامنے سویرا ہی نظر آتی تھی۔ اب بھی یوں تو وہ شاہ زمان کے کہنے پر ایک ”کام“ کے لیے نکلا تھا مگر اسے محسوس ہوتا تھا کہ وہ سویرا کی

خاطر سب کچھ کر رہا ہے۔ یہ کیسا ناتا تھا، کیسا رشتہ تھا؟ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا، جب سویرا کی شادی ہو گئی تو دلاور نے چوڈیرد حویلی چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر پھر شاہ زمان کے اصرار نے اسے روک لیا اور شاید وہ خود بھی رک جانا چاہتا تھا۔ خود کو اذیت دینے کے لیے یہ ایک ایسی خواہش تھی جسے وہ کبھی سمجھ نہیں پایا تھا اور اب تو صورتِ حال ایسی ہو گئی تھی کہ دلاور ہر صورت یہاں رہنا چاہتا تھا۔ اسے لگتا تھا، شاہ زمان کی دوسری شادی کے بعد سویرا پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ وہ اندر ہی اندر گھل رہی ہے، مرجھاتی جا رہی ہے، اس کی جڑیں سوکھ رہی ہیں۔ وہ اسے ایسی مخدوش حالت میں چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔ وہ اس کے آس پاس رہنا چاہتا تھا...... حویلی میں رہنا چاہتا تھا اور حویلی میں رہنے کے لیے اسے شاہ زمان کا اعتماد جیتنا تھا۔ اس پر ثابت کرنا تھا کہ وہ اس کی ضرورت ہے اور یہی ثابت کرنے کے لیے وہ آج دیوانہ وار اس سرد جھیل کے کنارے موجود تھا۔

اس نے جھیل کی خاموش سطح کو دیکھا...... ہاں وہ پانیوں کا شناور تھا۔ سرفودم گھٹ کے ''ساتھ'' اور اس کی سخت تربیت نے اسے پیراکی کے ہنر میں طاق کر دیا تھا...... وہ گہرے پانیوں کی مچھلی کی طرح ہو گیا تھا۔ گہرے پانیوں کی مچھلی جو سخت دباؤ میں بھی زندہ رہتی ہے۔ بس اپنا یہی ایک ہنر تھا جس پر وہ ناز کر سکتا تھا۔

اللہ کا نام لے کر وہ پانی میں اترا۔ غوطہ لگایا اور نیچے ہی نیچے تیرنا شروع کر دیا۔ اس کے پاس قدرت کا تحفہ تھا۔ وہ پانیوں کے نیچے سانس روک لیتا تھا اور اتنا روکتا تھا کہ کناروں پر کھڑے اس کی زندگی سے مایوس ہو کر چلانے لگتے تھے۔ آج بھی وہ اپنے اس Skill کو استعمال کر رہا تھا۔ قریباً پانچ منٹ بعد اس نے پہلی مرتبہ اپنا سر سرد پانی سے باہر نکالا...... اپنے رخ کا تعین کیا اور پھر ڈبکی لگا دی۔ دوسری مرتبہ بھی قریباً پانچ منٹ بعد ہی وہ بے آواز...... سطح آب پر ابھرا۔ ایک فکس سرچ لائٹ کی روشنی جھیل کے اس حصے کو مسلسل روشن رکھے ہوئے تھی۔ اوپر فصیل نما دیوار پر کوئی پہریدار حرکت کر رہا تھا۔ وہ ایک بار پھر پانی میں روپوش ہو گیا...... اس مرتبہ اسے زیادہ دیر پانی میں رہنا تھا۔ اس کے پھیپھڑے آکسیجن کی طلب میں پھٹنے لگے لیکن یہ مشکل ترین مرحلہ بھی بالآخر گزر گیا۔

وہ بلند دیوار کی جڑ میں اس بارشی پانی کے پائپ کے پاس پہنچ چکا تھا جس کی نشاندہی نقشے میں موجود تھی۔ یہ کوئی 30 انچ قطر کا قدیم پائپ تھا۔ شاید انگریزوں کے دور کا۔

دلاور اس پائپ میں داخل ہوا اور اپنی پنسل ٹارچ روشن کر لی۔ پائپ کے اندر بھی پانچ چھ انچ تک بدبودار پانی موجود تھا۔ جگہ جگہ جالے لگے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں مینڈکوں اور چوہوں سے بھی سابقہ پڑا مگر وہ ان سارے مسائل کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو کر آیا تھا۔ وہ کرالنگ کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا گیا۔ بالآخر عمارت کے ایک چھوٹے سے صحن میں پہنچ گیا جہاں کئی چھتوں کے پرنالے آ کر گرتے تھے۔

اب دلاور نے اپنا پستول نکال لیا اور ہر آمدہ خطرے کے لیے تیار ہو گیا۔ رات کے اس پہر کچا قلعہ کے بیشتر مکین یقیناً سو رہے تھے۔

حقیقی خطرے سے دلاور کی پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ عمارت میں قریباً سو میٹر اندر آ چکا تھا۔ ایک پرچھائیں اس پر جھپٹی۔ یہ ایک مسلح شخص تھا۔ دلاور کے جسم میں جیسے بجلیاں بھری ہوئی تھیں۔ اس نے پھرتی سے نہ صرف خود کو حملہ آور کے وار سے بچایا بلکہ اسے گھما کر اتنی زور سے ایک دیوار کے ساتھ مارا کہ وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح زمیں بوس ہو گیا۔

آواز پیدا ہوئی تھی۔ دلاور نے ایک تاریک کونے میں چھپ کر کچھ دیر ردعمل کا انتظار کیا پھر مطمئن ہو کر باہر نکل آیا۔ پہریدار کی حالت سے ظاہر تھا کہ وہ اگلے ایک ڈیڑھ گھنٹے تک تو ہوش میں نہیں آئے گا۔ دلاور نے اس کی شلوار قمیص کی تلاشی لی۔ واسکٹ کی ایک جیب سے چابیوں کا گچھا نکلا۔ ان میں سے ایک چابی بھاری بھرکم محرابی دروازے کی تھی۔ دلاور نے آواز پیدا کیے بغیر دروازہ کھولا۔ بے ہوش پہریدار کو گھسیٹ کر تیل کے ڈرموں کے پیچھے گھسیڑا اور پنسل ٹارچ سے نقشہ دیکھنے کے بعد آگے بڑھنے لگا۔ اس کا دل بڑی شدت سے دھڑک رہا تھا۔

سب کچھ ٹھیک جا رہا تھا۔ دلاور کو ہرگز توقع نہیں تھی کہ وہ اتنی جلدی مطلوبہ کمرے تک پہنچ جائے گا۔ مزے کی یہ بات تھی...... سامنے کی طرف تو ہر طرح کے حفاظتی انتظامات تھے لیکن عقبی جانب کو بڑی حد تک نظرانداز کیا گیا تھا۔ اس نے دروازے سے کان لگا کر سنا۔ کمرے میں پروں کی پھڑپھڑاہٹ اور پالتو طوطوں کی چوں چوں سنائی دی۔ بے شک یہی باز والا کمرا تھا۔ دلاور نے پستول جیکٹ میں رکھ کر دودھاری خنجر ہاتھ میں لے لیا اور دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔

''کون؟'' اندر سے غنودگی بھری آواز آئی۔

دلاور نے دوبارہ دستک دی۔ ایک جوان لڑکے نے

دروازہ کھولا اور مچی مچی آنکھوں سے دلاور کو دیکھا۔ ایک دم اس کی نگاہ دلاور کے چمک مارتے خنجر پر پڑی۔ اس نے شاید چلّانے کے لیے ہی منہ کھولا تھا لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ دلاور نے اسے جکڑ لیا اور اپنا مضبوط ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔ دائیں ہاتھ میں خنجر تھا اور یہ لڑکے کی عین شہ رگ پر تھا۔

لڑکے کی عمر اٹھارہ انیس سال رہی ہوگی۔ دبلا پتلا لیکن زور والا تھا۔ دلاور نے اس کی گردن پر خنجر کا دباؤ بڑھایا اور پھنکارا۔ ''زور مارو گے تو گردن کاٹ دوں گا، ابھی لاش پڑی نظر آئے گی۔''

وہ مچھلی کی طرح تڑپا اور دلاور کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کی۔ دلاور نے پھر سرسراتی سرگوشی کی۔ ''گردن کٹ جائے گی تیری کسی کا کچھ نہیں جائے گا۔''

لڑکے میں ہوش کم اور جوش زیادہ تھا۔ وہ پھر بے طرح پھڑکا، دونوں گرتے گرتے بچے۔ اب دلاور کے پاس اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ خنجر استعمال کرتا مگر لڑکے کی کم عمری دیکھتے ہوئے اسے ترس آیا۔ کسی ماں کا بیٹا تھا، ابھی تو اس نے جینا شروع کیا تھا...... ابھی تو شاید کسی سویرا نے اس کی زندگی میں آنا تھا، ابھی تو شاید......

اس نے گردن کے بجائے لڑکے کے پیٹ کے نچلے حصے کو نشانہ بنایا۔ خنجر پہلے لڑکے کے سویٹر پھر کپڑے اور پھر گوشت میں گھسا۔ لڑکے کی خطرناک مزاحمت یک لخت دم توڑ گئی۔ تب دلاور نے پستول کے دستے سے اس کے سر پر دو تین ضربیں لگائیں اور بوسیدہ فرش پر ڈال دیا۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

کچھ دیر خاموش رہ کر وہ اردگرد کی آہٹیں سنتا رہا پھر کمرے کی طرف متوجہ ہوا۔ یہاں اس مستطیل کمرے میں تین چار چھوٹے بڑے پنجرے تھے۔ ایک بڑے پنجرے میں کونجیں تھیں۔ ایک میں طوطے تھے۔ ایک بڑے پنجرے کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ایک حصے میں ایک مقامی شکرا بند تھا، دوسرے میں وہ نایاب عقاب تھا جس نے ان گنت لوگوں کی زندگی حرام کررکھی تھی۔ وہ واقعی بے مثل پرندہ تھا۔ پروں کی چوڑائی حیران کن تھی۔ اسے دیکھ کر دل پر ایک ہیبت سی طاری ہوتی تھی۔ دلاور ظفری کے ساتھ ایک بار پہلے بھی اسے دیکھ چکا تھا۔

اس پنجرے میں اس نایاب پرندے کے آرام و آسائش کا خصوصی خیال رکھا گیا تھا۔ اسے بے قراری سے بچانے کے لیے اس کے سر پر مخمل کی اندھیاری چڑھائی گئی

تھی۔ اس اندھیاری نے دلاور کا کام آسان کردیا۔ دلاور نے اپنی پشت سے بندھا ہوا چھوٹا واٹر کولر اتارا، اس کا ڈبل ڈھکنا کھولا اور کولر کو پنجرے کے بالکل سامنے کردیا۔ جونہی دلاور نے پنجرے کا دروازہ کھولا، پرندہ آگے بڑھا...... چند لمحے کے لیے ٹھٹکا پھر کولر میں داخل ہوگیا۔ دلاور نے کولر کے دونوں ڈھکنے بند کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ اس واٹر کولر میں اتنی آکسیجن تو بہرحال موجود تھی کہ یہ نایاب پرندہ اگلے ایک گھنٹے تک زندہ سلامت رہ سکتا تھا۔

لڑکا بے ہوش تھا۔ اس کے زخم سے خون تو بہہ رہا تھا مگر اتنا زیادہ نہیں۔ دلاور امید کرسکتا تھا کہ اسے بچا لیا جائے گا۔ واٹر کولر کو ایک بار پھر اپنی پشت سے باندھنے کے بعد دلاور نے پستول اپنے ہاتھ میں لیا اور واپس چل پڑا۔ ابھی وہ ڈکیتوں کے اس ڈیرے سے باہر نہیں نکلا تھا۔ ٹھنڈے پانی کی جھیل میں بھی نہیں اترا تھا لیکن اس کی چھٹی حس پکار پکار کر کہنے لگی تھی کہ وہ اپنی اس مہم میں کامیاب ہو چکا ہے۔

☆☆☆

دلاور نے واقعی ایک کارنامہ انجام دیا تھا۔ بغیر کسی بڑے خون خرابے کے وہ ساجے جیسے خطرناک شخص کی کچھار میں گھس کر اس کو ایک ''زبردست چپت'' لگا آیا تھا اور گوہر مطلوب حاصل کرلیا تھا۔ وہ باز واقعی دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا اور اگر اس کی وجہ سے دو وسیع دست وگریباں تھے تو بات سمجھ میں آتی تھی۔

باز کو شاہ زمان کے حوالے کرنے کے بعد دلاور ایک طرح سے اپنی ذمے داری سے عہدہ برآ ہوگیا تھا۔ اس کے بعد دلاور نے اس امر میں زیادہ دلچسپی نہیں لی کہ باز کہاں پہنچایا گیا، کس نے پہنچایا اور اس کے نتائج کیا نکلے۔ بس ایک دن پیر فضل کی زبانی اسے اتنا پتا چلا کہ پرندہ حضور چانڈیو کو مل گیا ہے اور وہ تنازعہ جو دن بدن شدت اختیار کرتا جا رہا تھا، اب تقریباً ختم ہے۔

اس واقعے کے بعد حویلی والوں کی نگاہ میں اور خاص طور سے شاہ زمان کے نزدیک دلاور کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوگیا تھا۔ ایک روز دلاور کو زبردست سرپرائز ملا۔ اسے شاہ زمان نے بلایا۔ وہ اس کی بیٹھک میں پہنچا تو وہاں اس کے کئی عام اور خاص ملازم موجود تھے۔ ان سب کے سامنے شاہ زمان نے دلاور کے شانے پر ایک خاص قسم کی شال رکھی اور چھوٹے چھوٹے شیشوں سے مزین ایک نہایت قیمتی ٹوپی اسے پہنائی گئی۔

''تم آج سے میرے ''کارخاص'' ہو۔'' شاہ زمان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

سب حاضرین نے اسے مبارک باد دی۔ ''کارِ خاص'' کا لفظ حویلی میں دراصل اہم ترین ملازم کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اسے ایک طرح سے شاہ زمان کا مشیر اور ملازمین کا انچارج بھی کہا جاسکتا تھا۔ یہ ''اعزاز'' اس سے پہلے ٹیپو ٹریگر کو حاصل تھا مگر زخمی اور بیمار ہونے کے بعد ٹریگر کی کارکردگی وہ نہیں رہی تھی لہٰذا اسے آرام دیا جارہا تھا۔

یہ اور بات ہے کہ یہ آرام ٹیپو ٹریگر کو ہضم نہیں ہوا۔ ایک دو دن میں ہی دلاور کو اندازہ ہوگیا کہ ٹریگر اور اس کے ساتھیوں کی آنکھوں میں اس کے لیے نفرت چمکنے لگی ہے۔ بہرحال دلاور ایسی باتوں کی پروا کرنے والا نہیں تھا۔ حقیقی معنوں میں اگر اس حویلی میں اسے کسی کی پروا تھی تو وہ صرف اور صرف سویرا تھی۔ سویرا بھی جانتی تھی کہ دلاور نے شاہ زمان کے کہنے پر خود کو ایک زبردست خطرے میں جھونکا ہے اور ساجے کے ڈیرے سے قیمتی باز نکال لایا ہے...... جس کے صلے میں اسے ''کارِ خاص'' بنایا گیا ہے۔ وہ اس صورتِ حال پر خوش تھی۔ شاہ زمان کی دوسری اچانک شادی نے سویرا کو کچھ دیر کے لیے بالکل مرجھا ڈالا تھا مگر اب وہ آہستہ آہستہ اس صدمے سے سنبھلنا شروع ہوگئی تھی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اس جال میں کتنا بھی پھڑپھڑائے گی، خود کو زخمی کرنے کے سوا کچھ نہیں کر پائے گی۔ ایک ناک کٹی عورت یہاں پہلے ہی موجود تھی، وہ دوسری بننا نہیں چاہتی تھی۔ کسی وقت سویرا سے دلاور کا آمنا سامنا ہوتا تو سویرا کی حسین آنکھوں میں دلاور کو اپنے لیے کئی خاموش سوال نظر آتے۔

وہ جیسے خاموشی کی زبان میں اس سے پوچھتی، کون ہو تم؟ کہاں سے آئے ہو؟ کیوں تنہا درخت کی طرح اکیلے ہو؟ کیوں کسی بچھڑی ہوئی کونج کی طرح دل گرفتہ ہو؟ کیوں اپنی زندگی کو سنبھالتے نہیں ہو؟ کیوں اپنے ویران گلشن کو آباد نہیں کرتے ہو؟ زندگی اتنی بے وقعت تو نہیں، اسے یوں برباد کیوں کررہے ہو؟

ان سارے خاموش سوالوں کا دلاور کے پاس ایک ہی جواب تھا اور پتا نہیں کیوں، کبھی کبھی دلاور کو یقین ہونے لگتا کہ وہ بھی اس جواب کے بارے میں جانتی ہے......

شاہ زمان اب دلاور کو اکثر اپنے ساتھ رکھتا تھا اور عموماً اس سے حویلی کے اہم معاملات میں مشاورت بھی کرتا تھا۔ ایک رات دیر تک وہ نشست گاہ میں دلاور کے ساتھ بیٹھا سگریٹ پھونکتا رہا۔ گفتگو کے دوران میں ایک بار پھر ساجے اور اس کے کرتوتوں کا ذکر چھڑ گیا۔ دلاور نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ''بڑے سائیں! ایک سوال بڑے دنوں سے میرے ذہن میں اٹکا ہوا ہے۔ کافی عرصہ پہلے آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ دلاور، تم سے ایک خاص کام لینا ہے اس لیے حویلی میں ہی رہوں...... آپ نے کہا تھا نا......؟''

''ہاں کہا تھا...... اور کام لیا بھی تو ہے۔ تمہیں ساجے کے ڈیرے میں گھسایا اور تم نے وہ کر دکھایا جو شاید کوئی دوسرا نہ کرپاتا۔''

''یہی تو سوال ہے سائیں! آپ نے حویلی میں رہنے والی بات مجھ سے کافی عرصہ پہلے کہی تھی، اس وقت تو باز چوری نہیں ہوا تھا۔ نہ ہی آپ کو یہ پتا تھا کہ اسے چوری کرنے والا اسے کہاں لے کر جائے گا......''

''مجھے پتا نہیں تھا لیکن پھر بھی پتا تھا۔'' شاہ زمان ہولے سے مسکرایا۔

''کیا مطلب؟''

''سمجھو کبھی کبھار مجھے آنے والے وقت کا پہلے سے پتا چل جاتا ہے۔ جیسے الہام سا ہوجاتا ہے۔ میرے دل میں اچانک یہ بات بیٹھ جاتی ہے کہ فلاں کام ہوگا اور اس طرح ہوگا۔ ہر آنے والے دن کے ساتھ یہ بات پختہ ہوتی جاتی ہے، بس ساجے مغل والا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا......''

اس نے اس سلسلے میں کچھ اور مثالیں بھی پیش کیں۔ اس نے کہا کہ شروع میں جو جیپ والا حادثہ پیش آیا تھا، اس سلسلے میں بھی اس کے ذہن میں پہلے سے ایک بڑا مضبوط شک اور خوف موجود تھا۔ وہ ایک طرح سے غیب دانی کا دعویٰ کررہا تھا لیکن وہ غیب دان نہیں تھا...... کیونکہ اس واقعے سے بے خبر تھا جو اگلے چند گھنٹوں میں پیش آنے والا تھا۔

اس رات شاہ زمان اور دلاور دیر تک باتیں کرتے رہے۔ شاہ زمان نے بتایا کہ اس نے پولیس کے ایک اعلیٰ افسر سے بات کی ہے۔ کچھ دنوں تک ساجے کے خلاف ایک بڑا آپریشن ہوگا اور علاقے سے یہ ''بیماری'' دور ہوجائے گی۔ اس کے بعد کچے میں ایک دو بڑے رقبے خریدنے اور ان کو آباد کرنے کی راہ ہموار ہوجائے گی۔ اس کے ذہن میں اس حوالے سے ایک دو شاندار منصوبے تھے۔ وہ علاقے کی سیاست کے بارے میں بھی پُرجوش تھا۔ وہ ایک ایسے شخص پر سرمایہ کاری کرنے کا منصوبہ رکھتا تھا جو ایک صوبائی نشست آسانی سے جیت کر اس کے دستِ راست کا کردار ادا کرسکتا تھا۔ شاہ زمان نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیتے ہوئے کہا۔ ''دلاور! میں تمہارے آنے والے دن بڑے چمکدار دیکھ رہا ہوں۔ تمہارے اندر کوئی خاص بات ہے...... اور میں چاہتا ہوں کہ تمہیں اس حویلی میں

تمہارا صحیح مقام ملے۔''

دلاور ممنونیت سے سر جھکا کر رہ گیا تو شاہ زمان بولا۔

''میں نے شیرو سے اور بالے سے کہہ دیا ہے۔ رائفلیں تیار رکھو۔ صبح ہم نے بصیرت پور کے میلے میں سور کے شکار کے لیے جانا ہے...... تم نے کبھی...... شکار کیا ہے...... سور کا......؟''

دلاور کے نفی کے جواب میں شاہ زمان بولا۔ ''بڑا مزے دار اور بڑا دل جگرے والا شکار ہوتا ہے یہ...... تمہیں یہ سب کچھ آنا چاہیے......'' پھر شاہ زمان آخری سگریٹ بجھاتا ہوا اٹھ گیا اور بولا۔ ''جاؤ آج جلدی سو جاؤ...... صبح شاید جلدی نکلنا پڑے۔'' شاید اسے خود بھی اپنی نئی بیوی کے پاس جانے کی جلدی تھی۔ کل سویرا سے ملنے کے بعد وہ حد سے زیادہ مضطرب تھا۔ آج نیند کہاں آنی تھی...... آج بہت دنوں بعد اس کا رخ پستہ قد بیریوں کی جانب ہو گیا۔ وہ اپنی جائے پناہ کی طرف چلا جا رہا تھا۔ ابھی وہ ریت کے بلند ٹیلے سے پار نہیں اترا تھا کہ ایک مخصوص سرسراہٹ، ایک ہلکے شور نے اس کے پاؤں جکڑ لیے۔ یکایک اس کی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھ گئیں...... اس کے سر سے عین اوپر تارے جگمگا رہے تھے مگر مشرق کے افق کی جانب تارے ناپید تھے اور اس کی جگہ سیاہی اور دھول سی تھی۔ دلاور کو سمجھنے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ یہ ریت کا طوفان تھا۔ ایسا ہی ایک طوفان پہلے بھی آیا تھا۔ وہ سرعت سے واپس پلٹا اور اس نے حویلی کی طرف دوڑ لگا دی۔ دوڑتے ہوئے اس نے کندھے پر رکھا کپڑا ڈھاٹے کی صورت چہرے اور سر پر لپیٹ لیا۔ اس کے حویلی میں داخل ہونے اور کمرے میں پہنچنے تک ریتیلا طوفان شروع ہو گیا۔ کھڑکیاں دروازے بجنے لگے۔ ہوا سیٹیاں بھرنے لگی۔ ظفری بے خبر سو رہا تھا۔ دلاور بستر میں دبک کر بیٹھ گیا۔

ہوا میں ایسی آوازیں تھیں جیسے بہت سی عورتیں کہیں بین کر رہی ہوں۔ بین کی آوازیں ہمیشہ اسے پریشان کرتی تھیں۔ آدھے سفید آدھے مہندی لگے بالوں والی عورت کی میت پر بھی عورتوں نے بہت بین کیے تھے۔

تب سے وہ بین کی آوازوں پر کانوں پر ہاتھ رکھ لیا کرتا تھا۔ اب بھی یہی ہوا تھا۔ اس نے کانوں پر دونوں ہاتھ جما دیے تھے۔ چند منٹ تک ایسے کی چلتا رہا پھر ہوا کا شور رک گیا...... اس نے کھڑکی کھول دی اور جالی کے ساتھ منہ لگا کر باہر کے ماحول کا اندازہ لگانے لگا۔ اچانک اسے محسوس ہوا کسی کے چلانے کی آوازیں آ رہی ہیں۔ اس نے اسے واہمہ جانا...... مگر ایک مختصر لمحے کے بعد آواز میں شدت آ گئی...... وہ کسی بچے یا کسی عورت کے رونے کی آوازیں تھیں۔ دلاور چھلانگ لگاتے ہوئے اپنے بستر سے اٹھا، رائفل اتار کر ہاتھ میں لی اور باہر دوڑتا چلا گیا...... آندھی تھم چکی تھی مگر ہوا ہنوز چل رہی تھی۔ وہ جوں جوں آواز کی سمت چلتا گیا۔ رونے اور واویلا کرنے کی آوازوں میں شدت آتی گئی۔ یہ کسی عورت کے رونے کی آوازیں تھیں جو حویلی کے کسی کمرے سے آ رہی تھیں۔ دلاور کے پاؤں بجلی کی سی تیزی سے اٹھنے لگے، ابھی وہ کوریڈور میں پہنچا تھا کہ کوئی وزنی چیز اس کے کندھے سے اس زور سے ٹکرائی کہ رائفل ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری۔ وہ کوئی اٹھائیس تیس سالہ جوان تھا جس کی شیو بڑھی ہوئی تھی۔ رنگ صاف، آنکھوں میں سرمہ اور سر پر تلے والی ٹوپی تھی۔ اس کے ہاتھ میں خون آلود خنجر تھا۔ وہ ہانپ رہا تھا اور نتھنے پھولے ہوئے تھے۔ سرمہ لگی آنکھیں لال انگارہ ہو رہی تھیں۔ اس نے آگے بڑھ کر ایک بھرپور وار سیدھا دلاور کے سینے پر کیا۔ دلاور نے خنجر والی کلائی پکڑ لی پھر اپنی ٹانگ کا وار اس کے پیٹ پر کیا۔ وہ اچھل کے گرا اور دوہرا ہو گیا۔

خنجر ابھی اس کے ہاتھوں میں تھا۔ وہ ہمت کر کے دوبارہ کھڑا ہوا، بے دریغ خنجر چلاتے ہوئے ایک طرف کو بھاگ کھڑا ہوا...... دلاور واپس پلٹا۔ اس نے اپنی رائفل اٹھائی۔ ابھی وہ حملہ آور کی طرف سیدھی کرنا چاہتا تھا کہ اس نے ایک روح فرسا منظر دیکھا۔ حملہ آور بھاگتے بھاگتے رک گیا۔ اس نے تذبذب کے عالم میں دلاور کی طرف دیکھا پھر خنجر سے اپنی شہ رگ کاٹ لی۔ وہ دو چار قدم چلا پھر کوریڈور کے چپس لگے فرش پر گرا اور تڑپنے لگا۔ اتنی دیر میں حویلی کے ملازمین جاگ چکے تھے اور بھاگم بھاگ وہاں پہنچ چکے تھے۔ ہر طرف ہلچل تھی۔ دلاور کوئی موقع ضائع کیے بغیر اس کمرے کی جانب بڑھ گیا جہاں سے ابھی تک رونے اور بین کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ آواز کا اندازہ لگاتا ہوا دلاور ایک کمرے کے پاس پہنچ گیا......

دروازہ کھلا ہوا تھا اور رونے کی آوازیں اندر سے آ رہی تھیں۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے کا اندرونی منظر لرزا دینے والا تھا۔ شاہ زمان آدھا بیڈ پر اور آدھا کارپٹ پر تھا۔ اس کا پیٹ پھٹا ہوا تھا اور انتڑیاں باہر نکلی پڑی تھیں۔ بیڈ کا ایک کونا خون سے رنگین ہو چکا تھا۔ کارپٹ کا ایک حصہ بھی خون سے لتھڑ چکا تھا۔ نئی نویلی کم سن دلہن کا گلا رو رو کر بیٹھ چکا تھا۔ اب وہ ہذیانی انداز میں پھٹی پھٹی نگاہوں سے ادھر اُدھر بکھری چیزوں کو

دیکھ رہی تھی۔ دلاور نے اس چھوٹی سی عمر کی دلہن کو بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور کمرے سے باہر نکال دیا۔ کمرے سے باہر عورتوں کا جمگھٹا لگ چکا تھا۔ پھر کچھ عورتیں سراسیمہ حالت میں کمرے میں داخل ہوئیں۔ اچانک جیسے کلیجا پھاڑ دینے والے بین شروع ہو گئے۔

دلاور کی آنکھوں میں نمی تھی۔ چوڈیرو حویلی کا بڑا سائیں اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ وہ جو رات کو شکار کا پروگرام ترتیب دے رہا تھا اور دلاور کے آنے والے کل کے لیے پیش گوئیاں کر رہا تھا، اپنے کل سے کتنا بے خبر تھا۔ وہ بے خبر انسان آج دنیا سے اٹھ گیا تھا۔ یہ سب کیا تھا؟ کیسے ہوا تھا؟ یہ ساری کہانی مختصراً یوں تھی...... جس کم سن خوبرو لڑکی کو شاہ زمان اپنی دلہن بنا کر لایا تھا، اسی کا منگیتر بنوں سے چلا آیا تھا۔ جان ہتھیلی پر رکھ کر حویلی میں گھسا تھا۔ سوچے ہوئے منصوبے کے تحت اس نے شاہ زمان کو قتل کیا تھا۔ وہ اپنی منگیتر کو ساتھ لے جانا چاہتا تھا مگر لڑکی کے شور مچانے اور مزاحمت کرنے پر وہ بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ راستے میں اس کا ٹاکرا دلاور سے ہو گیا تھا۔ دلاور سے لڑائی کے دوران اس نے اپنی شہ رگ کاٹ کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا تھا۔ شاید اسی لڑکے کی وجہ سے لڑکی کے والدین چاہتے تھے کہ شاہ زمان جلد سے جلد برات لے کر آ جائے۔ وہ ساری گفتگو دلاور کے ذہن میں گونجنے لگی۔ شاہ زمان نے ایک دن سویرا سے کہا تھا۔ ''عورتیں خود کو بہت دانا اور سمجھدار سمجھتی ہیں مگر وہ اصل میں احمق ہوتی ہیں، تمہارے جیسی......'' اس نے سویرا کی طرف انگلی سے اشارہ کیا تھا۔

وہ عورت تھی، کمزور تھی۔ وہ تب خاموش رہی تھی۔ نوعمر دلہن کے حویلی میں آنے سے اس پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی مگر آج وہی دلہن شاہ زمان کی موت کا سبب بن گئی تھی۔ آج کوئی غائبانہ آواز کہہ رہی تھی... مرد خود کو بہت دانا اور سمجھ دار سمجھتے ہیں مگر ان میں سے بھی کچھ احمق ہوتے ہیں۔ تمہاری طرح۔ ''شاید'' یہی مکافاتِ عمل تھا۔ کتنی جلدی اور کتنی آسانی سے ختم ہوئی تھی کہانی اس حویلی کے وڈے سائیں کی۔ دلاور کو یقین نہیں آ رہا تھا...... کسی کو بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔

☆☆☆

ہوائیں بدل گئی تھیں، موسم بدل گیا تھا۔ روہی سے آگے جو کیکر کے درخت تھے، ان پر بور آنا شروع ہو گیا تھا۔ اب روہی کی جانب سے چلنے والی ہواؤں میں ٹھنڈک ہوتی تھی۔ شاہ زمان کو دنیا سے رخصت ہوئے پانچ چھ ماہ کا عرصہ بیت چکا تھا۔ شاہ فرمان ''بڑے سائیں'' کی ''گدی'' سنبھال چکا تھا۔ پیر فضل اکثر علیل رہتے تھے۔ خاوند کی موت کا شدید صدمہ سہنے کے بعد سویرا اب سنبھلنا شروع ہو گئی تھی۔ نوعمر بیوہ اپنے وارثوں کے پاس واپس جا چکی تھی۔

دلاور حویلی کا کارِ خاص ہونے کے ناتے تمام حویلی والوں کی آنکھوں کا تارا بن چکا تھا۔ وہ پھر سے باتونی اور ہر ایک کا دل بہلانے والا بن چکا تھا مگر اندر تو وہی اندھیرے تھے۔ اب بھی جب گھٹن حد سے بڑھ جاتی تھی، ... رات کے اندھیرے میں، جب روہی کی فضائیں سوتی تھیں۔ حویلی کے مکین خواب خرگوش کے مزے لوٹتے تھے، وہ پستہ قد بیریوں کی طرف نکل جایا کرتا تھا۔ نشہ اس نے چھوڑ دیا تھا۔ عرصہ پہلے سویرا کو لکھا ہوا خط آج بھی اس کی پاکٹ میں موجود تھا۔ وہ خط جو اپنی ''منزل'' پر نہیں پہنچ سکا تھا۔ آج بھی اپنی نارسائی پر روتا ہوا پلاسٹک کے کور میں محفوظ تھا۔ وہ خط دلاور نے پہلے دن سے خود سے جدا نہیں ہونے دیا تھا...... اور...... وہ کیسے ہونے دیتا۔ اس پرانے خط میں اس کی سانسیں قید تھیں۔ اس خط کو اس کی موت کے بعد ہی منظرِ عام پر آنا تھا۔ وہ اکثر رات کے سناٹے میں بیریوں کے نیچے بیٹھا سویرا کی لکھی ہوئی نظم دہراتا تو اسے یوں لگتا کہ سویرا اسے بہت پہلے سے جانتی ہے۔ شاید سیکڑوں...... شاید ہزاروں سال پہلے سے...... جب اس روہی کی جگہ بستیاں آباد تھیں۔ وہ انہی بستیوں کے کسی نیم تاریک گھر کے کسی ویران کونے میں بیٹھ کر اپنے ''محبوب دلاور'' کے لیے ایک نظم تخلیق کرتی ہے اور وہ اشعار لکھتے وقت نہیں جانتی کہ ہزاروں سال بعد یہاں کوئی بستی نہیں ہوگی...... صرف اور صرف ریت ہوگی اور روہی کی بیکراں وسعتیں ہوں گی...... اور رات کی خاموش تنہائی میں جب سارا جگ سوتا ہوگا کوئی دلاور پستہ قد بیریوں کے نیچے بیٹھا یہ اشعار دہرا رہا ہوگا۔

تم کب تک مجھ کو بھولو گے
اس دشت کی تنہا راتوں میں اک درد جو ٹھہرا ہوتا ہے
وہ درد بھی طعنے دیتا ہے
چپ چاپ سا سسکیاں لیتا ہے
اک ٹیس بھی اٹھ کے کہتی ہے
تم کب تک مجھ کو بھولو گے......
صحرا کی جھلسی دوپہروں میں، کچھ ان دیکھی سی راہیں ہیں
کچھ ان دیکھے سے سائے ہیں
جو سنگ سنگ میرے چلتے ہیں
اور ان سایوں کی بستی میں

اک گرم دوپہر کی مستی میں
اِک خام خیال سی ہستی میں
کچھ اَن چھوئے سے جذبے ہیں
اَن جانے سے موسم ہیں
جو اکثر مجھ سے کہتے ہیں
تم کب تک مجھ کو بھولو گے!

سویرا اسے بھولنے کا کہتی تھی۔ وہ بھلا اسے کیسے بھول سکتا تھا۔ اس کی سانسوں میں، اس کی نس نس میں سویرا سا چکی تھی۔ ایک عورت کی جدائی اس نے روتے ہوئے برداشت کرلی تھی مگر تب وہ چھوٹا تھا، ناسمجھ تھا مگر اب کی بار وہ دھوکا نہیں کھانا چاہتا تھا۔ ماں بچے کو چھوڑ کر جانے لگے تو وہ روتے ہوئے اس کا دامن تھام لیتا ہے، بلکتے ہوئے آسمان سر پر اٹھالیتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسا ہی بچہ بن چکا تھا۔ ہر رشتے سے محروم دلاور سویرا کو اپنی نگاہوں سے دور ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ کچھ اور نہیں چاہتا تھا۔ بس اس کے قریب رہنا چاہتا تھا۔ بس ایک فاصلہ رکھ کر اس کے ہر دکھ سکھ میں شریک ہونا چاہتا تھا۔

ٹیپو ٹرگیر صحت یاب ہوکر حویلی میں آچکا تھا۔ وہ شاہ فرمان کا بہت خاص اور لاڈلا تھا۔ حویلی میں جو کچھ ہو رہا تھا، دونوں دیکھ رہے تھے۔ دلاور یہاں ہر دلعزیز تھا۔ حویلی کے مکین اس سے بے حد خوش تھے اور خاص طور سے سویرا کی نوازشیں تو بے انتہا تھیں۔ سویرا اس سے یوں رویہ رکھتی تھی جیسے وہ حویلی کا ملازم نہ ہو بلکہ کوئی بہت قریبی رشتے دار ہو۔ شاہ فرمان کو یہ باتیں ایک آنکھ نہ بھاتی تھیں۔ وہ ایسے موقعوں پر کچھ کر نہیں سکتا تھا، صرف جل بھن کر رہ جاتا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ سویرا ہمیشہ سے من موجی ہے اور وہی کرتی ہے جو اس کے دل میں آتا ہے۔ سویرا ایک پڑھی لکھی ہوش مند لڑکی تھی۔ شاہ فرمان اس پر زیادہ سختی کرتے ہوئے ہچکچاتا تھا۔ ورنہ حویلی کی عام عورتوں کے حوالے سے وہ بڑا سنگدل تھا۔ چند دن پہلے اس نے اپنی ایک جوان ملازمہ کو پانچ گھنٹے کے لیے ایک کتے کے ساتھ ''ڈاگ ہاؤس'' میں بند کر چھوڑا تھا۔ ملازمہ کا خوف سے جو حال ہوا، بیان سے باہر تھا۔ ملازمہ کا قصور صرف اتنا تھا کہ اس نے شاہ فرمان کے اس لاڈلے کتے کو باورچی خانے میں دیکھ کر ناک بھوں چڑھائی تھی...... شاہ فرمان من پسند ملازماؤں سے تعلقات استوار کرنا بھی اپنا حق سمجھتا تھا۔

ایک دن تنہائی میں شاہ فرمان ٹرگیر سے بولا۔ ''تو دل چھوٹا نہ کر...... میں نے کچھ سوچا ہے اور بہت جلد ہمیں اس پر عمل کرنا ہے۔''

''بڑے سائیں! دلاور بڑا چالباز ہے۔ اس نے سویرا بی بی کو اپنے ہاتھوں میں کیا ہوا ہے۔ مجھے تو ڈر ہے کہیں...... لوگ باتیں بنانا نہ شروع ہوجائیں۔''

''میں نے کہا نا...... خود کو حوصلے میں رکھ...... یہ کام جوش کا نہیں ہوش کا ہے۔ ہر جگہ طاقت ہی مسئلے حل نہیں کرواتی...... کبھی کبھی اس سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔'' شاہ فرمان اپنی انگلی کنپٹی سے ٹکراتے ہوئے بولا۔

''تو کیا...... دلاور...... کو باہر...... باہر سے...... ہی......'' ٹیپو ٹرگیر نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''او نہیں اوئے...... تو بھی کسی سورنی کا بچہ ہے۔ ہر وقت...... خون خرابا...... قتل و غارت۔ میں نے پہلے بھی تجھے کہا ہے۔ ہوش سے کام لے...... دلاور کو چاچا پیر فضل کی تھپکی بھی ہے۔ ان کو کسی گڑبڑ کا پتا چل گیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔''

''تو پھر...... آپ کے دل میں کیا ہے؟''

''کل کا دن انتظار کر میں پرسوں تجھے سب کچھ بتاؤں گا۔'' شاہ فرمان کی آنکھوں میں شیطانی چمک تھی۔ ٹیپو ٹرگیر ان آنکھوں کی کہانی پڑھ رہا تھا۔

سویرا دلاور سے ہمیشہ کی طرح بے تکلف تھی۔ وہ اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی تھی۔ دلاور انجان تھا...... وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ سویرا اس کے احساسات سے لاعلم ہے مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں سویرا نے اس کی الماری کی تلاشی لی تھی اور وہاں سے برآمد ہونے والے رومال...... گھڑی...... ٹوٹی چوڑیوں...... اور ایک ورق پر لکھی ہوئی نظم نے سارے راز کھول دیے تھے...... یہ چیزیں اس کا پول نہ بھی کھولتیں تو ایک عورت کی حس پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ دلاور کے دل میں کچھ ہے۔ سویرا دلاور کے لیے جو کچھ کررہی تھی، اس کی وجہ یہی رہی تھی۔ اس کے دل میں ابھرنے والے انجان جذبے جب زور پکڑتے تھے اور وہ جو ایک دل کے نہاں خانے کی ندی تھی، اس کے پانیوں میں خوفناک اچھال پیدا ہوتا تھا تو وہ حد سے زیادہ پریشان ہوجاتی تھی۔ متضاد کیفیت کا شکار ہوجاتی تھی...... وہ سر تھام کر بیٹھ جاتی تھی...... بھیانک چیخیں اس کے وجود میں گونجنے لگتی تھیں...... خود کو مجرم عظیم سمجھنے لگ جاتی تھی...... جب جب ایسی حالت ہوتی تھی، تب تب وہ نماز پڑھتی تھی۔ کفارے کے طور پر دلاور کی بے پناہ دل جوئی میں لگ جاتی تھی لیکن ساتھ ساتھ ڈرتی بھی تھی کہ لوگ غلط مطلب نہ لینے

لگیں۔ وہ بھی ایسی ہی ایک شب تھی۔ رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ یہ آنسو بھی اس کی خاموش محبت کی طرح نہ سمجھ آنے والے تھے۔ وہ ایسی محبت کا شکار ہو چکی تھی...... جس کی اسے خود بھی خبر نہ تھی اور اگر تھی بھی...... تو اس پر معاشرتی جبر کا اتنا موٹا اور دبیز پردہ پڑا ہوا تھا کہ پہچان ناپید تھی۔

اس نے آنسو پونچھے اور ایک ڈائری نکال لی جس پر اس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی نظم درج تھی...... تم کب تک مجھ کو بھولو گے۔

وہ نظم دہرانے لگی۔ اچانک ساتھ والے کمرے میں کھٹکا ہوا...... پہلے اس نے وہم جانا...... مگر دوبارہ آہٹ ہونے پر وہ اٹھی اور دبے پاؤں دروازے تک گئی۔ جس دروازے پر سویرا کھڑی تھی، وہ جڑواں کمروں کا درمیانی دروازہ تھا۔ دوسرے کمرے کا ایک دروازہ باہر بھی کھلتا تھا۔ اس دروازے میں تھوڑی سی درز موجود تھی۔ سویرا ڈرتے ہوئے آگے بڑھی۔ اس نے وہ دروازہ کھول کر باہر نگاہ دوڑائی...... باہر مہیب سناٹا اور روہی کی جانب سے آنے والی مدھر ہوا تھی...... اس نے دل میں سوچا شاید وہ رات کو دروازہ لگانا بھول گئی ہے۔ اس نے کنڈی چڑھائی اور واپس پلٹی۔ ابھی وہ چار پانچ قدم ہی چلی تھی کہ الماری کے پیچھے سے ایک ہیولا برآمد ہوا۔ وہ ایک ڈھاٹا پوش تھا۔ اس نے اپنا سر، کان، چہرہ ایک موٹے کالے کپڑے میں لپیٹ رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ اس نے اشارے سے سویرا کو چپ رہنے کا حکم دیا۔ خوف سے سویرا کی آنکھیں باہر کو ابل پڑیں...... سخت گھبراہٹ کے عالم میں سویرا کی نگاہ ڈھاٹا پوش کے عقب میں پڑی جہاں ایک کالے رنگ کا تھیلا...... زیورات اور نقدی سے بھرا ہوا تھا۔ ساری بات سویرا کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ حلق کی پوری قوت سے چیخی...... ڈھاٹا پوش بجلی کی سی تیزی سے اس کی جانب بڑھا...... وہ پچھلے قدموں پلٹی اور بھاگی...... ڈھاٹا پوش نے ایک جست لگاتے ہوئے اسے دبوچ لیا...... سویرا بری طرح چیخنے چلانے اور ہاتھ پیر مارنے لگی۔ وہ اس کی گرفت سے نکلی جا رہی تھی۔ وہ ہاتھ بڑھا کر اس کا منہ بند کرنا چاہ رہا تھا۔ سویرا نے کئی تھپڑ اس کے منہ پر جڑ دیے اور ناقابلِ یقین انداز میں اسے ایک دھکا دیا...... وہ دیوار سے ٹکراتے ٹکراتے بچا...... وہ دروازے کی طرف بڑھی اور دروازہ کھولنا چاہتی تھی کہ ڈھاٹا پوش نے اسے عقب سے تھام لیا اور اٹھا کر بیڈ پر پھینکا۔ سویرا کے ہاتھ میں شیشے کا لیمپ آ گیا۔ اس نے گھما کر ڈھاٹا پوش کے سر پر وار کیا۔ وہ جھکائی دے کر سر بچا گیا...... شیشے کا لیمپ اس کے کندھے پر لگ کر چکنا چور ہو گیا۔ وہ دوسرا لیمپ بھی آزمانا چاہتی تھی کہ وہ جست لیتا ہوا بیڈ پر چڑھ گیا۔ اس نے لیمپ سویرا کے ہاتھ سے چھینا اور دو تین تھپڑ جڑ دیے۔ وہ چکرا کر اس کے ساتھ آ لگی...... ڈھاٹا پوش غصے سے دیوانہ ہو چکا تھا۔ شیطانی حس بیدار ہوئی اور وہ سویرا پر پل پڑا۔ وہ اسے نوچنے کھسوٹنے لگا۔ سویرا کے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹ گئے۔ لانبی سنواری زلفیں بکھر کر منتشر ہو گئیں۔ اس کی پیش قدمی نہیں رکی۔ سویرا اسے خدا رسول کے واسطے دینے لگی۔ مگر وہ اس پر حاوی ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے سویرا کو نیچے گرا لیا تھا...... وہ چیخ رہی تھی۔ مدد کے لیے پکار رہی تھی۔ اسی دوران باہر کا دروازہ بجنے لگا۔ ڈھاٹا پوش اپنی جگہ پر ٹھٹکا۔ پھر اس نے سویرا کو چھوڑ دیا۔ بڑی سرعت سے دوسرے کمرے میں گیا۔ نقدی اور زیورات والا تھیلا اٹھایا اور دوسری طرف والا دروازہ کھول کر کسی چھلاوے کی طرح تاریکی کا حصہ بن گیا۔

دروازہ دھڑ دھڑانے والی بڑی آپا تھیں۔ سویرا نے دروازہ کھولا۔ بڑی آپا اندر آئیں تو ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ سویرا کی حالت بری ہو رہی تھی۔ اس کے کپڑے جا بجا پھٹے ہوئے تھے۔ نچلا ہونٹ پھٹ گیا تھا۔ بڑی آپا نے کلیجا تھام لیا۔ چیختے ہوئے بولیں۔ ''سویرا! کیا ہوا ہے تجھے؟''

سویرا جواب میں کچھ نہیں بولی۔ بڑی آپا کے گلے لگ کر سسکیاں بھرنے لگی۔ صبح تک یہ خبر پوری حویلی میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی تھی۔ ہر ایک کی زبان پر یہ کہانی تھی کہ رات سویرا بی بی کے کمرے میں کوئی بندہ گھسا تھا۔ پہلے اس نے تجوری خالی کی۔ اس کے بعد سویرا بی بی کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی۔

وہ تو شور شرابے سے بڑی آپا کی آنکھ کھل گئی اور وہ موقع پر پہنچ گئیں...... نہیں تو...... سویرا بی بی کے ساتھ پتا نہیں کیا ہو جاتا۔ یہ بہت بڑا واقعہ تھا...... بہت بڑا۔

شاہ فرمان کا پارہ ساتویں آسمان کو چھو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں چھوٹ رہی تھیں۔ اس کا کہنا تھا کہ میں ہر قیمت پر اس بندے کو ڈھونڈ نکالوں گا...... اور پھر ایسی سزا دوں گا کہ اس کی اگلی پچھلی نسلیں بھی یاد رکھیں گی۔ اس نے حویلی کی بہو کی عزت پر ہاتھ ڈال کر اپنی قبر خود کھودی ہے۔ ڈکیتی سے اگلے دن شاہ فرمان نے دو نہایت

تربیت یافتہ کھوجی بلالیے...... آتے ہی انہوں نے اپنی تفتیش کا آغاز کردیا۔ صدر دروازے کے محافظین کے مطابق ڈکیت باہر سے نہیں آیا تھا۔ دو گھنٹے کی ان تھک محنت کے بعد کھوجیوں نے صدر دروازے کے محافظین کی بات کی تصدیق کردی...... ڈکیت حویلی کے اندر ہی موجود تھا۔ کھرا ڈھونڈتے ہوئے انہیں ایک پرانا لائٹر...... ایک سرخ رنگ کا بال پوائنٹ ملا تھا۔ شاہ فرمان نے حویلی کے تمام داخلی دروازوں کو بند کروادیا تھا۔ اس کا کہنا تھا جب تک تفتیش مکمل نہیں ہوجاتی، حویلی کا کوئی بندہ باہر نہیں جائے گا...... ڈکیت کو ڈھونڈنا شاہ فرمان کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ بن چکا تھا۔ حویلی کو سیل کردیا گیا...... کھوجیوں نے اپنا ایک اور ساتھی بہاولپور سے بلوالیا۔

شاہ فرمان نے حویلی کے نچلے درجے کے تمام ملازمین کو ایک کمرے میں اکٹھا کرلیا۔ دہاڑتے ہوئے بولا۔ ”اوئے کتے کے پترو...... مجھے صاف صاف بتادو...... یہ کام کس کا ہے...... بندہ تو میں نے ڈھونڈ ہی نکالنا ہے۔ اگر خود بتادو گے تو سزا کم اذیت ناک ہوگی...... ورنہ تم سور کے تخم مجھے اچھی طرح جانتے ہو...... دندوں والی چھری سے کھال اتروادوں گا میں تمہاری سب کی...... بولو اوئے...... جواب دو کوئی......“ شاہ فرمان نے ایک دو کے منہ پر تھپڑ جڑ دیے۔ ایک کے زیر ناف ایسی ٹانگ ماری کے وہ دہرا ہوگیا۔ ٹیپو ٹریگر بھی ان پر پل پڑا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں دو چار کے منہ پھٹ گئے۔ ایک ملازم آنکھ پہ ہاتھ رکھ کر بے تحاشا چلانے لگا۔ شاہ فرمان دوبارہ گرجا۔ ”اوئے ننگا کرو اوئے ان سب کو...... میں ان کی ماں کی......“

پانچ چھ ملازمین جو ان میں تگڑے تھے، ان کے کپڑے اتروالیے گئے۔ صرف جسم پر ایک انڈرویئر رہنے دیا گیا۔ الٹا لٹکا کر ٹیپو ٹریگر انہیں بید کے ڈنڈے سے پیٹنے لگا۔ ان کی چیخ وپکار سے دلاور کا دل گھبرانے لگا، آدھ گھنٹے تک بہیمانہ تشدد چلتا رہا۔ کسی نے اعتراف جرم نہیں کیا۔

شام نے ابھی اپنے پر نہیں پھیلائے تھے۔ روہی کی طرف سے اٹھنے والی ہواؤں میں ابھی ہلکی سی حدت برقرار تھی۔ کھوجیوں نے شاہ فرمان کو اپنے پاس بلالیا۔ وہ سگار کے کش لیتا ہوا وہاں پہنچا تو ایک اہم خبر اس کی منتظر تھی...... کھوجیوں نے انتھک محنت کرکے ڈکیت کے جوتی کے نشانوں کا کھرا ڈھونڈ نکالا تھا اور ان نشانوں کی نشاندہی حیرت انگیز طور پر ٹیپو ٹریگر نے کی تھی۔ وہ حویلی کا پرانا نمک حلال تھا۔ ایسے معاملات میں اس کی حس بے حد تیز تھی۔ یہ پشاوری جوتی کے نشان تھے جو کوریڈور سے نکلتے ہوئے باغیچے میں آئے تھے۔ پھر درختوں سے پرے چلے گئے تھے۔ کھوجیوں نے سفوف ڈال کر ان نشانات کو مزید واضح کرلیا تھا۔

اگلا مرحلہ نہایت اہم اور دلچسپ تھا۔ حویلی کے تمام ملازمین کی جوتیاں ایک جگہ اکٹھی کرلی گئیں۔ یہاں تک کہ دلاور اور ٹیپو ٹریگر کی جوتیاں بھی ان میں شامل تھیں۔ ایک گھنٹے کی مزید عرق ریزی کے بعد نتیجہ صفر نکلا...... کسی جوتی کے تلے کا ڈیزائن مطلوبہ نشانوں پر پورا نہیں اترا......

شاہ فرمان عجیب کشمکش کا شکار ہوگیا۔ وہ پریشانی سے پیشانی مسلنے لگا۔ دلاور اور ٹیپو ٹریگر اس کے قریب کھڑے تھے۔ وہ دھیرے سے ان سے مخاطب ہوا بولا۔ ”کہیں وہ بندہ حویلی کے باہر سے تو نہیں آیا تھا؟“

دلاور نے شاہ فرمان کے خدشے سے اتفاق کیا مگر ٹیپو ٹریگر...... ایک نہایت ہوشیار اور تیز رفتار آدمی کا نام تھا۔ جھٹ سے بولا۔ ”بڑے سائیں! سب ملازمین کے کمروں کی تلاشی لی جائے، کیا پتا...... مطلوبہ جوتی کہیں سے برآمد ہوجائے۔“ ٹیپو ٹریگر کی بات پر شاہ فرمان یوں چونکا جیسے اسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آگئی ہو۔ اس نے تعریفی نظروں سے ٹیپو ٹریگر کی جانب دیکھا پھر اگلے چند منٹوں میں ٹیپو ٹریگر کے دیے ہوئے مشورے پر عمل شروع ہوگیا۔

تین کھوجی اور حویلی کے چار بڑے ملازمین حویلی میں ملازمین کے ہر کمرے کی تلاشی لینے لگے۔ آدھے گھنٹے بعد مطلوبہ جوتی دلاور کے کمرے کی الماری کے عقب سے برآمد ہوگئی...... ظفری پچھلے ایک ہفتے سے کراچی میں تھا۔ اسے شاہ فرمان نے کسی ضروری کام سے وہاں بھیجا ہوا تھا۔

زمین وآسمان دلاور کی نگاہوں میں گھوم گئے...... وہ تقریباً ہکلاتے ہوئے بولا۔ ”یہ...... یہ کیا ہے......؟“

”یہ وہ چپل ہے جس کی تلاش میں ہم سب مارے مارے پھر رہے ہیں۔“ ٹیپو ٹریگر غصیلے لہجے میں بولا۔ اس نے اپنے ساتھ کھڑے کھوجی کے ہاتھ سے وہ کاغذ کا بڑا پرچہ جھٹکے سے چھین لیا۔ جس پر زمین پر جابجا نمودار ہونے والے ”فٹ پرنٹ“ کو کاپی کیا گیا تھا۔ ادھیڑ عمر شاہ فرمان کے ماتھے پر کئی سلوٹیں نمودار ہوچکی تھیں۔ وہاں موجود سب لوگوں کے منہ حیرت سے کھلے ہوئے تھے۔ ٹیپو ٹریگر نے جوتی کا ایک پیر ”فٹ پرنٹ“ پر رکھ دیا۔ جوتی کا وہ پیر پورا پورا ”فٹ پرنٹ“ پر بیٹھ گیا۔

شاہ فرمان کا رخ اب دلاور کی جانب تھا۔ اس کے نتھنے پھولے ہوئے تھے...... پھنکارتے لہجے میں بولا۔

"اوئے...... یہ...... سب کیا ہے...... یہ جتی تیری ہے۔"

"بڑے سائیں! یہ جوتی میری ہی ہے...... مگر یہ یہاں کیسے آئی...... میں نہیں جانتا...... میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔"

"اوئے پر یہ جُتی...... یہاں کیا انڈے دے رہی ہے۔" شاہ فرمان حلق کے بل چیخا۔

"بڑے سائیں! مجھے پھنسایا جارہا ہے۔ میں اس حویلی کا نمک حلال ہوں...... اس حویلی کے لیے میں اپنی جان پر بھی کھیلا ہوں۔ میں ...... بھلا یہ سب کیسے کرسکتا ہوں...... آپ کی سوچ پر افسوس ہورہا ہے۔"

"اوئے میں تجھے ابھی بتاتا ہوں۔ تو ہے کیا...... تو نے کب سے اس گھر کی عزت پر آنکھ رکھی ہوئی ہے۔ اوئے میں تیری آنکھیں چھرے سے نکال کر زمین پر ڈال دوں گا۔"

ٹیپو ٹرگر جوشیلے انداز میں دھاڑتے ہوئے آگے بڑھا تو شاہ فرمان نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ بولا۔

"اوئے نہیں اوئے......! اسے اپنی صفائی کا موقع ملنا چاہیے...... اتنی جلدی فیصلہ نہیں کرنا ہے۔"

دلاور کا دماغ گھن چکر بنا ہوا تھا۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں دم توڑ گئی تھیں۔

حویلی کے تمام داخلی اور خارجی دروازے بند کردیے گئے تھے۔ تفتیش نے جو نیا رخ اختیار کیا تھا، اس نے سب کو حیران کررکھا تھا۔ دلاور باری باری حویلی کے سب بڑوں کے پاس گیا۔ شاہ فرمان، پیر فضل، بڑی آپا...... اس نے سب کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اسے پھنسایا جارہا ہے۔ وہ تو اس حویلی کے لیے اپنی جان قربان کرسکتا ہے۔ وہ سوچ بھی کیسے سکتا ہے کہ اس طرح کی گھناؤنی حرکت کرے۔ اس نے بڑی آپا سے کہا۔ "آپ جانتی ہیں مجھ سے پہلے ٹیپو ہی حویلی کا "کارِ خاص" تھا۔ میرے منع کرنے کے باوجود اللہ بخشے شاہ زمان صاحب نے یہ ذمے داری مجھے دے دی۔ ٹیپو اور اس کے ساتھیوں نے دل میں میرے لیے رنجش پالی ہوئی ہے۔ وہ مجھ سے بدلہ لینے کی کوشش کررہے ہیں۔"

بڑی آپا نے کہا۔ "میں جانتی ہوں تم ایسے نہیں ہو۔ تم نے حویلی کے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ پر اب ...... جو کچھ سامنے آرہا ہے اس کا کیا مطلب لیا جائے۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ ابھی ملازم فرزند نے بتایا ہے کہ تمہارے کمرے میں سے شراب کی بوتلیں بھی نکلی ہیں۔ کئی ایک نے گواہی دی ہے کہ تم کبھی کبھی اتنا نشہ کرتے ہو کہ تم سے کھڑا نہیں ہوا جاتا۔ وہ کہتے ہیں کہ تم نے جو کچھ کیا ہے اسی نشے میں کیا ہے۔"

وہ بولا۔ "بڑی آپا! میں آپ کو ماں کی طرح سمجھتا ہوں، یقین کریں ایک عرصے سے میں نے اس گندی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔ وہ ایک چھوٹا سا دور آیا تھا جب میں نے پریشانیوں سے گھبرا کر اس منحوس چیز کا سہارا لیا تھا لیکن اب تو......"

اچانک دلاور کو خاموش ہونا پڑا۔ ایک اندرونی کمرے سے سویرا نکلی تھی۔ سیاہ چادر میں لپٹی ہوئی...... رنج وغم کی تصویر...... آنکھیں سوجی ہوئیں۔ اس نے دلاور کی طرف نہیں دیکھا۔

دلاور نے جیسے تڑپ کر کہا۔ "بب...بی بی جی۔ آپ ہی بتائیں۔ کیا میں ایسا کرسکتا ہوں؟ مجھ پر جو الزام لگایا جارہا ہے، وہ درست ہوسکتا ہے؟ آپ اپنے دل سے پوچھیں...... آپ کا دل کیا کہتا ہے۔ میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں کہ آپ کا دل جو بھی کہے گا وہ میں مان لوں گا۔ چاہے وہ گناہ میں نے کیا ہو یا نہ کیا ہو۔"

وہ عجب دل گرفتہ آواز میں بولی۔ "میں کیا کہوں؟ مجھے تو لگتا ہے کہ میں اندھی، گونگی اور بہری ہوچکی ہوں۔ میرے بارے میں جو کچھ بھی کہنا یا کرنا ہے، دوسروں نے کرنا ہے۔" وہ سسکی اور ایک دم پلٹ کر واپس چلی گئی۔

وہ رات دلاور نے جاگ کر گزار دی۔ جب وہ حد سے زیادہ پریشان ہوتا تھا تو...... روہی میں بلند ٹیلے سے پار پستہ قد بیریوں کے پاس چلا جایا کرتا تھا مگر حویلی کے کرتا دھرتاؤں نے آج اس سے یہ حق بھی چھین لیا تھا، کمرے میں بیٹھے بیٹھے گھٹن بڑھنے لگی تو وہ باہر نکل گیا۔

اس کا رخ سیبوں والی حویلی کی جانب ہوگیا۔ سیبوں والی حویلی کے اندر ایک بلند گھاٹی سی تھی جس پر بیٹھ کر روہی کا نظارہ کیا جاسکتا تھا۔ وہ رات کے اس پہر اس گھاٹی پر پہنچ گیا۔ وہ وہاں بیٹھ کر پستہ قد بیریوں کا نظارہ کرنا چاہتا تھا۔ مگر حویلی سے باہر مہیب تاریکی منہ کھولے کھڑی تھی۔ جس طرح حویلی کے لوگوں نے اس سے منہ موڑ لیا تھا، آج دشت کے نظارے اور پستہ قد بیریوں نے بھی اس سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی۔ جیسے آپس میں سب ملے ہوئے تھے۔

وہ وہاں بیٹھا رہا۔ شاید ایک گھنٹا، شاید ڈیڑھ دو گھنٹے۔ صرف اجنبی سناٹے ہی تھے جو اس کے دل کی زبان پڑھ رہے تھے...... اور کیوں نہ ہوتے ...... وہ اس کا پہلا عشق جو تھے۔

وہ گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا تھا کہ کسی نے اس کے

کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے چونک کر نگاہ اوپر اٹھائی تو وہ حویلی کا ملازم بالا تھا۔ اس کے چہرے پر بے پناہ اضطراب تھا بولا۔ ”چلو...... تمہیں بی بی جی بلا رہی ہیں۔“

”کون بی بی جی...؟“ دلاور نے چندھیائی ہوئی نگاہوں سے اس کی جانب دیکھ کر کہا۔

”سویرا بی بی نے تمہیں بلایا ہے۔“ وہ ہانپی ہوئی آواز میں بولا۔ دلاور کے اندر یک ایک امید کی کرن جاگی۔ اسے لگا کہ سویرا کی طرف سے اس کے لیے ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آئے گا اور شکوک کے وہ سارے زہریلے بادل بکھر جائیں گے جو اس کی سانس روک رہے تھے۔

مگر جب وہ دھڑکتے دل کے ساتھ زنان خانے میں سویرا کے روبرو پہنچا تو وہاں کچھ اور ہی منظر نظر آیا۔ آنسو سویرا کے رخساروں پر بہہ رہے تھے اور آنکھوں میں دنیا جہان کی دکھ آمیز حیرانی سمٹی ہوئی تھی۔ وہ عجب دردناک لہجے میں بولی۔ ”دلاور! میں اب بھی یقین نہیں کر پا رہی۔ مجھے اب بھی آس ہے کوئی ایسی بات سامنے آجائے گی جو سارے حالات کو غلط ثابت کر دے گی......“

”آپ...... کن حالات کی بات کر رہی ہیں؟“

اس نے لرزتے ہاتھوں کے ساتھ ایک طلائی نیکلس دلاور کے سامنے کیا اور بولی۔ ”یہ بڑی آپا کی ملازمہ صفیہ سے ملا ہے۔ مار کھا کر اس نے اعتراف کیا ہے کہ یہ نیکلس بدھ کی رات تم نے اسے تحفے میں دیا تھا اور کہا تھا کہ وہ تمہارے ساتھ بہاولپور چلے تم اسے عیش سے رکھو گے......“ آخری الفاظ کہتے کہتے سویرا کا گلا رندھ گیا۔

دلاور تڑپ کر بولا۔ ”یہ جھوٹ ہے...... سراسر الزام ہے۔ اسے...... میرے سامنے لائیں، مجھے اپنی مری ماں کی قسم ہے بی بی...... یہ سفید جھوٹ ہے، مجھے نہیں پتا۔ یا تو اس کڑی کو بہت مارا پیٹا گیا ہوگا...... یا اس نے لالچ میں آکر یہ بیان دیا ہوگا...... آپ...... آپ مجھے یہ بتائیں، آپ کا اپنا دل کیا کہتا ہے؟ میں ایسا نیچ ہو سکتا ہوں؟ میں یہ سب کر سکتا ہوں......؟“

سویرا نے جیسے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھوں میں پریشانی، تذبذب اور رنج کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ دلاور کچھ اور کہتا، بڑی آپا تیزی سے اندر آگئیں۔ بڑی آپا کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ وہ چلا کر بولیں۔ ”بس...... بس اب صفائیاں پیش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اور نہ ہمیں تمہاری صفائیاں سننے کی ضرورت ہے۔ سب کچھ چٹے دن کی طرح سامنے آگیا ہے...... سب کچھ......“

سویرا نے ذرا تعجب سے بڑی آپا کی طرف دیکھا۔ اسی دوران میں شاہ فرمان، پیر فضل اور نیپو ٹرنگر وغیرہ بھی دندناتے ہوئے اندر آگئے۔ شاہ فرمان نے سویرا کو بتایا کہ اس کا سارا چوری شدہ زیور دلاور کے کمرے کے فرش سے نکلا ہے۔ اینٹیں اکھاڑ کر زیور وہاں دبایا گیا تھا اور اینٹیں دوبارہ بڑی صفائی سے جوڑ کر اوپر جستی پیٹی رکھ دی گئی تھی۔ مٹی میں لتھڑے ہوئے کئی گہنے شاہ فرمان کے ہاتھ میں تھے۔

اس سے پہلے کہ دلاور اپنے دفاع میں کچھ کہتا بڑی آپا تیزی سے آگے آئیں اور ان کا زناٹے دار تھپڑ دلاور کے رخسار پر پڑا۔ وہ بالکل ہکا بکا رہ گیا۔ تھپڑ پڑنے کی دیر تھی کہ یکایک شاہ فرمان کے تنومند کارندے دلاور پر جھپٹ پڑے۔ وہی کارندے جن کا وہ ”کارِ خاص“ تھا۔ جو کل تک اسے سلام کرتے تھے، اس کا حکم مانتے تھے، اسے لاتوں اور گھونسوں کے ساتھ بے دردی سے پیٹنے لگے۔

ایک کہرام سا مچ گیا تھا۔ بڑی آپا کی چلاتی ہوئی آواز جیسے کوسوں دور سے اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھی ...... ”ان بھوکے ننگوں کی فطرت ایک جیسی ہوتی ہے۔ یہ اندر سے کمینے ہوتے ہیں، اندر سے زہریلے ہوتے ہیں۔ ان کو جتنا مرضی دودھ پلاؤ، ایک دن ڈس کر ہی رہتے ہیں۔“

ہاں اسے بے دردی سے مارا جارہا تھا۔ اسے سویرا کے سامنے مارا جارہا تھا۔ ٹھوکروں اور گھونسوں کی بارش کے دوران میں اس نے ایک دو بار اٹھنے کی کوشش کی لیکن اسے پھر گرا دیا گیا۔ سر پر لگنے والی ضربات نے جیسے اس کی نظر کو دھندلا دیا تھا۔ اس کے چاروں طرف ایک سرخ دھند سی پھیل گئی تھی۔ سماعت سے وحشی آوازیں ٹکرا رہی تھیں۔

”ماردو اسے...... جان سے مار ڈالو۔“

”ٹکڑے کردو، کتوں کے آگے ڈال دو۔“

”پولیس کو بلاؤ...... ایس پی کو فون کرو۔“

”نہیں نہیں...... خود رسا ڈالو اس کمینے کی گردن میں......“

اور وہ دیکھ رہی تھی...... یقیناً دیکھ رہی تھی۔ رائفل کا ایک دستہ اس کی گردن کے پچھلے حصے میں لگا اور وہ برآمدے کی سیڑھیوں سے لڑھکتا ہوا احاطے میں جا گرا۔ وہ اسے غلیظ ترین گالیوں سے نواز رہے تھے۔ اسے مارتے اور گھسیٹتے چلے جارہے تھے۔ وہ اسے اس کمرے تک لائے جہاں وہ رہتا تھا۔ اس نے دھندلائی نظروں سے دیکھا۔ کمرے کا اینٹوں کا فرش کھدا پڑا تھا۔ ”یہ دیکھ حرامزادے ...... یہ ہیں تیرے کرتوت......“ شاہ فرمان کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

اس نے دیکھا، اس کے سامان والا صندوق بھی اٹھا کر برآمدے میں پھینک دیا گیا تھا۔ سامان بکھرا ہوا تھا۔ وہ ایک دھکا کھا کر اپنے سامان کے اوپر ہی گرا۔ اس کا ہاتھ اس چوبی ڈبے سے ٹکرایا جس میں اس کی سب سے قیمتی متاع تھی۔ اس نے جنونی سے انداز میں وہ ڈبا اپنے سینے سے لگا لیا۔ مارنے والے اسے مارتے چلے گئے مگر وہ ڈبے کو تھامے رہا۔ اس کے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹ گئے تھے۔ مارنے والے ہاتھوں میں سے کسی کی کوئی سخت چیز اس کے سر سے ٹکرائی تھی جس سے سر پھٹ گیا تھا اور خون پھٹی ہوئی شرٹ کے کالر کو بھگو رہا تھا...... پھر اس کے لڑکھڑاتے جسم کو بازوؤں سے تھام کر جیپ میں ڈال دیا گیا۔ جیپ اسٹارٹ ہوئی اور نامعلوم مقام کی طرف روانہ ہوگئی۔ وہ جیپ قریباً آدھا گھنٹا چلتی رہی۔ جیپ رکی تو اسے نیچے اتار لیا گیا۔ پاس ہی کہیں سے پانی کا شور بھی سنائی دے رہا تھا۔ جیپ سے اتار کر اسے پھر لاٹھیوں سے پیٹا جانے لگا۔ ایک لاٹھی اس کی کلائی پر پڑی تو ڈبا ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر کر کھل گیا...... چیزیں بکھر گئیں۔

وہ دیوانوں کی طرح ان چیزوں کو سمیٹنے کے لیے جھکا تو اس پر لاٹھیوں، ڈنڈوں کی بارش ہوگئی...... وہ گھڑی کو پکڑنے کی کوشش کرتا تو ہاتھ پر ڈنڈا پڑتا۔ رومال یا کاغذ کے ٹکڑے کو چھونا چاہتا تو ضربات سے ہاتھ کی ہڈیاں کڑکڑا جاتیں......

تم کب تک مجھ کو بھولو گے...... اس دشت کی تنہا راتوں میں اک درد جو ٹھہرا رہتا ہے...... اس نے ڈنڈے کھاتے ہوئے بھی رومال اور وہ پرچہ اپنے ہاتھ میں کر لیا مگر پھر ایک لاٹھی کی جان لیوا ضرب اس کے سر پر لگی تو اس کا دماغ تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا...... وہ مر چکا تھا یا مرنے والا تھا۔ بس کہیں دور بہت دور سے کچھ سرسراہٹیں سی تھیں۔ اس کے جسم کے ساتھ کسی رسّا ٹائپ چیز سے کوئی وزنی شے باندھی جا رہی تھی۔ کچھ آوازیں آ رہی تھیں۔ ''اوئے شیرو! ایکسل ٹھیک طرح سے باندھ...... یہ کھل گیا...... تو یہ کمینہ پانی پر واپس اوپر آ جائے گا۔'' یہ آخری آوازیں تھیں جو اس کے ڈوبتے ذہن میں سنائی دیں...... اس کے بعد یوں لگا کہ اس کا وجود پانی کے اندر کہیں نیچے گرتا چلا جا رہا ہے۔ بہت سی ملی جلی سرگوشیاں پانی کے دباؤ میں ابھرنے لگیں۔

تم کب تک مجھ کو بھولو گے......

''چلو آج ایک کام کرتے ہیں۔ آج سے میں اور تم اچھے دوست ہیں۔ تم جتنے دن حویلی میں رہو گے مجھے سویرا بی بی نہیں، صرف سویرا کہو گے......''

''دلاور! میں تمہاری بے حد احسان مند ہوں۔ تم نے ہم دونوں کی جان بچا کر بہت بڑا کام کیا ہے۔''

''دلاور! تم خود کو اکیلا مت سمجھو...... ہم سب تمہارے ساتھ ہیں......''

''دلاور! میں نے تمہارے لیے بہت کچھ سوچ رکھا ہے۔ دیکھنا آنے والے دنوں میں تم حویلی کے بہت ہی خاص بندوں میں شمار ہو گے......''

''دلاور! میں تمہارے لیے کچھ الگ طرح سے سوچتی ہوں۔''

دلاور پانی کی تہ میں تھا۔ وہ گہرے پانی کی مچھلی تھا...... جو بے پناہ دباؤ میں بھی زندہ رہتی ہے مگر وہ زندہ کب تھا۔ وہ تو مر رہا تھا۔ فرشتۂ اجل کی سرگوشیاں اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ ان جان لیوا لمحوں میں ایک کھڑکی سی دلاور کی دھندلائی ہوئی نگاہوں کے سامنے کھل گئی۔ یہ اس کے ماضی کی کھڑکی تھی...... گرمی کی چمکتی دوپہر تھی۔ لوہاری سے آگے اور شاہ عالمی سے پہلے بائیں طرف ایک تنگ گلی اوپر کو چڑھتی تھی۔ بازار کے اختتام پر تنگ گلیوں اور بوسیدہ مکانوں کا ایک گورکھ دھندا تھا۔ انہی تنگ گلیوں کے ایک بوسیدہ مکان میں جس کے برآمدے کے ایک کونے میں سنہری دھوپ اترتی تھی، وہاں پر ایک ٹوٹی چارپائی کو آدھے سفید آدھے مہندی لگے بالوں والی عورت ٹھیک کرتے ہوئے مسکراتی ہے...... کیونکہ سرفو دم گھٹ نے اس کی جھولی میں ایک ننھا بچہ لا کر ڈالا ہے۔

''لے سنبھال اسے...... صبح جب میں راوی پر گیا تھا تو ایک کشتی میں روتا ہوا ملا تھا مجھے...... دوپہر تک اس کے مالکوں کو ڈھونڈتا رہا...... مگر کوئی نہیں ملا...... تو پال اسے...... تھوڑا بڑا کرا سے...... دیکھ...... پھر میں اسے کیسا ٹوبا بناتا ہوں...... لوگ سرفو کو بھول جائیں گے۔''

''دلاور پتر! جا بازار سے مجھے سبزی لا دے......''

''آ میرا پتر ادھر...... تو نال والے پپو کے ساتھ نا کھیلیا کر...... دیکھ تیرے پنڈے پر لاس ڈال دی ہے۔''

''ماں...... مجھے چاچا سرفو کے ساتھ نہیں جانا...... مجھے پانی میں ڈبکیاں دیتا ہے۔ میری ناک میں پانی گھس جاتا ہے۔ میری آنکھوں سے پانی بھی بہنے لگتا ہے۔ وہ مجھے بڑی دیر پانی میں رکھتا ہے......''

''میرا پت تو بڑا بہادر ہے۔ دیکھ دلاورے! دل چھوٹا نہ کریا کر...... تیرا چاچا تیرے بھلے کے لیے ہی سب کچھ کرت ہے۔ وہ تجھے کچھ سکھانا چاہتا ہے...... بنانا چاہتا ہے۔''

سرفراز عرف سرفو دم گھٹ جدی پشتی ٹوبا تھا۔ گہرے

پانیوں میں زیادہ سے زیادہ دیر رہنے کا فن نسل در نسل اس میں منتقل ہوا تھا...... اور اب وہ یہ فن ...... آٹھ سالہ دلاور میں منتقل کر رہا تھا۔ اس نے ہانپتے ہوئے دلاور کو دوبارہ پانی میں غوطہ دیا۔ وہ حلق کی پوری قوت سے چلانا چاہتا تھا مگر منہ کھولتا تو ڈھیروں پانی اس میں چلا جاتا۔ اسی لیے اس نے دوبارہ سانس اپنے سینے میں روک لیا۔ دس سیکنڈ...... بیس سیکنڈ...... تیس سیکنڈ...... چالیس پینتالیس سیکنڈ...... اس کے ننھے وجود میں آواز گونجنے لگی۔

"چاچا...... مجھے چھوڑ دے...... چاچا ہاتھ ہٹالے ...... میں مرجاؤں گا...... میرا دم گھٹ رہا ہے...... میرا سینہ پھٹنے والا ہے۔ چاچا...... مجھے پانی سے نکال لے...... میں مر رہا ہوں......" ایک جھٹکے کے ساتھ وہ ہوش میں آ گیا...... چوڈیرو حویلی کے "غنڈوں" کی بدترین مار کھانے والا دلاور ہوش میں آ گیا...... گہرے پانی کی مچھلی ...... گہرے پانیوں کا شناور...... سرفو دم گھٹ کا "لے پالک" ہوش میں آ گیا۔

اس کے جسم کا ایک ایک حصہ اذیت کے سپرد تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد کچھ پانی حلق کے راستے اس کے جسم میں چلا گیا تھا۔ صورتِ حال خطرناک تھی۔ اس کے پھیپھڑوں کو ہوا درکار تھی...... جو پانی کی اس تہ میں ناپید تھی۔ اس نے ہاتھ پاؤں چلاتے ہوئے سطحِ آب پر آنا چاہا مگر اس کے کرم فرماؤں نے ایک نیکی یہ بھی کی تھی کہ اس کی کمر کے ساتھ ایک رسا باندھا گیا تھا۔ رسّے کا دوسرا سرا کسی گاڑی یا ٹریکٹر کے آہنی ایکسل کے ساتھ منسلک تھا۔ دلاور نے تیر کر اوپر آنا چاہا مگر وہ بری طرح ہاتھ پاؤں چلانے کے باوجود ایک فٹ بھی اوپر نہ جا سکا۔ یہ بڑے اہم اور کٹھن لمحے تھے۔ دلاور نے رسے کو پکڑ کر کھینچا اور ایکسل تک پہنچ گیا۔ اس نے ہمت مجتمع کرتے ہوئے ایکسل کو اٹھایا۔ ایک ڈیڑھ فٹ اوپر لایا مگر اس کی ہمت جواب دے گئی۔ اس نے ایکسل کو چھوڑ دیا۔ اب وہ کمر کے گرد بندھے رسّے کو کھولنے کی کوشش کرنے لگا مگر ناکام رہا۔ آخری کوشش کے طور پر اس نے رسے کو پکڑ کر زور زور سے کھینچا...... شاید رسّا ایکسل سے جدا ہو جائے...... مگر قسمت کی دیوی مہربان نہیں ہوئی۔ وہ بری طرح تڑپنے لگا اور رسّے کو جھٹکے دینے لگا......

"چاچا...... چاچا...... مجھے باہر نکال لے...... میں مر رہا ہوں...... میرا سینہ پھٹنے والا ہے چاچا...... بس کر چاچا! میں مرجاؤں گا...... مجھے پانی سے نکال لے......"

اس نے تصور میں دیکھا، اس کا منہ آسمان کی طرف تھا۔ اس پر ایک خوشبودار چادر تھی۔ وہ ایک چارپائی پر لیٹا ہوا تھا اور بہت سے لوگ کندھوں پر اس چارپائی کو اٹھائے بھاگے جا رہے تھے۔ یوں لگتا تھا سب کو بہت جلدی ہے۔ ہر طرف سر ہی سر ہیں اور لوگ دیوانہ وار بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ یہ اس کا جنازہ تھا۔ یکایک منظر غائب ہو گیا۔ مہلت مل گئی۔ رسّے کی گرہ تو نہیں کھلی مگر وہ ایکسل سے جدا ہو گیا۔ پانیوں کا بادشاہ...... پانی کو پچھاڑتے ہوئے سطحِ آب پر آ گیا...... وہ کنارے پر رینگتا ہوا خشکی پر آ گیا...... یہ کوئی بیلا تھا...... ہر طرف درخت ہی درخت تھے۔ اس کے ڈوبتے ذہن نے ایک فائر کی آواز سنی پھر اس کا ذہن اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆☆☆

دوبارہ اس کی حسیات بیدار ہوئیں تو اس نے کچھ لوگوں کو اپنے اوپر جھکے ہوئے پایا۔ وہ آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔

"لگتا ہے...... اب بچ جائے گا یہ......"

"اسے اسپتال لے جاتے ہیں......"

"مگر یہ پولیس کیس ہے۔ کہیں......؟"

"اوئے دیکھ لیں گے...... کیس...... تو بھی ...... پولیس کو بھی...... پتا نہیں کس مائی کا لال ہے...... ڈالو اسے جیپ میں، ابھی اسپتال لے کر چلتے ہیں۔"

پھر دلاور نے خود کو اسپتال کے بیڈ پر پایا۔ جب کبھی کوہ ہمالیہ سے بھی زیادہ بھاری دھند کے پار سے کوئی روشنی کی کرن نمودار ہوتی تو دلاور کو اس میں کچھ مناظر نظر آتے ...... ڈاکٹر اس پر جھکے ہوتے...... نرس گلوکوز کی بوتل میں سرنج کے ذریعے کوئی پیلا سا محلول انجیکٹ کر رہی ہوتی۔ کبھی کچھ اجنبی سے لوگ اسے اپنے اردگرد منڈلاتے نظر آتے۔

یہ دھوپ چھاؤں پتا نہیں کتنے دن چلتی رہی۔ جب باقاعدہ اس نے آنکھ کھولی تو خود کو ایک درمیانے درجے کے کمرے میں پایا۔ اس نے پردہ سرکا کر دیکھا تو دن کی روشنی میں اسے کپاس کا ایک بلند پہاڑ نظر آیا۔ کچھ بندے سیدھے بیلچوں کی مدد سے کپاس کو اکٹھا کر رہے تھے۔ وہاں کچھ عورتیں بھی تھیں جنہوں نے موٹے دبیز کپڑوں کے جھولا نما بڑے بڑے فراک پہن رکھے تھے۔ ان میلی کچیلی عورتوں نے بڑی بڑی بالیاں پہن رکھی تھیں اور ناک کی درمیانی جھلی میں دو، دو...... تین، تین چھوٹی بالیاں پرو رکھی تھیں۔ کچھ ننگ دھڑنگ بچے اودھم مچا رہے تھے...... پتا نہیں کیوں...... اس کو یہ منظر بھلا لگا...... شاید...... یہ زندگی تھی......

اور وہ...... اس ''چارپائی'' سے اتر کر آرہا تھا جس کو بہت سے لوگ بڑی تیزی سے بھگائے لے جارہے تھے۔

دلاور اپنے حواس میں آیا...... سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں بیدار ہوئیں...... تو گزرے ہوئے واقعات کی فلم پوری جزئیات کے ساتھ اس کے دماغ میں چل گئی۔ اس کو غم سے نڈھال ہوجانا چاہیے تھا۔ درد سے بے حال ہوجانا چاہیے تھا مگر اس کے من میں ٹھہراؤ ڈیرے ڈال چکا تھا اور کیوں نہ ہوتا۔ وہ اس چارپائی سے نیچے اتر کر آرہا تھا جسے لوگ بھگائے لے جارہے تھے۔ شاید اس نے دوسرا جنم لیا تھا۔

دلاور کو اسی دن معلوم ہوگیا تھا کہ اس کی جان بچانے والے لوگ حضور چانڈیو کے کارندے تھے، جو صبح ہونے سے پہلے مرغابیوں کا شکار کھیلنے آئے تھے۔ شکار کے دوران میں ان کی نظر نیم مُردہ دلاور پر پڑی اور وہ اسے اٹھا کر اسپتال لے گئے۔ دلاور سات آٹھ دن اسپتال میں رہا تھا۔ اسپتال میں ہی حضور چانڈیو کے ایک کارندے نے دلاور کو پہچان لیا۔ جب حضور چانڈیو تک خبر پہنچی تو اس نے حکم دیا کہ اسپتال سے ڈسچارج ہونے کے بعد دلاور کو سبز حویلی لایا جائے۔

سبز حویلی میں یہ اس کا دوسرا دن تھا۔ دلاور اچھی طرح جانتا تھا کہ یہی وہ حضور چانڈیو ہے جس کے ساتھ شاہ زمان اور شاہ فرمان کی خونی دشمنی چل رہی تھی۔ دونوں پارٹیوں کے کئی بندے قتل ہوچکے تھے اور ایک دوسرے پر درجنوں کیس بنے ہوئے تھے۔ پہلے حضور چانڈیو کے ''کارِ خاص'' افضل بھگا نے دلاور سے سوال جواب کیے پر حضور چانڈیو خود دلاور کی کتھا سننے کے لیے آن موجود ہوا۔ حضور چانڈیو قدرے سانولے رنگ اور اونچی ناک والا ایک درمیانی عمر کا چودھری تھا۔ وہی وڈیروں والی تن فن اور اونچے شملے والی پگڑی...... بہرحال فی الوقت وہ دلاور کا محسن اور میزبان تھا۔

دلاور نے اپنی کہانی کے کچھ حصے چھوڑ کر باقی سب کچھ چانڈیو کے گوش گزار کردیا۔ دلاور نے اسے بتایا کہ اس پر کتنا گھناؤنا الزام لگا کر اور کس طرح جاں بلب کر کے چوڈیرو حویلی والوں نے اسے پانی کی نذر کردیا تھا۔

حضور چانڈیو نے کہا۔ ''سو حرامزادوں کو اکٹھا کیا جائے تو ان کا ایک حرامزادہ یہ شاہ فرمان بنتا ہے۔ مجھے تو پورا یقین ہے، اس نے چھوٹے بھرا کی موت کے بعد اس کی زنانی (سویرا) پر بھی اپنی گندی نظر رکھی ہوئی ہوگی۔ تم دیکھ لینا، وہ بہت چھیتی پانچویں شادی بھی کھڑکا دے گا۔''

ان باتوں کے دوران میں ہی چانڈیو کی ایک ملازمہ ٹرے میں دودھ کی سردائی کا ایک بڑا جگ اور ایک گلاس رکھ کر لے آئی۔ پتا چلا کہ یہ حضور چانڈیو کا ''سردائی ٹائم'' ہے۔ ملازمہ کا نام بعد ازاں سندری معلوم ہوا۔ وہ کالے رنگ کی تھی لیکن بہت تیکھے نقوش اور تیز طرار۔ وہ انہی عورتوں کے قبیلے سے لگتی تھی جن کو دلاور نے کپاس کے بلند ڈھیر کے پاس دیکھا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ میلی کچیلی تھیں مگر یہ خوب نکھی ستھری ہوئی تھی۔ جیسے سیاہ بوٹوں کو پالش کردیں تو وہ چمک اٹھتے ہیں۔ وہ بھی سر پر تیل چوپڑے، کس کے بال باندھے، آنکھوں میں کاجل لگائے ایسے ہی دمک رہی تھی۔

پچھلے چند ہفتوں میں دلاور کو بہت اچھی طبی امداد ملی تھی۔ ورنہ جس بے دردی سے اسے مارا گیا تھا، شاید وہ کئی ماہ تک بستر سے نہ اٹھ سکتا۔ اس کے جسم کا گوشت کئی جگہ سے پھٹ گیا تھا۔ مسل ٹوٹ پھوٹ گئے تھے۔ کم از کم دو جگہ ہڈیوں میں ہیئر لائن فریکچر تھے۔ بے شمار اندرونی اور بیرونی چوٹیں تھیں۔

جب وہ اکیلے میں ان مناظر کو یاد کرتا تو اس کے سینے کے اندر جیسے آنسوؤں کا ایک آبشار سا گرنے لگتا۔ اسے وہ قیامت کے لمحے یاد آتے جب شاہ فرمان کے چہیتے ٹیپو ٹریگر نے دیگر کارندوں کے ساتھ مل کر اسے روئی کی طرح دھنک ڈالا تھا۔ دلاور کے لیے سب سے زیادہ دکھ کی بات یہ تھی کہ یہ سب کچھ سویرا کی موجودگی میں ہوا تھا۔ اس ہستی کی موجودگی میں جس کے لیے وہ اپنی جان ہر وقت ہتھیلی پر لیے پھرتا تھا۔ جس کے لیے اپنا سب کچھ قربان کردینا اس کے لیے اتنا ہی آسان تھا جتنا آنکھیں بند کرنا اور کھولنا۔

آہ...... وہ یہ سب کچھ دیکھتی رہی تھی۔ کہتے ہیں کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ کیا دلاور کے دل سے کوئی راہ سویرا کے دل تک نہ جاتی تھی؟ اگر جاتی تھی تو پھر اس کی آنکھوں میں نمی کیوں نہیں آئی تھی؟ اس کے قدم اسے چھڑانے کے لیے کیوں نہیں اٹھے تھے؟ کیوں وہ پتھر کا بت بنی کھڑی رہی تھی؟

وہ جب یہ سب کچھ سوچتا تھا تو دل ہی دل میں کراہ اٹھتا تھا...... سویرا! کیا تم نے بھی وہی سمجھا جو دنیا والوں نے سمجھا...... کیا ہمارے درمیان کچھ نہیں تھا...... کیا دل سے دل تک جانے والی کوئی راہ نہیں تھی؟ یہ بات روزِ روشن کی طرح بالکل عیاں تھی کہ اس کے خلاف گھناؤنی سازش ہوئی تھی۔ انسے پھنسایا گیا تھا۔ اسے پھنسانے کے لیے جوڈراما رچایا گیا، اس کا ڈائریکٹر یقیناً شاہ فرمان تھا اور ٹیپو ٹریگر نے اہم ترین رول ادا کیا تھا...... ایک دن وہ بستر پر لیٹا اسی طرح

اپنے خیالوں میں گم تھا کہ چونک گیا۔ کھڑکی میں سے سبز حویلی کے سرسبز لان میں اسے دور کچھ درختوں کے نیچے حضور چانڈیو نظر آیا۔ وہی چودھریوں جیسا بڑا پگڑ اور کلف دار کڑکتی ہوئی شلوار قمیص...... حضور چانڈیو کے ساتھ ایک بارعب عربی شیخ تھا۔ اس نے اماراتی طرز کا لمبا لبادہ پہن رکھا تھا اور سر پر ڈبی دار رومال تھا۔ اردگرد مؤدب ملازمین تھے جن میں افضل بھگا بھی شامل تھا۔ شیخ کے ہاتھ پر دستانہ تھا اور دستانے پر وہی بے مثال باز پھڑپھڑا رہا تھا جسے ایک دن کچا قلعہ کی اونچی دیواروں سے نکالنے کے لیے دلاور نے سر دھڑ کی بازی لگائی تھی۔ باز کے سر پر مخملی اندھیاری یعنی غلاف تھا۔ موقع پر موجود ہر شخص بے حد اشتیاق سے اس نایاب پرندے کو دیکھ رہا تھا۔ پھر یہ سارے لوگ درختوں کے پیچھے اوجھل ہوگئے۔

دلاور نے ایک طویل ٹھنڈی سانس لی۔ وہ سمجھ گیا کہ یہی وہ شیخ تھا جس نے اس پرندے کے حصول کے زندگی موت کا مسئلہ بنا رکھا تھا اور جس کے لیے ضد میں آکر لاکھوں نہیں کروڑوں روپے ادا کیے گئے ہیں۔ یہ شیخ ابھی تک اس سبز حویلی میں موجود تھا۔ یا شاید دوبارہ یہاں آیا تھا۔

شام کو جب افضل بھگا سے دلاور کی ملاقات ہوئی تو اس سے اس بارے میں بات ہوئی۔ شیخ صاحب کا نام بن باقر معلوم ہوا۔ افضل بھگا نے بتایا۔ ”یہ لوگ اب واپس دبئی جا رہے ہیں۔ کافی سیر سپاٹے کر لیے ہیں انہوں نے۔“

”یہ لوگ سے تمہارا کیا مطلب ہے؟ کیا شیخ صاحب کے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟“

”ہاں ان کی سب سے چھوٹی بیگم' دو ملازم بھی ہیں۔ چھوٹی بیگم بہت زیادہ لاڈلی ہے۔ شیخ صاحب اس کی ہر بات مانتا ہے۔ وہ پاکستان دیکھنا چاہتی تھی، خاص طور سے وہ علاقے جہاں شکار وغیرہ ہوتا ہے، اس کی فرمائش پوری ہوئی لیکن اس کی کوئی ایک فرمائش تھوڑی ہے۔ ہر روز نئی فرمائش ہوتی ہے۔ کبھی کسی میلے میں جاتی ہے، کبھی پہلوانوں کی کشتیاں دیکھتی ہے۔ اب کسی کچی بستی میں جا کر رات گزارنا چاہتی ہے۔ اب اس کی ایک تازہ فرمائش ہے جسے سن کر شاید تمہیں بھی حیرانی ہو۔“

”کیا؟“

”پانی کے جہاز کے ذریعے واپس دبئی جانا چاہ رہی ہے۔ اب شیخ کے بندے بھاگ دوڑ کر رہے ہیں کہ سمندری سفر کا بندوبست کیا جائے......“

افضل اور دلاور میں یہ گفتگو سبز حویلی کے پچھلے احاطے میں ہو رہی تھی۔ دونوں گھاس پر آلتی پالتی مارے آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ اچانک افضل کے چہرے کا رنگ بدلا، وہ بڑبڑانے والے انداز میں بولا۔ ”لو بھئی...... بڑی لمبی عمر ہے شیخ صاحب کی...... وہ ادھر ہی آ رہے ہیں۔“

وہ دونوں جلدی سے کھڑے ہوگئے۔ حضور چانڈیو اور شیخ بن باقر چند ملازموں کے ساتھ تشریف لا رہے تھے۔ حضور چانڈیو نے دلاور کی طرف اشارہ کر کے بن باقر سے کچھ کہا۔ جس کا ترجمہ بن باقر کے ملازم نے بن باقر تک پہنچایا۔ بن باقر کے چہرے پر دلچسپی نمودار ہوئی، حضور چانڈیو نے دور ہی سے ہانک لگائی۔ ”اوئے دلاور! ادھر آ......“

دلاور اور افضل بھگا، حضور چانڈیو کے پاس پہنچے۔ دونوں نے جھک کر سلام کیا۔ شیخ کی نگاہیں بدستور دلاور کا طواف کر رہی تھیں۔ حضور چانڈیو نے کہا۔ ”دلاور ے، شیخ صاحب تیری سخت جانی کا سن کر بڑے حیران ہوئے ہیں۔ میں نے انہیں بتایا ہے کہ شاہ زمان کے غنڈوں نے تجھے مردہ سمجھ کر ڈونگے چھپڑ میں پھینک دیا تھا اور تیرے پنڈے کے ساتھ کوئی دو من کا لوہے کا ایکسل باندھ دیا تھا مگر تو پھر بھی ہمت کر کے نکل آیا......“

بن باقر نے عربی میں کچھ پوچھا۔ اردو دان ملازم نے ترجمہ کرتے ہوئے کہا۔ ”جناب شیخ تم سے پوچھ رہے ہیں کہ ملازمت کرنا پسند کرو گے؟“

دلاور نے کہا۔ ”میں تو چانڈیو صاحب کا بے دام کا غلام ہوں۔ اگر وہ آگ میں چھلانگ لگانے کا کہیں گے تو ابھی لگا دوں گا۔“

دلاور کا جواب شیخ تک پہنچا تو وہ مسکرانے لگا۔ وہ دلاور کے سراپا کو اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے کوئی گھوڑا، اونٹ یا باز وغیرہ خریدنے سے پہلے اسے دیکھا جاتا ہے۔ دلاور کو یہ انداز اچھا تو نہیں لگا مگر اس نے چہرے سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ مرحوم شاہ زمان بھی تو اسے ایسے ہی دیکھا کرتا تھا۔

شیخ نے کچھ کہا۔ جس کا ترجمہ کرتے ہوئے مترجم نے دلاور سے کہا۔ ”شیخ صاحب فرماتے ہیں، وہ تمہیں ساتھ لے جانے کے بارے میں سوچیں گے......“

افضل بھگا اور دلاور نے ایک بار پھر جھک کر سلام کیا...... وہ لوگ آگے بڑھ گئے۔

☆☆☆

اس دن شیخ بن باقر تلور کا شکار کھیلنے کے لیے پوری پلٹن کے ساتھ رحیم یار خان سے کچھ آگے مالن پور کے بیلے میں موجود تھا۔ چھوٹی بیگم بھی ساتھ تھی۔ بن باقر چالیس سے

پینتالیس کے پیٹے میں تھا جبکہ چھوٹی بیگم بمشکل بائیس تیئیس سال کی تھی۔ اس کی ایک فرمائش ابھی پوری نہیں ہونے پاتی تھی کہ دوسری کا تقاضا شروع ہو جاتا تھا۔ ایک دن پہلے اس نے ایک مقامی میلے میں جانے کی فرمائش کر دی تھی۔ ہوا یوں تھا کہ بن باقر کا قافلہ، اندرونِ شہر سے گزر رہا تھا۔ وہاں ایک کھلی جگہ پر میلے کا اہتمام تھا۔ روایتی پنگوڑے...... مقامی کھانے ...... انوکھے کھیل تماشے...... چھوٹی بیگم نے انگلی سے میلے کی جانب اشارہ کر دیا۔ پھر کیا تھا۔ بن باقر کے حکم سے قافلے کا رخ میلے کی طرف ہو گیا۔

پاکستان سے روانگی میں تین دن باقی تھے اور آج چھوٹی بیگم کی شکار دیکھنے کی خواہش سب کو مالن پورلے آئی تھی۔ دلاور اور افضل بھگا بھی شکار پارٹی میں شامل تھے۔ شکار تین چار گھنٹے تک جاری رہا۔ پندرہ بیس پرندے تو صرف شان باز کے ذریعے شکار ہوئے۔ دلاور سارا دن غم کی تصویر بنا رہا۔ پتا نہیں کیوں آج اتنے دنوں بعد اس کے دل کے موسم میں ہلچل پیدا ہوئی تھی۔ سویرا بے طرح اسے یاد آ رہی تھی۔ ہاں وہی سویرا جس نے اسے عشق کی ایک ایسی سولی پر چڑھایا تھا، جو مارتی نہیں تھی بس جاں کنی کے عالم میں رکھتی تھی۔ وہی سویرا جس کی موجودگی میں اس پر تشدد کی انتہا کر دی گئی تھی۔ جس حویلی سے وہ مرتے دم تک نہیں نکلنا چاہتا تھا وہاں سے اسے نکال باہر کیا گیا تھا۔ روہی کے اجنبی سناٹے اس سے جدا ہو گئے تھے۔ پستہ قد بیریوں سے وہ بہت دور چلا آیا تھا اور اس ہوا سے بھی جس میں اس کا بے رحم محبوب سانس لیتا تھا...... شاید کہنے والے نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ لمبے پنڈے اوکھیاں راہواں عشق دیاں......

اگلی رات حضور چانڈیو نے اسے نشست گاہ میں طلب کر لیا۔ دلاور نشست گاہ میں پہنچا تب بھی بے حد دل گرفتہ تھا۔ حضور چانڈیو نے سگریٹ کو مٹھی میں دبا کر کش لیتے ہوئے کہا۔ ”دلاور! جانتے ہو میں نے تمہیں یہاں کیوں بلایا ہے؟“

”نہیں حضور سائیں!“ دلاور نے آہستگی سے سر کو دائیں بائیں حرکت دی۔

”میں کہوں گا کہ تم بن باقر کے ساتھ دبئی چلے جاؤ......“

دلاور کچھ دیر سر جھکا کر خاموش کھڑا رہا۔ پھر اس نے دکھی لہجے میں کہا۔ ”حضور سائیں! میں چوڈیرو حویلی واپس جانا چاہتا ہوں۔ میں ...... اپنے اوپر لگے ہوئے جھوٹے الزام کو مٹانا چاہتا ہوں۔“

حضور چانڈیو بڑی کرسی پر براجمان ہو گیا۔ اپنے سگریٹ کو گھورتے ہوئے بولا۔ ”شاہ فرمان بہت کمینہ آدمی ہے۔ جہاں تمہاری سوچ ختم ہوتی ہے، اس کی کمینگی وہاں سے شروع ہوتی ہے۔ ٹیپو ٹریکر اس کا خطرناک چیلا ہے۔ چوڈیرو حویلی جاؤ گے تو اس بار وہ تمہاری آخری سانس تک نکال لیں گے۔ میرا کہا مانو تو ابھی ادھر ادھر ہو جاؤ۔ اگر ان کنجروں کو بھنک بھی پڑ گئی کہ تم زندہ ہو...... تو وہ بھوکے بگیاڑوں کی طرح تمہارے پیچھے پڑ جائیں گے اور تمہیں پھاڑ کھائیں گے۔ اس ویلے ان کا زور چل رہا ہے۔“

جواب میں دلاور خاموش رہا۔ حضور چانڈیو نے بات جاری رکھی۔ ”شیخ باقر بہت چنگا آدمی ہے۔ اس کی ملازمت کر کے بڑے فائدے میں رہو گے تم۔ تمہارے علاوہ سندری اور شاید دو لڑکے اور بھی جائیں گے۔ بس عام سا چھوٹا موٹا گھر کا کام ہوگا......“

دلاور کی نگاہوں میں یکایک وہ تمام مناظر روشن ہو گئے جب اسے بدترین مار پیٹ کا نشانہ بنا کر پانی میں پھینک دیا گیا تھا۔ کچھ وقت ایسے ہوتے ہیں جب بات ذہن میں بیٹھ جاتی ہے۔ یہ بھی ایسا ہی لمحہ تھا۔ دلاور کے ذہن نے مختصر وقت میں سارے حساب کتاب جوڑے اور وہ تین دن بعد پاکستان چھوڑنے کے لیے تیار ہو گیا۔ ہاں...... وہ اس زمین...... اس دھرتی کو چھوڑنے کے لیے تیار ہو گیا جہاں اس کا سنگ دل محبوب رہتا تھا اور جہاں اس نے اپنی زندگی کے اَن گنت سال گزارے تھے۔ وہ ایسی غربت کی ماری، لاچار زندگی جینا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے اندر کچھ بدل چکا تھا۔

☆☆☆

جدید طرز کا تفریحی بحری جہاز کھلے سمندر میں دبئی کی طرف رواں تھا۔ گلف ڈریم نامی یہ جہاز درمیانے سائز کا تھا۔ اس میں تقریباً 60 کمرے تھے اور ڈیڑھ سو مسافروں کے سفر کی گنجائش تھی۔ ان کا یہ سفر تقریباً پانچ روز کا تھا۔ دلاور کو معلوم ہوا تھا کہ ویسے تو کراچی سے دبئی تک کا سمندری راستہ 1200 کلومیٹر سے کچھ کم ہی تھا اور یہ سفر ایک ڈیڑھ روز میں طے ہو سکتا تھا لیکن اس جہاز کو بہت ایزی اسپیڈ پر کھلے سمندر کی سیاحت کرتے اور کچھ جگہوں پر رکتے ہوئے جانا تھا۔ بن باقر پاکستان سے جن چار ملازموں کو ساتھ لے کر جا رہا تھا، ان میں دلاور کے علاوہ سندری، اس کی ماں اور ایک مکرانی لڑکا تھا۔ گلف ڈریم نے پاکستانی حدود کو چھوڑا تو دلاور کی آنکھوں میں نمی لہرا گئی۔ دور...... روہی کی ریتیلی زمین پر کھڑی پستہ قد بیریوں کے آس پاس آنسوؤں سے بھیگی ہوئی کچھ سرگوشیاں تھیں ...... تم کب تک مجھ کو

بھولو گے...... صحرا کی جھلسی دوپہروں میں کچھ اَن دیکھی سی راہیں ہیں......

یہ سفر کے دوسرے روز کی بات ہے۔ دلاور رات بہت دیر تک جاگتا رہا۔ کمرانی لڑکا دلاور کے ساتھ والے بیڈ پر چھوٹے کیبن میں سو رہا تھا۔ لگژری جہاز بحیرۂ عرب کے سینے کو چیرتا ہوا منزل کی طرف گامزن تھا۔ رات آخری پہر دلاور کی آنکھ لگ گئی مگر پھر اچانک کھل گئی۔ اسے یوں لگا جیسے ابھی وہ تھوڑی دیر سویا ہے۔ باہر دن کا خوبصورت اجالا پھیل چکا تھا۔ کچھ بلند آوازیں باہر سے سنائی دے رہی تھیں۔ کوئی تیز عربی لہجے میں بات کر رہا تھا۔ دلاور آنکھیں ملتا ہوا باہر نکلا۔ بڑی شاندار دھوپ تھی، اور گہرا نیلا آسمان۔ شیخ بن باقر اپنے ایک عربی ملازم سے سخت لہجے میں باتیں کر رہا تھا۔ قریب ہی ایک جدید پنجرے میں وہ شان نامی نایاب باز ٹہل رہا تھا جس کے لیے کروڑوں روپے ادا کیے گئے تھے۔ باز کی چونچ خون سے سرخ نظر آ رہی تھی۔ عرشے کے فرش پر بلی کا ایک معصوم سا بلونگڑا شدید زخمی حالت میں آخری سانس لے رہا تھا۔ اس کی انتڑیاں پیٹ سے باہر تھیں۔

معلوم ہوا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے باز کو پنجرے سے نکالا گیا تھا۔ بن باقر کے عربی ملازم نے غلطی سے باز کی اندھیاری (آنکھوں کو ڈھانپنے والی تھیلی) اس کے سر سے ہٹا دی۔ یہ بدقسمت بلونگڑا قریب ہی موجود تھا۔ باز اپنی تربیت کے مطابق اس پر جھپٹ پڑا اور چیر پھاڑ کر رکھ دیا۔ اب اس کی ماں حسرت کی تصویر بنی کچھ فاصلے پر کھڑی تھی۔

دلاور ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ اسے لگا کہ ان چودھریوں، وڈیروں اور سرمایہ داروں کی اکثریت، شکاری باز جیسی فطرت ہی رکھتی ہے۔ وہ موقع ملتے ہی کمزور پر جھپٹ پڑتے ہیں اور چیر پھاڑ دیتے ہیں۔ معاشرہ اور قانون وغیرہ بس چھڑانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے ہی رہ جاتے ہیں۔

اسی اثنا میں دلاور کی نظر حضور چانڈیو پر پڑی اور اسے پہلی بار یہ پتا چلا کہ وہ بھی اس جہاز میں موجود ہے۔ دلاور نے حضور چانڈیو کو دیکھ کر حیرانی ظاہر کی۔ وہ ایک آرام دہ کرسی پر پھیل کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''میں تو بس سیر سپاٹے کے لیے جا رہا ہوں دلاور...... دس پندرہ دن رہ کر ہوائی جہاز سے واپس آ جاؤں گا اور اگر تیرا دل نہ لگا تو بے شک تو بھی آ جانا۔ پر میری صلاح تو یہی ہے کہ تو سال دو سال کے لیے وہاں ٹک جا۔''

شاید حضور چانڈیو کچھ اور بھی کہتا مگر اسی دوران میں شیخ باقر لمبے ڈگ بھرتا ہوا وہاں آ گیا۔ چوکس ملازموں نے مستعدی سے دو تین مزید لگژری کرسیاں وہاں رکھ دیں۔ شیخ باقر کے ساتھ اس کے دو کویتی دوست بھی تھے۔

حضور چانڈیو نے مترجم کے ذریعے دلاور کا تعارف کرایا۔ آخر میں بولا۔ ''جناب عالی! جنات جیسا کام کیا ہے اس نے۔ ان ظالم دشمنوں نے کوئی تین من لوہا باندھا تھا اس کے پنڈے کے ساتھ ...... اور یہ سخت زخمی بھی تھا۔ پر نکل آیا زندہ سلامت۔ پہاڑ جیسی ہمت ہے جی اس کی۔''

شیخوں کی دلچسپی اس میں بڑھ گئی۔ وہ سر جھکائے مؤدب کھڑا رہا۔ اس کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی۔ اسے لگا جیسے وہ کوئی انسان نہیں خچر، گھوڑا یا کوئی اعلیٰ نسل کا پالتو جانور ہے اور حضور چانڈیو دوسروں کے سامنے اس کی ملکیت پر فخر محسوس کر رہا ہے۔ خاموشی کی زبان میں کہہ رہا ہے...... دیکھو یہ میرا ہے، میرا مطیع ہے، میرا محکوم ہے، میرا پالتو ہے، دیکھو ذرا میری پسند کو۔

مرحوم شاہ زمان بھی تو اسے ایسے ہی دیکھتا تھا...... اور بڑی آپا بھی...... اور شاہ فرمان بھی...... اور شاید...... شاید نہیں...... وہ ایسی نہیں تھی، وہ نہیں تھی ایسی...... لیکن اگر وہ ایسی نہیں تھی تو پھر......

اس سے آگے وہ کچھ نہیں سوچ سکتا تھا۔ اس کا ذہن جیسے سن ہو جاتا تھا...... یہ سمندری سفر کی تیسری رات تھی۔ گلف ڈریم تاریکیوں کو چیرتا ہوا منزل کی طرف رواں تھا۔ رات کے کھانے کے بعد حضور چانڈیو کو بدن دبوانے کی عادت تھی۔ کمرانی لڑکے کو بخار تھا اور الٹیاں آ رہی تھیں۔ مٹھی چاپی کی ذمے داری دلاور پر آ گئی۔ حضور چانڈیو کے لگژری روم میں وہ ایک گھنٹا اس کی مٹھی چاپی کرنے اور اس کی زبانی شاہ فرمان کی شان میں ''قصیدے'' سننے کے بعد وہ اپنے کیبن کی طرف جا رہا تھا جب اس نے سندری کو دیکھا۔ وہ ایک ملازم کے ساتھ اس لگژری اپارٹمنٹ کی طرف جا رہی تھی جہاں بن باقر کا کویتی دوست مقیم تھا۔ دلاور احتیاط سے پیچھے گیا اور ایک منظر دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ نہائی ہوئی اور قدرے بنی سنوری سندری بڑی خاموشی کے ساتھ کویتی کے اپارٹمنٹ میں داخل ہو رہی تھی۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ بے شک وہ اپنی مرضی سے جا رہی ہے لیکن بہت ڈری سہمی ہوئی ہے۔

پتا نہیں کیوں باز اور معصوم بلونگڑے والا سین پھر دلاور کی نگاہوں میں گھوم گیا۔ ہاں، باز طاقتور تھا اور بلونگڑا کمزور۔ اسے باز کے پنجوں میں آنا ہی آنا تھا۔ سندری کالی سیاہ تھی لیکن تر و تازہ اور چمکدار تو تھی...... اور کالا انگور بھی تو

ہوتا ہے۔ پھلوں کے شوقین ہر طرح کا پھل چکھنا چاہتے ہیں۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ دلاور ایک طویل سرد آہ بھر کر رہ گیا۔

صبح وہ ایک نامانوس سا شور سن کر جاگا تھا۔ وہ کیبن سے باہر نکلا اور چند زینے طے کر کے عرشے پر پہنچا۔ اس نے دیکھا کہ بن باقر کی نوجوان چلبلی بیوی ایک طرف کرسی پر بیٹھی بھوں بھوں رو رہی تھی اور بن باقر اسے چپ کرانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ قریب ہی دو بندے غوطہ خوری کے لباس میں کھڑے تھے۔

بیوی کو چپ کرانے کی ناکام کوشش کے بعد بن باقر غوطہ خور ملازموں پر برس پڑا۔ وہ انگلش بول رہا تھا۔ ''لگژری شپ ہے یہ...... اور اس میں انتظامات کیا ہیں تم لوگوں کے۔ آکسیجن سلنڈر تک کام نہیں کر رہا تم لوگوں کا۔ ہزاروں ڈالرز سیکیورٹی کے کھاتے میں لیتے ہو تم لوگ...... کیا ہے تمہاری مینجمنٹ؟''

''سوری سر! ہم نے کوشش تو پوری کی ہے۔'' ایک ''سی ڈائیو'' بولا۔

''کوشش کو میں نے چاٹنا ہے۔ مجھے میری چیز چاہیے۔ کہاں ہے تمہارا کیپٹن...... کس کی گود میں گھس کر سویا ہوا ہے۔ اسے بلاؤ۔''

اس مکالمے سے جو کچھ دلاور کی سمجھ میں آیا اور جو کچھ اسے اردگرد موجود لوگوں سے معلوم ہوا، اس سے پتا چلا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے یہاں ایک اہم واقعہ ہو گیا ہے۔ بن باقر کی چلبلی بیوی عروسہ چڑھتے سورج کی نرم روشنی میں اپنی سیلفیاں لینے کے لیے عرشے پر آ گئی۔ اس کے پاس قیمتی جیولری سے بھرا ہوا ایک ہینڈ باکس بھی تھا۔ وہ ایک ایک زیور اس میں سے نکال کر پہنتی۔ اپنی سیلفیاں لیتی اور اسے دوبارہ باکس میں رکھ دیتی۔ وہ اس خود ستائشی میں اتنی مگن ہوئی کہ عرشے کے بالکل کنارے پر چلی گئی۔ باکس اس کے قریب ہی فرش پر رکھا تھا۔ ایک چوکس ملازم بھی قریب ہی کھڑا تھا مگر دونوں چوک گئے۔ جڑاؤ زمرد والا ایک نیکلس پہن کر جب عروسہ سیلفی لے رہی تھی، اس کے پاؤں کی ہلکی سی ٹھوکر جیولری باکس کو لگی اور وہ چکنی سطح پر پھسل کر تیس فٹ نیچے سمندر میں جا گرا...... جہاز کو وہیں روک لیا گیا تھا۔ اسے تھوڑا سا ریورس چلا کر موقع واردات پر لایا گیا تھا۔ اب پچھلے قریباً ایک گھنٹے سے جہاز کی سیکیورٹی کے غوطہ خور قریباً تیس میٹر تک نیچے جا کر باکس کو تلاش کرتے رہے تھے۔ اس کا کہیں پتا نہیں تھا۔ اب مزید تلاش اس لیے روک دی گئی تھی کہ ''سی ڈائیونگ'' میں استعمال ہونے والے ایک سلنڈر کے میلٹوم میں خرابی واقع ہو گئی تھی اور دوسرے کا ماؤتھ پیس کسی نکیلے پتھر سے ٹکرا کر پھٹ گیا تھا۔

......اسی دوران میں کیپٹن کا معاون ''کیپٹن'' کو بلا کر عرشے پر لے آیا۔ نشے کی وجہ سے کیپٹن کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ غالباً وہ بمشکل ہی اٹھ پایا تھا۔ بن باقر، کیپٹن پر بھی برسنا شروع ہو گیا۔ وہ اسے ناقص انتظامات کے طعنے دے رہا تھا اور دیر سے یہاں آنے پر بھی لتاڑ رہا تھا، کیپٹن پہلے تو برداشت کرتا رہا پھر اس نے بھی چند سخت جملے کہے۔ وہ بولا۔ ''میڈم کو اس خطرناک انداز میں سیلفیاں لینے کے لیے کس نے کہا تھا۔ اگر جیولری کی جگہ خدانخواستہ ان کو کچھ ہو جاتا تو کیا ہوتا؟ اس طرح کی سیلفیاں بہت سے لوگوں کی جان لے چکی ہیں۔''

جہاز رکا ہوا تھا۔ ہنگامہ جاری تھا۔ شیخ کی دو ملازمائیں روتی دھوتی عروسہ کو اس کے کمرے میں لے گئیں۔ پتا چلا کہ باکس میں عروسہ کی تقریباً تمام جیولری موجود تھی۔ اس میں ہیروں کے سیٹ اور ''اینٹیک پیس'' بھی تھے۔ کچھ نہایت بیش قیمت خاندانی گہنے اس کے علاوہ تھے۔ محتاط اندازے کے مطابق بھی ان اشیا کی قیمت اسّی نوّے کروڑ کے قریب تھی۔ حضور چانڈیو اور شیخ کے کویتی دوست بھی موقع پر پہنچ چکے تھے۔ جہاز کا ترک کیپٹن...... وائرلیس کے ذریعے کسی اردگرد کے جہاز یا لانچ وغیرہ سے رابطے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ غوطہ خوروں کا انتظام کیا جا سکے۔ مایوس کن اطلاع یہ تھی کہ علاقے میں طوفان کی آمد تھی اور قرب وجوار میں ایسا کوئی نہیں تھا جو اگلے ایک ڈیڑھ گھنٹے تک ان کی مدد کو پہنچ سکتا۔ اچانک حضور چانڈیو کی نظر دلاور پر پڑی اور دلاور نے حضور چانڈیو کی نگاہ میں ایک تیز چمک نمودار ہوتے دیکھی۔ وہ کچھ دیر تک دلاور کو دیکھتا رہا پھر سیدھا اس کی طرف آیا۔ ''دلاورے! یہ نئے فیشن کے غوطہ خور تو بکری بن گئے ہیں پر...... مجھے لگتا ہے کہ تو کوئی کام دکھا سکتا ہے۔ کہتے ہیں کہ کسی پنجابی ٹوبے کا پتر ہے تو۔ بڑی مشہوری ہے تیری اس بارے میں۔''

وہ ٹھٹک کر حضور چانڈیو کو دیکھنے لگا۔ ''تن...... نہیں چودھری جی! میں چھوٹے موٹے چھپڑوں، تالابوں میں تو چلا جاتا ہوں، پر یہ تو سمندر ہے۔''

''سمندر ہے، پر زیادہ ڈونگا تو نہیں ہے نا۔ وہ دیکھ اس پاسے ایک پتھر بھی نظر آ رہا ہے۔''

دلاور نے دیکھا جہاز سے کوئی آدھ کلو میٹر دور کسی

چٹان کا نوک دار سرا سمندر کے نیلے پانی میں سے نکلا ہوا تھا۔ بالکل ایسے لگتا تھا جیسے کسی عقاب کی مڑی ہوئی چونچ ہو۔ اس سے پہلے کہ دلاور جواب میں کچھ کہتا' حضور چانڈیو لپکتا ہوا ابن باقر کی طرف چلا گیا اور مترجم کے ذریعے بن باقر کے ساتھ جوشیلے لہجے میں باتیں کرنے لگا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور وہ بڑے فخریہ انداز میں دلاور کی طرف اشارے بھی کر رہا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ تیزی سے دلاور کی طرف آیا، اس کا کندھا تھپک کر جوش سے بولا۔ ''ان کو یقین نہیں آ رہا کہ تو سلنڈر شلنڈر کے بغیر پانی میں لمبی ڈبکی لگا سکتا ہے۔ پر مجھے پتا ہے تو لگا سکتا ہے۔ تو کر سکتا ہے۔''

''م...... مگر چودھری جی......''

''اوئے اگر مگر کیا...... اب مجھے شرمندہ کرے گا؟ یہ بڑا زبردست موقع ہے اپنا آپ منوانے کا۔ اگر سچ وہ ڈبا مل گیا تو شیخ کی اکھیوں کا تارا بن جائے گا تو۔ لمبا انعام شام بھی ملے گا۔''

دلاور سوچ میں تھا، حضور چانڈیو نے پھر اس کا شانہ تھپکا۔ ''اوئے سوچیں پیا تے بندہ گیا۔ پنجابی شیر ہے تو۔ اٹھ وڑ اور دکھا دے اپنی چھاتی کا زور۔''

......قریباً پندرہ منٹ بعد سرفودم گھٹ کا تربیت یافتہ دلاور نیلے پانی میں اترنے کے لیے تیار تھا۔ اس کی کمر سے ایک لمبا رسا باندھ دیا گیا تھا اور وہ کنارے پر اپنے ننگے پاؤں جمائے کھڑا تھا۔ پانی میں کام کرنے والی ایک ٹارچ اس نے بیلٹ کے ذریعے اپنے پیٹ سے باندھ لی تھی۔ درجنوں پُرتجسس نگاہیں اس پر لگی ہوئی تھیں جن میں حضور چانڈیو کی نگاہ بھی تھی۔ اس کی نگاہ میں ایک امید بھری فخریہ چمک تھی۔ دلاور نے اپنی سانس باہر نکالی۔ پانی میں جست لگائی اور نیچے اترتا چلا گیا...... ہاں پانی کی مچھلی۔ ایک فطری پیراک...... جسے ایک خاندانی ٹوبے نے اپنی بے رحم تربیت سے کندن بنا ڈالا تھا۔ یہ کندن برسوں سے خاک میں رل رہا تھا...... لیکن آج اس کی زندگی میں ایک سنہری موقع آیا تھا۔

وہ پستہ قد بیریوں کے نیچے بیٹھ کر اکثر سوچا کرتا تھا ...... اللہ نے اسے کس لیے بنایا ہے۔ وہ کس مرض کی دوا ہے؟ نہ ڈھنگ سے پڑھ سکا، نہ کوئی فن سیکھ سکا...... نہ کوئی ایسا ہاتھ تھامنے والا اسے ملا جو دنیا کی تیزی طراری اور آگے بڑھنے کے ہنر اسے سکھاتا۔ کیا اس کی قسمت میں معمولی کام اور چودھریوں کی چھوٹی موٹی ملازمتیں ہی لکھی ہیں؟ لیکن جب سے اس نے مرحوم شاہ زمان کے حکم پر کچے کی جھیل پار کی تھی اور ساہجے نسل کے چنگل سے باز نکال کر چوڈیرو لایا تھا، اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ کچھ نہ کچھ کر سکتا ہے۔

وہ سر کے بل سمندر کے پانی میں اترتا چلا جا رہا تھا۔ تاریکی بڑھتی جا رہی تھی۔ مناظر دھندلا رہے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد اسے سمندری نباتات اور چھوٹے بڑے پتھر نظر آنے لگے۔ ان پتھروں میں مچھلیاں اور دیگر آبی حیات متحرک تھیں، یہ اس کے لیے ایک بالکل نیا تجربہ تھا۔ بالآخر اس نے ٹارچ یعنی واٹر لائٹ روشن کر لی۔ اب اسے پانی کے اندر قریباً چار منٹ ہونے کو آئے تھے۔ اس کے پھیپھڑوں نے ہوا کے لیے مچلنا شروع کر دیا تھا۔ وہ مونگے کی چٹانوں اور کائی لگے پتھروں کے درمیان تیزی سے حرکت کرنے لگا۔ اس کی نگاہیں دیوانہ وار اس باکس کو تلاش کر رہی تھیں جو گلابی رنگ کے فائبر کا بنا ہوا تھا اور جس کا ہینڈل چمکیلے پلاٹینم کا تھا۔ واٹر لائٹ کا دائرہ ہر طرف حرکت کر رہا تھا۔ پھر اس کی ہمت جواب دینے لگی۔ اس نے ٹارچ بند کر دی اور بیلٹ میں اڑس لی۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ اسی سانس کے ساتھ پانی کی سطح تک پہنچ بھی سکتا ہے یا نہیں۔

...... اور وہ پہنچ گیا۔ بچھڑی ہوا، دیوانہ وار اس کے پھیپھڑوں میں گھسی۔ وہ بے طرح ہانپ رہا تھا۔ درجنوں سوالیہ نگاہیں اس کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ اس کے خالی ہاتھوں کو دیکھ کر وہ لوگ جان گئے کہ کم از کم اس غوطے میں تو کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔

حضور چانڈیو کی پکارتی ہوئی سی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ ''ہمت نہیں ہارنی شیرا! آج کچھ کر کے دکھا دو۔ میرا سر نیچا نہ ہونے دینا۔''

حوصلہ افزائی کی کچھ مزید آوازیں بھی اس کی سماعت سے ٹکرائیں۔ اوپر اسے عرشے پر عروسہ کی پریشان صورت بھی دکھائی دی۔ اس کے چہرے پر بھی امید و بیم کے سائے تھے۔ طوفان ابھی دور تھا لیکن سمندر میں ہلکی لہریں پیدا ہونا شروع ہو گئی تھیں۔

تین چار منٹ تک سانس درست کرنے کے بعد دلاور نے اوپر عرشے پر ان تین تنومند ملازموں کو دیکھا جنہوں نے اس کی کمر سے بندھا ہوا رسا تھام رکھا تھا۔ انہیں اشارہ کر کے دلاور پھر سمندر میں غوطہ زن ہو گیا۔ اس مرتبہ وہ زیادہ تیزی سے پانی میں اترا اور تہ میں پہنچ کر تلاش شروع کر دی۔ سانس الجھنے لگی تھی، ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ یکایک واٹر لائٹ کا روشن دائرہ پتھروں کے درمیان کسی چمکیلی چیز پر پڑا۔ دلاور کا دل دھڑک اٹھا۔ وہ تیزی سے

پاس گیا...... رگوں میں لہو سنسنا اٹھا۔ وہ گلابی باکس ڈھونڈنے میں کامیاب ہوچکا تھا۔ وہ قریباً ڈیڑھ کیوبک فٹ کا باکس دو نکیلے پتھروں کے درمیان اٹکا ہوا تھا اور ایک آبی پودا اس کے اوپر ہلکورے لے رہا تھا۔ دلاور نے اس کے پلاٹینم کے ہینڈل کو ہاتھ لگایا تو کامیابی کی ترنگ جسم میں پھیل گئی۔ ابھی وہ سطح آب پر نہیں پہنچا تھا لیکن تصور کی آنکھ سے دیکھ رہا تھا کہ عرشے پر کھڑے لوگوں کے چہرے خوشی سے تمتمارہے ہیں۔ وہ تالیاں بجارہے ہیں اور نعرے بلند کررہے ہیں۔ حضور چانڈیو کی خوشی دیدنی ہے۔ وہ فخریہ انداز میں عربی اور دیگر مسافروں کی طرف دیکھ رہا ہے اور دلاور کی پیٹھ تھپکتا چلا جارہا ہے۔

دلاور نے باکس پتھروں میں سے نکالا۔ اب اس کا اوپر کا سفر شروع ہوا چاہتا تھا لیکن اچانک ...... بالکل اچانک ...... اس کے اندر ایک جھماکا سا ہوا۔ اسے لگا جیسے وہ اپنی جگہ سکتہ زدہ ہوگیا ہے۔ ایک خیال بجلی کی سی تیزی سے اس کے ذہن میں کوندا تھا۔ ایک فقرہ کسی آتشیں تیر کی طرح اس کے تصور میں لہرایا اور دماغ میں پیوست ہوگیا۔

یہ چوڈیرو حویلی کی بڑی آپا کی آواز تھی ...... ان بھوکے ننگوں کی فطرت ایک جیسی ہوتی ہے۔ یہ اندر سے کمینے ہوتے ہیں، اندر سے زہریلے ہوتے ہیں۔ ان کو جتنا مرضی دودھ پلاؤ، ایک دن ڈس کر ہی رہتے ہیں......

یہ آواز نہیں تھی، پگھلا ہوا سیسہ تھا جو کانوں کے راستے اس کے دماغ میں اترا اور اسے پتھرا گیا۔ سانس اس کے سینے میں تڑپ رہی تھی لیکن وہ اپنی جگہ سے ایک انچ حرکت نہ کرسکا۔

...... ہاں کچھ لمحے ایسے ہی انقلاب آفریں ہوتے ہیں، وہ برسوں کا فاصلہ سیکنڈوں میں طے کرادیتے ہیں۔ چند ساعتوں کے اندر اندر دلاور کے ذہن نے جیسے مدتوں کے نشیب وفراز دیکھ لیے۔ سارے بھوکے ننگے ایک جیسے نہیں ہوتے ...... لیکن اگر بقول بڑی آپا ہوتے ہیں، تو پھر اکثر سرمایہ دار بھی ایک جیسے ہوتے ہوں گے۔ حضور چانڈیو بے شک شاہ زمان اور شاہ فرمان کا دشمن تھا لیکن فطرت تو اس کی بھی ان جیسی ہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بھی وہی لشکارے تھے، اسے بھی اپنے اردگرد کیڑے مکوڑے ہی نظر آتے تھے۔ وہ بھی دلاور کی تعریفیں اسی انداز میں کرتا تھا جس انداز میں کبھی شاہ زمان کیا کرتا تھا۔ یہ میرا کارندہ ہے، یہ میرا پالتو ہے، بڑی اچھی نسل کا ہے...... ہاں یہ سب ایک جیسے ہی تھے۔ بڑی آپا ہو، شاہ فرمان ہو، حضور چانڈیو ہو، یا پھر شیخ بن باقر ہو اور عروسہ ہو...... ان سارے بھوکے ننگوں کی فطرت ایک جیسی ہوتی ہے...... ایک جیسی ہوتی ہے...... آواز دلاور کے کانوں میں گونجتی چلی جارہی تھی۔ کہتے ہیں کہ پانی میں پسینا نہیں آتا لیکن اسے لگا کہ اسے پسینا آرہا ہے...... دیوانی سوچیں اس کے دل و دماغ کو جھنجوڑنے لگیں...... اس نے شاہ فرمان اور شاہ زمان کی بے دام کی غلامی کی۔ یہاں تک کہ اپنی زندگی کی پروا بھی نہ کی۔ لاکھوں ریال کی مالیت کا ''باز'' اپنی جان پر کھیل کر واپس لایا...... اس کے صلے میں اسے کیا ملا؟ صرف ''کارِخاص'' کا خطاب...... اور جھوٹی تعریفیں...... ہاں کچھ لمحے ایسے ہی کایا کلپ ہوتے ہیں۔ وہ برسوں کا فاصلہ ساعتوں میں طے کرتے ہیں۔ دلاور نے یہ فاصلہ طے کرلیا...... اس نے بیش بہا جیولری باکس کو دوبارہ پتھروں کے درمیان پھنسا دیا۔ چوڑے پتوں والا آبی پودا اس کے اوپر کسی شیش ناگ کی طرح لہرانے لگا......

دلاور کا سینا آکسیجن کی طلب میں پھٹ رہا تھا۔ اسے پانی میں اترے کم از کم دس منٹ ہوچکے تھے اور ابھی سطحِ آب تک پہنچنے میں اسے کم از کم تین منٹ مزید درکار تھے۔ کیا وہ تین چار منٹ تک سمندر کے قاتل پانی کو اپنے جسم میں داخل ہونے سے روک سکے گا؟ یہ بے حد سنگین سوال تھا...... بے حد مہلک...... سرفو دم گھٹ نے کہا تھا...... پانی ڈوبے کو نہیں ڈبوتا، اس کی کم ہمتی ڈبوتی ہے...... پانی کے اندر اس وقت تک رہنا سیکھو جب تک تمہاری آنکھوں کے سامنے اندھیرے کی چادر نہ کھلنے لگے۔ جب اندھیرے کی چادر کھلنے لگے تو پھر اوپر آنے کے لیے ہاتھ پاؤں چلانے شروع کردو......

...... اور دلاور نے ہاتھ پاؤں چلانا شروع کردیے۔ وہ اس کی اب تک کی زندگی کا سب سے خوفناک غوطہ تھا۔ وہ آنکھیں بند کرکے خود کو دیوانہ وار حرکت دیتا چلا گیا۔ وہ اوپر اٹھتا چلا جارہا تھا...... ہمت کر دلاور...... چند فٹ...... صرف چند فٹ۔ اس نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔ اسے روشنی نظر آرہی تھی، یہ سیکنڈوں کا کھیل تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ پانی سے باہر لہرایا...... اور پھر ڈھیروں پانی اس کے سینے میں اترتا چلا گیا۔ اندھیرے کی چادر چاروں طرف پھیل گئی تھی۔

☆☆☆

اسے دوبارہ ہوش آیا تو وہ جہاز کے عرشے پر ایک سائبان کے نیچے چت لیٹا تھا۔ بارش ہورہی تھی اور سمندر میں اچھال تھا۔ دن میں ہی رات کا سماں بنا ہوا تھا۔ سب

مسافر اور عملے کے زیادہ تر لوگ اپنے کمروں میں دبکے ہوئے تھے۔ جہاز درمیانی رفتار سے لہروں پر ہچکولے کھاتا بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ دلاور کے قریب مکرانی لڑکے رشید کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ اس نے کہا۔ "اپن کو بڑی فکر لگی ہوئی تھی، شکر ہے تم ہوش میں آ گئے۔"

"کیا ہوا تھا؟" دلاور نے پوچھا۔ (ویسے اسے ہر بات یاد آ چکی تھی)

"وڑی تمہارا ہاتھ تو نظر آ گیا تھا لیکن پھر تم ڈبکی کھا گیا، تم کو رستے سے اوپر کھینچ لیا گیا...... تمہارے پیٹ سے پانی نکالا گیا اور ڈاکٹر نے ایک ٹیکا بھی لگایا......" مکرانی رشید اسے تفصیل بتانے لگا اور ساتھ ساتھ اس کے کندھے دبانے لگا۔

"چودھری جی کہاں ہیں؟" دلاور نے پوچھا۔

رشید ذرا چپ رہنے کے بعد بولا۔ "وڑی کہاں ہونا ہے۔ اپنے کمرے میں ہوگا۔ تمہاری وجہ سے وہ کچھ شرمندہ بھی ہوا ہے۔ شیخ صاحب سے آنکھ نہیں ملا رہا تھا۔ شیخ صاحب نے کہا کوئی بات نہیں۔ چلو چھوکرے نے کوشش تو کیا ہے۔"

"باقی کیا کہہ رہے تھے؟"

"کہنا کیا تھا، بس منہ لٹک گئے تھے سب کے...... شیخ صاحب اور ترکی کیپٹن میں تھوڑا سا منہ ماری بھی ہوا۔ سمجھو کہ لفڑا ہوتے ہوتے رہ گیا۔ شیخ صاحب ابھی کچھ دیر اور وہاں رکنا چاہتا تھا مگر کیپٹن صاحب کا خیال تھا کہ سمندر میں ہلچل آ رہی ہے۔ اپن زیادہ دیر نہیں رک سکتا۔ یہ نہ ہو کہ جیولری ڈھونڈتے ڈھونڈتے جان کا لالہ پڑ جائے۔"

ان باتوں کے دوران میں سیاہ رنگت والی سندری بھی وہاں آ گئی۔ اسے بھی اس بات کا افسوس تھا کہ نیم بے ہوش دلاور کو یہاں عرشے پر چھوڑ کر سب اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے تھے۔ حضور چانڈیو بھی اپنے حال میں مست تھا اور کھا پی رہا تھا۔ اس نے یہ جاننے کی زحمت بھی نہیں کی تھی کہ دلاور اب کہاں ہے؟

سندری نے ہولے سے کہا۔ "یہ امیر لوگ بڑے مطلب پرست ہووت ہیں۔ جب تک مطلب ناہیں نکلتا بڑا کھیال رکھتے ہیں، مطلب نکل جاوے تو پھر میں کون تو کون؟"

دلاور نے سندری کی طرف دیکھا۔ اس کا چمکیلا پن کچھ ماند تھا۔ وہ مرجھائی مرجھائی سی نظر آ تی تھی۔ شاید وہ "ہڈبیتی" ہی بیان کر رہی تھی...... یہ امیر لوگ بڑے مطلب پرست ہووت ہیں......

تھوڑی سی گرم چائے مل جائے گی؟" دلاور نے مکرانی رشید سے پوچھا۔

رشید کے بجائے سندری نے جواب دیا۔ "میں ابھی لے کر آوت ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ تم کو ٹھنڈ لگ رہی ہے۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ واپس مڑی لیکن پھر رک کر بولی۔ "ویسے بھائی! تم نے کوشش تو پوری کی ہے۔ سب کو حیران کر دیا تھا اتنی دیر پانی میں رہ کر۔ وہ جو جہاز کا بڑا افسر ہے۔ اس کا تو ایک رنگ آوت تھا ایک جاوت تھا۔"

وہ چائے لینے چلی گئی۔ دلاور نے خود کو آرام کرسی پر ذرا نیم دراز کیا۔ رشید نے اس پر کمبل ڈال دیا۔ یہ مکرانی رشید بڑا ہمدرد لڑکا تھا۔ سات آٹھ ماہ سے حضور چانڈیو کے ایک مچھلی فارم پر کام کر رہا تھا۔ اس سے پہلے وہ ایک شپنگ کمپنی کا پانڈی یعنی "لوڈر" تھا...... سیکڑوں دفعہ سمندر کے راستے دبئی جا چکا تھا۔ حضور چانڈیو نے مچھلی فارم ختم کر دیا تھا اس لیے وہ دوبارہ شپنگ کمپنی کی ملازمت کا ارادہ رکھتا تھا۔

سندری چائے لے آئی لیکن پتا نہیں کیوں دلاور کا چائے پینے کو دل نہیں چاہا۔ اسے سندری پر ترس آ رہا تھا، اسے لگ رہا تھا کہ وہ بے چاری غلاظت میں لتھڑی ہوئی ہے۔ اسے لگا سندری کی ساری بے بسی، لاچاری اور ناپاکی اس چائے میں بھی در آئی ہے۔ اس نے سندری کا شکریہ ادا کر کے چائے ایک طرف رکھ دی۔

سندری چلی گئی۔ دلاور اسی طرح کرسی پر نیم دراز تھا۔ بارش ہلکی تھی لیکن مسلسل برس رہی تھی۔ لہروں میں اچھال تھا۔ لہروں پر نگاہیں جمائے ہوئے دلاور نے رشید کو مخاطب کیا...... اور کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔ "رشید! جس جگہ ہم کو رکنا پڑا، وہ کون سی جگہ تھی؟"

"جہاں جیولری باکس گرا تھا؟" رشید نے وضاحت چاہی۔ دلاور نے اثبات میں سر ہلایا۔ رشید بولا۔ "وڑی اس کو "برڈ سائٹ" کہوت ہیں۔ شاید آپ نے دیکھا ہووے گا، ادھر دائیں طرف ایک اونچا پتھر پانی میں سے باہر نکلا ہوا ہے۔ کسی پرندے کی چونچ کے مافق لگتا ہے۔"

"ہاں دیکھا تھا میں نے۔" دلاور نے بدستور کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

"یہ جگہ مسقط اور برکا سے پچیس تیس ناٹ شمال کی طرف ہے۔ ناٹ سمجھتا ہے نا آپ؟ یہ سمندری میل کو کہوت ہیں۔ پچھلے سال کی بات ہے۔ ایک دفعہ اپن ادھر سے گزر رہا تھا......"

مکرانی رشید اپنی روانی میں بولتا چلا جا رہا تھا۔ کسی

پرانے سفر کی روداد سنا رہا تھا۔ رشید کی آواز دلاور کے کانوں تک پہنچ رہی تھی لیکن دماغ تک نہیں جا رہی تھی۔ اس کا دماغ تو کہیں اور تھا۔ کہیں دور نمکین اور تاریک سمندر کی گہرائی میں...... جہاں مونگے کی چٹانوں کے پیچھے، کالے اور خیالے رنگ کے پتھروں کے درمیان ...... کچھ موجود تھا۔ اب شام گہری ہوتی جا رہی تھی۔ بارش برس رہی تھی اور گلف ڈریم لہروں پر ہلکورے لیتا منزل کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

وقت ہمیشہ آگے کی طرف رواں رہتا ہے۔ گھڑی کی سوئیاں سرکتی رہتی ہیں۔ رات اور دن ایک دوسرے کے تعاقب میں رہتے ہیں۔ بہاریں اور خزائیں ایک دوسرے کے عقب سے نمودار ہوتی ہیں۔ چوڈیرو میں بھی یہ سب کچھ ہوتا رہا۔ کھیتوں کھلیانوں، کچے پکے۔۔ گھروندوں اور دھول اڑاتے راستوں پر دھوپ اور چھاؤں کی بساط بچھی رہی...... اور اسی طرح چار برس گزر گئے......

چوڈیرو حویلی کی بلند دیواروں کے اندر جو تنی ہوئی گردنوں والے لوگ بستے تھے، ان کی ایک الگ ہی دنیا تھی۔ الگ رہن سہن، الگ رسمیں اور آسائشوں میں گھرے ہوئے الگ شب و روز لیکن اس حویلی میں ایک لڑکی دوسروں سے جدا تھی۔ وہ ہمیشہ سے جدا تھی لیکن پچھلے تین چار برسوں میں تو اور جدا ہو گئی تھی۔ اس کا نام سویرا تھا۔ جس سیاہ رات میں حویلی کے اندر طوفان بپا ہوا تھا، چنگھاڑیں گونجی تھیں، للکارے بلند ہوئے تھے، دلاور کو جانوروں کی طرح مارا گیا تھا اور پھر نیم مردہ کر کے ایک جیپ میں پھینک دیا گیا تھا...... اس سیاہ رات میں سویرا کے اندر کچھ ٹوٹ گیا تھا۔ کرچی کرچی ہو کر اس کے جسم اور اس کی روح میں پیوست ہو گیا تھا۔ اس کے اندر ایک خون سا رستا رہتا تھا۔ وہ سوچتی تھی...... اس رات وہ بھی مر کیوں نہ گئی...... کیوں کھڑی سب کچھ دیکھتی رہی۔ لیکن...... لیکن وہ بالکل کھڑی تو نہیں رہی تھی۔ وہ ایک بار بے ساختہ آگے بڑھی تھی لیکن بڑی آپا اور ایک ملازمہ نے اسے پکڑ لیا تھا۔ اور پھر وہ بالکل ہی پتھرا کر رہ گئی تھی۔ اس نے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے ہی دیکھا تھا...... وہ جیپ میں اوندھا پڑا تھا، اس کی آنکھیں ادھ کھلی تھیں۔ ایک لمحے کے لیے اسے لگا تھا کہ وہ اسی کی طرف دیکھ رہا ہے۔ پھر وہ لوگ اسے لے گئے تھے۔ دفن کرنے کے لیے یا پھر کسی قاتل پانی میں غرقاب کرنے کے لیے۔

...... اور وہ پتھرائی رہی تھی...... شاید وہ اب تک پتھرائی ہوئی تھی۔ غم کے شدید ریلوں کے بعد اب اس کی زندگی میں کچھ ٹھہراؤ آنا شروع ہو گیا تھا۔ وہ جیسے سمجھ گئی تھی کہ یہ زندگی اسے ایسے ہی گزارنی ہے۔ شاہ زمان کی موت کے بعد وہ بیوہ ہو گئی تھی۔ ایسی جوان بیوہ جس کا کوئی بچہ بھی نہیں تھا۔ نئی زندگی شروع کرنے کا اس نے کبھی سوچا نہیں تھا لیکن اگر وہ سوچتی بھی تو اسے اس حویلی کی اونچی دیواریں کون پار کرنے دیتا۔ یہاں کی رسمیں الگ تھیں۔ نہ طلاق کی صورت میں رہائی تھی، نہ بیوگی کی صورت میں...... بلکہ شاید مر کے بھی رہائی نہیں تھی کیونکہ یہ حویلی اتنی بڑی تھی کہ اس کا خاندانی قبرستان بھی اونچی چار دیواری کے اندر ہی تھا۔

اسے پتا نہیں تھا کہ دلاور زندہ ہے یا مر چکا ہے۔ پہلے تو یہی کہا جاتا تھا کہ وہ اسی رات مار دیا گیا تھا...... لیکن پھر تین چار ماہ بعد کچھ اڑتی اڑتی سی باتیں سویرا کے کانوں تک پہنچی تھیں۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ وہ بچ گیا تھا اور حضور چانڈیو کے لوگ اسے اٹھا کر اپنی سبز حویلی میں لے گئے تھے مگر ٹھوس ثبوت کے ساتھ ان باتوں کی تصدیق کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ ایک بار یہ اڑتی اڑتی بھی سنی گئی تھی کہ وہ پاکستان میں نہیں ہے۔ حضور چانڈیو نے اسے مڈل ایسٹ بھیج دیا ہے...... پھر ایک مرتبہ سویرا کو اپنی پروفیسر پھپھو کی زبانی معلوم ہوا کہ انہوں نے کراچی کی ایک سڑک پر دلاور کی جھلک دیکھی ہے۔ وہ کسی کے ساتھ موٹر سائیکل پر سوار تھا اور اسٹیشن کی طرف جا رہا تھا۔ بس یہ ساری باتیں اور مفروضے ہی تھے۔ غالب گمان اور تلخ حقیقت شاید یہی تھی کہ وہ نومبر کی اسی تاریک شب میں مار دیا گیا تھا۔ اس کا نام ان بہت سے لوگوں میں شامل ہو گیا تھا جو ان وڈیروں کی اونچی دیواروں والی حویلیوں میں جان ہارتے ہیں۔ نہ ان کا کوئی پرچہ درج ہوتا ہے، نہ کوئی تفتیش ہوتی ہے، بلکہ کبھی کبھی تو ان کی قبر بھی نہیں ہوتی......

وہ دلاور کو اور اس کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کو بھول جانا چاہتی تھی لیکن پتا نہیں کیوں، وہ اسے بھولتا نہیں تھا۔ کسی نہ کسی بہانے، کسی نہ کسی ناتے سے وہ اس کے سامنے آن کھڑا ہوتا تھا۔ خون میں لتھڑا ہوا اور زخموں سے بھرا ہوا۔ وہ اس سے پوچھتا تھا۔ ”بی بی جی! کیا آپ بھی وہی سمجھتی تھیں، جو لوگ سمجھتے تھے؟ کیا آپ کا خیال بھی یہی ہے کہ میں نے منہ چھپا کر آپ کی عزت پر ہاتھ ڈالنا چاہا؟“

وہ سسک اٹھتی۔ دل ہی دل میں کہتی۔ ”مجھے کچھ پتا نہیں، میں سماج کی باندی ہوں۔ میں ایک گونگی بہری اندھی عورت ہوں۔“

وہ کہتا۔ ''لیکن آپ کا دل تو ہے بی بی جی، کیا آپ کے دل سے کوئی راہ میرے دل کی طرف نہیں آتی تھی؟''

وہ تڑپ اٹھتی، خیالی ہیولے سے مخاطب ہو کر کہتی۔ ''ہاں آتی تھی...... ہاں آتی تھی، وہ اب بھی ہے...... شاید ہمیشہ رہے گی۔ لیکن وہ راہ ہمیشہ سات پردوں میں چھپی رہتی ہے اور وہ چھپی ہی رہے گی۔''

وہ بے آواز رونے لگتی۔ ایسے میں دل کے نہاں خانوں میں جو خاموش سی ندی تھی، اس میں اچھال پیدا ہوتا اور اونچی پگڑیوں اور بلند دیواروں کے خوف سے اس کا سارا وجود لرز جاتا۔

شروع کے ایک دو برسوں میں شاہ فرمان نے کوشش کی تھی کہ اس حویلی کی پرانی رسموں کے مطابق اپنے بھائی کی بیوہ کو اپنے گھر میں ڈال لے لیکن جب اس نے دیکھا کہ بڑی آپا کی کوششوں کے باوجود سویرا سخت مزاحمت کر رہی ہے اور اس مزاحمت میں خودکشی کی حد تک جانے کو تیار ہے تو وہ پیچھے ہٹ گیا۔ مگر حویلی کی قید تو بہرحال موجود تھی...... ناک کٹی نگینہ بیگم کی طرح اس نے بھی اس قید کو آہستہ آہستہ قبول کر لیا تھا...... شاہ فرمان کی دوسری بیوی سے اس کا بیٹا شاہ بابر اب بالغ ہو چکا تھا اور شاہ فرمان اسے مستقبل میں مختارِ کل بنانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ شاہ بابر میں بھی اپنے باپ اور چچا کی ساری جاگیردارانہ خصوصیات موجود تھیں۔ آج کل وہ ایک سنگین چکر میں پھنسا ہوا تھا۔ ساجے بٹھل اور چوڈیرو والوں کی دشمنی ہنوز موجود تھی۔ گاہے بگاہے کوئی کھٹراگ ...بھی ہو جاتا تھا۔ ایسے ہی ایک کھٹاگ میں پچھلے سال ٹیپو ٹریگر گولیوں سے چھلنی ہو چکا تھا۔ ظفری ایک کیس میں چار سال کے لیے جیل چلا گیا تھا۔ بڑی آپا پہلے کی طرح حویلی میں دندناتی تھی اور شاہ فرمان کبھی کبھی رات کو شکار کے لیے نکلتا تھا لیکن یہ ''شکار'' جنگل میں نہیں حویلی کے اندر ہی ہوتا تھا اور اس کا نشانہ اکثر کوئی اچھی شکل والی ملازمہ یا بہاولپور وغیرہ سے آئی ہوئی طوائف بنتی تھی۔

وہ فروری کی ایک خنک شام تھی۔ سویرا کے کندھوں پر سفید شال تھی۔ وہ انگیٹھی کے سامنے بیٹھی ایک کتاب پڑھ رہی تھی۔ بڑی آپا جو پچھلے کئی دنوں سے کافی خوش تھی، روتی ہوئی سویرا کے پاس آئی اور بولی۔ ''سویرا! بہت برا ہوا ہے۔ حاجی اشرف نے راضی نامہ کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ انہوں نے دوٹوک بات کر دی ہے۔ پرسوں والی پیشی پر وہ عدالت میں نہیں گئے...... تو...... تو بابر لٹک جائے گا، وہ نہیں بچے گا۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے بڑی آپا کی آواز بیٹھ گئی اور آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔

سویرا بے حد حیران تھی، کانپتی آواز میں بولی۔ ''لیکن...... لیکن وہ تو مان چکے تھے۔ سب کچھ طے ہو گیا تھا......''

''پتا نہیں کیا ہوا ہے۔ وہ بالکل لوہے کے تھن بن گئے ہیں۔ سمجھو انہوں نے دھکے مار کر شاہ فرمان اور پیر فضل کو گھر سے نکال دیا ہے...... یہ سب کچھ اسی شاہ لاہوری کی طرف سے ہو رہا ہے۔ وہ خبیث ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے پڑ گیا ہے۔ نہیں تو حاجی اشرف کے خاندان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ راضی نامہ نہ کرتے۔ یہ سب کچھ اسی کمینے کا کیا دھرا ہے۔ پہلے ہماری زمین پر نظر تھی، اب کنجر ہمارے پتر کے پیچھے پڑ گیا ہے۔''

بڑی آپا جس کو شاہ لاہوری کہہ رہی تھی، اس کا نام پچھلے سال ڈیڑھ سال سے ہی سننے میں آ رہا تھا۔ وہ زیادہ تر لاہور میں ہی رہتا تھا مگر اس کے منیجر اور کارندے یہاں بڑا زبردست کام کر رہے تھے۔ انہوں نے چوڈیرو والوں کی زمینوں کے ساتھ ہی بہت سی زمین خریدی تھی اور وہاں ایک بڑی کاٹن جننگ فیکٹری لگائی تھی۔ فیکٹری کی تعمیر کے دوران میں شاہ فرمان کا فیکٹری مالکوں سے زبردست جھگڑا بھی ہوا تھا۔ وہی زمین کی حد بندی کے معاملے تھے کوئی اور ہوتا تو شاہ فرمان اور پیر فضل وغیرہ اسے کہاں ٹکنے دیتے مگر شاہ لاہوری ایک بہت بڑی پارٹی تھا اور لوگ صحیح کہتے ہیں کہ بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھاتی ہے۔ شاہ لاہوری تو لاہور میں تھا، اس کے دست راست منیجر سلطان واہلہ نے ہی چوڈیرو والوں کو تارے دکھا دیے تھے۔ بہرحال وہ معاملہ کچھ لو کچھ دو کی بنیاد پر طے ہو گیا تھا۔ اب یہ بابر والا نیا کیس شروع ہو گیا تھا۔

بڑی آپا ہولے ہولے لرز رہی تھی۔ اس نے سویرا سے کہا۔ ''مجھ سے تو حاجرہ کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔ ڈر لگ رہا ہے کہ اسے کچھ ہو ہی نہ جائے...... کلا کلا پتر ہے۔ اللہ خیر کرے۔ اسے کچھ ہو گیا تو وہ تو جیتے جی مر جائے گی۔''

سویرا نے کہا۔ ''اور بھائی فرمان کی بھی تو جان ہے بابر میں۔ جب سیشن کورٹ نے سزا بولی تھی بابر کو...... آپ کو پتا ہی ہے ان کی کیا حالت ہو گئی تھی۔''

''اب بھی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ بلڈ پریشر بڑھا ہوا ہے، گولیوں کے پھکے مار رہے ہیں۔ کسی وڈے سرکاری افسر کو لے کر ایک بار پھر حاجی اشرف کی طرف جا رہے ہیں۔''

سویرا بولی۔ ''ہم عورتوں کو ان باتوں کا زیادہ پتا تو نہیں ہوتا۔ لیکن مجھے لگتا ہے بڑی آپا کہ حاجی اشرف وغیرہ

سے بات کرنے کے بجائے اس شخص سے بات کی جائے جو اس مصیبت کی جڑ ہے۔ شاہ لاہوری یا پھر اس کے کسی بااختیار بندے سے رابطہ کیا جائے۔"

"میں نے کہا ہے پیر فضل سے۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ یہاں نہیں ہے، بلکہ پاکستان میں ہی نہیں ہے۔ ویسے بھی ان بڑے لوگوں سے ملنا کون سا آسان کام ہوتا ہے۔"

بابر کی شکل سویرا کی نگاہوں میں گھومنے لگی ...... کیا واقعی ...... اسے پھانسی ہو جائے گی؟ اس کی عمر ہی کیا تھی۔ اٹھارہ سال اور شاید چند مہینے ...... یا پھر انیس پورے ہو گئے ہوں گے۔ ابھی مسیں ہی بھیگی تھیں۔ اونچا قد، نمایاں طور پر اونچی ناک اور آنکھوں میں وہی تیز چمک جو چوڈیرو حویلی والوں کی خاصیت تھی۔ جس ماحول میں اس کی تربیت ہوئی تھی، اس کا نتیجہ نکلا تھا۔ بالغ ہوتے ہی اس کے مزاج میں کچھ عجیب تبدیلی ہوئی تھی ..... اسے کھیتوں سے دلچسپی تھی۔ اس دلچسپی کا تعلق لہلہاتی فصلوں سے نہیں، گاؤں کی خوش شکل لڑکیوں سے تھا مگر پھر جب بات اس کی اپنی بہن پر آئی تھی تو وہ ایک "باغیرت" بھائی بن گیا تھا اور سارے چولستان کی آگ اس کے اندر اکٹھی ہو گئی تھی۔ اس کی بہن مہرین کا نام ایک لڑکے عاطف کے ساتھ آ گیا تھا۔ عاطف ساتھ والے گوٹھ کے ایک درمیانی درجے کے زمیندار حاجی اشرف کا بیٹا تھا اور زرعی کالج میں پڑھتا تھا۔ عاطف اور مہرین ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے تھے۔ لیکن ان وڈیروں کی تو اپنی ہی "معاشرت" ہوتی ہے۔ اپنے لیے کچھ اور اصول ...... دوسروں کے لیے کچھ اور ضابطے۔ بابر نے کچھ ساتھیوں کو اپنے ہمراہ لیا اور ایک دن منڈ بھیرو کے قریب عاطف پر ٹوٹ پڑا۔ عاطف کے ساتھ اس کا بڑا بھائی شاہد اور ایک دوست تھا۔ انہوں نے عاطف کو بچانے کی کوشش کی۔ اس لڑائی میں بابر کی سیون ایم ایم رائفل سے چلنے والی دو گولیوں نے عاطف کے بڑے بھائی کی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔ عاطف کے بازو میں بھی گولی لگی۔ بابر گرفتار ہوا۔ ثبوت بڑے واضح اور ناقابلِ تردید تھے۔ سیشن کورٹ سے بابر کو پھانسی کی سزا ہوئی جو بعد کے مراحل میں بھی برقرار رہی اور اب وہ پھانسی کی کوٹھڑی میں اپنے انجام سے دہشت زدہ، ایک زندہ لاش کی طرح موجود تھا۔ تین چار ماہ قبل، پہلی مرتبہ اس حوالے سے امید کی کچھ کرنیں پیدا ہوئی تھیں ...... ایک مقامی سیاست دان کے توسط سے حاجی اشرف کے گھرانے سے بات آگے بڑھی تھی۔ خون بہا اور دیت کے قانون کے مطابق اگر وارث مجرم کو معاف کر دیتے تو بابر کی پھانسی ٹل سکتی تھی۔ یہ بات چیت مسلسل ڈیڑھ دو مہینے جاری رہی تھی۔ بالآخر چوڈیرو حویلی میں خوشی کے شادیانے بجنا شروع ہو گئے تھے۔ مدعی پارٹی نے کچھ شرائط کے ساتھ معافی نامے پر رضامندی ظاہر کر دی تھی ...... ان شرائط کے مطابق شاہ فرمان نے بیس مربعے زرعی اراضی حاجی اشرف کی فیملی کو دینا تھی۔ مقتول کی بیوہ کے لیے ایک کروڑ روپیہ نقد بھی طے ہوا تھا۔ ایک شرط یہ بھی طے کی گئی تھی کہ مقتول کے گوٹھ کو جانے والا قریبی راستہ جو شاہ فرمان کی زمینوں کی وجہ سے بند تھا، آمدورفت کے لیے کھول دیا جائے گا۔

...... یہ سارے معاملے تقریباً طے پا چکے تھے اور چوڈیرو حویلی میں ایک بار مٹھائی بھی تقسیم کی جا چکی تھی لیکن اب اچانک اطلاع آئی تھی کہ مدعی پارٹی نے مزید بات چیت سے انکار کر دیا ہے ...... اور خون بہا لینے کا ارادہ بدل دیا ہے۔ چوڈیرو حویلی میں تقریباً سب ہی جان گئے تھے کہ اس انتہائی تشویشناک تبدیلی کے پیچھے کن لوگوں کا ہاتھ ہے۔

☆☆☆

منظر ایک سجے سجائے وسیع ڈرائنگ روم کا تھا۔ یہ ڈرائنگ روم جس کوٹھی کا تھا، وہ چوڈیرو حویلی سے زیادہ دور نہیں تھی۔ یہی کوئی سات کلومیٹر کا فاصلہ رہا ہوگا۔ یہ کوٹھی زیادہ بڑی نہیں تھی اور شاہ لاہوری نے یہاں اپنے عارضی قیام کے لیے اپنی جننگ فیکٹری کے پہلو میں تعمیر کرائی تھی۔ ڈرائنگ روم میں بے حد رقت آمیز منظر تھا۔ بابر کی ماں حاجرہ جو ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتی تھی، اپنی چادر پھیلا کر شاہ لاہوری کے دستِ راست سلطان والہلہ کی منتیں کر رہی تھی۔ شاہ فرمان اور پیر فضل بھی جو کچھ دیر پہلے تھوڑا ترش بولے تھے اب بھیگی بلی بنے کھڑے تھے۔ ان کی پگڑیوں کے اونچے شملے بھی جیسے ان کی طرح ہی مرجھائے ہوئے تھے۔ شاہ فرمان نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "والہلہ صاحب! اتنی گل کا تو ہم کو بھی پتا ہے کہ حاجی اشرف میں خود اتنا دم نہیں ہے، وہ جو کچھ کر رہا ہے آپ لوگوں کی رائے اور مشورے سے کر رہا ہے لیکن جو کچھ بھی ہے، ہم اس لڑائی کو اور لمبا کرنا نہیں چاہتے۔"

"نہیں ...... آپ کرنا چاہتے ہیں تو کر لیں۔" سلطان والہلہ نے اپنی رعب دار مونچھوں کو سہلایا اور اندازِ بے نیازی سے بولا۔

بڑی آپا جیسے تڑپ گئی۔ ایک دم آگے بڑھ کر بولی۔ "نہیں بھائی صاحب! ہم تو آپ لوگوں کے سامنے اپنی

جھولی پھیلانے آئے ہیں۔ بابر کو اللہ نہ کرے پھانسی ہوئی تو ایک نہیں دو موتیں ہوں گی۔ یہ کرماں سڑی ماں بھی زندہ نہیں رہے گی۔ اس کے ساتھ ہی قبر میں اتر جائے گی۔'' بڑی آپا نے بابر کی بیمار ماں حاجرہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

دونوں عورتیں بلند آواز میں رونے لگیں۔ سویرا بھی یہاں موجود تھی۔ چادر کے نقاب میں سے بس اس کی آنکھیں ہی نظر آ رہی تھیں۔ سوجی ہوئی سرخ آنکھیں۔ وہ بھی دونوں جیٹھانیوں کو دیکھ کر سسک اٹھی۔ پیر فضل نے انہیں بہ مشکل چپ کرایا اور سلطان واہلہ سے مخاطب ہو کر ملائمت سے بولا۔ ''واہلہ صاحب! حاجی اشرف نے جو تین شرطیں کہی تھیں وہ ہم نے پوری کی پوری مان لی تھیں۔ اب اگر وہ کوئی اور شرط رکھتے ہیں تو ہم اس پر بھی ابھی غور کرنے کو تیار ہیں۔ سنا ہے کہ وہ ایک دو اور شرطوں کی بات کر رہے ہیں......''

''یہ آپ لوگوں سے کس نے کہا ہے؟'' سلطان واہلہ درشت لہجے میں بولا۔ ''وہ تو سرے سے کوئی بات کرنے کو تیار ہی نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جس طرح انہوں نے اپنے جوان پتر کا لاشا دیکھا تھا وہ آپ کے پتر کا بھی دیکھنا چاہتے ہیں۔''

''خدا دا واسطہ اے...... خدا رسول دا واسطہ اے۔ ایسی گل نہ کرو۔'' بابر کی ماں حاجرہ نے روتے ہوئے اپنے ہاتھ جوڑ دیے۔ شاہ فرمان کا لشکارے مارتا ہوا رنگ بھی مٹی ہو رہا تھا۔

سلطان واہلہ نے سگریٹ سلگا کر اپنے بیش قیمت طلائی لائٹر کو جیب میں ڈالا۔ اس کے چہرے پر تھوڑی سی نرمی کے آثار پیدا ہوئے۔ وہ بولا۔ ''میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔ آپ ...... ایک دفعہ بڑے صاحب سے بھی بات کر کے دیکھ لیں۔ لیکن آج کل تو وہ بہت مصروف ہیں۔ اگلے ہفتے انہوں نے یہاں فیکٹری کے کام سے آنا ہے۔ میں ان سے آپ کے لیے ٹائم لینے کی کوشش کروں گا۔''

پیر فضل ہراساں لہجے میں بولا۔ ''پر تب تک تو بڑی دیر ہو جائے گی۔ وکیل پراچہ کہہ رہا تھا کہ جو کچھ بھی کرنا ہے، اتوار کے دن تک کر لو۔ ورنہ......'' شاید وہ آگے بھی کچھ کہتا مگر روتی ہوئی عورتوں کی طرف دیکھ کر چپ ہو گیا۔

پیر فضل نے بڑی عاجزی سے سلطان واہلہ کو اشارہ کیا کہ وہ علیحدہ ہو کر اس کی بات سن لے۔ دونوں کوریڈور کی طرف چلے گئے۔ پانچ دس منٹ بعد دونوں کی واپسی ہوئی تو پیر فضل کی چھوٹی چھوٹی کھچڑی داڑھی پر آنسوؤں کی نمی تھی۔ لیکن دونوں کے تاثرات بتا رہے تھے کہ جہاندیدہ اور تحمل مزاج پیر فضل کسی حد تک سلطان واہلہ کو قائل کرنے میں کامیاب رہا ہے۔ سلطان واہلہ نے نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''میں کوشش کرتا ہوں کہ بڑے صاحب (شاہ لاہوری) اتوار کے بجائے منگل یا بدھ کو یہاں کا چکر لگا لیں۔ زیادہ لوگوں کو لانے کی ضرورت نہیں۔ یہی جو پانچ لوگ یہاں ہیں، وہی آ جائیں...... اور ایک دفعہ بات کر کے دیکھ لیں۔ حاجی اشرف کی فیملی تو بالکل کوئی بات نہیں سن رہی لیکن میں کوشش کروں گا کہ حاجی اشرف کو کسی طرح یہاں بلا لوں۔ آگے آپ کی قسمت۔''

پھر وہ سویرا سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''بہن جی! آپ بھی ضرور آئیں۔ میرا خیال ہے کہ ان میں آپ ہی پڑھی لکھی ہیں...... اور آسانی سے بات کر لیتی ہیں۔''

وہ سب کے سب اثبات میں سر ہلانے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر پا رہے تھے۔ ان ابتلا کی گھڑیوں میں ان کو دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ یہ چوڑیرو کی اسی اونچی حویلی کے مکین ہیں جو گردنوں کو خم کرنا نہیں جانتے، جن کو ہوا بھی چھو کر گزرنے سے ڈرتی ہے اور جن کی ایک دھاڑ سے پنچ لوگوں کے کپڑے گیلے ہو جاتے ہیں۔ آج وہ اپنے سے زیادہ طاقتور اور بارسوخ شخص کے پنجے میں تھے۔ ہاں...... اونٹ پہاڑ کے نیچے تھا۔

☆☆☆

بدھ تک کا دن ایک ایک پل گن گن کر کاٹا گیا تھا۔ چوڑیرو حویلی میں جہاں بس گھنگرو ہی چھن چھناتے تھے، ایک درجن حفاظ قرآن شب و روز تلاوت میں مصروف تھے۔ عیاشی کی دعوتوں کی جگہ لنگر جاری کیا گیا تھا۔ ترنڈا.. منڈ بھیرو اور نہ جانے کہاں کہاں سے لوگ اس لنگر پر آ رہے تھے اور ''کایا کلپ'' پر تبصرے کر رہے تھے۔ چوڑیرو حویلی والے اچھی طرح جان چکے تھے کہ اس خوفناک تالے کی اصل کنجی اس شاہ لاہوری کے پاس ہے۔ ورنہ حاجی اشرف اور اس کے خانوادے کی کیا حیثیت تھی۔ ان کو تو کسی نہ کسی طرح سنبھال ہی لیتا تھا چوڑیرو والوں نے۔

خدا خدا کر کے وہ گھڑیاں آئیں، جب حویلی کی روتی سسکتی عورتیں اپنے مردوں کے ساتھ شاہ لاہوری کے سامنے پہنچیں۔ انہیں وسیع ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا گیا تھا۔ قریباً دس منٹ بعد اندرونی دروازہ کھلا۔ دراز قد شاہ لاہوری اپنے منیجر اور مسلح گارڈ کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ وہ کاٹن کی شاندار شلوار قمیص اور واسکٹ میں تھا...... چھوٹی چھوٹی نفیس داڑھی اور فریم لیس عینک میں بڑا وجیہہ لگ رہا

تھا۔ سویرا نے دھیان سے اسے دیکھا اور اسے اپنے اردگرد کی ہر شے گھومتی ہوئی محسوس ہوئی۔ کہیں وہ جاگتی آنکھوں سے خواب تو نہیں دیکھ رہی تھی۔ یا پھر...... اس کی نگاہ درست کام نہیں کررہی تھی۔ اسے لگا کہ جو شخص رسمی کلمات ادا کرنے کے بعد سامنے اٹالین صوفے پر بیٹھا ہے، وہ دلاور ہے۔ وہی دلاور جو چوڈیرہ حویلی کا ڈرائیور رہا تھا، گارڈ رہا تھا...... کارِ خاص رہا تھا اور پھر ایک گھناؤنے الزام کے ساتھ مار دیا گیا تھا۔

سویرا نقاب میں تھی لیکن اس کی آنکھیں اور پیشانی تو دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے چادر کھینچ کر اپنی پیشانی کو کچھ اور چھپایا...... لیکن اسے لگا کہ یہ چھپانا بے کار ہے...... وہ جو کوئی بھی تھا، اسے دیکھ چکا ہے اور پہچان چکا ہے۔

''جی کہیں۔ میں آپ لوگوں کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟'' وہ ٹھہری ہوئی بھاری آواز میں بولا۔ ہاں، یہ وہی آواز تھی۔

کون تھا جو اس کی بات کا جواب دیتا۔ سب کے منہ کھلے ہوئے تھے اور آنکھوں میں حیرت کا سمندر تھا۔

شاہ فرمان نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ ''تم...... تم...... آپ؟'' اس سے آگے اس کی زبان بند ہوگئی۔

سویرا نے دیکھا، پیر فضل اور بڑی آپا بھی تھرتھر کانپ رہے تھے۔ وہ رعب دار آواز میں بولا۔ ''اتنا حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ جو اڑتی اڑتی سی باتیں آپ نے سنی تھیں کہ دلاور ابچ گیا ہے...... دلاور احضور چانڈیو کے پاس ہے...... دلاور اباہر ہے...... وہ غلط نہیں تھیں۔ میرا جرم تو بہت بڑا تھا اور مجھے واقعی مر بھی جانا چاہیے تھا لیکن ...... بس اللہ کی مرضی تھی۔ اس تالاب میں سے نکلتے وقت میں بالکل مُردہ نہیں تھا، کوئی دو چار سانسیں باقی تھیں میرے اندر......''

یہاں کون تھا جو اس کی باتوں کا جواب دیتا ...... یا اس کی طرف آنکھ بھر کر دیکھ بھی سکتا۔ وہ سب لرزاں و ترساں کھڑے تھے یوں کہ کاٹو تو بدن میں لہو کی بوند نہیں اگر کوئی کم لرزاں اور کم حیران تھا تو وہ سویرا تھی۔ وہ یک ٹک اسے دیکھتی چلی جارہی تھی۔

...... وہ پھر اس کے سامنے آ گیا تھا۔ وہ کیوں اس کے سامنے آ گیا تھا؟ ہزاروں سال پہلے جب اس روہی کے گرد قدیم بستیاں تھیں، وہ شاید ان بستیوں میں بھی نظر آتا تھا۔ بار بار اس کے سامنے آ جاتا تھا...... وہ دور رہ کر بھی اس کے آس پاس ہی ہوتا تھا......

تم کب تک مجھ کو بھولو گے

اس دشت کی تنہا راتوں میں اک درد جو ٹھہرا رہتا ہے
وہ درد بھی طعنے دیتا ہے، چپ چاپ سا سسکیاں لیتا ہے
اک ٹیس بھی اٹھ کے کہتی ہے
تم کب تک مجھ کو بھولو گے
صحرا کی جھلسی دوپہروں میں، کچھ ان دیکھی سی راہیں ہیں
کچھ اَن دیکھے سے سائے ہیں، جو ساتھ مرے ہی چلتے ہیں
اور ان سایوں کی بستی میں، اک گرم دوپہر کی مستی میں
اک خام خیال سی ہستی میں
کچھ ان چھوئے سے جذبے ہیں، جو اکثر مجھ سے کہتے ہیں
تم کب تک مجھ کو بھولو گے

وہ اسے دیکھتی چلی جارہی تھی۔ اردگرد سے بے خبر ہوکر سب سے جدا ہوگئی تھی۔ کمرے میں کہرام سا مچا ہوا تھا۔ حاجرہ اور بڑی آپا دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں اور تو اور...... شاہ فرمان کی آنکھوں میں بھی نمی تھی۔ وہ دلاور سے پتا نہیں کیا کچھ کہہ رہا تھا مگر سارے لفظ عاجزی کے تھے...... شکست کے تھے اور منت کے تھے۔ شاہ فرمان کی آواز جیسے کہیں بہت دور سے سویرا کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ ٹوٹے ٹوٹے سے فقرے تھے...... ''اللہ نے تجھے بڑی اچی شان دے دی ہے دلاور۔ ہم سے پرانے بدلے نہ لے۔ جو ہوگیا ہم نے اس پر مٹی ڈال دی، تم بھی ہمیں معاف کردو۔ جرم تھا تو بھی کردو، نہیں تھا تو بھی کردو۔''

پیر فضل بھی اسی طرح کے جملے بول رہا تھا۔ کچھ جملے سویرا کی سمجھ میں آ رہے تھے، کچھ نہیں آ رہے تھے۔ پھر اچانک بڑی آپا بری طرح چلّا اٹھیں۔ بابر کی ماں حاجرہ، شاہ لاہوری کے پاؤں پکڑنے آگے بڑھی تھی اور وہیں پر بے ہوش ہوگئی تھی۔

☆☆☆

بابر کی والدہ کو آدھ گھنٹے بعد ہوش آ گیا۔ پیر فضل وغیرہ اسے بہاولپور اسپتال لے جانا چاہتے تھے لیکن وہ دروازے کی چوکھٹ پکڑ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ اپنے بچے کے لیے معافی نامہ لیے بغیر یہاں سے نہیں جائے گی۔ اگر جان جاتی ہے تو چلی جائے۔

...... آخر فیصلہ کن مرحلہ پہنچ گیا۔ شاہ لاہوری یعنی دلاور نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تین شرطیں ایسی ہیں جن کو مانے بغیر یہ مسئلہ کسی صورت بھی حل نہیں ہوسکتا......''

بابر کے لواحقین تناؤ اور دکھ کی انتہا تک پہنچ چکے تھے۔ حاجرہ بیگم نے یہاں تک کہہ دیا۔ ''وے میرے پتر!

مجھے تیری شرطیں بغیر سنے منظور ہیں۔ تو بس میرے بابر کی گردن سے پھانسی کا پھندا نکلوادے۔" وہ بلک رہی تھی۔

دلاور نے کہا۔ "لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ شرطیں سن لیں۔ ویسے یہ کوئی ایسی شرطیں نہیں ہیں جو آپ نہ مان سکیں اور ایک شرط تو بالکل معمولی ہے۔"

"تم بتاؤ دلاور! ہم سن رہے ہیں۔" پیر فضل بے قراری سے بولا۔

"جو زرعی زمین آپ لوگ ہرجانے میں دے رہے ہیں، وہ اونٹ کے منہ میں زیرے والی بات ہے۔ وہ کم از کم چالیس مربعے ہونی چاہیے۔ پچاس پچاس مربعے زمین تو آپ کے گھر کے ایک ایک بچے کے پاس ہے۔"

یہ شرط فوری طور پر مان لی گئی۔

اس کے بعد دلاور نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "دوسری شرط یہ ہے کہ...... حاجی اشرف کا بیٹا عاطف اور آپ کی بیٹی مہرین ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ یہ کسی طرح بھی کوئی بے جوڑ رشتہ نہیں ہے۔ آپ لوگ ان دونوں کے راستے کی دیوار نہ بنیں، ان کی شادی کردیں۔"

شاہ فرمان کے چہرے پر کئی رنگ آکر گزر گئے......

لیکن کچھ بھی تھا شیر لوہے کے جال میں تھا۔ یا یوں کہہ لیں کہ روہی کا سرکش وڈیرا مکافات کے شکنجے میں تھا۔ سب خاموش تھے...... اور یہ خاموشی بوجھل ہو رہی تھی۔ بڑی آپا نے بات سنبھالتے ہوئے کہا۔ "یہ بات پہلے بھی ہمارے کانوں میں پڑ چکی ہے دلاور ...... اور ہم اس بارے میں سوچ رہے ہیں۔ اب تم نے بھی یہ بات کہہ دی ہے۔ میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ یہ کام بھی ہو جائے گا۔ بس ہم حویلی میں تھوڑا سا مشورہ کرلیں۔"

"مشورہ کس سے کرنا ہے آپ نے؟" دلاور چیخ کر بولا۔ "مجھ سے کچھ چھپا ہوا نہیں ہے۔ سارے "مشورے والے" اسی جگہ یہاں موجود ہیں۔ جو کچھ ہو جانا ہے، اب یہیں پر ہو جانا ہے یا پھر نہیں ہونا۔"

دلاور کو برہم دیکھ کر ایک بار پھر چوڈیرو حویلی کے سرخیلوں کے رنگ اڑ گئے۔ حاجرہ بیگم کی حالت غیر ہونے لگی۔ شاہ فرمان، پیر فضل اور بڑی آپا وغیرہ نے تھوڑی دیر تک سر جوڑ کر باتیں کیں۔ اس دوران میں ڈرائنگ روم کے اندر عجیب سنسنی خیز ماحول رہا۔ آخر شاہ فرمان نے مرے مرے سے لہجے میں کہا۔ "جس میں بچے خوش ہیں، ہم بھی اس میں خوش ہیں۔ ہمیں یہ شرط منظور ہے۔"

سویرا ایک طرف بیٹھی مبہوت، سب کچھ دیکھ رہی تھی۔

اب سب کو تیسری شرط کا انتظار تھا۔ دل دھڑک رہے تھے۔ دلاور نے کہا۔ "تیسری شرط بھی کچھ زیادہ بڑی نہیں ہے لیکن یہ میرے لیے بہت بڑی ہے۔" اس نے چند لمحے رک کر بڑی آپا کی طرف دیکھا اور بات جاری رکھی۔ "میں ایک بھوکا ننگا غریب تھا اور بھوکے ننگے غریبوں کے لیے عزت سے قیمتی اور کوئی چیز نہیں ہوتی۔ بس یہی ان کا سرمایہ ہوتا ہے۔ آپ کو اچھی طرح پتا ہے، چار سال پہلے آپ کی اُچی حویلی میں مجھ سے یہ سرمایہ چھینا گیا۔ مجھ پر چوری کا الزام لگا اور اس سے بھی بڑا الزام یہ لگا کہ میں نے ...... اپنی مالکن کو بے عزت کرنے کی کوشش کی۔ وہ مالکن جس کو میں آنکھ بھر کر دیکھنا بھی گناہ سمجھتا تھا......" دلاور کی آواز بوجھل ہوگئی۔

کمرے میں سناٹا تھا۔ سب سکتہ زدہ تھے۔ دلاور نے شاہ فرمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں اس بات کو لمبا کرنا نہیں چاہتا۔ شاہ فرمان! تمہیں ابھی سب کے سامنے اس رات کی اصل حقیقت بتانا ہوگی۔ یہی تیسری شرط ہے۔"

شاہ فرمان کی صورت دید نی تھی۔

...... اگلے پندرہ بیس منٹ میں وہی کچھ ہوا جو دلاور چاہتا تھا۔ اپنے اندر کی ساری تڑپ پھڑک کے باوجود شاہ فرمان کو یہ تیسری شرط بھی ماننا پڑی۔ اس نے زندگی میں شاید پہلی بار اپنی کسی غلطی کو تسلیم کیا ہوگا...... سویرا آنسوؤں میں ڈوبی یہ سب کچھ سنتی رہی۔ شاہ فرمان نے اعتراف کیا کہ وہ ٹیپو ٹریگر اور دو تین قریبی کارندوں کی باتوں میں آ گیا تھا۔ نشے کی حالت میں اس سے ایک غلط فیصلہ ہوگیا۔ وہ گول مول بات کر رہا تھا مگر دلاور کے کاٹ دار نہایت تیکھے سوالات کے جواب میں شاہ فرمان کو بتانا پڑا کہ دلاور کو سویرا کی نظر سے گرانے اور حویلی سے نکالنے کے لیے اسے یہ منصوبہ بنانا پڑا۔ اس نے تسلیم کیا کہ اس رات چہرہ چھپا کر لاکھوں کے گہنے چوری کرنے والا اور سویرا پر حملہ کرنے والا ٹیپو ٹریگر تھا......

شاہ فرمان کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ لگتا تھا کہ اسے بھی دل کا دورہ پڑ جائے گا۔

سویرا نقاب کے اوپر سے دلاور کی طرف دیکھتی چلی جا رہی تھی۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں اس سے پوچھ رہی تھی ...... تم کون ہو...... تم کہاں سے آئے ہو...... ہزاروں سال پہلے بھی میں نے تمہیں دیکھا تھا۔ شاید اسی روہی کے کنارے ...... شاید انہی ریتیلے کھنڈروں کے آس پاس ...... میرے دل کی اتھاہ گہرائی میں جو ایک بے نام ندی بہتی

ہے، اس کا پانی تمہیں جانتا ہے۔ میں نہیں جانتی لیکن وہ تمہیں جانتا ہے۔ وہ مجھے بتاتا ہے تم ہمیشہ سے ایسے ہی بے خوف ہو۔

☆☆☆

اگلے چار پانچ دن میں جو کچھ ہوا، بڑی تیز رفتاری سے ہوا۔ بلکہ حیران کن تیز رفتاری سے ہوا۔ نہ صرف زرعی زمین کے سلسلے میں ضروری کاغذات تیار ہو گئے بلکہ چند افراد کی موجودگی میں عاطف اور مہرین کا نکاح بھی ہو گیا۔ طے ہوا کہ رخصتی چند ہفتے بعد اچھے طریقے سے کی جائے گی۔ بابر کے ڈیتھ وارنٹ تک جاری ہو چکے تھے۔ مقتول کے لواحقین نے عدالت میں پیش ہو کر معافی نامہ اور دیگر ضروری دستاویزات پیش کر دیں۔

شاہ فرمان کے اکلوتے بیٹے کے گلے سے پھانسی کا پھندا نکل گیا۔ مگر وہ فالج کے سبب خود بستر پر جا پڑا۔ شاید اپنی گردن جھکانے اور شرطیں ماننے کا صدمہ بھی اسے اسی طرح ہوا تھا جس طرح بیٹے کی پھانسی کا ہوتا۔ اسپتال میں ہی اسے فالج کا دوسرا شدید اٹیک بھی ہو گیا...... اور وہ کچھ بھی نگلنے کے قابل نہ رہا۔ ایک پہلو شروع میں ہی بے جان ہو گیا تھا۔

دلاور ابھی اپنی فیکٹری والی کوٹھی میں ہی تھا۔ ایک روز وہ ناشتے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ اس کا سیکریٹری منشا ریاض اندر داخل ہوا اور بولا۔ "جناب! ایک خاتون آپ سے ملنے پر اصرار کر رہی ہے۔ واہلہ صاحب نے اسے لان میں بٹھایا ہے۔"

"کون ہے؟" دلاور نے اخبار دیکھتے ہوئے کہا۔

"کسی بڑے اخبار کی رپورٹر ہے۔ کہتی ہے کہ اس کے پاس آپ کے لیے کچھ مفید اطلاعات ہیں اور وہ آپ کو براہِ راست دینا چاہتی ہے۔"

دلاور کے چہرے پر پہلے تو بیزاری کے آثار نمودار ہوئے پھر وہ اپنی رسٹ واچ دیکھتا ہوا لان کی طرف بڑھ گیا۔

سرسبز لان پر سرما کی نرم سنہری دھوپ چمک رہی تھی۔ دیدہ زیب سفید میز کے گرد فائبر کی سفید کرسیاں دھری تھیں۔ ایک کرسی پر ایک برقع پوش خاتون بیٹھی تھی۔ اس کے کندھے سے شولڈر بیگ جھول رہا تھا۔ ہاتھ میں فائل تھی۔ وہ دلاور کو دیکھ کر کھڑی ہو گئی۔ رسمی کلمات کے بعد دلاور اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔ "میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے محترمہ۔ آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟"

"کہنا تو بہت کچھ چاہتی ہوں لیکن پتا نہیں تم سنو گے یا نہیں۔"

دلاور نے چونک کر دیکھا۔ برقعے کے نقاب میں سے بس آنکھیں اور پیشانی کا تھوڑا سا حصہ نظر آ رہا تھا لیکن اگر اس سے بھی کئی گنا کم نظر آ رہا ہوتا تو وہ پہچان لیتا اور اس آواز کو بھی وہ لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ یہ سویرا تھی۔

وہ سکتہ زدہ سا اسے دیکھتا چلا گیا۔ وہ بولی۔ "دلاور! اس طرح دیکھو گے تو کسی کو شک ہو جائے گا۔ کوئی بات کرو۔" اس کے ساتھ ہی اس نے فائل اپنے سامنے میز پر پھیلا لی۔

وہ اپنی لرزش کو سنبھالتے ہوئے بولا۔ "مجھے یہ امید تو تھی کہ آپ سے ملاقات ہو گی لیکن یہ توقع نہیں تھی کہ اس طرح ہو گی۔"

"میں تم سے ملنا چاہتی تھی اور میرے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔" وہ بوجھل آواز میں بولی۔ "کیا تمہارے پاس کچھ وقت ہو گا مجھ سے بات کرنے کے لیے؟"

دلاور کا دل بھر آیا۔ بے ساختہ بولا۔ "سویرا بی بی! آپ کہیں تو ساری زندگی اسی طرح بیٹھ کر آپ کی بات سن سکتا ہوں۔"

وہ کبھی سویرا بی بی کہنے پر ناراض ہو جایا کرتی تھی لیکن اس نے کچھ نہیں کہا، بس نم آنکھوں سے اسے دیکھ کر بولی۔ "دلاور...... سب سے پہلے تو...... تم سے معافی مانگنا چاہتی ہوں۔ میری وجہ سے...... تم نے بہت دکھ سہے ہیں۔ مجھے...... ایک ایک بات یاد ہے...... میں کچھ بھی بھولی نہیں ہوں۔" اس کا گلا رندھ گیا۔

"آ...... آپ شرمندہ کر رہی ہیں۔ آپ تو مالکن ہیں۔ میری وجہ سے رسوائی ہوئی آپ کی...... دکھ ملا آپ کو...... معافی تو مجھے مانگنی ہے۔"

سرسبز گراسی لان کے اوپر سرما کا سورج تھا۔ روہی کی طرف سے آنے والی ہوا دھوپ کو مزید خوشگوار کر رہی تھی۔ وہ دونوں جیسے اردگرد کی ہر چیز، ہر منظر سے کٹ گئے تھے۔ بس ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے اور ایک دوسرے کو سن رہے تھے۔ دل کے پھپھولے پھوٹنا شروع ہوئے تو پھوٹتے چلے گئے۔ ایک موقع پر سویرا نے اشک بار آواز میں کہا۔ "میں اس بات پر خود کو کبھی معاف نہیں کر پاؤں گی کہ وہ لوگ تمہیں میرے سامنے بے دردی سے مار رہے تھے اور میں تماشا دیکھنے کے سوا کچھ نہیں کر پا رہی تھی۔ پچھلے چار سالوں میں وہ بات شاید ایک پل کے لیے

بھی میرے ذہن سے نہیں نکلی دلاور......''

دلاور نے کہا۔ ''میرے ان سارے زخموں پر، آپ کی بس یہ ایک بات ہی مرہم رکھ رہی ہے کہ آپ کو کبھی مجھ پر لگنے والے الزام کا یقین نہیں ہوا......''

گفتگو طویل ہوتی جا رہی تھی۔ لمحے پَر لگا کر اڑ رہے تھے۔ ایک ملازم دو دفعہ چائے رکھ کر جا چکا تھا اور اب دلاور اسے تیسری مرتبہ طلب کرنے والا تھا۔ سویرا کے ذہن میں بے شمار سوالات تھے۔ وہ اب جاننا چاہ رہی تھی کہ اس رات کے لہولہان آغاز کے بعد دلاور پر کیا بیتی۔ وہ کہاں کہاں سے ہوتا ہوا ''لاہوری انٹر پرائزر'' کی شاندار منزل تک پہنچا اور اس کے دیگر حالات کیا ہیں؟

دلاور تو ہمیشہ سے سویرا کے لیے کھلی کتاب کی طرح تھا۔ جن کی ذات سے عشق ہوتا ہے، ان سے کچھ بھی چھپایا نہیں جاتا۔ شاید چھپایا جا ہی نہیں سکتا۔ دلاور نے ڈھیرے ڈھیرے سب کچھ سویرا کے گوش گزار کر دیا۔ وہ حیرت میں غلطاں سنتی رہی۔ کئی من وزنی آہنی ایکسل کے ساتھ دلاور کا پانی سے نکلنا، حضور چانڈیو کی سبز حویلی میں پہنچنا، زخموں کا علاج کرانا، پھر حضور چانڈیو اور شیخ بن باقر کے ساتھ بحری سفر...... بحری سفر میں پیش آنے والا وہ سنسنی خیز واقعہ جب بے شمار مالیت کا جیولری باکس سمندری پانی میں گرا۔ دلاور کا باکس کو ڈھونڈ لینا لیکن پھر اسے وہیں پر چھپا رہنے دینا...... دلاور نے سب کچھ سویرا کو کہہ سنایا۔

وہ ماضی میں کھویا ہوا تھا اور بول رہا تھا...... ''میرے اندر کچھ بدل چکا تھا سویرا بی بی......! ان اُچی حویلی والوں نے مجھے اندر سے تبدیل کر دیا تھا۔ ورنہ میں نے تو کبھی کسی کو دھوکا نہیں دیا تھا۔ کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا۔ میں حضور چانڈیو اور دوسرے لوگوں کے ساتھ دبئی پہنچ گیا۔ وہاں میں اور کمرانی رشید دو مہینے سے زیادہ نہیں رکے۔ رشید نے ایک زخمی عربی کو خون دیا تھا۔ ان لوگوں نے بخشش کے طور پر اسے کوئی پندرہ ہزار ریال دیے۔ کچھ ریال ہم نے ویسے کمائے تھے۔ یہ ساری رقم لے کر ہم دبئی سے واپس ''برکا'' پہنچے۔ کمرانی رشید بحری جہاز کا لوڈر رہا تھا اور کئی ملاحوں سے اس کی واقفیت تھی۔ میں نے اسے جیولری باکس کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ اس نے بھاگ دوڑ کر کے ایک لانچ کا بندوبست کیا...... اور ایک نقشے کا انتظام بھی کر لیا۔ میں زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ ایک روز کے پُرخطر سفر کے بعد ہم کھلے سمندر میں اس مقام پر پہنچ گئے جہاں پرندے کی چونچ جیسا بڑا پتھر سمندر میں سے نکلا ہوا تھا۔ میں نے آپ کو بتایا ہے نا کہ اس جگہ کو ''برڈ سائٹ'' کہتے ہیں۔ غوطہ خوری کا کچھ سامان بھی ہماری لانچ پر موجود تھا مگر مجھے اس کی ضرورت نہیں پڑی۔ سمندر پُرسکون تھا۔ تیسرے غوطے میں ہی میں پتھروں میں پھنسے ہوئے اس جیولری باکس تک پہنچ گیا......

''میرا خیال ہے کہ اب آپ کو زیادہ کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ آپ کافی کچھ سمجھ گئی ہوں گی۔ مجھے اس منزل تک پہنچانے میں اس جیولری باکس نے بہت مدد کی ہے۔ میں نے بن باقر فیملی کے کچھ خاندانی زیورات کو چھوڑ کر باقی جیولری مسقط، دوہا اور کراچی میں مختلف جگہوں پر فروخت کی۔ میرے پاس ایک کافی بڑی رقم آ گئی۔ میں اس رقم کو کہیں لگانا چاہتا تھا۔ آخر میں نے اسے ایک محفوظ کاروبار میں انویسٹ کر دیا۔''

''کون سا کاروبار؟'' سویرا نے پوچھا۔

''مجھے معلوم تھا آپ یہ سوال کریں گی۔'' دلاور نے کہا اور کچھ کھو سا گیا۔ چائے کی دو چسکیاں لے کر بولا۔ ''شاید آپ کو عجیب لگے گا کہ میں نے آسان کاروبار چھوڑ کر ایک مشکل میدان کیوں منتخب کیا...... سویرا بی بی! میں نے دبئی میں ''سی ڈائیونگ'' کا ایک بڑا ٹریننگ سینٹر خریدا اور اس کو مزید وسیع کر دیا۔ یہ امارات میں غوطہ خوری کے چند بڑے تربیتی مراکز میں سے ایک ہے۔''

''میں...... واقعی حیران ہو رہی ہوں۔'' وہ بھی کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔

دلاور نے نیلے آسمان کی طرف دیکھا۔ روہی کی ہوا نے بالوں کی لٹیں اس کے ماتھے پر بکھیر دیں۔ اس نے کہا۔ ''سویرا بی بی! مجھے اپنے ماں باپ کا کچھ پتا نہیں۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ میں پانی ہی کا بیٹا ہوں۔ جس ٹوبے سرفودم گھٹ کا میں ذکر کیا کرتا ہوں، اس نے مجھے دریائے راوی کے پانیوں سے ہی تو نکالا تھا اور اپنی بانجھ بیوی کی گود میں ڈالا تھا۔ وہی جس کا آدھا سر سفید تھا اور آدھے بال مہندی رنگے تھے۔ وہ میری سگی ماں نہیں تھی لیکن اس نے سگی ماؤں کی طرح ہی میری پرورش کی تھی۔ چاچا سرفو لاہور کا بلکہ شاید پورے پنجاب کا نامور ٹوبا تھا۔ اپنی جوانی میں اس نے بڑے یادگار کام کیے تھے۔ بڑھاپے میں اس نے اپنا فن مجھے سونپ دیا۔ اس نے مجھے گہرے پانیوں کی مچھلی بنا دیا۔ لیکن یہاں میرے فن کی قدر کرنے والا کون تھا۔ میں باہر کے کسی ملک میں ہوتا تو شاید مجھے گولڈ میڈل ملتے...... مجھ پر ڈالروں کی بارش ہوتی لیکن یہاں مجھے ناقدری اور غربت کی بارش نے کچے لون (نمک) کی طرح کھور دیا۔ ایک بار میں

ملازمت کے لیے ایک محکمے میں گیا تو مجھے دھکے دے کر باہر نکال دیا گیا۔ ایک بار تیراکی کے مقابلوں میں حصہ لینا چاہا لیکن ناکام ہوا...... پرائیویٹ ایف اے کرنے والے کے لیے کہیں کوئی جگہ نہیں تھی۔ آخر در بدر ہوگیا۔ پیٹ پالنے کے لیے چھوٹی موٹی ملازمتیں کرنے لگا۔ بڑی آپا اور شاہ فرمان جیسے سخت مزاج لوگوں کا چاکر ہوگیا۔ شاید یہی وجہ تھی ...... کہ جب مجھے موقع ملا تو میں نے اپنے ''غوطے'' کی پوری قیمت وصول کی۔ براڈ سائٹ پر اس طوفانی شام میں وہ ''غوطہ'' صرف میں لگا سکتا تھا اور میں نے لگا لیا......''

وہ چند سیکنڈ چپ رہ کر بولا۔ ''سوری سویرا بی بی! بات دوسری طرف نکل گئی۔ میں بتا رہا تھا کہ ہوش سنبھالنے سے پہلے بھی میرا ناتا پانی سے ہی تھا۔ اس لیے جب میرے پاس سرمایہ آیا تو میں نے اسے اس فن میں لگایا جو میرے اپنے اندر موجود تھا۔ میں نے ''سی ڈائیونگ کی ٹریننگ'' کے کام کو چکایا اور وہ ایسا چمکا کہ مجھے نہال کر گیا۔ میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ مجھے اتنی جلدی اتنی بڑی کامیابیاں ملیں گی۔ اب خلیج میں میرے آٹھ بڑے ٹریننگ سینٹر ہیں۔ ایک سینٹر کراچی میں تیار کروا رہا ہوں جس کا سارا چارج نگرانی رشید کے پاس ہے۔ وہ ایک بہترین دوست اور پارٹنر ثابت ہوا ہے۔ قریباً ڈیڑھ سال پہلے میں دبئی میں شیخ بن باقر سے ملا تھا۔ میں نے پہلے اس سے معافی مانگی پھر اس کا سارا پیسا، منافع سمیت اسے واپس کر دیا۔ وہ ہکا بکا رہ گیا تھا۔ اسے مزید خوشی اس بات کی تھی کہ اسے اس کے باقی خاندانی زیورات بھی جوں کے توں واپس مل گئے تھے۔ آج کل ...... میں کچھ اور چھوٹے موٹے کام بھی کر رہا ہوں۔ جیسے آپ کے گوٹھ کے پاس یہ فیکٹری......''

سویرا اور دلاور کی گفتگو کو بریک لگ گئے، تازہ چائے آ گئی تھی۔ سویرا نے ابھی تک صرف ایک کپ پیا تھا۔ دلاور کے اصرار پر اس نے دوسرے کپ پر آمادگی ظاہر کی۔ دلاور نے خود چائے بنائی ...... اور کپ اس کی طرف بڑھایا۔ بڑی احتیاط کے ساتھ ...... کہ کہیں وہ اپنی انگلیوں سے اس کی انگلیوں کو نہ چھو لے۔ وہ نقاب کو ذرا سرکا کر چھوٹے چھوٹے سپ لینے لگی۔ ناگاہ دلاور کی نگاہ اس کے ہونٹوں پر پڑی۔ وہ جیسے سرتاپا جھنجھنا اٹھا۔ وہ اس کے ہونٹوں کی طرف دیکھنے سے ہمیشہ کتراتا تھا۔ ان حسین گداز ہونٹوں سے اس کا ایک پرانا ناتا تھا۔ ایسا ناتا جس سے ''ہونٹوں والی'' بھی بے خبر تھی۔ دلاور کو لگا کہ اس کی پیشانی پر پسینے کی نمی آ گئی ہے۔

موبائل فون کے سگنلز نے دلاور کی مشکل آسان کی۔ یہ فون سویرا کے شولڈر بیگ میں گنگنایا تھا۔ اس نے اسکرین دیکھی لیکن فون اٹینڈ نہیں کیا۔ وہ اب مضطرب نظر آنے لگی تھی۔ اس نے بتایا کہ اسے حویلی سے نکلے کافی دیر ہو چکی ہے۔ اب اسے جانا ہوگا۔

دلاور نے کہا۔ ''کیا آپ دوبارہ آسکیں گی؟''

''پتا...... نہیں۔'' وہ تذبذب سے بولی۔

''آپ نے تو مجھ سے بہت کچھ پوچھ لیا۔ ایک دو باتیں میں بھی آپ سے پوچھنا چاہتا تھا۔'' دلاور کے لہجے میں درخواست تھی۔

اس نے ایک بار دلاور کی آنکھوں میں دیکھا، پھر کہنے لگی۔ ''اچھا...... دو تین دن میں کوشش کروں گی......''

پھر وہ عجلت میں چلی گئی۔ وہ دو تین دن کا کہہ رہی تھی، وہ دو تین زندگیاں انتظار کر سکتا تھا۔ وہ ایک پرائیویٹ کورے کار کو خود ڈرائیو کر کے آئی تھی، اسی پر واپس روانہ ہوگئی۔

☆☆☆

چوڑیرو والی کوٹھی کے عقبی لان میں دلاور نے ایک چھوٹا سا خوبصورت تالاب بنوا رکھا تھا۔ نیلے ٹائلوں والا۔ اس میں اترنے کے لیے چمکیلے اسٹیل کی سیڑھی تھی۔ دوپہر کا وقت تھا۔ وہ اپنی عادت کے مطابق بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے پانی کے اوپر سیدھا لیٹا ہوا تھا۔ پانی کی جانی پہچانی سرگوشیاں سن رہا تھا۔ وہ ایک بے مثال غوطہ خور تھا۔ اس نے عشق کے پانیوں میں بھی ایک طویل ...... بہت طویل غوطہ لگایا تھا مگر گوہر مقصود آج بھی اس سے اتنا ہی دور تھا، جتنا بہت برس پہلے تھا...... شاید ہزاروں برس پہلے تھا۔ اچانک وہ چونک گیا۔ سیکریٹری مشا نے آکر اطلاع دی کہ اس دن والی میڈم آئی ہیں۔ دلاور کے سینے میں جلترنگ سا بج اٹھا۔ وہ پل پل اس کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔

قریباً دس منٹ بعد دلاور اور سویرا سنہری دھوپ والے ہرے بھرے لان میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ ملازم چائے اور لوازمات لے آیا تھا۔

''آج میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے دلاور! تم کیا کہنا چاہتے تھے؟'' سویرا نے آدھے نقاب کی اوٹ سے پوچھا۔ آواز میں کسی بے نام دکھ کی لہر تھی۔

دلاور بات کو کسی دوسرے طریقے سے کرنا چاہتا تھا لیکن کچھ لمحے ایسے ہوتے ہیں جن میں وہ کچھ نہیں ہوتا جو سوچا ہوتا ہے۔ دلاور کے منہ سے بھی بے ساختہ جو بات نکلی،

وہ کچھ اور تھی اس نے دفعتاً کہا۔ ''سویرا! میں اپنی حیثیت جانتا ہوں اور آپ کا مرتبہ بھی...... ہم میں زمین اور آسمان کا فرق ہے لیکن کیا...... کسی طرح، ایسا ہوسکتا ہے کہ...... یہ زمین اور آسمان...... مل سکیں؟''

ایک چھناکا سا ہوا۔ جیسے ہزار ہا قمقموں والا کوئی فانوس دھماکے سے فرش پر گرے اور چکنا چور ہو جائے۔ وہ سکتہ زدہ نظروں سے دلاور کی طرف دیکھتی چلی گئی۔ دلاور بھی پتھرایا ہوا تھا۔ اس کے لیے کائنات کی گردش جیسے تھم گئی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ یہ گردش جب دوبارہ بحال ہوگی تو کس ڈھنگ سے ہوگی؟ سویرا کا ردعمل کیا ہوگا؟ خاموشی طویل اور بوجھل ہوتی چلی گئی۔ دلاور کے ضبط کے تار تناؤ کے سبب ٹوٹنے لگے۔ آخر وہ عجیب دکھی لہجے میں بولی۔ تم نے یہ کیسے سوچ لیا دلاور؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے...... ہم...... مجھے ہرگز امید نہیں تھی کہ تم سے...... کوئی ایسی بات سنوں گی۔''

نہ جانے اتنا حوصلہ دلاور کے اندر کہاں سے آ گیا تھا۔ شاید یہ حوصلہ اسے اس کی انوکھی اور سچی محبت نے دیا تھا جو برسوں بڑی خاموشی سے اس کے اندر پروان چڑھتی رہی تھی۔ وہ بولا ''سویرا! اگر آپ نہ چاہیں تو کچھ نہیں ہوسکتا...... اور اگر آپ چاہیں تو سب کچھ ہوسکتا ہے۔ ہر رکاوٹ گر سکتی ہے، ہر دیوار رستہ دے سکتی ہے۔ سب کچھ آپ پر ہے۔ صرف آپ پر۔''

وہ گم صم تھی، بس اس کی خوبصورت آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ ان آنکھوں میں آنسو تھے اور خوف کا اور دکھ کا مدوجذر تھا۔

وہ بولا۔ ''میں جو کہہ رہا ہوں پہلی اور آخری بار کہہ رہا ہوں۔ خوف ہماری خوشیوں کو کھا جاتا ہے سویرا...... اور عورت کا خوف تو اس کی پوری زندگی برباد کر دیتا ہے۔ اس خوف سے نکل آنا ہی، اصل میں جینا ہے۔ آپ کی بہت سی زنجیریں ٹوٹ چکی ہیں۔ چوڈیرو حویلی کی وڈیرا شاہی دم توڑ رہی ہے۔ وڈا چودھری ایک زندہ لاش کی طرح اسپتال میں پڑا ہے۔ آپ کے پنکھ ہیں، آپ اڑ سکتی ہیں...... اگر آپ اڑنا چاہیں......'' اس نے سویرا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بے حد اعتماد سے کہا۔ ان لمحوں میں وہ صرف دلاور نہیں تھا...... دلاور شاہ لاہوری تھا۔

سویرا نے نہایت بے قراری سے دائیں بائیں سر ہلایا۔ ''یہ نہیں ہوسکتا۔ کسی صورت نہیں۔ تم جانتے نہیں تم کیا کہہ رہے ہو۔ مجھے ہرگز توقع نہیں تھی کہ تم ایسی بات کہو گے۔ یہ تو آگ میں چھلانگ لگانے والی باتیں ہیں۔ ہم...... میں نے کبھی تمہارے بارے میں اس طرح سے نہیں سوچا تھا......''

''آپ غلط کہہ رہی ہیں...... آپ غلط کہہ رہی ہیں۔''

وہ ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف پر زور دے کر بولا۔ اس کا سارا وجود اندرونی اضطراب سے لرزنے لگا تھا۔

سویرا نے پھر چونک کر اس کی طرف دیکھا لیکن بولی کچھ نہیں، وہ ہاتھوں کی انگلیوں کو بری طرح مروڑ رہی تھی۔ پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ انداز مستحکم تھا۔ ''میرا خیال ہے، اب مجھے...... جانا چاہیے......''

روہی کی ہوا کراہ اٹھی۔ دھوپ کا رنگ ہلدی جیسا ہوگیا۔ اونچے پیڑوں نے اور چھوٹے قد کے دکھوں نے دکھ سے اپنے سر جھکا لیے۔ دلاور بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنی واسکٹ میں سے ایک تہ کیا ہوا کاغذ نکالا اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''ایسا ہی ایک خط میں نے برسوں پہلے آپ کو دینے کے لیے لکھا تھا۔ وہ آپ تک نہ پہنچ سکا۔ اس کی جگہ یہ خط دے رہا ہوں۔ میری آخری درخواست ہے کہ اس خط کو ایک بار پڑھ ضرور لیجیے گا۔''

سویرا نے خط نہیں تھاما تو دلاور نے اسے اس کے شولڈر بیگ کی بیرونی پاکٹ میں ڈال دیا۔ ''خدا حافظ!'' وہ عجیب لہجے میں بولی۔

''خدا حافظ!'' دلاور نے خود کو بمشکل سنبھال کر کہا۔

وہ مین گیٹ کی طرف چل دی۔

تم کب تک مجھ کو بھولو گے...

☆☆☆

روہی کے اوپر گہرے تاریک آسمان پر تاروں کے جھرمٹ تھے۔ کیکروں، ٹاہلیوں اور بیریوں سے گزر کر آنے والی ہوا، دلاور کے بالوں کو اس کی پیشانی پر لہرا رہی تھی۔ وہ اپنی کوٹھی کی چھت پر نواڑ کی چارپائی پر نیم دراز تھا۔ ابھی ابھی سلطان واہلہ نے اسے اطلاع پہنچائی تھی کہ شاہ فرمان اسپتال سے لاعلاج ہو کر حویلی آ گیا ہے۔ اب اس نے جتنی دیر بھی جینا تھا، شاید بستر پر ہی جینا تھا۔ بڑی آپا نے حویلی کی باگ ڈور اپنے کمزور ہاتھوں میں لے لی تھی۔ بابر ابھی جیل میں تھا۔ ویسے بھی ابھی وہ اس قابل نہیں تھا کہ باپ کی پگڑی سر پر رکھ سکتا۔ باقی اولاد اس سے بھی چھوٹی تھی۔

پرسوں جو خط دلاور نے سویرا کو دیا تھا، اس کا ایک ایک لفظ اسے یاد تھا۔ یہ خط اس نے پرسوں اس وقت جلدی

جلدی گھسیٹا تھا جب ایک فون سننے کے بہانے وہ سویرا کے پاس سے اٹھ کر اندر گیا تھا۔ وہ خط کچھ اس طرح تھا۔

"سویرا! میں زیادہ کچھ نہیں کہوں گا۔ یہ جو کچھ ہے بس آخری بار ہے۔ ہفتے کی شام جل گوٹھ میں سائیں رحیم کے بیٹے کا ولیمہ ہے۔ آپ کے گھر سے بھی لوگ وہاں جا رہے ہیں۔ آپ بھی جا رہی ہوں گی۔ آپ کو یاد ہوگا جب کئی برس پہلے آپ نے مجھے تحفے میں گھڑی دی تھی تو میں نے بھی اپنی اوقات سے بڑھ کر ہمت دکھائی تھی اور آپ کو گلابی پھولوں والی ایک کشمیری شال کا تحفہ دیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ آپ وہ اوڑھیں گی مگر میں نے وہ کبھی آپ کے جسم پر نہ دیکھی۔ اگر آپ نے میری جسارتوں کو نظرانداز کر کے، میری التجا کے بارے میں کچھ سوچا ہے...... اور اپنے فیصلے پر نظرثانی کی ہے تو پلیز ...... مجھے بے خبر نہ رکھیں۔ میں نے اس شال کا ذکر بھی اسی حوالے سے کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ سمجھ گئی ہوں گی۔ ہاں سویرا...... ہفتے کی شام میری زندگی کے لیے بہت اہم ہوگی...... بہت ہی اہم۔ میں جانتا ہوں وہ شال اب بھی آپ کے پاس موجود ہے...... اگر آپ وہ شال اوڑھ کر آئیں گی تو میں اپنی قسمت پر ناز کروں گا...... روئے زمین پر مجھ جیسا خوش قسمت اور کوئی نہ ہوگا اور اگر آپ نہیں اوڑھیں گی تو ...... میں سمجھ جاؤں گا کہ مجھے اب کبھی آپ کو اپنی صورت نہیں دکھانی۔ میں ہمیشہ کے لیے پاکستان سے نکل جاؤں گا لیکن سویرا! اس میں بھی آپ سے کوئی گلہ نہیں ہوگا۔ ہاں سویرا! مجھے ...... اپنی مری ہوئی ماں کی قسم ہے، میں کوئی گلہ نہیں رکھوں گا۔ آپ نے محبت کی جو دولت مجھے دے رکھی ہے، وہ ملاپ یا جدائی کی مرہونِ منت نہیں...... اور نہ کبھی ہوگی۔

خدا حافظ!"

خط کا ایک ایک لفظ اسے یاد تھا، اس کے ذہن میں پیوست تھا۔ اس کے جدید سیل فون پر کال کا میوزک ابھرا۔ اس کے لیے دبئی سے اس کے ایک منیجر کی کال تھی۔ وہ کوئی پاکستانی ہی تھا بولا۔ "سر! سنگاپور سے کچھ لوگ آئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ چیف انسٹرکٹر سے ملنا ہے۔ وہ "سی ڈائیونگ" کے حوالے سے ایک بڑا شو کر رہے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ آپ بھی اس میں چند منٹ کی پرفارمنس دیں۔ چار پانچ منٹ کی لائیو پرفارمنس کے لیے وہ ایک لاکھ ڈالرز کی آفر کر رہے ہیں۔"

"کب ہے شو؟"

"اتوار کی دوپہر۔"

"ریجیکٹ کر دو۔ میں اتوار کے روز یہاں سے نکل سکتا ہوں۔" اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

☆☆☆

رحیم سائیں کے گاؤں کا نام جل گوٹھ تھا۔ رحیم سائیں نے بیٹے کی شادی تو عام سے انداز میں کی تھی مگر ولیمے میں ساری کسر نکال دی تھی۔ گوٹھ سے باہر دور تک قناتیں اور خیمے لگے ہوئے تھے۔ جنریٹرز کی مدھم گھوں گھوں میں ہر طرف بجلی کے لشکارے تھے۔ ڈھول تاشے، ناچ گانا، آتش بازی، غرضیکہ خوشی کا ہر رنگ یہاں موجود تھا۔ ڈیڑھ ہزار مہمانوں کے کھانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ صوبائی وزیر، ایم این اے، سابق ایم این اے، ایم پی اے، اعلیٰ سرکاری افسران، نامی گرامی وڈیرے، ہر طرح کے لوگ یہاں موجود تھے۔ دلاور شاہ لاہوری، ان لوگوں میں سے تھا جنہیں یہاں خاص الخاص مہمانوں کی حیثیت حاصل تھی۔ اس کے اردگرد کیمرے بار بار چمکارے مار رہے تھے۔ رنگ و روشنی کی اس برسات میں دلاور کی نگاہیں کسی کا انتظار کر رہی تھیں...... دھڑکنیں زیروزبر تھیں۔ پل پل ایک پہاڑ تھا۔ بالآخر چوڈیرو حویلی کی دو پجارو گاڑیاں نظر آئیں۔ دلاور ہر طرف سے کٹ کر ان گاڑیوں کو دیکھنے لگا...... مجسم نگاہ بن گیا۔ سینے میں دھڑکن کے گولے پھٹنے لگے۔ گاڑیوں میں سے چوڈیرو حویلی کے لوگ اترنے لگے۔ پہلے زرق برق لباس میں بڑی آپا اتریں پھر ماجرہ بیگم، پھر نگینہ بیگم اور دیگر عورتیں...... ایک ایک کر کے سب اتر گئے۔ گاڑیاں خالی ہو گئیں۔ دلاور کا دل ڈوب گیا۔ ہر طرف تاریکی چنگھاڑنے لگی۔ تو کیا وہ آئی ہی نہیں؟ اس نے خود کو حویلی کی اونچی دیواروں میں حنوط کر لیا ہے...... وہ دیوانہ سا ہو کر مہمانوں کے درمیان سے اٹھ کھڑا ہوا۔ خیموں سے آگے نکل گیا۔ اسے پتا چلا کہ ابھی امید کی کرن باقی ہے۔ چوڈیرو حویلی سے شاید ایک یا دو گاڑیاں مزید آنا تھیں۔

اس کی دھڑکنیں زیروزبر تھیں۔ سانسیں الجھ رہی تھیں۔ وہ ریتیلے ٹیلوں میں تھوڑا آگے نکل گیا۔ چند قدم کی دوری پر وہی تالاب تھا جہاں دلاور نے سویرا کو پہلی بار دیکھا تھا...... مرحوم شاہ زمان اور سویرا، جیپ سمیت بارشی تالاب میں گر گئے تھے ...... یہیں پر...... ہاں یہیں پر وہ یادگار واقعہ ہوا تھا جس نے دلاور کے جسم و جاں میں لازوال عشق کا بیج بویا تھا۔ پاکیزہ ...... بے غرض ...... اور فاصلے کا عشق ...... اجنبی سناٹوں کی طرح خاموش ...... یکسر خاموش۔ یہی وہ پیڑ تھے جن کے نیچے اس نے نیم بے ہوش سویرا کو لٹایا تھا ...... اور ...... اس کے نایاب ہونٹوں کو چھوا تھا۔ یہیں سے یہ کہانی شروع ہوئی تھی ...... اور شاید آج

اسے...... یہیں پر ختم ہونا تھا۔

روہی کا ذرہ ذرہ منتظر تھا۔ بابا فرید کی آواز جیسے نشیب وفراز میں گونج رہی تھی...... یہ عشق آسان نہیں۔ مٹی نہ...

پھرول فریدا...... یار گواچے نیئں لبھدے (لیکن اس کا یار تو ابھی گم نہیں ہوا تھا)

اور پھر اس کی تمام حسیات سمٹ کر آنکھوں میں آگئیں۔ چوڈیرو حویلی کی ایک اور ٹویوٹا جیپ عظیم الشان خیموں کی ''مین انٹرنس'' کے سامنے آن کرر کی تھی۔ کائنات کی گردش تھم گئی اور اسی کائنات میں اس کا دل بھی تھا۔ وہ سکتے کی سی کیفیت میں ان لوگوں کو دیکھتا جارہا تھا جو جیپ سے اتر رہے تھے...... پھر ایک چودھرانی کے عقب میں اسے سویرا نظر آئی۔ دلاور کی جان لبوں پر آگئی۔ چند لمحوں کے لیے اسے لگا کہ وہ بھسم ہو گیا ہے اور زمین کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتا چلا جارہا ہے۔ ہلکے نسواری اور کریم لباس والی سویرا نے ایک پتلی سی سفید شال اوڑھ رکھی تھی۔ وہی سفید شال جو بیوگی اور اندوہ کی علامت ہوا کرتی ہے...... دلاور کی ٹانگیں بے جان ہوگئیں۔ وہ جیسے بے دم ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا تھا۔

چند سیکنڈ بعد اس نے دھندلائی ہوئی نگاہوں کے ساتھ دوبارہ جیپ کی طرف دیکھا۔ سویرا ادھ کھلے دروازے کے عقب میں تھی۔ اس نے سفید چادر اتار کر جیپ میں رکھی...... اندر سے، نفاست سے تہ کی ہوئی گلابی پھولوں والی کشمیری چادر نکالی۔ عجیب دلنشین انداز میں سر جھکائے ہوئے اس نے یہ شال اوڑھ لی۔ اسے کندھوں پر درست کیا اور دیگر عورتوں کے ساتھ شامیانوں کی طرف بڑھنے لگی۔

تھمی ہوئی کائنات دوبارہ گردش میں آگئی۔ روہی کا ذرہ ذرہ چمک اٹھا۔ دلاور کا دل دوبارہ متحرک ہو گیا۔ آسمان پر کروڑ ہا ستاروں کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ خوف کے پتھر پر قطرہ قطرہ گرنے والی محبت نے اس میں سوراخ ہی نہیں کیا تھا، اسے چکنا چور بھی کر دیا تھا۔ دلاور نیم تاریکی میں کھڑا مسلسل سویرا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک بے کشش چاہ تھی اس دیکھنے میں۔ کسی درویش کے بول دلاور کے کانوں سے ٹکرا رہے تھے۔

تیرے عشق دے وچ معشوق نا ہو، نئیں اج تک غلط نگاہ کیتی
تیری ہر ملاقات میں اج کیتی جیویں موسیٰ نال خدا کیتی
اک تینوں رب نئیں کہہ سکدا باقی ساری رسم ادا کیتی

اے میرے محبوب! میں نے آج تک تجھے غلط نگاہ سے نہیں دیکھا۔ تیرے ساتھ میری جو بھی ملاقات تھی وہ ایسی ہی تھی جیسی موسیٰ اور خدا کے درمیان ہوتی تھی (اپنے شوق اور جذب کا بیان کیا کرو) میں بس تمہیں خدا ہی نہ کہہ سکا ورنہ دل میں تیرا رتبہ خدا کے قریب قریب ہی رہا ہے......

''سویرا......!'' دلاور نے دل ہی دل میں کہا اور شامیانوں کی طرف بڑھنے لگا۔

☆☆☆

منظر اسی کوٹھی کے ڈرائنگ روم کا تھا جہاں آج کل دلاور قیام پذیر تھا۔ دلاور کے سامنے سویرا کی پھپھو پروفیسر عالیہ بیٹھی تھیں۔ عینک اور تین چوتھائی سفید بالوں والی انتہائی سمجھدار اور زیرک خاتون وہ مسلسل رو رہی تھیں اور بار بار اپنے سفید رومال سے آنسو پونچھتی تھیں۔ یہ یقیناً خوشی کے آنسو تھے۔ وہ کہہ رہی تھیں۔ ''دلاور! خدا گواہ ہے، مجھے ابھی تک یقین نہیں آرہا کہ یہ سب ہو چکا ہے...... مجھے لگتا ہے کہ میں جاگتی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھ رہی ہوں۔ سویرا تم سے شادی پر رضامند ہو چکی ہے۔ اس کے اندر ایک نیا حوصلہ پیدا ہوا ہے اپنے پنجرے سے نکلنے کا...... اپنے جال کو توڑنے کا۔ لیکن وہ اب بھی بہت ڈری ہوئی ہے۔ اس نے مجھ سے ایک دو باتیں کہی ہیں جو میں تم تک پہنچانا چاہتی ہوں بیٹا۔'' وہ عجب محبت بھری عاجز آواز میں بولیں۔

''آپ حکم کریں پھپھو! میں سویرا کو اپنانے کے لیے ہر شرط ماننے کو تیار ہوں۔ ہر حد تک جا سکتا ہوں۔''

پھپھو عالیہ، دلاور کے دونوں ہاتھ تھام کر کہنے لگیں۔ ''وہ شرطیں منوانے والی نہیں ہے دلاور، وہ تو...... وہ تو تمہاری محبت میں سر سے پیر تک ڈوبی ہوئی ہے۔ میں پھر کہوں گی، مجھے ابھی تک یقین نہیں آرہا کہ میں یہ سب کچھ اپنے ہوش و حواس میں دیکھ رہی ہوں...... میں جو کچھ کہہ رہی ہوں، دل کی پوری سچائی سے کہہ رہی ہوں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اگر تم اس سے یہ کہو کہ یہ جو کچھ ہے یہ سب تمہارا نہیں ہے کسی اور کا ہے، اور وہ تمہارے ساتھ چل کر کسی جھونپڑا بستی میں رہنا شروع کر دے تو وہ خوشی سے راضی ہو جائے گی۔ ایسی تبدیلیاں دو چار مہینوں یا برسوں میں نہیں آتیں دلاور۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ تم دونوں کے درمیان...... بہت پہلے سے...... کچھ موجود تھا۔ تم دونوں کے دلوں کی گہرائی میں چھپا ہوا تھا۔''

وہ خاموش رہا مگر اس کے دل سے آواز آرہی تھی...... شاید ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔ ہزاروں سال پہلے جب روہی میں بستیاں تھیں...... چمکیلی گرم دوپہروں میں نیم عریاں جسموں والے جفاکش لوگوں کے سائے یہاں حرکت کرتے تھے، اس وقت بھی ہماری روحیں یہاں بھٹکتی تھیں۔

وہ پھر موضوع کی طرف آتے ہوئے بولا۔ ''سویرا کیا کہتی ہیں پھپو؟''

''وہ کہتی ہے بیٹا! جو کچھ بھی ہونا ہے یہ جلد ہو، اس میں جتنی دیر ہوگی، اتنا ہی غلط ہوگا۔ دوسری بات وہ یہ کہتی تھی کہ شادی بہت سادگی سے ہو اور بہاولپور میں ہو۔ اس کے والدین تو بس نام کے ہیں، پچھلے کچھ عرصے سے تو یہ بھی پتا نہیں کہ وہ کہاں ہیں۔ ان کی شرکت کا ذکر تو بے معنی ہے...... تیسری بات اس کے دماغ میں یہ بیٹھی ہوئی ہے کہ شادی کے بعد تمہیں اور اسے زیادہ دیر یہاں پاکستان میں نہیں رہنا چاہیے۔ اگر دیکھا جائے تو اس کی بس ایک ہی شرط ہے...... اور وہ یہ کہ شادی کے بعد چند دن کے اندر وہ تمہارے ساتھ پاکستان سے چلے جانا چاہتی ہے......اور یہ بھی چاہتی ہے کہ تم یہاں اپنے کاروبار کو وائنڈاپ کردو یا کسی دوسرے کے حوالے کردو مکمل طور پر......کم از کم اگلے دس سال کے لیے۔''

دلاور چند لمحے سوچتا رہا پھر ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ''پھپو! سویرا کو جن لوگوں کا خوف ہے، ان کا زور ٹوٹ چکا ہے۔ ان کی طرف سے ہونے والی ہلکی سی ہلکی مزاحمت کا بھی میں انہیں منہ توڑ جواب دے سکتا ہوں لیکن سویرا کا کہا ٹالنا میرے لیے ممکن نہیں۔ میں ان کی ان ساری باتوں سے مکمل اتفاق کرتا ہوں اور عین اس کے مطابق چلوں گا۔''

وہ جو کچھ کہہ رہا تھا، دل کی اتھاہ گہرائیوں سے کہہ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اپنے عشق کی مجازی تکمیل کے لیے وہ کہاں تک جاسکتا ہے۔ اگر سویرا اس سے کہتی کہ وہ انہی کپڑوں میں اٹھ کر اس کے ساتھ چل دے۔ دنیا کی آخری حد پر بسی ہوئی کسی بستی میں جا بسے اور کبھی ماضی کی طرف مڑ کر نہ دیکھے تو اسے یہ بھی دل و جان سے قبول تھا۔

......چوڈیرہ حویلی کی اونچی دیواریں اب سویرا کو روک نہیں سکی تھیں۔ شاہ فرمان تو زندہ لاش کی صورت بستر پر تھا۔ فیملی کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ باہمی بٹوارے شروع ہوگئے تھے۔ دلاور کے کہنے پر مقامی ایم این اے نے خود جاکر ''بڑی آپا'' سے بات کی تھی اور اس نے معمولی پس وپیش کے بعد سویرا کو آزادی کا پروانہ جاری کردیا تھا۔ حویلی کے اصولوں کے مطابق اسے کئی مربعے اراضی سے محروم ہونا پڑا تھا۔ اس نے خوشی سے یہ جائداد حویلی والوں کی جھولی میں پھینک دی تھی۔ پیش کیے گئے کاغذات پر دستخط کردیے تھے۔

......اور یہ محبت کی تکمیل کی رات تھی۔ بہاولپور کی ایک کوٹھی میں سادگی سے سجائے گئے ایک حجلۂ عروسی کا منظر تھا۔ ایک چاند دلاور کے ہاتھوں میں تھا اور وہ ان گھڑیوں میں روئے زمین کا سب سے خوش قسمت شخص تھا۔ اس کے اردگرد ایک طلسماتی گلابی دھند تھی۔ اس نے اپنی پیشانی چاند کی پیشانی سے ٹکائی...... وہ ان سرخ ہونٹوں کو بہت پہلے سے جانتا تھا۔ یہ ایک ایسا راز تھا جو صرف اس کے اور ان ہونٹوں کے درمیان تھا......

وہ ہولے سے بولا۔ ''سویرا! کہیں ایسا تو نہیں کہ میں جاگتی آنکھوں کے ساتھ کوئی خواب دیکھ رہا ہوں؟''

''نہیں دلاور!'' اس نے پلکیں جھکائے جھکائے کہا۔ پھر توقف سے بولی۔ ''دلاور! تمہاری محبت نے میرے خوف کو چکنا چور کردیا ہے لیکن اس کی کرچیاں اب بھی میرے چاروں طرف بکھری ہوئی ہیں۔ مجھے یہاں سے دور لے جاؤ۔''

''آپ نے جو کہہ دیا......وہ ہوگیا۔'' وہ ڈوب کر بولا۔

وہ ذرا چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ ہولے سے بولی۔ ''اب مجھے آپ نہ کہو دلاور۔''

''زندگی کی آخری سانس تک کہوں گا۔ آپ کے لیے کوئی اور لفظ میری زبان پر آ ہی نہیں سکتا۔'' اس نے اپنی پیشانی سویرا کے ان ہاتھوں پر ٹیک دی جو اس کے گھٹنوں پر دھرے تھے۔

یہ محبت تھی...... پرستش تھی...... مجازی عشق کی معراج تھی...... یا اس سے بھی آگے کی کوئی چیز......

اگلے چند روز دلاور اور سویرا کی زندگی کے حسین ترین دن تھے۔ ان شب و روز کی کیفیت کو وہ شاید دونوں ہی لفظوں میں بیان نہیں کرسکتے تھے۔ بہاولپور کی یہ کوٹھی ان دونوں کے لیے ہر طرح سے محفوظ تھی۔ اونچی چار دیواری، خاردار تاریں، سیکورٹی ایجنسی کے مسلح گارڈز۔ پھپو عالیہ بھی ان دونوں کے ساتھ قیام پذیر تھیں۔ ایک روز وہ دونوں بغیر کسی پروٹوکول کے لاہور پرواز کرگئے۔ دلاور نے سویرا کی ایک دیرینہ خواہش پوری کی۔ اسے اندرونِ لاہور کے وہ گلی کوچے دکھائے جہاں وہ کھیلا کودا اور پروان چڑھا تھا۔ انہی تنگ گلیوں میں وہ بوسیدہ مکان بھی تھا جہاں کبھی سرفودم گھٹ رہتا تھا۔ جو اس کا چاچا بھی تھا، باپ بھی اور استاد بھی...... دلاور ان گلیوں میں اپنی یادیں تازہ کرتا رہا اور ماضی کے دھندلکوں میں گھومتا رہا۔ وہ ایک خطیر رقم کا چیک بھی اس بستی کی حالت سدھارنے کے لیے لایا تھا۔ ذمے دار لوگوں کو یہ چیک سپرد کرنے کے بعد اس کی آنکھوں میں نمی آگئی۔ جیسے ایک قدیم بوجھ اس کے کندھوں سے اتر گیا۔ وہ دونوں شاہراہ قائداعظم کے ایک ہوٹل میں ٹھہرے اور

پورے تین روز لاہور کی سیاحت کرتے رہے۔ شاہ لاہور کی اور اس کی دلہن بغیر کسی پروٹوکول کے لاہور کی سڑکوں پر تھے لیکن سڑکوں پر کہاں تھے، وہ تو جیسے فضاؤں میں اڑ رہے تھے۔ دن میں کئی بار دلاور اپنے آپ سے یہ سوال پوچھتا تھا، کیا زندگی اتنی خوبصورت بھی ہوسکتی ہے؟ اتنے دلکش دن؟... اتنی طلسماتی راتیں؟ کسی وقت سویرا ایک دم چپ سی ہوجاتی تھی۔ وہ اس چپ کی وجہ سمجھتا تھا۔ سویرا کو ایک بات کا قلق تھا جو کبھی اس سے جدا نہیں ہوتا تھا...... چار برس پہلے وہ اس وقت بے عملی اور تذبذب کی کیفیت میں کیوں رہی جب چوڈیرو حویلی میں اسے اس کے سامنے زخموں سے چُور کر کے موت کی طرف دھکیلا جارہا تھا۔ وہ ان لمحوں میں اس کے لیے کھڑی کیوں نہ ہوسکی...... کبھی کبھی اس کے اچانک چپ ہوجانے کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ اب جلد از جلد پاکستان سے پرواز کرجائیں۔ بہاولپور جاکر سویرا نے پھر یہی بات کہی تو دلاور بولا۔ ''سویرا! آپ کے اور پھپو کے کاغذات تیار ہوچکے ہیں۔ مجھے صرف تین روز کی مہلت اور دے دیں۔''

''وہ کس لیے دلاور؟'' وہ ذرا اداسی سے اس کے ہاتھ پر اپنا مرمریں ہاتھ رکھ کر بولی۔

''جمعے کے دن میرا ایک بہت پرانا سپنا پورا ہونے والا ہے۔ کراچی کے ''سی ڈائیونگ سینٹر'' کا افتتاح۔ میں یہ افتتاح خود کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کو پتا ہے اس سینٹر کا نام کیا ہے؟''

وہ سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''اس کا نام ہے سرفراز سی ڈائیونگ ٹریننگ سینٹر۔ سرفراز...... جسے لوگ سرفو دم گھٹ کے نام سے جانتے ہیں اور میں جس کے تصور کو کبھی اپنی زندگی سے نکال نہیں سکتا۔''

وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن پھر مسکرا کر چپ ہوگئی۔

وہ دونوں بیش قیمت صوفے پر بیٹھے تھے۔ اس نے اپنا سر دلاور کے شانے سے ٹکا دیا۔ ذرا کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔ ''دلاور! کسی وقت بہت ڈر لگتا ہے۔''

''کس سے؟'' وہ اس کی نسواری زلفوں کو اس کے کانوں کے پیچھے اڑس کر بولا۔

''پتا نہیں کس سے۔''

''ان لوگوں میں اتنا دم نہیں کہ وہ اب میری اور آپ کی ہوا کو بھی چھو سکیں۔''

''لیکن دلاور! میری نانی کہا کرتی تھیں، روہی رنگ رنگیلی ہے...... اور زہریلی بھی۔ اور جب یہ اپنے زہریلے روپ میں ہوتی ہے تو ناگن بن جاتی ہے اور اس کے بہت سے منہ ہوتے ہیں۔ وہ کس منہ سے ڈس لے، کسی کو پتا نہیں ہوتا۔''

''آپ...... کیا کہنا چاہتی ہیں؟''

''ہمیں جلد سے جلد یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ چوڈیرو والے نہ سہی، کوئی اور ہمیں نقصان پہنچا سکتا ہے۔''

کراچی کے ساحل پر عظیم الشان ٹریننگ سینٹر کا افتتاح کرنے کے بعد دلاور نے خود کو ہوا کی طرح ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ اب اس کی سوچوں کا رخ خلیج عمان کی ایک الگ تھلگ اور پُرسکون جگہ ''برکا'' کی طرف تھا۔ یہاں سمندر کے قریب ایک درمیانے سائز کے لیکن نہایت خوبصورت بنگلے کو اس نے اپنی مستقل رہائش کے لیے منتخب کیا تھا...... اس کے حکم پر اس کے اماراتی منیجر نے اسے دنیا کی ہر سہولت سے آراستہ کردیا تھا...... وہ فی الحقیقت ایک جنت نشاں جگہ بن گئی تھی۔ اس سے بہتر رہائشی آئیڈیا دلاور کے ذہن میں آ ہی نہیں سکتا تھا۔ صرف بیس دن کے مختصر وقت میں اس نے اس جگہ کو اپنی سویرا کے شایانِ شان بناڈالا تھا۔

وہ بہاولپور والی کوٹھی میں دلاور کی آخری شام تھی، ٹکٹ کنفرم تھے۔ پھپو عالیہ، ڈرائیور اور دو گارڈز کے ساتھ کچھ ضروری شاپنگ کے لیے گئی ہوئی تھیں...... سویرا ملازمہ کی مدد سے پیکنگ میں مصروف تھی۔ دلاور حسبِ عادت رات کے کھانے سے پہلے سوئمنگ پول میں تھا۔ وہ گہرے پانی کی مچھلی جو بے پناہ دباؤ میں بھی زندہ رہنے کا ہنر جانتی ہے۔ ریلیکسیشن کے لیے وہ سانس باہر نکال کر پانی کی تہ میں چلا جاتا تھا اور دس پندرہ منٹ کے لیے آنکھیں موند لیتا تھا۔ باہر کی آوازیں ناقابلِ فہم سرسراہٹ کی طرح اس کی سماعت تک پہنچتی تھیں۔ اسے لگا کہ سویرا اسے پکار رہی ہے۔ اسے دن میں کئی مرتبہ اس طرح کا دھوکا ہوتا تھا۔ یہ کیسی محبت تھی جو ملاپ سے کم نہیں ہورہی تھی، بڑھ رہی تھی اور وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ عارضی اضافہ نہیں ہے۔

اچانک اسے دوبارہ آواز کا شک ہوا۔ اسے پتا چلا کہ اس مرتبہ دھوکا نہیں، وہ تیر کی طرح پانی کی سطح پر آیا۔ اس نے ایک قیامت خیز منظر دیکھا۔ سفید شلوار قمیص والا ایک کرخت چہرہ لڑکا چلّا رہا تھا۔ گالیاں بک رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک دو دھاری خنجر تھا۔ سویرا اس کے پاؤں سے چمٹی ہوئی تھی۔ وہ اسے دلاور کی طرف آنے سے روک رہی تھی۔ اس کے ساتھ گھسٹتی چلی آرہی تھی۔ لڑکے کی عمر بمشکل چودہ پندرہ سال رہی ہوگی مگر اس کا تن و توش اچھا تھا۔ وہ پکار رہی تھی۔ ''دلاور...... دلاور۔'' سویرا کے پہلو میں اس کی

سفید پھولوں والی قمیص پر خون کا ایک بڑا داغ دکھائی دے رہا تھا۔ یکا یک بجلی سی چمکی۔ لڑکے نے دلاور کو پانی سے نکلتے دیکھا تو جھلا کر پلٹا اور سویرا کی کمر اور گردن پر خنجر کے پے در پے تین وار کیے۔ تب تک دلاور کا سکتہ ٹوٹ چکا تھا اور وہ دیوانہ وار حملہ آور پر جھپٹ پڑا تھا۔ سویرا نے ابھی تک حملہ آور کے قدم نہیں چھوڑے تھے۔ دلاور اوپر اور حملہ آور نیچے تھا۔ اس نے اتنی وحشت سے حملہ آور کی کلائی مروڑی کہ ہڈی چٹخنے کی آواز آئی اور خنجر اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اسی دوران میں گارڈز اور دو ملازم لپکتے ہوئے موقع پر پہنچ چکے تھے۔ وہ حملہ آور سے لپٹ گئے۔ وہ چنگھاڑنے لگا۔ ''شاہ پرویز نام ہے میرا..... شاہ فرمان کا پتر ہوں۔ ہم اپنی دشمنی بھولتے نہیں ہیں۔ قبر تک پیچھا کرتے ہیں..... قبر تک کرتے ہیں......''

چوڑے چکلے جسم کا وہ نوعمر لڑکا کسی پکی عمر کے مرد کی طرح دھاڑ رہا تھا۔ آنکھوں سے شعلے برسا رہا تھا۔ دلاور، سویرا کی طرف لپکا۔ اس کا سارا لباس خون سے تر بتر تھا۔ اردگرد کی ہر چیز...... اور اس کے ساتھ ساتھ زمین و آسمان دلاور کی نگاہوں میں گھومنے لگے۔ اس نے خونچکاں سویرا کو سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔ ''سویرا......'' وہ دیوانوں کی طرح پکارا۔ ''گاڑی نکالو..... جلدی کرو۔'' اس کی آواز کوٹھی کے در و دیوار میں گونجتی چلی گئی...... اس کے گارڈز نے حملہ آور کو پوری طرح چھاپ رکھا تھا۔

چند منٹ بعد ٹویوٹا کی جیپ برق رفتاری سے اسپتال کی طرف دوڑ رہی تھی۔ سویرا کا خونچکاں چہرہ دلاور کی گود میں تھا۔ سویرا نے اپنا مہندی لگا ہاتھ اوپر اٹھایا۔ ست رنگی چوڑیاں اس کی کلائی میں چھنک اٹھیں۔ وہ دلاور کے رخسار پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ''دلاور...... جب چوڑیرو حویلی میں آپ کو...... بے وردی سے مارا جا رہا تھا...... میں کچھ نہ کر سکی تھی...... دیکھتی رہ گئی تھی...... آج..... شاید میں نے..... کچھ نہ کچھ تو..... کفارہ ادا کر دیا ہے..... کر دیا ہے نا؟''

دلاور نے اسے گلے سے لگا کر بھینچ لیا۔ وہ اسی طرح اس کے سینے میں منہ چھپائے چھپائے دوبارہ بولی۔ ''ہم نے دیر کر دی دلاور! ہم نے دیر کر دی نا..... آپ سے کہا تھا..... یہ لوگ ہمیں چھوڑیں گے نہیں..... خود کچھ نہ کر پائے..... تو کسی اور طریقے سے کریں گے..... ان کے..... بہت سے..... منہ ہیں دلاور......'' اس کی سانس ٹوٹ رہی تھی۔ گاڑی کے پہیے بہاولپور کی سڑکوں پر چرچرا رہے تھے۔

دلاور نے ڈرائیور کو گاڑی اور تیز چلانے کا حکم دیا۔ پھر وہ سویرا کی پیشانی چوم کر بولا۔ ''میں آپ کو کچھ نہیں ہونے دوں گا۔ آپ کو بچنا ہے..... آپ کو زندہ رہنا ہے..... میری خاطر..... میری خاطر سویرا..... نہیں تو میں بھی نہیں رہوں گا۔''

اس نے لمبے لمبے سانس لیے۔ جیسے چاہتی ہو کہ اس کی سانسوں کی ڈور ٹوٹنے نہ پائے۔ اپنی روح کو اپنے جسم سے منسلک رکھنے کی کوشش کر رہی ہو..... وہ جیسے پوری جان کے ساتھ دلاور سے لپٹ گئی مگر موت کا فرشتہ زیادہ زور آور ہوتا ہے...... وہ اپنا کام کر گزرا..... وہ اسپتال کے دروازے میں داخل ہونے سے پہلے مر گئی......

اوکھے پینڈے لمبیاں راہواں عشق دیاں..... درد جگر سخت سزاواں عشق دیاں......

☆☆☆

منظر بہاولپور شہر کے ایک قبرستان کا تھا۔ اس قبرستان میں سویرا ابدی نیند سو رہی تھی۔ وہی سویرا جو عشق کے ایک انجانے بندھن کی اسیر تھی..... معروف رومانی کردار صاحباں کی طرح اس نے بھی اپنے مرزا سے کہا تھا کہ وہ دیر نہ کرے، وہ یہاں سے نکل جائے، وہ جلدی کرے۔ لیکن ہونی تو ہو کر رہتی ہے۔ یہاں بھی ہو کر رہی تھی۔

سویرا کو اس قبرستان کا مکیں ہوئے اب دو ماہ گزر چکے تھے۔ روزانہ شام سے پہلے اس کی قبر پر آنا دلاور کا معمول تھا۔ دلاور کی شیو بڑھ کر اب چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ سر کے بال لمبے ہو چکے تھے۔ ایک عجیب صوفیانہ رنگ سا چڑھتا جا رہا تھا اس پر..... لیکن یہ بھی نہیں تھا کہ وہ اپنے بزنس اور اپنے معمولات سے بالکل علیحدہ ہو گیا تھا۔ وہ کراچی میں اپنے ٹریننگ سینٹر اور چوڑیرو میں جننگ فیکٹری کی خبر رکھتا تھا۔ اس نے یہیں بہاولپور شہر میں ایک مناسب گھر خرید لیا تھا۔

وہ قبر کے قریب گم صم کھڑا تھا جب کسی نے اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا، یہ اس کا عزیز ترین دوست اور بزنس پارٹنر رشید تھا، رشید مکرانی۔ تھری پیس سوٹ میں ملبوس وہ واقعی ایک جواں سال بزنس مین نظر آتا تھا۔

''تم یہاں؟'' دلاور نے پوچھا۔

رشید نے کہا۔ ''دلاور بھائی! اپن کا وکیل پورے سندھ میں نمبر ایک ہے۔ اس لونڈے کی عمر کم ہے۔ پھانسی کی سزا تو نہیں ہوگی، مگر تیرہ چودہ سال سے پہلے باہر آ گیا تو قسم ہے..... نام بدل دینا۔''

وہ جس کو ڈھونڈتا پھر رہا تھا...... یہ وہی نہایت نشیلا "چودھری زادہ" تھا جو دو ماہ پہلے دلاور کو قتل کرنے کی نیت سے اس کی کوٹھی میں داخل ہوا تھا۔ اسے تو قتل نہ کر سکا مگر اس کا دو دھاری خنجر سویرا اور ایک گارڈ کی جان لے گیا۔ واردات کے وقت اس تنومند لڑکے نے چلّا چلّا کر کہا تھا......

میرا نام شاہ پرویز ہے۔ میں شاہ فرمان کا پتر ہوں......

وہ شاہ فرمان کا بیٹا نہیں بھانجا تھا...... اس کی بہن کا بیٹا۔ حویلی کی زہریلی فضا نے اس کے کچے ذہن میں زہر بھرا تھا۔ غرور، نفرت اور کینے سے بھری ہوئی وہ حویلی اپنے کمینوں کو اور کمینوں کے بچوں کو اور دے بھی کیا سکتی تھی۔

شاید سویرا نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ یہ رنگ رنگیلی ٹڑی روہی جب زہریلی ناگن کا روپ دھارتی ہے تو اس کے کئی منہ ہوتے ہیں۔ وہ کس طرف سے اور کس منہ سے ڈس لے گی، کچھ پتا نہیں ہوتا۔

رشید آنکھوں میں نمی لے کر عجیب نظروں سے دلاور کی طرف دیکھتا رہا پھر اس کے سامنے ایک کاغذ کرتے ہوئے بولا۔ "دلاور بھائی! یہ آپ کا ٹکٹ ہے۔ آپ نے اپن سے وعدہ کیا تھا کہ کچھ ٹائم گزر جائے...... پھر آپ سوچیں گے۔ اپن کا خیال ہے کہ اب وہ ٹائم آ گیا ہے۔ وڑی وہاں دبئی میں آپ کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔ نقصان ہو رہا ہے۔ آپ کو جانا چاہیے۔"

دلاور نے ٹکٹ کا پرنٹ رشید کے ہاتھ سے لے لیا۔ کچھ دیر خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتا رہا، پھر پھاڑ کر پھینک دیا۔ "تم اپنے نام کا ٹکٹ بنواؤ رشید۔"

"آپ ...... کیا کہہ رہے ہو بھائی؟" رشید سخت حیرت میں تھا۔

"میری جگہ تم وہاں جاؤ گے رشید...... تمہاری جگہ میں یہاں رہوں گا...... وہ دیکھو...... وہ وہاں سو رہی ہے۔ میں اسے چھوڑ کر کہاں جا سکتا ہوں؟ میں اسے چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا۔"

رشید نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ پچھلے چار پانچ برسوں میں وہ اس کا رمز شناس ہو چکا تھا۔ وہ دلاور کے اس لہجے کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ سمجھ گیا کہ اس نے جو کچھ کہہ دیا ہے، وہ حتمی ہے۔ دونوں کافی دیر خاموش بیٹھے رہے۔ سورج جنتر، کیکر اور بیری کے درختوں کے پیچھے اوجھل ہو رہا تھا۔ شہرِ خموشاں پر اس کی آخری کرنیں بکھری ہوئی تھیں۔ رشید نے لمبی سانس لے کر کہا۔ "یہ بات اپنے مغز میں آ گئی ہے کہ اب آپ یہاں سے نہیں جائے گا لیکن آپ اپن کو بس ایک بات بتا دیں۔ آپ کو پتا ہے کہ آپ کا یہاں رہنا کتنا خطرناک ہے۔ بہاولپور اور چوڈیرو میں کوئی بہت زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ یہ آگ جو آپ کے اردگرد سلگ رہی ہے اور ان کوٹھوں میں ہر جگہ جس کی چنگاڑیاں ہیں، آپ کو کسی بھی ٹائم نقصان پہنچا سکتی ہیں۔"

دلاور کی نگاہ چند میٹر دور سویرا کی قبر پر تھی۔ وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔ "اب میرے پاس گنوانے کو کچھ نہیں ہے رشید! میں اب یہیں رہوں گا۔ انہی شاہ فرمانوں، شاہ پرویزوں اور ساجے بھٹلوں کے درمیان۔" اس نے عجب پُرعزم لہجے میں کہا...... اور جیکٹ کے نیچے اپنے بھرے ہوئے گولٹ پسٹل کو چھوا۔

کچھ دیر بعد جب رشید کمرانی جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تو دلاور دبے دبے کرب کے ساتھ بولا۔ "وہاں جا کر ایک کام کرنا ہے رشید...... برکا کے اس بنگلے کو ختم کر دینا جہاں جا کر ہم نے رہنا تھا۔"

"آپ...... کا مطلب ہے فروخت کر دیں؟"

"نہیں۔" وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔ "اسے ختم کر دینا ہے۔ بالکل مسمار...... میں اگر کبھی وہاں جاؤں تو مجھے اس کی ایک اینٹ بھی نظر نہیں آنی چاہیے۔"

رشید نے گہری سانس لے کر اثبات میں سر ہلایا اور آگے بڑھ گیا۔ وہ گارڈز کے ساتھ اپنی ہنڈا اکارڈ میں بیٹھ کر چلا گیا تو دلاور بھی اپنی جگہ سے اٹھا۔ سویرا کی قبر پر گرے ہوئے خشک پتوں اور گھاس وغیرہ کو ہٹایا، اس پر تھوڑا سا چھڑکاؤ کیا۔ گلاب کی چند پتیاں اس پر بکھیریں اور گم صم سا ایک طرف بیٹھ گیا۔ روہی کی تھوڑی سرد تھوڑی رنگیلی ہوا چلنا شروع ہو گئی تھی۔ اس ہوا میں بیتے دنوں کی خوشبو تھی اور پھر وہ چند پُرمسرت دن جو کئی صدیوں پر بھاری تھے اور آخر میں وہ جانگداز صدمہ۔

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ دل ہی دل میں کہنے لگا۔ "آپ ہمیشہ مجھ سے پوچھتی رہی ہیں۔ شاید صدیوں سے پوچھتی رہی ہیں...... تم کب تک مجھ کو بھولو گے؟...... آج میں آپ کو بتاتا ہوں...... میں آپ کو کبھی نہیں بھولوں گا۔ میں بھول سکتا ہی نہیں۔ یہ میرے بس میں ہے ہی نہیں۔

"دنیا میں ایسا ہوتا تو نہیں ہے لیکن آپ دیکھ لینا...... جب تک میری سانس ہے، میں آپ کو یہاں اپنے آس پاس ہی نظر آؤں گا...... ہاں سویرا! جب تک سانس ہے اور جب سانس نہیں رہے گی...... تو پھر...... تو پھر آپ کو پکاروں گا، آپ کو تلاش کروں گا۔"

آدم خور جزیرہ

ایک لرزہ خیز مُہم کی ناقابلِ فراموش داستان

پیٹر بینچلے کے شہرۂ آفاق ناول
دی آئی لینڈ کی تلخیص

طاہر جاوید مُغل

مچھلیاں

مچھلیاں پکڑنے والی جدید طرز کی ایک خوبصورت کشتی کھلے سمندر میں ہچکولے کھا رہی تھی۔ سورج دُور مغرب میں ایک سُرخ تھال کی طرح نظر آ رہا تھا اور ڈیوڈ کشتی کے کنارے پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا۔ مچھلی پکڑنے والی کُنڈی کی ڈور اُس کے بائیں ہاتھ میں تھی۔ دُوسرے ہاتھ سے وہ کبھی کبھی سگریٹ کا کش لے لیتا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر سُورج ڈوبنے سے پہلے وہ ایک ٹیلوفن مچھلی اور پکڑ لے تو اپنے دونوں دوستوں کا ریکارڈ توڑ سکتا ہے۔ جارج نے پیر کے روز تین اور ماریا نے بُدھ کے روز چار ٹیلوفن پکڑی تھیں۔ وہ اس سے پہلے صرف ایک ٹیلوفن پکڑ سکا تھا۔ آج صبح ہی سے اُس کی قسمت ساتھ دے رہی تھی اور اُس نے دوپہر تک چار ٹیلوفن پکڑ لی تھیں لیکن دوپہر کے بعد ایک ٹیلوفن بھی اُس کے ہاتھ نہیں آئی تھی۔ ریکارڈ اُس کے ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا۔ وہ تینوں پچھلے ہفتے سے کُھلے سمندر میں مچھلیاں پکڑ رہے تھے۔ آج اُن کا یہ آخری روز تھا۔ ڈیوڈ نے سگریٹ کا کش لیتے ہُوئے سوچا کل اُن کو واپس روانہ ہو جانا ہے اور پرسوں پھر وہی بھاگ دوڑ کے روز و شب ہوں گے۔ صبح سات بجے دفتر روانگی اور شام چھ بجے واپسی۔ فائلوں کے انبار، مسائل کے ڈھیر، اُلجھنوں کے جال ـــــ اچانک اُسے سامنے سمندر میں کوئی چیز تیرتی نظر آئی۔ جب وہ شے کشتی کے قریب پہنچی تو ڈیوڈ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ کسی شخص کی لاش تھی۔ مُردہ شخص کے جسم پر ایک پتلون کے سوا اور کچھ نہیں تھا اور وہ اوندھے مُنہ پانی پر تیر رہا تھا۔ لاش آہستہ آہستہ کشتی کے بالکل قریب پہنچ گئی۔ ڈیوڈ نے جارج اور ماریا کو آواز دے کر بُلانے کا ارادہ کیا۔ جارج شاید بالکونی میں بیٹھا کوئی ناول پڑھ رہا تھا۔ ماریا وی سی آر پر فلم دیکھ رہی تھی ... لیکن پھر اس سے پہلے کہ ڈیوڈ اُن کو آواز دیتا لاش میں حرکت پیدا ہُوئی اور اب مُردہ شخص کا چہرہ ڈیوڈ کو صاف نظر آنے لگا۔ خدا کی پناہ، وہ اک عجیب و غریب چہرہ تھا۔ جلد بالکل سیاہ اور آنکھیں بالکل سُرخ۔ وہ ایک انسانی چہرہ تھا لیکن اُس کی مجموعی کیفیّت لفظوں میں بیان کی ہی نہیں جا سکتی تھی۔ ڈیوڈ کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور اُس کا مُنہ عجیب انداز میں کُھلا ہُوا تھا۔ پھر اُس کے دیکھتے ہی دیکھتے اُس شخص کا بالوں سے بھرا ہُوا ہاتھ آگے کی طرف بڑھا اور اُس نے کشتی کا کنارہ تھام لیا۔ پھر اُس کا دوسرا ہاتھ پانی سے باہر نکلا۔ ڈیوڈ نے خنجر کی جھلک دیکھی، پھر اُس کی آنکھوں کے سامنے بجلی سی کوندگئی ...

جب ڈیوڈ نے اپنی تمام جمع شدہ قوّت بروئے کار لا کر چلّانا چاہا تو اُسے یُوں لگا جیسے اُس کا گلا نرخرے سمیت کٹ چکا ہو۔ گرم گرم خُون کی حدّت وہ اپنے سینے پر محسُوس کر رہا تھا پھر اُس کی نظروں کے سامنے سب کچھ دُھندلا گیا اور وہ اُلٹ کر کشتی میں جا گرا۔

کشتی کے ایک سجے سجائے کمرے میں ماریا صوفے پر بیٹھی وی سی آر پر ایک تازہ فلم دیکھ رہی تھی۔ فلم کلائمیکس پر پہنچنے والی تھی اور ماریا پُوری طرح کہانی کے طلسم میں گرفتار تھی۔ دفعتہً کمرے کا دروازہ کُھلا اور جارج ناول ہاتھ میں تھامے نمُودار ہُوا۔

” فلم کتنی باقی رہ گئی ؟ آج چائے ملے گی یا نہیں۔“ وہ اپنی بیوی ماریا سے بولا۔

” زیادہ سے زیادہ دس منٹ۔“ ماریا نے ایک لمحے کے لیے اسکرین سے نگاہیں ہٹاتے ہُوئے کہا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ اسکرین پر توجّہ مرکوز کرتی، اُسے جارج کے پیچھے دروازے میں ایک ایسا منظر نظر آیا جس نے اُسے پاگلوں کی طرح چیخنے پر مجبُور کر دیا۔ جارج نے حیرت سے اُس کے چہرے کے بدلتے ہُوئے تاثرات دیکھے اور اُس کے مُنہ سے اُبلتی ہُوئی چیخ سُنی، لیکن پھر اس سے پہلے کہ وہ گھوم کر دروازے کی طرف دیکھتا ایک نہایت

وزنی چیز اُس کے سر سے ٹکرائی۔ اُس نے اپنی کھوپڑی
کے ٹوٹنے کی آواز سُنی اور وہ دائیں طرف پڑے ہُوئے
شیمپین کے کریٹ پر گرا۔ جارج کی آنکھوں نے زندگی کا
جو آخری منظر دیکھا وہ بوتلوں کے فرش پر گر کر ٹوٹنے کا تھا۔
ماریا نے اُٹھ کر بھاگنا چاہا لیکن بالوں سے بھرے ہُوئے
دونوں ہاتھوں نے اُسے گرفت میں لے لیا اور اُس
کے نتھنوں میں ایک انتہائی ناگوار بُو گھستی چلی گئی۔ عجیب
طرح کی بُو تھی یہ۔ ماریا کو یاد آیا کہ ایسی بُو اُس نے اُس
وقت سُونگھی تھی جب ایک دفعہ گھر کا ریفریجریٹر خراب ہوجانے
کی وجہ سے اُس کے اندر پڑی ہُوئی مچھلیاں سڑ گئی تھیں۔
اُس نے پُوری قوّت سے خود کو حملہ آور کی گرفت سے چھڑانا
چاہا لیکن ناکام رہی۔ اُس نے دایاں پاؤں حملہ آور کی
پسلیوں میں دے مارا۔ وہ غضبناک انداز میں غرّایا پھر
اُس کا ہاتھ اپنی پتلون کی بیلٹ تک گیا۔ پُرانے زمانے
کا ایک چمکتا ہُوا خنجر اُس کے ہاتھ میں نظر آرہا تھا۔ ماریا
ایک بار زور سے مچلی پھر اُس نے محسوس کیا کہ انگارہ سا
اُس کے دل کے مقام پر اُتر گیا ہے۔ اُس کا جسم حملہ آور
کی گرفت میں ایک دو بار پھڑکا اور ہمیشہ کے لیے
ساکت ہوگیا۔

■

آج پھر 'منیارڈ' دفتر سے لیٹ تھا۔ رات بھر
ایک رسالے کے لیے مضمون لکھتا رہا تھا جس کے نتیجے
میں آٹھ بجے سے پہلے اس کی آنکھ نہیں کُھلی تھی۔ اُس نے
ایک جماہی لی اور اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ گھر میں چاروں طرف
عجیب قسم کی اُداسی چھائی ہُوئی تھی۔ جب اُس کی بیوی اور
بچّہ اُس کے ساتھ رہتے تھے تو گھر کا ماحول کتنا مختلف تھا!
جاتے وقت اُس کی بیوی بہت سا سامان لے گئی تھی۔
اب کھڑکیاں پردوں سے خالی تھیں۔ فرش پر قالین بھی
نہیں تھا، فرنیچر بس حسبِ ضرورت ہی تھا۔ دیواروں
پر آویزاں بڑی بڑی پینٹنگز کی جگہ اُن کے نشان ہی نظر آرہے
تھے۔ اس اپارٹمنٹ سے منیارڈ کی اَن گنت یادیں وابستہ
تھیں۔ یہاں اپنی بیوی 'ڈیسیون' اور بچّے 'جوسٹائن'
کے ساتھ اُس نے بارہ سال گزارے تھے... زندگی
سے بھرپور یہ بارہ سال اور اتنی لمبی رفاقت کے بعد دونوں
ایک دُوسرے سے علحدہ ہوگئے تھے۔ منیارڈ پیدائشی
طور پر ایک ادیب تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس میدان میں
آمدن کے مواقع زیادہ نہیں لیکن اپنی فطرت سے مجبور تھا۔
اُس نے مسلسل ریاضت اور کاوش کے ذریعے اپنا ایک
مقام بنا لیا تھا۔ وہ آگے بڑھ رہا تھا لیکن اُس کی بیوی اُس
کی رفتار سے غیر مطمئن تھی۔ گھر کی حالت سُدھارنے کے
لیے اُس نے خُود بھی نوکری کر لی۔ اُس کی صلاحیّتیں کُھل
کر سامنے آئیں اور وہ تیزی سے ترقّی کے مراحل طے
کرنے لگی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ مغرور ہوتی چلی گئی۔
کوئی چھ ماہ پہلے اُن میں طلاق ہوگئی۔ جوسٹائن کے بارے
میں یہ فیصلہ ہُوا کہ وہ ماں کے پاس رہے گا اور منیارڈ
اُس کی تعلیم و تربیت میں تعاون کے طور پر پانچ سو
ڈالر ماہانہ ادا کرے گا۔

منیارڈ ماضی کی یادوں میں گُم، اپنی چھوٹی گاڑی
ڈرائیو کرتا ہُوا ہفت روزہ 'ٹوڈے' کے دفتر کے
سامنے رُکا۔ گاڑی پارکنگ میں کھڑی کرنے کے بعد وہ
تیز قدموں سے چلتا ہُوا لفٹ کی طرف بڑھا۔ دفتر میں
داخل ہوتے وقت اُس نے گھڑی پر نگاہ ڈالی، وہ ڈیڑھ
گھنٹے لیٹ تھا۔ سیدھا اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ اُس
کی اسسٹنٹ ڈیانا نے اُسے گڈ مارننگ کہا۔ پھر فکرمند
نظروں سے اُسے دیکھتے ہُوئے بولی:

"آپ ٹھیک تو ہیں؟"

"ہاں، بالکل ٹھیک ہُوں۔" منیارڈ نے دلکش انداز
میں مُسکراتے ہُوئے کہا۔ وہ جانتا تھا کہ ڈیانا اُسے بھائیوں
کی طرح چاہتی ہے۔ اُس کے تاخیر سے دفتر پہنچنے پر فکرمند
ہوجاتی تھی۔ وہ ستائیس اٹھائیس برس کی ایک خوبصورت

ایک رپورٹ بھی ملی۔ اس میں بھی کچھ کام کی باتیں درج تھیں۔ منیارڈ یہ دونوں چیزیں لے کر پھر سینیئر ایڈیٹر کے دفتر پہنچا۔ ہلر نے بیزاری سے کہا:

"سٹرکین! پچاس ہزار افراد ہر سال سڑکوں پر مر جاتے ہیں، اگر یہاں تین سال میں ۲۰۰۰ لوگ مر گئے تو یہ کون سی بڑی بات ہے۔ اگر تم بہت ضروری سمجھتے ہو تو کسی ماتحت کو اس کام پر لگا دو۔ خدا کے لیے خود تحقیق و تفتیش کرنے کے چکّر میں نہ پڑ جانا۔ یہاں ہمارے سر پہ بہت کام چڑھا ہُوا ہے۔"

منیارڈ نے اس خبر کی اہمیت پر زور دیا تو وہ طیش میں آکر بولا:

"منیارڈ! تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تم ایک نیوز رائٹر ہو۔ اگر تم دُوسرے چکروں میں پڑو گے تو نیوز رائٹر بھی نہیں رہو گے۔"

منیارڈ یک لخت اُٹھ کھڑا ہُوا اور صاف لہجے میں بولا: "جناب مجھے معلوم ہے کہ مَیں نیوز رائٹر ہُوں... اور اسی لیے مَیں وہاں جانا چاہتا ہُوں... خُدا حافظ۔" اُس نے زور سے دروازہ بند کیا اور باہر نکل گیا۔

▪

جوسٹائن بڑی محویّت سے کارٹون رسالہ دیکھ رہا تھا۔ اُس کے برابر والی نشست پر اُس کا باپ منیارڈ بیٹھا تھا۔ اس وقت وہ دونوں طیّارے کے ذریعے واشنگٹن جا رہے تھے۔ وہاں منیارڈ کا پروگرام اُس ساحلی محافظ 'فلوریو' سے ملنے کا تھا جس کا بیان کشتی کی گمشدگی کے سلسلے میں شائع ہُوا تھا۔ منیارڈ نے روانہ ہونے سے پہلے ہی ٹیلی فون پر اُس سے ملاقات کا وقت لے لیا تھا۔ جوسٹائن نے اچانک رسالے سے سر اُٹھاتے ہُوئے کہا:

"ڈیڈ! اگر میری پیانو کی کلاس نکل گئی تو ممّی میرا حلیہ خراب کر دیں گی۔"

منیارڈ نے اُسے تسلّی دیتے ہُوئے کہا: "گھبرانے کی بات نہیں، پیانو کی کلاس سے پہلے پہلے ہم واپس پہنچ جائیں گے۔ اگر کچھ دیر بھی ہو گئی تو مَیں معذرت کر لوں گا تمہاری اُستانی سے۔"

جوسٹائن کے چہرے پر فکرمندی کے تاثّرات کچھ ماند پڑنے لگے۔ پھر وہ بڑے دلکش انداز میں چار ماہ پہلے کی باتیں دُہرانے لگا جب اُس کی ممّی ایسے ہی ایک دَورے پر گئی تھی اور جوسٹائن کو اپنے باپ کے ہمراہ چند پُرلطف دن گزارنے کا موقع ملا تھا۔ وہ دونوں شاٹ گنوں سے مسلّح ہو کر شکار کرنے چلے گئے تھے۔ شاٹ گن کی بات چل نکلی تو جوسٹائن نے ایک گن کی فرمائش کر دی۔ منیارڈ ٹالنے کے لیے اچھّی سی دلیل سوچ ہی رہا تھا کہ جہاز کے رن وے پر اُترنے کا اعلان ہُوا۔ ہوائی اڈّے سے اُنہوں نے ٹیکسی لی۔ منیارڈ نے جوسٹائن کو راستے میں 'ایئر اینڈ سپیس' میوزیم کی عمارت پر اُتار دیا۔ اور خود فلوریو سے ملنے روانہ ہو گیا۔

فلوریو پینتالیس پچاس کا ایک تنومند شخص تھا۔ اُس نے گول شیشوں والی نظر کی عینک لگا رکھی تھی۔ وہ بڑے تپاک سے منیارڈ کو گھر کے اندر لے گیا۔ منیارڈ نے اپنے آنے کا مقصد تفصیل سے بیان کیا اور کشتیوں کی گمشدگی کے بارے میں اُس کی رائے طلب کی۔ فلوریو کا خیال تھا کہ یہ تمام واقعات کشتی رانوں کی کوتاہ اندیشی کی وجہ سے پیش آرہے ہیں۔ لوگوں کے پاس پیسہ بہت ہو گیا ہے۔ وہ نت نئی اور جدید کشتیاں خریدتے ہیں اور سیر و تفریح کے لیے کُھلے سمندر میں نکل جاتے ہیں۔ اُنہیں کشتیوں کے بارے میں کچھ پتہ ہوتا ہے نہ سمندر کے بارے میں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کوئی نہ کوئی حادثہ پیش آجاتا ہے۔

منیارڈ نے سوال کیا: "کیا تمام کی تمام کشتیاں حادثات کا شکار ہوتی ہیں؟"

فلوریو نے لمبا سانس لے کر کہا: "تین برسوں میں،

۱۰ فیصد کشتیوں کی گمشدگی کو دیکھتے ہُوئے کچھ پُراسراریت سی محسُوس ہوتی ہے۔ ۲۵ فیصد یعنی کوئی ۱۳۰ کشتیاں ایسی تھیں جنہیں مقامی ڈگر اس ہوپرز نے اغوا کیا۔ پھر اُنہیں توڑ کر بیچ دیا یا بحر الکاہل میں لے گئے۔ تیس چالیس ایسی ہوں گی جن کو مختلف لوگوں نے چُرایا ہوگا۔ بالکل اُسی طرح جس طرح کوئی آپ کی کار یا موٹر سائیکل چُرا لیتا ہے۔ باقی کشتیوں کے واقعات پُراسرار معلوم ہوتے ہیں۔"

منیارڈ نے سوال کیا: "اب تک غائب ہونے والی کشتیوں کا کوئی مسافر زندہ بھی بچا ہے؟"

فلوریو نے پائپ کا کش لیتے ہُوئے کہا: "حیرت انگیز امر یہی ہے کہ ابھی تک کوئی ایسا فرد ملا ہی نہیں جو صورتِ حال کو واضح کر سکے۔"

منیارڈ نے یہ معلوم کرنا چاہا کہ مقامی حُکّام نے اس ضمن میں اب تک کیا احتیاطی تدابیر کی ہیں۔ فلوریو نے بتایا گشتی دستے قائم کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ کشتی رانوں کو سختی سے ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ کھُلے سمندر میں زیادہ دُور تک نہ جائیں، غیر آباد جزیروں پر نہ اُتریں، اپنے ساتھ ٹرانسمیٹر رکھّیں اور وقتاً فوقتاً محافظ پولیس سے رابطہ قائم کرتے رہیں۔ بہت کم لوگ ان ہدایات پر عمل کرتے ہیں، البتّہ اب وہ قصداً کیکاؤس گروپ کے جزیروں کی طرف جانے سے گریز کرتے ہیں۔ منیارڈ خاصی دیر فلوریو سے اس موضوع کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کرتا رہا پھر اجازت لے کر واپس چل دیا۔ اُسے جلد از جلد ایئر اینڈ سپیس میوزیم پہنچنا تھا۔

جوسٹائن اُسے میوزیم کی سیڑھیوں ہی پر مل گیا۔ میوزیم سے وہ سیدھے ہوائی اڈّے کی طرف روانہ ہُوئے۔ وہ طیّارے کی روانگی سے بیس منٹ قبل ہی ہوائی اڈّے پر پہنچ گئے۔ منیارڈ کی نظر نیشنل ایئر لائنز کے لاؤنج کی طرف اُٹھ گئی۔ مسافروں کا ایک گروہ میامی جانے والے ہوائی جہاز پر سوار ہو رہا تھا۔ منیارڈ رُک گیا۔ "کیا بات ہے، ڈیڈ!" جوسٹائن نے انگلی پکڑے پکڑے پُوچھا۔ منیارڈ کا ذہن کہیں دُور پہنچا ہُوا تھا اور دل و دماغ میں ایک جنگ جاری تھی۔ عقل کہتی تھی کہ چُپ چاپ نیویارک لوٹ جاؤ۔ کشتیوں کی گمشدگی پر لعنت بھیجو اور کل سے دفتر پہنچ کر بھلے مانسوں کی طرح روزمرّہ کا کام شروع کر دو لیکن جذبات کچھ اور کہہ رہے تھے۔ کہیں اُس کے اندر سے آواز آئی تھی کہ نیویارک واپس جا کر تم بہت بڑی غلطی کرو گے۔ تمہیں آگے بڑھنا چاہیے۔ خطرات کے اندھیروں میں اُمّید اور کامیابی کی کرن بہت واضح نظر آ رہی ہے۔ اس کے اندر سے ایک لہر سی اُٹھی اور اُس نے جوسٹائن کا ہاتھ پکڑا اور میامی جانے والی فلائٹ کی طرف مُڑ گیا۔ جوسٹائن حیرت زدگی کی حالت میں بولا: "ڈیڈ! یہ ہمارا جہاز تو نہیں۔"

منیارڈ نے مُسکراتے ہُوئے کہا: "اب ہمارا یہی جہاز ہے، کیونکہ ہم اب میامی جا رہے ہیں۔"

تھوڑی دیر بعد وہ میامی کی طرف پرواز کر رہے تھے۔ جوسٹائن بہت خوش دکھائی دے رہا تھا اور بڑی دلچسپی سے کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا تھا۔ میامی ایئرپورٹ پر اُتر کر منیارڈ نے جوسٹائن کو نئے کارٹون رسالے خرید کر دیے اور پھر اُس کھڑکی کا رُخ کیا جس کے اُوپر "معلومات" کا بورڈ آویزاں تھا۔ ایک خوبصورت لڑکی کھڑکی میں وہاں موجود تھی۔ منیارڈ نے کہا۔ ہم کیکاؤس جانا چاہتے ہیں۔ لڑکی نے ایک بڑی سی کتاب کھولی اور کچھ دیر بعد سر اُٹھا کر کہا: "آپ کیکاؤس نہیں جا سکتے۔ کچھ عرصہ پہلے نیو بیئرڈ سے چند پروازیں جاتی تھیں لیکن اب وہ منسوخ کر دی گئی ہیں۔ آپ صرف چارٹرڈ جہاز میں جا سکتے ہیں اور اس کے لیے برابر والی کھڑکی سے معلومات مل جائیں گی۔" منیارڈ سامنے والی کھڑکی پر پہنچا۔ ایک عمر رسیدہ شخص نے اُسے بتایا کہ رات کے وقت کوئی جہاز کیکاؤس نہیں جاتا۔ وہاں کا رن وے اتنا خراب ہے کہ اُترنے میں سخت دشواری پیش آتی ہے، ہاں کل صبح جہاز مل سکتا ہے۔ منیارڈ نے رات ہوٹل میں گزارنے کا فیصلہ

کیا۔ ایک ہوٹل میں کمرہ کرایے پر لینے کے بعد دونوں باپ بیٹا سیر کے لیے نکل کھڑے ہُوئے۔ میامی کے ساحل سے ہوتے ہُوئے وہ مرکزی مارکیٹ میں پہنچے۔ یہاں اسلحے کی دُکان سے میناڑڈ نے جوسٹائن کے اصرار پر ایک جدید آٹومیٹک پستول خریدا۔ پھر وہ ہوٹل میں واپس چلے آئے۔

■

ویران جزیرے میں وہ ستارے کی شکل کی اکلوتی عمارت تھی۔ ستارے کے پانچوں کونے دراصل پانچ چھوٹے چھوٹے فلیٹس تھے۔ ان میں ایک ایک خاندان باآسانی رہائش رکھ سکتا تھا۔ ستارے کا مرکز ایک بڑے ہال کی شکل میں تھا جو دو حصّوں میں منقسم تھا۔ ایک حصّہ کھانے کے کمرے کے طور پر استعمال ہوتا اور دوسرا عبادت کے لیے۔ یہ عمارت دراصل ایک اعتکاف گاہ تھی، وہ لوگ جو چند ہفتوں کے لیے دُنیا کے ہنگاموں سے کنارہ کش ہو کر اپنا وقت پُرسکون مذہبی ماحول میں گزارنا چاہتے تھے، ادھر آجاتے تھے۔
اس اعتکاف گاہ کی واحد منتظم چوبیس سالہ کیتھرائن تھی۔ اس وقت وہاں چودہ افراد رہائش پذیر تھے جو تین مختلف گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ بچّے عموماً کھیلتے کُودتے رہتے اور بڑوں کا وقت عبادت اور مذہبی کتابوں کے مطالعے میں صرف ہوتا۔ اس وقت کیتھرائن کھانے کے کمرے میں سب کو چائے پیش کر رہی تھی۔ اُس نے پُوچھا "تمام لوگ موجود ہیں نا؟" ایک عورت بولی: "نہیں، میری اور آرتھر دونوں باہر کھیل رہے ہیں۔" کیتھرائن نے کہا: "آپ لوگوں کو پہلے بھی کہہ چکی ہُوں کہ شام کے وقت بچّوں کو باہر نہ نکلنے دیا کریں۔ پچھلی دفعہ بھی ایک بچّہ گُم ہو گیا تھا اور بڑی مشکل سے ملا تھا۔" اتنے میں کمرے کا دروازہ زور سے کھُلا اور ایک دس گیارہ سال کا بچّہ بھاگتا ہُوا اندر آیا۔ "وہاں سمندر میں ایک کشتی ہماری طرف آرہی ہے۔" اس نے کمرے کے وسط میں کھڑے ہو کر اعلان کیا۔ کیتھرائن اس اطلاع پر چونک اُٹھی۔ اس کا رنگ یکدم سفید پڑ گیا۔ اُس نے پُوچھا:

مُلّا واحدی کی علامہ راشد الخیری سے گہری دوستی تھی۔ ایک مرتبہ واحدی صاحب کسی بات پر ناراض ہو گئے اور دو ماہ تک بول چال بند رہی۔ اتّفاق سے اُنھی دنوں مُلّا واحدی کے چھوٹے بھائی سیّد محمد مرتضیٰ کی شادی تھی۔ اُنہوں نے علامہ صاحب کو دعوت نامہ نہ بھیجا لیکن وہ بارات کے وقت از خود پہنچ گئے اور اپنے غیر معمولی حُسنِ اخلاق سے واحدی صاحب کو پانی پانی کر دیا۔

(سیّد اوصاف علی واحدی)

"تم نے اچھّی طرح دیکھا ہے کہ وہ کشتی ہی ہے؟" بچّے نے بڑے یقین سے اثبات میں جواب دیا۔ تمام افراد حیران تھے کہ اس وقت جزیرے پر کون آ سکتا ہے۔ ایک چھوٹے جہاز کو سامان خورونوش لے کر آنا تھا لیکن اُس کے آنے میں ابھی چار پانچ روز باقی تھے۔ ایک شخص اُٹھتے ہُوئے بولا: "مَیں دیکھتا ہُوں وہ کون لوگ ہیں۔" کیتھرائن نے اُسے فوراً منع کر دیا۔ اُس کی آنکھوں میں گہرا خوف نظر آرہا تھا۔ اُس نے لرزتی ہُوئی آواز میں آرتھر سے پُوچھا "میری کہاں ہے؟" اُس نے کہا وہ ایک تتلی کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ کہہ رہی تھی مَیں اس کو پکڑ کر رہوں گی۔ کیتھرائن بھاگتی ہُوئی باہر نکل گئی۔ عمارت سے باہر ایک پتھّر پر چڑھ کر اُس نے دیکھا ساحل سے کوئی ۰۰ گز کے فاصلے پر ایک کشتی صاف نظر آرہی تھی۔ اُس کا رُخ جزیرے کی طرف ہی تھا۔
کیتھرائن کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا "یا خدا! مجھ سے کونسا گناہ سرزد ہو گیا ہے جس کی یہ سزا مل رہی ہے۔" پچھلے دس ماہ میں یہ دوسرا واقعہ تھا کہ کشتی ظاہر ہُوئی تھی۔
پھر اُس نے جلدی جلدی مَیری کو تلاش کرنے کی کوشش کی۔ دھیمی آواز میں اُس کا نام لے کر پکارا۔ جب کوئی جواب نہیں ملا تو وہ بھاگتی ہُوئی عمارت کے اندر چلی گئی۔

ہال کمرے میں سب لوگ حیران کھڑے تھے۔ کسی توقّف کے بغیر وہ سر سراتی ہُوئی آواز میں بولی: "آپ لوگ میری باتوں پر عمل کریں ورنہ ایک دردناک موت ہم سب کا مقدّر بن جائے گی۔ اس کمرے سے اپنی موجودگی کا ہر نشان فوراً مٹا ڈالیں۔" اس کے بعد وہ خود بھی اُن کے ساتھ شامل ہوگئی۔ اُنہوں نے تمام برتن اکٹھے کرکے باورچی خانے میں رکھ دیے۔ ادھر اُدھر بکھری ہُوئی چھوٹی موٹی چیزیں جمع کیں۔ پھر اُس نے سب کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا، اور اُن کو لے کر ایک تہ خانے میں اُتر گئی۔ اُس نے تیل کا ایک لیمپ جلایا اور اُن کو ہدایت کرتے ہُوئے بولی:

"مَیں دروازہ بند کرکے باہر جا رہی ہُوں۔ آپ اندر سے دروازہ بند کرلیں۔ جب تک مَیں نہ کہوں دروازہ نہ کھولیں۔ بچّوں کو خاموش رکّھیں اور خود بھی کوئی آواز مُنہ سے نہ نکالیں۔"

پھر وہ باہر کی طرف لپکی۔ ایک عورت نے چیختے ہوئے کہا: "میری بچّی تو باہر ہے۔" کیتھرائن نے ہاتھ جوڑتے ہُوئے جواب دیا: "خدا کے لیے خاموش ہو جاؤ۔ اگر تمہاری بچّی کی زندگی ہے تو وہ ضرور بچ جائے گی۔ دُعا کرو کہ وہ جلد ہی واپس نہ آجائے۔"

پھر وہ تہ خانے کا دروازہ بند کرکے باہر آگئی۔ اُس نے کھانے کی میز کا ایک بار پھر جائزہ لیا اور کُرسی پر بیٹھ گئی۔ تب دروازہ ایک دھماکے سے کُھلا اور دو افراد نظر آئے۔ اُنہوں نے لنگوٹیاں پہن رکھی تھیں اور سر سے پاؤں تک کوئی سیاہ چیز جسم پر ملی ہُوئی تھی۔ کیتھرائن نے اُن کے چہرے دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ جُونہی وہ اندر داخل ہُوئے ایک ناگوار قسم کی بُو کے بھبکے اُس کے نتھنوں میں گھستے چلے گئے۔ وہ جانتی تھی وہ کیا کریں گے۔ اُنہوں نے بغیر کچھ کہے کیتھرائن کو بازوؤں سے پکڑا اور میز پر لٹا دیا۔ اُس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور سانس روک لی۔ وہ اپنے ذہن میں شدّت کے ساتھ دُعاؤں کا ورد کر رہی تھی۔ ایک لحاظ سے اُس نے خود کو اپنے جسم سے بالکل علحدہ کرلیا تھا... وہ اُس کی طرف سے مطمئن ہو کر ریفریجریٹر کی طرف لپکے۔ کھانے پینے کا تمام سامان اُنہوں نے تھیلوں میں بھر لیا۔ ایک شخص نے غُرّاتے ہُوئے کہا: "پنسلین کہاں ہے؟" کیتھرائن نے ایک الماری میں سے پنسلین کے دو ڈبّے نکال کر اُنہیں تھما دیے۔ دوسرا شخص بولا: "تم سے کہا تھا اگلی دفعہ ہمیں شراب چاہیے۔" کیتھرائن نے کہا: "جو کچھ موجود تھا تم نے سمیٹ لیا، اب خدا کے لیے یہاں سے چلے جاؤ۔" دونوں نے ہم آہنگ ہو کر قہقہہ لگایا۔ پھر وہ دروازے کی طرف بڑھے۔ عین اُسی وقت کمرے سے باہر چھوٹے چھوٹے قدموں کی آواز آئی۔ مُیری تتلی پکڑ کر واپس آرہی تھی۔ چند ہی لمحے بعد وہ کمرے کے اندر تھی۔ اُن دونوں کی آنکھوں میں درندگی عود کر آئی۔ کیتھرائن چیخی: "خدا کے لیے اس معصوم بچّی پر رحم کرو اور اسے چھوڑ دو۔" اتنی دیر میں اُنہوں نے اُسے دبوچ لیا تھا۔ ایک شخص کے ہاتھ میں خودکار پستول نظر آرہا تھا۔ کیتھرائن جانتی تھی کہ وہ کس قدر ظالم ہیں۔ وہ اپنی جگہ سے حرکت بھی نہ کرسکی۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے معصوم بچّی کی چیخیں سُنیں ـــــ چیخیں جو لمحہ بہ لمحہ دُور ہوتی جا رہی تھیں۔

■

اگلے روز منیارڈ حسبِ وعدہ ساڑھے چھ بجے ایئرپورٹ پر پہنچ گیا۔ جوسٹائن بھی اُس کے ہمراہ تھا۔ وہاں سے پتہ چلا کہ آج کوئی بھی مسافر بردار طیّارہ کیکاڈس نہیں جا رہا۔ منیارڈ نے واپس نیویارک جانے کا فیصلہ کرلیا اور اپنے بیٹے کو بھی اُس سے آگاہ کر دیا۔ ابھی وہ کچھ ہی دُور چلے تھے کہ پیچھے سے کسی نے آواز دی۔ وہ ایک درمیانی عمر کا شخص تھا اور کتنی ہی دیر سے بنچ پر بیٹھا اُنہیں دیکھ رہا تھا۔ اُس نے اپنا تعارف کراتے ہُوئے کہا: "میرا نام وُائٹی ہے اور ایک طیّارے میں کچھ سامان لے کر کیکاڈس جا رہا ہُوں۔ اگر آپ چاہیں تو آپ کو اپنے ساتھ لے جاسکتا ہُوں۔" اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ وہ ایک خوش اخلاق

اور خوش گفتار شخص تھا۔ تقریباً آدھ گھنٹے بعد وہ اُس کے ہمراہ کیکاؤس کی طرف پرواز کر رہے تھے۔ اُن کا سفر نہایت خوشگوار اور پُرلطف رہا۔ کیکاؤس کے چھوٹے سے ہوائی اڈّے پر اُترنے کے بعد وہ جزیرے کے کمشنر 'پیس میک' سے ملنے چل دیے۔ پائلٹ وائٹی نے مژدہ سُنایا تھا کہ وہ تین گھنٹے آرام سے گھوم پھر سکتے ہیں۔ وہ جزیرے کے ماحول سے لطف اندوز ہونے کے لیے پیدل ہی چل کھڑے ہُوئے اور آدھ گھنٹے بعد کمشنر کے دفتر میں داخل ہُوئے۔ منیارڈ نے ہفت روزہ 'ٹوڈے' کے سب ایڈیٹر کی حیثیت سے اپنا تعارف کراتے ہُوئے کہا کہ اُس کا اصل مقصد اُن واقعات کا سُراغ لگانا ہے جن میں پُراسرار طور پر کشتیاں اور کشتی ران غائب ہو رہے ہیں۔ کمشنر نے کہا: "یہ آپ لوگوں کا معاملہ ہے۔ ہمارے پاس نہ تو اتنے وسائل ہیں اور نہ اتنا وقت کہ اس معاملے کی تحقیق کرتے پھریں۔" باتیں کرتے کرتے وہ دفتر سے باہر نکل آئے اور قریب ہی ایک ساحلی کلب میں جا بیٹھے۔ منیارڈ نے مہمان کے بجائے میزبان کا کردار ادا کرنا پسند کیا اور خود کھانا منگوایا۔ جوسٹائن نے چھوٹی کشتی پر ساحل کی سیر کرنے کی فرمائش کی۔ منیارڈ نے اُسے کشتی کرائے پر لے دی اور تاکید کر دی کہ زیادہ دُور نہ جائے۔ وہ کشتی پا کر بہت خوش ہُوا اور پیڈل چلاتا ہُوا اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔ کمشنر اور منیارڈ پھر باہمی دلچسپی کے موضوعات پر گفتگو کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد جوسٹائن واپس آتا دکھائی دیا۔ اُس کے چہرے سے لگتا تھا کہ وہ کوئی خبر لے کر آ رہا ہے۔ اُس نے آ کر بتایا کہ آدھ فرلانگ کے فاصلے پر ریت کے اندر ایک کشتی کا ڈھانچہ دبا پڑا ہے۔

کمشنر نے ویٹرس کو بُلایا اور اس ڈھانچے کے بارے میں پُوچھا۔ ویٹرس نے حیرت کا اظہار کرتے ہُوئے کہا کہ اُس طرف بہت کم لوگ جاتے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سمندر میں پانی چڑھنے کی وجہ سے کشتی پہلے نظر نہ آئی ہو۔

منیارڈ نے اُسی وقت کشتی دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ وہ تینوں ساحل کے ساتھ ساتھ چلتے ہُوئے جوسٹائن کی بتائی ہُوئی جگہ پر پہنچے۔ واقعی کشتی کا ایک حصّہ ریت سے باہر نکلا ہُوا نظر آ رہا تھا۔ کشتی اپنے پہلو کی طرف اُلٹی ہوئی تھی اور اُس کا اگلا حصّہ ریت میں دبا ہُوا تھا۔ اُنہوں نے ہاتھوں سے ریت ہٹانا شروع کی۔ یہ پچّیس تیس فٹ لمبی ایک جدید طرز کی مچھلیاں پکڑنے والی کشتی تھی۔ سامنے کے حصّے سے تختے ٹوٹے ہُوئے تھے۔ یُوں لگتا تھا جیسے کشتی کو جان بُوجھ کر ڈبونے کی کوشش کی گئی ہو۔ مختلف جگہوں پر ہتھوڑے کی ضربات بھی نظر آ رہی تھیں۔ اسٹیئرنگ وہیل غائب تھا۔ اسٹیل اور پیتل کی تمام فٹنگ بھی اُتار لی گئی تھی۔ منیارڈ کو ایک جگہ اُبھار سا نظر آیا۔ اُس نے ہاتھ پھیر کر دیکھا۔ یہ لوہے کی کوئی چیز تھی جو لکڑی میں دھنسی ہُوئی تھی۔ جوسٹائن نے اپنا جیبی چاقو نکالا اور اُس چیز کے اردگرد لکڑی کھودنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد لوہے کی ایک چھوٹی سی گولی اُس کے ہاتھ میں تھی۔ منیارڈ نے اس گولہ نما چیز کو اپنی ہتھیلی پر رکھ کر غور سے دیکھا۔ کمشنر بھی تجسّس سے اسے دیکھ رہا تھا۔ منیارڈ کے چہرے پر اُلجھن کے آثار نمایاں تھے۔ اُس نے ایک لمبا سانس لیتے ہُوئے کہا: "یُوں لگتا ہے جیسے کشتی پر کسی قدیم طرز کے پستول سے فائر کیا گیا ہو۔ یہ اٹھارھویں صدی کے پستول میں استعمال ہونے والی گولی ہے۔" وہ تینوں باتیں کرتے ہُوئے واپس ہوٹل کی طرف چل دیے۔

وہاں سے ایئرپورٹ آئے۔ جہاز اُن کے انتظار ہی میں تھا۔ اُن کے سوار ہوتے ہی وہ میامی کی طرف پرواز کرنے لگا۔ پائلٹ وائٹی طیّارے کو خود کار اُڑان پر سیٹ کر کے اُونگھنے لگا۔

راستے میں اُنہیں نیو بیئرڈ کے جزیرے پر چند منٹ کے لیے رُکنا تھا لیکن یہاں پر طیّارہ ایسا اُترا کہ پھر پرواز ہی نہ کر سکا۔ تکنیک کار دو گھنٹے نقص دُور کرنے میں لگے

رہے۔ آخر کار انہوں نے اعلان کیا کہ وہیل سسٹم میں خرابی پیدا ہوگئی ہے اور وہ طیّارہ پرسوں سے پہلے پرواز نہ کر سکے گا۔ منیارڈ نے فوری طور پر کوئی دوسرا طیّارہ چارٹر کرنے کی کوشش کی۔ پتہ چلا کہ صبح سے پہلے کوئی ہوائی جہاز میسّر نہ آسکے گا۔ انہوں نے ایک مقامی ہوٹل میں رات گزارنے کا فیصلہ کیا۔ اسی ہوٹل کی بالکونی میں منیارڈ کی ملاقات ایک مقامی باشندے 'ونڈسر' سے ہوگئی۔ وہ یہاں کرایے پر کشتیاں دینے کا کاروبار کرتا تھا۔ اُس کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی۔ وہ ان جزائر کی معاشی اور سیاسی حالت پر دیر تک گفتگو کرتا رہا۔ رخصت ہوتے وقت اُس نے منیارڈ کو اپنا پتہ دیتے ہُوئے گھر آنے کی دعوت دی۔

دوسرے روز بھی طیّارے کا کوئی انتظام نہ ہوسکا۔ منیارڈ کے اندر مُہم جُوئی کا شوق پھر سر اُٹھانے لگا۔ وہ اب تک کئی بار اُس لوہے کی گولی کا معاینہ کرچکا تھا۔ قدیم اشیا اور خاص طور پر اسلحے سے اُسے بہت دلچسپی تھی۔ اُس نے 'ونڈسر' کے ہاں جانے کی ٹھان لی۔ ونڈسر کا گھر جزیرے کی شمالی جانب گھنے سرسبز علاقے میں تھا۔ ایک ٹوٹی پھوٹی سڑک درختوں کے درمیان بل کھاتی شمال کی جانب جاتی تھی۔ وہ پیدل ہی اُس پر چل دیے۔ راستے میں ایک شخص نے انہیں روکتے ہُوئے بتایا کہ وہ اس طرح اس علاقے میں داخل نہیں ہو سکتے؛ یہاں زہریلے مچھّر اور کھٹمل کثیر تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ اُس نے پچاس منٹ لیے اور دونوں پر ایک خاص قسم کی دوا کا سپرے کردیا۔ اُس کے کہنے کے مطابق اب وہ مچھّروں وغیرہ سے محفوظ تھے۔

دونوں گھنے درختوں میں سفر کرتے ہُوئے آگے بڑھتے رہے۔ حبس بہت زیادہ تھا اور اُن کے جسموں سے پسینے کی دھاریں بہہ رہی تھیں۔ ونڈسر کا گھر ایک الگ تھلگ جگہ پر واقع تھا۔ کال بیل بجانے پر وہ برآمد ہُوا اور بڑی محبّت سے اندر لے گیا۔ رسمی گفتگو کے بعد منیارڈ نے اپنی آمد کا مقصد بیان کرتے ہُوئے کہا کہ وہ ساحلِ سمندر میں مچھلیاں پکڑنے کے لیے کشتی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ونڈسر نے پہلے تو انہیں اس ارادے سے باز رکھنا چاہا کہ سخت گرمی کی وجہ سے شکار کا ملنا بہت دُشوار ہے۔ منیارڈ نے اصرار کیا تو وہ اپنی کشتی دینے پر رضامند ہوگیا؛ تاہم یہ کہا کہ اس علاقے میں کشتی رانی خطرے سے خالی نہیں اس لیے آپ دُور نہ جائیے اور مجھے ریڈیو کے ذریعے ہر آدھ گھنٹے بعد اطّلاع دیجیے۔

■

ہفت روزہ 'ٹوڈے' کے دفتر میں فون کی گھنٹی بجی۔ منیارڈ کی اسسٹنٹ ڈیانا نے ریسیور اُٹھایا۔ دوسری طرف سے منیارڈ کی بیوی 'ڈیسیون' بول رہی تھی۔ اُس نے بڑے غصّے سے منیارڈ کے بارے میں پوچھا اور کہا کہ اُس کے بچّے کو اسکول جانا ہے اور منیارڈ اُسے اب تک لے کر نہیں آیا۔ اتنی دیر میں ڈیانا کے دوسرے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اُس نے منیارڈ کی بیوی سے سینیئر ایڈیٹر ہلّر سے بات کرنے کے لیے کہا اور وہ دوسرا فون سُننے لگی۔ یہ فون واشنگٹن سے ساحلی محافظ 'فلوریو' کا تھا۔ وہ بھی منیارڈ کے بارے میں پُوچھ رہا تھا۔ ڈیانا نے اُسے بتایا کہ تین روز سے منیارڈ کا کچھ پتہ نہیں۔ پھر اُس نے یہ کال بھی ایڈیٹر ہلّر کی طرف منتقل کردی۔ ریسیور رکھ کر وہ اٹھی اور راہداری میں چلتی ہُوئی ہلّر کے کمرے میں پہنچی۔ ہلّر اُس وقت 'فلوریو' کی کال سُن رہا تھا۔ اُس کے چہرے پر جھلّاہٹ کے آثار نمایاں تھے۔ وہ کہہ رہا تھا: "مسٹر فلوریو! اگر وہ کہیں گیا ہے تو سراسر اپنی ذمّے داری پر گیا ہے۔ مَیں نے اُسے منع کیا تھا لیکن وہ ایک پاگل شخص ہے۔ مَیں اس سلسلے میں کوئی ذمّے داری قبول کرنے کو تیّار نہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اُس کی بیوی بول رہی تھی۔ وہ بھی سخت پریشان تھی۔ مَیں اُس کے لیے کچھ بھی نہیں کرسکتا۔ اُس کی تلاش میں کشتیوں کا بیڑا بھیجنا میرے بس میں نہیں۔" ڈیانا پاس ہی کھڑی ہلّر کی باتیں سُن رہی تھی۔ منیارڈ کی گمشدگی کا سُن کر وہ

سخت پریشان ہو گئی۔ اُس کی آنکھوں میں تشویش کے سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔

بسزی مائل نیلا سمندر دُور دُور تک پھیلا ہُوا تھا اور اُن کی بائیس فٹ لمبی کشتی لہروں پر ہچکولے کھا رہی تھی۔ آسمان صاف تھا اور سُورج کی کرنوں میں کافی تمازت تھی وہ ایک گھنٹے سے یہاں موجود تھے لیکن کوئی مچھلی اُن کے ہاتھ نہ آئی تھی۔ جوسٹائن اب کچھ کچھ بور ہونے لگا تھا۔ منیارڈ نے اُس کی طرف دیکھتے ہُوئے کہا: "اس شکار میں اگر ہر پانچ منٹ بعد ایک مچھلی ہاتھ نہ آئے تو مزا کرکرا ہو جاتا ہے۔" اُس نے اپنے سامنے نیو بیئرڈ کا نقشہ پھیلایا۔ اس پر وضاحت سے جزیرے کی سمندری حدود کی نشاندہی کی گئی تھی۔ منیارڈ نے ایک جگہ اُنگلی رکھتے ہُوئے کہا یہاں پانی بہت گہرا ہے۔ اگر ہم یہاں پہنچ جائیں تو کوئی بڑا شکار ہاتھ آسکتا ہے۔ جوسٹائن نے ٹھنکتے ہُوئے کہا: "تو پھر چلیں نا، ڈیڈ!"

منیارڈ نے کشتی کا انجن اسٹارٹ کیا اور وہ آگے روانہ ہو گئے۔ تقریباً پانچ منٹ بعد اُس نے ایک جگہ کشتی روک دی۔ یہاں پانی میں نیلاہٹ تھی اور سطح پُرسکون۔ منیارڈ نے ریڈیو آن کر کے ونڈسر سے رابطہ قائم کرنا چاہا۔ تھوڑی دیر بعد ونڈسر کی آواز آئی: "ہیلو! میں ونڈسر ہُوں۔ تم کہاں ہو؟ میری دُوربین تمہیں دیکھ نہیں سکتی۔" منیارڈ نے نقشے کی مدد سے اپنی جگہ کی نشاندہی کی۔ ونڈسر کی آواز آئی: "تم بہت دُور نکل گئے ہو۔ میرا خیال ہے تمہیں واپس آ جانا چاہیے۔ اگر ذرا اور آگے نکل گئے تو پھر ریڈیو کام نہیں کرے گا۔ ایسے میں اگر انجن بند ہو گیا تو سخت مشکل پیش آئے گی۔"

"گھبرانے کی بات نہیں۔ ہم آگے نہیں جائیں گے۔" منیارڈ نے کہا اور ریڈیو بند کر دیا۔ اتنی دیر میں جوسٹائن کی چیخ سُنائی دی وہ ایک مچھلی پکڑنے میں کامیاب ہو

دنیا کے مختلف کتب خانوں میں مسلمان اکابرین کے تحریر کردہ تیس لاکھ مخطوطات منتشر اور غیر مربوط حالت میں تحقیق و جستجو کے محتاج ہیں۔ صرف ترکی میں اُن کی تعداد چار لاکھ ہے جبکہ اسپین میں سولہ ہزار قدیم طبّی نسخے دریافت ہُوئے ہیں۔ نیشنل میوزیم میں بارہ ہزار مخطوطات کسی دیکھ بھال کے بغیر تہ خانوں میں پڑے ہیں جبکہ سندھ کی لائبریریوں میں انہیں دیمک چاٹ رہی ہے۔ (ڈاکٹر مہدی حسن۔ تذکارِ حکمت)

گیا تھا اور اُسے بڑی مشکل سے کھینچ کر کشتی میں لے آیا تھا۔ دونوں باپ بیٹا اُلٹ پلٹ کر کے دیکھنے لگے۔ وہ ایک بھاری بھرکم اور خوبصُورت مچھلی تھی۔ منیارڈ نے کہا یہ مچھلی جا کر ممّی کو دکھانا، اُس کا سارا غصّہ کافور ہو جائے گا۔ جوسٹائن کہنے لگا: "ممّی سے زیادہ غصّہ تو پیانو کی ٹیچر کو ہوگا۔ میرا خیال ہے مچھلی اُسے دوں گا اور لوہے کی گولی ممّی کو۔"

دونوں قہقہہ مار کر ہنسنے لگے۔ قریباً ایک گھنٹہ اور وہ اُس جگہ لہروں پر ہچکولے کھاتے رہے۔ اس عرصے میں اُنھوں نے ایک چھوٹی مچھلی اور پکڑی۔ پھر منیارڈ نے ونڈسر کو ریڈیو پر بتایا کہ وہ آدھے گھنٹے تک واپس پہنچ رہے ہیں۔ اُس وقت جب منیارڈ واپسی کے لیے کشتی کا انجن اسٹارٹ کر رہا تھا اچانک اُس نے دُور پانی کی سطح پر کوئی چیز تیرتی دیکھی۔ تجسّس سے مجبور ہو کر وہ رُک گیا۔ وہ شے اُنہی کی طرف آ رہی تھی۔ شاید وہ کوئی شارک مچھلی تھی۔ جب وہ قریب پہنچی تو اُنھوں نے دیکھا کہ یہ ایک درخت کا تنا ہے جسے کشتی کی شکل میں ڈھالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تنے کے ساتھ ساتھ کوئی اور چیز بھی اُن کی سمت آ رہی تھی۔ یہ ایک لڑکی تھی جو ہاتھ ہلا ہلا کر اُنھیں اپنی طرف متوجّہ کر رہی تھی۔ منیارڈ نے سوچا شاید یہ کسی جہاز یا کشتی سے سمندر میں گر

گئی ہے۔ اُس نے فوراً انجن اسٹارٹ کیا اور کشتی کا رُخ لال کی طرف موڑ دیا۔ قریب پہنچ کر اُس نے اپنا ہاتھ اُس کی طرف بڑھایا۔ اُس کی عمر بارہ تیرہ سال ہوگی، وہ بالکل خاموش تھی اور اُس کی آنکھوں میں عجیب طرح کی وحشت نظر آ رہی تھی۔ منیارڈ نے اُسے اُوپر کھینچنا چاہا تو احساس ہُوا کہ لڑکی کا وزن بہت زیادہ ہے، اتنا زیادہ کہ وہ اُسے اُوپر نہیں کھینچ سکتا تھا۔ لڑکی کا بازو منیارڈ کے ہاتھوں سے پھسل گیا . . . اور پھر دفعتاً پانی سے کوئی اور چیز نکلی، ایک ضرب منیارڈ کے سینے پر لگی اور وہ اُلٹ کر کشتی میں جا گرا۔ جب اُس نے اُٹھ کر دیکھا تو ایک بدہیئت شخص کشتی پر سوار ہو رہا تھا۔ اُس کے جسم پر ایک انڈرویر تھا اور تمام جلد پہ کوئی روغن ملا ہُوا تھا۔ اُس کے لمبے لمبے بال ماتھے اور گردن سے چپکے ہُوئے تھے اور اُس کے مُنہ میں ایک بھی دانت نہیں تھا۔ بائیں ہاتھ میں ایک وزنی کلہاڑا تھام رکھا تھا۔ منیارڈ پر مسلسل نگاہ رکھتے ہُوئے اُس نے دایاں بازو نیچے کی طرف بڑھایا۔ منیارڈ نے دیکھا کہ سانولی رنگت کا ایک بارہ تیرہ سالہ لڑکا اُس کا بازو تھام کر اُوپر چڑھ رہا ہے۔ اُس شخص نے اپنا کلہاڑا اُس لڑکے کو تھما دیا اور منیارڈ کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے بھاری بھرکم آواز میں بولا: "ختم کر دو . . . ختم کر دو۔" لڑکے نے منیارڈ کی طرف دیکھا۔ اُس کے ہاتھ کلہاڑے کے دستے پر گردش کر رہے تھے لیکن یُوں لگتا تھا جیسے وہ حملہ کرنے کی اپنے اندر ہمّت نہیں پاتا۔ وہ شخص آگے بڑھا اور اُس نے خنجر سے لڑکے کا چہرہ چھیل ڈالا۔ زخم سے خُون رِسنے لگا۔ وہ شخص غرّایا: "ویسے ہی کرو جیسے تمہیں سکھایا گیا ہے۔" لڑکا ہچکچا کر ایک قدم آگے بڑھا۔

منیارڈ نے قمیص کے اندر ہاتھ ڈالا اور اب اُس کے ہاتھ میں وہی پستول تھا جو اُس نے جوسٹائن کے اصرار پر میامی سے خریدا تھا۔ منیارڈ نے دونوں ہاتھوں سے اُس شخص کے سر کا نشانہ لیا اور مضبوط لہجے میں کہا: "چاقو نیچے پھینک دو۔" اس کے جواب میں اُس شخص نے منیارڈ پر چھلانگ لگا دی۔ ۳۲ء پوائنٹ کی سُبک رفتار گولی اُس کی دائیں آنکھ میں داخل ہو کر بائیں کان سے نکل گئی۔ منیارڈ تک پہنچنے سے پہلے اُس کی رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی لیکن اتنی دیر میں لڑکا اُس پہ حملہ آور ہو چکا تھا۔ منیارڈ اُس کی طرف سے غافل تھا۔ اس لیے اپنا دفاع نہ کر سکا۔ کلہاڑے کا بھرپور وار اُس کے سر پر پڑا اور وہ دُھندلائی ہُوئی نظروں سے جوسٹائن کی طرف دیکھتا ہُوا کشتی میں گر گیا۔ اتنی دیر میں وہ لڑکی بھی کشتی میں چڑھ آئی۔ جوسٹائن نے دیکھا کہ اُس کی گردن کے پچھلے حصّے میں آکسیجن کی ربڑ ٹیوب بندھی ہُوئی ہے۔ ہلاک ہونے والا شخص اور یہ لڑکا اس ٹیوب سے لپٹ کر آکسیجن حاصل کرتے رہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ لڑکی اس قدر بھاری ہو گئی تھی۔ جوسٹائن کو یہ سارا منظر خواب کی طرح دکھائی دیا۔ اُس کے قریب ہی اُس کا باپ بے سُدھ پڑا تھا۔ اُس کے سر کے زخم سے بے تحاشا خون بہہ رہا تھا۔ جوسٹائن نے غیر محسوس طور پر اپنا ہاتھ بڑھاتے ہُوئے ریڈیو آن کر دیا اور سرگوشی میں کہا: "مدد . . . مدد . . . اُنھوں نے ڈیڈی کو مار دیا ہے۔ اب وہ کشتی کو کسی اور طرف لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔" ابھی اُس نے فقرہ مکمّل کیا ہی تھا کہ لڑکا اُس پر جھپٹا۔ اُس کا زوردار مُکّا جوسٹائن کی ٹھوڑی پر پڑا۔ وہ اُلٹے پاؤں اپنے ڈیڈی پر جا گرا۔ لڑکا غُرّایا: "بُھول جاؤ اب مدد کو۔ کوئی مدد یہاں نہیں آئے گی۔" دوسری طرف اُس کی آواز 'ونڈسر' کے کانوں میں گونجی پھر اچانک سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ونڈسر نے ایک لمبا سانس لیا۔ "وہی ہُوا نا دوست! جس کا ڈر تھا۔" اُس کی آنکھوں سے گہرا دُکھ جھانک رہا تھا۔

▪

منیارڈ نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں اور پھر آہستہ سے بند کر لیں۔ وہ قریباً دس منٹ سے اپنے اردگرد کی آوازیں سُن رہا تھا۔ وہ بہت سے افراد تھے۔ تمام کے تمام مرد۔ اُن کے لباس عجیب و غریب تھے۔

کسی نے پینٹ کے اوپر بنیان پہن رکھی تھی، کسی نے
نیکر کے اوپر قمیص زیب تن کر رکھی تھی اور کوئی اوورکوٹ
پہنے ہُوئے تھا اور بہت سوں کے جسم پر صرف لنگوٹیاں
تھیں ۔ وہ چیخ رہے تھے، اُچھل کود رہے تھے اور ایک
بڑے برتن میں سے کوئی مشروب پی رہے تھے ۔ وہ
شاید کسی جزیرے پر تھا، چاروں طرف درخت تھے
اور زمین پر ریت ۔ پھر اُس نے اپنے بازو سخت ہاتھوں
کی گرفت میں محسوس کیے۔ وہ اُسے اُٹھا رہے تھے، پھر
اُنھوں نے اُسے کسی درخت کے ساتھ مضبوطی سے باندھ
دیا ۔ اُس کے سر اور جسم کے مختلف حصّوں سے خُون بہہ رہا
تھا لیکن کسی کو پروا نہ تھی ۔ وہ اپنے حال میں مست تھے۔
منیارڈ عجیب اُلجھن کا شکار تھا۔ اُسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ
وہ کن لوگوں میں گِھرا ہُوا ہے ۔ وہ جنگلی قسم کے تھے اور
نہ مہذّب ۔ کہیں قریب ہی ٹیپ ریکارڈر بج رہا تھا ۔
گانوں کی آوازیں صاف سُنائی دے رہی تھیں ۔ پھر گانے
ختم ہوگئے اور ایک مذہبی دُھن سنائی دینے لگی ۔ دُھن ختم
ہُوئی تو ایک اور آواز گُونجی ۔ کوئی شخص وعظ کرنے کے انداز
میں بول رہا تھا: ”ہر شخص کو صرف ایک بار زندگی ملتی ہے ۔
پھر وہ چلا جاتا ہے، نجانے کہاں ؟“ پھر ایک اور شخص کی
آواز گونجی: ”یہ زمین تمہاری ہے ۔ تم اس زمین کے مالک
ہو، تمہیں مشترکہ کھانا ملے گا، کپڑے ملیں گے اور انصاف
ملے گا اور مال میں سے تمہیں حصّہ ملے گا۔ کھاؤ، پیو اور عیش
کرو ۔“ پھر ایک گھنٹی کی آواز سنائی دی ۔ شور مچاتے ہُوئے
لوگ خاموش ہو گئے ۔

منیارڈ نے آنکھوں کی جِھری میں سے دیکھا کہ تمام افراد
ایک دائرے کی صُورت میں اُس کے گرد جمع ہیں ۔ پھر دائرے
میں راستہ پیدا ہُوا اور تین افراد ریت پر چلتے ہُوئے
اُس کی طرف بڑھے ۔ اُن میں سب سے آگے ایک لمبا
تڑنگا شخص تھا ۔ شاید وہ اُن کا سردار تھا ۔ اُس کے پیچھے ایک
عورت تھی اور پھر ایک مرد ۔ لمبے شخص نے ایک میلی کچیلی
ریشمی قمیص پہن رکھی تھی ۔ اُس کی پتلون کے پائنچے پھٹے
ہُوئے تھے اور پاؤں ننگے تھے ۔ اُس کے کندھوں سے
دو پستول لٹک رہے تھے ۔ عورت نے بڑا ہی قیمتی اور
ماڈرن اسکرٹ پہن رکھا تھا ۔ اُس کے سر پر پُرانے فیشن
کی ٹوپی تھی ۔ عمر تیس برس کے لگ بھگ ہوگی ۔ تیسرا آدمی
عمر رسیدہ تھا ۔ وہ اوورکوٹ پہنے ہُوا تھا ۔ اُس کی پنڈلیاں
ننگی تھیں اور پاؤں میں ربڑ سول کے جُوتے تھے ۔ سردار
نے منیارڈ کے قریب پہنچ کر ایک طمانچہ اُس کے مُنہ پر
دے مارا ۔ منیارڈ نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں ۔ وہ اپنے میلے
دانتوں کی نمائش کرتے ہُوئے بولا: ”مجھے معلوم تھا تم ہوش
میں آ گئے ہو ۔ مرنے سے پہلے آخری بار دُنیا کو اچھی طرح
دیکھ لو ۔“ منیارڈ نے کراہتے ہُوئے پُوچھا: ”آپ لوگ کون
ہیں اور مَیں کہاں ہُوں ؟“ اُس شخص نے قہقہہ لگاتے ہُوئے
جواب دیا: ”تمہیں بتانے میں کوئی حرج نہیں ۔ مرنے والوں
کی آخری خواہش ضرور پُوری کرنی چاہیے ۔ مَیں ’ناؤ‘ ہُوں ۔
یہاں کے رہنے والے مجھے ’اولو نائز‘ کہہ کر پُکارتے ہیں ۔“
منیارڈ ’اولو نائز‘ کے لفظ پر چونک سا گیا ۔ اُس شخص نے
اُس کی کیفیت بھانپتے ہُوئے کہا: ”ہو سکتا ہے تم اولو نائز
کے نام سے واقف ہو ۔ ہاں ... یہ وہی ’اولو نائز‘ ہے
جسے تمہاری تاریخ میں ایک ظالم اور سفّاک سمندری لُٹیرے
کے نام سے یاد کیا گیا ہے ۔ تم لوگ جانتے ہو کہ وہ زندہ
آدمیوں کا کلیجہ نکال کر کھا جایا کرتا تھا ۔ میری طرف دیکھو ،
مَیں اُس کی اولاد میں سے ہُوں ۔ ’اولو نائز‘ نے چارلس
دوم کے زمانے میں یہ ویران جزیرہ آباد کیا تھا ۔ اُس وقت
سے ہم نہایت خاموشی کے ساتھ یہاں آباد چلے آ رہے
ہیں ۔ ’اولو نائز‘ مر چکا ہے لیکن اُس کے بعد کئی اولو نائز
پیدا ہُوئے ہیں ۔ دسواں اولو نائز تمہارے سامنے کھڑا
ہے ۔ اپنے آباؤ اجداد کی روایت پر عمل کرتے ہُوئے
مَیں بھی تھوڑی دیر میں تمہارا کلیجہ کھاؤں گا ... ہا ہا ہا ۔“ اُس
نے درندگی سے بھرپُور قہقہہ لگایا ۔ منیارڈ نے چیختے ہُوئے

کہا: "مَیں زندہ رہنا چاہتا ہُوں تم جو کچھ کہو گے مَیں وہی کچھ کروں گا۔ مَیں مرنا نہیں چاہتا۔"

"نہیں، یہ ناممکن ہے۔" اُس نے سفّاکانہ انداز میں کہا۔ "تم نے ہمارے ایک وفادار آدمی کا خُون کیا ہے۔ ہمارا قانون تمہیں زندہ رہنے کی اجازت نہیں دیتا۔"

منیارڈ کے ذہن میں گزرنے والے تمام واقعات تازہ ہونے لگے۔ پھر اُس کی نگاہوں کے سامنے جوسٹائن کا چہرہ گھُوم گیا۔ وہ چیخا: "میرا بچّہ جوسٹائن کہاں ہے؟"

لمبے تڑنگے شخص نے ہاتھ کا اشارہ کیا، لوگوں کے دائرے میں حرکت پیدا ہُوئی اور وہی لڑکا نمودار ہُوا جس نے کشتی میں منیارڈ پر کلہاڑے سے حملہ کیا تھا۔ اُس کے پیچھے پیچھے جوسٹائن آ رہا تھا۔ اُس کی گردن رسّے سے بندھی تھی جس کا ایک سرا لڑکے کے ہاتھ میں تھا۔ منیارڈ کو دیکھ کر جوسٹائن کی آنکھوں سے لگاتار آنسو بہنے لگے لیکن خلافِ توقع اُس نے چیخنے چلّانے کی کوشش نہیں کی۔ اُس نے سردار کی طرف دیکھتے ہُوئے کہا: "میرے ڈیڈی کو چھوڑ دیں۔" سردار شفقت سے جوسٹائن کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہُوئے بولا: "لڑکے! ہر چیز کا اپنا ایک وقت ہوتا ہے۔ ابھی تم بچّے ہو آہستہ آہستہ سمجھ جاؤ گے۔" پھر اُس نے ساتھ والے لڑکے کو اشارہ کیا، وہ جوسٹائن کی رسّی کھینچتا ہُوا دائرے سے باہر نکل گیا۔ ایک طرف چند بچّے کھڑے تھے، وہ دونوں اُن میں شامل ہو گئے۔ منیارڈ زور زور سے چیخ رہا تھا جوسٹائن... جوسٹائن۔ پھر وہ سردار 'ناؤ' کی طرف دیکھتے ہُوئے بولا: "اِس معصوم نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ مجھے جو جی چاہے سزا دو لیکن اسے چھوڑ دو۔" منیارڈ نے محسوس کیا اُس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہے چلے جا رہے ہیں۔ 'ناؤ' نے ایک بلند قہقہہ لگایا اور کہا: "مَیں اسے کچھ نہیں کہوں گا... مَیں بیوقوف نہیں کہ اپنے ایک سپاہی کو میدانِ جنگ میں بھیجنے سے پہلے ہی اپنے ہاتھوں ختم کر دوں۔ یہ بچّے کل کے سپاہی ہیں۔"

اتنے میں 'ناؤ' کے پیچھے چلنے والی عورت آگے بڑھی۔ وہ اب تک بڑی گہری نظروں سے منیارڈ کو دیکھ رہی تھی۔ وہ 'ناؤ' کی طرف مُڑتے ہُوئے بولی: "او لو نائز! یہ شخص مجھے کسی اعلیٰ خاندان سے لگتا ہے۔ تم جانتے ہو کہ ایک ایسے بچّے کی خواہش رکھتی ہُوں جس کی رگوں میں کسی اعلیٰ نسل کا خُون ہو۔ مَیں اب عمر کی اُن حدوں تک پہنچنے والی ہُوں جہاں میری یہ خواہش ہمیشہ کے لیے دم توڑ جائے گی۔ تم اس شخص کو میرے حوالے کر دو، جُونہی مَیں اس سے بچّہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی، تم اپنے فیصلے پر عمل کرنے میں پُوری طرح آزاد ہو گے۔" پھر وہ آپس میں دھیمے لہجے میں گفتگو کرنے لگے۔ خاصی دیر تک 'ناؤ'، اُس عورت اور ادھیڑ عمر شخص کے درمیان فقروں کا تبادلہ ہوتا رہا۔ 'ناؤ' کی آنکھوں میں اُلجھن کے آثار نظر آ رہے تھے۔ آخر کار اُس نے منیارڈ کی طرف دیکھا اور اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ اسے کھول کر 'بنیتھ' کے حوالے کر دو، اُس کا اشارہ عورت کی طرف تھا۔

عورت نے اُسے اپنے ساتھ لیا اور ایک جھونپڑی کا رُخ کیا۔ یہ جھونپڑی مٹّی اور گھاس کی بنی ہُوئی تھی۔ نیچے ایک چٹائی بچھی ہُوئی تھی۔ منیارڈ اُس پر لیٹ گیا۔ اُس کا جسم زخموں سے چُور تھا۔ عورت نے اُسے مشروب پلایا اور وہ گہری نیند سو گیا۔ پھر کچھ خبر نہ رہی وہ کتنے دن اور کتنی راتیں اس حالت میں رہا۔ کبھی کبھی وہ اُٹھتا، عورت اُسے کھانا کھلاتی، مشروب پلاتی اور وہ گہری نیند سو جاتا۔ آہستہ آہستہ وہ ٹھیک ہونے لگا۔ پانچ چھ روز میں اُس کے سر کا زخم بھی بڑی حد تک مندمل ہو گیا تھا۔ عورت نے اُس کے گلے میں زنجیر ڈال کر ایک آہنی ہُک سے باندھ رکھا تھا۔ خاصے دن گزرنے کے باوجود عورت کا رویّہ انتہائی ہتک آمیز اور ظالمانہ تھا۔ اُس نے اپنی ذات اور اپنے لوگوں کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ ایک دوسرے سے بہت کم بات کرتے تھے۔ منیارڈ

نے کئی بار اُس سے اپنے بیٹے کے بارے میں پوچھا۔ اُس نے یہی جواب دیا مَیں کچھ نہیں جانتی۔ یہاں آ کر منیارڈ کی معلومات میں صرف اتنا اضافہ ہُوا کہ یہ لوگ اردگرد کے سمندر میں قزّاقی کرتے اور کشتیوں کو لوٹ کر روزمرّہ کی ضرورتیں پُوری کرتے ہیں۔ جزیرے کی کُل آبادی چھ سو نفوس پر مشتمل ہے۔ یہ لوگ کھانا پکا کر نہیں کھاتے کیونکہ جزیرے پر آگ جلانا سخت منع ہے۔ آگ کی وجہ سے یہ لوگ اُوپر سے گزرنے والے کسی بھی ہوائی جہاز کو نظر آ سکتے ہیں یا قرب و جوار سے گزرنے والا کوئی جہاز اُن کے بارے میں آگاہ ہو سکتا ہے۔ ان کے آباؤ اجداد نے جو قانون بنائے تھے وہ سختی سے اُن پر عمل کرتے ہیں۔

اس وقت بیتھ اُس سے تھوڑے فاصلے پر بیٹھی کسی جانور کی کھال سے اُس کے لیے پاجامہ تیار کر رہی تھی۔ قریب ہی ایک پلیٹ پڑی تھی، اُس میں کچّی مچھلی اور کسی پرندے کے کچّے انڈے رکھے تھے۔ پہلے پہل تو منیارڈ کو اُنہیں دیکھتے ہی اُبکائی آ جاتی لیکن بھُوک کے ہاتھوں مجبور ہو کر اب وہ سب کچھ کھانے لگا تھا۔

اُس کی ڈاڑھی بڑھی ہُوئی اور بال بکھرے ہُوئے تھے۔ اور بیتھ کی طرح اُس نے بھی اپنے پُورے جسم پر ایک سیاہی مائل روغن ملا ہُوا تھا۔ اس جزیرے کے باسیوں کو یہ روغن ہر قسم کے مچھّروں اور کیڑوں سے محفوظ رکھتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ناڈ بھی ادھر ہی آ دھمکا۔ پستول حسبِ دستور اُس کے کندھوں سے لٹک رہے تھے اور ہاتھ میں ایک کلہاڑا تھا۔ اُس نے بیتھ کو مخاطب کرتے ہُوئے کہا، "اس سے پہلے بھی تم ایک دفعہ ناکام ہو چکی ہو۔ یہ تمہارا دُوسرا اور آخری چانس ہے۔ اگر اس دفعہ بھی بچّہ حاصل نہ ہُوا تو تمہیں دوسری عورتوں کے ساتھ رہنا ہوگا۔"

بیتھ نے بیزاری سے ناڈ کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں خاموش تلخی بھری ہُوئی تھی۔ پھر وہ دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ ناڈ، منیارڈ کی طرف دیکھ کر طنزیہ انداز میں مسکراتا رہا، پھر ایک طرف کو چل دیا۔

اُس کے جانے کے بعد منیارڈ نے بیتھ سے پوچھا: "یہ کیا کہہ رہا تھا؟ دوسری عورتوں میں جانے سے کیا مراد ہے؟"

بیتھ نے ہونٹ سکوڑتے ہُوئے کہا: "دُوسری عورتوں میں جانے کا مطلب ہے کہ مجھے طوائف بن کر رہنا ہوگا۔ یہی اس جزیرے کا اصول ہے۔"

منیارڈ نے اُس کی باتوں سے اندازہ لگایا کہ اُس کی حیثیت جزیرے میں ایک راہبہ یا گوشہ نشین کی سی ہے۔ وہ شاید اس بارے میں کچھ اور پُوچھتا لیکن بیتھ کا مُوڈ خراب ہو گیا تھا اس لیے خاموش رہنا مناسب سمجھا۔ تھوڑی دیر بعد بیتھ اُٹھی، اُس نے منیارڈ کی گردن سے لپٹی ہُوئی زنجیر کے ایک سرا چھت سے لگی ہُوئی ہُک کے اندر سے گزارا اور پھر زنجیر کے دونوں سرے ایک تالے میں پرو کر بند کر دیے۔ پھر اُس نے ٹوکری اُٹھائی اور باہر کا رُخ کیا۔ شاید روغن تیار کرنے کے لیے جڑی بوٹیاں اکٹھی کرنے گئی تھی۔ منیارڈ نے زنجیر میں لگے ہُوئے تالے کو غور سے دیکھا۔ یہ نمبروں والا تالا تھا۔ وہ پچھلے چار دن سے اُس کے نمبر ملانے کی کوشش کر رہا تھا جب بیتھ جھونپڑی میں نہ ہوتی تو وہ فارغ بیٹھا یہی کام کرتا رہتا۔ وہ سینکڑوں نمبر آزما چکا تھا۔ اُس نے اندازہ لگایا کہ یہ ایک طویل کام ہے۔ بیتھ مختصر سے عرصے کے لیے جھونپڑی سے باہر جاتی۔ شاید اصل نمبر ملنے میں کئی مہینے لگ جائیں۔

اچانک منیارڈ کے ذہن میں خیال آیا کہ اس قسم کے تالوں کا ایک ابتدائی نمبر ہوتا ہے۔ جو تالے کے ساتھ کارڈ پر لکھا ہوتا ہے۔ تالے کا خریدار بعد میں اپنی مرضی سے نمبر منتخب کر لیتا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ لوگ ابھی تک ابتدائی نمبر ہی استعمال کر رہے ہوں۔ ابتدائی نمبر بہت آسان سا ہوتا ہے۔ اُس نے ۰۰۰ ملایا ..... اور تالا کُھل گیا۔ منیارڈ کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔

(جاری ہے)

بحری قزاقوں کے درمیان ایک مہم جو صحافی پر بیتنے والے لرزہ خیز واقعات

دی آئی لینڈ کی تلخیص ۔۔۔ دوسری اور آخری قسط

آدم خور جزیرہ

پیٹر بینچلے / طاہر جاوید مغل

منیارڈ
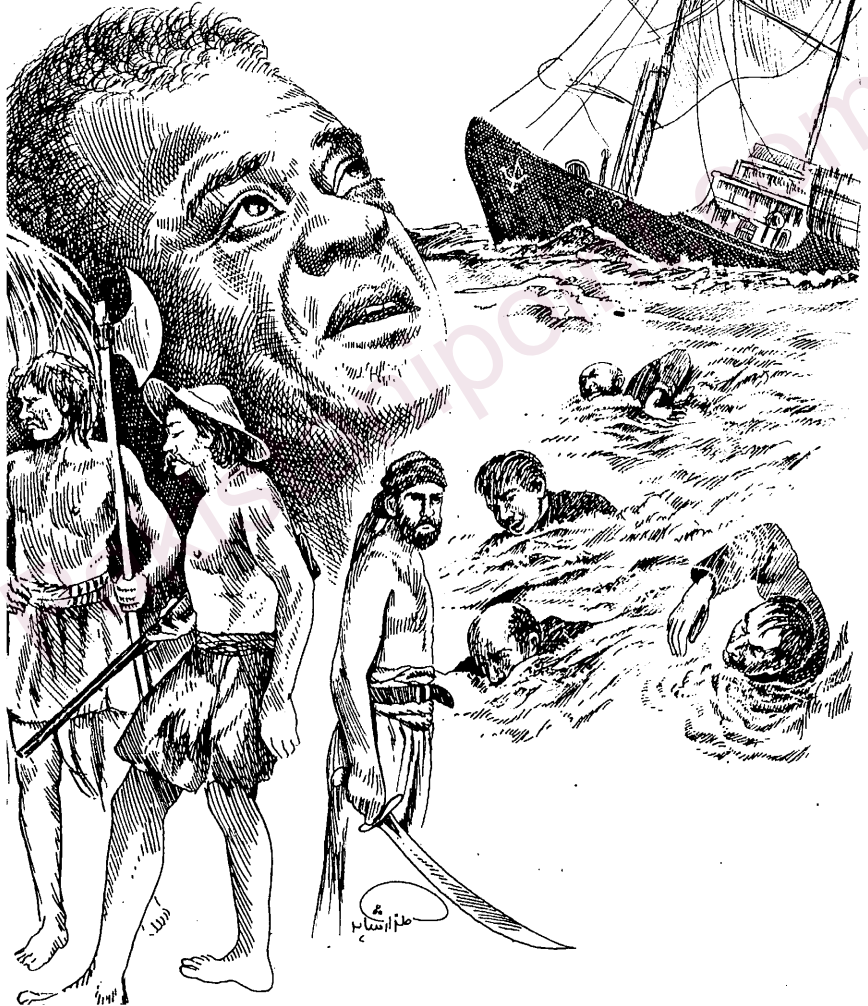
اس غیر متوقع واقعے پر خوشی میں ڈوب گیا مگر اُسے فوراً ہی احساس ہُوا کہ وقت بڑا نازک ہے اور آزادی کا جو یہ لمحہ میسّر آیا ہے اُس کے صحیح استعمال ہی پر اُس کی زندگی کا دارومدار ہے۔ وہ سب سے پہلے زمین پر گھِسٹتا ہُوا جھونپڑی کے اُس کونے تک گیا جہاں اُس کے خیال میں کوئی قیمتی شے دفن تھی۔ اُس نے لکڑی کا تختہ اُٹھایا تو اندر سے سیاہ رنگ کا ایک صندوق نکل آیا۔ وہ نہایت بوسیدہ کاغذات سے بھرا ہُوا تھا۔ اُن کی سیاہی بھی پھیکی پڑ چکی تھی۔ منیارڈ نے اُن کا جائزہ لینا شروع کیا۔ اُسے جو چونکا دینے والی معلومات حاصل ہُوئیں اُن کا لُبِّ لُباب یہ تھا: اس جزیرے پر آباد لوگ بحری ڈاکو تھے۔ اُن کا تذکرہ سترہویں اٹھارہویں صدی کی مستند کتابوں میں بکثرت ملتا ہے۔ ۱۶۸۴ء میں 'ایسکوملنگ' نامی مصنّف نے ان لوگوں کے درمیان رہ کر ایک کتاب لکھّی تھی جس کا نام تھا 'امریکی قزّاق'۔ اس تہلکہ خیز کتاب میں ان لوگوں کے رہن سہن اور حالاتِ زندگی تفصیل سے بیان ہُوئے تھے۔ منیارڈ خود بھی اس کا مطالعہ کر چکا تھا۔ ان پُرانے کاغذات میں اُس کتاب کا اوّلیں ایڈیشن موجود تھا۔ منیارڈ نے اُس کی ورق گردانی شروع کی۔ یہ لوگ دراصل بہت سے علاقوں سے آئے تھے۔

اُن میں ڈاکو، لُٹیرے اور قاتل بھی تھے اور حکومتوں کے باغی اور غلام بھی جو مہذّب دُنیا سے نکل نکل کر یہ لوگ بتدریج ایک جگہ اکٹھے ہونے لگے۔ ابتدا میں اُنہوں نے تورتگا اور ہسپانیولا کو اپنا مسکن بنایا۔ اُن کا بُنیادی ذریعۂ معاش شکار تھا۔ اس کے علاوہ یہ لوگ علاقے میں سفر کرنے والے بحری جہازوں کے ساتھ چھوٹی موٹی تجارت بھی کیا کرتے تھے۔ بعد میں سپین کے بادشاہوں نے فیصلہ کیا کہ صرف سپین کے سرکاری جہاز ہی بیرونی ممالک سے تجارتی لین دین کریں گے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بحری قزّاق بیشتر ضروریاتِ زندگی سے محروم ہو گئے۔ اُنہیں نے صرف شکار پر گزارا کرنا چاہا لیکن کامیاب نہ ہُوئے۔ آخر مجبور ہو کر اُنہوں نے چھینا جھپٹی اور لوٹ مار کا راستہ اختیار کر لیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُن کے حوصلے بڑھتے اور وہ منظّم ہوتے چلے گئے۔ اُن میں شامل ہونے والا ہر فرد اپنا پہلا نام اور پہلی ذات بھول کر نئے کوائف اختیار کر لیتا اور وہ صرف ایک بحری قزّاق ہوتا۔ لوٹ مار کرتے کرتے ایک وقت ایسا آیا کہ سمندر میدانِ کارزار بن گیا۔ ان سمندری لُٹیروں میں سے ایک شخص کا نام جین ناؤ تھا۔ وہ بڑا ہی ظالم اور سفّاک شخص تھا۔ تمام بحری قزّاق اُس کی قیادت میں جمع ہو گئے اور اُنہوں نے سپین کے جہاز رانوں کی نیندیں حرام کر دیں۔ یہ لوگ ہر قسم کے جہازوں پر حملہ آور ہوتے، مال واسباب کے علاوہ عورتیں اور بچّے بھی اُٹھا کر لے جاتے۔ ۱۷۱۴ء کے بعد سپین اور دوسرے کئی ممالک نے مل کر بحری قزّاقوں کو زیر کرنے کی زبردست مُہم شروع کی۔ بحری قزّاقوں کے بڑے بڑے سردار مارے گئے اور بچے کھچے لوگ غلام بنا لیے گئے۔ یُوں بحری قزّاق صفحۂ ہستی سے مٹ گئے ہیں۔ منیارڈ ایک زنجیر سے بندھا ہُوا ایک جھونپڑی میں بیٹھا تھا اور تاریخ کا ایک تاریک گوشہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اُس نے کچھ اوراق اور پلٹے اور اُسے معلوم ہُوا کہ بحری قزّاقوں کو اس جزیرے کا سراغ ۲؍ جولائی ۱۷۱۶ء کو ملا تھا۔ اُنہوں نے اسے اپنی سکونت کے لیے نہایت موزوں پایا۔ کاغذوں میں جزیرے کا محلِّ وقوع بھی ظاہر کیا گیا تھا۔ منیارڈ نے اس نقشے کو دیکھتے ہُوئے اندازہ لگایا کہ جزیرہ، مغربی اور جنوبی کیکاؤس کے درمیان کہیں واقع تھا۔ یہ جگہ تمام فضائی اور بحری راستوں سے ہٹ کر تھی۔ تین سو سال سے بحری قزّاق اس جزیرے پر نہایت خاموشی سے زندگی گزار رہے تھے۔ بیرونی دُنیا سے کوئی اس طرف نہیں آیا تھا اور اگر آیا تھا تو زندہ واپس نہیں گیا تھا۔ منیارڈ نے کچھ اور کاغذات دیکھے جو اس جزیرے کی تاریخ، تہذیب اور معیشت کی مکمل دستاویز تھے۔ منیارڈ پر بہت سے لرزہ خیز انکشافات ہُوئے۔ امریکہ اور قرب و جوار کی بہت سی نامور شخصیّتیں، جو تاریخ کی کتابوں کے مطابق

سمندری حادثات میں ہلاک ہُوئی تھیں یا پُراسرار طور پر گُم ہوگئی تھیں، دراصل بحری قزاقوں کی وحشت کی بھینٹ چڑھی تھیں۔ اُن کا ذکر ان کاغذات میں تفصیل سے موجود تھا۔

منیارڈ کی آنکھوں کے سامنے تاریخ کا ایک نیا باب وا ہو رہا تھا۔ اُس نے سوچا اگر وہ زندہ بچ نکلنے میں کامیاب ہوگیا تو ہفت روزہ ٹُوڈے دُنیا میں تہلکہ مچادے گا۔ اُس نے چند ورق اور پلٹے، ایک جگہ جزیرے کے آئین و قوانین بیان کیے گئے تھے: "ہر شخص وقت کے اولونائز (سردار) کی اطاعت کرے گا۔ نافرمانی سنگین جُرم تصوّر ہوگی۔ جزیرے سے بھاگنے کی کوشش یا بھاگنے والے کی پردہ پوشی ایک ناقابلِ معافی جُرم تصوّر ہوگا۔ بلا اشتعال اپنے گروہ کے کسی فرد پر حملہ کرنے والے کو تیس کوڑے لگائے جائیں گے۔ قتل کرنے والے کو مرتے دم تک کوڑے رسید کیے جاتے رہیں گے۔ کسی کی بیوی پر دست درازی کرنے والے کو گولی مار دی جائے گی اور کسی راست باز عورت پر دست درازی سنگین جُرم تصوّر ہوگی۔"

ان بُنیادی قوانین کے علاوہ بھی کئی ضوابط وضع کیے گئے تھے۔ مثلاً کسی شخص کو ذاتی ریڈیو رکھنے کی اجازت نہ تھی۔ صرف سرکاری طور پر ایک ریڈیو رکھا جاسکتا تھا اور وہ بھی ریسیور کے طور پر۔ ریڈیو سگنل بھیجنا ناقابلِ معافی جُرم تھا۔ ہر قسم کی کرنسی تلف کردی جاتی۔ موٹر بوٹ اور لمبے فاصلے تک سفر کرنے والی کشتیاں لُوٹنے کے بعد سمندر میں ڈبو دی جاتیں۔ پھر ایک اور نوٹ پر منیارڈ کی نظر پڑی۔ یہ ایک نیا کاغذ تھا۔ شاید حال ہی میں کوئی قانون وضع کیا گیا تھا۔ لکھا تھا: "اولونائز نے فیصلہ کیا ہے کہ آج کے بعد جو لوگ بھی پکڑے جائیں گے اُن میں سے تیرہ سال سے زائد عمر کے تمام افراد قتل کردیے جائیں گے اور تیرہ سال عمر تک کے بچّوں کو اپنا رکن بنایا جائے گا۔ اولونائز نے یہ فیصلہ اس بنا پر کیا ہے کہ بڑی عمر کے لوگ پُختہ ذہن کے مالک ہوتے ہیں، جس کے باعث وہ یہاں کے ماحول اور قوانین کو نیک نیّتی سے قبول نہیں کرتے اور انتشار کا سبب بنتے ہیں۔"

منیارڈ بڑی دلچسپی سے اس دستاویز کا مطالعہ کر رہا تھا کہ اُس کی چھٹی حِس نے اُسے اچانک کسی خطرے سے خبردار کیا۔ اُس نے جھونپڑی کے دروازے میں سے جھانکا۔ وہ واپس آرہی تھی۔ اُس نے جلد جلد صندوق مقرّرہ جگہ پر رکھا اور زنجیر پہن کر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ بیتھ نے آکر زنجیر کا تالا کھولا اور اُسے کھینچتے ہُوئے باہر لے آئی اور کہا کہ تم 'ٹیو بارب' سے ملنے جارہے ہو۔ ٹیو بارب تمہارے بیٹے کا نیا نام ہے۔ وہ تم سے ملنا چاہتا ہے لیکن سُنو اب وہ تمہارا بیٹا نہیں رہا اور یہ بھی یاد رکھو کہ یہاں کم سن بچّوں کو خاص عزّت دی جاتی ہے۔ اُس کے سامنے نظریں جُھکائے رکھنا۔

منیارڈ کی آنکھوں میں پدرانہ محبّت کی چمک نظر آنے لگی۔ وہ اُسے لے کر چل دی۔ جگہ جگہ تھوڑی سی زمین کو جھاڑیوں اور سبزے سے صاف کیا گیا تھا۔ ان خالی جگہوں پر جھونپڑیاں نظر آرہی تھیں۔ راستے میں اُنہیں دو آدمی ملے۔ دونوں جوان تھے۔ جزیرے کے دوسرے باسیوں کی طرح اُنھوں نے بھی بے ڈھنگا سا لباس پہن رکھا تھا۔ وہ بیتھ کو دیکھتے ہی کھڑے ہوگئے اور پھر کسی بات پر قہقہہ مار کر ہنس دیے۔ بیتھ نے اُنہیں دیکھ کر زمین پر تھوک دیا۔ پھر اُس نے منیارڈ کی زنجیر کو جھٹکا دیا اور اُسے لے کر آگے بڑھتی چلی گئی۔ تھوڑا آگے چل کر تقریباً پندرہ جھونپڑیاں ایک دائرے کی شکل میں نظر آرہی تھیں۔ اُن کے باہر جزیرے کی طوائفیں بے ڈھنگا سا نیم عریاں لباس پہنے کھڑی تھیں۔ اُنھوں نے بھی بیتھ کو دیکھ کر اُس کا مضحکہ اُڑایا۔ اُن میں سے ایک بڑے انداز سے اِٹھلاتی ہوئی بولی:

"پیاری بیتھ! کب تک جان لڑاؤ گی؟ تم پہلے بھی آزما چکی ہو۔ تم ماں نہیں بن سکو گی۔ تھک ہار کر تمہیں ان ہی جھونپڑیوں میں آنا پڑے گا۔"

بیتھ کے چہرے پر غصّے کے شدید آثار نظر آرہے تھے۔ یُوں لگتا تھا جیسے وہ ابھی اُن پر جھپٹ پڑے گی

لیکن اُس نے اپنے آپ پر ضبط کیا اور منیارڈ کو کھینچتی ہوئی آگے چل دی۔ منیارڈ نے پوچھا:

"بیتھ! تم نے بتایا تھا کہ جزیرے میں بیس عورتیں ایسی ہیں جو طوائفیں نہیں۔ وہ سب کی سب شادی شدہ زندگی گزار رہی ہیں۔ تمہارے کہنے کے مطابق بیس بائیس مرد بھی ایسے ہیں جو غیر شادی شدہ ہیں۔ پھر تم اُن میں سے کسی مرد کے ساتھ شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟"

بیتھ نے کہا:

"شادی شُدہ عورت کے لیے یہاں کا قانون کچھ دوسرے راستے تجویز کرتا ہے۔ یا تو وہ ماں بن جائے یا پھر طوائفوں میں شامل ہو جائے۔ پہلے مَیں نے ایک دوسرے شخص سے بچّہ حاصل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اُسے ایک جرم کی بنا پر پھانسی دے دی گئی۔ اب مجھے طوائف بننے پر مجبور کیا جا رہا تھا لیکن مَیں ماں بننا چاہتی تھی۔ اس دوران میں تم یہاں آ گئے اور مَیں نے 'اولونائز' سے تمہیں مانگ لیا۔ ماں بننے کا اب یہ میرا آخری موقع ہے۔"

وہ باتیں کرتے ہُوئے ایک فرلانگ تک چلتے رہے۔ اب وہ ساحل پر پہنچ گئے تھے۔ لُوٹی ہُوئی کشتیوں کی ایک لمبی قطار کنارے پر نظر آ رہی تھی۔ منیارڈ نے دیکھا۔ دُور ایک لمبا سا شخص اُس کی طرف پُشت کیے کھڑا ہے۔ اُس کے دائیں بائیں دو لڑکے دکھائی دیے۔ بیتھ اور منیارڈ اُن کے قریب پہنچے تب لمبے شخص نے گھُوم کر دیکھا۔ وہ سردار ناؤ تھا۔ اُس کے ہمراہ جوسٹائن اور ایک دوسرا لڑکا تھا۔ یہ وہی تھا جس نے کشتی میں منیارڈ کے سر پر کلہاڑا مارا تھا۔ اس کا نام 'مینوں' تھا۔ پہلے تو منیارڈ نے جوسٹائن کو پہچانا ہی نہیں۔ اُس نے سر پر پٹکا باندھ رکھا تھا اور اس کا لباس بھی بے ڈھنگا سا تھا۔ اُس کے کندھے سے پستول لٹک رہا تھا۔ منیارڈ کا دل چاہا کہ وہ دوڑ کر اُس سے لپٹ جائے لیکن اُس کے گلے میں زنجیر تھی۔ بیتھ نے اُس کی زنجیر کھینچ کر اُسے گھُٹنوں کے بل جُھکنے پر مجبور کر دیا۔ وہ اُس کو ناؤ کی تکریم میں جُھکا رہی تھی۔ ناؤ نے چند منٹ کے لیے دونوں باپ بیٹے کو علحدگی میں گفتگو کرنے کی اجازت دے دی۔ منیارڈ جوسٹائن کو لے کر ایک جھاڑی کے پیچھے آ گیا۔ وقت بہت کم تھا۔ اُس نے مختصر الفاظ میں جوسٹائن کو وہ تمام واقعات بتائے جو اُسے پیش آئے تھے۔ پھر اُس نے جوسٹائن سے اب تک کے حالات کے بارے میں پُوچھا۔ جوسٹائن نے جو کچھ بتایا اُس کا لُبِّ لُباب یہ تھا:

"یہ لوگ اُسے ایک جنگجو سپاہی بنانا چاہتے ہیں۔ اُس کو نشانہ بازی اور لڑائی بھِڑائی کی تربیت دی جا رہی ہے۔ ان لوگوں کے پاس بندوقیں اور شاٹ گنیں تو بے شمار ہیں لیکن گولیاں اور کارتوس بہت کم۔ ڈاکہ زنی میں بھی زیادہ تر کلہاڑے، خنجر وغیرہ استعمال ہوتے ہیں۔"

اتنے میں ناؤ کی آواز آئی وہ جوسٹائن کو بُلا رہا تھا۔ منیارڈ نے اُس کو جلد جلد سمجھایا کہ وہ کسی قسم کا خطرہ مول نہ لے اور خاموشی سے حالات کے رُخ پر چلتا رہے۔ یہ بھی سمجھایا کہ وہ پستول کی چند گولیاں چُھپا کر کہیں رکھ دے۔ ہو سکتا ہے کسی وقت کام آئیں۔ اُس نے جوسٹائن کو تسلّی دی کہ وہ جلد ہی یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ ڈھونڈ لے گا۔ ناؤ نے جوسٹائن کو ایک اور آواز دی۔ وہ دوڑتا ہُوا اُس کے پاس جا پہنچا۔ وہ تینوں ایک جانب چل دیے۔ منیارڈ دُور تک اُن کو جاتا دیکھتا رہا، پھر وہ چونک پڑا۔ بیتھ اُس کی زنجیر کھینچ کر اُسے اُٹھنے کا کہہ رہی تھی۔

■

اگلی رات کا ذکر ہے، جب بیتھ گہری نیند سو گئی اور اُس کی گہری سانسوں کی آواز منیارڈ کے کانوں تک پہنچنے لگی تو اُس نے نمبروں والا تالا کھول کر خود کو زنجیر سے آزاد کیا اور دبے پاؤں باہر نکل آیا۔ اُس کا رُخ ساحل کی طرف تھا۔ وہ کشتیوں کی جانب جا نہیں سکتا تھا کیونکہ وہاں ہر وقت محافظ

موجود رہتے تھے۔ اُس کا پروگرام تھا کہ کسی چیز کے سہارے تیرتا ہُوا جزیرے سے دُور نکل جائے۔ اُسے اُمّید تھی کہ موافق لہریں مل جائیں گی اور صُبح ہونے تک وہ خاصی دُور نکل جائے گا۔ اُس نے جوسٹائن کو ڈھونڈنے یا اُسے چھڑانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ اس بارے میں اُس نے بہت سوچا تھا اُسے پورا یقین تھا کہ وہ لوگ اُس کے فرار کے نتیجے میں جوسٹائن کو گزند نہیں پہنچائیں گے اور اگر وہ کل شام تک بیرونی دُنیا سے رابطہ قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا تو پرسوں سُورج نکلنے سے پہلے یہ جزیرہ شیطانی قوتوں سے آزاد ہو جائے گا۔ ساحل سے کوئی دس گز کے فاصلے پر حسبِ توقّع اُسے درخت کا ایک کٹا ہُوا چھوٹا سا تنا مل گیا۔ تھوڑی سی جدّوجہد کے بعد وہ تنے کو پانی میں لے آیا۔ اُس نے لکڑی بغل میں دبائی اور آہستہ آہستہ ساحل سے دُور ہٹنے لگا۔ لیکن جلد ہی اُس کو احساس ہُوا کہ اُس کی ٹانگوں کے ساتھ کوئی چیز لپٹ رہی ہے۔ اُس نے اپنی ٹانگیں چھڑانا چاہیں کراتنے میں اُس کے ہاتھ کسی زندہ چیز سے ٹکرائے۔ پھر اُسے اپنے بازو پر بھی ایسی ہی گرفت محسوس ہُوئی۔ اُس نے بازو پانی سے باہر نکالا۔ "اوہ میرے خدا!" اُس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ آکٹوپس کی طرز کا ایک کریہہ صورت آبی جانور اُس کے بازو سے لپٹا ہُوا تھا۔ پھر اُسے اپنی ٹانگ میں شدید قسم کی ٹیس محسوس ہُوئی۔ آبی جانور نے اُس کی پنڈلی پر اپنا ڈنک آزمایا تھا۔ اُس کے حلق سے ایک خوفناک چیخ نکلی۔ ساحل پر کھڑا ہُوا ایک شخص بلند آواز میں قہقہے لگا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد تین آدمی اُسے اُٹھائے ہُوئے بیتھ کی جھونپڑی میں داخل ہُوئے ـــــ منیارڈ کی ٹانگ نیلی ہو رہی تھی اور وہ بُری طرح تڑپ رہا تھا۔

■

دوسری طرف منیارڈ اور جوسٹائن کو ڈھونڈنے کی کوششیں جاری تھیں۔ اس ضمن میں ڈیانا بہت فعّال کردار ادا کر رہی تھی۔ صُبح سے شام تک وہ بے حد مصروف رہتی تھی۔ اس وقت وہ ایڈیٹر ہلمر کو مجبور کر رہی تھی کہ وہ دفتر کے خرچ پر ایک طیّارہ کرائے پر حاصل کرے اور مختلف جزائر کے اُوپر پرواز کر کے منیارڈ کو ڈھونڈنے کی کوشش کی جائے وہ اس طرح ہلمر کے پیچھے پڑ گئی تھی کہ اُسے اپنی جان چھڑانا مشکل نظر آ رہی تھی۔ منیارڈ کی بیوی بھی اُسے ڈھونڈنے کی تگ و دو کر رہی تھی لیکن اُس کا انداز دوسرا تھا۔ اُس نے پولیس میں رپورٹ درج کروائی تھی کہ منیارڈ اُس کے بچّے کو اغوا کر کے لے گیا ہے۔

■

جزیرے کی معاشی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ 'ناؤ' اور سرکردہ افراد کا ایک گروہ صُبح سویرے 'شکار' کی تلاش میں نکل جاتا اور شام کو عموماً خالی ہاتھ واپس آ جاتا ــــ ایک دوبار اُنہوں نے مایوسی کی حالت میں کسی قریبی جزیرے کے ماہی گیروں پر بھی حملہ کیا تھا لیکن حاصل کچھ نہ ہُوا۔ ضروری اشیا کی قلّت کے پیشِ نظر 'ناؤ' نے چند روز کے لیے راشننگ کا نظام قائم کیا جس سے ایک طبقے میں بغاوت کا اندیشہ لاحق ہو گیا۔ مجبوراً یہ فیصلہ واپس لینا پڑا۔ منیارڈ کی ٹانگ اب ٹھیک ہو گئی تھی۔ بیتھ نے بتایا تھا کہ جزیرے کے اردگرد آکٹوپس کے ہم نسل آبی جانوروں کی بہتات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کشتی کے بغیر کوئی سمندر میں اُترنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ بیتھ اپنے بچّے کے بارے میں بہت محتاط تھی اور ہر وقت منیارڈ سے اس بارے میں سوالات کرتی رہتی تھی منیارڈ نے اندازہ لگا لیا تھا کہ بیتھ ضرور کسی اعلیٰ خاندان کی فرد رہی ہے اور اُسے بچپن میں اغوا کر لیا گیا ہو گا اور اب اپنے ماضی سے وہ بالکل لاعلم تھی لیکن اُس کی رگوں میں دوڑتا ہُوا خون اُسے مہذّب اور شریفانہ زندگی گزارنے پر اُکسا رہا تھا۔ منیارڈ نے ایک دفعہ اُسے اعتماد میں لے کر فرار ہونے کی بات چھیڑی۔ وہ مشتعل ہو گئی۔ منیارڈ نے محسوس کیا کہ بیرونی دُنیا کے بارے میں ایک انجانا سا خوف اُس کے ذہن پر مسلط ہو چکا ہے۔ شب و روز

ایک بیزار کن کیفیت میں گزر رہے تھے۔ ایک اُکتا دینے والا تسلسل تھا۔ بیتھ اُس کی بہت نگہداشت کرتی تھی اور اُس کے آرام کا خیال رکھتی لیکن اس میں دلی لگاؤ کو دخل نہ تھا۔ وہ یہ سب کچھ 'ماں' بننے کے لیے کر رہی تھی۔

فارغ وقت میں منیارڈ فرار کے منصوبے بناتا رہتا۔ اس بار وہ بہت سوچ سمجھ کر کوئی قدم اُٹھانا چاہتا تھا۔ اُس کے ذہن میں ایک منصوبہ یہ بھی تھا کہ کسی وقت 'ناؤ' کی جھونپڑی میں داخل ہونے کی کوشش کی جائے جہاں ریڈیو ٹرانسمیٹر موجود تھا۔ اس بات کا پتہ اُسے صندوق سے ملنے والے کاغذوں سے چلا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ اگر ریڈیو کے ذریعے ایس او ایس کا سگنل نشر کیا جائے تو ہو سکتا ہے ارد گرد کے سمندر میں کوئی جہاز وہ پیغام سُن لے۔

کبھی کبھی اُسے خیال آتا شاید کوئی اُسے ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر وہ خود ہی اس خیال کو رد کر دیتا۔ اپنے حلقے میں وہ ایسا اہم آدمی نہیں تھا کہ اُس کی تلاش میں رات دن ایک کر دیے جاتے۔ ہو سکتا ہے ایڈیٹر ہلر چند روز پریشان رہا ہو اور پھر کسی اور کو ملازم رکھ لیا ہو۔ اُمّید کی ایک مدّھم سی کرن اُسے ڈیانا کی صورت میں دکھائی دیتی تھی۔ اُس کا شفیق اور پُر خلوص چہرہ منیارڈ کی نگاہوں میں گھوم جاتا۔ وہ سوچتا ڈیانا ضرور اُس کے لیے کوشش کر رہی ہو گی لیکن اس بات کا کیا امکان تھا کہ ان کوششوں کے رنگ لانے تک وہ زندہ رہے گا۔

منیارڈ کی بے حد منّت سماجت کے بعد بیتھ نے ایک دو بار اُسے جوسٹائن کی شکل دکھائی تھی ـــــ اور وہ بھی دُور سے۔ ہر روز شام کے وقت بیتھ اُسے ساحل پر لے جاتی، اُسے نہلاتی، کھانا کھلاتی اور ایک دو گھنٹے کے لیے چہل قدمی کراتی تھی۔ ایک شام منیارڈ نے 'ناؤ' کو تنہا ایک پتھّر پر بیٹھے دیکھا۔ وہ اپنے اُن جوانوں کا انتظار کر رہا تھا جو شکار کی تلاش میں نکلے ہُوئے تھے۔ بیتھ اُس کی زنجیر کھینچتی ہُوئی 'ناؤ' کے قریب سے گزرنے لگی تو منیارڈ رُک گیا۔ 'ناؤ' اُس کی طرف دیکھ کر مُسکرا دیا: "تمہاری زندگی کے اب تھوڑے دن باقی رہ گئے ہیں، منیارڈ! جی بھر کر گھوم پھر لو۔"

منیارڈ نے اُس کی دھمکی نظر انداز کرتے ہُوئے پُوچھا:

"ناؤ! جن آدمیوں کا تم انتظار کر رہے ہو اگر وہ واپس نہ آئے تو پھر؟"

ناؤ مُسکراتے ہُوئے بولا:

"کیوں واپس نہیں آئیں گے؟ اس جزیرے میں تمہاری عمر کے چند ہی بے وقوف ہوں گے جو یہاں سے فرار ہونا چاہتے ہوں ـــــ لیکن اُن کے لیے یہ ممکن ہی نہیں۔ آبادی کا بڑا حصّہ امن و سکون کی زندگی گزار رہا ہے۔ لوگ جانتے ہیں کہ باہر کی دُنیا کس قدر وحشت ناک ہے۔ عیّاری، دھوکے بازی، بُھوک اور بدامنی۔ وہ تمہاری دُنیا کے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں۔ یہ جزیرہ اُن کے لیے گوشۂ عافیت ہے۔"

منیارڈ نے پوچھا: "تمہارے بعد کون جانشین ہو گا؟"

ناؤ مُسکرایا: "مَیں تمہارے سوالوں کا جواب اس لیے دے رہا ہُوں کہ تمہاری زندگی مختصر ہے۔ اس لیے تمہیں بتانے میں کوئی حرج نہیں۔ میرے بعد میرا بیٹا جانشین ہو گا۔ وہ میرا حقیقی بیٹا نہیں ہو گا ـــــ حقیقی بیٹا دس برس کی عمر میں ایک لڑائی میں مارا گیا تھا ـــــ اب میرے بیٹے کا کردار تمہارا بیٹا جوسٹائن ادا کرے گا۔"

وہ ایک آنکھ میچ کر بولا: "مَیں جوسٹائن کو لے پالک بنانے کے بارے میں سوچ رہا ہُوں۔"

■

ایک صبح منیارڈ عجیب قسم کا شور سُن کر جاگ اُٹھا۔ کوئی شخص بڑے تسلسل سے نقّارہ پیٹ رہا تھا۔ ذرا دیر بعد بیتھ کی آنکھ بھی کُھل گئی۔ اُس نے نقّارے کی آواز سُن کر منیارڈ کو اپنے ساتھ لیا اور بھاگتی ہُوئی جھونپڑی سے باہر نکل آئی۔ وہ پُر جوش انداز میں بولی:

"کوئی بڑا شکار گھیرے میں آیا ہے۔"

کچھ ہی دیر میں وہ ایک کُھلی جگہ پہنچ گئے۔ سردار 'ناؤ' اور

سفید بالوں والا بوڑھا ایک اونچے مقام پر بیٹھے تھے۔ اُن کے چاروں طرف لوگ ایک گھیرے کی صُورت میں جمع ہو رہے تھے۔ اچانک 'ناؤ' نے ہاتھ کا اشارہ کیا اور نقّارہ خاموش ہوگیا۔ وہ تقریر کرنے کے سے انداز میں بولا:

"بڑی مُدّت بعد ہمارے باہمّت جوانوں کو بہت اچھا شکار ملا ہے۔ ایک چھوٹا جہاز مغرب کی طرف سے سفر کرتا ہُوا ہمارے علاقے میں داخل ہُوا ہے۔ اُس پر لدے ہُوئے سامان کے بارے میں فی الحال ہم کچھ نہیں جانتے۔ اطّلاع کے مطابق اُس پر دو درجن افراد موجود ہیں۔ خیال ہے کہ وہ سب کے سب مسلّح ہیں۔ کوئی اس مُہم پر جانے سے خوفزدہ ہے تو ابھی بتا دے۔"

سب لوگوں نے بلند آواز میں نہیں کہا۔ اُن کے درمیان ایک بہت بڑے برتن میں کوئی نشہ آور مشروب رکھا تھا۔ چھوٹے بڑے سب پیالے بھر بھر کر پی رہے تھے اور قہقہے لگا رہے تھے۔ 'ناؤ' نے پھر کہا:

"قانون کے مطابق جو شخص لڑائی میں پیچھے رہے گا، اُسے اُسی جگہ موت کے گھاٹ اُتار دیا جائے گا۔"

پھر وہ سفید بالوں والے کی طرف دیکھنے لگا۔ سفید بالوں والا اپنی جگہ پر کھڑا ہوگیا۔ سب لوگ اُسے ہزونر کہہ کر بُلاتے تھے۔ ہزونر کا لفظ مذہبی پیشوا کے معنوں میں استعمال کیا جاتا تھا۔ اُس کے کھڑے ہوتے ہی تمام مردوزن نے اپنے سر زمین کی طرف جھکا دیے۔ وہ دُعائیہ انداز میں بولا: "اے میرے آقا! آج کے دن ہماری مدد کر۔ ہماری کشتیوں کو اپنی حفاظت میں رکھ!" تمام لوگوں نے ہم آہنگ ہو کر آمین کہا۔ پھر وہ سب مشروب پر ٹُوٹ پڑے اور پیالے بھر بھر کر پینے لگے۔ بیتھ کے مجبور کرنے پر منیارڈ نے بھی ایک پیالے سے چند گھونٹ لیے۔ اُس کے سینے میں آگ سی بھڑک اُٹھی ــــ اچانک اُس کی نظر جوسٹائن پر جا پڑی۔ وہ اپنے ساتھی لڑکے کے ساتھ مشروب پینے میں مصروف تھا۔ منیارڈ کتنی ہی دیر اُس کی طرف دیکھتا رہا لیکن جوسٹائن اُس کی طرف متوجہ نہیں ہُوا۔ منیارڈ یہ سوچ کر سخت پریشان ہو رہا تھا کہ 'ناؤ' جوسٹائن کو بھی اس حملے میں اپنے ہمراہ لے جائے گا۔

تھوڑی دیر بعد سمندری قزّاقوں کا یہ قافلہ چھ کشتیوں پر سوار ہو کر روانہ ہوگیا۔ ہر کشتی پر چھ افراد سوار تھے۔ 'ناؤ' دونوں لڑکوں جوسٹائن اور مینول کے ساتھ ایک علٰحدہ کشتی میں سوار تھا۔ اُس کے کہنے پر بیتھ بھی منیارڈ کو لے کر ساتھ چل دی تھی۔ وہ دونوں ایک الگ کشتی میں سوار تھے۔ تمام افراد آتشیں اسلحے سے لیس تھے۔ دھوپ بڑی تیز تھی۔ 'ناؤ' کی کشتی سب سے آگے تھی۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک سفر کے بعد اُنہیں جہاز نظر آیا جو بڑا ہی خُوبصُورت تھا۔ اُس کے بادبان کھُلے ہُوئے تھے اور آنے والے لمحوں سے بے خبر وہ بڑی روانی کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ کشتیوں پر موجود تمام افراد حملے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ دوسرے نمبر پر جانے والی کشتی پر ایک لمبا تڑنگا حبشی کمند کے رسّے دُرست کر رہا تھا۔

بدقسمت جہاز اب بہت نزدیک پہنچ چکا تھا ــــ اُس کی لمبائی کم از کم سو فٹ تھی۔ بڑے بڑے سُرخ حرفوں میں 'بریگیڈیر' لکھا ہُوا تھا۔ کشتیاں ایک نیم دائرے کی شکل میں جہاز کو سامنے سے گھیر رہی تھیں۔ قزّاقوں کے چہرے چمک رہے تھے اور نشے میں ڈوبی ہُوئی آنکھیں نہایت خوفناک ہو گئی تھیں۔ جہاز نے کشتیوں کو سامنے سے ہٹانے کے لیے دو تین بار زور سے ہارن بجایا۔ اُسی لمحے بیک وقت دو کمندیں فضا میں بلند ہُوئیں۔ جن میں سے ایک جہاز کے ساتھ اُلجھنے میں کامیاب ہوگئی ــــ لیکن وہ کمند بھی جہاز کی چکنی دیوار سے پھسل گئی اور اُس کے ذریعے اُوپر چڑھنے والا شخص پُرشور آواز سے سمندر میں گر پڑا۔ جہاز اب تیز رفتاری سے کشتیوں کے گھیرے میں سے نکل رہا تھا۔ کنٹرول رُوم میں جہاز کے اسٹیئرنگ وہیل کے سامنے کھڑا ہُوا آدمی صاف نظر آ رہا تھا اور 'ناؤ' اپنی کشتی کے اگلے سرے پر سے دُور مار رائفل سے اُس کا نشانہ لے رہا تھا۔ اُس نے اپنی سانس

روک رکھی تھی اور اُس کی پُوری توجہ نشانے پر مرکوز تھی۔ جہاز کی وجہ سے پانی میں بڑی بڑی لہریں پیدا ہُوئی تھیں اور کشتی برابر اُوپر نیچے ہچکولے کھا رہی تھی۔ 'ناؤ' نے فائر کر دیا۔ گولی نشانے پر لگی۔ کنٹرول رُوم میں نظر آنے والا آدمی اُلٹ کر پیچھے کی طرف گرا۔ اسٹیئرنگ وہیل آزاد ہو کر تیزی سے دائیں جانب گھُومنے لگا۔ حبشی نے اپنی کشتی میں سے ایک چپّو نکالا اور اُس کے ساتھی کشتی کو کھیتے ہُوئے جہاز کے قریب لے گئے۔ اُس نے چپّو بڑی مہارت سے نیزے کے انداز میں پھینکا۔ وہ سیدھا جہاز کی مشینی چرخی میں گھُس گیا۔ کڑکڑاہٹ کی زوردار آواز آئی اور چرخی ساکت ہوگئی۔ چند ہی لمحوں میں جہاز کی رفتار صفر ہوگئی اور وہ پانی پر ہچکولے کھانے لگا۔ کمندیں ایک بار پھر فضا میں بلند ہُوئیں۔ قزّاق چیختے چلّاتے جہاز پر چڑھنے لگے۔ چند لمحے بعد لوگوں کے چیخنے کی آوازیں آئیں پھر ایک دو فائر ہُوئے۔

منیارڈ ساکت و جامد اپنی کشتی پر بیٹھا تھا۔ بیتھ اُسے بھرا ہُوا ریوالور دیتے ہُوئے بولی:

"اُٹھو اور دوسرے لوگوں کے ساتھ شریک ہو جاؤ ورنہ 'ناؤ' تمہیں اسی جگہ گولی مار دے گا۔"

پھر وہ خود بھی کمند کے ساتھ لٹک کر تیزی سے اُوپر چڑھنے لگی۔ منیارڈ نے گلے کی زنجیر گردن کے گرد لپیٹی اور بیتھ کے پیچھے چل دیا۔ ایک چاقو کسی جانب سے ہوا میں اُڑتا ہُوا آیا۔ منیارڈ نے جلدی سے سر نیچے جھُکا لیا۔ چاقو چھپاکے سے پانی میں غائب ہوگیا۔ جہاز کے عرشے پر دو لاشیں نظر آ رہی تھیں۔ ایک اور مسافر شدید زخمی حالت میں جنگلے کے قریب پڑا تھا۔ اچانک منیارڈ نے بائیں طرف دیکھا۔ 'ناؤ' دونوں لڑکوں جوسٹائن اور مینول کو سہارا دے کر عرشے کے اُوپر چڑھا رہا تھا۔ مینول کے ہاتھ میں کوئی نو انچ لمبا تار نظر آ رہا تھا۔ اس تار کے دونوں سروں پر لکڑی کے دو چھوٹے چھوٹے ڈنڈے بندھے ہُوئے تھے۔ منیارڈ کے دیکھتے ہی دیکھتے مینول تیزی سے جہاز کی اندرونی جانب بھاگا۔ پچّیس چھبیس سال کی ایک خوفزدہ خاتون دروازے سے باہر نکل رہی تھی۔ مینول نے چھلانگ لگائی اور عورت کو جا لیا ___ اُس نے ہاتھ میں پکڑے ہُوئے تار کو اُس کی گردن کے گرد ایک بل دیا اور زور لگانے لگا۔ خوفزدہ عورت بالکل مزاحمت نہ کر سکی اور چند ہی لمحے میں تڑپ تڑپ کر ٹھنڈی ہوگئی۔ منیارڈ نے 'ناؤ' کی طرف دیکھا وہ جوسٹائن کو اُنگلی کے اشارے سے کچھ دکھا رہا تھا۔ ایک تیس بتّیس سالہ، لمبے بالوں والا شخص خوفزدگی کے عالم میں بادبان کے رسّے کے سہارے سے اُوپر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ 'ناؤ' کے کہنے پر جوسٹائن نے اپنا پستول والا ہاتھ سیدھا کیا۔ وہ اُس شخص کا نشانہ لے رہا تھا۔ صحیح نشانے کے لیے 'ناؤ' نے بھی ایک ہاتھ سے پستول کو سہارا دے رکھا تھا۔ ہوا میں لٹکتا ہُوا شخص بڑی بے بسی سے اُن کی طرف دیکھ رہا تھا۔ 'ناؤ' کی آواز آئی:

"دباؤ ٹریگر... آہستہ آہستہ دباؤ۔"

فائر ہُوا اور وہ شخص قلابازی کھا کر جہاز کے زیریں عرشے پر جا گرا۔ منیارڈ نے دیکھا جوسٹائن کے چہرے پر عجیب طرح کی خوشی پھیل گئی ہے۔ اتنی دیر میں جہاز کے اندرونی کیبنوں سے لڑائی کی آوازیں آنے لگیں۔ 'ناؤ' جوسٹائن کو اکیلا چھوڑ کر اُس طرف بڑھ گیا۔ منیارڈ بھاگتا ہُوا جوسٹائن کے پاس پہنچا۔ "جوسٹائن!" وہ چیخا لیکن جوسٹائن اُس کی طرف متوجّہ نہیں ہُوا۔ اتنے میں بغلی دروازہ کھُلا اور ایک شخص ایم ۔ ۱۶ کی رائفل لیے کھڑا نظر آیا۔ رائفل کا رُخ جوسٹائن کی طرف تھا۔ منیارڈ کے جسم میں بجلیاں سی کوندیں۔ وہ تیزی سے جھپٹا اور اُس نے کیبن کا دروازہ پُوری طاقت سے بند کر دیا۔ حملہ آور کا بندوق والا بازو دروازے کے اندر آ گیا۔ دو تین گولیاں چھت کو پھاڑتی ہُوئی نکل گئیں اور بندوق اُس کے ہاتھ سے گر پڑی۔ کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر منیارڈ اُس کی چھاتی پر سوار ہوگیا اور اپنی زنجیر سے اُس کی گردن دبا دی۔ پھر وہ سانسیں درست کرتا ہُوا اُٹھا اور جوسٹائن سے مخاطب

ہُوا:

"بس بیٹے، بہت ہو چکا، اب یہ پستول مجھے دے دو۔"

لیکن اُس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب جوسٹائن اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہُوا۔ منیارڈ دیکھ رہا تھا کہ وہ آہستہ آہستہ اپنے پستول کا رُخ اُس کے سر کی طرف کر رہا ہے۔ ایک لمحے کے لیے اُس نے سوچا شاید جوسٹائن مذاق کر رہا ہے لیکن اُس کی آنکھوں میں عجیب طرح کی سنجیدگی تھی۔ تب ایک دھماکے کی آواز سُنائی دی۔ منیارڈ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ گولی اُس کے کندھے کے اُوپر سے گزر گئی تھی۔ جوسٹائن بلند آواز میں ہنس رہا تھا اور تب منیارڈ نے محسوس کیا کہ وہ نشے میں مدہوش ہے۔ "جوسٹائن! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟" منیارڈ چیخا۔ جوسٹائن نے اطمینان سے جواب دیا کہ وہ بالکل ٹھیک ہے لیکن اُس کا نام جوسٹائن نہیں ٹیوبارب ہے۔

منیارڈ نے اُسے اُس کے نئے نام سے پُکارتے ہُوئے یاد دلایا کہ وہ اُس کا باپ ہے۔ جوسٹائن نے بے پروائی سے کہا کہ اُس کا باپ مر چکا ہے۔ منیارڈ نے بڑے کرب سے کہا کہ مرا تو نہیں لیکن شاید اب مر جائے۔ اتنے میں اُسے کسی نے آواز دی اور وہ بھاگتا ہُوا باہر نکل گیا۔ منیارڈ نے محسوس کیا کہ جہاز پر لڑائی ختم ہو چکی ہے۔ اب صرف ناؤ کے آدمیوں کی فاتحانہ آوازیں سُنائی دے رہی تھیں۔

اچانک ان آوازوں کے درمیان منیارڈ کو ایک اور آواز سنائی دی۔ یہ ہوائی جہاز کی آواز تھی۔ وہ جلدی سے عرشے پر آیا۔ سُورج کی طرف ہاتھ کی اوٹ کر کے اُس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ ایک چھوٹا سا جہاز اُن کی طرف آ رہا تھا۔ منیارڈ نے جلدی جلدی چاروں طرف دیکھا۔ وہ کوئی ایسی چیز ڈھونڈھ رہا تھا جسے اشارہ کرنے کے لیے استعمال کیا جا سکے۔ شیشہ یا کوئی چمکدار سکّہ۔ ایک مُردہ شخص کی کلائی پر خوبصورت گھڑی بندھی ہُوئی تھی۔ منیارڈ نے جلدی سے گھڑی اُتاری اور اُسے سُورج کے سامنے ایک خاص زاویے پر رکھ کر حرکت دینے لگا۔

◘

ڈیانا کی شبانہ روز کوششوں سے طیّارے کا انتظام ہو گیا تھا اور اس وقت منیارڈ کی سابقہ بیوی ڈسیون ایک پائلٹ کے ساتھ طیّارے میں موجود تھی۔ دونوں تقریبًا پانچ گھنٹے سے مختلف جزائر کے اُوپر پرواز کر رہے تھے۔ لرکس اور کیکاؤس گروپ کے جزیرے پر اُنھوں نے خاص طور پر توجہ دی تھی۔ ڈسیون کے چہرے پر جھلاّہٹ کے آثار ہویدا تھے۔ وہ اس قسم کی کوششوں کے بارے میں زیادہ پُراُمید نہیں تھی اور واپس چلنے کی سوچ رہی تھی۔ اچانک دُور نیچے اُسے کوئی چیز چمکتی ہُوئی نظر آئی۔ اُس نے غور سے دیکھا یہ ایک چھوٹا سا بحری جہاز تھا۔ یُوں لگ رہا تھا جیسے وہاں سے کوئی شخص سگنل دینے کی کوشش کر رہا ہو۔ اُس نے پائلٹ کو اُدھر چلنے کے لیے کہا۔ طیّارے نے اپنا رُخ تھوڑا سا تبدیل کیا اور بحری جہاز کی طرف پرواز کرنے لگا۔ دوسری طرف منیارڈ عرشے پر کھڑا برابر گھڑی کو حرکت دے رہا تھا۔ دفعتًا اُس کے پیچھے دروازہ زور سے کُھلا۔ اُسے ایک دھکّا لگا اور وہ لُڑھکتا ہُوا فرش پر جا گرا۔ اُسے یُوں محسوس ہُوا جیسے زندگی کی آخری گھڑی آن پہنچی ہو لیکن اُسے کچھ اطمینان ہُوا کہ آنے والے نے اُسے سگنل دیتے ہُوئے نہیں دیکھا تھا۔ وہ صرف دروازے کا پٹ لگنے سے گرا تھا۔ آنے والا ناؤ کا آدمی تھا۔ اُس کے پیچھے ایک اور لحیم شحیم شخص چلا آ رہا تھا۔ دونوں طیّارے کی آمد سے آگاہ ہو چکے تھے۔ اُنھوں نے بڑی پُھرتی سے عرشے پر پڑی ہُوئی دو لاشیں کھینچ کر چھت کے نیچے کر دیں۔ پھر بحری جہاز کے ڈرائیور کی لاش سیدھی کی اور اُس کے سر پر دُھوپ سے بچاؤ کرنے والی چھتری تان دی۔ لحیم شحیم شخص نے منیارڈ کی زنجیر اُس کی گردن کے گرد لپیٹ دی پھر وہ اُس کے گلے میں بازو ڈال کر بڑے دوستانہ انداز میں جنگلے کے قریب بیٹھ گیا۔

"اگر تم نے کوئی حرکت کی تو مَیں گردن توڑ دوں گا۔" وہ

منیارڈ کو دھمکاتے ہُوئے بولا۔

ایلٹی میٹر کے مطابق طیّارے کی بلندی سو فٹ تھی اور وہ مزید نیچے آرہا تھا۔ پائلٹ نے ڈیسیون سے پُوچھا اتنا ٹھیک ہے یا اور نیچے لے آؤں۔ ڈیسیون نے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔ وہ بڑے غور سے جہاز کے عرشے کو دیکھ رہی تھی۔ ایک شخص عرشے پر کسی چیز سے ٹیک لگائے سو رہا تھا۔ دو اور آدمی قریب بیٹھے تھے۔ ایک نے دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈال رکھّی تھیں۔ لگتا تھا وہ نشے میں مدہوش ایک دوسرے پر گرے پڑے ہیں۔ طیّارہ بحری جہاز کے اُوپر سے گزر چُکا تھا۔

جہاز کے عملے میں سے صرف پانچ افراد بچے تھے اور وہ پانچوں جوان تھے، چار مرد اور ایک عورت۔ وہ جہاز کے عرشے پر قطار میں کھڑے تھے۔ جہاز کا سامان کشتیوں پر لادا جا رہا تھا۔ بیتھ اس کام کی نگرانی کر رہی تھی۔ وہ بڑی احتیاط سے ایک ایک چیز دیکھ کر لدوا رہی تھی۔ سامان میں کھانے پینے کی اشیا، کپڑے، اسلحہ اور کچھ فلیش لائٹس شامل تھیں۔ ہر قسم کی مشینری، بجلی سے چلنے والی چیزیں اور ادویات جہاز ہی میں چھوڑ دی گئی تھیں۔ حبشی کے چہرے پر ایک گہرا زخم نظر آرہا تھا۔ اُس نے لڑکی سے دست درازی کی کوشش کی تھی اور اُس نے اُسے کاٹ کھایا تھا۔ ایک شخص آگے بڑھا اور اُس نے 'ناؤ' سے پوچھا۔

"ہم لوگ کہاں ہیں اور تم کون ہو؟"

'ناؤ' نے جواب دیا:

"ہمیں صرف تمہارے سامان سے غرض ہے۔ اس کے بعد ہم تمہیں روانہ کر دیں گے۔"

منیارڈ نے دیکھا کہ چاروں افراد نے ایک دوسرے پر نگاہ ڈالی تو اُن کی آنکھیں مُسکرا رہی تھیں۔ اُسے اُن کی حماقت پر غصّہ آیا۔ وہ اپنے چاروں طرف بکھری ہُوئی لاشیں دیکھ رہے تھے اور پھر بھی سمجھتے تھے کہ بچ کر نکل جائیں گے۔ سفید بالوں والا آدمی آگے بڑھا۔

"تم لوگوں کا سامان کہاں ہے؟" اُس نے ٹھہرے ہُوئے لہجے میں پُوچھا۔ اُن میں سے ایک شخص نے جو لیڈر معلوم ہوتا تھا، آگے بڑھ کر کہا: "کون سا سامان؟ دوست! سارا سامان تو تم لُوٹ چُکے ہو۔"

'ناؤ' نے ایک شخص کو اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھا۔ اُس نے جواب دینے والے کی کلائی مضبوطی سے پکڑ کر بیرونی دیوار کے اُوپر رکھ دی، پھر اُس کا چاقو والا ہاتھ بلند ہُوا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتا، اُس کی اُنگلی ہاتھ سے علیحدہ ہو چُکی تھی۔ انگوٹھے کے ساتھ ایک چھوٹا سا ٹُنڈ نظر آرہا تھا جس میں سے تیزی کے ساتھ خون اُبل رہا تھا۔ زخمی شخص کا چہرہ برف کی طرح سفید ہو گیا۔

"کہاں ہے تمہارا اصل سامان؟" 'ناؤ' دہاڑا۔

پانچوں خاموش تھے۔ 'ناؤ' نے حبشی کو اشارہ کیا۔ وہ لڑکی کی طرف بڑھا۔ لڑکی آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگی۔ وہ بُری طرح چیخ رہی تھی "نہیں... نہیں" حبشی نے ایک زوردار تھپّڑ اُس کے گال پر دے مارا۔ وہ اُلٹے پاؤں جنگلے سے جا ٹکرائی۔

"بتاتی ہُوں۔ بتاتی ہُوں" وہ چیخی۔ "نیچے تہ خانے میں ہے۔" اُس نے تہ خانے کا راستہ بتایا۔ "کس قسم کا سامان ہے؟" 'ناؤ' نے پُوچھا۔ "کوکین... ہم اُسے بیچنے جا رہے تھے۔" لڑکی ہکلائی۔ 'ناؤ' نے منیارڈ کی طرف دیکھا۔ منیارڈ نے اُس کی نظروں کا سوال سمجھتے ہُوئے کہا:

"کوکین ایک قسم کی نشہ آور دوا ہے۔ لوگ اسے سکون حاصل کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔"

لڑکی اب رحم طلب نظروں سے منیارڈ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ شاید اُس کو منیارڈ میں تہذیب کی جھلک دکھائی دی تھی۔ منیارڈ اُسے کیسے بتاتا کہ وہ بھی اُن ہی کی طرح ایک بے بس قیدی ہے۔ لڑکی اُن سب میں سمجھدار نظر آئی تھی اور وہ اپنے گرد موت کے منڈلاتے ہُوئے سائے محسوس کر چُکی تھی۔ اُس نے کہا:

"آپ لوگ ہم سے سودا کر لیں۔ یہ کوکین بے حد قیمتی ہے۔"

ناؤ لڑکی کی بات سمجھ نہیں سکا۔ منیارڈ نے اُس کی ترجمانی کرتے ہُوئے کہا: "وہ کہہ رہی ہے کہ تہ خانے میں جو دوا ہے وہ نہایت قیمتی ہے۔ وہ چاہتی ہے اُن کے ساتھ سودا کر لیا جائے۔" ناؤ نے ایک قہقہہ بلند کیا۔ دوسرے لوگوں نے بھی اُس کا ساتھ دیا۔ وہ بولا:

"یہ ہمارے قبضے میں ہیں، ان کے اسلحے اور جہاز پر بھی ہمارا قبضہ ہے۔ سودا کس بات کا؟"

اتنے میں تین چار افراد کوکین سے بھرے ہُوئے تھیلے اُٹھائے عرشے پر پہنچ گئے۔ ناؤ نے ایک تھیلا پھاڑ ڈالا، پھر سفید رنگ کا سفوف چکّھا۔ منیارڈ نے بتایا اسے سُونگھتے ہیں۔ اُس نے ایک چُٹکی سفوف سُونگھا۔ اُسے کچھ محسوس نہ ہُوا تو وہ بیزاری سے بولا:

"پھینک دو اس کو سمندر میں۔"

اُس کے آدمیوں نے کوکین کے تھیلے سمندر میں پھینکنے شروع کر دیے۔ قیدیوں میں سے ایک چیخا: "یہ کیا کر رہے ہو؟ تمھیں اس کی قیمت کا اندازہ نہیں۔" ناؤ کے آدمی اپنے کام میں لگے رہے۔ اُنھوں نے تمام تھیلے سمندر میں پھینک دیے۔ ناؤ اب اُن پانچوں کی طرف مُڑا: "دوستو! اب سفر کے لیے تیّار ہو جاؤ۔ تم ایک جرائم پیشہ گروہ سے تعلق رکھتے ہو۔ اس کا حساب آگے جا کر ہوگا۔۔۔ ہم تمھارے سفر کو زیادہ دشوار نہیں بنائیں گے۔" اُس نے ہزونر کو اشارہ کیا۔ وہ اپنے سفید بالوں کو سنوارتا ہُوا آگے بڑھا۔ اُس نے ایک طویل مذہبی دُعا پڑھنی شروع کی۔ ناؤ بے چینی سے اپنی جگہ پہلو بدل رہا تھا۔ جب دُعا ختم ہُوئی تو اُس نے حبشی کو اشارہ کیا۔ حبشی خوفناک انداز میں بازو پھیلا کر لڑکی کی طرف بڑھا۔ اُس کی آنکھیں دہشت سے پھٹی ہُوئی تھیں۔ پلک جھپکتے میں اُس نے لڑکی کو دبوچ لیا اور ہاتھ میں پکڑا ہُوا باریک تار اُس کی گردن کے گرد لپیٹ دیا اور پھر ایک ہی جھٹکے میں لڑکی کی گردن ہڈّی تک کٹ گئی۔

ناؤ نے پھر جوسٹائن کو اشارہ کیا۔ وہ اپنا پستول نکالے پُرشوق انداز میں آگے بڑھا۔ اُس نے اُنگلی کٹے ہُوئے شخص کا نشانہ لیا۔ وہ اپنے ہاتھ کو تھامے ہُوئے سکتے کے عالم میں کھڑا تھا۔ جوسٹائن کی گولی نے اُس کی آنکھوں کے عین درمیان سوراخ کر دیا۔ پھر ناؤ آگے بڑھا۔ اُس کا وزنی کلہاڑا تین بار دُھوپ میں چمکا اور تینوں افراد ڈھیر ہو گئے۔ ناؤ نے آسمان کی طرف دیکھا۔ ہوائی جہاز کا دُور دُور تک نام و نشان نہ تھا۔ اُس نے مینول سے کہا:

"جوسٹائن کو ساتھ لے لو اور جہاز کو ڈبو دو۔" مینول نے بڑی فرمانبرداری سے سر جھکایا اور جوسٹائن کو پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہُوئے نیچے اُتر گیا۔ اب وہ سب کے سب اپنی کشتیوں پر آ چکے تھے اور جہاز سے تھوڑے فاصلے پر کھڑے لڑکوں کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔ جہاز پانی پر بالکل ہموار کھڑا تھا۔ تب منیارڈ نے محسوس کیا کہ اُس کا سامنے والا حصّہ دھیرے دھیرے پانی میں غائب ہونے لگا ہے۔ دونوں لڑکے جہاز کے عرشے پر نظر آئے پھر وہ رسّے کی سیڑھی کے ذریعے جلدی جلدی اُترے اور ناؤ کی کشتی میں سوار ہو گئے۔ اب جہاز کا پچھلا حصّہ بھی پانی میں ڈُوبنے لگا تھا۔ جلد ہی وہ تیزی سے نیچے جانے لگا۔ دس منٹ بعد پُورا جہاز ایک طویل گونج کے ساتھ سطحِ آب کے نیچے چلا گیا۔ اب وہاں پانی کے بلبلوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔

■

شام کے جھٹپٹے میں وہ سامان سے لدی ہُوئی کشتیاں لے کر جزیرے کے ساحل پر اُترے۔ منیارڈ اور بیتھ کی کشتی بھی کنارے پر لگی۔ ساتھ ہی ایک اور کشتی کھڑی تھی جو پہلے یہاں موجود نہیں تھی۔ کچھ دُور ایک شخص لینن کا سُوٹ پہنے کھڑا تھا۔ اُس نے اپنی پتلون کے پائنچے چڑھا رکھے تھے۔ اندھیرے کی وجہ سے منیارڈ اُسے پہچان ہی نہ سکا۔ وہ ونڈسر تھا۔ وہی ونڈسر جس کی کشتی پر سوار ہو کر وہ مچھلیاں پکڑنے نکلے

تھے اور اس منحوس جزیرے پر پہنچ گئے تھے۔ وِنڈسر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ناؤ کی جھونپڑی میں داخل ہُوا۔ ناؤ نے اُٹھ کر گرمجوشی سے اُس کا استقبال کیا۔

"کیا لائے ہو اس بار؟" ناؤ نے پوچھا۔

"دو کلو پاؤڈر اور تمہارے جسموں کو صاف کرنے والی دوائی۔"

"بہت خُوب۔" ناؤ نے کہا۔

"شراب کی کمی تو آج ہم نے پُوری کر لی۔ باقی چیزیں تم لے آئے ہو۔"

ناؤ اُسے آج کے ڈاکے کی تفصیلات بتانے لگا۔

اچانک وِنڈسر کی نظر جوسٹائن پر جا پڑی اور اُسے فوراً پہچان گیا۔ اُس نے جوسٹائن کو اپنے پاس بُلایا اور اُس کا حال دریافت کیا۔ پھر اُس کی نگاہ منیارڈ کی طرف چل گئی۔ وہ بیتھ کے ہمراہ کشتی سے اُتر کر جزیرے کی طرف آ رہا تھا۔ وِنڈسر اُس کے پاس گیا اور منیارڈ اُسے دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ وِنڈسر نے حیرانی سے پُوچھا: "تم ابھی تک زندہ ہو... یہ کیسے ممکن ہُوا؟ تم بار بار کے منع کرنے کے باوجود ادھر آ نکلے۔ اب وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

یہ کہتے ہُوئے وہ ناؤ کی جھونپڑی کی طرف واپس چلا گیا۔

بیتھ نے اُس کی زنجیر کھینچی اور وہ آگے چل دیے۔

آہستہ آہستہ جزیرے کی فضا پر کیف و سرور طاری ہو رہا تھا۔ بیتھ اُسے جھونپڑی میں لے آئی۔ تھوڑی دیر بعد اُن کے حصّے کا مال بھی وہاں پہنچ گیا۔ بیتھ کو جزیرے کے قانون کے مطابق خاص اہمیت حاصل تھی۔ لُوٹ مار کے مال میں اُس کا حصّہ بھی عام شرح سے زیادہ تھا۔ اُن کی جھونپڑی خوراک، لباس اور شراب سے بھر گئی۔ بیتھ کا مُوڈ بڑا خوشگوار تھا۔ وہ دونوں سیر کے لیے ساحل کی طرف چل دیے۔ پُورا جزیرہ دادِ عیش دے رہا تھا۔ واپسی پر اُنہیں ناؤ اپنی جھونپڑی کے سامنے بیٹھا دکھائی دیا۔ لوگ اُس کے ساتھ ایک خاص مشروب پی رہے تھے۔

قریب سے ایک نسوانی چیخ سُنائی دی۔ کوئی عورت درد سے بے تاب ہو کر چیخی تھی۔ ناؤ فوراً اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اُس نے دو آدمیوں کو اشارہ کیا اور وہ اُس جھونپڑی کی طرف بڑھے جہاں سے آواز آئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ لمبے تڑنگے وحشی کو لے کر باہر آ گئے۔ ناؤ نے سخت لہجے میں کہا: "جیکی! تمہیں معلوم ہے ہمارے قانون کے مطابق عورت پر تشدّد کرنا جُرم ہے۔" وہ بہانے بناتا رہا۔ اتنے میں عورت ناؤ کے سامنے آ کھڑی ہوئی اور اُس نے کہا: "او لونائز! یہ غلط کہہ رہا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ اس نے مجھے سونے کا ہار دینے کا وعدہ کر رکھا ہے اور اسے ٹالتا رہتا ہے۔ آج میں نے اصرار کیا تو وہ مجھے مارنے پر اُتر آیا۔" ہار کے ذکر پر ناؤ چونک اُٹھا۔ "جیکی! جہاں تک مجھے علم ہے تمہارے پاس کبھی سونے کا ہار نہیں تھا۔ کہاں ہے وہ ہار؟" جیکی کے چہرے پر سراسیمگی پھیلنے لگی۔ ناؤ کے ہاتھ میں اب پستول نظر آ رہا تھا۔ اُس کا رُخ جیکی کی پیشانی کی طرف تھا۔ "میں پُوچھتا ہُوں کہاں ہے وہ ہار؟" جیکی خاموش کھڑا رہا۔ اُس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہو رہے تھے۔ اُس کی ٹانگیں لرز رہی تھیں۔ وہ جانتا تھا اب کیا ہونے والا ہے۔ اُس کا ہاتھ آہستہ آہستہ جیب کی طرف گیا۔ ناؤ نے ہزونر کو اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھا اور اُس نے حبشی کی جیب سے ہار نکال لیا۔ ناؤ نے اُس کا معاینہ کرتے ہُوئے کہا: "تم میرے بچپن کے ساتھی ہو جیکی! لیکن تمہیں خوب معلوم ہے کہ چوری کی سزا کیا ہے۔" اُس کا پستول والا ہاتھ سیدھا ہُوا۔ ہلکا سا دھماکا ہُوا اور جیکی کی دونوں آنکھوں کے درمیان سوراخ ہو گیا۔ وہ مُردہ چھپکلی کی طرح زمین پر جا گرا۔ دو آدمی آگے بڑھے اور اُس کی لاش کو گھسیٹتے ہُوئے ایک طرف لے گئے۔ دھماکے کی آواز سُن کر ڈاکٹر وِنڈسر جھونپڑی سے باہر نکل آیا تھا۔ ناؤ نے اُس کو ساری بات بتا دی۔

شراب کا دور پھر چلنے لگا اور ایک لڑکے اور عورت کے درمیان کُشتی کا سلسلہ چل نکلا۔

منیارڈ، ونڈسر کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ اُس نے دبی آواز میں پُوچھا کہ ان لوگوں سے اُس کا رابطہ کیسے ہُوا۔

ونڈسر نے لڑائی دیکھتے دیکھتے کہا:

"یہ آج سے تیس برس پہلے کی بات ہے۔ سفر میں میری کشتی خراب ہو گئی اور مجھے تیر کر اس جزیرے پر آنا پڑا۔ جزیرے پر اُترنے کے باوجود میں ان کے ہاتھ نہیں آیا۔ میں نے بہت جلد اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ لوگ اجنبیوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے۔ کوئی پندرہ روز اس جزیرے میں چُھپا رہا۔ پھر ایک روز میں نے ایک شخص کو قتل کیا اور اُس کی لاش کے سہارے تیرتا ہُوا ساحل سے دُور نکل گیا۔ راستے میں لاش ایک شارک ہڑپ کر گئی اور میں بغیر سہارے کے تیرتا رہا۔ پھر اس سے پہلے کہ میری ہمّت جواب دے جاتی ایک کشتی نے مجھے دیکھ لیا۔ یُوں میں واپس اپنے شہر چلا گیا۔ لیکن میں نے کسی کو ان لوگوں کے بارے میں نہیں بتایا مجھے ان کا رہن سہن پسند آیا تھا۔ ان کا معاشرہ میرے خوابوں کی تعبیر تھا۔

میں تفریح کے لیے آنے والوں کو کشتیاں فراہم کرتا تھا۔ کبھی کبھی میں خود بھی سمندر میں بہت آگے نکل جاتا۔ میں جزیرے کی طرف سفر کرنے والی لہروں کے دوش پر کچھ تحائف روانہ کرتا رہتا۔ اُن میں الکحل، کھانے کی اشیا اور بعض اوقات زیورات بھی ہوتے تھے۔ مجھے معلوم تھا اُن میں سے بہت سی چیزیں جزیرے کے ساحل پر پہنچ جاتی ہیں۔ ان تحائف کے ساتھ میں پیغامات بھی روانہ کرتا رہتا۔ ان پیغامات کا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ میں دوستی کا خواہاں ہوں۔ آخر کار میری ان طفلانہ کوششوں کا نتیجہ برآمد ہُوا اور اولونائز نے مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ کھلے سمندر میں ہماری ملاقات ہُوئی۔ میں نے اولونائز کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا جو اُس نے قبول کر لیا۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ اولونائز اور اُس کے مشیر یہ سمجھتے تھے کہ اگر انھوں نے زیادہ دیر مجھے نظرانداز کیا تو میں مایُوس ہو کر اُن کا راز فاش کر دوں گا۔"

منیارڈ غور سے اُس کی کہانی سُن رہا تھا کہ اُس کی توجّہ سامنے ہونے والی لڑائی کی طرف مرکوز ہو گئی۔ عورت اور لڑکا لڑ لڑ کر بے حال ہو چُکے تھے۔ دونوں کے لباس تار تار تھے اور جسم کے مختلف حصّوں سے خون نکل رہا تھا۔ پھر اچانک عورت نے ایک داؤ لگایا اور لڑکے کو نیچے گرا دیا اور اپنے دانت پُوری قُوّت سے اُس کے نرخرے میں گاڑ دیے۔ لڑکے کے مُنہ سے ایک دلدوز چیخ نکلی۔ منیارڈ نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑی دیر بعد آنکھیں کھولیں تو عورت فاتحانہ انداز میں میدان کا چکّر لگا رہی تھی اور دو آدمی نیم مُردہ لڑکے کی لاش گھسیٹ کر باہر لے جا رہے تھے۔

تالیوں کی گونج میں ’ناؤ‘ نے اعلان کیا کہ بیتھ ایک اہم انکشاف کرنے والی ہے۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑی ہُوئی۔ اور مُسکراتے ہُوئے بولی:

"ساتھیو! میں منیارڈ کے بچّے کی ماں بننے والی ہُوں۔"

محفل کے شُرکا نے بے پناہ خوشی اور جوش کا اظہار کیا۔ ہنزونر کہہ رہا تھا: "کھاؤ پیو اور عیش کرو۔ صبح ۵ بج کر ۲ منٹ پر تمھیں اگلے سفر پر روانہ کر دیا جائے گا۔"

منیارڈ اگلے سفر کا مطلب بخوبی سمجھتا تھا۔ اُس کے بدن میں سردی کی لہر دوڑ گئی۔ اُس نے چور نظروں سے بیتھ کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے حال میں مگن تھی۔ اُس نے ایک دفعہ بھی منیارڈ کی طرف دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔

دھیرے دھیرے سب سو گئے اور ناؤ بھی اپنی جگہ ٹیک لگا کر خراٹے لینے لگا۔ اب کچھ کرنے کا وقت تھا۔ شاید یہ آخری موقع تھا۔

وہ آہستہ سے اُٹھا۔ کسی شخص کی پتلون لٹک رہی تھی۔

اُس کی پیٹی میں ابھی تک خنجر اُڑسا ہُوا تھا۔ اُس نے خنجر نکال کر ہاتھ میں لیا اور جوسٹائن کے خیمے کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ جانتا تھا دوسرا لڑکا مینول بھی اُس کے ساتھ ہوگا لیکن وہ ہر قسم کے خطرے کا مقابلہ کرنے کو تیار تھا۔ ضرورت پڑنے پر وہ مینول کو بے ہوش یا ہلاک بھی کر سکتا تھا۔ اُس نے جھونپڑی کے دروازے پر کان لگا دیے۔

دونوں لڑکے سو رہے تھے۔ وہ پردہ اُٹھا کر اندر داخل ہُوا۔ اُس نے چاند کی مدّھم روشنی میں جوسٹائن کو پہچان لیا اور آہستہ آہستہ اُس کا بازو ہلایا تو وہ جاگ اُٹھا:

"کون ہو تم؟ کیا بات ہے؟" جوسٹائن بولا۔

"منیارڈ نے سرگوشی کے انداز میں کہا: "مَیں تمہارا ڈیڈی ہُوں ... آہستہ بولو ورنہ یہ لڑکا جاگ جائے گا۔"

"کیا بات ہے؟ کیا کرنے آئے ہو تم یہاں؟" جوسٹائن جان بُوجھ کر اُونچی آواز میں بولنے لگا۔ اتنی دیر میں مینول بیدار ہو گیا۔ یُوں لگتا تھا جیسے وہ ابھی پُوری طرح سویا ہی نہیں تھا۔ وہ اُن کی تمام باتیں سُنتا رہا تھا۔ منیارڈ کو محسوس ہُوا جیسے ابھی جوسٹائن مدد کے لیے چیخنے لگے گا لیکن اُس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب مینول اپنی جگہ سے اُچھلا اور سیدھا جوسٹائن کے اُوپر گر پڑا۔ اُس نے دونوں کو اندھیرے میں گتھم گتھا ہوتے دیکھا۔ چند لمحے بعد مینول، جوسٹائن کے اُوپر سے اُٹھ رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک رسّی تھی۔ شاید اُس نے اس رسّی سے جوسٹائن کی گردن دبا دی تھی۔

"یہ تم نے کیا کر دیا، لڑکے!" منیارڈ نے حیرت سے کہا۔

"کچھ نہیں، تھوڑی دیر کے لیے سو گیا ہے۔ ابھی ہوش میں آجائے گا ... تم اسے فوراً کندھے پر لادو اور میرے پیچھے پیچھے آؤ۔" اُس نے منیارڈ کو کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ منیارڈ، جوسٹائن کو کندھے پر لادے اُس کے پیچھے چل دیا۔ ایک مخصوص راستے پر چلتا ہُوا وہ کھاڑی تک لے آیا۔ دائیں طرف درختوں کے درمیان ایک کشتی موجود تھی۔ منیارڈ نے جوسٹائن کو کشتی میں لٹا دیا۔ وہ لڑکا چپّو لینے کے لیے قریبی جھونپڑی کی طرف دوڑا۔

اب پُوری بات منیارڈ کی سمجھ میں آرہی تھی۔ مینول دراصل جوسٹائن سے رقابت رکھتا تھا۔ جوسٹائن کی آمد سے قبل 'ناؤ' کی نظروں میں اُس کی بہت اہمیت تھی جو اب کم ہو گئی تھی۔ کچھ دن پہلے ناؤ نے جوسٹائن کو مُنہ بولا بیٹا بھی بنا لیا تھا۔ اب یہ خیال کیا جانے لگا تھا کہ جوسٹائن ہی 'ناؤ' کا جانشین بنے گا۔ مینول کے دل میں پیدا ہونے والے حسد کے اس جذبے نے منیارڈ کی مشکل آسان کر دی تھی۔ اب وہ باپ بیٹے کو فرار ہونے کا موقع دے رہا تھا۔

ایک طویل چیخ نے منیارڈ کے خیالات کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ اُس نے دیکھا کہ جوسٹائن کشتی پر کھڑا ہے اور زور زور سے چیخ رہا ہے ... "خطرہ ... خطرہ" پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ جھونپڑیوں کی طرف بھاگ کھڑا ہُوا۔ مینول چپّو لے کر اُس کی طرف آرہا تھا۔ اُس نے جب جوسٹائن کو چیختے دیکھا تو چپّو پھینک کر وہیں سے واپس چلا گیا۔ منیارڈ کے لیے تنہا فرار ہونے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ اُس نے چپّو لیے اور کشتی میں آکر بیٹھ گیا۔ اب وہ پُوری قوّت سے چپّو چلاتا ہُوا ساحل سے دُور ہٹ رہا تھا۔ چاند کی روشنی دُور دُور تک پھیلی ہُوئی تھی اور وہ تیزی سے سمندر کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ اُس نے بادبان کھول دیے کیونکہ ہوا موافق تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد اُسے کسی خرابی کا احساس ہُوا۔ کشتی میں تیزی سے پانی داخل ہو رہا تھا۔ کشتی کے کئی تختے اُکھڑے ہُوئے تھے اور درزوں میں گنّے کی راب بھر دی گئی تھی۔ مینول نے سارے پتّے اپنے ہاتھ میں رکھے تھے۔

منیارڈ نے ایک سرد آہ بھری اور کشتی پر سے پانی میں چھلانگ لگا دی۔ اب وہ تیرتا ہُوا جزیرے کی طرف جا رہا تھا۔

منیارڈ کی اسسٹنٹ ڈیانا اپنی کوششیں جاری رکھّے ہُوئے تھی۔ وہ پچھلے دنوں واشنگٹن گئی اور اُس کی ملاقات سینٹ کے ایک اہم رُکن سے ہُوئی تھی جو منیارڈ کی تحریروں کا زبردست مدّاح تھا۔ اُس نے ڈیانا کو اپنے تعاون کا پُورا پُورا یقین دلایا تھا۔ نتیجے میں ساحلی پولیس حرکت میں آگئی تھی۔ ایک فوجی بجرے میں دس محافظوں کا ایک دستہ فلوریو کی سرکردگی میں روانہ ہُوا۔ اُن کا رُخ کیکاؤس جزائر کی طرف تھا۔

◘

منیارڈ جزیرے کی کھاڑی میں ایک چھوٹے سے گڑھے کے اندر لیٹا ہُوا تھا۔ سپیدۂ سحر نمودار ہوتے ہی اُس نے اپنے اُوپر ریت اور مٹّی ڈالنی شروع کر دی تھی۔ اب صرف اُس کا سر ننگا تھا۔ دُھوپ نکلنے کے ساتھ ہی مچھّروں نے اُس پر یلغار کر دی۔ اُس نے لیٹے لیٹے ہاتھ اُوپر اُٹھایا۔ اُس کے سر پر بیری کی شاخیں جھکی ہُوئی تھیں۔ اُس نے کچھ بیر توڑے، ہاتھوں میں بھینچ کر اُن کی لئی سی بنائی اور مُنہ پر اُس کا لیپ کر لیا۔ اب وہ مچھّروں سے بڑی حد تک محفوظ ہو چکا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اُسے باتیں کرنے کی آواز سُنائی دی۔ ناڈو اپنے ساتھیوں کے ساتھ ساحل پر کھڑا تھا۔ منیارڈ اپنی جگہ پر بالکل ساکت ہو گیا۔ ناڈو کا نائب کہہ رہا تھا:

"اولونائز! ہم نے اُس کا تعاقب کرنے کا ارادہ کر لیا تھا لیکن پھر دیکھتے ہی دیکھتے کشتی پانی میں ڈُوب گئی۔ ہم بڑی دیر یہاں کھڑے رہے لیکن کہیں اُس کے آثار دکھائی نہ دیے۔ ویسے بھی وہ نشے میں تھا۔ میرا خیال ہے وہ کشتی کے ساتھ ہی ڈُوب گیا ہے۔"

ناڈو نے اُسے تلاش کرنے کا حکم دیا۔

جوسٹائن نے اپنا پستول نکال لیا تھا۔ وہ تلاش کے سلسلے میں بڑا پُرجوش نظر آ رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے تمام لوگ اُن ٹیلوں کی طرف چلے گئے جہاں چھوٹے چھوٹے بچّوں کے لیے جھونپڑیاں بنی ہُوئی تھیں۔ جب سب چلے گئے اور کھاڑی خالی ہو گئی تو منیارڈ نے اپنے جسم پر سے ریت ہٹائی اور جھاڑیوں میں رُوپوش ہو گیا۔ تمام لوگ کسی جانور وغیرہ کو ہنکانے کے انداز میں ایک طویل قطار میں آگے بڑھ رہے تھے۔ یہ قطار جزیرے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلی گئی تھی۔ اُن کے ہاتھوں میں چھوٹی تلواریں اور کلہاڑیاں تھیں۔ ناڈو اُونچی آواز میں احکام دے رہا تھا۔ منیارڈ اُن کے آگے آگے بھاگ رہا تھا اور کسی گوشۂ عافیت کی تلاش میں نظریں دوڑا رہا تھا لیکن زمین اُس پر تنگ ہو رہی تھی۔ اُس نے ایک دو جگہیں چھُپنے کے لیے چُنیں لیکن پھر ارادہ بدل دیا۔ اب وہ ساحل کے بالکل نزدیک پہنچ چکے تھے۔ منیارڈ کے گرد گھیرا تنگ ہو رہا تھا۔ اُس نے گھاس کی ایک نلکی نما ڈنڈی توڑ لی تھی۔ آخری قدم کے طور پر اُس نے سوچا تھا کہ پانی میں چھلانگ لگا دے گا اور تہ میں چھُپ کر نلکی کے ذریعے سانس لینے کی کوشش کرے گا۔ اب وہ بالکل کنارے پر پہنچ چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ پانی میں چھلانگ لگاتا، اُسے ہارن سُنائی دیا۔ ہارن دوبارہ وقفے وقفے سے بجایا گیا تھا۔ منیارڈ کے چہرے پر خُون کی سُرخی دوڑ گئی۔ یہ کسی جہاز کی آواز تھی جسے سُنتے ہی اُس کے تعاقب میں آنے والے ٹھٹک کر ٹھہر گئے۔ پھر چند آوازیں آئیں اور سب لوگ کھاڑی میں پہنچ گئے۔ منیارڈ نے ایک چھوٹے سے ٹیلے کی اوٹ سے جہاز کو دیکھا۔ وہ اندازاً تین میل کے فاصلے پر تھا۔ پھر بھی وہ اُسے پہچان گیا۔ وہ ساحلی فورس کا جہاز تھا۔ اُس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تیرنے لگے۔

وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور چیختا چلّاتا ساحل کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگا اور گھنے درختوں میں سے ہوتا ہُوا کھاڑی کی طرف بڑھتا گیا۔ اچانک اُسے ناگوار سی بُو محسوس ہُوئی۔ وہ ٹھٹک کر اُس جگہ رُک گیا۔ کچا گوشت

اور مُردار مچھلیاں کھانے کی وجہ سے جزیرے کے لوگوں
کے جسم سے ناگوار سی بُو اُٹھتی رہتی تھی۔ اُس نے اُچک کر
دیکھا، صرف تین گز کے فاصلے پر ناؤ اور ونڈسر ایک ٹیلے
پر بیٹھے تھے۔ اگر منیارڈ نے ایک قدم بھی اور بڑھایا ہوتا
تو دونوں اُسے دیکھ لیتے۔ ونڈسر، ناؤ کو سمجھا رہا تھا کہ یہ
ایک فوجی جہاز ہے۔ اس پر حملے کا مطلب ہے یونائیٹڈ
سٹیٹس سے براہ راست ٹکر۔ ناؤ اُس کے خدشات جُھٹلا
رہا تھا اور دُوربین کے ذریعے بڑی للچائی ہُوئی نظروں سے
جہاز کو تک رہا تھا۔ منیارڈ نے اُسی سمت میں دیکھا۔
دُھوپ میں جہاز کی دیوار پر ’نیو ہوپ‘ کے الفاظ چمک رہے
تھے۔ اُس کے رُخ سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ جزیرے
سے آدھ میل کے فاصلے سے نکل جائے گا۔ وہ تقریباً
۲۰ ناٹ کی رفتار سے اپنے راستے پر گامزن تھا۔ منیارڈ
حرکت میں آیا۔ اب وہ بڑی احتیاط سے بھاگتا ہُوا اُس
میدان کی طرف جا رہا تھا جہاں رات ناؤ نوش کی محفل جمی
تھی۔ اُس نے وہاں سے رم کی بوتلیں اور کچھ پُرانے
کپڑے جمع کیے۔ مشروب کے بڑے برتن کے نیچے
ابھی تک کوئلے سُلگ رہے تھے۔ عین اُس وقت جب جہاز
اُس کی نظروں سے اوجھل ہونے والا تھا وہ ایک خوفناک
دھماکہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

◘

فلوریو، جہاز کے عرشے پر کھڑا تھا۔ ایک چھوٹی موٹر
بوٹ پانی میں ہچکولے کھا رہی تھی۔ لیفٹیننٹ مولڈ اور
پنکس موٹر بوٹ پر سوار ہو چکے تھے۔ فلوریو نے کہا ایک رائفل
مین کو بھی ساتھ لے جائیں۔ مولڈ نے اپنے ہولسٹر کو تھپتھپاتے
ہُوئے کہا: ”یہ کافی ہے“۔ وہ ایک ویران اور دُور دراز
جزیرہ تھا جہاں سے دھماکے کی آواز آئی تھی۔ ہو سکتا ہے کچھ
لوگ زخمی ہو گئے ہوں ـــــ اور اُنہیں مدد کی ضرورت ہو۔
یہی سوچ کر فلوریو نے یہ موٹر بوٹ جزیرے کی طرف
روانہ کی تھی۔ مولڈ اور پنکس کھاڑی پر پہنچے تو اُنہیں وہاں
دوسری کشتیاں بھی نظر آئیں۔ اُنہوں نے زور زور سے
آوازیں دیں: ”کوئی ہے؟ کوئی ہے؟“ جواب میں مکمل
خاموشی تھی۔ ایک جگہ اُنہیں ’ووڈکا‘ کی ٹوٹی ہوئی بوتل
نظر آئی۔ دونوں متجسّس نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتے
ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ اچانک اُنہیں کسی عورت
کے گانے کی آواز سُنائی دی۔ چھوٹی سی خالی جگہ پر ایک
عورت دھوئے ہُوئے کپڑے ٹہنیوں پر پھیلا رہی تھی۔
اُس نے ایک نہایت قیمتی ریشمی اسکرٹ پہن رکھا تھا اور
چہرے پر کسی سیاہ روغن کا لیپ کر رکھا تھا۔ پنکس نے
اُسے اپنی طرف متوجّہ کیا۔ اُس کی آنکھوں میں غُصّے اور
نفرت کے آثار پائے جاتے تھے۔

”کیا اس جزیرے پر اور لوگ بھی ہیں؟“ مولڈ نے
پُوچھا۔

”ہاں“ عورت نے جواب دیا۔

ارد گرد کی جھاڑیوں میں حرکت پیدا ہُوئی۔ مولڈ اور
پنکس نے دیکھا اُن کے چاروں طرف مسلّح افراد کھڑے
ہیں۔ اُن کے بال بڑھے ہُوئے تھے۔ آنکھیں سُرخ
تھیں اور جسموں سے ناگوار بُو اُٹھ رہی تھی۔

◘

منیارڈ کھاڑی کے قریب ایک جھاڑی میں چھُپا یہ سارا
منظر دیکھ رہا تھا۔ موٹر بوٹ پر ایک ایک کر کے آدمی
سوار ہو رہے تھے۔ دونوں ساحلی محافظ بھی اُن کے
ہمراہ تھے۔ منیارڈ حیران تھا کہ ناؤ کے بغیر یہ لوگ کہاں
جا رہے ہیں۔ پھر اُس نے غور سے دیکھا تو پتہ چلا کہ ناؤ اور
اُس کا ایک ساتھی ساحلی محافظوں کی وردی میں ملبوس ہیں۔ ونڈسر
کی آواز اُسے صاف سُنائی دے رہی تھی۔ وہ ناؤ کو اس
جہاز پر حملہ کرنے سے باز رکھنے کی مسلسل کوشش کر رہا
تھا۔ ناؤ نے اپنی کمر سے خنجر نکالا اور ونڈسر کے سینے میں
دل کے مقام پر گھونپ دیا۔

”بزدلوں کے لیے ہمارے پاس کوئی جگہ نہیں!“ اُس

Downloaded from https://paksociety.com

کی آواز آئی۔

موٹر بوٹ جہاز کی طرف روانہ ہو چکی تھی۔ ونڈسر ریت پر تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ منیارڈ دیکھ چکا تھا کہ جوسٹائن بھی موٹر بوٹ میں سوار ہوا ہے۔ اب وہ جلد از جلد جہاز تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے نکلا اور کھاڑی کی طرف بڑھا۔ ایک چھوٹی کشتی میں بیٹھ کر اُس نے چپّو سنبھالے ہی تھے کہ کسی کے کپڑوں کی سرسراہٹ اور قدموں کی چاپ سُن کر اُس نے سر اُٹھایا۔ سامنے بیتھ کھڑی تھی۔ "خدا حافظ!" وہ بولی۔ منیارڈ جانتا تھا کہ اس کے بعد گولی کی آواز آئے گی اور اُس کے سر میں سوراخ ہو جائے گا۔ وہ کسی بچّے کی طرح ڈر کر نیچے جُھکا لیکن ... دھماکا نہیں ہُوا۔ اُس نے دیکھا بیتھ کے ہاتھ خالی ہیں، اُس کی آنکھوں میں چمک ہے، شاید آنسوؤں کی۔

"اُس نے کہا جلدی نکل جاؤ ورنہ کوئی محافظ پہنچ جائے گا۔"

"خُدا حافظ!" منیارڈ بولا اور تیز تیز چپّو چلاتا ہُوا ساحل سے دُور ہٹنے لگا۔

■

فلوریو عرشے پر کھڑا تھا۔ اُس نے ایک سپاہی سے پُوچھا: "کیا دیکھا تم نے؟" سپاہی نے دُوربین آنکھوں سے ہٹاتے ہُوئے کہا۔ "دونوں افسر واپس آ رہے ہیں۔ اُن کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی ہیں اور دو بچّے بھی لانچ میں موجود ہیں۔" فلوریو نے کہا۔

"یہ تو کوئی سنسنی خیز کہانی معلوم ہوتی ہے۔ تم کیمرہ مینوں سے کہو اگر وہ فلم بنانا چاہیں تو اُوپر آ جائیں۔" تھوڑی ہی دیر بعد ٹی وی کے دو کیمرہ مین لانچ کی آمد فلمانے لگے۔ لانچ جہاز کے پہلو سے آ لگی۔ فلوریو نے جنگلے پر رکتے ہُوئے کہا: "کیا خبر ہے؟ مولڈ؟"

مولڈ! "خاموش تھا۔ فلوریو نے دو تین آوازیں دیں لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ جہاز سے سیڑھی لٹکائی جا چکی تھی۔ فلوریو سیڑھی پر پاؤں رکھ کے چند قدم نیچے آیا۔

"کیا معاملہ ہے؟ مولڈ!"

مولڈ سر جُھکائے بیٹھا رہا۔ پھر اُس نے جھٹکے کے ساتھ سر اُٹھایا اور چیخ مار کر فلوریو کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ فلوریو موٹر بوٹ پر جا گرا۔ لانچ کے تمام افراد تیزی سے جہاز پر چڑھنے لگے۔

منیارڈ جہاز کے قریب پہنچ گیا تھا۔ اُوپر سے فائرنگ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اُس نے اپنی کشتی جہاز کے لنگر سے باندھی۔ پھر وہ لنگر کی زنجیر کے سہارے اُوپر پہنچ گیا۔ اُس نے بیرونی دیوار سے سر نکال کر دیکھا۔ بالائی عرشہ خالی تھا۔ ہر قسم کے خدشات کو بالائے طاق رکھ کر وہ عرشے پر اُتر گیا۔ فائرنگ ختم ہو چکی تھی۔ منیارڈ لڑائی کے انجام سے ناواقف تھا۔ زیریں عرشے سے سامان گھسیٹنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ پھر اُسے ایک قہقہہ سُنائی دیا... وہ جان گیا کہ لڑائی کس نے جیتی ہے۔ وہ ناؤ کا قہقہہ تھا۔ اُس نے 'برج' کی اوٹ سے جھانکا۔ نچلے عرشے پر چھ افراد قطار میں کھڑے تھے۔ اُن میں پانچ فوجی اور ایک سویلین تھا۔ ایک فوجی قریب ہی اوندھے مُنہ پڑا تھا۔ وہ شدید زخمی دکھائی دیتا تھا۔

دو آدمی ریوالور تانے کھڑے تھے۔ قریب ہی 'ناؤ' کے پہلو میں جوسٹائن کھڑا تھا۔ کچھ آدمی جہاز کا سامان کشتیوں پر اُتارنے میں لگے ہُوئے تھے۔ ہزونرا اپنی طویل دُعا شروع کر چُکا تھا۔ 'ناؤ' بے چینی سے اپنے ہاتھ میں ریوالور گھما رہا تھا۔ وقت بڑا کم تھا۔ منیارڈ نے اردگرد نظر دوڑائی اور پھر اُس کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ وہ رینگتا ہُوا لوہے کی سیڑھی کے پاس پہنچا۔ پھر آہستہ آہستہ اُترتا ہُوا نیچے آ گیا۔ وہ اب ایک انتہائی جدید اور طاقت ور مشین گن کے سامنے کھڑا تھا۔ ایمونیشن کا ایک بڑا ڈلّا مشین گن سے منسلک تھا۔ وہ اُس کے عقب میں لیٹ گیا۔ لانچ پر سامان اُتارنے والے افراد پُوری طرح اُس کی زد میں تھے۔ ایک ہاتھ سے اُس نے

کالنگ بیور کھینچا۔ دوسرا ہاتھ ٹریگر پر پہنچ گیا تھا۔ وہ غرّا کر کہہ رہا تھا: "ایسے جرائم کی باز پُرس آخرت میں ہو گی، اس لیے ہم تمہارا سفر آسان کیے دیتے ہیں۔" منیارڈ کی آنکھوں میں دھیرے دھیرے خُون اُتر رہا تھا۔ اُس کے جبڑے بھنچے ہُوئے تھے۔ پھر اُس نے ٹریگر دبا دیا۔ گولیاں پانی کی دھار کی طرح مشین گن سے نکلیں۔ لانچ پر سامان لادنے والے افراد اُچھل اُچھل کر فرش پر گرے اور ساکت ہو گئے۔

منیارڈ نے ٹریگر سے اُنگلی ہٹائے بغیر گن کا رُخ پھیرنا شروع کیا۔ جو جو اس خوفناک چھڑکاؤ کی زد میں آیا، ڈھیر ہو گیا۔ پانچ سیکنڈ کے اندر زیریں عرشہ خون سے رنگین ہو گیا۔ 'ناؤ' نے پھرتی سے جوسٹائن اور مینول کو اپنے آگے کر لیا۔ منیارڈ نے ٹریگر پر سے اُنگلی اُٹھا لی۔ 'ناؤ' نے جوسٹائن کے ہولسٹر میں ہاتھ ڈالا اور اُس کا پستول اُس کی کنپٹی پر لگا دیا۔ منیارڈ نے 'ناؤ' کا سر نشانے پر رکھتے ہُوئے کہا: "پستول پھینک دو۔"

'ناؤ' مسکرایا۔ منیارڈ نے مشین گن 'ناؤ' کی دونوں آنکھوں کے درمیان فکس کر دی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ 'ناؤ' کے ٹریگر دبانے سے پہلے اُس کی پیشانی میں سوراخ ہو سکتا ہے لیکن پھر بھی اپنے بچّے کی زندگی کے لیے وہ کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔

"کیا چاہتے ہو؟" منیارڈ نے پُوچھا۔

'ناؤ' بولا: "تم رات اسی جگہ گزارو گے اور مَیں اپنے آدمیوں سے مشورہ کروں گا۔ صبح تم جزیرے پر آؤ گے اور اپنے آدمیوں کو لے جاؤ گے۔ وعدہ کرتا ہُوں کہ مَیں انھیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔"

منیارڈ نے کہا: "تمہارے وعدوں پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا، تاہم یہ بتاؤ کیا جوسٹائن کو بھی چھوڑ دو گے؟"

"نہیں، یہ ناممکن ہے۔" 'ناؤ' نے جواب دیا۔ "مجھے اُس کی اب پہلے سے زیادہ ضرورت ہے۔ مَیں اُسے پاس رکھوں گا۔"

منیارڈ نے جوسٹائن کی طرف دیکھا۔ اُسے ایک بار پھر وہی پُرانا جوسٹائن نظر آ رہا تھا۔ تیرہ سالہ معصوم بچّہ، ڈرا ہُوا، سہما ہُوا، رحم طلب نظروں سے اپنے باپ کو دیکھتا ہُوا۔ اُس کے معصوم ذہن کو مبہوت کرنے والا سحر ٹوٹ چُکا تھا۔ منیارڈ نے کہا: "تمہارے ساتھ بھیجنے سے بہتر ہے کہ مَیں اسے یہیں ختم کر ڈالوں۔"

'ناؤ' نے قہقہہ لگایا:

"تم ایسا نہیں کر سکتے۔ تمہاری خواہش یہی ہو گی کہ تمہارا بیٹا کہیں بھی رہے، زندہ رہے اور خوش رہے۔"

منیارڈ نے کچھ سوچتے ہُوئے کہا: "اچھا ٹھیک ہے۔" اُس نے دیکھا جوسٹائن اب 'ناؤ' کی گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ چیخ رہا تھا: "نہیں ڈیڈی! نہیں۔"

منیارڈ نے پیار سے کہا: "جوسٹائن! جیسے یہ کہتا ہے ویسے ہی کرو۔ یہ تمہارے ڈیڈ کا حکم ہے۔"

'ناؤ' نے مینول سے کہا: "چلو تم پہلے سیڑھی سے اُترو۔"

منیارڈ نے دیکھا کہ مینول اپنی جگہ ساکت کھڑا ہے۔ منیارڈ کو اُس کی آنکھوں میں بھی جوسٹائن جیسی التجا نظر آئی۔ 'ناؤ' دونوں لڑکوں کو ساتھ لے کر نیچے اُترنے لگا۔ لانچ اس جگہ سے نظر نہیں آ رہی تھی اور منیارڈ سمجھتا تھا کہ مشین گن اب استعمال نہیں کی جا سکتی۔ جوسٹائن نے آخری بار منیارڈ کو اتنی بے چارگی سے دیکھا تھا کہ اُس کا کلیجہ لرز گیا تھا۔ اُس نے بالکل غیر ارادی طور پر ایک فیصلہ کیا اور اُٹھ کھڑا ہُوا۔ وہ دبے پاؤں چلتا ہُوا جنگلے کے پاس پہنچا، کمر سے اُڑسا ہُوا خنجر ہاتھ میں پکڑا اور لانچ پر چھلانگ لگا دی۔ اُس وقت 'ناؤ' جوسٹائن کو کشتی پر بیٹھنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ مینول پاس کھڑا تھا۔ ۔ ۔ پھر منیارڈ کی مختصر سی پرواز ختم ہو گئی۔ وہ ایک دھماکے سے 'ناؤ' کے اُوپر گرا۔ لانچ ایک دفعہ بُری طرح ڈگمگائی۔ پُوری نفرت، پُوری عداوت اور غُصّے کے ساتھ منیارڈ کا ہاتھ بلند ہُوا اور چاقو 'ناؤ' کی دو پسلیوں کے درمیان گُھس گیا۔ وہ پیچھے کی طرف گرا۔ گرتے

گرتے اُس نے ٹانگ منیارڈ کے پیٹ میں دے ماری، پھر اُس نے ایک جھٹکے سے چاقو اپنی پسلیوں میں سے نکالا۔ دونوں لانچ کے اُوپر گتھم گتھا ہو گئے۔

چھ کے چھ آدمی جہاز کے اوپر جنگلے کے پاس کھڑے بے بسی سے یہ لڑائی دیکھ رہے تھے۔ اُن کے ہاتھ پیچھے کی طرف بندھے ہوئے تھے۔ جوسٹائن اور مینول بھی لانچ کے ایک کونے میں سہمے کھڑے تھے۔ 'ناؤ' اپنی قوّت وحشیانہ انداز میں استعمال کرتے ہوئے منیارڈ کو نیچے گرا چکا تھا۔ اُس وقت جوسٹائن اپنے باپ کی مدد کو آگے بڑھا۔ 'ناؤ' نے خنجر والا ہاتھ گھمایا اور جوسٹائن ایک طویل چیخ کے ساتھ کشتی میں اُلٹ گیا۔ منیارڈ پر جنون کی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ تڑپ کر ناؤ کے نیچے سے نکلا۔ پھر نجانے کس طرح اُس نے چاقو چھین لیا اور بڑی وحشت اور درندگی سے اُس نے 'ناؤ' پر پے در پے وار کرنے شروع کر دیے۔ اُسے کچھ ہوش نہ تھا کہ چاقو کہاں لگ رہا ہے۔ پھر اچانک اُس کا پاؤں پھسلا اور وہ دوبارہ 'ناؤ' کے نیچے آگیا۔ وہ اس طرح گرا تھا کہ لانچ کی دو سیٹوں کے درمیان پھنس گیا تھا۔ اب 'ناؤ' اُس کے سینے پر سوار تھا اور کمر سے اپنا خنجر نکال چکا تھا۔ منیارڈ کا چاقو نجانے ہاتھ سے نکل کر کہاں چلا گیا تھا۔ 'ناؤ' نے چاقو دونوں ہاتھوں سے تھام کر آہستہ آہستہ سر سے اُوپر اٹھایا۔ منیارڈ اُس کے نیچے ایک بار زور سے مچلا لیکن حرکت ممکن نہیں تھی۔ 'ناؤ' کے جسم کے مختلف حصّوں سے خون کے دھارے بہہ رہے تھے۔ یُوں لگتا تھا جیسے وہ چند لمحوں کا مہمان ہو۔ اُس نے خنجر سر سے بلند کیا اور چیخا: "میں تمہیں بتانا چاہتا ہُوں کہ میں اپنی قوم کا شہزادہ ہُوں ... آزاد شہزادہ۔"

منیارڈ نے دیکھا چاقو تیزی سے نیچے آیا۔ اُسے اپنے دل کے مقام پر ایک خیالی ٹیس محسوس ہُوئی۔ لیکن نہیں ... چاقو نے اُس کے جسم کو نہیں چھُوا تھا۔ 'ناؤ' نے چاقو خود اپنے پیٹ میں گھونپ لیا تھا۔ ایک ڈوبتی ہُوئی کراہ کے ساتھ وہ پُشت کے بل لانچ میں گرا اور ایک دفعہ لرز کر ساکت ہو گیا۔

منیارڈ لپک کر جوسٹائن کے پاس پہنچا۔ وہ اپنا زخمی بازو دوسرے ہاتھ سے تھامے آہستہ آہستہ اُٹھ رہا تھا۔ منیارڈ نے دیکھا کہ زخم زیادہ گہرا نہیں؛ چنانچہ اُسے سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔ پھر سینے سے علیحدہ کر کے اُس کا چہرہ دیکھا۔ جوسٹائن کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ ایک بار پھر منیارڈ کے سینے سے چمٹ گیا اور منیارڈ کے کان میں کہا: "پیارے ڈیڈ! آپ کہاں چلے گئے تھے؟ اب مَیں کہیں بھی آپ کو جانے نہ دوں گا۔" منیارڈ نے اُس کے کان میں سرگوشی کی: "ممّی کا کچھ پتہ ہے؟ وہ تمہارا حُلیہ خراب کر دے گی۔"

اتنے میں جہاز کے اُوپر سے ایک لیفٹیننٹ کی آواز آئی: "جناب! واشنگٹن سے کال آئی ہے۔ آپ کی بیوی آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔" منیارڈ کو ایک خوشگوار حیرت کا احساس ہُوا۔

❀❀

ملائشیا میں حکومت لوگوں کی حوصلہ افزائی کر رہی ہے کہ وہ شادی کر کے زیادہ سے زیادہ بچّے پیدا کریں۔ اس وقت ملائشیا کی آبادی ایک کروڑ بچپن لاکھ ہے اور ۲۰۰۰ء تک اس میں چار گنا اضافے کے لیے حکومت بڑے خاندانوں کو ٹیکس کی چھوٹ دے گی۔ جن ماؤں کے پانچ بچّے ہوں گے اُنہیں خصوصی الاؤنس دیا جائے گا۔ سکولوں میں شادی اور بچّے کی پیدائش و تربیت کے متعلق خصوصی مضمون بھی شاملِ نصاب کیا جا رہا ہے۔

Pakistanipoint
Waqar
Azeem
طاہر جاوید مغل
ڈیڈ ڈاک
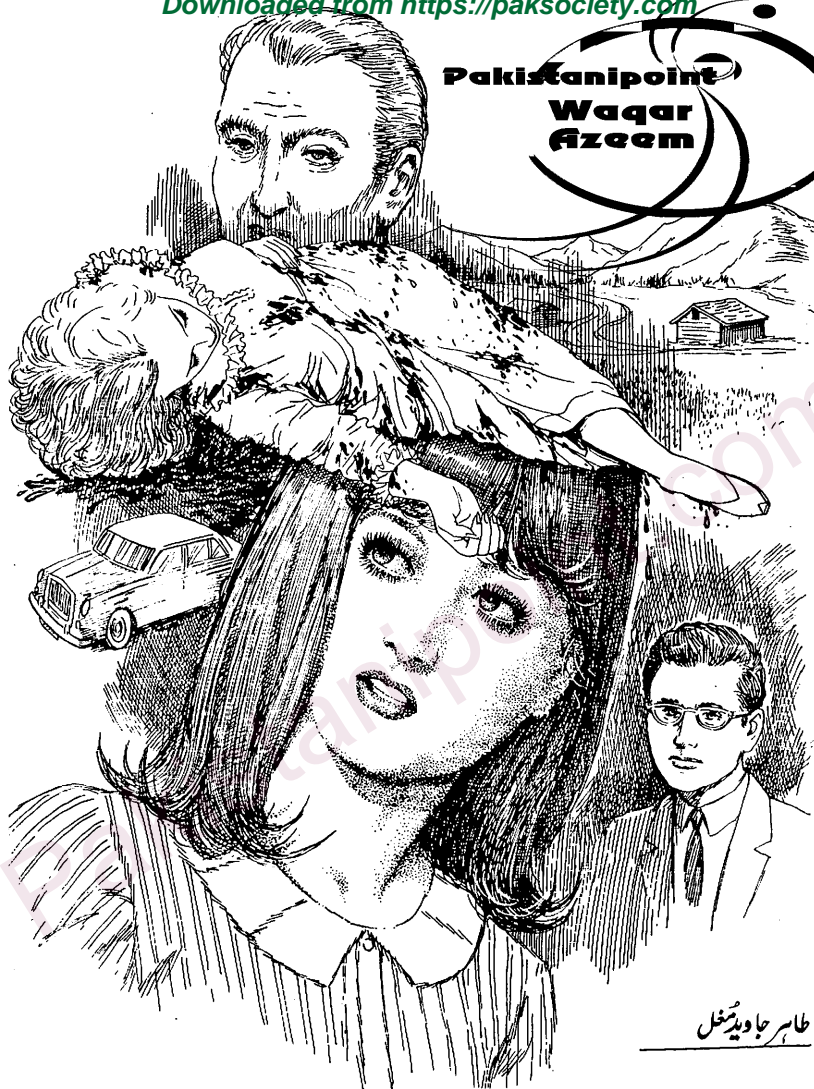
آخری لمحے تک تجسّس، تحیّر اور تاثّر قائم رہتا ہے
اور قاری تیز رو واقعات کے ساتھ ساتھ
بے اختیار بہنے لگتا ہے

سراغ رسانی اور مہم جوئی کے ایک ہوشربا ناول "ڈیڈ ڈاک" کی تلخیص۔

گرمی شدید تھی۔ سڑک کے دونوں طرف کپاس کے کھیت پھیلے ہوئے تھے۔

کیتھرین گاڑی ڈرائیو کرتے طائرانہ نظر سے اطراف کا جائزہ لے رہی تھی۔ سڑک بل کھاتی کھیتوں کے درمیان سے گزرتی تھی اور گاڑی چلانے کے لیے زیادہ دیر تک سڑک سے نظریں ہٹانا ممکن نہیں تھا۔ کیتھرین اب اپنی زمین کی حدود میں داخل ہو چکی تھی۔ یہ زمین اُسے ورثے میں ملی تھی۔

ایک موڑ پر کیتھرین اچانک ٹھٹک گئی۔۔ سامنے سڑک کے بیچوں بیچ کُتا مرا پڑا تھا۔ اُس کی انتڑیاں سڑک پر بکھری ہوئی تھیں۔ کوئی تیز رفتار گاڑی اُسے کچلتی ہوئی گزر گئی تھی۔ کیتھرین کوشش کے باوجود دوبارہ کُتّے کی طرف نہیں دیکھ سکی۔ پانچ فرلانگ آگے جا کر ایک درخت کی چھاؤں میں گاڑی روکی اور باہر نکل آئی۔ وہ نیلی جیکٹ اور پینٹ پہنے ہوئے تھی۔ پاؤں میں ٹینس شوز تھے۔ اُس کے لمبے سیاہ بال شانوں پر لہرا رہے تھے۔ گاڑی کی عقبی نشست سے اُس نے ایک بیگ اُٹھایا جس میں اُس کا پستول گولیاں اور بیئر کے خالی ڈبے تھے۔ ایک لمحے رُک کر اُس نے اطراف کا جائزہ لیا۔ پھر بیگ ہاتھ میں جھلاتے وہ ایک دوسرے درخت کی چھاؤں میں آ بیٹھی۔ سامنے کچھ فاصلے پر لکڑی کے بنے ہوئے دو کیبن نظر آ رہے تھے لیکن دُور دُور تک کوئی متنفّس دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اُس نے بیگ سے بیئر کے ڈبے نکالے۔ کچھ فاصلے پر بنی مٹی کی منڈیر پر یہ ڈبے ایک قطار میں رکھنے کے بعد وہ درخت کے نیچے لوٹی۔ پھر اُس نے پستول نکالا اُس کے چیمبر کا معاینہ کیا اور بڑے ماہرانہ انداز سے دائیں ہاتھ کی کلائی کو بائیں ہاتھ سے سہارا دیا اور سانس روک کر فائر کر دیا۔ ایک دھماکے سے بیئر کا ڈبہ اُچھل کر دُور جا گرا۔ یکے بعد دیگرے چھ فائر ہوئے اور پانچ ڈبے منڈیر پر سے غائب ہو گئے۔ صرف ایک نشانہ خطا گیا۔

نشانہ بازی اُس کا پرانا مشغلہ تھا۔ اپنے باپ کی زندگی میں وہ اتوار کے روز اکثر مشق کے لیے اس جگہ آیا کرتی تھی۔ اُس نے پستول پھر لوڈ کیا۔ خالی ڈبے اُٹھا کر قطار میں رکھے۔ دوبارہ نشانہ بازی کرنے سے قبل اچانک اُس کی نگاہ لکڑی کے کیبن کی طرف گئی جس کی کھڑکی میں اُسے جو چیز نظر آئی اُس نے اُسے ہلا دیا۔ وہ ایک انسانی ہاتھ تھا جس کی ہتھیلی اُوپر کی طرف اُٹھی ہوئی تھی اور اُنگلیاں ساکت۔ کیتھرین کے ذہن میں انجانے خدشے جاگ اُٹھے۔ اُس کا دل دھڑکنے لگا۔ محتاط قدموں سے وہ کیبن کی طرف بڑھی۔ اُس نے دیکھا کہ ہاتھ کے اُوپر اور کلائی کے گرد کثرت سے مکھیاں بھنبھنا رہی ہیں۔ وہ جانتی تھی مکھیاں بھنبھنانے کا مطلب کیا ہے۔ اُس کے قدم لرز گئے ــــــ وہ ایک عورت کی لاش تھی جو پُشت کے بل زمین پر پڑی تھی۔ اُس کے سر سے بہنے والا خُون فرش پر دائرے کی صُورت جم گیا تھا۔ عورت کا چہرہ دوسری طرف تھا۔ کیتھرین کچھ اور دیکھنے کی ہمّت نہ کر سکی۔ وہ اُلٹے پاؤں اپنی کار کی طرف بھاگی۔ چیخ اُس نے بڑی مشکل سے حلق میں دبائی۔ کانپتے ہاتھوں سے دروازہ کھولا اور انجن اسٹارٹ کر کے گاڑی پُوری رفتار سے دوڑائی۔ چلچلاتی دوپہر، دُور دُور کوئی شخص نظر نہیں آتا تھا۔ وہ جلد از جلد اپنے قصبے لوفیلڈ پہنچنا چاہتی تھی۔ شیرف کا چہرہ بار بار اُس کی نگاہوں میں گھوم رہا تھا۔ لوفیلڈ کے شیرف کا دفتر جیل کی عمارت کے ساتھ ہی

تھا۔ دفتر کے سامنے اُس نے گاڑی روکی اور تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ وہ خاصی بدحواس تھی۔ اپنے آپ پر کسی قدر قابو پا لینے کے بعد اُس نے شیرف کو بتایا کہ ایک سفید فام عورت کی لاش کسی مزارع کے مکان میں پڑی ہُوئی ہے۔ اپنا بیان ختم کرنے کے بعد کیتھرین نے جب شیرف کے چہرے پر افسردہ نگاہ ڈالی تو اُس کی آنکھوں میں تشویش کے ساتھ ساتھ رُوکھاپن بھی تھا۔ وہ کیتھرین کے مرحوم باپ کا پُرانا دوست تھا لیکن اُس وقت وہ صرف شیرف دکھائی دے رہا تھا۔

*

تھوڑی دیر بعد کیتھرین، شیرف گیلیئن اور پولیس کے عملے کے ساتھ جائے وقوع کی طرف جا رہی تھی۔ تین گاڑیوں کا قافلہ بڑی سڑک سے اُتر کر چھوٹی سڑک پر آ گیا۔ جُوں جُوں منزل قریب آتی گئی، کیتھرین کے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی۔ شیرف اُس کے ساتھ والی نشست پر تھا۔ اُس نے کیتھرین کا دھیان ہٹانے کے لیے اردگرد پھیلے کپاس کے کھیتوں کا ذکر چھیڑ دیا۔ کیتھرین نے بتایا کہ یہ ساری زمین اُس کے باپ دادا کی ہے۔ کئی برسوں سے 'مارٹن بارنر' نے اسے پٹے پر لے رکھا ہے۔ شیرف کے پُوچھنے پر کیتھرین نے بتایا کہ مارٹن بارنر اُن کے گھر کے قریب ہی رہتا ہے اور اُس کے خاندان کے ساتھ اُن کے پُرانے تعلّقات ہیں۔

گاڑیاں جائے وقوع پر پہنچیں تو کیتھرین نے اُنگلی کے اشارے سے لکڑی کے کیبنوں کی نشاندہی کی اور خود آنکھیں بند کر کے حالات پر غور کرنے لگی۔

کچھ آہٹ سُن کر آنکھیں کھولیں تو اُس نے ادھیڑ عمر تنومند کارل پارکنز کو جو اُس کے مرحوم باپ کا دوست بھی تھا کھڑا پایا۔ وہ قصبے کا تفتیشی افسر تھا۔ کیتھرین اُسے دیکھ کر گاڑی سے باہر آئی۔ پھر وہ دونوں تقریباً دس منٹ تک درختوں کے سائے میں ٹہلتے رہے۔ لاش کے متعلّق پارکنز نے چند سوال کیے۔ کیتھرین نے اُسے تفصیل سے تمام واقعات بتائے۔ اتنے میں شیرف گیلیئن بھی آ گیا۔ اُس کا بھاری بھرکم چہرہ پسینے میں شرابور تھا۔ اُس کی آنکھوں سے تشویش اور مزاج میں برہمی عیاں تھی۔ گہری نظروں سے دیکھتے ہُوئے اُس نے کہا:

"کیتھرین! تمہارا کہنا ہے کہ تم مقتولہ کو نہیں جانتیں لیکن میرا خیال ہے تم اُسے جانتی ہو۔"

"کیا مطلب؟" کیتھرین کی آنکھوں میں خوف کے سائے لہرا گئے۔

شیرف نے سگار کا کش لگاتے ہُوئے کہا: "مرنے والی تیس برس تک تمہارے والد کے کلینک میں بطور نرس کام کر چکی ہے۔"

کیتھرین کا مُنہ استعجاب سے کُھلا کا کُھلا رہ گیا۔

"اوہ میرے خدا! تو یہ لیونا کی لاش ہے لیکن وہ اس جگہ کیا کر رہی تھی؟"

شیرف نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اُن اہلکاروں کی طرف متوجّہ ہو گیا جو موقعِ واردات کا نقشہ تیّار کرنے میں مصروف تھے۔ کیتھرین نے پھر سوچنا شروع کیا۔ "مِس لیونا اُس کے والد کے ساتھ تیس برس تک نرس کے طور پر کام کرتی رہی تھی۔ بظاہر وہ خوش اخلاق اور ملنسار تھی لیکن بچپن سے کیتھرین اُس سے متنفر تھی۔ اُس کا خیال تھا اُس میں دکھاوا اور بناوٹ زیادہ ہے۔ کیتھرین کی ناپسندیدگی کی شاید ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اُس کے والد ہر وقت مِس لیونا سے ہمدردی جتایا کرتے تھے۔

کارونر جیوری نے موقع کا اچھّی طرح معاینہ کیا اور اُسے قتل کی واردات قرار دیا۔ پولیس اہلکار لاش کو ایمبولنس پر چڑھانے کی تیّاریوں میں مصروف تھے کہ پارکنز پھر آیا اور تسلّی تشفّی کی باتیں کرنے لگا۔ اُس نے شکایت کی کہ والدین کی وفات کے بعد تم نے مجھ سے ملنا جُلنا بہت کم کر دیا۔ کیتھرین نے اس حقیقت کا اعتراف کیا اور کہا کہ وہ تنہائی میں زیادہ سکون محسوس کرتی ہے۔ بہرحال آئندہ وہ اُن کے

ہاں آیا جایا کرے گی۔ باتوں باتوں میں پارکنز نے قصبے کے نئے ڈاکٹر کا ذکر کیا۔ کیتھرین کو ڈاکٹر کا ذکر ہمیشہ ناگوار گزرتا تھا۔ ایسے موقع پر اُسے اپنے مرحوم باپ یاد آنے لگتے۔ جو شہرت و مقبولیت اُنہیں میسّر تھی کسی اور کے حصّے میں کہاں! ویسے ڈاکٹر میو کو شخصی حیثیت سے وہ زیادہ بلند نہیں سمجھتی تھی۔ کیتھرین نے نظریں اُٹھائیں تو ڈاکٹر میو ایک درخت تلے کھڑا اُس کی طرف تک رہا تھا۔ اُس نے نہایت بیزاری سے اپنا مُنہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اتنے میں ایمبولنس گاڑی حرکت میں آگئی۔ کارل پارکنز اور کیتھرین نے بات ختم کی اور اپنی اپنی گاڑیوں کی طرف بڑھ گئے۔

گاڑیوں کا واپسی سفر شروع ہُوا۔ کیتھرین بہت تھک چکی تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ اب شیرف اُسے گھر جانے کی اجازت دے دے گا لیکن شیرف نے بتایا کہ ابھی تھانے چل کر کیتھرین کو اپنا مکمّل بیان قلمبند کرانا ہوگا۔ اُس نے دیکھا نہ صرف شیرف بلکہ تمام لوگوں کا رویّہ اُس کے ساتھ کچھ بدلا بدلا سا ہے۔ ایک دم تمام آنکھیں شناسائی سے عاری نظر آئیں۔ جیوری کے افسران تھوڑی دیر اُس سے زبانی گفتگو کرتے رہے پھر اُس کا بیان قلمبند کیا گیا۔

*

اگلا دن اتوار کا تھا۔ کیتھرین قریباً دس بجے سو کر اُٹھی تو گزشتہ واقعات نے پھر آ دبوچا۔ والدین کی موت کے بعد اس وسیع مکان میں تنہائی پہلے تو بہت کھلی پھر وہ اس کی عادی ہوگئی۔ اُس نے کمروں کی آرائش اور ترتیب میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہُوئی نشست گاہ میں آئی تو تصوّر کی آنکھوں سے اُس نے اپنے والدین کو روزمرّہ کے معمولات میں منہمک دیکھا۔

نہا دھو کر غُسل خانے سے نکلی تو گیارہ بج چکے تھے۔ ناشتے سے فارغ ہو کر مطالعے کے کمرے میں آ بیٹھی۔ کھڑکی سے پارکنز کے صحن کا نظّارہ کر رہی تھی کہ بیرونی گیٹ کے قریب کسی گاڑی کے رُکنے کی آواز نے چونکا دیا۔ اوہ! یہ تو اُس کے باس کی گاڑی تھی۔ ہفت روزہ لوفیلڈ گزٹ کا ایڈیٹر رینڈل۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اُس نے کیتھرین کے گھر کا رُخ کیا تھا۔ کیتھرین نے تنقیدی نظروں سے اُس کے سراپا کا جائزہ لیا۔ چوڑے شانے، متناسب قد، کسی حد تک فربہ لیکن مضبوط جسم، ہلکے رنگ دار شیشوں والی عینک چہرے پر بھلی لگ رہی تھی۔ وہ باوقار انداز میں چلتا ہُوا دروازے کے قریب پہنچا تو کیتھرین نے لباس دُرست کیا۔ لپک کر دروازہ کھولا اور مُسکراتے ہُوئے اُس کا استقبال کیا۔ رینڈل ایک متین اور سنجیدہ آدمی تھا۔ اُس کے رویّے میں گرمجوشی کے ساتھ بُردباری تھی۔ کیتھرین سمجھ گئی کہ وہ کل پیش آنے والے واقعے پر تبادلۂ خیال کرنے آیا ہے۔ ابھی رسمی جُملے ہی ادا ہُوئے تھے کہ گھنٹی بجی۔ دروازہ کھولا تو ٹام سامنے تھا۔

ٹام دُبلا پتلا دراز قد شخص تھا۔ اُس کا شمار ہفت روزہ گزٹ کے محنتی رپورٹروں میں ہوتا تھا۔ کیتھرین کے مکان کے دو حصّے تھے۔ ایک حصّہ رہائش کے لیے مختص تھا اور دوسرا اُس کے والد بطور کلینک استعمال کیا کرتے تھے۔ ڈیڈی کی وفات کے بعد کلینک کا کوئی مصرف نہیں رہا تو اُس نے یہ حصّہ ٹام کو کرایے پر دے دیا۔ ٹام ایک خوش باش نوجوان تھا۔ وہ پیدائشی طور پر ایک صحافی تھا اور ہر وقت کسی نہ کسی کہانی کی کھوج میں رہتا تھا۔ کیتھرین بھانپ گئی وہ کل کی واردات کے بارے میں تبادلۂ خیال کرنے کے لیے بے چین ہوگا۔ اُس کے سوالوں کی بوچھاڑ سے بچنے کے لیے اُس نے ٹام کو فوراً رینڈل کی موجودگی کی اطّلاع دے دی۔ باس کا نام سُن کر وہ ایک دم محتاط ہوگیا۔ کیتھرین اُسے رینڈل کے پاس بٹھا کر کافی بنانے چل دی۔

رینڈل جانتا تھا کہ ٹام لیونا کے قتل کو اس ہفتے کی سُرخی کہانی بنانے کے لیے سخت محنت کر رہا ہے۔ اُس نے پُوچھا کیا وہ ڈاکٹر میو سے بھی ملا ہے۔ ٹام نے اثبات میں سر ہلاتے ہُوئے کہا:

”ہاں، ڈاکٹر میو کا کہنا ہے کہ مس لیونا کو اُس جھونپڑی میں

قتل نہیں کیا گیا درِ اصل پرسوں رات پچھلے پہر اُس کو مکان میں قتل کرنے کے بعد جھونپڑی میں لایا گیا ہے۔ یہ ڈکیتی یا مجرمانہ حملے کی واردات نہیں۔"

*

دوسرے دن پیر تھا۔ ایک فٹ بال میچ کے سلسلے میں چھُٹی تھی۔ کیتھرین آج بھی سوچوں میں غرق تھی۔ اگر اُس کے والدین اور مس لیونا کے قتل کے درمیان کوئی تعلّق تھا تو وہ کیا تھا؟ کیا وہ تینوں کسی ایسے راز سے آگاہ تھے جو اُن کی موت کا باعث بنا؟ لیکن اگر ایسی بات تھی تو پھر دونوں وارداتوں کے درمیان چھ ماہ کا وقفہ کس لیے تھا۔ کیا مس لیونا کو قتل کرنا اتنا ہی دُشوار تھا کہ قاتل کو چھ ماہ لگ گئے۔

وہ ان خیالات میں کھوئی ہُوئی تھی کہ اچانک اطّلاعی گھنٹی بجی۔ اُس کا خیال تھا کہ یہ رینڈل ہوگا لیکن کھڑکی سے شیرف کا چہرہ دیکھ کر اُس پر اداسی پڑ گئی۔

شیرف اندر آکر صوفے پر بیٹھ گیا "میں تمہارا زیادہ وقت نہیں لُوں گا" شیرف نے سگار سُلگاتے ہُوئے کہا۔ اُس نے ایک لمحہ رُک کر کیتھرین کے چہرے کی طرف دیکھا جو انتہائی سنجیدہ تھا۔ "جب تم نشانہ بازی کے لیے جا رہی تھیں کسی واقف کار سے سڑک پر ملاقات ہُوئی تھی؟" شیرف نے پہلا سوال داغا۔

کیتھرین نے ذہن پر زور دیا اور پھر اچانک اُسے یاد آیا۔ راستے میں نیلی پک اپ نے اُسے کراس کیا تھا، پک اپ میں مارٹن بارنر تھا۔ اُس نے کیتھرین کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا تھا۔ مارٹن بارنر اُس کا پڑوسی ادھیڑ عمر کا شریف الطّبع آدمی تھا۔ کیتھرین سوچ رہی تھی کہ شیرف کے سامنے اُس کا نام لینے سے وہ کہیں کسی مصیبت میں نہ پڑ جائے۔ بہرحال حقیقت کو چھُپانا نامناسب نہیں تھا۔ اُس نے شیرف کو بتایا کہ راستے میں مارٹن بارنر سے اُس کی ملاقات ہُوئی تھی۔ شیرف نے پُوچھا کہ اُس نے اُسے کس جگہ دیکھا تھا۔ کیتھرین نے ایک بار پھر ذہن پر زور دیا لیکن وہ کسی خاص جگہ کا تعیّن نہ کرسکی۔

شیرف نے اپنی ڈائری میں کچھ نوٹ کرنے کے بعد سر اُٹھایا: "آخری دفعہ مس لیونا سے تمہاری ملاقات کب ہُوئی تھی؟"

کیتھرین نے سوچتے ہُوئے کہا "اگر آپ کی مُراد لیونا کو دیکھنے سے ہے تو وہ دس پندرہ روز پہلے کی بات ہے۔ اگر ملاقات سے مُراد بات چیت ہے تو اس کو کوئی تین مہینے گزر چکے ہیں۔ جب ٹام کو مَیں نے ڈیڈی کے دفتر والا حصّہ کرایے پر دیا تو لیونا میرے پاس آئی۔ اُس نے کہا کہ وہاں کئی ایسی چیزیں موجود ہیں جو نئے ڈاکٹر مَیو نے نہیں خریدی ہیں اور اگر تم وہ چیزیں وہاں سے ہٹانا چاہتی ہو تو مَیں تیّار ہُوں۔ مجھے اُس کی موجودگی پسند نہیں تھی لیکن مَیں انکار نہ کرسکی۔ کچھ الماریاں اُوپر دوسری منزل پر لے جانا تھیں اور مَیں اکیلی یہ کام نہیں کرسکتی تھی۔" شیرف نے پُوچھا: "اُس دن کی کوئی اور بات جو تمہیں یاد ہو!"

"کوئی خاص بات نہیں۔" کیتھرین نے سوچتے ہُوئے کہا۔ "سامان کی منتقلی کے دوران لیونا نے مذاقاً کہا تھا کہ قصبے کے کچھ لوگ کتنے صحّت مند ہیں کہ چھ ماہ گزرنے کے باوجود اُنہیں اپنی فائلوں کی ضرورت نہیں پڑی۔ آدھی سے زیادہ فائلیں ڈاکٹر میو کے پاس پہنچ چکی ہیں لیکن ایک چوتھائی ابھی تک الماریوں میں موجود ہیں۔ شیرف نے گہری نظروں سے کیتھرین کو دیکھتے ہُوئے ایک بالکل غیر متوقّع سوال کیا۔ اُس نے پُوچھا کہ کیا اُس نے اپنے ڈیڈی کے سامان میں سے کوئی چیز لیونا کو بھی فروخت کی تھی۔ اُس نے نفی میں جواب دیا۔ شیرف نے کہا:

"لیونا نے ایک وصیّت بھی چھوڑی ہے۔ یہ وصیّت چند سال پُرانی ہے۔ اس کے مطابق مرحومہ کی ہر چیز مکان، رقم وغیرہ تمہارے ڈیڈی کے نام ہے۔ اب یہ ساری چیزیں تمہارے حصّے میں آئیں گی۔"

کیتھرین نے شیرف کی طرف دیکھا اور اُسے پہلی بار احساس ہُوا کہ شیرف وہ کیا کہنے کی کوشش کر رہا ہے۔ کیتھرین

کا چہرہ غُصّے سے تمتما اُٹھا۔ شیرف نے سلسلۂ کلام جاری رکھا:

"ہفتے کی صُبح تم نے لیونا کی لاش دریافت کی لیکن اُسے جمعے کی رات ہی قتل کر دیا گیا تھا۔ قاتل نے کسی گولائی نما وزنی چیز سے اُس کے سر پر دو ضربیں لگائی تھیں۔ شاید بیس بال کا بلّا استعمال کیا گیا ہو۔ قتل کے بعد قاتل یا قاتلہ نے اُس کے گھر کی اچھی طرح تلاشی لی تھی۔ صوفے اُدھڑے ہُوئے تھے اور ہر طرف ٹُوٹ پھُوٹ کے آثار دکھائی دیتے تھے۔"

پھر شیرف نے کہا: "یُوں محسوس ہوتا ہے جیسے قاتل واردات کے بعد زیادہ سے زیادہ وقت لینا چاہتا تھا۔ اگر لاش وہیں گھر میں پڑی رہتی تو اس موسم میں دو دن کے اندر اندر ہمسایوں کو خبر ہو جاتی لیکن اُس جھونپڑی میں ہو سکتا تھا کئی روز تک یہ راز افشا نہ ہوتا۔ قتل کے بعد اُس نے لاش کو گاڑی وغیرہ میں رکھ کر جھونپڑی تک پہنچایا۔ میرا خیال ہے قاتل یا تو مرد ہے یا کوئی لمبی تڑنگی صحّت مند عورت۔"

شیرف کے آخری فقرے نے کیتھرین کے جسم میں اطمینان کی لہر دوڑا دی۔ اُس نے قدرے اعتماد سے پُوچھا، "آخر لیونا کا قاتل اُس کے گھر میں کس چیز کی تلاش کرتا رہا؟"

شیرف نے سگار کا طویل کش لے کر کہا: "ہمیں پتہ چلا ہے کہ لیونا ایک بلیک میلر تھی۔ اس بات کی واضح شہادتیں ملی ہیں کہ وہ قصبے کے لوگوں کو بلیک میل کرتی تھی۔"

اس انکشاف پر کیتھرین سُنّ ہو کر رہ گئی۔

*

ابھی وہ شیرف کی جاتی ہُوئی کار ہی کو دیکھ رہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی۔ اُس نے ریسیور اُٹھایا۔ دوسری طرف سیلی کن تھی۔ سیلی، مارٹن بارنر کی شادی شدہ بیٹی تھی۔ تھوڑی دیر رسمی گفتگو کے بعد سیلی نے کہا۔

"مجھے ہفتے کے واقعے پر بہت تشویش ہے۔ اگر تم اپنے گھر میں خوف محسوس کرتی ہو تو ایک دو روز کے لیے ہمارے ہاں آ جاؤ۔" کیتھرین نے رسمًا اُس کا شکریہ ادا کیا۔ سیلی نے کہا۔ "ڈیڈی نے مجھے پرسوں ہی بتایا تھا کہ راستے میں اُن کی ملاقات تم سے ہُوئی تھی۔ وہ دراصل زمین کا چکّر لگانے گئے تھے۔"

کیتھرین اس بات پر بُری طرح چونک گئی؛ تاہم اُس نے اپنی حالت ٹیلیفون پر ظاہر نہیں ہونے دی۔ سیلی سے گفتگو ختم کرنے کے بعد وہ حیران تھی کہ مارٹن بارنر نے اپنے گھر والوں سے جھُوٹ کیوں بولا۔ جہاں تک کیتھرین کو یاد پڑتا تھا وہ اپنی زمین کی جانب سے ہرگز نہیں آ رہا تھا۔ یُوں لگتا تھا جیسے سڑک کے کنارے بنے ہُوئے مکانوں میں سے موڑ کاٹ کر بڑی سڑک پر آیا ہو۔ یہ جگہ وہاں سے بہت قریب تھی جہاں لیونا کی لاش پڑی تھی۔

لوگوں کی ٹٹولتی ہُوئی نگاہوں نے اُسے سخت پریشان کر رکھا تھا۔ اطلاعی گھنٹی پھر بجی۔ کیتھرین نے سوچا اس دفعہ ضرور ریندل ہو گا لیکن اس بار بھی توقّع پُوری نہیں ہُوئی۔ دروازے پر تفتیشی افسر پارکنز کی بیوی مولی تھی۔ اُس کے ہاتھوں میں ایک پلیٹ تھی۔ اُس نے مُسکراتے ہُوئے کہا؛ "مَیں سوچتی تھی تم پریشانی میں کھانا وغیرہ کیسے پکاؤ گی۔ اس لیے یہ لائی ہُوں۔" کیتھرین نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور اندر آنے

کو کہا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدموں سے چلتی ہُوئی اندر آ گئی۔ وہ مختصر سے قد کی نہایت بھاری بھر کم عورت تھی۔

ابھی وہ صوفے پر بیٹھنے کا ارادہ ہی کر رہی تھی کہ فون کی گھنٹی پھر بجی۔ اُس نے سوچا یہ رینڈل نہیں ہو سکتا، اس لیے ریسیور اُٹھانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ رات ابھی دُور تھی لیکن کیتھرین کو ابھی سے وحشت ہونے لگی۔ اُسے گھر کے در و دیوار سے خوف سا آ رہا تھا لیکن اُس نے عزم کر لیا کہ اُسے یہیں رہنا ہے۔ دل بہلانے کے لیے اُس نے ٹام کے گھر جانے کا فیصلہ کیا۔ بغلی دروازہ کھول کر وہ کھلے احاطے میں آ گئی اور پھر گارڈنیا کی باڑ سے گزر کر ٹام کے دروازے پر پہنچ گئی۔ گھنٹی دینے پر ٹام نے دروازہ کھولا۔ وہ کیتھرین کو دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ تین ماہ پہلے اُس نے یہ مکان ٹام کو کرایے پر دیا تھا اور آج پہلی دفعہ وہ یہاں قدم رکھ رہی تھی۔ اُس نے گھر کے در و دیوار کا بغور جائزہ لیا۔ ٹام نے مکان کو اچھے طریقے سے سنبھال رکھا تھا۔ کیتھرین ڈرائنگ رُوم میں آ کر بیٹھ گئی۔ اُس کے والد اس کمرے کو انتظار گاہ کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ اچانک اُس کی نگاہ دروازے کے بالائی حصے پر پڑی اور وہ چونک پڑی۔ شاید اُسے کچھ یاد آیا تھا۔ وہ اُٹھ کر دروازے کے پاس پہنچی اور چوکھٹ پر ہاتھ پھیر کر دیکھنے لگی۔ ایک جگہ چھوٹا سا بٹن نظر آ رہا تھا۔

"یہ کیا ہے؟" ٹام نے پُوچھا۔

"یہ دراصل ایک ہنگامی گھنٹی کا بٹن ہے۔ یہ گھنٹی ڈیڈی نے مریضوں کی سہولت کے لیے لگائی تھی۔ اگر رات کے وقت کسی کو ڈیڈی کی ضرورت پیش آتی تو وہ یہ بٹن دبا دیتا تھا۔"

"ونڈرفل۔" ٹام نے دلچسپی سے کہا۔ "کیا یہ اب بھی کام کرتی ہے؟"

"کام تو کرتی ہے، لیکن تم اسے استعمال کر کے مجھے تنگ نہیں کرو گے۔"

"تم بے فکر رہو۔ مَیں جانتا ہُوں تم پہلے ہی کئی ذہنی صدمے برداشت کر چکی ہو۔" ٹام نے ہنستے ہُوئے کہا۔

"بہت شکریہ!" پھر وہ کچھ یاد کرتے ہُوئے بولی، "ٹام! جہاں تک مجھے یاد ہے تم جمعے کی رات اپنی گاڑی پر کہیں گئے تھے۔ اُس وقت مَیں سونے کی کوشش کر رہی تھی۔ تم جانتے ہو تمہاری کھٹارہ گاڑی کی آواز سینکڑوں میں پہچانی جا سکتی ہے۔"

ٹام نے اثبات میں سر ہلاتے ہُوئے کہا کہ وہ ایک دوست سے ملنے گیا تھا۔ کیتھرین نے ٹام سے کہا: "اُسی رات لیونا قتل کی گئی تھی۔ کیا تم نے قصبے میں کوئی غیر معمولی چیز نوٹ کی تھی؟"

ٹام نے کچھ سوچتے ہُوئے کہا "نہیں مَیں نے کوئی خاص چیز نہیں دیکھی لیکن پھر بھی اس معاملے میں میری معلومات تم سب لوگوں سے زیادہ ہیں۔" کسی انجانے خدشے کے تحت کیتھرین نے گھُور کر ٹام کو دیکھا اور نصیحت آمیز لہجے میں کہا: "لوگوں کو یہ سوچنے پر مجبور نہ کرو کہ تمہیں کوئی بہت اہم بات معلوم ہے۔ بعض اوقات کسی بات سے آگاہی بھی انسان کے لیے خطرناک ثابت ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے میرے ممّی، ڈیڈی اور لیونا کے قتل کی وجہ بھی یہی رہی ہو۔" ٹام اُس کی بات سمجھ رہا تھا۔ پھر بھی اُس نے اپنے دل کی بات کیتھرین کو بتانے میں کوئی عار نہیں سمجھا۔ اُس نے یہ انکشاف کیا کہ شیرف گیلیئن کا بیٹا قصبے میں منشّیات کا کاروبار کرتا ہے اور جیسا کہ شیرف خود اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ مس لیونا بلیک میلنگ بھی کرتی تھی، ہو سکتا ہے شیرف کے بیٹے نے اُس کا مُنہ بند رکھنے کے لیے اُسے بڑی بڑی رقوم دی ہوں اور آخر زچ ہو کر اُس کا کام تمام کر دیا ہو۔

ٹام کی بات یکسر نظر انداز نہیں کی جا سکتی تھی۔ تھوڑی دیر اس موضوع پر گفتگو کرنے کے بعد کیتھرین اپنے گھر میں لوٹ آئی۔ شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ اُس نے مختلف کمروں کی روشنیاں جلا دیں۔ جب وہ ٹی وی آن کرنے کا سوچ رہی تھی تو اطلاعی گھنٹی بج اُٹھی۔ اس مرتبہ رینڈل تھا۔ پچھلے دو روز میں وہ اچانک رینڈل کے بہت قریب آ گئی تھی۔ رینڈل اور کیتھرین کے خاندانوں میں بہت پرانے روابط

تھے۔ قصبے کی مختصر اور محدود زندگی میں ایک دوسرے سے ملنے کے مواقع بے شمار تھے۔ کیتھرین، رینڈل اور اُس کے بھائی بہنوں میں کھیل کر جوان ہُوئی تھی۔ ایک سال پہلے وہ رینڈل کے ہفت روزہ میں ملازم ہُوئی تھی۔ اُس وقت سے اب تک اُن کے درمیان بالکل رسمی قسم کے تعلّقات تھے۔ ہاں ایک دوبار اُس نے رینڈل کی آنکھوں میں ایک مُبہم تحریر دیکھی تھی جسے وہ اب صاف پڑھ سکتی تھی۔ رینڈل اُس سے محبّت کرتا تھا۔

اُس نے کافی بناتے ہُوئے رینڈل کی طرف دیکھا۔ وہ نشست گاہ میں بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا۔ اپنے مضبوط اور ورزشی جسم سے وہ کسی صورت رسالے کا ایڈیٹر نہیں لگتا تھا۔ کیتھرین نے سوچا اگر وہ عینک اُتار دے تو اتھلیٹ نظر آئے لیکن پھر اپنے خیال پر وہ خود ہی مُسکرا دی۔ وہ جانتی تھی عینک کے بغیر اخبار کی تحریر تو کیا اُسے اخبار بھی نظر نہیں آئے گا۔ کافی پیتے ہُوئے وہ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ کیتھرین محسوس کر رہی تھی کہ خاصی دیر سے وہ کچھ کہنے کی کوشش کر رہا ہے۔ آخر اُس نے کیتھرین کو باہر گھومنے کی دعوت دی لیکن اُس نے نہایت سلیقے سے انکار کر دیا۔ رینڈل نے ایک شریف اور بُردبار آدمی کی طرح اس انکار کو برداشت کیا۔ پھر وہ اُس سے رُخصت ہو کر اپنی گاڑی کی طرف چل دیا۔

کیتھرین نے اُسے کھڑکی میں سے جاتے ہُوئے دیکھا۔ وہ کچھ بُجھا بُجھا ہُوا نظر آ رہا تھا۔ کیتھرین کو اپنے انکار پر دُکھ تھا لیکن وہ اپنی مقرر کردہ حدُود کو پھلانگنا نہیں چاہتی تھی اور اپنے معاشرے کی زبُوں حالی سے واقف تھی۔ ہر طرف فحاشی کا دَور دَورہ تھا۔

*

منگل کا دن روشن تھا۔ تین چُھٹّیوں کے بعد کیتھرین دفتر جانے کے لیے گاڑی میں بیٹھ رہی تھی کہ اچانک اُس نے ڈاکٹر میو کی گاڑی دیکھی۔ وہ جاتے جاتے سڑک پر رُک گیا تھا۔

"ہیلو کیتھرین! کیسی گزر رہی ہے؟" اُس نے حسبِ معمول ہانک لگائی۔

یہ اُس کا روز کا معمول تھا۔ دفتر کے لیے نکلتے وقت عمُوماً دونوں کی ملاقات ہو جاتی تھی۔ کیتھرین نے اُسے کبھی مُنہ نہیں لگایا لیکن وہ بلا کا ڈھیٹ تھا۔ پچھلے دنوں جب کیتھرین نے اُس کی شادی کی درخواست ٹُھکرائی تھی تو اُس کا خیال تھا کہ اب وہ کبھی اُسے مُنہ نہیں دکھائے گا لیکن اُس کی بدتمیزی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ کیتھرین نے بڑے خشک انداز میں اُس کے سلام کا جواب دیا اور گاڑی میں بیٹھ کر ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔

دفتر پہنچ کر اُس نے اپنے ہمکاروں کی طرف دیکھا۔ تمام نگاہیں غیر محسوس طور پر اُس پر جمی ہُوئی تھیں۔ ایک دو ساتھیوں سے سلام دُعا کے بعد وہ اپنی نشست پر جا بیٹھی۔ حسبِ معمول ہفتے کا پہلا دن کام کا انبار لے کر آیا تھا۔ کیتھرین ہفت روزہ 'گزٹ' میں سوسائٹی کا صفحہ مرتّب کرتی تھی۔ اس صفحے میں زیادہ تر شادی اور سالگرہ کی تقریبوں کا احوال ہوتا تھا۔ شاید شادی کی خبریں چھاپ چھاپ کر ہی وہ اپنے لیے شادی کو ضروری خیال کرنے لگی تھی۔ ورنہ جس ماحول میں وہ رہتی تھی، وہاں ان باتوں کی پروا کم ہی کی جاتی تھی۔

"مَیں نے سُنا ہے تم نے پولیس کو مارٹن کے خلاف بیان دیا ہے۔" اس آواز پر کیتھرین نے چونک کر بائیں طرف دیکھا۔ اُس کی ساتھی ٹائپسٹ جیول اُس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جیول تیکھے نین نقش کی لمبی تڑنگی جلد دوست بنانے والی عورت تھی۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں۔ مَیں نے صرف اس بات کا ذکر کیا تھا کہ ہفتے کی صُبح مارٹن ایک پِک اپ پر قصبے کی طرف آ رہا تھا۔"

کیتھرین دو دن سے سوچ رہی تھی لیکن اُسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ اُس نے مارٹن کو کس مقام پر دیکھا تھا۔ اب اُسے یاد آ گیا تھا کہ وہ جیول کے گھر کی طرف سے بڑی سڑک پر آیا تھا۔ جیول اُس سے کہہ رہی تھی کہ تم نے اس بارے میں بیان

دے کر مارٹن کو مشکل میں ڈال دیا ہے۔ اُس کی بیوی نہایت شکّی مزاج عورت ہے۔ پرسوں سے اُن کے گھر میں جھگڑا ہو رہا ہے۔ وہ سمجھ رہی ہے کہ مارٹن کا لیونا سے رومان تھا اور اُس سے ملنے کے لیے جھونپڑی میں گیا تھا اور اُسے مرا ہُوا دیکھ کر واپس بھاگ آیا۔ کم بخت یہ بات بھی نہ سمجھی کہ مارٹن اور لیونا کا بھلا کوئی جوڑ تھا؟ کیتھرین گہری نظروں سے جیول کو دیکھ رہی تھی۔ اچانک اُسے یاد آیا کہ ایک دفعہ پہلے وہ مارٹن اور جیول کو ایک ریسٹورنٹ میں دیکھ چکی ہے۔ اس کا مطلب تھا... کہ مارٹن اور جیول محبّت کا کھیل کھیلنے میں مصروف تھے۔

یقیناً ایسا ہی تھا۔ کیتھرین کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ مارٹن کے گھریلو حالات ایسے تھے کہ وہ اس راز کے افشا کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اگر اُس کی جھگڑالو بیوی طلاق مانگتی تو مارٹن کو ایک بڑی رقم سے محروم ہونا پڑتا۔ ہو سکتا ہے لیونا اُسے بلیک میل کر رہی ہو۔ بالآخر تنگ آ کر مارٹن نے یا مارٹن اور جیول دونوں نے لیونا کا کام تمام کر دیا ہو۔

کیتھرین کے عین سامنے اُنّیس بیس سالہ خوبرو کاپی پلیسٹر پنکی کی نشست تھی۔ پنکی جب نئی نئی دفتر آئی تو کیتھرین کے کرایے دار ٹام نے اُس پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کی لیکن کیتھرین کی بروقت نصیحت نے پنکی کو اس چکّر میں گرفتار ہونے سے بچا لیا تھا۔ یُوں وہ کیتھرین کا بہت احترام کرنے لگی اور اپنے دل کی باتیں اُس پر بے جھجک کھول دیا کرتی تھی۔ پنکی کیتھرین کے پاس رازدارانہ انداز میں آ کر بولی:

"کیتھرین! مَیں نے اخبار میں مِس لیونا کے قتل کے بارے میں پڑھا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہُوا کہ لاش آپ نے دریافت کی تھی۔ پولیس اس بارے میں آپ سے پُوچھ گچھ کر رہی ہوگی۔ دراصل مَیں لیونا کے متعلّق ایک اہم بات جانتی ہُوں۔ ہو سکتا ہے اس سے قتل پر کوئی روشنی پڑ سکے۔" کیتھرین ہمہ تن گوش ہو گئی۔ پنکی نے کہا: "شاید آپ کو اس بات کا پتہ نہ ہو کہ لیونا اسقاطِ حمل کا کام بھی کرتی تھی۔"

کیتھرین پہلے تو اس انکشاف پر بھونچکّی رہ گئی پھر اُس نے کچھ سوچتے ہُوئے کہا: "پنکی، یہاں سے صرف تیس میل دُور میمفس (MEMPHIS) میں اسقاطِ حمل کو قانُونی تحفّظ حاصل ہے کیا اس عمل کے خواہشمند وہاں نہیں جا سکتے؟" پنکی نے جواب میں کہا کہ اُسے اچھّی طرح معلوم ہے لیکن اس صورت میں عورتوں کو کم از کم دو دن گھر سے باہر رہنا پڑتا ہے۔ کوئی نوجوان لڑکی والدین کو بتائے بغیر کس طرح میمفس جا سکتی ہے اور دوسری بات یہ کہ لیونا میمفس کے مقابلے میں نہایت سستی بھی تھی۔ کیتھرین نے پنکی کو گھُورتے ہُوئے پُوچھا کہ اُسے یہ سب باتیں کیسے معلوم ہُوئیں؟ پنکی کچھ دیر خاموش رہی۔ شاید اخلاقی جرأت کا سہارا لے رہی تھی پھر اُس نے اعتراف کیا کہ آج سے پانچ ماہ قبل وہ خود بھی اسقاط کرا چکی ہے۔

پانچ ماہ کا سُن کر کیتھرین کو قدرے اطمینان ہُوا۔ اُس کا مطلب تھا یہ اُس کے والد کی وفات کے بعد کا واقعہ ہے۔ اب اُسے یاد آیا کہ شیرف نے اُس سے یہ سوال کیوں کیا تھا کہ لیونا کے پاس اُس کے والد کے اوزار تو نہیں۔ کیتھرین کو علم تھا کہ وہ اوزار جو ڈاکٹر میو نے خریدے تھے لیونا نے سنبھال لیے تھے۔ اس کا مطلب تھا ان ہی اوزاروں سے وہ اسقاطِ حمل کا گھناؤنا کام کرتی تھی۔

دروازے میں حرکت پیدا ہُوئی۔ کیتھرین نے دیکھا ٹام لمبے ڈگ بھرتا اُس کی طرف آ رہا ہے۔ اُس نے بتایا کہ آج وہ صبح سے لیونا کے قتل کے سلسلے میں لوگوں سے انٹرویو لے رہا ہے۔ کیتھرین کے پُوچھنے پر اُس نے اعتراف کیا کہ ابھی تک کوئی نئی بات معلوم نہیں ہو سکی۔ پھر وہ اپنی کھٹارہ کار کارونا لے کر بیٹھ گیا۔ اُس نے بتایا کہ گاڑی پھر خراب ہو گئی ہے اور وہ اُسے ورکشاپ چھوڑ آیا ہے۔ اتنے میں 'گزٹ' کا ایڈیٹر رینڈل آتا دکھائی دیا۔ اُسے دیکھ کر ٹام نے کھسکنے میں عافیت سمجھی۔

رینڈل تھوڑی ہی دیر اُس کے پاس بیٹھا تھا کہ چھُٹّی کا وقت ہو گیا۔ دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہُوئے دفتر سے باہر آ گئے۔

کیتھرین نے رینڈل کو اپنی گاڑی میں بیٹھنے کی دعوت دی۔
وہ بیٹھ گیا تو کیتھرین نے اُس سے کہا "لیونا کے گھر سے ملنے
والی رقم سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ قصبے کے بہت سے
افراد کو بلیک میل کر رہی تھی۔ ایک طرف حمل گرواتی اور دوسری
طرف اپنے بدنصیب مریضوں کے راز سے فائدہ بھی اُٹھاتی
تھی۔ اب نہ معلوم کون کون اُس کے ستم کا نشانہ بنا۔ ہر ایک
پر شک کیا جا سکتا ہے۔"

کیتھرین کے خاموش ہونے پر رینڈل نے کہا: "اب
تم اس بارے میں کس کس پر شک کرتی ہو؟"

کیتھرین نے بلاتوقف مارٹن، جیول اور شیرف کے بیٹے
کے بارے میں بتا دیا۔ اُس نے ٹام کے متعلق بھی بتایا کہ
وہ واردات کی رات اپنی کار پر سوار ہو کر کہیں گیا تھا۔ تھوڑی دیر
وہ مختلف امکانات پر غور کرتے رہے۔ پھر رینڈل گاڑی سے
نیچے اُتر آیا اور کیتھرین گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔

اُس شام کیتھرین باورچی خانے میں برتنوں کو دُرست کر کے
رکھ رہی تھی ـــــ اچانک اُس کا ہاتھ ایک غیر مانوس چیز سے
ٹکرایا ـــــ یہ مولی کی دی ہُوئی ڈِش تھی۔ اُس نے سوچا چلو
اسے واپس کر آؤں۔ مس مولی کے گھر پہنچ کر اُس نے گھنٹی کا
بٹن دبایا تو غیر متوقع طور پر مسٹر پارکنز دروازے میں نظر آئے۔
اُنھوں نے ہمیشہ کی طرح لمبی آستینوں کی قمیص پہن رکھی تھی۔
اُن کے تنومند جسم نے پُورے دروازے کو روک رکھا تھا۔
رسمی کلمات ادا کرتے ہُوئے مسٹر پارکنز نے اُسے اندر آنے
کا راستہ دیا۔ سامنے ہی مولی بیٹھی بُنائی کر رہی تھی۔

کیتھرین نے ڈِش کے لیے شکریہ ادا کیا۔ وہ جلد ہی جانا
چاہتی تھی لیکن مسٹر پارکنز کی شفقت نے اُسے بیٹھنے پر مجبور
کر دیا۔ اُنھوں نے مولی سے کافی لانے کے لیے کہا۔ جب
مولی کافی لینے چلی گئی تو مسٹر پارکنز، کیتھرین کے ڈیڈی کا ذکر
کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد مولی کافی لے آئی۔ وہ کچھ گھبرائی
ہُوئی لگ رہی تھی۔ مسٹر پارکنز کو کافی تھماتے ہُوئے اُس کے
ہاتھ کانپے اور اُبلتی ہُوئی کافی پارکنز کے ہاتھوں پر جا گری۔ کیتھرین

کا خیال تھا کہ مسٹر پارکنز چیخ پڑیں گے لیکن اُنھوں نے غیر معمولی
تحمّل سے یہ تکلیف برداشت کر لی۔ وہ یُوں ظاہر کر رہے
تھے جیسے کچھ ہُوا ہی نہیں۔ وہ مرہم لگانے کے لیے باتھ رُوم کی
طرف چلے گئے۔ جُونہی مسٹر پارکنز ہاتھ پر پٹّی باندھے واپس آئے
کیتھرین کُرسی سے اُٹھ کھڑی ہُوئی۔ اُس نے دونوں سے اجازت
طلب کی۔ مسٹر پارکنز 'نہیں نہیں' کہنے کے باوجود اُسے گھر تک
چھوڑنے آئے۔ کیتھرین نے کہا "مولی کچھ گھبرائی ہُوئی نظر آ رہی
تھیں کیا وہ بیمار ہیں؟"

پارکنز نے نفی میں جواب دیا تو کیتھرین نے کہا:
"میرا خیال ہے مولی کو مجھ پر شک ہے۔ شاید وہ سمجھتی ہے
کہ لیونا کی موت میں میرا ہاتھ ہے۔ شاید اسی لیے میری موجودگی
میں وہ خوفزدہ ہو؟"

"ہاں، یہ ٹھیک ہے،" مسٹر پارکنز نے اُس کے
شانے پر ہاتھ رکھتے ہُوئے کہا: "وہ تمھاری وجہ سے خوفزدہ
ہے لیکن اس لیے نہیں کہ وہ تمھیں خدانخواستہ قاتل سمجھتی ہے
بلکہ اس لیے کہ وہ تمھیں خطرے میں گھرا ہُوا محسوس کرتی ہے۔"

کیتھرین نے وضاحت طلب نظروں سے مسٹر پارکنز
کی طرف دیکھا۔ اُنھوں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہُوئے کہا:
"تین ایسے افراد قتل ہو چکے ہیں جن کا تمھارے ساتھ قریبی رشتہ
ہے۔ ایک بزرگ کی حیثیت سے میرا مشورہ ہے کہ اپنے

بارے میں محتاط رہو۔ تمہارا تنہا رہنا مناسب نہیں۔ اگر تم چاہو تو کچھ دنوں کے لیے ہمارے ہاں آسکتی ہو۔"

وہ اُن کی تجویز سے متفق نہیں تھی پھر بھی اُس نے بات پر غور کرنے کا وعدہ کیا اور احتیاط سے اپنے گھر کا دروازہ کھولا۔ شاید یہ پہلا موقع تھا کہ اُس نے کسی ہمسائے کے گھر جاتے ہُوئے دروازے کو تالا لگایا تھا۔ مسٹر پارکنز نے کہا" اگر تمہیں کسی قسم کی مدد کی ضرورت ہو تو ہم حاضر ہیں "۔۔۔ کیتھرین نے یہاں تک آنے پر پارکنز کا شکریہ ادا کیا۔ خدا حافظ کہہ کر وہ پیچھے مُڑے لیکن پھر رُک گئے۔ شاید اُنہیں کوئی بات یاد آ گئی تھی۔ اُنھوں نے کہا:

"کیتھرین! میرے بڑے بیٹے کا طبّی ریکارڈ تمہارے ڈیڈی کے پاس تھا۔ کیا ڈاکٹر میبو تمہارے ڈیڈی کے تمام کاغذات اپنے ساتھ لے گیا ہے؟"

کیتھرین نے اُسے بتایا کہ ریکارڈ ابھی تک سابقہ دفتر کی بالائی منزل پر ہے۔ اگر وہ ضروری خیال کرتے ہیں تو وہ کل اُن کے بیٹے کی فائل ڈھونڈ کر لا دے گی۔ مسٹر پارکنز نے معذرت کے لہجے میں کہا کہ ایسی کوئی جلدی نہیں۔ پانچ چھ روز سے پہلے ضرورت نہیں پڑے گی۔ پارکنز کے رُخصت ہونے کے بعد اُس نے سارے گھر کی بتیاں جلائیں۔ اچھی طرح کونے کُھدروں کا جائزہ لیا۔ پھر بتیاں بُجھا کر اپنے بیڈ رُوم میں آ گئی اور دروازے کو مقفّل کر کے بستر پر گر گئی ۔۔۔۔ دُور گلی میں ایک سایہ بے چینی سے متحرّک تھا۔

*

دوسرے دن صبح جب کیتھرین دفتر کے لیے تیار ہو رہی تھی کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اُس نے رسیور اُٹھایا۔ دوسری طرف ٹام تھا۔ وہ اُسے بتا رہا تھا کہ اُس کی گاڑی ابھی تک ورکشاپ میں ہے، اس لیے دفتر جانے کے لیے اُسے لفٹ کی ضرورت ہے۔ مہینے میں ایک آدھ بار ایسا موقع ضرور آتا جب اپنی کھٹارہ ویگن کے طفیل ٹام کو کیتھرین سے لفٹ کی درخواست کرنا پڑتی تھی۔ کیتھرین نے بے تکلفی سے کہا:

"ٹام کے بچّے! آنا ہے تو جلدی آؤ میں بالکل روانہ ہونے والی ہُوں۔"

"ٹام کے بچّے" نے واقعی دیر نہیں کی۔ ادھر کیتھرین نے رسیور رکھا اُدھر وہ آ موجود ہُوا۔ دفتر پہنچ کر دونوں اپنے اپنے کاموں میں جُت گئے۔ وہ دوپہر تک بے حد مصروف رہی۔ سرِ ورق کی کہانی لیونا کے قتل پر مبنی تھی اور ٹام اُسے مکمّل کرنے کے لیے زبردست بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔ قریباً ایک بجے کیتھرین نے ٹائپ رائٹر سے سر اُٹھایا تو ٹام کے کمرے میں گہما گہمی آ گئی۔ شیشے کے دوسری طرف ٹام اور شیرف گیلیئن بڑے انہماک سے مصروفِ گفتگو تھے۔ ٹام کی چرب زبانی شیرف سے نئی نئی باتیں اُگلوا رہی تھی۔ قریب ہی مسٹر پارکنز ہاتھ میں ایک فائل پکڑے کھڑے تھے۔ جب اُنھوں نے کیتھرین کو اپنی طرف متوجّہ پایا تو چہرے پر مسکراہٹ بکھیرتے اُس کی طرف بڑھ آئے۔ کیتھرین مصروفیّت کی اس گھڑی میں کسی گفتگو کی متحمّل نہیں ہو سکتی تھی لیکن پارکنز سے بے رُخی برتنا بھی مشکل تھا۔ اُس نے خوش اخلاقی سے اُن کا استقبال کیا۔ وہ کُرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئے۔

"بھئی آج رات تم اپنے بُوائے فرینڈ کے ساتھ ہمارے گھر مدعو ہو۔" مسٹر پارکنز نے بے تکلفی سے کہا۔ کیتھرین اس اچانک حملے پر گھبرا گئی۔

"کون بُوائے فرینڈ؟" اُس نے حیرت سے پُوچھا۔

"بھئی وہی تمہارا کرایے دار۔ کیا نام ہے اُس کا، ٹام؟"

کیتھرین نے دلکش انداز میں مُسکراتے ہُوئے اپنا سر نفی میں ہلایا۔ وہ کن انکھیوں سے رینڈل کے کمرے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ فیصلہ کر چکی تھی اور اُس کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد رینڈل ہو گا ۔۔۔۔ اور شاید آخری بھی۔ اُس نے مسٹر پارکنز کو بتایا کہ ٹام اُس کا بُوائے فرینڈ نہیں صرف کرایے دار ہے۔ جاتے ہُوئے پارکنز نے ایک دفعہ پھر اپنے گھر میں آنے کی دعوت دی۔ تھوڑی دیر بعد کیتھرین لنچ کھانے گھر چلی گئی۔ دفتر واپس پہنچ کر وہ شام تک مصروف رہی۔ رینڈل سے صرف چند منٹ بات چیت ہُوئی۔ اُس نے کیتھرین سے ہفتے کے اختتام تک

سیر کے لیے درخواست کی۔ کیتھرین نے یہ دعوت قبول کر لی۔ ٹام کی گاڑی ابھی تک ٹھیک نہیں ہوئی تھی۔ شام گھر جاتے وقت وہ اُس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ٹام کی صرف ایک بات کیتھرین کو ناپسند تھی۔ وہ لڑکیوں کے بارے میں گفتگو کرتے وقت بڑا غیر محتاط ہو جاتا تھا۔

*

اگلے دن کیتھرین نے گھر کی صفائی کی اور پھر تھک ہار کر آرام کرسی پر نیم دراز ہو گئی۔ اُس کا ذہن ایک بار پھر مس لیونا کے قتل میں اُلجھ گیا۔ رات آئی تو اُس نے اُٹھ کر گھر کے دروازے دیکھے۔ صرف سامنے والا دروازہ کُھلا تھا۔ مکان میں مکمل خاموشی تھی۔ اچانک وہ ایک مدّھم سی آواز پر چونک گئی۔ یُوں محسوس ہُوا جیسے کوئی گھاس میں دبے پاؤں چل رہا ہو۔ اُس نے کھڑکی سے باہر جھانکا کوئی چیز نظر نہیں آئی۔ تھوڑی دیر بعد پھر کسی کے بھاگتے قدموں کی آواز آئی۔ اس دفعہ آواز اتنی واضح تھی کہ کیتھرین کو اپنا دل اُچھل کر حلق میں آتا محسوس ہُوا۔ وہ گھر کا صدر دروازہ بند کرنے کے لیے اُٹھی تو اُسے شیرف کو مطّلع کرنے کا خیال آیا۔ پھر اُس نے سوچا آخر شیرف سے کیا کہے گی۔ اچانک اُسے گھنٹی کی ایک مخصوص آواز سُنائی دی۔ وہ سوچنے لگی اور پھر اُسے اندازہ ہُوا کہ گھنٹی کی آواز اُس کے ڈیڈی کے کمرے سے آرہی ہے۔ یہ ہنگامی گھنٹی کی آواز تھی۔ کوئی اُس کے ڈیڈی کو بُلا رہا تھا... لیکن وہ تو مر چکے تھے اور پھر جیسے اُسے ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ سمجھ گئی کہ ٹام گھنٹی بجا رہا ہے۔ کیا وہ اُس سے کوئی شرارت کر رہا تھا؟ لیکن نہیں۔ اُس نے تو بڑی سنجیدگی سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اُسے تنگ نہیں کرے گا... کیتھرین سر سے پاؤں تک لرز گئی۔ گھنٹی کی آواز تیسری بار سُنائی دی۔ اُس نے جھپٹ کر دراز کھولی، ریوالور نکالا اور بھاگتی ہُوئی کمرے سے باہر آ گئی۔ ایک بٹن دبا کر اُس نے گھر کا بغلی صحن روشن کیا۔ وہ بالکل خالی تھا۔ وہ بھاگتی ہُوئی زمین کے خالی قطعے میں سے گزری اور دوسری طرف پہنچ گئی۔ اب وہ ٹام کے گھر کے پچھواڑے کھڑی تھی جس کا عقبی دروازہ کُھلا ہُوا تھا... کُھلے دروازے کو دیکھ کر اُسے اپنی سانس رُکتی محسوس ہُوئی۔ گھنٹی کی آواز نے اُسے اتنا خوفزدہ نہیں کیا تھا جتنا اس کُھلے دروازے نے کیا۔ وہ سمجھ گئی کوئی نہایت خوفناک واقعہ رُونما ہو چکا ہے۔ پستول تھامے وہ آہستہ آہستہ دروازے کے قریب پہنچی۔ دہلیز میں قدم رکھا تو کمرہ بالکل خالی تھا۔ وہ دوسرے اور پھر تیسرے کمرے میں پہنچی لیکن کوئی دکھائی نہیں دیا۔ ہال کمرے کا دروازہ ادھ کُھلا تھا۔ اُس نے دھیمے لہجے میں دو تین بار ٹام کو آوازیں دیں پھر دروازے میں سے جھانکا اور اُسے ٹام کی لمبی لمبی ٹانگیں نظر آئیں۔ وہ جی کڑا کر کے آگے بڑھی اور تب ٹام کا سارا جسم اُس کے سامنے آ گیا۔ وہ پُشت کے بل فرش پر گرا ہُوا تھا۔ اُس کی آنکھیں نیم وا تھیں۔ سر خُون میں لتھڑا ہُوا تھا۔ خُون کی ایک پتلی لکیر ابھی تک اُس کے رُخسار پر دوڑ رہی تھی۔ کیتھرین نے قطرہ قطرہ خُون قالین میں جذب ہوتے دیکھا۔ اُس نے ٹام کی نبض ٹٹولی۔ اُس کی اُنگلیوں کے نیچے گردن کی شریان نے ایک دو بار حرکت کی اور پھر ساکت ہو گئی... ٹام مر چکا تھا۔ اُس کا بھائیوں جیسا دوست اب اس دُنیا میں نہیں رہا تھا۔ دفعتاً اُسے اپنے سامنے شیشے کے پیچھے حرکت محسوس ہُوئی۔ اُس نے اپنی اُنگلی پستول کی لبلبی پر رکھی تب دروازہ کُھلا اور اُسے پنکی کا چہرہ نظر آیا وہ حواس باختہ نظروں سے اُس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"پنکی! ٹام مر چکا ہے۔" اُس نے بھرّائی ہُوئی آواز میں کہا۔

پنکی سکتے کے عالم میں کھڑی تھی۔ کیتھرین نے ہاتھ بڑھا کر اُسے چھُونے کی کوشش کی تو وہ تڑپ کر پیچھے ہٹ گئی۔

"خبردار! مجھے ہاتھ نہ لگانا۔" وہ چیخی۔

اور تب کیتھرین نے اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا تو تمام کا تمام ٹام کے خُون سے رنگین تھا۔

پنکی اب بلند آواز میں رو رہی تھی۔ کیتھرین کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ اُسے ٹام کا قاتل سمجھ رہی ہے۔ اُس نے پنکی کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن اُس کی چیخیں بلند سے بلند تر ہوتی گئیں۔ کیتھرین نے محسوس کیا کہ اُسے ہسٹیریا کا دورہ پڑ گیا ہے۔ اس

کیفیت سے نجات دلانے کے لیے اُس نے دو زوردار تھپّیڑ پنکی کے مُنہ پر جڑ دیے: "بے وقوف لڑکی! تم مجھے ٹام کی موت کا ذمّے دار سمجھ رہی ہو، مَیں تو اُس کی مدد کے لیے آئی تھی۔ یہ دیکھو۔" اُس نے چوکھٹ کے اُوپر لگے بٹن کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے کہا: "ٹام نے جدّوجہد کے دوران میں یہ بٹن دبایا تھا جس کا تعلق ہمارے گھر میں لگی گھنٹی سے ہے۔"

اب پنکی کچھ کچھ سمجھ رہی تھی۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ کئی مرتبہ ڈاکٹر کے پاس آ چکی تھی اور اس بٹن کے بارے میں جانتی تھی۔ کیتھرین نے اُس کے قریب پہنچ کر اُس کے شانے پر ہاتھ رکھّا اور پُوچھا تم ٹھیک تو ہو؟

پنکی کے چہرے پر بے چینی کے آثار تھے۔ اُس نے کہا "مجھے قے آ رہی ہے۔" کیتھرین اُسے جلدی سے غُسل خانے میں لے گئی۔ اُس کا اپنا دل بھی بُری طرح متلا رہا تھا۔ وہ فوراً اس منحوس جگہ سے نکل جانا چاہتی تھی۔ اُس نے پنکی کی خستہ حالت کے پیشِ نظر اُس سے پُوچھا: "کیا تم چل سکو گی؟" پنکی نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ اُسے گھسیٹتی ہُوئی اپنے گھر تک لائی۔ پھر اُسے ایک صوفے پر بٹھا کر اُس نے شیرف کو ٹیلیفون کیا۔ دوسری طرف سے عملے کا ایک آدمی بولا۔ کیتھرین نے اُسے اپنا نام بتایا اور کہا جتنی جلد ہو سکے شیرف کو یہاں بھیج دو۔ پھر اُس نے رنیڈل کو رِنگ کیا اور ٹام کے قتل کی اطلاع دی۔

پھر وہ پنکی کی طرف متوجّہ ہُوئی جو خاموشی سے آنسو بہا رہی تھی۔ کیتھرین نے اُس کی طرف شکایتی نظروں سے دیکھا۔ پنکی نے سر جُھکا لیا۔ پھر وہ رُندھی ہُوئی آواز میں بولی: "مَیں آپ کی گناہ گار ہُوں۔ مَیں نے آپ کا کہنا نہیں مانا اور ٹام سے ملنے چلی آئی۔ ہم دونوں ڈرائنگ رُوم میں بیٹھے تھے۔ اچانک صحن کی طرف سے آہٹ سُنائی دی۔ ٹام نے مجھے خاموش رہنے کو کہا اور خود دبے پاؤں باہر نکل گیا۔ قریباً ایک منٹ بعد دھینگا مُشتی کی آوازیں آئیں۔ بے ساختہ میری چیخ نکل گئی۔ مَیں چونکہ چوری چُھپے ٹام سے ملنے آئی تھی اس لیے باہر نکلنے کی جُرأت نہ کر سکی۔ مجھے ڈر تھا کہیں میرا راز فاش نہ ہو جائے۔ تھوڑی دیر بعد خاموشی چھا گئی۔ مَیں آہستہ آہستہ چلتی ہُوئی باہر نکلی اور تب مَیں نے آپ کو پستول تھامے ٹام کی لاش کے پاس کھڑے پایا۔"

عین اُس وقت باہر سڑک پر ایمبولینس گاڑی اور پولیس کاروں کا شور سُنائی دینے لگا۔

*

کیتھرین کا گھر پولیس اسٹیشن کا منظر پیش کر رہا تھا۔ پولیس اہلِ کار موقعِ واردات کا معاینہ کرنے کے بعد کیتھرین کے ڈرائنگ رُوم میں اکٹھے ہُوئے۔ رنیڈل اور اُس کی والدہ بھی موجود تھیں ـــــــ پنکی پچھلے دس منٹ سے پولیس آفیسرز کے سوالوں کے جواب دے رہی تھی۔ اُس کے والدین بھی پہنچ چکے تھے۔ پنکی نے بڑی ہوشیاری سے والدین کے سامنے اپنی پوزیشن صاف کرتے ہُوئے کہا۔ وہ دفتری اُمور کے سلسلے میں ٹام سے ملنے آئی تھی۔

کیتھرین کے گرد شکوک کے بادل گہرے ہو رہے تھے۔ پُراسرار حالات میں بات تھی بھی تشکیک کی۔ چار دن کے اندر یہ دوسرا قتل تھا۔ دونوں مواقع پر وہ نہ صرف جائے واردات پر موجود تھی بلکہ لاش بھی اُسی نے دریافت کی تھی۔

دروازہ کُھلا اور شیرف داخل ہُوا۔ وہ بہت رنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ اُس نے ترحّم آمیز نظروں سے اُس لڑکی کی طرف دیکھا جسے وہ گود میں کھلاتا رہا تھا اور جو اب والدین کی موت کے بعد کٹھن حالات کا شکار تھی۔ وہ کیتھرین کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔ پولیس اب کیتھرین سے سوالوں کا سلسلہ شروع کرنے والی تھی۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔ اُسے معلوم تھا زبان کی ذرا سی لغزش اُسے باقی زندگی کے لیے جیل کی کال کوٹھڑی میں دھکیل سکتی ہے۔ ایک ڈپٹی نے پُوچھ گچھ کا آغاز کیا:

"ریٹا عرف پنکی کے مطابق اُس نے لڑائی بھڑائی کی آوازیں سُن کر چیخیں ماری تھیں۔ تمہارے گھر کی تمام کھڑکیاں بھی کُھلی ہُوئی تھیں۔ تم وہ چیخیں کیوں نہ سُن سکیں؟"

کیتھرین نے گلا صاف کیا: "پنکی ڈرائنگ رُوم میں

تھی جب کہ قتل ہال کمرے میں ہُوا۔ ڈرائنگ رُوم سے چیخ
کی آواز کا میرے کانوں میں پہنچنا محال تھا۔"

"تم ٹام کے گھر کیسے پہنچیں؟"

"مَیں ہنگامی گھنٹی کی آواز سُن کر اُس کی مدد کو گئی تھی۔"

"جب تم نے گھاس میں کسی کے چلنے کی آواز سُنی تو
پولیس کو فون کیوں نہیں کیا؟"

"مَیں سمجھی شاید یہ کوئی پرندہ وغیرہ ہے۔"

اس موقعے پر شیرف نے سوال شروع کیے: "کیا کبھی ٹام
نے ذکر کیا تھا کہ وہ مِس لیونا کے قتل کے بارے میں اہم بات
جانتا ہے؟"

"آپ کو معلوم ہے کہ وہ اپنی معلومات کے بارے میں
بلند بانگ دعوے کیا کرتا تھا لیکن جہاں تک مجھے علم ہے اُسے
اس بارے میں کوئی خاص بات معلوم نہیں تھی۔"

"ٹام کے کمرے سے نشہ آور سفوف کا ایک پیکٹ بھی
برآمد ہُوا ہے۔ اس بارے میں تم جانتی ہو؟"

"ہاں ... مَیں پچھلے ہفتے اُس کے گھر گئی تھی اور اُس نے
بتایا تھا کہ یہ سفوف اُس نے قصبے ہی سے خریدا ہے۔"

شیرف کے چہرے پر ایک رنگ آیا اور گیا۔ شاید اُس کا
دھیان اپنے بیٹے کی طرف چلا گیا تھا۔ پھر اُس نے پُوچھا: "ٹام کی
کار کہاں ہے؟"

"وہ ورکشاپ میں ہے۔"

شیرف گہری سوچ میں ڈُوبا ہُوا تھا۔ اُس نے خود کلامی
کے انداز میں کہا: "ٹام کی کار موجود نہیں تھی اور گھر کی بیشتر روشنیاں
بھی بُجھی ہُوئی تھیں۔ ہو سکتا ہے قاتل کسی چیز کی تلاش میں آیا ہو۔
وہ سمجھ رہا ہو کہ ٹام گھر میں موجود نہیں۔ پھر جب اچانک ٹام سامنے
آ گیا ہو تو اُسے قتل کر بیٹھا ہو۔ بعد میں اُس نے بِنکی کی چیخیں سُنی
ہوں اور اپنا مقصد حاصل کیے بغیر واپس چلا گیا ہو۔"

رنیڈل نے متین لہجے میں کہا: "اس کا مطلب یہ ہے کہ
قاتل بِنکی کی موجودگی سے بھی بے خبر تھا لیکن"..... اُس نے فقرے
کے درمیان کیتھرین کی طرف دیکھا اور اُس کی آنکھوں کا اشارہ

پا کر خاموش ہو گیا۔ دراصل وہ یہ کہنا چاہتا تھا کہ بِنکی کی کار قاتل کو
نظر کیوں نہیں آئی۔ بِنکی نے کیتھرین کو بتایا تھا کہ ٹام سے اپنی
ملاقات پوشیدہ رکھنے کے لیے اُس نے اپنی کار گھر سے خاصے
فاصلے پر رکھی تھی۔ اب اگر رنیڈل کے سوال کے نتیجے میں
شیرف اس بات سے باخبر ہو جاتا تو بِنکی کا یہ بیان غلط ہو جاتا
کہ وہ دفتری اُمُور کے سلسلے میں ٹام سے ملی تھی۔ کیتھرین اس
بات سے خوش تھی کہ رنیڈل نے اُس کا مافی الضمیر سمجھ کر سوال
اُدھورا چھوڑ دیا ہے۔

-*-

کوئی دو گھنٹے تفتیش کا سلسلہ جاری رہا۔ شام ڈھلے
پولیس کیتھرین کے گھر سے چلی گئی۔ بِنکی بھی اپنے والدین کے
ہمراہ رُخصت ہو گئی۔ شیرف نے کیتھرین کو بتایا تھا کل اُسے مزید
پُوچھ گچھ کے لیے دفتر آنا ہو گا۔ وہ سوچ رہی تھی ہو سکتا ہے
کل تک مَیں ایک اور لاش دریافت کرنے میں کامیاب ہو
جاؤں۔ اُوپر تلے کے حادثات نے اُسے بُری طرح پریشان
کر دیا تھا۔ رنیڈل نے کیتھرین سے کہا کہ وہ آج رات یہیں سے

گا، اُسے تنہا نہیں چھوڑے گا۔ اور یہ بات اُس نے اپنی والدہ
کو بھی بتادی ہے۔ رینڈل نے کیتھرین سے کہا اپنا یہ منحوس
لباس تبدیل کرلو۔ کیتھرین نے شاید پہلی مرتبہ غور سے اپنے کپڑوں
کو دیکھا۔ اُس کی پینٹ اور جیکٹ خون کے دھبّوں سے رنگین تھی،
بازوؤں پر بھی دھبّے تھے۔ وہ فوراً غسل خانے میں چلی گئی جب
اور لباس تبدیل کرکے آئی تو بُری طرح بجھی ہُوئی نظر آتی تھی۔ رینڈل
ٹیلیفون پر ٹام کے گھر والوں کو اطلاع دینے کا ناخوشگوار فریضہ
انجام دے رہا تھا۔ وہ ریسیور رکھ کر کیتھرین کی طرف مُڑا۔ اُس
کا چہرہ اُترا ہُوا تھا۔ اپنے ہونہار رپورٹر کی موت نے اُسے پژمردہ
بنادیا تھا اور کیتھرین کو پہلی بار احساس ہو رہا تھا کہ وہ اُس سے عمر
میں بارہ سال بڑا ہے۔ اُس نے اپنی عینک کے شیشے صاف
کرتے ہُوئے کہا: "کیتھرین! اب سو جاؤ۔" لیکن نیند کیتھرین
کی آنکھوں سے کوسوں دُور تھی۔ وہ خوف زدہ لہجے میں بڑبڑائی:

"پہلے میرے والدین... پھر میرے باپ کی نرس اور
اب ایک رپورٹر جس کا دعویٰ تھا کہ وہ قاتل کے بارے میں بہت
کچھ جانتا ہے۔"

رینڈل نے پائپ کا کش لیتے ہُوئے کہا: "کہیں ایسا تو نہیں کہ
تمہارے ڈیڈی بطور ڈاکٹر کوئی ایسی بات جانتے ہوں جو اُن کی
موت کا باعث بنی ہو؟"

"نہیں، یہ ضروری تو نہیں۔ قصبے کی اکثریّت ڈیڈی کو
دل و جان سے چاہتی تھی۔"

"تمہارے خیال میں کیا مس لیونا تمہارے والدین کو قتل کر
سکتی تھی.... تمہارے ڈیڈی کے بارے میں اُس کا رویّہ کیا تھا؟"

"بلیک میلنگ اور اسقاطِ حمل کا دھندا شروع کرنے
سے پہلے وہ مدّت تک ڈیڈی کی قابلِ اعتماد نرس رہی
ہے۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے وہ ڈیڈی سے محبّت کرتی تھی۔"

رینڈل نے ہنکارا بھرا: "ہوسکتا ہے یہ سوچ کر کہ وہ تمہارے
ڈیڈی کو کبھی حاصل نہیں کرسکے گی اُنہیں قتل کر دیا ہو۔"

"میرے خیال میں ایسا نہیں تھا۔ اُس کے لیے ڈیڈی
کی دن بھر کی رفاقت ہی بہت تھی۔ دوسری باتوں کے علاوہ
ایک نقطۂ نظر یہ بھی ہے کہ وہ ڈیڈی کی کار میں خرابی پیدا نہیں
کرسکتی تھی۔"

رینڈل بولا: "دونوں واقعات کے درمیان چھ ماہ کا وقفہ ہے۔
ممکن ہے کہ لیونا نے چھ ماہ تک اپنا مُنہ بند رکھا ہو اور قاتل اُسے
خاموشی کی قیمت ادا کرتا رہا ہو۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ لیونا کو تمہارے
ڈیڈی کی موت کے بعد اس راز کا پتہ چلا ہو۔ جب وہ دفتر کا
سامان منتقل کر رہی ہو یا اُن کے کاغذات دیکھ رہی ہو۔ یہ بھی امکان
ہے کہ اُس نے کوئی ایسی گفتگو سُنی ہو جو ڈاکٹر کے کسی مریض یا
دوست نے اُن کے ساتھ کی ہو۔"

کیتھرین نے اس سے اتفاق کرتے ہُوئے کہا: "ممکن ہے
کیونکہ لیونا کا کیبن ڈیڈی کے کیبن سے اتنا قریب تھا کہ وہ
مریضوں کے ساتھ اُن کی گفتگو آسانی سے سُن سکتی تھی۔ ہاں،
جب خاص طور پر کسی شخص کی پردہ پوشی مقصود ہوتی تو ڈیڈی لیونا
کو باہر جانے کا کہہ دیا کرتے تھے لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ وہ
دروازے سے کان لگا کر سُنتی رہتی ہو۔"

رینڈل اب سونے کے مُوڈ میں تھا۔ اُس نے کیتھرین
کا شانہ تھپتھپایا اور دوسرے کمرے میں جانے کے لیے اُٹھ گیا۔
کیتھرین نے بستر پر گر کر آنکھیں میچ لیں۔ آج وہ گھر میں اکیلی نہیں
تھی۔ دو مضبوط بازو اُس کی حفاظت کے لیے موجود تھے۔ تحفّظ
کا بے پناہ احساس لیے وہ نیند کی آغوش میں چلی گئی۔

*

صبح کو جب کیتھرین جاگی تو رینڈل جا چکا تھا۔ جانے سے
پہلے اُس نے کافی پی تھی۔ پیالی کے نیچے ایک پرچی رکھی ملی:
"گڈ مارننگ کیتھرین! تم بہت تھکی ہُوئی ہو۔ اس لیے کام پر نہ آنا۔
مَیں نے تمہیں جگانا چاہا لیکن پھر یہ سوچا کہ نیند تمہارے ذہن کے
لیے سب سے ضروری چیز ہے۔" کیتھرین مُسکرادی۔ پھر وہ جلدی
جلدی تیاری میں مصروف ہوگئی۔ اُسے بیان قلمبند کروانے کے
لیے شیرف کے دفتر پہنچنا تھا۔

*

اپنا طویل بیان قلمبند کروانے کے بعد جب وہ شیرف

کے دفتر کی سیڑھیاں اُتر رہی تھی، ایک ٹیکروڈوپی نے اس کا راستہ روک لیا۔ اس شخص کا نام مائیکل تھا جس کی ماں کیتھرین کے گھر صفائی کا کام کیا کرتی تھی۔ اُس نے کیتھرین کو اطلاع دی کہ اُس کی ماں اُسے یاد کر رہی ہے۔ اُس کے پاس کیتھرین کے لیے ایک اہم خبر ہے۔ کیتھرین نے تھوڑی دیر سوچا اور پھر فیصلہ کیا کہ دفتر جانے سے پہلے وہ مسز بیٹی سے ملے گی۔

جب وہ بوسیدہ پردہ اُٹھا کر بیٹی کے گھر داخل ہوئی، وہ کرسی پر بیٹھی اُونگھ رہی تھی۔ کیتھرین کی آہٹ سن کر اُٹھی اور بڑے تپاک سے ملی۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد اُس نے مس لیونا کا ذکر چھیڑ دیا۔

"مس لیونا کوئی اچھی عورت نہیں تھی۔ ٹھیک ہے سب انسان خدا نے بنائے ہیں لیکن اچھے بُرے کی تمیز بھی اُسی نے سکھائی ہے۔ مَیں جانتی تھی کہ لیونا تمہیں اور تمہاری ماں کو اچھا نہیں سمجھتی اس لیے مَیں ہر وقت اُس پر نگاہ رکھتی تھی۔ گا ہے گا ہے میں تمہارے ڈیڈی کے دفتر کی صفائی کے لیے بھی جایا کرتی تھی۔ ایک روز شام کے وقت مَیں کلینک گئی تو معاینے کے کمرے سے باتیں کرنے کی اُونچی آواز سنائی دے رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی شخص تمہارے ڈیڈی سے جھگڑ رہا ہو۔ یہ واقعہ تمہارے والدین کی موت سے تین روز پہلے کا ہے۔ مَیں اُس وقت نشست گاہ کی صفائی کر رہی تھی۔ اس کمرے میں امتحان گاہ سے آنے والی آوازیں صاف سُنائی نہیں دے رہی تھیں۔ پھر مَیں نے لیونا کو امتحان گاہ کی طرف جاتے دیکھا تمہیں معلوم ہی ہے کہ وہ اپنے ربڑ سول جُوتوں میں کتنی خاموشی سے چلا کرتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد تمہارے ڈیڈی کی آواز آئی۔ وہ اُسے کہہ رہے تھے کہ سب مریض فارغ ہو چکے ہیں اس لیے وہ گھر جا سکتی ہے۔ تب لیونا واپسی کے لیے مُڑی لیکن وہ واپس نہیں گئی۔ وہ دروازے سے کان لگائے سب کچھ سُن رہی تھی۔ جب تمہارے ڈیڈی نے دروازہ کھولنے کے لیے ناب گھُمائی تو لیونا کمال ہوشیاری سے برابر والے کمرے میں غائب ہو گئی۔ تمہارے ڈیڈی اور اُن کا ملاقاتی باہر نکلے۔ دونوں غصّے میں تھے لیکن ملاقاتی کا پارہ نقطۂ عروج پر نظر آرہا تھا کمرے سے باہر آکر تمہارے ڈیڈی نے چند الفاظ کہے جو اب تک مجھے یاد ہیں۔ اُنھوں نے کہا تھا: 'بہر حال کچھ بھی ہو تمہیں حالات کا سامنا کرنا ہوگا۔ مَیں قانون شکنی نہیں کر سکتا۔ مجھے بے حد افسوس ہے لیکن اُس بات کی رپورٹ مجھے بہر حال کرنا ہو گی۔' مَیں گفتگو کو پُوری طرح نہیں سمجھ رہی تھی لیکن میرا اندازہ ہے کہ کسی سرکاری ادارے کی بات تھی۔ تمہارے ڈیڈی کہہ رہے تھے: 'تم جانتے ہو اب حالات پہلے جیسے نہیں رہے۔ کچھ عرصے بعد تم اپنے گھر واپس آجاؤ گے۔ کوئی تمہارے بارے میں جاننے کوشش نہیں کرے گا اور تم سکون سے زندگی گزار سکو گے۔' اس کے بعد کی گفتگو بالکل مُبہم تھی۔ تمہارے ڈیڈی شاید۔۔۔۔ شاید کسی جانور کا ذکر کر رہے تھے۔ مجھے اُس کا نام یاد نہیں شاید وہ 'ا' سے شروع ہوتا تھا۔"

"مسز بیٹی!" اُس نے گہری سانس لے کر کہا۔ "کیا اس ملاقاتی کی شکل آپ نے دیکھی تھی؟"

"یہی تو بد قسمتی ہے۔" بیٹی نے مایوسی سے سر ہلایا۔ "مَیں

> "بڑا حصّہ عمرِ گراں کا سر رشتۂ تعلیم کی ابتدائی کتابوں میں صَرف ہُوا۔ وہ کتابیں نام کو ابتدائی ہیں مگر مجھ سے اُنھوں نے انتہا سے بڑھ کر محنت لی۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ جب تک انسان خود بچّہ نہ بن جائے تب تک بچّوں کے مناسب حال کتاب نہیں لکھ سکتا۔ پھر اُنھیں بار بار کاٹنا اور بنانا، سکھانا اور مٹانا اور بھی زیادہ مشکل کام تھا۔ بڈّھا ہو کر بچّہ بننا پڑا۔ چلتے پھرتے، جاگتے، سوتے، بچّوں ہی کے خیالات میں رہا۔ مہینوں نہیں بلکہ برسوں صَرف ہُوئے جب وہ بچّوں کے کھلونے تیّار ہُوئے۔"
>
> (مولانا محمّد حسین آزاد کے خطوط سے ایک اقتباس)

اس پوزیشن میں نہیں تھی کہ اس کی شکل دیکھ سکتی لیکن مجھے یقین ہے کہ ایونا نے شکل دیکھی تھی۔"

*

مسز بیٹی کے ہاں سے وہ سیدھی دفتر پہنچی۔ ابھی وہ بیٹھی ہی تھی کہ رینڈل نے اُسے اپنے کمرے میں بلایا۔ دورانِ ملازمت یہ شاید دوسرا موقع تھا کہ وہ رینڈل کے کمرے میں گئی تھی۔ وہ اُس کے بارے میں بڑا فکرمند نظر آ رہا تھا۔ "میں تمہارے لیے ایک پیغام چھوڑ آیا تھا۔ تمہیں آج آرام کرنا چاہیے تھا۔"

"میں تمہارے بارے میں پریشان تھی کہ تم اکیلے دفتر کیسے سنبھالو گے۔" کیتھرین نے اُس کی طرف محبت آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ بہت اُلجھا ہوا نظر آ رہا تھا۔

کیتھرین گہری نظروں سے رینڈل کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور رینڈل گفتگو میں مصروف ہو گیا۔ کیتھرین دفتر کا جائزہ لینے لگی۔ سامنے دیوار پر مختلف تصویریں لگی تھیں۔ کیتھرین نے ایک تصویر کو غور سے دیکھا۔ تصویر میں رینڈل ایک نوجوان کھلاڑی کے ساتھ نظر آ رہا تھا۔ تصویر کافی پہلے اُتاری گئی تھی لیکن کیتھرین رینڈل کو پہچان گئی۔ نیچے لکھے ہوئے الفاظ کے مطابق یہ دونوں دوست 'لو فیلڈ' کاؤنٹی کی جونیئر بیس بال ٹیم کے کوچیز تھے۔ کیتھرین کے لیے یہ ایک نیا انکشاف تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ رینڈل نہ صرف بیس بال کا اچھا کھلاڑی رہا ہے بلکہ کالج کے زمانے میں کوچنگ بھی کرتا رہا ہے۔ اُس نے تصور کی آنکھوں سے دیکھا۔ رینڈل ایک زوردار ہٹ لگا کر بلا پھینک رہا ہے.... بیس بال کا بلا.... بالکل اچانک اُس کا ذہن دوسری طرف چلا گیا اُس نے دیکھا کہ بیس بال کا بلا رینڈل نے سر پر اُٹھا رکھا ہے اُس کے بازوؤں کی مچھلیاں اُبھری ہوئی ہیں۔ پھر وہ پوری طاقت سے بلا مس لیونا کے سر پر مارتا ہے مس لیونا کراہ کر زمین بوس ہو جاتی ہے۔ وہ اپنا بلا پھر اُٹھاتا ہے۔ اب اس بلے کے نیچے ٹام ہے۔ کیتھرین نے زور سے اپنے سر کو جھٹکا۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی اس خیال کو اپنے ذہن میں جگہ نہیں دینا چاہتی تھی لیکن ذہن بے لگام ہو چکا تھا۔ اُس نے خوفزدہ نظروں سے رینڈل کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی تک گفتگو میں مصروف تھا۔

حالات نے یہ کیسا پلٹا کھایا تھا کیتھرین کو ایک دم ہی رینڈل کی شکل اجنبی نظر آنے لگی تھی۔ وہ یہ سوچ کر کانپ گئی کہ کل رات اس اجنبی چہرے کے ساتھ وہ گھر میں تنہا تھی۔ اُس نے یہ سوچ کر آنکھیں جھکا لیں کہ کہیں رینڈل اُس کے ذہن میں اُٹھنے والے طوفان سے آگاہ نہ ہو جائے۔ اُس نے سوچا فی الحال مجھے رینڈل کو اُس گفتگو سے آگاہ نہیں کرنا چاہیے جو بیٹی کے ساتھ ہوئی ہے۔ وہ آہستہ سے اُٹھی اور باہر نکل آئی اور سیڑھیاں اُتر کر نیچے سڑک پر آ گئی۔ اُس کا ذہن گھڑ دوڑ کا میدان بنا ہوا تھا۔ کیا رینڈل قاتل تھا؟ رینڈل جو اُس کے ارمانوں کا مرکز تھا۔ اُس نے سوچا اگر رینڈل ہی مجرم ہے تو اُسے چوکنا کرنا ٹھیک نہیں۔ یہ سوچ کر وہ واپس دفتر جانے کے لیے مُڑ گئی۔

دفتر پہنچی تو حسبِ توقع رینڈل اُس کی تلاش میں باہر جانے کے لیے سیڑھیاں اُتر رہا تھا۔ کیتھرین کو دیکھ کر اُس کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ کیتھرین نے سوالات کی بوچھاڑ سے بچنے کے لیے فوراً ایک گھڑا گھڑایا بہانہ اُسے سُنا دیا۔ اُس نے کہا کہ دانت میں شدید درد اُٹھا تھا اور وہ اپنے ڈاکٹر کے پاس چلی گئی تھی۔ رینڈل کو مطمئن کرنے کے بعد وہ اپنی میز پر جا پہنچی۔ پھر اُس کا دھیان ٹام کی طرف چلا گیا۔ ٹام کے کاغذات دیکھنے سے ہو سکتا ہے اُس کے قتل پر کچھ روشنی پڑ جائے۔ ٹام کی میز قریب ہی تھی لیکن اب پولیس کی اجازت کے بغیر وہ اس میز کو ہاتھ نہیں لگا سکتی تھی۔ حسبِ توقع تھوڑی دیر بعد شیرف نے ایک ڈپٹی کو ٹام کی میز کی تلاشی لینے کے لیے بھیج دیا۔ کیتھرین نے اُس کے ساتھ مل کر میز کے دراز کھولے۔ آدھ گھنٹے کی اُلٹ پلٹ میں کوئی کام کی چیز ہاتھ نہ آئی۔ مس لیونا کے قتل پر ٹام کے تحقیقی کام کا ادھورا مسوّدہ ملا لیکن اُس میں کوئی ایسی بات درج نہیں تھی جو دوسرے لوگوں کو معلوم نہ ہو۔

ڈپٹی کے جانے کے بعد کیتھرین نے ٹام کی کھینچی ہوئی

تصویروں کو دھونے کا پروگرام بنایا۔ ڈارک روم میں گھس کر اُس نے فلم دھو ڈالی۔ دو دن پہلے ایک مقامی ہوٹل میں ہونے والی تقریب کی تصویریں تھیں۔ بستی کی کئی جانی پہچانی شخصیتیں، شیرف، ڈاکٹر میو، سپیکر کے بالکل سامنے پارکنز اپنی لمبی آستینوں کی قمیص میں بیٹھا شاید کسی بات پر مُسکرا رہا تھا۔ اُس کے ساتھ رینڈل مُنہ میں پائپ دبائے بیٹھا تھا۔

دونوں ہاتھ گود میں رکھے وہ کتنی ہی دیر اپنی نشست پر گم سُم بیٹھی رہی۔ آنسو جیسے اندر ہی اندر اُس کے حلق میں گر رہے ہوں۔ بیس بال کا بَلّا بار بار اُس کے ذہن پر ضربیں لگا رہا تھا۔ بیس بال کا بَلّا کوئی ایسی نادر چیز تو نہ تھی۔ وہ کئی بار خود کو سمجھا چکی تھی۔ قصبے کے کئی گھروں میں بیس بال کے بَلّے موجود ہوں گے۔ تم اس قدر تنگ نظری کا ثبوت کیوں دے رہی ہو۔ لیکن پھر فوراً ہی ذہن کے کسی گوشے سے کوئی مُخالفانہ دلیل اُبھر آتی۔

اس وقت اُسے کل رات کا واقعہ یاد آ رہا تھا۔ رات پچھلے پہر اُس کی آنکھ کُھل گئی تھی۔ باہر گھن گرج کے ساتھ موسلادھار بارش ہو رہی تھی۔ یہ خیال اُس کی ڈھارس بندھا رہا تھا کہ رینڈل دوسرے کمرے میں موجود ہے۔ اُسے دیکھنے کے لیے وہ دبے پاؤں دروازے کے پاس پہنچی لیکن یہ دیکھ کر ششدر رہ گئی کہ رینڈل بستر پر موجود نہیں۔ ابھی وہ اُسے تلاش کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ رینڈل تیزی سے کمرے میں داخل ہُوا۔ نائٹ بلب کی روشنی میں اُس کا چہرہ بھیگا ہُوا نظر آ رہا تھا۔ پھر وہ جلدی سے بستر میں گُھس گیا۔ کیتھرین بھی یہ سوچ کر خوابگاہ میں واپس آ گئی کہ صبح اُس سے پُوچھے گی کہ وہ کہاں گیا تھا؟ . . . . لیکن اب تو ساری صورتِ حال ہی بدل گئی تھی۔ تاریکی کے اندر سے رینڈل کے خدوخال واضح ہو رہے تھے۔

ایک آہٹ نے اُس کے خیالوں کا سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔ رینڈل اُس کے سامنے کھڑا تھا: "یہ دیکھو کیتھرین" اُس نے کاغذ کی ایک چِٹ اُس کی آنکھوں کے سامنے لہرائی: "اس ہفتے کی بہترین تفریح، لوفیلڈ تھیٹر کی پیشکش 'پہلی محبّت'۔ مَیں نے جمعے کی شب کے لیے دو نشستیں مخصوص کرالی ہیں۔"

کیتھرین نے بے یقینی سے اُس کی آنکھوں میں دیکھا۔ کس قدر پُر اعتماد نظر آ رہا تھا وہ۔ "شاید ہم اس تفریح سے لطف اندوز نہ ہو سکیں۔" اُس نے دل میں سوچا۔ "ہو سکتا ہے ہفتے کا دن تمہیں حوالات میں آئے۔"

"کیا سوچ رہی ہو؟ کیتھرین!" رینڈل نے اُس کی میز پر جُھکتے ہُوئے کہا۔

"کچھ نہیں۔" اُس نے چہرے پر زبردستی مُسکراہٹ بکھیری۔ "ٹام کے متعلق سوچ رہی تھی۔ اُس کی لکھی ہُوئی تحریر اور کھینچی ہُوئی تصویروں میں کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی جسے اُس کی فوری موت کا سبب قرار دیا جا سکے۔" ایک لمحہ رُک کر وہ بولی: "رینڈل! کبھی کبھی مجھے یُوں لگتا ہے جیسے کوئی نزدیکی شخص ان واقعات کا ذمّے دار ہے۔ کوئی ایسا شخص جسے مَیں اچھّی طرح جانتی ہُوں۔ بہت اچھّی طرح۔"

رینڈل نے کچھ کہنے کے لیے مُنہ کھولا لیکن پھر فون کی گھنٹی بجنے لگی اور وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ کیتھرین نے جلدی جلدی اپنی چیزیں سنبھالنی شروع کیں۔ وہ اس وقت شیرف سے ملنے جا رہی تھی۔ جب وہ کاغذوں کا ایک پلندہ دراز میں رکھ رہی تھی تو چند کاغذ پھسل کر فرش پر گر گئے۔ اُس نے جُھک کر اُنہیں اُٹھایا۔ یہ قصبے کے ڈاکٹر میو کا لکھّا ہُوا ایک مضمون تھا جو اُس نے کوئی تین ہفتے قبل اشاعت کے لیے دیا تھا اور جسے کیتھرین نے لاپروائی سے اصلاح طلب مضامین میں پھینک دیا تھا۔ وہ یہ مضمون شائع کر کے ڈاکٹر میو کی مستقل آمدورفت کی راہ نہیں کھولنا چاہتی تھی۔

اُس نے حسبِ سابق ایک طائرانہ نگاہ مضمون پر ڈالی اور چونک گئی۔ ایک جگہ لفظ ARMADELLO لکھّا نظر آیا تھا۔ کیتھرین سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور جلد جلد مضمون پر نظر دوڑانے لگی۔ یہ تحریر کوڑھ کے مرض پر تازہ ترین تحقیق کا احاطہ کرتی تھی۔ ڈاکٹر میو نے ایک معروف ماہرِ طب کا ذکر کرتے ہُوئے لکھّا تھا کہ اُنہوں نے کوڑھ کے اثرات کا مشاہدہ کرنے کے لیے ARMADILLO (وسطی امریکہ کا نیولا نما جانور) پر تجربات کیے ہیں۔ ان تجربات سے

اُنہیں گراں قدر معلومات حاصل ہُوئی ہیں۔ کوڑھ کا مرض پہلے بھی قابلِ علاج تھا لیکن اب اس کا سدِباب اور بھی سہل اور یقینی ہو گیا ہے۔

کیتھرین کے چہرے پر ہیجان کے آثار نظر آ رہے تھے۔

جب اُس نے مضمون ختم کیا تو وہ ایک فیصلے پر پہنچ چکی تھی۔ اس نے رینڈل کے کمرے کی طرف دیکھا۔ وہ ایک فائل پر جُھکا ہُوا تھا۔ ایکا ایکی سب کچھ جانا پہچانا اور حسین لگنے لگا تھا۔ وسوسوں کی دُھند چھٹ گئی تھی۔ رینڈل کا چہرہ ہمیشہ کی طرح روشن نظر آ رہا تھا... رینڈل مُجرم نہیں تھا، مُجرم کوئی اور تھا اور وہ جو کوئی بھی تھا اب کیتھرین سے بچ نہیں سکتا تھا۔

*

وہ تیزی سے کار ڈرائیو کرتی ہُوئی گھر پہنچی۔ شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ وقت بہت تھوڑا تھا۔ گھر کے سامنے ایک شیورلیٹ گاڑی دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی۔ ایک ادھیڑ عمر مرد عورت اُس کا انتظار کر رہے تھے۔ یہ ٹام کے والدین تھے۔ دونوں کے چہروں سے بیٹے کی موت کا غم عیاں تھا۔ کیتھرین اُنہیں گھر کے اندر لے گئی۔ وہ قریباً پندرہ منٹ اُس کے پاس بیٹھے رہے۔ وہ ٹام کی آخری رُسوم ادا کرنے کے لیے ٹام کا ایک سُوٹ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ کیتھرین نہیں چاہتی تھی کہ وہ خود اس عمارت میں داخل ہوں۔ اُس نے بہانہ بنایا کہ پولیس نے مکان کو سیل کر رکھا ہے؛ تاہم اُن سے وعدہ کیا کہ کل تک وہ اُنہیں سُوٹ پہنچا دے گی۔ اُن کے رُخصت ہوتے ہی کیتھرین نے ٹینس شوز پہنے، دراز میں سے پستول نکالا اور مکان کے اُس حصّے میں جانے کے لیے تیار ہو گئی جہاں کل ٹام قتل کیا گیا تھا۔ اُس کا دل شدّت سے دھڑک رہا تھا لیکن غُصّے کی ایک لہر بار بار اُس کے خوف کو دبا دیتی تھی۔ آخری لمحے اُس نے سوچا کہ اگر مکان میں اُس کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ گیا تو وہ معلومات جو اُس کے دل میں ہیں بے کار چلی جائیں گی۔ اُسے مکان میں داخل ہونے سے پہلے کسی کو اس بارے میں بتا دینا چاہیے۔ اُس نے رینڈل کو فون کیا: "ہیلو رینڈل ... ڈیئر! مَیں جو کچھ کہہ رہی ہُوں غور سے سُنو۔ میرے پاس وقت کم ہے۔ ٹام لیونا اور میرے ممّی اور ڈیڈی کا قاتل قصبے کا ایک کوڑھی شخص ہے۔ مَیں اُس کے بارے میں فی الحال کچھ نہیں جانتی۔ اُس کی میڈیکل فائل ڈیڈی کے سابقہ کلینک کی بالائی منزل میں پڑی ہے۔ مَیں یہ فائل لینے جا رہی ہُوں۔ خُدا حافظ۔"

رینڈل ہیلو ہیلو پُکارتا رہا لیکن کیتھرین نے ریسیور رکھ دیا۔

اُس نے دروازہ کھولا اور بغلی صحن میں سے ہوتی ہُوئی باڑ کے دوسری طرف پہنچ گئی۔ مکان کا عقبی دروازہ مقفّل تھا لیکن اُس کی مُتبادل چابی کیتھرین کے پاس موجود تھی۔ اُس نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گئی۔ مکان میں عجب پُرہول خاموشی اور گہری تاریکی تھی۔ وہ روشنی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اُس نے جیب سے چھوٹی ٹارچ نکالی اور اندرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ یہ دروازہ مقفّل نہیں تھا۔ عقبی برآمدے میں سے ہو کر وہ خواب گاہ میں داخل ہُوئی۔ سامنے ہال کمرے کا دروازہ نظر آ رہا تھا۔ ذرا سے دباؤ سے دروازہ کُھل گیا۔ اُس نے دیوار پر لگا سوئچ آن کیا۔ بلب کی کمزور روشنی ہال کمرے میں پھیل گئی۔ کھڑکیوں کے پردے کھنچے ہُوئے تھے، اس لیے روشنی باہر جانے کی توقّع نہیں تھی۔ کمرے کی تمام چیزیں کل ہی کی طرح اِدھر اُدھر بکھری ہُوئی تھیں۔ صرف ایک چیز کی کمی تھی اور وہ تھی ٹام کی لاش۔ اُس نے اس ہولناک منظر سے توجّہ ہٹائی اور زینے کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ زینہ ایک چکّر کھا کر بالائی منزل پر آ گیا۔ یہاں ایک بڑے کمرے میں بہت سی الماریاں آگے پیچھے رکھّی تھیں۔ کیتھرین کو معلوم تھا وہ فائل کہاں ہو گی۔

جس روز الماریاں اُوپر لائی گئی تھیں اُس نے لیونا کو ایک الماری میں کوئی چیز چُھپاتے ہُوئے دیکھا تھا؛ تاہم اُس وقت غور نہیں کیا لیکن اب وہ جان گئی کہ لیونا نے وہاں کوڑھی مریض کی فائل چُھپائی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ فائل کسی اور جگہ سے یہاں زیادہ محفوظ رہے گی۔ اُس فائل کے ذریعے وہ اس شخص کو چھ ماہ تک بلیک میل کرتی رہی تھی۔ کیتھرین نے ٹارچ روشن کی اور ایک الماری کے تختوں پر پاؤں رکھ کر اُوپر چڑھ گئی۔ بالائی

خانے میں ایک پُرانے صندوق کے پیچھے فزا ٹٹولنے سے وہ فائل اُس کے ہاتھ میں آگئی۔ وہ فائل لے کر الماری سے نیچے اُتر آئی اور پھر کانپتے ہاتھوں سے اُس نے ٹارچ کی روشنی فائل کے کوَر پر مرکوز کی۔ وہاں مریض کا نام لکھا تھا... مسٹر کارل پارکنز، عمر ۴۵ سال، پیشہ لوفیلڈ کا تفتیشی افسر۔

کیتھرین نے ایک طویل سانس لی ....اب وہ سمجھ گئی تھی کہ پارکنز ہر وقت لمبی آستینوں کی قمیص کیوں پہنتا ہے پھر اُسے یاد آیا کہ ہاتھوں پر اُبلتی ہوئی کافی گرنے کے باوجود اُس کا چہرہ تکلیف سے عاری رہا تھا۔ یقیناً اُس کی جلد مفلوج ہو چکی تھی، وہ کوڑھ کا مریض تھا لیکن اپنے مرض کو سماجی حیثیت، عزّت اور وقار کے لیے خطرہ سمجھتا تھا۔ اس لیے اُسے چھپانا چاہتا تھا۔ لیکن کیتھرین کے والد اپنی پیشہ ورانہ ذمّے داری کے ہاتھوں مجبور تھے۔ ملکی قانون کے مطابق کوڑھ کے مریض کی رپورٹ کرنا ضروری تھا۔ وہ اُس کا علاج کرنا چاہتے تھے لیکن رپورٹ کرانا بھی ضروری سمجھتے تھے۔

کیتھرین نے جلد جلد فائل کے صفحے اُلٹے۔ اُس کے ڈیڈی نے بڑی محنت سے پارکنز کی بیماری کا ریکارڈ تیار کیا تھا۔ وہ یقیناً اُن کے علاج سے شفایاب ہو جاتا لیکن اُس کی ہٹ دھرمی اور کمینگی نے نہ صرف کیتھرین کے ڈیڈی کی جان لے لی تھی بلکہ تین اور انسانوں کے خون سے بھی ہاتھ رنگ لیے تھے۔ اُس کے ظلم کا شکار ہونے والے ان چار افراد میں سے صرف لیونا ہی کو کسی حد تک قصوروار ٹھہرایا جاسکتا تھا۔ باقی تینوں افراد بے گناہ تھے۔ اُس کے ڈیڈی کی خطا یہ تھی کہ وہ اپنا فرض پُورا کرنا چاہتے تھے۔ اُس کی ممّی اس لیے قتل ہُوئی کہ وہ اپنے خاوند کے ساتھ کار میں سوار تھی اور ٹام کا گُناہ یہ تھا کہ وہ کیتھرین کا کرایے دار تھا اور ایک غلط جگہ غلط وقت پر موجود تھا۔

پارکنز اپنی فائل کی تلاش میں پہلے لیونا کے گھر گُھسا تھا لیکن فائل اُسے نہیں ملی۔ بعد میں اُس نے لیونا کو قتل کر دیا لیکن یُوں لگتا ہے جیسے قتل کرنے سے پہلے اُس نے لیونا سے پُوچھ لیا تھا کہ اُس نے فائل کہاں چھپا رکھی ہے۔ کیتھرین کو وہ شام یاد تھی جب پارکنز چہل قدمی کے بہانے اُسے گھر چھوڑنے آیا تھا۔ اُس نے اپنے بیٹے کی فائل کے بارے میں پُوچھا تھا۔ دراصل وہ لیونا کے بیان کی تصدیق کرنا چاہتا تھا۔ جب کیتھرین نے بتایا کہ فائلیں ٹام کے گھر کی بالائی منزل پر ہیں تو اُس نے وہاں گُھسنے کا پروگرام بنا لیا۔ اُس سے اگلے روز دوپہر کے وقت وہ دفتر آیا تھا۔ وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ ٹام آج شام گھر میں موجود ہوگا یا نہیں۔ جب اُس نے ٹام کو پنکی سے باتیں کرتے سُنا تو وہ جان گیا کہ ٹام اس لڑکی کے ساتھ ڈائننگ پر جا رہا ہے۔ ستم یہ ہُوا کہ گاڑی خراب ہونے کی وجہ سے ٹام گاڑی گھر نہ لایا۔ دوسری طرف پنکی بھی اپنی گاڑی ایک دوسری گلی میں کھڑی کر کے ٹام کے گھر آئی۔ گیراج خالی دیکھ کر پارکنز کو یقین ہو گیا کہ ٹام گھر میں موجود نہیں۔ وہ فائل نکالنے کے لیے اندر گُھسا۔ جب اُس نے ٹام کو اچانک اپنے سامنے پایا تو ہاتھ میں پکڑے ہُوئے بیلچے سے اُس کا کام تمام کر دیا۔ عین اُس وقت پنکی چیخنے لگی اور وہ اپنا مشن اُدھورا چھوڑ کر واپس آگیا۔

اوہ میرے خُدا! کس قدر سفّاک قاتل تھا وہ۔ کیتھرین نے سوچا۔ وہ اب نچلی منزل کی خوابگاہ سے ٹام کا سُوٹ حاصل کر کے فوراً یہاں سے نکل جانا چاہتی تھی.... اور پھر وہ چونک اُٹھی اُس کے پیچھے کوئی آہستہ آہستہ دروازہ کھول رہا تھا۔ خُون کیتھرین کی رگوں میں منجمد ہو گیا۔ وہ ٹام والی غلطی دُہرا چکی تھی۔ اُس نے بھی عقبی دروازہ کُھلا رہنے دیا تھا، شاید رینڈل کے لیے.... لیکن اُس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ یہ رینڈل نہیں۔ یہ وہی سفّاک قاتل پارکنز ہے۔ اُس کے ہاتھ میں بیس بال کا بلّا ہے اور وہ اپنا اُدھورا مشن مکمّل کرنے اِدھر آرہا ہے۔ یقیناً یہ وہی ہے۔ اُسے معلوم ہے کہ آج رات گھر میں کوئی نہیں۔ وہ اطمینان سے فائل تلاش کر سکتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اُس نے کھڑکیوں میں سے چھنتی ہُوئی روشنی دیکھ لی ہو۔ یہ سب کچھ چند ثانیے میں کیتھرین کے ذہن سے گزر گیا۔ اُس نے ایک جھٹکے سے مُڑ کر دیکھا۔ پارکنز اُس سے دس قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ نیچے ہال سے آتی ہُوئی روشنی میں اُس کا نصف چہرہ نظر آرہا تھا۔

اُس کے ہاتھ میں بیس بال کا بلا تھا اور آنکھوں میں دیوانگی ناچ رہی تھی۔

کیتھرین کو پوری شدت سے خطرے کا احساس ہوا۔ فائل اُس کے ہاتھ میں تھی اور پارکنز قدم بہ قدم اُس کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گا۔" وہ پھنکارا۔ "میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گا۔"

فائل کی تلاش کے دوران کیتھرین اپنا پستول فرش پر رکھ چکی تھی۔ اور اب وہ اُن کی پہنچ سے دُور تھا۔ وہ جان چکی تھی کہ اُسے پارکنز کا کم از کم ایک وار بچانا ہوگا۔ اُس نے اپنی آنکھیں بیس بال کے خونی بلّے پر مرکوز کر رکھی تھیں اور پھر ایک چنگھاڑ کے ساتھ پارکنز نے بلّا گھمایا۔ کیتھرین تیزی سے نیچے جھکی۔ بلّا زوردار آواز کے ساتھ الماری سے ٹکرایا۔ وار بچانے کے ساتھ ساتھ وہ جھک کر ریوالور بھی اُٹھا چکی تھی۔ اس سے پہلے کہ پارکنز دوسرا وار کرتا، کیتھرین تیر کی طرح دروازے کی طرف لپکی ــــ اور سیڑھیاں اُتر کر وہ ہال کمرے میں آئی۔ ٹارچ گر چکی تھی لیکن در و دیوار اُس کے جانے پہچانے تھے۔ وہ ٹٹول ٹٹول کر بھی دروازے تک پہنچ گئی۔ پارکنز اُس کے پیچھے طوفان کی طرح آ رہا تھا۔ پہلے اُس نے اپنے گھر میں گھسنے کا ارادہ کیا لیکن پھر گلی میں مڑ گئی۔ گلی سنسان تھی۔ دُور ایک سٹریٹ لائٹ جل رہی تھی۔ یہ سٹریٹ لائٹ اُس کے لیے اُمید کی کرن تھی۔ اُس نے پوری شدت سے روشنی کی طرف دوڑ لگا دی لیکن پارکنز کی رفتار بھی کم نہیں تھی۔ وہ لمحہ بہ لمحہ اُس سے قریب ہو رہا تھا۔ کیتھرین جان گئی کہ وہ اُسے سڑک تک نہیں پہنچنے دے گا۔ اُس نے رُکنے کا فیصلہ کر لیا اور تیزی سے مڑی۔ ایک لمحے کے لیے ساکت ہوگئی۔ پھر خود بخود اُس کے گھٹنوں میں خم آگیا۔ اُس کا سر پیچھے کی طرف جھکا۔ پستول والا ہاتھ سیدھا ہوا۔ بائیں ہاتھ نے دائیں ہاتھ کی کلائی تھامی۔ پارکنز قریب آچکا تھا۔ کیتھرین کے پاس صرف ایک موقع تھا۔ صرف ایک فائر داغنے کا لمحہ۔ اُس نے گولی چلا دی۔ گولی عین پارکنز کے دل میں پیوست ہوگئی۔ وہ بیئر کے خالی ڈبے کی طرح فضا میں اُچھلا اور گرتے ہی ساکت ہوگیا۔ عقب میں بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز آ رہی تھی۔ کیتھرین نے دیکھا رینڈل چند دوسرے افراد کے ساتھ اُس کی طرف آ رہا تھا۔ فائل نیچے گر چکی تھی کیتھرین نے فائل اُٹھائی۔ رینڈل نے قریب پہنچ کر اُس کا ہاتھ تھام لیا اور وہ اُس کے بازوؤں سے لگ کر سسکنے لگی۔

*